کاروانِ اسلام

(مکمل تاریخِ اسلام عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

رئیس ا

ایچ ایم سعید کمپنی ★ ادبِ م
پاکستان چوک کراچی

کاروانِ اسلام

اسلام کی چودہ سو سال کی مکمل مستند اور

جامع تاریخ

— از —

رئیس احمد جعفری (ندوی)

ادب منزل
پاکستان چوک۔ کراچی

کاروانِ اِسلام

طبع اوّل، سنہ ۱۹۶۶ء

طابع
ایچ۔ ایم سعید کمپنی
پاکستان چوک کراچی

مطبوعہ
ایجوکیشنل پریس۔ کراچی

پیش لفظ

اُردو زبان میں تاریخ اسلام کے موضوع پر اب تک بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ اور ہمیں اس حقیقت کے اعتراف میں تامل نہیں کہ ان میں سے بعض بہت خوب اور ہر اعتبار سے معیاری اور مُستند ہیں، لیکن اس طرح کی کتابیں زیادہ تر طویل اور ضخیم ہیں۔ جو لوگ علم و تحقیق کا ذوق اور فرصت رکھتے ہیں ان کے لیے یہ کتابیں حاصلِ مطالعہ اور نعمتِ غیر مترقبہ ہیں۔ لیکن جن لوگوں کے پاس وقت کم ہے مگر جو اسلام کی عہد بہ عہد کی تاریخ سے واقف ہونا چاہتے ہیں ان کے لیے بڑی دشواری تھی کہ کیا کریں۔ اپنی تشنگی کس طرح بجھائیں؟ اپنے ذوقِ علم و تحقیق کی تکمیل کا کیا سر و سامان بہم پہنچائیں!

یہ ایک بہت بڑی دشواری تھی جو تاریخ اسلام کے دلچسپ، سبق آموز اور ولولہ خیز موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کو پیش آ رہی تھی۔

اس امر کی ضرورت بھی محسوس کی جا رہی تھی جو ایک طرف تو ۱۴ سو سال کی پوری تاریخ دول اسلامی پر حاوی ہو۔ دوسری طرف پاکستان کی پوری تاریخ بھی اس کے اندر موجود ہو۔

پاکستان بننے کے ساتھ ساتھ یا اس سے کچھ پہلے یا اس سے کچھ بعد کئی اسلامی

ممالک آزاد ہوئے، کئی اسلامی ممالک ایسے ہیں جو اب تک غلام ہیں لیکن آزادی کا استحقاق پیدا کر چکے ہیں۔ کئی ایسے اسلامی ممالک بھی ہیں جو اب تک محرومی اور مجبوری کی زندگی بسر کر رہے ہیں، جہدِ حریت میں مصروف ہیں اور استعمار نے ان کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے، ضرورت تھی کہ ان ممالک کا تذکرہ بھی اس تاریخ میں موجود ہو۔

الحمدللہ یہ اہم ترین ضرورت ملک کے مانے ہوئے ادیب، مؤرخ اور صحافی سید رئیس احمد جعفری نے پوری خوبی سے پوری کر دی ہے، ۱۴ سو سال کی مستند اور جامع تاریخ مرتب کر کے اور اس میں نو آزاد، نیم آزاد اور سردست محکوم اسلامی ممالک کی تاریخ شامل کر کے وقت کی بہت بڑی اور اہم ضرورت کی تکمیل کر کے ایسی خدمت انجام دی ہے جسے علمی حلقوں میں یقیناً تحسین و آفرین کی نظروں سے دیکھا جائے گا۔ ہمیں مسرت ہے کہ اس کتاب کی طبع و اشاعت ہمارے ہاتھوں انجام پا رہی ہے۔ اور ہمیں یہ اعلان کرتے ہوئے مسرت محسوس ہو رہی ہے کہ ہمارا ادارہ جعفری صاحب کی کئی اہم علمی اور تحقیقی تالیفات و تراجم عنقریب شائع کر رہا ہے۔

محمد ذکی

ایم۔ اے (علیگ)

انتساب

مسٹر محمد شعیب

وائس پریسیڈنٹ ورلڈ بینک (امریکہ)

کے نام

عالم ہیں تم سے لاکھ سہی تم مگر کہاں ؟

رئیس احمد جعفری

ترتیب

علالت، استخلاف اور وفات

کارِ نبوت

خصوصیات اور ممیزات

شہادت اور آخری لمحات

خصوصیات اور ممیزات

چھٹی منزل

خلیفہ واثق باللہ

متوکل علی اللہ

منتصر باللہ

مکتفی باللہ

مقتدر باللہ

قاہر باللہ

راضی باللہ

متقی للہ

سترھویں منزل

اٹھارویں منزل

مغل دورِ حکومت

مغلوں کا دورِ زوال ۱۰۷۹

از ۱۷۰۷ء تا ۱۸۵۷ء

تاریخ اسلام کے ادوار

عہدِ زرّیں

دورِ خلافت

◎

تاریخ اسلام کا عہد زریں، خلافت راشدہ کا دور ہے۔ یہ مثالی دور تھا، یہ ایسا دور تھا۔ جس کی مثال دنیا کی تاریخ آج تک نہیں پیش کر سکی، نہ قیامت تک پیش کر سکے گی۔

یہ دور حضرت ابوبکر صدیق رضؓ سے شروع ہوا اور حضرت امام حسن رضؓ پر ختم ہوا۔

◎

عہدِ نکبت

دورِ ملوکیت

خلافت راشدہ کے بعد دورِ ملوکیت اور بادشاہت کا دور شروع ہوتا ہے۔

یہ دور خلافت راشدہ کے مقابلے میں عہدِ نکبت ہے۔ لیکن دنیاوی نقطۂ نظر سے اسے عہدِ فتوحات و کشورکشائی اور عہدِ ثقافت وحضارت اور عہدِ ترویج علوم سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اس دور میں دنیاوی اعتبار سے بڑی ترقیاں ہوئیں لیکن خالص دینی نقطۂ نظر سے اسے عہدِ ادبار ہی کہا جائیگا۔

عہد جدید

دورِ جمہوریت

صدہا سال کی گردشوں کے بعد دنیا نے ملوکیت سے دامن چھڑایا، اور جمہوریت کو فروغ دیا۔
لیکن ___ مسلمان جنہوں نے دنیا کو جمہوریت سے روشناس کرایا تھا ملوکیت کے سحر میں گرفتار رہے، لیکن اب وہ بھی انگڑائی لے کر اٹھے ہیں اور جمہوری اقدار کو اپنا رہے ہیں جس کا سب سے بڑا مظہر پاکستان ہے''!

کاروانِ اسلام کی جھلکیاں

انعقادِ خلافت

انعقادِ خلافت کو قبول کر لینے سے خلیفہ اس امر کا پابند ہو جاتا تھا کہ اپنے اختیار کو ان حدود کے اندر استعمال کرے گا، جو شریعت ربانی نے قائم کر دیئے ہیں اور یہ اس کا اولین اور لازم ترین فریضہ تھا۔ چونکہ انسان کو دنیاوی تعلقات اور منافع سے (جو بالکل بیہودہ ہیں اور آخر نابود ہو جاتے ہیں) کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے اس کا ایمان محفوظ رہنا چاہیئے جو اس کو ابدی زندگی کی طرف لے جاتا ہے۔

خلیفہ اس امر کا ذمہ دار ہے کہ اسلام کے دنیاوی مفادات کی حفاظت کرے۔ مثلاً سرحدوں کا تحفظ، کفار کے خلاف جہاد، داخلی امنیت، عمومی اموال کا انتظام اور انصاف و عدالت۔

امت مسلمہ کا یہ رئیس اپنے ان دو گونہ فرائض کی بجا آوری میں "خلیفہ رسول" کی حیثیت سے عمل کرتا ہے۔ خلیفۂ رسول پیغمبر کے روحانی مشن کے وارث نہ تھے۔ ان کا کام حقیقت میں صرف یہ تھا کہ رسول کے جانشین کی حیثیت سے امت کے دینی و دنیاوی مفادات کے متعلق کام جاری رکھیں۔ ابوبکرؓ کو کسی نے خلیفہ اللہ کہا تو انہوں نے صاف کہہ دیا کہ "میں خلیفہ اللہ نہیں ہوں بلکہ خلیفہ رسول ہوں"۔ اس کے بعد عمرؓ کے زمانے میں امیر المومنین کا لقب رائج ہو گیا اور اس سے اس امر کی بہتر وضاحت ہو گئی کہ خلیفہ بادشاہ نہیں۔ بلکہ محض حکمران ہے جو قانون کے ماتحت حکومت کرتا ہے لفظ "امام" "پیش نماز جماعت" کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن تمام زمانوں میں یہ لقب حکمران کے لئے بھی استعمال کیا جاتا رہا۔ کیونکہ حکمران شریعت اسلامی کے مطابق عدل، جہاد، اور احتساب رسوم کا ذمہ دار تھا جب مصنفین بغیر کسی صراحت کے لفظ امام استعمال کرتے ہیں تو ان کی مراد رئیس و فرمانروائے قوم اور صاحب اختیار حکمران سے ہوتی ہے۔ جس کے نام سے تمام معاشری وظائف بجا لائے جاتے ہیں۔ بعض مصنفین نے لکھا ہے کہ ان وظائف کی بجا آوری کی وجہ سے حکمران کو کوئی مقدس یا مذہبی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔

○

خلیفہ کی حیثیت

حقیقت یہ ہے کہ مذہبی رئیس کی حیثیت سے خلیفہ "پوپ" نہیں بن جاتا۔ اس کو کسی قسم کی مذہبی پیشوائی کی حیثیت حاصل نہیں ہوتی۔ کیونکہ اسلام میں مذہبی پیشوائی اور پادریت بالکل موجود نہیں۔ نہ وہ اپنی سیاسی حیثیت سے "آقا" اور "رب" ہے۔ خلافت کوئی ایسا عہدہ نہیں جو شریعت حقہ نے عموی بہبود کے انصرام کے لئے قائم کیا ہو بلکہ یہ ایک "عمومی تولیت" ہے۔ جس کا مقصد شریعت مقدسہ کی خدمت، حفاظت اور تنفیذ ہے۔ خلیفہ کو عام طور پر راعی یا چرواہے سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اس کی شخصیت گویا اس کے گلہ یا ریوڑ کے اتحاد کی ضامن ہے جس طرح چرواہا اپنے گلے کی نگہبانی کرتا ہے اور ولی اپنے شاگرد کی امداد کرتا ہے۔ اسی طرح حکمران محض اس لئے ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ان مفادات کی خدمت کرے جن کا اہتمام وہ من حیث الجماعت نہیں کر سکتے۔ وہ امت مسلمہ کا وکیل ہوتا ہے۔ اس کے اعمال و افعال کا جواز اور ان کی تحدید اس اصول سے ماخوذ ہے۔ کہ حکمراں کو اپنی قوم کی بہبود کا خیال رکھنا چاہیئے کیونکہ حکمرانوں کے وجود کا مقصد یہی ہے۔ وکیل وامین کا فرض ہے کہ اپنے مالک کے سامنے اپنے افعال کا صحیح صحیح بیان پیش کرے۔ اسی طرح خلیفہ خدا کے آگے جواب دہ ہے۔ امام ابو یوسف نے خلیفہ ہارون کو لکھا کہ "میں تمہیں تلقین کرتا ہوں کہ جو گلہ تمہارے سپرد کیا گیا ہے۔ اس کی نگہبانی کرو۔ کیونکہ راعی اپنے مفوضہ گلے کے متعلق جواب دہ ہوتا ہے اور تم اللہ کے سامنے جواب دہ ہو گے۔"

○

جماعت اور امام

"جماعت" اور "امام"۔ یہ دو سادہ سی اصطلاحات اسلام کے پورے سیاسی نظام اور اس کے تصور مملکت کو نہایت بلاغت سے واضح کر رہی ہیں۔

مملکت کی نمائندہ اور انتظامی قوت کا مرکز خلیفہ ہے۔ جس کا خلیفہ یہ ہے کہ جہاں قانون شرعی واضح اور قطعی ہو وہاں اس کا اطلاق کرے۔ اس معاملے میں اس کو قانون شرعی میں کسی رد و بدل کا اختیار نہ حاصل نہیں۔ اس کا اطلاق لازمی طور پر کرنا پڑے گا۔ مثلاً قانون قاضی کو تخفیف سزا یا عفو کی اجازت نہیں دیتا۔ جن امور میں کوئی قطعی قانون موجود نہ ہو ان میں حکمران کی آزادی بغیر محدود ہے۔ کیونکہ وہ کوئی معمولی کارندہ نہیں۔ بلکہ امین و وکیل ہے اور قانون کی تنفیذ اس کے اختیار تمیزی پر چھوڑ دی گئی ہے۔ اس عدالتی اختیار کے علاوہ اسے عمومی حیثیت کے بہت سے دوسرے معاملات میں اختیارات تمیزی حاصل ہیں۔ مثلاً اجرائے جنگ، تقسیم غنیمت، مالیہ، آراضی کی تجویز۔ مداخل عمومی کا صرف و استعمال اور حکومت کے عہدہ داروں کا تقرر۔

○

بیعت کا مفہوم

جہاں تک عوام کا تعلق ہے۔ بیعت کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے رئیس حکومت کے احکام کی تعلیم کریں گے۔ جو شخص امام کا باغی ہے وہ اللہ کا باغی ہے۔ اپنے رئیس کی اطاعت کرو۔ خواہ وہ حبشی غلام ہی ہو۔ اطاعت کے فریضہ کے ساتھ امداد و حمایت (نصرت) کا فریضہ بھی شامل ہے اور ہر بیعت کرنے والے کا فرض ہے کہ جب کبھی حکمران کسی ایسے دشمن کے خلاف جنگ کرنے کے لئے استمداد کرے، جو اس کے اقتدار کی مخالفت کرتا ہو یا مسلمانوں کی سلامتی کو خطرے میں ڈالتا ہو تو اس استمداد پر لبیک کہے۔

○

نقض بیعت

یہ فرائض صرف اس حالت میں ساقط ہو سکتے ہیں جب جسمانی یا اخلاقی امداد قطعی طور پر ناممکن ہو۔ یعنی امام کا کوئی حکم انسانوں کی استطاعت سے باہر ہو، یا صریحاً شریعت کے بانی کے خلاف ہو۔ مثلاً حکمراں کسی کو ارتکاب قتل یا زنا یا شراب خواری یا ترک صلوٰۃ کا حکم دے دے تو اس کی اطاعت کا فرض ساقط ہو جائے گا۔ حدیث میں آیا ہے کہ "ارتکاب معاصی میں کوئی اطاعت فرض نہیں"۔ جب تک خلیفہ ملت مسلمہ کی حفاظت کا فرض ادا کرنے کی قابل نہ رہے اس کا اختیار ختم ہو جاتا ہے اور معاہدہ قانوناً منسوخ قرار پا جاتا ہے۔ مثلاً خلیفہ جسمانی ناکارگی کا شکار ہو جائے یا کفار کا قیدی ہو جانے کی وجہ سے آزادی کے حقوق کھو بیٹھے۔

○

زوال خلافت

"جس قسم کی خلافت کا خاکہ اوپر کھینچا گیا ہے۔ یہ فقہائے متقدمین کے سیاسی لائحہ عمل کے مطابق ہے اور اس کو "خلافت نبوی" کہتے ہیں اور اسلام میں حکمرانی کی جائز شکل صرف یہی ہے ان حضرات کے نزدیک یہ جائز شکل اسلام کے عہد زریں یعنی پہلے چار خلفاء کے زمانوں تک موجود تھی۔ جن کو خلفائے راشدین کہتے ہیں۔ فقہاء کا خیال یہ ہے کہ خلفائے راشدین کے بعد اس نظام میں پیہم زوال آتا رہا اور اسلام جتنا اپنی اصل سے انحراف کرتا گیا، اسی قدر اس کہ زوال کی رفتار تیز ہوتی چلی گئی۔ صحیح خلافت کے بعد بادشاہت کا دور شروع ہوا، یعنی محض طاقت و قوت کا زمانہ جس کو شریعت حقہ اسلامی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ رسول اللہ کی ایک حدیث ہے۔ "میرے بعد امیر ہوں گے۔ ان کے بعد سلاطین اور ان کے بعد ظالموں کا دور شروع ہو جائے گا"۔ اس قسم کی احادیث سے تاریخ خلافت کا خاکہ سامنے آجاتا ہے۔ اور تاریخ کے واقعات نے اس کی تصدیق کر دی ہے۔ (میراث اسلام)

(ڈیوڈ سنیلانا، پروفیسر تاریخ اسلام روما یونیورسٹی)

○

خلافتِ اسلامیہ کا مرقّع

خلیفہ مامون الرشید کی آمدنی

سواد

دو کروڑ اٹھتر لاکھ سات درہم۔ دو سو نجرانی حلے[۲۰۰]۔ مہر لگائی کی مٹی دو سو چالیس رطل۔

کنسکر

ایک کروڑ سو لاکھ درہم۔

دجلہ کے اضلاع

دو کروڑ آٹھ درہم

حلوان

اڑتالیس[۴۸] لاکھ درہم

اہواز

پینتالیس[۴۵] ہزار درہم اور تیس[۳۰] ہزار رطل شکر

فارس

دو کروڑ ستر لاکھ درہم۔ گلاب تیس ہزار شیشے۔ زیت سیاہ بیس[۲۰] ہزار رطل

کرمان

بیالیس[۴۲] لاکھ درہم یمن کے پانچ سو[۵۰۰] ریشمی تھان۔ کھجوریں بیس ہزار رطل۔ چار لاکھ درہم۔

سندھ اور اس کے متعلقات

ایک کروڑ پندرہ لاکھ درہم۔ عود ہندی ایک سو پچاس[۱۵۰] رطل

سیستان

چالیس لاکھ درہم۔ خاص قسم کے کپڑے کے تین سو تھان۔ فانیذ بیس رطل

خراسان۔

دو کروڑ اسی لاکھ درہم۔ دو ہزار نقرہ چاندی، چار ہزار گھوڑے۔ ایک ہزار غلام۔ بیس ہزار تھان پارچہ تیس ہزار رطل ہلیلہ۔

جرجان

ایک کروڑ بیس لاکھ درہم۔ ریشم کے ہزار لچھے۔

قومس

دس لاکھ درہم۔ پانچ لاکھ نقرہ چاندی

رے

ایک کروڑ بیس لاکھ درہم، شہد بیس ہزار رطل

طبرستان، رومان و نہاوند

تریسٹھ لاکھ درہم۔ فرش طبرستانی چھ سو۔ چادریں دو سو۔ پانچ سو تھان پارچہ مندیل تین سو جامات تین سو۔

ہمدان

ایک کروڑ بیس لاکھ درہم۔ رب الرمانین ہزار رطل۔ شہد بارہ ہزار رطل

کوفہ و بصرہ کے درمیانی اضلاع

ایک کروڑ ستر لاکھ درہم

ماسبذان و دبور

چالیس لاکھ درہم

شہرزور

ستر سٹھ لاکھ درہم

موصل مع متعلقات

دو کروڑ چالیس لاکھ درہم۔ شہد سفید دو کروڑ رطل

آذربائیجان

چالیس لاکھ درہم

جزیرہ واعمالِ فرات

تین کروڑ چالیس لاکھ درہم، ایک ہزار غلام، شہد بارہ ہزار مشک، بزات دبارز، دس سرایا لباس بیس۔

آرمینیہ

ایک کروڑ تیس لاکھ درہم۔ گدگدے فرش بیس، زقم پانچ سو تیس رطل۔ مسایج سور ماہی دس ہزار رطل، صونج دس ہزار رطل۔ خچر دو سو بچھیرے تین سو۔

قنسرین

چار لاکھ دینار۔ زیت ہزار بار شتر۔

دمشق۔

چالاکھ بیس ہزار دینار

اردن

ستانوے ہزار دینار۔

فلسطین

تین لاکھ دس ہزار دینار۔ زیت تین لاکھ رطل

مصر

انیس لاکھ بیس ہزار دینار

برقہ

دس لاکھ درہم

افریقہ

ایک کروڑ تیس لاکھ درہم۔ فرش ایک سو بیس قطعے

یمن

تین لاکھ ستر ہزار دینار۔ متاعِ یمنی اس کے علاوہ تھا

حجاز۔ تین لاکھ دینار۔ (مقدمہ ابن خلدون ص۲۰۶، ص۲۰۹)

"امیر المومنین" کا لقب کب رائج ہوا؟

—"بعض صحابہ نے حضرت عمرؓ کو امیر المومنین کے لقب سے پکارا تو سب سننے والوں نے اس لقب کو پسند کیا اور خود بھی اسی لقب سے پکارنے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ عبداللہ بن جحشؓ نے سب سے پہلے حضرت عمرؓ کو امیر المومنین کے لقب سے پکارا۔ بعض کہتے ہیں کہ عمرو بن العاصؓ اور مغیرہ بن شعبہؓ نے اس لقب کی ابتدا کی۔ اور ایسی بھی روایت ہے کہ ایک قاصد کسی جیش اسلامی کی فتح کی خوشخبری لایا اور مدینہ میں پہنچا تو حضرت عمرؓ کو پوچھنے لگا اور کہنے لگا کہ امیر المومنین کہاں ہیں۔ مومنین نے اس لقب کو سنا تو بہت پسند کیا اور اس کی اس ایجاد پر تعریف کی کہ واقعی اس نے خوب لقب دیا۔ حقیقت میں حضرت عمرؓ مومنین کے امیر ہی تو ہیں۔ پھر سب آپ کو اسی لقب سے پکارنے لگے۔ اور اس کی ایسی شہرت ہوئی کہ یہ خلافت بعد خلافت بطور وراثت چلتا رہا۔ اور دولت بنی امیہ میں بھی یہی لقب رواج پذیر رہا۔ اور خلفائے کے علاوہ کسی اور کو اس لقب سے یاد نہ کرتے۔"

(مقدمہ ابن خلدون صـ۲۵۸)

○

ظالم سلطنت کی تعریف

"بڑے ظلم کی مثال جو آبادی کو بھی برباد کرے اور سلطنت کو بھی تباہ۔ یہ ہے کہ سلطنت لوگوں کے مالوں کو حکومت کے دباؤ کے ذریعہ ارزاں تر قیمت پر خریدے۔ پھر بجبر و اکراہ زیادہ سے زیادہ قیمت پر ان کو دے ڈالے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ارزاں قیمت پر اشیا خرید کر اطراف ملک میں بانٹ دی جاتی ہیں اور ایک میعاد معینہ پر ان کی قیمت ان کے ذمہ واجب الادا قرار دی جاتی ہے۔ جب حکومت کے ہاتھ سے گراں خریدے ہوئے مال کو بازار میں لاتے ہیں تو وہ بازاری نرخ میں کم قیمت پر بکتا ہے تو گویا بیچارے حکومت کے مارے تاجر دونوں پہلوؤں سے نقصان اٹھاتے ہیں۔ یعنی مہنگا لیتے ہیں اور سستا بیچتے ہیں اور ان کی اصل پونجی بھی ختم ہونے لگتی ہے۔ کبھی یہ مصیبت بہت عام ہو جاتی ہے۔ مقامی ہر تاجر خواہ شہری دکاندار ہو یا باہر کا خریدار۔ میوہ فروش ہو یا غلہ فروش، صنعت گر اور پیشہ ور ہو یا اور کوئی کاروباری، خواہ مقامی ہو یا بیرونی بیوپاری۔ اس ظلم و ستم کی زد سے نہیں بچتا۔"

(مقدمہ ابن خلدون ص ۳۱۹)

○

امراء و ملوک

"جب کسی شہری کی دولت بڑھتی ہے اور وہ جائیدادوں کا مالک بن کر سارے اہلِ شہر کی نظر کا نشانہ بنتا ہے، اور عیش و آرام، نازو نعمت میں پلنے لگتا ہے تو امراء و ملوک طمع و لالچ اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور ہر ایک کوشش کرتا ہے کہ ہر ممکن حیلہ و ترکیب سے اس کی دولت کو اینٹھ لے اور اس کے روپیہ پیسہ کو لے اڑے۔ یہاں تک کہ ایک حربہ ان کا یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کو کسی عتاب سلطانی میں پھانس کر اس سے روپیہ اچک لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیونکہ آج کل کے احکامِ سلطانی عدل و انصاف پر مبنی نہیں ہوتے۔ یہ محض خلافت شرعیہ کا خلاصہ تھا جو آنحضرتؐ کے بعد جلد ہی ختم ہو گیا۔ چنانچہ آنجنابؐ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میرے بعد خلافت تیس برس رہے گی۔ پھر جابرانہ حکومت کا دور دورہ ہوگا۔ جب یہ حالات ہوتے ہیں تو شہر کے مشہور دولت مند کو حامی و مددگار رکھنے پڑتے ہیں اور بادشاہ کے کسی قریبی عزیز یا خواص اہلِ عصبیت سے رسوخ بڑھانا پڑتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے بادشاہ کی سایہ عاطفت میں امن و چین کی زندگی بسر کر سکے اور لوگوں کے ظلم و تعدی سے خود کو بچا سکے۔

(مقدمہ ابن خلدون ص ۳۹۷)

○

پہلی منزل

خطۂ عرب

یعنی

وادیٔ غیر ذی زرع

عرب جس کا چرچا ہے یہ کچھ وہ کیا تھا؟

زمیں سنگلاخ اور ہوا آتش افشاں
لوؤں کی لپٹ بادِ صرصر کے طوفاں
پہاڑ اور ٹیلے، سراب اور بیاباں
کھجوروں کے جھنڈ اور خارِ مغیلاں
نہ کھیتوں میں غلّہ نہ جنگل میں کھیتی
عرب اور کُل کائنات اس کی یہ تھی

نہ واں مصر کی روشنی جلوہ گر تھی
نہ یونان کے علم و فن کی خبر تھی
وہی اپنی فطرت پہ طبعِ بشر تھی
خدا کی زمیں بِن جُتی سر بسر تھی
پہاڑ اور صحرا میں ڈیرہ تھا سب کا
تلے آسماں کے بسیرا تھا سب کا!

افتاحیہ

آج سے چودہ سو برس پہلے!

یہ دُنیا اتنی ترقی یافتہ نہ تھی جیسی آج ہے۔ چودہ سو سال کی مسافت معمولی نہیں ہوتی چودہ سو برس پہلے انسان کشتیوں میں بیٹھ کر دریا اور سمندر پار کرتا تھا۔ اونٹ کی پیٹھ پر لد کر ریگستان اور بیابان طے کرتا تھا، ستاروں کو دیکھ کر منزلیں متعین کرتا تھا۔ ہر چیز میں سُست روی تھی۔ آہستہ خرامی تھی۔ اور اب وہ طیاروں میں اڑتا ہے، ریل اور موٹر میں بیٹھ کر سفر کی منزلیں راحت و آسائش سے طے کرتا ہے۔ اس کے آبدوز سمندر کی تہہ کی خبر لاتے ہیں۔ اس کے راکٹ اور سیّارے مدارِ زمین سے باہر نکل کر مدارِ شمس و قمر کا طواف کرتے ہیں، اس کی دُوربینیں چاند اور سورج کے اسرار منکشف کر رہی ہیں۔ اس کی خوردبینیں ناقابلِ تصور اجسام کا مطالعہ کر رہی اور جائزہ لے رہی ہیں، پہلے میدانِ جنگ میں اس کے ہتھیار، تیر و پیکان، نیزہ و شمشیر اور تیغ و خنجر تھے۔ اب وہ ایٹم بم کا موجد ہے جس سے لاکھوں کی آبادی آن کی آن میں ختم ہو جاتی ہے۔ اب وہ ہائیڈروجن بم تیار کر رہا ہے جو بڑے بڑے ملکوں کو بہ یک چشم زدن مٹی کا ڈھیر بنا دینے کی قوت

رکھتا ہے۔ پہلے دشمن پر چڑھائی کرنے کے لیے فوج کوچ کرتی تھی، منزل بہ منزل پڑاؤ کرتی تھی، پھر دشمن کے شہر کا محاصرہ کرتی تھی، اس کے بعد جنگ کی نوبت آتی تھی اور یہ جنگ تیغ و تفنگ کی حد سے آگے نہیں بڑھتی تھی۔ اب صرف ایک بٹن دبانے کی دیر ہے۔ ہر ملک، ہر ملک کو گھر بیٹھے تباہ کر سکتا ہے۔ پہلے لوگ غلام بنا لیے جاتے تھے لیکن صرف وہ لوگ جو میدانِ جنگ میں لڑتے ہوئے پکڑے گئے ہوں، اب قومیں غلام بنائی جاتی ہیں۔ ملکوں کے گلے میں غلامی کا طوق ڈالا جاتا ہے، اُن کی رُوح غلام بنائی جاتی ہے، وسائلِ حیات غلام بنا لیے جاتے ہیں۔

پہلے انسان کا علم محدود تھا، علم کے وسائل محدود تھے، لوگ گھر کو الوداع کہہ کر علم حاصل کرنے نکلتے تھے اور سالہا سال کی کاوش و جدّوجہد کے بعد عالم بن کر واپس آتے تھے۔ اور اس علم کا بڑا حصہ مشتمل تھا منقولات، نظریات اور روایات پر۔

لیکن اب؟

اب علم ایک مشاہدہ ہے، ایک تجربہ ہے، علم کے کتب خانے عام ہیں۔ علم کی تجربہ گاہیں عام ہیں، اپنی آنکھ سے دق اور ہیضے کے جراثیم دیکھ لیجیے، چاند اور سورج کی چال پہاڑوں کی بلندی اور غاروں کی گہرائی، حد یہ ہے کہ روشنی کی رفتار ناپ لیجیے۔ ایک سکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل۔

چودہ سو برس کا یہ سفرنامہ کتنا طویل، کتنا دلچسپ اور کتنا حیرت آفریں ہے۔ محوِ حیرت ہوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔!

لیکن اس ارتقاء اور بوقلمونی کے باوجود، حالت یہ ہے کہ انسان نے مادّی فروغ تو بہت حاصل کر لیا ہے مگر ذہنی سرمائے میں اضافہ نہ کر سکا:

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دُنیا کا سفر کر نہ سکا

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ستاروں پر کمند ڈالنا کہیں آسان ہے۔ مگر الٰہیت، خلوص اور عبادت قلب و عمل کا توشہ لے کر عالمِ افکار کا سفر کرنا بہت مشکل ہے!

آج سے چودہ سو برس پہلے ایک شخص (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک ایسی سرزمین پر نمودار ہوا جو بے آب وگیاہ تھی۔ جہاں انسانیت دم توڑ رہی تھی، اخلاقی قدریں پامال ہو رہی تھیں افکار و عقائد کی گمراہیوں نے بدترین اخلاقی جرائم کو عام کر دیا تھا۔

اس شخص کی صدائے حق فضا میں گونجی:

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی

اس کی صدائے حق نے ایک نئی قوم پیدا کی، اور وہ قوم اپنا کارواں لے کر دنیا کے گوشے گوشے اور چپے چپے میں پہنچی، کہیں اسے سر کاٹنا پڑے، کہیں کٹانا پڑے، لیکن کاٹتے وقت اس نے عدل و انصاف کا دامن نہ چھوڑا۔ کٹتے وقت بزدلی اور کمزوری کا اظہار نہیں کیا۔

یہ کارواں سیدھا رستہ چلتے چلتے بھٹکا بھی، بہکا بھی، ٹھوکر بھی کھائی، سربلند بھی ہوا۔ اور سرنگوں بھی، اوجِ ثریا پر بھی پہنچا اور تحت الثریٰ میں بھی گرا۔

آئندہ اوراق میں اس کاروانِ اسلام کی تاریخ بیان کی گئی ہے، پوری صداقت اور پوری غیر جانب داری کے التزام کے ساتھ۔

یہ تاریخ اپنے اندر بہت کچھ رکھتی ہے ——— یہ تاریخ طویل بھی ہے، دلچسپ بھی، اور حیرت آفریں بھی۔ میں نے اس کی طوالت کو مختصر کر دیا ہے، دلچسپی قائم رکھی ہے اور حیرت آفرینی تو اس کے جلو میں چل رہی ہے۔

گرچہ تھے صفحۂ ہستی پہ ہم اک حرفِ غلط
لیک اٹھے بھی تو اک نقش بٹھا کے اٹھے

دُنیا کی بہت سی قوموں نے تاریخ لکھی ہے، کچھ قومیں ایسی بھی ہیں جنھوں نے تاریخ بنائی ہے اور ان تاریخ ساز قوموں میں کوئی قوم بھی مسلمانوں کی ہم پلّہ نہیں بن سکی۔ مؤرخین کو حیرت ہے کہ یہ قوم جو کچھ نہ تھی، جو علم و فن اور تہذیب و تمدّن سے یکسر ناآشنا تھی صرف چند سال کے قلیل عرصے میں اقلیمِ علم کی شہریار اور دُنیائے تمدّن کی تاجدار کس طرح بن گئی، اس کے علمی کارناموں

کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہی قوم تھی جس نے ظلمت کدۂ یورپ میں علم کی شمع روشن کی۔ جہالت کی تاریکی دُور کی۔ اور ایک عرصہ دراز اور مدتِ مدید تک یورپ کی یونیورسٹیوں میں اس کی تصنیف و تالیف کی ہوئی کتابیں نصابِ درس میں شامل رہیں۔ اس کے علمی فتوحات اور کمالات آج بھی دانشورانِ علم کی بزم و انجمن میں موضوعِ بحث و گفتگو بنے ہوئے ہیں، جن کے اعتراف میں آج بھی دانشورانِ علم رطب اللساں ہیں اور اس کے تمدنی کارنامے اتنے وقیع ہیں کہ صدیاں گزر چکنے کے بعد بھی وہ زندہ، تاباں اور روشن ہیں۔

دُنیا کی دوسری قوموں کی طرح مسلمان بھی زوال و انحطاط سے دوچار ہوئے لیکن ان کا زوال بھی دوسروں کے عروج سے زیادہ شاندار تھا اور آج بھی اس کی تابانی اور رعنائی قائم ہے اور ماہ و سال کی کتنی ہی گردشیں گزر جائیں لیکن یہ قائم رہے گی۔

آنے والے صفحات میں اسی تاریخ کی اجمالی داستان بیان کی گئی ہے۔

رئیس احمد جعفری

۸۹۔ ٹیگور پارک ــــــــ لاہور

۱:

عرب اسلام سے پہلے

باشندگانِ نخلستان و ریگستان کے روایتی امتیازات

چھٹی صدی عیسوی کا عرب

چھٹی صدی عیسوی کے عرب کا نقشہ ــــــــ جب آنحضرت صلعم کی بعثت ہوئی اور اسلام نمودار ہوا۔ محمد حسین ہیکل نے اس طرح کھینچا ہے:

چھٹی صدی عیسوی کے اوائل میں جزیرہ نمائے عرب دو پُرہیبت سلطنتوں کے درمیان جا ہوا نظر آتا ہے۔ مغرب میں روم کی سلطنت اور مشرق میں ایران کی شوکت اسے خوف زدہ رکھنا چاہتی ہے۔

روم کے عیسائی اور ایران کے مجوسی باشندوں میں ہر ایک گروہ اپنے اپنے مذہب کی تبلیغ کا سودا سر میں لیے ہوئے ہے۔ مگر خطۂ عرب میں دونوں کے اثر و نفوذ کی یہ عدم پذیرائی اس نخلستان کی طرح اپنے تمام قومی و روایتی امتیازات کے تحفظ میں کامیاب رہی جس کی سرسبز و شاداب وادیوں میں کسی اجنبی نے قدم تک نہ رکھا ہو بجز ان علاقوں کے جو اس (عرب) کے کناروں پر واقع ہیں جہاں عیسویت یا مجوسیت کو برائے بیت پناہ مل سکی۔

خطۂ عرب کی یہ خاصیت تاریخی لحاظ سے تعجب انگیز ہے کہ روم اور ایران دونوں کے درمیان قربِ مکانی اور شوکت و ہیبت کے باوجود نہ یہاں کسی کے مذہب کو قبولیت حاصل ہوئی اور نہ کسی کی سطوت اہالیانِ عرب کو متاثر کر سکی۔ عرب کے رہنے والے صدیوں سے جس وضع و قماش پر زندگی بسر کر رہے تھے کوئی خارجی قوت اس کے ردّ و بدل میں کامیاب نہ ہو سکی۔

عرب کا جغرافیہ اور طبعی حالات

(ملک) عرب جس کی جغرافیائی حیثیت غیر متوازی الاضلاع مستطیل کی سی ہے۔ جس کے حدودِ اربعہ یہ ہیں:

شمال میں فلسطین و صحرائے شام

مشرق میں حیرہ۔ دریائے دجلہ و فرات اور خلیج فارس

جنوب میں بحرِ ہند اور خلیج عدن۔

مغرب میں بحیرۂ قلزم۔

پورا ملک ایسے محفوظ قلعے کی صورت میں ہے جس کو مغرب اور جنوب میں سمندر، مشرق اور شمال میں صحرا اور خلیج فارس نے گھیر رکھا ہے لیکن غیر ملکی حکومتوں کے استعمار سے نجات کا سبب اس ملک کا صرف محلِ وقوع ہی نہیں بلکہ اس کی یہ بیکراں وسعت بھی ہے۔

عرب کا رقبہ یہ ہے

طول (تقریباً) ایک ہزار کیلومیٹر سے زائد

عرض " " "

ملک کی یہ طبعی حالت بھی دوسری قوموں کی دخل اندازی میں مانع رہی۔ تمام ملک میں بے آب و گیاہ صحرا پھیلے ہوئے ہیں۔ نہ کوئی دریا ہے نہ بارش کا کوئی موسم معین۔ نہ وقت پر پانی برسنے کی توقع جس کے بل بوتے پر کاشت کی جا سکے صنعت و حرفت بھی نابود! یمن کے سوا جو ملک کے جنوب میں واقع ہے اور جہاں کی زمین سدا سرسبز و شاداب اور بارش کا گہوارہ ہے۔

ان طبعی غیر ہمواریوں کے ساتھ اس سرزمین میں تہ بہ تہ پہاڑوں کا سلسلہ بھی ہے کہیں بلند اور کہیں چھوٹی پہاڑیاں جن میں خشک اور بے منفعت درّے ہیں یا ان کے گرد لق و دق صحرا۔ اور اگر کہیں زمین کا کوئی قطعہ ابھر بھی آیا ہے تو غیرِ ذی زرع (۱۴-۴۰) (ناقابلِ زراعت) انسان کسی ایک مقام پر زیادہ مدت سکون سے قیام کر ہی نہیں سکتا۔ تمدن اور اس کے ارتقا

کا سوال کیسا؟ آج جس نے یہاں ڈیرا ڈال رکھا ہے کل کسی اور جگہ۔ صحرا گویا ان لوگوں کا دریا ہے اور اونٹ اس دریا کی کشتیاں جو صحرا کی ایک چراگاہ سے لنگر انداز ہو کر دوسرے نخلستان میں پہنچ جاتے ہیں۔ صحرا کے یہ نخلستان بھی پانی کے ان چشموں کے صدقے ہیں اپنی بہاریں دکھا رہے ہیں۔ جو آسمان پر بھٹکے ہوئے بادلوں کی کرم گستری سے ریگستان میں آبیاری کا اتفاقی ذریعہ بن جاتے ہیں۔ جن چشموں کے اردگرد روئیدگی کچھ جاذبیت پیدا کرتی ہے۔ صحرا کے خانہ بدوش انسان ان نخلستانوں کو اپنا عارضی مستقر بنا لیتے ہیں۔ عرب کی یہ حالت افریقہ کے صحرائے اعظم کی طرح ہے! ظاہر ہے کہ جو شخص ان صحراؤں میں قدم رکھے گا وہ عجلت سے عبور کرنے میں جان کی سلامتی سمجھے گا۔ اتنے بڑے ریگستان میں صرف گنتی کے نخلستان ہیں جن میں انسان کی معمولی ضروریات اور ان کے مویشی کے لیے تھوڑی سی مدت کے لیے چارہ پیدا ہو جاتا ہے اپنی وجوہ کی بنا پر دوسرے ملکوں کے باشندوں نے یمن کے سوا اس سرزمین سے بے خبری میں ایک زمانہ گزار دیا۔

عرب کا شوقِ تجارت

عرب کے باشندے تجارت کے لیے بحری سفر موت کا مترادف سمجھتے تھے اس کا بدل حاصل کرنا بھی لازمی تھا۔ مشرق و مغرب کے درمیان سوداگروں کی گزرگاہوں سے ملحقہ شہروں میں تجارت جاری تھی۔ تاجر مال لاتے اور لے جاتے۔ اس دور میں سوداگروں کے جو قافلے مصر اور خلیج فارس کی راہوں سے آتے انھیں حجاز میں ہو کر گزرنا پڑتا۔ مسلّم ہے کہ تاریخ کے اس دور میں حجاز کے ان صحراؤں پر عرب کے بادیہ نشین ہی حکمراں تھے۔

صحرائے عرب میں قافلوں کے راستے متعیّن ہی نہ ہو سکتے تھے۔ یہ خود بخود قائم ہوتے گئے۔ مسافروں کو ان وسیع ریگستانوں سے گزرتے وقت تکان دور کرنے کے لیے آرام کی ضرورت ہوتی۔ جہاں کہیں انھیں کھجور کے درخت اور میٹھے پانی کا چشمہ نظر آتا خود پانی پیتے، سواریوں کو پلاتے اور تکان دور کرنے کے لیے ٹھہر جاتے۔ اسی طرح یہ مقامات رفتہ رفتہ تاجروں کا مرجع بن گئے۔ مسافروں میں خوش عقیدہ لوگوں نے ان جگہوں پر کہیں کہیں بُت خانے اور عبادت گاہیں بھی بنالیں۔ سوداگر یہاں اترتے تو ان بُتوں سے اپنی تجارت کی ترقی کے لیے دعا کرتے اور

دوسرے ضرورت مند اپنی حاجتیں طلب کرتے۔

ان صحراؤں میں بے شمار راستے تھے لیکن ان میں دو گزرگاہوں پر بہت زیادہ آمد و رفت رہتی تھی:

۱: خلیج فارس اور دریائے دجلہ سے ملتی ہوئی راہ از صحرائے شام تا فلسطین۔ یہ راہ عرب کے مشرقی حدود پر واقع ہونے کی وجہ سے "طریق الشرق" (مشرقی گزرگاہ) کے نام سے موسوم کی جا سکتی ہے۔

۲: بحیرۂ قلزم کے قریب سے نکلتی ہوئی راہ۔ بحیرۂ قلزم کے مغرب میں ہونے کے باعث اسے "طریق الغرب" (مغربی گزرگاہ) سے نامزد کیا جا سکتا ہے۔ انہی دونوں راستوں سے مشرق و مغرب کے درمیان تجارت کا سلسلہ قائم تھا۔ عرب کے صحرا نشین بدّو انہی سوداگروں سے ضروریاتِ زندگی حاصل کرتے۔

یہاں کے صحراؤں اور ان کے راستوں سے خود عرب کے بھی وہی لوگ عہدہ برآ ہو سکتے تھے جنھیں طفولیت سے ان کا تجربہ تھا اور زندگی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ان لوگوں میں بے شمار اشخاص نے کسی مقصد کے بغیر اپنی زندگی ان صحراؤں کی بھینٹ چڑھا دی۔

جو لوگ ان حالات میں زندگی بسر کر رہے ہوں دُنیا کے متمدن لوگ ان کے قریب ہو کر بھی نکل سکیں ناممکن ہے یہ اسباب ہیں جن کی بنا پر زمانۂ قدیم میں جزیرہ نمائے عرب کو دُنیا میں کوئی اہمیت حاصل نہ ہو سکی۔

سرسبز و شاداب و زرخیز یمن

جس زمانے میں عرب کے غیر متمدن ہونے کی وجہ سے دُنیا کی کوئی قوم اس (ملک) سے متعارف نہ تھی۔ اس دور میں یمن اور اس کے نواحی خطے جو خلیج فارس کے قرب و جوار میں تھے اطرافِ عالم میں شہرت سے بہرہ ور تھے۔ ان خطوں کی شان و شوکت صرف اسی وجہ سے نہ تھی کہ انھیں خلیج فارس بحرِ ہند اور بحیرۂ قلزم کا قرب حاصل تھا۔ یمن عرب کے دوسرے قطعوں کی طرح بے آب و گیاہ ریگستانوں سے اٹا ہوا نہ تھا جن کے باعث باہر کے ملک اس کی طرف سے نگاہ ہٹائے رکھیں اور اس کے ہمسایہ ملک اس کی دوستی کے خواہاں نہ ہوں۔ بلکہ سرزمین یمن طبعی طور پر سرسبز و شاداب تھی، اُسے

موسم بہ موسم بارش سیراب کرتی۔ وہ قدرتی طور پر تمدن کا مرکز اور اپنے دامن میں ایسے پُر رونق شہروں کو لیے ہوئے جن (شہروں) میں پُر رونق سر بفلک عبادت گاہیں بھی تھیں اور ملک کا ممتاز قبیلہ حمیر ذہنی طور پر عقل و فرزانگی سے بہرہ مند!

سدِّ مآرب

قبیلۂ حمیر کے دیدہ وروں کو قدرت نے مختلف علوم و فنون سے بہرہ مند فرمایا۔ ان کی سب سے بڑی صفت سدِّ مآرب ہے (مآرب نام شہر کے قریب پانی کا بند) قدرت نے انھیں بارش کا پانی کام میں لانے کی طرف متوجہ فرمایا جسے انھوں نے سمندر میں جاکر کھو جانے کی بجائے اپنے باغات اور کھیتوں کے لیے ذخیرہ بنالیا۔

پہاڑوں سے پانی کے وہ دَل جو شہر مآرب کے نشیب سے گزرتے حمیر (قبیلہ) کے صناعوں نے انھیں روکنے کے لیے ۴ کیلو میٹر لمبا ایک بند (آب) تعمیر کیا، جس کے دونوں کنارے دونوں طرف کے پہاڑ سے ملا دیے گئے۔ بند میں نیچے اور اوپر دہانے رکھ دیے گئے۔ تاکہ پانی ضرورت کے مطابق لیا جائے۔ اس پانی سے کھیتوں اور باغوں میں آبپاشی کی جاتی۔ مگر آج یہ شہر (مآرب) اور اس کا مشہور بند آب (سدِ مآرب) دونوں حوادث کا شکار ہو چکے ہیں۔ ماہرین آثار اس کے کھنڈروں کا طواف کر رہے ہیں۔ تھوڑے بہت حالات کی تحقیق ہو سکی ہے اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ ان کتبوں سے قبیلۂ حمیر کے جوہر تہذیب و تمدن کی تابانی نے اہلِ علم و دانش کو حیران کر رکھا ہے۔

چھٹی صدی عیسوی میں جب روم اور حبشہ دونوں سلطنتیں پورے عروج پر تھیں، ان کے ملحقہ سمندروں (بحیرۂ روم اور بحیرۂ قلزم) پر انہی دونوں کا قبضہ تھا۔ اور دونوں ملکوں کے

۱: شہر مآرب کے جنوب میں داہنے بائیں وہ پہاڑ ہیں جن کا نام کوہِ ابلق ہے، دونوں پہاڑوں کے بیچ میں وادی اذینہ ہے، پہاڑوں سے اور نیز اِدھر اُدھر سے پانی جمع ہو کر وادیٔ اذینہ میں ایک دریا جاری ہو جاتا ہے۔ سبا نے ان دونوں پہاڑوں کے بیچ میں تقریباً ۸۰۰ ق م سدِّ مآرب کی تعمیر کی تھی۔ یہ بند تقریباً ۱۵۰ فٹ لمبی اور ۵۰ فٹ چوڑی ایک دیوار ہے۔ اس کا اکثر حصہ تو اب افتادہ ہے۔ تاہم ایک ثلث دیوار اب بھی باقی ہے۔

(ارض القرآن سید سلیمان ندوی جلد ۱ ص ۲۵۵)

باشندوں کی بحری تجارت فروغ پر تھی۔

قیصرِ روم کا فرمان نجران کے عیسائیوں کی شکایت سے متاثر ہو کر ایک مرتبہ قیصر روم نے حبشہ کے بادشاہ کو لکھا کہ وہ (یمن کے بادشاہ) ذو نواس یہودی سے عیسائی شہیدوں کا بدلہ لے جنھیں اس نے ہلاک کر ڈالا تھا۔

یمن پر ابرہہ کی حکومت اس پر نجاشی (بادشاہِ حبشہ) نے قیصر روم کی معیت میں لشکر جرار بھیجا جس پر ارباط (نام) کو سپہ سالار مقرر کیا۔ ابرہہ الاشرم نامی سپاہی بھی اس لشکر میں تھا۔ ارباط نے یمن فتح کر کے اسے حبشہ کی بادشاہت میں شامل کر لیا۔ کچھ عرصے تک یہی ارباط یمن پر بطور گورنر حکمراں رہا مگر بعد میں ابرہہ نے اسے قتل کر کے یمن پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ یہی ابرہہ وہ "صاحب الفیل" ہے جس نے کعبۃ اللہ کو نیست و نابود کرنے کے لیے مکّہ معظمہ پر ہاتھیوں کی فوج سے چڑھائی کی اور ناکام پھرا۔

ابرہہ کے بعد اس کے بیٹے (یمن پر) حکمراں ہوئے مگر وہ انصاف پر قائم نہ رہ سکے۔ ملک کے باشندے ان کے مظالم سے گھبرا اٹھے۔ آخر قبیلہ حمیر کا سردار سیف بن ذی زن نعمان بن منذر کے حضور باریاب ہوا۔ جو حیرہ اور اس کے نواحی علاقہ عراق پر کسریٰ ایران کی طرف سے گورنر تھا مگر نعمان اپنے بادشاہ کے حکم کے بغیر کچھ نہ کر سکتا تھا۔ وہ سیف کو اپنے ہمراہ لے کر دارالسلطنت ایران میں داخل ہوا۔

مملکتِ ایران پر تسلّط خسرو پرویز کے دربار کی شان و شوکت کا عجیب حال تھا۔ سرِ دربار دارا کا وہ تخت جس کے نقش و نگار میں ہیرے اور جواہرات استعمال کیے گئے۔ سرما میں جاڑے کی شدّت کم کرنے کے لیے چاروں طرف قیمتی پوستینوں کے پردے لگا دیے جاتے، شاہی تاج میں رنگا رنگ کے جواہرات از قسم یاقوت و زمرد و مروارید سونے اور چاندی کے تاروں سے ٹکے ہوئے جو تخت اور سقفِ ایوان کے برزخ میں طلائی زنجیر کے سہارے لٹکا رہتا، بادشاہ زربفت کی پوشاک زیب تن کئے گلے میں سونے کے بیش بہا زیورات سے مرصّع، جب نووارد یہ شان و شوکت دیکھتا تو ششدر رہ جاتا۔ یہی اثر سیف ذی زن پر ہوا۔ وہ دیر تک مبہوت و سراسیمہ کھڑا رہا۔

ابن ذی زن کچھ دیر بعد سنبھلا اور شہنشاہ کے اشارے پر اس نے حبشیوں کے مظالم کی سرگزشت عرض کی، پہلے تو خسرو تردّد ظاہر کرتا رہا، مگر بعد میں اس نے درخواست منظور کرلی اور ایران کے ہرز نامی امیرزادے کو جو شجاعت وجواں مردی کے ساتھ سپہ گری کے فن میں بھی فردِ یگانہ تھا۔ اس مہم کے لیے نامزد فرمایا۔ ہرز نے حبشیوں کو جو دو سال سے یمن پر مسلّط تھے نکال کر ملک کو ایران کے زیرنگیں کردیا۔ عرب اور اس کے نواحی ملکوں پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہونے تک وہ ایران کا باجگزار بنا رہا۔

لیکن یمن کے ایرانی گورنر بھی مرکز کے پوری طرح مطیع فرمان نہ رہے خصوصاً جس زمانے میں شیرویہ نے اپنے باپ پرویز کو قتل کرادینے کے بعد خود تختِ شاہی پر قبضہ کرلیا اور رعایا کے سود و بہبود کی بجائے شاہی خزانے اپنی ہوا و ہوس میں لٹانے شروع کردیے۔ اس کے دماغ میں سودا سما گیا تھا کہ مملکت کے یہ خزانے صرف اسی کی ہوس پرستی کے لیے ہیں۔ وہ ملکی معاملات سے بے پروا رہ کر اپنے نفس کی دادرسی میں لگ گیا۔

چوتھی صدی عیسوی سے یمن کو جن سیاسی حوادث نے اپنا گھر بنا رکھا تھا رنگ لائے بغیر نہ رہ سکے۔ (یہاں کے) بدنصیب باشندے وطن چھوڑ کر دوسرے خطّوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ تاریخ کی ایک روایت میں مسطور ہے کہ سدِّ مآرب جو حمیری کاریگروں کی صنعت و محنت کا ثمرہ اور ملک کی سرسبزی وشادابی کا وسیلہ تھی سیلِ عرم سے بیکار ہو گئی اور یمن میں متواتر طوائف الملوکی کی وجہ سے اس کی اصلاح ودرستی پر توجّہ نہ کی جاسکی۔

جس زمانے میں یمن کا قدیم سیاسی نظام اس طرح تہ وبالا ہو رہا تھا کہ حمیر کے متمدن شہر اس خلفشار کا مرجع اور ان کی وادیاں رزم گاہیں بنی ہوئی تھیں۔ اس دور میں (یمن کے ماسوا) بقیہ عرب نظامِ سیاسی کی ابجد سے بھی ناآشنا تھا یعنی یہ نظامِ حیات جسے آج ہم سیاسی نظم ونسق سے تعبیر کر رہے ہیں تہامہ، حجاز، نجد اور عرب کے خطّے اور قبیلے اس نظام سے بے گانۂ محض تھے۔ ان خطّوں کے باشندوں کا زیادہ حصّہ شہروں اور بستیوں کی بجائے ریگستانوں میں زندگی بسر کرتا۔ انھیں شہری زندگی بسر کرنے کا موقع کبھی نہ ملتا۔ نہ اسے وہ ترجیح دیتے وہ اپنے مویشیوں کے چارہ کی مجبوریوں سے کسی ایک جگہ زیادہ مدت

تک پڑاؤ نہ رکھ سکتے تھے۔ پھر ریگستان کی تند ہواؤں کے اثر سے ان کی جولاں گاہ بے پایاں صحراؤں کی بجائے حصار شدہ بستیاں کیونکر ہو سکتی تھیں۔؟

بدوی طریقِ حیات کا قانونی سہارا اپنے اپنے قبیلے میں مل کر رہنا تھا۔ عرب کے بادیہ نشین جو آج یہاں کل وہاں نظر آتے ہوں، ان کے لیے اجتماعی قوانین کا سوال کوئی معنی نہیں رکھتا۔

صحرانشینوں کی شجاعت

عرب کے بادیہ نشین شجاعت میں بے مثل ہونے کے ساتھ ہمسایوں کی حمایت کے لیے بھی سربکف اور دشمنوں کو معاف کرنے میں بھی فیاض تھے۔ یہ ایسے صفات ہیں جو صحرائی زندگی میں نمایاں مگر شہری بودوباش سے ماند پڑ جاتے ہیں۔

عربوں کی اس مردانگی اور اپنے شرف و مجد اور صحرانشینی کی حفاظت کے باعث نہ تو روم نے ان کے ساتھ جنگ کرنے میں اپنا اقتصادی یا سیاسی فائدہ دیکھا اور نہ ایران نے ان کو اپنے زیرِنگیں کرنے میں کوئی مصلحت سمجھی۔ ان دونوں (ایران و روم کو) اس قسم کے منافع یمن سے حاصل ہو سکتے تھے جسے دونوں حکومتیں اپنے اپنے قابو میں رکھنے کے لیے مصروفِ عمل رہیں، اگرچہ بدوی اخلاق ان باشندوں میں بھی سرایت کر چکے تھے جو ملک بھر کے گنتی کے چند شہروں میں بودوباش کیے ہوئے تھے۔ ان میں بیرونِ عرب سے جو تاجر آتے سفر کی کلفت دور کرنے کے لیے اتر پڑتے اور اُن کے بُت کدوں میں دیوتاؤں سے اپنی حفاظت کے لیے استدعا بھی کرتے۔ یہ شہر تھے مکہ، طائف اور یثرب وغیرہ جو کسی زمانے میں پہاڑوں کے منقسم دروں یا صحرا کے دامن میں کسی بڑے نخلستان کے سہارے آباد ہو گئے

عربوں کا مذہب اور اعتقادات

اس وسیع ملک کے رہنے والے جس طرح اخلاقی سیاسی اور اجتماعی عادات و اطوار میں ایک ہی نہج پر گامزن تھے اسی طرح مذہب میں بھی اُن کا عمل اور عقیدہ ایک دوسرے سے مشابہ تھا۔

عیسائی مبلغین جس طرح آج دُنیا کے چپے چپے پر اپنے دین کی تبلیغ کیلئے سرگرداں ہیں اسی طرح قدیم زمانے میں بھی وہ عیسویت کی ترویج کے لیے ہر جگہ پہنچ جاتے تھے۔

مسیحیت جو اپنے ظہور ہی سے تبلیغ میں مصروف ہے کیا اس نے عربستان میں بھی اپنے پرچار کی طرح ڈالی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مسیحی مبلغوں نے عرب میں تبلیغ کی مہم جاری کرنے میں کسی کوتاہی سے کام نہیں لیا، لیکن پورے عرب میں (بشمولِ یمن) اُسے برائے نام کامیابی حاصل ہوئی اور ملک کا غالب ترین عنصر اپنے آبائی بُت پرستانہ مذہب ہی پر قائم رہا۔

اس عہد میں بحیرۂ روم و قلزم دونوں کے ساحلی خطوں پر تمدن اپنا پورا عروج دکھا رہا تھا۔ اور انہی علاقوں کے یہودی اور مسیحی دونوں ایک دوسرے کے دوش بدوش آباد تھے جن میں باہم سماجی روابط قائم تھے مگر یہودی عیسائیوں کے ہاتھوں اپنی ارضِ مقدس سے نکالے جانے پر اس درجہ برہم تھے کہ ان سے انتقام لینے کے لیے ہمیشہ بے قرار رہتے۔ وہ یہودی بھی جو مسیحی قیصرِ روم کی رعایا تھے اس غم میں گھُلے رہتے۔

ادھر عربستان میں بھی یہودی آباد تھے، یمن اور یثرب میں تو ان کی اکثریت تھی ہی مگر اس طرف ایران کے باشندے عیسائیوں کی بجائے عربوں کے ساتھ اپنی طرح بُت پرست ہونے کی وجہ سے دلی محبت کرتے۔

عربوں کے اس مذہبی استقلال و استقامت کا یہ نتیجہ ہوا کہ عرب کے عیسائی اور یہودی باشندے جن کے ساتھ ان (عربوں) کے تجارتی روابط تھے دونوں ان کے استقلالِ مذہب سے متاثر ہو کر اپنے اپنے ہاں بُت پرستی کی ایجاد پر مائل ہو گئے۔ اگرچہ یہ بھی ممکن ہے کہ عیسائیوں میں بُت پرستی کا رواج اُن کے آبائی اثرات کی وجہ سے ہوا ہو، کیونکہ ان کے آباء و اجداد بھی تو بُت پرست تھے۔

غرض نجران اور یثرب کے مسیحی اور یہودی باشندوں اور مشرکینِ عرب میں جو تجارتی روابط تھے ان کی وجہ سے یہ دونوں فرقے ان کے مذہبی عقائد سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ عرب کے رہنے والے عیسائیوں میں بُت پرستی کا رواج اُن کے آبائی عقیدے کی تاثیر سے عود کر آیا ہو کیونکہ اس عہد کے عیسائی باشندوں کے دلوں میں بُت پرستی کی لگن ابھی تک موجود تھی۔

عربوں کی بُت پرستی عرب میں خداوندانِ محسوس (بتوں) کی اتنی قسمیں تھیں کہ جن کا احصا محال ہے۔ عربوں کے اندر ان کی منزلت قدوسیت کے درجے تک

مستلم تھی۔ ہر قبیلے کا بُت جدا جدا تھا اور ان کے تین مختلف روپ تھے۔

صنم: انسان کی شکل پر لکڑی یا دھات سے بنے ہوئے بُت۔

وَثن: پتھر سے تراشے ہوئے بُت۔

نُصُب: پتھر کے ٹکڑے۔ اگر یہ پتھر چقماق کی قسم سے ہوتے یا ان میں کوئی اور طبعی ندرت ہوتی تو انھیں آسمانی نشان مان لیا جاتا۔

عرب کے بُتانِ معبود میں یمن کے تراشے ہوئے مجسّمے کاریگری کا حیرت انگیز نمونہ تھے، کیونکہ حجاز و نجد و کندہ کے مقابلے میں یمن کا تمدن عروج پر ہونے کی وجہ سے وہاں صنعت بھی بے مثل تھی۔ افسوس یہ ہے کہ جن کتابوں میں عرب کے بتوں کی حکایت ملتی ہے وہ پوری طرح ان کے خدوخال کے بیان سے قاصر ہیں۔ ایک "ہبل" کے سوا جو عقیق سے انسانی شکل میں تراش کر کعبہ میں رکھا ہوا تھا ایک مرتبہ اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا تو قریش مکّہ نے اسے سونے کے تاروں سے جوڑ دیا۔ "ہبل" عرب کے بقیہ تمام بتوں سے منزلت میں بالا سمجھا جاتا۔ دُور و نزدیک ہر مقام سے لوگ اس کی زیارت کے لیے آتے اور بندگی کے جملہ رسوم اس کے حضور ادا کرتے۔ "ہبل" کے سوا کئی اور چھوٹے معبود بھی بتوں کی صورت میں جلوہ گر تھے۔ یہ بُت گھروں میں بھی نصب تھے۔ دستور یہ تھا کہ گھر سے باہر نکلتے وقت اور باہر سے گھر میں داخل ہوتے وقت ان کو ڈنڈوت کیا جاتا۔ سفر میں جانا ہوتا تو پہلے ان سے التجائے رخصت کی جاتی۔ پھر انھیں بھی اٹھا کر ہمراہ لے جایا جاتا۔ یہ بُت کعبہ کے اندر یا مکہ معظمہ میں رکھے ہوئے تھے۔ یا ایسے بُت تھے جو عرب کے دوسرے شہروں اور خانہ بدوش قبائل میں موجود رہتے۔ ان کے پُوجنے والے بہ ظاہر انھیں اپنے اور خدا تعالیٰ کے درمیان وجہ تقرب بتاتے لیکن فی الحقیقت یہ لوگ خدائے برتر کو بھول کر انھیں کو مقصودِ حقیقی سمجھ چکے تھے۔

جزیرۃ العرب میں خطّہ یمن اپنے تمدن و شادابی اور ذرائع آب پاشی کی وسعت کی وجہ سے ممتاز تھا پھر بھی عرب کے صحرانشینوں کو اس کی قسمت پر ذرہ برابر رشک نہ آتا اور نہ وہ یمن کی ہر فلک عبادت گاہوں کی زیارت کرنا فخر سمجھتے۔ ان کے لیے تو عرب کی: وادٍ غیرِ ذی ذرعٍ (۱۴:۴) کی وہ بستی مرجع تھی جس کا نام مکہ ہے اور اس بستی کا وہ گھر انھیں پسند تھا جو حضرت اسمٰعیلؑ نے حاجیوں کے لیے تعمیر فرمایا جس کی زیارت کے لیے ان کی آنکھیں ہمیشہ ترستی رہتیں اور وہاں پہنچنے کے لیے

وہ ہمہ وقت پابہ رکاب رہتے۔ خصوصاً سال کے چار مہینوں میں باہمی جنگ وجدال حرام سمجھا جاتا۔ ان مہینوں میں تجارتی اور مذہبی سفر کا سلسلہ رہتا۔ مکّہ ان خصوصیات کی وجہ سے تمام عرب کا مرجع تھا اور قدرت نے مکّہ کی انہی خوبیوں کی بنا پر اُسے محمد صلعم کا مولد بننے کے لیے منتخب فرمالیا تاکہ یہ شہر نہ صرف عرب کے بسنے والوں بلکہ ہر ملک کے باشندوں کے لیے ذریعہ کشش ثابت ہو اور اس کا بیت اسماعیل ہمیشہ کے لیے تقدیس کا حامل بنا رہے۔ مکہ معظمہ اور کعبۂ مکرمہ کی برتری کے صدقے میں قریش کا مقام بھی بلند رہے۔ باوجودیکہ حضرت محمدؐ کی ولادت تک قریش کی قدیم سادہ اور بدوی زندگی میں کوئی فرق نہ آیا جس پر وہ صدیوں سے عمل پیرا تھے۔

مکّہ معظمہ اور اس کی تاریخ

وہ عام شاہراہ جو بحیرۂ قلزم کی مشرقی جانب سے گزرتی ہے اس راہ سے ملتا ہوا یمن اور فلسطین کے درمیان چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا سلسلہ چلا گیا ہے جو سمندر سے ۸۰ کلومیٹر تقریباً ۵۰ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اسی (پہاڑی) سلسلے میں ایک درّہ یمن، وجدّہ اور فلسطین تین مشہور خطوں کا سنگم ہے۔

یہ بستی (مکّہ) آج سے ہزاروں سال پیشتر آباد ہوئی مگر اس کا زمانہ متعین نہیں ہو سکا، اس کے سوا کہ عہدِ قدیم میں جو قافلے یمن اور فلسطین کے درمیان سفر کرتے وہ ان اطراف میں پہنچ کر اسی مقام پر پڑاؤ کرتے۔ جہاں مکہ معظمہ واقع ہے۔ یہاں انھیں پینے کے لیے ٹھنڈے اور میٹھے چشموں کا پانی افراط سے مل جاتا۔ سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ کے فرزند حضرت اسمٰعیلؑ نے اس سرزمین کو اپنی مستقل قیام گاہ بنالیا تھا۔ اس سے قبل یہ مقام ان قافلوں کی وجہ سے تجارتی منڈی بن چکا تھا۔ جو یمن وفلسطین سے ادھر آنکلتے تھے۔

حضرت اسماعیل کے توطن مکہ سے قبل بنائے کعبہ کی تاریخ نہیں ملتی۔ ممکن ہے کہ ان کی تشریف فرمائی سے قبل ہی مقام عبادت گاہ بن چکا ہو۔

حضرت ابراہیم کے والد کا نام آزر اور وطن عراق ہے۔ آزر لکڑی کے بُت تراش کر بسر اوقات کرتے۔ جب اُن کے فرزند حضرت ابراہیم سِن رشد کو پہنچے تو اپنے باپ کا پیشہ دیکھ کر حیران رہ گئے والد سے دریافت کیا یہ بُت جو آپ تراش کر فروخت کرتے ہیں معبودیت کے قابل کیونکر ہو سکتے ہیں؟ نجار انھیں مطمئن نہ کرسکے۔ یہ حال دیکھ کر ان کے والد کو فکر دامن گیر ہوئی۔ مبادا میرے فرزند

کی اس قیل و قال سے میرا کارخانہ برباد ہو جائے اس لیے اپنے لختِ جگر کو سمجھانا چاہا مگر حضرت ابراہیم خود صائب الرائے تھے۔ ان کے اندر داعیہ محرک تھا کہ دوسروں کو اپنے نظریات سمجھا سکیں۔ انھوں نے ایک موقع حاصل کیا وہ عوام کی نظروں سے بچ کر ان کے بڑے مندر میں تشریف لے گئے اور مندر کے بڑے بُت کے سوا تمام مورتیوں کو تہس نہس کر دیا۔

مگر حضرت ابراہیمؑ نے ان (بتوں) کے ساتھ یہ برتاؤ اس وقت کیا جب بُت پرستوں کی ضلالت اور معبودِ حق کی یکتائی پر انھیں پورا یقین ہو گیا تھا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں بھی منقول ہے۔

لیکن حضرت ابراہیمؑ قوم کو راہ راست پر لانے میں کامیاب نہ ہو سکے، اس پر لوگوں نے ان سے برافروختہ ہو کر انھیں جلتی آگ میں ڈال دیا، وہ گلزار ہو گئی اور اللہ تعالیٰ نے انھیں صحیح سلامت بچا لیا۔

آخر حضرت ابراہیمؑ دل برداشتہ ہو گئے۔ انھوں نے اپنی اہلیہ سارہ کو اپنے ہمراہ لیا اور فلسطین کے ارادے سے ہجرت فرما ہو گئے۔ یہاں سے مصر مراجعت فرمائی۔ اس وقت مصر میں عمالقہ کی حکومت تھی۔ جن کے بادشاہ نے آپ کی رضا طلبی کے لیے گوناگوں تحائف نذر کیے جن میں اپنی ایک صاحب زادی بھی تھیں، ان کا اسم گرامی ہاجرہ ہے۔

ادھر طویل مدت تک جناب سارہ اولاد سے محروم رہیں۔ انھوں نے خود اپنے شوہر (حضرت ابراہیم) سے اصرار کیا کہ "آپ ہاجرہ کو اپنی زوجیت سے سرفراز فرمالیجیے"۔ ایسا ہی ہوا اور راہنی ہاجرہ کے بطن سے حضرتِ اسماعیلؑ پیدا ہوئے۔ حضرت سارہ بھی صاحب اولاد ہو گئیں اور آپ کے بطن سے حضرتِ اسحٰقؑ پیدا ہوئے۔

اسحٰق اور اسمٰعیل دونوں بھائی یک جا رہتے، دونوں پر باپ کی شفقت یکساں تھی مگر سارہ کو دونوں بھائیوں پر باپ کی مساویانہ شفقت گوارا نہ تھی۔ اسی دوران میں اسماعیل نے کسی بات پر اسحٰق کے مُنہ پر طمانچہ مار دیا، سارہ تو پہلے ہی سے دل میں خلش لیے بیٹھی تھیں۔ انھوں نے قسم کھائی کہ اب وہ ہاجرہ کے ساتھ یک جا نہ رہیں گی۔ حضرت ابراہیمؑ نے زندگی کی یہ تلخی محسوس کی تو ہاجرہ اور اسمٰعیل کو لیا اور یہاں سے جنوب کی سمت روانہ ہو گئے۔ یہ سفر

انھوں نے اس درّۂ کوہ میں آکر ختم کیا جہاں آج مکہ (معظمہ) آباد ہے۔ ہاجرہ نے یہاں ایک مختصر سی جھونپڑی بنائی حضرت ابراہیمؑ ان کے لیے جو تھوڑا بہت سامان معیشت گھر سے لے کر نکلے تھے وہ سونپ کر الٹے پاؤں وطن واپس تشریف لے گئے لیکن یہ توشہ سارا ختم ہو گیا۔ ایک روز یہ ماجرا نظر آیا کہ بچہ اپنے پیر زمین سے رگڑ رہا ہے اور اس کی ایڑیاں پانی سے شرابور ہیں۔ ذرا اور آگے بڑھ کر دیکھا تو پانی کی اور زیادہ مقدار ملی۔ انھوں نے یہ پانی اسماعیل کو پلایا خود بھی پیا اور چشمے کے چاروں طرف مینڈھ بنادی تاکہ پانی ریت میں جذب نہ ہو جائے اس دوران میں حضرت ہاجرہ کھانے کا سامان ان سوداگروں سے خرید لیتیں جو یہاں پڑاؤ کرتے۔

پانی کا چشمہ پھوٹ آنے سے یہ درّہ اور بھی زیادہ کشش کا باعث ہو گیا عرب کے بعض قبائل یہاں آکر اقامت گزیں ہو گئے جن میں اوّلیت قبیلۂ جرہم کو ہے۔

اسمٰعیل جب بالغ ہوئے تو اسی قبیلۂ جرہم کی ایک لڑکی کے ساتھ عقد فرمالیا۔ سدا یہیں سکونت فرمارہے تاآنکہ ان کی قیام گاہ کے اردگرد آبادی بڑھتی گئی۔ اطراف سے اور قبائل بھی آکر آباد ہو گئے۔ بعد میں یہ آبادی مکّہ کے نام سے موسوم ہوئی۔

حضرت اسمٰعیل نے کچھ عرصے بعد اسی قبیلۂ جرہم کی ایک اور لڑکی بنت مضاض (بن عمرو) سے عقد فرمالیا۔

اسی بی بی کے بطن سے حضرت اسمٰعیل کے ہاں بارہ فرزند پیدا ہوئے جو اپنے گرامی منزلت والد کے نسب کی وجہ سے عرب مستعربہ سے مشہور ہوئے، ان کی والدۂ عالیہ کے مورثِ اعلیٰ کا نام یعرب بن قحطان ہے۔ اس وجہ سے فرزندانِ اسمٰعیل عرب عاربہ سے بھی موسوم ہیں حضرت اسمٰعیل اپنی والدہ کی وجہ سے مصر سے منسوب ہیں اور حضرت ابراہیمؑ نے دورانِ ہجرت میں عراق و فلسطین کے جن جن علاقوں میں جہاں جہاں قیام فرمایا ان سے بھی منسوب!

کعبہ بُت خانہ بن گیا

حضرت ابراہیمؑ نے اس نیت سے کعبۃ اللہ تعمیر کیا کہ یہاں لوگ توحید کا تصور لے کر آئیں گے اور یہاں چند روز رہ کر خدائے واحد لاشریک کی عبادت کریں گے۔ لیکن خدا کا یہ گھر کس طرح بتوں کی آماجگاہ بن گیا۔ اس کے اندر علانیہ بُت پرستی کس طرح شروع ہو گئی۔ یہ برائی حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کی وفات

کے بعد بیت اللہ میں کس راہ سے دخل انداز ہوئی؟ ایک اللہ کی عبادت پر بتوں کی پرستاری غالب آ گئی؟ افسوس ہیں تاریخ ان سوالات کے حل میں ہماری مدد نہیں کر سکتی اور اگر کسی شخص نے اس پر قلم اٹھایا ہے تو محض فرضی تصورات اور ان پر خود ساختہ جوابات سے اپنے لیے تسکین کا سامان جمع کر لیا ہے۔

ستارہ پرستی کا عربوں میں رواج گزشتہ زمانے میں عرب کے اندر ستارہ پرستی کو پورا عروج حاصل ہوا۔

مکہ میں بُت پرستی کی ابتدا بعد میں لوگوں نے سنگِ چقماق میں آگ کا کرشمہ دیکھ کر تصور کر لیا کہ آسمان سے جو پتھر ہمارے معبود پر ستاروں کی بھینٹ کے لیے گرائے گئے ہیں وہ یہی پتھر ہیں! نتیجہ یہ ہوا کہ عرب کے ستارہ پرستوں نے پہلے خداؤں کو ان پتھروں سے بدل لیا۔ بعد ازاں یہ ولولہ اس حد تک ترقی کر گیا کہ انھوں نے کعبۃ اللہ میں نصب شدہ حجر اسود کے تعظیمی بوسے پر اکتفا کرنے کی بجائے کعبہ کے گرد و نواح میں بکھرے ہوئے پتھروں کو سفر میں اپنے ساتھ لے جانا شروع کر دیا۔ جن سے ہر کام کے ابتدا میں اس کی اجازت طلب کی جاتی یعنی بندگی کے جو رسوم ستاروں سے وابستہ تھے ان میں سے ایک ایک معاملہ بُتوں کے ساتھ استوار کر لیا گیا حتیٰ کہ ان پتھروں کے مجسمے بنا کر ان کی تقدیس اور ان کی رضا کے لیے قسم قسم کی قربانیاں شروع کی گئیں۔

حضرت ابراہیمؑ کے بعد عرب میں دوسرے نبیوں کا ظہور ان عہدوں میں بھی عرب میں پے بہ پے انبیائے کرام تشریف لائے جنھوں نے خدائے وحدہٗ لاشریک کی عبادت کی دعوت پیش کی مگر عرب کے باشندے انبیاء کی دعوت کو ٹھکرا کر بہ دستور بُت پرستی پر قائم رہے۔

برابر انبیائے کرام تشریف لاتے رہے جن کے اذکار مقدس اور ان کی دعوت کے عواقب و نتائج جابجا قرآن مجید میں مذکور ہیں کہ ان کی دعوت سے انکار کرنے والوں کا کیا حشر ہوا کیونکہ وہ سب کچھ سن کر بھی بُتوں کی پرستش پر قائم رہے۔

قصی بن کلاب کی شخصیت قصی بن کلاب وہ پہلے شخص ہیں جنھیں تعمیر کعبہ سے لے کر

ان کی مکہ پر سیادت کے ساتھ مندرجہ ذیل اعزازات حاصل ہوئے:

۱: حجابتِ کعبہ — اور وہ تعبیر ہے بیت اللہ کی کلید برداری سے۔

۲: سقایت — یہ خدمت ہے حاجیوں کے لیے آبِ شیریں فراہم کرنا جو اہلِ مکہ کا لذیذ ترین مشروب تھا اور ان کے لیے کھجوروں کا عصارہ بہم پہنچانا جو شرب و اکل دونوں کا بدل ہے۔

۳: رفادت — مفلوک الحال حاجیوں کی دعوتِ طعام اور ان کی واپسی پر انھیں زادِ راہ پیش کرنا۔

۴: صدارت — اہلِ مکہ کی روزمرّہ کی مجلسِ قومی کی صدارت

۵: لواء — وہ عَلَم جو دشمنوں کے ساتھ معرکہ آرائی کے لیے نکلنے پر لہرایا جاتا ہے۔

۶: قیادت — جنگی لشکر کی سپہ سالاری۔

اور یہ عہدے کعبہ کی عظمت کا ثمرہ تھے جو اسے عرب کے باشندوں میں مرکزی عبادت گاہ ہونے کی وجہ سے حاصل تھی۔ یہ عہدے قُصَیّ کے حسنِ خدمات کے باوجود ایک ہی ساعت میں تفویض نہیں ہوئے۔ ایک منصب کے بعد دوسرا عہدہ اور دوسرے اعزاز کے بعد تیسرا۔

ہماری تحقیق کے مطابق تعمیرِ کعبہ کے وقت ان مناصب کا وجود عمل میں نہ آیا تھا بلکہ جوں جوں ضرورتیں پیدا ہوتی گئیں عہدے بڑھتے گئے۔ مذکورہ عہدوں میں بعض ایسے مناصب بھی ہیں جنھیں کعبہ کی دینی عظمت کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں لیکن اہلِ مکہ کے مزاج کے ساتھ انھیں ضرور مناسبت حاصل ہے۔

تعمیرِ کعبہ کے زمانے میں مکہ کا تمدّن اس قدر جاذب نہ تھا کہ وہ اس دور کے دو معروف قبائل عمالقہ و جرہم کی توجہ کے قابل ہو سکتا۔ لیکن جب حضرت اسماعیل نے اس مقام کو اپنی اقامت کا شرف بخشا اور بعد میں جناب ابراہیمؑ و اسماعیل دونوں نے مل کر کعبہ کی تعمیر فرمائی تو ان دوگونہ صفات کی وجہ سے اس سرزمین میں انسان کی مستقل اقامت گاہ بننے کی صلاحیت عود کر آئی، ہر سمت سے قبائل آتے گئے اور یہاں سکونت پذیر ہوتے گئے۔ رفتہ رفتہ یہ مقام

شہر کی صورت میں منتقل ہو گیا۔

قبیلۂ جرہم نے عمالقہ کو شکست دے کر مکۂ معظمہ پر قبضہ کر لیا جو مضاض (بن عمرو بن الحارث) کے عہد تک قائم رہا۔ جرہم کے پورے دور میں مکہ کی تجارت کو فروغ رہا جس سے جرہم کی زندگی ناز و نعم کی عادی ہو گئی۔ وہ بھول گئے کہ اس ناقابلِ کاشت سرزمین (وادِ غیر ذی زرع) پر رہ کر محنت شاقہ کے بغیر روزی کا دستیاب ہوتا رہنا محال ہے۔ اور تو اور وہ تعیش کے نشے میں (چاہ) زمزم کی صفائی اور اس کی دیکھ بھال سے بھی بے پروا ہو گئے۔ یہاں تک کہ اس کے سوتے بند ہو گئے

جرہم کی اس غفلت اور نالائقی سے قبیلۂ خزاعہ نے اس کے اقتدار و مناصب پر تصرف کا ارادہ کر لیا جس کے عواقب سے مضاض نے اپنے ساتھیوں کو ہر چند آگاہ کیا مگر ان کی آنکھیں نہ کھلیں۔ مضاض کے دل میں جرہم کی ذلت کا احساس بڑھتا گیا، اسے یقین ہو گیا کہ اب یہ اقتدار خزاعہ کا انتظار کر رہا ہے۔ اس نے پیش بندی کے طور پر کعبہ کے خزانے میں سے بیش قیمت سامان اور سونے کے دو ہرن جو کبھی کعبے کے لیے ہدیے کے طور پر رکھے گئے تھے دوسروں کی نظروں سے چھپا کر زمزم میں دفن کر دیا۔ تاکہ جب دوبارہ وہ مکہ پر قابض ہوں تو انھیں اپنے کام میں لائیں۔ اس مہم سے فارغ ہو کر مضاض اپنے قبیلے اور بنو اسماعیل کو لے کر مکہ سے نکل آیا۔ اب یہاں بنو خزاعہ کی حکمرانی تھی جو قصی بن کلاب کے دور تک رہی۔ قصی کا رسول اللہ صلعم سے نسبی علاقہ پانچویں پشت میں ہے۔

قصی کی والدہ کا نام فاطمہ ہے (بنت سعد بن سہیل) ان کے دو فرزند پیدا ہوئے۔ دوسرے کا نام زہرہ ہے یہ قصی سے بڑے تھے۔ کلاب کے انتقال کے وقت قصی اپنی ماں کی گود میں تھے، بڑے ہوئے تو ان کی وقت نظر و اصابت رائے نے تمام خاندان میں انھیں محترم بنا دیا۔

اس موقع پر کعبے کی تولیت حُلیل بن حُبیشہ کے قبضے میں تھی۔ یہ نسباً خزاعی تھے اور صاحبِ فراست۔ قصی نے ان کی صاحب زادی (حبی) کے لیے خطبہ (درخواست نکاح) کیا جسے حُلیل نے منظور کر لیا اور شادی ہو گئی۔ قصی کو تجارت میں بڑا ملکہ تھا۔ کاروبار کرتے سے کبھی غافل نہ رہتے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ مال دار ہو گئے۔ خدا کی دین کہ مال کے ساتھ اولادِ نرینہ میں بھی افزائش

ہو گئی۔ یہ دونوں نعمتیں اپنے معاصرین میں قصی کے احترام مزید کا باعث ہو گئیں۔

قصی اور کلیدِ کعبہ حُلیل نے اپنی آخری علالت میں کعبہ کی کلید اپنی صاحبزادی حبیؔ کے لیے وصیت کر دی۔ اس طرح بیت اللہ کی سیادت اور اعزازات پر قصی بن کلاب کا قبضہ ہو گیا۔

قصی کے صاحب زادوں میں عبدالدار سب سے بڑے اور عبد مناف ان سے چھوٹے تھے۔ لیکن قبیلہ اور دوسرے خاندانوں میں عبد مناف کا وقار زیادہ تھا۔ قصی کے قویٰ کمزور ہونے لگے تو انھوں نے کلید کعبہ کے ساتھ دوسرے تمام اعزازات بھی عبدالدار کو تفویض کر دیے ان میں رفادت بھی تھی جس کے لیے تمام قریش کے ذمے سالانہ ٹیکس تھا جو قصی کے ہاں جمع ہوتا اور اس میں حج کے موقع پر مفلوک الحال حاجیوں کو کھانا اور زادِ راہ بھی مہمانی کے طور پر دیا جاتا جس کا آغاز قصی نے کیا تھا۔

خاندانی مناقشات کا تصفیہ عبدالدار اپنے باپ (قصی) کی طرح بدستور اپنے فرائض ادا کرتا رہا۔ اور عبدالدار کے بعد اس کے فرزند۔ عبد مناف کے بیٹوں کا بھی قریش میں بڑا وقار تھا۔ ایک مرتبہ وہ چاروں (ہاشم، عبدشمس، مطّلب، نوفل) بنو عبدالدار سے بیت اللہ کی چابیاں لینے پر مُصر ہوئے، اس پر قریش میں دو گروہ ہو گئے۔ مصالحت اس شرط پر ہوئی کہ:

سقایت و رفادت ——— بنو عبد مناف کے لیے

کلید برداری۔ علم اور ندوہ کی صدارت ——— بنو عبدالدار کے لیے

اور فریقین کے اختلاف انھیں ظہورِ اسلام تک مناسب طریق سے نبلٹتے رہے۔

ہاشم اپنے چاروں بھائیوں میں بڑے تھے۔ گھر میں مال و منال وافر تھا۔ ہاشم زائرین بیت اللہ کی ضیافت ان کی مکہ سے واپسی تک کرتے اور نہ صرف زائرین کعبہ بلکہ مکہ کے مفلوک الحال باشندوں کی دست گیری بھی اُن کا معمول تھا۔ ایک مرتبہ مکہ میں قحط رونما ہوا تو ہاشم نے غریبوں کے لیے اپنا دسترخوان اس فراخی کے ساتھ وسیع کر دیا کہ انھیں اپنے لیے غذا بہم پہنچانے کا کوئی فکر نہ رہا۔ وہ ان کے لیے ثرید (شوربے میں بھیگے ہوئے نان) بہم پہنچاتے۔

اطرافِ حجاز میں ہاشم کی وجاہت

ہاشم سال میں دو مرتبہ تفریحی سیر و سیاحت کے لیے مکہ سے نکلتے۔ گرمی کے موسم میں یمن اور سردیوں میں شام کی طرف جاتے۔ جس سے ان کی وجاہت کے ساتھ ان کے زادبوم (مکہ) کی شہرت بھی اطرافِ حجاز میں پھیل گئی۔

عبدمناف کے بیٹوں نے وقت کو پہچان کر اپنے قرب و جوار کے امرار کے ساتھ باہمی امن و سلامتی کے معاہدے کر لیے۔ ہاشم نے قیصر روم اور امیر (قبیلہ) غسّان کے ساتھ اس معاہدہ میں اوّل الذکر سے یہ شرط بھی طے کر لی کہ اپنے اپنے ملک کے اندر دوران سفر میں وہ قریش کی جان و مال کی سلامتی کے ذمہ دار ہیں۔ اسی قسم کا معاہدہ ہاشم کے برادرِ صغیر عبدشمس نے حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے ساتھ کر لیا۔ دوسرے دو بھائیوں نوفل اور مطلب نے فارس اور یمن کے تاجداران قبیلہ حمیر سے یہی معاہدات تسلیم کرا لیے۔

ان معاہدوں سے مکہ کی وجاہت و ثروت میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی گئی۔ اہلِ مکہ کی تجارت میں دن بدن بھارت بڑھنے لگی۔ معاہد ممالک کے سوداگر مکہ میں اپنا مال لے کر آنے لگے۔ شہر مکہ سے باہر پینٹھ کے بازار قائم ہو گئے۔ ان کے ملکوں میں سوداگری کے لیے گرمی اور سردی دونوں موسموں میں جاتے، دیکھتے ہی دیکھتے اہلِ مکہ تجارت کے ہیر پھیر میں تمام ممالک کے سوداگروں سے بازی لے گئے۔ وہ تجارت کے اصولوں میں نقد و نسیہ (اُدھار بٹہ) دونوں کے نفع و ضرر کو جان گئے۔

ہاشم معمر ہو جانے کے باوجود منصبِ سیادت کو نباہتے رہے۔ اس دوران ہاشم نے دورانِ سیاحت میں فلسطین کے شہر غزہ میں وفات پائی۔ (یہ گرمی کا موسم تھا) باپ کے تمام مناصب اور اعزازات ان کے برادرِ خورد مطلب کو تفویض ہوئے۔ جن کی فضیلت و سخاوت کا سکہ اس قدر عام تھا کہ انھیں قریش "الفیض" کہہ کر پکارتے۔ جس کی بنا پر یہ سیادت انہی کے لیے سزاوار ہو سکتی تھی۔ مطلب نے اپنے فرائض اسی خوبی سے ادا کیے جس کی طبعاً ان سے توقع تھی۔

کچھ عرصے بعد مطلب کو ہاشم کے بیٹے یعنی اپنے مدنی نژاد بھتیجے شیبہ کی یاد نے ستایا اور وہ یثرب تشریف لے گئے۔ انھیں اپنے ہمراہ مکہ میں لے آئے۔ جس وقت مکہ میں ان کی سواری داخل ہوئی

تو شیبہ (عبدالمطلب) ان کے عقب میں بیٹھے تھے۔ اہلِ مکّہ نے یہ سمجھا کہ یہ نوجوان مطلب کا غلام ہے۔ اور ان میں سے کسی نے بہ آواز بلند کہہ بھی دیا "عبدالمطلب"۔ مطّلب نے فوراً کہا یہ میرا غلام نہیں بلکہ "ابن ہاشم" ہے۔ لیکن اتفاق کی بات کہ شیبہ عبدالمطلب (نام) سے مشہور ہی ہو گئے اور ان کا اصل نام لوگوں کے ذہن سے اتر گیا۔

مطّلب نے اپنے برادر زادہ (شیبہ) کو مکّہ میں لے آنے کے بعد اپنے بھائی کا ترکہ ان کے فرزند شیبہ (عبدالمطلب) کے حوالے کر دیا۔

مطّلب کی وفات کے بعد اُن کے جملہ اعزازات و مناصب انہی عبدالمطلب کو تفویض ہوئے لیکن رفادت و سقایت دونوں کا نباہ ان کے لیے بار ہوتا گیا۔ ان کی امداد کے لیے تنہا اُن کا ایک فرزند حارث ہی تو تھا۔

زمزم کو مضاض بن عمرو جرہمی نے پاٹ دیا تھا۔ جس کی وجہ سے قریب سے پانی حاصل ہونا ناممکن تھا۔

عربوں کو ابھی تک یاد تھا کہ جو کنواں کعبے کے پائیں میں واقع تھا اسے فلاں صدی میں مضاض بن عمرو نے پاٹ دیا تھا۔ اور سب کی یہ تمنا تھی کہ کاش وہ کنواں پھر ابھر آئے اور اس کے سوتے پھوٹ نکلیں۔ دوسروں سے کہیں زیادہ یہ تمنا عبدالمطلب کے دل میں تھی۔ لیکن زمزم کے محلِّ وقوع کے بارے میں کسی کو صحیح علم نہ تھا کہ وقت نے مساعدت کی خواب میں عبدالمطلب کو اس کا نقطۂ وقوع بتا دیا گیا۔ اور وہ تنہا اپنے نورِ نظر حارث کو اپنے ہمراہ لے کر کھدائی میں مصروف ہو گئے —— اور وہ نکل آیا۔

عبدالمطلب نے نذر مانی کہ اگر میرے ہاں دس فرزند پیدا ہوں تو ان میں سے ایک کو کعبہ کے سامنے اللہ کی نذر کر دوں گا۔ عبدالمطلب کی یہ دعا مقبول ہوئی اور جب تمام بچے سنِ رشد کو پہنچے تو عبدالمطلب نے اپنی نذر کا ماجرا اُن سے بیان کیا۔

قرعہ عبداللہ کے نام پر نکلا جن کا ۹۹ اونٹ ذبح کر کے فدیہ دیا گیا۔

اہلِ مکّہ کو اس بادۂ ناب سے رغبت تھی جسے وہ خرمے سے نچوڑ لیتے اور مُنہ سے لگاتے ہی بدمست ہو جاتے، وفورِ مستی میں کبھی تو کنیزوں کے گلے میں باہیں ڈال دیتے اور گاہے ان امرد

غلاموں سے مختلط ہو جاتے جو سینکڑوں کی تعداد میں اموالِ تجارت کی شکل میں جمع رہتے۔
اہل مکہ کے ان مشاغل میں کعبہ ہی کے سامنے ایسی بزم آرائیاں ہوتیں بادۂ ناب کی گردش کے ساتھ باتوں کی ہوائیاں چھوٹتیں کعبہ کا حاشیہ تین سو بتوں کا نگارخانہ بنا ہوا تھا۔
اہلِ مکہ نے خود یہ سمجھ رکھا تھا کہ نہ تو اہلِ کتاب میں سے کوئی شخص مکہ میں اقامت گزیں ہونے پائے نہ یہاں آکر وہ اپنے دین اور کتاب کی حکایت بیان کر سکے۔ وہ یہاں صرف مزدوری کرنے کے لیے (عارضی طور پر) قیام کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ نہ تو نجران کی طرح نصاریٰ کا وطنِ مالوف بننے پایا نہ یثرب کی مانند اس کے ارضِ یہود بننے کی نوبت آئی بلکہ وہ (کعبہ) ان بتوں کی برکت سے حریم قدس بن گیا جو دوسروں کی یلغار سے مکہ کی حفاظت کرتے۔
جس طرح عرب کے بادیہ نشین ایک دوسرے کے تغلّب سے خود اپنے محافظ تھے جن کی سب سے بڑی سلطنت اپنا استقلال تھا انھیں نہ تو دو قبائل کا باہم تصادم گوارا تھا نہ ان کے رسوم میں یہ دخل دیتے۔ نہ قبائل کے گٹھ جوڑ کر کے اپنے ہمسایہ ملک روم یا فارس کی طرح دوسری قوموں اور ملکوں کو اپنے زیرنگیں کرنے کی مہمیں جاری رکھیں۔ یہی وجوہ ہیں کہ ان سب کی ذہنیت یکساں اور سب کا دستور صحرا نشینی کی وہ زندگی تھی جس کے مطابق وہ ایک نخلستان سے اپنے ناقے کی مہار موڑ کر دوسرے نخلستان میں پڑاؤ ڈال لیتے۔ ان کی زندگی کا جہاز صحراؤں میں قدم قدم پر صعوبت کے تھپیڑوں سے ٹکراتا رہتا۔ لیکن وہ اپنی آزادی قائم رکھنے کے لیے ان مصیبتوں کا استقبال خندہ پیشانی سے کرتے۔
ان کے سکونتی مکانات کعبے سے قرب اور بعد کی صورت میں ان کے مناصب کی ترتیب پر تین نقطوں میں واقع تھے:۔

۱: قریش کے مناصب سقایت و رفادت اور کعبے سے جملہ اختصاصات کی بنا پر ان کی حویلیاں کعبے کی دیواروں سے ملی ہوئی تھیں۔

۲: قریش کی حویلیوں کے بعد ان لوگوں کے مکانات تھے جو وجاہت میں ان (قریش) سے دوسرے درجے پر تھے۔ مگر اپنے سوا اوروں سے افضل!

۳: یہودی اور نصرانی مزدوروں اور غلاموں کی جھونپڑیاں تھیں جن کا دوسرا رخ صحرا کا

دامن تھا۔ انھیں شہر کے بیرونی رُخ پر اس لیے آباد کیا گیا کہ ان کی مذہبی بات چیت کی آواز قریش اور اہلِ بستی کے کانوں تک نہ پہنچے تاکہ اہلِ کتاب میں سے کسی کے دین کی طرف ان کا میلان نہ ہونے پائے، باوجودیکہ اہلِ مکّہ اپنی سیر و سیاحت اور تجارتی سفروں میں ان کے کلیساؤں اور کنیساؤں کے پاس سے گزرتے ہوئے باتیں سُنتے چلے آئے تھے۔

لیکن قریش کا اہلِ کتاب کو شہر سے باہر ایک کنارے پر آباد کرنے کا یہ منشا تھا کہ ان کی باہمی گفت گو سے اپنے یہودی یا نصرانی ہو جانے سے ڈرتے۔ بلکہ یہ دونوں (یہود و نصاریٰ) آنے والے پیغمبر کی تشریف آوری کے منتظر تھے۔ جس کا ظہور سرزمینِ عرب میں ہونے کو تھا جس کے تذکرے اُن کی زبانوں پر اکثر و بیشتر آتے یہ بات قریش کے کانوں میں بھی پڑ چکی تھی۔ ایک روز اُمیّہ بن ابی الصلت یہی تذکرہ کسی رہبان کی حکایت میں کر رہے تھے کہ ابوسفیان نے سُن لیا۔ اور اُن سے خفا ہو کر کہا:

"آپ کو معلوم نہیں کہ مسیحی رہبان یہ تذکرہ اپنے دین سے ناواقف رہ جانے کی وجہ سے کرتے ہیں تاکہ ایک اور نبی آئے اور پھر انھیں ان کا دین سمجھائے۔ لیکن ہمیں نبی کی کیا ضرورت ہے ہم اپنے بتوں کے آگے سرنگوں ہیں۔

لِیُقَرِّبُوْنَا اِلَی اللّٰہِ زُلْفٰا" (تاکہ ہمارے یہ معبود ہمیں خدا سے قریب کر دیں۔) (۳۹ : ۳)

اس لیے ہمیں ایسی بات کی مخالفت کرنا چاہیے جس میں کسی نبی کے آنے کی حکایت ہو"

ابوسفیان جو اپنے زاد بوم (مکّہ) اور معبود بتوں کی محبّت میں سرشار تھے انھیں یہی کہنا چاہیے تھا۔ کاش انھیں علم ہوتا کہ ہدایت کا زمانہ کس قدر قریب اور ظہورِ اکبر کا وقت آ ہی پہنچا ہے جس نور کے سامنے بُتوں کی تاریکی اپنا مُنہ چھپائے گی۔ نہ صرف مکّہ اور عرب بلکہ تمام عالم اس نورِ ہدایت سے فیض یاب ہوگا۔ دُنیا میں توحید کی ضیا پھیلے گی۔ کلمۃ الحق سے لوگوں کو قوتِ ایمان نصیب ہوگی۔

اِدھر قریش کے نونہال عبداللہ بن عبدالمطلب نے شباب کی منزل میں قدم رکھا۔ شہر

کی عورتوں میں اُن کے حسن و جمال کے چرچے شروع ہو گئے۔ خصوصاً جب وہ (مکّہ کی عورتیں) یہ تصوّر کرتیں کہ ہمارے بڑے معبود "ہبل" کے حضور عبداللہ کی جان کس قدر محبوب تھی کہ انھوں نے اس کے فدیے میں ایک سو شتر سے کم پر سودا نہیں کیا تو ان کے دل میں عبداللہ کی عظمت اور بھی سوا ہو جاتی۔ بایں ہمہ عبداللہؓ کے اوصاف میں ایسے فرزندؐ کے باپ ہونے کا اضافہ بھی مقدّر تھا جن کا نام تاریخ نے ہمیشہ فخر کے ساتھ دوہرایا اور قریش کے اس نونہالؐ کی ماں ہونے کا امتیاز آمنہ (بنت وہب) کی تقدیر میں لکھا تھا (ان) دونوں کا عقد ہو گیا لیکن عبداللہ بن مطلب تزویج سے چند ماہ بعد ایسے بیمار ہوئے کہ اب آکر انھیں موت کے منہ سے بچانے کے لیے فدیہ کی نوعیت بھی کارگر نہ ہو سکی۔ عبداللہؓ آسودہ ہو گئے۔ جناب آمنہ اپنے نورِ نظر (جناب) محمدؐ (فداہ ابی و امّی) کے ظہور تک زندگی کے گہوارہ میں جھولتی رہیں مگر اجل کا فرشتہ ان کی تاک میں بھی لگا ہوا تھا اور وہ بھی اپنے فرزند کے عہدِ طفولیت میں قبر میں جا سوئیں!

کاروان اسلام

دوسری منزل

محمد

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

در شبستانِ حرا خلوت گزید

قوم و آئین و حکومت آفرید

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ھادیؐ
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی
نئی اک لگن سب کے دل میں لگادی
اک آواز میں سوتی بستی جگادی
سبق پھر شریعت کا اُن کو پڑھایا
حقیقت کا گُر اُن کو اک اک بتایا

دیے پھیر دل اُن کے مکر و ریا سے
بھرا اُن کے سینے کو صدق و صفا سے
بچایا انھیں کذب سے، افترا سے
کیا سرخ رُو خلق سے اور خدا سے
نشاں راہ منزل کا اک اک دکھایا
بنی نوع کا ان کو رہبر بنایا

در دلِ مُسلم مقامِ مصطفیٰ است
آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰ است

ہر کہ عشقِ مصطفیٰ سامانِ اوست
بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست

طُور، موجے از غبارِ خانہ اش
کعبہ را بیت الحرم کاشانہ اش

بوریا ممنونِ خوابِ راحتش
تاجِ کسریٰ زیرِ پائے اُمّتش

وقتِ ہیجا تیغِ او آہن گداز
چشمِ اُو شد اشک بار اندر نماز

از کلیدِ دیں، درِ دُنیا کشاد
ہمچو او بطنِ اُمِّ گیتی نہ زاد

در نگاہِ اوؐ یکے بالا و پست
با غلامِ خویش بر یک خواں نشست

آنکہ بر اعدا درِ رحمت کشاد
مکہؐ را پیغامِ لاتثریب داد

مذہبِ اوؐ قاطعِ ملک و نسب
از قریش و منکر از فضلِ عرب

اے ظہورِ تو شبابِ زندگی
جلوہ ات تعبیرِ خوابِ زندگی

۱:

آنحضرتؐ کے سوانح حیات

ظہور قدسی اور اس کے اثرات ونتائج

دُنیا میں بہت سے پیغمبر گزرے ہیں، وہ بھی جن کے نام قرآن میں آئے ہیں اور وہ بھی جن کے نام قرآن میں نہیں ہیں۔ کوئی سرزمین ایسی نہیں جہاں کوئی ہادی نہ بھیجا گیا ہو، کوئی قوم ایسی نہیں جس میں کوئی بشیر ونذیر نمودار نہ ہوا ہو، کوئی ملک ایسا نہیں جہاں نبی اور رسول نہ آئے ہوں۔

ان انبیاء اور مرسلین میں ایسے بھی ہیں جن کا دین آج تک قائم ہے، جن کی اُمتیں اب بھی موجود ہیں۔ جنھیں دعویٰ ہے کہ ان کے پاس اللہ کی کتاب ہے اور وہ اس پر عامل ہیں۔

لیکن کیا ان انبیاء اور مرسلین میں کوئی ایسا بھی ہے جس کے حالات وسوانح پوری صحت اور استناد کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر ثبت ہوں؟ جس کی حیاتِ شب وروز کا ایک ایک واقعہ اپنی پوری تفصیل اور تفصیل کے جملہ جزئیات کے ساتھ تاریخ نے اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہو؟ خود جس کے اُمتی اور پیرو اس کی کوئی مفصل سوانح عمری خواہ وہ دوسروں کے نقطۂ نظر سے غیر تاریخی ہی کیوں نہ ہو اپنے پاس رکھتے ہیں؟

تاریخ کا جواب انکار میں ہے۔

لیکن ہاں اس کرۂ ارض کے پورے عرصۂ حیات میں ایک نبی ایسا گزرا ہے جس کے اٹھنے بیٹھنے،

کھانے پینے، ملنے جلنے، چلنے پھرنے، آنے جانے اور سونے جاگنے کی پوری تفصیل ایک ایک جزئیہ کے ساتھ اس صحت و استناد کے ساتھ موجود ہے کہ دنیا کی کوئی تاریخ صحت و استناد کے معیار میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور وہ ہستی ہے نبی امّی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی۔

کاروانِ اسلام کی یہ تاریخ سیرتِ نبوی کا کوئی حصہ نہیں ہے کہ بسط و تفصیل کے ساتھ اس حیاتِ گرامی کے تمام پہلو پیش کیے جا سکیں۔ لیکن اس تاریخ کا یہ پہلا باب ضرور ہے۔ جب تک ہم اسے نہ پڑھ لیں اس وقت تک کاروانِ اسلام کے بارے میں ہمارے معلومات تشنہ، ناقص اور نامکمل رہیں گے۔ لہٰذا اس نقص اور تشنگی کو دور کرنے کے لیے سب سے پہلے ہم سراپائے نبوی کا دیدار کرنے پر مجبور ہیں۔ خواہ اس دیدار کی مدت کتنی ہی مختصر کیوں نہ ہو۔

ولادتِ باسعادت

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دعائے خلیل و نویدِ مسیحا!

تاریخ ولادت میں اختلاف ہے۔ لیکن کثرتِ آراء اس طرف ہے کہ آپ ۹۔ ربیع الاوّل کو اور بعض ثقہ روایتوں کے بموجب ۱۲۔ ربیع الاوّل کو پردۂ عدم سے عالمِ وجود میں آئے۔ دوشنبہ کا مبارک دن تھا۔ آپ کی ولادت کا وہی سال تھا جو مکہ پر ابرہہ کی فوج کشی کا تھا۔ جب وہ اپنے ہاتھیوں کی فوج لے کر چڑھ دوڑا تھا۔ عیسوی سال کے لحاظ سے ۱۷۔ اپریل ۵۷۱ یا ۲۰۔ اپریل ۵۷۱ ہوئی۔

عبد المطلب پوتے کی پیدائش سے بہت خوش ہوئے، ان کی گود میں ایک یتیم بچہ تھا لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ مشرق و مغرب کی بادشاہت اس کے مبارک قدموں کے نیچے ہو گی۔ سعادت و برکت اس کے سر پر سایہ فگن ہے اور انسانیت کی فلاح اور انسانیتِ کبریٰ کا وجود اسی پر منحصر ہے۔ جوشِ مسرت میں نام محمدؐ رکھا۔ بعض لوگوں نے اعتراض کیا کہ یہ نیا نام کیسا؟ خاندانی ناموں کے طرز و اسلوب سے انحراف و اعراض کیوں؟ جواب دیا "تاکہ وہ سزاوارِ ستائش رہے۔" اور کون کہہ سکتا ہے عبدالمطلب کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی!

ابوطالب کا دور!

شرفائے مکہ کے عام اصول اور رواج کے مطابق آپ حلیمہ کے سپرد کر دیے گئے کہ بادیہ میں رہیں۔

اور وہیں پروان چڑھیں۔ ہر چھ مہینے کے بعد وہ آتی تھیں اور ماں کی مشتاق نگاہوں کو دیدار کا شربت پلا جاتی تھیں۔ ماں کی ٹوٹی امیدوں کا یہی سہارا اور بیوگی کی تاریک راتوں کا یہی چاند تھا۔

لیکن قدرت خود جن افراد کی تربیت اور نگہداشت کرتی ہے انھیں ظاہری اور مادی وسائل سے یکسر محروم کر دیتی ہے ابھی آپ نے زندگی کی صرف چار بہاریں دیکھی تھیں کہ ماں کو بھی پیامِ اجل آ گیا۔ اب بوڑھے دادا نے اس معصوم بچے کو عصائے پیری بنا کر پروان چڑھانا شروع کیا۔ اور چار سال کے بعد جب کہ آپ کی عمر صرف ۸ سال کی تھی وہ بھی ۸۲ سال کی عمر میں داغِ مفارقت دے گئے۔ اب ماں، باپ اور دادا کی محبت جس ایک دل میں سما گئی وہ ابوطالبؑ تھے۔ انھوں نے اپنے ننھے اور یتیم بھتیجے کو اپنی آغوشِ محبت میں پالنا شروع کیا۔

ابوطالبؑ کی محبت!

ابوطالب حضرتؐ سے بہت محبت کرتے تھے۔ اپنی اولاد سے بھی زیادہ۔ ساتھ لے کر سوتے۔ باہر جاتے تو بھی ننھا بھتیجا ساتھ رہتا۔ اس شفقت و محبت کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپؐ بھی چچا سے بہت مانوس ہو گئے اور بڑی محبت کرنے لگے۔

آپ کی عمر ۱۲ سال کی تھی کہ حسبِ دستور ابوطالب نے کاروباری سفر کی تیاری شام کے لیے شروع کر دی راستے کی تکالیف کے خیال سے آپ کو ساتھ لے جانے کا ارادہ نہیں تھا لیکن جب رختِ سفر باندھ کر چلنے لگے تو آپؐ ان سے لپٹ گئے اور ساتھ چلنے کے لیے مچل گئے۔ ابوطالب اپنے محبوب بھتیجے کی دل شکنی نہ کر سکے اور سفر پر ساتھ لے گئے۔

بچپن میں آپ کا زیادہ وقت بکریاں چرانے میں صرف ہوتا تھا تعلیم و تعلم کا عرب میں رواج نہیں تھا۔ لہٰذا آپ کی تعلیم کا سوال بھی نہیں پیدا ہوا۔ بکریاں چرانے کے سوا جو وقت بچتا تھا وہ آپؐ چچا کے کاموں میں ہاتھ بٹانے میں صرف کرتے تھے۔

سنِ شعور

اس طرح آپ سنِ شعور کو پہنچے: بچپن سے نوجوانی تک آپؐ کی زندگی ایک آئینے کی طرح صاف اور روشن نظر آتی ہے۔ آپؐ نے کبھی کسی ایسے کام میں شرکت نہیں کی جو کسی اعتبار سے بھی قبیح ہو۔ آپؐ کی زندگی سراپا تقدس اور نیک تھی۔ لہو و لعب، شرک و فسق، شراب اور جوا، ناچ رنگ، بدعہدی

اور ظلم، ان چیزوں کے قریب بھی آپ کبھی نہیں پھٹکے۔ پاک دامانی اور طہارتِ نفس کا یہ عالم تھا کہ کبھی کسی عورت کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ جب آپؐ سنِ بلوغ کو پہنچے آپؐ کے اوصاف یہ تھے:

صاحبِ مروّت، ذی حلم، فصیح اللسان، صادق القول، صادق الوعدہ۔ امین اور پارسا ایسے کہ آپؐ کے ہم عمروں میں کوئی بھی آپؐ کا مثل و نظیر نہ تھا۔ قوم میں آپؐ امینؐ کے لقب سے مشہور تھے۔[1]

فکرِ معاش

آپؐ بے انتہا غیور تھے۔ اگرچہ آپؐ کے ساتھ ابوطالب کا برتاؤ بالکل باپ کا سا تھا لیکن آپؐ کی حمیت نے اسے گوارا نہ کیا کہ آپؐ خود کچھ نہ کمائیں۔ خاندان کا پیشہ تجارت تھا، چنانچہ اسی پیشے کو اختیار کر لیا۔ آپؐ کے پاس کوئی ذاتی سرمایہ نہ تھا کہ اپنا کاروبار شروع کر سکتے لیکن آپؐ کی صداقت، دیانت اور امانت کی ساکھ اتنی زیادہ تھی کہ بے تکلف روپے والے لوگ اپنا مال آپؐ کے حوالے کر دیتے۔ سرمایہ ان کا ہوتا محنت آپؐ کی، آپؐ اس محنت اور سچائی کے ساتھ کام کرتے کہ ٹوٹے سے کبھی دوچار نہیں ہوئے۔ ہر مرتبہ نفع ہوا۔ آپ نفع بہ حصہ رسدی تقسیم کر لیتے۔

دیانت اور امانت

آپؐ کی دیانت اور امانت کا شہرہ مکّہ کی ایک دولت مند خاتون خدیجہ کے کانوں تک پہنچا۔ خدیجہ کے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا، تجارت کا سلسلہ کافی وسیع اور کامیاب تھا، وہ بھی خاندانِ قریش سے تعلق رکھتی تھیں۔ چند پشتوں کے بعد آپؐ کا اور اُن کا خاندان مل جاتا تھا۔

ایک روز خدیجہ نے آپؐ کو بلایا اور استدعا کی کہ میرا مالِ تجارت شام لے جائیے جو معاوضہ اجوی میں دوسروں کو دیتی ہوں اس سے دوگنا دوں گی۔ آپؐ نے منظور فرمالیا۔[2] خدیجہ کے غلام کے ساتھ مالِ تجارت لے کر آپ بصرہ تشریف لے گئے اور کامیاب و کامراں واپس آئے۔

پیامِ نکاح

غلام نے آں حضرتؐ کی سیرت و کردار کے بارے میں اپنے مشاہدات اپنی مخدومہ کے

۱: ابوالفداء   ۲. طبقات ابن سعد جزو اوّل

سامنے حرف بہ حرف بیان کیے[1]۔ وہ خود بھی جانتی تھیں کہ آپؐ مروت اور جواں مردی میں تمام قوم میں افضل، خلق میں سب سے اچھے، اختلاط و معاشرت میں سب سے شریف تر، باتیں کرتے میں سب سے بہتر، حلم و امانت میں سب سے بڑے، تکلم میں سب سے سچے، فحش و اذیت میں سب سے دور و نفور، نہ کبھی گالی گلوچ کرتے دیکھے گئے نہ کسی سے لڑتے جھگڑتے یا کسی پر شک و شبہ کرتے پائے گئے[2]۔

چنانچہ خدیجہ نے یہ باتیں سن کر پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنے نکاح کی درخواست کی[3]۔

شادی

آں حضرتؐ کو جب خدیجہ کا پیغام نکاح پہنچا تو آپؐ نے منظور کر لیا۔ اس وقت آپؐ ۲۵ برس کے تھے اور خدیجہ چالیس برس کی تھیں۔ واقعۂ اصحابِ فیل سے وہ پندرہ برس پہلے پیدا ہو چکی تھیں[4]۔ نکاح بتیس اونٹ کے مہر پر منعقد ہوا[5]۔

خانۂ کعبہ کی تعمیرِ نو

خانۂ کعبہ کی عمارت بہت بوسیدہ اور کمزور ہو چکی تھی۔ قریش نے اسے از سرِ نو تعمیر کرایا۔ جب حجرِ اسود تک تعمیر پہنچی تو عرب کے قبائل میں سے ہر ایک نے یہ چاہا کہ اس پتھر کو اس کے اصل مقام پر نصب کرنے کی سعادت اور فخر مجھے حاصل ہو۔ بات جب زیادہ بڑھی تو یہ فیصلہ ہوا کہ کل صبح جو شخص سب سے پہلے خانۂ کعبہ میں داخل ہو اُسے حَکَم مان لیا جائے اور وہ جسے چاہے اس ذمہ داری کا امین بنا دے۔ دوسرے روز آپؐ سب سے پہلے حرم کعبہ میں داخل ہوئے سب نے بے تامل آپؐ کو حَکَم بنا لیا۔ آپؐ نے چادر بچھائی، اس پر حجرِ اسود رکھا اور فرمایا: ہر قبیلے کا ایک ایک آدمی اس چادر کا کونہ پکڑ لے تاکہ یہ سعادت سب کے حصے میں آئے۔ چنانچہ اسی پر عملدرآمد ہوا۔ پھر آپ نے حجرِ اسود دستِ مبارک سے اٹھا کر اس کی جگہ رکھ دیا۔ اور اس طرح ایک بہت بڑی خونریزی سے عربوں کو اپنی ذات، دانائی اور تدبر کے باعث بچا لیا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!

۱: ابوالفدا۔ ۲: طبقات ابن سعد جزو اول ۳: ابوالفدا ۴: طبقات ابن سعد جزو اول۔ ۵: ابوالفدا

۲:

نبوّت، رسالت، ہجرت اور فتحِ مکّہ

تاریخِ آغازِ اسلام کے عہد بہ عہد کی داستان

نبوّت و رسالت

آنحضرتؐ نے جب شعور کی آنکھیں کھولیں تو ہر چہار طرف کفر و شرک ڈیرا ڈالے ہوئے تھے۔ خود کعبہ جس کی اساسِ توحید حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے اپنے دستِ مبارک سے رکھی تھی، عرب میں بُت پرستی کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ سینکڑوں بُت تھے جو اجلال و اکرام کے ساتھ خانۂ کعبہ میں متمکن تھے اور جن کی علی الاعلان پُوجا ہوتی تھی بُت پرستی کے علاوہ عیسائیت اور یہودیت کا پرچم بھی لہرا رہا تھا۔ کچھ ایسے بھی تھے جو دہریے تھے، نہ خدا کو مانتے تھے نہ بتوں کو۔ اطمینان سے زندگی بسر کرتے تھے اور کبھی یہ نہیں سوچتے تھے۔ اس دُنیا کو کس نے پیدا کیا ہے، کیوں پیدا کیا ہے؟ خدا اور بندے کے درمیان کیا رشتہ ہے۔ خدا بندہ سے کیا چاہتا ہے اور بندے کا کیا فرض ہے؟

لیکن ایک ہستی (آنحضرتؐ)، جو اس ماحول سے قطعاً غیر مطمئن تھی جس کا خاندان بُت پرست تھا۔ لیکن اُسے بت پرستی سے نفرت تھی جس کے وطن میں یہودی بھی تھے اور عیسائی بھی لیکن یہ دونوں بھی راہِ ہدایت سے اس درجہ بھٹک چکے تھے کہ آنحضرتؐ کا دامنِ توجہ اپنی طرف نہ کھینچ سکے، گمراہوں کے ہجوم میں گھر کر سرے سے راہِ ہدایت سے انکار کر دینا یہ بھی حضورؐ کا شیوہ نہیں تھا

آپؐ اپنے ماحول سے غیر مطمئن تھے، دل کے سکون سے محروم تھے۔ خدا تک پہنچنا چاہتے تھے مگر راستہ نہیں ملتا تھا۔ سیدھے راستے تک جانا چاہتے تھے لیکن ضلالت کے پتھر اور کانٹے عناں گیر ہوتے تھے اس صورتِ حال سے تنگ آکر آپؐ نے غارِ حرا کا رُخ کیا۔ آپ تھوڑا سا آذوقہ (پانی اور ستو) لے کر پہنچ جاتے۔ اور کئی کئی دن وہاں مقیم رہتے۔ آپؐ کا مشغلہ کیا تھا؟ —— غور و فکر اور عبرت پذیری!

رؤیائے صادقہ رویائے صادقہ بھی نبوت کا ایک جزو ہے منصبِ نبوت پر فائز ہونے سے پیشتر آپ کو رویائے صادقہ نظر آنے لگے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ رات کو آپؐ خواب دیکھتے اور صبح کو رات کی دیکھی ہوئی بات ہو بہو پوری ہو کر رہتی۔

اب آپؐ کا یہ معمول ہو گیا، وقت اور فرصت کا بڑا حصہ آپ غارِ حرا میں صرف کرتے جب تک آذوقہ کام دیتا وہیں رہتے۔ جب ختم ہو جاتا پھر شہر تشریف لے آتے اور یہاں سے پھر رسد لے کر آپؐ غارِ حرا میں چلے آتے۔

وحیٔ الٰہی ایک دن حسبِ معمول آپ غارِ حرا میں تشریف فرما تھے کہ ایک فرشتہ آپؐ کو نظر آیا یہ حضرت جبرئیل تھے۔ آپؐ سے کہا اقراء (پڑھ) آپؐ نے کہا، مجھے پڑھنا نہیں آتا۔ جبرئیل نے آپؐ کو سینے سے لگایا اور پھر کہا "پڑھ"۔ آپؐ نے پھر وہی جواب دیا۔ تیسری مرتبہ بھی یہی ہوا۔ آخر جبرئیل نے کہا:

اقراء باسم ربک الذی خلق خلق الانسان من علق اقراء وربک الاکرم الذی علم بالقلم علم الانسان مالم یعلم ۝	پڑھ! اس خدا کا نام جس نے کائنات کو پیدا کیا۔ جس نے آدمی کو گوشت کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔ پڑھ، تیرا خدا کریم ہے۔ وہ جس نے انسان کو قلم کے ذریعے علم سکھایا، وہ جس نے انسان کو یہ باتیں سکھائیں جو اسے معلوم نہ تھیں۔

آپؐ نے ان آیتوں کو دُہرایا، فرشتہ غائب ہو گیا۔ آپؐ دہشت زدہ سے ہو گئے اور گھر تشریف لائے۔ خدیجۃ الکبریٰ سے کہا "مجھے چادر اڑھا دو"۔ پھر جب ذرا سکون ہوا تو آپؐ نے سوچا

خدا کی طرف سے کتنی بڑی ذمہ داری آپؐ کو سونپی گئی ہے یعنی ایک جاہل قوم کو اسلام کی دعوت کفر اور شرک کا استیصال، اعلائے کلمۃ الحق کی گرانبار ذمہ داری نے آپؐ کو اور زیادہ خوف زدہ کردیا حضرتِ خدیجہؓ نے آپؐ کو تسلی دی اور کہا: آپ نیکی کرتے ہیں، صدقہ دیتے ہیں، مسکینوں کو کھلاتے ہیں، حاجت مندوں کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اندوہ گیں نہیں کرے گا۔"

ورقہ بن نوفل

پھر حضرت خدیجہؓ آپؐ کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لائیں، یہ عیسائی مذہب اختیار کر چکے تھے اور صحفِ سماوی کی تلاوت میں وقت گزارا کرتے تھے۔

ورقہ نے سارا ماجرا سن کر کہا۔ یہ وہی ناموس ہے جو موسیٰؑ پر اترا تھا۔ اور کہا: اے کاش! میں اس وقت تک توانا و تندرست رہتا جب آپؐ کی قوم آپؐ کو دیس نکالا دے گی۔ آپؐ نے فرمایا کیا ایسا ہوگا؟ ورقہ نے جواب دیا جو پیغامِ الٰہی لے کر آپ تشریف لاتے ہیں آپؐ سے پہلے بھی اسے لے کر جو آیا اس کے ساتھ یہی سلوک ہوا۔

وحی کے وقت آپؐ کی عمر قمری حساب سے ۴۰ سال ۶ ماہ ۱۲ دن تھی۔ اور شمسی حساب سے ۳۹ سال تین ماہ ۱۶ یوم (اگست ۶۱۰ء) ماہ رمضان مبارک، تاریخ ۲۵۔

آپ کی پہلی دعوت پر جو لوگ بے تامل مسلمان ہوئے وہ حضرت خدیجہؓ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت زیدؓ بن حارثہ اور حضرت علی مرتضیٰؓ تھے۔ یہ اسلام لانے والے کوئی اجنبی یا غیر نہیں تھے کہ چکنی چپڑی باتوں میں آکر کلمہ پڑھ لیا ہو۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے سامنے آنحضرتؐ کی چالیس سالہ زندگی کا ایک ایک صفحہ تھا۔ آپؐ کو خلوت و جلوت میں دیکھا تھا۔ آپؐ کے ہمراز اور غمگسار تھے۔ آپ کے کردار اور سیرت سے اچھی طرح واقف تھے۔ لیکن دعوتِ اسلام فوراً قبول کر لی کیونکہ انھیں یقین تھا کہ آپؐ کبھی جھوٹ نہیں بول سکتے۔ اس لیے کہ آپؐ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔

حضرت ابوبکرؓ نے اپنے دوستوں اور شناساؤں تک بھی اسلام کا پیغام پہنچایا چنانچہ آپؐ کی کوشش سے حضرت عثمان بن عفان، زبیر بن عوام، عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص، طلحہ بن عبیداللہ، ابوعبیدہ بن جراح، ابوسلمہ، ارقم مخزومی، عبیدہ بن حارث، سعید بن زید اور اُن

کی بیوی فاطمہ (حضرت عمرؓ کے بہنوئی اور بہن) نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ آں حضرتؐ ارقم کے گھر میں اپنے صحابہ کے ساتھ تشریف فرما ہوتے اور قرآن کی تعلیم دیتے تھے۔

غرض آہستہ آہستہ اسلام نے کفرستان میں پھلنا پھولنا شروع کر دیا۔

لیکن قریش کو اور مشرکینِ مکّہ کو یہ نیا دین پسند نہ آیا۔ انھوں نے آپؐ کی ایذا رسانی پر کمر باندھ لی اور توہین و تحقیر، ساتھ ہی ساتھ تشدّد اور ایذا دہی کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ آخر آپؐ کا حکم پاکر چند مسلمانوں نے ہجرت کے ارادے سے حبش کا رُخ کیا۔ پہلا قافلہ بارہ صحابہ پر اور دوسرا اسّی اشخاص پر مشتمل تھا۔ حضرت ابوطالبؓ اور حضرت خدیجہؓ کے انتقال نے معاندین کے جوش و خروش میں اور اضافہ کر دیا۔ آپؐ طائف تشریف لے گئے۔ کون تھا جسے اسلام کی دعوت نہ دی ہو۔ لیکن جواب پتھروں، گالیوں اور ایذا رسانیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

آخر آپؐ مکّہ واپس تشریف لائے۔ یہاں پھر تبلیغ دینِ الٰہی میں مصروف ہو گئے۔ اسی اثنا میں مدینہ کے قبائل اوس و خزرج کے کچھ لوگ حج کے ارادہ سے مکّہ وارد ہوئے۔ انھوں نے جو آپؐ کا جمالِ جہاں آرا دیکھا اور نطقِ گوہر بار سے شاد کام ہوئے۔ تو قبولِ اسلام پر مجبور ہو گئے۔

مکّہ اپنے فرزندِ جلیل کے لیے دل تنگ ثابت ہوا۔ لیکن مدینے نے آغوشِ عقیدت اس پردیسی کے لیے کھول دی۔ اوس اور خزرج مدینے کے سب سے زیادہ بااثر قبیلے تھے۔ اسلام وہاں جنگل کی آگ کی طرح پھیلنے لگا۔

آخر آپؐ نے بھی ہجرت کا ارادہ فرمایا اور حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ لے کر اور حضرت علیؓ کو اپنی جگہ سُلا کر مدینے تشریف لے گئے۔

یہ ایک دَور کا خاتمہ اور ایک دَور کا آغاز تھا۔

مدینے میں ورود

جمعہ کے روز ۲۲۔ جولائی ۶۲۲ء کو[1] آپؐ مدینے میں تشریف فرما ہوئے[2] انصارِ مدینہ نے دیدہ و دل فرشِ راہ کیے اور کاروانِ نبویؐ کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ ہر شخص کی تمنا یہ تھی کہ آپؐ اس کے ہاں قیام فرمائیں لیکن آپؐ نے فرمایا اونٹنی کو چلنے دو۔ وہ حضرت ابوایوبؓ کے مکان کے سامنے رک گئی۔ آپؐ وہیں اتر پڑے۔ فرمایا "المساء

۱: بعض روایتوں میں دوشنبہ کا دن ہے۔ ۲: طبری

مع رحلہ ذاتِ نبویؐ کی میزبانی کا شرف اس طرح حضرت ابوایوبؓ کے حصے میں آیا۔ سعد بن زرارہ نے رسول اللہؐ کی اونٹنی کی نکیل پکڑلی، وہ ان کے ہاں رہی ــــ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قیام ــــ ابوایوب کے ہاں سات مہینے رہا[1]۔

کچھ دنوں کے بعد حضرت علیؓ بھی تشریف لے آئے، حضرت ابوبکرؓ کا خاندان بھی آگیا۔ زید بن حارثہ اور ابورافع، حضرت فاطمہؓ، حضرت ام المومنین اور بنتِ زمعہ اور اسامہؓ بن زید کو لے آئے۔ آپؐ نے ان سب کو حارثہ بن نعمان کے گھر پر اتارا[2]۔

مسجدِ نبویؐ

آں حضرتؐ نے مسجدِ نبوی کی تعمیر کے لیے ایک زمین خریدی، حضرت ابوبکرؓ نے اس کی قیمت ادا کی۔ پھر رسول اللہؐ نے اینٹیں لانے کا حکم دیا۔ اینٹیں لائی گئیں مسجد بننی شروع ہوئی۔ نیو پتھر سے اٹھائی گئی، ستون درختوں کے تنوں کے بنائے گئے اور چھت کھجور کی شاخوں سے پاٹی گئی۔

پیمانِ اخوّت

مدینہ آکر آپؐ نے انصار اور مہاجرین کے درمیان عقدِ مواخات یعنی پیمانِ اخوت استوار کرایا۔

انصار نے اس پیمانِ وفا کو اس شان سے نباہا کہ جائداد و املاک تک میں مہاجرین کا حصہ رکھ لیا۔ وراثت بھی انھیں دینے لگے، بعض نے تو یہاں تک کیا کہ اگر دو بیویاں تھیں تو کسی ایک کو کسی مہاجر بھائی کے حق میں طلاق دینے کو تیار ہو گئے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایسا ہونے نہیں پایا لیکن خلوصِ نیت کا ثبوت تو مل گیا۔

پھر جب مہاجرین کی حالت سدھر گئی، وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے تو ان سہولتوں سے وہ از خود دست بردار ہو گئے۔ لیکن انصار کی طرف سے کسی قسم کی بے لطفی یا کوتاہی کبھی پیش نہیں آئی۔

مکّہ کے مہاجر یہاں تباہ حال آئے تھے، نہ اُن کے پاس گھر تھا، نہ زر، نہ کھیت، نہ روٹی نہ روزگار، نہ اطمینان، لیکن یہ مہاجر جب ایک ایک انصاری کے بھائی بن گئے تو انھیں سب

۱: طبقات ابن سعد۔ ۲: طبری۔ ۳: فتوح البلدان جزو اوّل۔

پھول گیا۔

مگر بھی، روزی بھی، اطمینان بھی، کیا دُنیا کی تاریخ اسلام کے سوا اس ایثار اور مواخات کی کوئی نظیر پیش کرسکتی ہے؟

کلاّ ثم کلاّ!

حقیقت اور امر واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی بنیادی تعلیمات نے مسلمانوں کے دل میں کچھ ایسا گھر کرلیا ہے کہ گو وہ دوسرے اعتبارات سے پست اور مائل بہ زوال ہوتے گئے، لیکن ان تعلیمات کے اثرات ان کے کردار اور عمل سے کبھی محو نہیں ہوئے، آج بھی دُنیا کی ترقی یافتہ قوموں میں اونچ نیچ کا سلسلہ قائم ہے اور عبادت گاہیں تک اس سے مستثنیٰ نہیں، لیکن اسلام کی اخوّت اور مساوات عامہ بدستور قائم ہے۔:

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

۳ :

غزواتِ نبویؐ

رسالت کے اسباب و محرکات

اسلام کا جہاد اور غیر مسلموں کی جنگ دو بالکل الگ چیزیں ہیں۔ اسلام کے جہاد کا مقصد حُبِّ جاہ، طلبِ دُنیا، حصولِ سیم و زر نہیں ہے۔ یہ صرف جاں سپاروں کے لیے ہے کہ خدا کا بول بالا ہو مظلوم کی اعانت ہو، حق کی نصرت ہو، حق کی تائید کی جائے۔ ظلم، عدوان اور فتنے کا خاتمہ کیا جائے۔ امن امان اور سکون کی سلطانی قائم کی جائے۔ جارحانہ حملوں کی مدافعت کی جائے اور ملک گیری کی ہوس کے سامنے سدِ سکندری بن کر کھڑا ہو جائے۔ قرآن میں ہے:

اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا وان اللہ علیٰ نصرھم لقدیر الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللہ ○	جن لوگوں سے لوگ برسرِ جنگ ہوتے ہیں انھیں اس بنا پر جنگ کرنے کی اجازت دی گئی کہ وہ مظلوم ہیں اور خدا ان کی مدد پر قادر ہے۔ وہ لوگ جو اپنے گھروں سے صرف اس لیے نکال دیے گئے کہ وہ کہتے تھے ہمارا پروردگار خدا ہے

حدیث میں مروی ہے:

من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا	جو شخص اس لیے لڑتا ہے کہ خدا کا بول بالا ہو۔

جہاد کی حالت میں بھی بار بار خدا کو یاد کرنے یعنی دُنیا سے رُو گرداں ہو کر خدا سے لَو لگانے، نماز باجماعت ادا کرنے یعنی جنگ و پیکار صرف خدا کے لیے کرنے کی ہدایت کی گئی۔ بار بار رسول اللہؐ نے فرمایا کہ جو شخص حصولِ زر اور مالِ غنیمت کے لیے جہاد کرتا ہے اس کا جہاد مقبول نہیں۔

غزوات کی تعداد

آں حضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بنفسِ نفیس جن جنگوں میں شرکت فرمائی، جو آپ کے حسب ہدایت لڑی گئیں ان کی تعداد میں اختلاف ہے، لیکن اگر امعانِ نظر سے دیکھا جائے اور تحقیق کی نگاہ سے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ غزواتِ نبویؐ کی تعداد بہت کم ہے اور یہ مختصر تعداد بھی اس لیے ہے کہ کافروں اور مشرکوں نے جنگ کو ناگزیر بنا دیا۔ خود یورش کی، حملے کیے، مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کی تدبیریں کیں، معاہدے توڑے، سازشیں کیں اور ننگِ انسانیت جرائم کا ارتکاب کیا۔

اس کے باوجود ان ناگزیر جنگوں میں بھی رسول اللہؐ نے جنگ کے دوران اور جنگ کے بعد بھی ایسے اقدامات فرمائے جن سے جاہلیت کی تاریخ خوب ناآشنا تھی۔ یہ اقدامات اس لیے فرمائے گئے کہ آپؐ رحمۃ اللعالمینؐ تھے۔ آپؐ نے اسیرانِ جنگ کے ساتھ عزیزوں سے بڑھ کر برتاؤ کیا۔ آپؐ نے جنگ کے دوران بوڑھوں، بچّوں اور عورتوں کے قتل کی ممانعت فرمائی۔ آپ نے ہرے بھرے درختوں کو کاٹنے لہلہاتے کھیتوں کے اجاڑنے اور غیر جنگجو لوگوں پر حملہ آور ہونے کی ممانعت فرمائی۔ آپؐ نے اللہ کے بندوں کا ۔ خواہ ان کا دین اور عقیدہ کچھ بھی ہو ۔ خون بہانے سے حتی الامکان پورا پورا اجتناب فرمایا۔ آپؐ نے جنگ کی طرف کبھی پیش قدمی نہیں کی۔ ہاں جب جنگ دروازے تک آگئی تو آپؐ نے ضرور مقابلہ کیا۔

صرف پانچ جنگیں ایسی ہوئی ہیں جن میں درحقیقت لڑائی کی نوبت پہنچی۔ مؤرخینِ عرب و یورپ نے یہاں تک دعویٰ کیا ہے کہ ۲۷ مہمیں خود آنحضرتؐ کی سرکردگی میں واقع ہوئیں اور ۷۴ ایسے اشخاص کی ماتحتی میں جنھیں آنحضرتؐ نے سردار بنا کر بھیجا تھا۔ اس حساب سے کل ۱۰۱ مہمیں ہوئیں۔ یہ تعداد ابن سعد کاتب الوحی نے لکھی ہے (دیکھو قسطلانی ج ۶ ص ۳۸۶) ابن اسحٰق نے آں حضرتؐ کی مہمات کی تعداد تو

۲۷ ہی بیان کی ہے مگر دیگر مہموں کی تعداد صرف ۳۸ لکھی ہے (دیکھو ابن ہشام صفحہ ۹۷۲-۹۷۳) ابو یعلیٰ نے جابر سے روایت کی ہے کہ صرف ۲۱ مہمیں پیش آئیں۔ مگر زید بن ارقم جو سب سے زیادہ مستند راوی ہیں غزوات کی تعداد ۱۹ بیان کرتے ہیں۔ مہموں کی تعداد جو بیان ہوئی ان میں واقعی جنگوں کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱: بدر

۲: احد

۳: احزاب

۴: خیبر

۵: حنین

فتح مکہ کے وقت کوئی جنگ نہیں ہوئی، وہ صلح سے مسلمانوں کے حوالے کر دیا گیا۔

ان مہموں میں آنحضرتؐ نے اپنے آپ کو اور مسلمانوں کو بچانے کے لیے دشمنوں سے مدافعانہ جنگ کی۔ دشمن کا نقصان بدر میں ۴۹ ۔ احد میں ۲۰ ۔ احزاب میں ۳ ۔ خیبر میں ۹۳ اور حنین میں بھی ۹۳ تھا۔ مسلمانوں کی طرف کا نقصان علی الترتیب ۱۴، ۴، ۷، ۵ اور ۷ تھا۔ ان جنگوں میں کُل اموات مسلمانوں کی طرف سے ۱۲۹ اور دشمنوں کی طرف سے ۲۵۸ ہوئیں[1]۔

ہم بتا چکے ہیں کہ آنحضرتؐ نے بہ نفسِ نفیس جن جنگوں میں شرکت فرمائی ان کی تعداد بہت کم ہے ــــ گو تعداد کم ہے، لیکن اس میں کوئی شُبہ نہیں کہ یہ چند جنگیں بڑی فیصلہ کُن اور انقلاب آفریں ثابت ہوئیں۔ انھوں نے تاریخ کا رُخ بدل دیا۔ اگر یہ برپا نہ ہوئی ہوتیں تو شاید اسلام کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔

ان جنگوں نے یہ ثابت کر دیا کہ نبی امیؐ نے اپنی امت کو جس سانچے میں ڈھالا تھا وہ کیا تھا! اور یہ کہ حق کے سامنے باطل حد درجہ طاقت ور ہونے کے باوجود کیوں نہیں ٹھہر سکا۔

اب ہم مختصر طور پر ان چند جنگوں کا تذکرہ کریں گے:

۱: تحقیق الجہاد۔

قریش اور مشرکینِ مکّہ کو یہ بات بہت گراں گزر رہی تھی کہ مسلمان ان کے پنجۂ ستم سے بچ کر مدینے پہنچ گئے اور وہاں امن و آسائش سے رہنے لگے، چنانچہ وہ جنگ کی تیاریاں کرنے لگے۔ اُن کا مقصد یہ تھا کہ مدینے پر یورش کر کے مسلمانوں کا خاتمہ کر دیں۔

جنگِ بدر

مدینے سے چند میل کے فاصلے پر ایک مقام بدر ہے یہ مشہور اور تاریخی لڑائی یہیں برپا ہوئی۔ مشرکینِ مکّہ نے مسلمانوں کا قلع قمع کرنے کے ارادے سے مدینے پر یورش کی۔ ابوسفیان اس لشکر کا (جو نو سو پچاس افراد پر مشتمل تھا[1]) سردار تھا۔ آں حضرتؐ تین سو افراد[2] کے ساتھ اس ریلے کو روکنے کے لیے نکلے۔

مشرکین کے پاس روپیہ تھا، اناج تھا، ہتھیار تھے، گھوڑے تھے، اونٹ تھے، چھنے ہوئے سرد و گرم چشیدہ جنگ آزما سورما تھے، پھر انھیں اپنے اوپر، اپنے وسائل پر اعتماد تھا اور یقین تھا کہ حسبِ ضرورت کمک بھی مل جائے گی۔

اور دوسری طرف ——— تین سو نفوس تھے جن کے پاس صرف دو گھوڑے تھے، زرہیں ٹوٹی ہوئی، ہتھیار نامکمل ——— لیکن اُن میں اور اِن میں ایک فرق تھا ——— بہت بڑا فرق ——— وہ زندگی کو عزیز رکھتے تھے، یہ زندگی پر موت کو ترجیح دیتے تھے۔ وہ اپنے دست و بازو پر نازاں تھے اور یہ نصرتِ الٰہی پر بھروسہ رکھتے تھے۔ وہ اپنے ساز و سامانِ جنگ پر اکڑ رہے تھے، یہ اپنی جاں نثاری اور فداکاری پر نازاں تھے۔

جنگ شروع ہونے سے قبل سعد بن عبادہ نے رسولِ اکرمؐ کو مخاطب کر کے کہا تھا: اگر آپؐ ہمیں سمندر میں کود پڑنے کا حکم دیں تو ہم کود پڑیں گے۔"

اور حضرت مقداد نے عرض کیا تھا: ہم داہنے بائیں آگے پیچھے حضرت کے ساتھ لڑیں گے۔

۱: ابوالفداء (دوسری روایتوں میں یہ تعداد گیارہ سو ہے)

۲: طبری (دوسری روایتوں میں ۳۱۳ نفوس کی تعداد بتائی گئی ہے)

جنگ شروع ہوئی۔

یہ عجیب و غریب جنگ تھی۔ یہ کفر و اسلام کی جنگ تھی۔ حق و باطل کی جنگ تھی، بھائی بھائی کے مقابلے میں تلوار کھینچے ہوئے تھا، باپ بیٹے کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔ بیٹا باپ کے سامنے نبرد آزما تھا۔

ایک طرف عصبیت اور جاہلیت تھی، دوسری طرف حق اور اسلام!

جنگ ختم ہوئی۔

کفر کا لشکر ہار گیا، اسلام کے جاں نثار جیت گئے۔

قریش کے بڑے بڑے سردار اس جنگ میں کام آئے۔ شیبہ، ابوجہل، عتبہ، زمعہ، امیہ ابن خلف۔ یہ وہ لوگ تھے جن کی قوت و طاقت، دبدبہ و سطوت، فنونِ جنگ کی مہارت کا ڈنکا بجتا تھا۔ انھیں خود اپنے اوپر ناز تھا۔ ان پر اُن کے وطن کو، قوم کو اور قبیلے کو فخر تھا۔ لیکن یہ ناز اور فخر رائگاں گیا۔ یہ مارے گئے اور قریش کی کمر ٹوٹ گئی۔

جو لوگ گرفتار ہوئے وہ بھی چوٹی کے لوگ تھے:

عباس ــــ آں حضرت کے چچا

عبدالمطلب کے بیٹے عقیل ــــ حضرت علیؓ کے بھائی اور ابوطالب کے صاحبزادے۔

اور بھی کئی سربرآوردہ اصحابِ قریش گرفتار ہوئے۔

حُسنِ سلوک جو لوگ گرفتار ہوئے آنحضرت کے حکم کے بموجب اُن کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا گیا۔ جن مسلمانوں کی تحویل میں یہ قیدی رکھے گئے اُن کی کیفیت یہ تھی کہ خود فاقہ کرتے تھے، بھوکے رہتے تھے مگر اپنے قیدیوں کو پیٹ بھر کر کھانا کھلاتے تھے۔

یہ جنگ ۱۷ رمضان ۲ھ ہجری کو بروز جمعہ برپا ہوئی[1]

جنگِ اُحد

جنگِ بدر کے مقتولین کا انتقام لینے کے لیے ابوسفیان نے لوگوں کو بھڑکایا اور پہلے سے زیادہ زور

---

[1] ابوالفداء۔

کے ساتھ مشرکین مکہ نے ابوسفیان کی سربراہی میں تیاریاں شروع کردیں۔

تین ہزار قریش جن میں سات سو زرہ پوش اور دو سو سوار تھے اور باقی پیادے ابوسفیان کی سرکردگی میں نکلے، ابوسفیان کی بیوی ہندہ بھی ساتھ تھی۔ اس کے ساتھ پندرہ عورتیں مقتولین بدر پر روتی اور مسلمانوں سے لڑنے کے لیے مشرکوں کو برانگیختہ کرتی تھیں۔ بدھ کے روز ۴ شوال ۳ھ[1] کو یہ لوگ مدینے کے قریب مقام ذوالحلیفہ میں اترے[2]۔ مسلمانوں کا لشکر بھی مقابلے کے لیے نکلا جو سات سو نفوس پر مشتمل تھا، اور کوہ احد پر خیمہ زن ہوا۔ اس لشکر میں سو آدمی زرہ پوش اور باقی بے زرہ اور پا پیادہ تھے کسی کے پاس دو شخصوں کے سوا گھوڑا نہ تھا[3]۔

تعداد کا تفاوت

اس جنگ میں بھی تعداد کا فرق بہت زیادہ تھا، کہاں تین ہزار کہاں سات سو لیکن مسلمانوں کے حوصلے میں کوئی فرق نہیں آیا۔

گھمسان کی لڑائی ہوئی مشرکین کے پاؤں اکھڑ گئے، پہاڑ کی پشت پر جو دستہ متعین تھا وہ اپنی جگہ چھوڑ کر مالِ غنیمت کی طرف بڑھا۔ موقع دیکھ کر خالد بن ولید (جو اب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے) حملہ آور ہوئے اور مسلمانوں کی فتح شکست سے تبدیل ہوگئی۔ اس جنگ میں رسول اللہ ﷺ بھی زخمی ہوئے، کچھ دیر کے لیے یہ یقین ہوگیا کہ آپ شہید ہوگئے[4]۔ بڑے بڑے صحابہ نے ہمت ہار دی حضرت عمرؓ تک تلوار پھینک کے پہاڑی پر چڑھ گئے، کہ اب ساری تگ و دو سے کیا حاصل[5]۔ ایک انصاری ابن نظر نے کہا۔ اب زندگی بے لطف ہے تلوار کھینچی اور لڑتے لڑتے شہید ہوگئے[6]۔ حضرت علیؓ بدستور کفار و مشرکین کے مقابلے میں جمے رہے[7]۔ جب کعب بن مالک نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھ کر اعلان کیا کہ آپ زندہ ہیں تو پھر مسلمان پورے حوصلے کے ساتھ لڑنے لگے۔ کفار نے سارا زور اسی طرف لگا دیا کہ آپ ﷺ کو شہید کردیں، لیکن انصار پروانہ وار آپ پر قربان ہوتے رہے مہاجرین کا بھی یہی حال تھا حضرت طلحہ تلوار کا وار ہاتھ پر روکتے تھے، ایک ہاتھ کٹ گیا تو سینہ تان کر آگے آکر جم گئے کہ فخر کائنات چشم زخم سے محفوظ رہیں[8]۔

۱: مطابق ۶۲۴ع   ۲-۳-۴: ابوالفدا۔   ۵-۶-۷-۸: الفاروق

۹: الفاروق۔

حضرت حمزہ کی شہادت

اس جنگ میں آنحضرتؐ کے چچا حضرت حمزہ بھی شہید ہوئے ابوسفیان کی بیوی اور امیر معاویہ کی ماں ہندہ نے جوشِ عداوت میں آپ کا کلیجہ چبا لیا۔

مسلمان اس جوش و خروش سے دوبارہ آمادۂ جنگ ہوئے کہ قریش کو جنگ جاری رکھنے کی ہمت نہ پڑی، وہ مکہ واپس چلے گئے[1]۔

صلح حدیبیہ

ماہ ذی قعدہ سنہ ۶ھ میں[2] رسول اللہؐ عمرہ کے ارادے سے نکلے۔ قربانی کے ستر جانور آپ کے ساتھ تھے[3]۔ مہاجرین اور انصار کی تعداد ۱۴سو تھی۔ سب احرام بہ ارادۂ حج باندھے ہوئے تھے۔

لیکن مشرکین مکہ نے مزاحمت کی، قریب تھا کہ لڑائی چھڑ جائے لیکن پھر یہ معاہدہ ہوا کہ آپؐ آئندہ سال حج کے لیے تشریف لائیں اس سال واپس جائیں۔ جو مسلمان مکہ میں ہیں وہ مدینہ نہیں جائیں گے، مدینہ میں جو ہیں وہ اگر مکہ میں رہنا چاہیں تو انھیں منع نہیں کیا جائے گا۔ مکہ کا کوئی مسلمان مدینے چلا جائے تو اسے واپس مکہ بھیج دیا جائے۔ رسول اللہؐ نے اس معاہدہ پر بڑی سختی سے عمل کیا لیکن خود قریش کی طرف سے پھر اس کی اجازت ہوگئی کہ مکے کا جو مسلمان چاہے مدینے جا سکتا ہے۔

اس معاہدہ کے بعد مشرکین کو مسلمانوں کی سیرت اور کردارِ جمیل کے مشاہدہ کا زیادہ موقع ملا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قبائل میں تیزی کے ساتھ اسلام پھیلنے لگا اور اس طرح مسلمانوں کو عملی اور اخلاقی طور پر بہت فائدہ پہنچا۔

یہودیوں کا استیصال

رسول اللہؐ نے مدینہ کے یہودیوں کے ساتھ بہت رعایت کی، انھیں مساوی حقوق عطا فرمائے۔ ان کی مذہبی آزادی کا احترام کیا، ان کے اندرونی معاملات میں کسی قسم کی بھی مداخلت سے ہمیشہ احتراز کیا۔

لیکن یہودی ہمیشہ مسلمانوں سے اور رسول اللہؐ سے جلتے رہے۔ وہ صلح پر کبھی قائم نہیں

۱: ابوالفداء۔ ۲: طبری۔ ۳: ابوالفداء۔

رہے۔ انھوں نے معاہدات کا کبھی احترام نہیں کیا۔ انھوں نے محض مسلمانوں کو زک دینے کے لیے مشرکینِ مکہ سے ساز باز کا سلسلہ جاری رکھا۔ وہ مسلمانوں کے شہر میں رہتے تھے لیکن مسلمانوں کے دشمنوں کے یارِ غار بنے ہوئے تھے انھیں ہر طرح کی خبریں پہنچاتے رہے، اُن کی ہر طرح سے مدد کرتے تھے۔

سنہ۴ھ میں آپؐ نے ان کی (یہود کی) کھلی ہوئی بدعہدی اور غداری[۱] کے باعث بنو نضیر کا محاصرہ کرلیا۔ انھوں نے اس شرط پر صلح چاہی کہ وہ ترکِ سکونت کرلیں گے۔ چنانچہ صلح کرلی گئی اور وہ آپؐ کی اجازت سے خیبر چلے گئے۔

سنہ۵ھ میں آپؐ نے بنو قریظہ کا محاصرہ کیا۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے غزوۂ خندق یا جنگِ احزاب میں (معاہدہ کے برعکس) مشرکینِ مکہ کو (فوجی) مدد دی تھی[۲]۔ پھر جب آپؐ ادھر سے گزرے تو معذرت کے بجائے گالیوں پر اتر آئے۔

آخر خود انہی کے مقرر کیے ہوئے حکم نے فیصلہ کیا کہ جو لوگ ہتھیار بند ہیں وہ قتل کردیے جائیں عورتیں، لونڈی اور بچے غلام بنالیے جائیں۔ ان کا مال مسلمانوں میں تقسیم کردیے جائیں[۳]۔ یہ ظاہر یہ فیصلہ سخت ہے لیکن حکم نے یہ فیصلہ یہود کی مذہبی کتاب توریت کے مطابق کیا تھا۔ اس لیے انھیں بے چون وچرا ماننا پڑا[۴]۔

فتحِ خیبر اب یہودیوں کا مرکز خیبر تھا، بنو نضیر بھی یہاں پہنچ چکے تھے، وہ یہودیوں کو اسلام، داعیِ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا کرتے تھے۔ یہاں کے یہودی مال دار بھی تھے اور طاقتور بھی، مسلمانوں سے خائف بھی، اور اُن کے بدترین دشمن بھی آخر انھوں نے فیصلہ کرلیا کہ مسلمانوں سے لڑیں گے، اور جو کام مشرکینِ مکہ سے نہ ہوسکا وہ کریں گے۔ یعنی مسلمانوں کا استیصال —— اسے خود اپنے مال و زر اور قوت و طاقت کے بل پر انجام دیں گے اور مسلمانوں کا قلع قمع کرکے دم لیں گے۔

۱: فتوح البلدان بلاذری اوّل۔

۲، ۳، ۴: فتوح البلدان بلاذری جلد اوّل۔

غالب علی کل غالب علی ابن ابی طالبؓ

یہود کی فوجی تیاری اور حملہ آور ہونے کے ارادے کی جب آپؐ کو اطلاع ملی، تو آپؐ ماہِ محرم ۷ھ میں تقریباً[1] ڈیڑھ ہزار مسلمانوں کو لے کر خیبر کی طرف بڑھے۔ یہودیوں کے پاس چھ قلعے تھے اور بیس ہزار جنگ جو سورما[2] جنگ شروع ہوئی۔ یہاں کے باشندے ایک عرصے تک آپ کے مقابلے پر جمے رہے۔ رسول اللہؐ نے ایک ماہ تک ان کا محاصرہ جاری رکھا۔[3] یہودیوں کے پاس جو قلعے تھے، ان میں قلعہ قموص نہایت استوار اور محفوظ تھا۔ یہودیوں کا مایہ ناز بہادر پہلوان مرحب یہیں رہتا تھا۔ اس قلعے کو سَر کرنے کی کوشش حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور کئی جلیل القدر صحابہ نے کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ دوسرے روز ـــــ "آنحضرتؐ نے فرمایا کل میں ایسے شخص کو علم دوں گا جو قلعہ فتح کیے بغیر واپس نہ آئے گا۔ دوسرے دن حضرتؐ نے علیؓ کو علم دیا۔ علیؓ نے مرحب کو قتل کر دیا۔ قلعے کا دروازہ اکھاڑ کے پھینک دیا۔ قلعے میں خود بھی درآئے اور مسلمان بھی داخل ہوئے"۔[4]

اس شکست کے بعد یہودیوں نے اس درخواست کے ساتھ ـــــ "صلح کرلی کہ ہمارے خون معاف کیے جائیں ہمارے بال بچّے قید نہ کیے جائیں ہمیں باغبانی اور آبادکاری کا کام خوب آتا ہے۔ ہمیں یہیں رہنے دیجیے۔ آپؐ نے ان کی درخواست منظور فرمائی اور بٹائی پر معاملہ کرلیا"۔[5]

یہودیوں کا اعتراف

رحمۃ للعالمینؐ نے خیبر کے یہودیوں کی گزشتہ شرارتوں اور خیانتوں کو معاف کر دیا۔ سارے کھیت اور نخلستان اس شرط پر انھیں واپس کردیے کہ آدھے تمھارے اور آدھے ہمارے ـــــ ہر سال جب بٹائی کا وقت آتا تو عبداللہ بن رواحہ تخمینہ کرنے خیبر جاتے اور آدھوں آدھ کر دیتے۔ ایک دفعہ یہود نے عبداللہ کو رشوت دینی چاہی[6]۔ انھوں نے کہا اے خدا کے دشمنو! کیا تم مجھے حرام خوری کا لالچ دیتے ہو؟ خدا کی قسم میں تمھارے پاس اس شخص کی طرف سے آیا ہوں جسے میں دنیا میں سب سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں اور تم سے مجھے نفرت ہے، تاہم مجھے اس بات پر نہ تمھاری دشمنی نے آمادہ کیا ہے نہ اس کی محبت نے کہ تمھارے

۱: ابو الفدا ۲: طبری ۳: فتوح البلدان ۴: طبری ۵: فتوح البلدان۔ ۶: یہود نے اپنی عورتوں کے زیور جمع کرکے رشوت میں پیش کی۔ ۷: (ماجاء فی المساواۃ)

ساتھ عدل کا برتاؤ نہ کروں۔ یہود نے (متاثر ہو کر) کہا۔ زمین اور آسمان اسی عدل پر قائم ہیں۔[1]

فتح مکہ مسلمانوں کی قوت و طاقت میں اضافہ ہو گیا تھا، اُن کی مالی حالت سُدھر چکی تھی۔ ان کی تعداد ہزاروں کیا بلکہ لاکھوں تک پہنچ چکی تھی۔ وہ اب ایک مستقل قوت تھے، مستقل طاقت تھے، ان کا وجود عزت اور احترام کے ساتھ معاصرین نے تسلیم کر لیا تھا۔ ان کی صداقت، راست بازی، جمالِ کردار اور جمالِ سیرت کے لوگ ثنا خواں اور مدّاح تھے۔ وہ کبھی کسی معاملے میں حق و صداقت کا دامن نہیں چھوڑتے تھے۔ خواہ انھیں نفع ہو یا نقصان!

اب تک مسلمان صلح حدیبیہ پر قائم تھے۔ تطہیرِ کعبہ ان کا مقصدِ زندگی تھا مگر اس مقصد کو بھی وہ عہد شکنی کر کے حاصل کرنا نہیں چاہتے تھے۔

لیکن خود مشرکینِ مکہ نے عہد شکنی کی، معاہدے کے خلاف قریش نے مسلمانوں کے حلیف قبیلہ خزاعہ کے لوگوں کو اپنے حلیف بنی بکر کی تائید میں قتل کر دیا۔ خزاعہ کے لوگ آپؐ کے پاس فریاد کناں آئے۔[2] آپ نے قریش سے کہلوایا کہ یا تو وہ فسخِ عہد کا اعلان کریں یا خوں بہا ادا کریں اور بنو بکر سے تعلق منقطع کر لیں۔ قریش نے فسخِ عہد کو ترجیح دی۔ پھر جب انھوں نے جنگ کا تصوّر کیا تو ابوسفیان کو تجدیدِ عہد کے لیے بھیجا۔ لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا آپؐ نے تجدیدِ عہد نہیں کی۔

رسول اللہؐ ـــــــــ دس رمضان ۸ھ کو دس ہزار کے لشکرِ جرّار کے ساتھ مکّہ کی طرف بڑھے![3]

قریش میں اس لشکرِ گراں کو روکنے کی تاب نہ تھی۔ راستے میں ابوسفیان ملے۔ حضرت عباسؓ کی سفارش سے (حضرت عمرؓ کی مخالفت کے باوجود) رحمت للعالمینؐ نے ان کی جان بخشی کی۔ جو اسلام کا سب سے بڑا دشمن تھا جو داعئ اسلام کی جان کا گاہک تھا، آج اس کی تمام گزشتہ خطائیں معاف کر دی گئیں یہی نہیں ہاری ہوئی قوم کے ہارے ہوئے اور دل شکستہ سردار ابوسفیان کی عزت افزائی فرمائی جا رہی تھی۔ ارشاد ہوا:

"جو خانۂ کعبہ میں پناہ گزیں ہو جائے، جو ابوسفیانؓ کے گھر میں خانہ نشین ہو جائے اس سے کوئی باز پرس کی جائے۔

۱: فتوح البلدان اوّل ۲: ابوالفداء ۳: ابوالفداء و طبری ۴: فتوح البلدان ۵، ۶: طبری۔

مسلمانوں کا لشکر فاتحانہ شان سے مکہ میں داخل ہوا۔ کسی کی ہمت نہ پڑی کہ مزاحمت کرتا۔ کسی کا حوصلہ نہ ہوا کہ سامنے آتا ــــ اللہ نے اپنے رسول ؐ کو فتح عنایت فرمائی۔ لڑائی کی نوبت نہ آئی ۔[1]

عفوِ عام

آج ۸ سال کی جلاوطنی کے بعد خانۂ کعبہ میں وہ مہاجر داخل ہوا جسے اس کے اہلِ وطن نے گالیاں دی تھیں، جس کے راستے میں کانٹے بچھائے تھے جس کے جسمِ اطہر پر اونٹ کی اوجھڑیاں ڈالی تھیں اس کے خلاف بار بار صف آرا ہوتے تھے۔ جسے زخمی کیا تھا، لہولہان کیا تھا، جس کا بائیکاٹ کیا تھا، جس کا گھر چھین لیا تھا جس کے قتل کے منصوبے تیار کیے تھے، اور اس مہاجر ؐ کے ساتھ وہ مہاجرین بھی تھے جنھیں محض قبولِ اسلام کے جرم میں جلتی ہوئی ریت پر لٹا دیا گیا تھا، جن کے سینے پر گرم گرم پتھر رکھے گئے تھے۔ جنھیں نیزوں سے چھیدا گیا تھا۔ جن کے عزیزوں کو قتل کیا گیا تھا، جن کی عورتوں کو بے آبرو کیا گیا تھا۔ جن کے بچوں کو چھین لیا گیا تھا۔ جن پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا اور جنھیں ترکِ وطن پر مجبور کر دیا گیا تھا۔

آج وہ مہاجر اپنے آقا کے ساتھ فاتح اور کشور کشا کی حیثیت سے مکہ میں آئے تھے اور یہ قریش یہ اہلِ مکہ، یہ عرب جو ہمیشہ لڑتے رہے تھے سر جھکائے کھڑے تھے کہ اپنی قسمت کا فیصلہ سنیں اور وہ فیصلہ وقت کے عام اصول اور رواج کے مطابق قتلِ عام کے سوا کیا ہو سکتا تھا۔

دیکھنا ــــ وہ فاتح مہاجر حرمِ کعبہ میں ــــ دو رکعت نماز پڑھتا ہے، پھر کہتا ہے ، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ، وہ یکتا ہے ، اس کا کوئی شریک نہیں ، اس نے اپنا وعدہ پورا کیا ، اپنے بندے کو نصرت دی اور تمام جماعتوں کو شکست دی، حمد بھی خدا ہی کے لیے ہے اور حکومت بھی ــــ ہاں تم لوگ (میرے بارے میں) کیا گمان کرتے ہو اور کیا کہنا چاہتے ہو؟

سہیل نے کہا: ہم حسنِ ظن رکھتے ہیں اور کلمہ خیر کہتے ہیں، تو شریف بھائی اور شریف ابن عم ہے

حضرت ؐ نے فرمایا: میں بھی وہی کہتا ہوں جو یوسف ؑ نے اپنے ستم گر بھائیوں سے کہا تھا ، لا تثریب علیکم الیوم (آج کے دن تم پر کوئی مواخذہ نہیں) ــــ انتم الطلقاء (تم آزاد ہو)

۱: طبری۔

یہ عفوِ عمومی کی نوید سن کر بڑے بڑے سرکشوں اور دشمنوں کی گردنیں فرطِ ندامت سے جھک گئیں

خطبۂ نبوی

پھر آپؐ نے فرمایا: ——— عہدِ جاہلیت کا ہر خون — مال، غرور، بزرگی میرے ان دونوں قدموں کے نیچے دب گیا۔ بجز کعبہ کی سدانت (خدمت) اور سقایت (حاجیوں کو پانی پلانے) کے ——— پھر بلال بامِ کعبہ پر چڑھے، اذان دی۔ بُت ہٹا دیے گئے۔ تصویریں مٹا دی گئیں۔

جاء الحق وزهق الباطل ان الباطل كان زهوقا

غیر مسلم کا اعتراف

ایک غیر مسلم مورخ کا قول:

"جنوری ۶۳۲ء کے ختم پر مکہ پوری طرح فتح ہو گیا۔ محمدؐ شہر کے سب سے بڑے حرم (خانۂ کعبہ) میں داخل ہوئے۔ آپ نے یہاں کے تمام بت توڑ ڈالے ان بتوں کی تعداد تین سو ساٹھ بیان کی جاتی ہے۔ آپؐ جاء الحق وزهق الباطل (حق آیا اور باطل چلا گیا) (قرآن۔ بنی اسرائیل۔ ا) فرماتے جاتے تھے اور بتوں کو توڑتے جاتے تھے۔ لیکن خود شہر کے لوگوں کے ساتھ آپ نے بڑی فراخ دلی برتی۔ مفتوحہ شہر میں اس شان سے کسی فاتح کے داخل ہونے کی مثال اس سے پہلے کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔"[1]

---

[1] فلپ ہٹی کی مختصر تاریخ عرب۔

۴:

جب احمدِ مرسلؐ نہ رہے کون رہے گا؟

آنحضرتؐ کی وفات اور سلسلہ وحی کا انقطاع

علالت اور وصال ۱۱ھ (۶۳۱ء) آنحضرتؐ کا سالِ وفات ہے۔

تبلیغ کا کام پورا ہو چکا تھا، بُت پرستی سرنگوں ہو چکی تھی، جاہلیت کا دور افسانۂ پارینہ بن چکا تھا، اسلام کا بول بالا ہو چکا تھا۔ توحید کا جھنڈا بلند ہو رہا تھا، اسلام کا بنایا ہوا آئین و قانون نافذ ہو چکا تھا۔ اب اسلام کا دور تھا، صرف اسلام کا دور!

اب آپؐ کی روحِ گرامی رفیقِ اعلیٰ سے جا ملنے کے لیے بیتاب تھی۔ آپؐ نے دُنیا سے پردہ فرمانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ خود بارگاہِ خداوندی سے بھی ایسی بشارتیں اور اطلاعیں ملنے لگیں جو اس حقیقت کی آئینہ دار تھیں کہ اب آپؐ اس مادّی دُنیا سے رختِ سفر باندھ کر عرشِ معلیٰ کی طرف ہجرت فرما ہونے والے ہیں۔

رخصت کی علامتیں وفات سے کئی ماہ پہلے حجِ وداع سے فراغت کے بعد منیٰ میں یہ آیۂ کریمہ نازل ہوئی۔

اذا جاء نصر اللّٰہ والفتح ورایت الناس یدخلون فی دین اللّٰہ افواجاً فسبح بحمد

ربک واستغفرہ انہ کان توابا۵

(جب اللہ کی نصرت اور فتح پہنچ گئی اور (اے محمدؐ) تو نے لوگوں کو فوج در فوج دینِ الٰہی میں داخل ہوتے دیکھ لیا تو اب اللہ کی حمد و تسبیح کر، اس سے طلبِ مغفرت کر، وہی ہے توبہ کا قبول کرنے والا۔

اسی طرح سورۂ نصر سے پہلے عرفہ میں آخری اور وداعی خطبہ ارشاد کرنے کے بعد جو وحیٔ الٰہی نازل ہوئی وہ یہ تھی۔

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت	آج میں نے تمہارے لیے دین کو
علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام	پورا کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی
دینا۵	اور تمہارے لیے اسلام کے دین کو چن لیا۔

مذکورہ بالا آیات میں صاف اطلاع دی گئی ہے کہ کارِ نبوت ختم ہو گیا اور دربارِ الٰہی میں حاضری کا وقت آ پہنچا۔

احساسِ نبوی

خود آپؐ کو بھی حقیقت کا احساس ہو چکا تھا کہ اب دُنیا میں زیادہ قیام نہیں رہے گا۔ حالانکہ ظاہری طور پر آپؐ کی صحت بہت اچھی تھی اور بظاہر کوئی اندیشہ اس امر کا نہیں تھا کہ یہ زندگی کے آخری دن ہیں۔

آپ نے آخری خطبے میں بھی اس طرف اشارہ فرمایا تھا مسلمانوں کو بہت سی نصیحتیں فرمائیں اور فرمایا: تم سے عنقریب (یعنی میری وفات کے بعد) لوگ سوال کریں گے، یاد رکھو جو کوئی اپنی طرف سے من گھڑت باتیں کہے گا اُسے چاہیے کہ جہنم میں پہلے سے اپنا ٹھکانا بنا لے۔ پھر ارشاد ہوا: میں تم میں ایک ایسی چیز چھوڑے جاتا ہوں جس کے بعد تم کبھی گمراہ نہ ہو گے بشرطیکہ مضبوطی سے اسے پکڑے رہو، وہ کیا ہے؟ اللہ کی کتاب اور اس کے نبی کی سنت۔ خمِ غدیر کے موقع پر آپؐ نے جو خطبہ دیا اس میں بھی فرمایا: قریب ہے میرے رب کا قاصد آئے اور میں داعیٔ اجل کو لبیک کہوں، تم میں دو بہترین (ثقلین) چیزیں چھوڑے جاتا ہوں، کتاب اللہ اور اپنی عترت (یعنی اہل بیت)

ایک مرتبہ وفات سے کچھ پیشتر حضرت عباسؓ نے ایک خواب بیان کیا۔ آپؐ نے فرمایا: تعبیر آپ

کے بھتیجے کی موت ہے۔ معاذؓ بن جبل کو جب یمن بھیجنے لگے تو انھیں بھی اپنی وفات کی خبر دے دی فرمایا: معاذ شاید اس سال بعد تو مجھے نہ پائے گا۔ لوٹ کر شاید میری اس مسجد اور قبر ہی کو دیکھے گا۔ حضرت معاذ رونے لگے۔ آپ نے انھیں تسلی دی۔

ماہِ صفر ۱۱ھ اب آپؐ نے آخری سفر کی تیاریاں شروع فرمادیں۔ آپؐ احد تشریف لے گئے اور شہیدانِ اُحد سے رخصت ہوئے۔

پھر ۲۸ صفر کو آدھی رات کے وقت آپ اچانک کھڑے ہو گئے حضرت عائشہ نے پوچھا: میرے ماں باپ آپؐ پر قربان کہاں؟ ارشاد ہوا البقیع۔ آپ بقیع کے قبرستان تشریف لے گئے۔ آپ کے خادم ابو مویہبہ آپؐ کے ساتھ تھے وہاں پہنچ کر آپؐ نے مُردوں کے لیے دُعائے مغفرت فرمائی۔ واپسی میں حضرت میمونہ کے ہاں قیام فرمایا۔

۲۹ صفر ۱۱ھ آپؐ ایک جنازہ سے واپس تشریف لا رہے تھے کہ دردِ سر شروع ہوا پھر شدید بخار چڑھا، باربار غسل (حدت کم کرنے کے لیے) فرماتے اور پانی میں ہاتھ بھگو بھگو کر چہرہ تر کرتے، بخار اتنا شدید تھا کہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں۔ آپ کی سانس اس قدر تیز چلتی تھی جیسے منقّی کھانے والا بیج پھونک کر مُنہ سے پھینکتا ہے۔

بیماری کی شدّت علالت برابر بڑھتی ہی رہی، اس حالت میں بھی عدل کا اس درجہ خیال تھا کہ آپؐ پانچ دن تک باری باری امہات المومنین کے ہاں جاتے رہے، اب حالت یہ پہنچی کہ چلنا پھرنا دوبھر ہو گیا غرض جب مرض نے بہت شدت اختیار کی تو آپؐ نے پوچھا کل کس کے گھر رہوں گا۔ عرض کیا گیا فلاں بی بی کے ہاں۔ پھر فرمایا: پرسوں کس کی باری ہے؟ عرض کیا گیا فلاں بی بی کی۔ اس طرح سوالات کرنے سے حضرت فاطمہؓ سمجھ گئیں۔ آپؐ حضرت عائشہؓ کے ہاں رہنا چاہتے ہیں حضرت فاطمہؓ نے ازواجِ مطہرات سے عرض کیا۔ ان سب نے مل کر رسولؐ سے عرض کیا: ہم نے اپنی اپنی باری حضرت عائشہ کو بخش دی۔ یہ واقعہ وفات سے ایک ہفتہ پہلے کا ہے۔ پھر آپؐ آخر وقت تک حضرت عائشہؓ کے ہاں رہے۔

پاسِ وفا حضرت ابو ذرؓ سے آپؐ کو بہت چاہت تھی۔ اسی بیماری کے دوران میں ایک دن انھیں یاد فرمایا، وہ آئے تو آپؐ غنودگی میں تھے۔ وہ اوپر جھک کر آپؐ کو

کو دیکھنے لگے۔ آپ کی آنکھ کھل گئی، انہیں دیکھا اور سینے سے لگا لیا۔

اتوار کے دن حضرت اسامہؓ اپنے پڑاؤ سے چل کر آنحضرتؐ کی خطرناک علالت کا حال سننے کے بعد تشریف لائے، جب وہ داخل ہوئے تو آپؐ بیہوش تھے، وہ جھکے اور آپ کا بوسہ لیا۔ آپؐ نے آنکھیں کھول دیں، مگر یارائے تکلم نہ تھا۔ آپؐ دستِ مبارک آسمان کی طرف اٹھاتے تھے اور اسامہؓ پر رکھتے تھے، حضرت اسامہؓ فرماتے ہیں۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ آپ میرے لیے دعا فرما رہے ہیں۔

نماز کا اہتمام

جب تک چلنے پھرنے کی قدا بھی سکت رہی مسجدِ نبوی میں نماز پڑھانے برابر تشریف لاتے رہے۔ سب سے آخری نماز آپؐ نے مغرب کی پڑھائی عشا کا وقت آیا تو دریافت فرمایا نماز ہو چکی؟ عرض کیا گیا حضورؐ کا انتظار ہے۔ لگن میں پانی بھروا کر غسل فرمایا، جب اٹھنا چاہا تو بے ہوش ہو گئے، کچھ دیر بعد افاقہ ہوا۔ تو پھر وہی سوال کیا اور جواب میں وہی عرض کیا گیا۔ آپؐ نے پھر غسل فرمایا، مگر جب اٹھنے لگے تو بے ہوش ہو گئے۔ تیسری بار پھر ایسا ہی ہوا۔ پھر آپؐ نے حکم دیا۔ ابوبکرؓ نماز پڑھائیں۔ چنانچہ کئی روز تک وہ نماز پڑھاتے رہے۔

سنبھالا!

وفات سے چار روز پیشتر طبیعت ذرا سنبھلی، ظہر کے وقت آپؐ نے سات مشکوں سے غسل فرمایا، غسل کے بعد آپؐ حضرت عباس اور علیؓ مرتضیٰ کے سہارے سے مسجد میں تشریف لے گئے، حضرت ابوبکرؓ نماز پڑھا رہے تھے۔ آہٹ پا کر انھوں نے پیچھے ہٹنا چاہا، مگر آپؐ نے روک دیا اور اُن کے پہلو میں آ کر بیٹھ گئے، نماز کے بعد آپؐ نے ایک بڑا اثر انگیز خطبہ دیا:

"میں تمھارا امیرِ کارواں ہوں اور تم پر گواہ ہوں، تم سے ملاقات کا وعدہ حوضِ کوثر پر ہے۔ میں اس وقت حوضِ کوثر پر کھڑا ہوں اور اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں — سُنو، اللہ نے ایک بندے کو اختیار دیا کہ دُنیا اور دُنیا کی مسرتوں سے جتنا چاہے لے لے یا جوارِ خداوندی کی سعادتوں کو قبول کرے۔ اس بندے نے جوارِ خداوندی کی سعادت قبول کر لی۔"

حضرت ابوبکرؓ سمجھ گئے۔ اشارہ خود اپنی ذاتِ گرامی کی طرف ہے، وہ زار زار رونے لگے اور عرض کیا، "بلکہ ہم، ہمارے ماں باپ اور ہماری تمام آل اولاد آپؐ پر قربان۔" لیکن دوسرے صحابہ

اس راز کو سمجھ نہ سکے ، بعض کو بہ ظاہر اس بے موقع جواب پر تعجب بھی ہوا حضرت ابو سعید خدری فرماتے ہیں :

" ہمیں ابو بکر کے رونے پر بہت حیرت ہوئی لیکن بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ ابو بکرؓ ہم میں رسول اللہؐ کو سب سے بہتر جاننے والے تھے " آنحضرتؐ نے ابو بکر کو تسلی دی اور کہا " بس ابو بکر بس ! " پھر فرمایا : یہ مسجد میں دروازے نکلے ہوئے ہیں (مختلف گھروں کے) ان سب کو بند کر دو صرف ابو بکرؓ کے گھر کا دروازہ باقی رہنے دو ، کیونکہ کوئی ایسا نہیں جس کا ہم پر احسان ہو اور ہم نے اس کا بدلہ نہ اتار دیا ہو بجز ابو بکر کے !

خطبے کے بعد حضرت عائشہؓ کے حجرے میں تشریف لائے اور حضرت علیؓ کو وصیت کی " تم ہی مجھے نہلانا ، کیونکہ جو کوئی میرا ستر دیکھے گا اس کی آنکھیں پھوٹ جائیں گی ۔ حضرت علیؓ نے عرض کیا یارسول اللہ میں ڈرتا ہوں آپ کو غسل نہ دے سکوں گا ۔ ارشاد ہوا ۔ نہیں تجھے اس کی توفیق دی جائے گی " ۔

بیماری کا زور کبھی گھٹ جاتا کبھی بڑھ جاتا ، اضطراب کے عالم میں کبھی چادر منہ پر ڈال لیتے کبھی گرمی سے گھبرا کر الٹ دیتے ۔ اسی حالت میں آہستہ آہستہ فرمایا : یہود اور نصاریٰ پر خدا کی لعنت جنھوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا ہے ۔

اسی شدتِ علالت کے حال میں یاد آیا حضرتِ عائشہ کے پاس کچھ اشرفیاں رکھوائی تھیں دریافت فرمایا : عائشہؓ وہ اشرفیاں کہاں ہیں ؟ کیا محمدؐ خدا سے بدگمان ہو کر ملے گا ؟ جاؤ ، انھیں خدا کی راہ میں خیرات کر دو ۔

وفات

دوشنبہ کے روز جو یوم وصال تھا ، بہ ظاہر مرض کی شدت کم تھی ، نقاہت کے باوجود چہرۂ مبارک ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا ، حجرۂ مبارک مسجد سے ملا ہوا تھا ، آپؐ نے صبح کے وقت پردہ اٹھا کر دیکھا تو صفیں جمی ہوئی تھیں ۔ حضرت ابو بکرؓ امامت فرما رہے تھے ۔ آپؐ یہ منظر دیکھ کر مسکرائے ۔ آپؐ کی آہٹ پا کر مسلمان پھر بے قابو ہو چلے تھے ، قریب تھا کہ صفیں ٹوٹ جائیں حضرت ابو بکرؓ جو امامت کر رہے تھے پیچھے ہٹنے لگے ۔ آپؐ نے اشارہ سے روکا اور حجرہ کے اندر داخل ہو کر پردہ گرا دیا ، یہ آخری دیدار تھا جو اپنے نبی کا مسلمانوں نے کیا !

اس شدید بیماری کے دوران میں بھی خدا ، نماز اور قرآن کا آپؐ کو کتنا خیال تھا ۔ اس کا اندازہ حضرت

عمرؓ کی اس روایت سے ہوسکتا ہے کہ وہ وفات سے چند روز پہلے عیادت کو حاضر ہوئے۔ آپؐ بخار سے جل رہے تھے۔ حضرت عمرؓ کہتے ہیں۔ میں نے کپڑے پر ہاتھ رکھا تو شدتِ حرارت کے باعث ہاتھ کھینچ لینے پر مجبور ہوگیا۔ میں نے کہا یا رسول اللہؐ! آپ کو کتنا تیز بخار ہے! فرمایا ہاں، مگر اس کے باوجود میں نے بحمد اللہ کہ گئی سورتیں تلاوت کیں، جن میں سبع الطوال بھی داخل ہیں"۔ میں نے عرض کیا۔ اے نبی اللہ! آپؐ کے تمام اگلے پچھلے گناہ خدا نے معاف کر دیئے ہیں۔ پھر آپ اتنی مشقت کیوں اٹھاتے ہیں۔ کچھ تو اپنے حال پر ترس کھائیے۔

فرمایا: لیکن کیا میں خدا کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟!

آپؐ حضرت عائشہؓ کے سینے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ جیسے جیسے دن چڑھتا جاتا تھا بار بار غشی کے دورے پڑتے تھے۔ سخت بے چینی کا عالم تھا۔ ایک پاؤں پھیلاتے تھے دوسرا سمیٹ لیتے تھے حضرت فاطمہؓ سینے سے چمٹ کر رونے لگیں "آہ میرے باپ کی تکلیف! آہ میرے باپ کی تکلیف! فرمایا آج کے بعد تمھارا باپ کبھی بے چین نہ ہوگا۔ تیرے باپ کو اب وہ منزل پیش آنے والی ہے جس سے خدا کسی کو بھی چھوڑنے والا نہیں، قیامت کے دن ملاقات ہوگی۔ بیٹی روؤ نہیں، جب وفات پا جاؤں تو کہنا: انا للہ وانا الیہ راجعون! کیونکہ اسی میں آدمی کے لیے ہر مصیبت کی تسلی موجود ہے۔

حضرت فاطمہؓ نے پوچھا: کیا آپ کی جُدائی کی بھی یا رسول اللہ! فرمایا: ہاں میری جُدائی کی بھی!

بار بار بے ہوشی کا دورہ پڑتا تھا۔ آنکھ کھلتی تو آپؐ فرماتے: اپنے غلاموں کے معاملے میں خدا سے ڈرتے رہو۔ پانی کا پیالا پاس رکھا تھا۔ آپؐ پیالے میں ہاتھ ڈال کر چہرہ تر کر لیتے۔ چہرۂ مبارک کبھی سُرخ ہو جاتا کبھی زرد، ارشاد فرماتے: لاالہ الا اللہ ان للموت سکرات!

اتنے میں حضرت عبدالرحمن بن ابوبکرؓ تشریف لائے۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں ان کے ہاتھ میں مسواک تھی۔ آپ نے مسواک پر ٹکٹکی باندھ دی۔ میں نے عرض کیا، کیا آپ یہ مسواک لیں گے؟ اشارہ سے فرمایا: ہاں۔ میں نے مسواک عبدالرحمن سے لے لی، توڑی اور آپ کے دستِ مبارک میں دے دی لیکن نقاہت کے باعث اسے چبا نہ سکے۔ میں نے عرض کیا اسے نرم کر دوں۔ اشارہ سے فرمایا ہاں۔ میں نے اپنے منہ میں لے کر چبائی، جب نرم ہوگئی تو آپؐ کے مُنہ میں دے دی۔ آپ نے استعمال شروع کر دیا۔ ذرا دیر بعد مسواک انگلیوں میں بھاری ہوگئی۔ مجھے دینے لگے تو چھوٹ گئی۔ آپؐ آہستہ آہستہ فرما رہے

تھے۔ "بل الرفیق الاعلیٰ" یہ کہتے کہتے آپؐ کے ہاتھ لٹک گئے پتلی اوپر کو اٹھ گئی اور آپؐ اپنے رب سے جا ملے۔ پیر کا دن، ربیع الاوّل کا مہینہ، سہ پہر کا وقت، ۱۱ھ، عمر گرامی ۶۳ سال، تاریخ عام روایتوں کی بنا پر ۱۲ ربیع الاوّل، مگر خاص تحقیق کی بنا پر پہلی ربیع الاوّل (ملاحظہ ہو سیرۃ النبی از مولانا شبلی) حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں جہاں آپؐ نے وفات پائی تھی وہیں دفن ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

صحابہ کا غم

آنحضرتؐ کی وفات سے صحابہ پر سکتہ چھا گیا۔ منافق مسرور ہو رہے تھے اور مسلم رنجور حضرت عمرؓ اتنے بے حال ہوئے کہ تلوار سونت کر کھڑے ہو گئے۔ اور فرمایا جو کوئی یہ کہے گا کہ رسول اللہؐ نے وفات پائی اس کی گردن اڑا دوں گا۔ سب دہل گئے۔ اتنے میں حضرت ابو بکرؓ تشریف لائے، سالم بن عبداللہ الاشجعی سے پوچھا۔ کیا واقعی رسول اللہؐ فوت ہو گئے؟ شدتِ غم سے ان کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ جواب دیا کیسے کہوں، یہ عمرؓ کہہ رہے ہیں، جو رسول اللہؐ کی وفات کا ذکر کرے گا اس کی گردن اڑا دوں گا۔ حضرت ابو بکرؓ باچشمِ گریاں مسجدِ نبوی میں داخل ہوئے پھر سیدھے حجرۂ نبوی کی طرف بڑھے۔ حسبِ دستور حاضر ہونے کی اجازت چاہی۔ حضرت عائشہؓ کی آواز آئی۔ آج کے دن اجازت کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ فرمایا سچ ہے۔ پھر اندر داخل ہوئے رسول اللہؐ کی چارپائی کی طرف بڑھے۔ آپؐ کی پیشانیٔ اقدس کو بوسہ دیا۔ روتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے، "میرے ماں باپ تجھ پر قربان تو زندگی میں بھی طیب و طاہر تھا اور موت کے بعد بھی طیب و طاہر ہے۔ حضرت عمرؓ بدستور بولے جا رہے تھے۔ ابو بکرؓ نے کہا: او قسمیں کھانے والے ٹھہر، اپنی جگہ بیٹھ جا" مگر وہ اس قدر جوش میں بھرے ہوئے تھے کہ بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ حضرت ابو بکرؓ بھلا نگتے ہوئے منبر کی طرف بڑھے اور ایک یادگار خطبہ دیا:

"لوگو! اگر کوئی محمدؐ کو پوجتا تھا تو جان لے کہ وہ اس دنیا سے تشریف لے گئے، اور اگر کوئی محمدؐ کے رب کو پوجتا تھا (تو جان لے) وہ زندہ ہے، اس کو موت نہیں۔ پھر فرمایا:

وما محمد الا رسول قد خلت من قبله	اور محمدؐ تو خدا کے رسول ہیں، ان سے پہلے
الرسل، افان مات او قتل انقلبتم	بہت سے نبی گزر چکے ہیں۔ کیا اگر ان کا انتقال
علی اعقابکم ومن ینقلب علی عقبیه	ہو جائے یا وہ خدا کی راہ میں مارے جائیں تو

فلن یضر اللہ شیئاً وسیجزی اللہ الشاکرین
تم اسلام سے پلٹ جاؤ گے؟ اور جو کوئی پلٹ جائے گا تو وہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑے گا اور اللہ شکرگزار بندوں کو جزائے خیر دے گا۔

یہ آیت سنتے ہی حضرت عمرؓ نے چلا کر پوچھا: کیا یہ آیت قرآن میں موجود ہے؟ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیئے بغیر سلسلۂ تقریر جاری رکھا اور فرمایا:

خدا نے کہا ہے:

کل من علیھا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام
(جو کوئی اوپر زمین کے ہے فنا ہونے والا ہے اور باقی رہے گی ذات تیرے پروردگار کی جو صاحب جلال و اکرام ہے۔

اس خطبے کا یہ اثر ہوا کہ سب کی آنکھیں کھل گئیں۔

تجہیز و تکفین وفات کے بعد حضرت علیؓ حجرۂ نبویؐ میں پہنچے، اتنے میں حضرت عباسؓ تشریف لائے حضرت علیؓ نے بزرگ خاندان کو دیکھا تو ضبط نہ کر سکے۔ رونے لگے اور چیخ کر کہا:

—— بابی انت طیباً حیاً وطیباً میتاً۔

حضرت علیؓ نے غسل دیا، پھر کفن پہنایا۔ کفن میں صرف تین یمنی کپڑے تھے، پھر نماز جنازہ ہوئی۔ سب سے پہلے خاندانِ نبوت نے، پھر مہاجرینؓ نے پھر انصار نے باری باری حجرۂ نبویؐ میں جا کر بغیر کسی اقتدا کے نماز پڑھی۔ یہ سلسلہ لگاتار ۲۴ گھنٹے جاری رہا۔ اسی لیے رحلت سے تقریباً ۳۲ گھنٹے بعد آپؐ کی تدفین عمل میں آئی۔ حضرت علیؓ اور دوسرے افرادِ خاندان نے آپؐ کو قبر میں اتارا۔ حضرت بلالؓ نے قبر پر ایک مشک پانی کا چھڑکا۔

ایک دفعہ حضرت انسؓ سے پوچھا گیا، وفات کے وقت رسول اللہؐ کی کیا حالت تھی؟ فرمایا نہایت تر و تازہ، خوبصورت، وجیہ، تندرست، سر اور ریش مبارک میں سفیدی تک نہیں دوڑی تھی۔ داڑھی کے صرف ۳۰ بال سفید ہوئے تھے۔

مرثیے آپؐ کی وفات پر درد بھرے دلوں کی آہیں مرثیوں کی صورت میں نکلیں۔ بہت مختصر سا نمونہ

نمونہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے

حضرت فاطمہؓ نے فرمایا:

"ہم تجھ سے اس طرح محروم ہوگئے ہیں جس طرح زمین مینہ سے محروم ہو جائے۔ اے کاش تیرے خاک میں سونے سے پہلے ہمیں موت آجاتی۔"

اس حادثے کے بعد حضرت فاطمہؓ کو کبھی کسی نے ہنستے نہیں دیکھا۔ وہ چھ مہینے کے بعد اس دنیا سے رخصت ہوگئیں۔

حضرت ابوبکرؓ کا مرثیہ:

اے آنکھ رو اور رونے سے کبھی نہ اکتا، آقا پر رونا ہر طرح سے بجا ہے۔ کاش ہم سب کو موت آجاتی اور ہم سب اس کے ساتھ ہوتے!

حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب کا مرثیہ:

فاطمہ! صبح سے شام تک روئے جا اور رونا بھی نہ اکتا ہر نے والا ایسا ہی تھا کہ اس پر رویا جائے ریگستان اس کی جدائی پر رو رہے ہیں مکّہ روتا ہے پہاڑ روتے ہیں۔

حضرت حسان بن ثابت کا مرثیہ:

مدینے میں رسولؐ کی نشانیاں اور یادگاریں ہیں۔ اگرچہ نشانیاں کبھی مٹ بھی جایا کرتی ہیں۔ لیکن مدینے کی نشانیاں نہیں مٹ سکتیں۔ اس میں رہبر کا منبر ہے جس پر وہ بلند ہوا کرتا تھا، وہ حجرے ہیں جن میں خدا کی طرف سے نور نازل ہوا کرتا تھا۔

آنحضرتؐ کی حیاتِ طیبہ پر ایک نظر

سال بہ سال کے واقعات و حوادث کا مختصر سا جائزہ

داعئ اسلام علیہ التحیۃ والسلام کی حیاتِ گرامی کا ایک مختصر سا خاکہ گزشتہ صفحات میں پیش کیا گیا ہے۔ اب کتاب کا یہ حصہ ختم کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کی حیاتِ طیبہ کے بعض اور پہلوؤں کو بھی سرمۂ چشم سعادت بنا لیا جائے تاکہ بیک نظر آپؐ کی حیاتِ گرامی کے خاص خاص گوشے نظر کے سامنے آجائیں۔

عہدِ نبوت کے خاص خاص واقعات

سب سے پہلے ہم عہدِ نبوت کے خاص خاص واقعات کا خاکہ پیش کرتے ہیں۔

از سنہ ۱ھ تا سنہ ۱۰ھ

سنہ ۱ھ
تعمیر مسجد نبوی
حضرت عائشہؓ کی رخصتی

سنہ ۲ھ
رمضان کے روزوں کی فرضیت
تحویلِ قبلہ
حضرت فاطمہؓ کا حضرت علیؓ سے نکاح، مہر تقریباً سوا سو روپے، جہیز، ایک چارپائی، چمڑے

کا ایک گدا، ایک چھاگل، دو چکیاں، دو مٹی کے گھڑے۔

سنہ ۳ھ حضرت امام حسنؓ کی پیدائش۔
بنتِ رسول حضرت امِ کلثومؓ سے حضرت عثمانؓ کا نکاح، قانونِ وراثت کا نزول
مُشرکہ عورتوں سے مسلمان مردوں کے نکاح کی حُرمت،

سنہ ۴ھ حضرت امام حسین کی ولادت،
شراب کی حرمت کا حکم،
پردہ کا حکم (آیۂ حجاب)

سنہ ۵ھ صلوٰۃِ خوف کی اجازت،
تیمم کی اجازت،
لعان کا طریقہ،
پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے کی سزا کا نفاذ،
غزوۂ خندق،
حضرت عائشہؓ پر تہمت،

سنہ ۶ھ تبلیغی خط شہنشاہانِ عالم کے نام،
۱: قیصر روم،
۲: شاہِ ایران،
۳: عزیز مصر،
۴: نجاشی شاہِ حبش،

قیصر روم نے آں حضرتؐ کے ساتھ اظہارِ عقیدت کیا، خسرو پرویز شہنشاہ ایران نے گستاخی کی۔ نامۂ مبارک چاک کر ڈالا، شاہ مصر نے بھی اظہارِ عقیدت کیا، شاہِ حبش نے اسلام قبول کر لیا۔

سنہ ۷ھ ۱: درندے، ٹیڑھے پنجے والے پرندے، گدھا اور خچر حرام قرار پائے۔
لونڈیوں سے تمتع کے لیے استبرا کی شرط عائد کی گئی۔

۳: چاندی سونے کا تبادلہ تفاضل کے ساتھ حرام قرار دیا گیا۔

سنہ ۸ھ
بحرین کے حاکم کا قبولِ اسلام،
عمان کے باشندوں کا قبولِ اسلام،
خالد بن ولید اور عمرو بن العاص کا قبولِ اسلام،
غزوۂ حنین،
مشرکوں کے خانۂ کعبہ میں داخل ہونے کی ممانعت،

سنہ ۹ھ
حکمِ زکوٰۃ،
حرمتِ سود،
غزوۂ تبوک،

سنہ ۱۰ھ
قبائلِ عرب کے قافلوں کا قبولِ اسلام کے لیے حاضرِ مدینہ ہونا،
حضرت علیؓ کا بہ حکمِ رسول اللہؐ یمن کی طرف کوچ اور سلسلہ تبلیغِ اسلام،

ازواجِ مطہراتؓ

۱: حضرت خدیجہؓ بنتِ خویلد (بیوہ)

۲: حضرت سودہؓ بنتِ زمعہ (بیوہ)

۳: حضرت حفصہؓ بنت عمر (بیوہ)

۴: حضرت ام سلمہؓ (بیوہ)

۵: حضرت زینبؓ بنتِ خزیمہ (ام المساکین) (بیوہ)

۶: حضرت زینبؓ (زید کی مطلقہ)

۷: حضرت جویریہؓ (بیوہ)

۸: حضرت ام حبیبہؓ (عبید اللہ بن جحش کی مطلقہ)

۹: حضرت میمونہؓ (بیوہ)

۱۰: حضرت صفیہؓ (بیوہ)

۱۱: حضرت عائشہؓ بنتِ ابوبکرؓ

۱۲: حضرت ماریہ قبطیہؓ

ان میں سے کسی نے آپؐ کی زندگی میں وفات پائی، باقی نے آپؐ کی وفات کے بعد۔

اولادِ نبوی ؐ

۱: حضرتِ فاطمہ رضؓ ۔
۲: حضرت زینب رضؓ
۳: حضرت ام کلثوم رضؓ
۴: حضرت رقیہ رضؓ
۵: حضرتِ قاسم رضؓ
۶: حضرتِ ابراہیم رضؓ

ان میں سے حضرت فاطمہ رضؓ کے سوا تمام اولاد کا انتقال آپ صلعم کی زندگی ہی میں ہو گیا۔ حضرت فاطمہ رضؓ آپ ؐ کی وفات کے ۶ ماہ کے بعد اس جہانِ فانی سے رخصت ہو کر اپنے محبوب باپ ؐ سے جا ملیں۔

شمائلِ نبوی

رسول اللہ صلعم دوہرے بدن کے بڑے باعظمت، بڑے صاف ستھرے تھے، چہرۂ مبارک چمکتا تھا، بہایت خوش خلق تھے، قد مبارک ٹھنگنے آدمی سے زیادہ اور لمبے سے کم تھا، شکم مبارک ابھرا ہوا نہ تھا۔ تمام اعضا میں تناسب تھا، بالوں میں تھوڑا سا گھونگھرا پن تھا مگر مانگ نکل آتی تھی۔ رنگ چمک دار تھا، جس میں سرخی ملی ہوئی تھی۔ آواز نرم تھی، ریش مبارک گھنی، دہانہ کشادہ تھا، گفتار شیریں، بازو اور سینہ کشادہ، سینۂ مبارک کے بالائی حصے پر بال تھے۔ کلائیاں لمبی تھیں، ہتھیلیاں کشادہ اور تلوے پُر گوشت، چلتے تو یہ معلوم ہوتا بلندی سے پستی کی طرف اُتر رہے ہیں، نگاہ نیچی رکھتے، جس سے ملتے پہلے خود سلام کرتے۔ جب کوئی شخص ہاتھ پکڑتا تو اس وقت تک نہ چھڑاتے جب تک وہ خود ہی نہ چھوڑ دیتا، جب کوئی سائل آپ سے حاجت روائی کی درخواست کرتا تو حاجت روائی فرماتے یا سہل و نرم کلام سے جواب دیتے۔

حرفِ آخر:

آنحضرتؐ کا خطبۂ حجۃ الوداع

آخری حج کے موقع پر آنحضرتؐ نے جو خطبہ دیا وہ تاریخ میں خطبۂ حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے یہ خطبہ اپنی معنویت اور ارشاد و نصیحت کے اعتبار سے گویا مسلمانوں کے لیے زندگی کا ہدایت نامہ ہے اس میں وہ تمام باتیں آگئی ہیں جو ایک مسلمان کو مسلمان بنانے کے لیے کافی ہیں۔ ابن خلدون نے اپنی تاریخ میں اس خطبے کا ذکر یوں کیا ہے:

ذی الحجہ ۱۰ سنہ ہجری

رسول خداؐ مدینے سے حجۃ الوداع کے لیے نکلے جب کہ ابھی ذوالقعدہ کے پانچ دن باقی تھے آپ کے ہمرکاب عرب کے شرفاء تھے اور ایک سو اونٹ جن پر کجاوے نہ تھے۔ آنحضرتؐ مکہ میں ذوالحجہ کی چار تاریخ کو اتوار کے روز داخل ہوئے۔ حضرت علیؓ ابن ابیطالب بھی جو اہل نجران کے صدقات لائے تھے وہیں مکہ میں آپؐ سے ملے۔ آپؐ نے لوگوں کو حج کے مناسک اور طریقے سکھائے اور عرفات کے مقام پر لوگوں کو ایک خطبہ دیا۔ چنانچہ آپؐ نے خدا کی حمد و نعت کے بعد فرمایا:

یا ایھا الناس! اسمعوا قولی فانی لا ادری لعلی لا القٰکم بعد عامی ھذا بھذا الموقف ابداً ایھا الناس! ان دماءکم و اموالکم علیکم حرام الی ان تلقوا ربکم کحرمۃ یومکم

اے لوگو! میری بات سنو، کیونکہ میں نہیں جانتا کہ میں اس سال کے بعد اس مقام پر آئندہ کبھی مل سکوں گا۔ اے لوگو تمھارا خون اور تمھارا مال تم پر قیامت تک اسی طرح حرام ہے جس طرح یہ دن اور یہ مہینہ تمھارے لیے حرام ہے، عنقریب تم اپنے

هٰذا او حرمة شهركم هٰذا و ستلقون ربكم فيسألكم عن اعمالكم وقد بلّغت۔

فمن كان عنده امانةٌ فليؤدّها الیٰ من ائتمنهٗ عليها وان كان ربا فهو موضوعٌ ولكم رؤس اموالكم لاتظلمون ولا تظلمون قضى الله انّه لاربا ان ربا العباس بن عبد المطلب موضوعٌ كلّه

وانّ كل دمٍ فی الجاهلية موضوع كله وان اوّل دمٍ يوضعُ دم ربيعة بن حارث بن عبد المطلب (وكان مسترضعًا فی بنی ليث فقتله بنو هذيل) وهو اوّل ما ابدا ء من دم الجاهلية

يا ايها الناس ان الشيطان قد يئس من ان يعبد بارضكم هذه ابدًا ولكنّه رضى ان يطاع فيما سوىٰ ذالك مما تحقرون من اعمالكم فاحذروه على دينكم۔

پروردگار کے سامنے جاؤ گے اور وہ تم سے تمھارے اعمال کی بابت سوال کرے گا اور یاد رہے کہ میں نے تمھیں فرمانِ الٰہی پہنچا دیا ہے۔ جس شخص کے پاس کوئی امانت ہو تو اسے اس کے مالک کے حوالے کر دے اور اگر سود ہے تو وہ چھوڑ دیا جائے اور تمھارے لیے صرف راس المال ہے نہ تم کسی پر زیادتی کرو اور نہ تم پر کوئی زیادتی کرے۔ خدا کا حکم ہے کہ ربا کوئی چیز نہیں۔ عباس بن عبد المطلب کا تمام ربا (سود) منسوخ ہے ایّامِ جاہلیت کے تمام خون موقوف ہیں۔ سب سے پہلا خون جو چھوڑا جاتا ہے وہ ربیعہ بن حارث بن عبد المطلب کا خون ہے (ربیعہ بنو لیث میں پرورش پا رہا تھا کہ قبیلہ ہذیل نے اسے مار ڈالا) اور جاہلیت کا وہ پہلا خون ہے جس کو میں چھوڑتا ہوں۔

اے لوگو! شیطان اس بات سے مایوس ہو گیا ہے کہ تمھارے ملک میں اس کی کبھی پوجا کی جائے گی، لیکن وہ اس بات سے خوش ہے کہ پرستش کے سوا ان امور میں جن کو تم حقیر سمجھتے ہو اس کی اطاعت کی جائے گی لہٰذا اپنے دین کے بارے میں اس سے بچو۔

انما النسیٔ زیادۃ فی الکفر
یضل بہ الذین کفروا یحلونہ
عاما ویحرمونہ عاما لیواطئوا عدۃ
ما حرم اللہ فیحلوا ما حرم اللہ
الا وان الزمان قد استدار
کہیئتہ یوم خلق اللہ السموات
والارض وان عدۃ الشھور عند
اللہ اثنا عشر شھرا فی کتاب
اللہ یوم خلق السموات والارض
منھا اربعۃ حرم ثلاثۃ متوالیۃ
ذوالقعدۃ و ذی الحجۃ والمحرم
ورجب الفرد الذی بین جمادیٰ
وشعبان۔

نسی کفر میں زیادتی ہے اس کے ذریعہ سے جو لوگ کافر ہیں گمراہ کیے جاتے ہیں ایک سال تو اس (مہینہ) کو حلال کر لیتے ہیں اور ایک سال حرام کر لیتے ہیں تاکہ ان (مہینوں) کا شمار پورا کرلیں جن کو اللہ نے حرام کیا ہے اور اس طرح سے جس کو اللہ نے حرام کیا ہے اسے حلال کر لیں۔

خبردار زمانہ چکر کاٹ کر اسی صورت پر آگیا ہے جس دن اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تھا مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک بارہ مہینے ہے اللہ کی کتاب میں جس دن اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، ان میں سے چار مہینے حرام (یعنی مقدس) ہیں یعنی تین مہینے ذوی القعدہ، ذوی الحجہ اور محرم تو مسلسل ہیں اور رجب اکیلا ہے جمادیٰ اور شعبان کے درمیان۔

یا ایھا الناس فان لکم علیٰ
نسائکم حقا ولھن علیکم حقا
لکم علیھن ان لا یوطئن فرشکم
احدا تکرھونہ وعلیھن ان
لا یاتین بفاحشۃ مبینۃ فان فعلن
فان اللہ قد اذن لکم ان تھجروا
ھن فی المضاجع وتضربوھن

اے لوگو تمھاری عورتوں پر تمھارا حق ہے، اور ان کا تم پر حق ہے، تمھارا حق ان پر یہ ہے کہ وہ تمھارے بچھونے پر کسی کو نہ لٹائیں جس کو تم ناپسند کرتے ہو اور اگر وہ بُرا کام کریں تو خدا کی طرف سے تمھیں اجازت ہے کہ تم ان کو بستروں سے الگ رکھو۔ اور ان کو ایسی مار مارو جس سے ان کا بدن نہ

ضرباً غیر مبرح فان انتهین
فلهن رزقهن وکسوتهن
بالمعروف واستوصوا بالنساء
خیر فانهن عندکم لا یملکن
لانفسهن شیئاً وانکم انما
اخذتموهن بامانة الله واستحللتم
فروجهن بکلمة الله۔

نہ ٹوٹے۔ اگر وہ باز آجائیں تو ان کا کھانا کپڑا دستور کے موافق دو اور عورتوں کے ساتھ نیک سلوک کرو کیونکہ وہ تمھاری دست نگر ہیں اور خود مختار نہیں ہیں بلکہ تم نے ان کو اللہ کی امانت کے طور پر لیا ہے اور اللہ کے حکم سے وہ تمھارے لیے مباح ہوئی ہیں۔

فاعقلوا ایا ایها الناس واسمعوا
قولی فانی قد بلغت قولی وترکت
فیکم ما ان استعصمتم به فلن
تضلوا ابداً کتاب الله وسنة
نبیه۔

اے لوگو میری بات سنو اور سمجھو کیونکہ میں نے تمھیں اپنی بات پہنچادی ہے اور تم میں ایسی چیز چھوڑی ہے کہ اگر تم اسے مضبوطی سے پکڑلو تو کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ وہ چیز کتاب اللہ اور سنتِ نبوی ہے۔

ایها الناس! قولی واعلموا ان کل
مسلم اخو المسلم وان المسلمین
اخوة فلا یحل لامرئ من مال اخیه
الا ما اعطاه ایاه عن طیب نفس
فلا تظلموا انفسکم الا هل بلغت

اے لوگو! میری بات سنو، اور سمجھو کیونکہ میں نے تمھیں اپنی بات پہنچادی ہے سنو اور جان لو کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، اور تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں پس کسی شخص کے لیے اپنے بھائی کا مال حلال نہیں سوائے اس کے جو وہ خوشی سے اسے دے پس اپنے نفسوں پر ظلم نہ کرو، کیا میں نے حکم الٰہی پہنچادیا ہے۔؟

فذکر انهم قالوا، اللهم نعم
فقال رسول الله، اللهم اشهد

لوگوں نے کہا، ہاں، پھر رسول خداؐ نے کہا کہ اے خدا تو اس بات کا شاہد ہے۔

یہ حج حجۃ البلاغ کہلاتا ہے اور حجۃ الوداع بھی۔ کیونکہ اس کے بعد آنحضرت ؐ نے پھر حج نہیں کیا۔ اس سے پہلے آپؐ دو حج کر چکے تھے۔ حجۃ الوداع کے ساتھ آپؐ نے عمرہ بھی کیا۔ پس یہ تین حج ہوئے۔ ذوالحجہ سنہ ۱۰ھ کے باقی دنوں میں آپؐ مدینہ واپس تشریف لے گئے۔

حجۃ الوداع کا یہ خطبہ اپنی افادیت اور معنویت کے اعتبار سے مسلمانوں کے لیے درحقیقت ایک وصیت نامہ ہے۔ یہ خدا کے آخری نبی کا اپنی اُمت کے نام اور اس کے واسطے سے دُنیا کے نام آخری پیام ہے۔ اس پیام میں کیا کچھ نہیں ہے؟ وہ دستورِ حیات ہے کہ اگر آج مسلمان اسے اپنا لیں تو صحیح معنی میں خیر امم بن جائیں اور اگر دُنیا اسے اختیار کر لے تو اس کے سارے مفاسد ختم ہو جائیں۔ وہ تمام مسائل جنھوں نے دُنیا کو ہلاکت، بربادی اور تباہی کے دہانے پر لا کر کھڑا کر دیا ہے خود بخود حل ہو جائیں، اور امن و عافیت کی چار سو عملداری ہو جائے، یہ دُنیا فردوسِ بریں بن جائے!

تیسری منزل

خلافتِ راشدہ کا عہدِ سعادت

خلفائے راشدینؓ

۱: ابوبکر صدیقؓ
۲: عمر بن الخطابؓ
۳: عثمان بن عفانؓ
۴: علی ابن ابی طالبؓ
۵: حسن بن علیؓ ابن ابی طالب

خلیفہ تھے اُمّت کے ایسے نگہباں

ہو گلّہ کا جیسے نگہبانِ چوپاں

سمجھتے تھے ذمّی و مُسلم کو یکساں

نہ تھا عبد و حُر میں تفاوت نمایاں

رہِ حق میں تھی دوڑ اور بھاگ اُن کی

فقط حق پہ تھی جس سے تھی لاگ اُن کی

بھڑکتی نہ تھی خود بہ خود آگ اُن کی

شریعت کے قبضے میں تھی باگ اُن کی

جہاں کر دیا نرم، نرما گئے وہ

جہاں کر دیا گرم، گرما گئے وہ

محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم تراھم رکعاً سجداً یبتغون فضلاً من اللہ ورضواناً ٥ سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود ذالک مثلھم فی التوراۃ ومثلھم فی الانجیل ٥ کزرع اخرج شطئہ فآزرہ فاستغلظ فاستویٰ علیٰ سوقہ یعجب الزراع لیغیظ بھم الکفار ٥

(محمد رسول اللہ اور ان کے ساتھی کافروں کے مقابلے میں سخت اور آپس میں مہربان ہیں۔ تم انھیں دیکھو گے رکوع کناں اور سجدہ ریز، اللہ تعالیٰ کے فضل اور رضامندی کی جستجو میں لگے ہیں۔ ان کے آثار بہ وجہ تاثیر سجدہ کے ان چہروں پر نمایاں ہیں۔ اُن کے یہ اوصاف توریت میں ہیں اور انجیل میں اُن کا وصف یہ ہے کہ جیسے کھیتی، جس نے اپنی سوئی نکالی پھر اسے قوی کیا۔ پھر وہ اور موٹی ہوئی، پھر تنے پر سیدھی کھڑی ہو گئی کہ کسانوں کو بھلی معلوم ہونے لگی تاکہ ان (مسلمانوں) سے کافروں کو جلن میں مبتلا کرے)

سانحۂ عظیم!

عمر فاروقؓ کا اضطراب، صدیقِ اکبرؓ کی استقامت

آں حضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا حادثۂ وفات اس چرخِ نیلگوں کے نیچے اور اس کرۂ ارض پر سب سے بڑا سانحہ تھا۔ اس سانحے کے بعد کوئی سانحہ اور اس غم کے بعد کوئی غم، غم نہ رہ گیا۔

وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا، خدا کی طرف سے براہِ راست رشد و ہدایت کا دور ختم ہو گیا۔ جو کچھ معلوم ہونا تھا وہ معلوم ہو گیا۔ اب قیامت تک کے لیے یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ:

چہ گفت آں خداوندِ تنزیل و وحی
خداوندِ امر و خداوندِ نہی

اس سانحے نے مسلمان اکابر تک کو بدحواس کر دیا تھا، ابنِ خلدون نے اس سانحے کا مرقّع ان الفاظ میں کھینچا ہے:

"رسولِ خدا ؐ کا انتقال دوشنبہ کو دوپہر کے وقت ربیع الاول کی دوسری تاریخ کو ہوا۔ اور اگلے دن سہ شنبہ کو دوپہر کے وقت آپ مدفون ہوئے۔

جب لوگوں کے درمیان رسولِ خدا ؐ کی وفات کا اعلان ہوا تو اس وقت حضرت ابوبکرؓ موجود

منہ تھے کیونکہ وہ اپنے اہل و عیال کے پاس سُنخ کے محلے میں گئے ہوئے تھے مگر حضرت عمرؓ موجود تھے وہ اٹھے اور لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ منافقین میں سے بعض آدمی کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ مر گئے حالانکہ وہ مرے نہیں بلکہ اپنے پروردگار کے پاس گئے ہیں جس طرح حضرت موسیٰؑ گئے تھے وہ یقیناً واپس آئیں گے اور منافقین کے ہاتھ پاؤں کاٹیں گے۔

جب حضرت ابوبکرؓ کو رسول خداؐ کے انتقال کی خبر پہنچی تو وہ اُن کے حجرہ میں داخل ہوئے اور کپڑا ہٹا کر ان کے چہرے کو بوسہ دیا اور کہا:

"آپؐ پر میرے ماں باپ قربان ہوں آپؐ نے آخر اس موت کا مزا چکھا جس کو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے لیے مقدر کر رکھا تھا۔ اس کے بعد آپؐ پر ہرگز کوئی موت نہیں آئے گی۔"

پھر آپ باہر آئے اور دیکھا کہ حضرت عمرؓ وہی کلمات کہہ رہے تھے حضرت عمرؓ سے کہا کہ خاموش رہو۔ مگر حضرت عمرؓ نے ان کی بات پر کان نہ دھرا۔ پھر حضرت ابوبکرؓ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ لوگ حضرت عمرؓ کو چھوڑ کر حضرت ابوبکرؓ کے پاس چلے آئے۔

حضرت ابوبکرؓ نے اللہ کی حمد و ثنا کے بعد کہا:

"اے لوگو! جو شخص محمد (صلعم) کی پرستش کرتا تھا تو بیشک محمدؐ مر گئے مگر جو شخص اللہ کی عبادت کرتا تھا تو بے شک اللہ زندہ ہے جو کبھی نہیں مرے گا۔ پھر آپ نے ان آیات کی تلاوت کی

وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل افان مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم ومن ینقلب علی عقبیه فلن یضر الله شیئا وسیجزی الله الشاکرین۔

"یعنی محمد صلعم اللہ کے محض ایک پیغامبر ہیں۔ اس سے پہلے بھی پیغمبر گزر چکے ہیں پس اگر وہ مر جائیں یا قتل ہو جائیں تو کیا تم اپنے قدموں پر پھر جاؤ گے (یعنی دوبارہ مشرک ہو جاؤ گے) اور جو شخص اپنے پاؤں پر پھر جائے گا۔ تو وہ اللہ کو ہرگز کچھ نقصان نہ پہنچائے گا۔ اور اللہ عنقریب شاکر لوگوں کو جزا دے گا" جب حضرت ابوبکرؓ کی زبان سے یہ آیت سنی تو انھوں نے ایسا محسوس کیا گویا انھیں اس کی تنزیل کا علم نہ تھا حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ جب میں نے حضرت ابوبکرؓ کو یہ آیت تلاوت کرتے ہوئے سُنا تو میں زمین پر گر پڑا اور میرے پاؤں تھرا گئے۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا

کہ رسول خدا صلعم فی الواقع انتقال کر گئے ہیں۔ ایک روایت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اس موقع پر یہ آیت بھی پڑھی تھی۔

انک میت وانھم میتون (یعنی اے نبی بیشک تو مرنے والا ہے اور وہ لوگ بھی مرنے والے ہیں)

جب لوگ اس پریشانی میں تھے تو ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور یہ خبر لایا کہ انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں سعد بن عُبادہ کی بیعت کے لیے جمع ہو رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ایک امیر ہم میں سے اور ایک قریش میں سے ہو۔ یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ اور دیگر مہاجرین ان کی طرف چل دیے۔ بالآخر قریش و انصار کی باہمی کشمکش بیعتِ ابوبکرؓ پر ختم ہو گئی۔

ابوبکر صدیقؓ

ہمتِ او کشتِ ملت را چو ابر
ثانیٔ اسلام و غار و بدر و قبر!

احوال وسوانح

سیرتِ صدیقی کا خلاصہ

حضرت ابوبکر صدیق کے احوال وسوانح کا مختصر سا خاکہ یہ ہے:

نام اور خاندان

نام عبداللہ، کنیت ابوبکر، عرفیت عتیق۔

والد کا نام عثمان جنہیں ابوقحافہ بھی کہتے تھے۔

والدہ کا نام ام الخیر بنتِ صخر۔

نسلاً والدین کا تعلق مکہ کے مشہور خاندان کعب بن سعد بن تیم بن مرہ سے تھا۔ رسول اللہ سے عمر میں تین سال چھوٹے تھے اور تجارت کرتے تھے۔ شیوخ میں سب سے پہلے اسلام لانے والے آپ ہی تھے۔

خلافت کیلیے بیعت

جب رسول اللہ کی رحلت کے بعد سقیفہ بنی ساعدہ میں آپ کی جانشینی کے مسئلے پر مشورہ کرنے کے لیے صحابہ جمع ہوئے تو مہاجرین و انصار میں اختلاف پیدا ہوا۔ انصار اپنے میں سے سعد بن عبادہ کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے اور مہاجرین اس پر راضی نہ تھے۔ جب جھگڑا زیادہ بڑھا تو ابوبکرؓ نے قریش اور مہاجرین کی افضلیت و خدمات کا ذکر کرتے ہوئے انصار سے کہا کہ تم بھی ہمارے بھائی ہو یعنی اگر ہم تمھارے امیر ہیں تو تم

ہمارے وزیر ہو اور اس لیے میں چاہتا ہوں کہ عمرؓ بن الخطاب اور ابوعبیدہؓ بن الجراح میں سے کسی ایک کو منتخب کرلو۔

حضرت عمرؓ نے کہا کہ "جب تک تم زندہ ہو یہ کیونکر ممکن ہے" اور یہ کہہ کر فوراً حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ مار کر اپنی بیعت کا اعلان کردیا اور اس کے بعد اوروں نے بھی بیعت کرلی حضرت علیؓ اور ان کے بعض ساتھی چونکہ رسول اللہؐ کی تجہیز میں مشغول تھے البتہ سقیفہ آکر بیعت نہ کرسکے۔

سعد بن عبادہ اس رسمِ بیعت کے بعد حضرت عمرؓ نے خیال ظاہر کیا کہ اگر سعد بن عبادہ بیعت نہ کریں تو انھیں قتل کردینا چاہیے کیونکہ ان کے رہنے سے تفرقہ کا اندیشہ تھا سعد یہ معلوم کرکے شام چلے گئے۔ لیکن ایک روایت کے مطابق حضرت عمرؓ نے اپنا ایک آدمی شام کی طرف روانہ کیا اور جب انھوں نے بیعت سے انکار کیا تو قتل کردیے گئے۔ یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ خلافت ابوبکرؓ کے بعد یہ حوارن چلے گئے اور حضرت عمرؓ کی خلافت کے دو سال کے بعد انھوں نے ۱۵ سنہ ھ میں انتقال کیا۔

جیشِ اسامہؓ کی روانگی رسول اللہؐ قبل رحلت اسامہؓ بن زید کی قیادت میں ایک لشکر بنوغسان کی سرکوبی کے لیے بھیج رہے تھے لیکن اس لشکر کی روانگی سے پہلے آپؐ کا انتقال ہوگیا۔ آپؐ کے بعد صحابہ نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ لشکر کی روانگی ملتوی کردی جائے۔ لیکن آپ نے کہا کہ جس لشکر کا جھنڈا رسول اللہؐ کھول چکے ہیں میں اس کو لپیٹ نہیں سکتا اور اسے روانہ کردیا۔ راستے میں اسے روم کی فوجیں ملیں اور ان سے مقابلہ ہوگیا۔ لیکن اس کو نمایاں کامیابی ہوئی۔ عہدِ خلافت کی یہ پہلی کامیاب لڑائی تھی۔

مُرتدین کے خلاف اقدام رحلتِ نبوی کے بعد اکثر قبائل مرتد ہوگئے تھے۔ اس لئے ان کے خلاف بھی سخت قدم اٹھایا گیا اور اکثر کو قتل کرکے اسلام کے اُکھڑے ہوئے قدم پھر جمادیے۔

اس وقت پڑوس کی حکومتوں میں فارس اور روم کی حکومتیں بہت بااقتدار تھیں اور آپس میں لڑتی رہتی تھیں۔ شام و فلسطین پر روم کا قبضہ تھا۔ اور عراق پر فارس کا۔

دورِ فتوحات کا آغاز آپ نے ۱۲ سنہ ھ میں خالدؓ بن الولید کی سیادت میں ایک لشکر فارس کی

کی طرف روانہ کیا اور حکومتِ فارس کو شکست دے کر جزیہ دینے پر مجبور کیا۔

۱۳ھ میں سلطنتِ روم کے مقابلے میں شام کی طرف فوجیں روانہ کیں اور انھیں کامیابی ہوئی یرموک کی لڑائی جاری تھی کہ آپ کا انتقال ہوگیا۔

آپ کو بخار آگیا تھا اور جب وہ پندرہ روز تک نہ اترا اور زندگی کی توقع نہ رہی تو آپ نے صحابۂ کبار کو جمع کرکے ان کے مشورہ سے حضرت عمرؓ کو خلیفہ مقرر کر دیا۔

آپ نے ۲۳۔ جمادی الثانی ۱۳ھ۔ ۲۳ اگست ۶۳۴ء کو انتقال کیا اور حجرۂ عائشہؓ میں رسول اللہؐ کے پہلو میں دفن کیے گئے۔ آپ نے ۲ سال تین ماہ تیرہ دن خلافت کی۔ آپ نے اپنے بعد صرف ایک دینار چھوڑا۔

آپ کے عہد میں اسلام کے زیرِ اثر یہ مقامات آچکے تھے،

مکہ۔ طائف۔ صنعا۔ حضرموت۔ خولان۔ زبید۔ رمعہ۔ جند۔ نجران۔ جرش۔ بحرین۔ عراق و شام میں جنگ البتہ ختم نہ ہوئی تھی۔ جاری تھی۔

خصوصیات و ممیّزات

حضرت ابوبکرؓ کی شانِ صدیقیت کا جمالِ رعنا

آں حضرت صلعم کی ذاتِ گرامی کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ کو والہانہ تعلق تھا۔ اس راہ میں اپنا سب کچھ لٹا دینا اپنا حاصلِ حیات سمجھتے تھے۔

میں کھو کے تری راہ میں سب دولتِ دُنیا
سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لیے ہے

اور واقعہ یہ ہے کہ جب تک آپ زندہ رہے تن من دھن سے اسلام اور داعیٔ اسلام کی خدمت کرتے رہے۔

ذیل میں آپ کے بعض خصائص و ممیزات کا اجمالی طور پر ذکر کیا جاتا ہے:

پیدائش ولادتِ سرورِ عالم کے دو برس چند ماہ بعد یعنی ۳ سنہ ولادتِ محمدی (۵۷۳ء) میں حضرت ابوبکر مکۂ معظمہ میں پیدا ہوئے۔ وہیں پلے بڑھے۔ ماں باپ نے نام عبدالکعبہ رکھا تھا۔ لیکن قبولِ اسلام کے بعد آنحضرتؐ نے عبدالکعبہ کو عبداللہ سے بدل دیا۔ خوب رُو اور خوش اندام تھے۔ اسی لیے "عتیق" بھی نام پڑ گیا۔

تجارت دولت مند گھرانے کے فرد تھے، جب سنِ شعور کو پہنچے تو تجارت کو ذریعۂ معاش بنایا۔

اور اس میں خوب پھولے پھلے اور کامیاب رہے۔ تجارت کے سلسلے میں مکے سے باہر بھی جاتے رہتے تھے۔ زیادہ تر شام کی طرف۔

شخصیت آں حضرت صلعم کے تقریباً ہم عمر تھے، بچپن سے دوستانہ تعلقات تھے یہ آنحضرتؐ کی صحبت اور فطرت سلیم کا اثر تھا کہ عہد جاہلیت میں بھی پاک دامن رہے نہ لہو و لعب میں کبھی حصہ لیا نہ خرافات اور لغویات میں، سیرت اور کردار کی بلندی کے باعث اپنے قبیلے اور قوم میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

اسلام کی حلقہ بگوشی حضرت رسول مقبولؐ نے جب اسلام کی دعوت دی تو سب سے پہلے بغیر کسی تامل اور تذبذب کے (مردوں میں) جس نے اس دعوت پر لبیک کہا وہ ابوبکرؓ ہی تھے۔

دردمندی اور خدا ترسی آپ کو خدا نے فطرۃً نرم دل اور بنی نوع انسان کا ہمدرد پیدا کیا تھا۔ آنکھوں میں مروت تھی، دل دردمندی اور خوفِ الٰہی سے بھرا ہوا تھا۔ کبھی کسی کو مصیبت میں نہ دیکھ سکتے تھے۔ جہاں تک بنتا خدا ترسی اور فیاضی سے کام لیتے۔ لوگوں کے ساتھ نیکی اور بھلائی سے پیش آتے۔ جود و کرم کا جوہر دکھا کے غریبوں کی خبر گیری کرتے، محتاجوں کے پیٹ بھرتے اور مظلوم غلاموں کو مول لے کر آزاد کرتے۔

معاملہ فہم اور راست گو آپ کا شمار قریش کے اکابر اور رؤسا میں تھا۔ انساب عرب سے خوب واقف تھے، حالاتِ امم (سابقہ) سے بخوبی آگاہ تھے اس لیے بڑے معاملہ فہم مانے جاتے تھے۔ دار الندوہ میں جو اہم معاملہ پیش آتا اس میں آپ کی رائے زیادہ اہم اور باوقعت تسلیم کی جاتی تھی۔ اتقا اور پرہیزگاری کا یہ عالم تھا کہ کبھی جھوٹ نہ بولتے شراب کو عہدِ جاہلیت ہی میں اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ قوم میں جب کبھی کوئی قتل ہو جاتا خوں بہا کی رقم کا تشخص کرنا اور قاتل کو اپنی کفالت و حراست میں رکھنا خاص آپ کا کام تھا۔

بلال اور ابوبکر حضرت بلال کا آقا اُن کے قبولِ اسلام کے باعث بہت ناراض اور برہم تھا اور طبعاً سفاک اور بے رحم بھی۔ اس نے چاہا بلال اسلام سے دست بردار ہو جائیں۔ جب یہ نہ ہو سکا تو وہ "انتقام پر اتر آیا۔ وہ چلچلاتی ہوئی دھوپ میں تپتی ریت پر انھیں

لٹا دیتا، پھر سینے پر وزنی اور گرم پتھر رکھ دیتا اور کہتا "جب تک لات و عزیٰ پر ایمان نہیں لاؤ گے یونہی گت بنتی رہے گی" مگر اس ظلم و ستم کا جواب بلالؓ کی زبان پر صرف ایک تھا احدٌ احدٌ۔ یعنی اللہ ایک ہے، اللہ ایک ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کی لرزہ خیز نظر سے جب یہ منظر گزرا فوراً بلالؓ کو خرید لیا اور حسبۃً للہ آزاد کر دیا۔

غارِ ثور میں قبولِ اسلام کے بعد جس فداکاری، ایثار اور خلوص کے ساتھ آنحضرتؐ کا ساتھ دیا اس کی کوئی دوسری مثال نہیں مل سکتی۔

ایک مرتبہ اپنا سارا اثاثہ راہِ خدا میں دے دیا۔ رسول اللہؐ نے پوچھا، گھر میں کچھ چھوڑا؟ فرمایا خدا اور اس کا رسولؐ۔

ہجرت کے بعد مدینہ میں جب مسجدِ نبویؐ کے لیے آپ نے زمین خریدی تو اس کی قیمت ابوبکرؓ ہی نے ادا کی۔ ہجرت کے موقع پر اپنی جان خطرے میں ڈال کر آل و اولاد کو یونہی مکے میں بے آسرا اور بے سہارا چھوڑ کر ذاتِ رسالت کے ساتھ ہولیئے اور غارِ ثور میں پناہ گزین ہوئے۔ یہیں کفّار ڈھونڈتے ڈھونڈتے جب قریب پہنچے تو حضرت ابوبکرؓ پر آں حضرتؐ کی خیر طلبی کے باعث اضطراب سا طاری ہوا۔ آپؐ نے کامل سکون کے ساتھ فرمایا لاتحزن ان اللہ معنا (غمگین نہ ہو خدا ہمارے ساتھ ہے۔)

مجاہد کی حیثیت سے آں حضرتؐ کے ساتھ تقریباً تمام غزوات میں جوش اور فداکاری کے ساتھ شرکت کی۔ جب بڑے بڑے کارآزمودہ اور سرد و گرم چشیدہ لوگوں کے پائے ثبات میں لغزش آگئی، ابوبکرؓ کے استقلال اور استقامت، فداکاری اور جاں نثاری، دوستی اور رفاقت میں کوئی فرق نہیں آیا۔

خلافت آنحضرتؐ کے وصال کے بعد تقریباً بالاتفاق آپ کو جانشینِ رسول منتخب کیا گیا۔ اس گراں بار ذمّہ داری کو جس سچائی اور بے لوثی کے ساتھ آپ نے انجام دیا وہ آپ ہی کا حصّہ تھا۔

آں حضرتؐ کی وفات کے بعد جب زکوٰۃ کی عدم ادائی، ارتداد کی کارفرمائی اور نام نہاد

مدعیانِ نبوّت کی دعوت کا سلسلہ شروع ہوا تو ایمان اور کردار کی پوری استقامت کے ساتھ آپ نے ان حالات کا مقابلہ کیا اور بالآخر ان کا استیصال کر کے ہی دم لیا، حالات کی ابتری اور نزاکت کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ تک نے مانعینِ زکوٰۃ کے بارے میں نرمی کا مشورہ دیا لیکن حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا تم جاہلیت میں تو بڑے سخت تھے لیکن انت جبار فی الاسلام اور اسلام قبول کرنے کے بعد پست حوصلہ بن گئے۔ اس موقع پر اگر حضرت ابوبکرؓ سے ذرا بھی کمزوری سرزد ہوتی تو اسلام پھر کبھی نہ ابھر سکتا۔

پہلا خطبۂ خلافت

بیعت کے بعد ابوبکرؓ منبر پر چڑھے اور رسول اللہ کی نشست گاہ سے ایک زینہ نیچے بیٹھے۔ اللہ کی حمد و ثنا بیان کی اور کہا "میں تم لوگوں پر والی بنا دیا گیا ہوں حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں، اگر میں راہ راست پر چلوں تو پیروی کرو اگر کجی اختیار کروں تو مجھے سیدھا کر دو۔ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ بزرگی میں تم سے افضل ہوں۔"

بیت المال میں ابوبکرؓ کا حصّہ

حضرت ابوبکرؓ منصب خلافت پر فائز ہونے کے بعد بھی بہت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی کامیاب تجارت کو چھوڑ کر خلافت کا بارِ گراں اٹھایا اور انتہائی ایثار اور فدویت کے ساتھ زندگی بسر کی۔ انھوں نے لوگوں میں بیت المال سے مساویانہ تقسیم کی کسی کو کسی پر فضیلت نہیں دی، وہ بیت المال سے روزانہ تین درہم بطور مددِ معاش لیا کرتے تھے اور خلیفۂ رسول اللہ کہلاتے تھے۔

وفات

جمادی الآخر ۱۳ھ میں علیل ہوئے، بیماری جب شدّت پکڑ گئی تو حضرت عمرؓ کو اپنا جانشین نامزد کیا (پھر کہا) میں نے بیت المال سے جو روپیہ لیا تھا جب میں مر جاؤں تو فلاں مقام پر جو میرا باغ ہے اُسے فروخت کر کے قیمت بیت المال میں داخل کر دی جائے، ابوبکرؓ نے اپنے غسل کے لیے اپنی بیوی اسماء بنت عمیس کو وصیت دی، انھی نے (وفات کے بعد) انھیں غسل دیا، رات کے وقت دفن کیے گئے۔ ان کی وفات ۲۲ جمادی الآخر ۱۳ھ کو ہوئی۔

نمازِ جنازہ عمر بن خطابؓ نے پڑھائی، وہ اسی مکان میں دفن کیے گئے جس میں رسول اللہ کی قبر ہے، وفات کے وقت ان کی عمر ۶۳ برس کی تھی۔ ان کی خلافت تقریباً دو سال چار ماہ رہی۔

شمائل ابوبکرؓ

ابوبکر گورے، دُبلے پتلے تھے، رخسارے سبک تھے، پسلیاں جھکی ہوئی تھیں، مہندی اور کسم کا خضاب لگاتے تھے۔ ابوبکرؓ کے زمانے میں جن لوگوں سے فتویٰ لیا جاتا تھا وہ یہ تھے علی ابن ابی طالب۔ عمر بن خطاب، معاذ بن جبل، ابی بن کعب زید بن ثابت اور عبداللہ بن مسعود!

زبردست کارنامہ

حضرت ابوبکرؓ کی یوں تو ساری زندگی اسلام اور داعیٔ اسلام کی خدمت میں گزری لیکن آپ کی سب سے بڑی خدمت قرآن کی کتابی صورت میں (مصحف کے نام سے) ترتیب ہے۔ اگر آپ نے بروقت اس طرف توجہ نہ کی ہوتی تو اس سلسلے میں بعد کو مفاسد کے پیدا ہو جانے کا خدشہ تھا۔ لیکن آپ نے بروقت اقدام و اہتمام کر کے قرآن کریم کی سالمیت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پائندہ کر دیا۔

عہد ابوبکرؓ

اگرچہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا زمانہ صرف سوا دو سال کی مختصر مدت پر محدود ہے لیکن یہ سوا دو سال اہمیت کے لحاظ سے اپنے دامن میں ایسے دُور رس فیصلہ کن اور نازک ترمقامات، حالات اور کیفیات کے حامل تھے کہ ان میں سے کوئی ایک واقعہ بھی تاریخ کا رُخ بدل سکتا تھا۔ اگر آپ نے مانعین زکوٰۃ کو ذرا بھی ڈھیل دی ہوتی یا مُرتدین کے ساتھ رعایت کی ہوتی یا باطل مدعیان نبوت کے ساتھ چشم پوشی کی ہوتی یا جیشِ اسامہ کے معاملے میں تاخیر روا رکھی ہوتی یا کم از کم اسامہ کی سپہ سالاری ختم کر دی ہوتی تو ان میں سے ایک واقعہ بھی نتائج کے اعتبار سے اسلام کی تاریخ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کمزور بنا دیتا لیکن آپ نے ہر مرحلے پر ایسے استقلال، استقامت اور حوصلے کا ثبوت دیا کہ لوگوں میں ایک نئی امنگ پیدا ہو گئی۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں میں استقلال پیدا ہوا کہ وہ کوہِ گراں کی طرح ثابت اور مستقل ہو گئے۔

علالت، استخلاف اور وفات!

مسئلۂ جانشینی پر اتفاق و اختلاف کا اظہار

بیماری کا آغاز حضرت عائشہؓ کا بیان ہے:
بیماری اس طرح شروع ہوئی کہ، جمادی الثانی دوشنبہ کے دن آپ نے غسل کیا، سردی تیز تھی بخار آگیا اور طبیعت برابر خراب ہوتی چلی گئی۔

خلافت کے بارے میں مشورے جب مرض کی شدت بڑھ گئی اور اپنے جانشین کی فکر ہوئی تو عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو طلب کیا اور حضرت عمرؓ کے بارے میں رائے دریافت کی۔

حضرت عبدالرحمٰنؓ نے کہا:

آپ ایک ایسے معاملے میں سوال کرتے ہیں جسے آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ بجز اس کے وہ اس سے بھی زیادہ افضل ہیں جیسا آپ انھیں سمجھتے ہیں۔

پھر حضرت عثمانؓ کو طلب کیا، انھوں نے حضرت عمرؓ کی نسبت کہا:

میری دانست میں ان کا باطن اُن کے ظاہر سے اچھا ہے اور ہم میں ان کا جیسا کوئی آدمی موجود نہیں ہے۔

اس پر آپ نے فرمایا:

عثمان تم پر اللہ کی رحمت ہو بخدا اگر میں عمر کو چھوڑ دیتا تو تم سے آگے نہ بڑھتا (یعنی تمھیں خلافت کے لیے منتخب کرتا)

پھر سعید بن زید وغیرہ اکابر انصار و مہاجرین سے مشورہ کیا۔ سب نے حضرت عمرؓ کی تعریف کی حتیٰ کہ بعضوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ خلافت کا اُن سے زیادہ اہل کوئی نہیں۔

بعض دوسرے صحابہ کو ان مشوروں کی بھنک مل گئی۔ کئی آدمی حاضر ہوئے اور ایک شخص نے چلّا کر کہا:

"آپ کل خدا کو کیا جواب دیں گے جب وہ آپ سے عمرؓ کی بابت سوال کرے گا کہ انھیں اپنا جانشین کیوں بنایا؟ کیا آپ اُن کی حدّتِ طبیعت سے واقف نہیں ہیں؟"

یہ بات آپ کو ناگوار گزری، تیمارداروں سے کہا مجھے بٹھا دو۔ پھر جواب دیا:

"تم مجھے خدا سے ڈرانے آئے ہو؟ واللہ وہ ہلاک ہو گیا جو تم پر ظلم کا توشہ اپنے ساتھ لے جائے میں خدا کو جواب دوں گا کہ پروردگار میں مسلمانوں پر تیرے سب سے بہتر بندے کو جانشین بنا آیا ہوں۔ میرا یہ جواب تمام معترضوں کو جا کر سُنا دو۔"

پھر لیٹ گئے اور حضرت عثمانؓ کو بُلا کر حسبِ ذیل تحریر لکھوائی:

پروانۂ خلافت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ وہ وصیّت ہے جو ابو قحافہ کے بیٹے ابوبکر نے دُنیا سے رخصت ہوتے اور آخرت میں داخل ہوتے وقت لکھی ہے۔ یہ ایک ایسا وقت ہے جس میں کافر بھی ایمان لے آتا ہے فاجر بھی یقین کر لیتا ہے۔ کاذب بھی سچ بولنے لگتا ہے۔

مسلمانو! میں نے اپنے بعد تم پر عمر بن خطاب کو خلیفہ مقرر کیا ہے۔ تم اس کی سُننا اور اطاعت کرنا۔ میں نے خدا کے ساتھ، رسول کے ساتھ، دین کے ساتھ، اپنے نفس کے ساتھ اور تمھارے ساتھ پوری پوری خیر خواہی کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر عمرؓ عدل کرے گا تو اس سے میری یہی توقع ہے اور اس کی بابت یہی میرا علم ہے، لیکن اگر وہ بدل جائے تو ہر آدمی کو اپنا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ میں نے تمھارے ساتھ بھلائی کرنا چاہی

ہے لیکن میں عیب نہیں جانتا، ظالم عنقریب خود ہی جان لیں گے کہ کس حال میں ہو جاتے ہیں۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ"!

حضرت عمرؓ کو وصیت

پھر تحریر پر مہر ثبت کرائی اور حضرت عمرؓ کو طلب کر کے وصیت کی:

"اے عمرؓ میں تجھے رسول اللہؐ کے اصحاب پر خلیفہ بنا رہا ہوں۔ جان لے کہ رات میں خدا کا جو حق ہے اسے وہ دن میں قبول نہیں کرتا اور دن میں جو حق ہے وہ رات میں مقبول نہیں ہو سکتا۔ نفل اعمال اس کی بارگاہ میں اس وقت تک قبول نہیں کیے جاتے جب تک فرض اعمال انجام نہ دیے جا چکے ہوں۔ قیامت کے دن انہی لوگوں کی میزان بھاری ہوگی۔ جس میں حق کے سوا کچھ نہیں رکھا گیا ہے۔ لیکن ان لوگوں کی میزان، قیامت کے دن ہلکی ہوگی جنھوں نے یہاں دُنیا میں باطل کا ساتھ دیا اور باطل اُن کے لیے بہت آسان تھا۔ ظاہر ہے اس میزان کو ہلکا ہی ہونا چاہیے جس میں باطل کے سوا کچھ رکھا نہیں گیا۔

اے عمر! نرمی کی آیت کے ساتھ سختی کی آیت اتری ہے یہ اس لیے کہ مومن رغبت اور رہبت (یعنی امید و بیم دونوں سے دوچار رہے لہٰذا تجھے ایسی رغبت نہیں ہونی چاہیئے کہ خدا سے ایسی چیزیں مانگنے لگے جو تیرے لیے مناسب نہیں اور نہ تجھ میں اس درجہ رہبت ہی ہونا چاہیے کہ اپنے ہاتھ کی چیزیں بھی پھینک دے۔

اے عمر! خدا نے دوزخیوں کا ذکر ان کے بدترین اعمال کے ساتھ کیا ہے اور ان کے اچھے عمل نامقبول قرار دے کر مسترد کر دیے ہیں۔ لہٰذا جب تو دوزخیوں کا ذکر کرے تو تجھے صرف اس قدر کہنا چاہیے کہ مجھے امید ہے میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں گا اور خدا نے جنّتیوں کو ان کے بہترین اعمال کے ساتھ یاد کیا ہے کیونکہ ان کی بُرائیاں معاف کر چکا ہے۔ جب تو ان کا ذکر کرے تو کہنا چاہیے میں جنّتیوں کے اعمال میں سے وہ کون سا عمل انجام دوں کہ ان کا سا ہو جاؤں؟

اگر تو میری یہ وصیت یاد رکھے تو کوئی غائب بھی تجھے موت سے زیادہ محبوب نہیں

ہونا چاہیے، مہ ممت جو بہرحال تجھ پر نازل ہونے والی ہے، لیکن اگر تو میری وصیّت کو بھلا دے گا تو پھر تیری نظر میں سب سے زیادہ مکروہ موت ہی ہو گی مگر تو اسے کسی طرح بھی دفع نہیں کر سکے گا۔

وقتِ آخر آپ کی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے،

رَبِّ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ۔

(پروردگار مجھے حالتِ اسلام میں وفات دے اور صالحین سے ملا دے۔)

حضرت ابوبکرؓ کی یہ وصیت جو انھوں نے دُنیا سے رخصت ہوتے وقت حضرت عمرؓ کو فرمائی اس اصول کی نشان دہی کرتی ہے جو اسلام نے حاکم، امیر اور خلیفہ کے لیے وضع کیا ہے اور امرِ واقعہ یہ ہے کہ جب تک یہ اصول نظر سے اوجھل نہیں ہوتے پایا دُنیا مسلمانوں کے قدموں پر جھکتی رہی اور جب یہ اصول نظر سے اوجھل ہو گیا دُنیا نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔

کارِ نبوّت

شاہ ولی اللہؒ محدث دہلوی نے اپنی یگانۂ روزگار کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" میں حضرات خلفائے راشدین کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ ان کا تقابل کیا ہے اور حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں اپنے ایک الفا کا ذکر کرتے ہوئے ان کی مُرتدین سے جنگ کا تذکرہ کیا ہے اور اُسے کارِ نبوّت قرار دیا ہے۔

اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس موقع پر اگر ذرا بھی کمزوری کا اظہار ہوتا تو اسلام ختم ہو جاتا، لیکن وہ ان کی عدیم المثال عزیمت و استقامت تھی جس نے اسلام کو بچا لیا اور بلاشبہ یہ کارِ نبوت ہے!

عمرؓ بن خطاب

ہیبتِ حق است ایں از خلق نیست
ہیبت ایں مردِ صاحب دلق نیست

احوال و سوانح

سیرت فاروقی کا اجمالی جائزہ

حضرت عمرؓ بن خطاب کی حیاتِ گرامی کا مختصر سا مرقعؒ یہ ہے :

نام۔ خاندان۔ کنیّت والد کا نام خطاب۔ کنیّت ابو حفص۔ لقب فاروق۔ اشرافِ قریش میں تھے تیرھویں عام فیل میں پیدا ہوئے۔

دورِ کشور کشائی جب آپ خلیفہ ہوئے تو عراق و شام میں لڑائی جاری تھی۔ اور فتوحات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اس لیے آپ کی تمام تر توجہ انھیں مہموں کو کامیاب و وسیع بنانے میں صرف ہوئی۔ اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اسلام کا صحیح اقتدار جس نے بعد کو امویوں کے زمانے میں ایک مستقل حکومت کی صورت اختیار کی آپ ہی کے عہد میں قائم ہو چکا تھا۔ الغرض آپ کا دور مسلسل فتوحات کا دور تھا۔

خالدؓ بن ولید کی معزولی آپ نے خلیفہ ہوتے کے بعد سب سے پہلے خالدؓ کو معزول کر کے ابو عبیدہؓ کو سر لشکر مقرر کیا۔ اور ستر دن کے محاصرہ کے بعد ۱۴ سنہ ھ میں دمشق فتح ہو گیا۔ اس کے بعد ۱۵ سنہ ء میں بیت المقدس فتح ہوا۔ اس کے بعد جب حلب، انطاکیہ وغیرہ بھی قبضے میں آ گئے تو رومی فوجوں نے مایوس ہو کر شام کو خالی کر دیا۔ اور یہاں سے حکومتِ روما ختم ہو گئی۔

فتح بیت المقدس کے بعد عمروؓ بن العاص کو ۴ ہزار سپاہ کے ساتھ مصر کی طرف روانہ کیا اور مصر فتح ہونے کے بعد فسطاط فتح ہوا اور پھر اسکندریہ (سنہ ۲۰ھ سنہ ۶۴۱ء)۔

سنہ ۲۲ھ میں عمرو بن العاص نے اطرابلس (برقہ) فتح کیا۔ اس کے بعد طرابلس الغرب پر بھی قبضہ ہو گیا۔ عمرو بن العاص نے اس کے بعد افریقیا (تیونس) کی طرف بڑھنا چاہا لیکن آپ نے منع کر دیا۔

دریائے نیل اور بحر احمر کے درمیان خلیج موصل بھی اسی زمانے میں کھودی گئی جسے خلیج امیر المومنین کہتے ہیں۔ (سنہ ۲۳ھ)

ایرانیوں کی شکست

عراق کی طرف جو مہم خلیفۂ اوّل کے زمانے میں بھیجی گئی تھی اس کا انجام بھی حضرت عمر کے زمانے میں ہوا اور فرات کے کنارے عذیب پر ایرانیوں کو سخت شکست ہوئی۔ اس کے بعد ایرانیوں نے اپنا فرماں روا یزدجرد بن شہریار کو مقرر کیا۔ (اس کی عمر صرف ۲۱ سال کی تھی) اور حضرت عمرؓ نے سعد بن ابی وقاصؓ کی سرکردگی میں ایک زبردست فوج روانہ کی اور سنہ ۱۴ھ میں متعدد خونریز لڑائیوں کے بعد اسے قادسیہ میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔

مدائن کی فتح

اس کے بعد مدائن فتح ہوا اور ۱۷ اور ۱۸ھ کے درمیان جلولا، اہواز، سوس اور موصل، تکریت، ماسبذان، قرقلیسیا، جزیرہ، اور آرمینیا پر بھی قبضہ ہو گیا۔ یہ سلسلۂ فتوحات برابر جاری رہا اور ۱۹ اور ۲۰ھ کے مابین، خراسان، ازدشیر، سابور، اصطخر، سردیسیا، دارابجرد، کرمان، سجستان، تستر، ہمدان، مکران، دینور، شیراز، اصفہان، قزوین، طبرستان، وترمل، جرجان، طخارستان، صغد، بلخ اور بلاد دیلم الغرض ایران کا بڑا حصہ قبضے میں آگیا۔ لیکن یزدجرد، شاہ ایران بھاگ کر فرغانہ چلا گیا۔

شہادت

سنہ ۲۳ھ میں حضرت عمرؓ حج سے فارغ ہو کر مدینے پہنچے تو ابولولو مجوسی نے (جو مغیرہ بن شعبہ کا غلام تھا) زہر میں ڈوبے ہوئے خنجر سے آپ پر حملہ کر دیا۔ جب کہ آپ نمازِ فجر میں مشغول تھے

اسی شخص نے بارہ اور صحابیوں کو بھی زخمی کیا جن میں سے چھ جانبر نہ ہو سکے۔ اس کے بعد خود اس نے اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالا۔

کہا جاتا ہے کہ ابولولو نے حضرت عمرؓ سے اپنے مالک مغیرہ کی کچھ شکایت کی تھی اور آپ نے اس شکایت کی کوئی پروانہ کی تھی۔ اس لیے اس نے یہ حرکت کی لیکن اس کے پیچھے غالباً کوئی سیاسی سازش کام کر رہی تھی۔

آپ حضرت عائشہؓ کے مکان میں ابوبکرؓ کے پہلو میں دفن کیے گئے۔

آپ نے ۶۳ سال کی عمر پائی اور مدّتِ خلافت ۱۰سال ایک دن کم چھ مہینے رہی۔

مصر کے محمد حسین ہیکل نے، ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اور عمر ابوالنصر نے اس سازش پر اپنی کتابوں میں تفصیل سے بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ یہ حادثہ صرف سازش ہی کا نتیجہ تھا۔ تفصیلی بحث کا یہ موقع نہیں لیکن اتنا تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اتنی معمولی سی بات پر جو ابولولو سے منسوب کی گئی ہے وہ دنیا کی اتنی بڑی حکومت کے سربراہ کا خون نہیں بہا سکتا تھا جب تک اس کی پشت پر کوئی طاقت نہ ہوتی۔ اور بلاشبہ یہ سازش ہی تھی۔

خصوصیّات و ممیّزات

گوناگوں اور بوقلموں امتیازات و نظائر

حضرت عمرؓ کی شخصیت کی طرح ان کا عہدِ خلافت بھی گوناگوں اور بوقلموں خصوصیات و ممیزات کا آئینہ دار ہے ان سب پر تفصیل کیا اختصار سے بحث کرنے کے لیے بھی ایک پوری کتاب چاہیے لیکن اجمالی طور پر چند خصوصیات پیش کیے جاتے ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ نے اس دُنیا سے رختِ سفر باندھا، حضرت عمر کی نامزدگی قوم نے تسلیم کر لی۔ اور وہ منصبِ خلافت پر فائز ہو گئے۔

حضرت ابوبکرؓ رقیق القلب تھے، رحم دل تھے، بامروّت تھے برخلاف اس کے حضرت عمرؓ سخت مزاج تھے، اصول کے معاملے میں متشدّد تھے، حق کے معاملے میں رعایت اور مروّت کے قائل نہیں تھے لیکن مسندِ خلافت پر متمکن ہونے کے بعد ان میں وہ نرمی آگئی جو اس منصب کے لیے ضروری تھی، لوگ برسرِ منبر انھیں ٹوک دیتے تھے۔ ان پر اعتراض کرتے تھے، ان کی فکر و رائے سے اختلاف رکھتے تھے۔ اور زیادہ تر یہ اختلاف تند و ترش لہجے میں ہوتا تھا لیکن حضرت عمرؓ نے کبھی قوت اور طاقت کے بل پر لوگوں کی آواز دبانے کی کوشش نہیں کی۔

وہ راتوں کو گشت کر کے دیکھتے تھے کہ کون آسودہ حال ہے اور کون فاقہ مست۔ وہ بھوکوں

دیکھ کر لرز جاتے تھے، خود کاندھے پر اناج کی بوری اٹھاتے اور قافلہ میں لے کر پہنچتے تھے۔ وہ لوگوں کو حق دلانے میں ذرا بھی تاخیر روا نہ رکھتے تھے، وہ اپنے غلام کو بھی وہی کھلاتے تھے جو خود کھاتے تھے، وہی پہناتے تھے جو خود پہنتے تھے۔ بحر و بر کی حکومت اُن کے ہاتھ میں تھی لیکن لباس فاخرہ نہ خود پہنا نہ عاملوں اور اپنے گورنروں کو پہننے دیا، ایران و روم کے خزانے ان کے قدموں میں لاکر ڈال دیے گئے، لیکن ان کے دسترخوان کی سادگی میں فرق نہ آیا، ممالک غیر کے سفراء اُن سے ملنے آتے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ یہ زمین پر معمولی سا لباس پہنے ہوئے جو شخص دراز ہے یہی اس پرہیبت و عظمت شخصیت کا حامل ہے، جس کے نام پر باطل لرزتا اور تاحق کانپتا ہے۔

بیت المقدس میں ایک فاتح فوج کے سپہ سالارِ اعلیٰ کی حیثیت سے عمرؓ نے جب قدم رکھا تو پیوند لگا ہوا لباس ان کے بدن پر تھا لیکن رعب و جلال کا یہ عالم کہ اکڑی ہوئی گردنیں انھیں دیکھتے ہی ادب سے جھک گئیں۔

پیدائش حضرت عمرؓ آں حضرتؐ سے ۱۲ سال چھوٹے تھے، جب ذرا سمجھ آئی تو باپ نے اونٹوں کے چرانے کا کام سپرد کر دیا۔ اس کام میں اگر ذرا بھی غفلت کرتے تو سخت گیر باپ کے ہاتھوں پیٹے جاتے۔

اسلام کے آستانے پر عہدِ جاہلیت میں اسلام کے نام اور داعیٔ اسلام کے پیام کے سخت و شدید دشمن تھے۔ ایک مرتبہ اس ارادے سے نکلے کہ آج محمدؐ کا فیصلہ کر کے لوٹوں گا۔ راستے میں معلوم ہوا بہن اور بہنوئی بھی اسلام قبول کر چکے ہیں۔ راستے ہی سے پلٹے اور بہن کے ہاں پہنچے، وہاں تلاوتِ قرآن ہو رہی تھی۔ کلامِ الٰہی کا سننا تھا کہ دل کی دنیا زیر و زبر ہو گئی۔ سرکشی اطاعت سے بدل گئی۔ اسلام قبول کر لیا۔ جس سختی سے اسلام کے مخالف تھے اب اسی جوش کے ساتھ اسلام کے منّاد اور مبلغ بن گئے۔

مہاجر اور مجاہد رسول اللہؐ نے جب مدینے کی طرف ہجرت فرمائی تو کچھ عرصے کے بعد حضرت عمرؓ نے بھی وطنِ مالوف پر ایک الوداعی نظر ڈالی اور بہ ظاہر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک نئے شہر مدینے کی طرف روانہ ہو گئے۔

غزوات میں رسول اللہؐ کے دوش بدوش شرکت کی، استقامت اور پامردی کا ثبوت دیا۔

جنگِ احد میں جب آنحضرت ﷺ کی شہادت کی افواہ مشہور ہوئی تو حوصلے نے جواب دے دیا، تلوار ایک طرف پھینک دی کہ اب لڑکر کیا کریں گے؟ لیکن جب معلوم ہوا یہ افواہ غلط تھی تو پھر اسی جوش وخروش سے شریکِ جنگ ہوگئے۔ بدر سے لے کر تبوک تک تمام جنگوں میں آنحضرت ﷺ کے شریک رہے۔

مسندِ خلافت پر

حضرت ابوبکرؓ کی نامزدگی قوم نے قبول کرلی اور حضرت عمرؓ خلافت کے منصب پر فائز ہوگئے۔ آپ نے ۲۸ جمادی الآخر ۱۳ھ کو زمامِ خلافت ہاتھ میں لی۔ تقریباً ساڑھے دس سال تک اس شان کے ساتھ فرائضِ خلافت انجام دیے کہ وہ تاریخ اسلام کے ایک روشن اور تابناک باب کی حیثیت اختیار کرچکے ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ کی طرح حضرت عمرؓ کا دورِ خلافت بھی بے نفسی، بے لوثی اور فدائیت کا دور تھا، اپنی ذات کے لیے کچھ نہیں چاہا۔ اپنے خاندان کے لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی، کمزور کا ساتھ دیا، مظلوم کی دادرسی کی، ظالم کو سزا دی، انصاف اور مساوات کے معاملے میں بڑی سے بڑی شخصیت کا لحاظ بھی نہیں کیا، جبلہ بن ایہم غسانی ایک چھوٹا موٹا بادشاہ تھا، قبولِ اسلام کے بعد مکے آیا، طواف کی حالت میں ازار پر ایک بدو کا پاؤں پڑگیا، اس کی نخوت اس بدتمیزی کو برداشت نہ کرسکی بدو کے منہ پر طمانچہ ماردیا۔ اس نے دربارِ خلافت میں استغاثہ پیش کیا، فیصلہ جبلہ کے خلاف ہوا، وہ فرار ہوکر مرتد ہوگیا لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے انصاف کی آن پر حرف نہ آنے دیا۔

شہادت

۲۶ ذی الحجہ ۲۳ھ (۶۴۴ء) کو ابولولو ایک غیر مسلم غلام نے نماز کی حالت میں خنجر سے حملہ کرکے آپ کو شہید کردیا۔

وفات کے وقت آپ نے چھ آدمیوں کی ایک مجلس بنادی کہ وہ کثرتِ آرا سے جسے چاہے خلیفہ منتخب کرلے۔ مجلس نے یہ حق اپنے ایک رکن عبدالرحمٰن بن عوف کو دے دیا۔ انھوں نے حضرت عثمانؓ کی خلافت کا اعلان کردیا۔ اور اس طرح ان کی خلافت پر بیعت ہوگئی۔

شہادت اور آخری لمحات

⑤

وفات: ۲۳ ہجری - ۶۴۴ عیسوی

بچپن کے حالات حج سے واپس ہوتے ہوئے جب وادئ ضجنان میں پہنچے تو ساتھیوں سے فرمایا، تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، جسے چاہتا ہے بے روک بخش دیتا ہے۔ اسی میدان میں میں اپنے باپ خطاب کے اونٹ چرایا کرتا تھا، وہ بہت تند خو اور سخت مزاج آدمی تھا۔ اگر میں محنت سے کام کرتا تو تھکا ڈالتا تھا۔ اور سستی کرتا تو بے دردی سے مارتا تھا۔ لیکن اب آج یہ حالت ہے کہ میرے اور خدا کے مابین کوئی نہیں جس سے مجھے کچھ بھی ڈر ہو۔

فیروز ابولولو حضرت کے قاتل کا نام فیروز تھا۔ ابولولو کی کنیت سے مشہور تھا اور جنگ نہاوند میں قید کیا گیا تھا۔

فاروقی تدبر مشہور ہے۔ آپ نے یہ قاعدہ بنا رکھا تھا کہ بالغ عجمی غلاموں کو مدینے میں آنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ ابولولو بھی مدینے سے باہر کوفے میں اپنے آقا مغیرہ بن شعبہ کے پاس رہتا تھا۔ بعد میں مغیرہ نے لکھا کہ یہ غلام بڑا کاریگر ہے، آپ اسے مدینے میں رہنے کی اجازت دے دیجیے حدادی، نقاشی اور نجاری میں ماہر ہے اور مسلمانوں کے لیے بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے حضرت نے

اُسے آنے کی اجازت دے دی مغیرہ نے اس پر سو درہم ماہوار محصول باندھا۔ اور کام کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا۔

ارتکاب جرم سے پیشتر ہی حضرت عمرؓ کو اس شخص کے متعلق شبہ ہو گیا تھا۔ مگر اسلام کی آزادی میں کسی شخص کو محض شبہ کی بنا پر گرفتار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ابولولو نے اس آزادی سے پورا فائدہ اٹھایا اور خلیفہ کے قتل میں کامیاب ہو گیا۔

واقعہ یوں ہے کہ ایک دن ابولولو نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی کہ میرے آقا نے مجھ پر محصول بہت زیادہ باندھ رکھا ہے۔

آپ نے پوچھا:

تجھے کیا کام آتا ہے؟

اس نے بتایا کہ فلاں فلاں کام کر سکتا ہوں۔

فرمایا:

تیرا ہنر دیکھتے ہوئے محصول زیادہ نہیں معلوم ہوتا۔

وہ اس جواب سے ناراض ہو گیا اور بڑبڑاتا چلا گیا۔ چند روز بعد آپ کی نظر اس پر پھر پڑی اور سوال کیا:

سنا ہے تجھے ایسی چکی بنانی آتی ہے جو ہوا سے چلے۔

غلام نے تیکھی نگاہوں سے امیر المومنین کو دیکھ کر جواب دیا:

ہاں یہ سچ ہے۔ میں آپ کے لیے ایک ایسی چکی بناؤں گا جس کا چرچا دنیا میں ہمیشہ باقی رہے گا۔

یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور آپ نے حاضرین سے فرمایا:

غلام نے مجھے دھمکی دی ہے۔

اس گفتگو کے چند ہی روز بعد اس نے قاتلانہ حملہ کر دیا۔

قاتلانہ حملہ

عمرو بن میمون حادثے کے شاہد عینی ہیں۔ ان کی روایت ہے کہ اس وقت میں امیر المومنین کے بالکل قریب کھڑا تھا میرے اور

اُن کے درمیان ابن عباس کے سوا کوئی دوسرا نہ تھا۔

فجر کا وقت تھا اور آپ کی عادت تھی کہ مسجد میں صفوں کے مابین خود چلتے اور انھیں سیدھا کرتے۔ جب دیکھتے کہ کوئی کجی یا خلل باقی نہیں تو نماز شروع کرتے۔ اس دن بھی ایسا ہی ہوا مگر تکبیر کے بعد اچانک آپ کی چیخ سنی گئی۔

کتّے نے مجھے کاٹ کھایا۔

دراصل غلام نے حملہ کر دیا تھا۔ وار کر کے اس نے بھاگ جانا چاہا۔ ہاتھ میں خون آلودہ چھُری تھی جس کا دستہ بیچ میں تھا اور دونوں طرف تیز پھل لگے تھے۔ وہ چھُری ہلاتا آگے بڑھا، دائیں بائیں جسے پاتا مارتا ہوا راستہ صاف کرنے لگا۔ اس طرح اس کے ہاتھ سے تیرہ آدمی زخمی ہوئے جن میں سے سات آدمی مر گئے۔ عبدالرحمٰن بن عوف نے یہ دیکھ کر ایک بھاری سا کپڑا اس پر ڈال دیا۔ جب غلام نے دیکھا کہ گرفتار ہوا چاہتا ہے تو خودکشی کر لی، ساتھ ہی عبدالرحمٰن نے اس کا سر بھی کاٹ لیا۔

زخم کھانے کے بعد

عمرو بن میمون کہتے ہیں زخم کھا کر آپ نے عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو ہاتھ پکڑ کر امامت کے لیے آگے بڑھایا۔ قرب وجوار کے لوگ یہ ماجرا دیکھ رہے تھے لیکن مسجد کے دوسرے لوگوں کو کچھ خبر نہ تھی مگر جب اچانک امیرالمومنین کی آواز اُن کے کان میں نہ پہنچی تو بہت متعجب ہوئے اور سبحان اللہ کا ایک زیرِلب شور برپا ہو گیا۔ عبدالرحمٰن بن عوف نے نماز بہت جلد ختم کر دی۔

مسلمانوں کی پریشانی

پھر آپ کو گھر اٹھا لے گئے۔ راوی کہتا ہے ہم ساتھ گئے اس وقت مدینے میں رنج و غم کا وہ عالم تھا، گویا آج سے پہلے کوئی مصیبت پڑی ہی نہیں۔ کوئی کہتا خیریت ہوئی، اچھے ہو جائیں گے۔ کوئی کہتا میں ڈرتا ہوں، اللہ رحم کرے!

خوفِ قیامت

ابن عباس کہتے ہیں میں حضرت علیؓ کے یہاں گیا ہوا تھا کہ امیرالمومنین کے گھر سے نوحے کی آواز بلند ہوئی ہم دونوں دوڑ پڑے۔ اُم کلثوم چلّا رہی تھیں ہائے عمر!" ان کے ساتھ اور بہت سی عورتیں بھی رو رہی تھیں اور گھر اُن کے

گریے سے گونج اٹھا تھا۔ امیرالمومنین نے ہمیں دیکھ کر فرمایا:

"واللہ! اگر زمین کی تمام دولت بھی میرے قبضے میں ہوتی تو اُسے قیامت کی ہولناکی کے مقابلے میں دے دیتا۔ کاش خلافت کے معاملے میں مجھے کچھ دینا پڑے نہ لینا!"

وصیّت

پھر اپنے صاحبزادے عبداللہ سے فرمایا:

"حساب لگاؤ کہ مجھ پر کتنا قرض ہے۔"

حساب میں تقریباً چھیاسی ہزار درہم نکلے۔ فرمایا:

"اگر عمر کے خاندان کا مال یہ بار اتار سکے تو اتار دینا ورنہ خاندان عدی بن کعب سے مدد مانگنا۔ اگر اس کی مدد کافی نہ ہو تو قریش سے مدد مانگنا، قریش سے آگے نہ بڑھنا۔ اس قرض کا ادا کرنا بہرحال یہ تیرے ذمے ہے۔"

جب حالت خراب ہونے لگی تو حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، عبدالرحمن بن عوفؓ، طلحہ بن عبیداللہؓ اور زبیر بن عوامؓ کو طلب کیا۔

حضرت علیؓ سے فرمایا:

شاید یہ لوگ رسول اللہؐ سے تمھاری قرابت، رشتہ داری اور اس علم و تفقہ کا خیال کریں جو خدا نے تمھیں بخشا ہے۔ اگر یہ معاملہ (خلافت) تمھارے ہاتھ میں آجائے تو خدا سے ڈرتے رہنا۔

پھر حضرت عثمانؓ سے کہا:

شاید یہ لوگ رسول اللہؐ سے تمھاری قرابت، تمھاری عمر اور وجاہت کا خیال کریں اگر یہ معاملہ تمھارے ہاتھ میں آجائے تو خدا سے ڈرتے رہنا اور اپنے خاندان کو مسلمانوں کی گردن پر سوار نہ کر دینا۔

پھر فرمایا:

"یہ چھوؤں آدمی ایک الگ مکان میں بیٹھ کر مشورہ کریں۔ اگر کسی ایک شخص کے انتخاب پر اُن کا اتفاق ہو جائے تو اُس آدمی کی گردن مار دی جائے جو اُن کے فیصلے کی مخالفت کرے

اگر خلافت کے لیے سعدؓ کا انتخاب کیا گیا تو وہ اس کے اہل ہیں ورنہ جو کوئی بھی خلیفہ بنایا جائے وہ ان سے مدد لے کیونکہ میں نے ان کی کسی کمزوری یا خیانت کی وجہ سے معزول نہیں کیا تھا میرا یہ لڑکا تمھارے شوروں میں شریک رہے گا مگر خلافت میں اس کا کوئی حصّہ نہیں ہے۔

لوگوں کی خواہش تھی کہ آپ اپنا جانشین خود ہی مقرر کر جائیں، بار بار اصرار کیا جاتا تھا مگر آپ انکار ہی کرتے رہے۔

پھر آپ نے عبداللہ بن عمر کے ذریعے حضرتِ عائشہ سے حجرۂ نبوی میں اپنی تدفین کی اجازت چاہی۔

انھوں نے واپس آ کر کہا:

امیر المومنین آپ کی آرزو پوری ہو گئی۔

آپ بے اختیار چلّا اٹھے:

الحمدللہ! اس جگہ سونے سے زیادہ مجھے کوئی چیز بھی عزیز نہ تھی۔

اصحابِ شوریٰ کیلئے انتظام وفات سے ایک ساعت پہلے ابوطلحہ انصاری کو طلب کر کے فرمایا:

تم اپنے پچاس انصاریوں کو لے کر ان چھوؤں اصحابِ شوریٰ کے ساتھ رہو۔ غالبؔ یہ اپنے میں سے کسی کے گھر میں جمع ہوں گے تم اس گھر کے دروازے پر کھڑے رہنا کسی دوسرے کو اندر نہ جانے دینا۔ ان کا پیچھا اس وقت تک نہ چھوڑنا جب تک اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب نہ کر لیں۔ خدایا! تو ہی ان میں میرا جانشین ہے۔

دردناک بیان جب وقت آخر ہوا تو صاحبزادے سے فرمایا جو گود میں آپ کا سر لیے ہوئے بیٹھے تھے:

میرا منہ زمین پر رکھ دے شاید خدا کو مجھ پر ترس آجائے اور رحم فرمائے۔

مغیرہ ابن شعبہ کہتے ہیں:

دفن کے بعد میں حضرت علیؓ کے پاس گیا، کیونکہ حضرت عمرؓ کے بارے میں ان کی رائے

سننا چاہتا تھا۔

حضرت علیؓ نے کہا:

عمرؓ پر اللہ کی رحمت، وہ اس معاملہ (خلافت) کی تمام بھلائی لے گئے۔ اور اس کے شر سے نجات پا گئے۔

آپ کی وفات پر عبداللہ بن مسعود اس قدر روئے کہ سنگ ریزے ان کے آنسوؤں سے تر ہو گئے۔ کہنے لگے:

عمرؓ اسلام کا بہت مستحکم قلعہ تھے، لوگ اس میں داخل ہوتے تھے اور نکلتے نہیں تھے لیکن عمرؓ کی وفات کے بعد اس قلعے میں شگاف پڑ گیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کا یہ قول بالکل درست اور بجا ہے کہ اس میں کوئی شبہ نہیں حضرت عمر کی شہادت بہت بڑا حادثہ ہے۔ تاریخ اسلام کا یہاں سے ایک باب بند ہوتا ہے اور ایک نیا باب شروع ہوتا ہے یعنی حضرت عثمانؓ کی خلافت و شہادت!

حضرت عثمانؓ کی ذاتِ گرامی کا جہاں تک تعلق ہے وہ مجموعۂ صفات و حسنات تھے، وہ یکے از اصحاب عشرہ مبشرہ تھے۔ انھوں نے راہِ اسلام میں بڑی بڑی قربانیاں دی تھیں، وہ اسلام کے مہاجرینِ اوّل میں شامل تھے۔ انھوں نے اپنی دولت کا بڑا حصہ خوشی اور رضامندی سے اسلام کی راہ میں خرچ کیا، ان کی نیکی، ان کا تحمل، ان کی سادگی، یہ سب چیزیں ایسی ہیں جن کی صداقت اور حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔

یہ بھی امر واقعہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں بھی حضرت عثمانؓ کو شرف تقرب حاصل تھا۔ اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ آپ ذی النورین تھے یعنی یکے بعد دیگرے آپ کی شادی آنحضرتؐ کی دو صاحبزادیوں سے ہوئی، یہ کوئی معمولی اعزاز نہیں۔ اس اعزاز سے اندازہ ہوتا ہے کہ نگاہِ رسولؐ میں آپ کی کتنی وقعت تھی!

لیکن بدقسمتی یہ تھی کہ حضرت عثمانؓ نے ان لوگوں پر بھروسہ کر لیا جو نہ اسلام کے دوست تھے نہ حضرت عثمانؓ کے۔ یہ لوگ صرف اپنی ذات کے دوست اور خیر خواہ تھے۔ ان کے پیشِ نظر صرف اپنی سربلندی اور منفعت تھی حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے اغراض و مقاصدِ مشئومہ کے حصول

کے لیے حضرت عثمانؓ جیسی مقدس و محترم ہستی کو بھینٹ چڑھانے میں بھی تامّل نہیں کیا۔

حضرت عثمانؓ مرتبۂ شہادت پر فائز ہونے کے بعد اپنے رب سے جا ملے لیکن ان کے حادثۂ شہادت کے بعد مسلمانوں میں رزم آرائی ہوئی اور جس طرح ان کی قوت و حشمت کا چراغ گُل ہوا، اور جس طرح انھوں نے پیکارِ باہمی میں مبتلا ہو کر اسلام کے مفادِ عمومی کو نقصان پہنچایا۔ یہ ایک ایسا المیہ ہے جس پر تاریخ کا ہر طالب علم خون کے آنسو بہانے پر مجبور ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ شہادتِ عثمان رضؓ کے بعد فتنوں کا دروازہ کھل گیا اور مسلمانوں کی جمعیت منتشر اور پراگندہ ہو گئی اور اسلامی سیاست پر وہ قومیں غالب آگئیں جنھوں نے اسلام کو مجروح کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔

عثمان بن عفانؓ

خداوندِ شرم و خداوندِ دیں!

احوال وسوانح

سیرتِ عثمانی کا ایک دل آویز مرقع

حضرت عثمانؓ ذی النورین کے مختصر احوال وسوانح یہ ہیں:

آغاز خلافت: ۲۳ھ - ۶۴۴ء

خلافت جب حضرت عمرؓ کو اپنی موت کا یقین ہو گیا تو آپ نے عبدالرحمن بن عوفؓ کو بلا کر کہا کہ "میں تم کو خدمتِ خلافت سپرد کرنا چاہتا ہوں" انھوں نے کہا کیا علیؓ سے آپ نے پوچھ لیا ہے؟

آپ نے جواب دیا۔ "نہیں"

یہ سن کر عبدالرحمن بن عوفؓ نے کہا: تو پھر میں قبول نہ کروں گا۔

اس کے بعد آپ نے چھ صحابہ کا نام لیا۔ علیؓ۔ عثمانؓ۔ زبیرؓ۔ سعدؓ۔ عبدالرحمانؓ۔ طلحہؓ اور کہا کہ مشورے کے بعد انھیں میں سے کسی کو خلیفہ منتخب کر لینا۔ اگر ان میں سے پانچ کسی پر متفق ہو جائیں اور چھٹے کو اختلاف ہو تو اسے قتل کر دو، اسی طرح اگر چار کا کسی پر فیصلہ ہو اور دو کو اختلاف ہو تو ان دونوں کو قتل کر دو۔ لیکن اگر رائیں برابر ہوں تو پھر عبدالرحمن بن عوف کی رائے فیصلہ کن سمجھی جائے۔

جب یہ چھ صحابہ مشورے کے لیے اکٹھے ہوئے تو عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے کہا تم میں سے کون دعوائے خلافت سے دست بردار ہونا چاہتا ہے۔ یہ سن کر چار نے علیؓ اور عثمانؓ کے حق میں اپنی دست برداری کا اعلان کر دیا اور عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے حضرت عثمانؓ کے حق میں بیعت کر لی۔

نام اور خاندان

حضرت عثمانؓ کے والد کا نام عفان تھا۔ آپ ۶ عام الفیل میں پیدا ہوئے تھے۔ اور رسول اللہ صلعم کے بڑے خصوصی مقربین میں تھے۔

بیعت کے بعد حضرت عثمانؓ نے اکثر ان عمال کو جو حضرت عمرؓ کے زمانے میں تھے اپنی جگہ پر قائم رکھا اور حسب وصیت حضرت عمرؓ مغیرہ بن شعبہ کو کوفہ کی گورنری سے ہٹا کر سعد بن ابی وقاص کو ان کی جگہ متعین کیا۔ اس کے بعد جوں جوں زمانہ گزرتا گیا آپ نے اکثر پرانے عمال کو ہٹا کر نئے عمال مقرر کیے جو اُن کے اقربا میں سے تھے۔

لشکر کشی اور فتوحات

آرمینیا حضرت عمرؓ کے زمانے میں فتح ہو گیا تھا لیکن حضرت عثمانؓ کے زمانے میں اس نے سرکشی اختیار کی تو آپ نے اس کے خلاف لشکر کشی کی اور اسی سلسلے میں اور متعدد مقامات پر بھی قبضہ ہو گیا۔ (۲۵ھ)

اسی سال امیر معاویہؓ روم پر حملہ کر کے عموریہ تک پہنچ گئے۔ اور انطاکیہ اور طرطوس کے درمیان بہت سے قلعوں پر قبضہ کر لیا۔

امیر معاویہؓ نے حضرت عمرؓ کے زمانے میں جزیرۂ قبرص پر تاخت کی اجازت چاہی تھی لیکن حضرت عمرؓ نے اس بحری مہم کی اجازت نہیں دی۔ جب حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے ان سے اجازت لے کر بحری بیڑہ تیار کیا اور ۳۰ھ میں قبرص کا محاصرہ کر لیا۔ (عہدِ اسلام کا یہ پہلا بحری بیڑہ تھا۔)

شمالی افریقہ پر حملہ

شمالی افریقہ پر بھی آپ کے زمانے میں حملہ کر کے رومی فوجوں کو شکست دی گئی۔ اور روم کا بادشاہ جرجیر قتل ہوا۔ اس کے بعد اندلس پر حملہ ہوا اور اس میں بھی کامیابی حاصل ہوئی۔

اسکندریہ پہلے فتح ہو چکا تھا لیکن اس دوران میں روم کا قبضہ پھر ہو گیا تھا۔ اس لیے اسکندریہ پر دوبارہ حملہ کر کے قبضہ کر لیا گیا۔ (۳۱ھ)

سوڈان بھی منحرف ہو گیا تھا۔ اس لیے اسی سال اسے دوبارہ زیر کیا گیا۔ لیکن سب سے بڑی

فارس کی فتح بھی حضرت عمرؓ کے زمانے میں بعض بلاد فارس پر قبضہ ہو گیا تھا لیکن یہ مہم پوری نہ ہوئی تھی۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اور یزدجرد کے قتل ہونے پر حکومتِ اکاسرہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔

اس فتح کے بعد ایران مسلمان ہو گیا اور وہاں عربوں نے ایک مضبوط حکومت قائم کر لی۔

قسطنطنیہ کا محاصرہ

۳۲ھ میں امیر معاویہ نے قسطنطنیہ کا بھی محاصرہ کیا۔ چونکہ حضرت عثمانؓ نے امارت و ولایت پر زیادہ تر اپنے ہی اعزا و اقارب کو مامور کر رکھا تھا اس لیے لوگوں میں برہمی پیدا ہوئی اور حضرت عثمانؓ سے ان کو معزول کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔

یہ جھگڑا رفتہ رفتہ بہت طول پکڑ گیا اور مدینہ، کوفہ، بصرہ اور مصر سے متعدد جماعتیں مدینہ پہنچ گئیں اور اپنے مطالبات پر زور دینے لگیں۔ ان میں سب سے بڑا مطالبہ یہ تھا کہ مصر کی ولایت سے عبداللہ بن سرح کو ہٹا کر محمد بن ابی بکر کو مامور کیا جائے۔ حضرت عثمانؓ نے مطالبات تسلیم کر لیے اور وعدہ کیا کہ موجودہ عمال کو ہٹا کر دوسرے عمال مقرر کیے جائیں گے۔ چنانچہ آپ نے والیٔ مصر کی معزولی کے لیے ایک تحریر بھی روانہ کر دی، لیکن جب راستے میں اس قاصد کو پکڑ کر یہ تحریر دیکھی گئی تو اس میں حاکمِ مصر ابن ابی سرح کے نام یہ حکم لکھا پایا گیا کہ محمد ابن ابوبکر کو قتل کر دیا جائے۔ یہ دیکھ کر برہمی اور زیادہ بڑھ گئی اور مدینہ پہنچ کر باغیوں نے حضرت عثمانؓ کا محاصرہ کر لیا۔

حضرت عثمانؓ نے کہا کہ یہ تحریر میری نہیں ہے جعلی ہے لیکن کسی نے یقین نہ کیا اور آخر کار ۳۵ھ میں انھیں شہید کر دیا۔

آپ نے ۸۲ سال کی عمر پائی اور ایک دن کم بارہ سال تک آپ نے خلافت کی۔

خصوصیّات و ممیّزات

حضرت عثمانؓ اور ان کے عہد کے خصوصیّات و ممیزات یہ ہیں:

پیدائش مکہ پر ابرہہ کی فوج کشی (عام الفیل) کے چھٹے سال آپ نے اس دُنیا کو اپنے وجود سے رونق بخشی۔ بنوامیہؓ کے خاندان سے تھے۔

تجارت ہوش سنبھالا تو تجارت شروع کر دی، خوب کمایا، خوب کھلایا، دل رحم و مروّت سے معمور تھا۔ کسی سائل کا سوال رد نہیں کیا، خدا نے تجارت میں بہت برکت دی۔ لاکھوں کما ڈالے مگر بڑی دریا دلی سے خرچ بھی کر دیے۔

اسلام حضرت ابوبکرؓ سے بچپن کی دوستی تھی۔ جب انھوں نے اسلام قبول کیا تو عثمان کو بھی تلقین کی۔ آں حضرتؐ کی سیرتِ پاک کا نقش دل پر بیٹھا ہوا تھا، بے چون و چرا حلقہ بگوش اسلام ہو گئے اور اپنی دولت بے دریغ راہِ اسلام میں خرچ کرنے لگے۔

ذی النّورین آپ بے انتہا بُردبار، رحم دل، بامروّت اور خلیق و متواضع تھے۔ آپ کی حیاداری مشہور تھی۔ آں حضرتؐ آپ کو بہت عزیز رکھتے تھے، چنانچہ اپنی ایک صاحبزادی حضرت رقیہؓ سے شادی کر دی، اُن کا جب انتقال ہو گیا تو دوسری صاحبزادی

حضرت امِ کلثومؓ کو آپ کے حبالۂ عقد میں دے دیا۔ اسی باعث آپ ذی النورینؓ کہلائے۔

ہجرتِ اولیٰ

اسلام قبول کرنے کے بعد بے حد اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن پائے ثبات و استقامت میں لغزش نہ آئی۔

پھر آنحضرتؐ کے حکم سے چند مسلمانوں کا جو مختصر سا قافلہ حبشہ کی طرف ہجرت کر کے گیا اس میں حضرت عثمانؓ بھی تھے اور ان کے ساتھ ان کی اہلیہ حضرت رقیہ بھی۔ رسول اللہ صلعم نے یہ منظر دیکھا تو متاثر ہوئے۔ اور دعا دی۔

بعد ازاں جب مسلمانوں کو مکہ سے مدینہ کا اذنِ ہجرت ملا تو حضرت عثمانؓ وہاں بھی ہجرت کر کے ہر چیز سے منہ موڑ کے گھر بار، عزیز، دوست، دولت، ثروت سے کنارہ کش ہو کے وہاں پہنچ گئے۔

رسولؐ کا پیامبر

ایک مرتبہ آنحضرتؐ کی طرف سے پیام بر بن کر آپ مکہ گئے، کفار نے ازراہ شرارت آپ کو واپس نہ آنے دیا۔ آنحضرتؐ حدیبیہ کے مقام پر فروکش تھے (۶ھ) حضرت عثمان کے بارے میں یہ افواہ مشہور ہو گئی کہ کفار نے انھیں قتل کر دیا۔ آنحضرتؐ نے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر مسلمانوں سے قربانی کی بیعت لی، یہ بات خدا کو اتنی پسند آئی کہ قرآن مجید میں اس کا ذکر یوں آیا:

اذ یبایعونک تحت الشجرۃ

خلافت

یکم محرم ۲۴ھ کو آپ نے زمامِ خلافت سنبھال لی۔

جامع القرآن

حضرت عثمانؓ کی ایک حیثیت جامع القرآن کی بھی ہے۔ آپ نے قرآن جمع کیا اور اسے مرتب کیا۔ طویل سورتوں کو طویل کے ساتھ اور چھوٹی سورتوں کو چھوٹی سورتوں کے ساتھ کر دیا۔

صفاتِ عثمانؓ

حضرت عثمانؓ کاتبِ وحی بھی تھے۔ آپ کا شمار عشرۂ مبشرہ میں بھی ہے عشرہ مبشرہ ان دس صحابیوں کو کہتے ہیں جنھیں دنیا ہی میں جنت کی بشارت مل چکی تھی۔

شہادت

حضرت عثمانؓ بہت نرم دل تھے، اُن کی نرم دلی سے لوگوں نے ناجائز فائدے بھی اٹھائے۔

حضرت عثمانؓ نے مختلف صوبوں میں جو گورنر مقرر کیے تھے۔ ان کے بعض طور طریقوں سے لوگوں کو شکایات پیدا ہوئیں۔ خود حضرت عثمان کے جود و عطا سے بھی محروین کو صدمہ پہنچا اور سازش پر آمادہ ہوگئے۔

رفتہ رفتہ یہ فتنہ یہاں تک بڑھا کہ خاص مدینۃ الرسول میں باغیوں نے آپ کے گھر کا محاصرہ کرلیا، یہ محاصرہ چالیس روز تک جاری رہا حضرت علیؓ نے باغیوں اور مفسدوں کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ راہ راست پر نہ آئے احتیاطاً آپ نے حضرات حسنین علیہم السلام کو بعض دوسرے لوگوں کے ساتھ صدر دروازہ پر حفاظت اور نگہبانی کے لیے مامور کردیا۔

باغی یہ رنگ دیکھ کر پچھلے دروازہ سے گھر میں داخل ہوئے اور شہید کردیا۔

یہ واقعہ ایسا اچانک پیش آیا کہ سارے مدینہ پر ایک سراسیمگی طاری ہوگئی تین روز تک باغیوں کی حکومت رہی، اس کے بعد کہیں جاکر امن و امان قائم ہوا۔

شمائلِ عثمانؓ

اوسط قد والے، خوبصورت گھنی داڑھی والے گندم گوں شخص تھے۔ شانے بڑے بڑے، دونوں شانوں کے بیچ میں فاصلہ، سر کے بال گھن دار، دانت سونے کے تار سے بندھے ہوئے، داڑھی کا خضاب زرد ہوتا تھا عثمانؓ کے زمانے میں فقہا یہ لوگ تھے:

علی ابن ابی طالب، عبداللہ بن مسعود، ابی بن کعب، زید بن ثابت، ابوموسیٰ اشعری، عبداللہ بن عباس، ابو الدردا، ابوسعید الخدری، عبداللہ بن عمر، سمعان بن ربیعہ الباہلی۔

شہادتِ عثمانؓ اور نتائجِ مابعد!

تاریخِ اسلام کا سب سے پہلا اور بہت بڑا المیہ

حضرت عثمانؓ کی شہادت اور تاریخ اسلام کا بہت بڑا المیہ تھی۔ اس کی مختصر روداد یہ ہے:

وفات ۳۵ سنہ ھ ۔ سنہ ۶۵۶ء

عمر فاروقؓ کے جانشین تھے۔ مگر نہایت نرم مزاج، عمر کی درازی کے ساتھ نرمی بھی بڑھتی چلی گئی۔ مروان بن الحکم معاملات خلافت پر حاوی ہو چکا تھا، فتوحات کا سلسلہ بھی رک گیا تھا۔ جنگ جو عرب خالی بیٹھ نہیں سکتے تھے۔ صحیح اور غلط شکایتوں کو لے کر مصر، کوفہ، بصرہ وغیرہ امصار کے سرکش لوگ دار الخلافہ مدینہ پر چڑھ آئے، یہاں کسی نے مزاحمت نہیں کی اور انھوں نے امیر المومنین کے گھر کا محاصرہ کر لیا۔

باغی عقل و فہم سے دُور تھے، جاہلانہ جوش سے دیوانے ہو رہے تھے آپ انھیں بار بار نصیحت کرتے مگر باغیوں پر کسی نصیحت کا بھی اثر نہ ہوتا۔

حضرت علیؓ کا مشورہ باغیوں کی شکایت تھی کہ بنی امیہ اور بنی مروان کے آدمی، حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر قابض ہو گئے ہیں اور ظلم کر رہے ہیں۔

یہ شکایت بڑی حد تک صحیح تھی حضرت علیؓ نے مشورہ دیا کہ آپ علی الاعلان عذر کر لیجیے اور

اس فتنے کا خاتمہ کر ڈالیے۔ چنانچہ آپ مسجد میں تشریف لائے۔ اور حمد و نعت کے بعد حسب ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:

اے لوگو! تم میں سے کسی شخص نے کسی ایسی چیز کی مذمت نہیں کی ہے جس سے میں بے خبر ہوں میں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا ہے جس سے خوب واقف نہیں ہوں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ میرے نفس نے مجھے آرزوئیں دلائیں۔ اور دھوکا دے دیا، میری عقل مجھ سے دور ہو گئی تھی۔

میں نے رسول اللہؐ سے سنا ہے کہ آدمی غلطی کرے تو توبہ کر لے، ضد میں ہلاکت سے بڑھتا چلا نہ جائے۔ ظلم میں درازی، کجروی ہے۔ میں سب سے پہلا آدمی ہوں جسے نصیحت قبول کرنا چاہیے میں اپنے افعال پر اللہ سے مغفرت کا طالب ہوں، توبہ کرتا ہوں، میرے جیسے آدمی ہی کو غلط روش سے باز آنا اور توبہ کرنا چاہیئے۔

جب میں منبر سے اتروں تو اے لوگو تمہارے سردار میرے پاس آئیں اور اپنے مشورے میرے سامنے پیش کریں۔ بخدا اگر حق کا ہاتھ مجھے غلام بھی قرار دے دے تو میں غلام کی راہ اختیار کر لوں گا اور غلام ہی کی طرح جھک جاؤں گا، میں اس زرخرید غلام کی طرح بن جاؤں گا جسے اگر قبضے میں لایا جاتا ہے تو صبر کرتا ہے اور آزاد کر دیا جاتا ہے تو شکر بجا لاتا ہے۔ اللہ سے بچاؤ اللہ کے سوا کسی اور کے پاس نہیں۔ اگر کتاب اللہ کی رُو سے میرے پاؤں میں بیڑیاں ڈالنا ٹھیک نکلے تو بیڑیاں لاؤ اور میرے پاؤں میں ڈال دو۔

اچھی طرح سُن لو کہ تمہارے نیکوکار میرے پاس آنے سے باز نہ رہیں۔ میں ان کے مشورے سنوں گا اور اگر میرا داہنا ہاتھ اُن کی بات ماننے سے انکار کرے گا تو میرا بایاں ہاتھ ان کی تائید میں اٹھے گا۔ یہ خطبہ سُن کر بہت سے لوگ رو پڑے!

مغیرہ بن شعبہ کا مشورہ اور آپ کا جواب

محاصرہ کے دوران مغیرہ بن شعبہ نے آ کر عرض کیا:

آپ مسلمانوں کے امام ہیں اور دیکھ رہے ہیں کہ کس مصیبت میں گرفتار ہیں۔ میں آپ کو تین میں سے ایک بات کا مشورہ دیتا ہوں:

گھر سے باہر نکلیے اور باغیوں سے جنگ کیجیے۔ کیونکہ آپ حق پر ہیں اور وہ باطل پر

ہیں۔ آپ کے پاس ہنوز مددگاروں کی قوت موجود ہے۔ یا پھر یہ کیجیے کہ چپکے سے پیچھے کے دروازے سے نکل کر مکہ میں پہنچ جائیے جہاں یہ لوگ آپ کا خون نہ بہا سکیں گے، اگر یہ بھی منظور نہ ہو تو پھر شام چلے جائیے جہاں کے لوگ پورے پورے وفادار ہیں اور معاویہ بن ابوسفیان بھی وہاں موجود ہیں۔

حضرت نے جواب دیا:

یہ تجویز کہ ان لوگوں سے جنگ کروں تو میں ہرگز گوارا نہیں کر سکتا کہ محمد صلعم کی امت میں خوں ریزی کرنے والا پہلا جانشین میں بنوں اور یہ تجویز کہ مکہ چلا جاؤں تو میں نے رسول اللہ سے سنا ہے کہ مکہ میں ایک قریشی زیادتی کرے گا اور اس پہ آدھی دنیا کا عذاب ہوگا۔ میں ہرگز پسند نہیں کرتا کہ وہ قریشی میں ہوں۔ رہ گئی یہ تجویز کہ شام چلا جاؤں تو میں کسی حال میں بھی اپنے دار ہجرت کی اور رسول اللہ صلعم کے جوار کی مفارقت گوارا نہیں کروں گا۔

شہادتِ عثمانؓ شورش نہ رکی، ایک دن کئی حملہ آوروں نے مل کر ایک ساتھ وار کیا اور اس شخص کو مار ڈالا جو ایک ایک رکعت میں پوری رات گزار دیا کرتا تھا، جو رشتے جوڑتا تھا مصیبت زدوں کے کام آتا تھا، لوگوں کے بوجھ خود اٹھا لیا کرتا تھا۔

۱۸۔ ذی الحجہ ۳۶ھ کو نماز عصر کے بعد آپ شہید کر دیے گئے۔ اس دن آپ روزے سے تھے۔ اور سنیچر کی رات کو مغرب و عشا کے مابین بقیع میں غسل کے بغیر خون آلود کپڑوں کے ساتھ دفن کر دیے گئے۔ آپ کی خلافت بارہ دن کم بارہ برس رہی۔ شہادت کے وقت عمر ۸۲ برس تھی۔

علیؓ ابن ابی طالب

ارشادِ نبویؐ :—

من کنت مولاہ فعلی مولاہ

(جس کا میں مولا ہوں اس کے علیؓ مولا ہیں)

ارشادِ عمرؓ :—

لولا علی لھلک عمر،

(اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا)

احوال وسوانح

حضرت علی کرم اللہ وجہ کے احوال وسوانح کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

آغازِ خلافت ۳۵ھ — ۶۵۶ء

بیعتِ خلافت

حضرت عثمانؓ کے قتل کے بعد مہاجرین و انصار اور تمام مخالفینِ حضرت عثمان حضرت علیؓ کے پاس آئے اور ان سے بیعتِ خلافت لینے پر اصرار کیا۔ آپ نے اوّل انکار کیا لیکن بعد کو مان گئے۔ طلحہ اور زبیر نے بھی اس شرط سے بیعت کی کہ عثمان کے قاتلوں پر حدودِ شرعی جاری کی جائے۔

قتلِ عثمان سے تمام افرادِ بنی امیہ میں برہمی پیدا ہوگئی اور شام میں جہاں معاویہ بن ابی سفیان گورنر تھے۔ یہ لوگ عثمان کی خون آلود قمیص لے کر پہنچ گئے۔ اور اس طرح شام اس تحریک کا مرکز بن گیا۔

امیر معاویہ کی برطرفی

اس طرف حضرت علیؓ نے عہدِ عثمان کے تمام افراد کو علیحدہ کرنے کا ارادہ کر لیا اور مغیرہ بن شعبہ سے مشورہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ اگر یہ ضروری ہے تو کم از کم معاویہ کو نہ ہٹائیے۔ مگر علیؓ نے نہ مانا اور ابن عباس کو شام کا گورنر متعین کیا۔

معاویہ نے یہ معلوم کرکے فوجیں جمع کرنا شروع کردیں اور ادھر سے علی بھی فوج لے کر شام کی طرف روانہ ہوئے (۳۶ھ) اسی دوران اہل مکہ حضرت عائشہ کے پاس آئے اور "خونِ عثمانؓ" کے مطالبے میں ان کو بھی اپنا ہمنوا کرلیا اور ساتھ لے کر علیؓ کے مقابلے کے لیے روانہ ہوگئے اور خریبہ کے مقام پر (بصرہ کے قریب) دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ اس لڑائی میں علیؓ کو کامیابی ہوئی اور حضرت عائشہؓ کے اونٹ کا محمل کاٹ کر گرا دیا گیا۔ (اسی نسبت سے اس کو جنگِ جمل کہتے ہیں)۔

جنگِ صفین اس کے بعد علیؓ نے شام کا قصد کیا۔ اس وقت آپ کے پاس ۹۵ ہزار فوج تھی۔ صفین میں دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا (ذی الحجہ ۳۶ھ) اس جنگ میں دونوں طرف کے بہت سے آدمی کام آئے۔ اور جب معاویہ کا پلہ ہلکا ہوتا نظر آیا تو عمرو بن العاص کے مشورے سے معاویہ نے نیزوں پر کلام مجید اٹھا کر مطالبہ کیا کہ اس نزاع کے فیصلے کے لیے قرآن پر عمل کیا جائے۔

یہ دیکھ کر جیشِ علی نے ہاتھ روک لیے۔ علیؓ نے کہا یہ بھی سب مکر و فریب ہے لیکن وہ نہ مانے اور آخر کار یہ طے پایا کہ ایک ایک آدمی دونوں طرف سے منتخب کیا جائے اور دونوں کے ہاتھ میں فیصلہ دیا جائے۔ بڑی بحث و گفت گو کے بعد دومۃ الجندل میں دونوں فریق کے نمائندوں کا اجتماع ہوا۔ اور یہاں فیصلہ معاویہ کے حق میں ہوا۔ (۳۷ھ)

اس جنگِ صفین کے سلسلے میں جیشِ علی کے کچھ لوگ حضرت علی سے اس بنا پر مخالف ہوگئے کہ انھوں نے کیوں ثالثی فیصلے کو منظور کرلیا۔ اور انھیں کو خوارج کہتے ہیں۔

فتنۂ خوارج خوارج کا خروج سب سے پہلا وہ فتنہ تھا جس نے اسلام کی جامعیت کو سخت نقصان پہنچایا۔ اور علیؓ و معاویۂ دونوں سے جنگ کرکے انھوں نے انارکی پیدا کی۔

آپ نے ۶۳ سال کی عمر پائی اور ۴ سال نو ماہ خلافت کی۔

بلادِ اسلامیہ کے حدود حضرت علیؓ کی شہادت کے وقت اسلامی لشکر مشرق میں ترکستان تک، مغرب میں تیونس، شمالی افریقیا اور اندلس تک۔ اور شمال میں حوالی قسطنطنیہ تک پہنچ چکا تھا اور بلادِ اسلامیہ کے حدود

پر تھے:

شرق میں نہرِ سندھ۔

مغرب میں مراکش و الجزائر۔

شمال میں اناطول۔

جنوب میں نجد۔

حضرت علیؓ کا دَور فتوحات اور توسیعِ مملکت کے اعتبار سے زیادہ ممتاز نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو اندرونی اور داخلی مسائل پر اپنی ساری توجہ مرکوز کر دینی پڑی۔ ورنہ فاتح خیبر کا دور فتوحات اور توسیعِ مملکت کے اعتبار سے یقیناً سب سے ممتاز ہوتا۔

درحقیقت حضرت عمرؓ کی شہادت ایک سازش کے ماتحت ہوئی تھی۔ اور اس کے بعد سازش کا یہ سلسلہ ان قوتوں کی طرف سے برابر جاری رہا جنھیں اپنے راستے میں سب سے بڑا سنگِ گراں اسلام نظر آتا تھا، اسی لیے حضرت عمرؓ پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ اسی لیے حضرت عثمانؓ نے جامِ شہادت نوش کیا اور اسی لیے حضرت علیؓ شہید کیے گئے۔

خصوصیّات و ممیّزات

فاتحِ خیبر کے جلال و جمال کا آئینہ

حضرت علیؓ کی خصوصیات کا احاطہ ممکن نہیں لیکن مختصراً ان کی کیفیت یہ ہے:

پیدائش حضرت علیؓ آنحضرتؐ کے مبعوث ہونے سے دس سال پہلے تولد ہوئے۔ شروع ہی سے آنحضرتؐ آپ پر بہت مہربان تھے۔ چنانچہ ابوطالب کے سایۂ پدری کی بجائے اوائلِ عمر ہی سے آپ آنحضرتؐ کے سایۂ عاطفت میں پلے اور بڑھے۔

قبولِ اسلام حضرت علیؓ نے آں حضرتؐ کو نماز پڑھتے دیکھا، خود بھی پڑھنے لگے، اسلام کا چرچا سنا فوراً اسلام قبول کرلیا۔ باپ (ابوطالب) نے بیٹے کو اس رنگ میں دیکھا، نہ منع کیا نہ تادیب کی۔

رسولؐ سے تعلقِ خاطر رسول اللہؐ کی ذاتِ گرامی سے حضرت علیؓ کو والہانہ عشق تھا۔ جب آپؐ نے ہجرت کا فیصلہ کیا تو کفار گھر کو گھیرے ہوئے کھڑے تھے کہ جیسے ہی آپؐ باہر نکلیں قتل کردیں۔ آپؐ حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ لے کر ہجرت کے ارادے سے نکلے، اپنی چارپائی پر حضرت علیؓ کو لٹا دیا۔ جو امانتیں اہلِ مکہ کی تھیں وہ حوالے کردیں۔ حضرت علیؓ جانتے تھے کہ یہ پھولوں کی سیج نہیں بسترِ مرگ ہے مگر ذرا ہراساں نہ ہوئے نہایت اطمینان سے

لیٹ گئے۔ صبح کفّار نے آنحضرتؐ کے بجائے آپ کو بستر پر استراحت فرما دیکھا تو بہت تلملائے لیکن اب کیا کر سکتے تھے۔

عاشقِ رسول صلح حدیبیہ کے موقع پر صلح نامہ لکھنے کا کام حضرت علیؓ کے سپرد ہوا۔ کفّار نے اعتراض کیا کہ اس میں "محمد" کے ساتھ "رسول اللہ" نہ لکھا جائے ہم اگر نبی مانتے تو جھگڑا ہی کاہے کا تھا۔ رفعِ شر کے لیے آں حضرتؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا۔ رسول اللہ کا لفظ کاٹ دو۔ حضرت علیؓ نے فرمایا میں آپؐ کو رسول مانتا ہوں، رسول لکھ چکا ہوں، یہ لفظ مجھ سے نہیں کاٹا جا سکے گا۔ آخر خود آنحضرتؐ نے اپنے دستِ مبارک سے یہ لفظ مٹایا۔

تہوّر، دلیری اور بہادری حضرت علیؓ کی شجاعت، سپہ گری اور فنونِ جنگ کی مہارت ہمعصروں میں سب پر بالا تھی۔ بڑے بڑے معرکے سر کیے۔ بڑے بڑے پہلوانوں کو پچھاڑا۔ بڑے بڑے کار آزمودہ اور سرد و گرم چشیدہ جنگ جو سورماؤں کے دانت کھٹے کر دیے۔

خیبر کی جنگ میں مرحب پہلوان کا قلعہ کسی سے سر نہ ہو سکا۔ حضرت ابوبکرؓ گئے اور لوٹ آئے، حضرت عمرؓ نے دو مرتبہ کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ آپؐ نے فرمایا کل میں اسے بھیجوں گا جو خدا اور اس کے رسولؐ کو عزیز ہے۔ اور جسے خدا اور اس کا رسولؐ عزیز رکھتے ہیں۔ وہ اس معرکے کو سر ہی کر کے آئے گا۔

دوسرا دن آیا حضرت علیؓ کا مزاج ناساز تھا۔ سب لوگ اس امید میں آئے کہ دیکھیں نگاہِ رسالت کسے سرفراز کرتی ہے۔ آپؐ نے حضرت علیؓ کو یہ ذمہ داری سونپی، آپ پہلے ہی ہلّے میں مظفر و منصور ہوئے حضرت عمرؓ تک کو حضرت علیؓ کی اس سرفرازی پر رشک آ گیا۔

مدینہ کی طرف ہجرت آں حضرتؐ جب مکّہ سے مدینہ تشریف لے گئے تو کچھ عرصے کے بعد حضرت علیؓ بھی مدینہ منورہ پہنچ گئے۔

فاطمہ بنتِ محمدؐ سے عقد ۲ سنہ ھ میں حضرت علیؓ کی شادی حضرت فاطمہؓ بنتِ محمدؐ سے ہو گئی۔ حضرت فاطمہؓ سے شادی کی درخواست حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے بھی کی تھی لیکن آپؐ نے حضرت علیؓ کو ترجیح دی۔ اور انہی سے نہایت سادگی کے ساتھ سلطانِ

کونینؐ کی چہیتی بیٹی کی شادی ہو گئی۔ حضرت فاطمہؓ کی زندگی میں حضرت علیؓ نے کوئی دوسری شادی نہیں کی۔

غزوات میں شرکت

تقریباً تمام غزوات میں حضرت علیؓ نے شرکت کی، ذوالفقارِ علی جب بے نیام ہوئی تو بجلی بن کر کافروں کے خرمنِ حیات پر گری۔ بڑے بڑے مانے ہوئے پہلوان اور سورما مقابلے میں آئے اور مارے گئے۔ بعض معرکوں میں بڑے بڑے لوگوں کا حوصلہ چھوٹ گیا لیکن حضرت علیؓ شمعِ نبوت کے گرد پروانہ بن کر طواف کرتے رہے اور دشمنوں کے سر کاٹتے رہے۔ نہ ان پر ہراس تھا نہ دہشت، اسلام کی خاطر وہ اپنی جان ہتیلی پر لیے رہتے تھے۔

دیارِ خلافت

حضرت علیؓ نے پوری بے نفسی کے ساتھ خلفائے ثلاثہ کی بیعت کی، ان کا ساتھ دیا، انھیں مفید مشورے دیے، ان کی فکرِ صائب کا ایک موقع پر حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں اعتراف کیا تھا لولا علی لھلک عمر (یعنی اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔ حضرت عمرؓ جب بیت المقدس تشریف لے گئے تو حضرت علیؓ مدینے میں رہے اور حضرت عمرؓ کی قائم مقامی کرتے رہے۔

حضرت عثمانؓ کے بعد ۲۳۔ ذی الحجہ ۳۵ھ کو آپ خلافت پر متمکن ہوئے۔

سازش اور بغاوت

حضرت علیؓ خلفائے ثلاثہ کی زندگی میں بھی اپنے تقویٰ، اخلاص، جوشِ عمل، قربانی اور ایثار، فدویت اور جاں نثاری، زہد و عبادت، ہمت اور شجاعت، تدبّر اور اصابتِ فکر و رائے میں کسی سے کم نہیں تھے، اور اب تو کوئی اُن کا ہم پایہ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ لہٰذا اُن کی خلافت اور استحقاقِ خلافت سے کسی کو مجالِ انکار نہیں تھی۔

حضرت علیؓ کے مسندِ خلافت پر متمکّن ہونے کے بعد بعض صحابۂ کرام نے قصاصِ عثمان کی تجویز پیش کی حضرت علیؓ نے فرمایا، امن قائم ہو لے، حالات سازگار ہو جائیں تو یہ کام ضرور کیا جائے گا، لیکن مخصوص اور فتنہ پسند عناصر نے اس مطالبے کو نعرہ بنا لیا۔ اور سازش و بغاوت کی تیاریاں کرنے لگے۔

منکرینِ بیعت

جنگِ جمل کے سلسلے میں حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ کی نزاع غلط فہمی پر مبنی تھی۔ وہ بڑی آسانی سے پورے خلوص اور صداقت کے ساتھ دُور

ہو گئی۔ دونوں کے دل ایک دوسرے سے صاف ہو گئے۔

لیکن امیر معاویہ کا معاملہ دوسرا تھا۔ انھوں نے مطالبۂ قصاصِ عثمان کی آڑ لے کر بیعت تک کرنے سے انکار کر دیا۔ چونکہ حضرت علیؓ کی بیعت عام ہو چکی تھی لہٰذا انھوں نے منکرینِ بیعت کے خلاف جنگ کی تیاری شروع کر دی۔

خوارج

حضرت علی ہر اعتبار سے امیر معاویہ کے لشکر کو شکست دے سکتے تھے لیکن خوارج نے سر اٹھایا۔ یہ جماعت پہلے حضرت علیؓ کے ساتھ تھی، پھر "ان الحکم للّٰہ" کا نعرہ لگا کر مخالفت کرنے لگی۔ حضرت علیؓ خوارج کی آویزش میں ایسے مصروف ہوئے کہ پورے طور پر شام کی خودسر حکومت پر توجہ نہ کر سکے۔

شہادت

۱۷ رمضان ۴۰ھ کو ایک خارجی ابن ملجم نے نمازِ فجر کے وقت حضرت علی پر قاتلانہ حملہ کیا۔ یہ حملہ مہلک ثابت ہوا۔ اس کے بعد آپ صرف دو روز زندہ رہے، ابن ملجم گرفتار ہو گیا۔ آپ نے فرمایا اگر میں مر جاؤں تو اسے قتل کر دینا۔ اگر زندہ بچ گیا تو میں جانوں اور یہ شخص!

وفات کے وقت لوگوں نے دریافت کیا ہم حضرت امام حسنؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لیں؟ آپ نے فرمایا میں کچھ نہیں کہتا، یہ تمھارا کام ہے جسے چاہو اپنا امیر بناؤ۔

مدّتِ خلافت

تقریباً پونے پانچ سال آپ نے خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ وفات کے وقت ۶۳ سال عمر تھی، حضرت امام حسنؓ نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور کوفہ کے دار الخلافہ میں تدفین عمل میں آئی۔

علمائے عہدِ علوی

دورِ حضرت علیؓ کے وہ اصحاب جن سے علم حاصل کیا جاتا تھا، یہ تھے: حارث الاعور، ابو الطفیل عامر بن واثلہ، حبۃ العرنی، رشید الہجری، جویرہ بن مسہرۃ، اصبغ بن نباتہ، علیثم التمار، اور حسن بن علی۔

ناکام سازش

ابن ملجم کے دو اور ساتھیوں نے اسی دن امیر معاویہ اور عمرو بن عاص کو بھی قتل کرنے کا عہد کیا تھا، امیر معاویہ زخمی ہوئے، عمرو بن عاص بچ گئے اور ابن ملجم کی طرح اس کے دونوں ساتھی بھی قتل کر دیے گئے۔

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن!

حضرت علیؓ کو اپنے واقعۂ شہادت کا علم تھا

حضرت علیؓ کی شہادت اور اس کے اثرات و نتائج مابعد کا مختصر تذکرہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

وفات: سنہ ۴۰ھ - سنہ ۶۶۱ء

جنگِ جمل کے بعد اسلامی خلافت کی نزاع دو شخصوں میں محصور ہو گئی تھی حضرت علیؓ ابن ابیطالب اور معاویہ بن ابی سفیان، ان کے درمیان تیسری شخصیت عمرو بن العاص کی تھی۔ اور یہ شخصیت اپنے تدبّر کی وجہ سے غیر معمولی اہمیّت رکھتی تھی۔

خوارج کی سازش

جنگ صفین نے مسلمانوں میں ایک نیا فرقہ "خوارج" کا پیدا کر دیا تھا۔ یہ اگرچہ تمام تر سیاسی مقاصد و اغراض رکھتا تھا لیکن مسلمانوں کے دوسرے سیاسی فرقوں کی طرح اس کے عقائد بھی دینی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اس نے اپنا سیاسی مذہب یہ آیت قرار دی تھی: "اِنِ الحکمُ اِلّا لِلّٰہ"۔ یعنی حکومت کسی آدمی کی بھی نہ ہونی چاہیے۔ دراصل تاریخِ اسلام کے خوارج موجودہ تمدّن کے انارکسٹ تھے۔ ہٰذا وہ کوفہ اور دمشق دونوں کے مخالف تھے۔

مکّہ میں بیٹھ کر خارجیوں نے سازش کی۔ تین آدمیوں نے بیڑا اٹھایا کہ پوری تاریخ اسلام بدل دیں گے اور انھوں نے بدل دی۔

عمرو بن بکیر التمیمی نے کہا: میں حاکمِ مصر عمرو بن العاص کو قتل کروں گا کیونکہ وہ فتنے کی متحرک روح ہے۔

برک بن عبداللہ التمیمی نے کہا: میں معاویہ بن ابی سفیان کو قتل کروں گا، کیونکہ اس نے شام میں قیصریت قائم کی ہے۔

ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی۔ علی ابن ابی طالب کے خیال سے دل تھراتے تھے۔

بالآخر عبدالرحمٰن بن ملجم مرادی نے مہرِ سکوت توڑی۔ میں علی کو قتل کروں گا۔

ان ہولناک مہموں کے لیے ۱۷۔ رمضان مقرر کی گئی۔ دو پہلے شخص اپنی مہم میں ناکام رہے۔ لیکن عبدالرحمٰن بن ملجم کامیاب ہو گیا۔

روایتوں سے ثابت ہے کہ امیر المومنین کے قلب میں آنے والے حادثے کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔ ابن سعد کی روایت ہے کہ آپ فرماتے تھے۔ خدا کی قسم مجھے نبی امی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بتلا دیا ہے کہ میری موت قتل سے ہو گی۔

معلوم ہوتا ہے ہونے والے قاتل کو بھی آپ پہچان گئے تھے۔ عبدالرحمٰن بن ملجم کی طرف جب دیکھتے تو محسوس کرتے کہ اس کے ہاتھ خون سے رنگین ہونے والے ہیں۔ عبدالرحمٰن دو مرتبہ بیعت کرنے آیا مگر آپ نے لوٹا دیا۔ تیسری دفعہ آیا تو بیعت قبول کی۔

کبھی کبھی جب اپنے ساتھیوں سے ناراض ہوتے تو فرماتے تمھارے سب سے زیادہ بدبخت آدمی کو یہاں آنے اور میرے قتل کرنے سے کون چیز روک رہی ہے؟ خدایا میں ان لوگوں سے اکتا گیا ہوں اور یہ مجھ سے اکتا گئے ہیں مجھے ان سے راحت دے۔ اور انھیں مجھ سے راحت دے!

آپ کی کنیز امِ جعفر کی روایت ہے کہ واقعۂ قتل سے چند روز پہلے میں آپ کے ہاتھ دھلا رہی تھی کہ آپ نے سر اٹھایا پھر داڑھی ہاتھ میں لی اور ناک سے ملائی اور فرمانے لگے حیف تجھ پر تو خون سے رنگی جانے والی ہے۔

آپ کے بعض اصحاب کو بھی اس سازش کا کچھ کچھ پتہ چل گیا تھا چنانچہ خود ابن ملجم کے قبیلۂ مراد میں سے ایک شخص نے حاضر ہو کر عرض کیا، امیر المومنین ہوشیار رہیے۔ یہاں کچھ لوگ

آپ کے قتل کا ارادہ کر رہے ہیں۔

اس کے جواب میں آپ نے فرمایا: ہر آدمی کی حفاظت پر دو فرشتے مقرر ہیں۔ لیکن جب قضا آتی ہے تو وہ اسے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔

ایک دن آپ مسجد میں خطبہ دے رہے تھے، ابن ملجم منبر کے پاس بیٹھا تھا۔ لوگوں نے سُنا کہ دانت پیس پیس کر کہہ رہا ہے۔ واللہ میں ان لوگوں کو تیرے شر سے نجات دے دوں گا۔ امیر المومنین جب مسجد سے گھر لوٹے تو لوگ ابن ملجم کا گریبان پکڑ کر لائے۔ آپ نے انھیں کوٹھے پر سے جھانک کر دیکھا اور پوچھا کیا بات ہے؟ انھوں نے تمام واقعہ سُنا دیا۔ آپ نے فرمایا لیکن اس نے مجھے ابھی تک قتل نہیں کیا ہے۔ چھوڑ دو۔

اقدامِ قتل جمعہ کے دن نمازِ فجر کے وقت ہوا۔ ابن نباح مؤذن بھی حاضر ہوا اور آواز دی۔ "الصلوٰۃ!" (نماز) حسن نے آپ کا ہاتھ تھام لیا۔ آپ اٹھے۔ ابن نباح آگے بڑھا۔ پیچھے۔ دروازے سے باہر نکل کر آپ نے پکارا: "لوگو نماز!" آپ کا یہی دستور تھا کہ ہاتھ میں دُرّہ لیئے لوگوں کو نماز کے لیے مسجد میں جگاتے پھر رہے تھے۔

آپ جوں ہی آگے بڑھے دو تلواریں لپکتی نظر آئیں اور ایک آواز بلند ہوئی حکومت خدا کی نہ کہ اے علی تیری۔ شبیب کی تلوار تو طاق پر پڑی لیکن ابن ملجم کی تلوار آپ کی پیشانی پر پڑی اور دماغ تک اتر گئی۔

زخم کھاتے ہی آپ چلائے۔ فزت برب الکعبہ (ربِ کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا) نیز پکارے۔ قاتل جانے نہ پائے۔

لوگ ہر طرف سے ٹوٹ پڑے شبیب تو نکل بھاگا عبدالرحمٰن نے بھی تلوار گھمانا شروع کر دی۔ اور مجمع کو چیرتا ہوا آگے بڑھا قریب تھا کہ ہاتھ سے نکل جائے لیکن مغیرہ بن نوفل بن حارث بن عبدالمطلب جو اپنے وقت کے پہلوان تھے، دوڑے اور ایک بھاری کپڑا اس پر ڈال دیا پھر فوراً دے مارا اور سینے پر چڑھ بیٹھے۔ اب ہر طرف سے لوگوں نے اسے گھیر لیا اور دانتوں سے اس کا گوشت نوچنے اور کاٹنے لگے۔ ہر شخص یہی چلاتا تھا۔ دشمنِ خدا تو نے یہ کیا کیا۔ محمدؐ کی امت کو ہلاک کر ڈالا۔ مگر قاتل چُپ تھا کسی کو جواب نہ دیتا تھا۔

امیرالمومنین نے حضرت حسن سے کہا دیکھو یہ قیدی ہے اس کی تواضع کرو، اچھا کھانا کھلاؤ، نرم بچھونا بچھادو، اگر زندہ رہوں گا تو اپنے خون کے دعوے کا سب سے زیادہ حق دار میں ہی ہوں۔ قصاص لوں گا یا معاف کر دوں گا۔ اگر مر جاؤں تو اُسے بھی میرے پیچھے روانہ کر دینا رب العالمین کے حضور اس سے جواب طلب کروں گا۔

اے خاندانِ عبدالمطلب ایسا نہ ہو کہ مسلمانوں کی خونریزی شروع کر دو اور کہو کہ امیرالمومنین قتل ہو گئے ہیں! قتل ہو گئے ہیں! خبردار میرے قاتل کے سوا کوئی دوسرا آدمی قتل نہ کیا جائے۔

اے حسن! اگر میں اس کی ضرب سے مر جاؤں تو ایک ایسی ہی ضرب اس کے بھی مارنا۔ اس کے ناک کان کاٹ کر صورت نہ بگاڑنا کیونکہ میں نے نبی صلعم سے سنا ہے کہ خبردار کسی کے ناک کان نہ کاٹو اگرچہ وہ کٹکھنا کتا ہی کیوں نہ ہو۔

ایک اور روایت میں ہے کہ فرمایا: اگر تم قصاص لینے ہی پر اصرار کرو تو چاہیے کہ اسے بھی اسی طرح ایک ضرب سے مارو جس طرح اس نے مجھے مارا ہے۔

وصیّت

پھر آپ بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش آیا تو جندب بن عبداللہ نے حاضر ہو کر کہا: خدانخواستہ اگر ہم نے آپ کو کھو دیا تو کیا آپ کے صاحب زادے حضرت حسنؓ کے ہاتھ پر بیعت کریں؟

آپ نے جواب دیا: میں بھتیس نہ اس کا حکم دیتا ہوں نہ اس سے منع کرتا ہوں۔

پھر ان دونوں صاحبزادوں حسن اور حسین علیہما السلام کو بلا کر فرمایا: میں تم دونوں کو تقوائے الٰہی کی وصیت کرتا ہوں اور اس کی کہ دنیا کا پیچھا نہ کرنا اگرچہ وہ تمھارا پیچھا کرے، جو چیز تم سے جدا ہو جائے اس کا پیچھا نہ کرنا نہ اس کے لیے کڑھنا۔ ہمیشہ حق کہنا۔ یتیم پر رحم کھانا۔ بےکس کی مدد کرنا۔ خدا کے باب میں ملامت کرنے والوں کی ملامت سے نہ ڈرنا۔

پھر تیسرے صاحب زادہ محمد بن حنفیہ کی طرف دیکھا اور فرمایا:

جو نصیحت میں نے تیرے بھائیوں کو کی تو نے بھی حفظ کر لی؟

انھوں نے عرض کیا: جی ہاں۔

فرمایا: میں تجھے وصیت کرتا ہوں کہ اپنے ان دونوں بھائیوں کے حقِ عظیم کا خیال رکھنا، ان

کی اطاعت کرنا، ان کی رائے کے خلاف کوئی کام نہ کرنا۔

پھر حضرت حسن اور حسین علیہم السلام سے فرمایا:

میں تمھیں تمھارے اس بھائی کے بارے میں وصیت کرتا ہوں۔ کیونکہ یہ تمھارے باپ کا لڑکا ہے، تمھارا بھائی ہے اور تم جانتے ہو کہ تمھارا باپ اس سے محبت کرتا ہے۔

پھر حضرت حسنؓ کو مخاطب کیا:

فرزند! میں تجھے وصیت کرتا ہوں خوفِ خدا کی، اپنے اوقات میں نماز قائم کرنے کی، میعاد پر زکوٰۃ ادا کرنے کی، صحیح طریقے پر وضو کرنے کی، کیونکہ نماز بغیر طہارت کے ممکن نہیں اور مانع زکوٰۃ کی نماز مقبول نہیں۔ نیز وصیت کرتا ہوں خطائیں معاف کرنے کی، غصہ پی جانے کی، رشتے جوڑنے کی، بُردباری کی، دین میں عقل و دانش کی، ہر معاملے میں تحقیق کی۔ قرآن سے مزاولت کی۔ پڑوسی سے حسنِ سلوک کی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی، فواحش سے اجتناب کی۔

وفات کے وقت حسب ذیل وصیت لکھوائی:

آخری وصیت یہ علی ابن ابی طالب کی وصیت ہے۔ وہ گواہی دیتا ہے کہ اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور یہ کہ محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اللہ نے انھیں ہدایت و دینِ حق کے ساتھ بھیجا تھا تاکہ تمام دینوں پر غالب آجائیں اگرچہ مشرکین کو یہ پسند نہ ہوا۔

میری نماز، میری عبادت، میرا جینا، میرا مرنا سب کچھ رب العالمین ہی کے لیے ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں اس کا سب سے پہلا فرماں بردار ہوں۔

پھر اے حسن! میں تجھے اور اپنی تمام اولاد کو وصیت کرتا ہوں کہ خدا سے ڈرتے رہنا اور جب مرنا تو اسلام ہی پر مرنا۔ سب مل کر اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑے رہنا اور آپس میں پھوٹ نہ ڈالنا کیونکہ میں نے ابوالقاسم (صلعم) کو فرماتے سنا ہے کہ آپس میں ملاپ قائم رکھنا روزہ نماز سے بھی زیادہ افضل ہے۔ اپنے رشتہ داروں کا خیال رکھنا اُن سے بھلائی کرنا۔ ایسا کرنے سے خدا تم پر حساب آسان کر دے گا۔

اور ہاں یتیم! یتیم!! دیکھو یتیموں کا خیال رکھنا، اُن کے مُنہ میں خاک نہ ڈالنا، وہ تمھارے جیتے جی ضائع نہ ہونے پائیں۔

اور دیکھو تمھارے پڑوسی! تمھارے پڑوسی!! اپنے پڑوسیوں کا خیال رکھنا کیونکہ یہ تمھارے نبیؐ کی وصیّت ہے۔ رسول اللہؐ پڑوسیوں کے حق میں برابر وصیّت فرماتے رہے یہاں تک کہ ہم سمجھے شاید انھیں ورثے میں بھی شریک بنا دیں گے!

اور دیکھو قرآن! قرآن!! ایسا نہ ہو قرآن پر عمل کرنے میں تم سے کوئی بازی لے جائے۔

اور نماز! نماز!! کیونکہ وہ تمھارے دین کا ستون ہے۔

اور تمھارے رب کا گھر! تمھارے رب کا گھر!! اپنے رب کے گھر سے غافل نہ رہنا

اور جہاد فی سبیل اللہ! جہاد فی سبیل اللہ!! اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتے رہنا۔

اور زکوٰۃ! زکوٰۃ!! پروردگار کا غصّہ ٹھنڈا کر دیتی ہے۔

اور ہاں تمھارے نبی کے ذمّی! تمھارے نبی کے ذمّی!! (یعنی غیر مسلم جو تمھارے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تمھارے سامنے اُن پر ظلم کیا جائے۔

اور تمھارے نبی کے صحابی! تمھارے نبی کے صحابی!! یاد رکھو، رسول اللہ صلعم نے اپنے صحابیوں کے حق میں وصیّت کی ہے۔

اور فقراء و مساکین! فقراء و مساکین!! انھیں اپنے رزق میں شریک کرنا۔

اور تمھارے غلام! تمھارے غلام!! غلاموں کا خیال رکھنا۔ سمجھ لو کہ خدا کے باب میں اگر کسی کی بھی پروا نہیں کرو گے تو خدا تمھارے دشمنوں سے تمھیں محفوظ کر دے گا۔ خدا کے تمام بندوں پر شفقت کرنا۔

جب بات کرنا تو میٹھی زبان سے کرنا، ایسا ہی خدا نے حکم دیا ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ چھوڑنا۔ ورنہ تمھارے اشرار تم پر مسلط کر دیے جائیں گے، پھر تم دعائیں مانگو گے اور وہ قبول نہ ہوں گی۔ باہم ملے جلے رہو۔ بے تکلف اور سادگی پسند رہو۔ خبردار ایک دوسرے سے نہ کٹنا۔ آپس میں پھوٹ نہ ڈالنا۔ نیکی اور تقویٰ میں باہم مددگار رہنا۔ مگر گناہ اور زیادتی میں کسی کی مدد نہ کرنا، خدا سے ڈرنا کیونکہ اس کا عذاب بہت ہی سخت ہے۔ اے اہل بیت! خدا تمھیں محفوظ رکھے اور اپنے نبی کو تم میں یاد رکھے۔ میں تمھیں خدا کے سپرد کرتا ہوں، تمھارے لیے سلامتی اور رحمت چاہتا ہوں

ولاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم!

اس کے بعد لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہا اور ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کرلیں۔

یہ واقعہ ۱۸۔ رمضان ۴۰ھ کا ہے۔ اس وقت عمر ۶۳ سال کی تھی۔

حضرت زید کہتے ہیں: سب لوگ ہجوم کر کے ام المومنین حضرت عائشہؓ کے گھر گئے اور حاضری کی اجازت چاہی۔ انھوں نے دیکھا کہ یہاں پہلے ہی سے حادثے کی خبر پہنچ چکی ہے اور ام المومنین غم سے نڈھال آنسوؤں میں تر بہ تر بیٹھی ہیں۔ ہچکی بندھی ہے، آنکھیں اشک بار ہیں۔ لوگوں نے یہ حالت دیکھی تو لوٹ آئے۔

حضرت زید فرماتے ہیں، دوسرے دن سنا گیا کہ ام المومنین رسول اللہ ﷺ کی قبر پر آرہی ہیں۔ مسجد میں جتنے مہاجرین و انصار تھے استقبال کو اٹھ کھڑے ہوئے اور سلام کرنے لگے۔ مگر ام المومنین نہ کسی کے سلام کا جواب دیتی تھیں نہ کچھ بولتی تھیں نہ کسی طرف دیکھتی تھیں۔ شدتِ گریہ سے زبان بند تھی۔ غم سے آنکھوں میں اندھیرا تھا، دل تنگ تھا، چادر تک سنبھلتی نہ تھی۔ بار بار پیروں میں الجھتی اور آپ لڑکھڑا لڑکھڑا جاتی تھیں۔ بہ وقت تمام پہنچیں، لوگ پیچھے پیچھے چلے آرہے تھے۔ حجرے میں داخل ہوئیں تو دروازہ پکڑ کر کھڑی ہوگئیں۔ اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا:

"اے نبی ہدایت! تجھ پر سلام۔ اے ابوالقاسم تجھ پر سلام۔ اے رسول اللہ ﷺ آپ پر اور آپ کے دونوں ساتھیوں پر سلام۔ رسول اللہ! میں آپ کے سب سے زیادہ پیارے عزیز کی موت کی خبر آپ کو سنانے آئی ہوں۔ میں آپ کو آپ کے محبوب ترین کی یاد تازہ کرانے آئی ہوں۔ بخدا آپ کا چنا ہوا حبیب، منتخب کیا ہوا عزیز قتل کر ڈالا گیا۔ واللہ وہ قتل ہوگیا جس کی بیوی افضل ترین عورت تھی۔ واللہ وہ قتل ہوگیا جو ایمان لایا اور ایمان کے عہد میں پورا اترا۔ میں رونے والی غم زدہ ہوں میں اس پر آنسو بہانے اور دل جلانے والی ہوں! اگر قبر کھل جاتی تو تیری زبان بھی یہی کہتی کہ تیرا عزیز ترین اور مقرب ترین وجود قتل ہوگیا۔

ایک روایت میں ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ نے جب امیر المومنین کی شہادت کی خبر سنی تو ٹھنڈی سانس لی اور کہا: اب عرب جو چاہیں کریں کوئی انھیں روکنے والا باقی نہیں رہا!

وقتِ آخر شیرِ خدا علی مرتضیٰؓ نے جو وصیّت اپنے فرزند دلبند امام حسن کو فرمائی وہ درحقیقت امّتِ اسلامیہ کے ہر فرد کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ اس وصیّت سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کی زندگی اسوۂ نبی اور سنّتِ رسول کے سانچے میں کس طرح ڈھل گئی تھی اور ایسا ہونا بھی چاہیے تھا، وہ حضرت علی ہی تو تھے جنھوں نے عہدِ طفولیت میں اسلام قبول کرلیا تھا۔ اور جب آپؐ مکہ سے مدینے کی طرف ہجرت کر رہے تھے تو آپؐ پر اپنی جان قربان کرنے کے لیے بے تامل آپ بستر پر لیٹ گئے تھے۔ لہٰذا ان سے زیادہ اور کون اس سانچے میں ڈھل سکتا تھا۔

حسن بن علیؓ

سید شباب اهل الجنۃ

(حسن اور حسین جوانانِ جنت کے سردار ہیں)

(حدیثِ نبوی)

احوال وسوانح

سبطِ رسول کی حیاتِ گرامی کے چند پہلو

حضرت امام حسن کے احوال وسوانح کا اجمالی مرقّع یہ ہے:

آغازِ خلافت ۴۰ سنہ ھ ـ ۶۵۶ سنہ ع

بیعتِ خلافت

شہادتِ حضرت علیؓ کے بعد بنو ہاشم نے حسن کے ہاتھ پر بیعت کی۔ (۴۰ سنہ ھ)

دست برداری

جب معاویہ کو یہ خبر پہنچی تو کوفے کی طرف لشکر کشی کی۔ حسن نے بھی مقابلے کے لیے اپنی فوج روانہ کی۔ جب مدائن میں فوج نے قیام کیا تو یہ خبر اڑی کہ قیس بن سعد (سرِ لشکر) قتل کر دیے گئے (حالانکہ یہ واقعے کے خلاف تھا) اس پر لشکر میں ہیجان پیدا ہوا۔ اور جراح اسدی نے حسن پر خنجر سے حملہ کیا۔ یہ حالات دیکھ کر حسن کو اپنے ساتھیوں سے نفرت ہو گئی۔ اور معاویہ کو تحریر بھیجی کہ میں بعض شرائط پر خلافت سے دست بردار ہونے کے لیے تیار ہوں۔

بنو ہاشم کو معلوم ہوا تو انھوں نے اور خصوصیت کے ساتھ حسین اور عبداللہ بن جعفر نے سخت تنقید کی لیکن حسن نے کہا کہ میں مسلمانوں کا خون بہانا پسند نہیں کرتا۔

اس دوران میں معاویہ نے ایک سادہ کاغذ پر اپنی مہر کر کے حسن کے پاس بھیجا کہ تم جو شرائط چاہو

لکھ دو مجھے منظور ہیں۔

حسن نے اس کاغذ پر بہت سی شرطیں لکھ دیں جن میں خاص یہ تھیں:

۱: معاویہ کے بعد خلافت پھر مجھ کو دی جائے۔

۲: حضرت علیؓ کو بُرا بھلا نہ کہا جائے۔

جب معاویہ کے پاس حسن کی یہ تحریر پہنچی تو وہ خوش ہو گئے اور شرائط منظور کر لیں۔ لیکن ان پر عمل نہیں کیا۔

اس طرح حسن کی خلافت کل چھ ماہ رہی اور اس کے بعد معاویہ کو منتقل ہو گئی۔

اس کے بعد حسن اپنے گھر مدینے چلے گئے اور کہا جاتا ہے کہ ۴۹ھ میں معاویہ کی سازش سے ہلاک کر دیے گئے۔ انھوں نے ۴۷ سال عمر پائی۔

اوّلیاتِ خلفائے راشدین

علامہ جلال الدین سیوطی نے اپنی کتاب تاریخ الخلفاء میں اور بعض دوسرے مؤرخین نے حضرات خلفائے راشدین کے جو اوّلیات لکھے ہیں وہ یہ ہیں :

اوّلیاتِ ابوبکرؓ

۱ : جواں عمر لوگوں میں سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ نے اسلام قبول کیا۔

۲ : قرآن کا نام "مصحف" ابوبکرؓ نے رکھا۔

۳ : بیت المال قائم کیا جس کے منتظم ابوعبیدہ تھے۔

۴ : آپ ہی نے سب سے پہلے اپنا جانشین منتخب کیا۔ لیکن اربابِ حل وعقد کے مشورے سے — اور اس مشورے میں لوگوں نے پوری آزادی اور بیباکی سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

۵ : خلیفۃ الرسول کے لقب سے مخاطب ہوئے۔

اوّلیاتِ عمرؓ

۱: امیرالمومنین کے لقب سے مخاطب ہوئے۔

۲: سن ہجری جاری کیا۔

۳: دفتر قائم کیا۔

۴: کوفہ، بصرہ، موصل وغیرہ شہر بنائے اور بسائے۔

۵: یہودیوں کو حجاز سے جلاوطن کیا۔

اوّلیاتِ عثمانؓ

۱: جانوروں کے لیے چراگاہیں چھوڑیں۔

۲: لوگوں کو جاگیریں دیں۔

۳: مؤذنوں کی تنخواہیں مقرر کیں۔

۴: قبل از نمازِ عید خطبہ جاری کیا۔

۵: سب سے پہلے مع اہل وعیال ہجرت کی۔

۶: پولیس مقرر کی۔

اوّلیاتِ علیؓ

۱: آپ نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا۔ اس وقت آپ کی عمر بہ اختلاف اقوال ۸۔۹ سال کی تھی۔

۲: مدینے میں جب ہجرت کے بعد رسول اللہؐ نے صحابہ کے درمیان مواخات کا رشتہ قائم کیا تو انھیں اپنے ساتھ وابستہ کیا۔

۳: کسی جنگ میں آپ کو کسی کے ماتحت بنا کر رسول اللہ ﷺ نے نہیں بھیجا۔
۴: آنحضرتؐ نے آپ کو ابو تراب کنیّت عطا فرمائی۔
۵: شرابی کی سزا کی آخری حد مقرر کی۔

اوّلیاتِ حسنؓ

رضاکارانہ طور پر خلافت سے دست بردار ہو گئے۔

خلفائے راشدین کا ذکر

احادیث میں

کتبِ احادیث میں خلفائے راشدین کا ذکر بہ کثرت ملتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں اُن کی کس درجہ اہمیت اور وقعت تھی۔ اس جگہ ساری احادیث کا استقصا مقصود نہیں۔ چند ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

اقوالِ رسولؐ دربارۂ ابوبکرؓ

۱: ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے ایک مرتبہ حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا:

"تم غار میں میرے ساتھی تھے، حوضِ کوثر پر بھی میرے ساتھی رہو گے۔"

۲: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جن لوگوں نے مال کے ذریعے مجھ پر سب سے زیادہ احسان کیا ہے وہ ابوبکرؓ ہیں۔ اگر میں خدا کے سوا کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکر سب سے زیادہ مستحق تھے، لیکن اخوّتِ اسلام اس سے بڑھ کر ہے"

۳: حضرت ابو الدرداءؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کے درمیان کچھ رنج ہو گیا۔ اس موقع پر آپؐ نے فرمایا:

"جب خدا نے مجھے تم پر مبعوث کیا تو سب نے کہا تو جھوٹا ہے، مگر ابوبکرؓ نے میری تصدیق کی اور جان و مال سے میری مدد کی۔ مجھے میرے دوست کے معاملے میں ایذا نہ پہنچاؤ۔"

اقوالِ رسولؐ دربارۂ عمرؓ

۱: آپؐ نے فرمایا:

"عمر چراغِ اہلِ جنت ہیں۔"

۲: آپؐ نے ارشاد فرمایا:

"شیطان عمر سے ڈرتا ہے۔"

۳: آپؐ نے فرمایا:

"میں نے خواب میں دیکھا لوگوں کو میرے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور وہ قمیصیں پہنے ہوئے ہیں۔ بعض کی سینے تک ہیں بعض کی اس سے زیادہ مگر عمر کی قمیص زمین تک گھسٹتی جا رہی ہے۔

لوگوں نے سوال کیا: یا رسول اللہ وہ قمیص کیا تھی؟

آپؐ نے فرمایا: "دین"!

اقوال دربارۂ عثمانؓ

۱: حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عثمان رضؓ آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کپڑے سمیٹ لیے اور فرمایا:

"میں ایسے آدمی سے کیوں نہ شرم کروں جس سے ملائکہ بھی شرم کرتے ہیں۔

۲: حضرت ابوبکرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"میرے اصحاب میں عثمان مجھ سے بہت زیادہ مشابہت رکھتے ہیں۔"

۳: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
جس طرح عثمانؓ خدا اور اس کے رسولؐ سے حیا کرتے ہیں، فرشتے ان سے حیا کرتے ہیں۔

اقوال رسولؐ دربارۂ علیؓ

امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں: احادیث سے آپ کی فضیلت جتنی ثابت ہوتی ہے کسی صحابی کی ثابت نہیں ہوتی۔

۱: حضرت سعد بن وقاص کی روایت ہے کہ آپؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا:
"تمہیں مجھ سے وہی نسبت ہے جو موسیٰؑ کے ہارون کو تھی، یہ ضرور ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔"

۲: جنگ خیبر کے موقع پر آپؐ نے فرمایا:
"کل میں ایسے شخص کو علم دوں گا جس کے ہاتھ پر قلعہ فتح ہوگا۔ اس نے خدا اور اس کے رسول کو خوش کر لیا ہے اور خدا اور اس کا رسول اس سے راضی ہیں۔"
دوسرے دن آپؐ نے وہ پرچم حضرت علیؓ کو عطا فرمایا جن کے ہاتھ پر خیبر فتح ہوا۔

۳: غدیر خم کے موقع پر آپؐ نے فرمایا:
"جس کا میں دوست ہوں اس کا علیؓ بھی دوست ہے۔ الٰہی! جو علیؓ سے محبت رکھے تو بھی اس سے محبت رکھ، جو اس سے دشمنی رکھے تو بھی اس سے دشمنی رکھ!

اقوالِ رسولؐ دربارۂ حسنؓ

۱: ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کندھے پر حضرت حسنؓ کو بٹھا رکھا تھا۔ ایک شخص راستے میں ملا، حضرت حسنؓ کو مخاطب کر کے کہنے لگا:
"تم نے کتنی اچھی سواری پائی ہے۔"

یہ سن کر آپؐ نے فرمایا:

"سوار بھی تو بہت اچھا ہے۔

۲: عبداللہ بن زبیرؓ روایت کرتے ہیں: میں نے دیکھا رسول اللہؐ سجدے میں ہوتے حسن لپکتے ہوئے آتے اور آپؐ کے کندھے یا پشت پر چڑھ جاتے، آپؐ انھیں اس وقت تک نہ اتارتے جب تک وہ خود ہی نہ اتر جاتیں۔

۳: حضرت براء بن عازب کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسنؓ کو اپنے دوش پر سوار کیے تھے اور فرما رہے تھے: "اے اللہ! میں اس سے محبت رکھتا ہوں تو بھی اسے محبوب رکھ۔"

خلافتِ راشدہ ایک نظر میں

نام	سن	مدتِ خلافت	عمر
ابوبکر صدیقؓ	سنہ ۱۱ھ (سنہ ۶۳۲ع)	۲ سال ۳ ماہ	۶۳ سال
عمر بن الخطابؓ	سنہ ۱۳ھ (سنہ ۶۳۴ع)	۱۰ سال ۶ ماہ	۶۳ سال
عثمان بن عفانؓ	سنہ ۲۳ھ (سنہ ۶۴۴ع)	۱۲ سال	۸۲ سال
علی ابن ابیطالبؓ	سنہ ۳۵ھ (۶۵۶ع)	۴ سال ۹ ماہ	۶۳ سال
حسن بن علیؓ	سنہ ۴۰ھ (سنہ ۶۶۱ع)	۶ ماہ	۴۷ سال

تاریخ اسلام کے تین دور

پہلا دور: جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دُنیا میں تشریف لائے تھے۔
یہ دور ہر اعتبار سے یکتا اور یگانہ تھا۔ خاتم المرسلینؐ، سیدالانبیا اور فخرِ رسل کا عہد انصاف کا عہد تھا، مساوات کا عہد تھا، جمہوریت کا عہد تھا۔

دوسرا دور: یہ دور حضرت ابوبکرؓ سے شروع ہوتا ہے اور حضرت امام حسنؓ پر ختم ہوتا ہے۔
اس دور کا ایک ایک واقعہ اپنی پوری تفصیلات اور جزئیات کے ساتھ نظر کے سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ آنحضرتؐ نے جو کچھ فرمایا، جو کچھ کیا، اسے مکمل طور پر بروئے کار لایا گیا۔ اس سے سرِ مو انحراف نہیں کیا گیا۔ ہر عمل، ہر اقدام، ہر سعی و کوشش کا منتہا اور مقصود ایک اور صرف ایک تھا۔

به مصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر به او نہ رسیدی تمام بولہبی است

تیسرا دور: اس دور سے خلافت ختم ہوتی ہے اور بادشاہت قائم ہوتی ہے۔
یہ تیسرا آخر وقت تک یعنی زوالِ سلطنتِ ترکیہ تک قائم رہا۔ لیکن یہ اسلام کی حکومت نہ تھی مسلمانوں کی حکومت تھی!

عہدِ خلافتِ راشدہ

پر

ایک اجمالی نظر

جائزہ ○ مطالعہ ○ تبصرہ

خلفائے راشدین میں سے ہر ایک کے احوال و سوانح، خصائص و ممیزات اور کارناموں پر مختصر لیکن جامع طور پر ہم گفت گو کر چکے ہیں۔ اب اس پورے دَور پر مجموعی حیثیت سے ہم نگاہ ڈالتے ہیں کہ اس نے دُنیا کو کیا دیا اور دُنیا کے سامنے کیا مثال پیش کی۔

اپنی معنویت اور اہمیت کے لحاظ سے یہ باب بھی تفصیل و طوالت کا متقاضی ہے لیکن زیادہ سے زیادہ اختصار کے ساتھ اپنے موضوع کو سمیٹنے کی کوشش کریں گے۔

ہماری کوشش یہ ہوگی کہ اس دورِ سعادت کا ایک ایسا مرقع نظر کے سامنے آجائے جو آئینے کا کام دے اور ہر چیز واضح اور نمایاں طور پر سامنے آجائے۔

عہدِ خلافتِ راشدہ کا اجمالی جائزہ

خلیفہ کا طرزِ انتخاب خلیفہ یا امیر کے طرزِ انتخاب کے بارے میں اسلام خاموش ہے۔ اصلی بات یہ ہے کہ اصولی باتیں قرآن میں اور حدیث میں محکم طور پر بیان ہوئی ہیں۔ تفصیل ہمیشہ حالات اور مصالح اور وقت کی تابع ہوتی ہے۔ اسے اُمّت پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ جس طرح موزوں سمجھے عمل کرے۔

خلیفہ یا امیر کے بارے میں اسلام یہ تو بتاتا ہے کہ اس پر عوام کو اعتماد ہونا چاہیے، اسے عوام کے رُجحانات کا، بشرطیکہ وہ دین سے معارض نہ ہوں، پاس اور احترام کرنا چاہیے۔ مگر اسی طرح عوام کے لیے یہ تاکید ہے کہ امیر اور خلیفہ جب تک قرآن اور حدیث کے خلاف اقدام نہ کرے اس کی اطاعت فرض ہے لیکن اگر وہ زعمِ حکومت میں حدود سے تجاوز کرے تو صاف تصریح موجود ہے۔ لاطاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق۔

آں حضرتؐ نے جب اس دُنیا سے پردہ فرمایا تو کسی شخص کے لیے کوئی وصیت نہیں کی۔ مہاجر اور انصار نے حضرت عمرؓ کی تحریک پر حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ منتخب کر لیا۔

حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو اپنی جانشینی کے لیے "منتخب" کیا۔ پھر عوام سے اپنی رائے کی توثیق کرائی، پھر اس دُنیا سے رخصت ہوئے۔

حضرت عمر نے چند آدمیوں کو منصب خلافت کا اہل سمجھا۔ جن میں حضرت عثمان اور حضرت علی بھی تھے خلیفہ کے انتخاب کی ذمہ داری اربابِ حل وعقد کی ایک جماعت پر ڈالی، اس نے حضرت عثمان کو منتخب کر لیا۔ اور وہ خلیفہ ہو گئے۔

حضرتِ عثمان شہید ہوئے، وہ اس سلسلے میں کوئی اقدام نہ کر سکے۔ اہلِ مدینہ اور متعدد صحابہ کرام کے اصرار سے حضرت علی نے خلافت کا بارِ گراں اپنے دوشِ مبارک پر رکھا۔ اور تاریخِ اسلام میں پہلی مرتبہ امیر معاویہ نے بیعت سے انکار کر کے طغیان و سرکشی کا دروازہ کھولا!

اصلاحات نظم و نسقِ مملکت

خلافتِ راشدہ کا نظامِ حکومت مبنی تھا خوفِ الٰہی پر۔ اس کی بنیاد اور اساس یہ تھی کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں خدا اسے دیکھ رہا ہے ہم جو کچھ کریں گے خدا کے ہاں اس کی جواب دہی کرنا پڑے گی۔ ہم نے جو کچھ کیا اس کی ذمہ داری صرف ہم پر ہے، اور اس ذمہ داری سے ہمیں کوئی بچا نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ خلافتِ راشدہ کے سارے دور میں بھی کہیں وہ کمزوری نظر نہیں آتی جو بادشاہوں، ڈکٹیٹروں اور جمہوریت کے علمبرداروں میں نظر آتی ہے۔

یزید بن ابی سفیان کو جب شام کی مہم پر حضرت ابو بکر نے مامور کیا تو فرمایا۔ "اے یزید تمھاری قرابت داریاں ہیں، شاید تم ان کو اپنی امارت سے فائدہ پہنچاؤ، درحقیقت یہی سب سے بڑا خطرہ ہے جس سے میں ڈرتا ہوں۔ رسول اللہ ؐ نے فرمایا جو کوئی مسلمانوں کا حاکم مقرر ہو اور ان پر کسی کو بلا استحقاق محض رعایت کے طور پر افسر بنائے تو اس پر خدا کی لعنت!"

ابو بکر ؓ نے اپنے دورِ حکومت میں آنحضرت ؐ کے مقرر کیے ہوئے گورنروں کو بحال رکھا اور حکومت کے دوسرے شعبے ممتاز صحابہ کے سپرد کر دیے۔ مالیات کا شعبہ ابو عبیدہ ؓ اور عدالت کا محکمہ عمر ؓ کے حوالے کر دیا۔ حکومتِ اسلامیہ کا شہری نظام سب سے پہلے عمر ؓ نے قائم کیا تھا۔ انھوں نے ہر صوبے پر ایک گورنر کا تقرر کیا۔ جو ان کے ہدایات کے ماتحت کام کرتا تھا۔ خلیفہ کو عاملہ و عدلیہ اور انتظامیہ کے کلی اختیارات حاصل تھے۔ خراج کا افسر مالیات کا سب سے بڑا افسر تھا، گورنر نظم و نسق میں مختار تھا۔ اور خراج کا افسر مالیات کے محکمے کا مستقل حاکم تھا۔ مالیات کے افسر کا تقرر خلیفہ کے اختیار میں تھا۔ عثمان ؓ نے بھی عمر ؓ کی پالیسی اختیار کی۔

حضرت عمرؓ نے سب سے پہلے صرفِ دولت کو ایک منظم شکل دینے کے لیے دفاتر قائم کیے۔ یہ دفاتر مختلف شعبوں سے تعلق رکھتے تھے۔ فوج میں سپاہیوں اور ان کی تنخواہوں کی باقاعدہ فہرست رہتی تھی۔ دیوانی خراج میں ریاست کی آمدنی اور اس کے آمد و صرف کا حساب رہتا تھا۔

عہدِ جاہلیت میں جنگ کے وقت قبیلے کے افراد تلواریں، نیزے اور کمانیں لے کر نکلتے اور حریف سے مقابلہ کرتے۔ جنگ کے بعد اپنے گھر واپس آجاتے اور کاروبار میں لگ جاتے۔ اسلام نے عربوں کی شیرازہ بندی کی، حضرت عمرؓ نے فوج کو ایک منظم شکل دی اور فوجی نظم و نسق کے لیے دیوانی فوج قائم کی۔

پولیس

حضرت علیؓ کے عہد میں باقاعدہ پولیس کا نظام قائم ہوا۔ اس محکمے کے سب سے بڑے افسر کو "صاحب شرط" کہا جاتا تھا۔

آں حضرتؐ اور ابوبکرؓ کے زمانے میں مجرم کو ایک گھر یا مسجد میں بند کر دیا جاتا تھا۔ قید خانے کا رواج حضرت عمرؓ کے زمانے میں ہوا۔ پھر برابر قائم رہا۔

جس شخص کا تقرر کسی بڑے منصب پر ہوتا تھا اسے ایک پروانہ دیا جاتا تھا جس میں اس کے اختیارات کا ذکر ہوتا تھا۔ جہاں اس کا تقرر ہوتا تھا۔ وہاں ایک مجمع عام میں یہ پروانہ پڑھ کر سنایا جاتا تھا اور اس سے عہد لیا جاتا تھا کہ وہ ترکی گھوڑے پر سوار نہ ہوگا، باریک کپڑے نہ پہنے گا، چھنا ہوا آٹا نہ کھائے گا، اہلِ حاجت کے لیے اپنا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھے گا۔

بحری بیڑہ

حضرت عثمانؓ کے زمانے میں بحری جنگ پر زیادہ توجہ کی گئی۔ چنانچہ امیر معاویہ اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کی کوششوں سے تھوڑی سی مدت کے اندر اسلام کا بحری بیڑہ اتنی ترقی یافتہ حالت میں پہنچ گیا کہ ۳۱ھ میں جب قیصر روم نے چھ سو بحری جہازوں کا بیڑہ لے کر شام پر حملہ کیا تو عبداللہ بن سعد بن ابی سرح نے رومۃ الکبریٰ کے اس عظیم الشان بحری بیڑے کو ایسی ذلت آمیز شکست دی کہ اس کا منہ ہمیشہ کے لیے پھر گیا۔

عمارتیں، سڑکیں، پل

عوام کے فائدے کے لیے عہدِ عثمانی میں بہت سی عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ پل بنائے گئے، سڑکیں تیار کرائی گئیں، مہمان سرائے کی بنا پڑی۔ دیوان اور دفتروں کے لیے عمارتیں عالمِ وجود میں آئیں، مسجدِ نبوی کی بھی توسیع ہوئی۔

تعمیر کا تعلق درصل اس مدنیت سے ہے جو سادگی کی ضد ہے اور یہ مدنیت پیدا ہوتی ہے خود پسندی اور خدا فراموشی سے اسلام جب تک اصلی حالت میں باقی رہا مسلمانوں کا ذوقِ تعمیر نہیں ابھرا جب اسلام کی سادگی فراموش ہوگئی تو دوسرے جذبے ابھرنے لگے۔

جمہوری اقدار

جمہوریت اور عوامیت (ڈیموکریسی اینڈری پبلک) ان دونوں اصطلاحات نے دنیا کو بڑے مغالطے اور فریب میں مبتلا کر رکھا ہے۔

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب اور عوامیت کا حال بھی سوا اس کے کیا ہے کہ:

جس کے پردے میں نہیں غیر از نوائے قیصری!

لیکن بغیر اس اصطلاح کو استعمال کیے ہوئے اسلام کے عہد خلافت راشدہ میں جمہوریت اور عوامیت کا جو دل آویز منظر نظر آتا ہے وہ دن پھر دنیا نے کبھی نہیں دیکھا اور اس وقت تک نہیں دیکھ سکے گی جب تک جارج برنارڈشا کے الفاظ میں (Back to Mohammad) محمدؐ کی طرف رجعت نہ کی جائے۔

ذیل میں چند واقعات و مثال ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔

جب کوئی معاملہ پیش آتا تھا تو حضرت ابوبکر اہل الرائے اور فقہائے صحابہ سے شورہ کرتے تھے۔ اور مہاجرین و انصار میں سے چند ممتاز صحابہ حضرات عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، عبدالرحمٰن بن عوفؓ، معاذ بن جبلؓ، ابی بن کعبؓ اور زید بن ثابتؓ کی مجلسِ مشورت طلب کرتے تھے۔

شوریٰ کی اہمیت

آں حضرتؐ ابوبکرؓ سے مشورہ کیا کرتے تھے حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ کے عہد میں عثمانؓ اور علیؓ کی حیثیت وزراء کی تھی۔ اس زمانے میں خلیفہ نظم مملکت میں مجلس شیوخ سے مشورہ کرتا تھا۔ یہ مجلس بڑے بڑے صحابہ اعیانِ قوم اور سردارانِ قبائل پر مشتمل تھی۔ اس کا اجلاس مسجدِ نبوی میں ہوتا تھا۔

خلفائے راشدین نے ملاقات کی عام اجازت دے رکھی تھی چنانچہ ہر شخص بے تکلف ان کے پاس جا سکتا تھا کسی قسم کی روک ٹوک نہ تھی۔

دورِ کشور کشائی

خلافتِ راشدہ کا دور مجاہدات و فتوحات کے اعتبار سے ممتاز و منفرد ہے، مختصر طور پر چند خاص مہمات کا ذکر ہم کرتے ہیں۔

عراق کی فتح

حضرت ابو بکرؓ نے حضرت خالدؓ بن ولید کو فتح عراق پر مامور فرمایا۔ وہ فتح کا پرچم لہراتے ہوئے ربلہ پہنچے۔ عراق کا ایرانی حاکم ہرمز مقابلے کے لیے نکلا، ایرانیوں نے اپنے پیروں کو زنجیروں سے جکڑ لیا تھا کہ میدان سے مُنہ مڑنے نہ پائے لیکن ایرانیوں نے شکستِ فاش کھائی، ہرمز مارا گیا۔ اردشیر نے بہت بڑی فوج مدد کے لیے بھیجی۔ حضرت خالدؓ نے اس سے بھی مقابلہ کیا۔ دشمن کی تیس ہزار سپاہ کام آئی اور بڑے بڑے افسر مارے گئے۔

متعدد شہروں کو فتح کرتے ہوئے حضرت خالدؓ حریرہ پہنچے۔ ایرانی محاصرہ کی تاب نہ لا سکے، ایک لاکھ نوے ہزار درہم سالانہ پر صلح کر لی۔

ابنار کا معرکہ

اور متعدد مقامات فتح کرنے کے بعد حضرت خالد بن ولید نے ابنار کا معرکہ سر کیا۔

دومۃ الجندل کا محاصرہ

حضرت خالد کا فتح مند لشکر پھر آگے بڑھا اور دومۃ الجندل کا محاصرہ کر لیا۔ یہاں عراق اور شام کی سرحدیں ملتی تھیں دومۃ الجندل کے حاکم جودی نے جو عیسائی تھا مقابلہ کیا شکست کھائی اور مارا گیا حضرت خالد نے پھاٹک توڑ کر قبضہ کر لیا۔

دشمن کی بربادی

حضرت خالد نے بعض دوسرے مقامات فتح کرنے کے بعد، فراض کے فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ یہاں شام، عراق اور جزیرہ کی سرحدیں ملتی تھیں۔ اس لیے رومی بھی ایرانیوں کے ساتھ مل گئے، اگرچہ اس جنگ میں مسلمانوں کے مقابل تین تین طاقتیں تھیں لیکن تینوں نے شکست فاش کھائی، پیچھے دریا تھا، سامنے مسلمان، بھاگنے کا راستہ نہ ملا، دشمن کی فوج بالکل برباد ہو گئی۔

قادسیہ کی مشہور جنگ

حضرت ابو بکرؓ نے عمرو بن العاص کو فتح فلسطین پر مامور کیا تھا۔ اجنادین کے مقام پر بہت بڑی رومی فوج موجود تھی لیکن مسلمان غالب آئے۔ ۲۸ جمادی الاول سنہ ۱۳ھ)

حضرت عمرؓ نے (سنہ ۱۴ھ) سعدؓ بن ابی وقاص کی سرکردگی میں بیس ہزار کا ایک لشکر

ایرانیوں کے مقابلے کے لیے بھیجا، مقابلے میں رستم کا لشکر تھا، ایرانی فوجوں کی تعداد حد سے خارج تھی، نمازِ ظہر کے بعد لڑائی شروع ہوئی رات گئے تک جاری رہی، دوسرے روز پھر بڑے زور کا رن پڑا۔ اس معرکے میں دس ہزار ایرانی ہلاک ہوئے۔ دو ہزار مسلمانوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔ لیکن لڑائی کا فیصلہ نہ ہو سکا۔ تیسرے دن فیصلہ کن لڑائی شروع ہوئی آج ایرانیوں نے سب سے زیادہ زور ہاتھیوں پر دیا۔ مسلمان سپاہی اپنے نیزے لے کر ان ہاتھیوں پر پل پڑے۔ نیزے ہاتھیوں کی آنکھ پر پڑتے۔ اور وہ چنگھاڑتے ہوئے پیچھے ہٹتے، ایک بزرگ حضرت قعقاع نے نشان کے ہاتھی پر ایسا وار کیا کہ اس کی سونڈ کٹ کر گر پڑی۔ وہ بھاگا اور اس کے پیچھے پیچھے تمام ہاتھی بھی بھاگ کھڑے ہوئے۔ اب گھمسان کی لڑائی شروع ہوئی اور دست و بازو کا معرکہ شروع ہوا۔ سارا دن جنگ کے عالم میں گزرا۔ ساری رات اسی حالت جنگ میں گزر گئی، دوسرے روز دوپہر ڈھل جانے کے بعد ایرانیوں کا مایۂ ناز سپہ سالار رستم ہلاک ہو گیا، اب ایرانی فوج میدانِ جنگ میں نہ ٹھہر سکی، بھاگ کھڑی ہوئی اور اس طرح ایران کی صدہا برس کی عظمت خاک میں مل گئی۔ قادسیہ کی جنگ نے ایران کی قسمت پر ہمیشہ کے لیے مُہر لگا دی۔ تیس ہزار سے زیادہ ایرانی کھیت رہے۔

مدائن کا معرکہ

لیکن نہیں ——— ابھی تک ایک آخری معرکہ اور ناقابلِ فراموش مرحلہ اور باقی تھا۔ وہ تھا مدائن ——— نوشیرواں اور یزدجرد کے پایۂ تخت اور مجوسیوں کی عظمت و جلال کے مرکز کا سقوط۔

چند چھوٹی چھوٹی جنگوں کو سر کرنے کے بعد مسلمانوں کا لشکر مدائن کے سامنے پہنچ گیا ایرانیوں نے مسلمانوں کی پیش قدمی روکنے کے لیے یہ چال چلی کہ دریائے دجلہ کے پل کو توڑ دیا کشتیاں ہٹا دیں، لیکن یہ روک مسلمانوں کے لیے کوئی معنی نہ رکھتی تھی۔ ان کا سیلِ زمیں گیر ان رکاوٹوں کو کب خاطر میں لاتا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر سپہ سالار لشکرِ اسلام سعد بن وقاص نے اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔:

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے!

سالارِ لشکر کا یہ اقدام دیکھ کر ساری فوج دریا میں اتر گئی۔ یہ لوگ آپس میں باتیں کرتے

ہوئے، ہنستے مسکراتے ہوئے پار پہنچ گئے، ایرانیوں کے تصور میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ ایسے جیالے اور دلاور لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو یوں دریائے زخار کو پار کرلیں، ان پر مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی، انھیں مافوق الانسان سمجھنے لگے۔ مسلمانوں کو کنارے پر اترتا دیکھ کر ان کے مُنہ سے نکلا۔

"دیواں آمدند۔ دیواں آمدند" اور بھاگ کھڑے ہوئے۔

یزدجرد کو یہ خبر ملی تو وہ بھی بھاگ کھڑا ہوا۔ اب مدائن مسلمانوں کا انتظار کر رہا تھا چنانچہ صفر ۱۶ھ میں سعد بن ابی وقاص اپنا لشکر لے کر مدائن میں داخل ہوئے۔ جمعہ کا مبارک دن تھا کسریٰ کے ایوانِ شاہی میں اس کے تخت و جلال کبریائی کی جگہ خدا کے بندے خضوع و خشوع کے ساتھ سجدے میں گر گئے۔

کروڑوں روپے کا مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ اور ایرانی عظمت و جلال کی داستان ہمیشہ کے لیے ایک داستانِ پارینہ بن گئی۔

پردہ داری می کند بر قصر کسریٰ عنکبوت
بوم نوبت می زند بر گنبد افراسیاب

یہ شاعری نہیں حقیقت ہے، ٹھوس اور ناقابلِ تردید حقیقت!

جنگ سے پہلے مسلمانوں نے یزدجرد اور رستم سے ملاقات کر کے قبولِ اسلام کی دعوت دی تھی۔ تو یزدجرد نے کہا تھا۔ اگر سفیروں کا قتل جائز ہوتا تو تم میں سے کوئی یہاں سے زندہ واپس نہ جاتا۔

اور "کل" رستم نے جواب دیا تھا "آفتاب و ماہتاب کی قسم تم سب کو خاک میں ملا دوں گا۔"

لیکن وہ یزدجرد کہاں ہے؟

وہ رستم کیا ہوا؟

اور وہ پیوند لگے کپڑے پہننے والے عرب کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔

طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے!

ایرانی مرکزوں کا سقوط

اب مسلمانوں کا لشکر تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ اور تھوڑی مدت میں ایرانیوں کے دوسرے مراکز جلولا، حلوان، تکریت اور پھر ۱۷ سنہ ھ میں رقہ، حران، نصیبین، سمساط وغیرہ مقامات فتح کر کے جزیرہ کا پورا علاقہ زیر نگیں کر لیا کچھ ہی عرصے کے بعد خوزستان کے پورے علاقے پر اسلام کا پرچم لہرانے لگا۔ شوستر کے مقام پر ہرمزان نے مقابلہ کیا، بعد میں وہ مسلمان ہو گیا، اور حضرت عمرؓ نے اس کے ساتھ حسن سلوک سے کام لیا۔

تیس ہزار ایرانی ہلاک

یزدجرد ابھی زندہ تھا اور اپنی فتنہ سامانیوں سے باز نہ آتا تھا۔ اس نے پھر ایرانیوں کی ایرانی عصبیت سے اپیل کی۔ ڈیڑھ لاکھ کا لشکر جمع ہو گیا۔ مردان شاہ سپہ سالار بنا اور نہاوند میدانِ جنگ قرار پایا۔ یہاں پھر بڑی خوں ریز جنگ ہوئی۔ تیس ہزار سے زیادہ ایرانی قادسیہ کی طرح یہاں بھی ہلاک ہوئے۔ ہزاروں مسلمان شہید ہوئے۔ لڑائی سے پہلے مردان شاہ نے حضرت مغیرہ اسلامی سفیر سے سراپا پندار و نخوت بن کر کہا تھا:

دُنیا میں سب سے زیادہ ناپاک اور خسیس قوم جو ہو سکتی ہے وہ تم عرب ہو۔ تم اتنے ذلیل ہو کہ ہم اپنے تیر بھی تمھارے ناپاک خون سے آلودہ نہیں کرنا چاہتے۔

اور مغیرہ نے جواب دیا تھا:

ہم اس وقت تک واپس نہیں جائیں گے جب تک تمھارے اس ملک کو فتح نہ کریں یا قتل نہ ہو جائیں۔

ایران کی فتح

۲۱ سنہ ھ میں عبداللہ بن عبداللہ نے اصفہان فتح کر لیا۔ ۲۲ سنہ ھ میں ہمدان قزوین اور زنجان کے علاقے فتح ہو گئے، پھر نعیم بن مقرن نے رے پر قبضہ کر لیا۔ اور ان کے بھائی سوید نے قومس کو فتح کر لیا۔ ۲۳ سنہ ھ میں طبرستان کے سارے علاقے نے سر تسلیم خم کر لیا۔ یہی حشر آرمینیہ اور آذربائیجان کا ہوا۔

پورے خراسان پر قبضہ

اسی سن (۲۲ سنہ ھ) میں احنف یزدجرد کے مرکز مرو کی طرف بڑھے ہرات فتح کیا، بلخ پر قبضہ کیا۔ نیشاپور کو زیر نگیں کیا۔ گویا سارا

خراسان قبضے میں آگیا۔ یزدجرد خاقانِ چین کے ہاں بھاگ گیا۔ ایرانیوں نے احنف سے صلح کرلی اور امن و عافیت اور راحت و آسائش کی زندگی بسر کرنے لگے۔

۲۳ھ میں فارس کی طرف مسلمانوں کا لشکر بڑھا اور بہت جلد توج، اصطخر، شیراز اور فارس کے دوسرے اہم مقامات سرنگوں ہوگئے۔ اسی ۲۳ھ میں کرمان فتح ہوا۔ اور سیستان نے اطاعت قبول کرلی۔

دمشق زیرنگیں ہوگیا اجنادین سے فارغ ہوکر خالد نے ابوعبیدہ کی شرکت میں دمشق کا محاصرہ کیا۔ کئی ماہ تک محاصرہ رہا۔ اسی اثناء میں حضرت ابوبکرؓ وفات پاگئے۔ ایک روز خالد کمند کے ذریعے چند فداکاروں کو ساتھ لے کر فصیل کی دیوار پر چڑھے پھر شہر کے اندر پہنچ گئے۔ مخالفوں کو قتل کیا، پھاٹک کھول دیے۔ مسلمان سپاہی فوراً اندر داخل ہوگئے۔ دمشق کے عیسائیوں کو اس یک بہ یک حملے نے حواس باختہ کردیا۔ وہ دوسری طرف سے دوڑے دوڑے ابوعبیدہ کے پاس گئے اور صلح کی التجا کی۔ وہ خالد کی ترک تازیوں سے بے خبر تھے، صلح منظور فرمالی اب صورتِ حال یہ تھی کہ ایک طرف سے خالد فاتحانہ اپنے لشکر سمیت داخل ہوئے، دوسری طرف سے ابوعبیدہ مصالحانہ، اس طرح ۱۴ھ میں دمشق پورے طور پر مسلمانوں کے قبضے میں آگیا۔ پھر اسی سنہ میں اردن کا پورا صوبہ ایک زبردست جنگ کے بعد فتح ہوگیا۔ یہاں بھی عیسائیوں کو شکست کے سوا کچھ نہ ملا۔ پھر اور آگے بڑھ کر حمص اور بعلبک وغیرہ بھی سرنگوں ہوگئے۔ یہاں بھی اسلام کا پھریرا لہرانے لگا۔ اسی سال ابوعبیدہ کے ہاتھوں عیسائیوں کا ایک اور بہت بڑا مرکز لاذقیہ بھی فتح ہوگیا۔

یرموک کی جنگ مسلمانوں کی فاتحانہ یلغار اور رومیوں کی پسپائی اور حسرت نصیبی دیکھ کر ہرقل قیصر روم نے اپنے پایۂ تخت انطاکیہ میں بیٹھ کر پوری قوت و طاقت کے ساتھ ایک آخری اور فیصلہ کن جنگ کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے مذہب کے نام پر پراگندہ اور منتشر عیسائیوں کو مجتمع کیا اور دو لاکھ سے زیادہ لشکر فراہم کرلیا۔ مسلمانوں کا لشکر ۳۰۔۳۵ ہزار سے زیادہ نہ تھا۔

مسلمان بھی یہ فیصلہ کرچکے تھے کہ وہ وقت کی دو بڑی مہذب، متمدن لیکن خدافراموش قوموں

ایرانیوں اور رومیوں یعنی عیسائیوں اور مجوسیوں سے فیصلہ کن جنگ کر کے رہیں گے۔ وہ بھی تیار ہو گئے۔ یرموک کا میدان کارزار قرار پایا۔ یہ رجب ۱۵ سنہ ھ کا واقعہ ہے۔

عیسائیوں نے اس جنگ کو ہر قیمت پر جیتنے کا عزم کر لیا تھا۔ وہ بطریق اور راہب جو ترکِ دُنیا کر چکے تھے تلواریں اور نیزے لے کر مسلمانوں کو قتل کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ کئی ہزار رومیوں نے اپنے پاؤں میں بیڑیاں پہن لی تھیں۔ کہ بھاگنا چاہیں تو بھی نہ بھاگ سکیں۔ اس جنگ میں عرب کے چیدہ چیدہ بہادر اور سردار شریک تھے۔ ایسے معرکے کی جنگ اس سرزمین پر کبھی نہیں ہوئی تھی۔

یہ ایسی لڑائی تھی کہ زمین دہل اٹھی۔ اور آسمان کانپنے لگا۔ رُومیوں کے تقریباً ایک لاکھ آدمی مارے گئے۔ تین ہزار کے قریب مسلمانوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔

اس جنگ نے رومیوں کی کمر توڑ دی، ہرقل نے انطاکیہ میں جب یہ خبر سُنی تو شام کو الوداع کہا اور باحسرت و یاس قسطنطنیہ چلا گیا۔

بیت المقدس پر اسلامی پرچم

۱۶ سنہ ھ میں عمرو بن العاص نے بیت المقدس کا محاصرہ کر لیا۔ عیسائیوں نے صلح کی درخواست کی اور التماس کی کہ عمر خود آ کر معاہدۂ صلح لکھیں۔

رجب ۱۶ سنہ ھ میں حضرت عمر حضرت علی کو اپنا قائم مقام بنا کر بیت المقدس روانہ ہوئے۔ جابیہ کے مقام پر عہد نامۂ امن و صلح لکھا گیا۔ اس سے فارغ ہو کر وہ بیت المقدس پہنچے، وہی سادہ لباس جس میں پیوند لگے ہوئے تھے، لیکن عظمت و جلال کا یہ عالم کہ بڑے بڑے سرکشوں کی گردنیں خم تھیں۔

دورِ فتوحات

۲۷ سنہ ھ میں ابن ابی سرح والیٔ مصر نے عثمانؓ کی اجازت سے شمالی افریقہ پر حملہ کیا۔ طرابلس الغرب کے حدود میں وہاں کا فرماں روا جرجیر سوا لاکھ فوج کے ساتھ مقابل ہوا۔ کافی عرصے تک جنگ جاری رہی لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا، پھر عثمان نے عبداللہ بن زبیر کی سرکردگی میں ایک اور فوج بھیجی۔ اس فوج نے ایسا دباؤ ڈالا کہ طرابلس الغرب فتح ہو گیا۔ پھر تیونس، مراقش، الجزائر اور دوسرے ملحقہ علاقے بھی زیرنگیں ہو گئے۔ اسی سال امیر معاویہ نے جو اب عہدِ عثمانی میں پورے شام کے والی بن چکے تھے ۳۲ سنہ ھ میں قبرص پر مکمل قبضہ کر لیا۔

غزنہ سے کابل تک

۲۹ سنہ ھ میں سارے عجم میں بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے عبداللہ بن عامر نے اس مہم کو سر کرنے کا بیڑہ اٹھایا، فارس پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔ طبرستان کی بغاوت سعید بن عاص نے فرو کی پھر سارا طبرستان فتح کرلیا۔ یہ ۳۰ سنہ ھ کا واقعہ ہے۔ عبداللہ بن عامر نے اسی سال خراسان کی بغاوت کو دبایا۔ نیشاپور پر قبضہ کرلیا۔ یزدجرد پھر ادھر آگیا تھا۔ وہ مارا گیا۔ ابن عامر کے حسب ہدایت عبدالرحمٰن بن سمرہ نے سجستان کو جیتا پھر کابل کی طرف بڑھے، دوار کے باشندوں کو سرنگوں کیا۔ پہاڑ پر سونے کا ایک بُت تھا، اس کی آنکھیں یاقوت کی تھیں، عبدالرحمٰن نے اس کے ہاتھ کاٹ کر آنکھیں نکال لیں پھر وہاں کے مرزبان کو واپس کردیا۔ اور کہا مقصود صرف یہ دکھانا تھا کہ بُت نفع نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ پھر ابن عامر کے حسب الحکم عبدالرحمٰن نے غزنہ سے لے کر کابل تک کا علاقہ فتح کرلیا۔

مصر اور اسکندریہ کی فتح

۲۰ سنہ ھ میں عمرو بن العاص نے فسطاط کا محاصرہ کرلیا فرمانروائے مصر مقوقس (قبطی) تھا۔ سات مہینے تک محاصرہ جاری رہا۔ لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ آخر زبیر کی حسن تدبر اور فراست سے یہ قلعہ فتح ہوگیا مقوقس نے صلح کی درخواست کی جو منظور کرلی گئی اور بغیر کشت وخون کے مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔

اس صلح سے ہرقل بہت برہم ہوا۔ اور ۲۱ سنہ ھ میں رومیوں کا ایک لشکر گراں اسکندریہ روانہ کردیا۔ لیکن مقوقس نے ہرقل کا ساتھ نہیں دیا۔ بالآخر یہاں بھی رومیوں کو ذلت آمیز شکست ہوئی۔ اور اسکندریہ فتح ہوگیا۔ عیسائیوں کو اجازت دی گئی کہ خواہ اسلام قبول کریں یا اپنے مذہب پر قائم رہ کر جزیہ دیں۔ بہت سے مسلمان ہوگئے اور بہت سے اپنے دین ہی پر قائم رہے۔

اسلام کے فداکار

۱۳ سنہ ھ میں حضرت عمر مسند خلافت پر متمکن ہوئے۔ ان کے مسند خلافت پر بیٹھتے ہی ان کی طرف سے شورش اور بغاوت کے مظاہرے شروع ہوگئے۔ مشہور ایرانی سپہ سالار رستم نے مردان شاہ کو تازہ دم فوج کے ساتھ درفش کاویانی کے سائے میں روانہ کیا کہ وہ مسلمانوں سے لڑے اور ان کا استیصال کردے۔ مردان شاہ نے دریائے فرات کے ساحل پر اپنی فوجیں اتار دیں۔ دریا کی دوسری جانب مسلمانوں کا لشکر تھا مردان شاہ کی ہمت نہ پڑی کہ دریا پار کرکے مسلمانوں سے بھڑ جائے لیکن سالار جیش اسلام

ابو عبید ثقفی جوشِ شہادت سے مخمور تھے۔ انھوں نے رفقاء و مشیر کار کی رائے بھی نہ سنی اور اپنے لشکر سمیت فرات پار کر کے دشمن کے سامنے پہنچ گئے۔ لڑائی چھڑ گئی۔ ایرانی فوج میں ہاتھیوں کی بھی ایک قطار تھی۔ ان ہاتھیوں سے عرب کے گھوڑے پہلی بار آشنا ہوئے تھے، وہ بھڑکے، مسلمانوں نے گھوڑوں کو چھوڑا۔ اور پیادہ پا میدانِ مصاف میں تلوار کے جوہر دکھانے لگے۔ انھوں نے تلواروں سے ہودوں کی رسیاں کاٹ دیں اور ہاتھی سوار دھڑا دھڑ گرنے لگے۔ ابو عبیدہ ثقفی نے بڑھ کر ایک ہاتھی پر وار کیا، لیکن خالی گیا۔ ہاتھی نے انھیں سونڈ میں لپیٹا اور کچل دیا وہ شہید ہو گئے۔

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن!

اور اس طرح شہید ہو کر انھوں نے آنے والی فوجوں اور مجاہدوں کے سامنے شجاعت اور جاں بازی کی ایک نہ بھولنے والی تاریخ پیش کر دی۔

نعمان کی شہادت

نہاوند کی لڑائی زور شور سے جاری تھی، ایرانی بڑے صبر و استقلال سے لڑ رہے تھے۔ یہ ان کی زندگی اور موت کی جنگ تھی مسلمانوں کی فداکاری اور جاں نثاری اپنے شباب پر تھی۔ اسی جنگ کے دوران میں سالارِ لشکرِ اسلام نعمان بن مقرن نے بڑی بہادری سے جان دی۔

ایک جاں نثارِ اسلام

اسی جنگ میں قباث کے ہاتھ سے تلواریں اور نیزے ٹوٹ کر گرتے جاتے تھے، مگر ان کے تیور پر بل نہ آتا تھا۔ نیزہ ٹوٹ کر گرتا تو کہتے کوئی ہے جو اس شخص کو ہتھیار دے جس نے خدا سے اقرار کیا ہے کہ میدانِ جنگ سے مر کر ہٹے گا۔ لوگ فوراً تلوار یا نیزہ ان کے ہاتھ میں لا کر دے دیتے اور پھر وہ شیر کی طرح جھپٹ کر دشمن پر جا پڑتے۔

پروانۂ شمعِ اسلام

حباش بن قیس جو ایک بہادر سپاہی تھے، بڑی جاں بازی سے لڑ رہے تھے۔ اسی اثناء میں کسی نے اُن کے پاؤں پر تلوار ماری، ایک پاؤں کٹ کر الگ ہو گیا۔ حباش کو خبر تک نہ ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہوش آیا تو ڈھونڈتے پھرتے تھے کہ میرا پاؤں کدھر گیا۔ اُن کے قبیلے کے لوگ ہمیشہ اس واقعے پر فخر کرتے تھے۔

محاصرے کو سات مہینے کی طویل مدت گزر گئی مگر فسطاط کا قلعہ فتح نہیں ہوا۔

حضرت زبیرؓ عمرو بن عاص عاجز آ گئے۔ تنگ آ کر کہا۔ آج میں مسلمانوں پر فدا ہوتا ہوں، یہ کہہ کر ننگی تلوار ہاتھ میں لی اور سیڑھی لگا کر قلعہ کی فصیل پر چڑھ گئے، چند اور صحابہ نے ساتھ دیا۔ سب نے ایک ساتھ نعرہ تکبیر بلند کیا۔ ساتھ ہی تمام فوج نے نعرہ لگایا کہ قلعہ کی زمین ہل گئی۔ عیسائی یہ سمجھ کر کہ مسلمان قلعے کے اندر گھس آئے، بدحواس ہو کر بھاگے، اُدھر زبیر نے قلعے سے اُتر کر دروازہ کھول دیا، تمام فوج اندر گھس گئی۔ مقوقس نے یہ دیکھ کر صلح کی درخواست کی اور اسی وقت سب کو امان دے دی گئی۔

حضرت عکرمہ جنگ یرموک میں عکرمہ نے جو ابوجہل کے فرزند تھے، فوج کی طرف دیکھا اور کہا، مرنے پر کون بیعت کرتا ہے۔ چار سو شخصوں نے بیعت کی (ان سب نے) اس ثابت قدمی سے لڑائی لڑی کہ تقریباً سب کے سب وہیں کٹ کر رہ گئے۔

غیر مُسلم عہدِ خلافتِ راشدہ میں ذمی یا اہلِ ذمہ وہ غیر مسلم ہے جو مسلمانوں کا مذہب قبول نہیں کرتا لیکن ان کی حفاظت میں آ جاتا ہے۔ وہ مسلم حکومت میں رہتا ہے، اس کی جان و مال کی حفاظت کی جاتی ہے، اس سے فوجی خدمت نہیں لی جاتی۔ اور اگر وہ فوجی خدمت کرے تو جزیہ ساقط ہو جاتا ہے، اسے اپنے مذہبی معاملات میں پوری آزادی ہوتی ہے۔

اسلام نے ذمیوں کو کیا حقوق دیئے ہیں اور ان حقوق پر عہدِ خلافتِ راشدہ میں کس طرح عمل ہوا اسے ہم مختصر طور پر ذیل میں بیان کرتے ہیں۔:

حضرت خالدؓ نے اہلِ حیرہ سے محاصرہ کے بعد ان کی درخواست پر صلح کر لی اور جو صلحنامہ لکھا وہ یہ تھا:

اہلِ حیرہ ایک لاکھ نوے ہزار درہم سالانہ ادا کریں گے۔ ہم (مسلمان) اس کے معاوضے میں ان کی حفاظت کریں گے۔ اگر ان کی حفاظت نہ کر سکیں تو یہ رقم ان پر واجب نہ رہے گی۔ اور اگر وہ بدعہدی کریں تو ہم بری الذمہ ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ نے از روئے معاہدہ حیرہ کے عیسائیوں کو جو حقوق مرحمت فرمائے وہ یہ تھے

ان کی مخالفت ہیں اور گرجے منہدم نہ کیے جائیں، نہ اُن کا کوئی ایسا قصر گرایا جائے جس میں وہ ضرورت کے وقت دشمنوں کے مقابلے میں قلعہ بند ہوتے ہوں ناقوس بجانے کی ممانعت نہ ہوگی نہ تہوار کے موقع پر صلیب نکالنے سے روکے جائیں گے۔

حمص کے عیسائی اور مسلمان

سلسنہ ۱۵ءمیں یرموک کی تیاریوں کے وقت جنگی مصالح کے ماتحت سالار عسکر اسلام ابوعبیدہ نے فیصلہ کیا کہ اپنے مفتوحہ مقام حمص کو چھوڑ کر دمشق کو مرکز بنائیں۔ جب یہ فیصلہ ہو چکا تو ابوعبیدہ نے حبیب بن مسلمہ کو جو افسر خزینہ تھے بلا کر کہا۔ اس وقت ہم عیسائیوں کی حفاظت کا ذمہ نہیں لے سکتے اس لیے جو کچھ ان سے وصول ہوا ہے وہ سب واپس کردو، چنانچہ کئی لاکھ کی رقم جو وصول ہوئی تھی واپس کردی گئی۔ عیسائیوں پر اس واقعے کا اتنا اثر ہوا کہ وہ روتے جاتے تھے اور جوش کے ساتھ کہتے جاتے تھے۔ خدا تم کو واپس لائے۔ یہودیوں پر اس سے بھی زیادہ اثر ہوا۔ انھوں نے کہا توریت کی قسم جب تک ہم زندہ ہیں قیصر حمص پر قبضہ نہیں کرسکتا۔

کیا آج بھی فاتح حکومتیں مفتوح ملکوں اور ملتوں کے ساتھ یہی برتاؤ کرتی ہیں۔

غور سے سنو! — جاپان کے ناگاساکا اور ہیروشیما کیا جواب دیتے ہیں جرمنی کیا کہتا ہے۔ کوریا سے کیا صدا آرہی ہے یا — یا — جاپان کے دو لاکھ سے زیادہ بن باپ کے بچے کیا فریاد کررہے ہیں۔ جرمنی کی عصمت دریدہ دوشیزائیں کیوں رو رہی ہیں۔ کوریا کے خرابے اور کھنڈر کیا پکار رہے ہیں؟

پھر بھی ہم غیر مہذب تھے، اور وہ مہذب ہیں:

جنوں کا نام خرد پڑ گیا خرد کا جنوں!

عہد نامہ صلح

فتح بیت المقدس کے بعد حضرت عمرؓ نے جو عہد نامہ صلح لکھ کر مفتوح قوم کے حوالے کیا۔ اس کا خلاصہ:

یہ وہ امان ہے جو خدا کے غلام امیر المومنین عمر نے ایلیا کے لوگوں کو دی، یہ امان ان کی جان و مال، گرجا، صلیب، تندرست بیمار اور ان کے تمام مذہب والوں کے لیے ہے، نہ ان کے گرجاؤں میں سکونت کی جائے، نہ وہ ڈھائے جائیں، نہ اُن

کہ یا ان کے احاطوں کو کوئی نقصان پہنچایا جائے گا۔ نہ ان کی صلیبوں اور اُن کے مال میں کچھ کمی کی جائے گی نہ مذہب کے بارے میں اُن پر جبر کیا جائے گا۔ ایلیا والوں میں سے جو شخص اپنی جان و مال لے کر نکل جانا چاہے تو وہ بھی مامون ہے تا آنکہ وہ اپنی جائے پناہ تک نہ پہنچ جائے۔ اس تحریر پر خدا، رسول، خلفاء اور مسلمانوں کا ذمہ ہے۔ اس پر خالد بن ولید۔ عمرو بن العاص، عبدالرحمٰن بن عوف اور معاویہ بن ابی سفیان گواہ ہیں۔

ذمیوں سے ہمدردی حضرت عمرؓ نے شام کے سفر میں ایک مقام پر دیکھا کہ ذمیوں پر سختی کی جا رہی ہے، سبب پوچھا تو معلوم ہوا کہ انھوں نے جزیہ ادا نہیں کیا۔ دریافت کیا کیوں ادا نہیں کیا ہے۔ جواب ملا عسرت اور ناداری کے باعث۔ فرمایا انھیں چھوڑ دو، میں نے رسول اللہ صلعم سے سُنا ہے کہ لوگوں کو تکلیف نہ دو۔ جو لوگ دُنیا میں لوگوں کو عذاب دیتے ہیں خدا انھیں قیامت میں عذاب دے گا۔

ذمیوں سے رعایت امام ابو یوسف نے اپنی مشہور زمانہ کتاب میں لکھا ہے کہ معاہدہ حیرہ میں (جو حضرت ابو بکرؓ نے کیا تھا) یہ تصریح ہے کہ اگر کوئی بوڑھا ذمی کام کرنے کے قابل نہ رہے یا کسی مصیبت میں گھر جائے یا غریب اور نادار ہو جائے اور اس کے مذہب والے اسے خیرات دینے لگیں تو اس کا جزیہ معاف کر دیا جائے گا، اور اس کی آل اولاد کو مسلمانوں کے بیت المال سے مصارفِ حیات دیے جائیں گے۔

ذمیوں کو سہولت شام جب فتح ہوا تو عرب سوس بھی فتح ہوا جس کی سرحد ایشیائے کوچک سے ملی ہوئی تھی، صلح کے باوجود یہاں کے لوگ غداری سے باز نہ آتے تھے، رومیوں سے در پردہ ساز باز رکھتے تھے، جاسوسی کرتے رہتے تھے۔ وہاں کے حاکم عمیر بن سعد کو حضرت عمرؓ نے لکھا:

"جس قدر ان کی جائداد، مویشی اور اسباب ہے سب شمار کر کے ایک ایک چیز کی دو چند قیمت دے دو اور ان سے کہہ دو کہ یہاں سے چلے جائیں اور اگر یہ (ذمی) اس پر بھی راضی نہ ہوں تو ایک برس مہلت دو، پھر جلا وطن کر دو۔"

اسلام کا انصاف عمرو بن العاص رضؓ (فاتح مصر) کے فرزند ارجمند نے جب ایک قبطی عیسائی کو بے وجہ مارا تو حضرت عمرؓ نے اس قبطی کے ہاتھ سے مجمع عام میں سزا دلوائی۔ اور عمرو بن العاص اور ان کے بیٹے کی طرف مخاطب ہو کر کہا:

مذ کم تعبد تم الناس وقد ولدتھم امھم احرار۔	تم نے لوگوں کو غلام کب سے بنایا حالانکہ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد جنا تھا۔

حقوق الذمیین حضرت علیؓ نے ایک مرتبہ قرظہ بن کعب انصاری کو لکھا: تمہارے علاقے کے ذمیوں نے درخواست دی ہے کہ ان کی ایک نہر پٹ کر مٹ گئی ہے جس کا بنانا مسلمانوں کا فرض ہے۔ مجھے ان کا آباد رہنا زیادہ پسند ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ وہ ملک سے نکل جائیں یا عاجز و درماندہ ہو جائیں یا ملک کی بھلائی میں حصہ لینے کے قابل نہ رہیں۔

غلاموں کا مقام حضرت علیؓ فرمایا کرتے تھے: مجھے ایسے شخص کو غلام کہتے ہوئے شرم آتی ہے جو کہتا ہے میرا پروردگار اللہ ہے۔ ایک دفعہ آپ نے اپنے غلام کو کچھ دام دیے اور فرمایا، دو مختلف قیمتوں کے کپڑے خرید لاؤ۔ پھر آپ نے قیمتی کپڑا اسے دے دیا اور معمولی اپنے لیے رکھ لیا اور فرمایا تم جوان ہو تمھیں زیب و زینت کی خواہش ہونی چاہیے۔ میرا کیا میں اب عمر رسیدہ ہوں۔

حضرت ابوبکرؓ نے بہت سے غلاموں کو خریدا۔ اور راہِ خدا میں آزاد کر دیا۔ حضرت بلال حبشی انہی کے آزاد کردہ غلام تھے۔

صحیح بخاری کتاب المکاتب میں ہے کہ حضرت انسؓ کے غلام سیرین نے مکاتبت کی درخواست کی۔ انسؓ نے انکار کیا۔ سیرین حضرت عمرؓ کے پاس حاضر ہوا۔ آپ نے انسؓ کو مجبور کیا کہ وہ مکاتبت قبول کر لیں تاکہ وہ اپنی حسب خواہش آزاد ہو سکے۔

حضرت عمرؓ نے بدر کے مجاہدین کی جب تنخواہیں مقرر کیں تو ان کے غلاموں کی بھی انہی کے برابر تنخواہ مقرر کی۔ اضلاع کے جو عمال تھے ان کی نسبت ہمیشہ یہ بھی دریافت کرتے رہتے تھے کہ غلاموں

کے ساتھ ان کا برتاؤ کیا ہے۔ اگر یہ معلوم ہوتا کہ وہ غلاموں کی عیادت کو نہیں جاتا تو حضرت اس جرم پر معزول و موقوف کر دیتے تھے، اکثر غلاموں کے ساتھ کھانا کھایا کرتے تھے اور حاضرین کو سُنا کر کہتے تھے، خدا ان لوگوں پر لعنت کرے جن کو غلاموں کے ساتھ کھانا کھانے سے انکار ہے۔ سرداران فوج کو کہلا بھیجا تمھارا غلام کسی کو امان دے تو وہ امان تمام مسلمانوں کی طرف سے سمجھی جائے۔

سرکاری خزانہ

مسلمانوں کا بیت المال کیا تھا؟ اس کی نوعیت کیا تھی؟ خلافتِ راشدہ کے دَور میں اس کی کیا کیفیت رہی؟ یہ داستان بھی سُننے کے لائق ہے۔

آخر عہد میں حضرت ابوبکرؓ نے بیت المال کے لیے ایک عمارت تعمیر کرائی تھی لیکن اس میں کوئی رقم جمع کرنے کی نوبت نہ آئی۔ ایک مرتبہ کسی نے کہا آپ بیت المال کے لیے کوئی محافظ کیوں نہیں رکھتے؟ جواب دیا اس کی حفاظت کے لیے ایک قفل کافی ہے۔

اس لیے کہ نہ عوام سے جُڑے ہوئے روپے کی افراط تھی نہ عوام کی نیت خراب تھی۔

اکثر ایسا ہوتا کہ روپیہ تقسیم کرنے کے بعد (حضرت ابوبکر) بیت المال میں جھاڑو پھروا دیتے وفات کے بعد جب بیت المال کا جائزہ لیا گیا تو اس میں ایک درہم نکلا۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ بیت المال کا ایک اونٹ بھاگ گیا۔ حضرت عمرؓ بہ نفس نفیس اس کی تلاش میں نکلے کسی شخص نے کہا آپ کیوں تکلیف فرماتے ہیں کسی کو حکم دیجیے تلاش کر لائے گا۔

جواب دیا: ای عبد اعبد منی (یعنی مجھ سے بڑھ کر کون غلام ہو سکتا ہے)۔

آج اشتراکیت اور عوامیت کے اس دَور میں بھی حکومت کے سربراہ کو عوام کی امانت کا اتنا پاس و لحاظ ہے۔؟

حضرت علیؓ بیت المال کے مصارف پر بڑی کڑی نظر رکھتے تھے۔ اپنی ذات پر بھی کچھ خرچ نہیں کرتے تھے۔ ایک بار عمرو بن سلم اصفہان کا خراج لائے، اس میں شہد بھی تھا اور چربی بھی۔ آپ کی صاحبزادی ام کلثوم کو شہد کی ضرورت تھی۔ عمرو بن سلم نے کچھ شہد اور چربی بھیج دی۔ حضرت علیؓ نے شہد اور چربی فوراً واپس منگا کر بیت المال میں داخل کرا دی۔ جو حصہ خرچ ہو چکا تھا اس کی قیمت ادا کر دی۔

ابورافع عہد علوی میں بیت المال کے نگراں تھے، ایک مرتبہ انھیں ٹوکا اور فرمایا۔ تمھارا یہ حال

ہے کہ اپنی لڑکی کو بیت المال کے موتیوں سے آراستہ کرتے ہو، جب فاطمہؓ سے میری شادی ہوئی تھی تو میرے پاس صرف مینڈھے کی ایک کھال تھی جس پر میں رات کو سوتا تھا۔ اور دن کو اسی پر مویشی کو چارہ دیتا تھا۔ ایک خادم تک میرے پاس نہ تھا۔

جاڑے کا موسم تھا اور حضرت علیؓ ایک پرانی چادر اوڑھے کانپ رہے تھے۔ ایک شخص نے عرض کیا امیرالمومنین بیت المال میں آپ کا اور آپ کے اہل وعیال کا بھی حق ہے فرمایا تمھارے حصّے کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ یہ چادر میں مدینے سے اپنے ساتھ لایا تھا۔

باغیوں سے رعایت

حضرت عمرؓ کے عہد میں جب وہ منصب خلافت پر فائز ہوئے تو "پوران دخت" نے مشہور مدبّر اور مانے ہوئے بہادر رستم کو ایرانی افواج کا سپہ سالار بنایا، اس نے ایرانیوں کے مذہبی جذبات بھڑکا دیے، سارے ایران میں مسلمانوں کے خلاف آگ لگادی۔ پوری ایرانی قوم مسلمانوں کے مقابلے کے لیے یکسر جوش انتقام بن گئی۔ اور چند ہی روز میں عراق کے تمام مفتوحہ علاقوں میں بغاوت کی چنگاریاں پھیل گئیں۔ پوران دخت نے ایران کے دو مشہور بہادروں نرسی اور جابان کو رستم کی امداد و اعانت پر مقرر کیا۔ یہ دونوں اپنی فوجیں لے کر دو مختلف راستوں سے مسلمانوں کے مقابلے کے لیے چل پڑے۔ دوسری طرف سے ابو عبید ثقفی آرہے تھے۔ خارج کے مقام پر ان کی اور جابان کی مڈبھیڑ ہوگئی۔ ابو عبید نے جابان کے لشکر کو ذلت آمیز شکست دی۔ کئی افسر ہلاک ہوئے اور خود جابان زندہ سلامت گرفتار ہوگیا۔ لیکن جابان کو لشکرِ اسلام میں کوئی پہچانتا نہیں تھا۔ اس نے دھوکے سے کام لیا اور رہائی حاصل کرلی، رہائی کے بعد بعض مسلمانوں نے اسے پہچان لیا اور پھر اسے گرفتار کرکے ابو عبید کی خدمت میں پیش کیا۔ انھوں نے سارا ماجرا سن کر فرمایا:

ہم بدعہدی نہیں کرسکتے، اسے ایک مسلمان (خواہ غلط فہمی سے سہی) رہا کرچکا ہے لہٰذا یہ آزاد کردیا جائے۔ یہ حکم سنتے ہی مسلمانوں کی گردنیں جھک گئیں اور مملکت کا یہ بڑا باغی آن کی آن میں رہا کردیا گیا۔

تدبّر اور معاملہ فہمی

اس باب میں ہم ایسے واقعات کا بھی ذکر کریں گے جن سے معلوم ہوگا کہ نازک ترین لمحات میں بھی خلفائے راشدین کی بصیرت اور فراست نے

کس خوبی سے بڑے بڑے فتنوں اور طوفانوں کا قلع قمع کر دیا۔ کس کامیابی سے شورش اور بغاوت کا استیصال کیا۔ کس پامردی اور استقلال سے ناموافق اور ناسازگار حالات میں بھی وہی کیا جو حق، صداقت اور دین کا تقاضا تھا۔

آنحضرتؐ کے وفات پاتے ہی بعض قبائلِ عرب مرتد ہو گئے۔ بعض جھوٹے مدعیانِ نبوت پیدا ہو گئے۔ بعض لوگ اسلام پر تو قائم رہے لیکن زکوٰۃ کے ادا کرنے سے انکار کرنے لگے۔

حضرت ابوبکرؓ کے مسندِ خلافت پر بیٹھتے ہی یہ سب مسائل آپ کے سامنے حل طلب طور پر پیش ہوئے لیکن آپ ذرا بھی ہراساں نہیں ہوئے۔ مرتدین کا مقابلہ کیا۔ مدعیانِ نبوت کا قلع قمع کیا اور مانعینِ زکوٰۃ کو مجبور کیا کہ وہ بیت المال میں زکوٰۃ کی رقم ادا کریں۔ اور عین اس زمانے میں جب یہ فتنے اٹھ رہے تھے اور شورشیں برپا ہو رہی تھیں آپ نے خدا کی نصرت پر بھروسہ کر کے اسامہؓ بن زید کی سرکردگی میں وہ مہم بھی مدینہ سے باہر بھیج دی جسے رسول اللہؐ نے مامور کیا تھا۔ اور جب بدلے ہوئے حالات میں اجلّ صحابہ تک فوج کو مدینہ سے باہر بھیجنے کی رائے دیتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔

یہ سارے کارنامے آپ کی بصیرت اور فراست پر دال ہیں، اگر آپ نے مہم نہ بھیجی ہوتی یا مانعینِ زکوٰۃ کے سامنے سر خم کر دیا ہوتا یا مرتدین سے چشم پوشی کی ہوتی یا مدعیانِ نبوت کو مہلت دی ہوتی تو اسلام ایک تماشا بن کر رہ جاتا۔

عبداللہؓ بن عمرؓ نے ابولولوء قاتلِ عمرؓ کے ایک ساتھی کو شبہ کی بنا پر قتل کر دیا۔ مقدمہ حضرت عثمانؓ کے ہاں پیش ہوا۔ انھوں نے صحابہ سے رائے لی۔ حضرت علیؓ نے کہا قصاص لیا جائے۔ بعض صحابہ نے کہا کل عمرؓ قتل ہو چکے ہیں آج ان کے لڑکے کو قتل کرنا مناسب نہیں ہے۔ عمرو بن العاص نے کہا: آپ عبداللہ کو معاف کر دیں گے تو خدا آپ سے مواخذہ نہ کرے گا۔ اس اختلافِ رائے پر آپ نے فرمایا چونکہ مقتول کا کوئی وارث نہیں اس لیے میں بہ حیثیت ولی کے قصاص کو دیت سے بدلے دیتا ہوں۔ اور اپنی جیبِ خاص سے دیت ادا کر دی۔

پاسِ عہد

جنگ انسان کا باہمی توازن ختم کر دیتی ہے۔ عدل، انصاف، رواداری اور انسانیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ کوشش صرف ایک امر پر مرکوز رہتی ہے کہ دشمن کو شکست

دی جائے۔

آج سے چودہ سو برس پہلے کو چھوڑیے، آج جب کہ دنیا اتنی ترقی کر گئی ہے، کیا حال ہے۔ کیا اس تمدن اور حضارت کے زمانے میں بھی بے گناہ شہریوں پر بم نہیں پھینکے جاتے؟ کیا دشمن قوم پر اندھا دھند ایٹم بم نہیں برسائے جاتے؟ کیا کھیتوں کو نہیں جلایا جاتا؟ کیا پانی میں زہر نہیں ملایا جاتا کیا متعدی بیماریوں کے جراثیم کی نشر و اشاعت نہیں ہوتی۔ کیا آگ نہیں لگائی جاتی!

یہ سب کچھ ہوتا ہے، امن کے نام پر ہوتا ہے۔ "انسانیت" کی خاطر ہوتا ہے لیکن آج سے چودہ سو برس پہلے ایک اُمّی نے اپنے دورِ حکومت میں کیا کیا؟ اس داستان کو دنیا نہ سنے یہ دوسری بات ہے لیکن اسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

۱۳ھ میں حضرت ابوبکرؓ نے شام پر فوج کشی کے لیے چند سردار منتخب فرمائے تو ان سے کہا۔ تم ایسے لوگوں کو پاؤ گے جنھوں نے اپنے آپ کو خدا کی عبادت کے لیے وقف کر دیا ہے (عیسائیوں کے راہب مراد ہیں) ان کو چھوڑ دینا کسی عورت، بوڑھے اور بچے کو قتل نہ کرنا، پھل دار درختوں کو نہ کاٹنا، کسی آباد جگہ کو ویران نہ کرنا، کھانے کے سوا بکری اور اونٹ کو بیکار ذبح نہ کرنا۔ نخلستان نہ جلانا، مالِ غنیمت میں غبن نہ کرنا، اور بزدلی نہ دکھانا۔

قیصرِ روم نے جب مسلمانوں کے مقابلے میں اپنا ٹڈی دل لشکر فراہم کیا تو حمص کے مقام پر (۱۵ھ) سالارِ لشکرِ اسلام ابوعبیدہ نے مسلمان افسروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا: خدا نے تم کو بار بار جانچا اور تم اس جانچ میں پورے اُترے۔ اس کے صلے میں خدا نے تم کو ہمیشہ مظفر و منصور رکھا۔ اب تمھارا دشمن اس سر و سامان سے تمھارے مقابلے کے لیے چلا ہے کہ زمین کانپ اٹھی ہے۔ اب بتاؤ کیا صلاح ہے؟ معاویہ کے بھائی یزید بن ابی سفیان نے کہا میری رائے ہے کہ عورتوں اور بچوں کو شہر میں رہنے دیا جائے اور ہم خود شہر کے باہر لشکر آرا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ خالد اور عمرو بن العاص کو خط لکھا جائے کہ وہ دمشق اور فلسطین سے چل کر مدد کو آئیں۔ شرجیل بن حسنہ نے کہا۔ اس موقع پر ہر شخص کو آزادانہ رائے دینی چاہیے۔ یزید کی رائے بے شبہ خیر خواہی پر مبنی ہے لیکن میں اس کا مخالف ہوں، شہر والے عیسائی ہیں ممکن ہے وہ تعصب سے ہمارے اہل و عیال کو پکڑ کر قیصر کے حوالے کر دیں، یا خود مار ڈالیں، ابوعبیدہ نے کہا اس کی

تدبیر یہ ہے کہ ہم نے عیسائیوں کو اس شرط پر امن دیا ہے کہ وہ شہر میں اطمینان سے رہیں۔ ان سے نقضِ عہد کیونکر ہو سکتا ہے۔

ابو عبیدہ نے اپنی غلطی تسلیم کر لی۔

آج چودہ سو برس کے بعد مہذب اور متمدن دنیا کے لڑنے والے اسلام کے ان اصولوں سے آگے نکل گئے ہیں۔

شرطِ اشاعت ۲۳ھ میں سیستان نے اطاعت قبول کر لی۔ اہل سیستان کی شرط یہ بھی کہ ان کی تمام اراضی محفوظ قرار دی جائے اور مسلمان اس سے کوئی سروکار نہ رکھیں مسلمانوں نے یہ بات مان لی۔ اور اس شرط کا اتنا پاس و لحاظ رکھا کہ کھیتوں کے پاس سے جلدی سے گزر جاتے تھے کہ چھو نہ جائیں۔

دمشق کی مثال ۱۴ھ میں دمشق فتح ہوا۔ یہ فتح بھی عجیب و غریب تھی۔ ایک طرف سے خالد اپنے لشکر کو لے کر فاتح و منصور بن کر داخل ہوئے۔ دوسری طرف ابو عبیدہ نے عیسائیوں کی درخواست قبول کر لی گئی اور مصالحانہ داخل ہوئے، چونکہ ابو عبیدہ صلح کر چکے تھے لہٰذا یہ تسخیر مصالحانہ قرار دی گئی۔ فاتحانہ نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دمشق کے عیسائیوں سے نہ مالِ غنیمت لیا گیا نہ کسی کو لونڈی یا غلام بنایا گیا ـــــ ابو عبیدہ صلح کر چکے تھے مسلمانوں کا پاسِ عہد، جنگ کی فتح مندیوں اور فیروز مندیوں پر بھی غالب آتا ہے اور غالب آیا۔

رومی سفیر کا قبولِ اسلام جنگِ یرموک کے موقع پر رومیوں نے طلبِ سفارت کے لیے اپنا سفیر جارج نامی مسلمانوں کے لشکر میں بھیجا۔ سفیر جب پہنچا تو مغرب کی نماز کی تیاریاں ہو رہی تھیں، نماز شروع ہوئی، مسلمانوں کی محویت اور استغراق دیکھ کر اسے سکتہ سا ہو گیا۔ نماز کے بعد اس نے ابو عبیدہ سے پوچھا۔ عیسیٰ کے بارے میں تمہارا کیا اعتقاد ہے؟

ابو عبیدہ نے چند آیتیں پڑھیں جو حضرت عیسیٰؑ کی رسالت اور عبدیت سے متعلق تھیں وہ سن کر بے ساختہ کہہ اٹھا بلاشبہ تمہارا پیغمبر سچا ہے۔ پھر اس نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا۔

جارج مسلمان ہو کر اپنی قوم (عیسائیوں) کے پاس نہیں جانا چاہتا تھا لیکن ابو عبیدہ نے اس خیال سے کہ بدعہدی کا خیال نہ ہو، اُسے واپس جانے پر مجبور کیا۔

عدلِ کامل مساواتِ عامّہ

قاضیوں کا تقرر خلافت کی طرف سے کیا جاتا حضرت عمرؓ نے قاضیوں کے لیے ایک لائحہ عمل مقرر کیا تھا۔

مدّعی مدعا علیہ کو ایک نظر سے دیکھو، ان کی نشست میں کسی قسم کا امتیاز روا نہ رکھا جائے، عدل و انصاف میں کسی کے ساتھ رعایت نہ کرو۔ جن جدید مسائل میں تردّد پیدا ہو ان میں عقل و درایت سے کام لو، پچھلے نظائر اور امثال کی روشنی میں غور کرو مدّعی کو اتنی مہلت نہ دو کہ وہ گواہ اور ثبوت آسانی سے پیش کر سکے مسلمان ایک دوسرے کے لیے عادل گواہ کی حیثیت سے پیش ہو سکتے ہیں، بجز ان مسلمانوں کے جن پر شرعی حد جاری ہو چکی ہے، جن کی جھوٹی گواہی کا تجربہ ہو چکا ہو، یا اُن کا فریق مخالف کے ساتھ ذاتی تعلق یا قرابت داری ہو۔

عدالتِ اعلیٰ میں ماتحت عدالت کے فیصلے اسی وقت بھیج دیے جاتے تھے جب وہ انہیں نافذ کرنے کی طاقت نہیں رکھتی تھی، جب فریقین کو اس کے فیصلے سے اطمینان نہ ہوتا تھا، تو وہ عدالتِ اعلیٰ میں اپیل کر سکتے تھے۔ خلافتِ راشدہ میں صرف حضرت علی نے عدالتِ اعلیٰ کے فرائض انجام دیے۔ آپ نے اس کے لیے کوئی دن یا وقت مقرر نہیں کیا تھا بلکہ شب و روز جس وقت بھی کوئی مظلوم دادخواہ ہوتا اسی وقت انصاف کر دیتے۔

محتسب، احکامِ شرعی کا تحفظ اور ان کی پابندی کراتا تھا، منڈیوں اور بازاروں کے نظم و نسق کی نگرانی کرتا تھا۔ وہ وزنوں اور پیمانوں کی جانچ پڑتال بھی کرتا رہتا تھا، اور اس کام کے لیے ایک باقاعدہ دفتر بھی موجود تھا۔ جہاں تمام دکان داروں اور خرید و فروخت کرنے والوں کو معیّن اوقات میں آنا پڑتا تھا۔

حضرت عمرؓ نے سب سے پہلے احتساب کا نظام قائم کیا حضرت علیؓ اور ابو بکرؓ کے زمانے میں بھی احتساب کی کارفرمائی جاری تھی۔ خلافتِ راشدہ کے بعد دوسرے ادوار میں اس شعبے نے خاصی ترقّی کر لی۔

مساوات کا شور ہم آج بھی سنتے ہیں، اور اس شور سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی لیکن اسلام نے مساواتِ کامل کا جو نظارہ دنیا کو دکھایا اس کی مثال آج تک نہ مل سکی۔ عہدِ خلافتِ راشدہ میں مساوات کی جو مثالیں چند سال کی مختصر سی مدت میں نظر آگئیں، وہ جمہوریت اور عوامیت کے صدہا سال میں بھی نظر نہ آسکیں۔

عہدِ صدیقی میں زکوٰۃ، عشر، جزیہ اور غنیمت کی آمدنی میں کافی اضافہ ہوگیا تھا، لیکن حضرت ابوبکرؓ نے کوئی خزانہ نہیں قائم کیا۔ اسلامی ضروریات میں صرف کرنے کے بعد جو کچھ بچتا، اس کو بلا تفریق آزاد و غلام، ادنیٰ و اعلیٰ، مرد اور عورت عام مسلمانوں میں تقسیم فرما دیتے۔ اس مساوات پر ایک شخص نے اعتراض کیا تو فرمایا، فضل و منقبت اور شے ہے، اس کو رزق کی کمی بیشی سے کوئی علاقہ نہیں۔

خلیفہ، قاضی کے سامنے

ایک مرتبہ ابن ابی کعب نے حضرت عمرؓ کے خلاف زید بن ثابت کی عدالت میں مقدمہ دائر کیا۔ حضرت عمرؓ مدعا علیہ کی حیثیت سے پیش ہوئے، حضرت زید نے تعظیم کی۔ عمر نے فرمایا یہ تمھارا پہلا ظلم ہے، یہ کہہ کر اپنے فریق ابی کے ساتھ بیٹھ گئے، ابی کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا۔ عمر کو دعوے سے انکار تھا۔ ابی نے قاعدے کے موافق عمر سے قسم لینی چاہی۔ زید نے ابی سے کہا امیرالمومنین کو قسم سے معاف رکھو۔ عمر اس ترمیم پر آزردہ ہوگئے، فرمایا جب تک تمھارے نزدیک ایک عام آدمی اور عمر برابر نہ ہوں اس وقت تک تم منصبِ قضا کے اہل نہیں ہوسکتے۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ صحابیٔ رسول ابی بن کعب کی خدمت میں کچھ لوگ حاضر ہوئے۔ جب وہ اٹھے تو ازراہ تعظیم لوگ ساتھ ہوگئے۔ اسی موقع پر حضرت عمرؓ کا ادھر سے گزر ہوا۔ انھوں نے فوراً ابی کے ایک کوڑا لگایا اور فرمایا: تم نہیں جانتے کہ اس طرح کی تعظیم متبوع کے لیے فتنہ اور تابع کے لیے ذلت ہے۔

فرمانروائے وقت جبلہ مسلمان ہوگیا۔ طوافِ کعبہ کے وقت اس کی چادر کا ایک گوشہ بدو کے پاؤں کے نیچے آگیا۔ جبلہ نے اس کے منہ پر ایک تھپڑ مارا۔ بدو نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ جبلہ نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی۔ فرمایا، تم نے جیسا کیا ویسا پایا۔ جبلہ نے کہا ہم وہ ہیں کہ اگر ہم سے کوئی گستاخی کرے تو اس کی سزا قتل ہے۔ جواب دیا، ہاں عہدِ جاہلیت (کفر) میں ایسا ہی تھا۔ لیکن اسلام میں شاہ و گدا ایک ہیں۔

قریش کے کچھ سردار ایک مرتبہ حضرت عمرؓ سے ملنے آئے۔ اتفاق سے صہیب، بلال اور عمار وغیرہ موجود تھے جو آزاد شدہ غلام تھے اور دنیاوی لحاظ سے معمولی لوگ سمجھے جاتے تھے۔ عمرؓ نے سب سے پہلے انہی لوگوں کو بلایا، سرداران قریش باہر انتظار میں بیٹھے رہے۔ ابوسفیان کو یہ طرز عمل ناگوار گزرا خدا کی قدرت ہے، غلاموں کو باریابی کی اجازت ملتی ہے ہم منتظر بیٹھے ہیں، ایک ساتھی نے کہا ہم کو عمرؓ کی نہیں اپنی شکایت کرنی چاہیے۔ اسلام نے سب کو ایک آواز سے بلایا لیکن جو اپنی شامت سے پیچھے پہنچے وہ آج بھی پیچھے رہنے کے مستحق ہیں۔

علی اور قاضی شریح

ایک مرتبہ حضرت علیؓ کی زرہ کھو گئی، وہ ایک یہودی کو ملی، آپ نے اسے دیکھ کر پہچان لیا۔ اور قاضی شریح کی عدالت میں دعویٰ کیا۔ قاضی نے حضرت علیؓ سے ثبوت مانگا آپ ثبوت نہ دے سکے۔ قاضی نے یہودی کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ وہ اس واقعے سے اتنا متاثر ہوا کہ فوراً مسلمان ہو گیا۔ اس نے کہا:

یہ انصاف تو نبیوں جیسا ہے۔ امیر المومنین مجھے اپنی عدالت کے سامنے پیش کرتے ہیں اور قاضی امیر المومنین کے خلاف فیصلہ دے دیتا ہے۔

آزادیٔ تقریر

ایک دفعہ حضرت عمرؓ سے ایک آدمی نے برسرِ عام کہا:

عمر! کیا عاملوں (گورنروں) کے لیے چند قواعد مقرر کر دینے سے تم عذاب الٰہی سے بچ جاؤ گے؟ تم کو خبر ہے کہ عیاض بن غنم جو مصر کا عامل ہے باریک کپڑے پہنتا ہے اور دروازے پر دربان مقرر ہے۔

حضرت عمرؓ نے محمد بن مسلمہ کو بلایا۔ اور حکم دیا عیاض کو جس حالت میں پاؤ ساتھ لے آؤ۔ محمد نے وہاں پہنچ کر دیکھا تو واقعی دروازے پر دربان تھا اور وہ باریک کرتہ پہنے تھے۔ اسی ہیئت اور لباس میں انھیں لے کر مدینے آئے، حضرت عمرؓ نے وہ کرتہ اتروا کر بالوں کا ایک کرتہ پہنوایا۔ اور بکریوں کا ایک گلہ منگوا کر حکم دیا جنگل میں لے جا کر چراؤ۔ عیاض کو انکار کی مجال نہ تھی مگر بار بار کہتے تھے۔ اس سے مر جانا بہتر ہے۔ عمرؓ نے کہا تجھے اس سے عار کیوں ہے؟ تیرے باپ کا نام غنم اسی لیے پڑا تھا کہ وہ بکریاں چرایا کرتا تھا۔ عیاض نے دل سے توبہ کی اور جب تک زندہ رہے اپنے فرائض نہایت خوبی سے سرانجام دیتے رہے۔

حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ منبر پر چڑھ کر کہا:

صاحبو! اگر میں دنیا کی طرف جھک جاؤں تو کیا کرو گے؟

ایک شخص وہیں کھڑا ہو گیا اور تلوار میان سے کھینچ کر بولا۔ تمھارا سر اڑا دیں گے۔ عمرؓ نے اسے آزمانے کو ڈانٹ کر کہا۔ کیا تو میری شان میں یہ لفظ کہتا ہے۔ اس نے کہا۔ ہاں ہاں تمھاری شان میں۔ حضرت عمر نے کہا: الحمدللہ قوم میں ایسے لوگ موجود ہیں کہ میں کج ہوں گا تو وہ سیدھا کر دیں گے۔

عمرو بن العاص

۲۵ھ میں حضرت عثمانؓ نے عمرو بن عاص کو معزول کر کے عبداللہ بن ابی سرح کو مصر کا گورنر بنایا۔ عمرو بن عاص سے مصر کا خراج زیادہ وصول نہیں ہوتا تھا۔

حضرت عثمانؓ کے تقاضے پر عمرو بن العاص نے کہا اونٹنی اس سے زیادہ دودھ نہیں دے سکتی۔ ابن ابی سرح نے دوسرے سال بہت کافی ترقی دکھائی۔ عثمان نے عمرو بن العاص سے کہا دیکھو اونٹنی نے زیادہ دودھ دیا۔ عمرو نے جواب دیا ہاں، لیکن بچے بھوکے رہ گئے۔

ابو موسیٰ پر اعتراض

ابو موسیٰ اشعری بصرہ کے والی تھے۔ ۲۹ھ میں کردوں نے بغاوت کی ابو موسیٰ نے جہاد پر وعظ کیا اور راہِ خدا میں پیادہ پا چلنے کے فضائل بیان کیے۔ بہت سے لوگ آمادہ ہو گئے۔ ابو موسیٰ جب روانہ ہوئے ان کی سواری میں ایک نہایت عمدہ ترکی گھوڑا تھا اور چالیس خچروں پر ان کا سامان بار تھا۔ ایک شخص نے بڑھ کر باگ روک لی اور کہا، قول و فعل میں یہ اختلاف۔ اب ہم کو سواری دو اور خود پیدل چلنے کا ثواب حاصل کرو۔ ابو موسیٰ نے کوڑا مارا۔ لوگ شکایت لے کر حضرت عثمانؓ کے پاس پہنچے۔ اور ابو موسیٰ کی معزولی کا مطالبہ کیا۔ حضرت عثمانؓ نے ابو موسیٰ کو معزول کر کے عبداللہ بن عامر کو والی مقرر کر دیا۔

باہمی کشت و خون

خلافتِ راشدہ کا آخری دور

مسلمانوں میں خانہ جنگی کا آغاز حضرت عثمانؓ کے عہد سے ہوا۔ حضرت عثمانؓ بہت بامروت، خلیق، رحم خو اور نرم دل تھے۔ مخالفین نے انھیں خویش پروری کے سلسلے میں متہم کیا اور شورش کا آغاز کردیا

امیر معاویہ نے شام واپس جاتے وقت کہا:

امیر معاویہ کا اصرار میرے ساتھ چلیے وہاں آپ کا بال بیکا نہیں ہوسکتا۔

لیکن حضرت عثمانؓ نے کہا:

میں جوارِ رسولؐ نہیں چھوڑ سکتا۔

معاویہ نے کہا: مجھے ناگہانی حادثے کا خطرہ ہے۔

فرمایا: حسبی اللہ نعم الوکیل۔

سنہ ۳۵ھ میں کوفہ، بصرہ اور مصر کے باغی متحدہ طور پر یورش کر کے مدینہ پہنچے۔ موسم حج کے باعث مدینہ سونا تھا، خلقت مکہ میں تھی۔ باغیوں کی سرکشی حد سے بڑھ گئی۔ جمعہ کے دن آپ پر اتنے پتھر برسائے کہ آپ بے ہوش ہو کر منبر سے گر پڑے۔ امام حسینؓ وغیرہ آپ کی حفاظت کے لیے پہنچے لیکن آپ نے سب کو واپس کردیا۔

باغیوں کا مطالبہ یہ تھا کہ آپ خلافت سے دست بردار ہو جائیں۔ آپ کا جواب یہ تھا: سر دے دوں گا لیکن خدا کی بخشی ہوئی خلافت کو نہ چھوڑوں گا۔

حضرت علیؓ نے سمجھا بجھا کر باغیوں کو ہٹا دیا لیکن وہ ہر طرح فتنہ و فساد پر آمادہ تھے۔ انھوں نے بیتِ عثمانؓ کا محاصرہ کر لیا۔ امام حسینؓ اور عبد اللہ بن زبیرؓ وغیرہ آپ کی حفاظت کے لیے سینہ سپر دروازے پر موجود تھے۔ باغیوں کا جوش اور بڑھ گیا۔ انھوں نے حضرت علیؓ اور ام المومنین ام حبیبہؓ کی شان میں گستاخی کی مغیرہ بن شعبہ نے کہا یا مکے چلے جائیے یا شام یا باغیوں کا مقابلہ کیجیے۔ فرمایا میں وہ پہلا شخص نہیں بننا چاہتا جس کے ہاتھوں امتِ مسلمہ کی خونریزی شروع ہو۔ مکہ اور شام بھی نہیں جاؤں گا (کسی قیمت پر) جوارِ رسولؐ کو نہیں چھوڑوں گا۔ باغیوں نے دروازے میں آگ لگا دی، کچھ لوگ دیوار پر چڑھ کر اندر داخل ہو گئے حضرت عثمان تلاوت کر رہے تھے۔ کنانہ بن بشیر نے پیشانی پر لوہے کی لاٹ ماری، خون سے کلام اللہ کے اوراق رنگین ہو گئے۔ عمرو بن الحمق نے سینے پر چڑھ کر مسلسل وار کیے۔ حضرت نائلہ (حضرت عثمان کی بیوی) تلوار کے سامنے اپنے شوہر کو بچانے کے لیے دوڑیں۔ ان کی تین انگلیاں ہتھیلی سے اُڑ گئیں اور سودان بن حمران نے لپک کر شہید کر دیا۔ شہادت کے وقت آپ کی زبان پر یہ آیت تھی: فسیکفیکھم اللّٰہ وھو السمیع العلیم اور اس طرح ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ کو جمعہ کے دن ایک بہت بڑا صحابی، ایک بہت بڑا انسان اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

مدینہ پر باغیوں کا قبضہ مدینہ پر باغیوں کا قبضہ ہو گیا، بد امنی کے باعث دو روز تک لاشِ مبارک بے گور و کفن پڑی رہی۔

صحابہ کے تاثرات حضرت علیؓ نے اس حادثے کی خبر سن کر دونوں ہاتھ اٹھا کر فرمایا خدایا میں عثمان کے خون سے بری ہوں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا۔ اگر ساری مخلوق اس قتل میں شریک ہوتی تو قوم لوط کی طرح اس پر آسمان سے پتھر برستے۔ حضرت حذیفہ نے فرمایا۔ عثمان کی شہادت سے وہ رخنہ پیدا ہو گیا ہے جسے پہاڑ بھی بند نہیں کر سکتا۔

جنگِ جمل حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد صحابۂ کرام کی ایک مؤقر جماعت نے اصرار کر کے حضرت علیؓ کو خلیفہ بنایا۔

مسندِ خلافت پر فائز ہونے کے بعد آپ نے سب سے پہلے ۳۶ھ میں ان اعمال کو برطرف کرنے کی

جانب توجہ کی جو آپ کی نگاہ میں اپنے منصب کے اہل نہ تھے۔ چنانچہ امیر معاویہ بھی برطرف کر دیے گئے۔ لیکن انھوں نے اس برطرفی کو نہ مانا اور قصاص عثمان کا مطالبہ لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیاں اور حضرت عثمانؓ کا خون آلود پیرہن بھی شام منگوایا۔ عوام میں اس کی نمائش کی اور لوگوں کو قصاص پر ابھارا۔ حضرت علیؓ قصاص پر تیار تھے لیکن دو مشکلیں ان کے راستے میں حائل تھیں ایک تو یہ کہ نظم و امن مفقود تھا۔ آپ فرماتے تھے جب تک نظم و امن بحال نہ ہو جائے اس طرح کا اقدام اور زیادہ بدامنی کا باعث ہوگا۔ دوسرے قاتلین عثمان جب تک معین اور مشخص طور پر معلوم نہ ہو جائیں اس وقت تک قصاص کس سے لیا جائے، کس طرح لیا جائے؟

ادھر تو حضرت علیؓ امیر معاویہ کی سرکشی کا جواب دینے کی تیاریاں کر رہے تھے، اُدھر مکہ میں کچھ منافقوں دراندازوں مفسدوں اور سبائیوں نے حضرت عائشہؓ کو ہموار کر کے قصاص عثمان کے مطالبے پر آمادہ کر لیا۔

ام المومنین حضرت عائشہؓ کی دعوت پر ہزاروں مسلمانوں نے جاں نثاری کا عہد کر لیا۔ حضرت عائشہؓ اپنا کارواں لے کر صفر ۳۶ھ میں بصرہ کی طرف بڑھیں۔ حاکم بصرہ عثمان بن حنیف نے ان کے مقابلہ کا فیصلہ کر لیا ادھر حضرت عائشہ کے لشکر میں حضرت طلحہؓ و حضرت زبیرؓ بھی تیاریاں کرنے لگے۔

جنگ میں عثمان کو شکست ہوئی، وہ گرفتار ہوا لیکن ام المومنین نے اسے رہا کر دیا۔

حضرت علیؓ اب تک مدینے میں تھے، انھیں یہ خبریں پہنچیں تو فی الحال معاویہ سے مقابلے کا ارادہ ترک کر دیا۔ بصرہ کی طرف بڑھے، آپ کا مقصد ام المومنین سے جنگ نہیں صلح تھا۔ حضرت طلحہؓ و زبیرؓ بھی صلح چاہتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کی بھی یہی مرضی تھی۔ البتہ مفسدوں اور دراندازوں کی تو کوشش یہ تھی کہ صلح نہ ہونے پائے۔ چنانچہ عین اس وقت جب صلح تقریباً ہو چکی تھی رات کے اندھیرے میں دونوں فوجوں پر انھوں نے حملہ کر دیا۔ ہر فریق یہ سمجھا کہ یہ بدعہدی ہوئی ہے۔ چنانچہ صلح کے بجائے جنگ شروع ہو گئی۔ عین معرکۂ کارزار میں حضرت علیؓ کی نظر حضرت زبیرؓ پر پڑی۔ فرمایا تم کو یاد ہے ایک دن رسول اللہ ﷺ نے تم سے پوچھا تھا۔ تم علی کو دوست رکھتے ہو؟ تم نے کہا تھا ہاں رسول اللہ! پھر آپ نے فرمایا تھا ایک دن تم ان سے ناحق لڑو گے۔ حضرت زبیرؓ نے فرمایا ہاں مجھے یاد آ گیا۔ پھر اپنے بیٹے عبداللہ بن زبیر سے کہا۔ علی نے ایسی بات یاد دلا دی ہے جو میرے ذہن سے اتر گئی تھی میں واپس جاتا ہوں۔ لیکن انھوں نے انکار کیا اور حضرت زبیر تنہا لوٹ گئے۔

بہرحال لڑائی جاری رہی۔ حضرت عائشہ بیچ میں اونٹ پر تشریف فرما تھیں محمل مبارک پر ہر طرف تیروں کی بارش ہو رہی تھی۔ قبیلہ بنی ضبہ اور ازد نے اونٹ کو اپنے حصار میں لے لیا، اس معرکہ میں ام المومنین کی حفاظت کرتے ہوئے پونے پانچ ہزار کے قریب آدمی شہید ہوئے۔

حضرت علی کی رائے کے مطابق حضرت عائشہؓ کا اونٹ زخمی کر دیا گیا، وہ بلبلا کر بیٹھ گیا نتیجہ یہ ہوا کہ لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا اور حضرت عائشہؓ کی فوج نے ہمت ہار دی۔ حضرت علیؓ نے اعلان کیا کہ کسی بھاگنے والے کا تعاقب نہ کیا جائے جو ہتھیار ڈال دے یا گھر کا دروازہ بند کر لے اسے امن ہے، نہ کسی مسلمان کو قیدی بنایا جا سکتا ہے نہ اس کا مال مالِ غنیمت کے طور پر حاصل کیا جا سکتا ہے۔

جنگ کے بعد حضرت علیؓ حضرت عائشہ کی خدمت میں حاضر ہوئے پھر ان کی روانگی کا انتظام کر دیا، مدینہ جاتے وقت حضرت عائشہؓ نے کہا میرے بچو، یہ جنگ محض غلط فہمی کا نتیجہ تھی۔ علی ان واقعات کے بعد بھی میرے نزدیک اخیار میں ہیں۔ حضرت علی نے کئی میل تک حضرت عائشہؓ کی مشایعت فرمائی، پھر امام حسن اور حسینؓ کو ساتھ کر دیا۔ حضرت عائشہؓ کو زندگی بھر اس جنگ کا افسوس رہا۔ جب اس کا ذکر آتا تھا آنکھیں آبگوں ہو جاتی تھیں اور فرماتی تھیں، کاش بیس برس پہلے میں اس دنیا سے اٹھ گئی ہوتی۔

جنگ سے پہلے ابو سلامہ کے ایک سوال کے جواب میں حضرت علیؓ نے فرمایا۔ دونوں (مقابل جنگ آزادی) میں سے جو بھی خالصتہً للہ صاف دلی کے ساتھ قتل ہوگا وہ جنت میں جائے گا۔

جنگِ صفین

رجب ۳۶ھ میں منصبِ خلافت پر فائز ہونے کے بعد بعض ناگزیر مصالح کے باعث حضرت علیؓ نے دار الخلافہ مدینہ سے کوفہ منتقل کر دیا۔ پھر جریر عبداللہ بجلی کے ہاتھ ایک خط بھیجا جس میں لکھا تھا۔ "قاتلین عثمان کی بہت آڑ لے چکے، بیعت کرو، اس کے بعد باقاعدہ مقدمہ پیش کرو میں کتاب اللہ اور سنتِ رسول کے مطابق اس کا فیصلہ کروں گا۔"

امیر معاویہ نے عمرو بن العاص کو مصر کی حکومت دینے کا تحریری وعدہ کر کے انہیں اپنے ساتھ ملا لیا۔ عمرو بن العاص نے کہا۔ شام کے اکابر کو اس بات کا یقین دلا دو کہ قتل عثمان میں علی کا ہاتھ ہے امیر معاویہ نے عمرو کے مشورہ کے مطابق شام کے بہت بڑے آدمی شرجیل کو یہ یقین دلا کر کہ قتل عثمان میں علی شریک تھے اپنا ہمنوا بنا لیا۔

آخر صفین کے میدان میں امیر معاویہ نے اپنی فوجیں اتار دیں، شامی فوج نے پانی کے چشمہ پر قبضہ

کرلیا، مجبور ہو کر حضرت علیؓ نے حکم دیا کہ پانی چھین لیا جائے۔ عراقی سپاہیوں نے شامیوں کو شکست دے کر پانی پر قبضہ کرلیا۔ مگر حضرت علیؓ نے قبضے کے بعد بھی شامیوں کا پانی بند نہیں کیا۔

صلح کی کئی کوششیں ہوئیں لیکن سب ناکام رہیں۔ صفر ۳۷ھ میں جنگ نے شدت اختیار کرلی اور یہ سلسلہ کئی ماہ تک جاری رہا۔ ۴۵ ہزار شامی اور ۲۵ ہزار عراقی اس جنگ میں کام آئے۔ آخری معرکہ لیلۃ الحریر کا تھا۔ اس معرکے میں شامیوں کی کمر ہمت ٹوٹ گئی۔ عمرو بن العاص سے معاویہ نے مشورہ کیا انھوں نے کہا ہم قرآن کو حَکَم بنانے کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ دعوت اگر علی نے قبول کرلی تو اور نامنظور کردی تو ہر حالت میں ان کی فوج میں تفرقہ پڑجائے گا۔ یہی ہوا بھی۔ حضرت علیؓ تحکیم کو نہیں ماننا چاہتے تھے لیکن سادہ لوح مسلمانوں کے اصرار سے ماننا پڑا۔ حضرت علیؓ کی فوج کے کچھ لوگ تحکیم کے خلاف تھے وہ الگ ہو گئے اور خارجی کہلائے۔ تحکیم میں عمرو بن العاص نے دوسرے حَکَم ابوموسیٰ اشعری کو دھوکا دے کر امیر معاویہ کے حق میں فیصلہ کرویا۔ شریح بن ہانی نے عمرو بن العاص کو کوڑے مارنا شروع کردیے۔ اس نامنصفانہ فیصلہ کو حضرت علیؓ نے نہیں مانا اور پھر جنگ کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ادھر خوارج نے بہت زور باندھا اور ظلم و ستم، سفاکی درندگی، شقاوت اور بہیمیت کے ایسے مظاہرے کیے کہ اندرونی نظم و امن درہم برہم ہو کر رہ گیا۔

حضرت علیؓ نے خوارج کو راہ راست پر لانے کی لاکھ لاکھ کوششیں کیں مگر وہ کامیاب نہ ہوسکے۔ جنگ ہوئی اور خوارج کو شکست ہوئی، لیکن اب علوی فوج بھی بہت خستہ اور درماندہ ہو چکی تھی۔ جب خوارج کے مرحلے سے فراغت پاکر حضرت علیؓ نے معاویہ پر لشکر کشی کا ارادہ کیا تو اشعث بن قیس کندی نے کہا:

"امیر المومنین! ہمارے ترکش اب خالی ہو چکے ہیں، نیزوں کے پھل خراب ہو گئے ہیں!"

ادھر امیر معاویہ نے نزاعِ باہمی، خارجیوں کی شورش اور فوج علوی کی خستگی دیکھ کر موقع سے فائدہ اٹھایا، مصر پر قبضہ کرلیا اور ۳۸ھ میں عمرو بن العاص کو مستقل والی بنادیا۔ جنھوں نے حضرت ابوبکرؓ کے صاحب زادے محمد کو بڑی بے دردی کے ساتھ قتل کرادیا۔

امیر معاویہ موقع سے پورا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے لہٰذا انھوں نے حضرت علیؓ کے دوسرے مقبوضات پر بھی قبضہ کرنے کی کوششیں کیں۔ چنانچہ امیر معاویہ نے بسر بن ابی ارطاۃ جیسے ظالم کو حجاز اور یمن کی طرف بھیجا جس نے ظلم و ستم کا خوب خوب سرزمینِ مقدس پر مظاہرہ کیا۔ زبردستی تلوار کی نوک پر امیر معاویہ کی بیعت لینے کی کوشش کی لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ علوی فوج سر پر پہنچ گئی ہے تو بھاگ کھڑا ہوا۔

صلح آخر سنہ ۴۰ھ میں حضرت علیؓ اور امیر معاویہ کے درمیان ان شرائط پر صلح ہو گئی:

حجاز، عراق اور مشرق کا پورا علاقہ حضرت علیؓ کے پاس رہے گا۔

شام، مصر اور مغرب امیر معاویہ کے پاس، اس طرح ایک مدت مدید اور عرصہ دراز کے بعد عارضی طور پر خانہ جنگی کا خاتمہ ہوا۔ اس کے بعد جو خانہ جنگیاں ہوئیں ان کی تفصیل آگے آئے گی۔

لیکن اس جگہ اتنا اشارہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ خانہ جنگیاں اگر برپا نہ ہوتیں تو اسلام کا کارواں پوری سرعت کے ساتھ ساری دنیا کو فتح کر لیتا۔ اسلام کے پاس حق و صداقت کی جو قوت تھی اس کی حریف دنیا کی کوئی طاقت نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن یہ خانہ جنگیاں راستہ روک کر کھڑی ہو گئیں۔ اور کاروانِ اسلام کے بڑھتے ہوئے قدم اگر پیچھے نہیں ہٹے تو آگے بھی نہیں بڑھ سکے۔

نظرِ بازگشت

عہدِ رسالت اور عہدِ خلافتِ راشدہ کا تذکرہ ختم ہوگیا۔ یعنی خلافتِ الٰہی کی عملداری کا دور یہاں آکر ختم ہو جاتا ہے۔

اس دور کے بعد جو دور شروع ہوتا ہے قیصریت اور بادشاہت کا دور ہے اسے اسی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیے۔ کسی بادشاہ سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ مطلق العنان فرمانروائی کے ساتھ ساتھ وہ قرآن و سنّت کی حکومت بھی قائم کرے گا۔

لیکن قبل اس کے کہ قیصریت اور بادشاہت کے اس دور کو شروع کیا جائے مناسب یہ ہے کہ ایک مرتبہ پھر عہدِ رسالت اور خلافتِ راشدہ پر نظرِ بازگشت ڈالی جائے کہ بغیر اس کے صحیح موازنہ اور تقابل، ان ہر دو ادوار کے نظامِ حکومت، دستورِ مملکت اور آئینِ سیاست کا ممکن ہی نہیں ہے۔

چوتھی منزل

دولتِ بنو امیّہ

(۱)

عہدِ بنو سفیان

مطلق العنان اور موروثی بادشاہت کا آغاز

معاویہ بن ابی سفیان — سنہ ۴۰ھ
(۶۶۱ء)

یزید بن معاویہ — سنہ ۶۰ھ
(۶۸۰ء)

معاویہ بن یزید — سنہ ۶۴ھ
(۶۸۳ء)

ابتدائیہ

اسلام کے نمودار ہونے سے پہلے اس دُنیا کا نظامِ حیات اور نظامِ سیاست کیا تھا؟ نہ روحانی اور اخلاقی اقدار تھے، نہ امورِ مملکت میں جمہور اور عوام کی کوئی آواز تھی، رُوحانی طور پر پسماندگی کا یہ عالم تھا کہ بتوں کی، درختوں کی اور جانوروں کی پرستش کی جاتی تھی، حد یہ ہے کہ مظاہرِ قدرت تک کے سامنے سرِ عبودیت جھکایا جاتا تھا۔ اخلاقی زوال کی یہ کیفیت تھی کہ زنا کوئی جرم نہ تھا۔ دُختر کشی خودداری کی علامت تھی۔ سود قومی معیشت اور انفرادی زراندوزی کا بہترین وسیلہ تھا۔ جوئے کے بغیر ہر محفل سُونی تھی۔ شراب نوشی اور بدمستی عام تھی۔ عام طور پر نہ عورتوں میں پاسِ عفّت باقی رہ گیا تھا نہ مردوں میں احساسِ ننگ و عار، سرمستی اور فکرِ آخرت سے بیگانگی کا ایک سیلاب تھا اور پورے زور شور کے ساتھ اُس میں خلقت بہتی ہوئی تھی، یہی حالت سیاسی زندگی کی تھی کوئی ملک بھی ایسا نہیں تھا جہاں عوام کو حکومت کی تشکیل میں دخل ہو، جہاں عوام کی مرضی کارفرما ہو۔ جہاں حریّتِ برائے حریّتِ مقام اور حریّتِ کلام کے حقوق تسلیم کیے جاتے ہوں، پادشاہت کے تخت ہر جگہ نصب تھے۔ اور اُن پر ملوک و سلاطین متمکن تھے۔ اور ان ملوک و سلاطین کو ظلّ اللہ سمجھا جاتا تھا، ان کی ہر بات ہر حکم، ہر ارشاد کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا جاتا تھا:

گفتۂ او، گفتۂ اللہ بود

والا معاملہ تھا۔ ملوک و سلاطین کی عظمت اور تقدیس کی یہ کیفیت تھی کہ اُنھوں نے خدا سے بھی زیادہ حقوق حاصل کر لیے تھے۔ وہ جسے چاہیں جلاوطن کر دیں جس سے چاہیں جنگ چھیڑ دیں، جس کی جائداد منقولہ اور غیر منقولہ چاہیں ضبط کر لیں معمولی سی بات پر جس کا چاہیں سر قلم کرا دیں، جسے چاہیں دولتِ دُنیا بخش دیں جس سے چاہیں دولتِ دنیا چھین لیں۔ گدائے راہ نشین کو وزیر باتدبیر اور وزیر باتدبیر کو گدائے راہ نشین بنتے دیر نہیں لگتی تھی۔ یہ ملوک و سلاطین کسی دستور، آئین اور ضابطے کے پابند نہیں تھے۔ ان کے منہ سے نکلا ہوا حرف فرمان تھا، قانون تھا، دستور تھا، ان کی حاکمیت کو چیلنج کرنے کی کسی میں سکت نہ تھی۔ ان کا کام یہ تھا کہ بے غل وغش حکومت کرتے رہیں۔ اور رعایا کا کام یہ تھا کہ بے چون وچرا ان کی اطاعت کرتی رہے۔ ان کے لیے "جملہ حقوق محفوظ" تھے۔ اور رعایا کو اجتماعی یا انفرادی طور پر کوئی حق حاصل نہیں تھا۔ غرضیکہ دُنیا کی معیشت اور سیاست پر چند خاندان قابض تھے۔ قبضے کا یہ سلسلہ پشتہا پشت سے چلا آرہا تھا اور ڈول یہ ڈالا گیا تھا کہ قیامت تک اسی طرح چلتا رہے۔

دفعتہً عرب کے ریگزار میں ایک اُمّیؐ نے نعرۂ انقلاب بلند کیا۔

یہ نعرہ باطل شکن تھا، اس نعرہ کی ہیبت سے دُنیا دہل رہی تھی۔ اس نعرہ نے تمام فرسودہ باتوں کو ملیا میٹ کر کے رکھ دیا تھا۔ اور ایک نیا نظام دُنیا کے سامنے پیش کیا تھا!

یہ نیا نظام کیا تھا؟ اس کا تعلق کن امور سے تھا؟ یہ کیا چاہتا تھا؟

جواب بہت سادہ اور مختصر ہے۔

یہ نیا نظام نئے روحانی اور اخلاقی اقدار کا علمبردار تھا، اس نئے نظام کے جلو میں سلطانئ جمہور کا قافلہ رواں دواں تھا۔

روحانی طور پر اس نظام نے غیر اللہ کی عبادت ختم کر دی۔ اور دُنیا کو بتا دیا کہ:

کہ ہے ذاتِ واحد عبادت کے لائق!

توحید کے پیام نے ان تمام مفاسد کا خاتمہ کر دیا جو بُت پرستی، مظاہر پرستی اور شجر پرستی وغیرہ کی صورت میں انسانی سماج کے اندر موجود تھے۔ یہ نظام اتنا محکم اور مستحکم ثابت ہوا کہ چند سال کی قلیل ترین مدت میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ عرب کے رہزن کھیلنے جاتے تھے ایوان گہ کسریٰ میں شکار!"

اخلاقی طور پر اس نظام نے ان تمام عیوب کو دور کر دیا جو ننگ انسانیت تھے، انسانیت سوز تھے اور جنھوں نے انسانیت کو دکھی اور بیمار بنا دیا تھا۔

اس نظام کے برسرکار آتے ہی عورت کو وہ مقام بلند حاصل ہو گیا جس کا وہ خواب میں بھی تصور نہیں کر سکتی تھی۔ شراب حرام ہو گئی۔ زنا کا ارتکاب جرم قرار پایا۔ سود کا کاروبار بند کر دیا گیا، جوئے کی گرم بازاری ختم ہو گئی۔ اخوت اور مساوات کی کارفرمائی نے انسانی سماج میں ایک قسم کی برتری پیدا کر دی، وہی لوگ جو اس نظام کے زیر سایہ آنے سے پہلے آبرو باختہ تھے، بد چلن تھے مجموعۂ عیوب نقائص تھے دفعتہً انسانیت کبریٰ کا معیار بن گئے۔ انھوں نے جس سوسائٹی کی تشکیل کی وہ اپنی نوعیت کی پہلی اور آخری سوسائٹی تھی۔ چشم فلک نے ایسے لوگوں کا اور ایسی سماج کا نظارہ نہ پہلے کبھی کیا تھا نہ بعد میں کر سکی۔ یہ وہ لوگ تھے مقاسد سے جن کی تطہیر ہو چکی تھی۔ یہ وہ معاشرہ تھا جس میں کوئی گندگی کسی طرح کی بھی اور کسی قسم کی نامرغوب طبائع بات نہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس میں وہ کشش اور جاذبیت پیدا ہو گئی کہ جوق در جوق لوگ کھنچ کھنچ کر اس دائرے میں داخل ہونے لگے۔ اس لیے کہ اخوت، مساوات اور حسنات کے یہ صفات اس زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے کہیں اور نہ تھے۔

روحانی طور پر یہ سربلندی عطا کر کے اور اخلاقی طور پر یہ سروری بخشنے کے بعد اسلام کے اس نئے نظام نے ایک ایسا انقلابی قدم اٹھایا جس کی نظیر دنیا میں کبھی نہیں مل سکتی۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ لوگ نہ جمہوریت کے نام سے گوش آشنا تھے نہ عوامیت سے روشناس۔ نہ آمریت کے محرم اسرار۔ وہ صرف ایک چیز جانتے تھے اور وہ تھی بادشاہت۔ ان کی فطرت میں پشتہا پشت سے جو چیز رچی اور بسی ہوئی تھی وہ تھی بادشاہ کی غیر مشروط اطاعت۔ یہی ان کا ایمان تھا، یہی ان کا عقیدہ، یہی ان کا عمل۔ ان کے ذہن کے بعید ترین گوشے میں بھی کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔ وہ اپنی حقیقت سے، اپنے حقوق سے، اپنی قوت سے اور اپنی خصوصیت سے ناواقف تھے۔ اور اُن کی اس ناواقفیت سے ملوک و سلاطین پورا فائدہ اٹھا رہے تھے۔ ان کی سطوت و شوکت عوام کے بل پر قائم تھی۔ ان کا خزانہ سیم و زر سے اور گوہر سے بھرنے والے یہی عوام تھے ان کے تعیش و تمتعات کا وسیلہ غریب عوام کی محنت سے کمائی ہوئی دولت تھی۔ دولت جسے یہ عوام پیدا کرتے تھے اور بادشاہ کے خزانے میں جھونک آتے تھے۔ بادشاہ اس دولت سے نفس پروری کے

سامان کرتا تھا۔ لذاتِ دنیوی سے بہرہ ور ہوتا تھا۔ عیاشی اور ہوس رانی کی زندگی بسر کرتا تھا، بڑی بڑی قیمتیں دے کر باندیاں خریدتا تھا۔ اور نشاطِ لازوال کے سامان فراہم کرتا تھا۔ اپنی شان میں قصیدے کہنے والے شاعروں کی جھولیاں بھر دیتا تھا۔ درباری مصاحبوں، نقالوں اور بھانڈوں کو مالا مال کر دیتا تھا۔ جسے چاہتا تھا جاگیر بخش دیتا تھا۔ جسے چاہتا تھا خلعتِ فاخرہ عطا کرتا تھا۔ جسے چاہتا تھا سونے میں تول دیتا تھا۔ لیکن جو لوگ یہ سونا دیتے تھے وہ فقر و فاقے کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اپنی اس بے بسی پر قسمت کا لفظ کہہ کر فارغ ہو جاتے تھے۔

اسلام کے نظامِ سیاست و حکومت میں کسی بادشاہ اور سلطان کی گنجائش نہیں تھی۔ اور جس طرح کسی بادشاہ اور سلطان کی گنجائش نہیں تھی ٹھیک اسی طرح کسی گدائے بے نوا کی بھی گنجائش نہیں تھی۔ "نے کوئی فغفور و خاقاں نے گدائے رہ نشیں!"

اسلامی حکومت کے خزانے میں جو دولت آتی تھی اس کی پہلی شرط یہ تھی کہ وہ پاک ہو یعنی ظلم و جور سے حاصل نہ کی گئی ہو۔ اور دوسری شرط یہ تھی کہ وہ عوام کی فلاح و صلاح پر صرف کی جائے۔ اور تیسری شرط یہ تھی کہ حاکم یا امیر —— بادشاہ یا سلطان خود اپنی ذات کے لیے بھی اس سے زیادہ نہ لے جتنی دوسروں کو ملتی ہے۔ چوتھی اور آخری شرط یہ تھی کہ کوئی شخص محض اس لیے مسندِ امارت پر نہیں بیٹھ سکتا کہ اس کا باپ بھی امیر یا حاکم رہ چکا تھا۔ اس مسند پر بیٹھنے کے لیے اہلیت صلاحیت، استعداد اور قبولِ عام لازمی شرط تھی۔ اور آخری لازمی شرط تھی مشورت!

یہ کتنا بڑا انقلاب تھا!

یہ کتنا عجیب انقلاب تھا!

ملوکیت اور قیصریت کے بوجھ تلے دبی ہوئی انسانیت دفعتہً آزاد ہو گئی۔

جو اپنے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ خدا نے انھیں صرف غیر مشروط اطاعت کے لیے پیدا کیا ہے اُن سے اسلام کا انقلاب پکار پکار کر کہہ رہا تھا: "دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے!"

اور اس پکار پر انھوں نے جوش و خروش کے ساتھ لبیک کہا۔ اور اسلام کے حلقے میں موج در موج اور فوج در فوج داخل ہونے لگے۔ یدخلون فی دین اللہ افواجًا۔

اسلام کا سب سے پہلا امیر، اسلام کا داعیؐ تھا۔

اونٹوں سے لدے ہوئے خراج اور مالِ غنیمت کے خزانے آتے تھے اور اس کے قدموں میں ڈھیر کر دیے جاتے تھے اور یہ اس وقت اٹھتا تھا جب ایک ایک پائی ضرورت مندوں میں تقسیم کر لیتا تھا — صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

مرض الموت طاری ہو چکا تھا۔ دُنیا سے رخصت ہونے کا وقت قریب تر آ گیا تھا کہ دفعۃً یاد آتا ہے کچھ سونا عائشہؓ کے پاس رکھوا دیا تھا پوچھا، وہ کہاں ہے؟

عائشہ رضؓ نے جواب دیا طاقچہ میں رکھا ہے۔

فرمایا: عائشہؓ اسے فوراً تقسیم کر دو۔ کیا تم چاہتی ہو محمدؐ اپنے رب سے بدگمان ہو کر ملے!"

اور جب خدا کا یہ آخری نبیؐ، دُنیا کے سب سے بڑے انقلاب کا یہ داعی اس دُنیا سے رخصت ہو کر اپنے رفیقِ اعلیٰ سے جا ملا تو اس طرح کہ نئے امیر کے انتخاب کی ساری ذمّہ داریاں اُمّت کو سونپ گیا تھا۔ وہ اگر کسی کو نامزد کر دیتا تو کسی میں مجال نہ تھی کہ اختلاف کی جرأت کرتا لیکن وہ عوام کا حق چھیننا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے کسی کو نامزد نہیں کیا اور اُمّت نے پوری خود اعتمادی کے ساتھ ذمّہ داری کے اس بارِ گران کو اٹھا لیا۔ آزادانہ بحث و گفتگو اور بے باکانہ تبادلۂ افکار کے بعد ایک شخص کو اپنا امیر یا حاکم یا خلیفۃ الرسول منتخب کر لیا — یہ ابوبکر رضؓ تھے۔

حضرت ابوبکر رضؓ جب تک اس دنیا میں رہے اور جب اس دُنیا سے رخصت ہونے لگے تو انھوں نے کیا کہا اور کیا کیا؟

اپنی اور اپنے اہل و عیال کی گزر بسر کے لیے ایک معمولی سی رقم بیت المال (خزانۂ حکومت) سے لیتے تھے۔ لیکن جب وقتِ وفات آیا تو پہلی وصیت کی کہ میری فلاں جائداد فروخت کر کے وہ ساری رقم بیت المال میں داخل کر دی جائے جو میں نے اپنے عہدِ خلافت میں وصول کی تھی۔

ابوبکر رضؓ کی نظر میں عمر رضؓ خلافت کے لیے موزوں ترین شخص تھے، ان سے عوام کو جو

عقیدت اور محبت تھی اس کی بنا پر وہ ان کے نامزد کیے ہوئے شخص کو یقیناً قبول کر لیتے۔ لیکن ابوبکر رضؓ نے اس عقیدتِ عامہ سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ اہلِ مدینہ سے، اجل صحابہ رضؓ سے اور اربابِ حل و عقد سے مشورہ کرنے کے بعد ان سے استصواب کرنے اور ان کی رضا مندی کے بعد عمر رضؓ کی خلافت کا اعلان کر دیا۔ لیکن یاد رہے ابوبکر رضؓ اور عمر رضؓ میں کوئی خون کا رشتہ نہیں تھا۔

عمر رضؓ نے خلافت کی اور اس طرح کی کہ تاریخِ اسلام کا روشن ترین صفحہ اُن کا دورِ خلافت بن گیا۔ مگر جب وہ اس دُنیا سے رخصت ہونے لگے تو انھوں نے بھی کسی شخص کو نامزد نہیں کیا۔ جو لوگ اس منصب کے اہل تھے اُن پر مشتمل ایک مجلس قائم کر دی اور اس مجلس کو حق دے دیا کہ جسے چاہے منتخب کر لے اور صاف طور پر ہدایت کر دی کہ میرا بیٹا عبداللہ نہ خلافت کا امیدوار بن سکتا ہے نہ منتخب کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ عبداللہ ابن عمر رضؓ وہ تھے جو اپنے زہد و تقویٰ اور تقلیدِ سنت میں اپنی مثال آپ تھے۔ جو ہر طرح سے خلیفہ بننے کے سزاوار تھے۔ لیکن عمر رضؓ کی نظر میں ان کی سب سے بڑی نااہلیت (ڈس کوالی فکیشن) یہ تھی کہ اُن کے بیٹے تھے۔

عثمان رضؓ کا دور دورِ فتن تھا۔ وہ اچھی طرح محسوس کر چکے تھے کہ باغی انھیں قتل کر کے رہیں گے۔ چاہتے تو کسی کو جانشین نامزد کر دیتے۔ لیکن انھوں نے بھی ایسا نہیں کیا۔ معاملہ امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا کہ جسے چاہے خلیفہ منتخب کر لے۔

عثمان رضؓ کے بعد حکومت کا منصب رسولؐ کے خویش اور برادر فاتحِ خیبر حضرت علی رضؓ ابن ابی طالب کے ہاتھ آیا۔

علی رضؓ نے جب اس دُنیا سے رختِ سفر باندھا تو لوگوں نے سوال کیا:

کیا ہم حسن رضؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لیں؟

اور یہ حسن رضؓ صرف علی رضؓ کے بیٹے ہی نہ تھے بلکہ رسولؐ کے نواسے بھی تھے۔ دوشِ رسولؐ کے سوار بھی تھے ان کے نام پر کسی طرف سے مخالفت کی صدا بلند نہیں ہو سکتی تھی۔ مدینہ ان کی تقدیس و عظمت کا گواہ تھا لیکن علی رضؓ نے کیا جواب دیا:

کیا انھوں نے حسنؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لینے کی اجازت دے دی؟

نہیں ـــــ انھوں نے جواب میں ارشاد فرمایا:

نہ میں یہ کہتا ہوں کہ حسنؓ کی بیعت کرلو، نہ یہ کہتا ہوں کہ نہ کرو۔ میں تمھیں اسی طرح چھوڑتا ہوں جس طرح رسول اللہ ؐ تمھیں چھوڑ گئے تھے۔

یعنی انھوں نے بھی خلافت کے لیے کسی کو نامزد نہیں کیا تھا بلکہ یہ معاملہ امّت کی صوابدید پر چھوڑ دیا تھا۔

یہ تھی مثال رسول آخرالزماں ؐ اور خلفائے راشدین کی۔

لیکن کیا عہدِ بنو امیّہ میں بھی ایسا ہی ہوا؟

کیا اس عہد میں اسلام کی یہ تاریخ قائم رہی یا بدل گئی؟

عہدِ بنو امیہ (۱)

اس عہد کے حالات و کوائف کا ایک سرسری جائزہ

بنو امیہ کا عہدِ حکومت تقریباً ایک صدی تک جاری رہا۔ لیکن درحقیقت یہ زمانہ تین ادوار پر منقسم کیا جا سکتا ہے:

۱: پہلا دور امیر معاویہ سے شروع ہوتا ہے اور معاویہ بن یزید پر ختم ہو جاتا ہے یعنی اس کا آغاز ۴۱ھ سے ہوتا ہے اور اختتام ۶۴ھ پر، یہ کل ۲۳ سال ہوئے۔ اس مدت میں بیس سال امیر معاویہ نے حکومت کی، باقی مدت میں یزید اور معاویہ بن یزید برسر حکومت رہے۔

۲: بنو امیہ کی حکومت کا دوسرا دور ۶۴ھ سے شروع ہوتا ہے اور ۱۳۲ھ پر ختم ہوتا ہے یہ دوسرا دور تقریباً ۶۲ سال تک قائم رہتا ہے۔ اس دور کا پہلا حکمران مروان بن حکم تھا۔ اور آخری مروانِ ثانی یا مروان الحمار۔

۳: تیسرا دوران ہر دو ادوار کے مابین ہے یعنی خلافت ابن زبیر۔ اس کا سلسلہ شہادت حضرت امام حسینؓ کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اور عبدالملک بن مروان کے عہد میں ختم ہو جاتا ہے یعنی اس کا آغاز ۶۱ھ سے شروع ہوتا ہے اور ۷۳ھ میں یہ ختم ہو جاتا ہے۔

ہم ان تینوں پر الگ الگ گفتگو کریں گے۔

اس عہد کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ امیر معاویہ نے بحری بیڑا تیار کر کے روم کے کئی جزیروں پر قبضہ کر لیا۔ ۵۰ھ میں افریقہ پر چڑھائی کی اور طنجہ تک اموی عساکر پہنچ گئے۔ بالآخر وہاں کے حاکم نے جزیہ دینے پر رضامندی کا اعلان کر دیا۔ ۵۲ھ میں جزیرۂ روڈس بھی اس حکومت کے زیرنگیں آگیا۔ اور سندھ کے خاصے علاقے پر بھی قبضہ ہو گیا۔

یزید کا عہد فتوحات بہت مختصر ہے۔ اس کی ساری جنگی قوت مکّہ اور مدینہ پر صرف ہوئی۔ جس کی تفصیل اپنے موقع پر آئے گی۔

یزید کے بعد اس کا بیٹا معاویہ بن یزید تخت نشین ہوا، لیکن اس نے جو ہولناک مناظر دیکھے تھے اس نے اسے حکومت کی طرف سے متنفر کر دیا اور وہ دست بردار ہو کر خانہ نشین ہو گیا۔ جہاں سے مر کر نکلا۔

اب ہم اس عہد کا ذکر نسبتاً تفصیل سے کریں گے۔

امیرِ معاویہ

ذات و صفات، کردار و شخصیت

۴۱ھ تا ۶۰ھ —— ۶۶۱ء تا ۶۷۹ء

امیر معاویہ کی والدہ ہند بن عتبہ کی شادی پہلے فاکہ بن مغیرہ قرشی سے ہوئی تھی۔ لیکن شوہر کی بدظنی کی بنا پر دونوں میں جدائی ہو گئی۔ پھر یہ ابوسفیان بن حرب کے حبالۂ عقد میں آئیں جن سے امیر معاویہ تولد ہوئے۔ ان کی ولادت ہجرت سے سترہ سال قبل ہوئی۔ فتح مکّہ کے بعد ۲۵ برس کی عمر میں اسلام قبول کیا۔ اس لیے ان کا شمار بھی مولفۃ القلوب میں ہوتا ہے۔ یہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ان سے اپنے مکاتیب بھی سلاطین و امرائے عرب کے نام لکھوائے۔

میدانِ عمل میں وصالِ نبوی کے بعد حضرت ابوبکر رضؓ نے یزید بن ابی سفیان یعنی امیرِ معاویہ کے بھائی کو ایک لشکر کا سالار بنا کر شام بھیجا، امیر معاویہ بھی ایک دستہ سپاہ کے سربراہ بن کر اس کے ہمراہ ہو لیے۔ یزید بن ابی سفیان نے بڑی خوبی سے اپنے فرائض انجام دیے۔ فتوحاتِ شام میں ان کی شجاعت و شہامت کے کارنامے کسی طرح نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔ لیکن قدرت کی طرف سے زیادہ عمر لکھا کر نہ لائے تھے۔ طاعون عمودس میں ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ اب حضرت عمر رضؓ کا دورِ خلافت تھا۔ انھوں نے یزید کی جگہ ان کے

بھائی معاویہ کو سونپ دی۔ اور یہ شام کے والی بن گئے۔ اردن اور متعلقہ اضلاع بھی ان کی ماتحتی میں رہے۔

شان و شکوہ امیر معاویہ طبعاً شان و شکوہ اور تنعم کی زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ شام کی گورنری نے یہ موقع اور زیادہ آسانی اور کامیابی کے ساتھ مہیا کر دیا۔ حضرت عمرؓ جب بیت المقدس تشریف لائے تو ان کی اس زندگی پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے انھیں "کسرائے عرب" کے نام سے یاد کیا۔ اور اس بات پر زجر و توبیخ کی کہ ایوانِ خلافت پر چوبدار اور دربان کیوں مقرر ہیں۔

حلیہ، شکل و شمائل امیر معاویہ کشیدہ قامت تھے، چہرے کا رنگ سرخ و سپید تھا، رعب دار اور وجیہ شخصیت کے حامل تھے۔

بحری فوج امیر معاویہ کو بحری فوج سے بڑی دلچسپی تھی لیکن حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ کیونکہ وہ اس کے خلاف تھے۔ البتہ حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں اجازت مل گئی۔ اور انھوں نے ایک مضبوط اور وسیع بحری بیڑا تیار کر لیا۔

ضبط و تحمل اور حاضر جوابی امیر معاویہ کا طرزِ حکومت خلفائے راشدین کا سا نہ تھا، بلکہ کہنا چاہیے کہ اُن کے زمانے میں خلافت ــــ بادشاہت اور قیصریت میں تبدیل ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ ان پر طنز و ایراد سے نہیں چوکتے تھے۔

ایک مرتبہ یہ مدینہ منورہ آئے اور چند روز مقیم رہے۔ ایک روز حضرت ابوقتادہ انصاری ان کی طرف سے گزرے، انھوں نے کہا:

"کیا بات ہے سب لوگ تو میرے حضور میں حاضر ہوئے لیکن انصار نہیں آئے؟"

ابوقتادہ نے جواب دیا: "ہمارے پاس سواری نہیں ہے اس لیے ہم نہیں آسکے۔"

امیر معاویہ نے پوچھا: "اور تمھارے پاس جو اونٹ تھے وہ کیا ہوئے؟"

ابوقتادہ نے جواب دیا: "تمھارے اور تمھارے والد کے تعاقب میں وہ تھک گئے ہیں"

اس کے بعد سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا: "ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے

سُنا ہے کہ میرے بعد وہ زمانہ آئے گا کہ لوگ مستحق کے مقابلے میں غیر مستحق کو ترجیح دیں گے۔"

امیر معاویہ نے سوال کیا: "لیکن ایسے موقع کے لیے آں حضرتؐ نے کچھ فرمایا ہے کہ کیا کرنا چاہیے؟"

ابوقتادہ نے جواب دیا: "آپؐ نے فرمایا ہے کہ صبر کرنا چاہیے۔"

امیر معاویہ نے کہا "پھر صبر کرو۔"

امیر معاویہ کا تحمّل

اسی طرح ایک مرتبہ ایک قریش نوجوان نے امیر معاویہ کو اُن کے مُنہ پر بُرا بھلا کہنا شروع کیا، کچھ دیر وہ سُنتے رہے، پھر گویا ہوئے۔

"اس حرکت سے باز آجاؤ۔ کیونکہ بادشاہ کا غصّہ بچّے کی طرح ہوتا ہے اور اس کا مواخذہ شیر کی طرح!"

عقیل اور معاویہ

ایک روز حضرت عقیل بن ابی طالب امیر معاویہ سے ملنے گئے۔ انھیں دیکھ کر امیر معاویہ نے ازراہ تفنّن حاضرین سے کہا:

"دیکھو یہ ہیں جن کا چچا ابولہب تھا۔"

حضرت عقیل نے فوراً جواب دیا "اور یہ امیر معاویہ ہیں جن کی پھوپھی "حمالۃ الحطب" تھیں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا امیر معاویہ کے بارے میں قول ہے:

"معاویہ کا حلم اُن کے غصے کا تریاق تھا، ان کی سخاوت اور دریاشی لوگوں کی زبان پر تالا لگا دیتی تھی۔ تالیفِ قلوب میں انھیں ملکہ حاصل تھا۔ اور اسی لیے وہ حکومت قائم کر لینے میں کامیاب ہو گئے۔"

لیکن اس حلم، ضبط اور بردباری و تحمل کے باوجود جو فیصلہ کر لیتے تھے اس پر چٹان کی طرح جم جاتے تھے۔ اور ہر ممکن تدبیر سے اسے روبہ عمل لاکر رہتے تھے۔ مخالفوں کے ساتھ ان کا برتاؤ رواداری رہتا تھا۔ لیکن اگر اس سے مایوس ہو جاتے تھے تو اسے معاف بھی نہیں کرتے تھے۔ حجر بن عدیؓ جیسے جلیل القدر صحابی کو اس جرم میں کہ وہ ان کی خلافت اور انداز حکومت پر برسرِ عام نکتہ چینی کرنے سے کسی طرح باز نہیں آتے تھے، بڑی بے دردی سے قتل کرادیا۔ جس پر حضرت عائشہؓ نے جب امیر معاویہ اُن سے ملنے گئے، تو فرمایا:

"معاویہ! حجر کے معاملے میں تمھارے تحمل کو کیا ہو گیا تھا؟"

دادودہش اور بذل وعطا امیر معاویہ حد درجہ سخی اور جواد تھے۔ مخالفوں کو رام کرنے کے لیے بے دریغ روپیہ صرف کرتے تھے۔ کسی سے کسی بات پر خوش ہو جاتے تھے تو پھر اس کا جیب ودامن سیم وزر سے بھر دیتے تھے۔ اُن کے در سے کوئی سوالی مایوس ونامراد نہیں گیا۔ خواہ وہ دوست ہو یا دشمن! اپنا ہو یا غیر، حامی ہو یا مخالف جب بالکل مایوس ومجبور ہو جاتے تھے تب نوکِ خنجر سے کسی کو اطاعت پر مجبور کرتے تھے ورنہ جہاں تک ہو سکتا تھا دادودہش اور بذل وعطا سے ممنونِ کرم کر کے لوگوں کو جھکنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ بعض بڑے کٹر مخالف ان کی اس صفت سے متاثر ہو کر جاں نثار اور وفادار بن گئے۔ بعض ایسے لوگ بھی تھے مثلاً زیاد بن ابیہ جو ان کے خلاف جنگ کرنا ایک دینی فریضہ خیال کرتے تھے لیکن جب امیر معاویہ کی زرپاشی سامنے آئی تو یہ سب سے بڑا مخالف ان کا جاں نثار اور فدائی بن گیا۔ امیر معاویہ نے بھی اس کی قدر افزائی میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اسی طرح عمرو بن العاص جیسی شخصیت کو اپنا دست وبازو بنا لینا کسی طرح ممکن نہ تھا اگر مصر کی گورنری کا پروانہ مستقل طور پر ان کے نام نہ لکھ دیا گیا ہوتا۔

ایک مستشرق کی شہادت امیر معاویہ کے ان صفات پر تقریباً تمام مؤرخین متفق ہیں خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔

مشہور مستشرق ڈاکٹر نکلسن حضرت علیؓ کے عہدِ حکومت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

"حضرت علیؓ میں اس سیاسی زیرکی، شاہانہ فراست اور شاطرانہ حزم واحتیاط کا فقدان تھا جو ایک بیدار مغز حاکم اور باخبر مدبر میں ہونی ضروری ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت علیؓ نہایت بالغ نظر، بے نظیر مدبّر، بہترین مشیر، بڑے عقلمند وعدے کو کامل طور پر ایفا کرنے والے اور دشمنوں سے انتہائی شرافت کا برتاؤ کرنے والے تھے۔ مگر ان سب فضائل کے باوجود ان میں سیاسی سوجھ بوجھ کی کمی تھی۔ انھیں اپنی سلطنت کی سالمیت کی حفاظت کے لیے بھی ان حربوں کو استعمال کرنے میں تردّد ہوتا تھا جن حربوں کو ان کے حریف بے تکلف ان کے خلاف استعمال کرتے تھے۔ اسی لیے ان کے حریف ان پر غالب آ گئے۔ کیونکہ ان کے حریف

کا اصول تھا کہ جنگ میں ہر قسم کے داؤ پیچ استعمال کرنے مباح ہیں۔ لیکن حضرت علیؓ ان حربوں سے واقف تھے اور نہ ایسا کرنا جائز سمجھتے تھے۔"

ہمیں نکلسن کی اس رائے سے اختلاف نہیں البتہ تعبیرِ فکر میں اختلاف ضرور ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جس کے پیشِ نظر دین اور صرف دین ہو۔ وہ "سیاسی سوجھ بوجھ" کو اعلیٰ ترین اسلامی اور اخلاقی اقدار پر مقدم نہیں رکھ سکتا۔ بے شک حضرت علی رضؓ امیر معاویہ کو ان کے منصب پر بحال رکھتے تو ملّتِ اسلامیہ کی تاریخ شاید کچھ اور ہوتی، لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا، اور اس لیے نہیں کیا کہ سلطنت کے قیام و استحکام کے لیے وہ اصول پر سمجھوتہ نہیں کر سکتے تھے۔ اگر ایسا کرتے تو وہ اصول منہدم ہو جاتے۔ پھر دین اور سیاست میں بلند و پست کا جو رتبہ قائم ہے وہ ختم ہو جاتا۔ دونوں میں مساوات قائم ہو جاتی اور حضرت علیؓ اس کے لیے کبھی اور کسی قیمت پر تیار نہیں ہو سکتے تھے۔ یہی ان کی اصل فتح تھی۔

امیر معاویہ بحیثیت فرمانروا کے

امیرِ معاویہ کی سیاست، طرزِ حکومت، رفقاء اور مشیر

امیر معاویہ کے عہد سے خلافت کا دَور ختم ہوتا ہے اور ملوکیت کا دور شروع ہوتا ہے۔ اگر امیر معاویہ اپنے زمانے سے سو سال بعد پیدا ہوتے تو یقیناً تاریخِ اسلام میں ایک شہریار اور سلطان کی حیثیت سے وہ سب پر فائق نظر آتے۔ لیکن بدقسمتی یہ تھی کہ رسالت آبؐ کی وفات کے چند سال بعد اور خلافتِ راشدہ کے اختتام کے فوراً بعد وہ سریر آرائے خلافت ہوئے۔ اس زمانے میں صحابۂ کرام کی ایک بہت بڑی تعداد زندہ اور موجود تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے سرورِ دو عالمؐ کی زندگی دیکھی تھی، ان کی نظر سے ابوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ کا دَور گزرا تھا، انھوں نے کسی سے سنا نہیں، کہیں پڑھا نہیں، خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ سرکارِ دو عالمؐ کی زندگی تاجدارِ مدینہ بننے کے بعد بھی کتنی سادہ تھی۔ انھوں نے دیکھا تھا کہ خلفائے راشدین کے عہد میں فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا۔ مالِ غنیمت بہ کثرت اور بہ افراط ہر طرف سے آنے لگا۔ سونے اور چاندی کے ڈھیر لگے رہتے تھے۔ لیکن خلفائے راشدین کے لیے یہ روپیہ قوم کی امانت تھا۔ وہ اسے اپنی ذات پر نہیں ملتِ اسلامیہ پر خرچ کرتے تھے۔ اور اب معاً انھوں نے دیکھا کہ مسندِ خلافت پر جو ہستی جلوہ گر ہے، یہ ایک جلیل القدر بادشاہ اور سلطان تو ہے لیکن اس کی زندگی محمدؐ اور خلفائے محمدؐ سے بہت کم مناسبت

رکھتی ہے مسلمانوں نے فتنہ و فساد سے بچنے کے لیے اطاعت تو قبول کر لی۔ لیکن ان کے دل خوش نہ تھے۔

نکلسن لکھتا ہے:

نکلسن کا بیان "مسلمانوں نے بنو امیہؓ اور امیر معاویہ کے غلبے کو اس بُت پرست عنصر کی فتح سے تعبیر کیا جس نے (اسلام لانے سے قبل) رسول اللہؐ کی سخت مخالفت کرنے اور آپؐ کے صحابہ سے دشمنی کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ اور جو رسول اللہؐ کی وفات کے قریب تک آپ سے برسرِ پیکار رہا۔ ادھر مسلمانوں نے بھی نہایت پامردی و استقلال سے ان لوگوں کا مقابلہ جاری رکھا۔ اور بالآخر فتح یاب ہوئے۔

اس عنصر کی شکست سے دینِ اسلام کو اپنے وہ سادہ اصول عرب میں رائج کرنے کا موقع مل گیا جن کی بدولت تمام باشندگانِ عرب بلا استثنا ایک صف میں کھڑے ہو گئے اور کسی بڑے سے بڑے شخص کو بھی کسی معمولی سے معمولی انسان پر فضیلت اور بڑائی جتانے کا غرور باقی نہ رہا۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر اس قبائلی سیاست کا خاتمہ ہو گیا جو غریبوں کو ذلیل سمجھتی، کمزوروں کو حقیر جانتی اور دوسروں کے اموال کو ہتھیانا معمولی چیز خیال کرتی تھی اس لیے ہمیں کوئی تعجب نہیں ہوتا جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے بنی امیہؓ کے دوبارہ عروج کو انتہائی تشویش کی نگاہ سے دیکھا۔ ان کا خیال تھا کہ بنو امیہ کے برسرِ اقتدار آجانے سے تمام پرانے کینے نئے سرے سے زندہ ہو جائیں گے۔

بنو امیہؓ سے جمہور مسلمانوں کی نفرت کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ امویوں کا ایک بہت بڑا عنصر ایسا تھا جو محض شخصی مصالح اور فوائد کی خاطر اسلام میں داخل ہوا تھا۔ اور اسلام سے اس کا حقیقی تعلق نہ تھا۔ مزید برآں بنو امیہؓ کی سیاست نے خلافت کو کسروی بادشاہت میں تبدیل کر دیا تھا۔"[1]

شان و شوکت اور رعب و دبدبہ قائم رکھنا امیر معاویہ نے رومیوں سے سیکھا تھا جس وقت

---

[1]: تاریخ ادب العربی از نکلسن

آپ بازار میں نکلتے یا مسجد میں تشریف لاتے تو نیزہ بردار نیزہ لیے ہوئے آپ کے آگے آگے چلتے تھے۔ اپنے لیے آپ نے ایک محل تعمیر کرایا تھا جس کے ساتھ ایک تخت بھی بنوایا تھا۔ محل کے دروازے پر شب و روز دربان پہرہ دیا کرتے تھے۔ مسجد میں آپ کے لیے ایک مقصورہ بنا ہوا تھا۔ جب آپ نماز کے لیے تشریف لاتے تو اسی مقصورہ میں نماز پڑھتے ریشم اور دیباج پہننے میں بھی آپ نے رومیوں کی تقلید کی تھی۔

مقصورہ کی تعمیر پر ہنگامہ

دمشق کی جامع مسجد میں مقصورہ تعمیر ہوتے وقت لوگوں میں زبردست شور و شغب برپا ہوا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ ایسا کرنا صریحاً دین کے احکام کی خلاف ورزی اور خانۂ خدا میں عام لوگوں پر اپنے آپ کو ترجیح دینے کی ایک نئی مثال ہے۔

آپ اپنی جان کی حفاظت کے لیے اس قدر انتظامات کرنے کے بعد بھی مطمئن نہیں ہوئے۔ بلکہ یہ بھی حکم دیا کہ مسجد میں نماز پڑھاتے وقت آپ کے پہرہ دار آپ کے سامنے کھڑے رہیں۔ اور لوگوں کی نگرانی کرتے رہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ اسلام میں بالکل ایک نئی چیز تھی۔

ایک اور بات بھی امیر معاویہ نے نئی کی وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفائے راشدین کھڑے ہو کر خطبہ دیا کرتے تھے لیکن امیر معاویہ نے یہ سنّت بدل دی۔ اس امر سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ امیر معاویہ پر فارسی اور بازنطینی رسوم کا کتنا گہرا اثر تھا۔

امیر معاویہ کے صفاتِ گوناگوں

غرض امیر معاویہ کو اگر خلفائے راشدین کے پہلو بہ پہلو رکھ کر نہ دیکھا جائے تو ان کے ایک جلیل القدر فرماں روا، عظیم سیاستداں، مفکر اور مدبر ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ انھوں نے بڑی مضبوط بنیادوں پر اپنی حکومت ایک مختصر سی مدت میں استوار کر لی۔ اور ہر طرف سے یکسو ہو کر داد حکومت دینے لگے۔ کوئی ایسا نہ تھا جو ان کا حریف بن کر میدان میں آتا۔ اور اگر آتا تو کامیاب نہ ہو سکتا۔

عمر ابو النصر نے امیر معاویہ کی سیاست اور تدبر کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

"امیر معاویہ کی شخصیت گوناگوں صفات کی حامل تھی۔ آپ ایک اعلیٰ ترین سیاست داں بہت بڑے مدبر، بے حد حلیم، نہایت بردبار اور بے نظیر عقل و دانش کے مالک تھے۔"

یہ صفات ایسی ہیں جو شاذ و نادر ہی کسی فردِ واحد میں جمع ہوتی ہیں۔

اس کے بعد ان کے اندازِ سیاست پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتا ہے:

سیاسی جوڑ توڑ

آپ اکثر سیاسی جوڑ توڑ کے ذریعے اپنے ان اقارب کے درمیان نفرت کے جذبات پیدا کر دیا کرتے تھے۔ جن کے متعلق آپ کو خوف ہوتا تھا کہ کہیں وہ اپنے اثر و رسوخ کے ذریعے یزید اور اس کی اولاد کے لیے خطرہ کا باعث نہ بن جائیں۔ اس سلسلے میں مروان بن حکم اور سعید بن عاص کی طرف سے آپ کو خاص طور پر اندیشہ لگا رہتا تھا۔ مروان بنو امیہ کا نہایت معزز فرزند تھا اور سعید بن عاص بھی بنو امیہ میں زبردست اثر و رسوخ رکھنے والا شخص تھا۔

۵۴ھ (۶۷۴ء) امیر معاویہ نے سعید بن عاص کو مدینہ کی ولایت سے معزول کر کے اس کی جگہ مروان کو وہاں کا حاکم مقرر کر دیا۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ ایک دفعہ امیر معاویہ نے سعید بن عاص کو لکھا کہ وہ مروان کا گھر منہدم کر دے۔ اس کے تمام مال و اسباب پر قبضہ کر لے اور فدک کی جو جاگیر اسے دی گئی تھی وہ واپس لے لے۔ لیکن سعید بن عاص نے اس حکم پر عمل نہ کیا۔ اور خاموش ہو رہا۔ امیر معاویہ نے دوبارہ یاددہانی کرائی لیکن سعید پھر بھی خاموش رہا مگر دونوں فرمان سنبھال کر رکھ لیے۔

جب ادھر سے کوئی جواب نہ گیا تو امیر معاویہ نے ناراض ہو کر سعید کو معزول کر کے مروان کو اس کی جگہ حاکم بنا دیا۔ اور لکھا کہ سعید بن عاص کا مال و اسباب ضبط کر لیا جائے اور اس کے گھر کو منہدم کر دیا جائے۔ مروان نے حکم کی تعمیل کرنی چاہی، اور سعید کے گھر کو منہدم کرنے کے لیے موقع پر پہنچ گیا۔ سعید نے اس سے کہا:

اے ابو عبدالملک کیا تم میرا گھر منہدم کر دو گے؟

مروان نے جواب دیا: بیشک، امیر المومنین نے مجھے ایسا کرنے کے لیے لکھا ہے اگر

وہ تمھیں میرا گھر منہدم کرنے کا حکم دیتے تو تم بھی ضرور حکم کی تعمیل کرتے۔

سعید نے کہا: میں تو ایسا نہ کرتا۔

مروان نے جواب دیا: میں کس طرح یقین کر لوں۔

اس پر سعید نے اپنے غلام سے امیر معاویہ کے خطوط لانے کو کہا۔ چنانچہ وہ دونوں خطوط لے آیا۔ جب مروان نے انھیں پڑھا تو اسے بڑا تعجب ہوا۔ اس نے سعید سے پوچھا کہ "جب امیر المومنین نے تمھیں ایسا کرنے کا حکم دیا تھا تو تم نے حکم کی تعمیل کیوں نہ کی۔ اور مجھے اس سے مطلع کیوں نہ کیا۔"

سعید نے کہا: بات دراصل یہ ہے کہ امیر المومنین نے ہم دونوں کے درمیان عداوت پیدا کرنے کے لیے یہ طریق استعمال کرنا چاہا تھا۔ ان کی سوائے اس کے اور کوئی غرض نہ تھی تمھیں مطلع کرنے کے لیے میں موقع کا منتظر تھا، جو اب آگیا ہے۔

مروان نے کہا خدا کی قسم تم مجھ سے بہتر ہو۔ یہ کہہ کر وہ اس حکم کی تعمیل کیے بغیر واپس چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد امیر معاویہ کو حسب ذیل خط لکھا:

"امیر المومنین نے باوجود حد درجہ حلیم اور بردبار ہونے کے ہم قرابت داروں میں نفاق اور پھوٹ ڈلوانے، قطع رحمی کرنے اور ہماری اولادوں میں بھی ایک دوسرے سے نفرت و عداوت کے جذبات پیدا کرنے کی جو کوشش کی ہے اس سے مجھے بے حد تعجب ہوا۔ خدا کی قسم! اگر ہم ایک باپ کی اولاد نہ ہوتے تو ہم امیر المومنین خلیفۂ مظلوم کی حمایت کے لیے کبھی جمع نہ ہوتے۔ اس اتحاد و اتفاق کا یہ تقاضا تھا کہ امیر المومنین بھی اس کی نگہداشت کرتے اور اسے مضبوط کرنے کے لیے ہر امکانی کوشش کرتے۔"

اس کے جواب میں حضرت معاویہ کا معذرت کا خط آیا اور آپ نے آئندہ ان سے حسنِ سلوک کرتے رہنے کا وعدہ کیا۔

بیت المال کی حیثیت

خلفائے راشدین کے عہد میں حالت یہ تھی کہ ابوبکرؓ، عمرؓ اور علیؓ کی کوئی خاص جائداد نہ تھی، یہ بیت المال سے صرف اپنی ضرورت کے مطابق روپیہ لیتے تھے، لیکن امیر معاویہ کے عہد میں دولت کی غلط تقسیم نے

امیر اور غریب، جاگیر دار اور کاشت کار، سرمایہ دار اور مزدور کا سوال پیدا کر دیا۔ اب تک مسلمانوں میں کوئی ایسا طبقہ نہ تھا جو دولت و ثروت کے اعتبار سے، جائداد اور جاگیر کے اعتبار سے کوئی خاص پایہ رکھتا ہو۔ مگر اب دولت مندوں، جاگیرداروں اور اربابِ ثروت کا ایک بڑا طبقہ پیدا ہو گیا۔

خود امیر معاویہ کی ذاتی جائداد بھی کچھ کم نہ تھی اور یہ چیز ان لوگوں کو جو عہدِ رسالت مآبؐ اور خلفائے راشدین دیکھے ہوئے تھے کھٹکتی تھی۔ چنانچہ جلیل القدر صحابیٔ رسول حضرت ابوذر غفاریؓ اور امیر معاویہ سے اسی لیے اَن بن ہو گئی۔

"جب مسلمانوں نے شام فتح کیا تو وہاں کی زمینیں ان کے اصلی مالکوں کے ہاتھوں ہی میں رہنے دیں۔ لیکن کافی زمینیں ایسی بھی تھیں جو رومی بطریقوں، لشکر کے سپہ سالاروں اور ان کے علاوہ ایسے کثیر التعداد رومیوں کی ملکیت میں تھیں جو یا تو جنگوں میں قتل ہو چکے تھے یا شکست کھا کر روم کی طرف بھاگ گئے تھے اور اب وہ زمینیں خالی پڑی تھیں۔ ان زمینوں کو حکومت کی ملکیت میں دے دیا گیا اور ان کی آمدنی تمام کی تمام بیت المال میں داخل کی جانے لگی۔ جس وقت امیر معاویہ شام کے والی ہوئے تو انھوں نے رومیوں سے کافی حد تک اثر قبول کیا۔ اور اپنے لیے بھی اسی شان و شوکت کو اختیار کیا جو اُن کے پیشرو رومیوں کا خاصا تھی۔ چونکہ ان کی تنخواہ اس شان و شوکت کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی اس لیے انھوں نے حضرت عثمانؓ کو لکھا کہ میرے پاس مختلف ملکوں اور شہروں سے وفود، قاصد اور رومیوں کے سفیر آتے رہتے ہیں جن کی مہمانداری اور آرام و آسائش کے انتظام میں کافی رقم خرچ ہو جاتی ہے اور اس کے مقابلے میں میری تنخواہ کم ہے (حضرت عمرؓ نے آپ کو شام کا والی مقرر کرتے وقت آپ کی تنخواہ ایک ہزار دینار سالانہ مقرر کی تھی) اور ان اخراجات کے نکال لینے کے بعد جو رقم میرے پاس رہ جاتی ہے وہ گزارہ کے لیے ناکافی ہوتی ہے۔ شام میں بعض زمینیں ایسی موجود ہیں جن کے مالک یا تو لڑ کر قتل ہو چکے ہیں یا رومی علاقے میں بھاگ گئے ہیں پس یہ زمینیں نہ تو ذمیوں کی ملکیت ہیں نہ ان کا شمار خراجی زمینوں میں ہوتا ہے اس لیے اگر

ان کو میری تحویل میں دے دیا جائے تو نہ تو خراج میں کمی آئے گی اور نہ کسی ذمّی باشندے کی حق تلفی ہوگی۔ ان زمینوں کی آمدنی سے وفود اور سفیروں کی مہمانداری کے اخراجات بہ احسن وجوہ پورے ہوجایا کریں گے۔

حضرت عثمان رضؓ نے یہ درخواست قبول کرلی اور وہ زمینیں جن کا کوئی مالک نہ تھا امیر معاویہ کی تحویل میں دے دیں۔ مگر انھیں آپ نے ذاتی جاگیروں میں تبدیل کر دیا۔ اسی پر بس نہیں کی بلکہ آپ نے اپنے عہد میں حضرت عمر رضؓ کے قاعدے کے برخلاف مسلمانوں کو جائدادیں خریدنے کی بھی اجازت دے دی۔

حضرت ابوذر غفاری رضؓ سے اختلاف

امیر معاویہ کی مال و دولت جمع کرنے کی روش ہی کی وجہ سے ان کا حضرت ابوذر غفاری رضؓ سے اختلاف پیدا ہوا۔ حضرت ابوذر غفاری رضؓ حضرت عمر رضؓ کی زاہدانہ پالیسی کے زبردست حامی اور مال و دولت جمع کرنے کے سختی سے مخالف تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے پاس ایک دن اور ایک رات سے زیادہ کی خوراک یا کوئی ایسی چیز رکھے جسے وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا چاہتا ہو۔ وہ ہر روز شام کے وقت سرِ راہ کھڑے ہوجاتے اور کہتے:

اے دولت مندو اور غریبو! یاد رکھو کہ جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو اسی چاندی اور سونے سے قیامت کے دن ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پیٹھوں پر داغ لگائے جائیں گے۔

حضرت ابوذر غفاری رضؓ کے اس وعظ و نصیحت کا اثر یہ ہوا کہ غریبوں اور مسکینوں کے حوصلے بڑھنے لگے۔ اور انھوں نے امیروں پر دست درازیاں شروع کر دیں جس پر امیروں نے امیر معاویہ کے پاس جاجا کر حضرت ابوذر رضؓ کی شکایتیں کیں۔ امیر معاویہ خود ہی ابوذر رضؓ سے تنگ تھے۔ کیونکہ کئی بار وہ ان کے پاس بھی آکر انھیں مال و دولت جمع کرنے پر سخت الفاظ میں زجر و توبیخ کر چکے تھے۔ امیر معاویہ نے دمشق میں قصر خضرا تعمیر کرایا اور اس کے بارے میں حضرت ابوذر رضؓ کی رائے دریافت کی۔ انھوں نے کہا:

"اگر آپ نے یہ محل اللہ تعالیٰ کے مال سے بنوایا ہے تو خیانت کی ہے اور اگر اپنے مال سے بنوایا ہے تو اسراف سے کام لیا ہے"

حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے عہد میں مسلمان دولت و ثروت سے عموماً ناآشنا تھے۔ اگر ان کے بعد بھی مسلمان اپنی پرانی بدوی حیثیت جاری رکھتے تو یہ حالت بھی بدستور قائم رہتی لیکن وہ جونہی رومیوں اور ایرانیوں سے ملے ان کے دلوں میں بھی شان و شوکت کے حصول اور مال و دولت جمع کرنے کا جذبہ ابھر آیا۔ امیر معاویہ کی انعام و اکرام اور داد و دہش کے ذریعے قبائل اور افراد کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنانے کی عادت نے اس جذبے کو پھیلنے اور ابھرنے میں مدد دی۔

امیر معاویہ کے مشیر امیر معاویہ کے رفیقوں اور مشیروں کی فہرست میں تین نام زیادہ مشہور ہیں۔ زیاد بن ابیہ، مغیرہ بن شعبہ اور عمرو بن العاص۔ پوری عرب قوم ان کی فراست، تدبر اور سیاست دانی کا لوہا مانتی تھی۔ اور تمام مؤرخین اس پر متفق ہیں کہ یہ حضرات اگر امیر معاویہ کے ساتھ نہ ہوتے تو وہ کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔

زیاد کی سفاکی، مغیرہ کی فراست اور عمرو بن العاص کے تدبر نے ہر مشکل آسان کر دی اور وہ بے غل و غش حکومت کرتے تھے۔ اور اس رفاقت کا صلہ بھی انھوں نے وہی دیا جو مانگا گیا۔ عمرو بن العاص نے مصر کی مستقل گورنری کا مطالبہ کیا وہ منظور کر لیا گیا۔ زیاد کو کوفہ اور بصرہ کا گورنر بنا دیا گیا۔ مغیرہ کو بھی وہ سب کچھ مل گیا جس کے امیر معاویہ کی نظر میں سزاوار تھے۔

جو کام مغیرہ اور ابن عاص اپنے تدبر اور فراست سے کر لیتے تھے ان سے بڑھ کر کارنامے زیاد اپنی نوک شمشیر سے انجام دے ڈالتا تھا۔ کوفہ اور بصرہ کے عوام کی بے اطمینانی اور شورش کو جس سفاکی سے اس نے کچلا وہ اسی کا حصہ تھا۔

زیاد بن ابیہ گورنری پر فائز ہو کر وہ ۴۵ھ کے ماہ ربیع اوّل میں بصرہ پہنچا اور مسجد میں جمع کر کے لوگوں کے سامنے ایک تہلکہ خیز خطبہ دیا۔ اس نے کہا:

"تجربے سے مجھے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ جب تک بنیاد کو مضبوط نہ کیا جائے اس وقت تک عمارت کو درست کرنا بالکل بے کار ہے۔ اس لیے میں خدائے عزّوجل کی قسم کھا کر یہ اعلان کرتا ہوں کہ تم نے اپنی اصلاح نہ کی تو پھر میں غلام کی بجائے آقا کو، مسافر کی جگہ مقیم کو، نافرمان کی جگہ فرمانبردار کو اور بیمار کی جگہ تندرست کو پکڑ کر سزا دوں گا اور یہاں تک سختی برتوں گا کہ جب تم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی کو ملے گا تو وہ کہے گا "اے سعد اپنے بچاؤ کا سامان کر لو کیونکہ سعید ہلاک ہو گیا"۔ میری ان باتوں کو خالی دھمکیاں نہ سمجھو میں عملی طور پر یہ سب باتیں کر کے دکھا دوں گا۔ اگر میری یہ باتیں جھوٹ ثابت ہوئیں تو تم پر میری اطاعت واجب نہیں۔ جس شخص کے گھر میں رات کو نقب زنی ہو گی میں اس شخص کے مال کی ادائیگی کا ضامن ہوں۔ خبردار! تم میں سے کوئی شخص رات کو باہر نہ نکلے۔ جو شخص رات کے وقت باہر پھرتا پایا جائے گا وہ فوراً موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ میں ان احکامات کو جاری کرنے کے لیے تمھیں صرف اتنے عرصے کی مہلت دیتا ہوں جتنے عرصے میں ایک شخص یہاں سے کوفہ تک جائے اور پھر لوٹ آئے۔

ایک اسلامی حکومت میں یہ کتنی عجیب، کتنی غیر شرعی دھمکی تھی۔ چنانچہ:

زیاد کی سفاکی

اس خطبے سے ــــ جس کا شمار عربی کے فصیح ترین خطبوں میں ہوتا ہے زیاد کی شخصیت اہلِ بصرہ کے سامنے ایک خوفناک اور مہیب شکل میں ظاہر ہوئی۔ وہ ان سزاؤں کا جو زیاد نے اپنے خطبے میں ان کے لیے تجویز کی تھیں تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ بعض لوگوں نے اسے خالی دھمکیوں پر محمول کیا۔ کیونکہ یہ بات ان کے ذہنوں میں کسی طرح بھی نہیں آ سکتی تھی کہ مجرم کے بدلے بے گناہ، بد کی بجائے نیک اور مسافر کی جگہ مقیم پکڑ لیا جائے گا۔ چنانچہ اسی وقت ایک خارجی ابو بلال مرداس بن اُدیّہ کھڑا ہوا اور زیاد سے کہنے لگا:

"تم نے اس وقت جو باتیں کہی ہیں وہ کلام اللہ کے بالکل برخلاف ہیں۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے الا تزر وازرۃ وزر اخریٰ وان لیس للانسان الا ما سعیٰ۔ (کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور انسان کو اتنا ہی ملے گا جتنی اس

نے کوشش کی ہو گی) لیکن تم کہتے ہو کہ گناہ کا بوجھ بے گناہ کو اٹھانا پڑے گا۔"

"معلوم ہوتا ہے تم لوگ اس وقت تک باز نہ آؤ گے جب تک اچھی طرح خوں ریزی نہ ہو لے گی۔"

یہ کہہ کر وہ منبر سے اتر آیا۔ اس نے عبداللہ بن حصن کو شہر کا کوتوال مقرر کیا اور ان احکام کے نفاذ کے لیے لوگوں کو صرف اتنے عرصے کی مہلت دی جتنے عرصے میں کوئی شخص کوفہ جائے اور وہاں سے واپس آئے۔

زیاد عشا کی نماز تاخیر سے پڑھتا اور نماز کے بعد ایک شخص کو حکم دیتا کہ وہ سورہ بقرہ یا اسی کے برابر قرآن کریم کا کوئی اور حصہ پڑھے۔ جب قاری تلاوتِ قرآن پاک سے فارغ ہو جاتا تو اتنا توقف کرتا کہ ایک شخص مسجد سے بصرہ کے آخری حصے تک پہنچ سکے۔ اس کے بعد وہ کوتوال کو شہر کا گشت لگانے کا حکم دیتا۔ اور تاکید کر دیتا کہ وہ جس آدمی کو شہر کی گلیوں میں پھرتا دیکھے اسے گرفتار کر کے اس کے سامنے پیش کرے تاکہ وہ قتل کر ڈالا جائے۔

ایک رات کوتوال کو ایک بدو ملا۔ اس نے اسے زیاد کی خدمت میں حاضر کر دیا۔ زیاد نے اس سے پوچھا:

"کیا تو نے میرا حکم نہیں سُنا؟"

بدو نے قسم کھا کر کہا: "مجھے امیر کے حکم کی مطلق خبر نہیں۔ میں تو جنگل میں اپنی بکریوں کا ریوڑ چرا رہا تھا۔ جب رات ہو گئی تو بسیرا کرنے کے لیے شہر میں داخل ہو گیا۔ اور بکریوں کو لے کر ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔ مجھے پتہ نہیں کہ امیر نے کیا حکم دیا ہوا ہے۔"

زیاد نے کہا:

"تو مجھے تو سچا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن تیرے قتل کرنے میں امّت کا فائدہ معلوم ہوتا ہے۔ تاکہ لوگوں کو عبرت ہو اور کوئی شخص رات کو باہر نکلنے کی جرأت نہ کر سکے۔"

یہ کہہ کر اس کی گردن مار دینے کا حکم دیا اور وہ قتل کر دیا گیا۔

زیاد پہلا حاکم ہے جس نے اپنے دورِ حکومت میں اس قدر سختی سے کام لیا اور امیر معاویہ کی حکومت کو مضبوط تر کر دیا۔

ان سختیوں سے لوگوں پر شدید خوف و ہراس طاری ہو گیا۔

زیاد اور کوفہ کی گورنری

پھر حضرت مغیرہؓ کی وفات کے بعد زیاد کوفہ کا گورنر بن گیا بقول عمر ابوالنصر:

"وہ کوفہ پہنچا اور دستور کے مطابق لوگوں کو جمع کر کے جامع مسجد میں خطبہ دیا مگر لوگوں نے اس پر کنکریاں پھینکنی اور آوازے کسنے شروع کیے۔ یہ دیکھ کر وہ نہایت سکون کے ساتھ بیٹھ گیا۔ جب کچھ دیر کے بعد لوگوں کا جوش ٹھنڈا ہو گیا تو اس نے اپنے خاص آدمیوں کو بلایا اور انھیں مسجد کے دروازے پر متعین کر دیا۔ پھر ایک کرسی منگائی اور مسجد کے دروازے میں بچھا کر اس پر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد حکم دیا کہ چار چار آدمی اس دروازے سے باہر نکلیں۔ ہر ایک سے وہ قسم لیتا کہ کنکریاں اس نے نہیں پھینکیں، جو قسم کھا لیتا اسے باہر جانے دیتا اور جو قسم نہ کھاتا اسے روک لیتا۔ اس طرح تیس آدمی روکے گئے زیاد نے ان سب کے ہاتھ کاٹ ڈالے۔

اس واقعے کے بعد اس نے مسجد میں اپنے لیے مقصورہ بنوایا۔

شروع ہی میں اتنی سخت سزا کا یہ نتیجہ ہوا کہ پھر کسی کو اس کے سامنے زبان کھولنے اور اس کے خلاف شور مچانے کی جرأت نہ ہوئی۔

زیاد کا طریقہ یہ تھا کہ وہ چھ مہینے بصرہ میں رہتا اور چھ مہینے کوفے میں۔

حضرت حجر بن عدیؓ کا قتل

حضرت امام حسنؓ جب امیر معاویہ کے حق میں خلافت سے دست بردار ہو گئے۔ تو منجملہ اور شرائط کے ایک شرط یہ بھی تھی کہ حضرت علیؓ پر سب و شتم کا جو سلسلہ معاویہ کے حسب الحکم مساجد میں جاری ہے وہ بند کر دیا جائے گا۔ لیکن اس شرط پر عمل نہ ہو سکا، کوفہ میں ایک جلیل القدر صحابی حجر بن عدیؓ رہتے تھے جو حضرت علیؓ کے خلاف ایک لفظ سننا بھی گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ اور وہ زیاد جیسے سفاک سے بھی ٹکرا گئے۔ چنانچہ:

حضرت مغیرہؓ کے بعد جب کوفہ کی ولایت زیاد بن ابیہ کے ہاتھ میں آئی تو اس نے بھی حضرت علیؓ کو برا بھلا کہنے اور حضرت عثمانؓ کی تعریف کرنے کی رسم جاری رکھی۔ حجرؓ اور

اور ان کے ساتھیوں کو یہ بات سخت ناگوار گزرتی تھی اور وہ خفیہ مجالس منعقد کر کے امیر معاویہ اور ان کے اعمال پر سب و شتم کرتے اور بنو امیہ کی سیاست اور پالیسی پر تنقید اور اعتراض کیا کرتے تھے۔

جب ان اجتماعات کی خبر زیاد کو پہنچی تو وہ بصرہ سے کوفہ آیا اور منبر پر بیٹھ کر خطبہ دیا:

یاد رکھو کہ سرکشی اور بغاوت کا نتیجہ بہت خراب ہوتا ہے۔ تم میں سے بعض فتنہ پرداز لوگوں نے حکومت کی مخالفت پر کمر باندھی ہے اور مجھے پتہ لگا ہے کہ وہ اپنی خفیہ مجالس میں بغاوت کی تیاریاں کرتے رہتے ہیں۔ یاد رکھو کہ اگر تم سیدھے نہ ہوئے تو میرے پاس ایسے ذرائع ہیں جن سے کام لے کر میں تمھارا کس بل نکال دوں گا۔ میرا نام زیاد نہیں ہے اگر میں کوفہ میں حجر کو رہنے دوں۔ اور اسے دوسرے لوگوں کے لیے عبرت بنا کر نہ چھوڑوں۔

اس کے بعد زیاد نے حجر کو بلانے کے لیے اپنا ایک آدمی بھیجا لیکن انھوں نے آنے سے انکار کر دیا۔ اس پر زیاد نے پولیس کے کچھ نوجوان گرفتار کرنے کے لیے بھیجے۔ جب یہ لوگ حجر کی قیام گاہ پر پہنچے تو ان کے ساتھیوں اور حامیوں نے انھیں گالیاں دیں۔ اور انھیں ناکام واپس آنا پڑا۔ اس پر زیاد نے پھر اہلِ کوفہ کو جمع کیا اور کہا:

تمھیں کیا ہو گیا ہے تم ایک ہاتھ سے اپنا سر زخمی کرتے ہو۔ تمھارے جسم میرے ساتھ ہیں لیکن دل احمق حجر کے ساتھ۔ اس منافقت سے تمھاری اندرونی گندگی ظاہر ہوتی ہے خدا کی قسم یا تو تم اپنے عمل کے ذریعے حکومت کے ساتھ اپنی وفاداری کا ثبوت دو۔ ورنہ میں ایسی قوم کو تم پر مسلط کر دوں گا۔ جو تمھیں بالکل سیدھا کر دے گی۔

زیاد کی ان دھمکیوں سے اہلِ کوفہ مرعوب ہو گئے اور کہنے لگے:

معاذ اللہ! ہم آپ کی اطاعت اور فرمانبرداری سے روگردانی کر سکتے ہیں؟ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ ہم بہرحال حکومت کے وفادار ہیں۔

زیاد نے جواباً کہا:

اگر ایسا ہے تو ہر شخص اپنے اپنے رشتہ داروں اور عزیزوں کو جو حجر کے ساتھ ہیں ان کی ہمدردی اور اعانت کرنے سے روک دے۔

چنانچہ لوگوں نے ایسا ہی کیا اور حجرؓ کے ساتھیوں کی ایک کثیر تعداد ان سے الگ ہو گئی اس کے بعد زیاد نے کوتوالِ شہر کو حکم دیا کہ:

حجرؓ کے پاس جاؤ اور اسے میرے پاس لے آؤ۔ اگر وہ انکار کرے تو طاقت کا استعمال کرو اور اس کو اس کے ساتھیوں سمیت گرفتار کر کے فوراً میرے سامنے حاضر کرو۔

چنانچہ کوتوال گیا اور حجرؓ کو مع ان کے ساتھیوں کے گرفتار کر کے لے آیا۔ زیاد نے انھیں قید خانے میں ڈال دیا اور حجرؓ کے باقی ماندہ ساتھیوں کی تلاش کا حکم بھی دیا۔ ان میں سے کچھ لوگ تو بھاگ گئے، کچھ پکڑے گئے۔ گرفتار ہونے والوں کی تعداد چودہ تھی۔

اس کے بعد زیاد نے حجرؓ کے خلاف شہادتیں جمع کرنی شروع کیں۔ چنانچہ بیشتر لوگوں نے آکر گواہیاں دیں کہ حجرؓ نے بغاوت کی تیاری کے لیے لوگوں کو اپنے گرد اکٹھا کیا۔ اس کی مجالس میں امیر معاویہ کو گالیاں دی جاتی تھیں۔ اور ان سے لڑنے کے لیے منصوبے بنائے جاتے تھے۔ یہ تمام کوششیں اس لیے کی جا رہی تھیں کہ آلِ علیؓ کو دوبارہ پنپنے کا موقع مل سکے اور حجرؓ کے ساتھ جو دوسرے لوگ گرفتار کیے گئے ہیں وہ اس کے زبردست مددگاروں میں سے تھے۔

زیاد نے یہ تمام شہادتیں قلمبند کر کے انھیں حجرؓ اور ان کے ساتھیوں کے ہمراہ امیر معاویہ کی خدمت میں بھجوا دیا۔ امیر معاویہ انھیں لے کر دمشق کے قریب ایک مقام "مرج عذرا" میں پہنچے اور وہاں پہنچ کر ان میں سے آٹھ آدمیوں کے قتل کا حکم دیا۔ باقی چھ جنھوں نے حضرت علیؓ سے بیزاری کا اظہار کیا چھوڑ دیے گئے۔

زیاد کے عہد پر تبصرہ

زیاد کی ان کارروائیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے عمر ابوالنصر نے لکھا ہے:

جہاں تک نظم و نسق کو خوبی کے ساتھ چلانے اور قلمرو میں امن و امان قائم کرنے کا سوال ہے زیاد کی گراں قدر کوششوں میں کوئی شبہ نہیں، لیکن امن و امان کے قیام کے لیے اس نے جو طریقے استعمال کیے ان کی ہم کسی طرح حمایت نہیں کر سکتے۔ قتل و غارت کا جو سلسلہ اس نے شروع کیا تھا اس کی وجہ سے نہ صرف اس کی عزت لوگوں کی نظروں میں گر گئی بلکہ یہ چیز

بنو امیہ کی سیاست کے لیے بھی مہلک ثابت ہوئی۔ ہر جگہ ابن زیاد اور بنو امیہ کے دشمن پیدا ہو گئے۔ اور دلوں میں ان کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات ابھرنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب زیاد کی ولایت ختم ہوئی اور امیر معاویہ کا انتقال ہو گیا تو بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے اور ہر شہر سے فتنہ و فساد سر اٹھانے لگا۔

معلوم ہوتا ہے کہ زیاد فارس کی امارت کے زمانے میں ایران کے قدیم شاہی نظام سے بہت متاثر ہوا تھا۔ چنانچہ جب اسے امیر معاویہ نے بصرہ کا حاکم بنا کر بھیجا تو اس نظام کی بہت سی باتوں کو اس نے وہاں بھی رائج کیا۔ جب وہ شہر کی گلیوں میں چلتا تھا تو اس کے آگے پیچھے اس کے محافظوں کی ایک فوج ہوا کرتی تھی۔ اس کے محل کے دروازے پر کم از کم پانچ سو مسلح سوار پہرہ دیا کرتے تھے۔

یہ حقیقت ہے کہ امیر معاویہ نے جتنے عمال مقرر کیے۔ زیاد شان و شوکت، بہادری و شجاعت اور جرأت و ہمت میں ان سب سے بڑھ کر تھا۔ مشرق میں اس کی حکومت ہندوستان سے لے کر خلیج فارس تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور عراق کا تمام علاقہ اس کے زیر نگیں تھا لیکن اس قدر وسیع علاقے کی امارت پر بھی وہ قانع نہیں تھا۔ اپنی زندگی کے آخری حصے میں اس نے امیر معاویہ سے درخواست کی تھی کہ اسے حجاز کا والی بھی بنا دیا جائے۔ نہ معلوم امیر معاویہ کا کیا جواب ہوتا لیکن زیاد کی عمر نے زیادہ دیر تک وفا نہ کی اور اٹھاون برس کی عمر پا کر ۵۳ ھ ۶۷۳ء میں اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

امیر معاویہ کا دور تنظیم و انتظام مملکت کے اعتبار سے بہت سی ندرتیں اور خوبیاں رکھتا تھا:

حربی ایجاد منجنیق کا استعمال مسلمانوں میں غالباً سب سے پہلی مرتبہ امیر معاویہ کے عہد میں ہوا۔ کابل کے محاصرہ میں سنگ باری سے شہر پناہ توڑی گئی تھی۔

پولیس ملک کے اندرونی نظام اور قیام امن کے لیے پولیس کے محکمے کو بڑی ترقی ہوئی خصوصاً عراق میں جہاں ہمیشہ فتنہ و فساد برپا رہتا تھا پولیس کا بڑا زبردست

انتظام رہتا تھا۔ شہر کوفہ میں چالیس ہزار پولیس تھی۔ امن و امان کا یہ حال تھا کہ کوئی شخص راستے میں گری پڑی چیز اٹھانے کی ہمت نہ کر سکتا تھا تا آنکہ خود اس کا مالک آکر نہ اٹھاتا۔ راتوں کو عورتیں اپنے گھروں کے کواڑ کھول کر سوتی تھیں۔ زیاد والئ عراق کا دعویٰ تھا کہ اگر کوفہ سے خراسان تک رسّی کا ایک ٹکڑا بھی ضائع ہو جائے تو مجھے معلوم ہو جائے گا کہ کس نے لیا۔ ایک مرتبہ اس نے کسی گھر سے گھنٹہ بجنے کی آواز سنی، پوچھا تو معلوم ہوا کہ گھر والے پہرہ دے رہے ہیں۔ اس نے کہا اس کی ضرورت نہیں، اگر کسی کا مال ضائع ہو جائے گا تو میں اس کا ذمہ دار ہوں۔

قیامِ امن کے لیے مشتبہ لوگوں کی نگرانی بھی ایک احتیاط ہے۔ امیر معاویہ نے دمشق کے تمام بدمعاشوں کے نام درج رجسٹر کرائے تھے۔ زیاد نے جعد بن قیس کو بدمعاشوں کی نگرانی پر مقرر کیا تھا۔

ڈاک کا انتظام اسلامی حکومت میں امیر معاویہ سے پہلے سرکاری ڈاک کا باقاعدہ محکمہ نہ تھا انھوں نے برید کے نام سے اس کا مستقل صیغہ قائم کیا۔ اس کا نظام یہ تھا کہ ملک بھر میں تھوڑی تھوڑی مسافت پر تیز رفتار گھوڑے ہر وقت تیار رہتے تھے سرکاری ہرکارے منزل بہ منزل انھیں بدلتے ہوئے ایک مقام کی خبریں دوسرے مقام تک لے جاتے اور لاتے تھے۔

اسی طرح سرکاری فرامین کی نقلیں دفتر میں رکھنے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اس سے لوگوں کو ان میں ردّ و بدل کا موقع مل جاتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک شخص نے ایک لاکھ کے دو لاکھ بنا کر وصول کر لیے۔ اس وقت سے امیر معاویہ نے دیوانِ خاتم کے نام سے ایک نیا شعبہ قائم کیا۔ وہ جو حکم صادر کرتے تھے وہ پہلے دیوانِ خاتم میں آتا تھا۔ یہاں اس کی ایک نقل رکھ لی جاتی تھی۔ اور دفتر کا محرر حکم نامے کو لفافے میں بند کر کے اس پر مہر لگا کر آگے بڑھاتا تھا، اس احتیاط کے بعد احکام میں تغیر و تبدّل کا امکان باقی نہ رہ گیا۔ یہ طریقہ محض احکامِ شاہی کے لیے مخصوص نہ تھا، بلکہ بڑے بڑے حکام بھی اس پر عامل تھے۔ چنانچہ زیاد اپنے تمام فرامین و خطوط کی نقلیں رکھوا تا تھا۔

رفاہِ عام امیر معاویہ کے دور میں بہت سے ایسے کام ہوئے جن سے حکومت کے ساتھ رعایا کو بھی فائدہ پہنچا۔

زراعت کی ترقی کے لیے بہت سی نہریں جاری کرائیں جن سے لاکھوں ایکڑ زمین سیراب ہوتی تھی، اس سے ملک کی زراعت میں بڑی ترقی ہوئی۔ اور قحط سالی کا خطرہ جاتا رہا۔

مدینہ کے قرب وجوار میں نہر کظامہ، نہر ازرق اور نہر شہدا وغیرہ متعدد نہریں کھدائیں۔ ان نہروں کے ذریعے سے پیداوار میں جو ترقی ہوئی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صرف مدینہ کے قرب وجوار کی نہروں کے ذریعے ڈیڑھ لاکھ وسق خرما اور ایک لاکھ وسق گیہوں پیدا ہوتا تھا۔

بستیوں اور شہروں کی تعمیر امیر معاویہ کے عہد میں بعض پرانے ویران شہر دوبارہ آباد ہوئے اور نئے شہر بسائے گئے۔ چنانچہ شام کا اُجڑا ہوا شہر مرعش دوبارہ آباد کیا گیا۔

ایک نیا شہر قیروان افریقہ میں بسایا گیا۔ افریقہ کے بربر بڑے بغاوت پسند تھے جب تک ان کے سر پر فوجی قوت مسلط رہتی، اس وقت تک وہ مطیع ومنقاد رہتے تھے۔ اور جہاں آزاد ہوتے فوراً باغی ہو جاتے۔ اس لیے عقبہ بن نافع فہری نے یہاں فوجی چھاؤنی قائم کرنے کی غرض سے ساحل سے ہٹ کے جنگل کٹوا کر ایک شہر بسایا۔ اس کے وسط میں دارالامارہ کی عمارت بنوائی اور اس کے چاروں طرف مسلمانوں کے محلے آباد کر کے ایک جامع مسجد تعمیر کی۔ رفتہ رفتہ اس شہر نے اتنی ترقی کی کہ شمالی افریقہ میں مسلمانوں کا مرکزی شہر بن گیا۔

مختلف مقاموں پر اسلامی نو آبادیاں قائم کیں۔ ۴۳ھ میں انطاکیہ میں ایک نو آبادی بسائی۔ روڈس اور ارواڈ کے جزیروں میں مسلمان آباد کیے۔ اور متعدد مقاموں پر خصوصاً جہاں کسی دوسری حکومت کی سرحد ملتی تھی اور مسلمانوں کی آبادی کم تھی وہاں مسلمان آباد کیے۔ اس سے دو فائدے ہوئے ایک یہ کہ ان مقاموں پر دوسری قوموں کا حملہ کم ہو گیا، دوسرے اسلامی حکومت میں جہاں جہاں مسلمان نہ تھے ان کی آبادی ہو گئی۔

امیر معاویہ کے عہدِ حکومت پر تبصرہ

امیر معاویہ کے عہدِ حکومت پر تبصرہ کرتے ہوئے متحدہ ہندوستان کے یگانۂ روزگار مؤرخ مولانا شاہ معین الدین ندوی نے جو کچھ لکھا ہے وہ توازنِ فکر اور اصابتِ رائے کا بہترین نمونہ ہے۔ وہ فرماتے ہیں :

امیر معاویہ کے کارناموں کے بعد ان کی بعض واقعی کمزوریوں اور ان مبالغہ آمیز بلکہ غلط اور گمراہ کن واقعات پر تبصرہ ضروری ہے جن کی شہرت عام نے امیر کی جانب سے بہت سی غلط فہمیاں پھیلا دی ہیں۔ اور ان کے دشمن تو دشمن کوتاہ نظر دوستوں کے دلوں میں بھی ان کی جانب سے بہت سے شکوک و شبہات پیدا ہو گئے ہیں۔

اصولی طور پر اسے سمجھ لینا چاہیے کہ امیر معاویہ خلیفۂ راشد تھے اور نہ ان کی حکومت خلافت راشدہ یعنی اسلامی حکومت کا صحیح نمونہ تھی بلکہ وہ ایک دُنیوی حکمراں تھے اور اُن کی حکومت دُنیاوی بادشاہت تھی۔ جس میں اس کی بُرائیاں کم اور خوبیاں زیادہ تھیں، امیر معاویہ میں یقیناً کمزوریاں تھیں لیکن جن کمزوریوں سے کسی اسلامی اصول کی پامالی نہ ہوتی ہو وہ چنداں لائقِ التفات نہیں۔

حضرت علیؓ کے مقابلے میں ان کی ناحق صف آرائی اور اس میں کامیابی کے لیے ہر طرح کے جائز و ناجائز وسائل کا استعمال، حضرت علیؓ پر سب و شتم کی غیر مستحسن رسم، یزید کی ولی عہدی یہ سب ایسی کھلی ہوئی غلطیاں ہیں جن سے کوئی حق پرست انکار نہیں کر سکتا۔ خصوصاً یزید کی ولی عہدی نے خلافت کی اصلی روح اور اسلامی حریت و آزادی کا خاتمہ کر دیا۔

لیکن امیر معاویہ کے مخالفین نے ان کی ان غلطیوں کو اسی حد تک محدود نہیں رکھا بلکہ ایسے ایسے افسانے گھڑ کر یا معمولی واقعات کو ایسی رنگ آمیزی کے ساتھ امیر کی جانب منسوب کر دیا جو ایک صحابی کیا ایک معمولی انسان کے رتبے سے بھی فروتر ہیں۔"

ارشاداتِ بالا کا جہاں تک تعلق ہے وہ توازن اور اعتدال کا بہترین نمونہ ہیں، نہ ان کی صحت سے انکار کیا جا سکتا ہے نہ ان کی اصابت سے۔

لیکن اصل سوال جو زیرِ غور ہے اور جس کا جواب آج تک تاریخ نہیں دے سکی۔ یہ ہے کہ آخر خلافتِ راشدہ کے معاً بعد اسلام کے اصولوں اور اقدار کو پس منظر میں کس طرح پہنچا دیا گیا۔ اسلام کی دعوت انہی اصولوں اور اقدار کے لیے تھی جب یہی نہ رہے تو رہ کیا گیا۔

ہم اٹھ گئے تو کیا تری محفل میں رہ گیا!

اوّلیاتِ معاویہؓ

امیر معاویہ کے وہ معمولات جو ان کی ایجاد ہیں

علامہ سیوطی نے تاریخ الخلفا میں اولیاتِ معاویہ کے سلسلے میں لکھا ہے:

ابن ابی شیبہ ــــ شعبی کی زبانی مروی ہے:

۱: سب سے پہلے بیٹھ کر خطبہ پڑھنے والے امیر معاویہ تھے، کیونکہ وہ بڑے موٹے تازے تھے اور ان کی توند نکل آئی تھی۔

۲: عبد الرزاق نے زہری کے حوالے سے لکھا ہے: امیر معاویہ نے نماز عید سے پہلے خطبہ پڑھنے کی بنیاد ڈالی۔

۳: ابن ابی شیبہ نے سعید بن مسیب کی زبانی لکھا ہے: عیدین میں اذان دلانے کی رسم امیر معاویہ نے ایجاد کی۔

۴: تکبیرات میں کمی کرنے والے بھی امیر معاویہ ہیں۔

۵: عسکری نے اپنی اوائل میں لکھا ہے: اوّل اوّل امیر معاویہ نے اسلام میں خبر رساں مقرر کیے۔

۶: اپنی خدمت کے لیے خواجہ سرا رکھے۔

۷: آپ ہی کے زمانے میں رعایا دل گرفتہ ہوئی۔

۸: آپ ہی کو ان الفاظ میں سلام کیا گیا۔ السلام علیک یا امیر المومنین ورحمۃ اللہ وبرکاتہ والصلوٰۃ یرحمک اللہ۔

۹: آپ ہی نے دفتری مہر ایجاد کی۔ اور مہر کی نگرانی کے لیے عبداللہ بن اوس غسانی کو مامور کیا۔ اس مہر پر یہ عبارت کندہ تھی: "ہر کام کا ثواب ملتا ہے"۔ اور مہر لگانے کا طریقہ آپ کے زمانے سے لے کر تمام خلفائے عباسیہ میں آخری دم تک جاری رہا۔ مُہر کی ایجاد کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ آپ نے کسی کو ایک لاکھ درہم دینے کا حکم تحریر کیا۔ لیکن اس شخص نے حکم نامہ کھول کر اس میں دو لاکھ بنا لیے۔ حساب وکتاب کے وقت امیر معاویہ نے دو لاکھ کی تحریر سے انکار کیا۔ پھر حکم نامہ لے جانے والے کی خیانت معلوم کرنے کے بعد آپ نے مُہر کا طریقہ ایجاد کیا۔

۱۰: آپ ہی نے مسجد میں چھوٹا سا کمرہ بنوایا۔

۱۱: آپ نے سالانہ غلافِ کعبہ اتارنے کی بنا ڈالی ورنہ پہلے قاعدہ یہ تھا کہ غلاف کے اوپر ہی سالانہ غلاف چڑھا دیا جاتا تھا۔

۱۲: زبیر بن بکار نے اپنی موفقیات میں زہری کے بھتیجے کی زبانی لکھا ہے۔ میں نے چچا زہری سے پوچھا سب سے پہلے بیعت لیتے وقت قسم لینے کا طریقہ کس نے جاری کیا؟ انھوں نے کہا: امیر معاویہ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے بیعت لیتے وقت قسم لینے کا طریقہ جاری کیا۔ اور عبدالملک بن مروان نے بیعت لیتے وقت طلاق اور آزادیٔ غلام پر بھی قسم لینا شروع کر دی۔

عہدِ امیر معاویہ کی فتوحات

مسلمانوں کے نظامِ عسکری کے استحکام و قوت کا شاندار آغاز

فتوحات اور کشور کشائی کے اعتبار سے امیر معاویہ کا دور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ہر اعتبار سے شان دار اور ناقابلِ فراموش ہے۔

قسطنطنیہ اور سندھ پر یلغار

امیر معاویہ کے عہد میں اگرچہ اندرونی جھگڑوں کی وجہ سے بیرونی فتوحات کا دائرہ کچھ زیادہ وسیع نہیں ہوا۔ تاہم مغربی جانب عربی فوجیں قسطنطنیہ پر حملہ کرنے کے لیے بھیجی گئیں اور بحر متوسط (بحیرۂ روم) کے جزائر قبرص اور روڈس پر قبضہ کیا گیا۔

مشرق میں بھی جنگی سرگرمیاں محدود پیمانے پر جاری رہیں۔ عبداللہ بن سوار عبدی نے جو سندھ کی سرحد پر متعین تھا قیقان (قلات) پر حملہ کیا۔

گو رومی اور عربی تاریخوں میں قسطنطنیہ کی طویل جنگ کا ذکر ضرور آتا ہے لیکن وہ محاصرہ کے متعلق کوئی مفصل اور واضح بیان ہمارے سامنے پیش نہیں کرتیں۔ تاہم اغلب گمان یہ ہے کہ اس لشکر نے جو خشکی کی راہ سے حملہ آور ہوا تھا قسطنطنیہ کا محاصرہ ۶۶۷ء میں شروع کیا اور ۶۷۳ء میں عربی بیڑا وہاں سے واپس ہوا۔

محاصرہ کے دوران ہی میں حضرت ابو ایوب خالد بن زید انصاریؓ کی وفات ہو گئی۔ آپ ہی وہ خوش قسمت بزرگ ہیں جنھیں ہجرت کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی میزبانی کا شرف نصیب ہوا۔ آپ کو قسطنطنیہ کی فصیل کے نیچے سپردِ خاک کر دیا گیا۔ یہ مزار اب تک مرجعِ خواص و عوام ہے۔ بعد میں اس کے متصل ایک مسجد بھی بنا دی گئی۔ تمام عثمانی سلاطین کی تاجپوشی کی تقاریب اسی مزار پر بہایت شان و شوکت کے ساتھ منعقد ہوا کرتی تھیں۔

فتوحاتِ افریقیہ

افریقیہ میں بھی امیر معاویہ کو نمایاں فتوحات حاصل ہوئیں۔ ۵۰ھ (۶۷۰ء) میں امیر معاویہ نے عقبہؓ بن نافع کو وہاں کا والی مقرر کیا تھا جو حضرت عمرو بن العاص کے وقت سے برقہ اور زدویلہ میں مقیم تھے جس زمانے میں عمرو بن العاص افریقیہ میں پیش قدمی کر رہے تھے اس وقت عقبہ بن نافع بھی ان کے ساتھ تھے اور انھوں نے افریقی فتوحات میں بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اس علاقے میں بربر کثرت سے آباد تھے۔

افریقیہ میں بھی کاروانِ اسلام برابر بڑھتا رہا:

"اپنی ولایت کے دوران میں عقبہ کو خیال پیدا ہوا کہ اسلامی فوجوں اور ان کے اہل و عیال کے لیے ایک شہر بسایا جائے جو چھاؤنی کا کام بھی دے اور جہاں وہ مقامی باشندوں کی آئے دن کی بغاوتوں سے محفوظ بھی رہ سکیں۔ اس غرض کے لیے وہ جگہ منتخب کی گئی جہاں اب شہر "قیروان" آباد ہے۔ اس جگہ کو صاف کر کے شہر کی بنیاد ڈالی گئی۔ پہلے جامع مسجد اور دیگر مساجد تعمیر کی گئیں۔ اور پھر محلّے آباد کیے گیے۔ شہر کی تعمیر ۵۰ھ (۶۷۵ء) میں ختم ہوئی اس کی تعمیر کے دوران میں بھی عقبہ نے اردگرد کے علاقوں میں پیشِ قدمی جاری رکھی اور کئی قبائل کو مطیع کیا۔ اس دوران میں بربریوں نے بکثرت اسلام قبول کیا۔ اس طرح نہ صرف اسلامی سلطنت میں توسیع ہوئی بلکہ قیروان کا شہر آباد ہونے اور وہاں اسلامی فوجوں کے قیام سے مسلمانوں کو آئے دن کی شورشوں سے نجات مل گئی وہ افریقیہ میں اطمینان سے رہنے لگے اور اسلام کی طاقت مضبوط ہو گئی۔

غرض نگاہِ غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ امیر معاویہ نے اپنے عہد میں کشورستانی اور شہریاری کا جو سلسلہ شروع کیا وہ محکم اور مستحکم نظامِ عسکری پر مبنی تھا۔ اور یہی ان کی کامیابی کا بہت بڑا راز تھا۔

امیر معاویہ کے عہدِ حکومت پر بحث اور گفتگو کرتے ہوئے اس حقیقت کو نظر کے سامنے رکھنا چاہیے کہ انھیں خلفائے راشدین کے مقابلے میں نہ لایا جائے۔ خلفائے راشدین کی حکومت اس حکومت کا نمونہ کامل تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے۔ یعنی دوسرے الفاظ میں یہ حکومت قرآن اور سنت کی تھی لیکن اس کے برعکس امیر معاویہ کی حکومت بادشاہت تھی اور اس اعتبار سے اگر غور کیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ ان کی بادشاہت وقت کی دوسری بادشاہتوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ارفع و اعلیٰ اور بہتر و برتر تھی۔ اس فرق کو اگر ملحوظِ خاطر رکھا جائے تو بہت سی غلط فہمیاں خود بخود دور ہو جائیں گی۔ دشواری جو کچھ پیش آتی ہے وہ خلفائے راشدین سے تقابل میں پیش آتی ہے۔ لیکن اگر تقابل نہ کیا جائے تو پھر کوئی دشواری باقی نہیں رہتی۔ بلکہ صورتِ احوال اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔

یزید کی ولیعہدی

تاریخ اسلام کا ایک حادثہ

ایک لمحۂ فکریہ!

عمر ابو النصر نے اپنی کتاب معاویہ بن ابی سفیان میں حضرت امام حسن کی دستبرداری خلافت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

امیر معاویہ سے حضرت حسن کی شرط

آپ نے امیر معاویہ سے صلح کر لی اور اس شرط پر خلافت سے دستبرداری قبول کر لی کہ امیر معاویہ کی وفات کے بعد خلافت کا مسئلہ مسلمانوں کے باہمی مشورے سے طے کیا جائے گا۔ اور جس شخص پر عامۃ المسلمین کا اتفاق ہوگا وہی خلافت کی مسند پر بیٹھنے کا مستحق ہوگا۔

لیکن اس شرط پر عمل درآمد نہ ہوسکا، امیر معاویہ نے معاملہ امّت کی صوابدید پر نہیں چھوڑا۔ بلکہ اپنی زندگی میں اجلِ صحابہ، اکابر امت اور اعیان و اشرافِ مدینہ کی مخالفت کے باوجود یزید کی ولی عہدی پر کہیں بہ رضا و رغبت، کہیں بہ جبر و اکراہ کہیں ترغیب و ترہیب سے کام لے کر بیعت لے لی۔

طبری، ابن اثیر اور دوسری متداول اور مستند کتابیں سب اس پر متفق ہیں کہ:

"مغیرہ بن شعبہ نے امیر معاویہ کی خیر خواہی میں خلافت کا سلسلہ ان کی نسل میں منتقل کر دینا چاہا۔ چنانچہ یزید کو ادھر توجہ دلائی۔ یزید نے امیر معاویہ سے اس کا تذکرہ کیا، یہ ان کے دل کی بات تھی۔ لیکن اسے وہ ناممکن العمل سمجھ کر زبان سے نہ کہہ سکتے تھے مغیرہ کی تجویز پر اس کا موقع مل گیا چنانچہ مغیرہ کو بلا کر ان سے مشورہ کیا۔ انھوں نے کہا:

"عثمانؓ کی شہادت کے بعد سے مسلمانوں میں جو اختلاف اور خوں ریزی قائم ہے وہ آپ کی نگاہوں کے سامنے ہے اس لیے میری رائے میں یزید کی ولی عہدی کی بیعت لے کر اسے جانشین بنا دینا چاہیے تاکہ جب آپ کا وقت آ جائے تو مسلمانوں کا ایک سہارا اور جانشین موجود رہے۔ اور ان میں خونریزی اور فتنہ وفساد برپا نہ ہو"

گو امیر معاویہ کی دلی آرزو تھی، لیکن اس کی مشکلات کا انھیں پورا پورا احساس تھا چنانچہ انھوں نے مغیرہ سے پوچھا۔ اس مہم کو انجام کون دے گا۔ اُس وقت سیاسی حیثیت سے کوفہ وبصرہ اور مذہبی حیثیت سے حجاز مسلمانوں کے مرکز تھے۔ انہی پر اس قسم کی مہمات کا دارومدار تھا۔ مغیرہ نے کہا کوفہ کی ذمہ داری میں لیتا ہوں۔ بصرہ کو زیاد ہموار کر لے گا اور حجاز کی ذمہ داری مروان بن الحکم کے متعلق کی جائے۔

کوفہ میں مغیرہ بن شعبہ کا بڑا اثر تھا اور یہاں بنی امیہ کے حامیوں کی بھی ایک جماعت موجود تھی۔ اس لیے مغیرہ نے کوفہ جا کر یہاں کے چند معززین کا ایک وفد شام بھجوایا اس نے امیر معاویہ کی خدمت میں حاضر ہو کر خود یزید کی ولیعہدی کی تجویز پیش کی۔

زیاد گو امیر معاویہ کا قوت بازو تھا، اور اس کی سخت گیری کے سامنے یہ کوئی بڑا مشکل مسئلہ نہ تھا۔ لیکن اس معاملے میں اسے بھی اپنی ذمہ داری کا احساس ہوا۔ اس نے اپنے معتمد علیہ عبید بن کعب کو بلا کر اسے امیر کا حکم سنایا۔ اور کہا کہ وہ اس معاملے میں لوگوں کی مخالفت سے بھی ڈرتے ہیں اور یزید کی ولیعہدی بھی چاہتے ہیں۔ یہ اسلام کا معاملہ اور بڑی ذمہ داری کا کام ہے، یزید جیسا لاابالی ہے ظاہر ہے اس لیے تم جا کر امیر المومنین کو یزید کے مشاغل سے آگاہ کرو اور انھیں سمجھاؤ کہ وہ جلد بازی سے کام نہ لیں۔ عبید نے کہا امیر کو یزید کی جانب سے بددل کرنا مناسب نہیں ہے۔ میں جا کر خود یزید کو سمجھاتا ہوں کہ وہ اپنے

مشاغل چھوڑ دے کہ لوگوں کو گرفت اور مخالفت کا موقع نہ ملے۔ زیاد نے بھی اس رائے کو پسند کیا۔ چنانچہ عبید نے جاکر یزید کو سمجھایا۔ ان کے سمجھانے سے اس نے بہت سی قابلِ اعتراض باتیں چھوڑ دیں۔

کوفہ اور بصرہ سے زیادہ اہم معاملہ حجاز کا تھا۔ یہاں ایسے متعدد بزرگ موجود تھے جو یزید کے مقابلے میں ہر حیثیت سے خلافت کے زیادہ مستحق اور مدّعی ہو سکتے تھے۔ اور جن کی جانب سے اس تجویز کی مخالفت کا خطرہ تھا۔ اس لیے اس کی ذمّہ داری امیر نے مروان بن حکم کے سپرد کی اور اس کو لکھا:

"اب میں ضعیف ہو گیا ہوں، میرے قویٰ کمزور ہو گئے ہیں، معلوم نہیں کب وقت آجائے۔ مجھے خوف ہے کہ میرے بعد پھر امت میں اختلاف نہ پیدا ہو جائے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی بھلائی کے لیے اپنی زندگی ہی میں اپنا جانشین بنا جاؤں، اس معاملے میں تمھارا مشورہ ضروری ہے، اس کو اہلِ مدینہ کے سامنے پیش کرو اور وہ جو جواب دیں مجھے لکھو۔"

اس حکم پر مروان نے اس مسئلے کو اہلِ مدینہ کے سامنے پیش کیا۔ امیر معاویہ نے خط میں کسی جانشین کا نام نہیں لکھا تھا۔ بلکہ محض جانشینی کی مجمل تجویز تھی۔ مروان نے اسی کے متعلق رائے لی۔ اس حد تک یہ تجویز نامناسب نہ تھی۔ اس لیے سب نے اس سے اتفاق کیا۔ مروان نے امیر معاویہ کو اس کی اطلاع دی۔ اس کے بعد انھوں نے دوسرا حکم جانشین کے اعلان کا بھیجا۔ اس وقت مروان نے یزید کے نام کا اعلان کیا۔ یہ نام سنتے ہی لوگوں نے اختلاف کیا۔

عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ نے اٹھ کر کہا تم اور معاویہ دونوں غلط کہتے ہو اس سے امّت کی بھلائی مقصود نہیں ہے، بلکہ خلافت کو ہرقل کی شاہنشاہی بنانا چاہتے ہو کہ ایک ہرقل کے بعد دوسرا ہرقل اس کا جانشین ہو۔

ایک روایت یہ ہے کہ مروان نے یہ کہا تھا کہ "ابوبکرؓ و عمرؓ کی طرح یزید کو امیرالمومنین نامزد کر جائیں۔ عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ نے اس کے جواب میں کہا کہ یہ ابی بکرؓ و عمرؓ کی سنّت نہیں

بلکہ قیصر و کسریٰ کا طریقہ ہے۔ اُن دونوں نے اپنے لڑکوں کو ولیعہد نہیں بنایا بلکہ اپنے خاندان والوں تک کو اس سے دُور رکھا۔ یہی حالات مروان نے امیر معاویہ کو لکھ بھیجے۔

اس درمیان میں مدینہ، بصرہ اور مختلف مقاموں کے وفود شام پہنچ چکے تھے۔ امیر معاویہ نے پہلے مدینہ کے ایک بزرگ محمد بن عمرو بن حزم سے گفتگو کی۔ انھوں نے کہا ہر راعی اپنی رعیت کا ذمّہ دار ہے اس لیے جسے آپ امّت کا راعی بناتے ہیں اس پر خوب غور کر لیجیے۔

مدینہ کے وفد کے بعد بصرہ کے رئیس الوفد احنف بن قیس سے جو بڑے مدبّر اور بااثر رئیس تھے رائے طلب کی۔ انھوں نے جواب دیا: اگر ہم سچ کہتے ہیں تو آپ کا ڈر ہے اور جھوٹ بولتے ہیں تو خدا کا خوف ہے۔ آپ یزید کے شب و روز کے مشاغل، اس کے ظاہری و پوشیدہ حالات سے مجھ سے زیادہ واقف ہیں اگر اس کے بعد بھی آپ اس کو امّتِ محمدی کے لیے بہتر سمجھتے ہیں تو پھر اس میں صلاح و مشورہ کی کیا ضرورت ہے اور اگر ایسا نہیں سمجھتے تو خود دوسرے عالم کو جاتے ہوئے اس کو دُنیا کا توشہ نہ دیجیے، ورنہ یوں تو آپ کا جو حکم ہو اس کا سُننا اور بجالانا ہمارا کام ہے۔

لیکن امیر معاویہ یزید کی ولیعہدی طے کر چکے تھے۔ یہ محض رسمی کارروائی تھی اس لیے آخر میں کچھ لوگوں کو ڈرا دھمکا کر اور کچھ کو لطف و کرم سے ہموار کر لیا۔ اور عراق و شام کے باشندوں نے یزید کی بیعت کر لی۔

لیکن اصل معاملہ حجاز کا تھا کہ مہاجرین و انصار کے باقیات اور صحابہ و صحابہ زادے یہیں تھے، اس لیے امیر معاویہ نے خود مکّہ اور مدینہ کا سفر کیا۔ اس وقت یہاں پانچ بزرگ ایسے تھے جن کی جانب سے امیر معاویہ کو مخالفت کا خطرہ تھا۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ، عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، امام حسینؓ اور عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ۔

امیر معاویہ نے ان سب سے الگ الگ مل کر کہا کہ تم پانچوں آدمیوں کے علاوہ سب نے یزید کی ولیعہدی کی بیعت کر لی ہے اور تم چاروں ان کی رہبری کر رہے ہو۔ ان میں عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کے علاوہ ہر ایک نے جواب دیا کہ میں کسی کی رہبری نہیں کر رہا ہوں آپ چاروں

آدمیوں سے کہیے کہ اگر وہ بیعت کرلیں تو مجھے بھی کوئی عذر نہ ہوگا، اس طرح گویا چار آدمیوں سے الگ الگ بیعت کا وعدہ لے لیا۔ عبدالرحمن ابی بکرؓ سے البتہ تلخ گفتگو ہو گئی۔

یہ طبری کی روایت ہے۔ ابن اثیر کا بیان ہے کہ امیر معاویہ کی آمد کی خبر سن کر پانچوں آدمی مدینے سے مکّے چلے گئے۔ امیر معاویہ بھی وہاں پہنچے اور ان سب کو لطف و مدارات اور حسنِ خلق سے مائل کرنے کی کوشش کی۔ ان لوگوں نے فرداً فرداً گفتگو کرنے کے بجائے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو جو سب میں زیادہ تجربہ کار اور گویا تھے اپنا نمائندہ بنایا، امیر معاویہ نے ان سے کہا کہ تم لوگوں کے ساتھ میرا جو طرزِ عمل ہے اور جتنی صلہ رحمی کرتا ہوں اور تمھاری جس قدر باتیں انگیز کرتا ہوں وہ سب تم کو معلوم ہے، یزید تمھارا بھائی اور ابن عم ہے میں چاہتا ہوں کہ تم اسے صرف خلیفہ کا لقب دے دو، باقی حکومت کا تمام نظام، عمال کا عزل و نصب، خراج کی تحصیل و وصول اور اس کا صرف تمھارے ہاتھ میں رہے گا۔

عبداللہ بن زبیرؓ نے جواب دیا کہ انتخابِ خلیفہ کی تین نظیریں ہیں یا تو رسول اللہ صلعم کی طرح کسی کو نامزد نہ کیجیے، مسلمان جسے پسند کریں گے منتخب کرلیں گے یا ابوبکرؓ کی طرح ایسے شخص کو نامزد کیجیے جس کا آپ سے کوئی تعلق نہ ہو۔ یا عمرؓ کی طرح چند آدمیوں میں سے ایک کا انتخاب شوریٰ پر چھوڑ دیجیے۔ اس کے علاوہ کوئی چوتھا طریقہ ہم قبول نہیں کرسکتے۔

امیر معاویہ نے جب دیکھا کہ یہ لوگ آسانی کے ساتھ بیعت کرنے والے نہیں ہیں تو انھیں دھمکی دی کہ اگر تم لوگوں نے کوئی مخالفت کی تو تلوار سے کام لیا جائے گا۔ اور باہر نکل کر مسلمانوں میں اعلان کردیا کہ یہ لوگ مسلمانوں کے سربرآوردہ اور بہترین لوگ ہیں بغیر ان کے مشورے کے کوئی کام انجام نہ دیا جائے گا۔ انھوں نے یزید کی بیعت کرلی ہے اس لیے آپ لوگ بھی بیعت کرلیجیے۔

اہلِ مدینہ انہی لوگوں کے فیصلے کے منتظر تھے اس لیے اس اعلان پر سب نے بیعت کرلی۔ امیر معاویہ کی واپسی کے بعد لوگوں کو اصل واقعے کا علم ہوا، لیکن پھر کسی نے کوئی مخالفت نہیں کی۔

اور اس طرح اسلام میں جو جمہوریت کا داعی تھا شخصی اور موروثی حکومت قائم ہو گئی

جو اسلام کی روح سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ کیونکہ رسالت مآب صلعم اور خلفائے راشدین میں سے کسی نے ایسا نہیں کیا تھا۔

رجب ۶۰ھ میں امیر معاویہ نے ۸۰ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ یزید جسے امیر معاویہ اتنی بڑی حکومت دے گئے تھے، وقتِ مرگ خدمتِ پدر سے محروم رہا۔ وہ موت کا استقبال کر رہے تھے اور وہ سیر و شکار میں مصروف تھا۔ عبرت!

امر واقعہ یہ ہے کہ اگر پیشِ نظر دین اور خدمت نہ ہو صرف حصولِ اقتدار ہو تو انسان ان اقدار کو بھی یکسر فراموش کر دیتا ہے جن پر سوسائٹی کے قیام و بقا کا انحصار اور دار و مدار ہے!

یزید

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے

یزید کی بیعت جبری تھی، اور قبل از وقت تھی۔ اور یہ دونوں چیزیں اصول اور روح اسلام کے منافی تھیں۔ بقول مورخِ اسلام مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی:

"امیر معاویہ کا اپنی زندگی میں یزید کے لیے بیعت لینا ایک سخت غلطی تھی۔ لیکن مغیرہ بن شعبہ کی غلطی ان سے بھی بڑی تھی اس لئے کہ اس غلطی کا خیال اور اس پر عامل ہونے کی جرأت مغیرہ بن شعبہ ہی کی تحریک کا نتیجہ تھا۔ اسی لیے حضرت حسن بصری نے فرمایا تھا:

مغیرہ نے مسلمانوں میں ایسی رسم جاری ہونے کا موقع پیدا کر دیا جس سے مشورہ جاتا رہا۔ اور باپ کے بعد بیٹا بادشاہ ہونے لگا۔"

امام حسینؑ، عبداللہ بن زبیرؓ، عبداللہ بن عمرؓ اور عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ ان حضرات میں سے تھے جنھوں نے جبری اور پیشگی خلافت قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ تخت نشین ہونے کے بعد یزید کو فکر لاحق ہو گئی کہ اگر ان حضرات نے بیعت نہیں کی تو نہ صرف حجاز بلکہ ساری دُنیائے اسلام میں تہلکہ برپا ہو جائے گا۔ سب سے زیادہ اندیشہ امام حسینؑ اور عبداللہ بن

زبیرؓ سے تھا، ایک رسولؐ کا نواسا اور برادرزادہ تھا، دوسرا حواریٔ رسولؐ کا بیٹا اور ابوبکرؓ کا نواسا تھا۔ ان دونوں کی عظمت وجلالت کو سب تسلیم کرتے تھے لہٰذا یزید نے فیصلہ کرلیا کہ ہر قیمت پر ان حضرات سے بیعت لے کر رہے گا۔

یزید کا تاکیدی فرمان بیعت کے لیے

چنانچہ یزید نے حاکمِ مدینہ کو تاکیدی فرمان بھیجا کہ ان حضرات سے بیعت لے لیکن انھوں نے بیعت نہیں کی اور مدینے سے مکّے چلے گئے۔ مکّہ جاکر ابن زبیرؓ حرمِ الٰہی یعنی بیت اللہ میں پناہ گزیں ہو گئے۔ اور امام حسین علیہ السلام نے کوفہ کا رخ کیا، کیونکہ وہاں کے عوام اور عمائد کی طرف سے مسلسل اور بہ کثرت دعوت نامے آرہے تھے کہ آئیے اور ہماری سیادت وامارت قبول کیجیے۔ ہم یزید جیسے شخص کو اپنا امیر تسلیم نہیں کرسکتے۔

امام حسینؓ نے مسلم بن عقیلؓ کو دریافتِ احوال کے لیے کوفہ بھیجا۔ یہاں زیاد بن ابیہ کا بیٹا عبید اللہ بن زیاد حکمراں تھا۔ اس نے باایں ہمہ کہ حضرت مسلمؓ کو گرفتار کرتے وقت امان دے دی تھی انھیں بڑی بے کسی کے ساتھ قتل کردیا۔

امام حسینؓ کا سفر مکہ، کربلا تک

۳۔ ذی الحجہ ۶۰ ہجری کو امام حسین مکّہ سے کوفہ کی طرف مع اہلِ خاندان روانہ ہوئے، راستہ میں مشہور شاعر فرزدق سے ملاقات ہوئی۔ اس نے کہا:

"اہل کوفہ کے دل آپ کے ساتھ ہیں اور تلواریں آپ کے خلاف ہیں۔"

لیکن حضرت امام حسینؓ کی عزیمت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ برابر کوفہ کی طرف بڑھتے رہے۔ اور کربلا میں آکر معتصم ہوئے۔ یہاں یزید کے حکم سے عبید اللہ بن زیاد نے پہلے ہی سے ناکہ بندی اور مقابلے کی تیاری کررکھی تھی۔ امام حسینؓ نے کوفیوں کی بدعہدی دیکھ کر واپس جانا چاہا۔ لیکن عاملانِ یزید کا اصرار تھا کہ بغیر بیعت کیے واپس نہیں کیے جاسکتے۔ حُر ریاحی نے آپ کا راستہ روک رکھا تھا اور عمرو بن سعد اپنی سپاہ لیے آمادۂ جنگ تھا۔ اس نے کہا:

عمرو بن سعد اور امام حسینؓ کے سوال و جواب

بے شک آپ یزید کے مقابلے میں زیادہ مستحق خلافت ہیں لیکن خدا تعالیٰ

کو یہ منظور نہیں کہ آپ کے خاندان میں حکومت وخلافت آئے حضرت علیؓ اور حضرت حسنؓ کے حالات آپ کے سامنے گزر چکے ہیں۔ اگر آپ اس سلطنت وخلافت کے خیال کو چھوڑ دیں تو بڑی آسانی سے آزاد رہ سکتے ہیں ورنہ آپ کی جان کا خطرہ ہے۔ اور ہم لوگ آپ کی گرفتاری پر مامور ہیں۔"

امام حسینؓ کا جواب

"میں اس وقت تین باتیں پیش کرتا ہوں تم ان تین میں سے جس کو چاہو منظور کر لو۔

اوّل تو یہ کہ جس طرف سے میں آیا ہوں اسی طرف مجھ کو واپس جانے دو تاکہ میں مکہ معظمہ میں پہنچ کر عبادتِ الٰہی میں مصروف رہوں۔

دوم یہ کہ مجھ کو کسی سرحد کی طرف نکل جانے دو کہ وہاں کفار کے ساتھ لڑتا ہوا شہید ہو جاؤں۔

سوم یہ کہ تم میرے راستے سے ہٹ جاؤ اور مجھ کو سیدھا یزید کے پاس دمشق کی جانب جانے دو۔ میرے پیچھے پیچھے اپنے اطمینان کی غرض سے تم بھی چل سکتے ہو میں یزید کے پاس جا کر براہ راست اس سے اپنا معاملہ طے کر لوں گا۔"

عمرو بن سعد بھی اسی میدان میں خیمہ زن ہو گیا اور ابن زیاد کو یہ تمام کیفیت لکھ بھیجی۔ لیکن شمر کے مشورے سے ابن زیاد نے جواب بھیجا۔

"یہ تینوں باتیں کسی طرح منظور نہیں ہو سکتیں۔ ہاں صرف ایک صورت قابلِ پذیرائی ہے وہ یہ کہ امام حسینؓ اپنے آپ کو ہمارے سپرد کر دیں اور یزید کی بیعت یعنی اولاً میرے ہاتھ پر کریں، پھر میں یزید کے پاس اپنے اہتمام سے روانہ کر دوں گا۔

اس جواب کے آنے پر عمرو بن سعد نے حضرت امام حسینؓ کو اطلاع دی اور کہا کہ میں مجبور ہوں ابنِ زیاد خلافتِ یزید کی بیعت اوّل اپنے ہاتھ پر چاہتا ہے اور کسی دوسری بات کو منظور نہیں کرتا۔ امام حسینؓ نے کہا کہ ابن زیاد کی بیعت کرنے سے تو مر جانا بہتر ہے۔

ابن زیاد کی عمرو بن سعد کو زجر و توبیخ

ابن سعد اس کوشش میں مصروف تھا کہ کسی طرح کشت وخون نہ ہو یا تو امام حسینؓ ہی ابنِ

زیاد کی شرط کو مان لیں یا ابن زیاد امام حسینؑ کی منشا کے مطابق ان کو جانے کی اجازت دے دے۔ اسی خط و کتابت اور اصرار و انکار میں ایک ہفتے میں امام حسینؑ اور ابن سعد دونوں اپنے اپنے ہمراہیوں کے ساتھ کربلا کے میدان میں خیمہ زن رہے۔ امام حسینؑ کے ساتھی ابن سعد کے لشکریوں کے ساتھ مل کر نمازیں پڑھتے اور حضرت امام حسین علیہ السلام صفوں کو درست کرتے۔ ابن زیاد کے پاس جب یہ خبر پہنچی تو اس کو شک پیدا ہوئی کہ کہیں ابن سعد امام حسینؑ سے سازش نہ کرلے اس نے فوراً ایک چوبدار جویرہ بن تمیمی کو بلایا اور ابن سعد کے نام ایک خط لکھ کر دیا کہ:

"میں نے تم کو حسینؑ ابن علیؑ کی گرفتاری پر مامور کیا تھا تمھارا فرض تھا کہ ان کو گرفتار کر کے میرے پاس لاتے یا گرفتار نہ کر سکتے تو ان کا سر کاٹ کر لاتے۔ میں نے تم کو یہ حکم نہیں دیا تھا کہ تم ان کی مصاحبت اختیار کر کے دوستانہ تعلقات بڑھاؤ۔ اب تمھارے لیے بہتر یہی ہے کہ فوراً بلا تامل اس خط کو پڑھتے ہی یا تو حسینؑ بن علیؑ کو میرے پاس لاؤ ورنہ جنگ کر کے ان کا سر کاٹ کے بھیجو۔ اگر ذرا بھی تامل تم سے سرزد ہوا تو میں نے اپنے سرہنگ کو جو یہ خط لے کر آرہا ہے حکم دیا ہے کہ وہ تم کو گرفتار کر کے میرے پاس پہنچائے اور لشکر وہیں مقیم رہ کر دوسرے سردار کا منتظر رہے جس کو میں تمھاری جگہ مامور کر کے بھیجوں گا۔"

جویرہ یہ خط لے کر جمعرات کے دن ۹ محرم سنہ ۶۱ھ کو ابن سعد کے پاس پہنچا۔ ابن سعد اس وقت اپنے خیمے میں بیٹھا تھا۔ خط کو پڑھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ اور گھوڑے پر سوار ہو کر لشکر کو تیاری کا حکم دیا۔ اور جویرہ بن بدر سے کہا کہ تم گواہ رہنا کہ میں نے امیر کا حکم پڑھتے ہی اس کی تعمیل کی ہے۔ پھر صفوف جنگ آراستہ کر کے جویرہ کو ہمراہ لے کر آگے بڑھا۔ اور امام حسینؑ کو سامنے بلوا کر کہا کہ امیر ابن زیاد کا یہ حکم آیا ہے اگر میں اس کی تعمیل میں ذرا بھی دیر کروں تو یہ قاصد موجود ہے جس کو حکم دیا گیا ہے کہ فوراً مجھ کو قید کرلے۔ امام حسینؑ نے کہا کہ مجھے کل تک کے لیے سوچنے کی اور مہلت دو۔ ابن سعد نے جویرہ کی طرف دیکھا، اس نے کہا کہ کل کچھ دور نہیں ہے اتنی مہلت دے دینی چاہیے۔

ابن سعد میدان سے واپس آیا۔ اور فوج کو حکم دیا کہ کمر کھول دو آج کوئی لڑائی نہ ہوگی۔

ابن زیاد اور شمر ذی الجوشن

عبید اللہ ابن زیاد نے جویرہ بن بدر کے ہاتھ یہ حکم روانہ کرنے کے بعد سوچا کہ اگر ابن سعد نے سُستی کی اور جویرہ نے اس کو قید کر لیا تو فوج بغیر افسر کے رہ کر منتشر ہو جائے گی اور ممکن ہے کہ امام حسینؑ ہی سے جا ملے اس صورت میں ضرور دقت و پریشانی کا سامنا ہوگا اور امام حسینؑ کو موقع مل جائے گا کہ وہ مکہ کی طرف روانہ ہو جائیں اور قابو میں آئے ہوئے نکل جائیں۔

چنانچہ اس نے فوراً شمر ذی الجوشن کو بلوایا اور کہا کہ میں جویرہ کو بھیج چکا ہوں اور اسے حکم دے دیا ہے کہ اگر ابن سعد لڑائی میں تامل کرے تو اس کو گرفتار کر کے لے آئے۔ ابن سعد کی طرف سے مجھ کو منافقت کا شبہ ہے۔ اگر جویرہ نے ابن سعد کو گرفتار کر لیا تو فوج جو میدان میں پڑی ہوئی ہے سب آوارہ اور ضائع ہو جائے گی، میں تجھ سے بہتر اس کام کے لیے دوسرا شخص نہیں پاتا تو فوراً میدانِ کربلا کی طرف جا اگر ابن سعد گرفتار ہو چکا ہو تو فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لے اور امام حسینؑ سے لڑ کر ان کا سر کاٹ لا۔ اگر ابن سعد گرفتار نہ ہوا ہو اور لڑائی میں تامل کر رہا ہو تو فوراً جاتے ہی لڑائی چھیڑ دے۔ اور کام کو جلدی ختم کر دے۔

شمر ذی الجوشن نے کہا کہ میری ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ آپ کو معلوم ہے کہ میری بہن ام البنین بنتِ حرام حضرت علیؑ کی بیوی تھیں جن کے بطن سے حضرت علیؑ کے چار بیٹے عبداللہ، جعفر، عثمان اور عباس پیدا ہوئے۔ میرے یہ چاروں بھانجے بھی اپنے بھائی حسینؑ کے ہمراہ میدانِ کربلا میں موجود ہیں۔ آپ ان چاروں کو جان کی امان دے دیں۔ ابن زیاد نے اسی وقت کاغذ منگا کر چاروں کے لیے امان نامہ لکھ کر اور مہر لگا کر شمر ذی الجوشن کے سپرد کیا اور اسی وقت اس کو رخصت کر دیا۔

جویرہ رات کے وقت روانہ ہوا تھا اور جمعرات کے دن علی الصباح لشکر گاہِ کربلا میں پہنچ گیا تھا۔ شمر صبح کے وقت روانہ ہوا اور عصر کے وقت پہنچا۔ شمر کے آنے پر تمام کیفیت

جو پیش آئی تھی سنا دی۔ شمر نے کہا میں ایک لمحہ کی بھی مہلت نہ دوں گا۔ یا تو اسی وقت لڑائی کے لیے مستعد ہو جاؤ ورنہ لشکر میرے سپرد کر دو۔ ابن سعد اسی وقت سوار ہوا اور شمر کو ہمراہ لے کر امام حسینؑ کے پاس آیا اور کہا کہ عبید اللہ بن زیاد نے یہ دوسرا قاصد بھیجا ہے اور مہلت آپ کو بالکل نہیں دینا چاہتا۔

امام حسینؑ نے کہا سبحان اللہ! اب مہلت کے دینے یا نہ دینے کی کیا ضرورت ہے آفتاب تو غروب ہو رہا ہے کیا رات کے وقت بھی تم لوگ جنگ کو کل کے لیے ملتوی نہ رکھو گے یہ سن کر شمر ذی الجوشن نے بھی کل صبح تک کا انتظار مناسب سمجھا۔ اور دونوں اپنے فرودگاہ کو واپس چلے آئے۔

پانی بند کرنے کیلیے ابن زیاد کا حکم رات کے وقت عبید اللہ بن زیاد کا حکم پہنچا کہ اگر ابھی لڑائی شروع نہیں ہوئی ہے تو اسی وقت جب کہ یہ حکم پہنچے پانی پر قبضہ کر لو۔ اور حسین بن علیؑ اور ان کے ساتھیوں کے لیے پانی بند کر دو۔ اگر سپاہ شمر کے زیر کمان آ گئی ہے تو شمر کو اس حکم کی تعمیل کرنی چاہیے۔

عمرو بن سعد نے اس حکم کے پہنچتے ہی عمرو بن الحجاج کو پانچسو سوار دے کر ساحل فرات پر متعین کر دیا۔ اتفاقاً دن میں امام حسینؑ کے ہمراہیوں نے اپنے لیے پانی نہیں بھرا تھا ان کا تمام پانی ختم ہو چکا تھا۔ رات کو جب پانی بھرنا چاہا تو معلوم ہوا کہ دشمنوں نے پانی پر قبضہ کر لیا ہے۔ امام حسینؑ نے اپنے بھائی عباس بن علیؑ کو پچاس آدمیوں کے ہمراہ پانی لینے کے لیے بھیجا کہ زبردستی پانی لائیں مگر ظالموں نے پانی نہ لینے دیا۔ اب دم بدم پیاس کی شدت نے تکلیف پہنچانی شروع کی۔ یہ ایسی اذیت تھی جو تیر و شمشیر کی اذیت سے زیادہ سوہانِ روح تھی۔ امام حسین علیہ السلام کے چھوٹے بیٹے علی بن حسینؑ بیمار تھے اور خیمے میں پڑے رہتے تھے۔ وہ اور ان کی بہن ام کلثوم یہ دیکھ کر کہ صبح کو دشمنوں کا حملہ ہو گا اور تمام عزیز و اقارب جو اس وقت موجود ہیں شہید ہوں گے، رونے لگے۔ رونے کی آواز سن کر حضرت امام حسینؑ خیمہ کے اندر آئے اور کہا کہ دشمن ہمارے قریب ہی خیمہ زن ہے تمہارے رونے کی آواز سن کر وہ خوش ہوں گے اور ہمراہیوں کے دل تھوڑے ہوں گے تم کو ہرگز غمگین نہ

ہونا چاہیے۔

ساتھیوں سے امام حسینؑ کا خطاب

اس کے بعد حضرت امام حسینؓ نے اپنے ہمراہیوں کو اپنے سامنے بلا کر کہا کہ تم لوگ یہاں سے جس طرف کو مناسب سمجھو چلے جاؤ تم کو کوئی کچھ نہ کہے گا کیونکہ دشمنوں کو صرف میری ذات سے بحث ہے۔ تمھارے چلے جانے کو تو وہ اور بھی غنیمت سمجھیں گے۔ میں تم سب کو اجازت دیتا ہوں کہ اپنی اپنی جان بچالو۔ ہمراہیوں نے یہ سن کر کہا کہ ہم ہرگز ہرگز آپ کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے۔ ہم سب آپ کے اوپر قربان ہو جائیں گے۔ اور جب تک ہمارے دم میں دم ہے آپ کو آزار نہ پہنچنے دیں گے۔

امام حسینؑ سے ایک استدعا اور اس کا جواب

اسی شب تھوڑی دیر کے بعد ایک شخص طرماح بن عدی جو اس نواح میں آیا ہوا تھا حضرت امام حسینؓ اور ابن سعد کے لشکروں کا حال سن کر امام حسینؑ کے پاس آیا اور کہا کہ آپ میرے ساتھ تنہا چلیں۔ میں آپ کو ایک ایسے راستے سے لے چلوں گا کہ کسی کو مطلق اطلاع نہ ہو سکے گی۔ اور اپنے قبیلہ بنی طے میں لے جا کر پانچ ہزار آدمی اپنے قبیلے کے آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ آپ اُن پانچ ہزار سے جو چاہیں کام لیں۔

امام حسینؓ نے کہا کہ میں نے ابھی ان سب سے کہا تھا کہ مجھ کو تنہا چھوڑ کر تم سب چلے جاؤ تو انھوں نے اس بات کو گوارا نہیں کیا۔ اب یہ کیسے ممکن ہے کہ میں ان سب کو چھوڑ کر تنہا اپنی جان بچا کر نکل جاؤں، ان کے ہمراہیوں نے کہا کہ ہم لوگوں کو تو وہ کچھ کہیں گے نہیں جیسا کہ آپ ابھی فرما چکے ہیں وہ تو تنہا آپ کے دشمن ہیں لہٰذا آپ اپنی جان بچانے کے لیے نکل جائیں۔ امام حسینؓ نے فرمایا کہ عزیزوں اور قریبی رشتہ داروں کے بغیر کوئی چیز بھی گوارا نہیں ہو سکتی۔ میں بغیر آپ لوگوں کی معیت کے اپنی جان بچانے کے لیے ہرگز نہ جاؤں گا چنانچہ اس شخص کو شکریہ کے ساتھ واپس کر دیا۔

ابن زیاد کی امان سے خدا کی امان بہتر ہے

جب صبح ہوئی تو شمر ذی الجوشن اور عمر و بن سعد صفوفِ لشکر کو آراستہ کر کے میدان میں آئے

حضرت امام حسینؓ نے بھی اپنے ساتھیوں کو مناسب ہدایات کے ساتھ متعین کیا۔ شمر ذی الجوشن نے عبداللہ، جعفرؓ، عثمان اور عباس کو میدان میں بلوا کر کہا کہ تم کو امیر ابن زیاد نے امان دے دی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ ابن زیاد کی امان سے خدا کی امان بہتر ہے۔ شمر اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ ایک صحیح روایت کے مطابق آپ کے ہمراہ اس وقت بہتر آدمی تھے۔ بعض روایات کے مطابق ایک سو چالیس اور بعض کی مطابق دو سو چالیس تھے۔ بہر حال اگر بڑی سے بڑی تعداد دو سو چالیس بھی تسلیم کر لی جائے تو بھی دشمنوں کی ہزار ہا جرار افواج کے مقابلے میں امام حسینؓ کے ساتھی کوئی حقیقت نہ رکھتے تھے۔

حضرت امام حسینؓ کا اتمام حجت

امام حسین علیہ السلام اپنے ہمراہیوں کو مناسب مقامات پر کھڑا کر کے اور ضروری ہدایتیں فرما کر اونٹ پر سوار ہوئے اور کوفی لشکر کے سامنے تنہا گئے۔ ان لوگوں کو بلند آواز سے مخاطب کر کے ایک تقریر شروع کی۔ اور فرمایا کہ اے کوفیو! گو یہ تقریر کوئی نتیجہ میرے لیے اس وقت پیدا نہ کرے گی اور تم کو جو کچھ کرنا ہے تم اس سے باز نہ آؤ گے۔ لیکن میں مناسب سمجھتا ہوں کہ خدا تعالیٰ کی حجت تم پر پوری ہو جائے اور میرا عذر بھی ظاہر ہو جائے۔

لوگو! ___ تم میں سے ہر ایک شخص جو مجھ سے واقف ہے اور ہر ایک وہ شخص بھی جو مجھ کو نہیں جانتا اچھی طرح آگاہ ہو جائے کہ میں آنحضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا نواسا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا بیٹا ہوں حضرت فاطمہؓ خاتونِ جنت میری ماں اور جعفر طیارؓ میرے چچا تھے۔ اس فخر نسبی کے علاوہ مجھ کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ آنحضرتؐ نے مجھ کو اور میرے بھائی حسنؓ کو جوانانِ اہلِ جنت کا سردار بتایا ہے۔ اگر تم کو میری بات کا یقین نہ ہو تو ابھی آنحضرت صلعم کے بہت سے صحابیؓ زندہ ہیں تم اُن سے میری اس بات کی تصدیق کر سکتے ہو۔ میں نے کبھی وعدہ خلافی نہیں کی۔ میں نے کبھی نماز قضا نہیں کی اور نہ میں نے کسی مومن کو قتل کیا نہ آزار پہنچایا۔ اگر عیسیٰؑ کا گدھا بھی باقی ہوتا تو تمام عیسائی قیامت تک اس گدھے کی پرورش اور نگہداشت میں مصروف رہتے۔ تم کیسے مسلمان اور کیسے امتی ہو کہ اپنے رسولؐ کے نواسے کو قتل

کرنا چاہتے ہو نہ تم کو خدا کا خوف ہے نہ رسولؐ کی شرم ہے۔ میں نے ساری عمر کسی شخص کو بھی قتل نہیں کیا۔ تو ظاہر ہے کہ مجھ پر کسی کا قصاص بھی نہیں۔ پھر بتاؤ کہ تم نے میرے خون کو کس طرح حلال سمجھ لیا ہے۔ میں دُنیا کے جھگڑوں سے آزاد ہو کر مدینہ میں آنحضرت صلعم کے قدموں میں پڑا تھا۔ تم نے وہاں بھی مجھ کو نہ رہنے دیا۔ پھر مکہ معظمہ میں خانۂ خدا میں مصروفِ عبادت تھا۔ تم کوفیوں نے وہاں بھی مجھ کو چین نہ لینے دیا۔ اور میرے پاس مسلسل خطوط بھیجے کہ ہم تم کو امامت کا حق دار سمجھتے اور تمھارے ہاتھ پر بیعت خلافت کرنا چاہتے ہیں۔ جب تمھاری دعوت پر میں یہاں آیا تو اب تم مجھ سے برگشتہ ہو گئے۔"

اس تقریر کو سن کر سب خاموش رہے اور کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ تھوڑی دیر بعد انتظار کرنے کے بعد حضرت امام حسینؓ نے فرمایا:

"خدا کا شکر ہے کہ میں نے تم پر حجت پوری کر دی۔ اور اب تم کوئی عذر پیش نہیں کر سکتے۔"

اہلِ کوفہ سے تخاطب

پھر آپ نے ایک ایک کا نام لے کر آواز دی:

"اے شیث بن ربعی۔ اے حجاج بن الحسن۔ اے قیس بن الاشعث۔ اے حُر بن یزید تمیمی۔ اے فلاں ابن فلاں کیا تم نے مجھ کو خطوط نہیں لکھے تھے اور مجھ کو بہ اصرار یہاں نہیں بلوایا تھا؟ اور اب جب کہ میں آیا ہوں تو تم مجھ کو قتل کرنے پر آمادہ ہو۔"

یہ سن کر ان سب لوگوں نے کہا کہ ہم نے آپ کو کوئی خط نہیں لکھا اور نہ آپ کو بلایا۔ حضرت امام حسینؓ نے وہ خطوط نکالے اور الگ الگ پڑھ کر سنائے کہ یہ تمھارے خطوط ہیں۔ انھوں نے کہا کہ خواہ ہم نے یہ خطوط بھیجے یا نہیں بھیجے مگر اب ہم علی الاعلان آپ سے اپنی بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔

یہ سن کر امام حسین علیہ السلام اونٹ سے اترے اور گھوڑے پر سوار ہو کر لڑائی کے لیے تیار ہو گئے۔ کوفی لشکر سے اول ایک شخص میدان میں مقابلے کی غرض سے نکلا مگر اس کا گھوڑا

ایسا بدکا کہ وہ گھوڑے سے گرا اور گر کر مر گیا۔

حُر خدمتِ امام میں

اس کیفیت کو دیکھ کر حُر بن یزید تمیمی اس انداز سے جیسے کوئی حملہ آور ہوتا ہے اپنی ڈھال سامنے کر کے اور گھوڑا دوڑا کر امام حسینؓ کے پاس آیا اور ڈھال پھینک دی حضرت حسینؓ نے پوچھا تو کس لیے آیا ہے اس نے کہا کہ میں وہ شخص ہوں جس نے آپ کو ہر طرف سے گھیرا اور روک کر واپس نہ جانے دیا۔ اور اس میدان میں قیام کرنے پر مجبور کیا۔ میں اپنی اس خطا کی تلافی میں اب آپ کی طرف سے کوفیوں کا مقابلہ کروں گا آپ میرے لیے مغفرت کی دعا کریں۔ امام حسینؓ نے اس کو دعا دی اور بہت خوش ہوئے۔

دُنیا کی سب سے زیادہ عجیب جنگ

شمر ذی الجوشن نے عمرو بن سعد سے کہا کہ اب دیر کیوں کر رہے ہو؟ عمرو بن سعد نے فوراً ایک تیر کمان میں جوڑ کر حضرت امام حسین علیہ السلام کے لشکر کی طرف پھینکا اور کہا تم گواہ رہنا کہ سب سے پہلا تیر میں نے چلایا ہے۔ اس کے بعد کوفیوں کے لشکر سے دو آدمی نکلے۔ امام حسینؓ کی طرف سے ایک بہادر نے مقابلے پر جا کر دونوں کو قتل کر دیا۔ پھر اسی طرح لڑائی کا سلسلہ جاری ہوا دیر تک مبارزہ کی لڑائی ہوتی رہی اور اس میں کوفیوں کے آدمی زیادہ مارے گئے۔ پھر اس کے بعد امام حسینؓ کی طرف سے ایک ایک آدمی نے کوفیوں کی صفوں پر حملہ کرنا شروع کیا۔ اس طرح بہت سے کوفیوں کا نقصان ہوا۔ حضرت امام حسینؓ کے ہمراہیوں نے آلِ ابی طالب کو اس وقت تک میدان میں نہ نکلنے دیا جب تک کہ وہ ایک ایک کر کے سب کے سب نہ مارے گئے۔ آخر میں مسلم بن عقیل کے بیٹوں نے آلِ علیؓ پر سبقت کی۔ ان کے بعد حضرت امام حسینؓ کے بیٹے علی اکبر نے دشمنوں پر رستمانہ حملے کیے اور بہت سے دشمنوں کو ہلاک کرنے کے بعد خود بھی شہید ہو گئے پھر آپ کے بھائی عبداللہ، محمد، جعفر اور عثمان نے دشمنوں پر حملہ کیا اور بہت سے دشمنوں کو مار کر خود بھی ایک ہی جگہ ڈھیر ہو گئے۔ آخر میں امام حسنؓ کے ایک نو عمر بیٹے قاسم بن حسن نے حملہ کیا اور وہ بھی مارے گئے۔ غرضکہ امام حسینؓ کے لیے کربلا میں اپنی شہادت اور دوسری تمام مصیبتوں سے بڑھ کر مصیبت یہ تھی کہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے اپنے بھائیوں اور بیٹوں کو شہید ہوتے ہوئے

اور اپنی بہنوں اور بیٹیوں کو ان روح فرسا مناظر کا تماشا دیکھتے ہوئے دیکھا۔ امام حسینؑ کے ہمراہیوں اور خاندان والوں نے اپنی بہادری کے نمونے دکھائے تو دوسری طرف وفاداری جاں نثاری کی بھی انتہا کر دی۔ نہ کسی شخص نے کمزوری و بزدلی کا اظہار کیا نہ بے وفائی و تن آسانی کا الزام اپنے اوپر لیا۔ حضرت امام حسینؑ سب سے آخر میں تنہا رہ گئے تھے خیمے میں عورتوں کے سوا صرف علی اوسط معروف بہ زین العابدین جو بیمار اور چھوٹے تھے باقی رہ گئے تھے۔

ابن زیاد کا سفاکانہ حکم

عبید اللہ بن زیاد نے یہ بھی حکم بھیج دیا تھا کہ امام حسینؑ کا سر مبارک کاٹ کر ان کی لاش گھوڑوں سے یہاں تک پامال کرائی جائے کہ ہر ایک عضو ٹوٹ جائے۔

امام حسینؑ کی شہادت

حضرت امام حسینؑ نے تنہا رہ جانے کے بعد جس بہادری و جواں مردی کے ساتھ دشمنوں پر حملے کیے ہیں ان حملوں کی شان دیکھنے والا ان کے ہمراہیوں میں سے کوئی نہ تھا مگر عمرو بن سعد اور شمر ذی الجوشن آپس میں ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ ہم نے آج تک ایسا بہادر و جری انسان نہیں دیکھا۔ اس غم کی داستان اور روح کو مضمحل کر دینے والی کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت امام حسینؑ کے جسم پر پینتالیس زخم تیر کے تھے مگر آپ برابر دشمنوں کا مقابلہ کیے جا رہے تھے۔ ایک دوسری روایت کے مطابق ۳۳ زخم نیزے کے اور ۳۴ زخم تلوار کے تھے۔ اور تیروں کے زخم ان کے علاوہ تھے۔ شروع میں آپ گھوڑے پر سوار ہو کر حملہ آور ہوتے رہے تھے لیکن جب گھوڑا مارا گیا تو پھر پیدل لڑنے لگے۔ دشمنوں میں کوئی شخص بھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ امام حسینؑ میرے ہاتھ سے شہید ہوں بلکہ ہر شخص آپ کے مقابلے سے بچتا اور طرح دیتا تھا۔ آخر شمر ذی الجوشن نے چھ شخصوں کو ہمراہ لے کر آپ پر حملہ کیا۔ ان میں سے ایک نے شمشیر کا ایسا وار کیا کہ امام حسین علیہ السلام کا بایاں ہاتھ کٹ کر الگ گر پڑا۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے اس پر جوابی وار کرنا چاہا لیکن آپ کا داہنا ہاتھ بھی اس قدر مجروح ہو چکا تھا کہ تلوار نہ اٹھا سکے۔ پیچھے سے سنان بن انس نخعی نے آپ

کے نیزہ مارا جو شکمِ مبارک کے پار ہو گیا۔ آپ نیزے کا یہ زخم کھا کر گرے، اس نے نیزہ کھینچا اور ساتھ ہی آپ کی رُوح بھی پرواز کر گئی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون!

جسدِ مبارک کی بے حرمتی

اس کے بعد شمر نے یا شمر کے حکم سے کسی دوسرے شخص نے حضرت امام حسین علیہ السلام کا سر جسم سے جُدا کیا اور عبید اللہ بن زیاد کے حکم کی تعمیل کے لیے بارہ سوار متعین کیے گئے۔ انھوں نے گھوڑوں کی ٹاپوں سے آپ کے جسدِ مبارک کو خوب کچلوایا۔ پھر خیموں کو لوٹا، آپ کے اہلِ بیت کو گرفتار کیا۔

قافلۂ حسینی شام میں

حادثۂ شہادت۔ ۱۰ محرم الحرام ۶۱ھ (ستمبر ۶۸۰ء) کو پیش آیا۔ معرکۂ کربلا میں ۷۲ نفوسِ قدسی شریک تھے۔ ان میں بیس افراد بنو ہاشم کے مہر و ماہ تھے۔

شہادت کے بعد امام حسین علیہ السلام کا سرِ مبارک ابن زیاد کے پاس کوفہ بھیج دیا گیا۔ اور قافلۂ حسینؓ کی مخدرات اور طفلِ بیمار امام زین العابدین کو یزید کے پاس شام بھیج دیا۔ اس حادثے کی اطلاع جب یزید کو ملی تو وہ بھی اپنے آنسو ضبط نہ کر سکا۔

اُمّ المومنین اُمِّ سلمٰی کا خواب

سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں لکھا ہے:

ترمذی نے سلمیٰؓ کی زبانی لکھا ہے میں ایک دن حضرت ام سلمیٰ رضؓ کے پاس گیا وہ رو رہی تھیں۔ میں نے وجہ پوچھی تو فرمایا۔ رات میں نے رسول اللہ صلعم کو اس طرح دیکھا گویا ان کا سر اور داڑھی گرد آلود ہے۔ میں نے پوچھا یا رسولؐ اللہ! کیا بات ہے؟ ارشاد فرمایا میں نے ابھی حسینؓ کو شہید ہوتے دیکھا ہے۔

بیہقی نے دلائل میں ابن عباسؓ کی زبانی لکھا ہے۔ میں نے رسول اللہ صلعم کو ٹھیک دوپہر کے وقت دیکھا کہ وہ پراگندہ مو غبار آلود ہیں اور آپ کے دستِ مبارک میں ایک شیشی ہے جس میں خون ہے۔ میں نے کہا میرے ماں باپ آپؐ پہ قربان یا رسول اللہ صلعم یہ کیا چیز ہے۔ فرمایا یہ حسینؓ اور ان کے ساتھیوں کا خون ہے جو آج دن بھر جمع کرتا رہا ہوں۔ لوگوں نے اس خواب کے دن کا حساب لگایا تو وہ شہادت کا دن نکلا۔

بہرحال تاریخ کا ایک بہت بڑا المیہ بالآخر اس طرح انجام کو پہنچ گیا۔

مدینۂ رسولؐ اور خانۂ خدا کی بے حرمتی عہدِ یزید کے واقعات میں مدینۂ رسولؐ کی تاراجی اور خانۂ خدا پر سنگ باری بھی شامل ہے۔ جس کی ضروری تفصیل کسی دوسرے موقع پر آئے گی۔

یزید کی وفات ربیع الاوّل ۶۴ھ میں بمقام حوران یزید کا انتقال ہو گیا۔ عمر ۳۸ سال۔ مدتِ حکومت پونے چار سال۔

ایک جائزہ اس مختصر سی مدت میں یزید مسندِ حکومت پر بھی متمکن ہوا۔ قتلِ حسینؓ سے ہاتھ بھی رنگے، مدینۂ منوّرہ کو تاراج بھی کیا، خانۂ خدا پر سنگ باری کا موجب بھی بنا اور زندگی کی صرف ۳۸ بہاریں دیکھ کر اس دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو کر احکم الحاکمین کے دربار میں پہنچ گیا۔

معاویہ بن یزید[1]

تختِ حکومت سے دستبرداری

خاندانِ یزید کا خاتمہ

جس خاندان کے استحکام اور بقائے دوام اور اقتدارِ عام کے لیے اتنی خونریزیاں ہوئیں پانچ سال بھی تختِ حکومت پر متمکن نہ رہ سکا۔

معاویہ بن یزید کا اعلان یزید کی موت کے بعد ربیع اوّل سنہ ۶۴ھ میں اس کا نوجوان لڑکا معاویہ تخت نشین ہوا۔ اس وقت اس کی عمر اکیس سال کی تھی۔ لیکن بڑا دین دار اور صالح تھا۔ یزید کے زمانے میں جو حوادث و واقعات پیش آئے انھیں دیکھ کر معاویہ کا دل حکومت و سلطنت سے پھر گیا تھا۔ اس لیے تین مہینے کے بعد وہ تختِ حکومت سے دست بردار ہو گیا۔ اور مسلمانوں کے سامنے تقریر کی :

"مجھ میں حکومت کا بار اٹھانے کی طاقت نہیں ہے۔ میں نے چاہا تھا کہ ابوبکرؓ کی طرح کسی کو اپنا جانشین بنا دوں یا عمرؓ کی طرح چھ آدمیوں کو نامزد کر کے ان میں سے کسی ایک کا انتخاب شوریٰ پر چھوڑ دوں لیکن نہ عمرؓ جیسا کوئی نظر آیا اور نہ

۱: سنہ ۶۴ھ مطابق سنہ ۶۸۳ء)

ویسے چھ آدمی ملے، اس لیے میں اس منصب سے دست بردار ہوتا ہوں تم لوگ جسے چاہو اپنا خلیفہ بنالو۔"

ایک طرف یزید کا طرزِ عمل ہے کہ اس نے حصولِ اقتدار کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ دوسری طرف معاویہ بن یزید کا کردار ہے کہ سب کچھ پالینے کے بعد بھی خود اپنی مرضی سے دست بردار ہوگیا۔ یزید کو حکومت حاصل کرنے میں بڑی بڑی دشواریاں پیش آئی تھیں لیکن معاویہ بن یزید کے سامنے کوئی دشواری نہیں تھی۔ اسے ایک بنی بنائی مضبوط و مستحکم حکومت ورثے میں ملی تھی۔ لیکن اس کے سینے میں ایک حسّاس دل تھا، وہ اپنی ذمّہ داریوں کو محسوس کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ بارِ گراں جس کی بنیاد خونِ ناحق پر ہے اس کے اٹھائے نہیں اٹھ سکتا۔ اس نے عافیت اسی میں سمجھی کہ اس سے سبک دوش ہو جائے۔

خاندانِ یزید کا خاتمہ تختِ حکومت سے دست بردار ہونے کے بعد معاویہ بن یزید گھر سے باہر نہیں نکلا۔ اور چند ماہ کی مختصر مدّت کے بعد اپنے رب سے جا ملا۔

امیر معاویہ نے اس خاندان کی حکومت قائم کی تھی۔ ان کے پوتے معاویہ بن یزید کی دست برداری نے اس خاندان کا خاتمہ کر دیا۔ معاویہ نے یہ حکومت قائم کی، معاویہ نے یہ حکومت ختم کر دی۔

نظر باز گشت

عہدِ خلافتِ راشدہ کے بعد امیر معاویہ کے ہاتھ میں حکومت آگئی۔ انھوں نے اپنے پیش رَو خلفاء کے برعکس بعض مشیروں کی صلاح سے اس حکومت کو موروثی بنا لیا۔ وہ جمہوریت جو عہدِ رسالت سے اب تک مسلمانوں میں چلی آرہی تھی دفعتہً بادشاہت میں بدل گئی۔ صوری اعتبار سے بھی اور معنوی اعتبار سے بھی!

یہ بادشاہت اگر عہدِ راشدہ کے سو سال بعد آتی تو شاید تاریخ اسلام اتنی تلاطم خیز نہ ہوتی۔ لیکن خلافتِ راشدہ کے معاً بعد اس کا نمودار ہو جانا مسلمانوں کے لیے ناقابلِ برداشت تھا ——!

یہ اقدام اگر مکہؓ یا مدینہ میں کیا جاتا تو ملّتِ اسلامیہ اس پر ہرگز صاد نہ کرتی لیکن اس اقدام کا مرکز ملکِ شام تھا جہاں کے لیے بادشاہت کوئی نئی چیز نہ تھی۔ شام نے اور دوسرے مفتوحہ ممالک نے بہ آسانی اس اقدام کو برداشت کر لیا۔ لیکن مدینۃ الرسولؐ اور بیت اللہ کے باشندے اپنی بے مائگی کے باوجود پوری شدّت کے ساتھ اس کی مخالفت پر اور اسے قبول نہ کرنے پر بضد رہے۔ جس کا انجام دیارِ رسولؐ اور خانۂ خدا کی بے حرمتی کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ اور بے حرمتی بھی ایسی کہ جس کے تصوّر سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

معاویہ بن یزید نے یہ حقیقت محسوس کر لی تھی اس لیے اس نے یہ نادر روزگار تاج جو درحقیقت

کانٹوں کا تاج تھا، سر پر رکھنے سے انکار کر دیا تھا۔

عام مسلمانوں سے قطع نظر خود خاندانِ بنو امیہ کے اصحاب باطن و اصحاب دل بھی جو یزید کے خاندان سے براہ راست تعلق نہیں رکھتے تھے اس حکومت کو اسلامی حکومت ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔

چنانچہ سیوطی نے "تاریخ الخلفاء" میں ایک موقع پر لکھا ہے:

"نوفل بن فرات کا بیان ہے کہ میں عمر بن عبدالعزیز کے پاس بیٹھا ہوا تھا یزید کا ذکر چھڑا تو ایک آدمی نے کہا:

"امیر المومنین یزید بن معاویہ"

یہ سن کر حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز نے فرمایا:

"تو یزید کو امیر المومنین کہتا ہے"

اور پھر اس جرم میں اسے بیس دُرّوں کی سزا دی"

حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز اپنے زہد و تقویٰ، دیانت و راستی کے اعتبار سے نہ صرف اس خاندان کے بلکہ پوری ملّتِ اسلامیہ کے گوہر یک دانہ تھے۔ ان کے عہد حکومت کو بجا طور پر خلافتِ راشدہ سے تشبیہ دی جاتی ہے اور انھیں خلفائے راشدین کے زمرہ میں شامل کیا جاتا ہے۔ ان کے یہ ارشادات اپنے اندر کتنی حقیقت اور معنویت رکھتے ہیں۔

یہ خاندان امیر معاویہ سے شروع ہوا اور معاویہ بن یزید پر ختم ہو گیا۔ امیر معاویہ نے بیس سال امام حسن کی دست برداری کے بعد حکومت کی۔ یزید نے پونے چار سال اور معاویہ بن یزید نے صرف چند ماہ۔ گویا کم و بیش ۲۵ سال میں یہ خاندان ابھرا بھی اور ختم بھی ہو گیا۔ دنیا کی تاریخ میں کسی صاحب سطوت و حشمت حکمراں خاندان کی اتنی مختصر زندگی کی مثال شاید ہی مل سکے۔

معاویہ بن یزید کی دست برداری اور وفات کے بعد تاریخ کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ ترتیب زمانی کو مدّنظر رکھتے ہوئے پہلے ہم عبداللہ بن زبیر کا عہدِ خلافت لیتے ہیں پھر مروان ابن الحکم کے عہدِ حکومت پر ذرا تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

پانچویں منزل

خلافت ابن زبیرؓ

خلافتِ اسلامی کی رُوح باقی رکھنے کی آخری کوشش

شہادتِ حسینؑ کا ردِ عمل

عبداللہ بن زبیرؓ کے ہاتھ پر باشندگانِ حجاز کی بیعت

جن لوگوں نے امیر معاویہ کے سخت و شدید اصرار کے باوجود یزید کی بیعت نہیں کی تھی ان میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ بھی تھے۔ یہ مکہ مکرمہ میں بیت اللہ کے اندر پناہ گزین تھے کہ شہادتِ حسین کی خبر پہنچی۔ اس موقع پر آپ نے ایک تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"لوگو! دنیا میں عراق کے آدمیوں سے بُرے کہیں کے آدمی نہیں ہیں اور عراقیوں میں سب سے بدتر کوفی ہیں کہ انھوں نے بار بار خطوط بھیج کر بہ اصرار امام حسینؑ کو بلایا اور ان کی خلافت کے لیے بیعت کی۔ لیکن جب ابن زیاد کوفہ میں آیا تو اسی کے گرد ہو گئے۔ اور امام حسینؑ کو جو نماز گزار، روزہ دار، قرآن خواں اور ہر طرح مستحقِ خلافت تھے شہید کر دیا اور ذرا بھی خدا کا خوف نہ کیا۔"

یہ کہہ کر عبداللہؓ بن زبیر رو پڑے۔ لوگوں نے کہا کہ اب آپ سے بڑھ کر کوئی مستحقِ خلافت نہیں ہے۔ آپ ہاتھ بڑھائیے ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے اور آپ کو خلیفۂ وقت مانتے ہیں۔ چنانچہ تمام اہلِ مکہ نے عبداللہؓ بن زبیر کے ہاتھ پر بیعتِ خلافت کی۔

یزید نے اس حادثہ سے فارغ ہو کر والیٔ مدینہ عتبہ کو معزول کر دیا اور اپنے ایک دوسرے

بچازاد بھائی عثمان بن محمد بن ابی سفیان کو مدینہ کا حاکم بنا کر بھیج دیا۔

عثمان بن محمدؒ نے مدینہ میں آ کر مے خواری شروع کر دی جس سے لوگ بہت ہی بددل اور ناخوش ہوئے۔ عثمان محرم ۶۲ھ میں مدینہ کا عامل مقرر ہو کر آیا۔ چند روز کے بعد اس نے شرفائے مدینہ سے دس اشخاص منتخب کر کے یزید کے پاس دمشق کی جانب بھیجے۔ اس وفد میں منذر بن زبیر، عبداللہ بن حنظلہ اور عبداللہ بن عمرو بن حفص بن مغیرہ بھی شامل تھے۔ یہ لوگ جب دمشق میں پہنچے تو یزید نے ان کی خوب خاطر مدارات کی اور اوّل الذکر دونوں اشخاص کو ایک ایک لاکھ اور باقی آٹھ اشخاص کو دس دس ہزار درہم انعام دے کر رخصت کیا۔ ان لوگوں نے دمشق میں یزید کو گاتے بجانے کی محفلیں برپا کرتے اور خلافِ شرع کاموں میں مصروف دیکھا۔ واپسی میں سب نے ارادہ کیا کہ یزید کی خلافت کے خلاف کوشش کرنی چاہیے۔ دمشق سے نو شخص تو مدینہ کی طرف واپس آئے تھے اور ایک شخص منذر بن زبیر کوفہ کی طرف چلے گئے۔ کیونکہ عبیداللہ بن زیاد اور منذر بن زبیر کے درمیان دوستی تھی۔ انھوں نے عبیداللہ کی ملاقات کے لئے کوفہ کا عزم کیا تھا۔ جب عبداللہ بن حنظلہ مع ہمراہیوں کے مدینہ میں آئے تو لوگ حالات معلوم کرنے کی غرض سے ان کے گرد جمع ہو گئے۔

یزید کی مخالفت

عبداللہؓ نے کہا کہ یزید ہرگز مستحق خلافت نہیں کیونکہ وہ خلافِ شرع کاموں میں مصروف دیکھا جاتا ہے۔ اس کے مسلمان ہونے میں بھی کلام ہے اس سے تو مسلمانوں کو جہاد کرنا چاہیے۔

ان باتوں کو سن کر لوگ یزید سے بے حد متنفر ہو گئے۔ عبداللہ بن حنظلہ نے تجویز پیش کی کہ یزید کو معزول کر دیا جائے۔ چنانچہ قریش نے عبداللہ بن مطیع کو اور انصار نے عبداللہ بن حنظلہ کو اپنا اپنا سردار منتخب کر کے یزید کی خلافت و حکومت کا انکار کیا۔ عثمان بن محمد و مروان بن حکم اور تمام بنی امیہ جن کی تعداد مدینہ میں ایک ہزار کے قریب ہو گی یہ رنگ دیکھ کر کچھ تو مدینہ سے باہر چلے گئے اور کچھ مروان بن حکم کی حویلی میں پناہ گزیں ہوئے۔ اہلِ مدینہ نے تمام بنو امیہ کو جو ان کے ہاتھ لگے گرفتار و قید کر لیا۔ صرف مروان کے بیٹے عبدالملک کو جو حضرت سعید بن المسیبؓ فقیہ مدینہ کی خدمت میں ہمہ وقت موجود رہتا اور مسجد سے باہر کم نکلتا تھا اور بہت ہی عابد زاہد

نیک سمجھا جاتا تھا کچھ نہیں کہا۔

منذر نے مدینہ واپس پہنچ کر عبداللہ بن حنظلہ اور عبداللہ بن مطیع سے کہا تم کو چاہیے کہ علی بن الحسین (امام زین العابدین) کے ہاتھ پر بیعت خلافت کرو۔ چنانچہ یہ سب مل کر علی بن الحسینؓ کے پاس گئے۔ انھوں نے صاف انکار کیا۔

مروان جو مع دیگر بنی امیہ ایک حویلی میں قید تھا اس نے عبدالملک کے ہاتھ علی بن الحسین کے پاس کہلوا بھیجا کہ آپ نے جو کچھ کیا اچھا ہی کیا۔ ہم اس قدر امداد کے اور خواہاں ہیں کہ ہمارے بعض قیمتی اموال اور اہل وعیال جن کی اس جگہ گنجائش نہیں ہے آپ کے پاس بھجوائے دیتے ہیں آپ ان کی حفاظت کریں۔ علی بن حسینؑ نے اس کو منظور کر لیا۔ مروان بن حکم نے رات کی تاریکی میں پوشیدہ طور پر اپنے اہل وعیال اور قیمتی اموال علی بن الحسینؑ کے پاس ان کے گاؤں میں بھیج دیے۔

اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امام حسینؓ کی شہادت نے عالم اسلام میں، خاص طور پر باشندگان حجاز میں سخت اضطراب پیدا کر دیا تھا۔ اس موقع پر اگر امام زین العابدین میدان میں آتے تو ان کی کامیابی قطعی طور پر یقینی تھی۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ دعوائے خلافت نہیں کیا بلکہ ان لوگوں کی مدد سے بھی گریز نہیں کیا جو ان کے اور ان کے خاندان کے مخالف ایک عرصے سے چلے آرہے تھے، انھیں ان کے حال پر نہیں چھوڑا بلکہ پناہ بھی دی اور حفاظت بھی کی۔

اہل حجاز اور ابن زبیرؓ

عبداللہؓ ابن زبیر کی خلافت پر اہل حجاز کی آمادگی درحقیقت اس بات کا ناقابل تردید ثبوت ہے کہ کم از کم باشندگان حجاز نے شخصی اور موروثی خلافت کو نہ دل سے قبول کیا تھا نہ عمل سے۔ یہی وجہ ہے کہ یزید کے تخت حکومت پر بیٹھتے ہی ان میں اضطراب پیدا ہوا۔ انھیں اکرام و انعام سے رام کرنے کی کوششیں کی گئیں لیکن وہ رام نہیں ہوئے۔ وہ حجاز اور عالم اسلام میں وہی حکومت چاہتے تھے جو آں حضرتؐ کے وقت سے عہد خلافت راشدہ تک دیکھتے چلے آئے تھے۔ ابھی حجاز میں ایک بڑی تعداد صحابۂ کرام کی موجود تھی۔ اور جس شہر کے لوگوں نے اصحاب رسولؐ کی

تعلیم و تربیت سے فیض اٹھایا ہو وہ موروثی حکومت قبول بھی نہیں کر سکتے تھے۔

لیکن یزید کے لیے یہ معاملہ مرگ و زیست کا تھا۔

وہ جانتا تھا اور اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر جلد از جلد اہلِ حجاز سے خواہ برضا و رغبت یا بہ جبر و اکراہ بیعت نہ لی گئی تو اس حکومت کا جو اتنی دشواریوں سے حاصل ہوئی ہے قائم رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ کیونکہ دیارِ رسول ؐ اور بیت اللہ کے رہنے والوں کا احترام سب کے قلوب میں جاگزیں تھا، لوگ اُس طرف جھکیں گے جدھر یہ مائل ہوں گے لہٰذا سعی و کوشش اس بات کی شروع ہوئی کہ بہر قیمت مکہ اور مدینہ کو زیرنگیں کیا جائے خواہ اس سلسلے میں کیسا ہی سنگین اقدام کیوں نہ کرنا پڑے۔

ابنِ زبیر کی شخصیت

خصوصیات وصفات، عادات اور حالات وشمائل

عبداللہ بن زبیرؓ کوئی معمولی آدمی نہ تھے، وہ اپنے حلم ونفس، وجاہت اور شخصیت زہد وپارسائی، عبادت وریاضت کے اعتبار سے یکتا اور منفرد تھے۔ علامہ سیوطی نے ان کی ذات وصفات کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

خاندان ونسب نام عبداللہ بن زبیر بن عوام بن خویلد بن اسد بن عبد العزی بن قصی اسدی ہے اور ابوبکر وابوخبیب کنّیت ہے۔ آپ صحابی اور صحابی زادہ ہیں۔ آپ کے والد عشرۂ مبشرہ میں ہیں۔ آپ کی والدہ اسماء بنت ابوبکرؓ تھیں اور آپ کی دادی حضرت صفیہ رسول اللہؐ کی پھوپھی تھیں۔

طفولیت ہجرتِ نبوی ؐ کے بیس ماہ بعد آپ مدینہ منوّرہ میں پیدا ہوئے۔ بعض کے نزدیک سلنہ ھ ہی میں آپ کی ولادت ہوئی۔ غرضیکہ آپ وہ پہلے نومولود ہیں جو ہجرت کے بعد سب سے پہلے پیدا ہوئے آپ کی پیدائش سے تمام مسلمانوں کو مسرت ہوئی کیونکہ یہودیوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ ہم نے مسلمانوں پر جادو کر دیا ہے اور مدینہ میں ان کی کوئی اولاد نہ ہوگی۔ آپ کے پیدا ہونے کے بعد آپ کو رسالت مآبؐ کے پاس لے گئے۔ اور سرورِ عالمؐ نے کھجور چبا کر آپ کو چٹائی۔ آپ کا نام عبداللہ رکھا اور آپ کے نانا ابوبکرؓ کے نام پر آپ کی کنیت ابوبکر تجویز فرمائی۔

حالات و خصائل ابن زبیر عام طور پر روزے رکھتے، راتوں کو عبادت کرتے، نماز میں طویل قرأت کرتے، صلہ رحمی کرتے اور بڑے جیوٹ و دلیر تھے۔

آپ کا سہ شبانہ نظام عمل یہ تھا کہ ایک شب رات بھر صبح ہونے تک نماز پڑھتے۔ ایک شب رات بھر صبح ہونے تک رکوع میں رہتے اور ایک شب رات بھر سجدہ ریز رہتے۔ آپ کی زبانی ۳۳ احادیث مروی ہیں۔ جنھیں آپ کے بھائی عروہ، ابوملیکہ، عباس ابن سہل، ثابت بنانی، عطا، عبیدہ سلمانی اور دیگر حضرات نے روایت کیا ہے۔ آپ وہ شخصیت ہیں کہ یزید کی بیعت سے انکار کر کے مکہ معظمہ چلے گئے جہاں پہنچ کر اس افراتفری کے زمانے میں اپنی بیعت کی خواہش نہیں کی۔ بیعت نہ کرنے کی وجہ سے یزید آپ سے سخت ناراض ہوا۔ اور آپ پر مکہ میں چڑھائی کی۔ لیکن یزید کی وفات کے بعد لوگوں نے آپ کو خلیفہ بنایا۔ آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور باشندگانِ حجاز و یمن اور عراق و خراسان نے آپ کی اطاعت میں سرِ تسلیم خم رکھا۔ آپ نے خانۂ کعبہ کی از سرِ نو تعمیر کی۔ اور جس طرح حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں تھا اسی طرح خانۂ کعبہ کے دو دروازے بنائے۔ اور اپنی خالہ عائشہؓ کے کہنے پر کہ رسول اللہ صلعم کی خواہش تھی کہ خانۂ کعبہ میں مزید چھ گز زمین شامل کی جائے آپ نے شمالی جانب حجر اسود کے پاس سے چھ گز زمین حطیم کعبہ میں شامل کی۔ البتہ شامیوں اور مصریوں نے معاویہ ابن یزید کو اپنا خلیفہ تسلیم کیا تھا چونکہ اس کی زندگی نے وفا نہ کی اس لیے یہ سب شامی و مصری بھی اس کی موت کے بعد آپ کے مطیع و فرماں بردار ہو گئے۔ اور آپ کی خلافت پر ان سب نے بھی بیعت کر لی۔

مروان نے انہی دنوں میں خفیہ سازش کر کے شام و مصر پر تسلط حاصل کر لیا اور ۶۵ھ تک زندہ رہ کر اپنے بیٹے عبدالملک بن مروان کو ولی عہد مقرر کر گیا۔ ذہبی کا بیان ہے کہ مروان کو خلیفہ نہ کہا جائے کیونکہ وہ باغی تھا اور اس نے عبداللہ بن زبیرؓ پر خروج کیا تھا اور اس کی بغاوت ہی کی وجہ سے اس کا ولیعہد مقرر کرنا بھی درست و جائز نہیں۔

عبادت و شجاعت عمرو بن دینار کا بیان ہے ابن زبیر بہترین نمازی تھے۔ آپ حرم کعبہ میں نماز پڑھ رہے ہوتے منجنیق کے پتھر آ آ کر آپ کے کپڑوں پر گرتے لیکن آپ اُدھر متوجہ نہ ہوتے اور برابر نماز پڑھتے رہتے۔ مجاہد کا بیان ہے

کہ ابن زبیر عبادت کے بڑے شوقین تھے اور آپ کے بجائے کوئی دوسرا شخص ناگہانی حوادث سے عاجز ہو جاتا۔ ایک مرتبہ بیت اللہ میں بہت زیادہ پانی بھر گیا۔ کیونکہ آپ کو ارکان ادا کرنے تھے اس لیے تیر کر آپ نے طوافِ کعبہ کیا۔ عثمان بن طلحہ کا بیان ہے کہ شجاعت و عبادت اور بلاغت میں ابن زبیر کا کوئی مقابلہ نہ کر سکا۔ آپ اتنے بلند آواز تھے کہ آپ کے خطبے کی آواز پہاڑوں سے ٹکراتی تھی۔

خصوصیات ابن زبیر

ہشام بن عروہ اور خبیب کا بیان ہے کہ سب سے پہلے ابن زبیر نے خانہ کعبہ پر دیباج کا غلاف چڑھایا ورنہ اس سے پہلے پلاس و چمڑے کا غلاف چڑھایا جاتا تھا۔ عمرو بن قیس کا بیان ہے کہ ابن زبیر کے پاس سو غلام تھے۔ اور ہر ایک سے اس کی زبان میں گفتگو فرماتے تھے۔ جب میں انھیں دنیاوی کام میں مشغول دیکھتا تو کہتا کہ یہ ایک لمحہ کے لیے بھی دنیا سے الگ نہیں۔ اور جب دینی کاموں میں منہمک دیکھتا تو دیکھتا کہ انھیں دنیا سے کوئی تعلق و واسطہ ہی نہیں ہے۔

صاف بیانی

ابو عبیدہ کا بیان ہے۔ عبداللہ ابن زبیر اسدی نے ایک دن عبداللہ ابن زبیر بن عوام کے پاس آ کر کہا اے امیر المومنین! ہمارے آپ کے درمیان فلاں فلاں رشتہ داری ہے۔ اس پر امیر المومنین نے جواب دیا بالکل ٹھیک، لیکن ذرا غور کرو تو معلوم ہو جائے گا کہ ہم سب آدم و حوا کی اولاد ہیں۔ اس پر عبداللہ اسدی نے کہا میرے پاس خرچ کے لیے کچھ نہیں ہے۔ امیر المومنین نے جواب دیا تمھارے اخراجات کا میں ضامن نہیں۔ مناسب یہی ہے کہ تم اپنے گھر لوٹ جاؤ۔ اس پر وہ خفا ہو گیا لیکن بیت المال سے غلط طور پر ایک غیر مستحق کی مدد کرنا گوارا نہ کیا۔

مدینہ کی تاراجی۔ مکّہ کی بے حرمتی

تاریخِ اسلام کا سب سے بڑا حادثہ اور المیہ

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں!

حضرت عبداللہ بن زبیر نے یزید کی زندگی ہی میں حجاز پر تسلّط حاصل کر لیا تھا۔ اور مرگِ یزید کے بعد عالمِ اسلام کا بہت بڑا حصّہ زیرِ نگیں ہو گیا۔ اگر آپ میں لچک ہوتی اور اصولوں پر سمجھوتہ کر سکتے تو شاید بہت جلد ایک منظّم اور مستحکم حکومت قائم کر لیتے۔ لیکن حضرت علیؓ کی طرح آپ کا اصول بھی تھا کہ جان جائے یا رہے سند اور اقتدار ہاتھ میں آئے یا نہ آئے مگر حق و صداقت اور اصول کے معاملے میں کسی سے سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ آپ نے یزید کے زمانے میں بیت اللہ میں اقامت اختیار کر کے اور اس کی بیعت نہ کر کے اسے بہت بڑا چیلنج دیا تھا۔ یہ چیلنج اس نے بھی قبول کر لیا اور اس کے بعد مروان اور عبدالملک بن مروان نے بھی جس کے عہد میں بیدردی اور سفاکی کے ساتھ آپ شہید کیے گئے۔

یزید کو جس طرح اس پر اصرار تھا کہ امام حسین بیعت کر لیں اسی طرح اس پر بھی یہ ضد تھا کہ عبداللہ بن زبیر اور باشندگانِ مدینہ بھی اس کی خلافت تسلیم کر لیں یہ ناممکن سی آرزو تھی۔ لیکن اس کے حصول میں اس نے مدینۂ رسول ؐ اور خانۂ خدا کی حرمت تک داؤں پر لگا دی۔

مدینۂ منوّرہ کی تباہی اور بربادی

اہلِ مدینہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ خلافتِ راشدہ کے بعد حکومت کا چلن بگڑ گیا ہے اس کا

آئین و دستور قرآن نہیں بلکہ اعراض و مقاصد ہیں۔ لہٰذا وہ کسی قیمت پر بھی اپنے آپ کو سمع وطاعت پر آمادہ نہ کر سکے۔ چنانچہ حادثۂ ہائلہ کربلا کے بعد بھی انھوں نے یزید کی بیعت کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

اہلِ مدینہ کی دلی خواہش تھی کہ اہلِ بیت میں سے کسی کو امیر اور امام بنائیں۔ لیکن جب انھیں اس میں کامیابی نہ ہوئی اور ابن زبیر نے دعوائے خلافت کیا تو وہ ان کے ساتھ ہو گئے۔ کیونکہ انھیں یقین تھا کہ ابن زبیر کی حکومت بہرحال بڑی حد تک اسلامی حکومت ہی ہوگی۔ اس کا دستور و آئین بہرحال قرآن اور اسوۂ نبیؐ کا تابع ہوگا۔ کم سے کم ان منکرات و فواحشات کی گرم بازاری نہیں رہے گی جو عام ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ چنانچہ اخبار الطوال میں ہے۔

"نعمان بن بشیر کی واپسی کے بعد حجاز میں انقلاب بپا ہو گیا۔ ابن عباسؓ اور حضرت علیؓ کے صاحبزادے محمد بن حنفیہ کے علاوہ کل اہلِ حجاز نے ابن زبیر کے ہاتھوں پر بیعت کر لی۔ اور تمام اموی عمال کو مدینہ سے نکال دیا۔"

اہلِ مدینہ نے یزید کی بیعت فسخ کر کے عبداللہ بن حنظلہ انصاری کو اپنا امیر بنایا۔ اور مدینہ میں جو بنی امیہ مقیم تھے ان کو گھیر لیا۔ انھوں نے مدد کے لیے شام کو آدمی بھیجے ان سے یزید کو حالات معلوم ہوئے۔ ایک روایت یہ ہے کہ ابن زبیر نے تمام امویوں کو نکال دیا تھا اور خود امویوں کی زبانی یزید کو حالات معلوم ہوئے۔

یزید کا فرمان اہلِ مدینہ کے نام

اس انقلاب کی خبر سن کر یزید نے مسلم بن عقبہ کو دس ہزار فوج کے ساتھ حجاز روانہ کیا اور ہدایت کر دی کہ پہلے مدینہ کو اطاعت کی دعوت دینا جب وہ انکار کریں اس وقت تلوار اٹھانا اور انھیں شکست دینے کے بعد تین دن تک مدینے کو لوٹنا۔

"مسلم نے مدینہ پہنچ کر یزید کی ہدایت کے مطابق جنگ شروع کر دی۔ تین دن تک نہایت خوں ریز معرکہ ہوا۔ اہلِ مدینہ نے بڑی پامردی سے مقابلہ کیا لیکن حکومت کی فوج کا مقابلہ دشوار تھا۔ اس لیے آخر میں شکستِ فاش کھائی۔ اس جنگ میں بہت

سے اکابر و اشرافِ قریش اور انصار کام آئے۔ فضیل بن عباس بن ربیعہ، عبداللہ بن حنظلہ، عبداللہ بن مطیع ایک ایک کر کے قتل ہوئے۔ شکست دینے کے بعد شامی فوجیں تین دن تک مدینۃ الرسول کو لوٹتی اور قتلِ عام کرتی رہیں۔ چوتھے دن امن قائم ہوا۔ لیکن اس وقت بھی یہ اعلان تھا کہ جو شخص بیعت نہیں کرے گا وہ قتل کر دیا جائے گا۔ لیکن اب مدینہ تباہ ہو چکا تھا۔ کسی میں سکت باقی نہ رہ گئی تھی۔ اس لیے باقی ماندہ لوگوں نے بیعت کر لی۔"

طبری کی بیان کردہ تفصیل

طبری نے مدینہ منورہ کی لوٹ اور بربادی کی داستان ذرا وضاحت سے بیان کی ہے جو یہ ہے کہ جب مدینہ پر دھاوا ہوا تو وہاں کے رزم آرائوں میں:

"فضیل مسلم بن عقبہ کے تخت تک پہنچ گئے۔ ان کے چہرے کا رنگ سرخ تھا تلوار اٹھا کر وار کیا چاہتے تھے کہ وہ چلّایا: "یارو تم کہاں ہو یہ مردِ سرخ مجھے قتل کیے ڈالتا ہے۔ اے نیک بی بی کے فرزندو دوڑو اسے برچھیوں پر لو۔ فضیل کی طرف برچھیاں لے کر لوگ دوڑے وہ برچھیاں کھا کر گر پڑے۔ اس کے بعد مسلم کے سوار سب کے سب ابنِ فضیل کی طرف چلے اور قریب پہنچ گئے۔ اس وقت مسلم گھوڑے پر سوار ہو کر اہلِ شام کا دل بڑھانے لگا کہ اے اہلِ شام تم حسب نسب میں عرب سے بڑھ کر نہیں ہو، شمار میں ان سے زیادہ نہیں ہو، تمھارے بلاد اتنے وسیع نہیں ہیں۔ پھر بھی تمھیں خدا نے یہ خاص مرتبہ عنایت کیا ہے کہ دشمن کے مقابلے میں تمھاری مدد کی

ابن غسیل نے دیکھا کہ ہر ایک فوج اپنے اپنے علم کے ساتھ یورش کرتے آ رہی ہے تو یہ خطبہ پڑھا:

"سنو تم لوگ صاحبِ بصیرت ہو دار الہجرت کے رہنے والے ہو۔ واللہ میں خوب سمجھتا ہوں کہ بلادِ اسلام میں سے کسی شہر کے لوگوں سے خدا اتنا خوش نہیں ہوگا جتنا تم لوگوں سے خوش ہے۔ اور بلادِ عرب میں کسی شہر کے لوگوں پر خدا ایسا غضب ناک نہ ہوگا جیسا ان لوگوں پر غضب ناک ہے جو تم سے لڑنے آئے ہیں۔ تم سب کو ایک دن

مرنا ہے اور واللہ کسی طرح کی موت شہید ہو کر مرنے سے بہتر نہیں۔ لو شہادت کی دولت خدا نے تمھارے سامنے رکھ دی ہے اسے لوٹ لو اور واللہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ جتنی تمھاری مرادیں ہیں سب پوری ہو جائیں۔"

یہ کہہ کر علم لیے ہوئے بڑھے تھوڑی دور جا کر ٹھہر گئے۔ ابن نمیر بھی اپنا علم لیے ہوئے قریب آ پہنچا۔ مسلم نے عبداللہ بن عضاۃ کو پانچسو قدر اندازوں کے ساتھ ابن غسیل پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا۔ تیروں کا مینہ اہلِ مدینہ پر برسنے لگا۔

"ابن غسیل نے اپنے فرزندوں کو ایک ایک کر کے میدانِ جنگ میں بھیجا سب ان کے سامنے قتل ہو گئے۔ وہ خود رجز پڑھتے جاتے تھے۔ اور شمشیر زنی کرتے کرتے قتل ہو گئے۔ ان کے برادر اخیافی محمد بن ثابت انھیں کے ساتھ قتل ہوئے۔ یہ کہتے تھے کہ کفارِ دیلم مجھے قتل کرتے تو میں ایسا خوش نہ ہوتا جیسا ان لوگوں کے ہاتھ سے قتل ہو جاتے ہیں خوش ہو رہا ہوں۔ انھیں کے ساتھ محمد بن حزم انصاری بھی قتل ہوئے۔ ان کی لاش پر مروان بن حکم گزرا، لاش سے خطاب کر کے کہنے لگا۔ خدا تم پر رحم کرے میں نے کتنے رکنوں کے ساتھ تمھیں طولانی نمازیں پڑھتے دیکھا ہے۔"

اور اس کے بعد طبری ہی کا بیان ہے:

"مسلم بن عقبہ نے تین دن تک مدینہ کی لوٹ شامیوں کو مباح کر دی وہ لوگوں کو قتل کرتے پھرتے اور ان کے مال لوٹتے رہتے تھے۔"

مدینہ لوٹا جا رہا تھا!

اہلِ مدینہ قتل کیے جا رہے تھے۔ جہاں گنبد خضرا کا مکین محوِ خواب تھا، جہاں انسان تو انسان فرشتے سر جھکا کر حاضر ہوتے تھے۔ جہاں جبریل امین وحی لے کر وارد ہوا کرتے تھے۔ جو سرکار دو عالم صلعم کا زندگی میں بھی مسکن تھا اور وفات کے بعد بھی!

صحابیٔ رسول حضرت ابو سعید خدری

اور جن لوگوں کو مسلم بن عقبہ سالار یزید نے قتل کیا یا ایذا دی ان کا جرم کیا تھا ان کی خطا کیا تھی؟ طبری کی روایت ہے:

صحابہ میں سے ابو سعید خدری شہر سے نکل کر پہاڑ کی کھوہ میں جا کر چھپے۔ ایک شامی نے انھیں دیکھ لیا۔ وہ تلوار کھینچے ہوئے اس غار تک پہنچا۔ خدری نے بھی اسے دھمکانے کے لیے تلوار کھینچ لی کہ شاید یہ ڈرے ہوئے پلٹ جائے۔ اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ بڑھتا ہوا چلا آیا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ وہ باز نہیں آتا تو اپنی تلوار میان میں رکھی۔ اس سے کہا کہ اگر تو میرے قتل کے لیے ہاتھ اٹھائے گا تو میں تیرے قتل کے لیے ہاتھ اٹھانے والا نہیں ہوں پروردگار عالم سے ڈرتا ہوں۔

یہ کیفیت تو ایک صحابیِ رسول کی ہوئی جس کے مرویات سے کتب صحاح بھری پڑی ہیں۔

مقتولینِ مدینہ کا جرم کیا تھا؟

اب جو لوگ قتل ہوئے ان کے جرم پر بھی ایک نگاہ ڈال لیجیے:

مسلم نے مقام قبا میں لوگوں کو بیعت کے لیے بلایا۔ قریش میں سے یزید بن زمعہ اور محمد بن ابی الجہم کے لیے اور معقل بن سنان کے لیے امان طلب کی گئی۔ لڑائی کے ایک دن بعد یہ تینوں شخص مسلم کے پاس لائے گئے۔ مسلم نے دونوں قریشیوں سے بیعت کرنے کو کہا۔ انھوں نے کہا کہ ہم کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صؐ پر بیعت کرتے ہیں۔ مسلم نے کہا میں واللہ تمھاری اس بات کو ہرگز معاف نہیں کروں گا اس کے بعد دونوں کی گردنیں مار دی گئیں۔

پھر یزید بن وہب کو مسلم کے سامنے لائے۔ مسلم نے کہا کہ تم اس بات پر بیعت کرو کہ تم سب کے سب یزید بن معاویہ کے غلام ہو۔ اس کے بعد ابن وہب کے قتل کا حکم دیا اور وہ قتل کر دیا گیا۔

گویا مسلم بن عقبہ اہلِ مدینہ سے یزید کی بیعت کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صؐ پر نہیں بلکہ یزید کی غلامی پر لینا چاہتا تھا۔ اور اس سے انکار کا جرم مستوجب قتل تھا۔

صحابیِ رسولؐ عبدالملک کے دربار میں

مدینہ تاراج ہو گیا، وہاں کے باشندوں کو قتل ہونا تھا قتل ہو گئے۔ عبدالملک بن مروان اپنے باپ مروان کے بعد تختِ حکومت پر بیٹھا، لیکن ۔ لیکن مدینہ اب بھی مظلوم تھا۔

مدینہ کے باشندوں پر اب بھی ظلم توڑے جا رہے تھے۔ ایک اہلِ دل اور صاحبِ بصیرت شخصیت مولانا گیلانی نے اس واقعہ فاجعہ پر قلم اٹھاتے ہوئے لکھا ہے:

بنی امیہ اور ان کے سنگ دل گورنروں کی بدتمیزیوں کے اس بے پناہ طوفان نے ایک ایسا دہشت ناک اور مہیب منظر دنیائے اسلام میں قائم کر دیا تھا کہ ہر ایک اپنی اپنی جگہ دم بخود تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ممتاز صحابیوں کے ساتھ جو سلوک ہوتا تھا اس کا اندازہ اس ایک واقعے سے ہو سکتا ہے کہ عبدالملک بن مروان (جو اپنی مذہبی زندگی میں امتیاز رکھتا تھا) کے پاس بوڑھے اور نابینا صحابی حضرت جابر بن عبداللہؓ مدینہ طیبہ سے چل کر دمشق اس لیے آتے ہیں کہ واقعہ حرہ کے بعد انتقاماً مدینہ منورہ پر جو ظلم توڑے جا رہے تھے ان کو بند کرنے کی درخواست کریں۔ اس وقت رسول اللہؐ کے پڑوسیوں پر زندگی کے تمام ذرائع بند کر دیے گئے تھے۔ ہر شخص گویا اپنے گھر میں قیدیوں کی زندگی بسر کر رہا تھا۔

پیغمبرؐ کے ایک صحابی پیغمبر کے شہر کے بے قصور باشندوں، بچوں اور عورتوں پر رحم کی درخواست پیش کرتے ہیں۔ لیکن بجائے سمجھنے کے عبدالملک کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ حضرت چونکہ نابینا تھے اس لیے ان کو اس کی ناراضگی کا پتہ نہ چلا۔ آپ بار بار اسی بات کو دہرا رہے تھے۔ قریب تھا کہ ان کے ساتھ بھی کوئی واقعہ پیش آئے لیکن اتفاق سے دربار میں ان کے ایک شاگرد قبیصہ موجود تھے۔ انھوں نے حضرت کو خاموش کیا۔ ہاتھ پکڑ کر باہر نکال لائے اور حضرت کو سمجھانے لگے کہ یا ابا عبداللہ ان ھؤلاء القوم صاروا ملوکا (ابن سعد) حضرت! یہ لوگ (بنی امیہ) اب بادشاہ بن گئے ہیں۔

اور جس رسولؐ کی مسندِ خلافت پر عبدالملک متمکن تھا اسی نے مرض الموت میں مبتلا ہونے کے بعد آخری خطبہ جو دیا تھا اس میں انصارِ مدینہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"ایہا الناس!

میں انصار کے بارے میں تمھیں وصیت کرتا ہوں عام مسلمان بڑھتے جائیں گے لیکن انصار کم ہو کر رہ جائیں گے جو تمھارے امورِ نفع و نقصان کا متولی (یعنی خلیفہ) ہو اسے چاہیے کہ ان میں سے جو نیکوکار ہوں ان کو قبول کرے اور جن سے خطا سرزد ہو ان

کو معاف کر دے۔"

رسول اللہ کا یہی آخری خطبہ تھا جسے یاد دلاتے ہوئے صحابی رسول اللہ جریر بن عبداللہ عبدالملک خلیفۂ وقت کے پاس اس لیے پہنچے تھے کہ وہی اب مسلمانوں کے نفع و نقصان کا متولّی، یعنی خلیفہ تھا۔

لیکن عبدالملک نے یہ قولِ حق نہ سنا، اس نے انصارِ مدینہ کے ساتھ کوئی رعایت نہ کی۔

خانۂ خدا پر سنگباری

مکہ ــــ دنیا کے بُت کدے میں پہلا وہ گھر خدا کا۔ وہ حرم محترم ہے۔ اس کی حرمت، تحفظ و بقا کے لیے آپ نے طرح طرح کی ایذائیں جھیلیں، تکلیفیں اٹھائیں۔ یہی وہ مقدس جگہ ہے جہاں آپ نے طواف کیا، عبادت کی اور اس راہ میں ہر طرح کی تکلیفیں برداشت کیں۔

یہ مکہ ہے ــــ جس پر اصحاب فیل نے چڑھائی کی تھی کہ خدا کے اس گھر کو ڈھا دیں۔ لیکن "طیرِ ابابیل" نے بالائے ہوا سے ابرہہ اور اس کے لشکریوں پر کنکریاں پھینکیں جو ان کے لیے تیر و تفنگ بن گئیں۔ اور سارا لشکر اس طرح برباد ہو گیا کعصفٍ ماکول جیسے کھایا ہوا بھوسہ۔

کافروں سے خدا کا گھر بچ گیا۔ لیکن اسلام کے نام لیواؤں نے اس کی حرمت خاک میں ملا دی، اس پر منجنیقوں سے پتھر تک پھینکے۔

لیکن مکہ پر چڑھائی کرنے والے وہی تو تھے جو مدینۃ الرسول کو تاراج کر کے وہاں کے باشندوں کو لوٹ کے اور وہاں کے لوگوں کو یزید کا قن (غلام) بنا کے آئے تھے۔

مکہ کی فریاد یہ مکہ جس پر سنگ باری کی گئی آج زبانِ حال سے پکار رہا ہے اور یزید سے فریاد کر رہا ہے کہ جب ابوسفیان پر زندگی کے دروازے بند ہو گئے تھے، جب ابوسفیان کے لیے محبۃ و شرف کی زندگی بسر کرنا ممکن نہیں رہ گیا تھا، جب وقت آیا تھا کہ وہ کیفرِ کردار کو پہنچے تو رحمۃ اللعالمین نے فرمایا تھا:

"جو ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے اسے امان ہے۔"

میں نے ابو سفیان کو پناہ دی، اس کے گھر کو بیت الامن بنایا اور آج میرے سینے پر پتھر چلائے جا رہے ہیں!

مکہ نے ابو سفیان کے ساتھ کتنا بڑا احسان کیا تھا۔ اور اس کا پوتا (یزید) اس احسان کا بدلہ کس طرح ادا کر رہا تھا!

ربیع الاول ۶۴ھ کی تیسری تاریخ روز شنبہ کو ان لوگوں نے خانہ کعبہ پر منجنیق سے پتھر برسائے اور آگ لگا دی۔ ساتھ ہی یہ رجز پڑھتے جاتے تھے۔ یہ منجنیق ایک شترمست ہے کہ کہ ہم اس سے خانہ کعبہ پر نشانہ لگا رہے ہیں۔ عمرو بن حوط سدوسی کہتا جاتا تھا کیف تری صنیع ام فروہ تاخذھم بین الصفا والمروۃ۔ (ذرا ام فروہ کو دیکھنا کہ صفا و مروہ کے درمیان لوگوں کو کس طرح نشانہ بنا رہی ہے۔

ام فروہ اس نے منجنیق کا نام رکھا تھا مسلم کے دفن ہونے کے بعد ابن نمیر محرم کی ۲۳ تاریخ کو مکہ کی طرف روانہ ہوا۔ اور چھبیسویں کو مکہ پہنچا۔ ۶۴ دن تک محاصرہ کیے رہا غرہ ربیع الآخر کو یزید کے مرنے کی خبر سن کر محاصرہ اٹھالیا۔

ابن زبیرؓ کا عہدِ حکومت

خانہ جنگیوں اور باہمی رزم و پیکار کا دور

عراق پر ابنِ زبیرؓ کا قبضہ و تسلط

اہلِ کوفہ کی حالت یہ تھی کہ حادثۂ کربلا کے بعد ان لوگوں کے دلوں میں حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت نے اندر ہی اندر جذبۂ ندامت پیدا کیا کہ امام حسینؑ کو خطوط بھیج کر بلایا اور پھر ان کے قتل میں شریک ہوئے۔ ان لوگوں نے جو شیعیانِ حسینؑ کہلائے جاتے تھے سلیمان بن صرد خزاعی کے مکان میں جمع ہو کر ایک خفیہ جلسہ کیا اور اپنی خطاؤں کا اقرار کرنے کے بعد ان کی تلافی کے لیے اس تجویز پر اتفاق کیا کہ اب ہم کو خونِ حسینؑ کا معاوضہ ضرور لینا چاہیے۔ چنانچہ سب نے سلیمان بن صرد کے ہاتھ پر بیعت کی۔

جب عبیداللہ بن زیاد نے اہلِ کوفہ کو اپنی بیعت کی طرف متوجہ کرنا چاہا تو ابن زیاد کو صاف جواب دینے کے بعد اہلِ کوفہ نے عمرو بن حرث کو جو ابن زیاد کی طرف سے کوفہ کا حاکم تھا، نکال دیا اور ابن زبیر کی خلافت کو تسلیم کر لیا۔ عبداللہ بن زبیر کی طرف سے عبداللہ بن یزید انصاری کوفہ کے گورنر اور ابراہیم بن محمد بن طلحہ محصل خراج مقرر ہو کر آ گئے۔ عبداللہ بن زبیرؓ کے گورنر کی آمد سے ایک ہفتہ پیشتر مختار بن ابو عبید بھی جو محمد بن الحنفیہ کے پاس گیا ہوا تھا واپس کوفہ آیا۔ یہ رمضان ۶۴ھ کا واقعہ ہے بصرہ والوں نے بھی ابن زیاد کے چلے جانے پر عبداللہ بن حارث کو اپنا سردار بنا لیا اور پھر اہلِ کوفہ کی تقلید میں اپنا ایک وفد

بھیج کر حضرت عبداللہ بن زبیر کی حکومت و خلافت کو تسلیم کر لیا۔ اس طرح تمام ملک عراق پر عبداللہ بن زبیرؓ کی حکومت مسلط اور قائم ہو گئی۔

ابن زبیرؓ کی بیعت مصر میں مصر کا حاکم عبدالرحمٰن بن حجدم تھا۔ اس نے جب معاویہ بن یزید کے انتقال کی خبر سنی تو فوراً بذریعہ وفد عبداللہ بن زبیرؓ کی بیعت کی۔ حمص کے گورنر نعمان بن بشیر اور قنسرین کے حاکم ظفر بن حارث تھے۔ ان دونوں نے بھی معاویہ بن یزید کی وفات کا حال سن کر عبداللہ بن زبیرؓ ہی کی خلافت کو تسلیم کر لینا مناسب سمجھا۔ معاویہ بن یزید کی وفات کے بعد چونکہ جلد خلیفہ کا انتخاب نہیں ہو سکا لہٰذا اہل دمشق نے ضحاک بن قیس کے ہاتھ پر اس اقرار کے ساتھ بیعت کی تھی کہ جب تک مسلمانوں کا کوئی امیر اور خلیفہ منتخب و متعین ہو اس وقت تک ہم آپ کو اپنا امیر اور امام مانیں گے اور آپ کے احکام کی فرمانبرداری کریں گے۔ یہ ضحاک بن قیس بھی خلافت کے لیے عبداللہ بن زبیرؓ ہی کو سب سے بہتر سمجھتے تھے۔ فلسطین کا گورنر حسان بن مالک تھا وہ البتہ اس امر کا خواہاں تھا کہ آئندہ بھی جو خلیفہ منتخب ہو وہ بنی امیہ میں سے ہو۔

غرض معاویہ بن یزید کی وفات پر تمام عالم اسلام عبداللہ بن زبیر کی خلافت پر متفق ہو چکا تھا اور بنی امیہ کے سوا باقی تمام باثر اشخاص وراثت کو خلافت سے مٹانے اور عبداللہ بن زبیرؓ کو خلیفہ بنانے پر آمادہ پائے جاتے تھے۔

اگر عبداللہ بن زبیرؓ شام کے ملک میں تشریف لے آتے تو یقیناً ان کی خلافت کے قیام و استحکام میں کوئی شک و شبہ باقی نہ تھا۔ اور وہ تنہا عالم اسلامی کے خلیفہ بن کر ضرور ان برائیوں کو جن کی بنیاد پڑ چکی تھی کلیتہً مٹا دینے میں کامیاب ہو جاتے مگر مشیت الٰہی اور اس کے خلاف تھے جو ہو کر رہے۔

عبداللہ بن زبیرؓ کی متفقہ خلافت معاویہ بن یزید کی وفات کے بعد چھ سات ماہ تک عبداللہ بن زبیرؓ ہی خلیفہ رہے۔ ان کے سوا اور کوئی شخص بنی امیہ میں سے مدعی خلافت نہ تھا بلکہ تمام عمال و حکام نے عبداللہ بن زبیرؓ کی خلافت کو تسلیم کر لیا تھا۔ چھ سات مہینے کے بعد اپنی کوشش میں کامیاب ہو کر مروان ملک شام

پر قابض ہوا۔ لہٰذا مروان کی حیثیت ایک باغی کی قرار دی جا سکتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن زبیر کی کامیابی کے باوجود اموی اصحاب خلافت کے حصول کی برابر کوشش کرتے رہے چنانچہ موقع پا کر مروان نے در پردہ لوگوں کو اپنی خلافت کی ترغیب دینی شروع کی۔

غرض انتخاب خلیفہ کا مسئلہ چالیس روز تک مقام جابیہ میں زیر بحث رہا۔ بالآخر روح بن زنباع کی تجویز عبیداللہ بن زیاد کی تائید و کوشش سے منظور ہوئی اور ۳ ذیقعدہ ۶۴ھ کو مقام جابیہ میں مروان کے ہاتھ پر بنو امیہ، بنو کلب اور غسان و طے وغیرہ قبائل نے بیعت کر لی۔ اس بیعت کے بعد مروان بن حکم اپنی جمعیت کو لے کر مرج راہط کی طرف بڑھا اور ضحاک بن قیس (عبداللہ بن زبیر کے حامی تھے) کے مقابل جا کر خیمہ زن ہوا۔

مروان نے دن میں ضحاک کے پاس صلح کا پیغام بھیج کر استدعا کی کہ لڑائی کو بند کر دیجیے اور شرائط صلح کے طے ہونے تک کوئی کسی پر حملہ آور نہ ہو۔ اسی قرارداد کے موافق لڑائی بند ہو گئی۔ غروب آفتاب کے بعد جب رات شروع ہوئی تو ابن زیاد کی تجویز کے موافق یہاں شبخون کی تیاری ہونے لگی اور وہاں بالکل فارغ اور مطمئن ہو کر ضحاک کی فوج مصروف خواب ہوئی۔ آدھی رات کے وقت انھوں نے کئی جانب سے حملہ شروع کیا اس اچانک حملے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنو قیس کے اسی سردار اور بنو سلیم کے چھ سو آدمی مقتول ہوئے۔ ضحاک بن قیس بھی کام آئے اور بقیۃ السیف جس طرف کو منہ اٹھا بھاگ نکلے۔

مروان بھی بیعت پر آمادہ تھا جس زمانے میں معاویہ بن یزید کی وفات کے بعد دمشق میں انتخاب خلیفہ کے متعلق اختلاف آراء اور بنو کلب و بنو قیس کے درمیان رقابتیں آشکارا ہونے لگی تھیں تو مروان بن حکم نے یہ دیکھ کر کہ عراق وغیرہ اور شام کا بھی بڑا حصہ عبداللہ بن زبیرؓ کی خلافت کو تسلیم کر چکا ہے ارادہ کیا تھا کہ دمشق سے روانہ ہو کر مکہ میں عبداللہ بن زبیرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کرے اور خلافت تسلیم کرنے میں زیادہ دیر نہ لگائے۔ چنانچہ جامع دمشق میں جب لوگوں کے اندر فساد برپا ہوا تو مروان بن حکم بنو امیہ کی خلافت سے قطعاً مایوس ہو کر مکہ کے سفر

کا سامان درست کر چکا تھا کہ اتنے میں عبید اللہ بن زیاد دمشق میں وارد ہوا اور مروان بن حکم کے ارادے سے واقف ہو کر اس نے بہ اصرار مروان کو روانگی سے باز رکھا اور اسی کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ مروان کے ہاتھ پر بیعت خلافت ہوئی اور اسی کی تدبیر سے مرج راہط میں ضحاک بن قیس قتل اور بنو قیس کو شکست ہوئی۔

اب مروان دمشق میں آیا اور یزید بن معاویہ کے محل میں فروکش ہوا۔ یہاں آتے ہی اس نے ابن زیاد کے مشورے کے موافق سب سے پہلے خالد بن یزید کی ماں کے ساتھ نکاح کیا تاکہ بنو کلب کی حمایت حاصل رہے۔ اور آئندہ خالد بن یزید کی ولی عہدی کے اندیشے سے نجات حاصل ہو سکے۔ اس کے بعد اس نے فلسطین و مصر کی جانب کوچ کیا اور ۶۵ھ کے ابتدائی ایام میں عبداللہ ابن زبیرؓ کے تمام ہواخواہوں کو شکست دے کر قتل یا ملک سے خارج کر دیا۔

توابین کا قتل عام رمضان ۶۴ھ میں عبداللہ بن یزید انصاری عبداللہ ابن زبیرؓ کی طرف سے حاکم مقرر ہو کر آیا۔ اور انہیں ایام میں مختار بن ابو عبیدہ بھی کوفے میں آیا۔ مختار نے کوفہ میں آ کر لوگوں کو خون حسینؓ کا انتقام لینے کے لیے ابھارنا شروع کیا۔ لوگوں نے کہا کہ ہم تو پہلے ہی اس کام کے لیے سلیمان بن صرد کے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں لیکن ابھی اس کام کے لیے مناسب موقع نہیں آیا۔ مختار نے کہا کہ سلیمان ایک پست ہمت آدمی ہے وہ لڑائی سے جی چراتا ہے۔ مجھ کو محمد بن الحنفیہ برادر امام حسینؓ نے اپنا نائب بنا کر بھیجا ہے۔ تم لوگ میرے ہاتھ پر بیعت کرو اور خون حسینؓ کا انتقام اُن کے قاتلوں سے لو۔ لوگ یہ سُن کر مختار کے ہاتھ پر بیعت ہونے لگے۔

اس اعلان کے بعد سلیمان بن صرد اور اس کے ہمراہیوں نے بھی ہتھیار خریدنے شروع کر دیے اور علانیہ جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ یکم ماہ ربیع الثانی ۶۵ھ کو سلیمان بن صرد نے کوفہ سے نکل کر مقام نخیلہ میں قیام کیا اور سترہ ہزار آدمی اس کے گرد جمع ہو گئے سلیمان بن صرد ۵۔ ربیع الثانی کو نخیلہ کے لیے سترہ ہزار کی جمعیت کے ساتھ حدود شام کی طرف روانہ ہوا۔ روانگی کے وقت عبداللہ بن سعد بن نفیل نے سلیمان سے کہا کہ قریباً

تمام قاتلانِ حسینؓ تو کوفے میں موجود ہیں ان کو چھوڑ کر قاتلانِ حسینؓ کی تلاش میں اور کہاں جا رہے ہو۔

سلیمان بن صرد نے کہا کہ یہ لوگ تو سپاہی تھے جنہیں حکم دینے والا ابن زیاد تھا۔ لہٰذا اصل قاتل وہی ہے اور سب سے پہلے ہم کو اسی کی گردن مارنی چاہیے اس سے فارغ ہو کر باقی لوگوں کو درست کرنا بہت آسان کام ہے۔ نخیلہ سے روانہ ہو کر یہ لوگ کربلا پہنچے وہاں مقتلِ حسینؓ اور مدفنِ حسینؓ پر خوب روئے دھوئے۔ اور ایک دن رات قیام کرنے کے بعد روانہ ہوئے، کوچ و مقام کرتے ہوئے عین الوردہ کے مقام پر پہنچ کر خیمہ زن ہوئے۔ ان لوگوں کی خبر سن کر عبیداللہ بن زیاد نے جو موصل میں بہ حیثیت گورنر موصل مقیم تھا حصین بن نمیر کو بارہ ہزار فوج دے کر مقابلے کے لیے روانہ کیا۔ سلیمان بن صرد ۲۱۔ جمادی الاول ۶۵ھ کو عین الوردہ کے مقام پر پہنچا تھا۔ پانچ روز کے انتظار کے بعد ۲۶۔ جمادی الاول کو حصین بن نمیر بھی عین الوردہ پہنچ گیا۔ اسی روز لڑائی شروع ہوئی شام تک کی لڑائی میں شامیوں کو سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ لیکن رات نے حائل ہو کر ان کا پردہ رکھ لیا۔

اگلے دن صبح کو آٹھ ہزار کا ایک کمکی لشکر شامیوں میں اور آ ملا۔ جو ابنِ زیاد نے بھیجا تھا۔ آج بھی نمازِ فجر سے مغرب کے وقت تک خوب زور شور کی لڑائی جاری رہی اور کوئی فیصلہ نہ ہوا۔ رات کو دونوں لشکروں نے امید و بیم میں بسر کی۔ صبح ہوتے ہی ابنِ زیاد کا بھیجا ہوا دس ہزار کا ایک لشکر شامیوں کی مدد کے لیے آ گیا اور آج بھی صبح سے شام تک لڑائی جاری رہی۔ لیکن سلیمان بن صرد اور تمام بڑے بڑے سردار کوفیوں کے کام آئے بہت ہی تھوڑے سے آدمی باقی رہ گئے تھے۔ بقیۃ السیف سردار اپنے بچے کھچے آدمیوں کو لے کر رات کی تاریکی میں وہاں سے چل دیے۔ حصین بن نمیر نے ان کا تعاقب نہیں کیا۔ سلیمان بن صرد اور اس کے ہمراہیوں کو توابین کے نام سے پکارتے تھے۔ یعنی ان لوگوں نے حضرت امام حسینؓ کے ساتھ بے وفائی کر کے ان کو قتل کرانے کا جرم کیا تھا۔ پھر اس سے تائب ہو کر تلافی کے درپے ہوئے۔ اسی لیے جنگ عین الوردہ کو جنگِ توابین بھی کہتے ہیں۔

یہ لوگ کسی سلطنت کی باقاعدہ فوج نہ تھے بلکہ بطور خود جمع ہو کر ابن زیاد کے قتل کرنے کو گئے تھے اور خود بہت سے قتل ہو کر اور تھوڑے سے بچ کر واپس آ گئے تھے۔

مصعب بن زبیر کا تقرر بصرہ کی گورنری پر ۶۴ھ میں عبداللہ بن زبیر قریباً تمام عالم اسلام میں خلیفہ تسلیم کیے جا چکے تھے۔ اسی سال تمام شام، مصر اور فلسطین ان کے دائرۂ خلافت سے خارج ہو گیا۔ اور بنو امیہ کی خلافت دوبارہ دمشق میں قائم ہو گئی۔ ۶۵ھ میں بعض صوبوں کے اندر بغاوتیں ہوئیں لیکن عبداللہ بن زبیرؓ کو خلیفہ ضرور تسلیم کیا جاتا رہا۔ اور کوئی صوبہ قبضے سے نہیں نکلا۔ ۶۶ھ میں کوفہ اور یمامہ دونوں قبضے سے نکل گئے۔ کوفہ میں مختار کی حکومت اور یمامہ میں نجدہ بن عامر کی حکومت خود مختارانہ طور پر قائم ہو گئی۔ بصرہ کو حرث بن ربیعہ نے اور فارس کو مہلب بن ابی صفرہ نے سنبھالے رکھا اور خوارج کے فتنوں کو سر ابھارتے ہی دبا دیا۔ مختار کی طرف سے بصرہ پر ڈورے ڈالے جا رہے تھے اور بصرہ میں عبداللہ بن مطیع سابق گورنر کوفہ اور عمر بن عبدالرحمٰن نامزد گورنر کوفہ بھی موجود تھے۔ ان دونوں کو عبداللہ بن زبیر سے ندامت و شرمندگی تھی۔ اس لیے بصرہ میں ان دونوں کی موجودگی موجب خطر بھی ہو سکتی تھی کہ کہیں کسی سازش میں شریک نہ ہو جائیں۔ جب عبداللہ بن زبیرؓ نے یہ سنا کہ عبیداللہ بن زیاد، ابراہیم بن مالک کے مقابلے میں مقتول ہو چکا ہے تو ان کو اہل شام اور عبدالملک بن مروان کی طرف سے تو گونہ اطمینان ہوا کہ ان کی طاقت کو ایک بڑا صدمہ پہنچا تھا اور وہ جلد حجاز پر حملہ آور ہونے کا ارادہ نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن بصرہ کے متعلق خطرات بڑھ گئے کیونکہ مختار بن عبیدہ کی توجہ اس فتح کے بعد بصرہ ہی کی طرف مبذول ہونے والی تھی۔ لہٰذا انھوں نے فوراً بصرہ کے عامل حرث بن ربیعہ کو معزول کر کے اپنے بھائی مصعب ابن زبیر کو بصرہ کی گورنری پر مامور کر کے بھیجا۔

مختار کا قتل مختار ۱۴ رمضان المبارک ۶۷ھ کو مقتول ہوا۔ مختار کے ہمراہیوں میں عبیداللہ بن علی بن ابی طالب بھی مقتول ہوئے۔ مصعب ابن زبیر نے ان لوگوں کو جو قصر امارت کے اندر محصور تھے گرفتار کیا۔ تمام وہ لوگ بھی جو میدان جنگ میں گرفتار

ہوئے تھے کوفہ کے اندر لائے گئے اور ایک وسیع مقام پر ان تمام قیدیوں کو جمع کر کے اُن کی نسبت مشورہ لیا گیا۔ مہلب بن ابی صفرہ نے کہا کہ ان سب کو چھوڑ دینا چاہیے لیکن محمد بن الاشعث اور تمام دوسرے کوفیوں نے یہ سن کر مصعب بن زبیر کو اس رائے پر عمل کرنے سے منع کیا۔

آخر یہی فیصلہ کیا گیا کہ ان لوگوں کو قتل کر دیا جائے، چنانچہ وہ سب قتل کر دیے گئے اور اہلِ کوفہ کو اطمینان میسر ہوا۔ مصعب نے مختار کے دونوں ہاتھ کٹوا کر جامع مسجد کوفہ کے دروازے پر لٹکا دیے جو حجاج کے عہد امارت تک وہاں لٹکے رہے۔

فتنۂ خوارج کا زور

۶۸ھ میں ایسی صورت پیش آئی کہ فارس میں خوارج کے فتنے نے بہت زور پکڑا اور مغیرہ بن مہلب اور عمر بن عبداللہ بن معمر دونوں فتنۂ خوارج کو نہ دبا سکے مصعب بن زبیر نے موصل کی حکومت سے مہلب بن ابی صفرہ کو تبدیل کر کے پھر فارس کی حکومت پر مامور کیا اور حکم دیا کہ وہاں جا کر خوارج کے فتنے کو فرو کرو۔

اس میں شک نہیں کہ مہلب بن ابی صفرہ سے بہتر کوئی دوسرا شخص خوارج کا علاج نہیں کر سکتا تھا۔ مہلب نے کہا میں تو فارس جانے سے خوش ہوں مگر فی الحال مجھے موصل سے جدا کرنا آپ کے لیے بے حد مضر ثابت ہوگا اس لیے کہ عبدالملک بن مروان نے خفیہ سازشوں کا ایک جال عراق میں پھیلانا شروع کیا ہے۔ میں اس کی تدابیر کو خوب غور سے مطالعہ کر رہا ہوں ایسا نہ ہو کہ میرے یہاں سے چلے جانے کے بعد وہ اپنی تدابیر میں کامیاب ہو جائے۔

مصعب بن زبیرؓ نے فارس کی ضرورت کو اس موہوم ضرورت پر ترجیح دی اور مہلب بن ابی صفرہ کو فارس کی طرف روانہ ہونا پڑا۔

مصعب بن زبیرؓ کے پاس ابراہیم و مہلب دو زبردست سپہ سالار اور بجربہ کار افسر تھے انھوں نے ان دونوں میں سے ایک کو اپنے پاس سے جدا کر دیا۔ ساتھ ہی عبداللہ بن حازم کو خراسان کی حکومت پر بھیج دیا۔ عباد بن حصین کو مہلب کے ساتھ مامور کر دیا۔ یہ دونوں بھی بڑے زبردست سپہ سالار اور جنگی تجربہ کار تھے۔ اس طرح مصعب بن زبیر نے کام کے آدمیوں کو اپنے پاس سے جدا کر کے دور دراز مقامات پر بھیج دیا۔

عبداللہ بن زبیرؓ کا قتل

حجاج بن یوسف کی طرف سے مکہ پر سنگباری

مصعب بن زبیر کی بے بسی حالات بالکل دگرگوں ہوتے چلے جارہے تھے۔ عبداللہ بن زبیرؓ کی قوت مائل بہ انحطاط ہوتی چلی جارہی تھی اور بنو مروان کی طاقت میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔

اب مروان کا بیٹا عبدالملک سریر آرائے مملکت تھا۔ اس نے بدعہدی سے کام لے کر اپنے ایک بہت بڑے حریف عمرو بن سعید کے قتل سے فراغت پاکر،

"سازشی تدابیر شروع کردی تھیں۔ اس نے فارس کی طرف اپنے آدمیوں کو بھیج کر وہاں خوارج کو توقعات دلائیں اور ان کو خروج پر آمادہ کردیا۔ ادھر کوفہ اور بصرہ میں بھی اپنے آدمیوں کو بھیج کر ہواخواہانِ بنی امیہ کے ذریعے سازشوں کا ایک جال پھیلایا اور مصعب ابن زبیر کے فوجی سرداروں کو بھی خفیہ طور پر خط بھیج بھیج کر بڑے بڑے لالچ دینے شروع کیے۔ حتیٰ کہ مہلب اور ابراہیم کو بھی اس سے توڑنا اور اپنی طرف ملانا چاہا۔ مگر یہ دونوں ایسے نہ تھے کہ مصعب بن زبیر سے بے وفائی کرتے اسی لیے مہلب فارس کی طرف روانہ ہوتے وقت فکر مند تھا۔"

عبدالملک بن مروان کی سازش عبدالملک نے خالد بن عبداللہ بن خالد بن اسید کو خفیہ طور پر بصرہ میں بھیجا کہ وہاں جاکر عبداللہ بن زبیر کے خلاف اور بنوامیہ کے موافق

لوگوں کو اپنا ہم خیال بنائے۔ چنانچہ خالد نے بصرہ میں آ کر بنو بکر بن وائل اور قبیلہ ازد میں اپنا سازشی کام شروع کیا۔ اور ایک بڑی جماعت اپنی ہم خیال بنالی۔ اس کا حال عمر بن عبداللہ بن معمر کو معلوم ہوا تو اس نے فوج بھیجی، خالد کے ہمراہیوں نے مقابلہ کیا اور بالآخر خالد کو بصرہ سے نکال دیا گیا۔

عبدالملک بن مروان کی تیاریاں

آخر عبدالملک اپنی مکمل تیاریوں کے بعد شام سے عراق کی جانب فوج لے کر چلا۔ جس زمانے میں عبدالملک کی فوج کشی کی خبر کوفہ میں پہنچی اس سے پہلے مصعب بن زبیر عمر بن عبداللہ بن معمر کو خوارج کے مقابلے کے لیے بصرہ سے فارس کی طرف بھیج چکے تھے لہٰذا عمر بن عبداللہ بھی اس لڑائی میں موجود نہ تھا۔ دار جاثلیق کے قریب دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل پہنچ کر خیمہ زن ہوئے مصعب بن زبیر کی فوج بہت تھوڑی تھی۔ کیونکہ عین روانگی کے وقت بہت سے لوگوں نے حیلے بہانے کر کے جانے سے انکار کر دیا۔ جو لوگ میدان میں ساتھ آئے تھے اُن میں سے بھی زیادہ حصہ دشمن سے ملا ہوا تھا اور اس بات کا منتظر تھا کہ لڑائی شروع ہو تو دشمن سے جا ملیں غرض لڑائی شروع ہوئی عبدالملک نے پوری طاقت سے اسی فوج پر حملہ کیا جو ابراہیم بن مالک کی ماتحتی میں تھی۔

کوفیوں کی غدّاری

ابراہیم پر دشمنوں کا ہجوم دیکھ کر مصعب بن زبیر نے عتاب بن ورقا کو ابراہیم کی مدد کے لیے بھیجا۔ عتاب بن ورقا پہلے ہی در پردہ عبدالملک کی مدد کر چکا تھا۔ وہ قرارداد کے موافق فوراً میدان سے فرار ہو گیا۔ ابراہیم دشمنوں کے نرغے میں گھر کر بڑی بہادری سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ ابراہیم کے مارے جاتے ہی عبدالملک اور اہل شام کا دل بڑھ گیا۔ اور ان کو اپنی فتح کا کامل یقین ہو گیا۔

مصعب بن زبیر نے دوسرے سرداروں سے آگے بڑھنے اور حملہ کرنے کے لیے کہا۔ مگر کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ سب نے اِس کان سُنا اور اُس کان اڑا دیا۔ معدودے چند آدمی تھے جو میدان میں لڑ رہے تھے۔ باقی تمام فوج کوفیوں کی تماشا دیکھ رہی تھی۔

عبدالملک کے ہاتھ پر بیعت

اس جنگ میں مصعب کے صاحب زادے علیسیٰ ہلاک ہو گئے مصعب بن زبیر اپنے بیٹے علیسیٰ کے مارے جانے کے بعد اپنے خیمے میں گئے۔ سر میں تیل ڈالا، خوشبو لگائی اور باہر آکر شمشیر بدست دشمن پر حملہ آور ہوئے۔ اس حملے میں آپ کا ساتھ دینے والے صرف سات آدمی باقی تھے جو اُن کے ساتھ ہی مارے گئے۔ مصعب بن زبیر نے ایسا سخت حملہ کیا کہ شامیوں کی صفوں کو درہم برہم کر دیا۔ آخر تیروں، تلواروں اور نیزوں کے زخموں سے چُور ہو کر بے ہوش ہو گئے۔ ان کے گرتے ہی شامیوں نے ان کا سر کاٹ لیا۔ اور اے ہ میں دس برس کے بعد کربلا کا ڈراما تاریخ میں دوہرایا گیا۔

عبدالملک نے اسی میدان میں تمام لشکر کوفہ سے اپنی خلافت کی بیعت لی اور وہاں سے روانہ ہو کر کوفہ کے قریب مقام نخیلہ میں چالیس دن ٹھہرا رہا۔ جب اہلِ کوفہ کی طرف سے بہر طور اطمینان ہو گیا تو شہر میں داخل ہوا۔ جامع مسجد میں خطبہ دیا۔ لوگوں سے حسنِ سلوک کا وعدہ کیا۔ انعام و اکرام سے خوش کیا۔ فارس و خراسان اور بصرہ و اہواز کے عاملوں کو لکھا کہ لوگوں سے ہمارے نام پر بیعت لے لو۔ مہلب بن ابی صفرہ کو بھی اس کی جگہ پر بدستور قائم رکھا، سب نے عبدالملک کی خلافت کو تسلیم کر لیا۔ اور بجز تسلیم کرنے کے اب اُن کے لیے کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

مصعب بن زبیر کا حادثہ قتل

جب مکہ معظمہ میں عبداللہ بن زبیرؓ کے پاس یہ خبر پہنچی کہ ان کے بھائی مصعب بن زبیر عراقیوں کی بے وفائی سے قتل ہو گئے اور تمام ملک عراق پر عبدالملک بن مروان کا قبضہ ہو گیا تو انھوں نے اہلِ مکہ کو جمع کر کے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

مصعب اگر قتل ہوا تو اس کے باپ بھائی اور ابن عمر بھی تو قتل ہی ہوئے تھے جو نہایت نیک اور صالح تھے۔ اور خدا کی قسم ہم اپنے بستروں پر اس طرح نہ مریں گے جیسے ابوالعاص کی اولاد اپنے بستروں پر مر رہی ہے۔ خدا کی قسم ان لوگوں میں سے کوئی شخص نہ کبھی جاہلیت میں مارا گیا نہ اسلام میں اور ہم نیزوں کے زخم کھا کر تلواروں کے نیچے دم دیا کرتے ہیں۔

حجاج کی درخواست عبدالملک سے

عبدالملک بن مروان نے سرداران شام کو مکہ معظمہ پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کرنا چاہا۔ مگر سب نے حضرت عبداللہ ابن زبیر کے مقابلے پر جانے اور خانۂ کعبہ کو رزم گاہ بنانے سے انکار کیا۔ عبدالملک دمشق سے کوفہ گیا، وہاں اس نے حجاج بن یوسف ثقفی کو اس کام پر آمادہ کیا۔ حجاج تین ہزار آدمی ہمراہ لے کر جمادی الاوّل ۷۲ھ میں کوفہ سے روانہ ہوا۔

عبدالملک نے حجاج کی درخواست پر مزید پانچ ہزار آدمی اس کی امداد کے لیے اور روانہ کر دیے۔

مکہ معظمہ کا محاصرہ

حجاج نے رمضان المبارک میں مکہ معظمہ کا محاصرہ کر لیا اور کوہ ابوقبیس پر منجنیق لگا کر سنگ باری شروع کر دی۔ اہل مکہ کے لیے یہ رمضان کا مہینہ اس سنگ باری کے عالم میں بڑی مصیبت کا مہینہ تھا۔ لوگ محاصرہ کی شدت سے تنگ آ کر مکہ سے نکل نکل کر بھاگنا شروع ہوئے۔ رمضان و شوال کے بعد ذی قعدہ کا مہینہ بھی آ گیا اور اہل مکہ کی مصیبت اور محاصرہ کی شدت میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ روزانہ مقابلے پر جاتے اور محاصرین کو پسپا کرنے کی کوششیں عمل میں لاتے لیکن روزانہ ان کے ساتھیوں کی تعداد کم ہو رہی تھی۔ اس لیے ان کی تدابیر کوئی ایسا نتیجہ نہ پیدا کر سکیں جس سے کامیابی کی امید ہوتی۔

حجاج کی ستم رانیاں

اہل مکہ ایک طرف مکہ سے باہر نکلے چلے جا رہے تھے دوسری طرف سامانِ خورد و نوش کی نایابی و گرانی نے محصورین کے حوصلوں کو پست کر رکھا تھا۔ ماہ ذی قعدہ ۷۲ھ میں طارق نے مدینہ منورہ سے عبداللہ بن زبیرؓ کے عامل طلحۃ الندار کو نکال دیا۔ اور ایک شامی کو مدینہ کا حاکم مقرر کر کے خود مکہ معظمہ کی طرف پانچ ہزار فوج کے ساتھ روانہ ہوا۔ اس زبردست امداد کے پہنچنے پر حجاج کی طاقت بہت زیادہ بڑھ گئی اور اہل مکہ کی رہی سہی امیدیں بھی منقطع ہو گئیں۔ اسی حالت میں ماہ ذی الحجہ شروع ہو گیا۔ اور دور دور سے لوگ حج کے

لئے آنے شروع ہوئے۔ عبداللہ ابن زبیرؓ نے حجاج کو حج کرنے کی اجازت دے دی تھی مگر اس نے نہ طواف کیا نہ صفا و مروہ کے درمیان سعی کی حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے میدانِ عرفات میں جانا چاہا۔ تو حجاج نے روک دیا۔ چنانچہ انھوں نے مکہ ہی میں قربانی کی میدانِ عرفات میں کوئی امام نہ تھا۔ غرض اس سال لوگ ارکانِ حج ادا نہ کرسکے۔ ایام حج میں بھی حجاج نے سنگ باری کو بند نہ کیا۔ اس لیے خانۂ کعبہ کا طواف بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ حاجیوں کی آمد سے مکہ میں قحط اور بھی زیادہ بڑھ گیا۔ حضرت عبداللہ ابنِ عمرؓ بھی اس سال حج کے لیے تشریف لائے تھے۔ انھوں نے یہ حالت دیکھ کر حجاج کے پاس پیغام بھیجا کہ خدا کے بندے! اتنا خیال کر کہ لوگ دور دور سے حج کے لیے آئے ہوئے ہیں ان کو طواف کرنے اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنے کا تو موقع مل جائے اس سنگ باری کو حج کے ختم ہونے تک تو بند کرا دے۔ اس پیغام کا یہ اثر ہوا کہ حجاج نے سنگ باری بند کرا دی۔ ایامِ حج کے گزرتے ہی حجاج کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ باہر سے آئے ہوئے اشخاص فوراً اپنے اپنے شہروں کو روانہ ہو جائیں کیونکہ ابنِ زبیر پر سنگ باری شروع ہونے والی ہے۔ اس آواز کو سنتے ہی لوگوں کے قافلے روانہ ہوگئے اور ساتھ ہی بچے ہوئے مکہ والوں میں سے بھی بہت سے لوگ اپنی اپنی جان بچا کر نکل گئے۔

حجاج نے پھر سنگ باری شروع کر دی۔ حضرت عبداللہ بن زبیر خانہ کعبہ میں نماز پڑھتے تھے اور بڑے بڑے پتھر اُن کے ارد گرد آآ کر گرتے تھے۔ لیکن ان کی توجہ الی اللہ اور نماز کے خضوع و خشوع میں ذرہ برابر فرق نہ آیا۔

اہلِ مکہ شدید ترین محاصرے کی زد میں

یہ محاصرہ اسی شدّت سے برابر جاری رہا۔ مکہ معظمہ میں باہر سے کسی قسم کی امداد اور سامانِ رسد نہیں پہنچ سکتا تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے اپنا گھوڑا ذبح کر کے لوگوں میں تقسیم کر دیا۔ حضرت ابنِ زبیرؓ کے پاس غلہ اور کھجوروں کا ایک ذخیرہ موجود تھا وہ اس ذخیرہ میں سے صرف اس قدر لوگوں میں تقسیم کرتے تھے جس سے حیات

باقی رہے۔ مدعا ان کا یہ تھا کہ ہم دیر تک محاصرین کے مقابلے پر قائم رہ سکیں۔ حجاج نے جب یہ دیکھا کہ کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی تو اس نے عبداللہ بن زبیرؓ کے ہمراہیوں کے پاس امان نامے لکھ لکھ کر بھیجنے شروع کیے۔ یہ امان نامہ والی تدبیر کارگر ثابت ہوئی اور بہت سے آدمی عبداللہ بن زبیر کا ساتھ چھوڑ چھوڑ کر حجاج کے پاس چلے آئے۔ بہت ہی تھوڑے سے آدمی حضرت عبداللہ بن زبیر کے پاس رہ گئے حتیٰ کہ ان کے دو لڑکے حمزہ و حبیب بھی باپ کو چھوڑ کر حجاج کے پاس آ گئے۔ تیسرا لڑکا باپ کے ساتھ رہا اور آخری وقت تک دادِ شجاعت دیتا رہا۔ حتیٰ کہ عین معرکۂ کارزار میں کام آیا۔

اس سے پیشتر حجاج عبداللہ بن زبیر کی خدمت میں ایک خط بھیج چکا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ:

"اب آپ کے پاس کوئی طاقت نہیں رہی۔ آپ ہر طرح مجبور ہو چکے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ آپ ہماری امان میں آ جائیں۔ اور امیر المومنین عبدالملک کی بیعت اختیار کر لیں۔ آپ کے ساتھ انتہائی عزت و تکریم کا برتاؤ کیا جائے گا۔ اور آپ کی ہر ایک خواہش پوری کر دی جائے گی۔"

ماں اور بیٹے کی گفتگو

عبداللہ بن زبیرؓ خط کو پڑھ کر اپنی ماں حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیقؓ کے پاس گئے اور عرض کیا:

"میرے پاس اب کوئی آدمی نہیں رہا۔ برائے نام صرف پانچ آدمی ہیں جو میرا ساتھ دینے پر بظاہر اب تک آمادہ ہیں۔ لوگوں نے میرے ساتھ اسی طرح دھوکے کا برتاؤ کیا جیسا کہ حسینؓ ابن علیؓ کے ساتھ کیا تھا لیکن ان کے بیٹے جب تک زندہ رہے باپ کے سامنے تلوار لے کر دشمنوں سے لڑتے رہے، اور میرے بیٹے اس فاسق کی امان میں چلے گئے۔ اب حجاج کہتا ہے کہ تم بھی امان میں آ جاؤ اور جو کچھ مانگو ہم دینے کو تیار ہیں۔ پس میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں کہ آپ کیا حکم دیتی ہیں۔"

حضرت اسماءؓ نے جواب دیا:

"تم اپنے معاملے کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہو۔ اگر تم حق پر ہو اور حق کی طرف لوگوں کو بلاتے

تو اس کام میں برابر مصروف رہو۔ تمھارے ساتھی بھی راہِ حق میں شہید ہوئے اور تم بھی اسی راہ پر گامزن رہ کر شہادت حاصل کرو۔ اگر تم نے دنیا حاصل کرنے کا قصد کیا تھا تو تم بہت ہی نالائق آدمی ہو، تم خود بھی ہلاکت میں پڑے اور اپنے ہمراہیوں کو بھی ہلاکت میں ڈالا۔"

عبداللہ رضؓ بن زبیر نے کہا مجھے اس بات کا خوف ہے کہ وہ لوگ قتل کرنے کے بعد مجھ کو مثلہ کریں گے اور صلیب پر لٹکائیں گے۔

حضرت اسماء نے جواب دیا: بکری ذبح کر ڈالی گئی تو پھر اسے اس کی کیا پروا ہے کہ اس کی کھال کھینچی جاتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن زبیر نے ماں کے سر کا بوسہ لیا اور عرض کیا: میری بھی یہی رائے تھی جو آپ نے ظاہر فرمائی۔ مجھے دنیا کی خواہش اور حکومت کی تمنا بالکل نہ تھی۔ میں نے یہ کام صرف اس لیے اختیار کیا تھا کہ خدائے تعالیٰ کے احکام کی پابندی نہیں کی جاتی تھی اور ممنوعات سے لوگ بچتے نہ تھے۔ جب تک میرے دم میں دم ہے میں حق کے لیے لڑتا رہوں گا، آپ سے مشورہ لینا ضروری سمجھا۔ میں آج ضرور مارا جاؤں گا آپ مغموم نہ ہونا۔ ابھی میں نے یہ باتیں فخریہ نہیں کہیں بلکہ صرف اس لیے کہ میری ماں کو تسکینِ خاطر رہے۔

حضرت اسماء بولیں: مجھے امید ہے کہ خدائے تعالیٰ تم کو اس کا اجر عطا فرمائے گا تم اللہ کا نام لے کر دشمنوں پر حملہ کرو۔

بیٹے کو رخصت کرتے وقت حضرت اسماء نے گلے سے لگایا تو ہاتھ زرہ پر پڑا۔ پوچھا تم نے یہ زرہ کس ارادے سے پہن رکھی ہے؟ کہا صرف اطمینان و مضبوطی کی غرض سے۔ اسماء نے کہا اسے اتار دو اور معمولی کپڑے پہنے ہوئے دشمن سے لڑو۔ حضرت ابن زبیر نے وہیں زرہ اتار کر پھینک دی۔ قمیص کے دامن اٹھا کر کمر سے باندھے۔ دونوں آستینیں چڑھائیں اور گھر سے باہر نکل آئے اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اے آلِ زبیر! تم تلوار کی جھنکار سے خوف زدہ نہ ہونا کیونکہ زخم میں دوا لگانے سے تکلیف زیادہ ہوتی ہے بمقابلہ اس تکلیف کے جو زخم کے پیدا ہونے سے ہوتی ہے۔ تم مجھے ڈھونڈتے نہ پھرنا اور اگر میری تلاش ہی ہو تو میں سب سے آگے

دشمنوں سے لڑتا ہوا ملوں گا۔

یہ کہہ کر شامیوں پر ایک سخت حملہ کیا، صفوں کو چیرتے، لوگوں کو مارتے اور گراتے ہوئے شامیوں کی پچھلی صفوں تک پہنچ گئے۔ اور پھر اسی طرح لشکرِ شام کے سمندر میں پیرتے ہوئے واپس آ گئے۔

شہادت کوہِ صفا کے اوپر سے ایک شخص نے پتھر مارا، پیشانی پر لگا، خون بہنے لگا۔ آپ اسی حالت میں برابر لڑتے رہے، آخر ایک ایک کر کے تمام ہمراہی کام آئے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ پر دشمنوں نے چاروں طرف سے پتھروں اور تیروں کی بارش شروع کر دی۔ بالآخر یوم سہ شنبہ ماہ جمادی الثانی ۷۳ھ کو مرتبہ شہادت پر فائز ہوئے۔ لاش اسی جگہ یعنی مقام حجون میں دار پر لٹکا دی گئی اور سر عبدالملک کے پاس بھیج دیا گیا۔

ماں کی بے بسی حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ نے لاش کے دفن کرنے کی اجازت چاہی مگر حجاج نے انھیں اجازت نہ دی۔ عبدالملک کو جب یہ حال معلوم ہوا تو اس نے حجاج کو ملامت کی اور لاش دفن کرنے کی اجازت دی۔ چند روز کے بعد حضرت اسماءؓ کا بھی انتقال ہو گیا۔

خلافتِ عبداللہ بن زبیرؓ پر اجمالی نظر

... صد سالہ راہم دور شد

امیر معاویہ کی مدتِ حکومت ۴۰ سال ہے۔ بیس سال کا عرصہ رزم و پیکار میں گزرا اور بیس سال حضرت امام حسنؓ کی دست برداری کے بعد حکومت کے استحکام و اہتمام میں۔

جیسا کہ سیوطی اور دوسری کتب کے حوالہ سے ثابت ہوتا ہے امام حسنؓ کی دستبرداری کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ امیر معاویہ کے بعد نامزدگی یا ولایتِ عہد کے ماتحت کوئی شخص مسلمانوں کا امیر نہیں بنے گا۔ بلکہ شوریٰ کے بعد کوئی شخص منتخب ہو کر اس مسند پر متمکن ہو سکے گا۔

لیکن امیر معاویہ نے اس شرط کی چنداں پروا نہ کی، انھوں نے یزید کو ولی عہد بنا دیا۔ اور طوعاً کرہاً لوگوں نے یہ بات مان لی۔ جنھوں نے نہیں مانی انھوں نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔

جن اصحاب نے یزید کو ولی عہد ماننے سے انکار کیا انھوں نے اس صورتِ حال کے خلاف کوئی عملی اقدام کیوں نہیں کیا؟ شورش کیوں نہیں کی؟ بغاوت کیوں نہیں برپا کی؟ ایک خلافِ اصول بات پر خاموشی کیوں اختیار کر لی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ:

● امام حسنؓ کی دست برداری کے بعد امیر معاویہ کی حکومت اصولی اعتبار سے درست تھی اور جب تک ان سے کوئی معصیتِ کبیرہ سرزد نہ ہوتی ان کے خلاف شورش، بغاوت اور ہنگامہ آرائی جائز نہ تھی۔ کیونکہ اس طرح عام مسلمانوں میں تفرقہ پیدا ہوتا اور مسلمان قوم کی ہوا خیزی ہوتی۔

● یزید کی ولی عہدی گو ایک طرف خلاف اصولِ شرع تھی، دوسری طرف اپنے اندر حالات کے سازگار ہونے کا امکان بھی رکھتی تھی۔ خلاف شرع یوں تھی کہ مستقبل کا فیصلہ خدا کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔ آج جو شخص بہ ظاہر عابد و زاہد ہے کل وہ عصیاں شعار بلکہ مرتد تک ہو سکتا ہے ایسی صورت میں اس کا الگ کرنا بغیر خوں ریزی کے ممکن نہیں گویا کوئی شخص اگر عالم صحت و تندرستی میں قوم پر اپنا جانشین مسلط کرتا ہے تو وہ در پردہ ارادی یا غیر ارادی طور پر خانہ جنگی، بیکار یا ہی اور کشت و خون کا امکان بھی پیدا کرتا ہے، اور یہ چیز اصولِ شرع کے خلاف ہے۔ لیکن حالات کے سازگار ہونے کا امکان یوں تھا کہ ہو سکتا ہے یزید کے طور طریقے دیکھ کر امیر معاویہ اپنی رائے بدل لیتے اور اپنے فیصلے سے رجوع کر لیتے، جو شخص کسی کو نامزد کر سکتا ہے وہ اس نامزدگی کا منسوخ بھی کر سکتا ہے کیونکہ ولی عہدی ہبہ نامہ بالقبض تو ہے نہیں کہ اس کی تنسیخ ناممکن اور محال ہو۔ علاوہ ازیں بوڑھوں کے سامنے جوان مرتے ہی رہتے ہیں۔ یہ بات بالکل ممکن تھی کہ امیر معاویہ کی زندگی ہی میں یزید کا انتقال ہو جاتا۔ اگر ایسا ہوتا تو ظاہر ہے کہ وہ کسی کے لیے اتنی غیر معمولی جد و جہد نہ کرتے بلکہ عین ممکن تھا امر امارت مسلمانوں کے حوالے کر دیتے۔ امیر معاویہ کا انتقال تو بے شک عمر طبعی پر پہنچ کر ہوا لیکن یزید جوانی کے عالم میں مر گیا۔ اگر وہ چار سال پہلے مرتا تو حالات بالکل مختلف ہوتے۔ اور بہت ممکن تھا امت اس خلفشار سے بچ جاتی جس میں آج تک مبتلا چلی آ رہی ہے، ویسے بھی حتی الامکان مسلمان سے حسنِ ظن بھی رکھنا چاہیے۔ اور امیر معاویہ سے اس باب میں خاص طور پر حسنِ ظن رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے یزید کو بر بنائے استحقاق و اہلیت ولی عہد نہیں بنایا تھا کیونکہ اصل صحابہ کی ایک جماعت اور اجل صحابہ کے زاہد، متقی صاحب ورع و عبادت کے اخلاف موجود تھے جن سے یزید کو کسی طرح کی نسبت ہی نہیں تھی:

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

بہر حال یزید کی ولی عہدی قائم رہی اس کا انتقال امیر معاویہ کی زندگی میں نہیں

ہوا۔ وہ پوتے چار سال کے لیے ہی لیکن تختِ امارت پر متمکن ہوا۔

● عامہ مسلمین کے دلوں میں بد دلی امیر معاویہ ہی کے زمانے سے پیدا ہو چکی تھی کیونکہ ہر شخص یہ تسلیم کرتا ہے کہ یہ دور خلافت کا نہیں ملوکیت کا تھا اور اسلام کے مزاج اور ملوکیت کے مزاج میں بُعد المشرقین ہے۔ ان دونوں میں کسی طرح نہ اتحاد ممکن ہے نہ توافق۔

● لیکن امیر معاویہ کے بعد جب یزید سریر آرائے مملکت ہوا تو اس بد دلی اور مایوسی اور برہمی میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ امیر معاویہ کی زندگی گو ملوکانہ رہی ہو اور ان کا نظام مملکت گو خلافتِ راشدہ سے کتنا ہی بُعد رکھتا ہو اور ان کی سیاست سے گو کتنی ہی ناانصافیاں اور بے اعتدالیاں سرزد ہوئی ہوں لیکن بہرحال ان کے دور میں کوئی ایسی بات نہیں ہوئی جس کی تاویل نہ کی جا سکتی ہو یا جسے شریعتِ اسلامیہ سے کھلی ہوئی بغاوت قرار دیا جا سکتا ہو۔ لیکن یزید کا دور اس خصوصیت سے بھی یکسر محروم تھا۔ وہ بادشاہ بھی تھا اور ساتھ ہی ساتھ فاسق و فاجر بھی۔ اس کا نظام مملکت رواداری، مصلحت کوشی اور معاملہ فہمی سے یکسر عاری تھا۔ اگر وہ خود مدینہ پہنچ جاتا یا امام حسین کو دمشق بلا لیتا اور شریعتِ اسلامیہ کے حفظ و بقا کا عہد کر لیتا تو یقیناً صلح ہو جاتی، لیکن اسے اپنے فسق و فجور پر بھی اصرار تھا اور امام حسین وغیرہ سے اپنی بیعت لینے پر بھی اور ظاہر ہے یہ دونوں باتیں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتی تھیں۔ اس کا نتیجہ حادثۂ کربلا کی صورت میں ظاہر ہوا۔ جو تاریخ انسانیت کا اتنا بڑا المیہ ہے کہ اس کی نظیر نہیں پیش کی جا سکتی۔

● حادثۂ کربلا نے نہ صرف یزید کی رہی سہی ساکھ ختم کر دی بلکہ اس کے خلاف عالمِ اسلام میں عموماً اور حجاز یعنی مکہ اور مدینہ میں خصوصاً نفرت، بیزاری اور برہمی کی ایک لہر پیدا کر دی۔ یہ ایسا دل دوز حادثہ تھا جس کی نظیر چشمِ فلک نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ زمین لرز اٹھی، آسمان کانپ گیا۔ شجر و حجر تھرا اٹھے اور کروبیاں تلملا اٹھے، جگر گوشۂ بتول اور سبطِ رسولؐ کا اتنا بے دردانہ قتل کوئی معمولی حادثہ تو نہ تھا جسے معمولی سمجھ کر نظر انداز

کم کر دیا جاتا۔

اس حادثے کے بعد بھی اگر یزید سنبھل جاتا، اپنے طرز عمل میں تبدیلی کر لیتا، اپنے عادات بد یکسر بدل دیتا، تائب ہوتا اور خالص قرآن و سنّت کی حکومت قائم کر دیتا تو شاید حالات سدھر جاتے۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ ایک اور کربلا کا سامان کرنے لگا یعنی حضرت عبداللہؓ بن زبیر کے لیے اس نے احکام صادر کیے کہ ان سے بیعت لی جائے۔ اور اگر بہ آشتی وہ رضامند نہ ہوں تو جبر و جور سے کام لیا جائے۔

● — عبداللہ بن زبیر کوئی معمولی آدمی نہ تھے۔

یہ حضرت زبیر کے صاحبزادے تھے جن کا شمار عشرۂ مبشرہ میں ہوتا ہے۔ اور جن سے رسول اللہ صلعم کو اتنی محبت تھی کہ اپنا "حواری" بنا لیا تھا۔ یہ اسماء بنت ابی بکر کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ جنھوں نے غارِ ثور میں اپنے آپ کو خطرات و مہالک میں ڈال کر اللہ کے رسول ؐ کی خدمت کی تھی۔ یہ عائشہ صدیقہ رضؓ کے بھانجے تھے اور ان کے دامنِ علم و تربیت سے پورا فیض اٹھایا تھا۔ جو لوگ یزید کے ساتھ تھے اور ان سے برسرِ جنگ تھے وہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ ان سے بڑھ کر عابد شب زندہ دار اور صائم الدہر، متقی اور پرہیزگار کوئی نہیں تھا۔

ایک ایسے شخص سے جس کا دامن آئینے کی طرح صاف و شفاف ہو ایسا شخص بیعت لینا چاہے جو آلودگی سے بھرا ہوا ہو تو گو اس کی نوکِ خنجر سے ڈر کر لوگ اس کا دم بھرنے لگیں، لیکن دل سے تو کوئی ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔

● — عبداللہؓ بن زبیر کا معاملہ ابھی حل ہو رہا تھا کہ یزید کی عنانِ توجہ مدینہ منورہ کی طرف مبذول ہوئی۔

اہلِ مدینہ نے اب تک یزید کی بیعت نہیں کی تھی اور وہ اس پر بضد تھا کہ ان سے بیعت لی جائے۔ ادھر مدینہ والوں کو یہ اصرار تھا کہ وہ ایک فاسق و فاجر کے ہاتھ پر بیعت نہیں کر سکتے جب کہ اس کا دامن خونِ حسینؑ سے بھی رنگین ہے۔

ذرا طرزِ عمل کا فرق دیکھیے:

امیر معاویہ یزید کی ولی عہدی منوانے کے لیے مدینہ آئے تھے اور اہلِ مدینہ کے ساتھ انھوں

نے کسی طرح کی سختی اور قدرشناسی کا برتاؤ کرنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ لیکن یزید نے اپنی امارت کے لیے بھی مدینہ آنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ صرف فرامین صادر کرتا رہا کہ ان سے بیعت لی جائے۔

● ایک دوسری عظیم غلطی یزید سے یہ ہوئی کہ اس نے اہلِ مدینہ کے سربرآوردہ اصحاب کو دمشق بلایا اور تحائف کے نام سے رشوت دے کر انھیں ہمنوا بنانے کی کوشش کی۔

یزید کے اس اقدامِ ناروا نے بھی انھیں مشتعل کیا لیکن سب سے زیادہ جس چیز سے وہ متاثر ہوئے وہ "آنکھوں دیکھا حال" تھا۔

اب تک یزید کے، اس کے نظمِ مملکت کے اور سیاست کے بارے میں ان کے تاثرات "شنیدہ" تھے۔ یہاں آکر انھوں نے بچشمِ خود اسلام کی مظلومیت اور قرآن کا تعطل دیکھ لیا۔

یزید اگر مدینہ جاتا تو شاید انھیں رام بھی کر لیتا لیکن ان لوگوں نے دمشق آکر اسے برافگندہ نقاب دیکھ لیا۔ اب صلح و مفاہمت اور طاعت و بیعت کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

مدینہ واپس آکر ان لوگوں نے پہلے سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ یزید کے خلاف اظہارِ خیال کرنا شروع کر دیا۔ وہ سنی ہوئی باتوں کو تو جھٹلا سکتے تھے لیکن مشاہدات کی تردید تو نہیں کر سکتے تھے۔

● یزید اگر اہلِ مدینہ کو ان کے حال پر چھوڑ دیتا تو اس کی حکومت میں رخنہ نہ پڑتا۔ بلکہ عالمِ اسلام کی بیعتِ عام کے بعد شاید تفریق بین المسلمین کے اندیشے کے پیشِ نظر وہ بھی بیعت کے لیے ہاتھ بڑھا دیتے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ یزید نے مدینہ "فتح" کرنے کے لیے فوج بھیج دی اور اس فوج نے جو کچھ کیا اس کی تفصیل اپنے موقع پر گزر چکی ہے۔

ان حالات کے بعد یزید کے دامن پر دو بڑے بڑے دھبے نظر آنے لگے۔ ایک خونِ حسین ؓ کا، دوسرے تاراجیٔ مدینہ منورہ کا!

● لیکن یزید نے نہ خونِ حسین ؓ سے کچھ سبق لیا نہ تاراجیٔ مدینہ منورہ سے۔ اس نے ابنِ زبیر کو "فتح" کرنے کے لیے ایک دوسری فوج مکہ مکرمہ بھیج دی۔ جس طرح اس کی فوج نے مدینہ منورہ کا احترام ملحوظ نہیں رکھا تھا اسی طرح مکہ کا احترام بھی ملحوظ نہیں رکھا گیا۔

یہاں بھی محاصرہ کیا گیا، سنگ باری کی گئی اور خانۂ خدا کے رہنے والوں کو بے آبرو کیا گیا۔

● یہ حالات تھے جب یزید کا پونے چار سال حکومت کرنے کے بعد انتقال ہو گیا
یہ تاریخ اسلام کا بہت بڑا المیاتی مرحلہ تھا۔

یزید کی موت نے حالات کو بدلنے اور درو براہ کرنے کا ایک نادر موقع فراہم کر دیا تھا۔

● اور اس نادر موقع کی اہمیت اس وقت اور بڑھ گئی جب معاویہ بن یزید نے امارت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور دستبرداری اختیار کر لی۔

● اب صورت احوال یہ تھی کہ سارے عالم اسلام میں کوئی خلیفہ یا امیر نہیں تھا۔
دمشق کا ایوانِ امارت سنسان اور ویران پڑا تھا۔

عبداللہؓ بن زبیر کا کوئی حریف میدان میں موجود نہیں تھا، وہ بڑی آسانی سے سارے عالم اسلام کو زیر نگیں کر سکتے تھے۔

● لیکن ایسا نہیں ہوا، یہ نادر موقع ہاتھ سے نکل گیا۔

اگر حضرت عبداللہؓ بن زبیر دمشق تشریف لے جاتے اور انھوں نے خاندانِ بنو امیہ کے افراد اور افواج یزید کے سالاروں کی بات قبول کر لی ہوتی تو عالم اسلام میں کہیں سے بھی ان کے خلاف کوئی صدا بلند نہ ہوتی۔

● لیکن ابن زبیر نے بے لچک مزاج پایا تھا وہ ان ساز گار حالات سے فائدہ نہ اٹھا سکے دشمن نے اٹھا لیا۔

● مروان جو عبداللہ بن زبیر کی بیعت کے لیے بالکل تیار تھا یزید کی بیوی سے شادی کر کے خود خلیفہ بن گیا۔

● یہ وہی بدنام مروان ہے جو حضرت عثمان کے قتل کا اصل سبب تھا۔

● مروان نے وہ تمام ہتھکنڈے استعمال کیے جو ایک بادشاہ کر سکتا ہے، انعام رشوت، لالچ، جاگیریں، وعدے ــــ سب کچھ۔

● ابنِ زبیر نے یہ سب کچھ نہ کیا۔ وہ سمجھتے تھے میں حق پر ہوں اور حق اس کا سزاوار

ہے کہ اس کا ساتھ بغیر کسی طمع اور لالچ کے دیا جائے۔

● — مروان کا خیال تھا کہ حق کو دبایا بھی جا سکتا ہے اور خریدا بھی جا سکتا ہے چنانچہ جہاں اس نے موقع دیکھا حق کو دبایا اور جہاں موقع ملا حق کو خرید بھی لیا۔ اس نے اس عہد کو بھی یاد نہ رکھا جس کی بنا پر اسے امارت ملی تھی۔ اس نے یزید کی بیوی سے شادی کرتے وقت یہ عہد کیا تھا کہ ولی عہد خالد بن یزید کو بنائے گا۔ لیکن اس عہد پر عمل اس طرح کیا کہ یکے بعد دیگرے اپنے دو بیٹوں کو ولی عہد نامزد کر دیا۔

● — ابن زبیر کی حکومت عدل، انصاف، راستی، رواداری اور کتاب و سنت پر مبنی تھی، مروان ان چیزوں سے بہت دُور تھا۔ ابن زبیر بیت المال کا ایک پیسہ بھی غلط طور پر صرف کرنے کو تیار نہیں تھے نہ اپنے لیے نہ دوسروں کے لیے اور مروان پوری بے فکری سے بیت المال کو اپنی جاگیر سمجھ کر اپنے عیش و تنعم پر صرف کر رہا تھا اور دوسروں کو انعامات، جاگیریں اور عہدے بھی عطا کر رہا تھا۔ اس کا نتیجہ وہی ہوا جو حضرت علیؓ کے عہد میں ہو چکا تھا۔ ابن زبیر کے ساتھی ساتھ چھوڑتے گئے اور مروان کے ساتھیوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ اُن کی حکومت سمٹتی گئی اس کی حکومت پھیلتی اور وسیع ہوتی گئی۔ یہ بے دردی اور شقاوت کے ساتھ قتل کر دیے گئے اور وہ ایک مدّتِ مدید کے لیے حکومت اپنے اخلاف کے لیے محفوظ کر گیا۔

حضرت عبداللہؓ بن زبیر سے ذرا سی چوک ہو گئی۔ اگر انھوں نے مروان سے بیعت لے لی ہوتی اور کچھ عرصے کے لیے دمشق تشریف لے جاتے تو بارہ چودہ سو سال کی تاریخ ملوکیت کے مرگ آفریں دور کے بجائے جمہوریت کی داستانِ روح پرور ہوتی۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا!

ماندم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

جمہوریت کی محمل نظر سے ایسی اوجھل ہوئی کہ پھر نظر نہ آ سکی۔ عرصہ ہوا اقبال کا یہ نعرہ امتِ اسلامیہ کے کاخ و کو میں گونجا تھا:

جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول
منزل شناس جادۂ منزل نہ کر قبول

اور اب آثار کچھ ایسے ہیں کہ جمہوریت پھر عالمِ اسلام کا دورانِ خون بنتی جا رہی ہے :

سبق پڑھ پھر شجاعت کا صداقت کا عدالت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دُنیا کی امامت کا

دُنیا کی تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے کہ قومیں مرتی ہیں اور زندہ ہوتی ہیں۔ ایک فرد ایک شخص، ایک آدمی جب مرجاتا ہے تو وہ پھر زندہ نہیں ہو سکتا، لیکن ایک قوم جب مرتی ہے تو اس کی خاکستر میں زندگی کی چنگاری بھڑکتی رہتی ہے اور وقت آتا ہے کہ وہ انگڑائی لے کر اٹھتی ہے۔ قدرت اس سے قُم باذنی کہتی ہے اور وہ پھر سے زندہ ہو جاتی ہے۔

یہ صرف کوئی نظریہ یا فلسفہ نہیں ہے، حقیقت اور امرِ واقعہ ہے ہمارے سامنے چینی قوم کی مثال موجود ہے۔ یہ قوم مرچکی تھی، اس میں زندگی کے آثار باقی نہیں رہ گئے تھے۔ اس کے حصے بخرے دُنیا کی بڑی قوموں نے کر لیے تھے۔ چیانگ کائی شیک نے اسے فارموسا کے قبرستان میں دفن بھی کر دیا تھا۔

لیکن کیا چینی قوم مرگئی ؟

کیا وہ دُنیا سے ناپید ہو گئی ؟

واقعات و حقائق کا جواب نفی میں ہے۔

چینی قوم انگڑائی لے کر اٹھی۔ اور اس شان سے اٹھی کہ اسے دیکھ کر دوست اور دشمن سب کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا ____ کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے !

وہی گراں خواب چینی جن کے متعلق دُنیا نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب ان میں زندگی کی رمق بھی باقی نہیں ہے اس طرح سنبھلے کہ آج نہ صرف وہ زندہ ہیں بلکہ ایشیا کی قیادت کا خواب دیکھ رہے ہیں اور کچھ بعید نہیں اگر یہ خواب مستقبل قریب یا بعید میں شرمندۂ تعبیر بھی ہو جائے۔

اگر چینی قوم مرکر زندہ ہو سکتی ہے، اگر دوسری قومیں اور ملتیں احیاء کے دَور سے گزر سکتی

ہیں تو مسلمان قوم کیوں نہیں زندہ ہو سکتی۔ جب کہ مسلمان قوم اور دوسری قوموں میں ایک بہت بڑا فرق یہ ہے کہ دوسری قومیں ایک نسل، ایک خاک وطن اور ایک تہذیب سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور مسلمان قوم میں متعدد نسلیں اور متعدد تہذیبیں شامل ہیں، دوسری قوموں کو نیا خون نہیں ملتا اور مسلمان قوم میں نیا اور رواں دواں خون برابر شامل رہتا ہے لہٰذا کوئی وجہ نہیں ہے کہ یہ قوم ایک مرتبہ اور زندگی کی نعمتوں سے بہرہ ور اور ہم کنار نہ ہو۔ ضرور ہوگی:

دیکھئے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا؟
گنبد نیلو فری رنگ بدلتا ہے کیا؟

عہدِ بنو امیہ

(۲)

بنو مروان

از سنہ ۶۴ھ (سنہ ۶۸۵ء)

تا سنہ ۱۳۲ھ (سنہ ۷۴۹ء)

مروان بن الحکم

جس نے اُمویوں کے سر پر دوبارہ تاجِ شہریاری رکھا!

مروان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ جس کے ساتھ رہا اسے دھوکا دیا۔ جس سے عہد کیا اُسے توڑا۔ جس کا زیرِ بار احسان ہوا اس کا درپے آزار رہا۔

مروان اور اس کا خاندان

"مروان بنی امیۃ کی دوسری شاخ بنی العاص سے تھا۔ مروان کا باپ حکم ابن العاص حضرت عثمانؓ کا حقیقی چچا تھا۔ فتح مکہ کے دن مسلمان ہوا لیکن اس کے دل میں اسلام راسخ نہ ہوا تھا۔ اندرونی طور پر مسلمانوں کا دشمن رہا۔ اور اُن کے اسرار فاش کیا کرتا تھا۔ اس لیے رسول اللہؐ نے اس کو طائف جلاوطن کر دیا تھا۔ مروان اس زمانے میں صغیر السن تھا اس لیے وہ بھی باپ کے ساتھ طائف میں رہا۔ آخر زمانے میں حضرت عثمانؓ نے رسول اللہؐ سے اس کی واپسی کی اجازت حاصل کر لی تھی۔ اور اپنے زمانے میں انھوں نے اس کو مدینہ واپس بلالیا۔ آپ کو حکم اور مروان دونوں سے بڑی محبت تھی۔ حکم کی موت کے بعد مروان کو اپنے ساتھ رکھتے تھے اور اسے اپنا سکریٹری بنا لیا تھا۔ آپ کی مہر وغیرہ اسی کی تحویل میں رہتی تھی۔ اسی نے حضرت عثمانؓ کی طرف سے مصر کے والی کو لکھ دیا تھا کہ مصری باغیوں کے سرغنہ پکڑ کر قتل کر دیے جائیں۔ جس کے نتیجے میں حضرت عثمانؓ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔ جمل اور صفین کے معرکوں میں حضرت عائشہؓ اور امیر معاویہ کے ساتھ تھا۔ امیر

معاویہ نے اپنے زمانے میں اسے مدینہ کا والی بنا دیا تھا۔ ابن زبیر کے دعوائے خلافت تک وہ اسی عہدے پر تھا۔"

مروان کی محسن کشی پھر جب امیر معاویہ کے ہاتھ میں حکومت و امارت آئی تو یہی مروان تھا جو یزید کی ولی عہدی کا پُرجوش حامی تھا۔ وہی تھا جس نے والیٔ مدینہ کو مشورہ دیا تھا کہ اگر حسینؓ اور ابنِ زبیر یزید کی بیعت نہ کریں تو انھیں قتل کر ڈالو۔

لیکن یزید کے بعد خود مسندِ امارت پر بیٹھ گیا۔ اور خاندانِ یزید کا خاتمہ کر دیا۔ اور موروثی طور پر اپنے خاندان کے لیے امر امارت سونپ گیا۔

مروان کی بدعہدی مروان مسندِ امارت پر نہیں بیٹھ سکتا تھا اگر یزید کی بیوی ہمراہ نہ ہوتی۔ اس نے یزید کی بیوی سے عہد کیا کہ اپنا ولی عہد خالد بن یزید کو بنائے گا۔ لیکن :

"مروان نے حسان بن مالک کلبی کو جو خالد بن یزید کا سب سے بڑا طرف دار تھا لالچ اور فریب دے کر اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہی یہ تحریک پیش کرے کہ مروان کے بعد عبدالملک بن مروان اور اس کے بعد عبدالعزیز بن مروان خلیفہ بنائے جائیں۔ چنانچہ حسان بن مالک نے جامع دمشق میں مجمع عام کے روبرو کھڑے ہو کر کہا کہ ہم سن رہے ہیں کہ لوگ امیر المومنین مروان کے بعد خلافت کے معاملے میں ضرور جھگڑا کریں گے۔ لہٰذا میں اس خطرہ سے محفوظ رہنے کی ایک تجویز پیش کرتا ہوں اور ممکن ہے کہ امیر المومنین اور کافہ مسلمین اس کو پسند فرمائیں گے۔ وہ تجویز یہ ہے کہ امیر المومنین اپنے بعد اپنے بیٹے عبدالملک کو اور اس کے بعد عبدالعزیز کو خلافت کے لیے نامزد فرما دیں۔ اور لوگوں سے اس امر کے لیے بیعت لے لیں۔ اسی وقت لوگوں نے عبدالملک و عبدالعزیز کی ولی عہدی کے لیے بیعت کر لی۔"

مروان کے حالات و صفات "الفخریؒ کا بیان ہے :

معاویہ بن یزید کے بعد مروان بن حکم ابن ابی العاص بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف سریر آرائے حکومت ہوا۔ معاویہ بن یزید کے بعد لوگوں میں ایک خلفشار سا پیدا ہو گیا۔ اہلِ شام بنی امیہ کو چاہتے تھے اور دوسرے لوگ عبداللہؓ بن زبیر

کو پسند کرتے تھے۔ بنی امیہ کے حامیوں کی رائے غالب آئی۔ لیکن اب اس میں اختلاف پیدا ہو گیا کہ بنی امیہ میں سے کسے امیر بنایا جائے۔ کچھ لوگ تو خالد بن یزید بن معاویہ بن یزید کی طرف مائل تھے جو اگرچہ بڑا فصیح و بلیغ تھا بلکہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ کیمسٹری کا ماہر تھا لیکن وہ نو عمر تھا۔ کچھ دوسرے لوگ مروان بن حکم کی طرف مائل تھے۔ اس لیے کہ وہ بہر حال سن رسیدہ تھا۔ غرض یہ کہ لوگوں نے مروان کی بیعت کر لی۔ اس نے خود فوج کی قیادت کر کے مصر پر فتح حاصل کی۔ اسے ابن الطرید (نکالے ہوئے کا فرزند) کہا جاتا تھا۔ کیونکہ اس کے باپ حکم کو آنحضرتؐ نے مدینہ سے باہر نکال دیا تھا۔ جب عثمان بن عفان رضؓ خلیفہ ہوئے تو آپ نے حکم کو واپس بلوا لیا۔ عام مسلمانوں نے اس کی واپسی کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھا۔ آپ نے اس کے جواز کی یہ دلیل دی کہ آنحضرتؐ نے اسے واپس بلانے کا بھی وعدہ فرمایا تھا۔

مروان نے بیعتِ امارت کے بعد یزید بن معاویہ کی بیوی ام خالد سے شادی کر لی۔ تاکہ خالد لوگوں کی نظروں میں حقیر دکھائی دے۔

ایک دن خالد مروان کے پاس گیا تو اس نے خالد کو بیوقوف بنانے کے لیے اور شامیوں کی نگاہ میں اُسے حقیر ثابت کرنے کے لیے "اے ابن رطبہ" (تازہ کھجور کا بچہ) کہہ کر مخاطب کیا۔ خالد کو بڑی خجالت ہوئی۔ وہ اپنی ماں کے پاس گیا اور یہ واقعہ دُہرایا۔

ماں نے کہا: خبردار یہ بات کسی کو معلوم نہ ہو، تم نے مجھے یہ واقعہ بتا دیا ہے، میں اس کا بدلہ لے لوں گی۔"

مروان ایک شب اس کے پاس سویا تو اس نے اس کے منہ پر ایک گدا رکھ کر دبایا اور اس وقت تک دبائے رکھا جب تک مروان کا خاتمہ نہ ہو گیا۔ مروان نے نو ماہ کچھ دن حکومت کی۔

انتقال ۶۳ سال کی عمر میں مروان نے انتقال کیا۔ صرف نو مہینے تک مسندِ امارت پر متمکن رہا۔

عبدالملک بن مروان

عاقل و فرزانہ، عالم اور باجبروت فرمانروا

۶۵ سنہ ھ کے ماہ رمضان المبارک میں اپنے باپ مروان کے قتل یا ہلاکت کے بعد یہ مسند نشینِ امارت ہوا۔ یہ ۲۶ سنہ ھ میں پیدا ہوا اور ۳۹ سال کی عمر میں مالکِ تاج و تخت ہوا۔

عبدالملک کے خصائص

"الفخری" میں عبدالملک بن مروان کے متعلق مرقوم ہے:
یہ بڑا عاقل و فرزانہ، عالم اور باجبروت فرماں روا تھا۔ اس کا رعب و جلال، سیاست دانی اور حسنِ تدبیر مسلّم ہے۔ اس کے دور میں دفاتر کا کام جو پہلے فارسی میں تھا عربی میں کر دیا گیا اور استعماری برتاؤ شروع ہوا۔ یہ پہلا شخص ہے جس نے اپنی رعایا کو خلیفہ کے سامنے زیادہ گفتگو کرنے اور سوال و جواب کرنے سے روک دیا۔ حالانکہ پہلے ہر شخص اس کی جرأت کر سکتا تھا۔ اسی نے حجاج بن یوسف کو لوگوں پر مسلّط کیا۔ اسی نے مکّے پر حملہ کیا اور اسی نے پہلے مصعب بن زبیر کو بعد ازاں عبداللہ ابن زبیر کو قتل کیا۔

عبدالملک کے ۲ رُخ

اس سلسلے میں زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب یزید بن معاویہؓ نے اہلِ مدینہ و اہلِ مکّہ سے جنگ کرنے کے لیے فوج بھیجی تو عبدالملک کو انتہائی رنج پہنچا۔ اور اس نے کہا کہ کاش یہ آسمان ٹوٹ کر زمین سے مل جاتا۔ لیکن یہی عبدالملک جب خلیفہ ہوا تو اس نے یہی کچھ بلکہ اس سے زیادہ کیا۔ اور ابن زبیر کے محاصرے

کے لیے اور مکے پر حملہ کرنے کے لیے فوج بھیجی۔

خلافت سے پہلے عبدالملک یکے از فقہائے مدینہ تھے۔ انھیں "بام حرم" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ کیونکہ یہ مسجد میں زیادہ وقت تلاوتِ قرآن میں صرف کرتا تھا۔ جب اس کے باپ مروان کا انتقال ہوا اور اُسے خلافت کی خوشخبری دی گئی تو اس نے قرآن پاک کو بند کرتے ہوئے کہا ھٰذا فراق بینی وبینک (یہ میرے اور تیرے درمیان جدائی ہے) اس کے بعد وہ امورِ دنیا میں منہمک ہو گیا۔

کہا جاتا ہے کہ ایک دن عبدالملک نے سعید بن مسیب سے کہا کہ اے سعید میں نیکی کرتا ہوں تو اسے چھپاتا نہیں۔ اور بدی کرتا ہوں تو اس سے کوفت نہیں ہوتی۔

سعید بن مسیب نے کہا کہ اب تمھارے دل کی موت میں کوئی کسر نہیں رہی۔

مصعب بن زبیر عبداللہ بن زبیر کے بھائی مصعب بن زبیرؓ جو امیر عراق تھے بہت بہادر، خوبصورت، باوقار اور قابلِ تعریف تھے۔ انھوں نے سکینہ بنت حسینؓ اور عائشہ بنت طلحہ دونوں سے شادی کی تھی۔ یہ دونوں عزت، مال اور حسن میں تمام عورتوں سے بڑھ چڑھ کر تھیں۔ عبدالملک نے ایک دن اپنے ہم جلیسوں سے پوچھا کہ سب سے زیادہ بہادر کون ہے؟ لوگوں نے کہا آپ ہیں۔

عبدالملک نے کہا نہیں بلکہ سب سے بڑا بہادر وہ ہے جس نے سکینہ بنت حسین اور عائشہ بنتِ طلحہ دونوں کو یکجا کر دیا ہے۔ (یعنی مصعب)

جنگِ مکہ سے پہلے عبدالملک نے مصعب سے جنگ کرنے کی تیاری کی۔ جب اپنی بیوی عاتکہ بنتِ یزید سے رخصت ہونے گیا۔ تو وہ رخصت کرتے ہوئے رونے لگی اسے دیکھ کر اس کی کنیزیں بھی رونے لگیں۔ بہرحال وہ مصعب کے مقابلے کے لیے روانہ ہو گیا۔ سرزمین دجیل پر دونوں کا مقابلہ ہوا اور شدید جنگ کے بعد مصعب قتل کیے گئے۔ یہ ۷۱ھ کا واقعہ ہے۔

عبدالملک کی علمی منزلت عبدالملک بڑا ادیب، ذہین اور فاضل تھا۔ شعبی محدث کہتے ہیں کہ جس سے بھی میری علمی گفتگو ہوئی اس سے میں نے اپنے آپ کو بہتر پایا۔ لیکن عبدالملک ایسا شخص ہے کہ جو بات بھی کی اور جو شعر بھی پڑھا اس پر

اس نے کچھ نہ کچھ اضافہ ضرور کیا۔

عبدالملک کی فراست عبدالملک سے کسی نے کہا کہ آپ پر بڑھاپا بڑی جلدی آگیا۔ اس نے جواب دیا: ممبر کے چڑھنے اترنے (یعنی خطابت) اور لحن (اعراب کی غلطی) کے اندیشے نے مجھے بوڑھا کر دیا۔

اس کی رائے کیسی ہوتی تھی اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ جب یزید نے اہلِ مدینہ سے جنگ کرنے کے لیے مسلم بن عقبہ کو بھیجا اور یہ وہاں پہنچا اور بنی امیہ نے مدینہ کے گرد گھیرا ڈال لیا اس وقت بن عقبہ نے عبدالملک سے مشورہ کیا۔ عبدالملک اس وقت نوعمر تھا اس نے رائے دی کہ: آپ اپنے ساتھیوں کو لے کر چل پڑیے جب مدینہ کا قریب ترین نخلستان آئے تو ٹھہر جائیے۔ لوگ اس کے سایے سے فائدہ اٹھائیں گے اور عمدہ کھجوریں کھائیں گے جب صبح ہو تو روانہ ہو جائیے اور مدینہ کو بائیں طرف رکھ کر چکر کاٹیے اور اہلِ مدینہ پر حرہ کی طرف سے سورج نکلتے وقت حملہ کر دیجیے۔ اس وقت جو لوگ مقابلے کے لیے سامنے آئیں گے ان کے منہ پر سورج چمک رہا ہوگا۔ اور آپ کے ساتھیوں کی پشت کی طرف سورج ہوگا۔ دھوپ اور چمک کی تکلیف آپ لوگوں کو نہ ہوگی بلکہ مدینے والوں کو ہوگی۔ اس کے بعد اللہ کی مدد کے سہارے اُن سے جنگ کیجیے۔

عبدالملک کا وقتِ وفات عبدالملک جب سخت بیمار ہوا تو کہا کہ مجھے اونچی جگہ پر لے جاؤ۔ لوگ اسے بلند جگہ پر لے گئے تو اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ اے دُنیا تو بھی کیا اچھی چیز ہے، تیرا طویل وقت بھی مختصر اور تیری کثیر نعمت بھی تھوڑی ہے۔ مجھے تو دھوکے میں ڈالے رہی۔

عبدالملک کے بیٹوں کی ذہانت مرنے کے بعد اس کے فرزند ولید نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ اور اس کے دوسرے فرزند ہشام نے یہ شعر پڑھا:

فما کان قیس ھلکہ ھلک واحد ولکنہ بنیان قوم تھدما

یعنی قیس کی موت ایک آدمی کی موت نہیں بلکہ وہ ایک پوری قوم کی بنیاد کا انہدام ہے

ولید نے کہا کہ چپ رہو۔ یہ تو تم شیطان کی زبان سے بول رہے ہو یہ شعر کیوں نہیں پڑھتے:

جب ایک سردار گزر گیا تو دوسرا اس کی جگہ آگیا جو بزرگوں کی بات کہتا بھی ہے اور کرتا بھی ہے۔

توابین کا خاتمہ

کوفہ کے ایک ممتاز بزرگ سلیمان بن صرد شیعانِ علی کا مرکز تھا۔ لیکن جب حضرت امام حسین کربلا تشریف لائے تو سلیمان بن صرد اور ان کے ساتھی آپ کی کوئی مدد نہ کر سکے اور کربلا کا خونیں حادثہ پیش آگیا۔ اس غلطی پر ان کو اور ان کی جماعت کو بڑی ندامت و شرمندگی تھی۔ انھوں نے اس کفارہ میں قاتلانِ حسین سے انتقام لینا اپنا فرض قرار دیا اور "توابین" اپنا لقب رکھا۔ مروان کے زمانے میں جب ان کی قوت مضبوط ہو گئی تو یہ لوگ چھ ہزار کی جمعیت کے ساتھ نکلے اور حضرت امام حسینؓ کے مزار کی زیارت کرتے ہوئے شام کی طرف بڑھے۔

اس زمانہ میں عبداللہ بن زیاد عراق کی بعض مہموں میں مصروف تھا اس لئے اس کا اور توابین کا سامنا ہو گیا۔ دونوں میں بڑی خونریز جنگ ہوئی۔ توابین بڑی جانبازی سے لڑے لیکن آخر میں انھیں شکست ہوئی۔ سلیمان بن صرد اور ان کے تمام بڑے بڑے ساتھی کام آئے اور چھ ہزار توابین میں سے بہت تھوڑی تعداد زندہ بچی۔ اس جماعت کا آغاز مروان کے زمانے میں ہوا لیکن خاتمہ عبدالملک کے زمانے میں ہوا۔

اب میں تاریخ "طبری" سے توابین کے شوقِ شہادت اور جرأتِ ایمانی کے کچھ واقعات پیش کرتا ہوں۔

یہ توابین کس دم خم کے تھے۔ طبری کی روایت ہے:

"ابن صرد نے ایک حربی کمان پر زور دے کر لوگوں سے اس طرح خطاب کیا:
ایہا الناس! جو لوگ رضائے خدا اور جزائے آخرت کے خیال سے شریک ہوئے ہیں وہ ہمارے اور ہم ان کے ہیں، ان پر خدا کی رحمت نازل ہوا حیات میں بھی اور موت میں بھی اور جو لوگ دنیا اور حطام دنیا کی ہوس رکھتے

ہیں وہ سن لیں۔ نہ ہمیں مالِ غنیمت ملنے والا ہے نہ ہمارے پاس سیم وزر ہے نہ خز و حریر ہے، ہمارے کاندھوں پہ تلواریں ہیں۔ ہمارے ہاتھوں میں سنانیں ہیں۔ بس اتنی زادِ راہ ہے جس قدر کہ دشمن تک پہنچنے میں کفایت کرے۔ تو جس کسی کا مقصود اس کے علاوہ ہو اُسے ہمارے ساتھ نہ آنا چاہیے"

سلیمان بن صرد کی شہادت

صبح کو ادہم باہلی دس ہزار کا لشکر لے کر وارد ہوا۔ اسی وقت ہنگامہ کارزار گرم ہو گیا۔ دن چڑھے تک بہت سخت جنگ ہوتی رہی۔ اس کے بعد اہلِ شام ہر طرف سے توابین پر ٹوٹ پڑے سلیمان نے جو اپنے اصحاب کو اس مصیبت میں دیکھا تو گھوڑے سے اتر پڑے اور ندا کی۔ بندگانِ خدا جسے اپنے پروردگار سے ملاقات کرنا منظور ہو، جسے اپنے گناہ سے توبہ، اپنے عہد کو پورا کرنا مقصود ہو وہ میرے ساتھ آئے، یہ کہہ کر میان کو توڑ ڈالا۔ بہت سے لوگ ان کی آواز پر اتر پڑے، یہ سب لوگ سلیمان کے ساتھ پیادہ چلے۔

اب انھوں نے ایسی شمشیر زنی کی کہ اہلِ شام میں کشتوں کے پشتے لگا دیے اور بہت سے شامیوں کو زخمی کر دیا۔ حصین نے ان کے ثباتِ قدم ان کی سطوت کو دیکھ کر پیادوں کو بھیجا کہ ان کو تیروں کا نشانہ بنائیں۔ اب سواروں نے ان کو ہر طرف سے گھیر لیا۔ ایسی حالت میں سلیمان بن صرد قتل ہو گئے۔ ان کو یزید بن حصین نے تیر مارا تیر کھا کر گرے۔ پھر حملہ کیا۔ پھر گرے۔ اس کے بعد مسیب نے علم اٹھا لیا اور سلیمان سے خطاب کر کے کہا۔ بھائی خدا کی رحمت ہو تم پر جو کہا تھا وہی کیا اور جو تمھارے ذمے تھا اس کام کو تم نے پورا کر دیا۔ ہمارے ذمے جو کام ہے وہ ابھی باقی ہے۔ یہ کہہ کر علم لے کر مسیب نے حملہ کیا اور ایک ساعت لڑتے رہے۔ اس کے بعد واپس آئے پھر حملہ کیا اور لڑے پھر واپس آئے۔ اسی طرح بہت دفعہ حملہ کر کے واپس آئے پھر قتل ہو گئے۔

کیا عبدالملک کی خلافت جائز تھی؟

سیوطی نے اس بحث پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

اس کے والد نے اس کو اپنی زندگی میں ولی عہد بنایا۔ چونکہ یہ زمانہ عبداللہ بن زبیرؓ کی خلافت کا تھا اس لیے عبدالملک کی ولی عہدی خلافت صحیح و درست نہیں۔ عبداللہؓ بن زبیرؓ کی زندگی میں اس نے مصر و شام پر قبضہ کر لیا تھا۔ پھر ابن زبیرؓ کی شہادت سنہ ۷۳ھ کے بعد عراق پر بھی قابض و متصرف ہو گیا۔ اور بعد شہادت ابنِ زبیر سنہ ۷۳ھ سے اس کی خلافت صحیح ہو سکتی ہے۔

عبدالملک کے کارنامے

اسی سال سنہ ۷۳ھ میں عبدالملک کے سالارِ اعلیٰ حجاج بنِ یوسف نے کعبہ کو منہدم کر کے از سرِ نو تعمیر کیا۔

۲: اسی سال حجاج کے اشارہ پر ایک شخص نے زہر کا بجھا ہوا برچھا ابن عمر کو مارا جس کی سمیّت سے ان کا انتقال ہو گیا

۳: صحابہ کی بے حرمتی۔ سنہ ۷۴ھ میں حجاج نے باشندگانِ مدینہ کو ذلیل کیا اور باقی ماندہ صحابہ کے ساتھ نہایت سخت برتاؤ کیے۔ انسؓ، جابر بن عبداللہؓ، سہل بن ساعد ساعدی کے ہاتھ پاؤں بندھوا کر رسوا کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

۴: سنہ ۷۵ھ میں عبدالملک نے لوگوں کے ساتھ حج کیا اور اسی سال حجاج کو عراق کا گورنر بنایا۔

۵: سنہ ۷۷ھ میں مملکت روما کا مشہور شہر ہرقلہ فتح ہوا۔ اور اسی سال عبدالعزیز بن مروان نے مصر کی جامع مسجد کو منہدم کر کے چاروں طرف کی زمین اس میں شامل کر کے اسے وسیع و کشادہ طریقے سے تعمیر کیا۔

۶: سنہ ۸۲ھ میں مصیعتہ کے اطراف کا قلعہ سنان فتح ہوا اور اسی سال مغرب میں آرمینیہ صہاجہ کی جنگ ہوئی۔

۷: سنہ ۸۳ھ میں حجاج نے شہر واسط کی بنیاد رکھی۔

۸: سنہ ۸۴ھ میں مصیصہ فتح ہوا۔ اور مغرب کی وادیوں پر اسلامی قبضہ ہوا۔

۹: ۸۴ھ میں عبدالعزیز بن ابو حاتم بن نعمان باہلی نے شہر اردبیل و برذعہ آباد کیے۔

۱۰: ۸۶ھ میں قلعہ اخرم و قلعہ بولق فتح ہو گئے۔

۱۱: اسی سال ماہ شوال ۸۶ھ میں عبدالملک بن مروان نے انتقال کیا۔ اور ۷ لڑکے وارث چھوڑے۔

ابنِ عُمرؓ کا قول

ابن عمرؓ کا قول ہے کہ لوگ بیٹے پیدا کرتے ہیں لیکن مروان نے باپ پیدا کیا۔

عبادہ بن نسی کا بیان ہے کہ کسی نے عبداللہ ابن عمر سے پوچھا آپ قریش کے مشہور عالم ہیں لیکن آپ کے بعد ہم کس سے مسائل دریافت کریں تو ابن عمر نے جواب دیا مروان کا بیٹا عالم ہے اس سے پوچھنا۔

عبدالملک کی رائے ابن زبیر کے بارے میں

بیان کیا جاتا ہے کہ یزید نے جب مکہ پر فوج کشی کی تو عبدالملک نے کہا معاذ اللہ حرم کعبہ پر چڑھائی؟

یحییٰ غسانی کا بیان ہے مسلم بن عقبہ (سالار یزید) مدینہ میں داخل ہوا تو مسجد نبوی میں جا کر عبدالملک کے برابر بیٹھ گیا۔ اس پر عبدالملک نے مجھ سے کہا کیا تم بھی اسی لشکر میں ہو میں نے کہا جی ہاں۔ تو عبدالملک نے کہا تمہیں معلوم ہے کہ کس کے مقابلے میں آ رہے ہو؟ سنو عبداللہ ابن زبیر جو عہدِ اسلامی میں سب سے پہلے پیدا ہوئے سرورِ عالم ؐ کے حواری زبیر اور ذات النطاقین اسماء بنتِ ابی بکر کے بیٹے ہیں اور ایسے محبوب ہیں جنہیں رسول اللہ ؐ نے اپنی چبائی ہوئی کھجور خود چٹائی ہے۔ بجز اجب میں ان کے پاس دن کے وقت گیا تو انہیں روزہ دار پایا اور جب رات کے وقت ان کے پاس پہنچا تو انہیں نماز پڑھتے دیکھا اگر سبھی روئے زمین کے تمام باشندے اکٹھا ہو کر انہیں قتل کر دیں گے تو اللہ تعالیٰ تمام قتل کرنے والوں کو دوزخ میں اوندھے منہ جھونک دے گا۔ لیکن عبدالملک نے خود خلیفہ بننے کے بعد حجاج کے ذریعے مکہ پر چڑھائی کی اور حجاج کے لشکر نے عبداللہ ابنِ زبیرؓ کو شہید کر دیا۔

عبدالملک کے اولیات

۱: یحییٰ بن بکیر نے امام مالک کی زبانی لکھا ہے کہ عبدالملک ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے دینار و اشرفیوں پر آیاتِ الٰہی کندہ کرائیں۔

۲: مصعب عمیر کا بیان ہے کہ عبدالملک نے اشرفی کے ایک رخ پر قل ھو اللّٰہ احد اور دوسرے رخ پر لا الٰہ الا اللّٰہ کندہ کرایا۔ اس دینار کے اطراف میں سنہرے دائرہ پر ٹکسال کا نام اور دائرہ کے باہر محمد رسول اللّٰہ ارسلہ اللّٰہ بالھدیٰ و دین الحق کندہ ہوتا تھا۔

۳: عسکری نے اوائل میں اسناد کے ساتھ لکھا ہے کہ عبدالملک ہی وہ پہلا شخص تھا جو اپنے فرامین و سرکاری کاغذات کی پیشانی پر قل ھو اللّٰہ احد اور رسولِ اکرم کی ثنا اور سنہ و تاریخ لکھا کرتا تھا۔

عمرو بن سعید بن عاص کا قتلِ ناحق

سب سے پہلے اسی نے اسلام سے غداری کی۔ اور خلفاء کے دربار میں لوگوں کو بات کرنے کی ممانعت کی اور امر بالمعروف سے روکا۔ علاوہ ازیں کلبی کے حوالہ سے مرقوم ہے کہ مروان بن حکم نے اپنے بیٹے کے بعد عمرو بن سعید بن عاص کو ولیعہدِ حکومت بنایا تھا لیکن عبدالملک بن مروان نے اسے قتل کرادیا۔ اس قسم کا قتل اسلام میں پہلی غداری ہے۔

۷۵ھ میں بمقام مدینہ طیبہ عبدالملک بن مروان نے خطبہ دیا۔ اور حمد و ثنا کے بعد کہا: حضرت عثمان کی مانند میں ضعیف خلیفہ نہیں، امیر معاویہ کی طرح سست نہیں، یزید کی طرح کمزور رائے نہیں رکھتا۔ اچھی طرح سن لو میرے پیش رو خلیفہ اپنے حالات میں گزر گئے لیکن میرے پاس ان تمام بیماریوں کا علاج شمشیرِ برّاں ہے تمہیں چاہیے کہ میری امداد کے لیے اپنے نیزے سیدھے کرلو۔

سیوطی کی رائے عبدالملک کے بارے میں

میں جلال الدین سیوطی کہتا ہوں کہ عبدالملک اور حجاج میں کوئی فرق نہیں دونوں برابر ہیں۔ عبدالملک ہی نے حجاج کو صحابہ و ممتاز مسلمانوں پر حاکمِ اعلیٰ بنایا جس نے مسلمانوں کو ذلیل و خوار کیا، مارا پیٹا گالیاں دیں، صحابہ و تابعین کا قتلِ عام کیا۔ اور سب سے بڑا ظلم یہ کیا کہ مشہور صحابی حضرت انس رض

کی مشکیں کسوائیں اور طرح طرح کی سخت ترین تکلیفیں پہنچائیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے ظالم کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔

عبدالملک اور شعر و شاعری عبدالملک شاعر بھی تھا۔ اس کا دیوان ادب میں ایک بلند مقام رکھتا ہے۔

حوصلہ مندی ابن عساکر نے ابراہیم بن عدی کی زبانی لکھا ہے: عبدالملک کو ایک رات چار مشکلیں پیش آئیں لیکن نہ وہ گھبرایا نہ اس کے چہرے پر شکن پیدا ہوئی۔ عبیداللہ بن زیاد کا قتل، حجاز میں حبیش بن دلجہ کا مارا جانا۔ شہنشاہ روم کی کشیدگی کی خبر، اور دمشق پر عمرو بن سعید کے حملے کی اطلاع پائی۔

درباری شاعر کی قدردانی ابو عبیدہ کا بیان ہے عبدالملک کے روبرو اخطل شاعر نے زمزمہ سرائی کی تو عبدالملک نے اپنے غلام سے کہا اسے لے جاؤ۔ اور اسے اتنی دولت دو کہ اس کی خواہش پوری ہو جائے۔ اس کے بعد کہا ہر قوم میں ایک شاعر ہوتا ہے اور اخطل بنو امیہ کا شاعر ہے۔ اصمعی کا بیان ہے عبدالملک نے ایک دن اخطل سے کہا شراب کے صفات بیان کرو۔ چنانچہ اس نے کہا شراب نوشی کے بعد فوراً لذت و سرور ہوتا ہے لیکن آخر میں دردِ سر ہوتا ہے اور اس کے درمیان کی حالت ناقابلِ بیان ہے۔ عبدالملک نے کہا کچھ تو بتاؤ۔ تو کہا اے امیرالمومنین آپ کی تمام مملکت میرے جوتے کے نعل سے بھی زیادہ حقیر و کمزور نظر آتی ہے۔ یہ بہادری و ترنگ کا زمانہ ہوتا ہے۔

وفات ثعالبی کا بیان ہے عبدالملک کہتا تھا میری پیدائش، دودھ چھڑائی، ختمِ قرآن، بلوغ، ولی عہدی، خلافت، یہ سب ماہ رمضان ہی میں ہوئی اور مجھے خوف ہے کہ ماہ رمضان ہی میں میرا انتقال ہوگا۔ لیکن ماہ رمضان ۸۶ھ کے ختم پر موت سے اطمینان ہوا ہی تھا کہ ماہِ شوال میں انتقال ہو گیا۔

ولید بن عبد الملکؒ

اس عہد کی داستانِ فتح و ظفر

گو علم کے ایوان میں ولید کی کوئی قدر و منزلت نہیں تھی، بالکل جاہل تھا لیکن حوصلہ مند، غیور اور اولو العزم فرماں روا تھا۔ "الفخری" کے بیان کے مطابق اس نے کئی بڑی بڑی مسجدیں تعمیر کرائیں۔ جامع دمشق (۸۷ھ) جامع اقصیٰ اور جامع مدینہ (۸۷ھ) کا شمار اس کے کارناموں میں ہے۔ جذام زدہ لوگوں کو اس نے بھیک مانگنے سے منع کر دیا۔ اور ان کے لیے وظیفے مقرر کر دیے۔

فتوحات اور کشور کشائی فتوحات اور کشور کشائی کے اعتبار سے بھی ولید کا دور شاندار قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کے عہد میں مسلمانوں کے قدم خاکِ اندلس تک جا پہنچے۔ اس کے عہد میں بخارا، سمرقند و کاشغر کا دور دراز علاقہ مسلمانوں کے قبضے اور تسلط میں آ گیا۔

ذوقِ تعمیر ولید کو عمارتیں بنانے کا بھی حد سے زیادہ شوق تھا۔ اس نے بہت سی شاندار اور نظر افروز عمارتیں تعمیر کرائیں۔ یہ شوق اتنا زیادہ بڑھا کہ وقت کا فیشن بن گیا۔ اس کی دیکھا دیکھی لوگ ہر وقت اسی طرح کی باتوں کا چرچا کیا کرتے تھے۔

ظلم و ستم کی کثرت علامہ سیوطی کا بیان ہے:
ابو نعیم نے اپنی کتاب حلیہ ابن شوذب کے حوالے سے عمرؒ بن عبد العزیز

کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ ولید بن عبدالملک شام میں، حجاج عراق میں، عثمان بن حیارہ حجاز میں اور قرہ بن شریک مصر میں ظالم حاکم ہیں اور پوری دنیا میں ظلم و ستم ہو رہا ہے

اپنے بارے میں ولید کا سوال

ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیر میں ابراہیم بن زرعہ کی زبانی لکھا ہے کہ ولید بن عبدالملک نے مجھ سے پوچھا کہ اے ابراہیم میرے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے؟ میں نے عرض کیا اے امیر المومنین آپ ہی فرمائیے کہ آپ اور داؤدؑ میں سے کون برتر ہے؟ تو ولید نے کہا داؤد کو اللہ نے نبوت و خلافت دونوں چیزیں عنایت کی تھیں۔ نیز قرآن کریم میں ان کی بابت لکھا ہے اے داؤد! ہم نے آپ کو خلیفہ بنایا ہے انھوں نے اپنے دور میں جہاد بھی کیا اور ممالک بھی فتح کیے۔ اسی طرح میں نے جہاد و فتوحات حاصل کیں اور ۸۷ھ میں بخارا جیسی مملکت پر قبضہ کر کے اسلام کا ولیدی پرچم لہرایا۔ علاوہ ازیں میں نے اپنے دور میں یتیموں کے خلتے کرائے، ان کی تعلیم و تربیت کے مراکز قائم کیے۔ اپاہج خانے بنوا کر معذوروں کی خدمت کے لیے نوکر چاکر وغیرہ مقرر کیے۔ اندھوں کے کام کاج کے لیے خادم مہیا کیے۔ مسجد نبوی ؐ کی تعمیر و توسیع کی، عالموں کی تنخواہیں مقرر کیں، کمزوروں اور فقیروں کے کھانے پینے کا معقول انتظام کیا۔ اور دستِ سوال دراز کرنے کو قطعاً ممنوع ٹھیرایا۔ نیز امورِ مملکت کی انجام دہی کے لیے قواعد و ضوابط مقرر کیے۔

فتوحات اور داد و دہش

ابن ابی عطیہ کا بیان ہے اللہ تعالیٰ ولید بن عبدالملک پر رحم و کرم کرے۔ اس نے ہندوستان و اسپین فتح کیا۔ اور ۹۳ھ میں سمرقند کو زیرنگین کیا۔ دمشق کی جامع مسجد تعمیر کی۔

ولید بن عبدالملک وہ بادشاہ تھا جو بیت المقدس کی مسجد کے فقیروں کو ہمیشہ اشرفیاں بانٹا کرتا تھا۔

سلیمان بن عبدالملک

فصیح البیان ۔ عادل اور منصف ۔ جہاد کا شائق

ولید کے بعد اس کا بھائی سلیمان بن عبدالملک تخت نشین ہوا۔

سلیمان کے خصائل و شمائل

اموی خاندان میں سلیمان اپنے عادات و خصائل اور شمائل و صفات کے لحاظ سے یکتا اور یگانہ تھا۔ مجموعی حیثیت سے اتنی جامع خوبیوں کا کوئی آدمی ۔ سوا عمرؓ بن عبدالعزیز کے ۔ اس خاندان میں کوئی اور شخص نہیں گزرا۔ حددرجہ فصیح اللسان اور شیریں گفتار، عادل اور منصف، جہاد کا شائق اور خدا سے ڈرنے والا۔

ایک بدعت شنیعہ کا خاتمہ

عبدالملک اور اس کے حکام و عمال کے وقت سے یہ رسم پڑ گئی تھی کہ نماز با جماعت امیر یا حاکم تاخیر سے پڑھاتا تھا۔ بعض اکابر امت اس صورت احوال سے سخت دلگیر اور پریشان تھے۔ اگر جماعت ترک کرتے ہیں تو یہ بھی معیوب، دیر سے پڑھتے ہیں تو یہ بھی گناہ۔ آخر انھوں نے تدبیر یہ نکالی کہ ٹھیک وقت پر نماز تنہا پڑھ لیا کرتے اور مسجد میں آکر جماعت میں بھی خواہ کتنی ہی دیر سے ہو شریک ہو جاتے۔

سلیمان کے عہد میں اس بدعت شنیعہ کا خاتمہ ہوا۔ اور نماز ٹھیک وقت پر ہونے لگی۔ راگ رنگ اور رقص و سرود سے بھی اپنے پیش رووں کے برعکس سخت نفور تھا۔

یہ سلسلہ اس نے یکلخت بند کر دیا۔ شاید ان سب باتوں کا سبب یہ تھا کہ عمر بن عبدالعزیزؒ اس کے ندیم اور مشیر تھے۔

خلیفہ ہونے کے بعد سلیمان کی پہلی تقریر

سلیمان کا دورِ حکومت ۹۶ھ (۷۱۴ء) سے شروع ہو کر ۹۹ھ (۷۱۷ء) پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس مختصر سی مدت میں بھی اس نے بڑے روشن کارنامے انجام دیے۔ تخت نشین ہونے کے بعد اس نے جو پہلی تقریر کی وہ متعدد حیثیات سے اہم اور قابلِ غور ہے۔ اس نے کہا:

"دنیا دھوکے کا گہوارہ اور باطل کا نشیمن ہے۔ رونے والے کو ہنساتی ہے اور ہنسنے والے کو رلاتی ہے۔ بے خوف کو خوف زدہ کرتی اور خوف زدہ کو امن دیتی ہے۔ دولت مند کو محتاج کرتی ہے اور محتاج کو دولت مند بناتی ہے یہ اہلِ دنیا کو مائل کرنے والی اور ان کے ساتھ کھیلنے والی ہے۔

بندگانِ خدا! کتاب اللہ کو اپنا پیشوا بناؤ اور اس کے فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کرو۔ اسے اپنا رہنما بناؤ کہ وہ اپنے ماقبل کتابوں کی ناسخ ہے۔ اور خود اس کو کسی کتاب نے منسوخ نہیں کیا ہے۔

اللہ کے بندو! قرآن شیطان کے مکر کو اس طرح کھول دیتا ہے جس طرح صبح صادق کا نور رات کی ظلمت کو کافور کر دیتا ہے۔

عہدِ سلیمان کے خصوصیات اور حسنات

علامہ سیوطی نے سلیمان کے ذکر میں تحریر فرمایا ہے:-

یہ بنو امیہ کا بہترین بادشاہ تھا۔ سلیمان محدث تھا اس نے اپنے والد عبدالملک بن مروان اور عبدالرحمن بن ہبیرہ کے ذریعے احادیث بیان کی ہیں اور سلیمان بن عبدالملک بن مروان کے فرزند عبدالواحد اور زہری وغیرہ نے ہم تک روایات بہم پہنچائی ہیں۔ سلیمان بن عبدالملک نہایت مؤثر فصیح البیان، عادل اور جہاد کا متوالا تھا۔ ۶۰ھ میں پیدا ہوا سلیمان کے چند محاسن درج ذیل ہیں:

۱: عمرؓ بن عبدالعزیز جیسے شخص کو وزیر بنایا جو ہمیشہ نیک کام کرنے کی جانب مائل کرتا رہتا۔
۲: سلیمان ہی وہ صاحب خیر تھا جس نے حاجیوں کے معلموں کو یکلخت موقوف کر دیا۔
۳: عراق کے جیل خانوں سے تمام قیدی رہا کر دیے۔
۴: تمام بنو امیہ بادشاہ بہ تاخیر وقت نماز پڑھا کرتے تھے لیکن سلیمان نے بروقت نماز پڑھنے اور پڑھانے کی زندہ مثال قائم کی۔

ابن سیرین کا بیان ہے سلیمان بن عبدالملک پر اللہ رحم و کرم کرے اس نے اپنی خلافت کی ابتدا میں سب سے پہلے حکم دیا کہ بروقت نماز ادا کی جائے اور خلافت کے آخری زمانے میں بہتر کام یہ انجام دیا کہ ۹۹ھ میں عمر بن عبدالعزیز کو اپنا جانشین و خلیفہ بنایا۔ اس کی پرخوری کی حالت یہ تھی کہ ایک دفعہ ایک ہی دسترخوان پر ایک ہی وقت میں ستر انار، چھ ماہ کا بکری کا بچہ، چھ مرغیاں اور طائف کی تین پاؤ کشمش صاف کر گیا۔

دورِ سلیمانی کی فتوحات

سلیمان بن عبدالملک کے عہد خلافت میں حسب ذیل شہروں پر اسلامی پرچم لہرایا۔ جرجان، قلعۂ حدید، سردانیہ، شقا طبرستان اور شہر سیفیالہ وغیرہ۔

عمر بن عبدالعزیز کی نامزدگی آخری کارنامہ

عبدالرحمن بن حسان کنانی کا بیان ہے: سلیمان بن عبدالملک میدان جنگ میں دابق کے مقام پر دشمن کے ہاتھوں زخمی ہوئے اور مرض الموت کے زمانے میں رجا بن حیواۃ سے کہا میرے بعد کون خلیفہ ہوگا۔ پھر کہا میں اپنے کسی بیٹے کو خلیفہ منتخب کر دوں۔ رجاء نے کہا آپ کے فرزند اکبر یہاں موجود نہیں اور باقی بیٹے چھوٹے ہیں۔ تو سلیمان نے پھر پوچھا: بتاؤ تمھارا خیال کیا ہے؟ رجاء نے کہا عمر بن عبدالعزیز کو خلیفہ بنا دیجیے۔ سلیمان نے کہا مجھے خوف ہے اس تقرر سے میرے بھائی راضی نہ رہیں گے۔ رجاء نے پھر کہا یہ شرط کر دیجیے کہ عمر بن عبدالعزیز کے بعد یزید بن عبدالملک خلیفہ ہوگا۔ چنانچہ سلیمان نے کہا مناسب ہے یہی وصیت نامہ لکھو۔ اور اس کو لفافے میں بند کر کے سر بمہر کر دو۔ اور اس سر بمہر لفافے کو لیے

ہوئے باہر جاکر اعلان کرو کہ اس بند لفافے میں جس کا نام لکھا ہے اے لوگو اس کی بیعت کرو۔ چنانچہ میں باہر گیا اور امیر المومنین کا حکم سنایا، تو لوگوں نے پوچھا اس میں کس کا نام لکھا ہے۔ میں نے کہا لفافہ سر بمہر ہے اور اس کا مرقومہ نام مجھے نہیں معلوم، البتہ وفات کے بعد نام معلوم ہوگا۔ لوگوں نے جواب دیا ہم ایسی صورت میں بیعت نہیں کر سکتے۔ چنانچہ میں نے باہر جاکر سلیمان سے پورا ماجرا بیان کیا تو اس نے حکم دیا پولیس کی موجودگی میں ان سے بیعت لو اور جو انکار کرے اس کی گردن اڑا دو۔ چنانچہ میں نے اس طرح لوگوں کی بیعت لی۔

سلیمان کی خوئے انتقام

سلیمان میں بہت سی خوبیاں تھیں اور ان خوبیوں کا ذکر ہو چکا ہے۔ لیکن اس میں ایک بہت بڑا عیب بھی تھا۔

اور یہ عیب تھا جذبۂ انتقام!

وہ معاف کرنا نہیں جانتا تھا، جس سے ایک مرتبہ خفا ہو گیا اس کی خیر نہیں۔ ولی عہدی کے زمانے میں جن لوگوں سے کسی بات پر برہم ہوا تھا اور ان کا کچھ بگاڑ نہ سکا تھا تخت نشین ہونے کے بعد ان سے عبرت انگیز انتقام لیا۔ جو لوگ اس کے انتقام کا ہدف بنے ان میں یگانۂ روزگار علماء، قابلِ احترام تابعی، ناقابلِ فراموش سپہ سالار سب طرح کے لوگ تھے جس کی ضروری تفصیل مناسب مقام پر آئے گی۔

سلیمان کی وفات

سلیمان بن عبدالملک ۹۸ھ میں دمشق سے جہاد کے ارادے پر نکلا۔ اور قسطنطنیہ کی طرف فوج روانہ کر کے خود مقام دابق میں مقیم رہ کر اس یورش کو کامیاب بنانے کی کوشش کرتا رہا اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ سلیمان کو حالتِ جہاد ہی میں موت آئی۔ ۱۰ ماہ صفر ۹۹ھ بروز جمعہ سلیمان نے بمقام دابق متصل قنسرین وفات پائی۔ قریباً پونے تین سال خلافت کی اور ۴۵ سال کی عمر پائی۔ اس خلیفہ کے زمانے میں بھی مسلمانوں کو فتوحاتِ ملکی حاصل ہوئیں۔ خلافِ شرع کاموں کا رواج موقوف ہوا۔

عمر بن عبدالعزیز

عہد خلافت راشدہ کی تجدید واحیاء

صفات وحسنات، فضائل وشمائل

بنوامیہ کا عہدِ حکومت دنیاوی اعتبار سے جتنا کامیاب شاندار اور ممتاز نظر آتا ہے۔ دینی اور مذہبی حیثیت سے اتنا ہی افسوسناک، تکلیف دہ اور باعثِ الم ہے۔ اس عہد میں شریعت کی حکومت اُٹھ گئی تھی۔ اور خلیفہ کے اشارۂ چشم وابرو پر نظام حکومت چلتا تھا۔

لیکن عمر بن عبدالعزیزؓ اس خاندان میں ایک ایسے شخص تھے جنھوں نے اپنی مختصر ترین مدتِ خلافت میں عہد خلافتِ راشدہ کی یاد تازہ کردی۔

یہ مروان بن حکم کے پوتے تھے، ان کی والدہ حضرت عمرؓ کی پوتی تھیں لیکن طبیعت اور مزاج کے اعتبار سے انھیں اپنے دادھیال سے کوئی نسبت نہیں تھی، ان کی رگوں میں وہ خون دوڑ رہا تھا جو عمرؓ کا تھا، ان کی زندگی سراپا خشیّت وشریعت تھی۔ دائرۂ شریعت سے کبھی باہر قدم نہ نکالتے اور خدا کے خوف سے ہر وقت رقّت طاری رہتی اور لرزاں وترساں نظر آتے، یہ صاحبِ علم بھی تھے، صاحبِ تصوف بھی اور صاحبِ عمل بھی ان کی ذات میں وہ تمام خوبیاں اور صفات جمع تھیں جن کی توقع ایک سچے اور کھرے مسلمان سے کی جاسکتی ہے۔ انھوں نے ان تمام غلطیوں اور کوتاہیوں کی تلافی کی جو ان کے عہد سے پہلے سے ہوتی چلی آرہی تھیں۔ ۹۹ھ (۷۱۷ء) سے لے کر ۱۰۱ھ (۷۱۹ء) تک جلوہ گر رہے یعنی کل دو سال مدّتِ خلافت ہے۔

عمر بن عبدالعزیز کی اصلاحات

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے عہد میں جو اصلاحات نافذ کیے۔ ان میں شریعت کی روح پورے طور پر کارفرما نظر آتی ہے۔

عدی بن ارطاۃ کو ایک فرمان لکھا کہ ایمان چند فرائض، چند احکام اور چند سنن کا نام ہے جس نے ان اجزا کی تکمیل نہیں کی۔ اگر میں زندہ رہا تو ان تمام اجزا کو تمھارے سامنے واضح کردوں گا کہ تم اس پر عمل کرو اور اگر مر گیا تو مجھے تمھارے ساتھ رہنے کی حرص بھی نہیں ہے۔

چنانچہ عقائد و عبادات و اخلاق وغیرہ میں جو تغیر پیدا ہو چلا تھا، اسے پوری شدت کے ساتھ رد کیا۔ عقائد میں معبد جہنی اور غیلان دمشقی نے قضا و قدر کا پیچیدہ مسئلہ چھیڑ دیا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس سے توبہ کرائی اور محدثین و فقہاء کو لکھا کہ وہ ان خیالات کو قبول نہ کریں۔

حجاج کے زمانے میں زکوٰۃ کا نظام خراب ہو گیا تھا حضرت عمر بن عبدالعزیز نے عمال کو حکم دیا کہ وہ زکوٰۃ کے معاملے میں حجاج کی روش سے احتراز کریں۔ اور عدی بن ارطاۃ کو لکھا میں زکوٰۃ کے معاملے میں تم کو حجاج کی روش سے روکتا ہوں۔ وہ اس کو غیر محل سے لیتا تھا۔ اور بے محل صرف کرتا تھا خطوط میں لوگوں کو زکوٰۃ اور صدقات ادا کرنے کی تلقین کرتے تھے۔

تمام عمال کے نام فرمان جاری کردیا کہ ذمی مسلمانوں کے شہروں میں شراب نہ لانے پائیں اور شراب کی دکانوں کو حکماً بند کردیا۔

"لوگ شراب پی کر بدمستی میں نہایت برے کام کرتے ہیں اور اکثر لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ شراب پینے میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن جو چیز اس قسم کے کام کراتی ہے اس کے استعمال میں سخت نقصان ہے، خدا نے اس کے بدلے میں آب شیریں، دودھ اور شہد جیسی پینے کی چیزیں پیدا کی ہیں۔ جو شخص نبیذ بنائے وہ صرف چمڑے کے مشکیزے میں جس پر زفت کا روغن نہ ہو، کہ رسول اللہ ؐ نے اس قسم کے ظرف سے منع فرمایا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر کسی نے شراب پی تو اس کو سخت سزا دی جائے گی۔ اور جو چھپ کر پیے گا اس کو خدا عذاب دینے والا ہے"

فلاحِ عوام اور رفاہِ عام کے کام

وہ قرض دار جو ناداری کی وجہ سے اپنے قرض ادا نہ کر سکتے تھے۔ ان کے قرض کی ادائیگی کی ایک مد قائم کی۔ شیر خوار بچوں کے وظائف مقرر کیے۔ ایک عام لنگر خانہ قائم کیا جس سے فقرار اور مساکین کو کھانا ملتا تھا۔

تمام ملک کے حاجت مندوں میں صدقات تقسیم ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے ایک شخص کو غربار میں صدقات تقسیم کرنے کے لیے رقم بھیجنا چاہا۔ اس نے عذر کیا کہ میں ناواقفیت کی وجہ سے وہاں کے امیر و غریب میں امتیاز نہیں کر سکتا۔ فرمایا جو تمھارے سامنے ہاتھ پھیلائے اسے دے دینا۔

مہاجر بن یزید کا بیان ہے کہ ہم لوگ صدقہ تقسیم کرنے پر مقرر تھے۔ ایک ہی سال میں یہ حال ہو گیا تھا کہ ایک سال پہلے جو لوگ صدقہ لیتے تھے وہ دوسرے سال دوسروں کو صدقہ دینے کے قابل ہو گئے تھے۔

خاندانِ حجاج کی جلاوطنی

حجاج کے پورے خاندان کو جو سب سے زیادہ ظالم تھا یمن جلاوطن کر دیا۔ اور وہاں کے عامل کو لکھا کہ میں تمھارے پاس آلِ عقیل کو بھیج رہا ہوں جو عرب میں بدترین خاندان ہے اس کو اپنے حدود میں منتشر کر دو۔

حجاج سے تعلق رکھنے والے تمام عمّال کو ہر قسم کے ملکی حقوق سے محروم کر دیا۔

شبہہ کا فائدہ مجرم کو نہ کہ حکومت کو

ایک والی عبدالحمید کو لکھا کہ وسوسۂ شیطانی اور حکومت کے ظلم و جور کے بعد انسان کی بقا نہیں ہو سکتی اس لیے میرا خط ملتے ہی ہر حق دار کو اس کا حق ادا کرو۔ ظلم و جور کے جتنے وسیلے تھے سب یک قلم بند کر دیے۔ اموی دور میں ذرا ذرا سی بدگمانی اور سوئے ظن پر سزا دینا عام تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس طریقے کو بالکل بند کر دیا۔ موصل میں چوری اور نقب زنی کی وارداتیں بہ کثرت ہوتی تھیں۔ یہاں کے والی غسانی نے لکھا کہ جب تک لوگوں کو شبہہ میں نہ پکڑا جائے گا اور سزا نہ دی جائے گی اس وقت تک یہ وارداتیں بند

نہیں ہوسکتیں ۔ آپ نے لکھا : صرف شرعی ثبوت پر مواخذہ کرو ۔ اگر حق ان کی اصلاح نہیں کرسکتا تو خدا ان کی اصلاح نہ کرے ۔

ذمیوں کے ساتھ عمر بن عبدالعزیز کا برتاؤ

جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے بنو امیہ کی حکومت دینی نہیں دنیاوی تھی ۔ چنانچہ شریعت بالائے طاق رکھ دی گئی تھی اور حسبِ دل خواہ قوانین نافذ کرکے کام چلایا جارہا تھا ۔ انہی باتوں میں ایک بات یہ بھی تھی کہ ذمیوں سے یعنی ان اہلِ کتاب غیر مسلموں سے جو مسلمانوں کی ماتحتی میں رہ رہے تھے وہ حقوقِ شہریت چھین لیے گئے تھے جو اسلام نے انھیں عطا کیے تھے ۔ اسلام نے انھیں وہ تمام شہری اور انسانی حقوق دیے تھے ، جو اسلامی حکومت کے زیرِ سایہ کسی مسلمان کو حاصل ہوسکتے ہیں حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ان حقوق کو پھر سے بحال کیا ۔ اور اس مظلوم طبقے کو اس کا حق دلایا ۔ انھوں نے ذمیوں کی اور مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت میں سرمو فرق نہیں کیا ، ان کے مذہب میں کسی قسم کی دست اندازی نہیں کی ۔ جزیہ کی وصولی میں نرمی اور سہولت پیدا کی ، اُن کے لیے ہر طرح کی آسانیاں مہیا کیں ، عمال کو وقتاً فوقتاً احکام لکھتے رہتے ۔

نامہ بنام عدی بن ارطاۃ

عدی بن ارطاۃ کو لکھا کہ ذمیوں کے ساتھ نرمی برتو ، ان میں جو بوڑھا اور نادار ہوجائے اس کی کفالت کا انتظام کرو ۔ اگر اس کا کوئی صاحبِ حیثیت رشتہ دار ہو تو اسے اُس کی کفالت کا حکم دو ورنہ بیت المال سے کفالت کا انتظام کرو جس طرح اگر کوئی تمھارا غلام بوڑھا ہوجائے تو اسے یا تو آزاد کرنا پڑے گا یا موتے دم تک اس کی کفالت کرنا پڑے گی ۔

ذمی کے خون کی قیمت مسلمانوں کے خون کے برابر قرار دی ، ایک بار حیرہ کے ایک مسلمان نے ایک ذمی کو قتل کردیا حضرت عمر بن عبدالعزیز نے حیرہ کے حاکم کو لکھا کہ قاتل کو فوراً مقتول کے ورثاء کے حوالے کردو ۔ وہ چاہیں قتل کریں چاہیں معاف کردیں چنانچہ اس حکم پر قاتل کو حوالے کردیا گیا اور مقتول کے ورثاء نے اسے قتل کردیا ۔

ایک مرتبہ ایک مسلمان ربیعہ شعوذی نے ایک سرکاری ضرورت سے ایک خبطی کا گھوڑا بیگار

میں پکڑ لیا۔ اور اس پر سواری کی، حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس کو چالیس کوڑے لگوائے

خدا کی کتاب اور بادشاہ کی سند

شاہی خاندان سے ذمیوں کی زمینیں بھی واپس دلائیں۔ ایک ذمّی کی زمین عباس بن ولید کے قبضے میں تھی۔ اس نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے پاس دعویٰ کیا کہ عباس نے میری زمین پر غاصبانہ قبضہ کر لیا ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے عباس سے پوچھا تمھارے پاس اس کا کیا جواب ہے؟ انھوں نے کہا والد نے مجھے جاگیر میں دی تھی اور میرے پاس اس کی سند موجود ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا: خدا کی کتاب ولید کی سند پر مقدم ہے؟ اور ذمّی کی زمین واپس دلا دی۔

عیسائیوں کے گرجے کی واگزاری

دمشق کا ایک گرجا ایک عرصے سے ایک مسلمان خاندان کی جاگیر میں چلا آرہا تھا۔ عیسائیوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے پاس دعویٰ کیا، انھوں نے واپس دلا دیا۔ اسی طریقے سے ایک مسلمان نے ایک گرجا کی نسبت عذرداری کی کہ وہ اس کی جاگیر میں ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا اگر یہ عیسائیوں کے معاہدہ میں ہے تو تم اس کو نہیں پا سکتے۔
ابن اشعث کی بغاوت کی حمایت کے الزام میں حجاج نے عراق کے ذمیوں کے جزیہ کی مقدار بڑھا دی تھی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس اضافے کو گھٹا دیا۔

محمود و ایاز کا فرق ختم

مقدمات میں ذمیوں اور شاہی خاندان میں کوئی فرق نہ کرتے تھے دونوں کے ساتھ یکساں سلوک ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ ہشام بن عبدالملک نے ایک عیسائی پر مقدمہ دائر کیا۔ عمر بن عبدالعزیز نے ان دونوں کو برابر کھڑا کیا۔ ہشام کو یہ ناگوار ہوا۔ اس نے نخوت میں آکر عیسائی کے ساتھ سخت کلامی کی۔ عمر بن عبدالعزیز نے اس کو ڈانٹا اور سزا دینے کی دھمکی دی۔

والیِ خراسان کو حکم

ممالکِ محروسہ میں سرائیں بنوائیں۔ خراسان کے والی کو لکھا کہ وہاں کے تمام راستوں میں سرائیں تعمیر کرائی جائیں۔ سمرقند کے والی سلیمان بن ابی السری کو حکم بھیجا کہ علاقہ کے تمام شہروں میں سرائیں تعمیر کرائی جائیں۔ اور جو مسافر بھی

ادھر سے گزرے ایک شبانہ یوم اس کی میزبانی کی جائے۔ اس کی سواری کی حفاظت کی جائے۔ بیمار مسافروں کی دو دن مہمان داری کی جائے۔

اصلاحِ اخلاق و کردار

اہلِ عجم کے اثر سے حماموں کا عام رواج ہو گیا تھا جن میں عورتیں اور مرد بے باکانہ غسل کیا کرتے تھے۔ اور پردہ بلکہ شرم و حیا کا بھی کوئی لحاظ نہ رکھا جاتا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے عورتوں کو حمام میں جانے سے بالکل روک دیا اور مردوں کو حکم دیا کہ وہ بغیر تہ بند کے حمام میں غسل نہ کریں۔ اس حکم پر نہایت سختی کے ساتھ عمل کرایا جاتا تھا۔ اور اس کی خلاف ورزی پر سزا دی جاتی تھی۔

حمام کی دیواروں پر خلافِ شریعت تصویریں ہوتی تھیں، ایک مرتبہ انھیں خود اپنے ہاتھ سے مٹا دیا اور فرمایا اگر مصور کا نام معلوم ہوتا تو میں اس کو سزا دیتا۔

طبری کا بیان ہے کہ ولید عمارتوں کا بانی تھا اس لیے اس کے زمانہ کا عام مذاق یہی ہو گیا تھا اور لوگ آپس میں صرف تعمیر اور عمارتوں پر گفتگو کرتے تھے۔ سلیمان کو عورتوں اور نکاح سے دلچسپی تھی، اس لیے اس کے زمانے میں اسی کا چرچا تھا اور لوگوں کا موضوعِ بحث شادی اور لونڈیاں تھیں۔ لیکن جب عمر بن عبدالعزیزؒ نے تختِ خلافت پر قدم رکھا تو مذہب، عبادت اور اس کی تفصیلات موضوعِ گفتگو بن گئیں۔

حضرت علیؓ پر سب و شتم کا خاتمہ

اموی خلفاء نے ایک بری بدعت یہ جاری کی تھی کہ وہ خود اور ان کے تمام عمال خطبے میں حضرت علیؓ پر لعن و طعن کیا کرتے تھے اور اسے خطبے کا جزو بنا دیا تھا حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اسے بالکل بند کر دیا۔ اور تمام عمال کے نام فرمان جاری کر دیا۔ کہ حضرت علیؓ کے متعلق جو نازیبا الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں وہ بند کر دیں اور اس کی جگہ کلام اللہ کی یہ آیت داخل کی:

ان اللہ یامر بالعدل والاحسان	اللہ تعالیٰ عدل، احسان اور قرابتداروں
وایتاء ذی القربیٰ وینھی عن	کو دینے کا حکم دیتا ہے اور فحش، برائی اور
الفحشاء والمنکر والبغی یعظکم	ظلم سے منع کرتا ہے کہ شاید تم سمجھو۔
لعلکم تذکرون ○	

الخضری کا بیان ہے:

ان کے اس اقدام کی بعض شعراء نے بھی تعریف کی ہے مثلاً کثیر عزّہ کہتا ہے:

ولیت فلم تشتم علیا ولم تخف بریا ولم تتبع مقالۃ مجرم

وقلت فصدقت قلت بالذی فعلت فاضحی راضیا کل مسلم

یعنی: تم امیر المومنین ہوئے مگر تم نے علیؓ کو گالیاں نہ دیں۔ نہ تم کسی بے جرم سے ڈرے اور نہ کسی مجرم کی باتوں کی پیروی کی۔

تم نے جو کچھ کہا اس کی اپنے عمل سے تصدیق کر دی اور ہر مسلمان خوش ہو گیا۔

شریف رضی موسوی نے ان کا مرثیہ لکھا تھا۔ وہ کہتا ہے:

یا ابن عبد العزیز لو بکت العین فتی من امیۃ لبکیتک

انت انقذ تنا من السب والشتم فلو امکن الجزاء جزیتک

اے عبد العزیز! اگر میں بنی امیہ کے کسی نوجوان پر روتا تو بس تجھ پر روتا

تو نے ہمیں سب و شتم سے بچایا اگر اس کا بدلہ دے سکتا تو میں تجھے دیتا

خوفِ خدا، رقتِ قلب اور گدازِ طبع

معمول تھا کہ عشا کے بعد تنہائی میں بیٹھ کر رو رو کر دعائیں کرتے تھے۔ اسی حالت میں آنکھ لگ جاتی۔ بیدار ہوتے تو پھر یہی مشغلہ جاری ہو جاتا اور ساری ساری رات اسی طرح گزر جاتی۔

جب لوگ آپ سے گریہ و بکا کے متعلق کچھ کہتے تو آپ فرماتے تم لوگ رونے پر مجھے ملامت نہ کرو کیونکہ اگر فرات کے کنارے بکری کا ایک بچہ بھی ہلاک ہو جائے تو اس کے بدلے میں عمر پکڑا جائے گا۔

اپنے ایک فوجی افسر سلیمان بن ابی کریمہ کو ایک مرتبہ لکھا کہ خدا کی عظمت و خشیت کا سب سے زیادہ مستحق وہ بندہ ہے جس کو اس نے اس آزمائش میں ڈالا جس میں کہ میں ہوں، خدا کے نزدیک مجھ سے زیادہ سخت حساب دینے والا اور اگر اس کی نافرمانی کروں تو مجھ سے زیادہ ذلیل کوئی نہیں۔

بیت المال کے مال سے گریز بیت المال سے معمولی فائدہ بھی اٹھانا گوارا نہ تھا۔ رات کو جب تک خلافت کا کام کرتے تھے اس وقت تک بیت المال کی شمع جلاتے تھے اس کے بعد گل کر کے اپنی ذاتی شمع جلاتے تھے۔

بیت المال کی جانب سے فقرار و مساکین کے لیے جو مہمان خانہ تھا اس کے باورچی خانے سے اپنے لیے پانی تک گرم نہ کراتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کی لاعلمی میں ملازم ایک مہینہ تک عام مطبخ میں پانی گرم کرتا رہا۔ آپ کو معلوم ہوا تو اتنی ہی لکڑی خرید کر باورچی خانہ میں داخل کرادی۔

ایک مرتبہ غلام کو گوشت کا ایک ٹکڑا بھوننے کا حکم دیا۔ وہ اسی مطبخ سے بھون لایا۔ آپ نے اسے ہاتھ نہ لگایا۔ اور غلام سے کہا تم ہی کھالو میری قسمت کا نہ تھا۔

ایک مرتبہ بیت المال میں بہت سے سیب آئے، آپ انھیں عام مسلمانوں میں تقسیم فرمارہے تھے، آپ کا چھوٹا بچہ ایک سیب اٹھا کر کھانے لگا۔ آپ نے اس کے منہ سے چھین لیا وہ رونے لگا ماں سے جاکر شکایت کی۔ ماں نے بازار سے سیب منگوا دیا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز گھر واپس آئے تو انھیں سیب کی خوشبو آئی۔ پوچھا فاطمہ! سرکاری سیب تو یہاں نہیں آیا۔ انھوں نے سارا واقعہ بیان کر دیا۔ آپ نے فرمایا خدا کی قسم میں نے اس کے منہ سے نہیں چھینا تھا بلکہ اپنے دل سے چھینا تھا۔ اس لیے کہ مجھے یہ پسند نہ تھا کہ میں مسلمانوں کے حصے کے سیب کے بدلے میں اپنے کو اللہ تعالیٰ کے حضور میں برباد کردوں۔

آپ کو لبنان کا شہد بہت مرغوب تھا، ایک مرتبہ اس کی خواہش ظاہر کی تو آپ کی بیوی فاطمہ نے لبنان کے حاکم ابن معدیکرب کو لکھ بھیجا، انھوں نے بہت سا شہد بھجوا دیا۔ فاطمہ نے اسے عمر بن عبدالعزیز کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے دیکھ کر کہا معلوم ہوتا ہے تم نے ابن معدیکرب کے پاس کہلا بھیجا تھا، چنانچہ اس کو چکھا تک نہیں۔ اور اس کی قیمت بیت المال میں داخل کرادی اور ابن معدیکرب کو کہلا بھیجا کہ تم نے فاطمہ کے کہلانے پر شہد بھیجا ہے، خدا کی قسم اگر آئندہ تم نے ایسا کیا تو اپنے عہدہ پر نہیں رہ سکتے۔

تختِ خلافت پر قدم رکھنے کے بعد تحفہ و ہدیے قبول کرنے بند کر دیے، ایک مرتبہ کسی شخص

نے آپ کے پاس سیب اور دوسرے میوے بھیجے، آپ نے واپس کر دیا۔ بھیجنے والے نے آپ سے کہا کہ ہدیہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبول فرماتے تھے۔ آپ نے جواب دیا لیکن ہمارے اور ہمارے بعد والوں کے لیے وہ رشوت ہے۔

اسلام کی مساواتِ عامہ کا نمونہ ایک مرتبہ پنکھا جھلتے جھلتے ایک لونڈی کی آنکھ لگ گئی۔ آپ نے پنکھا لے کر خود اس کے جھلنا شروع کر دیا۔ اس کی آنکھ کھلی تو دیکھ کر گھبرائی۔ آپ نے فرمایا آخر تم بھی تو میری طرح انسان ہو، تم کو بھی میری طرح گرمی لگتی ہوگی۔ جس طرح تم مجھے پنکھا جھل رہی تھیں میں نے بھی تمہیں جھل دیا۔

اگر ملازم سو جاتے تو خود اپنے ہاتھ سے کام کر لیتے ملازم کے آرام میں خلل نہ ڈالتے ایک مرتبہ رجاء بن حیوۃ سے گفتگو میں رات زیادہ ہو گئی۔ اور چراغ جھلملانے لگا، ملازم قریب ہی سویا ہوا تھا۔ رجاء نے جگانا چاہا۔ حضرت عمر بن عبد العزیز نے روک دیا۔ رجاء نے خود چراغ درست کرنے کا ارادہ کیا۔ آپ نے انھیں بھی روک دیا۔ خود اٹھ کر تیل لیا اور چراغ میں ڈال کر واپس آئے اور فرمایا جب میں اٹھا تھا تب بھی عمر بن عبد العزیز تھا اور اب بھی عمر بن عبد العزیز ہوں۔

آپ کی سادگی، تواضع اور مساوات اس حد کو پہنچی ہوئی تھی کہ جو لوگ آپ کو پہچانتے نہ تھے انھیں عام مجمعوں میں پہچاننے میں دقت ہوتی تھی۔

ابوذر غفاری کی تقلید خلافت ملنے سے پہلے آپ کی زندگی عیش و تنعم کی تھی۔ خلافت کے بعد سارے تکلفات سے دست کش ہو گئے اور ابوذر غفاری کا قالب اختیار کر لیا۔ لونڈی غلام، فرش و فروش، لباس وغیرہ جملہ عیش و تکلف کے سامانوں کو بیچ کر ان کی قیمت بیت المال میں داخل کر دی تھی۔ گزارے کے لئے صرف چار سو دینار سالانہ لیتے تھے۔

ایک زمانہ میں چار سو کی قیمت کا کپڑا بھی جسم پر بار معلوم ہوتا تھا۔ اور دن بھر میں کئی کئی جوڑے بدلے جاتے تھے۔ یا صرف ایک جوڑا رہ گیا تھا۔ اسی کو دھو دھو کر پہنتے تھے۔ مرض الموت میں ایک قمیص کے علاوہ دوسری قمیص نہ تھی کہ بدلائی جاتی۔ آپ کے سالے مسلمہ بن عبد الملک نے اپنی بہن سے کہا کہ قمیص میلی ہو گئی ہے، لوگ عیادت کو آتے ہیں دوسری بدلوا دو، وہ

سن کر چُپ رہیں۔ مسلمہ نے جب دوبارہ کہا تو بولیں ”خدا کی قسم اس کے علاوہ دوسرا کپڑا نہیں ہے۔ پھر ایک جوڑا بھی سالم نہ ہوتا تھا بلکہ پیوند پر پیوند لگے ہوتے تھے۔

آپ کے بچے اسی تنگی سے بسر کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کی بچی آمنہ کے پاس کپڑا نہ تھا۔ آپ نے حکم دیا کہ فرش پھاڑ کر کرتہ بنا دیا جائے۔ آپ کی بہن کو معلوم ہوا تو ایک تھان بھجوا دیا۔ اور منع کر دیا کہ عمر سے نہ مانگنا۔

ملوکیت کے بجائے خلافت کا قیام جن لوگوں سے خلافت آپ کو ملی تھی وہ بادشاہ تھے لیکن آپ کی مسلسل کوشش یہی تھی کہ ملوکیت کو خلافت میں تبدیل کر دیں۔ خلفاء کے ساتھ نقیب و علمبردار چلتے تھے۔ نماز کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح ان پر درود و سلام بھیجا جاتا تھا، سلام میں خاص امتیاز برتا جاتا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ان سب مراسم کو بند کر دیا۔ چنانچہ حسب دستور جب کوتوال نے نیزہ اور نشان لے کر آپ کے ساتھ چلنا چاہا تو آپ نے فرمایا! میں مسلمانوں کا ایک معمولی فرد ہوں۔

عام حکم جاری کر دیا کہ سلام میں خصوصیت نہ برتی جائے بلکہ صرف عام سلام کیا جائے۔

علماء کی قدر و منزلت امام نووی کا بیان ہے کہ ان کی جلالتِ شان، فضیلتِ علمی، وفورِ علم، صلاح، آثارِ نبوی کے اتباع اور خلفائے راشدین کی پیروی پر سب کا اتفاق ہے۔

اس عہد کے اکابر علماء ان کے سامنے طفلِ دبستاں تھے۔ میمون بن مہران کا جو خود ایک بڑے صاحب علم تابعی ہیں بیان ہے کہ علماء عمر بن عبدالعزیزؒ کے سامنے تلامذہ معلوم ہوتے تھے۔ مشہور صاحبِ علم تابعی مجاہد کا بیان ہے کہ ہم لوگ انھیں تعلیم دینے گئے تھے لیکن کچھ دنوں کے بعد ہم خود ان سے تعلیم حاصل کرنے لگے۔ دُور دُور سے علماء اور فقہا کو بلا کر ان کی قدر افزائی فرماتے، امورِ خلافت میں وہی آپ کے مشیر اور ہم جلیس تھے۔ ان میں میمون بن مہران، رجاء بن حیوۃ، ریاح بن عبیدہ، سالم بن عبداللہ، محمد بن کعب قرظی اور سعید بن مسیب خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ مذہبی امور میں سعید بن مسیب سے

ضرور مشورہ فرماتے تھے۔

سرمایۂ حدیث کی نگہداشت

آپ نے جب دیکھا کہ بڑے بڑے حفاظِ حدیث اٹھتے جاتے ہیں اور اُن کے ساتھ حدیثیں بھی دفن ہوتی جا رہی ہیں تو قاضی ابوبکر بن حزم گورنر مدینہ کو لکھا کہ احادیث نبوی کی تلاش و جستجو کر کے انھیں لکھ لو، مجھے علماء کے ساتھ علم کے مٹ جانے کا بھی خوف ہے لیکن احتیاط ملحوظ رہے کہ صرف رسول اللہؐ کی حدیثیں قبول کی جائیں۔

اس حکم پر تمام محدثین نے حدیثیں تلاش کر کے ان کے مجموعے مرتب کیے گئے اور تمام ممالکِ محروسہ میں بھیجے گئے۔ سعد بن ابراہیم کا بیان ہے کہ ہم نے عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے دفتر کی دفتر حدیثیں لکھیں۔ اور انھوں نے اس کا ایک ایک مجموعہ تمام ممالکِ محروسہ میں بھیجا۔

باغِ فدک اور عمر بن عبدالعزیز

مروان نے فدک کو اپنے زمانے میں جاگیر بنا لیا تھا۔ اس لیے وہ عمر بن عبدالعزیز کے قبضے میں آیا۔ اسی پر اُن کی اور اُن کے اہل و عیال کی معاش کا دار و مدار تھا۔ چنانچہ اس بارہ میں رسول اللہ صلعم اور خلفائے راشدین کے عمل کی تحقیقات کر کے فدک کو اپنی ملک سے نکال کر پھر اس کے قدیم مصارف کے لیے مخصوص کر دیا۔ اور آلِ مروان سے کہا:

"فدک رسول اللہ صلعم کا خالصہ تھا جس کی آمدنی آپؐ اپنی اور بنی ہاشم کی ضروریات پر صرف فرماتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے تک اسی پر عمل ہوتا رہا۔ پھر مروان نے اسے اپنی جاگیر بنا لیا۔ اور وہ وراثۃً میرے قبضے میں آئی۔ لیکن جو چیز رسول اللہؐ نے فاطمہ کو نہیں دی اس پر میرا کوئی حق نہیں ہو سکتا اس لیے میں تم کو گواہ بناتا ہوں کہ فدک کی جو صورت رسول اللہ صلعم کے زمانے میں تھی میں اس کو اسی حالت پر لوٹاتا ہوں۔"

خاندان والوں کو بیت المال سے جو وظائف اور گزارے ملتے تھے بند کر دیے۔ عنبسہ بن سعد نے شکایت کی کہ امیر المومنین آپ پر ہم لوگوں کا بھی حق ہے۔ آپ نے فرمایا میرے ذاتی مال میں تمھارا حق ہو سکتا تھا مگر اس میں اتنی گنجائش نہیں اور بیت المال میں تمھارا اس سے زیادہ حق نہیں ہے جتنا برک غماد کے آخری حدود میں رہنے والے کا!

بیت المال کے آمد و خرچ کی اصلاح

اموی خلفاء نے بیت المال کو ذاتی خزانہ بنالیا تھا اس کی آمدنی اور مصارف کسی چیز میں بھی احتیاط نہ برتی جاتی تھی۔ جائز ناجائز ہر طرح کی آمدنی سے خزانہ بھرا جاتا تھا اور اسی بے عنوانی کے ساتھ صرف کیا جاتا تھا۔ بیت المال کا بڑا حصہ ان کے ذاتی تعیش پر صرف ہوتا تھا حضرت عمر بن عبد العزیز نے اس کی بھی پوری اصلاح کی، اور اس کے تمام ناجائز مصارف بند کر دیے۔

اموال مغصوبہ کی واپسی کے سلسلے میں بڑا حصہ بیت المال میں واپس ہو گیا تھا۔ اپنے گھر کا ایک ایک نگینہ تک انھوں نے بیت المال میں داخل کر دیا تھا۔ خاندان کے تمام وظائف بند کر دیے۔ شاہی شکوہ و تجمل کے تمام اخراجات موقوف کر دیے۔

نومسلموں اور غیر مسلموں سے جزیہ کا حصول

بیت المال کی آمدنی بڑھانے کے لیے حجاج نومسلموں سے بھی جزیہ وصول کرتا تھا حضرت عمر بن عبد العزیز نے اسے بالکل بند کر دیا اور ایک عام حکم جاری کر دیا کہ جو لوگ مسلمان ہو جائیں ان کا جزیہ چھوڑ دیا جائے۔ اس حکم پر تنہا مصر میں اتنے آدمی مسلمان ہوئے کہ جزیے کی آمدنی گھٹ گئی۔

اس بارہ میں اتنی سختی برتی کہ فرمانِ عام جاری کر دیا کہ اگر کسی غیر مسلم کا جزیہ ترازو میں رکھا جا چکا ہو اور اس حالت میں بھی وہ اسلام قبول کر لے یا نئے سال کے آغاز سے ایک دن پہلے (جب کہ پورے سال کا جزیہ عائد ہو جاتا ہے) اسلام لے آئے تو بھی جزیہ نہ لیا جائے۔

ملک میں جتنے مجبور اور معذور اشخاص تھے سب کے نام درج رجسٹر کر کے ان کا وظیفہ مقرر کیا۔ اگر اس میں کسی عامل سے ذرا بھی غفلت ہوتی تھی تو سخت تنبیہ کرتے تھے۔

مختلف ملکوں میں اس کثرت سے ذمی مسلمان ہوئے کہ جزیہ کی آمدنی گھٹ گئی بعض عمال نے حضرت عمر بن عبد العزیز سے اس کی شکایت کی، آپ نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہادی و رہبر بنا کے بھیجے گئے تھے۔ تحصیلدار بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے۔ میں یہ پسند کرتا ہوں کہ سارے ذمی مسلمان ہو جائیں اور ہم لوگوں کی حیثیت محض کاشت کار کی رہ جائے کہ اپنے ہاتھ سے کمائیں کھائیں بعض عمال نے رائے دی کہ "اکثر ذمی جزیے کے خوف سے مسلمان ہوتے ہیں۔

ختنہ کرا کے ان کا امتحان لیا جائے۔ آپ نے لکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہادی و رہنما تھے ختنہ کرنے والے نہ تھے۔

خلافت کی ذمّہ داری کا شدید احساس سلیمان کی تجہیز و تکفین کے بعد حسب معمول جب آپ کے سامنے شاہی سواری پیش کی گئی تو آپ نے واپس کر دی اور فرمایا "میرے لیے میرا خچر کافی ہے"۔

گھر آئے تو اس بار عظیم کی ذمّہ داری سے چہرہ پریشان تھا۔ لونڈی نے پوچھا خیر ہے۔ آپ اتنے متفکر کیوں ہیں۔ فرمایا اس سے بڑھ کر فکر و تشویش کی بات کیا ہوگی کہ مشرق و مغرب میں امّتِ محمدّیہ کا کوئی ایسا فرد نہیں ہے جس کا مجھ پر حق نہ ہو اور بغیر مطالبہ اور اطلاع کے اس کا ادا کرنا مجھ پر فرض نہ ہو۔

خلافت بغیر شوریٰ کے ناقابلِ قبول آپ کا انتخاب شوریٰ سے نہ ہوا تھا۔ اس لیے غور و فکر کے بعد آپ اس سے دست برداری کے لیے آمادہ ہو گئے۔ اور مسلمانوں کو جمع کر کے ان سے کہا۔

"لوگو! میری خواہش اور عام مسلمانوں کی رائے لیے بغیر مجھے خلافت کی ذمّہ داریوں میں مبتلا کیا گیا ہے۔ اس لیے میری بیعت کا جو طوق تمھاری گردن میں ہے میں خود اسے اتارے دیتا ہوں۔ تم جسے چاہو اپنا خلیفہ منتخب کرلو۔"

یہ تقریر سن کر مجمع نے شور بلند کیا کہ ہم نے آپ کو خلیفہ منتخب کیا ہے اور ہم سب آپ کی خلافت سے راضی ہیں۔ آپ خدا کا نام لے کر کام شروع کر دیجیے۔ جب آپ کو اس کا یقین ہو گیا کہ کسی شخص کو آپ کی خلافت سے اختلاف نہیں ہے تو اس وقت آپ نے اس بارِ عظیم کو قبول فرمایا۔

ہر خطرہ سے بے نیاز حضرت عمر بن عبد العزیز کا اصلی مقصد خلافتِ راشدہ کا دوبارہ احیاء تھا لیکن اموی حکومت کو دوبارہ جمہوری بنا دینا آپ کے اختیار میں نہ تھا۔ اس لیے آپ کم سے کم اس کی برائیاں دور کر کے طرزِ جہاں بانی میں اس کو خلافتِ راشدہ سے قریب تر کر دینا چاہتے تھے۔

اس سلسلے میں سب سے مقدم فرض رعایا اور زیردستوں کے اس مال و جائداد کی واپسی تھی جسے شاہی خاندان کے ارکان، اموی عمال اور دوسرے عمائد نے اپنی جاگیر بنا لیا تھا۔ یہ ایسا نازک کام تھا جس کو ہاتھ لگانا سارے خاندان کی مخالفت مول لینا تھا لیکن سب سے پہلے آپ نے اسی کارِ خیر کو شروع کیا، خود آپ کے پاس بہت بڑی موروثی جاگیر تھی، بعض خیر خواہوں نے عرض کیا کہ اگر جاگیر واپس کر دیں گے تو اولاد کے لیے کیا انتظام کریں گے؟ فرمایا ان کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔

اہلِ خاندان سے جنگ

اس کے بعد اہلِ خاندان کو جمع کر کے فرمایا:

"بنی مروان تم کو شرف اور دولت کا بڑا حصہ ملا ہے میرا خیال ہے کہ اُمت کا دو تہائی یا نصف تمہارے قبضے میں ہے۔"

ان لوگوں نے جواب دیا خدا کی قسم جب تک ہمارے سر تن سے جُدا نہ ہو جائیں گے اس وقت تک یہ جائدادیں واپس نہیں ہو سکتیں۔ خدا کی قسم نہ ہم اپنے آبا و اجداد کو کافر بنا سکتے ہیں اور نہ اپنی اولادوں کو مفلس نہ بنائیں گے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا: خدا کی قسم اگر اس حق میں تم میری مدد نہ کرو گے تو میں تم کو ذلیل اور رسوا کر کے چھوڑوں گا۔

اس کے بعد عام مسلمانوں کو مسجد میں جمع کر کے تقریر کی:

"ان لوگوں (اموی خلفاء) نے ہم ارکانِ خاندان کو ایسی جاگیریں اور عطایا دیے خدا کی قسم جن کے دینے کا نہ اُن کو حق تھا اور نہ ہمیں ان کے لینے کا۔ اب میں اُن سب کو ان کے اصلی حق داروں کو واپس کرتا ہوں اور اپنی ذات اور اپنے خاندان سے شروع کرتا ہوں۔"

اس تقریر کے بعد جاگیروں کی اسناد کا خریطہ منگایا۔ مزاحم ان اسناد کو نکال کر پڑھ پڑھ کر سناتے جاتے تھے اور عمر بن عبدالعزیز انھیں قینچی سے کاٹ کاٹ کر پھینکتے جاتے تھے۔ صبح سے لے کر ظہر کی نماز تک یہ سلسلہ جاری رہا اور اپنی اور اپنے پورے خاندان کی ایک ایک جاگیر واپس کر دی حتیٰ کہ اپنے پاس ایک نگینہ تک نہ رہنے دیا۔

علالت، وصیت اور وفات

رجب ۱۰۱ھ میں آپ مرض الموت میں مبتلا ہو گئے، اس کے بارے میں دو بیانات ہیں۔ ایک یہ کہ علالت طبعی تھی، دوسرا بیان یہ ہے کہ زہر کا نتیجہ تھی۔ اس کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ بنی امیہ نے آپ کے ایک خادم کو ایک ہزار اشرفی دے کر زہر دلوایا، آپ کو دوران علالت میں اس کا علم ہو گیا، لیکن آپ نے اس کا کوئی انتقام نہیں لیا۔ بلکہ اشرفیاں واپس لے کر بیت المال میں داخل کر دیں اور غلام کو آزاد کر دیا۔

وفات سے پہلے آپ کے سالے مسلمہ بن عبدالملک نے آپ سے عرض کیا:

"امیر المومنین آپ نے مال و دولت سے ہمیشہ اپنی اولاد کا منہ خشک رکھا اور انھیں بالکل خالی ہاتھ چھوڑے جاتے ہیں، ان کے متعلق مجھے یا خاندان کے کسی فرد کو کچھ وصیت کرتے جائیے۔"

یہ سن کر آپ نے فرمایا: "تم کہتے ہو کہ میں نے مال سے ہمیشہ اپنی اولاد کا منہ خشک رکھا۔ خدا کی قسم میں نے ان کا کوئی حق تلف نہیں کیا، البتہ جس مال میں ان کا حق نہ تھا وہ ان کو نہیں دیا۔ تم کہتے ہو ان کے متعلق کسی کو وصیت کرتا جاؤں تو اس معاملے میں میرا وصی اور ولی میرا خدا ہے۔"

پھر لڑکوں کو بلایا اور فرمایا:

"میری جان تم پر قربان، تم کو میں نے خالی ہاتھ چھوڑا ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں نے تم کو اچھی حالت میں چھوڑا، بچو! تم کو کوئی ایسا عرب اور ذمی نہ ملے گا جس کا تم پر حق ہو بچو! دو باتوں میں سے ایک بات تمھارے باپ کے اختیار میں تھی۔ ایک یہ کہ تم دولت مند ہو جاؤ اور تمھارا باپ دوزخ میں جائے، دوسرے کہ تم تہی دست رہو اور تمھارا باپ جنت میں داخل ہو۔ ان دونوں میں سے اس نے یہ پسند کیا کہ تم تہی دست رہو اور وہ جنت میں جائے۔ بس خدا حافظ، خدا تم کو حفظ و امان میں رکھے۔

ان مراحل سے فراغت کے بعد رجب ۱۰۱ھ میں انتقال ہوا۔ اس وقت ۳۹-۴۰ سال کی عمر تھی۔ دیر سمعان میں دفن کیے گئے۔ مدت خلافت دو سال پانچ مہینے۔

عمر بن عبد العزیز

(۲)

تقدس، پارسائی اور عدل و مساوات کا پیکر

چند مخصوص صفات و ملکات

سلیمان کو "مفتاح الخیر" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور کوئی شبہ نہیں اس نے عمر بن عبد العزیز کو خلیفہ نامزد کر کے اپنے آپ کو اس خطاب کا اہل اور مستحق بھی ثابت کر دیا۔ حضرت عمر بن عبد العزیز کی شخصیت اور کارناموں پر گزشتہ صفحات میں روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ اب ہم صرف ان صفات و ملکات کا اختصار و ایجاز کے ساتھ ذکر کریں گے جو علامہ جلال الدین سیوطی نے اپنی یگانۂ آفاق کتاب "تاریخ الخلفاء" میں درج کیے ہیں۔

۱: آپ نے اپنے والد اور حضرت انس، عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب، ابن قارض، یوسف بن عبداللہ بن سلام، عامر بن سعد، سعید بن مسیب، عروہ بن زبیر، ابوبکر بن عبد الرحمن، ربیع بن سمرہ اور دیگر حضرات سے احادیث روایت کی ہیں اور آپ سے اشخاص ذیل نے روایت کی ہے۔ زہری، محمد بن منکدر، یحییٰ بن سعید انصاری، مسلمہ بن عبد الملک، رجاء بن حیوٰۃ وغیرہ۔

۲: آپ کے والد نے آپ کو طلب علم کی خاطر عبید اللہ بن عبداللہ کے پاس مدینہ طیبہ روانہ کیا۔ اور آپ ان سے تحصیل علم کرتے رہے۔ والد کے انتقال کے بعد عبد الملک بن مروان نے اپنے پاس دمشق بلا لیا۔ اور اپنی بیٹی فاطمہ کا آپ سے عقد کر دیا۔

۳: ولید بن عبد الملک نے تخت خلافت پر متمکن ہونے کے بعد آپ کو مدینہ کا والی مقرر کیا۔

جہاں ۸۶ھ سے ۹۳ھ تک بہ حیثیت والیٔ مدینہ آپ مامور رہے۔

۴: زید بن اسلم نے انس کی زبانی لکھا ہے میں نے اکثر اماموں کے پیچھے نماز پڑھی ہے۔ لیکن عبدالعزیز ویسی ہی امامت کرتے تھے جیسی رسول اکرم ؐ نماز پڑھایا کرتے تھے۔ عمر بن عبدالعزیز چونکہ مدینہ کے والی تھے اس لیے وہی نماز پڑھاتے تھے۔

۵: عمر بن مہاجر کا بیان ہے عمر بن عبدالعزیز نے خلیفہ ہونے پر کھڑے ہو کر حمد و ثنا کے بعد کہا لوگو! قرآن کریم کے بعد کوئی دوسری کتاب نازل نہیں ہوگی۔ اور رسول اللہ ؐ کے بعد کوئی نبی پیدا نہیں ہوگا۔ میں حکم دینے والا نہیں بلکہ احکام کی تعمیل کرانے والا ہوں اور میں موجد بھی نہیں بلکہ متبع اور فرماں بردار ہوں۔ اور میں تم سے بہتر بھی نہیں ہوں تاہم تمھاری نسبت مجھ پر زیادہ بوجھ ڈال دیا گیا ہے اور جو کوئی ظالم امام سے بھاگ جائے تو ایسا شخص ظالم نہیں ہے اور یاد رکھو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتے ہوئے اس کی کسی مخلوق کی فرمانبرداری ہو ہی نہیں سکتی یعنی سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرو۔

۶: فرات بن سائب کا بیان ہے عمر بن عبدالعزیز کی بیوی فاطمہ بنت عبدالملک کے پاس نادر و نایاب جواہرات کا زیور تھا جو عبدالملک نے جہیز میں دیا تھا۔ ایک دن عمر بن عبدالعزیز نے اپنی بیوی سے کہا۔ یا تو تم اپنا زیور بیت المال میں دے دو یا پھر مجھے چھوڑ دو۔ کیونکہ مجھے یہ امر ناپسند ہے کہ تم اپنا قیمتی زیور لیے ہوئے میرے ساتھ رہو۔ اس پر آپ کی بیوی نے جواب دیا اس زیور پر میں آپ کو ترجیح دیتی ہوں۔ اور پھر وہ سب زیور بیت المال میں داخل کر دیا۔

۷: قیس بن جبیر کا بیان ہے خاندانِ بنو امیہ میں عمر بن عبدالعزیز کی مثال ایسی ہے جیسی خاندانِ فرعون میں کوئی مومن ہو۔ میمون بن مہران کا بیان ہے اللہ تعالیٰ نے ایک نبی سے دوسرے نبی کے لیے قول و قرار لیا ہے۔ اسی طرح اللہ نے لوگوں سے عمر بن عبدالعزیز کی خلافت کے لیے عہد لیا ہے۔

وہب بن منبہ کا بیان ہے اگر موجودہ لوگوں میں مہدی ہو سکتے ہیں تو عمر بن عبدالعزیز لازمی طور پر مہدی ہیں۔

عمر بن عبدالعزیزؒ کے لڑکے عبدالعزیز کا بیان ہے مجھ سے ابوجعفر منصور نے پوچھا کہ تمھارے والد کی آمدنی کتنی تھی؟ میں نے کہا خلیفہ ہونے سے پہلے ان کی آمدنی چالیس ہزار اشرفیاں تھیں۔ پھر انھوں نے پوچھا انتقال کے وقت کیا آمدنی تھی؟ میں نے جواب دیا صرف چار سو اور وہ اگر اور زندہ رہتے تو آمدنی میں اور بھی کمی ہو جاتی۔

۸: مسلمہ بن عبدالملک کا بیان ہے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ کی بیماری میں ان کی عیادت کے لیے گیا ان کے جسم پر بڑا میلا کُرتا دیکھ کر میں نے ان کی بیوی فاطمہ بن عبدالملک سے کہا اس کُرتہ کو دھوتی کیوں نہیں۔ تو انھوں نے جواب دیا ان کے پاس صرف یہی ایک کُرتہ ہے۔

۹: عون بن معمر کا بیان ہے ایک دن عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنی بیوی فاطمہ سے کہا کہ اگر تمھارے پاس ایک درہم ہو تو انگور منگالو۔ بیوی نے جواباً کہا میرے پاس تو نہیں ہے البتہ آپ امیرالمومنین ہیں کیا آپ کو اتنا بھی اختیار نہیں کہ ایک درہم کے انگور خرید کر خود کھائیں اور ہمیں بھی کھلائیں۔ اس پر جواب دیا آج تو یہ آسان ہے لیکن کل جہنم میں اس کے عوض بیڑیاں پہننا پڑیں گی۔

۱۰: امام اوزاعی فرماتے ہیں عمر بن عبدالعزیز کے گھر پر بنو امیہ کے معززین موجود تھے۔ آپ نے کہا کیا تمھاری یہ تمنا ہے کہ تم میں سے ہر ایک کو سالارِ فوج مقرر کر دوں؟ ان میں سے ایک نے کہا آپ ہم سے وہ بات کہہ رہے ہیں جسے کر نہیں سکتے۔ فرمایا تم میرے اس فرش کو دیکھ رہے ہو اور مجھے یقین ہے کہ ایک دن یہ فنا و برباد ہو جائے گا۔ تاہم مجھے یہ پسند نہیں تم اس پر اپنے پیروں کا میل کچیل صاف کرو۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اپنے مذہب اور تمام مسلمانوں کی عزّت و سربلندی کا تمھیں مالک بنا دوں۔ ان لوگوں نے کہا قرابت کا تو خیال کیجیے۔ جواب دیا اس معاملے میں تم اور ایک ادنیٰ درجے کا مسلمان دونوں برابر ہیں۔

۱۱: عمر بن مہاجر کا بیان ہے عمر بن عبدالعزیزؒ کا روزانہ گھر کا خرچ صرف دو درہم تھے۔

۱۲: آپ کے سکریٹری کے پیش کار و احکام نویس نعیم کا بیان ہے، اجرائی احکام و فرامین پر عمر بن عبدالعزیزؒ مجھے ہمیشہ منع کیا کرتے تھے کہ میں کسی تحریر میں ان کی شان و عظمت کا اظہار نہ کروں۔

۱۳: جعونہ کا بیان ہے عبد الملک کے انتقال پر عمر بن عبد العزیز ان کی تعریف کرنے لگے تو مسلمہ نے کہا اے امیر المومنین! اگر وہ زندہ رہتے تو کیا آپ انہیں ولیعہد بناتے۔ جواب دیا ہرگز نہیں مسلمہ نے کہا پھر آپ اُن کی تعریف و توصیف کیوں کر رہے ہیں۔ فرمایا واقعہ یہ ہے کہ ہر بیٹا اپنے باپ کی تعریف کیا ہی کرتا ہے۔

۱۴: آپ نے عمرو بن مہاجر انصاری کو بلا کر کہا: واللہ تم جانتے ہو کہ ہم میں تم میں کوئی قرابت نہیں ہے۔ البتہ اسلامی اخوت کا رشتہ موجود ہے۔ میں نے سنا ہے تم بکثرت قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہو نیز میں نے تم کو ایسے مقام پر عبادت کرتے دیکھا ہے جہاں کوئی دوسرا انہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے وہاں تمہیں خشوع و خضوع کے ساتھ نماز میں مشغول پایا ہے نیز تم انصاری بھی ہو۔ یہ تلوار لو میں نے تمہیں کوتوال شہر مقرر کیا۔

۱۵: ازہر کا بیان ہے میں نے عمر بن عبد العزیز کو خطبہ دیتے اس حالت میں دیکھا کہ وہ پیوند لگا کرتہ پہنے ہوئے تھے۔

۱۶: طبقات میں ہے کہ حریر بن عثمان رحبی اپنے والد کے ساتھ عمر بن عبد العزیز کے پاس آئے تو امیر المومنین نے ان سے کہا تم اپنے بیٹے کو فقہ اکبر سکھاؤ۔ انھوں نے کہا فقہ اکبر کسے کہتے ہیں؟ تو جواباً کہا قناعت کرنا اور مسلمانوں کو تکلیف نہ دینا۔

یزید بن عبدالملک

وفادارانِ حکومت کا عبرت انگیز انجام

صفات و خصوصیات

سلیمان نے عمر بن عبدالعزیز کے بعد یزید بن عبدالملک کو ولیعہد نامزد کیا تھا۔ چنانچہ آپ کے انتقال کے بعد یزید بن عبدالملک تخت نشین ہوا، اس نے پانچ سال تک حکومت کی۔ ۱۰۱ھ (۷۱۹ء) میں سریر آرائے خلافت ہوا۔ اور ۱۰۵ھ (۷۲۳ء) میں اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

اصلاحاتِ عمر بن عبدالعزیز رضؓ سے روگردانی

یزید بن عبدالملک جب تخت نشین ہوا تو صرف چل سے سوا مہینے تک اس دستور اور آئین پر عامل رہ سکا جو حضرت عمر بن عبدالعزیز رضؓ نے نافذ اور جاری کیا تھا، اس کی طبع عیش پسند اس ایثار اور قناعت کی متحمل نہ ہو سکی جس کا نمونہ عمر بن عبدالعزیز رضؓ نے پیش کیا تھا۔ اس نے ایک فرمان کے ذریعے وہ جملہ اصلاحات منسوخ کر دیں۔ اور شخصی اور مستبد حکومت کا دور پھر پورے جبروت اور جلال کے ساتھ شروع ہو گیا۔

عیش و عشرت اور ہوا و ہوس کا دور

یزید بن عبدالملک کا دور یکسر عیش و عشرت اور ہوا و ہوس کا دور تھا۔ الفخری نے اس کی داستانِ ہوس کی رنگینیوں سے پردہ اٹھایا ہے اور حرم خلافت کی دو کنیزوں حبابہ اور سلامہ کا ذکر کیا ہے جو اس پر چھائی ہوئی تھیں اور جن کے دام محبت میں اسیر ہو کر یہ دنیا و مافیہا سے غافل

ہو گیا تھا۔

بغاوتوں کا زور، فتوحات بند

اس کے دور میں بغاوتیں تو رونما ہوئیں لیکن فتوحات کا سلسلہ یکسر اور یک قلم موقوف ہو گیا۔ اس کے عہد کی دو بغاوتیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک یزید بن مہلب کی، دوسرے خوارج کی۔

یزید بن مہلب سے جنگ اور اس کا قتل

یزید بن مہلب کا باپ مہلب بن ابی صفرہ بہت بڑا جنگ جو، معاملہ فہم اور رجال نثار حکومت تھا۔ اس خاندان کے بقا اور استحکام میں اس کا بہت بڑا حصہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی اولاد کو بھی فروغ و عروج غیر معمولی طور پر حاصل ہوا اور بڑے بڑے مناصب اس کے قبضے میں آ گئے۔ اور اس کے اقتدار و اختیار میں بہت اضافہ ہو گیا۔

لیکن یزید بن عبدالملک اس خاندان کو مٹانے پر تلا ہوا تھا۔

ابن مہلب نے اپنے دورِ امارت میں یزید بن عبدالملک کے بعض سسرالی اعزہ کو سزائیں دی تھیں۔ اس بنا پر یزید اس سے برہم تھا اور چونکہ وہ نامزد شدہ ولیعہد تھا اس لیے ابن مہلب کو خطرہ پیدا ہوا کہ یزید تخت نشینی کے بعد ضرور اس کا انتقام لے گا۔ چنانچہ اسی طرح یزید نے تخت نشین ہو کر فوراً عدی بن ارطاۃ والی عراق کو آلِ مہلب کی گرفتاری کا حکم لکھ بھیجا۔ یہ لوگ بالکل بے خبر تھے۔ اس لیے یزید نے آسانی کے ساتھ یزید بن مہلب کے تین بھائی مفضل، مروان اور حبیب کو گرفتار کر کے قید کر دیا۔ اور یزید بن مہلب کے خطرات کو روکنے کی تدبیریں کیں۔

اس دوران میں یزید بن مہلب بصرہ پہنچ گیا۔ یہاں آ کر جب معلوم ہوا کہ اس کے بھائی گرفتار ہو چکے ہیں تو اس نے عدی سے مصالحت کی کوشش کی لیکن اس نے انکار کر دیا۔ بصرہ میں آلِ مہلب کے حامیوں کی ایک بڑی تعداد تھی۔ ان کی مدد سے اس نے عدی کو شکست دے کر گرفتار کر لیا۔ اور بصرہ پر اس کا قبضہ ہو گیا۔ دارالحکومت پر قبضے کے بعد عراق اور اس کے پورے ماتحت علاقے سے اموی حکومت اٹھ گئی۔ اور ابن مہلب نے فارس وغیرہ میں اپنے عمال مقرر کر دیے۔

یزید بن عبد الملک کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے اپنے بھائی مسلمہ بن عبد الملک کو اس کے مقابلے کے لیے عراق روانہ کیا۔ اس وقت ابن مہلب نے یزید بن عبد الملک کی بیعت فسخ کر کے حکومت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ اور لوگوں کو کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلعم کی دعوت کے ذریعے بنی امیہ کے مقابلے پر آمادہ کیا، اور انھیں یقین دلایا کہ ان سے جہاد کرنا ترک و دیلم کے جہاد سے بہتر ہے۔

انبار کے قریب مسلمہ اور یزید بن مہلب کا سامنا ہوا۔ ابن مہلب کے ساتھ ایک لاکھ فوج تھی، ابھی جنگ شروع نہ ہوئی تھی کہ مسلمہ کے آدمیوں نے فرات کے پل میں آگ لگا دی، یہی عراقیوں کے گزرنے کا راستہ تھا، وہ پل سے دھواں اٹھتا دیکھ کر اتنے بدحواس ہوئے کہ ان کی بڑی تعداد نے بغیر لڑے میدان چھوڑ دیا۔ ابن مہلب نے ہر چند سنبھالنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اس ہنگامے میں اس کا بھائی حبیب قتل ہوا۔ اس قتل کے بعد ابن مہلب اپنی مختصر جماعت کے ساتھ اپنی جان پر کھیل گیا۔ اور بڑی بہادری سے لڑ کر جان دی اس کا بھائی مفضل الگ ایک جتھے کے ساتھ برسرِ پیکار تھا۔ ابن مہلب نے پہلے سے اس کا انتظام کر لیا تھا کہ اگر اسے اس معرکے میں شکست ہو گئی تو وہ قندابیل (سندھ) میں جو اس کے ماتحت تھا، پناہ لے گا اس لیے مفضل بن مہلب اپنے خاندان کو لے کر قندابیل روانہ ہو گیا۔ ایک اموی سردار نے اس کا تعاقب کیا، اور مفضل کے بقیہ ساتھی بھی مارے گئے لیکن وہ خود کسی طرح جان بچا کر نکل گیا۔ قندابیل پہنچنے کے بعد یہاں کے حاکم وداع بن حمید نے دھوکا دیا اور مفضل کو شہر میں داخل ہونے سے روکا۔ اس نے بزور داخل ہونا چاہا لیکن اب اس کے پاس کوئی قوت نہ رہ گئی تھی۔ اس لئے عبد الملک مفضل، زیاد اور مروان خاندانِ مہلب کے تمام ارکان مارے گئے صرف چند صغیر السن بچ گئے۔ انھیں عورتوں سمیت قید کر کے مسلمہ کے پاس بھیج دیا گیا۔

سیوطی نے لکھا ہے:

"شکست کے بعد ابن مہلب کربلا کے قریب ایک مقام عقیر میں (لڑتا ہوا) قتل ہوا کلبی کی روایت ہے کہ اس قتل سے لوگوں میں یہ کہاوت چل پڑی کہ:

"بنو امیہ نے کربلا میں اسلام (امام حسینؓ) کو اور عقر میں سخاوت (یزید بن مہلب جیسے لکھ لٹ) کو تہ تیغ کر دیا۔"

خوارج کی شورش اور بغاوت

دوسری بغاوت خوارج کی تھی۔ یہ بغاوت اجتماعی نہ تھی۔ بلکہ مختلف مقامات پر خوارج کی مختلف ٹکڑیاں سر اٹھاتی تھیں اور دبا دی جاتی تھیں۔ اس لیے:

ان کا فتنہ بڑھنے نہ پایا۔ ۱۰۲ھ میں عقفان خارجی اٹھا، لیکن اس کی جماعت بہت مختصر تھی۔ جسے محض دھمکا کر منتشر کر دیا گیا۔ اسی سنہ میں بحرین میں مسعود ابن ابی زینب اٹھا اور یمامہ پر حملہ آور ہوا۔ یہاں کے والی سفیان بن عمرو عقیلی نے آسانی سے اس کا خاتمہ کر دیا، اس کے بعد ہلال نے اس کی جگہ لی، یہ بھی ہارا اور مارا گیا۔

ہشام اور ولید کی ولیعہدی کا اعلان، وفات

تخت نشینی کے تھوڑے ہی عرصے بعد یزید نے اپنے بھائی ہشام اور اس کے بعد اپنے لڑکے ولید کو نامزد کر دیا تھا۔

شعبان ۱۰۵ھ میں سل کی بیماری میں یزید کا انتقال ہوا، اس وقت چالیس سال کے قریب عمر تھی۔ مدتِ خلافت چار سال ایک مہینہ کچھ دن۔

وفات کے سلسلے میں یہ روایت بھی ہے:

اسے اپنی لونڈی حبابہ سے بڑی محبت تھی، وہ مر گئی۔ اس صدمے کی وہ تاب نہ لا سکا۔ اور چند ہی دنوں کے بعد اس کا بھی انتقال ہو گیا۔

ہشام بن عبدالملک

مُدبّر، اولوالعزم اور باحوصلہ فرماں روا

صفات، عادات، شمائل و فضائل

اس خاندان میں ہشام بن عبدالملک چند ممتاز اور یگانہ خصوصیات کا حامل تھا۔ اور خاص طور پر اپنے پیش رو یزید بن عبدالملک سے جب اس کا موازنہ کیا جائے تو ماننا پڑتا ہے کہ بہت زیادہ خوبیوں کا حامل تھا۔

گو اس میں ایک بہت بڑی کمزوری تھی یعنی خسیس اور کنجوس حد سے زیادہ تھا۔ آداب السلطانیہ، تاریخ الخلفاء، مسعودی، اور تمام معتبر و متداول کتب میں اس کمزوری کا اعتراف کیا گیا ہے لیکن اس کمزوری سے قطع نظر اس میں خوبیاں بھی تھیں اور بہت زیادہ تھیں۔ یہ حد درجہ حلیم، بردبار، معاملہ فہم اور صاحب فراست شخص تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اولوالعزم بھی۔ بڑے سے بڑے نازک اور کٹھن مواقع پر اس کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آئی۔ مہمات و فتوحات کے اعتبار سے بھی ہشام عہد ماقبل کے کئی خلفاء سے ممتاز نظر آتا ہے، مذہبی جذبہ بھی رکھتا تھا۔ اور اقدار مذہبی کی تکریم میں کسی طرح کا فرق نہیں آنے دیتا تھا۔ راگ رنگ اور رقص و سرود کے فنون عالیہ سے نہ صرف اسے کوئی لگاؤ نہیں تھا بلکہ امتناعی تدابیر بھی اس سلسلے میں اختیار کرتا تھا۔ اس سلسلے میں ایک لطیفہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے ایک مرد کہن سال اس جرم میں پیش خدمت کیا گیا کہ گانا سنتا ہے، دف اور بربط سے شوق رکھتا ہے شراب و کباب کا عادی ہے۔ ہشام کی سنجیدگی ان خرافات کی متحمل نہ ہو سکی۔ اس نے ایک آلہ موسیقی کی

طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"یہ طنبورہ اس کے سر پر دے مارو۔"

حکم کی تعمیل ہوئی۔ اور وہ بوڑھا شخص بلک بلک کر رونے لگا

ہشام نے کہا: روتے کیوں ہو؟ صبر سے کام لو۔

بوڑھے نے جواب دیا: روتا اس پر نہیں ہوں کہ میرا سر زخمی ہو گیا۔ رونا اس کور ذوقی پر آرہا ہے کہ بربط کو طنبورہ کہا جارہا ہے۔

ہشام ۱۰۵ھ (۷۲۳ء) میں تخت نشین ہوا اور ۱۲۵ھ (۷۴۳ء) میں وفات پائی۔

ستودہ صفات اور خوش اطوار سیوطی نے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے: سہل بن محمد کا بیان ہے ہشام بن عبدالملک کے علاوہ کسی خلیفہ کو نہیں دیکھا کہ خوں ریزی اس کو ناپسند و ذلیل معلوم ہوتی ہو۔

ابن عساکر نے ابراہیم بن عبلہ کی زبانی لکھا ہے خلیفہ ہشام بن عبدالملک نے مجھے مصر کا حاکمِ خراج بنایا۔ لیکن میں نے انکار کر دیا۔ خلیفہ کا رنگ متغیر ہو گیا، پھر اس نے کہا تمہیں یہ عہدہ منظور کرنا پڑے گا۔ چنانچہ میں اس وقت خاموش ہو گیا۔ جب غصہ ٹھنڈا ہوا تو میں نے کہا اے امیر المومنین قرآن کریم میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہم نے آسمان و زمین اور پہاڑوں کو اپنی امانت دینا چاہی تو انھوں نے کہا ہم میں اس امانت کے برداشت کی طاقت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان پر ناراض نہیں ہوا لیکن میرے انکار پر کیوں ناراض ہوتے ہیں؟ اس پر ہشام ہنسا اور مجھے معاف کر دیا۔

مذہب کی پاسداری، شریعت کا احترام اپنے لڑکوں پر نماز کی بڑی تاکید رکھتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک لڑکا جمعہ کی نماز میں نہ پہنچ سکا تو ہشام نے باز پرس کی، اس نے عذر کیا کہ سواری نہ تھی۔ ہشام نے کہا کیا پیادہ پا نہیں جا سکتے تھے۔ اور سزاءً ایک سال کے لیے سواری بند کر دی۔

ہشام نے امام زہری سے چار سو حدیثوں کا ایک مجموعہ مرتب کرایا تھا۔

مذہب میں کسی بدعت کو پسند نہ کرتا تھا مشہور قدری، غیلان بن یونس نے سب سے پہلے عمر بن عبدالعزیزؓ کے زمانے میں قدر کا عقیدہ ظاہر کیا تھا۔ لیکن توبہ کر لی تھی۔ ہشام کے زمانے میں اس کا اعادہ

کیا تو اس نے قتل کرادیا۔ اسی طریقے سے ایک اور شخص معد بن درہم نے خلقِ قرآن کا مسئلہ چھیڑا ہشام نے اسے بھی قتل کرا دیا۔

مہمات و فتوحات ۔ وسط ایشیا کا مورچہ

ہشام کا عہد مہمات اور فتوحات کا دور ہے اس عہد میں بڑی بڑی مہمیں بھیجی گئیں۔ اور کامیاب ہوئیں۔ فتوحات کا سلسلہ جاری رہا۔ خوارج نے بھی سر اٹھایا لیکن کچل دیے گئے۔ جہاں اس نے اپنی فوجِ ظفر موج بھیجی کامیاب و کامراں لوٹی۔

وسطِ ایشیا کے مفتوحہ علاقوں نے بار بار سر اٹھایا اور پوری قوت و شدت کے ساتھ نبرد آزما ہوئے لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ ترکستان کا فرمانروا خاقان اسی عہد میں مارا گیا۔ ہشام کی حوصلہ مندی اور جرأت نے کسی موقع پر بھی کمزوری کا جامہ نہیں پہنا۔

آذربائیجان ایشائے کوچک، سندھ اور آرمینیا کا محاذ

وسط ایشیا سے زیادہ سرگرمی ہشام کو اس علاقے میں دکھانا پڑی سخت رکاوٹوں اور مزاحمتوں کے باوجود اس نے مشکلات پر قابو پایا اور کامیاب رہا۔

سمرقند، بخارا اور خراسان میں بھی شورش اور بغاوت کی آندھیاں آئیں لیکن اس پہاڑ کے سامنے ٹھہر نہ سکیں۔

آرمینیا اور آذربائیجان کے علاقے میں کئی قوموں نے ابن خاقان کی سربراہی اور قیادت میں متحدہ محاذ بنا لیا تھا۔ کئی سال تک یہاں جنگ و پیکار کا سلسلہ جاری رہا۔

خاقان کا لڑکا مختلف اور متعدد زور آزمائیوں اور رزم آرائیوں کے بعد:

از سرِ نو فوجیں جمع کر کے دوبارہ انتقام کے لیے نکلا، دریائے بلیقان پر اس کا اور سعید کا مقابلہ ہوا آخر بڑی جانبازی سے لڑے اپنی پوری قوت مقابلہ میں صرف کر دی، لیکن مسلمانوں کے صف شکن حملوں کی تاب نہ لا سکے، اور ایک خونریز جنگ کے بعد شکست کھا کر اس بے ترتیبی اور بدحواسی سے پیچھے ہٹے کہ ان کا بڑا حصہ دریائے بلیقان میں غرق ہو گیا۔ سعید نے ہشام کو ان کامیابیوں کی اطلاع دی، اس نے اس کارگزاری پر اظہار خوشنودی کیا۔

۱۱۳ھ میں ہشام نے سعید کو واپس بلا لیا۔ اور اس کی جگہ اپنے بھائی مسلمہ کا تقرر کیا۔ اس نے خزر کے سارے علاقے میں فوجیں پھیلا دیں اور ان سے بڑے پُرزور معرکے ہوئے۔ خاقان کا لڑکا مارا گیا اور کوہستان بلجز کے اس پار کا پورا علاقہ زیرنگین ہوگیا۔ ۱۱۴ھ میں مروان بن محمد کو آرمینیا بھیجا اور ایک لاکھ بیس ہزار فوج اس کی مدد کے لیے ساتھ کی۔

آرمینیا آنے کے بعد مروان بن محمد نے لان پر فوج کشی کا ارادہ ظاہر کرکے خزر کو صلح کا پیام دیا۔ انھوں نے منظور کرلیا۔ اور گفتگو کے لیے قاصد بھیجا، مروان نے چند دنوں تک اس کو روکے رکھا۔ اور جنگ کی تیاری مکمل کرنے کے بعد جنگ کا پیام دے کر قاصد کو واپس کردیا اور اس کے ساتھ ہی خود روانہ ہوگیا۔ اور بہ عجلت تمام منزلیں طے کرتا ہوا خزر کے علاقے میں داخل ہوگیا۔ فرمانروائے خزر نے صلح کی امید میں کوئی تیاری نہ کی تھی اس لیے مقابلہ نہ کرسکا۔ اور دارالسلطنت چھوڑ کر سرحدی علاقہ کی طرف نکل گیا۔ اور مروان بغیر کسی رکاوٹ کے دُور تک بڑھتا ہوا چلا گیا۔ اور بے شمار مال غنیمت حاصل کیا۔

۱۰۵ھ میں مروان نے ایشیائے کوچک میں قونیہ اور زنجہ فتح کیے۔ ۱۰۸ھ میں مسلمہ بن عبدالملک نے قیساریہ پر قبضہ کیا۔ ۱۰۹ھ میں ہشام کے لڑکے معاویہ نے قلعہ طیبہ، ۱۱۰ھ میں صملہ اور ۱۱۲ھ میں خرشنہ فتح کیے۔ ۱۲۰ھ میں سلمہ بن ہشام نے مطمورہ پر قبضہ کرلیا۔

۱۰۷ھ میں سندھ کی حکومت پر جنید بن عبدالرحمن کا تقرر ہوا۔ اس نے سندھ آنے کے بعد دریائے سندھ کے کنارے پیش قدمی شروع کی۔ یہ راجہ داہر سنگھ کے لڑکے جے سنگھ کا علاقہ تھا۔

جے سنگھ بحری بیڑہ کے ساتھ جنید کے مقابلے میں آگیا۔ دریائے سندھ کے مشرقی کنارہ پر دونوں کا مقابلہ ہوا۔ لیکن جے سنگھ کی بدقسمتی سے اس کی کشتی دریا کے پایاب حصے میں پھنس گئی اور وہ گرفتار ہوگیا۔ جنید نے اسے قتل کرا دیا۔

۱۰۷ھ سے ۱۱۱ھ تک جنید سندھ میں رہا۔ اس مدّت میں فتوحات میں توسیع کے علاوہ اس نے انتظامی حیثیت سے سندھ کی حکومت کو بڑی ترقی دی۔

۱۱۱ھ میں جنید کی جگہ تمیم داری آیا۔ یہ بڑا نااہل تھا۔ اس کے آتے ہی سارے سندھ میں

بغاوت پھیل گئی مسلمانوں نے جو کچھ کیا تھا سب خاک میں مل گیا۔ یہاں سے اسلامی حکومت قریب قریب اٹھ گئی اور سندھیوں کا اتنا زور بڑھا کہ سندھ کے متوطن مسلمانوں کو سندھ چھوڑنا پڑا۔

سب سے پہلے حکم نے دریائے سندھ کے مشرقی سمت ایک شہر "محفوظہ" آباد کر کے مسلمانوں کا مرکز قائم کیا۔ اس کے بعد محمد بن قاسم کے بیٹے عمرو بن محمد بن قاسم کی مدد سے چند دنوں میں باغیوں کو زیر کر کے دوبارہ حکومت قائم کی۔ اور اس کامیابی کی یادگار میں "منصورہ" آباد کیا۔ جو آئندہ چل کر سندھ کی حکومت کا مرکز بنا۔

فرانس پر عربوں کا حملہ

فرانس کو فتح کرنے کا خیال اندلس کی فتح کے بعد ہی مسلمانوں کو پیدا ہو گیا تھا۔ اور مختلف والیوں نے اس کی کوشش کی۔ لیکن سب سے اہم حملہ ہشام کے زمانے میں ہوا۔ جس میں مسلمان وسط فرانس تک پہنچ گئے تھے۔

شورشیں اور بغاوتیں

ہشام بن عبدالملک کے عہد میں شورشیں اور بغاوتیں بھی ہوئیں اور گو یہ کامیاب نہ ہو سکیں۔ لیکن ان سے ملتِ اسلامیہ کے بقائے عمومی کو غیر معمولی صدمہ پہنچا۔ اور ان کی جمعیت اور قوت متزلزل ہوتی نظر آنے لگی۔

● ان شورشوں اور بغاوتوں میں سر فہرست بربر ہیں۔

بربروں نے ہر جگہ جہاں انھیں موقع ملا افریقہ، اندلس اور صقلیہ وغیرہ میں جہاں موقع ملا سر اٹھایا۔ انھیں عربوں سے شکایات تھیں۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں ان کی شکایات کو غیر متوقع بھی نہیں کہا جا سکتا۔

اسلام قبول کر لینے کے بعد بجا طور پر بربر اسلام کی دی ہوئی نعمت مساواتِ عامہ سے بہرہ مند ہونا چاہتے تھے۔ اور عرب اس نعمت کی ارزانی پر نہ کچھ زیادہ خوش نظر آتے تھے نہ اسے دینے پر تیار تھے۔

عربوں اور بربروں کی ساری کش مکش کا اصل راز یہی ہے۔ عربوں نے اسلام کے اصول مساوات عامہ کو توڑا۔ بربر نے اسلام کے دوسرے اصول "جماعت" کو توڑا۔ اور ان دوگونہ اصول شکنیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان قوم کو اس کے سنگین اور عبرت انگیز نتائج کمزوری اور پس ماندگی کی صورت میں بھگتنا پڑے۔

ہشام بن عبدالملک کے عہد میں خارجیوں نے بھی سر اٹھایا۔ لیکن ان کی شورش زیادہ نہ بڑھنے پائی۔ ۱۱۱ھ میں چند خوارج نے یزید بن ظریف ہمدانی والئی ہمدان کو اس کے گھر پر برسرِ عام نہایت بیباکی سے قتل کر دیا۔ اس کے علاوہ کئی آدمیوں کو پکڑ کر لے گئے۔ خالد بن عبداللہ والئی عراق نے اصبغ بن عبداللہ کلبی کو تھوڑی سی فوج کے ساتھ ان کے استیصال کے لیے بھیجا۔ سیستان کی گھاٹیوں میں ان کا مرکز تھا۔ اس لیے خود خوارج نے گھیر کر کلبی کا پورا دستہ ختم کر دیا۔ پھر ۱۱۹ھ میں کوفہ کے قریب بہلول خارجی اٹھا۔ خالد بن عبداللہ نے فوجیں بھیج کر موصل میں اس کا خاتمہ کرایا۔

بہلول کے قتل کے بعد اسی سنہ میں عمرو الیشکری اور بختری یکے بعد دیگرے اٹھے لیکن دونوں مارے گئے۔ ان کے بعد وزیر سختیانی نے حیرہ میں خروج کیا۔ اور بہت سے مسلمانوں کو قتل کیا اور ان کی بستیوں کو جلا دیا۔ حیرہ کے بیت المال پر قبضہ کر لیا۔ خالد نے فوجیں بھیج کر گرفتار کر لیا اس نے خالد کو نصیحت کی وہ اس کی نصیحت سے اتنا متاثر ہوا کہ اسے قتل نہیں کیا۔ اور اسے اپنے پاس ہی قید کر دیا۔ اور رات کو اس کی باتیں سنتا، کسی نے ہشام سے شکایت کر دی۔ اس نے فوراً حکم بھیج کر قتل کرا دیا۔ اسی سال صحاری بن شبیب ایک مختصر سی جماعت کے ساتھ اٹھا لیکن یہ بھی مارا گیا۔

حضرت زید بن علی کا قتل

ہشام کے عہد کا حد درجہ المناک حادثہ حضرت زید بن علی بن حسین کا قتل ہے۔

خاندانِ رسالت میں زید بن علی بن حسین کا قتل آخری سفاکانہ قتل تھا جو اس خاندان کے ہاتھوں عمل میں آیا، یہ اتنا سفاکانہ قتل تھا کہ اس نے ہر آنکھ کو نمناک بنا دیا۔ اس حادثہ کے چند سال بعد بنو امیہ کی وہ حکومت جس نے دبدبے اور طنطنے کے ساتھ سو برس تک کشورکشائی اور فرماں روائی کی تھی پکے ہوئے پھل کی طرح زمین پر آ رہی، جو دوسروں کو قتل کرتے تھے وہ خود قتل ہونے لگے۔

حضرت زید کا حلیہ

مقدمہ الروض النضیر میں حضرت زید کا حلیہ یہ درج ہے:

کان ابیض اللون اعین مقرون الحاجبین تام الخلق طویل

القامۃ کث اللحیۃ عریض الصدر اقنی الانف اسود الراس واللحیۃ الا اخالطہ الشیب فی عارضیہ

حضرت زید کا رنگ گورا تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی، ابرو دونوں ملے ہوئے تھے۔ جسم کی بناوٹ کھلی تھی، قد دراز تھا، داڑھی گھنی، سینہ فراخ و کشادہ بلند بینی، داڑھی اور سر کے بال سیاہ، تھوڑی سی آمیزش سفید بالوں کی دونوں رخساروں کے اطراف میں ہو چلی تھی۔

مولانا گیلانی نے تحریر فرمایا ہے کہ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں:-

شہادت زید بن علی کما شاھدت اھلہ فما رأیت فی زمانہ افقہ منہ ولا اعلم ولا اسرع جوابا ولا ابین قولا

میں نے زید بن علی کو دیکھا تھا، جیسے ان کے خاندان کے دوسرے حضرات کے مشاہدے کا موقع مجھے ملا ہے میں نے ان کے زمانے میں اُن سے زیادہ فقیہ آدمی اور کسی کو نہیں پایا۔ اور ان جیسا حاضر جواب اور واضح صاف جیسا گفتگو کرنے والا آدمی بھی مجھے کوئی نہ ملا۔

لقد کان منقطع القرین — درحقیقت ان کے جوڑ کا آدمی اس زمانے میں نہ تھا۔

محدث ابوعوانہ نے حضرت شہید کے متعلق لکھا ہے:

کان زید بن علی یری الحیاۃ عزاما لکان ضجر ابالحیاۃ

زید بن علی کے لیے زندگی ایک بوجھ بن گئی تھی، زندگی سے وہ تنگ آچکے تھے۔

حضرت زید مدینے میں

بعض وقت اتفاقات بھی کیسی کیسی گل کاریاں کرتے ہیں۔ زید مدینہ میں خلوت گزینی کی زندگی بسر کر رہے تھے کہ خالد قسری جو کسی زمانہ میں عراق کا گورنر تھا۔ ہشام بن عبدالملک کی نظر میں معتوب قرار پاتا ہے اور اس سے مطالبہ ہوتا ہے کہ اپنی جمع جتھا پیش کر دو۔ وہ مرد زیرک بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے میں نے اپنا سارا اطرہ زید کے پاس رکھوایا ہے۔ ان سے لے لیجیے۔ کہاں کوفہ، کہاں مدینہ؟ یہ بات بداہتہً اتنی غلط اور ناقابلِ یقین تھی کہ کوئی شخص اس پر اعتماد نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن روپے کی لگن بری بلا ہے اس ناممکن کو بھی ہشام نے باور کر لیا اور والیٔ مدینہ کو حکم بھیجا کہ فوراً زید دمشق روانہ کیے جائیں چنانچہ زید اور داؤد (حضرت عبداللہ بن عباس کے پوتے) کشاں کشاں دمشق بھیج دیے گئے۔

دیکھتے ہی بھڑک اٹھا۔ اور بجائے اس کے کہ اصل الزام کے سلسلے میں تحقیق و تفتیش کرے تلخ لہجے میں آپ سے گفتگو شروع کر دی۔ اور دورانِ گفتگو میں بے ساختہ کہہ اٹھا:

تم لونڈی زادے ہو کہ خلافت کی خواہش رکھتے ہو۔ زید نے جواب دیا کہ تم لونڈی ہونے کی وجہ سے میری ماں کا درجہ گھٹاتے ہو حالانکہ حضرت اسحٰق علیہ السلام آزاد عورت کے بطن سے تھے اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام لونڈی کے، ان دونوں میں خدا نے حضرت اسمٰعیلؑ کو نبوت کے لیے منتخب فرمایا۔ اور ان کی نسل سے عرب پھیلے اور انہی کی نسل سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیدا ہوئے۔ ایسی باتوں کو زبان پر لاتے ہوئے خدا کا خوف کیا کرو۔

ہشام نے کہا: تم جیسا شخص مجھے خدا کا خوف دلاتے ہو۔

زید نے کہا: کوئی آدمی اتنا چھوٹا نہیں ہے کہ وہ کسی کو خدا کے خوف سے نہ ڈرا سکے، نہ کوئی اتنا بڑا ہے کہ خدا سے نہ ڈرے۔

اس تلخ گفتگو کے بعد اصل مسئلہ زیرِ بحث آیا۔ حضرت نے اس الزام کی ایسے انداز میں تردید فرمائی کہ ہشام کہہ اٹھا:

انتما عندی اصدق من ابن نصرانیہ

نصرانیہ کے لڑکے (خالد) سے میرے نزدیک آپ دونوں زیادہ سچے ہیں۔

لیکن کھٹک قائم رہی چنانچہ مدینہ واپس کرنے کے بجائے کوفہ جانے کا حکم دیا کہ وہاں کا گورنر (یوسف) خالد کے سامنے پوچھ گچھ کر کے رائے قائم کرے اور رپورٹ کرے۔

سلاطین بنو امیہ کی عام پالیسی یہ تھی کہ اہلِ بیتِ رسول کے لوگ کوفہ کا رُخ نہ کرنے پائیں۔ لیکن طمع زر نے یہ اٹل پالیسی بھی توڑنے پر اسے مجبور کر دیا۔

حضرت زید کوفے میں

حضرت زید اور داؤد کو ذرا خواہش نہ تھی کہ کوفہ جائیں۔ لیکن کوفہ ان کے قدموں سے لپٹا جا رہا تھا، آخر وہ کوفہ پہنچے، یوسف کے سامنے معاملہ پیش ہوا۔ زید اور خالد قسری روبرو بیٹھے۔ سوال و جواب ہوئے۔ آخر خالد نے اپنے جھوٹ کا اعتراف کر لیا۔

کوفہ کے دورانِ قیام میں گو آپ کی سخت نگرانی کی جاتی تھی لیکن عقیدت مندوں کا ہجوم تھا

کر ٹوٹا پڑ رہا تھا۔

نتیجہ ان باتوں کا جو کچھ ہو سکتا تھا وہی سامنے آیا۔ عوام تو عوام خواص کے طبقات میں بھی یہ بات محسوس ہونے لگی کہ حضرت زید کا اتفاقی طور پر کوفہ آجانا ایک مغتنم موقع ہے۔

ان میں سے بعض جو زیادہ جوشیلے تھے انھوں نے علانیہ حضرت زید کی طرف سے لوگوں سے بیعت تک لینی شروع کر دی۔ اس طبقے کے سرگروہ منصور بن المعتمر تھے۔

وہ لوگ بھی جو کوفیوں کی غداری اور بدعہدی سے واقف تھے اور ذاتی طور پر عملی شرکت سے معذور تھے۔ حضرت کے برسرِ حق ہونے کا اعلان کر رہے تھے۔

کوفہ کے محدث جلیل اور امام نبیل الاعمش کا قول ہے:

واللہ لیخزلنہ واللہ لیسلمنہ کما فعلوا بجدہ وعمہ

خدا کی قسم یہ لوگ زید کو چھوڑ دیں گے، دشمنوں کے سپرد کر دیں گے جیسا ان کے دادا اور چچا کے ساتھ کیا تھا۔

لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی کہا کرتے تھے:

واللہ لولا ضرارۃ لی لخرجت معہ

خدا کی قسم اگر (آنکھ میں) ہرج نہ ہوتا تو ان کے ساتھ میں بھی نکل کھڑا ہوتا۔

یہی حال کوفہ کے دوسرے امام سفیان ثوری کا تھا۔

امام ابو حنیفہ اور حضرت زید مخلصین کے اس طبقے میں حضرت امام ابو حنیفہ بھی نظر آتے ہیں۔ فضیل نے چند ممتاز ہستیوں کے نام گنوائے ہیں، وہ ان لوگوں کے ذریعے تحریک کے انجام کے متعلق کچھ رائے قائم کرنا چاہتے تھے۔ ملاقات کے بعد امام ابو حنیفہ نے اپنا تاریخی بیان دیا:

خروجہ یضاھی خروج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوم بدر

حضرت زید کا اس وقت کھڑا ہونا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بدر میں تشریف بری کے مشابہ ہے۔

امام اعظم ابو حنیفہ نے صرف ایسا معرکہ آرا فتویٰ دینے پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ مالی قربانی سے بھی دریغ نہیں کیا۔ آخر میں حضرت امام نے دس بیس روپے نہیں بلکہ ہزار ہزار روپے کی دس تھیلیاں

گھر سے لاکر فضیل بن زبیر کے حوالے کیں اور فرمایا:

اعنیتہ بمالی فتیقوی بہ علی من خالفہ

میں حضرت کی خدمت اس مال سے کرتا ہوں ان سے کہنا اسے مخالفوں کے مقابلے میں استعمال کریں۔

یہی نہیں بلکہ:

کان ابوحنیفہ یفتی سراً لوجوب نصرۃ زید حمل المال الیہ

امام ابوحنیفہؒ پوشیدہ طور پر حضرت زید کی امداد کے فرض ہونے کا فتویٰ دیتے تھے۔ اور ان کے پاس پوشیدہ طور پر مالی امداد بھی کرتے تھے۔ (روض النضیر)

جہاد اور مقابلے کی تیاریاں

بہر حال کوفہ کے عوام و خواص کے اصرار سے مجبور ہو کر حضرت زید نے حکومت متعلقہ کے خلاف جہاد کی تیاریاں شروع کر دیں۔

جنگ اور جہاد کے لیے آپ نے لوگوں سے بیعت لی۔ اس کے الفاظ حسب روایت طبری یہ ہیں:

"میں بیعت لیتا ہوں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ظالموں سے جہاد کمزوروں کی مدافعت، محرمین کو عطا حق، سرکاری مال گزاری کی علی السویہ تقسیم کارد، جنگی کی موقوفی، اہل بیت کی مدد کی طرف ان لوگوں کے خلاف جو ہمارے مخالف ہیں اور جنھوں نے ہمارے حقوق کو دیدہ و دانستہ بھلا دیا ہے دعوت دیتا ہوں۔ کیا تم اس شرط پر بیعت کرتے ہو۔ اگر وہ اقرار کر لیتا تو اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیتے اور پھر کہتے اب تم پر اللہ کا عہد و میثاق اور رسول اللہؐ کی ذمہ داری ہے کہ تم میری بیعت کو پورا کرو گے میرے دشمن سے لڑو گے۔ ظاہر و باطن میرے خیر خواہ رہو گے۔ اگر وہ ان باتوں کا بھی اقرار کر لیتا تو پھر اپنے ہاتھ کو اس کے ہاتھ سے چھڑا دیتے۔ اور پھر کہتے اے خداوندا تو گواہ رہ!

چند ماہ یہی ہوتا رہا۔ جب ان کے خروج کا زمانہ قریب آیا انھوں نے اپنے طرف داروں کو تیاری کا حکم دیا۔ ان میں سے جو لوگ واقعی اپنے عہد کو پورا کرنا چاہتے تھے انھوں نے جنگ کی تیاری شروع کر دی۔

ہشام کا اضطراب اور ہدایات

کوفہ میں زید کی موجودگی اور جہاد کی تیاری نے ہشام کو پریشان کر دیا۔ اس نے گورنر کوفہ کو خط لکھا:

"اہلِ کوفہ کو اہلِ بیت سے جو محبت ہے اس سے تم واقف ہو، وہ انھیں ان کو اہلِ بیت سے زیادہ سمجھتے ہیں اسی بنا پر انھوں نے ان کی اطاعت کو اپنے اوپر فرض کر لیا ہے اور انہی کے مسلک پر چلنا وہ واجب سمجھتے ہیں۔ زید ایک جھگڑالو، چرب زبان، تقریریں رنگ آمیزی کرنے والے اپنے مطلب کے مطابق سلسلۂ کلام کو ڈھالنے والے ہیں۔ یہ اپنی حلاوتِ بیان اور دلائل و براہین کثرت سے پیش کرنے کی وجہ سے لوگوں کو جری بنانے کی اہلیت رکھتے ہیں اسی طرح وہ مقدمات و نزعات کی پیروی میں اپنے مقصد کے حاصل کرنے کے لیے اپنے حریف کے مقابلے میں اپنی قوتِ تقریر اور شخصیت کے اثر سے کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ اس لیے تم انھیں فوراً حجاز بھیج دو اور اپنے پاس نہ رہنے دو، کیونکہ اگر لوگوں نے ان کی باتیں سننا شروع کر دیں تو وہ اپنے الفاظ کی ملائمت، شیرینی، پھر رسول اللہ صلعم کے ساتھ ان کی قرابت کا اظہار یہ تمام وہ باتیں ہیں جس سے لوگوں کو وہ اپنا گرویدہ بنا لیں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام لوگ ان کی طرف جھک پڑیں گے نہ ان کے دل ٹھکانے رہیں گے، نہ عقلیں اور نہ ان کا اخلاق اور دین۔ تم کوفہ کے اشراف کو جماعت میں رہنے کی دعوت دو اور ڈراؤ کہ ورنہ انھیں قتل کر دیا جائے گا۔ اور ان کا تمام مال و متاع ضبط کر لیا جائے گا۔ جو لوگ ہماری فرمانبرداری کا حلف اٹھا چکے ہیں یا عہد کر چکے ہیں وہ ان کا ساتھ نہ دیں گے۔ صرف عام رعایا دیہاتی یا دوسرے حاجت مند جو فتنہ و فساد سے لذت حاصل کرتے ہیں وہی ان کی جماعت میں کھڑے ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ابلیس کو پوجتے ہیں اور وہ ان کی پرستش کرتا ہے۔ اس لیے پہلے انھیں محض دھمکاؤ، پھر کوڑے سے خبر لو اور آخر میں تلوار سے کام لینا۔ متوسط طبقے سے پہلے اشراف داعیان کو ڈرانا اور ادنیٰ اور رذیل طبقے سے پہلے متوسط طبقے کے لوگوں کو ڈرانا۔"

ہر حال یہ کوششیں رائیگاں گئیں۔ زید باطل سے لڑنے اور حق کو سربلند کرنے کے لیے میدان میں اترے۔ کوفہ کے گورنر یوسف نے بہت کوشش کی آپ تشریف لے جائیں، لیکن اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔

کوفیوں کی بے وفائی

حضرت زیدؒ کی تائید وقت کے بڑے بڑے علماء، فقہاء، محدثین، اور خواص نے بھی کی تھی اور جہاں تک ان سے ہو سکا اپنی جان خطرے میں ڈال کر ان کی مدد کرتے رہے اور اپنے لیے تباہیوں اور بربادیوں کو دعوت دیتے رہے لیکن ہمرہانِ گریز پا میں استقامت نہ پیدا کر سکے نتیجہ وہی ہوا جو ہمیشہ ہوتا آیا ہے۔ ایک مرتبہ پھر ایک بہت بڑی اور مقدس شخصیت احیائے اسلام کی جدوجہد کرتی ہوئی اپنی جان شیریں قربان کر بیٹھی اور حریف نے سمجھ لیا کہ وہ جیت گیا۔ لیکن تقدیر مسکرا رہی تھی۔

جنگ شروع ہوئی:

یوسف بن عمرو والی کوفہ نے ان کا مقابلہ کیا۔ ایک ہی معرکے کے بعد کوفیوں نے ساتھ چھوڑ دیا اور بہت مختصر جماعت زید کے ساتھ رہ گئی۔ لیکن وہ برابر جمے رہے۔ ایک تیر آکر پیشانی پر لگا۔ اس کے نکالنے میں روح پرواز کر گئی۔ ان کے ہمراہیوں نے کوفہ ہی میں دفن کر کے یوسف کے خوف سے قبر زمین کے برابر کر دی۔ لیکن اس نے پتہ چلا لیا اور لاش قبر سے نکلوا کر سولی پر آویزاں کرا دی۔ ان کے قتل کے بعد ان کے اتباع کا ایک مستقل فرقہ پیدا ہو گیا۔ جو امام زین العابدینؓ کے بعد امام محمد باقر کے بجائے حضرت زیدؒ کو امام مانتا ہے اور زیدیہ کہلاتا ہے یہ فرقہ اب بھی یمن اور دوسرے مقامات میں موجود ہے۔

حضرت زیدؒ کی شہادت کے بعد کل سات سال کے اندر اندر بنی امیہ کی حکومت کا جس کا پایہ تخت دمشق تھا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔ اس عرصے میں ہشام، ولید، یزید، ابراہیم اور مروان پانچ بادشاہ یکے بعد دیگرے بنی امیہ کی گدی پر بیٹھے۔ جن میں سے بعضوں کو چند مہینے سے زیادہ حکومت کرنے کا موقع نہ ملا۔ گویا فی بادشاہ ایک سال کچھ مہینے کا اوسط پڑتا ہے اور سب کچھ جو ہوا ہشام بن عبدالملک کی غلط کاریوں کا نتیجہ تھا۔

قدرت کا انتقام

حضرت زیدؒ کی لاش کئی مہینے تک سولی پر لٹکی رہی، پھر نذر آتش کر کے دریا برد کر دی گئی۔

لیکن قدرت کے کھاتے میں یہ واقعات درج تھے۔ ہشام ہی کے زمانے میں عباسیوں کی تحریک نے ابھرنا شروع کیا۔ جب عباسیوں نے امویوں کی جگہ سنبھالی تو انھوں نے سب سے

پہلا کام یہ کیا:

امام زید کی شہادت کے صرف چند سال کے بعد عمرؓ بن عبدالعزیز کے سوا عبدالملک وغیرہ تمام خلفاء کی لاشیں قبروں سے نکالیں اور انھیں نذرِ آتش کیا اور ہشام کی لاش پر تو کوڑے بھی لگائے۔ یوسف بن عمر جس نے زید کو قتل کیا تھا، مارا گیا تلک الایام نداولہا بین الناس!

ہشام کی وفات اپنے گرمائی صدر مقام رفاصہ میں تقریباً بیس سال حکومت کرنے کے بعد ہشام ایک خبیث بیماری میں مبتلا ہو کر اس دنیا سے رخصت ہوا۔

ولید ثانی

مسئلہ ولی عہد پر امام زہری کا اختلاف

ولید ثانی کی وضع وطریق

اس خاندان میں یہ عجیب و غریب شخص گزرا ہے۔ اسے نہ دین سے مناسبت تھی نہ احترامِ شریعت سے۔ ہر کوئی اس سے نالاں اور بیزار تھا، خود اس کے اہلِ خاندان تک اس سے گلو خلاصی کی تدبیریں کرتے رہتے تھے۔ اس نے کسی کو نہیں بخشا۔ عہدِ ولی عہدی میں کتابِ دل پر جن لوگوں کو معتوبین کی فہرست میں لکھ لیا تھا ایک ایک کر کے اُن سے انتقام لیا۔ حتیٰ کہ جس کا یہ ولی عہد تھا یعنی ہشام اسے بھی نہ چھوڑا۔ اس کی اولاد کی تذلیل کی۔ معزز اور باوقار منصب داروں کو ہدفِ انتقام بنایا۔ ہر وقت راگ رنگ اور عیش و تنعم میں مصروف رہتا۔

ولید ثانی کے عادات و اطوار

علامہ جلال الدین سیوطی نے اس کے بارے میں لکھا ہے:

ولید بن یزید بن عبد الملک بن مروان بن حکم نام تھا۔ ابو العباس کنیت تھی۔ ۹۰ھ میں پیدا ہوا۔ چونکہ اپنے والد کی وفات کے وقت کم سن تھا اس لیے خلافت کا بار اٹھانے کی صلاحیت نہ رکھتا تھا، چنانچہ یزید نے اپنے بھائی ہشام کو ولی عہد اور اس کے بعد ولید کو ولی عہد خلافت نامزد کیا۔ ہشام کے انتقال کے بعد ماہ ربیع الثانی ۱۲۵ھ میں ولید تختِ خلافت پر متمکن ہوا۔

ولید انتہائی فاجر و فاسق اور حد درجہ شرابی تھا۔ وہ بے باک اور حد سے تجاوز کرنے والا تھا ایک مرتبہ اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ خانۂ کعبہ کی چھت پر بیٹھ کر شراب نوشی کرے گا، چونکہ لوگ اس کے فسق و فجور سے عاجز ہو گئے تھے اس لیے اس پر حملہ کر کے ماہ جمادی الثانی ۱۲۶ھ میں اس کو تہِ تیغ کر دیا گیا۔ جب ولید کے محل کا محاصرہ کیا گیا تو اس نے کہا، لوگو! میں نے تمھارے عطیات میں اضافے کیے، تمھاری ہر طرح دست گیری کی اور تم غریبوں پر دولت و مال کی بارش کی۔ اس کا صلہ یہ ہے کہ میرا محاصرہ کر لیا تم نے؟

اس پر لوگوں نے جواب دیا ہم نے تم پر کوئی سختی نہیں کی، یہ نتیجہ ہے خود تمھارے کارید کا۔ تم نے اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیزوں کا مذاق اڑایا اور انھیں جائز قرار دیا۔ تمھاری شراب نوشی، ماں کا بیٹوں سے نکاح کرانا، احکام الٰہی کو ٹھکرانا اور ان کو ذلیل کرنا۔ یہ ہیں وہ امور جنھوں نے تمھاری یہ گت بنائی ہے۔

ولید کے قتل ہونے کے بعد اس کا سر یزید ناقص کے پاس روانہ کیا گیا جہاں اس کا سر نیزے پر رکھا گیا۔ اس حالت کو دیکھ کر ولید کے بھائی سلیمان بن یزید نے کہا بخدا ولید حد درجہ شرابی اور بیباک فاسق تھا۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ میں بھی اس کے رنگ میں رنگ جاؤں۔

ذہبی کا بیان ہے ولید کا کافر اور زندیق ہونا تو صحیح نہیں البتہ وہ شرابی اور اغلام باز تھا۔ اسی لیے لوگوں نے اس کے خلاف بغاوت کی۔

ولید کا سراپا مروان بن ابی حفصہ کا بیان ہے کہ ولید سب سے زیادہ خوبصورت اور مضبوط تھا اور وہ اعلیٰ درجے کا شاعر بھی تھا۔

ابو زناد کا بیان ہے کہ ہشام سے زہری ہمیشہ ولید کے عیب بیان کرتے رہتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ولید کو ولی عہد بنانا مناسب نہیں اسے تو ولی عہدی سے محروم کر دیا جائے لیکن ہشام نے ولید کو ولی عہدی سے محروم نہیں کیا۔ اگر ولید کی حکومت میں امام زہری زندہ رہتے تو ولید انھیں لازماً سزا دے کر قتل کرا دیتا۔

امام احمد نے اپنی مسند میں ایک حدیث لکھی ہے کہ امتِ محمدیہ میں ایک شخص ولید ہوگا جو امتِ مسلمہ پر فرعون سے بھی زیادہ سخت ترین مظالم کرے گا۔

ابن فضل اللہ نے عساکر میں لکھا ہے۔ ولید بن یزید بڑا ہی ظالم ، سرکش ، حاسد ، بے راہ ، اپنے وقت کا فرعون ، زمانہ بھر کا عیبی ، روزِ محشر اپنی قوم کے آگے آگے دوزخ میں جانے والا لوگوں کو تکالیف دینے والا ، بد انجام ، ہلاک ہونے والا ، قرآن کریم کو تیر سے پر اٹھانے والا ، فاسق و فاجر تھا اور گناہوں پر حد درجہ دلیر تھا۔

ہشام ولید کو ولی عہد بنانے میں متامل تھا

الفخری کا بیان ہے : ولید اگرچہ نوجوانانِ بنی امیہ میں زندہ دل ، بہادر ، سخی اور سخت گیر تھا۔ لیکن لہو و لعب ، مے نوشی اور گانے بجانے میں بڑا انہماک رکھتا تھا۔ خود بڑا اچھا شاعر تھا اور اس کے اشعار جنگ عشق اور تعریفِ مے میں بڑے اونچے درجے کے ہیں۔ اس کے بہترین اشعار وہ ہیں جو اس نے ہشام بن عبد الملک کو لکھے تھے۔ اس وقت وہ اسے ولی عہدی سے معزول کرنے کا ارادہ کر چکا تھا۔ ہشام نے جب ولید کو معاصی میں مبتلا اور لذات میں منہمک پایا تو اس نے اس کے بیٹے (یزید بن ولید) کو خلیفہ بنانے کی تمنا کی اور یہ چاہا کہ ولید خود ہی اپنے آپ کو معزول کرے۔ لہٰذا اس نے زبان سے اس کے خلاف بہت کچھ کہا اور اسے دھمکایا۔ ولید بن یزید نے اسے جواب میں لکھا :

رأیتک تبنی جاھدا فی قطیعتی ولو کنت ذا حزم لھدمت ما تبنی

میں دیکھتا ہوں کہ تم میرے قطعۂ زمین میں عمارت بنا رہے ہو۔ اگر تم پختہ آدمی ہوتے تو اپنی بنائی ہوئی عمارت کو ڈھا دیتے۔

ولید اور ابو نواس شاعر

بہت سے لوگوں نے ولید بن یزید کے اشعار کے مضامین استفادہ کر کے وہی تخیل اپنے شعروں میں پیش کیا۔ حتیٰ کہ اس نے شراب کی تعریف میں جو کچھ کہا ہے اس سے ابو نواس تک نے استفادہ کیا ہے۔

قرآنِ کریم کی بے حرمتی

ولید بن یزید کے متعلق یہ حکایت بیان کی جاتی ہے کہ اس نے قرآن سے فال لی تو یہ آیت نکلی :

واستفتحوا وخاب کل جبار عنید (انھوں نے فیصلہ چاہا اور نتیجے میں تمام سرکش اور ضدی نامراد ہو گئے) اس نے وہیں قرآن کو ٹانگ دیا اور اس پر ایک تیر چلاتے ہوئے کہا :

تھددنی بجبار عنید   نعم اذ ذاک بجبار عنید
اذاماجئت ربک یوم بعث   فقل یارب خرقنی الولید

یعنی: اے قرآن تو مجھے جبار عنید (خدائے جبار) کا نام لے کر ڈراتا ہے، حالانکہ وہ جبار عنید تو میں خود ہی ہوں۔

قیامت کے دن جب اپنے رب کے پاس حاضر ہوناتو کہہ دینا مجھے ولید نے چاک کیا تھا۔

ولید کے خلاف غم و غصے کی لہر

ولید صرف ایک سال تک اورنگ نشین رہا لیکن اس مختصر سی مدت میں بھی اس نے ملک، قوم، عالم، جاہل قرابت دار، دوست، عزیز، شناسا سب کو ایسے عالم کرب میں مبتلا کیا کہ وہ زندگی کو موت پر ترجیح دینے لگے۔ عربی کی ایک کہاوت ہے:

"بلی جب کوئی راستہ نہیں دیکھتی تو عاجز آکر کتے پر حملہ کر دیتی ہے"

بالکل یہی ولید کے ساتھ ہوا۔ اس کے دست نگر، محکوم اور تابع بھی جب اس سے عاجز آگئے تو اپنی زندگی قائم رکھنے کے لیے انھوں نے اس کی زندگی چھین لی۔

عیش و عشرت کی زندگی

لیکن وہ ان تمام باتوں سے بے پروا عیش و عشرت میں زندگی کے دن کاٹ رہا تھا۔

یزید بن ضبہ شاعر نے اس کی تخت نشینی کی مبارکباد میں پچاس شعر کا ایک قصیدہ پیش کیا تھا، ولید نے ہر شعر کے صلے میں ایک ایک ہزار درہم انعام دیا۔

موسیقی کا بھی بڑا شائق اور قدردان تھا۔ اس کے دربار میں ابن سریج، معبد، غریض، ابن عائشہ، ابن محرز، طویس اور دحمان وغیرہ اس عہد کے بڑے بڑے باکمال مغنی جمع تھے۔

ہشام کی طرح اسے بھی گھوڑوں اور گھوڑ دوڑ کا بڑا شوق تھا، اس کے پاس اس زمانے کے بہترین گھوڑے تھے۔

ولید کی خوئے انتقام۔ قتل

ولید نے خالد قسری سے عہد ہشام کی رقم کا مطالبہ کیا اور جب خالد اسے ادا نہ کر سکا تو اسے یوسف بن عمر ثقفی والی عراق کے جو اس سے تعصب رکھتا تھا حوالے کر دیا، اس نے اسے طرح طرح کی اذیتیں دے کر

ڈالا ولید نے اسی پر بس نہیں کیا۔ بلکہ یمن کی اس تحقیر کو فخریہ نظم کیا۔ اس سے قبائل یمن کے جذبات بھڑک اٹھے اور وہ اس کی مخالفت میں یزید بن عبدالملک سے جو اپنے بھائی سلیمان کی تحقیر و تذلیل کی وجہ سے ہشام کے خلاف ہو گیا تھا مل گئے اور اس کے ہاتھوں پر بیعت کر لی۔

ولید اس وقت حمص اور دمشق کے درمیان قلعہ بخرا میں تھا۔ یزید کے ہاتھوں پر بیعت کے بعد یمنی قبائل اسے لے کر بخرا پہنچے۔ اس وقت ولید کو ہوش آیا۔ اس کے پاس کوئی بڑی قوت نہ تھی۔ لیکن مقابلے کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہ تھا، ناچار اسی مختصر جماعت کے ساتھ مقابلہ کیا۔ اور شکست کھا کر مارا گیا۔ یہ واقعہ جمادی الثانی ۱۲۶ھ میں پیش آیا۔

اپنوں اور غیروں پر یکساں ظلم

ولید نے ظلم و جور کے معاملے میں کسی طرح کی قید و بند روا نہیں رکھی تھی۔ وہ صحیح یا غلط طور پر جس سے ناراض ہو جاتا تھا پھر اس کی خیر نہیں تھی، چاہے وہ معمولی آدمی ہو یا کوئی بڑی سے بڑی شخصیت اس نے اس باب میں پالیسی یہ رکھی تھی کہ کسی کانٹے کو باقی نہ رکھا جائے اور اس اصول پر بلا تفریق و تمیز اس نے عمل کیا۔ ہشام کے تمام آدمیوں پر اتنی سختیاں کیں کہ اس کے خدام اس کی قبر پر جا کر روتے تھے۔ ہشام کے ماموں ہشام بن اسمٰعیل کو مکہ کی حکومت سے معزول کر دیا اس کے لڑکے محمد اور ابراہیم کو کوڑوں سے پٹوایا اور انھیں یوسف بن عمر والئی عراق کے حوالے کر دیا۔ اس نے ان کو اتنی ایذائیں دیں کہ اس کے صدمے سے مر گئے۔

یحییٰ ابن زید کا قتل

ولید کی تخت نشینی کے چند ہی دنوں بعد یحییٰ بن زید خراسان میں اٹھے وہ اپنے والد زید بن علی کے خروج میں ان کے ساتھ تھے۔ ان کے قتل کے بعد خراسان چلے گئے تھے۔ اور بلخ کے ایک محب اہل بیت حریش بن عمر بن داؤد کے یہاں مقیم تھے۔ ولید کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے حفظ ماتقدم کے خیال سے نصر بن سیار والئی خراسان کو لکھا کہ حریش سے فوراً یحییٰ کے حوالے کرنے کا مطالبہ کرو۔ اس نے اس حکم کی تعمیل کی، حریش نے لاعلمی ظاہر کی، نصر نے سختی سے کام لیا۔ اس کی سختی دیکھ کر حریش کے لڑکے نے بتا دیا اور نصر نے یحییٰ کو گرفتار کر کے ولید کو اطلاع دی، بعد میں رہا کر دیا اور بلخ سے

نکال دیا۔

لیکن بلخ سے نکلنے کے بعد اپنی مختصر جماعت کے ساتھ نیشاپور چلے گئے۔ یہاں کے حاکم عمرو بن زرارہ کو ان کے ارادہ کا علم ہوا تو اس نے مقابلہ کیا۔ یحییٰ نے اسے شکست دے کر قتل کر دیا اور پھر بلخ لوٹ گئے۔ نصر کو اس کا علم ہوا تو اس نے سلمہ بن احوز ہلالی کو ان کے مقابلے پر مامور کیا اور خود بھی نکلا جوزجان میں دونوں کا مقابلہ ہوا۔ اس میں یحییٰ بن زید قتل ہوئے اور ان کی پوری جماعت کام آئی۔

ہشام کے بیٹے پر تعدی سلیمان کو کوڑوں سے پٹوایا اور اس کا سر اور داڑھی منڈوا کر قید کر دیا۔ اس کے اس فعل سے ہشام کی اولاد برہم ہو گئی۔

امراء و عمائد کی بھی تحقیر کی اور ان کے مقابلے میں بنی نزار کو بڑھانا شروع کیا۔ اس سے ان کی قدیم رقابت پھر ابھر آئی۔

نصیحت کی باتیں سننے سے گریز ہشام نے ولید کو راہ راست پر لانے کی بہتیری کوشش کی، زجر و توبیخ سے بھی کام لیا، تالیف قلب اور لطف و عنایت سے بھی، لیکن یہ بد عادتیں اس کے مزاج میں رچ گئی تھیں۔ کسی چیز سے بھی متاثر نہیں ہوا اور اپنی وضع و روش پر قائم رہا۔ اس کا لازمی نتیجہ وہی ہونا چاہیے تھا جو ہوا۔ اس نے اہل خاندان سے بھی بگاڑی، اہل قبائل سے بھی اور قدیم وفاداروں سے بھی۔ اس کے بیش رو کم از کم اپنے آدمیوں کے ساتھ تو بنا سکتے تھے اس نے یہ بھی نہ کیا۔

مروانِ حمار

خاندانِ بنو امیہ کا آخری فرمانروا

آفتابِ اقبال غروب ہوتا ہے

بنو امیہ کا آفتاب اقبال گہنا چکا تھا، اب وقت آگیا تھا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غروب ہو جائے

افراد و اشخاص کی طرح قوموں اور ملّتوں، خاندانوں اور جماعتوں پر بھی بیماری، نزع اور موت کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ جب تک بیماری جڑ نہیں پکڑتی مریض سنبھلتا رہتا ہے۔ تھوڑی سی کشمکش کے بعد پھر توانا اور تندرست ہو جاتا ہے اور بیماری کی پچھلی تکلیفیں اور اذیتیں فراموش کر دیتا ہے، لیکن جب بیماری جڑ پکڑ لیتی ہے تو دوا، علاج، پرہیز اور تیمار داری سے بھی اس کا دُور ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔ دل کا جانا ٹھہر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا!

بنو امیہ کی حکومت کو تقریباً سو سال کی مدّت گزر چکی تھی اور یہ ایک صدی کی مدّت، ان اسباب سے معمور تھی، جو زوال و انحطاط اور سقوط و ادبار کے موجب ہوتے ہیں۔ آخری وقت آگیا جب کوئی تدبیر کام نہ آئی اور اس خاندان کا خاتمہ ہو گیا، اس خاندان کا آخری فرمانروا مروانِ حمار تھا۔ یہ نالائق، آرام طلب یا بزدل نہ تھا لیکن جو بگڑا ہوا ڈھانچہ اسے وراثت میں ملا تھا اسے سنوارنا اور سنبھالنا اس کے بس میں نہ تھا۔

مروانِ حمار کا دورِ حکومت اور دیگر حالات۔ مروان کے بارے میں علامہ سیوطی نے

اپنی کتاب تاریخ الخلفاء میں تحریر فرمایا ہے:

مروان بن محمد بن مروان بن حکم بن ابو العاص نام اور ابو عبدالملک کنیت تھی۔ جعدی اس لیے کہتے ہیں کہ جعد بن درہم کا شاگرد تھا۔ اور حمار اس لیے کہتے ہیں کہ خارجیوں کے مقابلے میں اس کے گھوڑے کا سُمدہ کبھی خشک نہیں ہوا۔ یہ ہمیشہ ان سے برسرپیکار رہا اور جنگی تکالیف کو ہنسی خوشی برداشت کرتا رہا۔ مثل مشہور ہے کہ فلاں شخص جنگ میں گدھے سے بھی زیادہ صبر کرتا ہے اسی وجہ سے مروان حمار کے لقب سے مشہور ہو گیا۔

۷۲ھ میں بمقام جزیرہ مروان کی پیدائش ہوئی جہاں ان کے والد حاکم اعلیٰ تھے۔ اس کی ماں ام ولد تھی۔ مروان بادشاہت سے پہلے بڑے بڑے مقامات کا حاکم اعلیٰ رہ چکا تھا۔

۱۰۵ھ میں اس نے قونیہ (ترکی کا قدیم مرکز) فتح کیا۔ شہ سواری، ہتور، جواں مردی قوت، ہوشیاری وجفاکشی میں مروان بڑا مشہور تھا۔

ولید کے قتل کی اطلاع مروان کو آرمینیہ میں ملی تو اس نے وہاں اپنے بہی خواہوں سے بیعت لے لی اور پھر جب یزید ناقص کے انتقال کی خبر ملی تو اس نے خزانوں کے منہ کھول دیے اور آرمینیہ سے چل کر ابراہیم پر یلغار کر دی۔ پھر اسے شکست دے کر وہاں کے لوگوں سے بھی اپنی بیعت لی اور نیمہ ماہ صفر ۱۲۷ھ میں اپنی خلافت مضبوط و مستحکم کر لی۔

جنگ۔ شکست۔ قتل

مروان نے خلیفہ ہونے کے بعد سب سے پہلے یہ کام کیا کہ خلیفہ ولید کو قتل کرنے کے جرم میں یزید ناقص کی لاش اس کی قبر سے نکلوا کر سولی پر لٹکائی۔ مروان نے اپنے عہدِ خلافت میں کسی طرح کی خوشی و مسرّت نہیں دیکھی۔ کیونکہ سن ۱۳۲ھ تک ہر سمت سے اس پر حملے ہوتے رہے۔ اس کے بعد بنو عباس میں سے عبداللہ بن علی نے جو سفاح کا چچا تھا دھاوا کیا۔ موصل کے قریب گھمسان کا رن پڑا اور اس جنگ میں مروان شکست کھا کر شام کی جانب بھاگ نکلا۔ جہاں پھر عبداللہ نے اس کا تعاقب کیا۔ آخر کار بھاگ کر مصر پہنچا۔ جہاں عبداللہ کے بھائی صالح نے اس کا تعاقب کیا۔

مروان مصری علاقے میں تھا کہ موضع بوصیر میں صالح نے مروان کو گھیر لیا اور اس کے ہاتھوں مارا گیا۔

اموی حکومت کا سقوط۔ عباسیوں کی نمود

الفخری نے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

جب اموی حکومت کی بنیاد کمزور ہونے لگی اور مروان بن محمد کی بیعت کی گئی تو لوگوں میں سخت بے چینی پھیل گئی اور باہمی اختلافات رونما ہو گئے۔ ہر شخص کی الگ رائے اور جداگانہ راستہ تھا۔ کوفہ میں ایک شخص جعفر طیار علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے جن کا نام عبداللہ بن معاویہ (بن عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب) تھا۔ یہ بڑے قابل بھی تھے اور شاعر بھی۔ ان کے دل میں امارت حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ ادھر اہل کوفہ دمشق کے اختلافات کو بھی دیکھ رہے تھے اور اموی حکومت کی گرما گرمی کو بھی۔ اس لیے یہ کوفی حضرات عبداللہ بن معاویہ کے پاس آئے اور ان کی بیعت کر لی۔ اب ان کے پیچھے کافی لوگ اکٹھا ہو گئے۔ عبداللہ بن معاویہ نے مدائن کا رخ کیا اور دجلہ عبور کر کے حلوان اور اس کے آس پاس کی جگہوں پر قبضہ کر لیا اور پھر بلاد عجم کا رخ کیا اور وہاں کی پہاڑیوں پر اور ہمدان و اصفہان درے پر قابض ہو گئے۔ بہت سے بنی ہاشم بھی وہاں آ کر ان سے مل گئے اور ایک عرصے تک وہیں رہے۔

ابو مسلم خراسانی

ادھر ابو مسلم خراسانی کی شوکت نے زور پکڑ لیا تھا اس لیے وہ عبداللہ بن معاویہ کی طرف گیا اور انھیں قتل کر دیا۔ اس کے بعد ہی اس نے عباسی حکومت کا اعلان کر دیا۔ جو غالب آئی اور اس کی دعوت عام ہو گئی۔

ابو مسلم کے نسب میں بڑا اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ غلام تھا اور غلامی میں یکے بعد دیگرے منتقل ہو کر امام ابراہیم تک پہنچا۔ جب انھوں نے اسے دیکھا تو اس کی ذکاوت اور عقل سے متاثر ہوئے اور اسے خرید لیا اور پھر اس کی تعلیم و تربیت کی۔ پھر اپنے شیعوں کی طرف اور اصحاب دعوت کی طرف خراسان میں بھیجنے لگے۔ آخر ایک دن

صاحب امر ہوگیا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وتلک الایام نداولھا بین الناس (یہ دن ہیں جن کو ہم لوگوں کے درمیان گردش کرتے رہتے ہیں) کسی فرماں روا کے قبضے سے سلطنت نکل جانے کی تعزیت ایک حکیم نے یوں کی تھی کہ: اگر یہ حکومت کسی اور کے قبضے میں رہتی تو اس سے منتقل ہوکر آپ کے پاس نہ آتی۔

بنو عباس میں خلافت اور فرماں روائی چھ سو سال تک رہی۔ اس کے بعد دوسری حکومتیں اس پر غالب آتی رہیں مثلاً بنی بویہ کی حکومت جس کی عظمت سے سب واقف ہیں اور جس کا سربراہ عضد الدولہ تھا۔ یا مثلاً بنی سلجوق کی حکومت جس میں طغرل بک جیسا شخص تھا۔ یا مثلاً خوارزم شاہی حکومت جس میں علاء الدین جیسا فرمانروا تھا۔ جس کے پاس چار لاکھ نبرد آزما سپاہی تھے۔ یا مثلاً مصر میں بنی فاطمہ کی حکومت جس کا فوجی کمانڈر جوہر نامی ایک غلام تھا۔ اور اس کے لشکر سے بھاری اور کوئی لشکر دیکھنے میں نہیں آیا۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے:

فلا عسکر من قبل عسکر جوھر

تخب المطایا فیہ عشراً وتواضع

(جوہر کی فوج سے پہلے کوئی فوج نہیں۔ اس کی دس دس سواریاں ایک ساتھ چلتی ہیں)

یا مثلاً خوارج جو اسی اثنا میں ظاہر ہوئے ان کے ساتھ بھی بڑی بھاری جمعیت تھی۔ ان سبھوں میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو عباسیوں کی حکومت کو ختم کرتا اور ان کے اثر کو مٹاتا۔

بہت سی حکومتیں عباسی حکومت کے دور میں پیدا ہوتی رہیں لیکن کسی میں اتنی قدرت نہ ہوئی کہ وہ اس حکومت یا اس کے آثار کو مٹا دیتی۔ دراصل لوگوں کے دلوں میں ان خلفاء کی اتنی قدر و منزلت تھی کہ دنیا میں کسی دوسرے کی وہ قدر و منزلت نہ تھی۔

البتہ ہلاکو نے جب بغداد فتح کیا تو خلیفہ کو قتل کر دیا اور بنی عباس کے اثر کو بالکل ختم کر دیا۔ ان کے تمام اصول و قواعد بدل ڈالے۔ حد یہ ہے کہ بنی عبّاس کا لفظ زبان سے نکالنے والا بھی اپنے آپ کو خطرے سے محفوظ نہ پاتا تھا۔

بنی عباس کی حکومت کیسے قائم ہوئی؟

چونکہ بنی امیہ کی حکومت لوگوں کی نظروں میں ناپسندیدہ، قابلِ ملامت اور لائقِ مذمت تھی۔ اور معاصی و قبائح میں مبتلا تھی۔ اس لیے اکثر لوگ مختلف شہروں میں منتظر حکومت کا صبح شام انتظار کرتے تھے۔ ادھر محمد بن علی بن ابی طالب یعنی محمدؒ بن حنفیہ کے متعلق بعض لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ اپنے بھائی حسینؑ کے قتل کے بعد یہی صاحبِ حکومت ہوں گے۔ مگر فرقۂ امامیہ کا عقیدہ یہ تھا کہ علی بن الحسینؑ (امام زین العابدینؑ) اور ان کی اولاد میں یکے بعد دیگرے امامت ہو گی۔

جب محمدؒ بن حنفیہ وفات پانے لگے تو اپنے فرزند ابوہاشم عبداللہ کو وصی بنا گئے۔ یہ رجالِ اہل بیت سے تھے۔ اتفاق سے یہ ہشام بن عبدالملک سے ملنے دمشق گئے۔ ہشام نے ان کی بڑی آؤبھگت کی۔ لیکن ان کی فصاحت، بلندی اور علم کو دیکھ کر اسے حسد پیدا ہوا اور کچھ خطرہ بھی۔ اس لیے جب وہ مدینہ کی طرف لوٹے تو اس نے ایک آدمی کے ذریعے دودھ میں زہر دلوا دیا۔ جب انھیں پتہ چل گیا تو وہ محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس کی طرف متوجہ ہوئے۔ جو شام سے حمیمہ میں آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے محمدؒ کو بتایا کہ میں تو مر رہا ہوں اور تمھیں وصی بناتا ہوں۔ ابوہاشم کے ساتھ شیعوں اور مددگاروں کی کافی جماعت تھی جو انھوں نے محمد کے سپرد کر دی۔ اور ان کے بارے میں وصیت کرنے کے بعد دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اسی دن سے محمد بن علی کے دل میں آرزوئے خلافت چٹکیاں لینے لگی۔ انھوں نے خفیہ دعاۃ پھیلا دیے اور یہی کرتے رہے یہاں تک کہ انھوں نے بھی داعیٔ اجل کو لبیک کہی اور اولاد چھوڑ گئے۔ اولاد میں ابراہیم الامام سفاح اور منصور تھے۔ امام ابراہیم اپنے والد کے بعد امارت کے قیام کے لیے کوشاں ہوئے اور ہر چہار طرف بڑی کثرت سے دعاۃ بھیجے خصوصاً خراسان کی طرف، کیونکہ بہ نسبت اور ملکوں کے انھیں اہلِ خراسان پر زیادہ اعتماد تھا۔ اہلِ حجاز بہت تھوڑے تھے۔ اہلِ کوفہ و بصرہ سے اہل بیت خائف تھے۔ کیونکہ انھوں نے امیر المومنینؑ اور حسنینؑ علیہم السلام کے ساتھ غداری کی ساتھ چھوڑ دیا اور خون بہایا۔ اب رہ گئے اہلِ شام و مصر تو ان کا میلان بنی امیہ ہی کی طرف تھا اور ان کے دلوں میں بنی امیہ کی محبت رچی ہوئی تھی۔ غرض تمام علاقوں میں لے دے کے

صرف اہلِ خراسان ہی ایسے تھے جن کی طرف سے اطمینان تھا۔

یہ بھی کہا جاتا کہ سیاہ جھنڈے جو اہل بیت کے مددگار ہوں گے خراسان سے بلند ہوں گے۔ غرض امام ابراہیم نے داعی خراسان کی طرف دوڑا دیے۔ ان میں بڑے اور باثر لوگ تھے جنھوں نے لبیک کہہ کر خفیہ خفیہ پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ آخر میں ابراہیم نے ابو مسلم خراسانی کو بھیجا جو وہاں گیا اور کافی جمعیت پیدا کر لی۔ یہ سارے کام اور پروپیگنڈا خفیہ ہوتا رہا۔

جب مروان حمار کا دور آیا جو آخری خلیفہ بنی امیہ کا تھا تو انتشار پھیل گیا۔ شر نے سر نکالا، فتنے رونما ہوئے اور اموی نظام حکومت کی چولیں ڈھیلی ہو گئیں اور ان کے آپس کے اختلافات پیدا ہو گئے اور ایک نے دوسرے کی گردن مارنی شروع کر دی۔ عین اس موقع پر ابو مسلم نے عباسی دعوت کا اعلان کر دیا۔ اور ہر صائب الرائے خراسانی اس کے جھنڈے کے نیچے چلا آیا۔ اس طرح ایک کثیر فوج امیر خراسان کے مقابلے کے لیے جمع ہو گئی۔ اس وقت امیر خراسان نصر بن سیّار تھا۔ جب نصر کو ابو مسلم اور اس کی فوج کا حال معلوم ہوا تو اسے خطرہ پیدا ہو گیا۔ اس نے مروان حمار کو لکھا۔

مروان نے جواب دیا جو فتنہ تمھارے سامنے اٹھا ہے اسے ختم کر دو۔

مروان کے پاس متواتر اطلاعات آتی رہیں مگر اس کی قوت ہر روز کمزور سے کمزور تر ہوتی جا رہی تھی۔ آخر اسے یہ معلوم ہوا کہ یہ عباسی پروپیگنڈسٹ جس کی طرف دعوت دے رہے ہیں وہ در اصل ابراہیم بن محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس ہیں جو سفاح اور منصور کے بھائی ہیں مروان نے آدمی بھیج کر انھیں گرفتار کر لیا اور حرّان میں بحالت قید انھیں زہر دے کر ختم کر دیا۔

خدا کی قدرت اور حکمت

اس کے بعد ابو مسلم کی نصر بن سیار اور دیگر امرائے خراسان سے جنگ چھڑ گئی۔ خوب خوب جنگیں ہوئیں اور آخر "مسودہ" کو غلبہ حاصل ہوا۔ مسودہ سے مراد ابو مسلم کی فوج ہے۔ یہ نام اس لیے دیا گیا کہ بنی عبّاس کی وردی سیاہ رنگ کی ہوتی تھی۔ خدا کی قدرت دیکھیے وہ جو کچھ کرنا چاہتا ہے اس کے اسباب مہیا کر دیتا ہے اور اس کے ارادے کو کوئی روک نہیں سکتا۔

جب خدا نے فرمانروائی کو بنی عباس کی طرف منتقل کرنا چاہا تو ویسے ہی اسباب پیدا کر دیے

امام ابراہیم تو حجاز یا شام میں اپنے مصلّٰے پر بیٹھے عبادت میں یا بال بچّوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھے اور دنیوی سامان ان کے پاس کچھ زیادہ نہ تھا مگر اہلِ خراسان ان کی طرف سے جنگ کر رہے تھے اور اپنی جان و مال ان پر قربان کر رہے تھے۔ اکثر تو ان میں ایسے تھے جو ابراہیم کے نام اور حال سے بھی واقف نہ تھے۔ امام ابراہیم کو دیکھیے کہ وہ دُنیا ترک کر کے اپنے گھر کے اندر بیٹھے ہیں اور ان کا لشکرِ عظیم خراسان میں ان کی طرف سے جان کی بازی لگا رہا ہے۔ ابراہیم انھیں کوئی رقم نہیں بھیجتے اور انھیں کوئی سواری یا ہتھیار بھی نہیں دیتے بلکہ الٹا ہی لوگ انھیں رقمیں بھیجتے ہیں اور ہر سال خراج ادا کرتے ہیں۔

اور جب خدا کو یہ منظور ہوا کہ مروان بے بس ہو جائے اور اموی سلطنت ختم ہو جائے تو باوجود اس کے کہ اس کی بیعتِ خلافت ہو چکی تھی اور اس کے پاس لشکر، دولت، ہتھیار اور دُنیا کے سب سامان تھے مگر لوگ اس سے کٹتے جا رہے تھے اور وہ اتنا کمزور ہو گیا کہ آخر بھاگا اور قتل کیا گیا۔ فتعالی اللہ!

جب ابومسلم کو خراسان اور اس کے علاقوں پر غلبہ حاصل ہو گیا اور اس کی حکومت مضبوط ہو گئی تو وہ عراق کی طرف روانہ ہو گیا۔ ادھر جب مروان نے ابراہیم کو گرفتار کر کے حران میں قید کر دیا تو ان کے دونوں بھائی سفاح اور منصور کو خطرہ محسوس ہوا اور وہ اپنے اکثر قرابت مندوں کے ساتھ نکل بھاگے اور کوفہ میں پہنچ گئے۔ کیونکہ یہاں ان کے شیعہ حامی موجود تھے۔ یہاں سب سے بڑا شیعہ حامی ابوسلمہ حفص بن سلیمان الخلال تھا یہی بعد میں سفاح کا وزیر ہوا جسے سفاح نے بعد میں قتل بھی کرا دیا۔ اس ابوسلمہ نے کوفہ میں ان مسافروں کے لیے ایک مکان خالی کر دیا ان سب کی خدمت اپنے ذمّے لی اور ان کے معاملے کو پوشیدہ رکھا۔ جب تمام شیعہ ان کے گرد جمع ہو گئے اور ان کا اقتدار مستحکم ہو گیا تو ابومسلم بھی خراسان سے لشکر لے کر کوفہ پہنچا اور بنی عباس کے پاس جا کر پوچھا کہ تم میں ابن حارثیہ کون ہے؟

منصور نے اپنے بھائی سفاح کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا یہ ہیں۔ انہی کی والدہ کا نام حارثیہ تھا۔ ابومسلم نے خلافت سفاح کے سپرد کر دی۔

اب سفاح اپنے بھائیوں، عم زادوں اور دوسرے قرابت داروں کو لے کر جامع مسجد

کوفہ میں پہنچے ابومسلم بھی ساتھ ساتھ تھا۔ نماز کے بعد مسجد کے منبر پر چڑھ کر اپنی دعوت کا اعلان کر دیا، اور ایک خطبہ دیا جس کے بعد سفاح کی بیعت کر لی گئی۔ یہ ۱۳۲ھ کا واقعہ ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں دولتِ عباسیہ کا آغاز اور دولتِ امویہ کا خاتمہ ہوا۔

اس کے بعد سفاح نے کوفہ سے باہر فوجیں جمع کرنی شروع کیں اور لوگ ہر طرف سے آ آ کر اس کی بیعت کرنے لگے۔ جب کافی لوگ اکٹھا ہو گئے اور خاصی قوت حاصل ہو گئی تو اس نے اپنے ایک قریبی عزیز کو مروان سے جنگ کرنے کے لیے بلایا۔ یہ بنی عباس کا ایک آدمی عبداللہ بن علی تھا جو سفاح کا چچا تھا۔ یہ مروان سے مقابلہ کرنے کے لیے روانہ ہوا اور زاب میں پڑاؤ کیا جہاں مروان ملا۔ مروان کے ساتھ ایک لاکھ بیس ہزار سپاہی تھے اور عبداللہ کے ساتھ اس سے بہت کم فوج تھی۔ یہاں اللہ نے عبداللہ پر اپنی طرح طرح کی نوازشیں کیں اور مروان کو پوری طرح بے بس کر دیا۔

مروان اس وقت دریائے زاب کے کنارے ایک لاکھ بیس ہزار فوج لیے پڑا تھا بیعت کے بعد ابوالعباس نے اپنے چچا عبداللہ بن علی کو اس کے مقابلے کے لیے بھیجا۔ جمادی الثانی ۱۳۲ھ میں دریائے زاب کے ساحل پر معرکہ آرائی ہوئی۔ مروان کے پاس فوج، ہمّت اور بہادری کسی چیز کی کمی نہ تھی اور اس نے بڑی پامردی سے مقابلہ کیا لیکن ایک طرف عباسیوں کے بڑھتے ہوئے اور فاتحانہ ولولے تھے اور دوسری طرف ایک زوال پذیر حکومت کا مخالف طاقتوں میں گھرا اور تھکا ہوا فرماں روا تھا اس لیے اس کو بڑی شکستِ فاش ہوئی اور دریائے زاب کے کنارے بنی امیہ کی قسمت کا ہمیشہ کے لیے فیصلہ ہو گیا۔ اموی فوج اس بدحواسی اور بے ترتیبی سے پیچھے ہٹی کہ اس کا بڑا حصّہ دریا میں ڈوب گیا۔ تنہا اموی خاندان کے تین سو آدمی غرق ہوئے۔

اس شکست نے مروان کی قوت بالکل توڑ دی اور وہ موصل لوٹ گیا۔ عبداللہ بن علی بھی تعاقب میں پہنچا اس لیے مروان موصل میں نہ ٹھہر سکا اور حران ہوتا ہوا شام چلا گیا۔

عبداللہ نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ اور موصل اور حران ہوتا ہوا شام پہنچ گیا ایسے نازک وقت میں اہل شام نے بھی مروان سے بے وفائی کی اور اُسے شکستہ حال

دیکھ کر اہلِ حمص نے لوٹنے کی کوشش کی۔ اس لیے اسے شام کو بھی خیرباد کہنا پڑا اور وہ حمص، دمشق اور فلسطین ہوتا ہوا مصر کی طرف نکل گیا۔

شام پہنچنے کے بعد عبداللہ بن علی نے حمص اور فلسطین پر آسانی کے ساتھ قبضہ کرلیا، دمشق میں معاویہ بن ولید نے مزاحمت کی، لیکن عبداللہ نے محاصرہ کر کے اسے بھی فتح کرلیا۔ اور یہاں سے مروان کے تعاقب میں مصر کا رُخ کیا۔ پھر کچھ دور جاکر اپنے بھائی صالح اور ابوعون کو مروان کے تعاقب میں بھیج کر خود لوٹ آیا۔

مصر کے حدود میں داخل ہونے کے بعد مروان مقام بوصیر ٹھیرا تھا۔ ابوعون اور صالح پہنچ گئے۔ مروان نے مختصر سی جماعت کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اور شکست کھا کر مارا گیا۔ یہ امویوں کی آخری جنگ تھی۔

قتل کے وقت مروان کی عمر ۶۲ سال تھی۔ مدتِ خلافت پانچ سال دس مہینے۔ مروان کا پورا زمانہ شورش و انقلاب اور جنگ و جدال میں گزرا۔ اس لیے اس کے دور میں بنی امیہ کے زوال اور خاتمے کی روداد کے علاوہ اور کوئی واقعہ قابلِ ذکر نہیں ہے۔

بنی عباس کا انتقام اور بنی امیہ کا قتلِ عام

مروان کے قتل اور اموی حکومت کے خاتمے کے بعد بھی بنی عباس کے جذبۂ انتقام کو تسکین نہ ہوئی اور انھوں نے عوام کے دلوں پر اپنا رعب جمانے اور دبدبہ بٹھانے کے لیے نہایت بے دردی سے اموی خاندان کا نام و نشان مٹادیا۔ جو اموی جنگ میں مارے گئے اُن کے علاوہ نوّے زندہ گرفتار ہوئے تھے۔ ایک دن یہ سب عبداللہ ابن علی کے ساتھ کھانے کے لیے دسترخوان پر آئے تھے کہ ایک شخص شبل بن عبداللہ نے بنی امیہ پر اشتعال دلانے والے چند اشعار پڑھے۔ عبداللہ نے اسی وقت کل امویوں کو ڈنڈوں

سے پٹوا کر مروا ڈالا اور ان کی نیم بسمل لاشوں پر دسترخوان بچھا کر کھانا کھایا۔ اس کے نیچے سے جاں کنی کی سسکیوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ زندوں کے بعد مُردوں کی باری آئی اور اموی خلفاء کی قبریں کھدوا کر ان کی خاک برباد کی۔ ہشام بن عبدالملک کی لاش سالم نکلی اسے سولی پر لٹکا کر جلادیا۔

غرض اموی خاندان میں صغیر السّن بچّوں، عورتوں یا ان لوگوں کے علاوہ جو اندلس بھاگ گئے یا روپوش تھے، کوئی زندہ نہ بچا۔ انہی میں ایک عبدالرحمٰن الداخل تھا، جس نے اندلس پہنچ کر وہاں اموی حکومت قائم کی۔

امویوں کی داستانِ زوال

عہد ادبار و انحطاط کا جائزہ و محاکمہ

ایک بنیادی اور اہم مسئلہ عہدِ خلافتِ راشدہ کے بعد دولتِ بنو امیہ عالمِ وجود میں آئی جس کے بارے میں بجا طور پر کہا جاسکتا ہے :

مری تعمیر میں مضمر تھی اک صورت خرابی کی

تاریخ اور روایات و آثار کا سارا ذخیرہ اس امر پر متفق ہے کہ حضرت عمرؓ بن عبد العزیز کے مختصر ترین دورِ حکومت کے علاوہ ایک صدی کی یہ مدت اس شہنشاہی اور قیصریت کے فروغ و استحکام میں گزری جسے اسلام سے دُور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ اسلام تو شہنشاہیت اور قیصریت کو مٹانے آیا تھا۔ اسلام کی ترقی کو توسیع مملکت کے طویل و عریض نقشوں سے نہیں جانچا جاسکتا۔

اسلام اس لیے عالمِ وجود میں نہیں آیا تھا کہ نئے نئے اور بڑے بڑے شہروں پر اس کا پرچم لہرائے، وہ دل فتح کرنے آیا تھا، رُوح کی اقلیم پر سکّہ جمانے آیا تھا، اس کا مقصدِ وجود یہ نہیں تھا کہ اینٹ اور چونے سے بنی ہوئی بڑی بڑی عمارتوں اور شہروں پر قبضہ کرلے۔ وہ سونا اور چاندی امیروں سے لے کر غریبوں میں تقسیم کرنے آیا تھا۔ اس لیے نہیں آیا تھا کہ غریبوں سے روپیہ وصول کیا جائے اور اس سے شاعروں کا دامن بھر دیا جائے، لونڈیاں خریدی جائیں غلاموں کا سودا ہو۔ وہ اپنے پیرووں کے لیے نانِ جویں کی بشارت لے کر آیا تھا کہ :

جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدریؓ!

عیش و تنعم کی سوغات لے کر نہیں آیا تھا، وہ اپنے ماننے والوں کے قلب و نظر کی تطہیر چاہتا تھا۔ اس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ لذتِ نگاہ، عیشِ نظر اور آسودگیٔ قلب و جگر کے اسباب پیدا کیے جائیں۔ وہ دُنیا سے ظلم، ناانصافی اور تعصب کو مٹا دینا چاہتا تھا، یہ اس نے کب چاہا تھا کہ لوگوں کا خون بہایا جائے، ظلم و جور کی گرم بازاری ہو اور بربریت و بہیمیت کو مقصد و منہاج بنایا جائے۔ وہ اس لیے آیا تھا کہ مسجدیں آباد ہوں، اس لیے نہیں آیا تھا کہ مسجدیں ویران ہو جائیں اور قصور و محلات کے بام و در جگمگا جائیں۔ وہ اللہ کا حکم بلند کرنے کے لیے آیا تھا حرص و ہوس کا پشتیبان بن کر نہیں آیا تھا، وہ کتاب اللہ اور سنّتِ رسول اللہؐ پر عمل کی دعوت دیتا تھا سنّتِ قیصر اور اسوۂ کسریٰ کی طرف اس نے کبھی دعوت نہیں دی تھی، وہ چاہتا تھا انسانیت کے وہ تمام حقوق واگزار ہو جائیں جو وقت کے تاجداروں اور شہریاروں نے چھین لیے تھے۔ نئے تاجدار اور شہریار پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

اس صدی کے آغاز سے پہلے اور ربع صدی تک اسلام کی خدمت اور اسلام کا نظام جن لوگوں کے ہاتھ میں تھا انھوں نے دُنیا کو بتا دیا کہ اسلام کیا ہے؟ کیوں آیا ہے؟ کیا چاہتا ہے؟ اور اس ربع صدی کے گزرنے کے بعد ایک صدی تک جن لوگوں نے مسندِ شہریاری کو زینت بخشی انھوں نے گویا صاف اور واشگاف الفاظ میں اعلان کر دیا کہ

ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور!

ربع صدی کی خلافت کے بعد ایک صدی کی اس بادشاہت کا اگر جائزہ لیا جائے تو عروج و زوال کا ایک سبق آموز، عبرت انگیز اور ناقابلِ فراموش دور نظر کے سامنے آجاتا ہے۔

اس دور میں گو اقدارِ دین پامال ہوئے لیکن مادی، علمی اور دُنیاوی نقطۂ نظر سے ترقیاں بھی ہوئیں۔ اقدارِ دین کی پامالی نے آغاز ہی سے ادبار و انحطاط کے اسباب بھی پیدا کر دیے یہ دونوں قدریں ساتھ ساتھ چلتی رہیں اور بالآخر ایک دن اس شاندار حکومت کی بساط الٹ گئی اور دوسرے لوگوں نے ایوانِ حکومت پر قبضہ کر لیا۔

مختصر طور پر آئندہ صفحات میں ہم اس موضوع پر گفتگو کریں گے۔ تاریخ اسلام کے فاضل

مؤلف نے ان اسباب وعلل کا تجزیہ کرتے ہوئے بالکل صحیح فرمایا ہے:

"اموی حکومت کا زوال اس کے قیام کے تقریباً ایک صدی بعد ہوا، لیکن اس کے عناصر اس کی تعمیر ہی کے وقت سے اس میں مضمر تھے اور بعد کے خلفاء کی سیاست اور ان کے عمال کی بے عنوانیوں نے اس میں اور اضافہ کیا۔

اس کا سب سے بڑا اور بنیادی سبب اسلامی خلافت کی بجائے موروثی اور شخصی بادشاہت تھی۔ اس حکومت کے بانی امیر معاویہ تھے۔ شخصی حکومت کے قیام کی بدعت کے باوجود انھوں نے اور دوسری حیثیتوں سے اس کو جادۂ شریعت پر قائم رکھنے کی کوشش کی لیکن ان کے جانشین اس روش کو قائم نہ رکھ سکے اور امیر معاویہ کے بعد ہی اموی حکومت اسلامی روح سے خالی ہوگئی حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز نے اپنے دور میں اس کی اصلاح وتجدید کی، لیکن ان کے بعد پھر وہی پرانا غیر شرعی اور استبدادی نظام جاری ہوگیا، مسلمان اس نظام کے عادی نہ تھے۔ ان کے سامنے صرف خلافت راشدہ کا نمونہ تھا۔ اس لیے اموی حکومت خواصِ امّت کے لوگوں میں جگہ پیدا نہ کرسکی۔

امیر معاویہ نے ہمیشہ اسلام کے اساطین وعمائد خصوصاً بنی ہاشم اور اہل بیت نبویؐ کو جو اُن کے حریف مقابل تھے راضی رکھنے کی کوشش کی۔ اس لیے ان سے اختلاف کے باوجود عام مسلمانوں میں ان کے خلاف کوئی انقلابی تحریک پیدا نہیں ہوئی، لیکن ان کے جانشین ان کی سیاست کو نہ نباہ سکے اور ان کے بیٹے یزید ہی کے زمانے میں حضرت امام حسینؓ کی شہادت اور حرمین کی بے حرمتی جیسے اہم واقعات پیش آگئے۔ جس کا اثر عام مسلمانوں پر بہت برا پڑا اور یہ سلسلہ یزید پر ختم نہیں ہوگیا بلکہ اس کے بعد بھی ناپسندیدہ واقعات پیش آتے رہے۔

شیعہ اور خارجی پہلے سے بنی امیہ کے خلاف تھے، گو اُن کا مسلک جداگانہ تھا لیکن بنی امیہ کی مخالفت دونوں میں مشترک تھی۔ یہ دونوں جماعتیں ہر زمانے میں ان کے خلاف اٹھتی رہیں۔

اموی عمال کے جبر واستبداد کی بنا پر بہت سے خواصِ امّت بھی ان کے خلاف ہو گئے۔ اور انھوں نے انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے ان کی مخالفت کی اور بنی امیہ کی مخالف

تحریکوں میں حصہ لیا۔ چنانچہ ابن اشعث کی بغاوت میں کئی سو علماء اور حفاظ نے بنی امیہ کے خلاف ابن اشعث کا ساتھ دیا۔

ان مخالف جماعتوں میں شیعانِ علیؓ سے خاص طور سے ان کو نقصان پہنچا۔ یہ بنی امیہ کے پرانے دشمن تھے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کے واقعۂ شہادت نے شیعوں کے لیے مخالفت کا سامان پیدا کردیا اور انھوں نے بنی امیہ کے خلاف پروپیگنڈا شروع کردیا۔ واقعۂ شہادت سے چونکہ عام مسلمان بھی متاثر تھے اس لیے شیعوں کو بڑی کامیابی ہوئی اور عام مسلمانوں میں بھی بنی امیہ کے خلاف جذبات پیدا ہو گئے۔

ایک اور سبب ولی عہدی کا نظام تھا۔ خصوصاً ایک وقت میں یکے بعد دیگرے ولیعہدوں کی نامزدگی نے بڑی خرابی پیدا کی کیونکہ عموماً پہلا ولی عہد تخت نشینی کے بعد اپنے بعد کے ولی عہد کو جو بیشتر اس کا بھائی یا اور کوئی قریبی عزیز ہوتا تھا محروم کرکے اپنے لڑکے کو ولی عہد بنانا چاہتا تھا۔ اس سے ایک طرف خود خاندان میں پھوٹ پڑتی تھی اور دوسری طرف عمالانِ سلطنت میں جماعت بندی ہو جاتی تھی۔

ایک اور بڑا سبب ان امراء اور ارکین سلطنت کی ناقدردانی اور ان کے ساتھ خلفاء کی بدسلوکی تھی، جن کی قوت کے بل پر اموی حکومت قائم تھی۔ موسیٰ بن نصیر جیسا اولوالعزم فاتح سلیمان کے عتاب کا شکار ہوا۔ یزید بن عبدالملک نے آلِ مہلب کا جن کی اموی حکومت میں بڑی خدمات تھیں خاتمہ کیا۔

سب سے آخری سبب جس نے اموی حکومت کا خاتمہ کیا عدنانی اور قحطانی یا مضری اور یمنی قبائل کا باہمی تعصب اور خانہ جنگی تھی۔ یہ دونوں زمانۂ جاہلیت کے پرانے حریف تھے اسلام نے ان کو متحد کردیا تھا۔ پھر جس قدر اسلامی روح کمزور پڑتی گئی یہ تعصب ابھرتا گیا۔

بنی امیہ کی قوت کا دارومدار زیادہ تر یمنی قبائل پر تھا اس لیے ابتدائی دور میں ان کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ ان میں ایک مہلب بن ابی صفرہ والیٔ خراسان کا گھرانہ تھا۔ یہ بڑا نامور قحطانی سردار اور بڑے دبدبہ اور شکوہ کا امیر تھا، خوارج اور ترکوں کے مقابلے میں اس کے بڑے کارنامے تھے۔ اس کے لڑکے بھی نامور تھے اس لیے اس خاندان کو بڑا عروج حاصل ہوا۔

یہ گھرانا تدبر و شجاعت کے ساتھ علم دوست اور شرفا نواز بھی تھا اور اس کا آستانہ ادبا اور شعراء کا مرکز بن گیا تھا۔

سوئے اتفاق یزید بن عبدالملک اموی اور یزید بن مہلب کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا اور اتنا بڑھا کہ ابن مہلب نے اس کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے عراق اور خراسان پر قبضہ کر لیا۔ لیکن آخر میں اس کو شکست ہوئی اور یزید نے پورے گھرانے کو نہایت بے دردی کے ساتھ مٹا دیا۔

کسی مستحکم حکومت کا خاتمہ بھی یک بیک نہیں ہو جاتا جس طرح کوئی انسان یک بیک نہیں مرجاتا۔ چشم ظاہر بین کو کسی فرد یا قوم یا حکومت کی موت یک بیک جو نظر آتی ہے درحقیقت اس کا آغاز بہت پہلے سے ہو چکا ہوتا ہے۔ ایک تناور درخت جو یک بیک زمین پر گر پڑتا ہے اس کی جڑ مدت سے کھوکھلی ہونی شروع ہو چکتی ہے۔ یہی حالت انسان کی ذات اور کسی حکومت کے زوال کی ہوتی ہے۔ بلاشبہ موت بظاہر دفعۃً ہوتی ہے لیکن اس کے اسباب کا نامعلوم مدت سے آغاز ہو چکا ہوتا ہے۔

یہی صورت خاندان بنی امیہ کے خاتمے کی بھی ہوئی۔

اس حکومت کا خاتمہ مروان حمار کے دور میں ہوا۔ لیکن اس خاتمے کے اسباب کا آغاز مروان ہی کے عہد میں ہو چکا تھا جس نے یزید کی بیوی سے شادی کر کے اس کے بیٹے خالد کو ولی عہدی سے معزول کر کے اپنے بیٹے عبدالملک کو خلافِ معاہدہ ولی عہد بنا دیا تھا۔ اس طرح اس حکومت کے دورِ اوّل میں ہم دیکھتے ہیں کہ امیر معاویہ نے بڑی محنت سے یہ حکومت قائم کی لیکن یزید جس کے لیے یہ سب کچھ کیا گیا تھا اسے سنبھال نہ سکا اور اس کے بیٹے نے از خود دستبردار ہو کر اپنے خاندان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

اب ہم بنو عباس کے عہدِ حکومت پر ایک نظر ڈالیں گے۔

چھٹی منزل

بنو عبّاس کا دورِ اقتدار

تمہید و تقدیم

بنو امیہ کا دورِ جلال و اقبال ختم ہو گیا۔ اب اقتدار و اختیار کی مسند پر بنو عباس فائز ہوتے ہیں۔ کل تک وہ سب کچھ تھے اور یہ کچھ نہ تھے۔ آج یہ سب کچھ ہیں وہ کچھ نہ رہ گئے کل تک لوگوں کی گردنوں کے مالک تھے۔ ایک ہاتھ میں سیم و زر کی تھیلیاں دوسرے میں شمشیر آبدار دماغ بادۂ پندار سے مست، اور آج مولی گاجر کی طرح ان کی گردنیں کٹ رہی تھیں۔ سیم و زر کی تھیلیاں اپنی قدر و قیمت سے محروم ہو چکی تھیں، جو تلوار دوسروں کی گردن پر چلتی تھی وہ اب انہی کے حلقوم پر چل رہی تھی، جو دماغ کسی کو خیال میں نہ لاتا تھا، وہ اب زندگی کی دریوزہ گری کر رہا تھا تلک الایام نداولھا بین الناس۔

بنو امیہ تقریباً سو سال تک حکمراں رہے۔ عباسیوں کے ہاتھ میں عنانِ اقتدار کم و بیش پانچسو سال تک رہی اور اپنی عجائب کاریوں کے لحاظ سے یہ دَور بھی اپنا جواب آپ ہے۔

بنو عباس نے اہلِ بیت نبوی کے نام پر دعوتِ انقلاب میں حصّہ لیا تھا۔ لیکن بخت و اتفاق سے جب حکومت ان کے ہاتھ میں آگئی تو یہ بھی اہل بیت کے لئے بنو امیہ سے کم سفاک ثابت نہیں ہوئے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ بڑھ گئے تو شاید مبالغہ نہ ہوگا۔

اس عہد کی رنگ آرائیاں اور بوقلمونیاں بے اختیار دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتی ہیں یہ وہ عہد ہے جو تلوار کے زور سے شروع ہوا اور تلوار کی دھار پر ختم ہوا۔ اس کا پہلا

فرماں روا اپنی افتادِ طبع کے لحاظ سے سفاح (خون آشام) کے نام سے معروف ہوا اور آخری فرماں روا ہلاکو کی تیغِ شقاوت کا ہدف بنا۔

اس طویل مدت کا اگر جائزہ لیا جائے تو اس میں جہاں عہد شکنی، امان شکنی، ظلم و جور شقاوت و سفاکی، محسن کشی اور ستمِ ناروا کی اَن گنت مثالیں ملیں گی وہاں تہذیب و تمدّن کی ترقّی، علم کی وسعت، اختیار اور حکمت و دانش کی توسیع و فروغ کی بھی لاانتہا مثالیں دست یاب ہوں گی۔

اس عہد میں ابوسلمہ جیسا شخص ہلاک کیا گیا۔ ابومسلم جس نے اس حکومت کی تعمیر کی تھی، بے خطا قتل کیا گیا۔ خاندانِ برمکی جس کے جود و سخا کی داستانیں اور شرافت و انسانیت کی کہانیاں آج بھی زبان زدِ خاص و عام ہیں بے دردی سے مٹایا گیا۔ امام مالکؒ جیسے جلیل القدر امیر المومنین فی الحدیث کے تازیانے لگائے گئے۔ امام احمد بن حنبل جیسی گراں بہا شخصیّت کے بدن پر تازیانے مارے گئے۔ امام ابوحنیفہ جیسی عظیم و جلیل ہستی کو قید و زنداں کے مصائب برداشت کرنے پڑے۔ نفسِ ذکیہ، نفسِ رضیہ اور امام علی رضا وغیرہ کو جامِ شہادت نوش کرنا پڑا۔ وہاں بیت الحکمت بھی قائم ہوا۔ ارسطو اور فلاطون کے فلسفے کی نہ صرف تجدید کی گئی بلکہ اس میں گراں بہا اضافے بھی کیے گئے، بیمارستان کی بنیاد پڑی اور ناداروں کے علاج کا خاطر خواہ انتظام کیا گیا۔ دانش گاہیں قائم کی گئیں اور علم و حکمت کے موتیوں سے نہ جانے کتنوں کا دامن بھر گیا۔

فتوحات کے نقطۂ نظر سے بھی یہ عہد بے حد شان دار اور کامگار نظر آتا ہے۔ مسلمان حکومت کی سرحدا تنی وسیع ہوگئی جتنی کبھی نہیں ہوئی تھی۔ یہ حکومت اس جاہ و جلال اور دبدبہ و طنطنہ کے ساتھ قائم ہوئی کہ اس نے نہ صرف باغیوں کی سرکوبی کی بلکہ غیر مسلم حریفوں اور دشمنوں کو بھی اس طرح کچلا کہ پھر وہ سر نہ اٹھا سکے۔

اس عہد میں تاریخ کی تدوین ہوئی، علم اسماء الرجال مکمل ہوا۔ علمِ حدیث اور اصولِ حدیث، علمِ فقہ اور اصولِ فقہ نے تکمیل کے مراحل طے کیے۔ فقہا اور محدثین میں وہ عظیم المرتبت ہستیاں جن کی پیروی آج بھی عالمِ اسلام کے لیے مایۂ فخر و مباہات ہے اس دور میں ابھریں

اور ان کے حلقے قائم ہوئے۔ امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام محمد، امام ابویوسف، امام شافعی امام احمد بن حنبل وغیرہ اعاظمِ رجال اسی دَور کی پیداوار ہیں۔

غرض جس اعتبار سے نظر ڈالی جائے، یہ دور اپنے خصوصیات کے اعتبار سے منفرد اور یگانہ نظر آئے گا۔

پانچسو برس کی طویل تاریخ کو اس طرح مختصر کرنا کہ کوئی اہم چیز رہنے نہ پائے ایک کٹھن کام ہے لیکن یہ کام انجام دیئے بغیر کاروانِ شوق آگے نہیں بڑھ سکتا۔ کوشش کی گئی ہے کہ اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ، حجت و استناد کے تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر اس دَور کو پیش کیا جائے کہ اس منزل کے بعد بھی کئی منزلیں ہیں جن پر سے ہمارے اس کارواں کو گزرنا ہے۔

السعی منی والاتمام من اللہ!

ابوالعباس سفاح

امویوں کا استیصال کاروانِ فتح وظفر وزارت کا قیام

شمائل وفضائل ابوالعباس سفاح، بنو عباس کے پہلے خلیفہ کے بارے میں علامہ سیوطی نے لکھا ہے:

۳۔ ربیع الاول ۱۳۲ھ میں عبداللہ سفاح نے کوفہ میں اپنی خلافت کا اعلان کیا اور نماز جمعہ پڑھا کر دوران خطبہ میں کہا: تمام تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جس نے اسلام کو پسندیدہ مذہب بنایا اور بزرگی وشرافت وعظمت عنایت فرمائی اور ہم کو اسلام کی دولت سے سرفراز کر کے امداد واعانت فرمائی۔ اور ہمیں اسلام کا اہل اور قلعہ بنایا اور استحکام مرحمت فرما کر مکروہات کو نکال پھینکنے کا حکم صادر فرمایا پھر قرآن کریم کی آیات کا حوالہ دیتے ہوئے اپنی رشتہ داری کا یوں تذکرہ کیا کہ رسول اللہ کی رحلت کے بعد اللہ نے امورِ اسلامی کی اجرائی صحابۂ کرام کے حوالہ کر دی اور صحابہ بحکم الٰہی ورسالت پناہی امورِ اسلامی کو انجام دیتے رہے یہاں تک کہ وہ زمانہ آیا جس میں بنو حرب اور مروان پیدا ہوئے اور انھوں نے بے انتہا جور وستم کیے اور مظالم توڑنے پر کمربستہ ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ہمارے ذریعے ان ظالموں سے انتقام لیا اور ہمارا حق ہم کو دلایا تاکہ ہم ان لوگوں کی مدد کریں جو ستم وجور کی وجہ سے

۱: ۱۳۲ھ تا ۱۳۶ھ (۷۴۹ء تا ۷۵۳ء)

کمزور ہو گئے ہیں۔ اور اللہ نے جس چیز کو ہمارے خاندان کے ساتھ شروع کیا تھا وہ ہم کو دوبارہ دے دی اور ہم آل محمد کو اللہ تعالیٰ ہی نے توفیق دی اور وہی انشاءاللہ اچھے کام کرنے کی توفیق دے گا۔

اے کوفہ کے باشندو! تم ہماری محبت کے محل و مقام اور ہماری الفت کی منزل و فرودگاہ ہو۔ تم اپنی بیعت سے کنارہ کشی نہ کرنا اور ظالم و جابر تم کو تمھارے نیک ارادوں میں علیحدہ نہ کرنے پائیں۔ تم ہمارے ساتھ اپنی خوش قسمتی کو دیکھو تاکہ تم پر مزید اکرامات و احسانات کی بارش ہو۔ میں نے تمھاری جاگیروں، مناصب، وظائف اور تنخواہوں وغیرہ میں فی کس سو روپے کا اضافہ کر دیا ہے اب تم بالکل تیار ہو جاؤ۔ تم جانتے ہو کہ میں سفاح ہوں جو تم پر نیکیوں کے دریا بہائے گا اور اچھے کاموں کے عوض دولت کے کنوئیں تمھارے ہیں۔

دار الخلافہ کی تبدیلی

عبداللہ سفاح نے ۱۳۴ھ میں کوفہ کی بجائے انبار نامی مقام کو دار السلطنت قرار دیا جہاں اپنے بھائی ابوجعفر کو ولیعہد خلافت بنایا اور اسی مقام پر چیچک کے مرض میں مبتلا ہو کر ماہ ذی الحجہ ۱۳۶ھ میں انتقال کیا۔

اقوالِ سفاح

صولی نے سفاح کے یہ اقوال بیان کیے ہیں:

۱: جب اقتدار کی قوت وسیع ہو جاتی ہے تو خواہشات کم ہو جاتی ہیں اور کوئی نیکی ضائع اور اکارت نہیں ہوتی۔

۲: کمینے اور ذلیل وہ ہیں جو بخل کو احتیاط اور بردباری کو ذلت تصور کرتے ہیں۔ اگر بردباری کو حقیر تصور کیا جائے تو عفو و درگزر کرنا بھی کمزوری و عاجزی کہلائے گا۔

۳: صبر اور ثابت قدمی بڑی اچھی چیز ہے بشرطیکہ اس کے باعث اسلام میں کوئی خلل پیدا نہ ہو اور حاکمِ اعلیٰ میں سستی پیدا نہ ہو۔

۴: سخاوت وہیں تک اچھی ہے جہاں تک سکت اور قوت ہو۔

خصائلِ سفاح

صولی کا بیان ہے سفاح بڑا سخی سردار تھا۔ جب کسی سے کوئی وعدہ کر لیتا تو اسے پورا کیے بغیر مجلس برخاست نہ کرتا۔ ایک مرتبہ عبداللہ بن حسن

نے اس سے کہا میں نے ایک لاکھ درہم کا نام سُنا ہے لیکن آنکھوں سے کبھی دیکھے نہیں جس پر سفاح نے ایک لاکھ درہم منگوا کر عبداللہ کے ساتھ ان کے گھر بھجوا دیے۔

"الفخری" کے فاضل اجل مؤلف نے عہد بنو عباس پر عمومی تبصرہ کرتے ہوئے اور سفاح کے حالات و سیرت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ہے:

بنو عباس کے نقائص اور فضائل حکومت عباسیہ مکر و فریب اور بے وفائی کی حکومت تھی۔ اس میں جتنی قوت و شدت تھی اس سے کہیں زیادہ اس میں حیلہ و دغا تھی۔ خصوصاً آخری دور میں تو ان کے متاخرین نے قوت و شجاعت اور پامردی کو چھوڑ کر بہانے اور فریب کو اپنا وتیرہ بنا لیا تھا۔

ان تمام باتوں کے باوجود یہ حکومت بے شمار محاسن کا مجموعہ اور بے انتہا خوبیوں کا مرکز تھی۔ علوم کے بازار لگے ہوئے تھے، آداب کے سودے ارزاں تھے، شعائرِ دین کی عظمت قائم تھی۔ نیکیاں نہر کی طرح جاری تھیں، دُنیا آباد تھی۔ حرماتِ الٰہیہ کا لحاظ رکھا جاتا تھا اور سرحدیں نہایت مضبوط تھیں۔ اور یہ تمام باتیں آخری دور تک قائم رہیں۔ اس کے بعد جبر و استبداد پھیل گیا اور نظام درہم برہم ہو گیا۔ حکومت چھن گئی۔

امویوں کا قتلِ عام یہ بڑا سخی، بردبار، صاحبِ وقار، زیرک، باحیا اور خلیق تھا جب اس کی بیعت ہوئی اور اقتدار مستحکم ہو گیا تو اس نے بنی امیہ کے بچے کھچے لوگوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر تلوار کی نوک پر رکھا۔ ایک بار یہ اپنی محفل میں بیٹھا تھا۔ اور سلیمان بن ہشام بن عبدالملک بھی اس کے پاس بیٹھا تھا۔ سفاح اس کے ساتھ بہت شرافت سے پیش آیا اتنے میں ایک شاعر "سدیف" آیا اور اس نے یہ اشعار پڑھے:

لا یغرنک ما تری من رجال ان تحت الضلوع داءً دویا

فضع السیف وارفع السوط حتی لا تری فوق ظھرھا امویا

(اے سفاح) تم بعض آدمیوں کو دیکھ کر دھوکے میں نہ پڑو۔ پہلو کے نیچے شدید قسم کا درد موجود ہے تلوار اٹھائے رہو اور کوڑا اٹھائے رہو یہاں تک کہ روئے زمین میں کوئی اموی نظر نہ آئے۔

سلیمان نے مڑ کر دیکھا اور کہا: تم نے مجھے قتل کرا دیا۔ پھر سفاح اندر گیا اور واپس آکر سلیمان کو

پکڑا اور قتل کر دیا۔

ایک دوسرے موقع پر ایک دوسرا شاعر آیا تو اس وقت بنی امیہ کے ستّر افراد بیٹھے تھے اور ان کے آگے کھانا چنا ہوا تھا۔ شاعر نے کہا:

عباسی سرداروں کی بدولت بادشاہت کی بنیاد بڑی مضبوط ہو چکی ہے۔
انھوں نے ہاشم کا بدلا لینا چاہا اور آخر زمانہ کی کجرفتاری اور مایوسی کے بعد بدلہ لے لیا۔
اے عبدِ شمس ان گرے ہوؤں کو نہ اٹھاؤ بلکہ ہر لمبے کھجور کو جڑ سے کاٹ ڈالو۔
ان کی ذلّت ان کو اظہارِ محبت پر مجبور کر رہی ہے۔ ورنہ وہ تمھارے لیے استرے سے کم نہیں۔
قالینوں اور کرسیوں سے ان کا قریب ہونا مجھے بھی کھلتا ہے اور میرے سوا دوسروں کو بھی۔
اللہ نے انھیں ذلت و حقارت کے جس مقام پر رکھا ہے اسی مقام پر انھیں تم بھی رکھو۔
حسینؓ اور زید کے قتل کو اور نہر اس کے کنارے والے مقتول کو یاد کرو۔
اور حرّان کے اس مقتول کو بھی یاد کرو جو غربت اور فراموشی کے درمیان آرام کر رہا ہے۔"

امویوں میں سے ایک نے اپنے پاس والے شخص سے کہا کہ: اس شخص نے آج ہم سب کی جان لے لی۔ پھر سفاح کے حکم سے ان سب کی گردنیں مار دی گئیں اور ان کی لاشوں پر چمڑے کا فرش بچھا دیا گیا۔ جس پر سفاح نے بیٹھ کر کھانا کھایا اس وقت وہ بعض قریب مرگ لاشوں کی سسکیاں بھی سن رہا تھا۔

امویوں کی قبروں کی بے حرمتی

بنی عباس نے بنی امیہ کو بیخ و بن سے مٹا ڈالنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ حتیٰ کہ دمشق میں ان کی قبریں بھی کھود ڈالیں۔ انھوں نے معاویہ بن ابی سفیان کی قبر کھودی تو اس میں غبار کی طرح دھاگے کے سوا کچھ نہ ملا۔ یزید کی قبر کھودی گئی تو اس میں راکھ کی طرح کی خشک چیزیں ملیں۔ جب بنی امیہ کے آدمی مارے گئے اور مال لوٹے گئے تو سفاح نے کہا۔

اے بنی امیہ میں نے تم سب کو فنا کر دیا۔ میں نے بھی گزرے ہوئے ابتدائی دور میں تم سے

کیا کیا تکلیفیں اٹھائیں۔

یہ سوچ کر دل خوش ہوتا ہے کہ تم سب کو آگ یکجا کرے گی اور تمہیں اس کے شعلوں سے بدترین بدلہ ملے گا۔

خدا تم گرے ہوؤں کو نہ اٹھائے۔ تم کسی ایسے (عینی) جنگلی شیر کی آرزو لیے بیٹھے تھے جو دشمنوں پر جھپٹ پڑے۔

اگر پہلے مجھے تمہارے غائب ہونے کا خدشہ تھا تو اب میں اس بات سے راضی ہوں جس سے خدا بھی راضی ہے۔

سفاح کی حکومت زیادہ عرصے تک نہ رہی۔ وہ قیام انبار ۱۳۶ھ میں انتقال کر گیا۔

عہدِ سفاح ۔ وزارت اور سیاست کا جائزہ

صدق و راستی وزیر کا راس الکمال ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر وزیر ہی خائن ہو تو ساری تدبیریں ناکام ہو جاتی ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ جھوٹے کی کوئی رائے نہیں ہوتی۔ وزیر کے لیے مساوات، زیرکی، ذہانت، بیدار مغزی، تدبر اور دور اندیشی ضروری اوصاف ہیں۔ اسے بڑا سخی اور کھلانے پلانے والا ہونا چاہیے تاکہ وہ لوگوں کی گردنوں کو جھکا سکے۔ اور ہر زبان پر اس کا ذکرِ خیر ہو۔ نرمی، بردباری، ثابت قدمی، حلم، وقار، اقتدار اور بات کا دھنی ہونا بھی اس کے لیے لازمی صفات ہیں۔

وزارت کے باقاعدہ قوانین بنی عباس ہی کے دور میں باوقعت سمجھے گئے ورنہ اس سے پہلے وزارت نہ قواعد مقرر کرتی تھی نہ قوانین۔ ہر وزیر اپنے بادشاہ کا حاشیہ بردار اور جی حضوری ہوا کرتا تھا اور جب کوئی اہم معاملہ پیش آتا تو فرمانروا، اہل الرائے لوگوں کو جمع کر کے مشورہ کرتا اور اس وقت ہر رائے دینے والا گویا وزیر کا کام کرتا تھا بلکہ عباسیوں سے پہلے وزیر کو کاتب یا مشیر کہا جاتا تھا۔

ابو سلمہ ۔ پہلا وزیر اور اس کا انجام

پہلے عباسی خلیفہ کا سب سے پہلا وزیر حفص بن سلیمان ابو سلمہ خلال تھا۔ یہ بنی حارث بن کعب کا آزاد کردہ غلام تھا۔

ابوسلمہ کوفے کے خوشحال لوگوں میں تھا اور عباسی پروپیگنڈے پر اپنی دولت صرف کیا کرتا تھا۔ بنی عباس سے پیوستہ ہوجانے کا سبب یہ تھا کہ یہ بکیر بن ہامان کا سسرالی رشتہ دار تھا۔ بکیر بن ہامان ابراہیم الامام کا خاص سکریٹری تھا جب یہ مرنے لگا تو اس نے ابراہیم الامام سے کہا کہ کوفہ میں میرا ایک سسرالی رشتہ دار ہے جسے ابوسلمہ خلال کہتے ہیں۔ میں نے عباسی پروپیگنڈے کے لیے اپنا جانشین بنایا ہے۔ اس کے بعد بکیر بن ہامان مرگیا تو ابراہیم نے ابوسلمہ کو بتایا اور اپنے پروپیگنڈہ پر اسے مامور کیا۔ ابوسلمہ نے اس کام میں بڑا نمایاں حصہ لیا۔ لیکن جب بنی عباس کے حالات کی اس نے جانچ پڑتال کرلی تو اس نے ان کی طرف سے ہٹ کر اولادِ علیؓ کی طرف آنے کا ارادہ کرلیا اور تین بڑے ابنائے علی کو خط لکھے۔ ایک جعفر صادقؒ بن محمد کو دوسرا عبداللہ المحض بن حسن بن علی بن ابی طالب علیہ السلام اور تیسرا عمر الاشراف بن زین العابدین علیہ السلام کو۔ ابوسلمہ نے اپنے ایک غلام کو یہ تینوں خط دیے اور کہا کہ: پہلے جعفر صادق بن محمد کو خط دینا۔ اگر وہ مان لیں تو باقی دو خطوں کو ضائع کردینا۔ اگر وہ انکار کریں تو عبداللہ المحض کے پاس جانا۔ اگر وہ قبول کرلیں تو عمر الاشراف کا خط ضائع کردینا۔ اگر وہ بھی نہ مانیں تو عمر الاشراف کے پاس جانا۔

لیکن ابوسلمہ کی اسکیم ناکام رہی اور سفاح کی بیعت کرلی گئی۔ ابوسلمہ کی یہ شکایت سفاح تک پہنچ گئی اور اس نے ابوسلمہ کو قتل کردیا۔

ابوسلمہ بڑا شریف، فیاض اور بخشش کرنے والا تھا۔ عمدہ سے عمدہ ہتھیار اور سواری کا شوقین تھا۔ فصیح تھا اور روایات، اشعار، سیر اور مناظرے اور تفسیر کا بڑا عالم تھا۔ برجستہ گو اور فراخ دست تھا اور ظاہری مروت بہت تھی۔ جب سفاح کی بیعت ہوئی تو اس نے اسے وزیر بنایا۔ اور تمام معاملات اور دفاتر اس کے سپرد کردیے اور اسے وزیر آلِ محمد کا لقب بھی دیا۔ مگر سفاح کے دل میں اس کی طرف سے کچھ کھٹک تھی۔ سفاح کو یہ اندیشہ تھا کہ اگر وہ ابوسلمہ کو قتل کرادے تو ابومسلم خراسانی اس قتل کو اپنے لیے بھی خطرہ سمجھے گا اور خفا بھی ہوجائے گا۔ اس لیے اس نے اس کے لیے ایک عمدہ راستہ نکالا۔ یعنی ابومسلم کو خط لکھ کر بتایا کہ ابوسلمہ بنی عباس سے حکومت کو کسی اور طرف منتقل کرنا چاہتا ہے اور آخر میں لکھا کہ میں اس کا یہ جرم تمہارے پاس بطور تحفہ بھیجتا ہوں۔ گویا بین السطور یہ مضمون تھا کہ وہ ابوسلمہ کو قتل کرنے کی تصویب ابومسلم سے چاہتا تھا۔ یہ خط سفاح نے

اپنے بھائی منصور کے ہاتھ بھیجا تھا۔ ابو مسلم نے خط پڑھا اور سفاح کا مطلب سمجھ گیا۔ اس نے کچھ خراسانیوں کو بھیج کر ابو سلمہ کو قتل کرا دیا۔

خالد بن برمک کی وزارت اور اس کی سیرت

یہی خالد ہے جو برامکہ کا جد ہے اور انہی ایام میں دولت برمک نے فروغ پایا اور رشید کے زمانے میں اس کا زوال ہوا۔ خالد برمک حکومتِ عباسیہ کے خاص آدمیوں میں تھا۔ بڑا فاضل، سخی ہوشیار اور چوکس تھا۔ سفاح نے اسے وزیر بنایا اور برابر اس سے وابستہ رہا۔ وہ اسے وزیر کہتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ابو سلمہ کے بعد جو بھی وزیر ہوا وہ وزیر کہلانے سے بچتا تھا۔ کیونکہ پہلے وزیر ابو سلمہ کے ساتھ جو کچھ ہوا اسے فالِ بد تصور کرتا تھا۔

کہتے ہیں کہ خالد برمک وزیر ہی کا کام کرتا تھا، مگر وزیر نہیں کہلاتا تھا۔ خلفاء کی نظروں میں یہ عظیم المرتبت انسان تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دن سفاح نے اس سے کہا کہ اے خالد! جب تک تم نے مجھ سے خدمت نہیں لے لی اس وقت تک میں خوش نہیں ہوا۔ خالد ڈر گیا اور پوچھا کہ امیر المومنین! یہ کیسے ہو سکتا ہے میں تو آپ کا غلام اور چاکر ہوں۔ سفاح نے ہنس کر کہا: رات کو میری بیٹی ریطہ تمہاری بیٹی کے ساتھ ایک ہی جگہ سوتی ہے۔ میں شب کو اٹھتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ دونوں پر سے چادر ہٹی ہوئی ہے تو میں انھیں چادر اوڑھا دیتا ہوں۔ خالد نے یہ سن کر اس کا ہاتھ چوما اور کہا: آقا اپنے غلام و کنیز پر عنایت کر کے اجر حاصل کر لیتا ہے۔

خالد برمک کے دروازے پر لوگ بڑی کثرت سے آیا کرتے تھے۔ شعراء نے اس کی خوب خوب مدح کی ہے۔ لوگ اس کے پاس مالی فوائد حاصل کرنے کے لیے آیا کرتے تھے اس سے پہلے آنے والے لوگوں کو سائل کہا جاتا تھا۔ خالد نے اس لفظ کو ناپسند کیا اس لیے کہ ان آنے والوں میں بڑے بڑے شریف لوگ بھی ہوا کرتے تھے اس لئے ان آنے والوں کا نام زائر رکھا۔ چنانچہ بعض لوگوں نے کہا: ہم نہیں بتا سکتے کہ کون سا فائدہ زیادہ بڑا ہے آپ کے انعامات یا یہ لقب (زائر)۔

جب منصور نے شہر بغداد کی تعمیر شروع کی تو اس کے اخراجات بہت بڑھ گئے اس وقت ابو ایوب موریانی نے رائے دی کہ ایوانِ کسریٰ (واقع بغداد) کو ڈھا کر اس کا ملبہ

یہاں استعمال کیا جائے۔ منصور نے خالد بن برمک سے مشورہ کیا تو اس نے رائے دی کہ:
امیر المومنین! ایسا نہ کیجیے کہ یہ فتح اسلام کی ایک نشانی ہے، لوگ جب اسے دیکھتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ آسمانی طاقت کے سوا کوئی اس عمارت کو ڈھا نہیں سکتا۔ علاوہ ازیں یہاں علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا مصلیٰ (ادائے نماز کی جگہ) بھی ہے۔ نیز اس کے ملبے کی قیمت سے کہیں زیادہ خرچ اس کے توڑنے میں ہوگا۔ منصور نے کہا: اے خالد! تم میں ابھی عجمیت کی بُو باقی ہے۔ اس کے بعد اس نے اسے ڈھانے کا حکم دے دیا۔ اس کا ایک حصہ توڑنے سے معلوم ہوا کہ توڑنے کا خرچ ملبے کی قیمت سے کہیں زیادہ ہے منصور نے انہدام روک دیا اور کہا: خالد! میں نے تمھاری رائے اختیار کر لی ہے اور ایوان کا انہدام روک دیا ہے۔ خالد نے کہا: امیر المومنین! اب تو میری رائے توڑ دینے ہی کے حق میں ہے ورنہ لوگ کہیں گے آپ دوسروں کی بنائی ہوئی عمارت کو ڈھانے پر قادر نہ ہو سکے۔ اس لیے ہاتھ کھینچ لیا اور ڈھانے سے باز آگئے۔

مدینۃ المنصور سفاح کا پایہ تخت انبار تھا۔ اس نے یعقوبی کے بیان کے مطابق ہاشمیہ کے نام سے ایک نیا شہر آباد کیا تھا جیسے دہلی اور نئی دہلی۔ اخبار الطوال میں اس شہر کا نام مدینۃ المنصور درج ہے۔

نظمِ مملکت اور وسعتِ مقبوضات سفاح کا دور اس اعتبار سے بھی خاص اہمیت رکھتا ہے:

بنی عباس کے اعوان و انصار زیادہ تر عراق و خراسان میں تھے۔ یہیں سفاح کی سب سے پہلی بیعت ہوئی تھی۔ اس لیے اس نے عراق ہی کو پایہ تخت بنایا اور ۱۳۴ھ میں انبار میں ایک شہر ہاشمیہ آباد کر کے اس کو پایہ تخت قرار دیا۔ یہ شہر سفاح کے نام سے مدینۃ المنصور بھی کہلاتا تھا۔

سفاح نے اپنی حکومت کا ڈھانچہ اس طرح کھڑا کیا کہ اپنے بھائی ابوجعفر منصور کو جزیرہ آذربائیجان اور آرمینیہ کا والی بنایا اور اپنے چچا داؤد کو مدینۂ منوّرہ، مکہ معظمہ یمن اور یمامہ سپرد کیا اور اپنے ایک بھتیجے کو کوفہ بھیجا۔ اپنے دوسرے چچا کو شام دیا اور مصر

کی حکومت ابوعون کے سپرد کی۔ خراسان کی باگ بدستور ابومسلم کے ہاتھ میں رہنے دی۔ اور فارس کا امیر اپنے بھائی کو بنایا۔

بنی عباس اور بنی امیہ کی معرکہ آرائیوں کے زمانے ہی میں ممالک محروسہ کا بڑا حصہ بنی عباس کے زیر نگیں ہو چکا تھا، جو حصے باقی رہ گئے تھے ان پر سفاح کے زمانے میں قبضہ ہو گیا اس سلسلے میں بعض معمولی لڑائیاں بھی پیش آئیں۔

خراسان پر مروان ہی کے زمانے میں قبضہ ہو چکا تھا۔ ۱۳۳ھ میں محمد بن مسلمہ اموی نے اسے واپس لینے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اسی طرح اہلِ موصل کی جانب سے مخالفت کا ظہور ہوا اور انھوں نے عباسی حاکم محمد بن صول کو اپنے یہاں سے نکال دیا۔ سفاح نے یحییٰ بن علی کو بھیجا۔ اس نے بزورِ شمشیر اہل موصل کو مطیع بنایا۔

آرمینیہ پر یہاں کے اموی حاکم اسحٰق بن مسلم عقیلی کا نائب مسافر بن کثیر قابض ہو گیا تھا سفاح نے محمد بن صول کو اس کے مقابلے کے لیے بھیجا۔ اس نے اسحٰق کو قتل کر کے آرمینیہ کو اس کے قبضے سے چھڑایا۔

اسی طرح سندھ پر ایک شخص منصور بن جمہور نے بنی امیہ کے آخری دور میں غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا۔ عبدالرحمٰن بن مسلم نے مغلس عبدی کو سرحد کا حاکم مقرر کیا، اس نے سندھ پر فوج کشی کی منصور نے اسے قتل کر دیا۔ ابومسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے موسیٰ بن کعب کو سندھ روانہ کیا۔ اس نے منصور کو شکست دی، شکست کھا کر وہ ریگستانی علاقے کی جانب بھاگ گیا اور اس بے آب و گیاہ علاقہ میں پانی نہ ملنے کی وجہ سے پیاسوں مر گیا۔ سندھ پر قبضہ کے بعد موسیٰ نے منصورہ کو جو ہندوؤں کی یورش سے ویران ہو گیا تھا، دوبارہ آباد کیا اور بعض نئی فتوحات حاصل کیں۔

باغیوں کی سرکوبی عباسی دعوت چونکہ اہل بیتؑ کے نام کے پردہ میں کی گئی تھی اس لیے ان کے بہت سے ہوا خواہ اس میں شریک ہو گئے تھے لیکن بنی امیہ کے خاتمے کے بعد جب ان کی توقع کے خلاف اہل بیتؑ کے بجائے بنی عباس کے ہاتھوں میں حکومت آئی تو وہ لوگ ان کے خلاف ہو گئے۔ چنانچہ ایک محب اہل بیت شریک نے بخارا

میں علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ تیس ہزار آدمی اس کے ساتھ ہو گئے۔ لیکن ابو مسلم نے اس کا خاتمہ کر دیا۔ اور ایک خراسانی امیر بسام بن ابراہیم باغی ہو گیا۔ اس کے ساتھ بھی ایک جماعت ہو گئی تھی۔ سفاح نے خازم ابن خزیمہ کو بھیج کر اس کا بھی خاتمہ کر دیا۔

قیصرِ روم کا حملہ دوسری طرف انقلابِ حکومت کی بدنظمی سے فائدہ اٹھا کر ۱۳۳ھ میں قیصرِ روم نے ایشیائے کوچک کے ایک سرحدی شہر کمخ پر حملہ کر دیا۔ یہاں کے باشندوں نے ملطیہ کے مسلمانوں کی مدد سے مقابلہ کیا لیکن ان کو شکست ہوئی۔ کمخ کے بعد رومیوں نے ملطیہ کو گھیر لیا۔ اور یہاں کے مسلمانوں سے کہلا بھیجا کہ وہ شہر حوالہ کر کے اسلامی علاقے سے نکل جائیں۔ ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا۔ مسلمانوں نے انکار کیا۔ ان کے انکار پر رومیوں نے محاصرہ اور زیادہ سخت کر دیا۔ مسلمانوں میں زیادہ تابِ مقاومت نہ تھی اس لیے انھوں نے مجبور ہو کر ملطیہ چھوڑ دیا اور جزیرہ چلے گئے۔ شہر خالی ہونے کے بعد رومیوں نے اس کو بالکل ویران کر دیا اور یہاں جتنے مسلمان مرد تھے ان کو قتل اور عورتوں کو قید کر لیا۔ یعقوبی کا بیان ہے کہ ملطیہ پر رومیوں کا قبضہ نہیں ہوا۔ بلکہ مصالحت ہو گئی اور سفاح نے آئندہ خطرات کے انسداد کے لیے عبداللہ بن علی کو بھیج کر سرحد کی حفاظت کا انتظام کرایا۔

فوج کشی کا سلسلہ ان حوادث کے ساتھ سرحدوں پر فوج کشی کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ چنانچہ ۱۳۳ھ میں خالد بن ابراہیم نے ختن پر فوج کشی کی یہاں کا فرماں روا حبیش بن شبل معمولی سی مدافعت کے بعد چین کی طرف نکل گیا۔

اسی سنہ میں فرغانہ اور چاچ کے حکمرانوں میں مخالفت ہو گئی۔ فرغانہ کے حاکم نے خاقانِ چین کی مدد سے چاچ کا محاصرہ کر لیا۔ فرمانروائے چاچ میں خاقان کے مقابلے کی طاقت نہ تھی اس لیے اس نے اس کی اطاعت قبول کر لی۔ ابو مسلم خراسانی کو اس اختلاف کی خبر ہو گئی۔ اس نے فوراً زیاد بن صالح کو روانہ کر دیا۔ دریائے طراز پر دونوں کا مقابلہ ہوا۔ زیاد نے بڑی فاش شکست دی۔ ۱۳۴ھ میں خالد بن ابراہیم نے کش پر فوج کشی کی اور یہاں کے فرمانروا آخرید کو قتل کر کے بہت سا مالِ غنیمت حاصل کیا اور آخرید کے بھائی طاران کو کش کا حاکم بنایا۔

۱۳۶ھ میں سفاح نے اپنے بعد اپنے بھائی ابوجعفر منصور کو اور اس کے بعد اپنے بھتیجے

عیسیٰ بن موسیٰ کو ولی عہد مقرر کیا۔

ایک بدعت تو اسلام جیسے جمہوریت مآب مذہب میں انتخاب اور شوریٰ کے بجائے مطلق العنان اور موروثی بادشاہت کا قیام تھا جسے اسلام کے مزاج اور طبیعت سے ذرا بھی توافق حاصل نہیں تھا۔ دوسری اس سے بڑی بدعت جو آگے چل کر بہت سے فتنوں، خونریزیوں اور باہمی کشت و خون کا سبب بنی بہ یک وقت دو دو یا تین تین ولیعہدوں کی نامزدگی تھی۔

ولیعہدوں کی اس فہرست کو مرتب اور نافذ کرنے والا تو یہ سمجھ کر کہ اپنے اپنے خاندان اور اولاد میں سلسلۂ حکومت غیر منفصل طور پر قائم اور مستحکم کر دیا ہے اطمینان کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو جاتا تھا، لیکن اس کے بعد جو افراتفری مچتی تھی، جس طرح بھائی بھائی کے خون سے ہاتھ رنگتا تھا، جس طرح اہلِ دربار سازشوں کا جال بچھاتے تھے اور جس طرح خاندانِ خلافت کی بے وقری ہوتی تھی اس سے دشمن تو لطف اندوز ہوتے تھے لیکن ملت کا درد رکھنے والوں کے دل خون کے آنسو رونے لگتے تھے۔ اگر ولیعہدوں کے بارے میں ایسے اسراف سے کام نہ لیا گیا ہوتا تو بھی شاید حالات اتنے ناسازگار اور زبوں نہ ہوتے۔ لیکن اس چیز نے اور زیادہ حالات کو پیچیدہ اور ناقابلِ برداشت بنا دیا۔ جس کا ثمرِ تلخ ایک فرد یا ایک خاندان کو نہیں پورے ملک اور پوری قوم کو چکھنا پڑا۔

خلیفہ منصورؒ[1]

نفسِ ذکیہ کی شہادت

بغداد کی تعمیر، ابومسلم کا قتل، آلِ حسن کی بربادی

شخصیت اور سیرت

۴۱ سال کی عمر میں منصور ذی الحجہ سنہ ۱۳۶ھ میں تخت نشین ہوا۔ یہ سفاح کا بھائی تھا اور سلامہ کے بطن سے پیدا ہوا تھا، جو ایک بربری کنیز تھی۔ سفاح کی وفات کے وقت یہ مکہ میں تھا۔ چنانچہ عیسیٰ بن علی نے جو اس کا چچا تھا اس کی طرف سے بیعت لی، بھائی کی خبر مرگ اسے راستے میں ملی، وہیں ہمرکاب اصحاب نے جن میں ابومسلم خراسانی بھی تھا اس کی بیعت کی۔

"منصور بنو عباس میں سب سے زیادہ پر ہیبت، بہادر، مستقل مزاج، صائب الرائے صاحبِ جبروت، دولت جمع کرنے والا، کھیل کود سے متنفر، نہایت عقل مند، علم و ادب کا گہوارہ اور عظیم الشان فقیہ و عالم تھا۔ اس نے بکثرت مخلوقِ الٰہی کو قتل کر کے اپنی حکومت مضبوط و مستحکم کی۔ اور یہ منصور ہی وہ شخص ہے جس نے امام ابوحنیفہؒ کو قاضی بنانے کے سلسلے میں جیل بھیجا جہاں آپ نے سنہ ۱۵۰ھ میں وفات پائی۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ چونکہ امام اعظمؒ نے منصور پر خروج کرنے کا فتویٰ دے دیا تھا اس لیے منصور نے آپ کو جیل میں بند کر دیا اور زہر دے کر شہید کیا۔

۱: سنہ ۱۳۶ھ تا سنہ ۱۵۸ھ (۷۵۴ء ـ ۷۷۴ء)

منصور بڑا فصیح و بلیغ اور سخن گو تھا۔ حکومت اس کی فطرت میں تھی۔ وہ بڑا حریص اور بخیل تھا۔ چنانچہ یہ اپنے ماتحتین سے پیسہ پیسہ اور دانے دانے کا حساب کتاب لیا کرتا تھا۔ اس لیے ابوالدوانیق اس کا لقب مشہور ہو گیا تھا۔

(تاریخ الخلفاء۔ سیوطی)

منصور کی سیرت و شخصیت الفخری کا بیان ہے:

گھر میں بڑا خلیق تھا اور وہاں کتنی ہی ہنسی مذاق کی باتیں ہوں سب کو اس طرح برداشت کر لیتا تھا کہ کوئی دوسرا نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن جہاں لباس خاص پہن کر عوام کی مجلس میں آتا اس وقت چہرے کا رنگ بدل جاتا اور آنکھیں لال ہو جاتیں اور اس کی تمام کیفیات بدل جاتیں۔ ایک دن اس نے اپنے بچوں سے کہا کہ:

فرزندو! جب تم مجھے لباس بدل کر دربار میں جاتے دیکھو تو کوئی میرے قریب نہ آنے پائے ورنہ نقصان پہنچ جانے کا اندیشہ ہے۔

اس کے ایک غلام نے بیان کیا کہ میں منصور کے سرہانے کھڑا تھا کہ اس نے کچھ اونچی آوازیں سنیں۔ اس نے کہا کہ جا کر دیکھو یہ کیسی آواز ہے! میں نے دیکھا کہ اس کا ایک خادم ہے جو طنبورے سے شغل کر رہا ہے اور اس کے گرد کچھ چھوکریاں ہیں جو قہقہے لگا رہی ہیں۔ میں نے اس واقعے کی اطلاع دی تو منصور بھڑ گیا اور پوچھا کہ طنبورہ کیا چیز ہوتی ہے۔ میں نے طنبورہ کی حقیقت بتائی تو اس نے کہا تمھیں کیا معلوم کہ طنبورہ کیا چیز ہے۔ میں نے کہا: امیر المومنین میں نے اسے خراسان میں دیکھا ہے۔ اس کے بعد منصور اٹھا اور اس خادم کے پاس آیا۔ لڑکیوں نے اسے آتے دیکھا تو ادھر اُدھر ہو گئیں۔ اس کے بعد منصور کے حکم سے وہ اس زور سے اس خادم کے سر پر مارا گیا کہ طنبورہ ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد اس نے اس خادم کو باہر نکلوا کر فروخت کروا دیا۔

مہدی سے منصور کی محبت منصور اپنے فرزند مہدی سے بے انتہا محبت کرتا تھا۔ جب کوئی شخص جرم کرتا اور منصور اس پر جرمانہ کرتا تو بیت المال میں اسے الگ رکھوا دیتا اور اس پر اس کا نام لکھوا دیتا۔ جب منصور مرنے لگا تو اپنے فرزند

مہدی سے کہا: بیٹے! میں نے جس مجرم پر جو جرمانہ کیا ہے وہ سب جرمانے بیت المال میں الگ رکھے ہوئے ہیں۔ اور ہر ایک پر مجرم کا نام بھی لکھا ہوا ہے۔ جب تم خلیفہ بن جاؤ تو یہ سب جرمانے ان کے مالکوں کو واپس کر دینا۔ تاکہ لوگ تمھیں دعائیں دیں اور تم سے محبت کریں۔

یزید بن عمر بن ہبیرہ کہتا ہے کہ جنگ اور صلح دونوں موقعوں پر میں نے منصور سے زیادہ ہوشیار، چالاک اور بیدار کسی اور کو نہیں دیکھا۔ اس نے نو مہینے میرا محاصرہ کیے رکھا میرے ساتھ عرب کے شہ سوار تھے اور ہم سب نے ہر ممکن کوشش کی کہ اس کے لشکر سے کچھ فائدہ اٹھالیں۔ لیکن اس کے فوجی نظم وضبط اور اس کی چوکسی کی وجہ سے ہم اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے۔ جس وقت اس نے میرا محاصرہ کیا اس وقت میرے سر پر کوئی سفید بال نہ تھا۔ لیکن جب یہ محاصرہ ختم ہو گیا تو میرے سر پر کوئی سیاہ بال نہیں رہ گیا تھا۔

یہ منصور ہی ہے جس نے حکومت کی جڑیں مضبوط کیں، مملکت میں نظم وضبط قائم کیا۔ قواعد مرتب کیے اور دھاک بٹھادی۔ کچھ نئی چیزیں بھی ایجاد کیں مثلاً "نوبتی گھوڑے"، جن سے گزشتہ فرماں روا بالکل ناواقف تھے۔ اس کے ایجادات میں موسمِ گرما کے لیے کینوس کا خیمہ بھی ہے جسے لوگ اس سے پہلے نہیں جانتے تھے۔ اکاسرہ (ایرانی) ہر روز اپنے گھر کو گارے سے لپوایا کرتے تھے اور دوسرے دن دوسرے گھر کو لپواتے تھے۔

راوندیہ کا استیصال

اس کے عہدِ حکومت میں ایک عجیب واقعہ یہ ہوا کہ اہلِ خراسان میں ایک قوم ہے جسے "راوندیہ" کہتے ہیں۔ یہ تناسخ ارواح کے قائل تھے، ان کا عقیدہ تھا کہ ان کی قوم کے فلاں بڑے آدمی میں آدم کی روح منتقل ہو گئی ہے۔ نیز ان کا وہ رب جو انھیں کھلاتا پلاتا ہے یہی منصور ہے اور فلاں آدمی جبریل ہے۔ یہ لوگ شہر میں آئے تو منصور کے محل کے پاس بھی آئے اور اس کا طواف کر کے کہا کہ یہ ہمارے رب کا گھر ہے۔

منصور نے ان سرکردہ لوگوں کو جو دو سو کی تعداد میں تھے پکڑ کر قید کر دیا۔ بس باقی گروہ ناراض ہو گیا اور سب نے مل کر قید خانوں کو کھول دیا، اور اپنے قیدیوں کو باہر نکال لائے۔ پھر منصور پر

حملہ کر کے جنگ چھیڑ دی۔ منصور پیدل ہی نکل کھڑا ہوا۔ اس وقت اس کے دروازے پر کوئی سواری نہ تھی۔ اس کے بعد ہمیشہ ایک سواری محل کے دروازے پر ساز سے آراستہ کھڑی رہنے کا دستور قائم ہو گیا اور بعد کے خلفاء اور فرمانرواؤں نے بھی اسی سنّت کو جاری رکھا۔ جب منصور باہر نکلا تو سواری لائی گئی اور راوندیوں سے مقابلے کے لیے اس پر سوار ہو گیا۔ ان سب نے منصور پر دھاوا بول دیا اور قریب تھا کہ وہ اسے قتل کر دیتے اتنے میں معن بن زائدہ خفیہ طریقے سے آ گیا۔ وہ برابر جنگ کرتا رہا۔ آخر جنگ کے بادل چھٹ گئے اور راوندیوں پر فتح حاصل ہوئی۔ اس کے بعد منصور نے معن کو گورنر بنا دیا۔

شہر بغداد کی تعمیر جس جگہ بغداد واقع ہے یہ منصور نے خود منتخب کی تھی۔ ایک دانا نصرانی نے اس جگہ کی خوبیاں بتاتے ہوئے کہا کہ امیر المومنین! آپ یہاں دجلہ و فرات کے درمیانی جزیرے میں محفوظ رہیں گے۔ اگر کوئی آپ پر حملہ کرے گا تو دجلہ و فرات آپ کے شہر کے لیے خندقوں کا کام دیں گے پھر سامانِ رسد دیار بکر سے، سمندر سے، ہندوستان سے، چین سے، بصرہ سے براہِ دجلہ آئے گا اور رقہ و شام سے براہِ فرات۔ نیز سامان و اسباب آپ کے پاس خراسان، بلادِ عجم اور ساحلِ تامرہ سے بھی آئیں گے۔ آپ نہروں کے درمیان ہوں گے اور آپ کا جو دشمن بھی آئے گا وہ بہرحال بنے ہوئے پل سے یا پل بنا کر ہی آ سکتا ہے۔ آپ اگر انھیں اڑا دیں گے تو وہ آپ تک نہیں پہنچ سکتے۔ نیز آپ بصرہ، کوفہ واسط، موصل اور سواد کے وسط میں رہیں گے اور خشکی، تری اور پہاڑ سب کے وسط میں رہیں گے۔ یہ سن کر منصور کے اندر تعمیر کی کوشش اور شوق دوبالا ہو گیا۔ اس نے ہر جگہ راجوں اور مزدوروں کو بھیجنے کے لیے لکھا اور ایسے لوگوں کو منتخب کرنے کا حکم دیا جو عدالت عقل، علم، امانت، حساب اور انجنیری میں دستگاہ رکھتے ہوں تاکہ تعمیر شہر کے کام بانٹ دیے جائیں۔ یہ کام ۱۴۵ھ میں شروع کیا گیا۔

امام ابوحنیفہ رح کچی اور پکی اینٹیں گننے پر مامور تھے۔ پیمائش کی لکڑی سے ڈھیر کے

(طول وعرض وعمق کوناپ کر) اینٹوں کی تعداد معلوم کرنے کا مختصر طریقہ آپ ہی نے ایجاد فرمایا تھا۔ منصور نے شہرپناہ کی بنیاد کی چوڑائی پچاس ہاتھ رکھی تھی جو اوپر جاکر بیس ہاتھ ہوگئی تھی۔ پہلی اینٹ منصور نے خود اپنے ہاتھ سے رکھی اور یہ الفاظ زبان سے ادا کیے۔

بسم اللہ والحمد للہ۔ الارض للہ یورثہا من یشاء من عبادہ والعاقبۃ للمتقین۔

(اللہ کے نام سے، حمد اللہ کے لیے ہے۔ زمین اللہ کی ہے۔ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا وارث بنادیتا ہے اور حسن انجام اہل تقویٰ کے لیے ہے)

اس کے بعد اس نے کہا کہ اب تعمیر شروع کرو۔ ۱۴۵ھ میں تعمیر شروع ہوئی اور ۱۴۶ھ میں ختم ہوئی۔ یہ شہر گول تھا اور بیچ میں شاہی محل تھا تاکہ ہر طرف سے لوگ برابر فاصلے پر رہیں، کوئی دور اور کوئی نزدیک نہ ہو۔ اس کی لاگت چالیس لاکھ آٹھ سو تیس درہم آئی۔

فراغت تعمیر کے بعد اوورسیروں کو اس نے حساب کتاب پر لگایا کہ کاریگروں وغیرہ پر کتنا خرچ آیا اس کا حساب کریں۔ حساب کے بعد جو رقم ان کے ذمے نکلی وہ واپس لے لی گئی۔ حتیٰ کہ بعضوں کے ذمے پچیس درہم بھی نکلے۔

آل و اولادِ حسن کے ساتھ منصور کی تعدیاں

الفخری کا بیان ہے:

یہ منصور ہی ہے جس نے بنی حسن کے ساتھ ظلم کیے۔ عبداللہ المحض بن حسن بن حسن بن علی ابن ابی طالب علیہم السلام کو جو اپنے دور میں آل ابی طالب کے شیخ تھے اور ان کی اولاد کو، بھائیوں کو اور بھتیجوں کو پکڑ کر قید کردیا اور یہ اسی قید میں دنیا سے رخصت ہوگئے۔ یہ سب بنی حسن کے ممتاز شیوخ میں سے تھے۔

کہتے ہیں کہ جب حاجب منصور کا نکلا تو اس نے کہا کہ دروازے پر جو حسینی ہے وہ اندر داخل ہو لے۔ چنانچہ ابنائے حسینؓ کے مشائخ داخل ہوگئے۔ پھر اعلان کیا کہ جو حسنی ہے وہ اندر جائے۔ چنانچہ حسنی شیوخ اندر گئے۔ اس کے بعد وہ انھیں الگ ایک کمرے میں لے گیا اور دوسرے دروازے سے لوہاروں کو داخل کرکے ان سب کو زنجیروں

میں جکڑ لیا اور عراق لے جاکر انھیں قید خانے میں ڈال دیا۔ یہ سب بحالتِ قید ہی کوفہ میں دُنیا سے چل بسے (خدا اسے اس ظلم کے عوض جزائے خیر نہ دے)۔

اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ ہوئی کہ بنی حسن کا ایک شخص آکر منصور کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس نے پوچھا کہ تم کیسے آئے؟ اس نے کہا کہ میں اس لیے آیا ہوں کہ تم مجھے بھی میرے خاندان والوں کے ساتھ قید کر دو۔ کیونکہ ان کے بعد میں دُنیا کا خواہش مند نہیں۔ چنانچہ منصور نے اسے بھی قید کر دیا۔ اس قیدی کا نام ہے علی بن حسن بن حسن بن حسن بن علی بن ابی طالب انہیں میں محمد بن ابراہیم بن حسن بن حسن بن علی ابن ابی طالب علیہم السلام بھی تھے۔ جو بڑے خوبصورت تھے اور انھیں حسن و جمال کی وجہ سے دیباجِ اصفر (زرد ریشم) کہا جاتا تھا انھیں بلوا کر منصور نے پوچھا تم ہی دیباج اصفر ہو۔ وہ بولے لوگ ایسا ہی کہتے ہیں منصور نے کہا میں تمھیں ایسی موت کا مزہ چکھاؤں گا جو کسی اور نے نہ چکھا ہوگا۔ پھر اس نے ان کو اینٹوں میں زندہ چنوا دیا۔

بنی حسن کے ساتھ منصور کے برتاؤ کا سبب

بنی امیہ کے آخری دور میں بنی ہاشم۔ طالبی و عباسی نے یکجا ہو کر اپنے حالات کا جائزہ لیا۔ انھوں نے دیکھا کہ بنی امیہ میں انتشار پھیلا ہوا ہے اور بنی ہاشم کا اقتدار پیدا ہوتے لگا ہے۔ یہ محسوس کر کے انھوں نے اس پر اتفاق کر لیا کہ اپنا خفیہ پروپیگنڈا جاری رکھیں۔ انھوں نے طے کیا کہ ہمارا ایک رئیس ہونا چاہیے جس کی ہم سب لوگ بیعت کر لیں۔ سب نے نفسِ ذکیہ یعنی محمد عبداللہ بن حسن بن حسن بن ابی طالب کی بیعت پر اتفاق کر لیا۔ یہ نفسِ ذکیہ ساداتِ ہاشمی میں اپنے فضل و شرف و علم میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ اس مجلس میں تمام علوی و عباسی اعیان موجود تھے۔ طالبی ہاشمیوں میں جعفر صادق بن محمد اور عبداللہ بن حسن بن حسن بن علی ابن ابی طالب اور عبداللہ کے دونوں صاحبزادے محمد نفس ذکیہ اور ابراہیم قتیلِ ہاشمی اور دوسرے طالبی موجود تھے۔

منصور نفسِ زکیہ کے ہاتھ پر بیعت کر چکا تھا

عباسی اعیان میں سفاح اور منصور اور دیگر عباسی بھی موجود تھے سب نے نفس ذکیہ

کی بیعت کرلی۔ لیکن جعفر صادق بن محمد نے بیعت نہیں کی بلکہ نفس زکیہ کے والد عبداللہ المحض سے کہہ دیا کہ آپ کے فرزند کو یہ خلافت نہیں مل سکتی۔

بہر حال سب لوگوں نے بالاتفاق نفس زکیہ کی بیعت کرلی۔ زمانے نے پلٹا کھایا اور حکومت بنی عباس کی طرف منتقل ہوگئی۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوچکا ہے سفاح کے بعد منصور کے ہاتھ میں عنانِ حکومت آگئی اس کے بعد منصور کی ہمیشہ کوشش رہی کہ کسی طرح نفسِ زکیہ کو قابو میں لائے اور انھیں قتل کردے یا معزول کردے۔ اس پر یہ دھن اس لیے سوار تھی کہ لوگ فضل وشرف اور قیادت کا عقیدہ نفسِ زکیہ ہی سے وابستہ کیے ہوئے تھے اور ان کی طرف لوگوں کا بہت میلان تھا۔ منصور نے ان کے والد عبداللہ المحض سے نفس زکیہ کو حوالے کرنے کا مطالبہ کیا۔ عبداللہ المحض کا شمار ہاشمی سرداروں میں تھا۔ اس لیے منصور نے انہی کو دونوں فرزندوں نفسِ زکیہ اور ابراہیم کی حوالگی پر مجبور کیا۔ یہ دونوں کہیں چھپ گئے تھے۔ عبداللہ المحض نے کہا مجھے ان دونوں کا کوئی علم نہیں۔ جب گفتگو نے طول پکڑا تو عبداللہ نے کہا کہ تم کہاں تک گفتگو کو طول دو گے؟ بخدا اگر وہ میرے پیروں کے نیچے بھی ہوتے تو میں پیر اُن پر سے نہ اٹھاتا۔ سبحان اللہ! یعنی میں اپنے فرزندوں کو قتل کرنے کے لیے تمھارے حوالے کردوں۔ پس منصور نے عبداللہ کو اور ان کے تمام حسنی خاندان کو گرفتار کرلیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ اوپر بیان ہوچکا ہے۔

نفسِ زکیہ محمد بن عبداللہ کا خروج نفس زکیہ اپنے فضل، شرف، دین، علم، شجاعت، فصاحت، قیادت، بزرگی اور شرافت میں تمام بنو ہاشم میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ ابتدا میں انھوں نے لوگوں میں یہ مشہور کیا کہ یہی وہ مہدی ہوں جس کی بشارت دی گئی ہے۔ ان کے والد عبداللہ المحض نے بہت سے گروہوں میں اسی بات کو ثابت کیا۔ اس کے بعد اللہ نے ان لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت ڈال دی اور سب ان کی طرف مائل ہوگئے اور بنی ہاشم کے چوٹی کے لوگوں نے ان کی بیعت کرکے انھیں اور بھی تقویت پہنچادی۔ انھوں نے حکومت کے لیے ان کو تیار کرنا شروع کردیا اور اپنے آپ پر ان کو مقدم رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کی خواہش ان کے دل میں اور زیادہ ہوگئی اور لوگوں کے دل میں ان کی طرف رغبت بھی بڑھنے لگی۔ جب حکومت بنی عباس میں چلی گئی تو یہ جان کے ڈر سے چھپے چھپے پھرے لیکن جب انھیں اپنے

والد اور اپنے خاندان کے ساتھ منصور کے سلوک کا علم ہوا تو یہ مدینہ میں ظاہر ہوئے اور اپنی حکومت کا اعلان کر دیا۔ مدینہ کے تمام سربرآوردہ لوگ ان کے پیچھے ہو گئے۔ صرف تھوڑے سے لوگ تھے جو الگ رہے۔ پھر مدینہ پر اپنا تسلّط قائم کرنے کے بعد انھوں نے منصور کے بھیجے ہوئے امیر مدینہ کو معزول کر دیا اور وہاں اپنا عامل و قاضی مقرر کیا۔ قید خانوں کے دروازے کھول دیے۔ اور وہاں کے قیدیوں کو باہر نکال لائے۔ اور مدینے پر اپنا پورا قبضہ جما لیا۔ جس دن محمد بن عبداللہ نفس ذکیہ نے خروج کر کے مدینہ میں اپنی کارروائی کی۔ اسی دن ایک شخص ۔ اویس عامری ۔ مدینہ سے بھاگ کر منصور کے پاس پہنچا۔ یہ نو دن سفر کر کے شب کے وقت پہنچا۔ شہر کے دروازے پر چلّانے لگا۔ لوگوں کو معلوم ہوا تو اسے اندر بلا لیا۔ حاجب (ربیع) نے کہا کہ اس وقت تو امیرالمومنین آرام کر رہے ہیں تمھیں ان سے کون سا ایسا ضروری کام ہے۔ اس نے کہا کہ مجھے ان سے ابھی ملنا ضروری ہے۔ ربیع اندر گیا اور منصور کو اطلاع دی۔ منصور نے اسے اندر بلایا تو اس نے کہا کہ امیرالمومنین محمد بن عبداللہ نے مدینہ میں بغاوت کر کے یہ کچھ کیا ہے۔ منصور نے پوچھا کہ کیا تم نے انھیں بچشم خود دیکھا ہے۔ اس نے کہا ہاں ہاں میں نے انھیں منبر رسول ﷺ پر دیکھا ہے اور میں نے خود ان سے گفتگو کی ہے۔ منصور نے اسے ایک گھر میں ٹھہرا دیا۔ اس کے بعد منصور کے پاس مسلسل ایسی خبریں آتی رہیں تو اس نے اس آدمی کو باہر بلا کر کہا کہ میں عنقریب تمھارے ساتھ اچھا سلوک کروں گا اور تمھیں غنی کر دوں گا۔ یہ بتاؤ کہ تم کتنے دنوں میں یہاں پہنچے ہو۔ اس نے کہا نو دن میں۔

منصور نے اسے نو ہزار درہم دے دیے، اس کے بعد منصور اٹھ بیٹھا اور ایک مدت تک دونوں (منصور اور نفس ذکیہ) میں خط و کتابت جاری رہی۔ ہر ایک نے دوسرے کو عجیب و غریب خط لکھے جس میں مراسلت کے نادر ترین نمونے ہیں۔ ہر ایک خط میں اپنے اپنے مسلک کی تائید میں دلائل مہیا کیے گئے تھے۔

آخر کار منصور نے اپنے برادر زادے موسیٰ بن عیسیٰ کو جنگ کرنے کے لیے بلوایا۔ موسیٰ بن عیسیٰ ایک بڑا لشکر لے کر محمد کی طرف روانہ ہو گیا اور مدینہ کے قریب دونوں کی مڈبھیڑ ہوئی جس میں منصور کی فوج کو فتح حاصل ہوئی اور محمد بن عبداللہ (نفس ذکیہ) قتل کر دیے گئے اور

اُن کا سر منصور کے پاس بھیج دیا یہ ۱۴۵ھ کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد ان کے بھائی ابراہیم بن عبداللہ قتیلِ باخمری نے بصرہ میں بغاوت کا اعلان کیا۔

خروجِ ابراہیم کا مختصر حال

جس زمانے میں ابراہیم بن عبداللہ غائب تھے اس وقت وہ کبھی کبھی منصور کے لشکر میں خفیہ خفیہ آجایا کرتے تھے بلکہ بعض اوقات وہ دسترخوان پر بھی بیٹھ جایا کرتے تھے۔ منصور کو ان کی بڑی تلاش تھی لہٰذا وہ مدینہ منورہ سے نکل کر بصرہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں انھوں نے اپنے کو ظاہر کر کے لوگوں کو اپنی طرف دعوت دینی شروع کی۔ اور رفتہ رفتہ ایک بڑی جمعیت ان کے ساتھ ہو گئی۔ منصور نے اپنے اسی برادرزادہ عیسیٰ بن موسیٰ کو ان کی طرف بھیجا۔ عیسیٰ نفس زکیہ کے قتل کے بعد واپس آیا تو پندرہ ہزار سپاہیوں کا لشکر لے کر ابراہیم کی طرف گیا۔ کوفہ کے قریب باخمریٰ نامی ایک گاؤں میں دونوں کا مقابلہ ہوا جس میں منصور کو فتح حاصل ہوئی۔ اور ابراہیم اس معرکے میں قتل کیے گئے۔ یہ بھی ۱۴۵ھ کا واقعہ ہے۔

منصور کا عہد انتشار اور حوادث کا عہد تھا۔ اس کے خلاف خروج کرنے والوں میں خود اس کا چچا عبداللہ بن علی بھی تھا۔

جب منصور کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ کبھی کھڑا ہو جاتا اور کبھی بیٹھ جاتا۔ ابومسلم خراسانی نے اس سے کہا: اگر آپ فرمائیں تو میں یہیں رہ کر آپ کی خدمت کروں یا چاہیں تو خراسان جا کر آپ کی مدد کے لیے لشکر مہیا کروں یا حکم ہو تو عبداللہ سے جنگ کے لیے روانہ ہو جاؤں۔ منصور نے اسے عبداللہ سے جنگ کرنے کے لیے روانہ کر دیا۔ ابومسلم ایک بہت بڑا لشکر لے کر روانہ ہو گیا۔ دونوں میں کئی ماہ مقابلہ ہوتا رہا۔ اور آخر کار ابومسلم کو فتح ہوئی عبداللہ بن علی بھاگ کر منصور کے پاس آیا تو اس نے اسے قید کر لیا۔ منصور نے اس کے لیے ایسا گھر بنوایا جس کی بنیاد میں نمک بھرا تھا۔ جب اس میں پانی سرایت ہوا تو وہ مکان اس پر گر پڑا اور وہ مر گیا۔ اور یہ منصور ہی ہے جس نے ابومسلم خراسانی کو قتل کرایا۔

ابومسلم خراسانی کی داستانِ قتل

منصور کے دل میں ابومسلم کی طرف سے نفرت ہی نہیں بلکہ دونوں کے درمیان بغض تھا۔ منصور نے اپنے بھائی

سفاح کو اشارۃً ابو مسلم کو قتل کرنے کی رائے دی تھی۔ مگر اس نے ایسا نہ کیا اور کہا کہ جس نے ہماری حکومت کے لیے مصیبتیں جھیلی ہوں اس کے ساتھ یہ برتاؤ کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ جب منصور خلیفہ ہوا تو اس نے اپنے چچا عبداللہ سے جنگ کرنے کے لیے شام بھیج دیا جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ جب ابو مسلم اس پر فتح پا چکا تو اس نے عبداللہ بن علی کی فوج کے تمام سامانِ غنیمت پر قبضہ کر لیا۔ منصور نے اپنے ایک خادم کو اس غرض سے شام بھیجا کہ باقی ماندہ لشکر کے مال پر قبضہ کرے۔ اس پر ابو مسلم کو بڑا تاؤ آیا۔ اس نے منصور کو سخت سُست کہا۔ ایک مخبر نے منصور کو یہ سب کچھ لکھ بھیجا اور یہ بھی لکھا کہ وہ خراسان کی طرف جا رہا ہے۔ اور خلیفہ کے پاس نہیں آنا چاہتا۔ منصور نے دیکھا کہ اگر ابو مسلم خراسان میں چلا گیا تو وہ وہاں سارے معاملات کو بگاڑ کر رکھ دے گا۔

منصور بڑا چالاک، بارعب، بہادر، عقل مند، جرأت مند، فطین اور عالم تھا۔ احادیث کا علم بھی سماعاً حاصل کیا تھا اور ہر بات سے واقف تھا۔ اس نے ابو مسلم کو نہایت خوش کن اور تسکین بخش خط لکھ کر اپنے پاس آنے کی دعوت دی۔

ابو مسلم نے جواب دیا کہ میں اطاعتِ خلیفہ پر قائم ہوں اور خراسان جا رہا ہوں۔ اگر آپ نے اپنی اصلاح کر لی تو میں اسی طرح سمع و طاعت پر قائم رہوں گا اور اگر اپنے نفس کے کہنے پر چلتے رہے تو میں اپنے لیے ایسی راہ تلاش کروں گا جو میری سلامتی کی ضامن ہو۔

یہ جواب سن کر منصور کی بدحواسی اور بڑھ گئی۔ اور اس نے پھر ابو مسلم کو ایک خط لکھا کہ تم جیسا خیال کر رہے ہو میری نظروں میں وہ نہیں ہو۔ ہماری حکومت قائم کرنے میں جو مصیبتیں تم نے جھیلی ہیں اس نے تمھیں ایسی باتوں سے بہت بلند کر دیا ہے۔ یہ لکھتے ہوئے اس نے ابو مسلم سے آنے کی فرمائش کی نیز بعض اہم ہاشمی شخصیتوں سے بھی منصور نے ابو مسلم کو خط لکھنے کی فرمائش کی انھوں نے خط لکھ کر ابو مسلم کو منصور کی مخالفت اختیار کرنے پر ملامت کی اور یہ زور دیا کہ وہ منصور کی خدمت میں حاضر ہو کر عذر پیش کرے۔ منصور نے ایک نہایت دانا شخص کے ہاتھ یہ تمام خطوط بھجوائے۔

منصور کا خط لے کر قاصد روانہ ہوا اور تمام خطوط ابو مسلم کے حوالے کیے۔ خطوط پڑھنے کے بعد اس نے اپنے ایک دوست مالک بن ہیثم سے مشورہ طلب کیا۔ اس نے رائے دی کہ ہرگز منصور کے پاس نہ جاؤ، اگر گئے تو وہ تمھیں قتل کرا دے گا۔ اور اگر اپنے راستے پر چلتے ہوئے رے پہنچ جاؤ تو وہاں

تمھارے پشت پناہ موجود ہیں اور وہاں تم اپنے معاملات پر غور وخوض کر سکو گے، اگر کوئی حادثہ پیش آجائے تو پورا خراسان تمھاری پشت پر ہوگا۔ ابومسلم نے اسی رائے پر عمل کرنے کا ارادہ کرلیا اور منصور کے قاصد سے کہہ دیا کہ خلیفہ منصور کے پاس جانے کی رائے نہیں رکھتا اور میں خراسان ہی جاؤں گا قاصد نے کہا: اے ابومسلم تم ہمیشہ آلِ محمد کے امین رہے ہو اور میں تمھیں قسم دیتا ہوں کہ تم اپنے آپ کو نافرمانی سے داغدار نہ کرو۔ صحیح رائے یہی ہے کہ تم امیرالمومنین کی خدمت میں حاضر ہو کر عذر معذرت کرلو۔ امیرالمومنین کے پاس تم وہی کچھ پاؤ گے جو تم پسند کرتے ہو۔

ابومسلم سر جھکائے کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا: "میں چلتا ہوں"۔ وہ خلیفہ کی طرف روانہ ہوا۔ اور فوج کو اپنے ایک آدمی کے سپرد کرتے ہوئے کہا کہ اگر میرا خط تمھارے پاس آئے اور اس پر میری مہر آدھی ہو تو سمجھ لینا کہ میرا ہی خط ہے اور اگر اس پر پوری مہر ہو تو سمجھ لینا کہ میری لگائی ہوئی مہر نہیں پھر کچھ ضروری باتیں کرنے کے بعد وہ منصور کی طرف روانہ ہو گیا اور مدائن میں جاکر اس سے ملا منصور کو اس کے آنے کی خبر ملی تو تمام لوگوں کو اس کے استقبال کا حکم دیا۔ جب اندر گیا تو اس نے منصور کے ہاتھ چومے اور منصور نے بھی بڑے اعزاز کے ساتھ اپنے پاس بٹھایا۔ پھر اس سے کہا کہ اپنے خیمے میں جاکر آرام کرے اور حمام سے فارغ ہو کر کل ملاقات کرے۔ ابومسلم چلا گیا اور دوسری صبح کو منصور کا قاصد اسے بلانے کے لیے آیا۔ منصور نے یہ انتظام کرلیا کہ چند مسلح آدمیوں کو پس پردہ چھپا دیا اور ان سے کہہ دیا کہ جونہی میں اپنا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر ماروں تم فوراً باہر نکل آؤ۔ اور ابومسلم کو قتل کردو۔ جب ابومسلم منصور کے پاس آیا تو منصور نے پوچھا۔ عبداللہ بن علی کی چھاؤنی سے جو تمھیں دو تلواریں ملی تھیں وہ کہاں ہیں۔ ابومسلم نے ایک تلوار جو اس وقت اس کے ہاتھ میں تھی پیش کرتے ہوئے کہا کہ ایک تو یہ ہے منصور نے وہ تلوار لے کر اپنے مصلے کے نیچے رکھ لی، اس کے بعد ابومسلم کے ایک ایک جرم کو پیش کرکے اسے ڈانٹنا شروع کیا۔ اور ابومسلم ہر ایک کے عوض معذرت پیش کرتا گیا۔ منصور نے اس کے بہت سے جرم گنوائے۔

پھر منصور نے اپنا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر مارا اور چھپے ہوئے آدمی فوراً نکل پڑے اور تلواروں سے اس کے ٹکڑے اڑانے شروع کیے۔ ابومسلم چلّایا۔ امیرالمومنین! مجھے اپنے دشمنوں کے لیے زندہ رکھیے منصور بولا: تجھ سے بڑا میرا اور کون دشمن ہے۔ پھر منصور نے اشارہ کیا اور اس کی لاش دری

میں لپیٹ دی گئی۔ اس کے بعد عیسیٰ ابن موسیٰ اندر آیا اور پوچھا۔ ابو مسلم کہاں ہے؟ منصور نے کہا اس دری کے اندر ہے۔ عیسیٰ نے کہا آپ نے اسے قتل کرا دیا؟ منصور نے جواب دیا ہاں۔ عیسیٰ نے کہا انا للہ وانا الیہ راجعون! ــــ اس کی آزمائش، اس کی کارگزاری اور خدمات کے باوجود اور اسے امان دینے کے بعد؟ ــــ منصور نے اسے پناہ دی تھی اور عیسیٰ ابن موسیٰ نے ضمانت دی تھی۔ منصور نے کہا خدا تمھارے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کرے، خدا کی قسم روئے زمین پر اس سے بڑھ کر تمھارا کوئی دشمن نہیں۔ کیا اس کی موجودگی میں تمھارا کوئی اقتدار ممکن تھا۔ اس کے بعد منصور نے حکم دیا کہ فوج کو مال تقسیم کیا جائے۔ پھر لوگ منتشر ہو گئے اور منصور خراسان پر متصرف ہو گیا۔ یہ ۱۳۷ھ کا واقعہ ہے۔

عیسیٰ ابن موسیٰ کی داستانِ معزولی

ارباب سیر کے اس کی معزولی کے بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ منصور نے خود اس سے یہ فرمائش کی تھی۔ منصور اس کی بہت عزت کرتا تھا۔ اسے اپنی دائیں جانب اور مہدی کو بائیں طرف بٹھاتا تھا۔ جب منصور نے اس سے معزولی کی گفتگو کی تو اس نے کہا اے امیر المومنین ان قسموں کے بارے میں کیا کروں جن کے طوق میری اور لوگوں کی گردنوں میں پڑے ہیں اور جن کو توڑنے کے بعد غلاموں کی آزادی، بیویوں کی طلاق اور حج و صدقہ لازم آتا ہے۔ میں اپنے کو معزول نہیں کر سکتا۔

بس منصور کی نظریں بدل گئیں اور وہ اسے اپنے سے دور رکھنے لگا اور مہدی کو اس سے پہلے اندر بلانے لگا۔ مہدی سے اسے کمتر مقام پر جگہ دینے لگا۔ اور اسے ستانے کے بہانے بھی ڈھونڈنے لگا۔

روایت ہے کہ خالد بن برمک کو عیسیٰ کے پاس بھیجا گیا۔ اس نے منصور کے خاندان کے تیس آدمی لیے اور عیسیٰ کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں اس سے کہا کہ اپنے آپ کو خود معزول کر لو۔ اس نے انکار کیا۔ انکار کے بعد خالد نے ان ساتھیوں سے کہا کہ ہم سب چل کر گواہی دیں گے کہ عیسیٰ نے اپنے آپ کو معزول کر لیا۔ اس طرح ہم اسے قتل ہونے سے بھی بچا لیں گے اور اس فتنے کو بھی دبا لیں گے۔ غرض سب نے گواہی دے دی اور ثبوت

بہم پہنچا دیا۔ عیسیٰ نے تردید کی۔ مگر اس کی طرف توجہ نہ دی گئی۔ اس کی معزولی مکمل ہوگئی اور مہدی کی بیعت کر لی گئی۔

منصور ہی نے اپنے فرزند مہدی کے لیے رصافہ تعمیر کیا۔

تعمیر شہر رصافہ

منصور کے خلاف فوج ایک بار ہنگامہ کھڑا کر چکی تھی۔ اس لیے منصور نے قثم بن عباس بن عبید اللہ بن عباس سے کہا: تم فوج کے جذبۂ خونریزی سے واقف ہو۔ مجھے خطرہ ہے کہ یہ کہیں پھر متحد نہ ہو جائیں۔ قثم نے کہا: امیرالمومنین میری رائے یہ ہے کہ آپ اپنے فرزند کو مشرقی جانب بھیج دیجیے اور اس کے ساتھ فوج کا بھی ایک حصّہ بھیج دیجیے اور وہیں اس کے لیے ایک شہر آباد کر دیجیے۔ اس طرح جانبِ شرق وہ ایک شہر میں ایک حصّۂ فوج کے ساتھ رہے گا اور غرب میں آپ ایک شہر میں ایک حصّۂ فوج کے ساتھ رہیں گے پھر کسی ایک جانب سے کوئی خطرہ محسوس ہوگا تو آپ دوسری جانب سے مدد لے سکیں گے۔

منصور نے اس کی بات مان لی اور رصافہ کی بنیاد ڈال کر اسے مکمل کر دیا۔ اس کے بعد خلفاء اپنے مُردوں کو وہیں دفن کرنے لگے۔ اور شاندار مقبرے تعمیر کرائے۔ وہاں بے شمار قالین اور فرنیچر لے گیے۔ انھوں نے وہاں کے لیے بہت سی جائدادیں اور زمینیں وقف کر دی تھیں۔ رصافہ ان کے زمانے میں حرم تھا۔ یعنی جو خوف زدہ وہاں جاتا امن میں ہو جاتا۔

منصور کا انتقال، مہدی کی بیعت

منصور مکّے میں بحالتِ احرام ۱۵۸ھ میں مرا۔ ربیع نے مہدی کی بیعت کی خاطر اس خبر کو چھپایا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے منصور کی لاش کو بٹھا کر ایک چادر اڑھا دی اور چہرہ پر ایک باریک کپڑا ڈال دیا کہ چہرہ نظر آئے مگر پوری طرح نظر نہ آئے۔ پھر اعیانِ بنی ہاشم کو بلایا، وہ آئے اور اس کے سامنے بیٹھ گئے۔ وہ سمجھ رہے تھے یہ زندہ ہے۔ ربیع یوں آگے بڑھا جیسے اس سے مشورہ کرنا چاہتا ہے۔ پھر اس کے پاس سے واپس لوٹ کر کہا کہ: امیرالمومنین حکم دیتے ہیں کہ مہدی کی دوبارہ بیعت کر لی جائے۔ بس تمام لوگوں نے بیعت کر لی

عمر ۶۳ سال، حکومت ۲۲ سال سے کچھ زائد۔

تدوینِ فقہ وحدیث منصور کے عہد میں

امام ذہبی کا بیان ہے ۱۴۳ھ میں اس زمانہ کے علماء اسلام نے حدیث، فقہ اور تفسیر کو مدون و مرتب کرنا شروع کیا، چنانچہ ابن جریج نے مکہ میں، امام مالک نے مدینہ میں، اوزاعی نے شام میں، ابن ابی عروبہ اور حماد بن سلمہ نے بصرہ میں، معمر نے یمن میں، سفیان ثوری نے کوفہ میں احادیث مرتب کیں، ابن اسحٰق نے مغازی اور امام ابوحنیفہ نے فقہ اور قیاس پر کتابیں تالیف کیں۔ اس کے تھوڑے دنوں بعد ہشیم، لیث، ابن لہیعہ نے اور پھر ابن مبارک، ابویوسف، ابن وہب نے تصنیفات پیش کیں۔ اس کے بعد علوم کی باب وار ترتیب کرنے کی جانب اکثر لوگ مائل ہو گئے۔ اس کے علاوہ ادب، تاریخ، لغت اور سیرت پر کتابیں تالیف کی گئیں۔ اس زمانے سے پہلے یہ قاعدہ تھا کہ آئمہ و علماء اپنی قوتِ حافظہ کے ذریعے تعلیم دیا کرتے تھے یا پھر بعض لوگوں کے پاس چند غیر مرتب کتابیں تھیں جن کی مدد سے درس دیا کرتے تھے۔

منصور کے عفو و رحم کے واقعات

منصور نے اپنے بیٹے سے کہا۔ اے ابوعبداللہ! خلیفہ کے لیے ضروری ہے کہ تقویٰ کرے، بادشاہ کے لیے ضروری ہے کہ رعایا کے مصالح اور امورِ عامہ کو درست کرے اور رعایا پر واجب ہے کہ عدل و انصاف کے ساتھ اپنے کاروبار کی تکمیل کرتی رہے اور سب سے زیادہ قابل وہ شخص ہے جو عفو و درگزر کرے قدرت کے باوجود سزا نہ دے اور وہ شخص عقل سے بالکل پیدل ہے جو اپنے چھوٹوں پر مظالم کرتا ہو۔ علاوہ ازیں بغیر غور و فکر کیے کسی کام کا پختہ ارادہ نہ کرنا کیونکہ عقل ہی وہ آئینہ ہے جس کے ذریعے انسان اچھائیوں اور برائیوں میں تمیز و فرق کرتا ہے۔ بیٹے! اللہ کی نعمتوں پر ہمیشہ شکر کرتے رہو۔ معاف کرنے کی عادت ڈالو، تالیفِ قلوب کے ساتھ ساتھ اطاعت شعاری کرنا اور فتح و کامیابی کے بعد ہمیشہ عاجزی و رحم دلی سے پیش آتے رہنا۔

مبارک بن فضالہ کا بیان ہے۔ ہم لوگ منصور کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ اس نے ایک شخص کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ اس پر میں نے کہا امیر المومنین مجھ سے امام حسنؓ نے کہا کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے روزِ محشر منادی آواز دے گا کہ جن لوگوں کا اللہ پر کوئی حق ہو وہ آگے آئیں۔ اس اعلان پر صرف وہی

لوگ آگے بڑھیں گے جنھوں نے دنیا میں دوسروں کو معاف کر دیا ہوگا۔

ایک دیہاتی کا طنز منصور پر اصمعی نے لکھا ہے کہ منصور نے علاقۂ شام میں ایک دیہاتی سے کہا: اللہ کا شکر ہے جس نے تمھارے گاؤں سے مرض طاعون دور کر دیا۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ تم ہماری حکومت کے باشندہ ہو۔ دیہاتی نے جواب دیا: تم میں اور طاعون میں فرق ہی کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو دوہری مصیبت میں گرفتار نہیں کرتا۔

پند و نصیحت کا صلہ محمد بن منصور بغدادی کا بیان ہے کچھ باخدا اصحاب نے منصور سے کہا اللہ نے آپ کو دنیاوی نعمتیں دی ہیں، کچھ کام اپنے نفس کے لیے بھی کیجیے اور اس رات کا دھیان رکھیے جو قبر میں کاٹنا ہوگی۔ اور اس دن کا بھی خیال رکھیے جس کے بعد رات پھر کبھی نہ آئے گی۔ یہ سن کر منصور خاموش رہا۔ اور ان لوگوں کو مال و زر دینے کا حکم دیا، اس پر ان میں سے ایک نے کہا اگر ہمیں مال و زر کی ضرورت ہوتی تو تمھیں نصیحت نہ کرتے۔

عدل و انصاف عبداللہ بن صالح کا بیان ہے منصور نے بصرہ کے قاضی سوادین عبداللہ کو حکم بھیجا کہ زمین کے معاملے میں گھوڑے ہانکنے والے اور تاجر کا جو مقدمہ پیش ہے اس میں گھوڑے ہانکنے والے کے حق میں فیصلہ کیجیے۔ لیکن سوادین عبداللہ نے امیر المومنین کی خدمت میں معروضہ پیش کیا کہ ثبوت و شہادت سے ثابت ہے کہ زمین تاجر کی ہے اور ثبوت کے خلاف میں کوئی دوسرا عمل نہیں کر سکتا۔ جس پر منصور نے دوبارہ حکم بھیجا۔ اس کے جواب میں سوادین عبداللہ نے پھر یہی جواب دیا۔

منصور کے اخلاق و سیرت پر ایک نظر عباسی خلفاء میں منصور سب سے زیادہ باعظمت خلیفہ تھا۔ گو عباسی حکومت کا بانی سفاح تھا لیکن اس کو مستحکم منصور نے کیا۔ عباسی خلفاء میں اس کی وہی حیثیت تھی جو اموی خلفاء میں عبدالملک کی تھی۔ وہ عقل و دانش، سیاست و تدبیر، جرأت و دلیری، ہمّت و استقلال، سطوت و جبروت کا پیکر تھا۔ نازک سے نازک موقعوں پر بھی نہ گھبراتا تھا۔ بڑی بڑی پیچیدہ گتھیوں کو ناخنِ تدبیر سے سلجھا لیتا تھا۔ اس کے زمانے میں بڑے بڑے انقلابات ہوئے لیکن اس کی ہمت و تدبیر نے سلطنت کو ہلنے نہ دیا۔ اور اپنے زمانے میں عباسی سلطنت کو اس قدر مستحکم کر گیا کہ مدتوں اس

کے جانشین اطمینان سے حکومت کرتے رہے۔

تمام مؤرخین اس کے اوصاف و کمالات کے معترف ہیں۔ سب سے اوّل اسی نے عباسی حکومت کی جڑوں کو مضبوط کیا، اس کے قواعد مرتب کیے اور انھیں نافذ کیا۔

مسعودی کا بیان ہے کہ منصور خوبی تدبیر اور حسنِ سیاست کی معراج کمال پر پہنچا ہوا تھا۔ جس معاملے میں نفع کی توقع ہوتی تھی اس میں بے دریغ روپیہ صرف کر دیتا اور جہاں روپیہ ضائع ہوتا وہاں حقیر سے حقیر رقم بھی صرف نہ کرتا تھا۔

ابن ہبیرہ کا بیان ہے کہ جنگ اور امن دونوں حالتوں میں منصور سے زیادہ حیلہ ساز اور بیدار مغز کوئی نہ تھا۔ اس کا دماغ امن اور سکون اور شورش و فساد دونوں موقعوں پر یکساں کام کرتا تھا۔ اس لیے اس کے عہد میں کوئی انقلابی سازش کامیاب نہ ہو سکی۔

سیوطی لکھتے ہیں کہ منصور ہیبت و شجاعت، حزم و رائے، سطوت و جبروت کے لحاظ سے بنو عباس کا سب سے بڑا آدمی تھا۔

اپنے لڑکے مہدی سے کہا کرتا تھا کہ کوئی کام غور و فکر کے بغیر نہ کیا کرو۔ غور و فکر گویا عقل مند کے لیے آئینہ ہے جس میں اس کام کی اچھائی برائی نظر آتی ہے۔

ایک مرتبہ مہدی سے پوچھا تمھارے پاس کتنے جانور ہیں۔ اس نے کہا مجھے تعداد معلوم نہیں منصور نے کہا یہ تو تمھاری بڑی تقصیر ہے۔ جب تم کو جانوروں کا حال نہیں معلوم تو خلافت کو تم ضائع ہی کر دو گے۔

عدل و جور میں منصور کی سیاست منصور طبعاً سخت گیر اور درشت مزاج تھا اور تاریخوں میں اس کے ظلم و جور کے واقعات بھی ملتے ہیں۔ اس کا قول تھا کہ خلیفہ کو صرف تقویٰ درست رکھ سکتا ہے۔ سلطان کو عدل اور رعایا کو اطاعت، جو سزا دینے پر قدرت رکھتا ہے اس کے لیے عفو و درگذر زیادہ مناسب ہے اور وہ بڑا کم عقل ہے جو اپنے زیردستوں پر ظلم کرتا ہے۔

وہ کہا کرتا تھا کہ سلطنت کے ارکان چار ہیں۔ جن کے بغیر حکومت نہیں چل سکتی، ایک قاضی جو بغیر خوف لومۃ لائم منصفانہ فیصلہ کرے۔ دوسرے پولیس جو قوی کے مقابلے میں کمزور سے

انصاف کرے۔ تیسرے تحصیل دار جو پورا اخراج وصول کرے لیکن رعایا پر ظلم نہ ہونے پائے۔ چوتھے پرچہ نگار جو ان لوگوں کی صحیح اطلاع دیتا رہے۔

ان اصولوں کو اس نے جہانبانی میں رہنما بنایا تھا۔ رعایا کے ساتھ قیام عدل میں اتنا اہتمام تھا کہ اس نے لوگوں کو عام آزادی دے رکھی تھی۔ کہ جس کسی کو کسی حاکم سے کوئی تکلیف پہنچے وہ بلا روک ٹوک اس سے اس کی شکایت کر سکتا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک شخص نے ایک عامل کی شکایت کی کہ اس نے اس کی جائداد کا کچھ حصہ اپنی جائداد میں شامل کر لیا ہے منصور نے فوراً عامل کو لکھا کہ اگر تم عدل کروگے تو ہمیشہ سلامتی تمھارے ساتھ رہے گی۔ اس لیے اس مظلوم کے ساتھ انصاف سے کام لو۔ اسی طرح ایک مرتبہ ایک دہقانی نے ایک عامل کی شکایت کی منصور نے اس کو جواب دیا۔ کہ اگر تمھارا بیان صحیح ہے تو میں تم کو اس کی اجازت دیتا ہوں کہ عامل کو باندھ کر میرے پاس لے آؤ۔ طبری نے اس قبیل کے اور متعدد واقعات لکھے ہیں۔

گو وہ سخت گیر تھا، لیکن اکثر باغیوں کو بھی معاف کر دیتا تھا۔ قطن بن معاویہ کا بیان ہے کہ میں نفس زکیہ کے بھائی ابراہیم کے خروج میں ان کے ساتھ ہو گیا۔ ان کے قتل کے بعد منصور کے خوف سے چھپا چھپا پھرتا تھا۔ اس زندگی سے تنگ آکر میں نے امیر عمرو بن العلاء سے مشورہ کیا کہ میں منصور کے پاس جاکر اپنی خطاؤں کا اعتراف کروں۔ انھوں نے مخالفت کی اور کہا کہ اگر تم گئے تو ضرور قتل کر دیے جاؤ گے، لیکن میں بہت عاجز ہو چکا تھا اس لیے ابو عمرو کا مشورہ قبول نہ کیا۔ اور بغداد جاکر ربیع بن یونس وزیر دولت کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ اس نے حراست میں لے لیا۔ اس وقت مجھے ابو عمرو کا مشورہ قبول نہ کرنے پر ندامت ہوئی۔ اس کے بعد مجھے قصر خلافت پہنچا دیا گیا اور پھاٹک بند کر دیے گئے۔ اب مجھے اپنی موت کا یقین ہو گیا۔ ظہر کے وقت ایک خواجہ سرا وضو کے لیے پانی لایا اور کھانا بھی۔ وضو کر کے میں نے نماز پڑھی اور روزہ کا عذر کر کے کھانا واپس کر دیا۔ رات کے وقت جب محل کے پھاٹک بند ہونے لگے تو مجھے زندگی سے بالکل مایوسی ہو گئی۔ اور آنکھوں سے نیند اڑ گئی۔ آدھی رات گئے ایک خواجہ سرا مجھے آکر لے گیا۔ میں منصور کے حضور پیش کیا گیا۔ اس وقت صرف وہ اور یونس بن ربیع تھے، مجھے دیکھ کر منصور نے سر جھکا لیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد سر اٹھا کر کہا۔ کہو کیا ہے میں نے عرض

کی۔ امیر المومنین میں قطن بن معاویہ ہوں جس نے حضور کے خلاف اپنی تمام کوششیں صرف کر دیں۔ آپ کی نافرمانی کی، آپ کے دشمن کا ساتھ دیا۔ آپ کی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی۔ ان جرائم کے بعد اگر آپ مجھے معاف کر دیں تو آپ اس کے اہل ہیں اور اگر سزا دینا چاہیں تو میرے گناہوں کے بدلے قتل کر سکتے ہیں۔ منصور نے پھر سر جھکا لیا۔ اور پھر تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد سر اٹھا کر کہو کیا کہتے ہو؟ میں نے پھر جرائم دہرائے۔ منصور نے کہا امیر المومنین نے تم کو معاف کیا۔ یہ سن کر میرا حوصلہ بڑھا۔ میں نے عرض کی حضور کے دروازے سے اس حال میں واپس جاؤں گا کہ میری جائداد اور میرا گھر منضبط ہے۔

دربار منصور کے اصحاب کمال

اس کے دربار میں ہر فن کے اصحاب کمال جمع تھے۔ اس کا درباری منجم نوبخت اپنے فن کا ماہر تھا۔ اس کے بعد اس کا لڑکا ابوسہل باپ کا جانشین ہوا۔ نوبخت کی اولاد نے منصور کے لیے کواکب اور ان کے احکام پر متعدد کتابیں ترجمہ کیں۔

دوسرا درباری منجم ابراہیم فرازی تھا، یہ بھی بڑا صاحب کمال تھا۔ تاریخ اسلام میں سب سے پہلے اسی نے اصطرلاب ایجاد کیا۔ اور علم ہیئت پر کئی کتابیں لکھیں۔ اس کی بعض کتابوں کے نام یہ ہیں:

کتاب القصیدہ فی علم النجوم، کتاب المقیاس للزوال، کتاب التاریخ علی سنی العرب، کتاب العمل بالاصطرلابات، ذوات الحلق، کتاب العمل بالاصطرلاب المسطح۔

نجوم سے منصور کی دلچسپی کا شہرہ سن کر دور دور کے منجم بغداد پہنچ گئے تھے۔ ان میں ہندوستان کا بھی ایک منجم تھا۔ اس نے سنسکرت کی مشہور ہیئت کی کتاب سدھانت منصور کی خدمت میں پیش کی۔ اس نے ابراہیم بن منجم کے لڑکے محمد سے اس کا ترجمہ کرایا۔ اور اس کی مدد سے محمد نے ہیئت کی ایک کتاب سندھند کبیر کے نام سے تالیف کی جو مدتوں علمائے ہیئت کا مرجع رہی۔ طبی کتابوں کے ترجمہ اور تالیف کا آغاز بھی اسی زمانے سے ہوا۔ ایک مرتبہ منصور بیمار پڑا۔ اس کے علاج کے لیے جندشاپور کے مشہور شفاخانے کا رئیس الاطباء جورجیس بن بختیشوع بلایا گیا۔ اس کے علاج سے منصور کو فائدہ ہوا۔ اس نے اس کو انعام واکرام سے نوازا۔ اور اپنا طبیب خاص بنا لیا۔ جورجیس

نے منصور کے لیے طبی کتابوں کے ترجمے کیے۔ ایک اور درباری طبیب بطریق نے سقراط اور جالینوس کی کتابوں کے ترجمے کیے۔

منطق، فلسفہ اور فارسی کی کتابوں کے ترجمے ہوئے۔ منصور کے میر منشی عبداللہ بن مقفع نے جو بڑا نامور ادیب اور فلسفی تھا ارسطا طالیس کی کتاب قاطیغوریاس، بادی آرمیناس، اور انوطولیقا اور منطق کی مشہور کتاب ایساغوجی کا ترجمہ کیا۔ کلیلہ دمنہ کو بھی سب سے پہلے اسی نے عربی کا جامہ پہنایا۔ ترجمہ کے علاوہ سیاست پر دو رسالے لکھے۔ فارسی سے پارسی علم الاخلاق کی کتاب کا ترجمہ الادب الکبیر اور ادب الصغیر بھی ابن مقفع کی یادگار ہے ان کے علاوہ اس نے اور منصور کے دوسرے مترجموں نے ایران کے بانیان مذاہب مانی، دلسیاں، اور مرقون کی کتاب کے ترجمے کیے۔ لیکن اس سے مسلمانوں کے عقائد و خیالات پر اچھا اثر نہیں پڑا۔

منصور اور امام مالکؒ منصور نے امام مالکؒ کو موطا کی تالیف پر آمادہ کیا تو ان سے اس طرح مخاطب ہوا کہ اے ابو عبداللہ تم جانتے ہو کہ اسلام میں تم سے اور مجھ سے زیادہ شریعت کا جاننے والا کوئی باقی نہیں رہا۔ میں تو ان خلافت اور سلطنت کے جھگڑوں میں مبتلا ہوں۔ تم کو فرصت حاصل ہے لہٰذا تم لوگوں کے لیے ایک ایسی کتاب لکھو جس سے وہ فائدہ اٹھائیں۔ اس کتاب میں ابن عباس کے جواز اور ابن عمر کے تشدد و احتیاط کو نہ بھرو اور لوگوں کے لیے تصنیف و تالیف کا ایک نمونہ قائم کر دو۔ امام مالکؒ کہتے ہیں بخدا منصور نے یہ باتیں کیا کہیں تصنیف ہی سکھا دی۔

خلیفہ مہدی

جز رس باپ کا دریا دل بیٹا

داستانِ فتح و کامرانی یہ ابو جعفر منصور کا بیٹا تھا۔ اس کی کنیت ابو عبد اللہ تھی ۱۵۸ھ[1] میں مکہ مکرمہ میں اس کے ہاتھ پر بیعت کی گئی

"الفخری" کا بیان ہے:

یہ بڑا زود فہم، فطین اور شریف تھا مگر اہلِ الحاد اور زندقہ کے لیے بڑا سخت گیر تھا اور انھیں ہلاک کرنے میں کسی ملامت کی پروا نہیں کرتا تھا۔ قحط، حادثات اور فتنۂ خوارج میں اس کا عہد منصور کے عہد سے مشابہ تھا۔ یہ ظلم کو دور کرنے کے لیے ہر وقت تیار بیٹھا رہتا تھا۔

کہتے ہیں کہ جب وہ مظالم کی سماعت کے لیے بیٹھتا تو کہتا کہ قاضیوں کو بلالو۔ یہ محض قاضیوں کا احترام باقی رکھنے کو کہتا ورنہ وہ خود کافی ہوتا تھا۔

مدعیٔ الوہیت ابن مقنع کا ظہور ابنِ مقنع ایک کانا اور ٹھگنا شخص تھا۔ اس نے سونے کا ایک چہرہ بنایا تھا جو اپنے چہرے پر ڈھانپے رہتا تھا۔ تاکہ اس کا اصلی چہرہ نظر نہ آئے۔ یہ الوہیت کا دعویٰ کرتا تھا اور کہتا

---

1. ۱۵۸ھ تا ۱۶۹ھ (۷۷۵ء - ۷۸۵ء)

تھا کہ اللہ نے آدم کو پیدا کر کے خود آدم کی شکل پیدا کر لی۔ پھر نوحؑ کی صورت اختیار کر لی۔ اور اسی طرح یکے بعد دیگرے آخر میں ابو مسلم خراسانی کی شکل اختیار کی۔ یہ اپنا نام ہاشم بتاتا تھا۔ یہ تناسخ کا قائل تھا اور بہت سے گمراہوں نے اس کی بیعت کر لی۔ یہ لوگ جس شہر میں رہتے تھے۔ اور جہاں بھی ہوتے مقنع کی طرف رُخ کر کے سجدہ کرتے اور جنگ کے وقت یوں دہائی دیتے: اے ہاشم ہماری مدد کر۔ اس کے گرد ایک انبوہ کثیر جمع ہو گیا۔

مہدی نے اس کے مقابلے کے لیے ایک لشکر بھیجا۔ یہ وہیں اپنے کو بچانے کے لیے قلعہ بند ہو گیا۔ طول کھینچنے سے مقنع اور اس کے ساتھی عاجز آ گئے۔ اور بہت سے لوگوں نے امان طلب کی۔ اور اس کے ساتھی چند رہ گئے جو قلعے میں محصور تھے۔ مقنع نے ایک بڑا الاؤ روشن کیا۔ اور قلعے کی ہر چیز جانور، کپڑے اور دوسری چیزیں آگ میں ڈال کر بھسم کر دیں پھر اپنی عورتوں، بچوں اور ساتھیوں سے کہا کہ تم میں جو شخص بھی میرے ساتھ آسمان کی بلندیوں پر جانا چاہتا ہے وہ اپنے آپ کو اس میں جھونک دے۔ اس کے بعد اپنے آپ کو، اپنی عورتوں اور اپنی اولاد کو نذرِ آتش کر دیا۔ یہ اس ڈر سے کیا کہ اس کے جسم اور اس کی عورتوں پر دوسروں کا قبضہ نہ ہو۔ سب جل مرے تو قلعے کے دروازے بھی کھل گئے۔ مہدی کا لشکر قلعے میں داخل ہوا تو سارا قلعہ خالی اور اوندھا پڑا تھا۔

مہدی کی سیرت وشخصیت

جب مہدی خلیفہ ہوا تو عیسیٰ بن موسیٰ کی معزولی اور اپنے دونوں فرزندوں موسیٰ الہادی اور ہارون رشید کی ولی عہدی کو دوبارہ پختہ کر دیا۔

مہدی نے خلیفہ ہونے کے بعد اپنے فرزندوں کے لیے وہی کچھ کیا جو منصور نے خود مہدی کے لیے کیا تھا۔ اس نے بھی عیسیٰ بن موسیٰ کو بلا کر اپنے آپ کو معزول کرنے کا مطالبہ کیا۔ عیسیٰ نے انکار کیا تو اسے کچھ ڈرایا اور کچھ لالچ دیا۔ آخر وہ راضی ہو گیا اور اپنی معزولی کی شہادت دے کر مہدی کے دونوں فرزندوں ہادی و رشید کی بیعت کر لی۔

اپنے باپ منصور کی طرح اس کی نگاہیں بھی انتظامِ ملکی کی جزئیات پر رہتی تھیں۔ مہدی نے

خلیفہ ہونے کے بعد زیاد بن ابیہ کے خاندان کو عبید ثقفی سے نسب میں وابستہ کر کے قریشیوں کے رجسٹر سے ان کے نام خارج کرا دیے۔ نیز ابو بکرہ کے خاندان کے نسب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم کی اولاد سے وابستہ کر دیا۔ یہ احکام لکھ کر تمام جگہ بھیج دیے اور اسی پر اعتماد قائم رہا لیکن بعد میں کارپردازوں نے بنی زیاد سے رشوتیں لے کر ان کے نام پھر قریشیوں کے رجسٹر میں درج کر دیے

مہدی نے روم پر کئی بار حملے کیے جس میں مہدی غالب رہا۔ مہدی کی موت ماسبذان میں ہوئی۔ ہارون نے نماز جنازہ پڑھائی۔ وفات کے وقت اس کی عمر ۴۳ سال تھی۔ مدتِ خلافت دس سال۔

معاویہ بن یسار منصبِ وزارت پر مہدی کے دور میں وزیر یعنی ابو عبید اللہ معاویہ بن یسار چونکہ بڑا صاحبِ صلاحیت تھا اس لیے اس کے دور میں وزارت کی دھاک بیٹھ گئی تھی۔ اس نے مملکت کے محاصل یکجا کیے، دفاتر قائم کیے اور اس کے اصول و قواعد وضع کیے۔ یہ دنیا کا منفرد حساب داں، عالم اور باخبر وزیر تھا۔

علامہ سیوطی نے مہدی کے بارے میں لکھا ہے۔:

مہدی ابو عبد اللہ محمد بن منصور ۱۲۶ - ۱۲۷ھ میں مملکت سمرقند کے مشہور شہر اہواز کے قصبہ ایدج میں پیدا ہوا۔ والدہ کا نام ام موسیٰ بنت منصور حمیریہ تھا۔

مہدی کے شمائل و خصائل مہدی بڑا سخی، خوبصورت، رعایا کا محبوب ممدوح اور پختہ اعتقاد کا مالک تھا۔ اس نے زندیقوں کا پیچھا کیا۔ اور انھیں فنا کے گھاٹ اتار دیا۔ مہدی وہ پہلا شخص ہے جس نے ملحدوں اور زندیقوں کی تردید میں کتبِ جدل تصنیف کرائیں۔ اس کی حدیث دانی کا یہ عالم تھا کہ اپنے والد اور حضرت مبارک بن فضالہ سے احادیث کی سماعت کی اور پھر اس کے حوالے سے یحییٰ بن حمزہ، جعفر بن سلیمان، محمد رقاشی اور ابو سفیان حمیری وغیرہ نے احادیثِ مسموعہ کی روایت کی ہے۔

مہدی کی اصلاحات اور کارنامے ۱۶۰ھ میں ہندوستان کے مشہور شہر ارمد پر بزورِ شمشیر قبضہ کیا۔ اسی سال مہدی نے حج کیا۔ اور اس خوف

سے کہ بے شمار غلافوں کے بوجھ سے خانۂ کعبہ کی دیواریں کہیں منہدم نہ ہو جائیں تمام غلاف اتروا دیے۔ البتہ حکومت کا غلاف اس پر رہنے دیا۔ اور یہی وہ سال ہے جب مکۂ مکرمہ میں مہدی کی آب نوشی کے لیے برف لایا گیا۔ بقول ذہبی کے مہدی ہی وہ خلیفہ ہے جس کی آب نوشی کے لیے مکہ میں برف کا انتظام کیا گیا۔ ۱۶۱ھ میں مہدی نے مکۂ معظمہ میں سڑکیں، عالی شان عمارتیں اور حوض بنوائے۔ مسجدوں میں حاکم اعلیٰ کے لیے خاص کمرہ بنانے کی ممانعت فرمائی۔ اور مسجد کے منبروں کی لمبائی چوڑائی وہی جائز و باقی رکھی جتنی عہدِ رسالت مآب میں تھی۔

۱۶۳ھ میں اور اس کے بعد مملکتِ روما کے اکثر شہر فتح کیے۔

۱۶۶ھ میں مہدی نے عیسیٰ باد کو دار السلطنت بنایا اور مدینہ منورہ، یمن اور مکۂ معظمہ سے اس نئے دار السلطنت میں ڈاک لانے کے لیے اونٹ اور خچر مقرر کیے۔ امام ذہبی کا بیان ہے مہدی وہ پہلا خلیفہ ہے جس نے حجاز اور عراق کے درمیان ڈاک لانے لے جانے کا انتظام کیا۔

۱۶۷ھ میں مسجد حرام کی توسیع کی اور کافی زمین اس میں شامل کی۔

علم اور علماء کا وقار

امام بغوی نے اپنی جعدیات میں حمدان اصبہانی کی زبانی لکھا ہے میں شریک کے پاس بیٹھا ہوا تھا، اتنے میں مہدی کا لڑکا موسیٰ آیا۔ اور مسند پر تکیے کے سہارے بیٹھ گیا۔ اور شریک سے حدیث نبوی بیان کرنے کو کہا۔ لیکن شریک نے اس کی جانب التفات نہ کیا۔ پھر کئی مرتبہ اس نے حدیث بیان کرنے کا مطالبہ کیا۔ اور آخر کار کہا، آپ شہزادوں کو حقیر و ذلیل سمجھتے ہیں۔ شریک نے جواب دیا بالکل نہیں۔ لیکن شہزادوں کی بہ نسبت علماء علم کی زیادہ عزت و عظمت کرتے ہیں۔ اس نوبت پر موسیٰ بن مہدی دو زانو ہو کر بیٹھا۔ اور پھر حدیث سننے کی خواہش کی۔ تب شریک نے فرمایا ہاں اس طرح ادب سے علم حاصل کیا جاتا ہے۔

مہدی کی وسعتِ اخلاق

ابو عبیدہ کا بیان ہے مہدی ہمارے ساتھ جامع مسجد بصرہ میں پنج وقتہ نماز پڑھتا تھا۔ ایک دن نماز تیار تھی کہ ایک دیہاتی نے کہا، امیر المومنین مجھے آپ کے پیچھے نماز پڑھنے کا بے انتہا شوق ہے اور ظہر کی نماز میں بھی آپ کے ساتھ شامل نہ ہو سکا۔ اس پر مہدی نے سب لوگوں کو حکم دیا کہ اس دیہاتی

کے آنے کے بعد ہی نماز شروع کی جائے۔ ایک دن مہدی محراب میں بہت دیر تک کھڑا رہا۔ لوگوں نے جب کہا کہ وہ دیہاتی آگیا ہے تو مہدی نے تکبیر تحریمہ کہی۔ یہ دیکھ کر لوگوں نے تعجب کیا اور پھر کہا کہ مہدی کا اخلاق نہایت وسیع ہے۔

غیر مسلم حکمرانوں سے معاہدے

اکثر سرحدی علاقوں کے غیر مسلم حکمراں عباسی حکومت کے باغیوں سے مل جاتے تھے جس سے بڑی مشکلات پیش آتی تھیں اس لیے ۱۶۴ھ میں مہدی نے اپنے ماتحت باجگذاروں اور سرحدی فرمانرواؤں کے پاس سفراء بھیج کر ان سے صلح اور مفاہمت کر کے اس خطرہ کا سدباب کیا۔ اس سلسلے میں کابل، طبرستان، صغد، طخارستان، بامیان، فرغانہ، اشروسنہ، سجستان، ترک، تبت، سندھ، چین کے فرمانرواؤں اور ہندوستان کے بعض راجاؤں نے جیسا کہ یعقوبی کا بیان ہے اطاعت کا معاہدہ کیا۔

رومیوں سے معرکہ آرائیاں

مہدی کے زمانے میں اندرونی خلفشار نسبۃً بہت کم رہا اس لیے اس کو بیرونی فوج کشی کا زیادہ موقع ملا۔ گو اس کا زمانہ دس بارہ سال سے زیادہ نہیں تھا لیکن اتنی مدت میں اتنی فوج کشیاں ہوئیں کہ بنو امیہ کے بعد سے اس کے زمانے تک اس کی مثال نہیں ملتی۔ گرمائی فوجیں رومی ممالک پر ہر سال حملہ آور ہوتی تھیں مہدی نے اپنی تخت نشینی کے پہلے ہی سال اپنے چچا عباس کو بھیجا، اس نے ادھرہ فتح کیا۔

۱۶۱ھ میں ثمامہ بن ولید نے فوج کشی کی اور دابق میں اترا۔ میخائیل رومی اسی ہزار فوج کے ساتھ نکلا اور عمق مرعش میں بہت سے مسلمانوں کو قتل اور قید کر کے مرعش کا محاصرہ کر لیا یہاں بھی بہت سے مسلمان شہید ہوئے اور میخائیل محاصرہ اٹھا کر جیحان لوٹ گیا۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد ۱۶۲ھ میں رومیوں نے اسلامی اور رومی سرحد حدث پر حملہ کر کے اس کی شہرپناہ گرادی۔ مہدی نے حسن بن قحطبہ کو ایک جرار لشکر کے ساتھ بھیجا، اس نے اذرولیہ پہنچ کر رومی حدود سلطنت میں تاخت وتاراج کی۔ اور سالم وغانم واپس آیا۔ اسی سن میں یزید بن اسید سلمی نے قالیقلا کے نواح میں حملہ کر کے تین قلعے فتح کیے۔

۱۶۳ھ میں مہدی نے خود بنفس نفیس رومیوں کے مقابلے میں نکلنے کا ارادہ کیا، خراسان اور دوسری چھاونیوں سے تازہ دم فوجیں منگائیں اور بغداد میں اپنے لڑکے موسیٰ ہادی کو اپنا

قائم مقام بنا کر خود فوجیں لے کر نکلا اور موصل و جزیرہ ہوتا ہوا فرات کو عبور کر کے حلب پہنچا۔ یہاں زندیقوں کی بڑی تعداد تھی۔ ان کو جمع کر کے قتل کیا اور ان کی کتابیں تلاش کر کے ضائع کرائیں اس کے بعد جیحان آیا۔ اور یہاں سے ہارون، عیسیٰ بن موسیٰ، ربیع، حسن بن قحطبہ، سلیمان ابن برمک، یحییٰ بن خالد اور دوسرے عمائد کو رومی حدود کی جانب روانہ کیا۔ انھوں نے سمالو کا قلعہ فتح کیا۔ اور بہت سی چھوٹی چھوٹی فتوحات حاصل کیں لیکن کوئی بڑا معرکہ پیش نہیں آیا۔ اور مہدی بیت المقدس ہوتا ہوا بغداد واپس آیا۔

۱۶۴ھ میں عبدالکبیر بن عبدالحمید باب حدث کی طرف بڑھا۔ میخائیل اور طاراد ارمنی بطریق نوے ہزار فوج کے ساتھ اس کے مقابلے کو نکلا۔ عبدالکبیر میں اس انبوہ عظیم کے مقابلے کی طاقت نہ تھی اس لیے لوٹ گیا۔ مہدی اس کمزوری پر بہت برافروختہ ہوا۔ اور عبدالکبیر کو قتل کر دینا چاہا۔ لیکن لوگوں کی سفارش سے قید کرنے پر اکتفا کی۔ ۱۶۵ھ میں ہارون الرشید کو تقریباً چھیانوے ہزار فوج کے ساتھ صائفہ کا امیر بنا کر بھیجا۔ ہارون اس لشکر جرار کو لے کر ایشیائے کوچک میں داخل ہوا۔ نقیطا رومی مقابل میں آیا۔ یزید بن مزید نے اس کو شکست فاش دی اور اس کے کل ساز و سامان پر قبضہ کر کے دمستق رومی کی طرف بڑھا۔ اس نے ایک خطیر رقم دے کر صلح کر لی۔ اس لیے ہارون اسے چھوڑ کر آگے بڑھا۔ اور خلیج قسطنطنیہ تک بڑھتا چلا گیا۔ اس وقت قسطنطنیہ کے تخت پر لیون کی بیوہ اپنے صغیر السن بچے کی ولیہ کی حیثیت سے حکمراں تھی۔ اس نے ستر ہزار دینار سالانہ فدیہ پر صلح کر لی۔ شرائط صلح میں یہ بھی تھا کہ مسلمان جن جن راستوں سے گزریں گے وہاں رومی بازار لگائیں گے اور رہنمائی کے فرائض انجام دیں گے۔ ان لڑائیوں میں مسلمانوں کو بہ کثرت مال غنیمت ہاتھ آیا۔

سندھ اور اطراف سندھ میں فتوحات

سندھ کے علاقے میں بھی بعض فتوحات حاصل ہوئیں۔ ۱۵۹ھ میں مہدی نے عبدالملک بن شہاب مسمعی کو بحری مہم میں سندھ روانہ کیا۔ اس نے باربد (بھاڑبھوت) کے ساحل پر لنگر انداز ہو کر شہر کا محاصرہ کر لیا۔ اہل شہر نے مدافعت میں پوری قوت صرف

کردی لیکن ناکام رہے ۔ اور مسلمانوں نے باربد فتح کرلیا۔ اس معرکے میں بے شمار سندھی کام آئے اور مسلمانوں کی صرف چند جانیں ضائع ہوئیں ۔ اس مہم کو سر کر کے مسلمان واپس ہو رہے تھے کہ ایرانی ساحل کے قریب ان کا بیڑا طوفان میں گھر گیا۔ بعض جہاز ٹوٹ گئے اور بہت سے مسلمان ضائع ہوئے صرف چند جہاز صحیح و سالم پہنچے۔

طبرستان کے حاکم وندا وہرمزاد رشردین اکثر فساد برپا کیا کرتے تھے ۱۶۷ھ میں موسیٰ ہادی نے فوج کشی کر کے ان کی پوری تنبیہ کی۔

مہدی کی رحم دلی اور رقتِ قلب

منصور کے زمانے سے بہت سے علوی قید میں بند تھے۔ مہدی نے ان سب کو رہا کر کے ان کے وظائف مقرر کر دیے۔ اس کی رقیق القلبی کا ایک عبرت آموز واقعہ تاریخوں میں مذکور ہے بنی امیہ کے ساتھ بنی عباس کی دشمنی معلوم و مشہور ہے۔ مہدی ایسا شریف دل تھا کہ اس کو ان پر رحم بھی آجاتا تھا، ایک مرتبہ مہدی کی بیوی اور دوسری خواتین شاہی محل میں بیٹھی تھیں کہ خادم نے آکر اطلاع دی کہ ایک شریف مگر بدحال عورت اندر آنے کی اجازت چاہتی ہے لیکن نام نہیں بتاتی۔

مہدی کی بیوی خیزراں نے بلا لیا لیکن بشرہ پر شرافت کا جلال نمایاں تھا۔ خیزراں نے پوچھا بہن تم کون ہو؟ اس نے کہا میں محمد بن مروان (آخری اموی خلیفہ) کی بیوی مزنہ ہوں زمانے نے مجھے اس نوبت کو پہنچا دیا ہے۔ میرے جسم پر تم یہ جو پرانے کپڑے دیکھ رہی ہو یہ بھی میرے نہیں ہیں۔ بلکہ مانگے کے ہیں۔ گو زمانے نے ہمیں اس نوبت پر پہنچا دیا ہے لیکن اب بھی ہماری شرافت کا وقار ہم کو عامۃ الناس سے ملنے کی اجازت نہیں دیتا اس لیے ہم تمھارے پاس آئے ہیں کہ ہماری جو نوبت بھی ہو پردے میں ہو۔ مزنہ کی باتیں سُن کر خیزراں کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں لیکن اس کی مغلانی زینب نے جو بڑی منہ چڑھی تھی کہا:۔

مزنہ تم وہ دن بھول گئیں جب ہم حران میں تمھارے پاس ابراہیم کی لاش مانگنے کے لئے گئے تھے۔ اس وقت تم نے ہم کو ڈانٹ کر نکلوا دیا تھا۔ اور کہا تھا کہ مردوں کے معاملات میں عورتوں کو کیا دخل۔ تم سے اچھا سلوک تو مروان نے کیا تھا اور لاش ہمارے حوالے کر کے

مالی سلوک بھی کرنا چاہا تھا لیکن ہم نے انکار کر دیا۔ مزنہ نے کہا خدا کی قسم! ہماری یہ حالت اسی کا نتیجہ ہے معلوم ہوتا ہے کہ تم اس حالت کو اچھا سمجھتی ہو، جبھی اس سیّدہ خیزراں کو ایسے کام پر ابھار رہی ہو۔ جس میں مبتلا ہو کر ہم اس نوبت کو پہنچ گئے ہیں۔ تم کو چاہیے تھا کہ نیکی اور بھلائی پر آمادہ کرتیں اور برائی کے بدلے میں برائی کرنے سے روکتیں تاکہ خدا نے تم کو جو نعمت عطا کی ہے وہ باقی اور قائم رہے۔ بہن زینب! تم دیکھ رہی ہو کہ خدا نے دوسروں کی حق تلفی اور ان کے ساتھ بدسلوکی کا ہم سے یہ بدلا لیا ہے، پھر بھی تم ہماری ہمدردی سے اجتناب برتتی ہو یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

خیزراں دل میں بہت متاثر ہوئی لیکن زینب کی مخالفت نہ کر سکتی تھی۔ اس لیے ظاہری اخلاق نہ برت سکتی۔ اور ایک لونڈی کو اشارہ کر دیا کہ وہ چپکے سے کمرے میں لے جا کر کپڑے وغیرہ تبدیل کرا دے۔ رات کو جب مہدی محل میں آیا تو خیزراں نے یہ سارا قصّہ اسے سنایا۔ یہ سن کر وہ زار زار رونے لگا۔ اور خیزراں سے کہا کہ اگر تم مزنہ کے ساتھ شرافت سے پیش نہ آئی ہوتیں تو میں تم سے کبھی نہ بولتا۔ اور زینب پر سخت برہمی ظاہر کی۔ مزنہ کے آرام و راحت کا سارا سامان مہیّا کر دیا۔ اس میں اور خاندانِ شاہی کی خواتین میں کوئی فرق نہ کرتا تھا۔ حتیٰ کہ ان کے برابر جاگیر بھی ان کو دے دی۔ اور مزنہ نے راحت، عزّت اور آبرو کے ساتھ اسی محل میں پوری عمر گزاری اور ہاروں رشید کے زمانے میں انتقال کیا۔

مسعودی کا بیان ہے:

سفیان ثوری اور خلیفہ مہدی مشہور محدّث سفیان ثوری امراء و سلاطین سے بہت گھبراتے تھے، ایک مرتبہ کسی طرح مہدی کے دربار میں لائے گئے، لیکن کسی قسم کے شاہی آداب نہیں برتے محض السلام علیکم پر اکتفا کی۔ مہدی نے خوش طبعی کے طور پر کہا۔ آپ مجھ سے بھاگے بھاگے پھرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ میں آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اب تو آپ میرے قبضے میں ہیں جو حکم چاہوں دے دوں۔

سفیان ثوری نے جواب دیا جو حکم تم میرے بارے میں دو گے وہی حکم قادرِ مطلق تمھارے بارے میں دے گا۔ جو حق و باطل کا فیصلہ کر دے گا۔ اس جواب پر حاجب شاہی ربیع نے

ان کی شان میں نازیبا الفاظ استعمال کیے اور تلوار اٹھانے کی اجازت چاہی۔ مہدی نے اس کو ڈانٹا اور کہا ایسے بزرگوں کو قتل کر کے ان کی خیر و برکت سے محروم ہو جائیں اور اسی وقت کوفہ کے عہدہ قضا کا پروانہ لکھ کر ان کے حوالے کیا۔ اور یہ بھی آزادی دے دی کہ ان کے فیصلوں میں کوئی مداخلت نہ کی جائے گی۔ سفیان نے یہ پروانہ لے تو لیا لیکن وہاں سے نکلنے کے بعد اس کو چاک کر کے دجلہ میں پھینک دیا اور کہیں روپوش ہو گئے۔ مہدی نے بہت تلاش کرایا لیکن کہیں پتہ نہ چلا۔

ذاتِ رسالتمآب سے عقیدت مہدی کو ذاتِ نبوی سے اتنی عقیدت تھی کہ آپ کی جانب کسی چیز کی چھوٹی نسبت کا بھی بڑا احترام کرتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک شخص رومال میں ایک جوتہ لپیٹ کر اس کے پاس لایا اور کہا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعلینِ مبارک ہے آپ کی خدمت میں ہدیہ کے لیے لایا ہوں۔ مہدی نے اسے لے کر بوسہ دیا اور آنکھوں سے لگایا۔ اور لانے والے کو دس ہزار انعام عطا کیا۔ اس کے جانے کے بعد حاضرین سے کہا میں جانتا ہوں کہ اس جوتے پر رسول اللہ صلعم کی نگاہ بھی نہیں پڑی پہننا تو بڑی بات ہے، لیکن میں نے اس کو صرف اس لیے لے لیا کہ وہ شخص کہتا پھرتا کہ میں امیر المومنین کے پاس رسول اللہ صلعم کا جوتہ لے گیا انھوں نے واپس کر دیا۔

رنگین مزاجی اور عیش پرستی گو مہدی امورِ مملکت کے تمام جزئیات پر نگاہ رکھتا تھا اور بڑی بیدار مغزی سے سلطنت کے فرائض انجام دیتا تھا۔ لیکن رنگین مزاجی اور عیش پرستی میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ اس کا قصرِ شاہی دنیا کی حسین و جمیل عورتوں سے معمور رہتا تھا۔

خلیفہ ہادی

حسین بن علی کے خروج اور قتل کا حادثۂ المیہ

ماں اور بھائی سے کشمکش یہ مہدی کا بڑا بیٹا تھا، ۱۴۷ھ میں خیزراں کے بطن سے بمقام رَے پیدا ہوا۔ خیزراں بربر کی رہنے والی تھی جو مہدی کی کنیز تھی۔ مہدی نے آزاد کر کے ۱۵۹ھ میں اس سے نکاح کر لیا تخت نشینی کے وقت اس کی عمر ۲۲ سال کی تھی۔

ہادی کی شخصیت اور کردار ذہبی کا بیان ہے کہ ہادی شراب خور، کھیل کود کا متوالا، اور عمدہ گدھے کی سواری کا شوقین تھا۔ اس لیے پوری طرح امورِ خلافت انجام نہیں دیتا تھا۔ تاہم نہایت فصیح و بلیغ، قادر الکلام ادیب و مقرر تھا۔ نیز پُر ہیبت، صاحب شان و شوکت اور بارعب انسان تھا۔ ساتھ ہی ساتھ ظالم بھی تھا یہ پہلا خلیفہ تھا جس کے آگے آگے سپاہی ننگی تلواریں، چمکتے نیزے لیے ہوئے اور چلّوں میں تیر لگائے ہوئے کمان بردار چلا کرتے تھے۔ اس کی دیکھا دیکھی اس کے ارکین حکومت کا بھی یہی طرز رہا۔ اور ہادی ہی کے زمانے میں اسلحہ بندی کی کثرت ہوئی۔

خلیفہ ہادی کا انتقال ۱۷۰ھ میں ہادی نے انتقال کیا۔

۱؎ ۱۶۹ھ تا ۱۷۰ھ (۷۸۵ء - ۷۸۶ء)

ہادی کی والدہ خیزراں حکومت میں دخیل تھی۔ اس کے محل پر پہرہ دار بھی مقرر تھے۔ یہ حالات دیکھ کر ایک دن ہادی نے اپنی والدہ کو سخت و سست کہا اور یہ بھی کہا کہ اگر آئندہ تمھارے دروازے پر کسی حاکم سلطنت کو دیکھا تو اس کی گردن اڑا دوں گا۔ تمھارا کام چرخہ چلانا، قرآن کریم کی تلاوت اور تسبیح و تہلیل کرنا ہے۔ چنانچہ خیزراں برہم ہو کر اٹھ کر چلی گئی۔ اسی دن ہادی نے اپنی والدہ کو زہر آلود کھانا بھیجا جو اس نے ایک کتے کو دیا جس کے کھاتے ہی وہ کتا مر گیا۔ اس سے متاثر ہو کر خیزراں نے ہادی کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ ایک دن ہادی کو جاڑا بخار آیا وہ تپ و لرزہ کی وجہ سے منہ ڈھانپے ہوئے لیٹا تھا۔ کہ خیزراں کے اشارے پر جو لوگ اس کے اطراف جمع تھے انھوں نے ہادی کا گلا دبا دیا۔

ہادی کے مرتے وقت اس کے سات بیٹے زندہ تھے۔

خلیفہ ہادی کے اطوار و عادات

الفخری نے لکھا ہے کہ:

موسیٰ ہادی کی ۱۶۹ھ میں بیعتِ خلافت ہوئی۔ یہ بڑا بیدار مغز، عیزت مند، شریف، سخی، قوی، سخت گیر، قوی دل، چوکس، آگے بڑھنے والا، ہمت ور اور ہوشیار تھا۔

حسین بن علی کے خروج کا واقعہ

حسین بن علی بنی ہاشم کے ممتاز اور فاضل لوگوں میں تھے انھوں نے خروج کا ارادہ کیا۔ اور ان کے گھر کے سربرآوردہ لوگوں نے ان سے اتفاق کر لیا۔ پھر یہ ہوا کہ ایک علوی کو عامل مدینہ سے گزند پہنچی اور تمام آلِ ابی طالب جوش میں آ گئے۔ اور بہت سے لوگ ان کے ساتھ ہو گئے۔ اور دارالامارت کی طرف بڑھے۔ عاملِ مدینہ قلعہ بند ہو گیا۔ ان لوگوں نے قید خانے کو توڑ کر قیدیوں کو نکال لیا۔ اور حسین بن علی کی بیعت کر لی گئی۔ پھر ان کی قوت بڑھتی گئی۔ ہادی نے محمد بن سلیمان کو یا بقول بعض سلیمان بن منصور کو ایک لشکر دے کر ان کی طرف بھیجا۔ مکے اور مدینہ کے درمیان ایک جگہ ہے جسے فخ کہتے ہیں۔ یہیں دونوں کی مڈبھیڑ ہوئی اور سخت جنگ ہوئی۔ حسین بن علی مارے گئے اور ان کا سر موسیٰ ہادی کے پاس بھیج دیا گیا۔ جب یہ سر ہادی کے سامنے لایا گیا تو اس نے لانے والے سے کہا: تم تو ایک طاغوت کا سر لائے ہو۔ میں کم سے کم انعام جو تمھیں دے سکتا ہوں وہ یہ ہے

کہ تمھیں کچھ نہ دوں۔ اور واقعی اس نے کچھ نہ دیا۔

حسین بن علی بہادر و شریف تھے۔ یہ مہدی کے پاس آئے تو مہدی نے انھیں چالیس ہزار دینار دیے تھے۔ جو انھوں نے بغداد اور کوفے کے لوگوں میں تقسیم کر دیے۔ اور جب کوفے سے نکلے تو ان کے پاس صرف ایک جبّہ تھا جس کے نیچے کُرتہ بھی نہ تھا۔

ہادی کی وفات ۱۷۰ھ میں ہوئی۔

عجیب اتّفاق جس رات ہادی مرا اسی رات ہارون رشید خلیفہ بنا۔ اور اسی رات مامون تولّد ہوا۔

ہادی اور ہارون کی کشمکش ہادی کے بعد ہارون ولی عہد تھا۔ ۱۷۰ھ میں ہادی نے اپنے اسلاف کی تقلید میں ہارون کا نام ولی عہدی سے خارج کر کے اپنے لڑکے جعفر کو ولی عہد بنانا چاہا۔ افسرانِ فوج بھی اس کے ساتھ ہو گئے اور انھوں نے اپنی پوری جماعت کو ہارون کی مخالفت پر آمادہ کر لیا۔ اس سے ہادی کو بڑی تقویت ہوئی۔ چنانچہ اس نے ہارون پر دست برداری کے لیے زور ڈالنا شروع کیا۔ اور اس کو ملکی صلاح و مشورے سے خارج کر دیا۔

یحییٰ ابن خالد مہدی کے زمانے سے ہارون کا اتالیق اور مشیر کار تھا۔ ہارون کے مخالفین نے ہادی کو سمجھا دیا کہ ہارون کبھی آپ کے فیصلے کی مخالفت نہ کرتا۔ یحییٰ اس کو بھڑکاتا ہے، ہادی نے یحییٰ سے باز پرس کی۔ اس نے کہا مہدی کے بعد آپ ہی نے مجھ کو ہارون کی خدمت کا حکم دیا تھا اس لیے میں صرف حکم بجا لاتا تھا، اس جواب پر ہادی کا غصّہ کم ہوا۔ اور اس نے ہارون کو ولیعہدی سے خارج کرنے کے بارے میں یحییٰ سے مشورہ کیا، اس نے کہا: اگر آج امیر المومنین، امیر المومنین مہدی کے نامزد کردہ ولی عہد کو لوگوں کے کہنے سُننے سے ولیعہدی سے خارج کر دیں گے تو کل ان کے لیے امیر المومنین کے نامزد کردہ ولی عہد کا علیحدہ کر دینا بھی آسان ہوگا۔ ہاں اگر آپ ہارون کے بعد جعفر کو ولیعہد بنانا چاہیں تو یہ ولیعہدی زیادہ پائیدار ہو گی۔ بات معقول تھی ہادی کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے کہا تم سچ کہتے ہو۔ لیکن افسرانِ فوج اور اس کی ہم خیال جماعت نے پھر ہادی کو بھڑکا دیا۔ چنانچہ اس نے یحییٰ کو قید کرا دیا۔ یحییٰ نے قید خانہ سے کہلا بھیجا کہ امیر المومنین

سے کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ ہادی نے اجازت دے دی۔ اس نے آگے کہا: اگر بفیض اعدا امیر المومنین کا سایہ سر سے اٹھ جائے تو کیا امیر المومنین کو اس کی امید ہے کہ لوگ نابالغ شہزادہ جعفر کی خلافت قبول کرلیں گے۔ اور وہ نماز، حج اور جہاد وغیرہ میں ان کی امارت پسند کریں گے ہادی نے کہا اس میں تو ضرور شبہ ہے یحییٰ نے کہا ایسی صورت میں کیا آپ یہ خطرہ محسوس نہیں کرتے کہ آپ کے بعض بزرگ اہلِ خاندان خلافت کے مدعی ہو جائیں۔ اور یہ شرف آپ کے پدر بزرگوار کی اولاد سے ان میں منتقل ہو جائے۔ میں تو کہتا ہوں کہ اگر امیر المومنین مہدی ہارون کو ولی عہد نہ بھی بنا گئے ہوتے تو بھی آپ کا یہ فرض تھا نہ کہ آپ خود ان کو ولیعہدی سے خارج کر رہے ہیں۔ میری رائے یہ ہے کہ ہارون کی ولیعہدی برقرار رکھیے جعفر کے بلوغ کے بعد میں خود ہارون کو لا کر دست بردار کرا دوں گا۔ ہادی نے یہ مشورہ قبول کر لیا۔ اور یحییٰ رہا کر دیا گیا۔ لیکن افسرانِ فوج نے پھر اس کو مذبذب کر دیا۔ اس نے ہارون کو بلا بھیجا۔ یہ آیا مگر پھر شکار کے بہانہ سے واپس چلا گیا۔ ہادی ہارون سے آتنا بدگمان ہو رہا تھا کہ پھر اس کو طلب کیا۔ اس مرتبہ اس کو آنے میں تامل ہوا۔ مگر ہادی نے اس پر اتنا زور ڈالا کہ مجبوراً واپس آنا پڑا۔ لیکن ہارون کی قسمت سے اس کی واپسی کے کچھ ہی دنوں بعد ہادی کا وقتِ آخر ہو گیا اور جیسا کہ ابن اثیر کا بیان ہے اس کو کسی عملی کارروائی کا موقع نہ مل سکا۔

وزارت

ہادی کا سب سے پہلا وزیر ربیع بن یونس تھا۔ اس کی وزارت کا زمانہ بہت مختصر تھا۔ وزارت کے چند ہی دنوں بعد وہ مرگیا۔ اس کے بعد ابراہیم بن ذکوان حرانی وزیر ہوا۔

عیش پرست لیکن مذہب دوست

ہادی بھی باپ کی طرح عیش پرست اور مذہب میں متشدد اور ملحدوں اور زندیقوں کا سخت دشمن تھا۔ چنانچہ اس نے بھی ان کی بڑی تعداد قتل کی۔ مانی مذہب کا خاص طور سے بڑا دشمن تھا۔ اگر موت نے مہلت دی ہوتی تو اس مذہب کا بقول طبری نام و نشان مٹ گیا ہوتا۔

آں حضرتؐ سے والہانہ شیفتگی

آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہادی کو بے انتہا عقیدت و محبت تھی۔ ایک شاعر نے اپنے ایک قصیدہ

میں ذاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوءِ ادب کا ارتکاب کیا۔ جس پر اسے ٹوکا۔ اُس نے برجستہ اصلاح کرلی تو اسے انعام دیا۔

اسی جرم میں ایک شخص کی ایک مرتبہ گردن اڑا دی۔

بے انتہا فیاض اور دریادل تھا۔ خطیب وغیرہ نے اس کی فیاضی کے بہت سے واقعات لکھے ہیں۔

بنو امیہ نے عربوں کے سوا غیر عربوں کو منہ نہیں لگایا۔ اس لیے کہ انھیں اپنی حکومت کا قیام و دوام اسی میں نظر آیا۔ بنو عباس بھی شروع شروع میں اسی پالیسی پر عامل رہے۔ لیکن بعد میں غیر عرب اقوام کے ــــــ افراد کو رسائی ہوئی اور وہ دربار پر چھا گئے۔ اور دربار پر چھانے کے بعد حکومت کو اپنی مٹھی میں لینے میں کامیاب ہو گئے۔ چنانچہ جو ترک اس لیے آگے بڑھائے گئے تھے کہ یہ حفظِ خلافت کا کارنامہ سرانجام دیں گے وہی کچھ عرصے کے بعد خلافت کے لیے ایک مستقل خطرہ بن گئے۔ خلیفہ کا عزل و نصب، خلیفہ کی زندگی اور موت، خلیفہ کا حال و مستقبل سب کچھ اُن کے ہاتھ میں آگیا۔

فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ

خلیفہ ہارون الرشید

متضاد اور گوناگوں صفات و خصائل کا فرماں روا!

ہارون کا تعارف

ہم نے سفاح (خون آشام) کا حال پڑھ لیا۔ جس نے تختِ خلافت پر قدم رکھا تو جلال و جبروت کی ایک نئی دُنیا پیدا کر دی ہم نے منصور کا عہدِ خلافت دیکھ لیا۔ جس کے طمطراق، دابِ شاہی اور ہیبت و صولت سے نہ دین داروں کو پناہ ملی نہ بے دینوں کو۔ ہم نے مہدی اور ہادی کو اورنگِ شاہی پر متمکن ہوتے دیکھ لیا۔ جنھوں نے اپنے عہدِ حکومت میں نقشِ عہد ظلم و جور اور شوکت و سطوت شاہی کا ناقابلِ فراموش ریکارڈ قائم کر دیا۔

اب ان سب کے بعد ہارون رشید سریر آرائے مملکت ہوتا ہے۔

یہ عجیب و غریب، متضاد اور گوناگوں خصائص کا حامل تھا، یہ رحم دل بھی تھا اور شقی بھی، لکھ لُٹ بھی تھا اور طامع بھی، یہ جلاد کے سامنے گردنیں رکھ بھی دیتا تھا، یہ مالامال بھی کر دیتا تھا اور فقیر بے نوا بھی بنا دیتا تھا۔ یہ جاگیریں بخش بھی دیتا تھا اور چھین بھی لیتا تھا۔ یہ امان دیتا تھا مگر اپنی دی ہوئی امان توڑ بھی ڈالتا تھا۔ یہ معاف بھی کر دیتا تھا اور معاف کر چکنے کے بعد قتل بھی کر ڈالتا تھا۔ یہ دوستی اور یاری کا نباہنا بھی جانتا تھا اور رشتۂ اخوتِ دُنیادی کو کچے دھاگے کی طرح توڑ بھی ڈالتا تھا۔ یہ احسان شناس بھی تھا اور احسان فراموش بھی!

سفاح نے ابوسلمہ کی جان لی جو اس کا محسن تھا منصور نے ابو مسلم خراسانی کو ہلاک کیا۔ جس نے اس خاندان کو استحکام عطا کیا تھا اور اس خاندان کو حکومت بخشی تھی۔ ہادی اپنی ماں اور بھائی کے ساتھ بھی رحم و رعایت نہ کر سکا۔

لیکن ہارون ان سب سے کہیں آگے بڑھ گیا۔

ہارون نے حلیفوں اور حریفوں، دشمنوں، مخالفوں، باغیوں اور سرکشوں کی گردنیں قلم کیں اور آخر میں خاندانِ برامکہ کو تباہ کر دیا۔

جس خاندان کے طفیل وہ بادشاہ بنا تھا، جس خاندان نے اس کی حکومت کو دنیا کی سب سے بڑی اور طاقتور حکومت بنا دیا تھا، آن کی آن میں اسے تباہ و برباد کر دیا اور ذرا نہ سوچا یہ سلوک کس کے ساتھ کر رہا ہے۔

اسی ہارون کے عہدِ حکومت کا ہم مختصر سا جائزہ لیں گے:

ہارون کی ولادت اور عادات و خصائل

سیوطی نے لکھا ہے: ہارون رشید ۱۴۸ھ میں بمقام رَے پیدا ہوا اس زمانے میں اس کا باپ خراسان اور رَے کا حاکمِ اعلیٰ تھا۔ ہارون رشید کی والدہ کا نام خیزران اور بھائی کا نام ہادی تھا جس کی تعریف مشہور شاعر مروان بن حفصہ نے بھی کی ہے۔

ہارون رشید سرخ و سپید، دراز قد حسین و ملیح تھا۔ فصیح و بلیغ اور علم و ادب کا ماہر تھا۔ اپنے زمانۂ خلافت میں تاحیات روزانہ سو رکعتیں نماز پڑھتا رہا۔ البتہ سخت علالت کے دوران مجبور رہتا۔ اپنی ذاتی دولت میں سے روزانہ ہزار درہم خیرات کرتا۔ علم اور صاحبانِ علم کو عزیز رکھتا محرماتِ اسلام کی تعظیم کرتا، امورِ مذہبی میں تفرقہ و نزاع ڈالنے والوں کو سخت بُرا جانتا اور آیاتِ قرآنی کی تاویل کرنے والوں کا جانی دشمن تھا۔ ایک مرتبہ اسے معلوم ہوا کہ بشر مریسی خلقِ قرآنِ کریم کا قائل ہے تو قسم کھا کر کہا اگر میں فتح مند ہو گیا تو اس کی گردن اڑا دوں گا۔

وہ اپنی فضول خرچی پر روتا اور خاص کر وعظ میں اپنے گناہوں کا خیال کر کے گریہ و زاری کرتا، مداحوں کو پسند کرتا اور انھیں بے دریغ انعامات دیتا۔ ایک مرتبہ ہارون کے پاس ابن

سماک آئے تو ہارون نے ان کی بے انتہا عزت وعظمت کی۔ ہارون رشید کی خاکساری دیکھ کر ابن سماک نے کہا اے امیر المومنین! آپ کی خاکساری نے آپ کی عزت کو دوبالا کر دیا ہے۔ پھر ابن سماک نے وعظ کہا جسے سن کر ہارون پر گریہ طاری ہو گیا۔

ہارون رشید کا دستور تھا کہ حضرت فضیل بن عیاض کے مکان پر بہ نفس نفیس حاضر ہوا کرتا تھا۔

ہارون کی رسالت مآبؐ سے محبت

ابو معاویہ ضریر کا بیان ہے ہارون رشید کے روبرو جب رسول اکرمؐ کا تذکرہ ہوتا تو کہا کرتا صلی اللہ علیٰ سیدی۔

ایک دن میں نے کہا سرورِ عالمؐ نے فرمایا ہے میری تمنا ہے کہ اللہ کے راستے میں شہید ہوں پھر زندہ ہوں اور پھر شہادت نصیب ہو۔ یہ حدیث سن کر ہارون پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

ایک مرتبہ میں نے کہا کہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے ایک مرتبہ حضرت آدمؑ و موسیٰؑ کے درمیان کسی بات پر تنازعہ ہوا۔ یہ سن کر ہارون رشید کے پاس جو معزز قریشی بیٹھا تھا اس نے کہا کہ ان دونوں پیغمبروں کی ملاقات کہاں اور کب ہوئی؟ یعنی اس نے رسول اللہؐ کے بیان کو جھٹلایا جس پر ہارون رشید کو سخت غصہ آیا۔ چنانچہ اس نے ایک چمڑا بچھوایا اور اس زندیق کو موت کے گھاٹ اتارنا چاہا تاکہ ایسے ذلیل آدمی کا خون پاک زمین پر گرنے نہ پائے۔ میں نے کہا امیر المومنین اس سے نادانستہ غلطی ہو گئی ہے تب بہ مشکل ہارون رشید کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔

اہل علم کی قدر و منزلت، رقتِ قلب، جود و عطا

ابی معاویہ کا جو نابینا تھے بیان ہے کہ میں نے ایک دن ہارون رشید کے ساتھ کھانا کھایا۔ پھر ایک آدمی نے میرے ہاتھ دھلائے۔ تھوڑی دیر بعد ہارون رشید نے کہا آپ جانتے ہیں کہ آپ کے ہاتھ کس نے دھلائے؟ میں نے کہا جی نہیں۔ ہارون رشید نے کہا آپ کے علم کی عزت کی خاطر میں نے خود آپ کے ہاتھ دھلائے ہیں۔

منصور بن عمار کا بیان ہے پند و نصیحت کے موقع پر میں نے جن آدمیوں کو سب سے زیادہ رونے والا دیکھا ان میں ایک فضیل بن عیاض تھے دوسرا ہارون رشید۔

سخاوت نفطویہ کا بیان ہے ہارون رشید اپنے دادا منصور کے نقشِ قدم پر تھا مگر فرق اتنا تھا کہ منصور بخیل تھا اور ہارون رشید سخی، بلکہ سخاوت میں تمام گزشتہ خلفاء سے بازی لے گیا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ سفیان بن عیینہ کو ایک لاکھ اور اسحق موصلی کو دو لاکھ درہم دیے۔ اور مروان بن حفصہ سے ایک قصیدہ سن کر پانچ ہزار درہم، خلعت، اپنی سواری کا گھوڑا اور ایک رومی غلام عنایت کیا۔

جلوت میں تعریف خلوت میں نصیحت اصمعی کا بیان ہے ایک مرتبہ ہارون رشید سے میں نے کہا اے امیر المومنین میں آپ کی خدمت میں حاضری کے لیے کہیں نہیں ٹھہرا۔ بلکہ ہوا کے گھوڑے پر اڑا چلا آرہا ہوں۔ یہ سن کر ہارون رشید خاموش ہوگیا اور جب لوگ چلے گئے تو میں نے زبانِ شعر میں عرض کیا۔ آپ کے ایک ہاتھ میں زر و جواہر کی تھیلیاں ہیں اور دوسرے میں خونریز تلوار۔ یہ سن کر ہارون رشید نے کہا خوب! جلوت میں میری تعریف اور خلوت میں نصیحت۔ اور اس کے بعد مجھے پانچ ہزار اشرفیاں انعام میں دیں۔

اعیانِ حکومت جاحظ کا بیان ہے ہارون رشید کے تمام اعیانِ حکومت منتخب تھے جملہ وزراء برمکی تھے۔ قاضی القضاۃ ابو یوسف۔ شاعر دربار مروان بن حفصہ۔ مصاحبِ خاص عباس بن محمد۔ فضل بن ربیع دربان۔ ابراہیم موصلی درباری گویا اور زبیدہ رفیقۂ حیات۔ ان میں ہر ایک ماہر و کامل اور اپنے وقت کا عظیم تر انسان تھا۔

ہارون کے بارے میں امام ذہبی کی رائے امام ذہبی کا بیان ہے ہارون رشید کے تمام حالات لکھنا مشکل ہیں۔ اس کے محاسن کی تعداد بہت زیادہ ہے اور ساتھ ہی اس کے لہو و لعب، لذاتِ ممنوعہ اور گانے بجانے کے واقعات بھی بکثرت ہیں اللہ اس کی کوتاہیوں سے درگزرے۔

ہارون: سپہ سالار، مدبر، سیاست داں ۱۷۶ھ میں ہارون رشید کا شہر دلبتہ پر امیر عبدالرحمٰن بن عبدالملک بن صالح عباسی کے ذریعے قبضہ ہوا۔ ۱۷۹ھ میں ہارون رشید نے بماہ رمضان عمرہ کیا اور عمرہ کا احرام پہنے ہوئے

حج کیا اور مکہ معظمہ سے عرفات تک پیدل سفر کیا۔

۱۸۱ھ میں ہارون رشید نے خود میدانِ جنگ میں دشمنوں کو شکست دے کر قلعہ صفصاف فتح کیا۔

۱۸۷ھ میں شہنشاہ روم نقفور نے ہارون رشید کو ایک تہدید آمیز خط لکھا جس کا مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں اور ملکۂ روما میں جو صلح نامہ ہوا تھا اسے ختم کیا جاتا ہے۔

یہ خط پڑھنے کے بعد ہارون رشید سخت برہم ہوا۔ کسی کو اس کی طرف دیکھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ چہ جائیکہ کوئی اس سے گفتگو کرتا۔ تمام درباری خوف زدہ ہو کر اس کے پاس سے چلے گئے۔ وزیر خاص کو بھی کچھ دریافت کرنے کی ہمّت نہ ہوئی۔ ہارون رشید نے قلم دوات منگوا کر اس رقعہ کی پشت پر جواب لکھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم "منجانب ہارون امیر المومنین۔ بنام نقفور سگِ روم۔ اے کافر زادہ! میں نے تمھارا خط پڑھا۔ جواب تم سنو گے نہیں بلکہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے"

یہ جواب لکھ کر ہارون رشید اسی دن روانہ ہو گیا اور یلغار کرتا ہوا شہر ہرقل پہنچ گیا۔ اور وہاں زبردست جنگ ہوئی۔ جو آج تک مشہور ہے۔ غرضکہ ہارون رشید کو فتح ہوئی اور شہنشاہ روم نقفور نے صلح کی درخواست کی اور سالانہ خراج دینا چاہا۔ جسے ہارون رشید نے منظور کر لیا۔

اس فتح کے بعد ہارون رشید واپس ہوا۔ اور ابھی مقام رقہ تک آیا تھا کہ شہنشاہِ روم نے یہ سوچ کر عہد شکنی کی کہ اب سرما میں ہارون رشید حملہ نہیں کر سکے گا۔ سگِ روم کی معاہدہ شکنی کی خبر دینے کی کسی میں ہمت نہ تھی مگر عبد اللہ بن یوسف تیمی نے جرأت کر کے چار مصرعوں میں دشمن کی غدّاری لکھ کر سنائی۔ ابو العتاہیہ نے بھی معاہدہ شکنی کی اطلاع اشعار کے ذریعے دی۔ تو ہارون رشید نے کہا اچھّا اس نے یہ حرکت کی ہے اور پھر فوراً ہی واپس ہوا۔ بہت تیزی سے یلغار کرتا ہوا روم کے دار السلطنت جا پہنچا۔ اور کشتوں کے پشتے لگا کر مال غنیمت جمع کیا۔

۱۸۹ھ میں ہارون رشید نے فدیہ دے کر ان تمام مسلمانوں کو جو ہرقلہ میں قید تھے آزاد کر لیا۔

قبرص کی فتح

۱۹۰ھ میں شہر ہرقل فتح کیا اور مملکت روم میں اسلامی فوج پھیلا دی۔ چنانچہ شراحیل بن معن بن زائدہ نے قلعۂ صقالیہ اور یزید بن مخلد نے ملقونیہ فتح کیا۔ اور حمید بن معیوف نے قبرص پہنچ کر عمارتیں منہدم کیں۔ شہر میں آگ لگا دی اور قبرص فتح کر کے سولہ ہزار قبرصی گرفتار کیے۔

ہارون اور علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ

صولی نے اسحٰق ہاشمی کی زبانی لکھا ہے ہم لوگ ہارون رشید کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنے میں ہارون رشید نے کہا لوگ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ سے مجھے بغض و عداوت ہے حالانکہ بخدا حضرت علیؓ سے مجھے بے انتہا محبّت و الفت ہے اور حاسد لوگ ہمیں طعنہ و الزام دے کر اسلامی مملکت میں فتنہ و فساد برپا کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ سزا یافتہ اپنے گناہوں پر پشیمان و شرمندہ نہیں اور بنو امیہؓ کی طرفداری پر لگے ہوئے ہیں۔ بخدا حضرت علیؓ کی اولاد سید و سردار ہے اور فضیلت میں مقدم ہے۔ مجھ سے میرے والد اور دادا نے حضرتِ عباس رضؓ کی زبانی رسول اکرم ؐ کا یہ ارشاد بیان کیا ہے کہ حسنینؓ سے محبّت رکھنے والے نے مجھ سے محبّت کی اور ان سے عداوت رکھنے والے نے مجھ سے دشمنی کا برتاؤ کیا۔ اور حضرت مریم بنتِ عمران و آسیہ بنت مزاحم زوجۂ فرعون کے سوا حضرت بی بی فاطمہؓ روئے زمین کی خواتین کی سردار ہیں۔

پوری سلطنت کی قیمت

ایک دن ہارون رشید نے حضرت ابن سماک کی موجودگی میں پینے کا پانی منگوایا اور سخت پیاس کی وجہ سے بیتابی سے پینے لگا تو ابن سماک نے کہا اتنی جلدی جلدی نہ پیجیے اور یہ فرمایئے کہ اگر پانی نہ ملے تو اس کی طلب میں آپ کتنی دولت خرچ کر سکتے ہیں؟ ہارون رشید نے کہا نصف سلطنت۔ اس کے بعد ابن سماک نے کہا اب شوق سے نوش فرمایئے۔ پانی پینے کے بعد پھر ابن سماک نے پوچھا اگر پیشاب نہ آسکے تو اس کے اخراج کے لیے آپ کتنی دولت خرچ کر سکتے ہیں؟

ہارون رشید نے کہا پوری سلطنت۔ اس پر ابن سماک نے کہا آپ کی پوری سلطنت کی قیمت ایک گلاس پانی اور ایک مرتبہ کے پیشاب کرنے کے برابر ہے۔ اس لیے مناسب یہ ہے کہ دُنیا پر فریفتہ ہونے سے پرہیز کیا جائے۔ یہ ارشاد سن کر ہارون رشید نے خوب گریہ و زاری کی۔

ابن جوزی کا بیان ہے ہارون رشید نے شیبان سے کہا کچھ نصیحت فرمائیے۔ شیبان نے کہا تمھارا وہ مصاحب سب سے اچھا ہے جو خوفِ الٰہی دلاتا رہے۔ کیونکہ اللہ سے ڈرتے رہنے کا نتیجہ امن و اطمینان کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور اللہ سے نڈر بنا دینے والا مصاحب بہت خراب۔ کیونکہ اللہ سے نڈر ہونے کا انجام نہایت ہی بُرا ہے۔ ہارون نے کہا ذرا تفصیل سے فرمائیے تو شیبان نے کہا جو شخص تم کو خوف الٰہی دلائے اور کہے کل روز محشر تم کو جواب دہی کرنا پڑے گی تو ایسا شخص بہت بہتر و برتر ہے بہ نسبت اس کے جو یہ کہہ کر اللہ سے بے خوف کر دے کہ آپ کو کیا غم۔ آپ تو رسول اکرمؐ کے رشتہ دار ہیں یہ سن کر ہارون پر گریہ طاری ہو گیا۔

داد و دہش اور بذل و سخا صولی نے اپنی کتاب الاوراق میں لکھا ہے کہ ہارون رشید نے جب یحییٰ بن خالد برمکی کو اپنا وزیر بنایا تو مشہور شاعر ابراہیم بن موصلی نے مبارک باد دی جس پر ہارون رشید نے ابراہیم موصلی کو ایک لاکھ اور یحییٰ کو پچاس ہزار درہم انعام دیے۔

اسحٰق موصلی کا بیان ہے ایک مرتبہ میں نے ہارون رشید کو ایک مدحیہ نظم سنائی تو اس کے عوض ہارون نے اپنے وزیر فضل سے کہا اسے ایک لاکھ درم دے دو۔ اس نے بہترین نظم لکھی ہے اس کا مضمون اور بندشیں خوب ہیں۔ تو میں نے عرض کیا اے امیر المومنین! میری نظم سے تو آپ کا حکم زیادہ اچھا ہے جس پر حکم دیا اے فضل اسے ایک لاکھ درہم اور دے دو۔ چنانچہ وقتِ واحد میں دو لاکھ درہم مجھے مل گئے۔

ہارون کے اوّلیات محمد بن علی خراسانی کا بیان ہے ہارون رشید ہی وہ پہلا خلیفہ ہے جس نے چوگان اور شطرنج کھیلی اور نشانہ بازی کی۔

صولی نے لکھا ہے ہارون رشید ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے گانے والوں کے درجے مقرر کیے اور اپنی لونڈی کے انتقال پر خود مرثیہ لکھا۔

ہارون کا انتقال ہارون رشید نے مملکتِ خراسان کے مقام طوس میں بہ دوران جنگ ۴۵ سال کی عمر میں انتقال کیا اور وہیں ۳۔ جمادی الثانی ۱۹۳ھ کو دفن کیا گیا۔ اور اس کی نمازِ جنازہ اس کے بیٹے صالح نے پڑھائی۔

یحییٰ بن عبداللہ کا خروج اور اس کا انجام ہارون ہی کے زمانے میں یحییٰ بن عبداللہ بن حسن بن حسن بن علی بن ابی طالب نے خروج کیا۔

یحییٰ بن عبداللہ کے بھائیوں نفس زکیہ اور ابراہیم قتیل باخمری کے ساتھ جو کچھ ہوا اس سے یحییٰ کو خطرہ لاحق ہوگیا تھا اس لیے وہ دیلم کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ وہاں کے لوگوں کو یہ خوش اعتقادی پیدا ہوئی کہ یہی امامت کے حق دار ہیں۔ لہٰذا ان سب نے ان کی بیعت کرلی۔ بہت سے شہروں کے لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے۔ اور ان کا اقتدار قائم ہو گیا۔ رشید کو اس کا بڑا صدمہ ہوا۔ اور اس نے فضل بن یحییٰ کو پچاس ہزار کا لشکر دے کر جرجان، طبرستان اور رے وغیرہ کا گورنر بنا دیا۔ فضل بن یحییٰ اپنا لشکر لے کر روانہ ہوا اور یحییٰ بن عبداللہ سے مل کر بڑی مہربانی سے پیش آیا، کچھ دھمکایا، کچھ لالچ دیا۔ آخر یحییٰ صلح پر راضی ہو گئے اور ایک ایسے امان نامے کی خواہش ظاہر کی جس پر رشید کے دستخط ہوں اور قاضیوں نیز فقیہوں اور ہاشمی شیوخ کے دستخط ہوں۔ یہ امان نامہ تحفوں اور ہدیوں کے ساتھ بھیجا گیا۔ یحییٰ بن عبداللہ فضل بن یحییٰ کے ساتھ آئے۔ رشید نے پہلے تو ہر ممکن آؤ بھگت کی لیکن بعد میں انھیں قید کر دیا۔ ہارون نے فقہاء سے امان نامے کو منسوخ کر دینے کے بارے میں استفسار کیا۔ بعض نے جواز کا فتویٰ دیا تو ہارون نے ان سے مباحثہ کیا اور جن لوگوں نے اس کے عدم جواز کا فتویٰ دیا اس نے اسے غلط قرار دیا۔

رشید کے پاس زبیر بن عوام کے خاندان کا ایک شخص آیا اور اس نے یحییٰ کی شکایت

کرتے ہوئے بتایا کہ امان ملنے کے بعد یحییٰ نے فلاں فلاں حرکتیں کی ہیں اور لوگوں کو اپنی امارت کی دعوت دی ہے۔ رشید نے یحییٰ کو قید خانے سے بلایا اور اس زبیری کو سامنے کر کے حقیقت حال دریافت کی۔ یحییٰ نے انکار کیا مگر زبیری اپنی بات پر اڑا رہا۔ یحییٰ نے کہا اگر تم سچے ہو تو قسم کھاؤ۔ زبیری نے کہا خدائے طالب و غالب کی قسم ۔ ۔ ۔ ۔ آگے جملہ پورا کرنا چاہتا تھا کہ یحییٰ نے بات کاٹ کر کہا۔ اس قسم کو چھوڑ دو، کیونکہ جب بندہ خدا کی ستائش و کبریائی بیان کرتا ہے تو خدا اسے سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا۔ اس لیے برائت والی قسم کھاؤ جو بڑی قسم ہے۔ اس کی شکل یہ ہے کہ اپنی جان کے بارے میں یہ کہا جائے کہ "ایسا ایسا ہو تو میری جان خدا کی قوت و قدرت میں چلی جائے"۔ زبیری نے یہ قسم سنی تو لرز اٹھا اور کہا کہ یہ قسم کی کون سی نئی قسم ہے۔ یہ میں نہیں کھاؤں گا۔ رشید نے کہا کہ اس قسم سے ہچکچاتے کیوں ہو؟ سچے ہو تو اس قسم سے تمھیں ڈر کیا ہے۔ زبیری نے یہی قسم کھا لی مگر وہ ابھی محفل سے باہر بھی نہیں ہوا تھا کہ لڑکھڑا کر گرا اور وہیں مر گیا۔

اس تحکیم کی بڑی نشانی ظاہر ہونے کے بعد بھی یحییٰ کو قید خانے میں بری طرح قتل کر دیا گیا۔

موسیٰ بن جعفر کا قتل

رشید کی حکومت وقار اور رونق کے لحاظ سے بہترین حکومت تھی مملکت کی وسعت میں سب سے بڑھ کر تھی۔ رشید نے دنیا کا بڑا حصہ زیر نگیں کر لیا۔ کسی خلیفہ کے دروازے پر اتنے علماء، فقہاء، شعراء، قراء، قضاۃ، منشی، ندماء اور مغنی یکجا نہیں ہوئے جتنے رشید کے دربار میں یکجا ہوئے۔ ان میں سے ہر ایک کو اعلیٰ سے اعلیٰ انعام ملتے تھے۔ جس سے اس کی منزلت بڑھ جاتی تھی۔

موسیٰ بن جعفر علیہ السلام کو قید کر کے اس نے بغداد کے ایک خیمے میں رکھا پھر سندی بن شاہک کے گھر میں قید کر دیا۔ پھر قتل کرا کے یہ مشہور کر دیا کہ یہ اپنی موت سے مرے ہیں۔

خاندانِ برامکہ کے عروج و زوال کی داستانِ عبرت انگیز

برامکہ قدیم سے مجوسی دین رکھتے تھے۔ ان میں سے کچھ لوگ اسلام لائے اور اسلام پر عمر گی

سے قائم رہے۔

برمکی حکومت زمانے کی پیشانی کا چمکتا ہوا تارا، اور دہر کے سر پر دمکتا ہوا تاج تھی۔ اس کی جود و سخا ضرب المثل بن گئی تھی۔ لوگ دور و دراز سے اپنی آرزوئیں لے کر اس کے پاس آتے تھے۔ دُنیا اپنے جگر کے ٹکڑوں کو اس کے پاس بھیجتی تھی۔ اپنی بہترین سعادتوں سے اس نے دُنیا کو بھرپور کر دیا تھا یحییٰ اور اس کی اولاد چمکتے ستارے، لبریز سمندر، رواں سیلاب اور برستے ہوئے ابر تھے۔ علم و ہنر کے بازار ان کے عہد میں گرم تھے۔ اور قابلِ احترام شخصیتوں کی پوری پوری عزت افزائی ہوتی تھی۔ دُنیا آباد تھی اور مملکت کی رونق شباب پر تھی۔ وہ فریادیوں کا ملجا اور گرتوں کا سہارا تھے۔

وزیر یحییٰ ابن خالد کی شخصیت اور صفات

رشید جب تختِ حکومت پر بیٹھا تو اس نے یحییٰ بن خالد بن برمک کو وزیر مقرر کیا۔ یحییٰ خلافت سے پہلے بھی رشید کا سکریٹری، نائب اور وزیر تھا۔ یحییٰ نے حکومت کی ذمہ داریوں کا بوجھ پوری طرح سنبھال لیا تھا۔ اس نے سرحدوں کو مضبوط کر دیا اور جہاں جہاں اس میں کمزوری تھی اسے دور کر دیا۔ ٹیکس وصول کرنے کا مکمل انتظام کیا، علاقوں کو آباد کیا اور مملکت کی رونق کو دوبالا کر دیا۔ اور امورِ مملکت کی طرف پوری توجہ کی۔ یہ بلیغ نگار تھا۔ صاحبِ عقل اور ادیب تھا۔ دو ٹوک بات کرنے والا صحیح الرائے تھا۔ بڑا مدبر تھا۔ جو معاملات اس کے سپرد ہوتے انھیں ضبط و نظم کے ساتھ انجام دیتا۔ معاملات کی نگرانی میں بڑا سخت تھا۔ سخی ایسا تھا کہ سخاوت اور داد و دہش میں ہر اسے بازی لے جاتا۔ ہر شخص اس کے حق میں رطب اللساں تھا، بُردبار، عفت مآب، باوقار اور پُر رعب و جلال تھا۔

ہادی نے یحییٰ کو بلوایا اور ولی عہد کے بارے میں گفتگو کی۔ یحییٰ نے کہا۔ امیرالمومنین اگر آپ اپنے بھائی ہارون کو ولی عہدی سے محروم کر دیں اور آپ پر خدانخواستہ ایسے وقت موت آجائے کہ آپ کا فرزند جعفر کمسن ہو تو فرمائیے کیا اس کی خلافت صحیح ہو گی؟ اور بنی ہاشم کے سن رسیدہ لوگ اس پر راضی ہو جائیں گے۔ اور خلافت کو اس بچے کے سپرد کر دیں گے۔ ہادی نے کہا نہیں۔ یحییٰ نے کہا اگر یہ بات ہے تو اس معاملے کو چھوڑ دیجیے تاکہ جعفر کو قدرتی طور پر خلافت

مل جائے ۔ اگر مہدی نے ہارون کی بیعت نہ بھی لی ہوتی تو آپ کو ہارون ہی کے لیے بیعت لینی چاہیے تھی تاکہ خلافت بنی عباس کے باہر نہ جائے ۔ ہارون نے یحییٰ کی بات مان لی ۔ اور اس کے بعد ہارون یحییٰ بن خالد کی اس کارگزاری کو اپنی سب سے بڑی مدد تصور کرتا رہا ۔

یحییٰ کی زرپاشیاں، غریب نوازیاں

بیان کیا جاتا ہے کہ جب رشید نے برمکیوں کو رسوا کر کے ان کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا تو اعلان کر دیا کہ کوئی شاعر ان کا مرثیہ نہ لکھے ورنہ اسے سزا دی جائے گی ۔ ایک بار ایک سپاہی کسی ویرانے سے گزرا تو دیکھا ایک شخص کھڑا ہے جس کے ہاتھ میں ایک کاغذ ہے اور اس کاغذ پر ایک شعر لکھا ہے جس میں برامکہ کا مرثیہ ہے ۔ وہ شخص یہ شعر پڑھتا ہے اور روتا جاتا ہے ۔ سپاہی نے اسے گرفتار کر کے رشید کے سامنے پیش کیا اور واقعہ بیان کیا ۔ رشید نے اسے بلا کر اصلیت دریافت کی تو اس نے اقرار جرم کر لیا ۔ رشید نے کہا تمھیں یہ علم نہیں کہ میں نے برمکیوں کا مرثیہ لکھنے کی ممانعت کر دی ہے ۔ اب تمھیں ایسی سزا دوں گا کہ تم یاد کرو گے ۔ اس نے کہا امیرالمومنین اگر آپ اجازت دیں تو میں ایک واقعہ عرض کروں ۔ اس کے بعد آپ جو مناسب سمجھیں وہ کر گزریں ۔ رشید نے کہا بیان کرو ۔ اس نے کہا میں یحییٰ بن خالد کا بہت معمولی منشی تھا اور میرا حال سب سے زیادہ پتلا تھا ۔ یحییٰ نے ایک بار مجھ سے کہا کہ میری خواہش ہے کہ تم کسی دن میری دعوت کرو ۔ میں نے کہا میں بالکل اس لائق نہیں اور میرا مکان بھی اس قابل نہیں ۔ اس نے کہا کہ دعوت تو ضرور ہی کرنی پڑے گی ۔ میں نے کہا اگر یہ ضروری ہے تو مجھے اتنی مہلت دیجیے کہ میں کچھ اپنی حالت ٹھیک کر لوں اور اپنے مکان کو کسی قابل کر لوں ۔ اس نے پوچھا کہ کتنی مہلت دوں ؟ میں نے کہا ایک سال ۔ اس نے کہا یہ تو بہت ہے ۔ میں نے کہا اچھا چند مہینے سہی ۔ اس نے کہا اچھی بات ہے غرض میں گھر گیا اور گھر کی درستی اور سامانِ دعوت کی تیاریوں میں لگ گیا ۔ مکمل تیاری کے بعد میں نے یحییٰ بن خالد کو اطلاع دی ۔ اس نے کہا میں کل تمھارے ہاں آؤں گا ۔ میں نے کھانے پینے اور دیگر چیزوں کی تیاری کر لی ۔ وزیر اگلے دن آ گیا ۔ اس کے ساتھ اس کے دونوں فرزند جعفر اور فضل بھی تھے ۔ اور کچھ ممتاز لوگ بھی ۔ وہ سواری سے اترا ۔ اور اس کے دونوں فرزند جعفر و فضل بھی اترے ۔ یحییٰ نے مجھے نام لے کر پکارا اور کہا میں بھوکا ہوں جلد ہی کوئی کھانے کی

چیز لاؤ۔ میں اندر گیا اور تھوڑے بھنے ہوئے چوزے لے آیا۔ وزیر نے اور اس کے ساتھیوں نے کھایا۔ پھر گھر کے اندر ٹہلنے لگا اور کہا کہ اپنے گھر کا دوسرا حصہ بھی دکھاؤ۔ میں نے کہا۔ بس میرا یہی مختصر سا گھر ہے۔ اس کے سوا اور کوئی گھر نہیں۔ اس نے کہا معمار کو بلاؤ۔ جب معمار آگیا تو اس نے کہا اس دیوار میں ایک دروازہ پھوڑ کر نکالو۔ دروازہ نکالا گیا۔ وزیر اور اس کے فرزند اندر داخل ہوئے میں بھی ساتھ ہو گیا۔ اب دیکھتے کیا ہیں کہ ایک خوبصورت چمن ہے بہت سے درخت لگے ہیں۔ پانی جا بجا اچھل رہا ہے۔ کمرے اور مکانات ایسے ہیں کہ نگاہیں خیرہ ہو جائیں آلاتِ غنا، فرش، نوکر چاکر اور کنیزیں سب ایک سے ایک موجود ہیں۔ وزیر نے مجھ سے کہا: یہ قیام گاہ اپنے تمام سازوسامان سمیت تمھاری ہے۔ میں نے اس کا ہاتھ چوما اور اسے دعائیں دیں۔ پھر واقعے کی تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ جس دن اس نے مجھ سے فرمائش کی تھی اسی دن میرے پڑوس کی املاک خریدلی اور اس میں اعلیٰ درجے کا مکان بنا کر ہر چیز وہاں پہنچادی۔ مجھے اس کی کوئی اطلاع نہ تھی۔ میں عمارت بنتے دیکھتا تھا مگر سمجھتا کہ کسی پڑوسی کا ہوگا۔ وزیر نے اس کے بعد اپنے فرزند جعفر سے کہا۔ یہ گھر ہے اور یہ اس کے خدام ہیں۔ آخر یہ شخص اُسے سنبھالنے کے لیے خرچہ کہاں سے لائے گا؟ جعفر نے کہا میں نے اسے اپنی فلاں جائداد اور اس میں جو کچھ بھی ہے سب دے دیا۔ جلد ہی ہبہ نامہ بھی لکھ دوں گا۔ پھر وزیر نے اپنے دوسرے فرزند فضل کی طرف متوجہ ہو کر کہا جب تک اس موہوبہ جائداد کی آمدنی آئے اس وقت تک یہ کیا کرے گا؟ اور اخراجات کہاں سے لائے گا۔ فضل نے کہا میرے ذمہ دس ہزار دینار ہیں جو میں اسے پہنچادوں گا۔ وزیر نے کہا تم دونوں نے جو وعدے کیے ہیں ان کو جلد پورا کرو۔ جعفر نے ہبہ نامہ لکھ دیا اور فضل نے رقم پہنچادی۔ اس کے بعد میں دولت مند بن گیا۔ اور میرا معیارِ زندگی بلند ہو گیا۔ اس کے بعد بھی میں نے اس سے بہت کچھ دولت حاصل کی جس میں آج تک کھیل رہا ہوں۔ اے امیر المومنین یہی وجہ ہے کہ مجھے جہاں بھی موقع ملتا ہے اس کی ستائش کرتا ہوں۔ اگر آپ اس جرم میں مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو اختیار ہے۔ یہ واقعہ سن کر رشید کا دل پسیج گیا۔ اسے چھوڑ دیا اور لوگوں کو یحییٰ کا مرثیہ کہنے کی اجازت دے دی۔

جود و سخا میں مسابقت بیان کیا جاتا ہے کہ ہارون نے یحییٰ بن خالد بن برمک کے ساتھ

حج کیا تو یحییٰ کے دونوں فرزند جعفر اور فضل بھی تھے۔ جب یہ سب لوگ مدینہ پہنچے تو رشید اور یحییٰ ساتھ بیٹھے اور لوگوں کو عطیے دینے شروع کیے۔ دوسری طرف امین اور فضل بن یحییٰ بیٹھے۔ اور انھوں نے بھی عطیات دینے شروع کیے۔ تیسری طرف مامون اور جعفر بن یحییٰ بیٹھے اور انھوں نے بھی عطیات دینے شروع کیے یعنی اس سال لوگوں کو تین تین عطیے ملے۔ اور یہ سال اپنی فراوانی میں ضرب المثل بن گیا۔ اس سال کا نام ہی لوگوں نے تین عطیات کا سال رکھ دیا۔ اور لوگ اس کی وجہ سے خوشحال بن گئے۔

یحییٰ جب سواری پر نکلتا تو بہت سی تھیلیاں اپنے ساتھ رکھتا۔ ہر تھیلی میں دو سو درہم ہوتے پھر جو سامنے آتا اسے دے دیتا۔

فضل بن یحییٰ: کردار اور شخصیت

فضل دنیا کے سخی ترین لوگوں میں تھا۔ اپنے زمانے کا سب سے بڑا داتا تھا۔ اسے ہارون رشید کی والدہ نے دودھ پلایا تھا۔ اور اس کی ماں نے ہارون کو دودھ پلایا تھا۔

اسحٰق بن ابراہیم موصلی کی کہانی

اسحٰق بن ابراہیم موصلی اپنا ایک واقعہ یوں بیان کرتا ہے میں نے ایک بڑی خوبصورت کنیز کی پرورش و تربیت کی اور اسے تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا۔ اور فضل بن یحییٰ کو بطور تحفہ پیش کیا۔ یحییٰ نے کہا کہ اسحاق گورنر مصر کا ایلچی آیا ہوا ہے اور مجھ سے کہتا ہے کہ کوئی خدمت ہو تو فرمائیے ! میں اس سے اس کنیز کی خواہش ظاہر کروں گا۔ تم اس کنیز کو اپنے پاس رکھو۔ وہ تمھارے پاس جلد ہی پہنچے گا اور تم سے مول تول کرے گا۔ تو تم پچاس ہزار دینار سے کم نہ لینا۔ میں اس کنیز کو گھر لے کر آگیا۔ گورنر مصر کے ایلچی نے میرے پاس پہنچ کر اس کنیز کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے اسے کنیز دکھائی۔ اس نے دس ہزار دینار پیش کیے۔ میں نے انکار کر دیا۔ پھر بیس ہزار دینار دام لگائے۔ میں نے پھر بھی منظور نہیں کیا۔ آخر وہ تیس ہزار دینار تک پہنچا۔ تیس ہزار دینار سن کر میں اپنے دل پر قابو نہ پا سکا اور میں نے سودا کر لیا۔ اور رقم لے کر کنیز اس کے حوالے کر دی۔ دوسرے دن میں فضل بن یحییٰ کے پاس پہنچا تو اس نے پوچھا کہ اسحاق! تم نے کتنی رقم میں اس کنیز کو فروخت کیا۔ میں نے کہا تیس ہزار دینار میں۔ اس نے کہا کہ میں نے تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ پچاس ہزار دینار سے کم

میں مت دینا۔ میں نے عرض کیا کہ آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں۔ بات یہ ہے کہ تیس ہزار دینار سن کر میرے منہ میں پانی آگیا۔ اور میں اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ یحییٰ ہنس پڑا۔ پھر کہا کہ میرے پاس روم کے گورنر کا ایلچی آیا ہوا ہے اس نے بھی مجھ سے کسی قسم کی خدمت کی درخواست کی ہے یہ لو اپنی کنیز اور گھر جاؤ۔ اگر وہ (رومی ایلچی) تم سے دام چکائے تو پچاس ہزار سے کم پر راضی نہ ہونا۔ میں اس کنیز کو لے کر گھر چلا آیا۔ اس کے بعد رومی گورنر کا ایلچی میرے پاس آیا اور کنیز کے دام دریافت کیے۔ میں نے پچاس ہزار دینار بتایا۔ اس نے کہا یہ تو بہت ہے۔ بس تم تیس ہزار لے لو۔ تیس ہزار سن کر میرا دل قابو میں نہ رہا۔ اور میں نے سودا کر لیا اور رقم اپنے قبضے میں لے کر کنیز اس کے حوالے کر دی۔ دوسرے دن فضل بن یحییٰ کے پاس پہنچا تو اس نے پوچھا اسحٰق کتنے میں کنیز فروخت کی؟ میں نے کہا تیس ہزار دینار میں۔ اس نے کہا کیا میں نے تاکید نہیں کی تھی کہ اسے پچاس ہزار سے کم میں مت دینا۔ میں نے کہا میں قربان ہوں۔ بخدا جب میں نے اس کی زبان سے تیس ہزار کا لفظ سنا تو میرے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ یحییٰ ہنس پڑا اور کہا کہ یہ لو اپنی کنیز اسے اپنے گھر لے جاؤ۔ کل تمھارے پاس خراسان کے گورنر کا ایلچی آئے گا۔ اس وقت اپنے دل کو مضبوط رکھنا اور پچاس ہزار سے کم نہ لینا۔ میں (اسحٰق) کنیز کو لے کر گھر واپس آگیا۔ خراسانی ایلچی میرے گھر آیا اور اس نے مول تول شروع کیا۔ میں نے پچاس ہزار کا مطالبہ کیا۔ اس نے کہا کہ یہ تو بہت ہے۔ بس تیس ہزار لے لو۔ میں نے اب دل کو کڑا کر کے انکار کیا تو وہ چالیس ہزار تک پہنچا۔ بس مارے خوشی کے میرے حواس جاتے رہے اور اس کے سوا کچھ نہ کہہ سکا کہ منظور ہے وہ رقم لے کر آیا۔ اس نے رقم میرے حوالہ کی اور میں نے کنیز اس کے حوالے کی۔ دوسرے دن فضل بن یحییٰ کے پاس گیا تو اس نے پوچھا کہ اسحٰق کتنے میں کنیز فروخت کی؟ میں نے عرض کیا چالیس ہزار دینار میں۔ جب میں نے چالیس ہزار کا لفظ سنا تو میرے ہوش جاتے رہے۔ میں صدقے ہوں اب تو میرے پاس پورے ایک لاکھ دینار ہو گئے۔ اور اب مجھے کچھ مزید کی امید نہیں۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔ یحییٰ نے اشارہ کیا اور وہ کنیز باہر بلائی گئی۔ یحییٰ نے کہا۔ اسحاق اپنی کنیز لو اور گھر جاؤ۔

میں نے اپنے دل میں کہا کہ خدا کی قسم یہ کنیز میرے لیے سب سے زیادہ بابرکت ثابت ہوئی

اس لیے میں نے آزاد کر کے خود نکاح کر لیا۔

شریف پروری کا حیرت انگیز واقعہ

بیان کیا جاتا ہے کہ محمد بن ابراہیم الامام (بن محمد بن علی بن عباس) ایک دن فضل بن یحییٰ کے پاس آئے اس وقت ان کے پاس ایک ڈبیہ تھی جس میں ایک قیمتی پتھر تھا۔ انھوں نے یحییٰ سے کہا کہ میری آمدنی میری ضروریات سے بہت کم ہے اور مجھ پر دس لاکھ کا قرضہ ہے۔ کسی سے ذکر کرتے مجھے شرم آتی ہے اور یہ بھی غیرت گوارا نہیں کرتی کہ میں کسی تاجر سے قرض لوں البتہ میرے پاس ایک ایسی چیز ہے جسے پورے دس لاکھ میں رہن رکھا جا سکتا ہے۔ خدا آپ کو سلامت رکھے۔ بہت سے تاجر ایسے ہیں جن سے آپ کا واسطہ رہتا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ اتنی رقم آپ مجھے کسی تاجر سے قرض دلا دیں اور یہ چیز (قیمتی پتھر) اس کے پاس رہن رکھوا دیں۔ فضل نے کہا بسر و چشم مجھے منظور ہے لیکن اس ضرورت کی تکمیل کے لیے آپ کو ایک دن میرے پاس ٹھہرنا ہوگا۔ محمد بن ابراہیم ٹھہر گئے۔ فضل نے وہ ڈبیہ ان سے لے لی۔ اس پر مہر لگی ہوئی تھی۔ اس کے بعد دس لاکھ درہم اس ڈبیہ کے ساتھ ان کے گھر بھجوا دیے۔ اور گھر کے ایک ذمہ دار شخص سے اس کی رسید لے لی گئی۔ محمد بن ابراہیم شام تک فضل ہی کے ہاں مقیم رہے۔ جب گھر واپس گئے تو دیکھا کہ دس لاکھ درہم اور وہ ڈبیہ موجود ہے۔ وہ بہت ہی خوش ہوئے۔ دوسرے دن علی الصبح وہ فضل کا شکریہ ادا کرنے گئے۔ تو معلوم ہوا کہ وہ رشید کے پاس گیا ہوا ہے۔ یہ وہاں گئے۔ فضل کو ان کی آمد کی اطلاع ہوئی تو وہ دوسرے دروازہ سے نکل کر اپنے والد (یحییٰ) کے گھر پہنچ گیا۔ اب محمد وہاں پہنچے تو فضل سے ملاقات ہو گئی۔ محمد نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ میں صبح ہی آپ کے احسان کا شکریہ ادا کرنے حاضر ہوا تھا۔ فضل نے کہا۔ میں نے آپ کے معاملے میں غور کیا تو معلوم ہوا کہ میں نے جو دس لاکھ درہم آپ کے ہاں کل بھجوائے ہیں وہ تو قرض میں چلے جائیں گے۔ اس کے بعد پھر آپ کو ضرورت ہوگی۔ اور آپ قرض لیں گے اور اتنا ہی قرضہ اور ہو جائے گا۔ لہٰذا میں امیر المومنین کی خدمت میں صبح حاضر ہو گیا اور آپ کا معاملہ پیش کر کے میں نے ان سے ایک کروڑ درہم آپ کے لیے حاصل کر لیے۔ پھر جب آپ

یہاں میرے پاس آئے تو میں دوسرے دروازے سے نکل کر اپنے والد (یحییٰ) کے ہاں پہنچا۔ پھر جب آپ وہاں آئے تو میں وہاں سے بھی دوسرے راستے سے باہر چلا گیا۔ کیونکہ میں اس وقت تک آپ سے ملنا نہیں چاہتا تھا جب تک یہ ساری رقم آپ کے پاس نہ پہنچ جائے۔ اب بحمداللہ وہ رقم آپ کے ہاں پہنچ گئی ہے۔

جعفر برمکی کے اقتدار وادبار کی داستان جعفر بن یحییٰ بڑا فصیح، عاقل، ذکی فطین شریف اور حلیم تھا۔ ہارون رشید کو بہ نسبت فضل کے اس سے زیادہ دلچسپی تھی۔ کیونکہ جعفر نرم مزاج اور فضل سخت مزاج تھا۔

برامکہ کے آثارِ زوال شاہی طبیب بختیشوع کا بیان ہے کہ ایک دن میں رشید کے پاس گیا۔ اس وقت وہ اپنے قصرِ خلد میں بیٹھا تھا۔ برامکہ اس کے سامنے دوسری جانب آباد تھے۔ دونوں کے درمیان دجلہ کی چوڑائی حائل تھی۔ رشید نے یحییٰ بن خالد کے دروازے پر گھوڑوں کی آمد و رفت اور لوگوں کا ہجوم دیکھا تو کہنے لگا۔ یحییٰ کو اللہ جزائے خیر دے جو تمام امورِ مملکت میں منہمک ہے۔ اور مجھے پریشانی سے بچا کر میرے اوقات کو خوش باشی کے لیے چھوڑ دیا ہے۔

اس کے بعد پھر میں ایک دن رشید کے پاس گیا تو رشید کے خیالات برمکیوں کے بارے میں بدلنے لگے تھے۔ اس دن بھی اس نے گھوڑوں اور سواروں کو اسی طرح دیکھا جس طرح پہلے دیکھا تھا۔ اس وقت رشید نے کہا۔ سارے معاملات پر تو میری بجائے یحییٰ کا قبضہ ہو گیا، گویا خلافت حقیقت میں وہ کر رہا ہے۔ اور میں محض نام کا خلیفہ رہ گیا ہوں۔

بس اسی وقت میں سمجھ گیا کہ برامکہ کی شامت آنے والی ہے۔ اس کے بعد ہی اس نے اس کو ختم کر دیا۔

زوالِ برامکہ کے اسباب پر ایک نظر اصحاب سیر و تاریخ والوں کا زوالِ برامکہ کے اسباب میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ نہ رشید کو اپنی بہن عباسہ کے بغیر چین آتا تھا نہ جعفر بن یحییٰ کے بغیر۔ اس لیے

رشید نے کہا میں تمہارا عباسہ سے نکاح کر دوں تاکہ تمہارے لئے اس کا دیکھنا جائز ہو جائے مگر اس سے جنسی تعلق قائم نہ کرو۔ یہ دونوں جوان تھے اور جب یکجا ہوتے تو رشید وہاں سے ان دونوں کو تنہائی میں چھوڑ کر اٹھ جاتا۔ آخر ایک دن جعفر نے عباسہ سے جنسی تعلق قائم کر ہی لیا۔ عباسہ حاملہ ہو گئی اس طرح اس کے دو بچے تولد ہوئے مگر اسے پوشیدہ رکھا۔ آخر رشید کو علم ہو گیا۔ گویا یہ سبب ہوا برامکہ کی بربادی کا۔

بربادی کا ایک سبب یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ رشید نے جعفر کو مجبور کیا کہ خاندانِ ابی طالب کے فلاں شخص کو قتل کرا دو۔ جعفر نے مناسب نہ سمجھا اور اس طالبی کو رہا کرا دیا۔ جعفر کی شکایت رشید تک پہنچائی گئی۔ رشید نے اس سے پوچھا کہ اس طالبی کا کیا ہوا؟ وہ قید میں ہے۔ رشید نے کہا میری جان کی قسم! جعفر سمجھ گیا اور بولا نہیں، آپ کی جان کی قسم میں نے تو اسے چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ مجھے علم تھا کہ اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ رشید بولا: خیر تم نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا۔ لیکن جب جعفر وہاں سے اٹھ کر چلا گیا تو رشید نے کہا۔ اگر میں تجھے (جعفر کو) قتل نہ کر دوں تو خدا مجھے ہلاک کرے۔ اس کے بعد اس نے برمکیوں کا خاتمہ کر دیا۔

جعفر برمکی کا قتل۔ برمکی خاندان کی بربادی

رشید حج کر کے جب لوٹا تو حیرہ سے انبار کی طرف کشتی پر گیا۔ وہاں کبھی شراب و کباب میں مست ہوتا اور کبھی لہو و لعب میں۔ اس کے پاس تحفے اور ہدیے آرہے تھے۔ شاہی طبیب بختیشوع بھی پاس بیٹھا تھا۔ اور ابوزکار (نابینا) گا رہا تھا۔ جب شام ہو گئی تو رشید نے اپنے خادم "مسرور" کو جو جعفر بن یحییٰ کا سخت دشمن تھا۔ بلایا اور کہا کہ جاؤ اور جا کر جعفر کا سر لے آؤ۔ اور مجھ سے اس بارے میں کوئی حیل و حجت نہ کرو۔ مسرور بلا اجازت جعفر کے ہاں اچانک گھس گیا۔

جب مسرور داخل ہوا تو جعفر نے کہا۔ تمہارے آنے کی تو خوشی ہوئی لیکن بلا اجازت اندر آنے سے تکلیف ہوئی۔ اس نے کہا جس مقصد کے لیے آیا ہوں وہ اس سے عظیم تر ہے۔ امیر المومنین تمہارے ساتھ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں اس کے آگے گردن جھکا دو۔ کہتے

لگا کہ امیرالمومنین کے پاس واپس جاؤ وہ اس وقت نشے میں ہیں اس لیے یہ حکم (قتل کا) دیا ہے اور کم سے کم مجھے گھر کے اندر تو جانے دو تاکہ میں وصیت کر جاؤں۔ اس نے کہا گھر کے اندر تو تم جا نہیں سکتے البتہ وصیت جو چاہو کر لو۔ جعفر نے وصیت کر لی تو مسرور اسے لے کر رشید کے پاس آیا اور وہاں سے ایک خیمے میں لے جا کر گردن مار دی۔ اس کے بعد ایک ڈھال میں اس کا سر رشید کے پاس لایا۔ رشید نے پھر دوسرا حکم دیا اور جعفر کے باپ بھائیوں، گھر والوں اور ساتھیوں کو گرفتار کر کے "رقہ" میں قید کر دیا گیا۔ اور ان کی جڑیں کھوکھلی کر دی گئیں۔

برمکیوں کے بعد رشید نے فضل بن ربیع کو وزیر بنایا۔ جو پہلے اس کا حاجب (دربان) تھا۔ یہ فضل منصور، ہادی اور مہدی اور رشید کا حاجب رہ چکا تھا

ہارون رشید کا نیا وزیر جب برمکیوں کی جڑ کٹ گئی تو رشید نے اسے وزیر بنا دیا۔

فضل بن ربیع بڑا چست تھا اور شاہی آداب و احوال سے خوب باخبر تھا جب وزارت ملی تو اسے ادب سے بھی شوق پیدا ہو گیا اور اس نے اپنے گرد اہل علم کو جمع کر لیا اور ان سے تھوڑی مدت میں بہت کچھ حاصل کر لیا۔

فضل ابن ربیع کی وزارت برابر قائم رہی تا آنکہ رشید نے طوس میں وفات پائی۔

شہزادہ امین کی ولایتِ عہد ہارون الرشید کا بیٹا مامون الرشید، ہارون رشید کی تخت نشینی کے وقت ۱۷۰ھ میں پیدا ہوا مگر مامون الرشید مراجل نامی ام ولد کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا جو مجوسی النسل تھی۔ اسی سال میں اس کا دوسرا بیٹا محمد امین اس کی بیوی زبیدہ خاتون بنت جعفر بن منصور بن محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ امین کا اتالیق فضل بن یحییٰ بن خالد برمک تھا۔ اور مامون کا اتالیق جعفر بن یحییٰ بن خالد برمک تھا۔ فضل کی خواہش یہ تھی کہ ہارون رشید اپنے بیٹے امین کو اپنا ولی عہد بنائے اور جعفر اس کوشش میں تھا کہ مامون ولیعہد ہو۔ چونکہ امین ہاشمیہ کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا نیز فضل کے ساتھ زبیدہ خاتون کی کوششیں بھی شامل تھیں جو ہارون رشید کی بڑی چہیتی بیوی تھی لہٰذا ۱۷۵ھ میں جب کہ امین کی عمر صرف پانچ برس کی تھی ہارون الرشید نے لوگوں سے امین کی ولیعہدی کی بیعت لی۔

اسی ۱۷۵ھ میں ہارون الرشید نے عباس بن جعفر بن محمد بن اشعث کو خراسان کی گورنری سے معزول کر کے خالد بن عطا کندی کو مامور فرمایا۔

مامون ولی عہد دوم

ہارون نے ۱۸۲ھ میں اپنے بیٹے مامون بن مراجل کو جب کہ اس کی عمر بارہ سال کی تھی امین کے بعد ولی عہد بنایا یعنی لوگوں سے اس بات کی بیعت لی کہ امین کے بعد مامون تخت خلافت کا مالک ہوگا۔ مامون کا اصل نام عبداللہ اور امین کا اصل نام محمد تھا۔ جب محمد کو ۱۷۵ھ میں ولی عہد بنایا تھا تو اس کو امین کا خطاب دیا تھا اور اب جب عبداللہ کو ولی عہد دوم مقرر کیا تو اس کو مامون کا خطاب دیا اور خراسان نیز اس کے ملحقہ علاقہ یعنی ہمدان تک کی سند گورنری مامون کو عطا کر کے عیسیٰ بن علی گورنر خراسان کو طلب کیا جب وہ آگیا تو مامون کی طرف سے اس کو خراسان کی حکومت کی سند دے کر خراسان کی جانب واپس کر دیا۔ اسی سال یعنی ۲۷ رجب ۱۸۲ھ کو امام ابو یوسف نے جن کا نام یعقوب تھا اور امام ابوحنیفہ کے شاگرد اور بغداد کے قاضی القضاۃ تھے وفات پائی۔

امام موسیٰ کاظمؒ کا انتقال

امام موسیٰ کاظم ابن امام جعفر صادق علیہ السلام کو ہاروں رشید نے احتیاطاً بغداد ہی میں قیام رکھنے پر مجبور کیا تھا اور علویوں کے خروج سے خائف ہو کر ان کو بغداد سے نکلنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ اسی سال یعنی ۲۵ ماہ رجب روز جمعہ ۱۸۳ھ کو امام موسیٰ کاظم فوت ہو کر بغداد میں مدفون ہوئے۔ یہ شیعوں کے ساتویں امام مانے جاتے ہیں۔ ان کی اور امام محمد تقی کی قبر ایک گنبد کے نیچے بغداد میں موجود ہیں جو کاظمین کے نام سے مشہور ہے۔

موتمن ولی عہد سوم

۱۸۶ھ میں خلیفہ ہارون الرشید نے اپنے تیسرے بیٹے قاسم کو بھی ولی عہد بنایا۔ یعنی لوگوں سے اس بات کی بیعت لی کہ مامون کے بعد قاسم تخت خلافت کا وارث ہوگا۔ اسی موقع پر قاسم کو موتمن کا خطاب دیا۔ لیکن موتمن کو ولی عہد سوم بناتے ہوئے بیعت میں یہ شرط رکھ دی کہ اگر موتمن لائق ہو تو مامون کا جانشین بنے گا ورنہ مامون کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ اس کو معزول کر کے کسی دوسرے کو اپنا ولیعہد بنائے ولی عہد اوّل یعنی امین کو عراق، شام اور عرب ملکوں کی حکومت سپرد کی۔ مامون کو ممالک مشرقیہ

دیے تھے۔ موتمن کو جزیرہ، ثغور اور عواصم کے صوبوں کی حکومت عطا کی۔ پھر امین، مامون سے ایک ایک عہد نامہ لکھایا جس کا مضمون یہ تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے بلطائف عہد کریں گے ان عہدناموں پر اکابر علماء، مشاہیر، مشائخ، سرداران مملکت ارکین سلطنت، بزرگان مدینہ اور بزرگانِ مکہ کے دستخط کراکر خانۂ کعبہ میں آویزاں کر دیا۔ جو جو ملک جس جس بیٹے کو دیا تھا اسی پر ان کو قناعت کرنے اور کسی دوسرے بھائی کا ملک نہ لینے کا بھی اقرار لیا تھا۔ صرف خلافت میں ترتیب رکھی تھی۔ یعنی اوّل امین خلیفۃ المسلمین ہوگا اور مامون اس کی فرماں برداری کا اقرار کرے گا لیکن امین کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ وہ مامون کو ان ملکوں کی حکومت سے معزول کر سکے جن کو ہارون نے مامون کی حکومت کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔ امین کے بعد مامون خلیفہ ہوگا۔ یہ سب کچھ اسی عہد نامہ میں تصریح تھی جس پر امین و مامون وغیرہ سب کے دستخط و اقرار تھے اور جو خانۂ کعبہ میں آویزاں کیا گیا تھا۔ اس طرح ہارون الرشید نے اپنی سلطنت کو اپنے بیٹوں میں تقسیم کر کے آئندہ کے لیے ان میں لڑائی جھگڑے کے پیدا ہونے کا امکان مٹانا چاہا تھا لیکن یہ ہارون الرشید کی کوئی عاقلانہ حرکت نہ تھی۔ غالباً محبت پدری نے اس کو ایک ایسی حرکت اور ایسے کام پر آمادہ کر دیا جس کو کسی طرح بھی کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہو سکتا تھا۔

ہارون کے آخری ایام۔ وفات

رومیوں کی سرکوبی سے فارغ ہو کر اور نقفور کو مغلوب و ذلیل کر کے اور اس سے جزیہ کی رقم وصول کرنے کے بعد خلیفہ ہارون الرشید رقہ میں واپس آیا۔ یہاں آ کر اس کو رافع بن لیث کی چیرہ دستی اور بعض امرائے خراسان کی سرکشی کا حال معلوم ہوا۔ اس نے خود خراسان کا قصد کیا اور لشکر فراہم کر کے ماہ شعبان ۱۹۲ھ میں رقہ سے بغداد پھر خراسان سے بغداد کی جانب روانہ ہوا۔ ہارون نے روانگی کے وقت رقہ میں موتمن کو نائب السلطنت بنا کر خزیمہ بن خازم کو اس کے پاس چھوڑا۔ بغداد میں اپنے بیٹے امین کو اپنا قائم مقام بنا کر مامون کو بھی بغداد میں امین کے پاس رہنے کا حکم دیا۔ مامون کے کاتب فضل بن سہیل نے مامون سے کہا کہ آپ کا دار الخلافہ بغداد میں امین کے پاس رہنا مناسب نہیں ہے۔ آپ خلیفہ کے ہمراہ چلنے کی کوشش کریں مامون نے خلیفہ ہارون رشید سے ہم سفر و ہم رکاب رہنے کی التجا کی اور خلیفہ نے اس خواہش

کو منظور کر لیا۔ ہارون رشید بغداد روانہ ہونے کو تھا کہ رقہ میں فضل بن یحییٰ برمکی محرم ۱۹۳ھ کو بحالت قید فوت ہوا۔ بغداد سے روانہ ہو کر ماہ صفر ۱۹۳ھ میں خلیفہ جرجان میں پہنچا۔ جرجان میں پہنچ کر خلیفہ کی بیماری نے خطرناک صورت اختیار کی۔ ہارون جس زمانے میں بلادِ روم کے اندر مصروفِ قلعہ شکنی تھا۔ اسی زمانے میں بیمار ہو گیا تھا۔ رقہ میں بیمار ہی پہنچا تھا۔ وہاں سے بغداد آیا تب بھی علیل تھا۔ اور اسی حالتِ علالت میں فوج لے کر خراسان روانہ ہوا تھا۔ خلیفہ نے جرجان میں تمام سرداران لشکر کے روبرو یہ اعلان کیا کہ میرے ساتھ اس وقت جس قدر فوج اور سامان ہے یہ سب ملکِ خراسان اور مامون سے متعلق رہے گا۔ اور یہ تمام سردار اور سپہ سالار بھی مامون ہی کے تابع رہیں گے اس طرح مامون کا اطمینان کر کے جرجان سے مامون کو خراسان اور مرو کی طرف بھیج دیا اور اس کے ساتھ عبد اللہ بن مالک۔ یحییٰ بن معاذ۔ اسد بن خزیمہ عباس بن جعفر بن محمد بن اشعث اور نعیم بن حازم وغیرہ سرداران کو بھیجا۔ مامون کو مرو کی جانب روانہ کرنے کے بعد خود جرجان سے روانہ ہو کر طوس چلا گیا۔ اس وقت اس کے ساتھ فضل بن ربیع۔ اسمٰعیل بن صبیح۔ مسرور حاجب۔ حسین۔ جبرئیل بن بختیشوع وغیرہ موجود تھے۔ طوس پہنچ کر علالت نے یہاں تک ترقی کی کہ ہارون رشید صاحب فراش ہو کر بے ہوش ہو گیا۔ جب اس کو ہوش آیا تو جس مکان میں ٹھہرا ہوا تھا اسی مکان کے ایک گوشے میں قبر کھودنے کا حکم دیا۔ جب قبر کھد کر تیار ہو گئی تو چند حافظوں نے قبر میں اتر کر ختم قرآن کیا۔ ہارون نے اپنی چارپائی قبر کے کنارے بچھوائی اور چارپائی پر پڑے پڑے قبر کو دیکھتا رہا۔ اسی حالت میں ۳۔ جمادی الثانی ۱۹۳ھ مطابق ۲۴۔ مارچ ۸۰۹ء بوقتِ شب انتقال کیا۔ اس کے بیٹے صالح نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ ۲۳ سال ۲½ مہینے ہارون رشید نے خلافت کی۔ طوس میں اس کی قبر موجود ہے۔

ہارون کا چھٹا لڑکا۔ معتصم ہارون رشید کا نکاح زبیدہ بنتِ جعفر بن منصور سے ہوا تھا زبیدہ کی کنیت ام جعفر تھی۔ محمد امین اسی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ علی۔ عبد اللہ۔ مامون۔ قاسم۔ مؤتمن۔ محمد معتصم۔ صالح۔

محمد ابو موسیٰ، محمد ابو یعقوب، ابو العباس، ابو سلیمان، ابو علی، ابو احمد یہ سب بیٹے امہات اولاد سے پیدا ہوئے تھے۔ ہارون رشید کے ان لڑکوں میں۔ امین۔ مامون۔ موتمن اور معتصم چار زیادہ مشہور ہیں۔ معتصم پڑھا لکھا نہ تھا اسی لیے ہارون نے اسے ولی عہدی کے قابل نہ سمجھا۔ مگر وہ خلیفہ ہوا اور اس کی اولاد سے بہت سے عباسی خلیفہ ہوئے اور اسی سے ہارون رشید کی نسل چلی۔ ہارون رشید نے مرتے وقت جس طرح بہت سے بیٹے چھوڑے اسی طرح بیٹیاں بھی بہت سی تھیں جو سب کنیزوں کے پیٹ سے پیدا ہوئی تھیں۔

ہارون رشید کو خاندان عباسیہ میں آفتاب خاندان سمجھنا چاہیے۔ اس کے زمانے میں خلافتِ عباسیہ نہایت مضبوط ہو کر اپنی معراجِ کمال کو پہنچ گئی۔ ہارون رشید کے عہدِ خلافت میں آل ابی طالب اور دوسرے گروہوں کی ہمتیں پست ہو چکی تھیں۔ اس کو علم و فضل کا بے حد شوق تھا۔ پابندئ مذہب کا بہت خیال تھا۔ زندیقوں کے فتنے کا اس کے عہد میں بہ کلی استیصال ہو چکا تھا۔ روم و یونان کی عظیم الشان عیسائی سلطنت اس کی خراجگذار تھیں۔ ہارون رشید نے مرتے وقت خزانہ میں نو کروڑ دینار چھوڑے تھے اندلس و مراقش کے علاوہ تمام عالمِ اسلام کا فرماں روا تھا منصور ہی کے زمانے سے تصنیف و تالیف کا کام شروع ہو چکا تھا۔ ہارون رشید کے زمانے میں یہودی اور عیسائی علماء کی بھی قدر دانی دربارِ بغداد میں ہوتی تھی۔ عیسائیوں کو ہارون نے فوجی سرداریاں بھی عطا کیں، اور اپنی مصاحبت میں بھی جگہ دی اس کے زمانے میں ہندوستان کے علماء بھی گورنر سندھ کی معرفت اور براہ راست خود بھی بغداد میں پہنچے اور وہاں ان کی قدر و منزلت ہوئی۔ عبرانی زبان کی کتابوں کے ترجمے ہوئے۔ مختلف علوم و فنون کی کتابوں کی تدوین کا سلسلہ جاری ہوا۔ بغداد میں راحت و آسائش اور دولت و اطمینان لوگوں کو خوب حاصل تھا۔ اس لیے شاعری اور موسیقی کا چلن بھی بغداد میں خوب تھا۔

ہارون رشید بہادر اور سپاہی منش انسان تھا۔ وہ بڑی خوش دلی اور مسرت کے ساتھ گھوڑے کی زین پر بیٹھے اور برس صرف کر دیتا تھا۔ لیکن جب صوفیوں کی مجلس میں بیٹھتا تو ایک

تارک الدنیا صوفی درویش نظر آتا تھا۔ جب فقہا کی مجلس میں ہوتا تھا تو وہ اعلیٰ درجے کا فقیہ اور جب محدثین کی مجلس میں ہوتا تھا تو اعلیٰ درجے کا محدث ثابت ہوتا تھا۔ صرف زندیقوں یعنی لامذہبوں کا وہ دشمن تھا۔ باقی غیر مذہب والوں کے ساتھ اس کا برتاؤ مدارات و مروت کا تھا۔ حج، جہاد اور خیرات تین چیزوں کا اس کو بہت شوق تھا۔ وہ حد درجہ رقیق القلب بھی تھا۔ جب کوئی شخص اس کو نصیحت کرتا، دوزخ سے ڈراتا تو وہ زار و قطار رونے لگتا تھا۔

ہارون رشید چوگان کھیلتا اور تیر و کمان سے نشانہ بازی کرتا تھا

ہارون کا سببِ مرگ ہارون الرشید کی عمر وفات کے وقت ۴۵ سال کے قریب تھی۔ اس کے علاج میں حکیم جبرئیل بن بختیشوع سے غلطی ہوئی اس لیے مرض ترقی کر کے اس کی وفات کا باعث ہوا۔ یہ حکیم ہارون الرشید کے ہمراہیوں میں اس کے بیٹے امین کا طرفدار تھا۔ اور اس کا حاجب مسرور مامون کا ہوا خواہ تھا۔ جب کہ ہارون الرشید سفر ہی میں تھا اور اس کی علالت ترقی کر رہی تھی۔ تو بغداد سے اس کے بیٹے امین نے بکر بن المعتمر کی معرفت بعض خطوط ہارون الرشید کے ہمراہیوں کے نام لکھ کر بھیجے تھے جن میں ہارون الرشید کو فوت شدہ تصوّر کر کے اپنی بیعت کے لیے لکھا تھا۔ ایک خط امین نے اپنے بھائی صالح کے نام لکھا تھا کہ لشکر و اسباب اور خزانہ لے کر فضل بن ربیع کے مشورے سے فوراً میرے پاس چلے آؤ۔ اس مضمون کے خطوط اس نے ہارون الرشید کے دوسرے ہمراہیوں کو بھی لکھے تھے۔ اسی مضمون کا ایک خط فضل بن ربیع کے نام تھا۔ انہیں خطوط میں اس نے تمام سرداروں کو ان کے عہدوں پر قائم رکھنے کے لیے بھی وعدہ کیا تھا۔ بکر بن المعتمر کے آنے کی اطلاع اتفاقاً ہارون کو ہو گئی۔ اس نے بکر کو اپنے سامنے بلایا اور آنے کا سبب دریافت کیا۔ اس نے کوئی معقول جواب نہ دیا تو ہارون نے اس کو قید کر دیا۔ اس واقعے کے بعد ہی ہارون رشید کا انتقال ہو گیا۔ فضل بن ربیع نے بکر کو جیل خانے سے نکلوایا۔ اس نے امین کے وہ خطوط دیے۔ ان خطوط کو پڑھ کر سرداروں سے مشورہ کیا۔ چونکہ سب اپنے وطن بغداد کی طرف جانے کے آرزومند تھے فضل بن ربیع سب کو بغداد کی طرف لے کر روانہ ہو گیا اور ہارون نے جو وصیت کی تھی اور مامون سے جو ان کے عہد و میثاق تھے سب

خلیفہ امین الرّشید

آویزشِ عرب و عجم کا افسوسناک انجام

امین کی خصوصیت اور شخصیت

یہ ہارون الرشید کا لختِ جگر تھا!
عرب باپ اور عرب ماں کا فرزند دلبند!
بنو ہاشم کا گلِ سر سبد، عمِ رسول عباس بن عبد المطلب کے خاندان کا مایۂ فخر و ناز!
یہ زبیدہ کے بطن سے پیدا ہوا تھا جس سے ہارون والہانہ محبت کرتا تھا۔
حسب و نسب کے اعتبار سے نسل اور خاندان کے اعتبار سے، خون اور ہڈی کے اعتبار سے والا دودمان اور فخر خاندان تھا۔
زبیدہ کی خواہش تھی یہ ہارون کا جانشین ہو، ہارون کی تمنّا تھی یہ اس کا نام روشن کرے اس کے کارناموں کو اپنے کارناموں سے ماند کر دے۔
زبیدہ کی خواہش پوری ہو گئی۔ امین ولیعہد سلطنت نامزد کر دیا گیا۔
لیکن ہارون کی آرزو پوری نہ ہو سکی، اس لیے کہ اس کا یہ فرزند دل بند اپنے بھائی کے ہاتھوں خاک و خون میں لتھڑا اور ناکامی کا داغ لے کر اس دُنیا سے رخصت ہو گیا۔
کس کر و فر کے ساتھ امین نے تختِ خلافت پر قدم رکھا تھا۔ اور اس بے بسی کے

۱۔ ۱۹۳ھ تا ۱۹۸ھ (۸۰۹ء تا ۸۱۳ء)

ساتھ تختِ شاہی سے وہ گوشۂ قبر میں دھکیل دیا گیا۔

اس دُنیا میں سدا سے یہی ہوتا آیا ہے۔ اور ہمیشہ یہی ہوتا رہے گا۔ رہے نام اللہ کا!

صفات و شمائل

سیوطی نے امین کے صفات و شمائل کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:
امین خوبصورت جوان تھا، اس کا رنگ سُرخ و سفید تھا۔ وہ سیدھا دراز قد، زور آور اور یکتا بہادر تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ سے شیر بھی مارا۔ اگرچہ فصیح و بلیغ، صاحب علم و ادب اور عالم و فاضل تھا، لیکن کوتاہ اندیش، فضول خرچ، ضعیف الرائے تھا۔ غلط سلط کام کیا کرتا تھا اور خلافت کی اہلیت نہ رکھتا تھا۔ اس نے ۱۹۳ھ میں خلیفہ ہونے کے بعد دوسرے ہی دن قصر منصور کے برابر چوگان کھیلنے کا میدان بنانے کا حکم دیا۔

امین اور مامون کے مابین تلخی اور بدمزگی

۱۹۴ھ میں امین نے اپنے بھائی قاسم ملقب بہ مامون کو جسے اس کے والد ہارون الرشید نے ولی عہد دوم بنایا تھا معزول کر دیا۔ اسی وجہ سے ان دونوں بھائیوں میں رنجش اور کشیدگی پیدا ہو گئی۔ بعض کہتے ہیں فضل بن ربیع نے خیال کیا مامون کے زمانے میں میری یہ قدر و منزلت نہیں رہے گی اس لیے امین کو برانگیختہ کر کے مامون کو معزول کرا دیا۔ اور اس کی بجائے امین کے فرزند موسیٰ کو ولیعہد بنوا دیا۔ مامون کو جب یہ اطلاع ملی تو اس نے امین سے خط و کتابت بند کر دی اور امین کا نام اپنے سکّوں اور فرامین سے نکلوا دیا۔

اس کے بعد امین نے مامون کو لکھا کہ موسیٰ کے بعد تم ہی خلیفہ ہو گے۔ میں نے موسیٰ کو تم سے مقدم کر دیا ہے۔ اور موسیٰ کو ناطقِ حق کا لقب دیا ہے۔ لیکن مامون نے اس فرمان کو ٹھکرا دیا اور اپنی ولی عہدی کے ختم نہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ اور فرستادۂ امین پر خوب نوازش کی۔ یہ حالت دیکھ کر فرستادۂ امین نے بھی خفیہ طور پر بیعت کر لی۔ اور اسی ہی کو جائز ولیعہد سلطنت تسلیم کیا۔ غرضیکہ یہ فرستادۂ امین واپس ہو کر امین کے دارالسلطنت سے مامون کو ملکی و شاہی حالات سے باخبر کرتا رہا۔ اور عراق کے بارے میں واقعات لکھتا رہا۔ غرضیکہ امین نے اپنے والد کا عہد نامہ جس میں مامون کی ولیعہدی تحریر تھی اور جو کعبہ میں آویزاں تھا منگوا کر چاک کر دیا۔ اور مامون کو ولیعہدی سے بالکل خارج قرار دے دیا۔ اس وجہ سے مامون

مزید کشیدہ ہو گیا۔

صاحبانِ عقل و شعور نے امین کو سمجھایا نیز حازم بن حزیمہ نے کہا اے امیر المومنین جھوٹ بولنے والے آپ کے ناصح نہیں۔ اور سچے آپ کو دھوکا نہیں دے رہے ہیں۔ آپ ازراہِ کرم مامون کی ولیعہدی کو ممنوع قرار نہ دیجیے۔ ورنہ ممکن ہے کہ لوگ آپ کی خلافت سے بھی انکار نہ کر بیٹھیں۔ آپ عہد شکنی نہ کیجیے۔ ممکن ہے آپ سے بھی عہد شکنی کی جائے اور آپ کی بیعتِ خلافت سے لوگ دست کش ہو جائیں۔ واضح رہے کہ دھوکا دینے والے کینہ پرور ہیں اور عہد شکن کی لوگ امداد نہیں کرتے لیکن امین نے ایک نہ سنی اور لوگوں کو مال و دولت وغیرہ دے کر مزید اپنی طرف مائل کر لیا۔ اور اپنے بیٹے موسیٰ کی ولیعہدی کی لوگوں سے بیعت لے لی اور اس کا لقب ناطق حق مقرر کر دیا۔ اور یہ تمام کارروائی اس وقت کی گئی جب کہ یہ موسیٰ ناطق حق ابھی دودھ پیتا بچہ ہی تھا۔

مامون کی جوابی اور انتقامی کارروائیاں

مامون کو جب یہ یقین ہو گیا کہ امین نے اسے خلافت سے بالکل محروم کر دیا ہے تو اس نے اپنا لقب امام المومنین رکھا اور سرکاری کاغذات میں یہی لکھوانا شروع کیا۔

انہی دنوں ۱۹۵ھ میں امین نے بلادِ جبل، ہمدان، نہاوند، قم اور اصبہان پر علی بن عیسیٰ بن ہامان کو حاکمِ اعلیٰ مقرر کیا۔ (حالانکہ یہ مامون کی جاگیر تھی) اور علی بن عیسیٰ ۱۵ جمادی الثانی ۱۹۵ھ میں چالیس ہزار فوج کے ساتھ مامون پر حملہ آور ہوا۔ مامون نے اطلاع پا کر اس کے مقابلے میں طاہر بن حسین کو چار ہزار فوج کے ساتھ روانہ کیا۔ اور طاہر نے میدانِ جنگ میں فتح پا کر علی بن عیسیٰ کا سر کاٹ کر مامون کے دربار میں پیش کیا جو تمام خراسان میں گشت کرایا گیا۔ اس کے بعد مامون کو خلیفہ تسلیم کر لیا گیا۔ اس واقعے کی جس وقت امین کو اطلاع ہوئی تو وہ مچھلی کا شکار کھیل رہا تھا۔ اس نے اطلاع دینے والے اپنے غلام کوثر سے کہا میں نے اب تک کوئی مچھلی نہیں پکڑی تو ہلاک ہو مجھے دو مچھلیاں تو پکڑنے دیتا۔

باشندگانِ بغداد پر مصائب کا نزول

عبداللہ بن صالح جرمی کا بیان ہے۔ علی بن عیسیٰ کے قتل سے بغدادیوں میں بھی فتنہ وفساد اور اضطراب

پھیل گیا۔ امین کو اپنے اس فعل سے ندامت ہوئی کہ اس نے اپنے بھائی مامون کو خلافت سے محروم کیوں کیا؟ اب امین کو امرائے سلطنت کی لالچ و طمع کا علم ہوا۔ فوج نے اپنی بقایا اور موجودہ تنخواہ کا شدت کے ساتھ امین سے مطالبہ کیا۔ امین و مامون کے درمیان جنگ نے طول پکڑا۔ اور امین کی سلطنت میں زوال آتا رہا کیونکہ یہ لہو و لعب میں مصروف رہا۔ اور نادانی کے کام کرتا رہتا تھا۔ دوسری طرف باشندگانِ حرمین شریفین اور عراقی مملکت کے اکثر لوگوں نے مامون کی بیعت کی۔ امین کے حالات بدتر ہونے لگے۔ فوج میں ابتری پھیل گئی۔ خزانہ خالی ہو گیا اور عوام کی اقتصادی حالت بدتر ہو گئی۔ فتنہ و فساد عام ہو گیا۔ آپس کی جنگ، تیر اندازی اور منجنیق کی گولہ باری سے شہر کے شہر مسمار ہو گئے۔ اور بغداد کی خوبصورتی غائب ہو گئی۔

یہ حالات دیکھ کر لوگوں نے گریہ و زاری کی اور مرثیے لکھے۔ غرضیکہ بغداد جیسے خوبصورت شہر کو خراب و برباد ہوتے ایک عرصہ گزر گیا۔ یہاں تک کہ پندرہ ماہ کے بعد مصائب سے نجات حاصل کرنے کے لیے تمام عباسی و ارکانِ حکومت مامون کی فوج سے مل گئے۔ ۱۹۸ھ میں طاہر بن حسین حاکمِ افواجِ مامون تلوار کے زور پر بغداد میں داخل ہوا۔ جس نے امین کو مع اس کی والدہ و اہل و عیال کے قصرِ شاہی سے نکال دیا۔ اور یہ سب شہر منصورہ چلے گئے۔ جہاں ان کے ساتھ سپاہی اور غلام کوئی نہ تھا۔ اور خورد و نوش کی بھی کمی ہو گئی تھی۔

امین کا دردناک قتل چند روز بعد عجمیوں نے اسے گرفتار کر کے قید کر لیا۔ پھر اس کو زخمی کر کے پچھلی طرف سے اس کا سر قلم کر دیا۔ اور پھر یہ سر طاہر کے سامنے پیش کیا۔ جس نے اسے باغ کی دیوار پر رکھوا کر اعلان کیا لوگو! دیکھو یہ معزول امین کا سر ہے اور اس کا جسم کسی پہاڑ کی کھوہ میں ڈلوا دیا۔ پھر ایک عرصے کے بعد امین کا یہ سر، اس کی چادر اور کھجور کے پتوں کی بنی ہوئی جانماز جس کے نیچے استر لگا ہوا تھا اور عصا یہ سب مامون کے دربار میں روانہ کیا۔

مامون کو اپنے بھائی کے قتل سے سخت صدمہ ہوا۔ مامون کا منشا یہ تھا کہ امین کو زندہ گرفتار کر کے اس کے پاس پہنچایا جائے تاکہ وہ امین کے لیے خود سزا تجویز کرے۔

الفخری کے اہم تصریحات اس موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے مصنف الفخری نے

لکھا ہے:

امین کا وزیر فضل بن ربیع رشید کے مرنے کے بعد طوس میں ساری فوج کو اکٹھا کر کے امین کی خدمت میں لے آیا تھا۔ حالانکہ رشید نے مامون کے لیے وصیت کی تھی۔ فضل بن ربیع اپنی اس حرکت کی وجہ سے مامون سے خائف رہتا تھا اور سمجھتا تھا کہ جب بھی مامون خلیفہ ہوگا تو اس کا بدلہ لیے بغیر نہ رہے گا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے امین کو اکسایا کہ مامون کو ولیعہدی سے معزول کر کے اپنے فرزند موسیٰ کی بیعت لے لے فضل کے ساتھ ایک جماعت نے اتفاق کر لیا اور امین کا بھی ان باتوں کی طرف میلان ہو گیا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مامون کا دل پسیج گیا۔ اور اس نے اپنے آپ کو معزول کر کے موسیٰ کی بیعت کا ارادہ کر لیا۔ مامون کے وزیر فضل بن سہیل نے تنہائی میں باتیں کیں اور اسے اس ارادے سے باز رہنے کی ترغیب دی۔ اور جوش دلایا۔ اسے خلافت دلانے کا ذمہ لے لیا اور کہا کہ یہ میرا ذمہ رہا۔ مامون اپنے ارادے سے باز آ گیا۔ اور فضل بن سہیل نے مامون کے معاملے میں دلچسپی لیتے ہوئے لوگوں کو رام کرنا شروع کر دیا۔ اس نے سرحدوں کو مضبوط کیا اور دوسرے معاملات کو سنبھال لیا۔ دونوں بھائیوں (امین و مامون) میں عداوت تیز ہو گئی۔ اور بغداد و خراسان کے درمیان آمد و رفت بھی بند ہو گئی۔

آگے چل کر "الفخری" نے لکھا ہے:

زبیدہ مامون سے محبت کرتی تھی امین کی ماں زبیدہ خود امین سے بہت زیادہ ٹھوس رائے کی مالک تھی۔ جب امین علی بن عیسیٰ کو لشکر دے کر خراسان بھیجنے لگا تو یہ زبیدہ کے پاس بھی رخصت ہونے کے لیے گیا۔ اس وقت زبیدہ نے اس سے کہا: اے علی! اگرچہ امیر المومنین میرے فرزند ہیں اور میری تمام ہمدردیاں ان کے ساتھ ہیں مگر عبد اللہ یعنی مامون کو بھی میں بہت چاہتی ہوں، مجھے خطرہ ہے کہ اسے کوئی گزند نہ پہنچے۔ میرا فرزند ایسا حکمراں ہے جو اپنے بھائی کے اقتدار سے منافست رکھتا ہے مگر تم عبد اللہ (مامون) کے حق کو پہچانو اور دیکھو کہ وہ کس کا جگر گوشہ اور کس کا بھائی ہے۔ دیکھو اس کو کسی بات کا جواب نہ دینا اس لیے کہ تم اس کے ہمسر نہیں ہو۔ اس سے غلاموں کا سا سلوک نہ کرنا اور اسے قید کر کے یا بیڑیاں ڈال کر ذلیل نہ کرنا۔ اسے کسی کنیز یا خادم سے محروم نہ کرنا، چلنے میں اس پر کوئی سختی نہ کرنا اور اس کے برابر ہو کر

نہ چلنا اور اس سے پہلے تم سوار نہ ہونا۔ جب وہ سوار ہو تو اس کی رکاب تھام لو۔ اگر وہ گالی دے تو اسے برداشت کر لو۔ اس کے بعد زبیدہ نے ایک چاندی کی زنجیر پھینکتے ہوئے علی بن عیسیٰ سے کہا۔ اگر مامون تمھارے قبضے میں آئے تو اسے اسی سے قید کرنا۔ علی نے کہا آپ نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے ویسا ہی کروں گا۔

امین کے قاتل کا حشر تاریخ الخلفاء میں امین کے قاتل طاہر کے بارے میں لکھا ہے کہ: مامون نے اسے جلاوطن کر دیا یہاں تک کہ وہ گمنامی کے عالم میں کسی دُور مقام پر بے کسی کی حالت میں مر گیا۔ اور امین کا یہ قول پورا ہوا جو اس نے طاہر کو اپنے خط میں لکھا تھا۔ اے طاہر یاد رکھو جو کوئی ہماری باہمی نزاع میں کسی ایک پر ظلم کرے گا اس کی سزا تلوار ہے۔ اور تم بھی اپنی ذات کے لیے اسی کے منتظر رہو۔

امین کی غلط بخشیاں اور شاہ خرچیاں امین نے بادشاہ ہوتے ہی دُور دُور سے کھلاڑی بلائے، ان کی تنخواہیں مقرر کیں۔ انواع و اقسام کے درندے، جانور اور پرندے جمع کیے۔ اپنے رشتہ داروں اور حکام سے دُور رہتا انھیں ذلیل و رسوا کرتا، سرکاری خزانہ خالی کر دیا تھا، جواہرات اور دیگر عمدہ قیمتی چیزیں تلف و برباد کر دی تھیں کھیل کود کے لیے مختلف مکانات بنوائے تھے۔ ایک مرتبہ ایک گانے والے کو ایک کشتی بھر کے اشرفیاں دی تھیں۔ علاوہ ازیں شیر، ہاتھی، عقاب، سانپ اور گھوڑے کی شکل کی پانچ کشتیاں بنوائی تھیں جن کی تیاری میں بے دریغ دولت خرچ کی تھی۔ جس پر ابونواس نے نظم لکھی کہ یہ کشتیاں خشکی پر بھی چلا کرتی تھیں اور پانی میں بھی اور ان سے سخت تیر اندازی بھی کی جاتی تھی۔

امام احمد بن حنبل کا قول امین کے بارے میں امام احمد بن حنبل نے لکھا ہے اللہ کی رحمت سے امید ہے کہ وہ امین کی اس لیے مغفرت کرے گا کہ اس نے اسمٰعیل بن علیہ سے کہا تھا او بدبخت تو قرآن کریم کو مخلوق کیوں کہتا ہے۔ خبردار آئندہ تیری یہ جرأت نہ ہو۔

امین کا تفوق اور برتری: مسعودی نے لکھا ہے کہ اب تک صرف حضرت علیؓ، امام حسنؓ اور

امین ہی وہ خلیفہ ہیں جو ہاشمی نسل اور ہاشمی خاتون کے بطن سے پیدا ہوئے۔ ان کے سوا کوئی اور خلیفہ ہاشمی نہیں ہے۔ امین کی ماں زبیدہ تھی جو جعفر ابن ابو جعفر منصور بن محمد کی دختر تھی جس کا نام امۃ العزیز اور لقب زبیدہ تھا۔

امین کے محاسن اور مکارم

اسحٰق موصلی کا بیان ہے امین میں جو خوبیاں تھیں وہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوئیں۔ وہ بہت خوبصورت، بڑا سخی، نجیب الطرفین، ادیب و عالم ہونے کے ساتھ بہترین خلیفہ تھا۔ البتہ لہو و لعب میں مصروف رہا۔ دولت خرچ کرنے میں سخی سردار تھا۔

امین کا پایہ ادب و شعر میں

ابوالحسن احمر کا بیان ہے کہ علم نحو میں جب مجھے کوئی دلیل نہ ملتی تو امین ثبوت کے لیے فوراً ہی کسی استاد کا شعر سنا دیتا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ شاہزادوں میں امین و مامون سے زیادہ کوئی دوسرا اتنا اور ایسا باشعور نہیں پایا گیا۔

امین کو جب معلوم ہوا کہ مامون مخالفت پر کمربستہ ہے تو اس نے اپنے سوتیلے بھائی مامون کے نام ایک نظم لکھی جس میں تحریر کیا کہ تم برتری ظاہر نہ کرو کیونکہ تم باندی کے پیٹ سے ہو۔ اس لیے اپنی حیثیت پر نظر رکھو اور میرے مقابل میں آنے کی جرأت نہ کرو۔

میں جلال الدین سیوطی کہتا ہوں کہ مامون و ہارون رشید کے برعکس امین کے اشعار بہت بلند ہیں۔

اسمٰعیل بن ابی محمد یزیدی کا بیان ہے میرے والد کہا کرتے تھے امین و مامون نہایت ہی فصیح و بلیغ گفتگو کیا کرتے تھے۔ میں نے ان سے ایک دن کہا اگرچہ اموی خلفاء کی اولاد فصاحت و بلاغت سیکھنے کے لیے دیہاتیوں کے پاس جایا کرتی تھی لیکن آپ دونوں بھائی ان سے بھی زیادہ فصیح و بلیغ گفتگو کرتے ہیں۔

امین کی ایک اہم خصوصیت

ثعالبی نے لطائف المعارف میں ابو العینا کا یہ قول لکھا ہے امین کی والدہ زبیدہ بنت جعفر بن منصور اگر اپنے بال کھول دے تو اس کی ہر ایک لٹ میں خلیفہ اور ولی عہد نظر آئیں گے۔ منصور بن محمد زبیدہ کے

دادا تھے۔ سفاح دادا کے بھائی تھے، مہدی چچا اور ہارون الرشید اس کا شوہر تھا۔ اور امین اس کا لڑکا۔ علاوہ ازیں مامون و معتصم اس کے سوتیلے بیٹے تھے۔ واثق و متوکل اس کے سوتیلے بیٹوں کے فرزند تھے اور یہ سب خلیفہ ہوئے ہیں۔

باشندگانِ حجاز نے امین کا ساتھ کیوں چھوڑا؟

ابن اثیر کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے:

خلافت کا فیصلہ ایک حد تک حرمین کی حکومت اور یہاں کے باشندوں کی بیعت پر تھا۔ یہ دونوں مقامات امین کے قبضے میں تھے۔ لیکن امین کی بدعہدی خصوصاً ان معاہدوں کو جنھیں ہارون رشید خانۂ کعبہ میں محفوظ کر گیا تھا۔ چاک کر دینے کا حرمین پر بہت بُرا اثر پڑا تھا اور مکّہ کے حاکم داؤد بن عیسیٰ نے کعبہ کے خدام، علمائے مکّہ اور عمائد قریش کو جمع کر کے امین کی بدعہدی اور معاہدہ چاک کرنے کا حال سنا کر کہا ایسے شخص کی بیعت فسخ کر کے مامون کی بیعت کر لینی چاہیے۔ سب نے اس سے اتفاق کیا اور داؤد نے مجمع عام میں تقریر کر کے فسخِ بیعت کا اعلان کیا اور اہلِ مکّہ نے مامون کی بیعت کر لی۔ مکّہ کے بعد داؤد نے اپنے بیٹے سلیمان حاکم مدینہ کو لکھا، اس نے وہاں مامون کی بیعت کر لی۔ اور رجب سنہ ۱۹۶ھ میں حرمین میں مامون کی بیعت کر لی گئی۔ مامون داؤد بن عیسیٰ کی اس کارگزاری سے بہت خوش ہوا۔ اور اس کو انعام و اکرام سے نوازا۔

حقیقی بھائی نے بھی ساتھ چھوڑ دیا

بغداد کی حالت اتنی ابتر ہو گئی تھی کہ بہت سے امراء شہر چھوڑ کر طاہر سے مل گئے۔ امین کے حقیقی بھائی مؤتمن نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ خزیمہ بن خازم اور محمد بن علی نے جو ہرثمہ کو روکے ہوئے تھے امین کی بیعت توڑ کر ہرثمہ کو عسکر مکرم (بغداد کا ایک حصہ) میں داخل کر دیا۔ ان کے مل جانے کے بعد بغداد میں کوئی مزاحم باقی نہ رہ گیا۔ اور طاہر دوسرے دن شہر میں داخل ہو گیا۔ اور یہاں امنِ عام کی منادی کرا دی۔

طاہر اور ہرثمہ کی کشمکش اور رقابت

بغداد میں شاہی قصور و محلات کا ایک وسیع سلسلہ تھا جن میں سے ہر ایک محل مستقل قلعہ

کی حیثیت رکھتا تھا۔ طاہر نے ان سب کا محاصرہ کر کے قلعہ شکن آلات نصب کرا دیے۔ اس سلسلے میں مدینۃ المنصور کا بھی جس میں امین فروکش تھا محاصرہ ہوا۔ گو بہت سے امرا امین کا ساتھ چھوڑ چکے تھے پھر بھی ان کی تھوڑی تعداد اس کے ساتھ تھی۔ مدینۃ المنصور کے محاصرہ کے بعد ان میں سے اکثر امراء اور افسرانِ فوج سے لے کر لونڈی غلاموں تک نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور اس کے ساتھ صرف چند مخصوص جاں نثار باقی رہ گئے۔

اس وقت اس کے ہوا خواہ محمد بن حاتم اور محمد بن ابراہیم نے اسے صلاح دی کہ ہمارے پاس سات ہزار سپاہ موجود ہے ہم کو راتوں رات شام نکل جانا چاہیے۔ وہاں محفوظ جائے پناہ مل جائے گی اور آپ اطمینان سے اپنے لیے کوشش کیجیے گا۔ امین نے اسے منظور کر لیا۔ طاہر کو اس کی خبر ہو گئی۔ اس نے امین کے بعض امراء کو جو اس سے مل گئے تھے مجبور کیا کہ جس طرح ممکن ہو اس کو اس ارادے سے روکو، ان لوگوں نے جا کر امین کو ڈرایا کہ محمد بن ابراہیم اور محمد بن حاتم طاہر سے سرخروئی حاصل کرنے کے لیے دھوکا دے کر آپ کو اس کے حوالے کر دینا چاہتے ہیں۔ اس لیے آپ کہیں جانے کا قصد نہ کیجیے۔ آپ کی بھلائی اس میں ہے کہ ہرثمہ سے پناہ مانگ کر اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیجیے۔ ان لوگوں کے واپس جانے کے بعد ابن حاتم اور ابن ابراہیم نے امین کو بہت سمجھایا کہ اگر پناہ ہی لینا ہے تو طاہر سے لیجیے لیکن اس پر وہ آمادہ نہ ہوا اور ہرثمہ سے پناہ کی درخواست کی۔ اگرچہ ہرثمہ مامونی افسر تھا لیکن ہارون کا نمک خوار تھا اور عرب تھا۔ اس لیے وہ امین کے ساتھ بھی کوئی ناروا سلوک پسند نہ کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے امین کو اپنی پناہ میں لے لیا اور وعدہ کیا کہ میں آپ کی حفاظت میں اپنی جان فدا کر دوں گا۔

طاہر کو اس کی خبر ہوئی تو وہ بہت گھبرایا کہ اگر امین ہرثمہ کی پناہ میں چلا جاتا ہے تو اس مہم کی کامیابی کا سہرا اسی کے سر ہو جائے گا۔ اس لیے اس نے امین کے محل کے گرد خفیہ پہرہ لگا دیا کہ وہ جیسے ہی نکلے اس کا کام تمام کر دیا جائے۔ امین کو اس کی خبر ہو گئی، اس نے جب دیکھا کہ پناہ مانگنے کے بعد بھی اس کی جان بچتی ہوئی نظر نہیں آتی تو اس نے نکل جانا چاہا۔ اور ہرثمہ کو اس کی خبر کر دی۔ اس نے سمجھایا کہ تھوڑا توقف کیجیے۔ میں آپ کی حفاظت کا

سامان کرلوں تو چلے جائیے گا۔ مگر امین پر کچھ ایسا خوف و ہراس طاری تھا کہ وہ ٹھہرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ ہرثمہ نے مجبور ہوکر کشتیاں تیار کرادیں۔ امین نے اپنے لڑکوں کو بلایا اور آخری مرتبہ ان سے رو رو کر جدا ہوا۔

محل سے نکل کر کشتیوں پر بیٹھا۔ ہرثمہ نے اس کے ہاتھوں اور سر کو بوسہ دیا۔ طاہر کے آدمی پہلے سے چھپے ہوئے تھے۔ جیسے ہی کشتیاں چلیں انھوں نے دفعتًہ حملہ کرکے ڈبو دیا۔ امین کو کسی نہ کسی طرح ملاح نے نکال لیا۔ اور وہ پکڑ کر قید کر دیا گیا۔ رات کو طاہر کے آدمیوں نے قیدخانہ میں گھس کر قتل کر ڈالا۔ اور اس کا سر قلم کرکے طاہر کے حضور میں پیش کیا۔ اس طرح ابن خلدون کی تصریحات کے مطابق محرم ۱۹۸ھ میں بغداد پر مامون کا مکمل قبضہ ہوگیا۔ اور جمعہ کے دن جامع بغداد میں یہ حیثیت خلیفہ کے اس کے نام کا پہلا خطبہ پڑھا گیا۔

قتل کے وقت امین کی عمر کل ۲۷ سال تھی۔ مدت خلافت ۴ سال آٹھ مہینے اور چند دن۔

وزیر فضل بن ربیع کے خصائل ذمیمہ فضل بن ربیع معمولی حالت سے ترقی کرکے وزارت کے درجہ تک پہنچا تھا۔ منصور کے زمانے میں حاجب تھا۔ ہارون کے زمانے میں برامکہ کے قتل کے بعد وزیر ہوا۔ اور آخر تک اس عہدہ پر رہا۔ ہارون کی وفات کے بعد امین کا وزیر ہوا۔ گو یہ سلاطین کے آداب اور ان کے حالات کا واقف کار اور بڑا علم دوست تھا۔ وزارت ملنے کے بعد اس نے علماء و فضلاء کی مجلس قائم کردی تھی۔ مشہور شاعر ابونواس اس کا درباری شاعر تھا، لیکن ان خوبیوں کے ساتھ حد درجہ حاسد اور کینہ پرور تھا۔ برامکہ کے عروج پر حسد کرکے ہارون کو ان کے خلاف ورغلایا۔ برامکہ کے زوال کے اسباب میں ایک سبب اس کی کینہ پروری بھی تھی پھر مامون سے نمک حرامی کرکے امین سے مل گیا۔ اور دونوں بھائیوں کو لڑا کر حکومت بغداد کو کمزور کیا۔ پھر امین کی شکست کے بعد روپوش ہوگیا۔ اور طاہر بن حسین کی سفارش پر مامون نے اس کی خطاؤں سے درگذر کیا۔ اس نے ۲۰۸ھ میں وفات پائی۔

عرب اور عجم کی کشمکش کا انجام حقیقت یہ تھی کہ امین کی ماں ہاشمیہ تھی۔ اور وہ عربوں کی حمایت اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ مامون کی ماں ایرانی النسل تھی اس لیے ایرانی و خراسانی لوگ مامون کے ہوا خواہ تھے۔ امین بغداد میں عربوں کے اندر موجود تھا اور مامون

اپنے حامیوں یعنی ایرانیوں کے اندر مرو میں تھا۔ زبیدہ خاتون مامون سے متنفر تھی اور عربی سردار جو عباسیوں کے ہواخواہ تھے وہ علویوں کو ناپسند کرتے تھے لیکن خراسان میں علویوں کے حامی بہ کثرت موجود تھے۔ جعفر برمکی جو علویوں کا طرفدار تھا مامون کا اتالیق تھا۔ لہٰذا مامون کی مقبولیت خراسان وغیرہ ممالک مشرقیہ میں زیادہ تھی۔ فضل بن ربیع جو برامکہ سے متنفر تھے۔ مامون سے بھی ناخوش تھے۔ غرض کہ مامون و امین کے دل صاف نہ تھے اور ان دونوں کے گرد ایسے سردار جمع تھے جو دو گروہوں میں منقسم تھے اور ایک گروہ دوسرے گروہ کا مخالف تھا۔ لہٰذا ہارون کی آنکھ بند ہوتے ہی ان دونوں گروہوں نے امین و مامون کی سرکردگی میں ایک دوسرے کے خلاف زور آزمائی کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ اور ایک دوسرے کی طرف سے مطمئن نہ تھے۔ مامون نے اہلِ خراسان کی استمالتِ قلب کے لیے خراسان کا چوتھائی خراج معاف کر دیا۔ اور خراسانی سرداروں سے ترقیات و قدر دانی کے بڑے بڑے وعدے کئے۔ اہلِ ایران خوش ہو ہو کر کہتے تھے کہ مامون الرشید ہمارا ہمشیر زادہ ہے وہ ضرور ہمارے مرتبہ اور اقتدار کو بڑھائے گا۔ ادھر مامون نے مرو کے علماء اور فقہاء کو بلا کر کہا کہ آپ لوگ وعظ و پند کے ذریعے لوگوں کے خیالات کی تربیت کریں اور حالات کو قابو میں رکھیں۔ ان تمام حالات کے موجود ہوتے ہوئے مامون الرشید نے سب سے بڑی عقل مندی یہ کی کہ امین الرشید کی خدمت میں مؤدبانہ عرضی لکھ کر بھیجی اور ہدایا و تحائف روانہ کر کے اپنی نیاز مندی و فرمانبرداری کا بظاہر یقین دلانے کی کوشش کی۔

امین کی غلط کاریاں اور نافہمیاں

اگر خلیفہ امین الرشید کی طرف سے حزم و مآل اندیشی کے ساتھ کام لیا جاتا تو مامون الرشید ہی کی طرف سے نا جائز و ناشدنی حرکات کا ظہور ہوتا اور وہی ملزم قرار پا کر اہلِ عالم کی نگاہوں میں مطعون و بدنام ہوتا اور شاید اس کو کامیابی بھی حاصل نہ ہوتی۔ لیکن فضل بن ربیع اور دوسرے مشیر امین کے لیے اچھے مشیر ثابت نہ ہوئے۔ اور امین سے کسی دانائی و ہوشیاری کا ظہور نہ ہوا بلکہ اس نے اپنے کاموں سے لوگوں کو بہت جلد یقین دلا دیا کہ وہ ہارون الرشید کے تخت کو سنبھالنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ اس نے تختِ خلافت پر قدم رکھتے ہی سب سے پہلی غلطی یہ کی کہ اپنے بھائی قاسم یعنی موتمن کو جزیرہ کی حکومت سے معزول کر کے اس کے پاس صرف قنسرین و عواصم کا صوبہ باقی رکھا اور جزیرہ کی حکومت پر اپنی

طرف سے خزیمہ بن خازم کو مامور کر کے بھیج دیا۔

امان شکنی ملکہ زبیدہ اور امین کی اولاد کا حشر

جب امین کی کشتی میں پانی بھر آیا اور وہ ڈوب گئی۔ امین پانی میں تیرنے لگا، اس کو طاہر کے آدمیوں نے پکڑ لیا۔ احمد بن سالم تیر کر کنارے تک پہنچ گیا۔ جب دریا سے باہر نکلا تو وہ بھی طاہر کے آدمیوں کے ہاتھوں گرفتار ہوا۔ احمد بن سالم کا بیان ہے کہ مجھ کو گرفتار کر کے طاہر کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے مجھ کو قید خانہ میں بھجوا دیا۔ تھوڑی رات گزری ہوگی کہ قید خانہ کا دروازہ کھولا گیا اور امین کو اندر داخل کر کے پھر دروازہ بند کر دیا۔ اس وقت امین صرف ایک پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔ سر پر عمامہ اور شانوں پر ایک بوسیدہ کپڑا تھا۔ میں انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ کر رونے لگا۔

امین نے مجھے پہچان کر کہا۔ کیوں بھائی کیا یہ لوگ وعدۂ امان کو ایفا کریں گے۔ میں نے کہا انشاء اللہ تعالیٰ ضرور پورا کریں گے۔ ہم دونوں یہی باتیں کر رہے تھے کہ محمد بن حمید آیا، دور سے کھڑا ہوا دیکھتا رہا۔ اور امین کو پہچان کر واپس چلا گیا۔ اس کے بعد آدھی رات کے وقت چند عجمی ننگی تلواریں لیے ہوئے قید خانے میں آئے۔ امین ان کو دیکھ کر آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ ان میں سے ایک نے لپک کر امین کو پکڑ کر زمین پر گرا دیا۔ اور ذبح کر کے سر اتار دیا۔ سر لے کر چلے گئے۔ صبح ہوئی تو لاش کو بھی اٹھا کر لے گئے۔

طاہر نے امین کا سر منظر عام پر لٹکا دیا ۔ جب لوگوں نے اچھی طرح دیکھ لیا تو اپنے چچا زاد بھائی محمد بن حسن بن زریق بن مصعب کے ہاتھ خاتم خلافت، عصا، چادر کے ہمراہ مامون کے پاس بھیج دیا۔ اور شہر میں امان کی منادی کرا دی۔

جمعہ کے دن مسجد جامع میں مامون کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور امین کی برائیاں بیان کی گئیں۔ موسیٰ و عبداللہ پسران امین کو مامون کے پاس بھیج دیا اور زبیدہ خاتون مادر امین کو دریائے زاب کے کنارے کسی مقام پر جلا وطن کر کے بھیج دیا۔

خلیفہ مامون الرشید

ایک اولو العزم، باجبروت اور عہد آفریں شہنشاہ

قسمت کے کھیل

یہ مامون ہے!

عرب باپ اور غیر عرب ماں کا بیٹا، امین نجیب الطرفین تھا، یہ لونڈی زادہ۔ وہ حسب و نسب کے اعتبار سے اونچا تھا یہ اس کے مقابلے میں پست، اس کی رگوں میں خالص عربی خون دوڑ رہا تھا، اس کی شریانوں میں گردش کرنے والا خون مخلوط اور ممزوج تھا، وہ اس لیے تھا کہ سربلند رہے یہ اس لیے تھا کہ پست روی کی زندگی بسر کرے۔

وہ ولی عہدِ اوّل تھا یہ ولی عہدِ دوم۔

لیکن یہ انسانوں کے فیصلے تھے جو قدرت کے فیصلوں کے سامنے مکڑی کے جالے سے زیادہ کمزور ثابت ہوتے ہیں۔ انسان کا کیا ہوا فیصلہ رد ہو گیا، قدرت نے جو فیصلہ کیا تھا وہ نافذ ہو کر رہا۔ امین موت کے گھاٹ اترا۔ اور تاج شہریاری مامون نے زیب سر کیا۔

آئیے تاریخ کے آئینے میں مامون کی سیرت و شخصیت کا نظارہ کریں۔

مامون کا پایۂ علم، صفات و سیئات

سیوطی کے بیان کے مطابق مامون نے آئمہ وقت سے تکمیل حدیث کی اور علم و ادب کی تکمیل یزیدی سے کی ——— اور

ا: ۱۹۸ھ تا ۲۱۸ھ (۸۱۳ء۔۸۳۳ء)

روئے زمین کے فقہاء اور علماء کو جمع کر کے ان سے فقہ، عربی ادب اور تاریخ پڑھی، جوان ہونے کے بعد فلسفہ اور قدیمی علوم میں مہارت حاصل کرنے پر قرآن کریم کے مخلوق ہونے کا قائل ہو گیا۔

مامون تمام خاندان بنی عباس میں سب سے زیادہ باتدبیر، صاحب عزیمت، بردبار، صاحب علم، صاحب الرائے، زیرک، عاقل، بارعب، شجاع، بہترین سردار اور جواں مرد تھا۔ علاوہ ازیں اور گوناگوں صفات اور بہتر خوبیوں کا مالک تھا۔ البتہ نقص یہ تھا کہ قرآن کریم کو مخلوق کہنے کے باعث اسے بلحاظ عقیدہ لوگ بُرا جاننے لگے تھے۔ مامون تمام خاندانِ بنی عباس میں سب سے زیادہ فصیح، زبان آور اور قادر الکلام تھا۔ اور کہا کرتا تھا عمرو بن عاص کی وجہ سے معاویہ نے سیاست کی گتھیاں سلجھائیں۔ حجاج بن یوسف کے سبب سے عبدالملک تدبیر ملکی و سیاست میں مشہور ہوا۔ اور میں انشاء اللہ اپنے اعتمادِ نفس و خودداری کے بل بوتے پر حکومت کرتا ہوں۔

کہتے ہیں کہ مامون نے کبھی کبھی ماہ رمضان میں ۳۳-۳۳ مرتبہ قرآن کریم ختم کیا ہے۔

بعض اسے شیعہ کہتے ہیں اور یہ ثبوت پیش کرتے ہیں کہ اس نے اپنے بھائی مومن کو معزول کر کے علی رضا کو ولی عہد بنایا تھا۔

ابو معشر منجم کا بیان ہے مامون بے انتہا عادل، کامل فقیہ اور زبردست عالم تھا۔ ہارون رشید کا خود بیان ہے کہ مامون میں منصور جیسی پختگی، مہدی جیسا تقوی اور ہادی جیسی شان و شوکت تھی اور چوتھی چیز یہ کہ اسے خود اپنی ذات والاصفات سے تشبیہ دے سکتا ہوں۔ لیکن امین کو میں نے اس لیے ترجیح دی کہ وہ ہاشمی خاتون کا بیٹا ہے۔

مامون نے اپنے بھائی مومن کو کیوں معزول کیا؟

مامون نے ۲۰۱ھ میں اپنے بھائی مومن کو معزول کر کے اس کی جگہ علی رضا بن موسی کاظم بن جعفر صادق علیہم السلام کو ولی عہد بنایا۔ لوگوں نے اس فعل کو اس کے شیعہ ہونے پر محمول کیا۔ اور یہاں تک کہا گیا کہ مامون خود خلافت سے دست بردار ہو کر علی رضا کو خلیفہ بنانا چاہتا ہے۔ مامون نے امام موصوف کو رضا کا لقب دیا تھا۔ ان کی سکونت پہلی

کا ان کی بیوی بچوں کا نام مسکوک کرایا جاتا تھا۔ اور اپنی مملکت کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشے تک امام موصوف کو رضا لکھنے کے تاکیدی فرامین بھیجے تھے۔ امام علی رضا کو ولیعہد بنانے کے بعد مامون نے سیاہ لباس ترک کر کے سبز لباس اختیار کر لیا تھا اور یہ بات بنو عباس کو سخت ناگوار گزری۔

مامون کے خلاف بنو عباس کی برہمی اور اشتعال بنو عباس نے ابراہیم بن مہدی بن منصور (یعنی ہارون رشید کے بھائی) کے ہاتھ پر بعیت کی اور مبارک لقب دیا۔ اس کے بعد مامون پر ان لوگوں نے خروج کیا۔ مامون نے ان لوگوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ لڑائی ہو رہی تھی کہ مامون عراق کی جانب ضروری کام سے گیا۔ اور علی رضا نے ۲۰۳ھ میں انتقال کیا۔ مامون نے اہل بغداد کو لکھا علی رضا کا انتقال ہو چکا ہے اب فتنہ و فساد کیوں جاری ہے؟ لیکن اہل بغداد نے مامون کو سخت جواب دیا جو مامون کو بہت برا معلوم ہوا۔ دوسری طرف لوگ خفیہ طور پر ابراہیم سے علیحدہ ہونے لگے اور دو سال چند ماہ کی جنگ کے بعد ابراہیم ماہ ذی الحجہ ۲۰۳ھ میں کہیں روپوش ہو گیا۔ اور آٹھ سال تک روپوش ہو رہا۔ ماہ صفر ۲۰۴ھ میں جب مامون بغداد آیا تو عباسیوں نے اس سے کہا سبز لباس ترک کر کے اپنا قدیم لباس سیاہ زیب تن کرتے رہیے۔ جس پر مامون نے کچھ توقف کیا اور پھر سیاہ لباس زیب تن کرنا منظور کر لیا۔

ہاشمیوں اور عباسیوں پر حضرت علیؑ کے احسانات صولی کا بیان ہے مامون کے عزیزوں نے کہا تم حضرت علیؓ کی اولاد سے نیکی کرنا چاہتے ہو تو امور خلافت اپنے ہاتھ میں رکھو تاکہ ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ بھلائیاں کر سکو اور خلیفہ رہتے ہوئے تم ان سے عمدہ سلوک کر سکو گے جس پر مامون نے جواباً کہا حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ نے اپنے اپنے زمانے میں کسی ہاشمی کو خلیفہ یا حاکم اعلیٰ مقرر نہیں کیا البتہ حضرت علیؓ نے اپنے عہد حکومت میں عبداللہ بن عباس کو بصرہ کا، عبیداللہ کو یمن کا، سعید کو مکہ کا اور قثم کو بحرین کا حاکم اعلیٰ مقرر کیا۔ اور تقریباً ہر ایک ہاشمی کو کوئی نہ کوئی خدمت عنایت فرمائی۔ اس احسان کا بدلہ میں اس طرح اتار سکتا ہوں کہ خلافت ان کی اولاد کے حوالہ کر دوں۔

امیر معاویہ کے خلاف مامون کا اعلانِ برأت

سنہ ۲۱۱ھ میں مامون نے عام حکم دیا کہ جو شخص امیر معاویہ کا عزت سے نام لے گا میں اس کی جان و مال سے بری الذمہ ہوں۔ اور رسول اللہ صلعم کے بعد حضرت علیؓ سب سے افضل ہیں۔

سنہ ۲۱۲ھ میں مامون نے قرآن کریم کے مخلوق ہونے اور ساتھ ہی حضرت علیؓ کی افضلیت کا عام اعلان کیا اسی وجہ سے عباسی مامون سے نفرت کرنے لگے۔ اور ملک میں فتنہ و فساد کا بازار گرم ہو گیا۔ اس سبب سے سنہ ۲۱۸ھ تک پھر مامون نے اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا۔

مامون کی فتح مندیاں

سنہ ۲۱۵ھ میں مامون نے علاقہ روم پر چڑھائی کی اور قلعہ قرہ و ماجد کو بزور شمشیر فتح کیا۔ اور وہاں سے دمشق کے راستے مصر میں داخل ہوا۔ مامون عباسی خاندان کا وہ پہلا خلیفہ تھا جس نے مصر پر قبضہ کیا اور پھر سنہ ۲۱۷ھ میں مصر سے دمشق کے راستے دوبارہ علاقہ روم پر حملہ آور ہوا۔

مسئلہ خلق قرآن اور مامون الرشید

سنہ ۲۱۸ھ میں عوام کے اصرار پر مامون نے اپنے نائب سلطنت اسحٰق بن ابراہیم خزاعی کو جو طاہر بن حسین کا چچا زاد بھائی تھا یہ لکھا: عوام اور بڑے بڑے عالموں کو یہاں تک کہ وہ جاہل جسے علم کی ہوا تک نہیں لگی اور وہ لوگ جو اسلام کی حقیقت سے بالکل ناواقف ہیں جنھیں قدرتِ الٰہی کی معرفت اور حقیقت کا پتہ نہیں وہ اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوق کو برابر کہتے ہیں انھیں یہ علم تک نہیں کہ مخلوق اور قرآن کریم میں نازل شدہ احکام مساوی ہیں۔ یہ جاہل کہتے ہیں کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا پیدا کردہ اور بنایا ہوا نہیں۔ حالانکہ قرآن کریم میں ہے: انا جعلناہ قرآناً عربیاً (ہم نے قرآنِ کریم کو عربی زبان میں نازل کیا۔ ظاہر ہے کہ جس کو اللہ نے بنایا یا نازل فرمایا وہ مخلوق ہے۔

نیز لکھا ہے: وجعل الظلمات والنور (اندھیرا اور روشنی بنائی۔) اور نقص علیک من انباء ما قد سبق (ہم گزشتہ لوگوں کے حالات بیان کرتے ہیں) اس سے صریح

ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امور محدثات بیان کیے ہیں۔

علاوہ ازیں فرمایا: احکمت آیاتہ ثم فصلت (اللہ نے اپنی آیات کی تفصیل بیان کی) اس سے بھی صاف ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی محکم آیات کی تفصیل بیان کر رہا ہے۔ اس کے پیش نظر بھی اللہ تعالیٰ ہی خالق و پیدا کنندہ ہے۔

ان احکام الٰہی و دلائل کے باوجود جاہل لوگ علم کی کمی و ناقابلیت کے پیش نظر باطل و ناکارہ عقیدہ رکھتے ہیں اور خود کو اہل سنت والجماعۃ سے منسوب کرتے ہوئے دوسروں کو باطل پرست اور اپنے کو فرقہ ناجیہ کہتے ہیں۔ یہ جاہل اپنے باطل عقیدہ میں خود ہی غلو کرتے ہیں اور پھر دنیا بھر کو باطل پرست کہتے ہیں اور اپنے جاہلی عقائد کے سبب عوام غیر اللہ کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں۔ اور حق کو چھوڑ کر باطل کی راہ پر چل رہے ہیں۔ اور اسی گمراہی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کو اپنا معتمد علیہ بنا لیا ہے۔

اے اسحٰق! تمام قاضیوں کو جمع کر کے انھیں ہمارا یہ خط سناؤ اور پھر جو کچھ وہ کہیں اس کی فوراً ہمیں اطلاع دو کہ قرآن کریم کے مخلوق ہونے کے بارے میں اب ان کا کیا اعتقاد ہے۔ نیز انھیں سمجھا دو کہ جو شخص احکام مذہبی پر قائم نہ رہے گا ہم اس کی حفاظت کے ذمہ دار نہیں۔ غرض کہ ہر ایک سے گواہوں کی موجودگی میں سوالات کرو، اگر وہ راہ راست پر آجائیں تو ٹھیک۔ ورنہ ان سے قرآن کریم کے قدیم ہونے کے متعلق ثبوت طلب کرو۔ اور واضح رہے کہ جو شخص قرآن کریم کے مخلوق ہونے کا عقیدہ نہ رکھے اس کی کسی مقدمے میں گواہی طلب نہ کی جائے۔ تمھارے علاقہ بغداد کے قاضی و عالم جو کچھ جواب دیں وہ ہمارے پاس روانہ کرو۔ آئندہ ان کو اپنے کیے کا اختیار ہے۔" نائب سلطنت اسحٰق نے سب کے جوابات اپنی رپورٹ کے ساتھ مامون کو بھیج دیے۔

علمائے حق کے اختلافی جواب پر مامون کا اشتعال

مامون نے رپورٹ کے جواب میں اسحٰق کو لکھا:

حالات معلوم ہوئے جو لوگ خود کو اہل قبلہ کہتے ہیں اور ریاست کے نمک خوار ہیں وہ قرآن کو مخلوق نہ کہہ کر خود کو نااہل ثابت کر رہے ہیں جنھوں نے قرآن کے مخلوق ہونے کا

انکار کیا ہو۔ انھیں فتویٰ دینے اور پڑھانے سے روک دیا جائے۔ بشر سے کہو تم جھوٹے ہو امیر المومنین اور تمھارے درمیان کوئی معاہدہ نہیں۔ امیر المومنین کا اعتقاد اور قول سب کو معلوم ہے کہ قرآن مخلوق ہے اس لیے انھیں دوبارہ بلاؤ۔ اگر وہ اپنے عقیدے سے توبہ کرلیں، تو امان دے دو اور اگر وہ اپنے شرک پر اصرار کریں اور قرآن کو مخلوق نہ کہیں تو ان کی گردن اڑا دو۔ اور ان کا سر ہمارے دربار میں پیش کرو۔ اسی طرح ابراہیم بن مہدی اگر درست جواب دے تو جہا ورنہ اس کو بھی قتل کردو۔ الفت بن مقاتل سے کہو تم حرام حلال میں تمیز نہیں کرتے۔ احمد بن ابو عوام سے کہہ دو کہ تم نے کوئی اچھا جواب نہیں دیا اور ابھی تم عقل کے کچّے ہو۔ آدمی کو کچھ پڑھ کر عمدہ جواب دینا چاہیے۔ اگر اب بھی ٹھیک نہیں ہوتے تو تلوار تمھارے سر پر ہے۔ احمد بن حنبل کو جتادو کہ امیر المومنین نے جواب پر یقین کرلیا کہ تم جاہل اور آفت رسیدہ ہو۔ فضل بن غانم کو جتادو کہ مصر میں انھوں نے بہ حیثیت قاضی بہت کچھ دولت رشوت کی جمع کی ہے۔ زیادی کو سمجھادو تم ایسے جاہل ہو جو ایک چیز کا دعویٰ کرکے اس کا انکار کرتے ہو ابو نصر تمار سے کہو کہ امیر المومنین کو تمھاری کم عقلی کا پہلے ہی سے شبہ تھا جس کا تم نے ثبوت دیا۔ ابن نوح اور ابن حاتم سے کہو کہ سود خوری کی وجہ سے تم میں توحید کے سمجھنے کا مادہ ہی نہ رہا۔ ابن شجاع کو جتادو کہ حکومت کا مال تم ناجائز طریقے سے کھاچکے ہو۔ سعدویہ واسطی سے کہو خدا تمھیں غارت کرے تم احادیث گھڑتے ہو اور تمھیں حکومت کی حرص ہے۔ سجادہ سے کہو تم علی بن یحییٰ کی امانتیں کھاگئے ہو۔ اس لیے تم علماء کی صحبتوں کے باوجود توحید سے پھر گئے ہو۔ قواریری سے کہو تمھارا طریقہ رشوت معلوم ہے جس سے تمھارا مذہب، طریقہ، کم عقلی صاف ظاہر ہے۔ یحییٰ عمری سے کہو اگرچہ تم فاروق اعظمؓ کی اولاد میں سے ہو تاہم تمھارا جواب صاف نہیں ہے محمد بن حسن بن علی بن عاصم سے کہو اگرچہ تم سلف صالحین کی پیروی کرتے ہو لیکن ابھی علم حاصل کرنے کے لیے طفل نے سوار ہو۔

جن لوگوں کا ہم نے اوپر نام درج کیا ہے ان سب کو بشر اور ابن مہدی کے سوا موت کے گھاٹ اتار دو۔ اور ان دونوں کو ہمارے دربار میں جواب دہی کے لیے پیش کرو۔

اس حکم کے وصول ہونے پر امام احمد بن حنبل، سجادہ محمد بن نوح اور قواریری کے سوا

باقی لوگوں نے قرآن کے مخلوق ہونے کا اقرار کیا۔ اور ان چاروں کو نائب سلطنت اسحٰق نے گرفتار کرایا۔ پھر دوسرے دن جیل خانے جا کر مکرّر دریافت کیا تو سجادہ اور قواریری نے اقرار کر لیا۔ اور امام احمد بن حنبل اور محمد بن نوح کو نائب سلطنت نے شہر بدر کر کے روم کی جانب نکلوا دیا۔

مامون کو معلوم ہوا کہ اقرار کرنے والوں نے بہ جبر اقرار کیا ہے تو اس نے غضب ناک ہو کر لکھا کہ خلقِ قرآن کے جملہ ماننے والوں کو ہمارے دربار میں پیش کیا جائے۔ چنانچہ نائب سلطنت نے ان سب کو روانہ کیا۔ اور ابھی یہ لوگ مامون کے پاس پہنچے نہ تھے کہ مامون کا انتقال ہو گیا۔ اور ان مظلومین پر اللہ نے رحم و کرم کر کے ان کو مامون کی ایذا رسانی و تکلیف دہی سے محفوظ رکھا۔

مامون کی بیماری، دعا اور موت مسعودی کا بیان ہے کہ مامون چشمہ بذندون پر ٹھہرا۔ چشمہ کے پانی کی ٹھنڈک، صفائی، خوشبو اور اس مقام کی سرسبزی مامون کو بہت پسند آئی۔ اس نے اس تالاب میں ایک مچھلی دیکھی جو چاندی کی طرح سفید چمک دار تھی۔ پھر اس کے پکڑنے کا حکم دیا۔ لیکن کسی کو تالاب کے سرد پانی میں اترنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ آخر کار مامون نے کہا جو اس مچھلی کو پکڑ لائے گا اسے شاہی تلوار دی جائے گی۔ اس پر ایک فراش نے ہمت کی۔ اور تالاب میں کود کر مچھلی پکڑ لی، وہ ابھی کنارے تک پہنچنے نہ پایا تھا کہ مچھلی تڑپ کر اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ جس کے اچھل کر نکلنے کی وجہ سے مامون کے کپڑوں اور سینہ وغیرہ پر چھینٹے بھی آئے۔ فراش دوبارہ تالاب میں اترا اور اس مچھلی کو پکڑ لایا۔ جسے مامون نے دیکھ کر کہا ــــ اسے ابھی تل کر لاؤ۔ اس کے بعد مامون کو سردی معلوم ہونے لگی اور وہ لحاف اوڑھ کر لیٹ گیا۔ وہ بخار میں کپکپاتا اور ہذیان میں چیختا تھا۔ اسے اس زور کی سردی لگی کہ مجبوراً اس کے اطراف آگ جلائی گئی۔ مچھلی تل کر آئی ابھی اس نے چکھی بھی نہ تھی کہ موت کے آثار طاری ہو گئے۔ پھر تھوڑی دیر بعد ہوش آیا تو پوچھا یہ کون سی جگہ ہے؟ لوگوں نے کہا رقہ۔ مامون نے کہا میری پیدائش کے وقت نجومیوں نے کہا تھا کہ موت رقہ میں ہو گی اور واقعہ یہ ہے کہ موضع رقہ سے مامون ہمیشہ دور رہنے کی کوشش کرتا تھا۔

غرض روم کے موضع رقہ میں خود کو بیمار دیکھ کر مامون اپنی زندگی سے مایوس ہو گیا اور

دعا کی کہ اے اللہ! تیری مملکت ہمیشہ باقی رہنے والی ہے تو اس پر رحم کر جس کی حکومت کا زمانہ ختم ہو رہا ہے۔

مامون کا شوقِ علم اور استاد کا ادب ابن عساکر نے ابو محمد یزیدی کی زبانی لکھا ہے میں مامون کو اس کے بچپن میں تعلیم دیا کرتا تھا۔ ایک دن میں پڑھانے گیا تو وہ زنانہ محل میں تھا میں نے اسے بلانے کے لیے کئی ملازم اندر بھیجے۔ لیکن اس نے بر آمد ہونے میں تاخیر کی۔ اس دوران میں ملازمین نے کہا مامون کھلنڈرا اور شوخ ہے۔ وہ ہم ملازمین کے ساتھ شرارت کرتا اور ہم کو اذیتیں پہنچاتا ہے۔ آج انہیں سزا دے دیجئے۔ چنانچہ مامون کے بہ تاخیر آنے کے جرم میں اسے سات کوڑے مارے اور وہ روتے ہوئے آنکھیں ملنے لگا۔ اتنے میں جعفر بن یحییٰ برمکی ادھر آنکلا۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے مامون سے کہا مجھے خوف تھا کہ تم جعفر سے میری شکایت کرو گے۔ مامون نے کہا اے استادِ محترم میں والد بزرگوار ہارون رشید کو بھی مطلع کرنا نہیں چاہتا چہ جائیکہ جعفر سے کچھ کہتا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ میں علم و ادب حاصل کرنے کا آرزو مند ہوں۔

فنِ فقہ میں مامون کی مہارت ابن عیینہ کا بیان ہے مامون ایک دن دربارِ عام میں علماء کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اتنے میں ایک خاتون آئی اور کہا میرے مرحوم بھائی نے چھ سو اشرفیاں ترکہ میں چھوڑیں لیکن لوگ مجھے اس میں سے صرف ایک ہی اشرفی دینا چاہتے ہیں آپ انصاف فرمائیے۔ اس پر مامون نے تھوڑی دیر زبانی حساب لگانے کے بعد فوراً کہا۔ ہاں تمہارا حصہ ایک ہی اشرفی ہے۔ حاضر الوقت علماء نے کہا امیر المومنین یہ کس طرح؟ تو اس خاتون کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا مرحوم نے دو لڑکیاں چھوڑیں عورت نے کہا جی ہاں۔ کہا ان دونوں کو دو ثلث یعنی چار سو اور والدہ کا چھٹا حصہ یعنی ایک سو اور بیوی کا آٹھواں حصہ یعنی ۷۵ اشرفیاں۔ اور اے خاتون! تجھے اللہ کی قسم تیرے اور بھی بارہ بھائی ہیں تو اس خاتون نے کہا جی ہاں۔ اس پر مامون نے کہا ان میں سے ہر ایک کو دو دو اشرفیاں اور اس عورت کا ایک حصہ یعنی ایک اشرفی۔

مامون کی طب اور دیگر علوم سے واقفیت۔ محمد بن حفص انماطی کا بیان ہے۔ عید کے

دن ہم لوگ مامون کے مدعو تھے۔ اس کے دسترخوان پر تین سو قسم کے کھانے چنے گئے۔ مامون نے کھانوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ کھانا بلغمی مزاج والے کے لیے نقصان رساں ہے اور یہ کھانا صفراوی مزاج کے لیے سود مند ہے۔ سوداوی مزاج والا یہ کھانا نہ کھائے۔ جو کوئی کم غذائیت چاہتا ہو وہ یہ نوش کرے اور یہ کھانا فلاں فلاں بیماری کے لیے مضر ہے۔ اور فلاں فلاں مزاج والوں کے لیے مفید ہے۔ اس پر یحییٰ بن اکثم نے کہا امیر المومنین فنِ طب میں جالینوس، فنِ نجوم میں ہرمس، حساب دانی اور فقہ میں علی، سخاوت میں حاتم۔ صداقت میں ابوذر۔ بزرگی میں کعب بن امامہ۔ وفاداری میں سموئل بن عادیہ سے بھی سبقت لے گئے۔

مامون نے ایک خارجی کو لاجواب کر دیا ابوداؤد کا بیان ہے مامون نے ایک خارجی سے کہا تم ہمارے خلاف کیوں ہو؟ اس نے کہا اس لیے کہ قرآن کریم کی یہ آیت موجود ہے "جو کوئی قرآن کریم کو حکم و حاکم نہ بنائے وہ کافر ہے"۔ مامون نے کہا تمھیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ آیت قرآن کریم کی ہے۔ خارجی نے کہا اجماعِ امت سے کہ یہ آیت قرآن کریم کی ہے۔ مامون نے کہا جب کہ تنزیل کے بارے میں تم اجماعِ امت کے قائل ہو تو تاویل پر کیوں قائل نہیں ہوتے؟ خارجی نے کہا آپ سچ فرماتے ہیں اور میں آپ کو امیر المومنین تسلیم کرتا ہوں۔

مامون کے اقوال ابن عساکر نے محمد بن منصور کے ذریعے مامون کے یہ اقوال لکھے ہیں:
شریف کی نشانی یہ ہے کہ بڑوں کے مظالم برداشت کرے مگر اپنے چھوٹوں پر ظلم نہ کرے۔

۲: سعید بن مسلم نے مامون کا یہ قول بیان کیا اگر مجرموں کو میرا طریق معافی معلوم ہو جائے تو وہ نڈر ہو جائیں اور ان کے دلوں میں میری محبت جاگزیں ہو جائے۔

۳: ابراہیم بن سعید جوہری کا بیان ہے مامون نے ایک مجرم سے کہا تمھاری سزا قتل ہے اس نے کہا بُردباری کو کام میں لائیے اور نرمی فرمائیے کیونکہ مہربانی کرنا نصف معافی کے برابر ہے پوچھا یہ کس طرح ممکن ہے کیونکہ میں قتل کرنے کی قسم کھا چکا ہوں۔ مجرم نے کہا بارگاہِ الٰہی میں حلف

شکن بن کر حاضر ہونا زیادہ آسان ہے۔ بہ نسبت قاتل کے۔ یہ سن کر مامون نے اس کو بری کر دیا۔

خطیب نے ابو صلت عبد السلام کی زبانی لکھا ہے:

مامون کا حلم اور بردباری ۱: میں ایک رات مامون کے پاس سو رہا تھا اتفاقاً میری آنکھ کھلی تو میں نے کمرہ میں اندھیرا پایا۔ مشعلچی خراٹے لے رہے تھے۔ اتنے میں مامون نے خود اٹھ کر چراغ درست کر کے روشن کر دیا۔

۲: صولی نے عبد اللہ بواب کی زبانی بیان کیا ہے کہ مامون اُن باتوں کو بھی بُردباری سے برداشت کرتا تھا جن پر ہمیں غصہ آتا تھا۔ ایک مرتبہ دریائے دجلہ میں ہم ایک کشتی پر سوار ہوئے ایک طرف ہم اور دوسری طرف ملاح تھے۔ اور درمیان میں پردہ حائل تھا۔ اتنے میں ایک ملاح نے کہا مامون میرے بھائی کا قاتل ہے میری نظروں میں اس کی کوئی وقعت نہیں۔ اس پر مامون نے ہنستے ہوئے کہا آپ لوگ وہ ترکیب بتائیں جس کے ذریعے میں اس ملاح کی نظروں میں معزز ہو جاؤں۔

۳: خطیب نے یحییٰ بن اکثم کی زبانی لکھا ہے کہ مامون بے انتہا صاحب مروت تھا۔ میں ایک دن اس کے پاس سو رہا تھا۔ اتنے میں کھانسی آئی تو اس نے اپنی قمیص سے اپنا منہ بند کر لیا تاکہ لوگوں کی نیند میں خلل نہ پڑے۔

۴: ابن عساکر نے یحییٰ بن خالد برمکی کے حوالے سے لکھا ہے کہ مامون نے کہا اے یحییٰ! لوگوں کی ضروریات کی تکمیل غنیمت سمجھو کیونکہ آسمان گردش میں ہے اور زمانہ ستمگر ہے وہ کسی کو ایک حال میں نہیں رکھتا اور کسی کے پاس نعمتیں بھی باقی نہیں چھوڑتا۔

عبد اللہ بن محمد زہری نے مامون کا یہ قول لکھا ہے: محبت کی زیادتی مجھے قدرت و قوت سے زیادہ محبوب ہے، اس لیے کہ حکومت کی قوت زائل ہو جاتی ہے اور محبت کا غلبہ باقی رہتا ہے۔

۵: جاحظ کا بیان ہے مامون کے مصاحب کہا کرتے تھے کہ مامون کے چہرے اور جسم کا رنگ بالکل یکساں ہے۔ البتہ اس کی پنڈلیاں پیلی ہیں اور اتنی زرد گویا زعفران سے رنگی گئی ہوں۔

اسحٰق موصلی کا بیان ہے مامون کہا کرتا تھا گانا وہی اچھا ہے جسے سننے والے پسند کریں چاہے فن داں ہوں یا غیر فن داں۔

۶: ابن ابی داؤد کا بیان ہے شہنشاہ روم نے مامون کو دو سو رطل مشک خالص اور دو سو کھالیں سمور کی تحفہ میں بھیجیں تو مامون نے دگنا کر کے دونوں چیزیں اپنے پاس کی روانہ کرنے کا حکم دیا۔ اور کہا دُگنا اس لیے بھیج رہا ہوں تاکہ اس کو مسلمانوں کی قدر و منزلت معلوم ہو۔

مامون اور امیر معاویہ ابراہیم بن حسین نے لکھا ہے کہ مدائنی نے مامون سے کہا۔ امیر معاویہ کہتے تھے کہ بنو ہاشم بہادر، تیز فہم اور زبان آور ہیں اور ہم بنو امیہ بہ تمام و کمال سید و سردار ہیں۔ اس پر مامون نے جواباً کہا امیر معاویہ نے ایک بات کا اقرار کیا اور ایک کا دعویٰ۔ اپنے اقرار میں تو وہ سچے تھے اور دعویٰ میں مدّعی کی حیثیت تھی۔

مامون کا رحم و کرم ابوداؤد نے لکھا ہے: مامون نے ایک آدمی سے کہا۔ انصاف ہو یا نا انصافی جاؤ میں نے تمہیں معاف کر دیا۔ تم برائیاں کرو۔ میں بھلائی کروں گا۔ تم جرائم کرو اور میں عفو و درگزر سے کام لیتا رہوں گا۔ یہاں تک کہ معافیوں پر تم شرمسار ہو کر اپنی اصلاح کر لو گے۔

مامون کی فصاحت و بلاغت جاحظ نے ثمامہ بن اشرس کی زبانی لکھا ہے کہ: زمانے بھر میں جعفر برمکی اور مامون ہی سب سے زیادہ فصیح و بلیغ کلام کے مالک ہیں۔

مامون اور شعر و شاعری مامون نے چغلی کی مذمت، شطرنج سے دلچسپی اپنے اور اپنے بھائی امین کی مساویانہ تعریف میں بھی اکثر اشعار کہے ہیں۔

علم حدیث سے مامون کی دلچسپی صولی کا بیان ہے ہم سے ابوالقاسم بغوی نے احمد بن ابراہیم موصلی کے حوالہ سے کہا ہم لوگ مامون کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اتنے میں ایک آدمی نے کھڑے ہو کر کہا:

اے امیر المومنین! رسول اکرم ؐ نے فرمایا ہے جملہ مخلوق اللہ کی عیال ہیں۔ اس پر مامون نے چیخ کر کہا۔ خاموش ہو جاؤ میں تم سے زیادہ عالم حدیث ہوں۔ مجھ سے یوسف بن عطیہ صفار نے بحوالہ ثابت حضرت انس کی زبانی بیان فرمایا ہے کہ رسول اکرم ؐ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی خبر گیری کرتا اور مدد فرماتا ہے۔ اور اللہ کو وہ شخص محبوب ہے جو اس کے بندوں کو

زیادہ سے زیادہ نفع پہنچائیے۔ اس حدیث کو متفرق راویوں کی زبانی ابن عساکر اور ابویعلی موصلی وغیرہ نے بھی یوسف بن عطیہ کے حوالہ سے قلم بند کیا ہے۔

صولی نے لکھا ہے مجھ سے مسیح بن حاتم عکلی نے ابن عبداللہ کے حوالہ سے کہا کہ مامون نے اپنے خطبہ میں شرم وحیا کے اوصاف بیان کیے، پھر ہشیم کے حوالہ سے عمران بن حصین کی زبانی بیان کیا کہ رسول اکرم ؐ کا ارشاد ہے حیا ایمان کا جزو ہے اور اہلِ ایمان جنتی ہیں۔ اور بیہودہ گوئی سختی و ظلم ہے اور ظالم دوزخی ہیں۔ اس حدیث کو ابن عساکر نے بھی مامون کی زبانی یحییٰ ابن اکثم کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔

مامون کا اخلاقِ کریمانہ

ابن عساکر نے محمد بن ابراہیم غازی کے حوالہ سے یحییٰ بن اکثم کی زبانی لکھا ہے کہ مامون کے پاس میں سو رہا تھا آدھی رات کے قریب مجھے پیاس لگی اور میں نے بیدار ہو کر کروٹ لی۔ اس پر مامون نے بیدار ہو کر پوچھا۔ کیا بات ہے؟ میں نے کہا پیاس لگی ہے تو جھپٹ کر گیا اور پانی کا گلاس لے آیا۔ میں نے کہا امیرالمومنین کسی ملازم کو آواز دی ہوتی تو کہا مجھ سے میرے والد نے حدیث بیان کی کہ رسول اللہ ؐ نے فرمایا ہے قوم کا سردار قوم کا خادم ہے۔

بنو عباس کی مردم شماری

۲۰۰ھ میں بنو عباس کی مردم شماری کی گئی تو ان کے مرد و زن کی جملہ تعداد ۳۳ ہزار تھی۔

ہرثمہ بن اعین کی داستانِ قتل

ہرثمہ بن اعین کے کارنامے تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش حصہ ہیں۔ لیکن عربی اور عجمی کش مکش کی قربان گاہ پر وہ بھی بھینٹ چڑھ گیا۔ فضل بن سہل (جس کا لقب ذوالریاستین تھا) اور حسن بن سہل مامون کی ناک کے بال بنے ہوئے تھے اور یہ دونوں اپنے اقتدار، وزارت اور اختیارِ حکومت کی راہ میں ہرثمہ کو کانٹا سمجھتے تھے، چنانچہ برابر مامون کو اس کے خلاف جڑکایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ہرثمہ اس ارادے سے کہ ذوالریاستین کے فتنے سے مامون کو آگاہ کر دے بغداد آیا۔ ابن اثیر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے:

ہرثمہ مامون کی خدمت میں جب باریاب ہوا تو اس نے اس سے کہا کہ تم نے کوفہ میں

علویوں کو بڑھنے کا موقع دیا ابو سرایا کو بھڑکایا۔ اگر تم چاہتے تو ان سب کو پکڑ سکتے تھے۔ ہرثمہ نے ہر چند معذرت کی لیکن مامون نے شنوائی نہ کی۔ اور اس کو پٹوا کر قید کر دیا۔ وہ قید ہی میں قتل کر دیا گیا۔ اور مامون ایک بڑے اور خیر خواہ عرب سردار سے محروم ہو گیا۔

مامون نے امام موسیٰ رضا کو ولیعہد کیوں بنایا؟

اس کی تفصیل یہ ہے کہ مامون اپنے اسلاف کے برعکس اہل بیت نبوی سے محبت رکھتا تھا۔ اور حضرت علی بن موسیٰ رضا سے اس کو اتنی محبت تھی کہ ۲۰۱ھ میں اس نے ان کو ولیعہد بنا کر تمام ممالک محروسہ میں اس کا اعلان کر دیا۔ اور عام حکم جاری کر دیا کہ فوج میں عباسی حکومت کے رنگ کے بجائے آئندہ سے سبز فاطمی رنگ کی وردیاں استعمال کی جائیں اور فوج و بنی ہاشم سے علی بن موسیٰ رضا کی بیعت لی جائے۔

امام موسیٰ رضا کی شرافتِ نفس

بغداد کے عباسی بگڑ گئے۔ لیکن ذوالریاستین نے اپنے مصالح کی بنا پر مامون کو اس کی خبر نہ ہونے دی۔ امام علی رضا کو اس کی اطلاع مل چکی تھی انھوں نے صحیح واقعات اس کے گوش گزار کیے۔ اور اس نے بتایا کہ اہل بغداد نے آپ کی بیعت توڑ کر ابراہیم کو خلیفہ بنا لیا ہے۔ مامون نے کہا فضل کی اطلاع تو یہ ہے کہ خلیفہ نہیں بلکہ امیر بنایا ہے۔ امام موصوف نے اس کی تردید کی اور متعدد فوجی افسروں نے اس کی شہادت دی۔ کہ فضل آپ سے اصلی واقعات چھپاتا ہے۔ واقعہ یہی ہے کہ اہل بغداد نے ابراہیم کی بیعت کر لی ہے۔ اور اس کو "سنی" خلیفہ کا لقب دیا ہے۔ اور امام رضا کی ولی عہدی کی وجہ سے آپ پر رفض کا اتہام لگاتے ہیں۔ اور یہ حقیقت بھی ظاہر کی کہ گزشتہ انقلاب میں صرف ہرثمہ نے آپ کی خلافت بچائی تھی۔ اور آپ کے پاس خیر خواہانہ مشورہ دینے کے لیے آیا تھا لیکن فضل نے اس کو قتل کرا دیا۔ طاہر جس کے دست بازو نے آپ کو مسند خلافت پر بٹھایا اس کو فضل نے رقہ کے ایک گمنام گوشے میں

ڈال دیا ہے اور اس کی بے مثل شجاعت سے حکومت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا ہے اگر وہ اس وقت موجود ہوتا تو یہ واقعات رونما نہ ہونے دیتا، ان واقعات کے سنانے کے بعد افسروں نے درخواست کی آپ بغداد چلیے۔ بغدادی آپ کو دیکھ کر اب بھی سر اطاعت خم کر دیں گے۔

ذوالریاستین کا قتل

اصل واقعات کے بے نقاب ہونے کے بعد رجب ۲۰۲ھ میں مامون مرو روانہ ہوا۔ ابھی مامون سرخس پہنچا تھا کہ ۲ شعبان ۲۰۲ھ کو ذوالریاستین فضل بن سہل ایک حمام میں خفیہ قتل کر دیا گیا اور قاتل روپوش ہو گیا۔ مامون نے اس کا پتہ چلانے کے لیئے دس ہزار انعام مقرر کیا۔ عباس بن ہیثم دینوری نے ان کو گرفتار کیا۔ ان میں سے ایک غالب مسعودی، دوسرا قسطنطین رومی، تیسرا فرج دیلمی اور چوتھا موفق صقلبی تھا۔ یہ سب مامون کے سامنے پیش ہوئے اور کہا کہ آپ ہی نے ہمیں قتل کا حکم دیا تھا۔ مامون اس پر بہت برہم ہوا۔ اور اسی وقت سب کے سر قلم کر کے فضل کے بھائی حسن کے پاس بھجوا دیے۔ اور تعزیت میں لکھا کہ فضل کے قتل سے آپ لوگوں پر جو مصیبت پڑی ہے اس کا مجھے خوب اندازہ ہے اور اس کی تلافی کے لیے فضل کی جگہ حسن کو وزارت عظمیٰ پر فائز کیا۔ اور اس کی لڑکی بوران سے شادی کی۔ اس حسن تلافی سے بڑی حد تک حسن کو تسلی ہو گئی۔

امام رضا کی وفات

مامون کو امام علی رضا سے اتنی محبت تھی کہ اس نے اپنی ایک لڑکی ام حبیب ان سے بیاہ دی تھی۔ اور دوسری ام فضل محمد بن علی رضا سے۔ شادی کے چند ہی دنوں بعد علی رضا دفعۃً انتقال کر گئے۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ یہ موت انگور کھانے سے ہوئی۔ اسی لیے بعض مؤرخین لکھتے ہیں کہ ان انگوروں میں خود مامون نے زہر ملوا دیا تھا۔ لیکن یہ روایت ناقابل اعتبار ہے جس پر ہم آگے چل کر گفتگو کریں گے۔

مقتول امین سے مامون کا تعلق خاطر

۲۰۵ھ میں مامون نے اپنے مشہور و معروف جنرل طاہر بن حسین کو تمام مشرقی ممالک یعنی خراسان

سے لے کر سندھ تک کا گورنر جنرل مقرر کیا۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ ایک دن مامون اپنی بزم عیش میں نبیذ پی رہا تھا کہ طاہر آیا، مامون نے اسے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ طاہر نے دست بستہ عرض کی، خادم کو آقا کے سامنے بیٹھنے کی مجال نہیں۔ مامون نے کہا یہ آداب دربار میں ہیں نجی صحبتوں میں ان کے برتنے کی ضرورت نہیں۔ اثنائے گفتگو میں طاہر کی نظر مامون کی آنکھوں پر پڑی، دیکھا کہ ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ عرض کی ایسے وقت میں جب کہ پورا ملک حضور کے زیر فرمان ہے، رعایا مطیع اور اس کے دل میں حضور کی محبت ہے۔ رونے کا کیا موقع ہے۔ مامون نے کہا اس راز کا افشا کرنا ذلت آمیز اور چھپانا تکلیف دہ ہے۔ اس کے بعد طاہر چلا گیا۔ لیکن اس کے دل میں برابر یہ راز کھٹکتا رہا۔ اور اس نے مامون کے ساقی اور ندیم خاص حسین کو دو لاکھ درہم دیے کہ وہ کسی موقع پر اس معمے کو حل کرے۔ چنانچہ دوسرے دن جب مامون نے نبیذ مانگی تو حسین نے اصرار سے پوچھا گزشتہ شب طاہر کے آنے پر حضور کی آنکھیں کیوں ڈبڈبا آئی تھیں؟ مامون نے کہا تم اس راز کو کیوں پوچھتے ہو؟ اس نے کہا اس واقعے نے مجھ کو پریشان کر رکھا ہے۔ مامون نے کہا اچھا میں بتلائے دیتا ہوں، لیکن اگر تم نے اس کو اپنی زبان سے نکالا تو سر قلم کر دوں گا۔ واقعہ یہ ہے کہ جب میں طاہر کو دیکھتا ہوں تو بھائی امین کی ذلت اور بے کسی کی موت کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ مجھ کو خطرہ ہے کہ کسی دن طاہر کو میرے ہاتھ سے نقصان نہ پہنچ جائے۔ طاہر کو یہ راز معلوم ہوا تو وہ بہت گھبرایا۔ اس نے وزیر اعظم احمد بن ابی خالد سے درخواست کی کہ وہ اسے کسی طرح مامون سے دور کسی مقام پر بھجوا دے۔ اس نے وعدہ کیا۔ چنانچہ دوسرے دن جب وزیر مذکور دربار گیا تو اس نے مامون سے کہا کہ مجھے رات بھر نیند نہیں آئی۔ اس نے پوچھا کیوں؟ کہا آپ نے غسان کو خراسان کا والی بنایا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر کسی دن ترک اٹھ کھڑے ہوئے تو اس کا خاتمہ کر دیں گے۔ مامون نے کہا: میں بھی اس پر غور کر رہا ہوں۔ تمھاری نظر میں کون اس عہدے کا اہل ہے اس نے طاہر کا نام لیا۔ مامون نے کہا مجھ کو اس کی طرف سے بغاوت کا خطرہ ہے۔ احمد نے کہا میں اس کا ذمہ دار ہوں۔ احمد کی سفارش پر مامون نے ذیقعدہ سنہ ۲۰۶ھ میں

طاہر کو کل مشرقی صوبہ جات کا گورنر بنا دیا۔

مامون کا خطرہ بالکل صحیح نکلا، طاہر تقرر کے دو ہی سال بعد باغی ہو گیا۔ اور خطبہ میں اس کا نام نہیں لیا۔ مامون کو خبر ہوئی تو اس نے احمد بن ابی خالد کو بلا کر کہا کہ تمھاری ذمہ داری پر اس کا تقرر ہوا تھا ہٰذا اسے فوراً حاضر کرو۔ لیکن بغاوت کی خبر کے بعد ہی اس کی موت کی خبر آگئی۔ اس لیے احمد بن ابی خالد مواخذہ سے بچ گیا۔

بابک خرمی کا فتنہ اور اس کے نتائج

۲۰۱ھ میں بابک خرمی ایک نئی تحریک لے کر اٹھا۔ یہ تحریک ایران کے پرانے مذہب مزدکی کی پیداوار ہے مزدکی مذہب کے ایران سے مٹنے کے بعد سب سے پہلے ایک مجوسی جاویدان نے اس کو زندہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ دوسرے عجمی مذاہب کی طرح تناسخ اس کا بنیادی عقیدہ تھا اور چونکہ اس عقیدہ میں فنا نہیں ہے بلکہ محض قالب بدلتا رہتا ہے اس لیے اس نے اپنا لقب جاویدان یعنی ہمیشہ رہنے والا رکھا۔ اسلامی عہد میں بابک نے اس کو زندہ کرنے کی کوشش کی اور دعویٰ کیا کہ تناسخ کے ذریعے جاویدان کی روح اس میں منتقل ہو گئی ہے۔ اور وہ اس کا جانشین ہے۔

مزدکی مذہب میں اباحیت یعنی جنسی تمتع کے لیے بلا کسی قید کے مطلق آزادی کی خاص تعلیم تھی۔ اسی لیے بابک نے خرمی یعنی شادمانی اپنا لقب رکھا۔ اس آزادی کی وجہ سے ہزاروں آدمی اس میں شریک ہو گئے۔

یہ تحریک گو مذہبی رنگ میں تھی لیکن مسلمانوں کے خلاف حقیقت میں ایک سیاسی تحریک تھی۔ چنانچہ بابک نے اسلامی آبادیوں پر حملہ کر کے ہزاروں مسلمان تہ تیغ کر دیے۔ مامون نے کئی فوجیں اس کے مقابلے کے لیے روانہ کیں۔ لیکن سب ناکام واپس ہوئیں۔ ۲۱۲ھ میں محمد بن حمید اس مہم پر مامور ہوا۔ چنانچہ وہ زریق کو مطیع بنانے کے بعد بڑے اہتمام سے مقابلے کے لیے نکلا۔

بابک نے ایک دشوار گزار کوہستان کو اپنا مرکز بنایا تھا۔ محمد بن حمید اس کو طے کر کے مقام ہشتادسر پہنچا اور فوجوں کو از سر نو مرتب کر کے آگے روانہ کر دیا۔ اور خود ان کی حفاظت

کے لیے پیچھے رہا۔ بابک پہاڑی کے اوپر دروں میں چھپا ہوا تھا۔ جیسے ہی مسلمان اس کی زد پر پہنچے بابک دفعتہً کمین گاہ سے نکل کر ان پر ٹوٹ پڑا۔ محمد بن حمید نے ہرچند مسلمانوں کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ لیکن بابک کا حملہ ایسا ناگہانی اور سخت تھا کہ وہ سنبھل نہ سکے اور خرمیوں نے محمد بن حمید کو قتل کر دیا۔

فتوحات اور کامرانیاں ۲۰۱ھ میں عبداللہ بن خرداذبہ والی طبرستان نے دیلم پر چڑھائی کی۔ اور بلاذر، شیزر اور طبرستان کے بعض کوہستانی علاقوں کو فتح کر کے ابولیلیٰ بادشاہ دیلم اور کوہستانی علاقے کے بعض فرماں رواؤں کو مامون کی خدمت میں بھیجا۔

۲: محرم ۲۰۲ھ میں مامون نے بہ نفسِ نفیس ایشیائے کوچک پر فوج کشی کی اور منبج، وابق، انطاکیہ، مصیصہ اور طرطوس ہوتا ہوا ایشیائے کوچک میں داخل ہوا۔ اور حصن ماجد کو صلحاً اور حصن قرہ کو بزورِ شمشیر فتح کر کے برباد کر ڈالا۔ اور امیر اشناس کو حصن سندس اور جعفر کو حصن ستاذ پر مامور کیا۔ اشناس کے قلعہ دار کو گرفتار کر لیا۔ اور ستاذ کے قلعدار نے اطاعت قبول کر لی۔ اور مامون ظافر وغانم دمشق واپس آگیا۔

۳: اس کے ایک سال بعد رومیوں نے طرطوس اور مصیصہ کے کئی ہزار مسلمان قتل کر ڈالے مامون کو اس کی خبر ہوئی تو ۲۱۷ھ میں پھر روم پر فوج کشی کی اور انطیغوا کا محاصرہ کر لیا یہاں کے باشندوں نے صلح کر لی اور ہرقلعہ کا رُخ کیا۔ یہاں کے باشندوں نے بھی مصالحت کر لی اور مامون نے معتصم کو رومی قلعوں کی تسخیر پر مامور کیا۔ اس نے تیس قلعے اور مطمورہ کو فتح کیا۔ اور قاضی یحییٰ ابن اکثم نے بہت سے رومی گرفتار کیے۔ اور مامون کیسوم ہوتا ہوا دمشق لوٹ آیا۔

۲۱۸ھ میں پھر نکلا اور لولوہ کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ اس میں کامیابی نہ ہوئی اس لیے عجیف کو متعین کر کے خود لوٹ گیا۔ واپسی میں وہ مرض الموت میں مبتلا ہو گیا جس کا ذکر آئندہ آئے گا۔

۵: جزیرہ کریٹ کا کچھ حصہ ولیدا موی اور اس کے بعد ہارون کے زمانہ میں فتح ہوا تھا۔

مامون کے زمانہ میں ابو حفص عمر بن علیسی اندلسی نے یہاں ایک اور قلعہ فتح کیا اور رفتہ رفتہ پورا جزیرہ مسلمانوں کے قبضے میں آگیا۔

مامون کا دوسرا وزیر حسن بن سہل

مامون کا دوسرا وزیر فضل کا چھوٹا بھائی حسن تھا۔ فضل کے قتل کے بعد مامون نے اس کی دل دہی کے لیے اس کو وزیر بنایا اور اس کی لڑکی بوران سے شادی کی۔ حسن میں فیاضی اور اولوالعزمی کا وصف زیادہ نمایاں تھا۔ بوران کی شادی میں اس نے جس فیاضی کا مظاہرہ کیا اس کی مثالیں کم ملیں گی۔

بوران بنت حسن سے مامون کی شادی

مؤرخین کا بیان ہے کہ تاریخ اسلام میں اس شان کی شادی کی دوسری مثال نہیں ملتی اور اسے عہد مامونی کے اہم واقعات میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ شادی فم صلح میں ہوئی تھی۔ بارات میں مامون کا سارا خدم وحشم، فوج اور جملہ عمائد شریک تھے۔ ۱۹ دن تک بارات مقیم رہی۔ حسن نے بڑی اولوالعزمی سے بارات کی مدارات کی۔ یہ واقعہ خاص طور سے لائق ذکر ہے کہ شادی کے دن کاغذ کے پرزوں پر نقدی، جائداد، غلام اور ہر قسم کا نقد وجنس اور ساز وسامان لکھ کر ان کی گولیاں بنا کر لٹائیں۔ جس کو جو گولی ملی فوراً اس کی مرقومہ چیز اس کے حوالے کی گئی۔ ان گولیوں کے علاوہ طلائی اور نقرئی سکے براتیوں پر لٹائے گئے۔ مامون کے بیٹھنے کے لیے خالص سونے کا فرش تھا، جیسے ہی اس نے اس پر قدم رکھا اوپر سے سچے موتی نچھاور کیے گیے۔ اور جب پہلی مرتبہ مامون بوران سے ملا تو بوران کی دادی نے دولھا دلھن پر سے ایک ہزار بیش قیمت درِ یتیم نچھاور کیے۔ مؤرخین اس شادی کے اخراجات کا اندازہ پانچ کروڑ کرتے ہیں۔

حسن وزارت سے پہلے طاہر کے مفتوحہ ممالک کا والی تھا۔ فضل کے بعد وزیر اعظم ہوا۔ لیکن اس کو فضل کے قتل کا ایسا شدید قلق اور اس کے دماغ پر اتنا اثر تھا کہ کچھ ہی دنوں کے بعد جنون ہو گیا اور اسی حال میں ۲۳۶ھ میں وفات پائی۔

ولیعہد کی نامزدگی اور وفات

مامون نے ارض روم پر فوج کشی کی تھی۔ واپسی میں ایک مقام پر منزل ہوئی قریب ہی دریائے بدندون تھا، اس کی سیر کو گیا

اور تفریحاً دریا میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ اور پانی کی ٹھنڈک اور صفائی کی تعریف کرنے لگا اسی درمیان میں سرکاری ہرکارہ پہنچا اور عراق کے تازہ تازہ کھجور لایا۔ مامون اور اس کے ساتھیوں نے یہیں بیٹھے بیٹھے تازہ کھجور کھائے اور دریا کا پانی پیا۔ معلوم نہیں اس میں کیا اثر تھا کہ یہاں سے اٹھتے اٹھتے سب کو بخار آ گیا مامون کو ایسا سخت آیا کہ پھر نہ اترا۔ شاہی طبیب بختیشوع اور ابن ماسویہ ہمرکاب تھے۔ ہر طرح کی تدبیر کی مگر کوئی علاج کارگر نہ ہوا۔ اور بہت جلد معمولی بخار نے مرض الموت کی شکل اختیار کر لی۔ اس کا لڑکا عباس اور بھائی معتصم ساتھ تھے۔ فقہا اور قضاۃ کے روبرو معتصم کو ولی عہد نامزد کر کے ضروری وصیتیں کیں۔

اس سے فراغت کے بعد حالت اور بگڑ گئی۔ لوگوں نے کلمۂ شہادت کی تلقین کی۔ ابن ماسویہ طبیب نے روکا کہ اس وقت ان میں "مانی" اور خدا میں امتیاز کی صلاحیت نہیں ہے۔ یہ سن کر مامون نے آنکھیں کھول دیں اور ابن ماسویہ کو پکڑنے کا قصد کیا مگر طاقت جواب دے چکی تھی۔ کچھ بولنا چاہا مگر زبان نے یاری نہ دی۔ بمشکل اتنا کہا کہ اے وہ جسے وہ کبھی موت نہ آئے گی۔ اس پر رحم فرما جو مر رہا ہے۔ یہ کہہ کر جمادی الثانی ۲۱۸ھ میں جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ لاش طرطوس لے جا کر دفن کی گئی۔ وفات کے وقت ۴۸ سال کی عمر تھی۔ مدت خلافت بیس سال پانچ مہینے۔

مامون کی علمی سرپرستیاں اور علمی کارنامے مامون نے رومی کتب خانوں کی قدیم کتابوں کی فرمائش میں سلاطین روم کے پاس خطوط لکھے۔ اور حجاج ابن مطر، ابن البطریق اور بیت الحکمۃ کے ناظر کو بھیجا کہ یہ لوگ خود جا کر کتابیں منتخب کر کے لائیں۔ ان کے آنے کے بعد یوحنا ابن ماسویہ ان کے ترجمہ پر مامور ہوا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ عقلی علوم روما میں معصیت سمجھے جاتے تھے۔ اور یہاں سے علم وفن کا چرچا اٹھ چکا تھا۔ چنانچہ جب مامون کا خط قیصر کے پاس پہنچا اور اس نے کتابوں کی تلاش شروع کی تو ایک خانقاہ نشین راہب نے پتہ بتایا کہ فلاں مقام پر ایک مقفل مکان ہے جس میں قسطنطین نے تمام یونانی کتابیں بند کرا دی تھیں۔ اس وقت سے جو بادشاہ ہوتا ہے وہ اس پر ایک قفل کا اور اضافہ کرتا ہے۔ قیصر نے اعیان سلطنت سے مشورہ کیا۔ سب نے کھولنے

کا مشورہ دیا پھر راہب سے پوچھا کہ اگر یہ کتابیں اسلامی ممالک میں بھیج دی جائیں تو مجھ پر دنیا میں کوئی وبال یا آخرت میں مواخذہ تو نہ ہوگا۔ تجربہ کار راہب نے جواب دیا، وبال و مواخذہ نہیں بلکہ ثواب ملے گا۔ کیونکہ یہ چیزیں جس مذہب میں داخل ہوئیں اس کی بنیادیں ہلا دیں۔ چنانچہ مقفل خزانہ کھولا گیا۔ اور اس میں سے بے شمار قدیم یونانی کتابیں نکلیں اور وہ سب مسلمانوں کے ملک میں روانہ کی گئیں۔ مامون نے ان سب کا ترجمہ کرایا۔

بعض مترجمین کے نام یہ ہیں:

یعقوب بن اسحٰق کندی۔ یہ مسلمانوں میں پہلا شخص ہے جس نے فیلسوف عرب کا معزز لقب حاصل کیا۔ اس کی چھوٹی بڑی تالیفات و تراجم کی تعداد پچاس سے اوپر ہے۔

حنین بن اسحٰق عبادی۔ یہ اپنے عہد کا بڑا صاحب کمال نصرانی طبیب تھا اس کو یونانی، سریانی اور عربی تینوں زبانوں میں کامل دست گاہ حاصل تھی۔ اس نے یونانی کتابوں کے بکثرت عربی اور سریانی تراجم کیے۔ اس کی تالیف و تراجم بے شمار ہیں۔

قسطا بن لوقا بعلبکی نصرانی۔ یہ دولت عباسیہ کا مشہور مترجم ہے اس کو ریاضی ہندسہ ہیئت منطق۔ طب اور علوم طبعیہ میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ یہ عباسیہ کے زمانے میں روم گیا۔ اور وہاں سے بہت سی رومی تصانیف ساتھ لایا۔ مترجم کی حیثیت سے بغداد طلب کیا گیا چنانچہ یونانی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرتا تھا۔

عمر بن فرخان طبری، یہ علم ہیئت کا بڑا زبردست ماہر تھا۔ مامون کے وزیر فضل بن سہل نے اس کو بلا کر مترجمین کے زمرہ میں منسلک کیا۔ اس نے بہت سی نجوم کی کتابیں مامون کے لیے ترجمہ کیں۔ نجوم کے علاوہ اس نے فلسفہ کی بعض کتابیں بھی مامون کے لیے لکھیں۔

مامون کی فارسی علوم سے دلچسپی اور شغف

مامون کو یونانی علوم کے ساتھ فارسی علوم سے بھی دلچسپی تھی۔ برامکہ نے اپنے زمانۂ عروج میں فارسی لٹریچر کا بڑا ذخیرہ عربی میں منتقل کرایا تھا، مامون کے زمانے میں یہ عالی شان خاندان تباہ ہو چکا تھا اس لیے فارسی لٹریچر کی قومی سرپرستی ختم ہو گئی تھی۔ تاہم مامون نے یونانی تراجم کی طرح ماہر عجمی مترجمین فراہم کیے تھے۔ مامون ان مترجموں کو بیش قرار معاوضہ دیتا تھا چنانچہ

علاوہ انعام واکرام کے مترجمہ کتاب کو تول کر اس کے ہم وزن سونا دیتا تھا۔

عہدِ مامون میں علمِ ہیئت اور افلاک کی ترقی

مامونی عہد میں علمِ ہیئت میں بھی بڑی ترقی ہوئی۔ چنانچہ کرۂ ارض کی پیمائش اور رصد خانہ کا قیام سب سے پہلے تاریخ اسلام میں اسی عہد میں ہوا۔ اس وقت علمائے ہیئت مجسطی کی وجہ سے آلاتِ رصد سے کافی طور سے واقف ہو چکے تھے۔ مامون نے ان کو جمع کر کے بطلیموس اور دوسرے علمائے ہیئت کے طرز پر قوانین مرتب کرنے کا حکم دیا۔ جن کے ذریعے کواکب کا رصاد کیا جا سکے۔ چنانچہ یحییٰ بن ابی منصور، خالد بن عبدالملک مروزی سند بن علی اور عباس بن سعید نے زیجیں تیار کر کے شماسیہ کے شہر میں رصد خانہ قائم کیا اور اس کے ذریعے آفتاب اور بعض دوسرے ثوابت اور سیارات کے حالات معلوم کیے یہ رصد خانہ تاریخ اسلام میں پہلا رصد خانہ تھا اور رصد مامونی کے نام سے موسوم تھا۔

مامون کی دادرسی اور شانِ عدل

اس کے ایوانِ عدالت میں ادنیٰ اور اعلیٰ سب یکساں تھے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی شاہزادوں تک سے اپنا حق لے سکتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک شکستہ حال بوڑھی عورت نے استغاثہ دائر کیا کہ مامون کے لڑکے عباس نے اس کی جائداد پر غاصبانہ قبضہ کر لیا ہے۔ جب مقدمہ پیش ہوا تو مامون نے عباس کو بوڑھی کے پاس کھڑا کر کے دونوں کے بیانات لیے۔ شاہزادہ فرطِ ادب میں آہستہ آہستہ بولتا اور بوڑھی کی آواز بلند تھی۔ وزیر دولت احمد بن ابی خالد نے روکا کہ امیر المومنین کے سامنے بلند آواز سے باتیں کرنا خلافِ ادب ہے۔ مامون نے منع کیا کہ جس طرح کہتی ہے کہنے دو۔ حق نے اس کی آواز بلند کر دی ہے اور عباس کو گونگا کر دیا ہے۔ دونوں کے بیانات سننے کے بعد بڑھیا کے حق میں فیصلہ دیا۔ اور موکل کو لکھ کر اس کی جائداد واپس کر دی اور بڑھیا کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید کر دی۔

مامون کی حیاتِ رنگین۔ فکر و عقائد کا تنوع

مامون کی زندگی کے دو رخ تھے۔ نبیذ پیتا تھا، موسیقی کا شائق تھا، خود بھی اس کا ماہر تھا۔ اس کے دربار میں بڑے بڑے صاحبِ کمال مغنی جمع تھے۔ رقص و سرود

کی محفلیں ہوتی تھیں۔

دوسرا رُخ مذہبی زندگی کا تھا۔ اس کے بعض عقائد شیعی تھے، بعض اہل سنت کے اور بعض فلسفیانہ۔ حافظِ قرآن تھا۔ خلفائے راشدین کو چھوڑ کر یہ دولت کسی اور کے حصے میں نہ آئی تھی۔

رسالت مآبؐ سے مامون کی شیفتگی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ مبارک سے بڑی شیفتگی تھی۔ دمشق کے دورہ کے زمانہ میں آپ کا ایک فرمانِ مبارک جو غالباً کسی قوم سے معاہدہ پر مشتمل تھا۔ اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ اُسے آنکھوں سے لگا کر رو دیا اور اس میں جو معاہدہ تھا اسے قائم رکھا اور کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو عہد کیا تھا اس کو میں نہیں توڑ سکتا۔ واثق کی آنکھ میں کچھ شکایت تھی اسے دیا کہ اس کو آنکھوں سے لگاؤ، اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ شفا دے گا۔

مامون الرشید اور شیعیت بعض مسائل میں شیعوں کا ہم عقیدہ تھا۔ چنانچہ حضرت علیؓ کو شیخین سے افضل مانتا تھا۔

درحقیقت وہ موجودہ اصطلاحی معنوں میں نہ سنّی تھا نہ شیعہ بلکہ ایک آزاد مشرب تھا۔ فلسفہ کے مطالعے اور مختلف قوموں کے علماء کی صحبت نے اس کے خیالات کو آزاد کر دیا تھا۔ خلقِ قرآن کا عقیدہ اسی آزاد خیالی کا نتیجہ تھا، شیعہ وہ اس لیے نہ تھا کہ وہ حضرت علیؓ کو شیخین سے افضل مانتا تھا۔ لیکن اور خلفاء سے سوئے ظن نہ رکھتا تھا۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت عائشہ رضؓ سے حسنِ عقیدت کے ثبوت میں اس کے اشعار موجود ہیں۔

مامون کی اہلِ بیتِ نبوی سے محبت مامون اپنے اسلاف کے برعکس اہل بیت کے ساتھ بڑی محبت و عقیدت رکھتا تھا۔ امام علی رضاؓ کو ولی عہد تک نامزد کر دیا تھا۔ یہ محبت امام علی رضاؓ تک محدود نہ تھی بلکہ وہ اہلِ بیتِ نبوی کے ہر فرد کے ساتھ خوش عقیدہ تھا، اس کے زمانے میں ایک بزرگ یحییٰ بن حسین بن زید بن علی بن حسین علوی کا انتقال ہوا۔ مامون کو ان کی موت کا سخت قلق ہوا اور خلفاء کے دستور کے خلاف خود ان کے جنازہ میں شرکت کی۔

اموی اور عباسی دونوں زمانوں میں علویوں پر حکومت کے عہدوں کے دروازے بند تھے۔ مامون نے انھیں بڑے بڑے عہدوں پر مقرر کیا۔ اس کے خاندان کی ایک خاتون نے اس پر اعتراض کیا۔ مامون نے جواب دیا کہ میں گزشتہ خلفاء کی فروگذاشت کی تلافی کر رہا ہوں۔

باغ فدک کی واپسی اس کی اس عقیدت کو دیکھ کر اہل بیت کے چند افراد نے فدک کی واپسی کی درخواست کی۔ اس نے اس بارہ میں تحقیقات اور علماء سے استصواب کے بعد فدک یحییٰ بن حسین کے لڑکے محمد کے حوالے کر دیا۔

مامون کی سخاوت اور دریا دلی الفخری کا بیان ہے:

مامون دمشق میں تھا تو اس پر سخت تنگی آگئی اور رقم بہت تھوڑی رہ گئی۔ اس نے اپنے بھائی معتصم سے تنگی کی شکایت کی۔ اس کے زیر انتظام چند صوبے تھے۔ معتصم نے کہا: امیر المومنین آپ سمجھیے کہ رقم آپ ہی کے پاس ہے۔ آئندہ ہفتے آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائے گی۔ انہی ایام میں چند ان صوبوں سے جن کا گورنر معتصم تھا تیس ارب درہم آئے۔ اس نے یحییٰ بن اکثم سے کہا۔ آؤ چلو ذرا اس رقم کو تو دیکھ لیں۔ مامون نے اس دولت کے ایک معقول حصے کو دیکھا۔ اور لوگوں نے بھی اس رقم خطیر کو دیکھا اور خوش ہو گئے مامون نے کہا یہ دولت لے کر ہم گھر واپس جائیں اور لوگ اپنے گھروں کو خالی ہاتھ واپس جائیں یہ بڑے شرم کی بات ہے۔ اس نے اپنے منشی کو بلا کر کہا کہ فلاں کو دس لاکھ دو اور فلاں کو دس لاکھ اور فلاں کو اتنا زیادہ دے دو۔ اس طرح اس نے چوبیس ارب درہم وہیں ختم کر دیے۔ اس وقت مامون کے پاؤں رکاب میں تھے۔ باقی چھ ارب اس نے فوجی ضروریات کے لیے دے دیے۔

امام علی رضا کا ولی عہد بننے سے انکار مامون اپنے بعد خلافت کے معاملے پر غور کیا کرتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ خلافت کسی ایسے کے پاس جائے جو واقعی اس کا اہل ہو۔ تاکہ وہ (مامون) اپنے خیال کے مطابق بری الذمہ ہو جائے۔ کہتے ہیں کہ اس نے دونوں گھرانوں۔ عباسی اور علوی گھرانے کے اعلیٰ افراد پر نظر دوڑائی تو اسے علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے زیادہ افضل، متقی اور دیندار کوئی نظر نہ آیا اس لیے مامون نے

انہی کو ولی عہد بنا دیا۔ اور اپنے ہاتھ سے ایک خط لکھ کر جناب رضاؑ کو ولیعہدی قبول کرنے پر مجبور کیا۔ آپ نے پہلے تو انکار کیا پھر قبول کر لیا اور مامون کے خط کی پشت پر یہ جواب لکھا کہ میں نے تمھاری فرمائش کے مطابق ولی عہدی قبول کر لی ہے۔ اگرچہ علمِ جفر اور علمِ جامعہ دونوں اس کے خلاف جا رہے ہیں۔ دونوں (مامون اور رضا) کے دستخطوں پر گواہیاں ثبت ہو گئیں۔

مامون نے سنہ ۲۰۰ھ میں آلِ عباس کے اکثر افراد کو اپنے پاس مرو میں طلب کیا اور مہینوں اپنا مہمان رکھا مگر مامون کی نظرِ انتخاب میں کوئی کامل العیار نہ نکلا۔ آخر فضل بن سہل اور دوسرے محبانِ اہلبیت نے اس کی توجہ علی رضا بن موسیٰ کاظم کی طرف منعطف کی اور حقیقت یہ ہے کہ علی رضا اپنی قابلیت کے اعتبار سے بنی ہاشم میں سب پر فائق تھے چنانچہ مامون الرشید نے بلا تامل اپنی لڑکی کی شادی علی رضا سے کر دی اور ماہ رمضان المبارک سنہ ۲۰۱ھ میں علی رضا کو اپنا ولیعہد مقرر کر کے موتمن اپنے بھائی کو جو ہارون رشید کی وصیت کے مطابق مامون کا ولیعہد تھا ولی عہدی سے معزول کر دیا۔ موتمن کے معزول کر دینے کا خود ہارون نے مامون کو اختیار دے دیا تھا موتمن کی معزولی کا کوئی الزام مامون پر نہیں دیا جا سکتا۔

امام علی رضاؑ کی وفات پر مامون کا قلق

خلیفہ مامون الرشید اپنی بیٹی ام حبیب کا عقد علی رضا سے پہلے کر چکا تھا۔ اب اس نے دوسری بیٹی ام الفضل کا جو بہت ہی کم سن تھی عقد علی رضا کے بیٹے محمد بن علی رضا سے کر دیا مگر رخصتی آئندہ زمانے پر جب کہ لڑکی بالغ ہو جائے ملتوی رکھی گئی۔ چنانچہ یہ رخصتی سنہ ۲۱۵ھ میں ہوئی۔

مامون الرشید ماہ رجب سنہ ۲۰۲ھ میں مرو سے روانہ ہوا اور ۱۵۔ صفر سنہ ۲۰۴ھ کو بغداد پہنچا۔ یہ سفر مامون نے قریباً ڈیڑھ برس میں طے کیا۔ اور راستے میں ہر ایک مقام پر ہفتوں اور مہینوں ٹھہرتا ہوا بغداد کی طرف آیا۔ اس سفر میں ملک کے حالات سے اس کو خوب واقفیت ہوتی رہی۔ اور بغداد میں اس کے پہنچنے سے پہلے ہی حالات اس کے موافق ہوتے گئے۔ اسی سفر میں مامون الرشید نے بماہ ذیقعدہ علی رضا کے بھائی ابراہیم بن موسیٰ کاظم کو امیر الحج مقرر کر کے بھیجا۔ اور صوبۂ یمن کی گورنری بھی اس کو عطا کر دی۔ طوس میں پہنچ کر قیام کیا۔ اور اپنے باپ ہارون الرشید کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔

طوس میں ایک مہینے سے زیادہ قیام رہا۔ یہیں ایسا اتفاق پیش آیا کہ ولی عہد خلافت امام

علی رضاؒ نے انگور کھانے کی وجہ سے یکا یک انتقال کیا۔

مامون کو ان کی وفات کا سخت صدمہ ہوا۔ جنازہ کے ساتھ ننگے سر گیا اور رو رو کو کہنے لگا کہ اے ابوالحسن! تیرے بعد اب میں کہاں جاؤں اور کیا کروں؟ تین دن تک قبر پر مجاور رہا ایک روٹی اور نمک اس کی غذا تھی ــــــ اپنے باپ ہارون الرشید کی قبر اکھڑوا کر اسی قبر میں علی رضا کو بھی اپنے باپ کے پاس دفن کیا۔ تاکہ علی رضاؒ کی برکت سے ہارون الرشید کو بھی فائدہ پہنچے۔

علی رضا کے ساتھ مامون رشید کو بڑی عقیدت تھی۔ یہ خیال کہ مامون الرشید نے خود علی رضا کو انگوروں میں زہر دلوایا سراسر غلط اور نادرست ہے۔ اس لیے کہ علی رضاؒ کی ولیعہدی کے لیے مامون الرشید کو مجبور نہیں کیا گیا تھا۔ اس نے اپنی خوشی سے ان کو ولی عہد بنایا۔ اپنی خوشی سے اپنی دو بیٹیوں کی شادی علی رضاؒ اور علی رضا کے بیٹے محمدؒ کے ساتھ کی۔ بلاکسی دوسرے کی تحریک کے علی رضا کے بھائی کو یمن کی گورنری دی اور امیر الحج مقرر کیا۔ جس شخص کو وہ زہر دے کر مروا ڈالنا چاہتا تھا اس کے ساتھ یہ احسانات نہیں کر سکتا تھا۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ جس شخص کو اس نے خود زہر دلوا کر مروا ڈالا تھا اس کو اپنے باپ کی قبر میں دفن نہیں کر سکتا تھا۔ ان کی وفات پر مامون کا اظہار خیال بھی اس بات کا ایک ثبوت ہے۔ اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ مامون الرشید نے آئندہ اپنی حکومت و خلافت میں علویوں کے ساتھ ہمیشہ نیک سلوک کیا اور ان کو بڑے بڑے عہدوں پر مامور کرتا رہا۔ جو دلیل اس بات کی ہے کہ مامون الرشید کو علویوں سے کوئی نفرت نہ تھی۔ اور وہ علویوں کو بہتر حالت میں لانا اور ان پر احسان کرنا چاہتا تھا اگر اس نے علی رضا کو زہر دلوایا ہوتا تو آئندہ اپنے اس طرز عمل کو علویوں کے ساتھ جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ بنو عباس یا ان کے ہوا خواہوں میں سے کسی نے امام علی رضا کو انگوروں میں زہر دیا ہو۔ کیونکہ بنو عباس علی رضاؒ کے معاملے میں مامون الرشید سے ناراض تھے۔

امام علی رضا نے بعمر ۵۵ سال ماہ صفر ۲۰۳ھ میں وفات پائی۔ ۱۴۸ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے تھے۔

خلیفہ معتصم باللہ[1]

مردِ میداں، سالارِ کارواں، شہسوارِ دوراں

قسمت کے کھیل
یہ معتصم ہے!
خود ہارون کی نظر میں گو محبوب لیکن نکما اور نا اہل لڑکا۔

ہارون نے یکے بعد دیگرے تین ولیعہد نامزد کیے۔ پہلا امین، دوسرا مامون اور تیسرا مؤتمن لیکن معتصم میں اسے کوئی اہلیت نظر نہ آئی۔ اور اس کا نام ولی عہدی کی فہرست میں نہ آسکا۔ لیکن جس وقت معتصم کو نکما، نا اہل اور ناکارہ سمجھ کر نظر انداز کیا جا رہا تھا قسمت کے کاغذ پر قدرت کا قلم لکھ رہا تھا کہ اس خاندان کا نام معتصم ہی سے زندہ رہے گا۔ وہی اس بادشاہت اور سلطنت کے سلسلے کو جاری رکھے گا۔ اس کی نسل سے بڑے بڑے تاجدار اور شہریار ابھریں گے اور اپنی ہیبت و جلال کا سکہ دنیا کے دل پر بٹھا کر رہیں گے۔

تاریخ نے اپنے نگار خانے میں سب کے صفات و خصائل مخفی ظاہر کیے ہیں۔ آئیے اس نگار خانہ میں معتصم کا جلوہ دیکھیں۔

نکمّا لیکن محبوب لڑکا
ابو اسحٰق معتصم بن ہارون الرشید ۱۸۰ھ میں ماردہ نامی ام ولد کے بطن سے پیدا ہوا۔ ہارون الرشید کو اس کے ساتھ بہت محبت تھی۔

---

[1] ۲۱۸ھ تا ۲۲۷ھ (۸۳۳ء تا ۸۴۷ء)

وہ اپنی اولاد میں جب کوئی چیز تقسیم کرتا تو سب سے زیادہ حصہ معتصم کو دیا جاتا تھا۔ معتصم کو پڑھنے لکھنے کا مطلق شوق نہ تھا۔ لڑکپن میں اس نے کھیل کود کے اندر اپنا تمام وقت صرف کیا۔ ہارون نے ایک غلام متعین کر دیا تھا کہ وہ معتصم کے ساتھ ساتھ رہے اور جب موقع ملے اسے پڑھائے۔ جب وہ غلام مر گیا تو معتصم کتاب کے جھگڑے سے بالکل ہی چھوٹ گیا۔ معتصم کی نسبت مشہور ہے کہ وہ بالکل ناخواندہ تھا۔ مگر صحیح یہ ہے کہ وہ بہت ہی کم پڑھنا جانتا تھا۔ مگر چونکہ شاہی خاندان اور علماء کی صحبت میں پرورش پائی تھی اور ہارون و مامون کے زمانے کی علمی مجلسوں کے تماشے دیکھے تھے اس لیے واقفیت بہت وسیع تھی۔ معتصم نہایت تنومند پہلوان اور بہادر شخص تھا ساتھ ہی وہ سپہ سالاری کی اعلیٰ درجے کی قابلیت رکھتا تھا۔ ابن ابی داؤد کا قول ہے کہ معتصم اکثر اپنا بازو میری طرف پھیلا کر کہا کرتا تھا کہ خوب زور سے کاٹو۔ میں کاٹتا اور معتصم کہتا کہ مجھے کچھ بھی معلوم نہیں ہوا۔ میں پھر کاٹتا اور پھر بھی کوئی اثر نہ ہوتا۔ میرے دانتوں کا کیا اثر ہوتا اس پر تو نیزہ کا اثر بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ معتصم اکثر اپنی دو انگلیوں سے آدمی کے پہنچے کی ہڈی دبا کر توڑ دیا کرتا تھا۔

شعر و ادب کی قدردانی مسئلہ خلق قرآن

معتصم کبھی کبھی خود بھی شعر کہتا اور شعراء کی خوب قدردانی کرتا تھا۔ مسئلہ خلق قرآن کے خبط میں وہ اپنے بھائی مامون الرشید کی طرح مبتلا تھا۔ جس طرح مامون نے علماء کو اس مسئلے کے متعلق اذیتیں پہنچائیں اسی طرح معتصم باللہ عباسی نے بھی علماء کو تنگ کیا۔ حضرت امام احمد بن حنبل کو اسی مسئلہ خلقِ قرآن کے باعث نہایت بے دردی و بے رحمی سے تکلیفیں اور اذیتیں پہنچائیں۔

مامون نے بیٹے پر بھائی کو ترجیح کیوں دی؟

مامون الرشید کے عہد خلافت میں معتصم باللہ شام و مصر کا گورنر تھا۔ مامون الرشید نے جب بلادِ روم پر چڑھائی کی تو معتصم باللہ نے اپنی شجاعت کے خوب جوہر دکھائے۔ اسی لیے مامون الرشید نے خوش ہو کر اسے ولی عہد بنایا۔ اور اپنے بیٹے عباس کو محروم رکھا۔ معتصم باللہ کی بیعتِ خلافت مامون کی وفات کے دوسرے دن ۱۹۔ رجب ۲۱۸ھ مطابق ۱۰۔ اگست ۸۳۳ء بمقام طرطوس

میں ہوئی۔

طرسوس میں جب معتصم کے ہاتھ پر بیعت ہوئی تو فوج کے اکثر ارکین نے عباس بن مامون کا نام لیا کہ وہ خلافت کا زیادہ مستحق ہے۔ معتصم نے عباس کو طلب کیا اور اس نے معتصم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ عباس کی بیعت کے بعد یہ شورش خود بخود فرو ہو گئی۔

ترکوں کا فوج میں داخلہ

ترکوں کی جنگ جوئی اور سخت کوشی بہت پسند تھی۔ اب تک فوج میں عربی و ایرانی دو ہی قسم کے لوگ ہوتے تھے اور ترکوں سے برابر سرحد پر لڑائی جھگڑے برپا رہتے، کبھی ترک سردار باجگزار بن جاتے کبھی باغی ہو کر مقابلے پر آتے۔ اور فوجی طاقت سے مغلوب و محکوم بنائے جاتے۔ ان پر یہ اعتماد نہیں کیا گیا تھا کہ انھیں فوج میں بھرتی کیا جاتا معتصم نے ان کو اپنی فوج میں اس کثرت سے بھرتی کیا اور ترکوں کو اس قدر فوجی عہدے دیے کہ تعداد کے اعتبار سے بھی ترکی فوج ایرانی فوج کی مدمقابل بن گئی۔ عربی قبائل کم ہوتے ہوتے صرف مصر و یمن کی فوج میں باقی رہ گئے تھے۔ خلیفہ نے تمام عربی النسل دستوں کو ملا کر ایک فوج الگ تیار کی اور اس کا نام مغاربہ رکھا۔

نیا دار الخلافہ ۔ سامرّہ

سمرقند و فرغانہ و اشروسنہ کے ترکوں کی فوج جو سب سے زیادہ زبردست اور بڑی فوج تھی اس کا نام فراغنہ تجویز کیا۔ خراسانی لشکر کو لشکر فراغنہ سے رقابت پیدا ہوئی۔ خلیفہ معتصم نے چونکہ بڑے شوق سے ترکوں کی جدید فوج قائم کی تھی لہٰذا ہر قسم کی مراعات اسی فوج کو حاصل تھیں، ان کی وردی بھی زیادہ قیمتی اور خوبصورت تھی۔ ان کے گھوڑے بھی زیادہ اچھے تھے۔ ان کی تنخواہیں اور وظیفے بھی دوسروں سے زیادہ تھے۔ اس لیے خراسانیوں نے بغداد میں ان سے لڑائی جھگڑے شروع کر دیے۔ معتصم نے یہ رنگ دیکھ کر بغداد سے نوّے میل کے فاصلے پر دجلہ کے کنارے نہر قاطول کے مخرج کے قریب لشکر فراغنہ کی چھاؤنی قائم کی۔ وہیں اس نے ایک قصر اپنے رہنے کے لیے تعمیر کیا، فوج کے لیے مکانات بنوائے۔ بازار و جامع مسجد وغیرہ تمام ضروری عمارات بنوا کر اور ترکوں کو آباد کر کے خود بھی اس نو تعمیر شہر میں چلا گیا۔

اس کا نام سرمن رائے رکھا جو کثرتِ استعمال سے سامرا مشہور ہو گیا۔ اس شہر کی تعمیر ۲۲۰ھ

ہیں ہوئی۔ اور اسی سال بجائے بغداد کے سامرہ دارالخلافہ بن گیا۔ دارالخلافہ ہونے کی وجہ سے چند ہی روز میں سامرا کی رونق و آبادی بغداد کے مدمقابل بن گئی اور عربی و خراسانی عنصر کی بجائے ترکی عنصر دارالخلافہ اور خلیفہ پر مستولی ہوگیا۔ اسی سال محمد بن علی رضا بن موسیٰ کاظم بن جعفر صادق فوت ہو کر بغداد میں مدفون ہوئے۔

معتصم پر احمد بن ابی دؤد کا مرتبہ اور اس کے نتائج

مامون کے زمانے میں جس طرح قاضی یحییٰ بن اکثم اگرچہ وزیر نہ تھے مگر وزیر اعظم سے زیادہ اختیارات و اثر رکھتے اور ہر وقت مامون کے ساتھ رہتے تھے۔ اسی طرح معتصم کے پاس قاضی یحییٰ بن اکثم کے ایک شاگرد احمد بن ابی داؤد رہتے تھے وہ بھی اگرچہ وزیر اعظم نہ تھے مگر وزیر اعظم کے برابر ہی اثر و اقتدار رکھتے تھے۔ یہ دونوں استاد شاگرد متکلم و معتزلی تھے۔ مسئلہ خلق قرآن کی نسبت جو مامون و معتصم نے علماء پر زیادتیاں کی ہیں وہ انہیں دونوں بزرگوں کی تحریک و خواہش کا نتیجہ بیان کی جاتی ہیں۔ صرف ابن ابی داؤد ہی ایک شخص معتصم کے دربار میں تھے جو اہلِ عرب کے حامی و ہوا خواہ تھے اور انھیں کی وجہ سے عرب تھوڑی بہت عزت دارالخلافہ میں رکھتے تھے۔ ورنہ ہر طرف ترکوں یا ان کے بعد ایرانیوں کا غلبہ نظر آتا تھا۔

افشین حیدر ایک نومسلم کا اعزاز

معتصم کے سپہ سالاروں میں حیدر بن کاؤس نامی سب سے بڑا سپہ سالار تھا۔ یہ اشروسنہ کے بادشاہ کا بیٹا تھا جس کا خاندانی لقب افشین تھا۔ یہ مسلمان ہوگیا تھا اور حیدر اس کا اسلامی نام رکھا گیا تھا۔ اس لیے یہ افشین حیدر کے نام سے موسوم ہوا۔ یہ لشکر فراغنہ یعنی ترکی فوج کا سپہ سالار اعظم تھا۔ یہ مامون الرشید کے عہد خلافت میں معتصم کے ہاتھ پر مسلمان ہو کر معتصم کی خدمت میں رہتا تھا۔ معتصم نے اپنی گورنری شام و مصر کے زمانے میں افشین حیدر سے فوجی خدمات لی تھیں اور اس کو جوہر قابل پایا تھا۔ لہٰذا اب تخت خلافت پر بیٹھ کر اس نے لشکر فراغنہ کو مرتب کیا۔ تو افشین حیدر۔ ایتاخ، اشناس، عجیب،

وصیف ۔ بغا کبیر وغیرہ کو جو سب ترک تھے اپنے ترکی لشکر کی سرداریاں عطا کیں ۔ افشین حیدر کو سپہ سالار اعظم بنایا ۔

بابک خرمی کے استیصال کے لیے افشین کا کوچ

ان سب سرداروں کے لیے سامرا میں محلات تعمیر کرائے ۔ معتصم نے بابک کی قوت اور اس ملک کے پہاڑوں کی دشوار گزاری کا اندازہ کر کے افشین حیدر کو اس طرف روانہ کیا ۔ اس کی ماتحتی میں علاوہ ترکی فوجوں کے خراسانی اور عربی فوجوں کے دستے بھی بھیجے گئے ۔ ایک معقول تعداد عام مجاہدین کی بھی بغرضِ جہاد روانہ ہوئی ۔ افشین نے وہاں پہنچ کر نہایت ہوشیاری اور قابلیت کے ساتھ سلسلہ جنگ شروع کیا ۔ معتصم نے افشین کو اس سازوسامان اور لاؤ لشکر کے ساتھ روانہ کرنے کے بعد ایتاخ کو تازہ دم فوج دے کر بطور کمکی روانہ کیا ۔

چند روز کے بعد بغا کبیر کو سامانِ حرب اور ضروری سامان کے ساتھ روانہ کیا ۔ فوج کے تمام مصارف ۔ سامان رسد اور ہر قسم کی ضروریات کے علاوہ دس ہزار درہم روزانہ افشین کے مقرر تھے ۔ یعنی ایامِ محاصرہ اور ایامِ جنگ میں روزانہ دس ہزار درہم اور جن ایام میں محاصرہ و جنگ نہ ہو اور افشین اپنے خیمہ میں رہے ۔ روزانہ پانچ ہزار درہم خزانۂ خلافت سے علاوہ تنخواہ و وظیفہ جنگ بابک میں دیے جاتے تھے ۔ جنگ بابک کا سلسلہ قریباً ڈیڑھ سال تک جاری رہا ۔

افشین کی کامیاب جنگی تدبیریں ، بابک کی گرفتاری

افشین اردبیل پہنچ کر ایک جنگی چوکی قائم کر کے پھر آگے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اسی طرح چوکیاں قائم کرتا گیا ۔ تاکہ سامانِ رسد کے پہنچنے ، خطوط و پیغامات کے آنے جانے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو ۔ پھر ان پہاڑوں میں جو بابک کے تصرف میں تھے اور اس کی حفاظت کر رہے تھے داخل ہو کر فوجوں کو مناسب مقامات پر تقسیم کر کے کہیں جھنڈیوں کے ذریعے کہیں قاصدوں کے ذریعے ایک دوسرے کی نقل و حرکت سے باخبر رہنے کا بندوبست کر کے بابک کی فوج کو ہٹاتے اور قلعہ بذ کی طرف پسپا کرتے ہوئے آگے بڑھا ۔ شب خون اور کمین گاہوں کا بڑا اندیشہ تھا اس کا بھی افشین نے کافی

خیال رکھا۔

اس طویل سلسلۂ جنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ بابک مغلوب و مجبور ہو کر گرفتار ہوا۔ اور خلیفہ معتصم کی خدمت میں سامرہ کی طرف روانہ کیا گیا۔ بابک اور اس کے بھائی معاویہ کی گرفتاری ماہ شوال ۲۲۲ھ کو عمل میں آئی اور افشین ماہ صفر ۲۲۳ھ میں سامرہ واپس پہنچا۔ خلیفہ معتصم نے فتح اور بابک کی گرفتاری کا حال سن کر حکم جاری کر دیا کہ ہر منزل پر مقام برزند (آذربائیجان) سے سامرہ تک افشین کے لیے خلیفہ کی طرف سے ایک خلعت اور ایک گھوڑا مع ساز و یراق پیش کیا جائے اور اس کا استقبال شاہانہ شان و شوکت کے ساتھ ہو۔ جب افشین دارالخلافہ سامرہ کے قریب پہنچا تو معتصم نے اپنے بیٹے واثق کو شہر سے باہر استقبال کے لیے بھیجا۔

افشین کی عزت افزائی۔ بابک کا قتل

افشین جب خلیفہ کے سامنے دربار میں حاضر ہوا تو کرسی زر پر بٹھا کر اس کے سر پر تاج رکھا گیا۔ نہایت قیمتی خلعت اور بیس لاکھ درہم بطور انعام اس کو دیے گئے۔ دس لاکھ درہم اس کے علاوہ اس کی فوج میں تقسیم کرنے کے لیے عطا ہوئے۔ بابک کو معتصم کے حکم سے سامرہ میں قتل کیا گیا اور اس کے بھائی کو بغداد بھیج دیا گیا۔ وہ وہاں قتل ہوا۔ دونوں کی لاشوں کو صلیب پر لٹکایا گیا۔ بابک کا دورِ دورہ تقریباً بیس سال رہا۔ اس عرصے میں اس نے ایک لاکھ پچپن ہزار آدمیوں کو قتل کیا۔ سات ہزار چھ سو مسلمان عورت و مرد اس کی قید سے چھڑائے گئے۔ بابک کے اہل و عیال سے سترہ مرد اور تئیس عورتیں افشین نے گرفتار کیں۔

بابک کے اکسانے پر قیصرِ روم کا حملہ

بابک جب اسلامی لشکر کے محاصرہ میں بہت تنگ اور مجبور ہوا تو اس نے ایک خط نوفل بن میکائیل قیصر روم کے نام روانہ کیا۔ اس میں لکھا معتصم نے اپنی تمام و کمال فوجیں میرے مقابلے پر روانہ کر دی ہیں۔ آپ کو اس سے بہتر کوئی دوسرا موقع نہیں مل سکتا۔

قیصر اس خط کو پڑھ کر ایک لاکھ فوج کے ساتھ حملہ آور ہوا۔ مگر اس وقت بابک کی جنگ کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ اور اسلامی لشکر پوری طاقت سے اس کے سدِّ راہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ نوفل نے سب سے پہلے زبطرہ پر شب خوں مارا اور وہاں کے مردوں کو جو مقابلے پر آئے قتل کر ڈالا

اور عورتوں بچوں کو گرفتار کر کے لے گیا۔ اس کے بعد ملطیہ کی طرف متوجہ ہوا۔ اور وہاں بھی یہی طرزِ عمل اختیار کیا۔

ہاشمی عورت کی فریاد اور معتصم کی حمیت

معتصم کے پاس ۲۹۔ ربیع الثانی ۲۲۳ھ کو زبطرہ اور ملطیہ کے مفتوح و برباد ہونے کی خبر پہنچی۔ اس خبر کو بیان کرنے والے نے یہ بھی کہا کہ ایک ہاشمیہ عورت کو رومی کشاں کشاں لیے جاتے تھے اور وہ معتصم معتصم پکارتی جاتی تھی۔ یہ سنتے ہی معتصم لبیک لبیک کہتا ہوا تختِ خلافت سے اٹھ کھڑا ہوا اور فوراً گھوڑے پر سوار ہو کر کوچ کا نقارہ بجوا دیا۔ لشکر اور سرداران لشکر آ آ کر شامل ہوتے گئے۔ تمام شاہی لشکر اور مجاہدین کا ایک گروہ کثیر معتصم کے ہمرکاب تھا۔

شاندار کارنامہ۔ شہر قیصر کی فتح

الفخری نے لکھا ہے:

روانگی سے پہلے معتصم نے قاضیوں اور گواہوں کو بلا کر اعلان کر دیا کہ میں نے اپنی تمام جائداد و ملکیت کے تین حصے کر کے وقف کر دیا۔ ایک تہائی اللہ کے لیے، ایک تہائی میرے بال بچوں اور قرابت مندوں کے لیے اور ایک تہائی میرے آزاد کردہ غلاموں کے لیے وقف ہے۔ اس کے بعد وہ روانہ ہوا۔ راستے میں ایک رومی کو پکڑ کر دریافت کیا کہ رومیوں کا سب سے محفوظ اور مضبوط شہر کون سا ہے۔ اس رومی نے بتایا کہ عموریہ اس پورے ملک کی آنکھ ہے۔ بس معتصم نے ادھر کا رخ کر لیا۔ اپنی تمام فوجیں وہاں لے گیا۔ اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ پھر اسے فتح کر کے وہاں داخل ہوا۔ اور وہاں بھی اور دوسرے شہروں میں بھی خوب خوں ریزی کر کے اسیر و قیدی بنائے۔ حتیٰ کہ عموریہ کو کھدوا کر اس کی بنیادیں بھی اکھیڑ دیں اور وہاں کا سب سے بڑا آہنی پھاٹک اکھاڑ کر بغداد لے آیا۔ اور اس وقت وہی دار الخلافہ کی ایک گزرگاہ پر لگا ہے۔ جسے باب العامۃ کہتے ہیں۔

بڑے بڑے سرداروں اور مامون کی اولاد کا قتل

عجیف و افشین دونوں سرداروں میں رقابت تھی۔ خلیفہ معتصم عجیف کے کانوں پر اکثر نکتہ

جیسی کیا کرتا تھا اور افشین کے مقابلے میں اس کی بے قدری و بے عزتی ہوتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عجیف کی وفاداری میں فرق آگیا۔ اور وہ خلیفہ معتصم کے خلاف منصوبے گانٹھنے لگا۔ چنانچہ بلاد روم پر چڑھائی کے وقت اس نے عباس بن مامون سے جو اس سفر میں ساتھ تھا کہا کہ آپ نے بڑی غلطی کی کہ معتصم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اگر آپ خود خلیفہ بننے کی خواہش کرتے تو تمام سرداران فوج آپ کی حمایت پر آمادہ تھے۔

عباس کو اس تحریک و ترغیب سے کچھ خیال پیدا ہوا۔ اور عجیف نے اسی قسم کے تذکرے بار بار کر کے عباس کو خروج پر آمادہ کر لیا۔ تجویز یہ ہوئی کہ پوشیدہ طور پر اول سرداران لشکر کو ہم خیال بنایا جائے اور پھر بیک وقت معتصم، افشین اور اشناس کو قتل کر کے عباس کی خلافت کا اعلان کر دیا جائے۔ اس تجویز پر کاربند ہو کر اول بہت سے لشکر کو عباس کی خلافت پر آمادہ کر لیا گیا مگر فتح عموریہ کے بعد وہاں سے واپس ہوتے ہوئے راستے میں معتصم کو اس سازش کا حال معلوم ہو گیا۔

معتصم نے اوّل عباس کو بلا کر قید کر لیا اور افشین کے سپرد کر دیا۔ پھر شار بن سہل، عمر فرغانی اور عجیف کو بھی یکے بعد دیگرے گرفتار کر کے قید کر لیا۔ اوّل شار بن سہل کو قتل کیا۔ پھر مقام منبج میں پہنچ کر عباس بن مامون کو ایک بورہ میں بھر کر سی دیا۔ اسی حالت میں وہ دم گھٹ کر مر گیا۔ پھر مقام نصیبین میں پہنچ کر ایک گڑھا کھدوایا۔ اور عمر فرغانی کو اس میں زندہ دفن کر دیا۔ پھر موصل میں پہنچ کر عجیف کو بھی ایک بورہ میں بھر کر سی دیا جس سے دم گھٹ کر وہ مر گیا۔ سامرہ میں داخل ہو کر خلیفہ مامون الرشید کی بقیہ اولاد کو گرفتار کرا کر سب کو ایک مکان میں قید کر دیا یہاں تک کہ وہ سب وہیں مر گئے۔

غرض اس سفر میں خلیفہ معتصم نے چُن چُن کر ہر اس شخص کو جس پر بغاوت کا ذرا سا شبہ بھی تھا قتل کر کے قصہ پاک کیا۔

افشین اور خلیفہ معتصم میں رنجش و بدگمانی

جب افشین جنگ بابک سے فارغ ہو کر سامرہ میں واپس آیا تو اس کو توقع تھی کہ خلیفہ معتصم مجھ کو خراسان کی گورنری عطا کرے گا اور اس طرح مجھ کو بخوبی موقع مل جائے گا کہ میں اپنی

حکومت وسلطنت کے لیے بخوبی تیاری کرسکوں۔ لیکن خلیفہ معتصم نے اس کو آرمینیا و آذربائیجان کی حکومت پر مامور کیا۔ اور امید خراسان کا خون ہوگیا۔

اس کے بعد ہی جنگ روم پیش آگئی۔ افشین کو اس لڑائی میں بھی شریک ہونا پڑا مگر اس جنگ میں معتصم خود موجود تھا۔ اور اس نے ابتداءً ہی اگر کسی کو سپہ سالار اعظم بنایا تھا تو وہ عجیف تھا۔ جو اپنے آپ کو افشین کا مدمقابل اور رقیب سمجھتا تھا۔

افشین کی ہلاکت۔ ایک المیہ افشین کے متعلق معتصم مشکوک ہوگیا اور افشین کو بھی اس بات کا احساس ہوگیا کہ خلیفہ مجھ سے بدگمان ہوگیا ہے۔ چنانچہ افشین نے دار الخلافہ سے نکلنے اور بھاگ جانے کی تدبیریں شروع کیں۔ اوّل اس نے ارادہ کیا کہ میں خود اپنے صوبہ آذربائیجان و آرمینیا کی طرف جاکر وہاں سے بلاد خزر کی طرف ہوتا ہوا اپنے وطن اشروسنہ (ماوراء النہر) چلا جاؤں۔ لیکن اس ارادے میں اس لیے کامیابی نہ ہوئی کہ معتصم نے منکجور کی جگہ خود اپنی طرف سے افشین کا قائم مقام تجویز کرکے بھیج دیا تھا۔ اور افشین جانتا تھا کہ میں آذربائیجان میں محفوظ نہیں رہ سکتا۔

آخر اس نے ارادہ کیا کہ میں خلیفہ اور تمام اراکین وسرداران سلطنت کی ضیافت کروں۔ تمام دن ان لوگوں کو کھانے پینے میں مصروف رکھوں۔ شام ہوتے ہی یہ سب لوگ دن بھر مصروف ومشغول رہنے کے سبب سوجائیں گے اور میں موقع پاکر شام ہی سے نکل جاؤں گا۔ اور پھر کسی کے ہاتھ نہ آؤں گا۔ ابھی وہ کوئی مستقل رائے قائم نہ کرنے پایا تھا کہ اتفاقاً اس کو اپنے رازدار خادم پر کسی وجہ سے غصہ آیا۔ اور اس کو سخت سست کہا۔ اس خادم نے فوراً ایتاخ کے پاس آکر افشین کے تمام ارادوں کی اطلاع کردی۔ ایتاخ اسی وقت اس خادم کو لے کر معتصم کے پاس آیا اور کہا کہ افشین فرار ہونے کی تیاری کر رہا ہے۔ معتصم نے اسی وقت افشین کو طلب کیا۔ اور درباری لباس اتروا کر قید خانہ میں بھجوا دیا۔ اور کسی قسم کی کوئی بیتابی ظاہر نہیں کی۔ اس کے بعد خلیفہ معتصم نے فوراً افشین کے بیٹے حسن بن افشین کو جو ماوراء النہر کے علاقے کا والی اور اشروسنہ میں مقیم تھا گرفتار کرنے کا حکم صادر کردیا۔

جب حسن بن افشین گرفتار ہوکر آگیا تو معتصم نے اپنے وزیر اعظم محمد بن عبد الملک،

قاضی احمد بن ابی داؤد، اسحٰق بن ابراہیم اور دوسرے ارکینِ سلطنت کی ایک جماعت مرتب کر کے حکم دیا کہ تم سب مل کر افشین کے معاملے کی تحقیقات کرو اور وہ جس سزا کا مستحق ثابت ہو وہی سزا اس کو دو۔ اگرچہ معتصم اپنے حکم سے اسے فوراً قتل کرا سکتا تھا لیکن اس میں اندیشہ تھا کہ کہیں درپردہ بعض سردار اس کے شریک نہ ہوں۔ اس لیے اس نے یہ نہایت ہی عاقلانہ روش اختیار کی۔ اس طرح افشین کے قتل پر فوج میں کسی قسم کا جوش معتصم کے خلاف پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

معتصم افشین کی بدنیتی سے خوب واقف ہو چکا تھا اور جنگ بابک کے دوران ہی میں اس کو اس بات کی اطلاع مل چکی تھی لیکن اس وقت افشین ایک ایسے دشمن کے مقابلے پر معرکہ آرا تھا جو بیس سال سے مغلوب نہ ہو سکا تھا۔ لہٰذا معتصم بالکل خاموش رہا۔ جنگ بابک کی کامیابی کوئی معمولی کامیابی نہ تھی لہٰذا جنگ بابک کے بعد افشین کو انعام و اکرام سے محروم رکھنا اور اس کی بددیانتی کا مواخذہ کرنا خود معتصم کے لیے زہر ہلاہل کا حکم رکھتا تھا۔ اور اس کی بدنامی و قدر دانی کی شہرت کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی تھی۔

وزیر اعظم اور دوسرے سرداروں کی مجلس نے افشین کے مقدمے کو بڑی احتیاط اور باقاعدگی کے ساتھ سننا اور تحقیق کرنا شروع کیا۔ قید خانہ سے روزانہ افشین اس کچہری میں لایا جاتا اور اس کی موجودگی میں گواہوں کے بیانات اور ثبوت کے کاغذات پیش کیے جاتے تھے۔

اس مقدمے کی سماعت نہایت اطمینان کے ساتھ ہوئی۔ اور آخری فیصلہ یہ ہوا کہ مازیار کے چار سو دُرّے لگائے جائیں اور افشین کو سزائے موت دی جائے۔ چنانچہ مازیار چار سو دُرّے برداشت نہ کر سکا اور اسی سزا سے مر گیا۔ افشین کو سولی دے دی گئی اور اس کی لاش عبرت کے لیے منظرِ عام پر لٹکائی گئی۔

یہ واقعہ ماہِ شعبان ۲۲۶ھ کو وقوع پذیر ہوا۔ افشین کی جگہ اسحٰق بن یحییٰ بن معاذ کو سپہ سالاری کی خدمت سپرد ہوئی۔

طبری کی روایت یہ ہے کہ قید کی حالت میں مرا۔

معتصم باللہ کی وفات محرم ۲۲۷ھ میں معتصم نے پچھنا لگوایا۔ اس سے طبیعت ناساز ہو گئی۔ لیکن پھر افاقہ ہو گیا تھا کہ ایک دن زنام قصہ خوان نے چند عبرت آموز قصے سنائے انھیں سن کر طبیعت بگڑ گئی۔ اور ربیع الاول ۲۲۷ھ میں انتقال ہو گیا اور اپنے آباد کردہ شہر سامرا میں دفن کر دیا گیا۔ ۴۷ سال کی عمر تھی۔ مدت خلافت آٹھ سال آٹھ مہینے۔

معتصم قوی دل، قوی جسم اور بڑا بہادر اور عظمت و شان اور ہیبت و جبروت کا خلیفہ تھا۔ جسمانی قوت غیر معمولی تھی۔ ایک ہزار رطل تقریباً پانچ من کا بار اٹھا کر چل لیتا تھا۔

اس کی فوجی قوت اور جنگی مصارف کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ عموریہ کے معرکے میں سوار فوج کی تعداد پانچ لاکھ سے اوپر تھی۔ اور صرف شام کی سرحد کی حفاظت کا خرچ ایک لاکھ اشرفی سالانہ تھا۔

اس نے اپنی آٹھ سالہ مدتِ خلافت میں تمام اندرونی و بیرونی مخالف طاقتوں کا قلع قمع کر دیا۔ جس طاقت نے سر اٹھایا کچل کر رکھ دیا۔ عموریہ کی فتح اس کا سب سے بڑا جنگی کارنامہ ہے

معتصم نے ایرانیوں کا زور توڑنے کے لیے ترکوں کو آگے بڑھانے کی پالیسی اختیار کی۔ اور سمرقند، فرغانہ اور اشروسنہ وغیرہ سے ہزاروں غلام خرید کر منگائے تھے اور انھیں دیبا کی وردیاں، سونے کے پٹکے اور زیورات پہناتا تھا۔ جس طرح ہارون اور مامون کے زمانے میں ایرانیوں کا عروج ہوا تھا اسی طرح اس کے زمانے میں ترکوں کا ستارا چمکا۔ اس سے حکومت کی شان تو ضرور بڑھ گئی اور فتوحات کو بھی فائدہ پہنچا لیکن آئندہ چل کر جب حکومت کمزور پڑی تو ترکوں کی قوت اتنی بڑھ گئی کہ خلفاء کا وقار بالکل جاتا رہا۔ اور وہ ان کے ہاتھوں میں تماشا بن کر رہ گئے۔ ترک جسے چاہتے تھے تخت پر قائم رکھتے تھے اور جسے چاہتے تھے اتار دیتے تھے۔

امام احمد بن حنبل کا ابتلا مامون کے عہد میں خلق قرآن کا مسئلہ اٹھا تھا اس کو اس مسئلے سے اتنا شغف تھا کہ جو علماء اس کے منکر تھے انھیں سخت مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ مامون جس قدر خلقِ قرآن کے عقیدے میں سخت تھا امام احمد بن حنبل اسی قدر

اس کے انکار میں متشدد تھے۔ آپ بھی آزمائش سے نہ بچ سکے۔ لیکن مامون مرتے دم تک آپ سے اس کا اقرار نہ کرا سکا اور مرتے وقت معتصم کو ان پر سختی کرنے کی وصیت کر تا گیا۔

یہ جاہل اور ناشناس ادب تھا۔ اس نے امام احمد بن حنبل پر بڑی سختیاں کیں اور یہ فتنہ مامون کے عہد سے زیادہ بڑھ گیا۔ معتصم کا غلو یہاں تک بڑھا کہ اس نے سارے ممالک محروسہ میں علماء سے خلق قرآن کا اقرار کرانے کے فرامین جاری کر دیے۔ اور معلموں کو حکم دیا کہ بچوں کو اس عقیدے کی تلقین کریں۔۔ اس سے بڑا فتنہ پیدا ہوا۔

معتصم کے بارے میں علامہ سیوطی کے ارشادات علامہ سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں تحریر فرمایا ہے:

۲۲۳ھ میں معتصم نے روم پر چڑھائی کی اور وہاں کی رعایا پر بے انتہا مظالم کیے اور وہ ستم ڈھائے جو کسی خلیفہ کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔ رومیوں کو منتشر اور ان کی آبادیوں کو ملیامیٹ کیا اور شہر عموریہ کو ذریعہ شمشیر فتح کیا۔ جہاں تیس ہزار لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا اور اتنے ہی گرفتار کیے۔ اس جنگ کے شروع میں نجومیوں نے کہا تھا کہ طالع نحس ہے۔ اس لیے شکست ہو گی، لیکن اس کے باوجود معتصم کو شاندار فتح ہوئی۔ اور اس مسرت پر مشہور شاعر ابو تمام نے قصیدہ پڑھا۔

مرض الموت اور وفات مرض الموت کی حالت میں یہ آیت پڑھتا تھا: ترجمہ۔ اللہ تعالیٰ کے احسانات پر جب خوش ہو گئے تو اللہ نے انھیں اچانک اٹھا لیا۔ اور حالت نزع میں کہتا تھا۔ تمام حیلے حوالے ختم ہو گئے۔ اب کوئی تدبیر کارگر نہیں۔

معتصم نے اقصائے مغرب تک جانے کا فیصلہ کیا تھا تا کہ جن مقامات پر اب تک اموی حکمراں ہیں ان پر بھی بنو عباس کا قبضہ ہو جائے۔

صولی نے احمد بن خطیب کی زبانی لکھا ہے کہ معتصم نے مجھ سے کہا کہ بنو امیہ کی سلطنت میں ہم عباسیوں کی کہیں حکومت نہ تھی لیکن ہمارے زمانے میں ابھی تک اموی حکمراں ہیں اس لیے ان کو پسپا کرنے کے لیے سامانِ جنگ ضروری ہے۔ چنانچہ معتصم نے

جنگ کی تیاری شروع کی تھی کہ سخت بیمار ہو کر جاں بحق ہوا۔

مغیرہ بن شعبہ کا بیان ہے جتنے بادشاہ معتصم کے مطیع ہوئے اتنے کسی دوسرے کے آگے سرنگوں نہیں ہوئے۔ معتصم کی مانند کسی نے بھی اتنے زیادہ ممالک پر ظفر پیکر پرچم نہیں لہرایا۔

صولی کا بیان ہے کہ معتصم کی انگوٹھی پر یہ نقش کندہ تھا۔ الحمد للہ الذی لیس کمثلہ شیء۔

ابراہیم بن عباس کا بیان ہے معتصم نہایت ہی بلیغ اور اونچی بات کہا کرتا تھا۔

معتصم وہ پہلا خلیفہ تھا جس کے کھانے پر روزانہ ایک ہزار اشرفیاں خرچ ہوتی تھیں۔

خلیفہ واثق باللہ

اخلاق وصفات میں خلیفہ مامون کا پرتو

بڑے باپ کا بڑا بیٹا

واثق باللہ بن معتصم باللہ بن ہارون رشید بن مہدی بن منصور عباسی کی کنیت ابوجعفر یا ابوالقاسم تھی۔ اس کا اصل نام ہارون تھا۔ یہ مکہ کے راستے میں قراطیس نامی لونڈی کے پیٹ سے ۲۰۔ شعبان ۱۹۶ھ میں پیدا ہوا تھا۔ اس کو اس کے والد معتصم باللہ نے اپنا ولی عہد بنایا تھا۔

واثق کا حلیہ اور شمائل

یہ نہایت گورا چٹا آدمی تھا۔ داڑھی گھنی اور خوبصورت تھی۔ اس کی رنگت میں سفیدی کے ساتھ زردی بھی جھلکتی تھی۔ آنکھوں کی سفیدی میں سیاہ تل بھی نمودار تھا۔ یہ بہت بڑا شاعر اور ادیب تھا عربی ادب میں وہ مامون کا ہم پلہ بلکہ اس سے بھی فائق تھا۔ اس نے مامون الرشید کی علمی مجلسیں دیکھی تھیں، اس کو علم وفضل کا شوق تھا اسی لیے اسے مامون صغیر یا مامون ثانی کہتے تھے۔

واثق کو عربی اشعار اس قدر یاد تھے کہ خلفائے عباسیہ میں کسی کو اتنے اشعار یاد نہ تھے اپنے باپ کی طرح کھانے پینے کا بھی بہت شوق تھا۔ بہت پرخور وخوش خور تھا۔ شاعروں اور ادیبوں کو بڑے بڑے صلے اور انعام دیتا تھا۔ اہل علم کی قدر کرتا تھا۔ اور ان کے ساتھ تعظیم وتکریم کا برتاؤ ضروری سمجھتا تھا۔ مگر خلق قرآن کا خبط اپنے باپ سے وراثت میں پایا تھا اور اس معاملے میں یہاں تک غلو اختیار کیا تھا کہ اکثر بڑے بڑے علماء کو عذاب

سمجھ کر اپنے ہاتھ سے قتل کیا۔

مسئلہ خلق قرآن کے بارے میں واثق کا مسلک بدل گیا

آخر عمر میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ مسئلہ خلق قرآن کے متعلق اپنی سرگرمی کم یا بالکل موقوف کر دی تھی۔ وہ واقعہ یہ تھا کہ ابوعبدالرحمن عبداللہ بن محمد ازدی امام ابوداؤد اور نسائی کے استاد تھے۔ مسئلہ خلق قرآن کے متعلق مخالف عقیدہ رکھنے کے سبب گرفتار ہو کر آئے اور دربار میں پیش ہوئے وہاں قاضی احمد بن ابی داؤد سے جو معتصم کے زمانے سے دربار میں وزیر اعظم کی برابر مرتبہ رکھتے اور خلق قرآن کے قائل تھے ابوعبدالرحمن نے سوال کیا کہ تم پہلے مجھ کو یہ تو بتادو کہ آنحضرت صلعم کو بھی اس کا علم تھا یا نہیں کہ قرآن مخلوق ہے۔

قاضی احمد نے کہا کہ آنحضرت صلعم کو اس کا علم تھا۔ ابوعبدالرحمن نے کہا کہ آنحضرتؐ نے لوگوں کو قرآن کے مخلوق ہونے کے عقیدہ کی تعلیم دی یا نہیں۔ قاضی احمد نے کہا کہ آنحضرتؐ نے تو اس کے متعلق کچھ نہیں فرمایا۔

ابوعبدالرحمن نے کہا کہ جس عقیدہ کی آنحضرت صلعم نے لوگوں کو تعلیم نہیں دی اور باوجود علم رکھنے کے لوگوں کو اس کے ماننے پر مجبور نہیں کیا۔ تم اس کے متعلق لوگوں کی خاموشی کو کیوں کافی نہیں سمجھتے۔ اور ان کو کیوں اس کے ماننے اور اقرار کرنے پر مجبور کرتے ہو۔ یہ سنتے ہی واثق باللہ چونک پڑا اور دربار سے اٹھ کر اپنی محل سرائے میں چلا گیا۔ اور چارپائی پر لیٹ کر بار بار یہ کہتا رہا کہ جس معاملے میں آنحضرتؐ نے خاموشی اختیار کی ہم اس میں سختی کر رہے ہیں۔ پھر حکم دیا کہ ابوعبدالرحمن کو آزاد کر کے ان کے وطن بہ آرام واپس پہنچادو۔ اور تین سو دینار سرخ بہ طور انعام دے دو۔

نائب السلطنت کا نیا منصب

خلیفہ واثق نے تخت نشین ہو کر اشناس کو جو ترکی غلام تھا اپنا نائب السلطنت بنا کر تمام ممالک محروسۂ اسلامیہ کے سیاہ و سپید کا اختیار کامل دے دیا۔ یہ عہدہ جو اشناس کو سونپا گیا واثق باللہ نے نیا ایجاد کیا تھا۔

نائب السلطنت خلیفہ کے تمام اختیارات کا استعمال کرتا اور وزیر اعظم کا اسی طرح ونیز بقاعدہ خلیفہ۔ اب تک کسی خلیفہ نے ایسے وسیع اختیارات کسی دوسرے کو نہیں دیے تھے۔

علمی مجالس کا شوق

واثق باللہ چونکہ مجالس علمیہ کا بھی شوقین تھا اس لیے وہ علماء اور اراکینِ سلطنت کی مجلسوں میں بیٹھ کر گھنٹوں مذاکراتِ علمیہ اور روایاتِ قدیمہ سُنا کرتا تھا۔ علماء چونکہ اکثر عربی النسل لوگ تھے انھوں نے ہارون رشید کے زمانے کے واقعات بھی موقع پاکر سنانے شروع کیے۔ برامکہ کے علمی ذوق اور سخاوت کی حکایتوں کے ساتھ ہی ان کے اختیار و اقتدار کے قصے اور پھر خاندانِ خلافت کے خلاف ان کی سازشوں کی کیفیت اور بربادی کے تمام واقعات مناسب اور موزوں انداز میں واثق باللہ کے گوش گزار کیے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ واثق باللہ کی آنکھیں کھل گئیں۔ اور اس نے ترکی و خراسانی امراء کی نگرانی اور دیکھ بھال شروع کر دی۔ اکثر لوگوں پر غبن کے الزامات پایۂ ثبوت کو پہنچے اور واثق باللہ نے ان سے جرمانے وصول کرنے شروع کر دیے۔ اسی سلسلے میں اشناس ترکی کے اختیارات بھی محدود کر دیے گئے اور وہ ۲۳۰ھ میں فوت ہو گیا۔

اہلِ عرب کے وقار کا خاتمہ

اب تک برابر سلطنتِ عباسیہ اہلِ عرب کی سیادت کے کم کرنے میں مصروف رہی تھی اور عجمیوں کو برابر فروغ حاصل ہوتا رہا تھا، تاہم ملک عرب کی گہوارۂ اسلام ہونے کے سبب ایک خاص عزت اور دینِ اسلام کے اوّلین خادم ہونے کی وجہ سے عربوں کا ایک خصوصی احترام ہر ایک قلب میں موجود تھا۔ خود خاندانِ خلافت ایک عربی خاندان تھا۔ لیکن واثق باللہ کے زمانے میں عربوں سے یہ چیز بھی چھن گئی۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ نواحِ مدینہ میں قبیلۂ بنو سلیم کی ایک بڑی تعداد رہتی تھی۔ انھوں نے بنو کنانہ پر حملہ کیا۔ اور ان کا مال و اسباب لوٹ لیا۔

خلیفہ واثق باللہ کو جب ان حالات سے آگاہی ہوئی تو اس نے بغا کبیر اپنے ایک ترکی سپہ سالار کو ترکی فوج کے ساتھ اس طرف روانہ کیا۔ بغا کبیر شعبان ۲۳۰ھ میں مدینہ منورہ پہنچا۔ بنو سلیم سے لڑائیاں ہوئیں، ان کو شکست دی ایک ہزار بنو سلیم کو گرفتار کر کے مدینہ منورہ میں قید کر دیا اور بہت سوں کو قتل کیا۔

بغا کبیر قریباً چار مہینے تک مع اپنی ترکی فوج کے مدینہ میں مقیم رہا۔ حج سے فارغ ہو کر بغا کبیر نے بنو ہلال کی طرف توجہ دی اور ان کو بھی بنو سلیم کی طرح سزائیں دیں اور تین سو آدمیوں کو گرفتار کر کے قید کر لیا۔ پھر بنو مرہ کی طرف متوجہ ہوا۔ اور مقام فدک میں جا کر چالیس روز تک مقیم رہا۔ اور فزارہ و بنو مرہ کے بہت سے آدمیوں کو گرفتار کر کے لایا۔ اور مدینہ میں قید کیا۔ پھر بنو غفار، ثعلبہ اور اشجع کے رؤسار کو طلب کر کے ان سے اطاعت و فرماں برداری کے حلف لیے۔ پھر بنو کلاب کے تین ہزار آدمیوں کو گرفتار کر کے لایا۔ دو ہزار کو رہا اور ایک ہزار کو قید کر دیا۔ پھر یمامہ میں جا کر بنو نمیر کے پچاس آدمیوں کو قتل کیا اور چالیس کو قید کیا۔

ابھی یمامہ میں لڑائی کے شعلے فرو نہ ہوئے تھے کہ واثق باللہ نے ایک اور ترک سردار کو تازہ دم ترکی فوج کے ساتھ یمامہ کی طرف بغا کبیر کی مدد کے لیے بھیج دیا۔ بغا کبیر نے تمام ملک یمامہ میں قتل عام شروع کر دیا۔ اہل یمامہ وہاں سے بھاگے تو یمن تک ان کا تعاقب کیا اور ہزارہا آدمیوں کو قتل کیا۔

محدث احمد بن نصر کا خروج اور قتل

۲۳۱ھ میں ایک بزرگ احمد بن نصر نے احتجاجاً حکومت پر خروج کیا۔ وہ مالک بن ہیثم خزاعی نقیب دولت عباسیہ کے پوتے اور صاحب علم و تقویٰ بزرگ تھے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان کا شعار تھا۔ امام مالک سے سمع حدیث کیا تھا۔ یحییٰ بن معین جیسے محدث ان کے تلمیذ تھے۔

واثق خلق قرآن اور رویت باری کے مسئلے میں اپنے باپ معتصم کا ہم عقیدہ تھا اور محدثین کا گروہ اس عقیدہ کے خلاف تھا۔ اس لیے احمد بن نصر بھی اس کے مخالف تھے۔ انھوں نے اس میں اتنا تشدد اختیار کیا کہ برسر عام واثق کو کافر اور سؤر کہتے تھے۔ جب لوگوں نے ان کو عتاب شاہی کا خوف دلایا تو ان کے پیرو ابو ہارون السراج اور ابو طالب نے ابو نصر کی دعوت شروع کر دی جسے بہتوں نے قبول کر لیا۔ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر احمد بن نصر کی بیعت لی، ابو ہارون نے اس دعوت کی اشاعت میں روپیہ بھی صرف کیا اس لیے وہ جلد پھیل گئی۔ اور ابن نصر کے ماننے والوں کا دائرہ خاصا وسیع ہو گیا۔ اس وقت

ان لوگوں نے طے کیا کہ ایک مقررہ شب کو بغداد کے مشرقی اور مغربی دونوں حصوں میں بہ یک وقت حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔

احمد بن نصر کے اتباع میں ہر قسم کے لوگ تھے۔ ان میں سے بنی اشرس کے دو آدمیوں نے نبید کے نشے میں موعودہ شب سے ایک شب پہلے ہی طبل پیٹنا شروع کر دیا۔ مگر چونکہ حملہ کے لیے شب مقرر ہو چکی تھی اس لیے اس صدا کا کسی نے جواب نہ دیا۔ بغداد کے پولیس افسر محمد بن ابراہیم نے طبل کی آواز سنی تو سبب دریافت کیا۔ مگر کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ مزید تحقیقات سے ایک شخص احمد کے ذریعے اس سازش کا پتہ چل گیا۔ چنانچہ ابو طالب اور ابو ہارون فوراً گرفتار کر لیے گئے۔ بنو اشرس کی خانہ تلاشی میں دو سبز علم برآمد ہوئے جو بنو عباس کی مخالفت کا نشان تھا۔ اس لیے احمد بن نصر کو بھی گرفتار کر کے ان کے گھر کی تلاشی لی گئی۔ مگر ان کے یہاں کوئی مشتبہ چیز برآمد نہ ہوئی۔ اور وہ واثق کے پاس سامرہ بھیج دیے گئے۔

قتیلِ فتنۂ خلقِ قرآن احمد بن نصر کے سامرہ پہنچنے کے بعد واثق نے علماء کی ایک عام مجلس منعقد کر کے احمد سے پوچھا کہ قرآن کے بارے میں تمھارا کیا عقیدہ ہے۔ انھوں نے جواب دیا قرآن کلام اللہ ہے اور احمد پاک وصاف ہو کر قتل کے لیے آمادہ ہے۔ واثق نے پھر پوچھا کیا قرآن مخلوق ہے؟ انھوں نے پھر وہی جواب دیا کہ قرآن کلام اللہ ہے۔ پھر سوال کیا کہ قیامت اور رویتِ باری کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے۔ انھوں نے کہا امیر المومنین اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ تم لوگ قیامت کے دن اپنے رب کو اس طرح دیکھو گے جس طرح بے بدلی کے صاف آسمان پر چودھویں کا چاند دیکھتے ہو۔ اس لیے میں اس حدیث کا پابند ہوں اور دوسری مرفوع حدیث سفیان بن عیینہ کی ہے کہ ابن آدم کا قلب اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں کے بیچ میں ہے جس کو وہ بدلتا ہے۔ اور رسول اللہ صلعم ارشاد فرماتے تھے کہ اے دلوں کے پلٹنے والے میرا دل اپنے دین پر قائم رکھ۔ یہ سن کر اسحٰق بن ابراہیم بولے: دیکھو تم کیا کہہ رہے ہو۔ احمد نے کہا تم ہی نے مجھ سے کہلوایا ہے۔ اسحٰق نے کہا میں نے کہا تھا۔ احمد نے جواب دیا تم ہی نے مجھے امیر المومنین کو نصیحت کرنے کا اشارہ دیا تھا۔ اور میری نصیحت یہ ہے کہ وہ رسول اللہ کی حدیث کی مخالفت نہ کریں۔ اس

گفتگو کے بعد واثق نے لوگوں سے پوچھا ان کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے؟ یہ سب اہلِ دنیا تھے۔ حاکمِ وقت کا اشارہ پاتے ہی زبانیں دراز ہوگئیں۔ عبدالرحمن بن اسحٰق نے جو کسی زمانہ میں بغداد کے قاضی رہ چکے تھے اور احمد بن نصر کے دوست تھے ان کا خون حلال قرار دیا۔ ابوعبداللہ ارمنی نے کہا امیر المومنین اس کا خون مجھے پلا دیجیے۔ قاضی ابن داؤد جو ابن نصر کے خون کا بار بھی اپنے ذمے نہیں لینا چاہتے تھے اور خلیفہ کی رضامندی کے بھی خواہاں تھے یہ گول رائے دی کہ امیر المومنین یہ کافر ہے اس سے توبہ کرائیے غالباً اس کو کوئی دماغی مرض اور عقلی فتور لاحق ہوگیا ہے۔

ان فتووں کے بعد اسی مجلس میں واثق نے اپنے ہاتھ سے احمد بن نصر کا سر قلم کیا۔

عہدِ واثق باللہ کے فتوحات کا جائزہ

واثق کا عہد فتوحات سے بھی خالی نہیں ہے۔ اس کے زمانے میں سسلی میں بعض اہم فتوحات حاصل ہوئیں۔

۲۲۸ھ میں فضل بن جعفر ہمدانی نے سسلی پر حملہ کیا اور مسینی کی بندرگاہ پر فوجیں اتار کر مختلف سمتوں میں پھیلا دیں اور خود ناپل کی طرف بڑھا۔ یہاں کے باشندے امان حاصل کر کے اس کے ساتھ ہو گئے۔ مسلمانوں نے دو سال تک اس کو فتح کرنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ آخر میں شہر کے چاروں طرف چکر لگا کر ایک مقام پر شہر میں داخلے کا ایک راستہ معلوم کر لیا۔ اہلِ شہر دوسرے حصے کی مدافعت میں مشغول تھے۔ اس لیے مسلمان پہاڑ کو عبور کر کے دفعتہً عقب سے شہر میں داخل ہو گئے۔ اس ناگہانی حملے سے گھبرا کر اہلِ شہر نے میدان چھوڑ دیا اور شہر پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

اسی سال شہر مسکان فتح ہوا۔

۲۲۹ھ میں ابوالعباس اغلب بن فضل شرہ تک بڑھتا چلا گیا۔ اہل شرہ نے روکنا چاہا۔ لیکن انھوں نے بڑی شکست فاش کھائی۔ دس ہزار رومی کام آئے۔ اس کے مقابلے میں صرف تین مسلمان شہید ہوئے۔

پھر ۲۳۲ھ میں فضل بن جعفر نے مسینی کا محاصرہ کیا۔ دورانِ محاصرہ میں اس کو اطلاع ملی کہ مسینی کے باشندوں نے صقلیہ کے پادری سے مدد مانگی ہے۔ اس نے مدد کا وعدہ کیا ہے

اور اپنی آمد کی یہ علامت بتائی ہے کہ جب فلاں پہاڑ پر تین دن تک آگ روشن دیکھو تو سمجھ لو کہ چوتھے دن تمھارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ اس وقت تم تیار ہو جانا اور دونوں مل کر دفعتہً مسلمانوں پر حملہ کر دیں گے۔ یہ راز معلوم ہو جانے کے بعد فضل نے مقررہ وقت سے پہلے اس پہاڑ پر تین دن تک برابر آگ روشن کرا دی۔ رومی پادری کے وعدہ کے مطابق فوراً جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔ فضل نے ایک فوج کمین گاہ میں چھپا کر محاصرہ کرنے والوں کو ہدایت کر دی کہ جب سیسلی کے باشندے شہر سے نکلیں تو تم کمین گاہ کی طرف پسپا ہو جانا۔ وہ تم پر حملہ آور ہوں گے اور جب وہ حملے میں کمین گاہ سے آگے نکل جائیں تو فوراً پلٹ کر حملہ کر دینا۔ چنانچہ اہل سیسلی جب چوتھے دن بطریق کی امداد کی امید پر شہر سے نکلے تو سامنے مسلمان موجود تھے۔ دیکھتے ہی ان پر حملہ کر دیا۔ یہ فضل کی ہدایت کی مطابق کمین گاہ کی جانب پسپا ہو گئے۔ جب رومی کمین گاہوں سے آگے بڑھ گئے تو مسلمان دفعتہً پلٹ پڑے۔ پیچھے سے کمین گاہ والی فوج نے نکل کر حملہ کر دیا اور رومی دونوں طرف سے گھر کر صاف ہو گئے۔ جو باقی بچے انھوں نے اپنی جان و مال کی امان لے کر شہر حوالہ کر دیا۔

اسی سنہ میں انکبردہ کے شہر طارنت میں مسلمان آباد ہوئے۔

مرض الموت اور وفات ذی الحجہ ۲۳۲ھ میں واثق استسقا میں مبتلا ہوا۔ اطبا نے گرم تنور میں بٹھا کر بھاپ دلائی، اس سے کچھ افاقہ محسوس ہوا۔ دوسرے دن اس نے تنور کو زیادہ گرم کرا کے دیر تک بھاپ لی۔ اس کے اثر سے بخار آ گیا۔ یہی بخار موت کا بہانہ بن گیا۔ وفات کے وقت بہ اختلاف ۳۲ سال یا ۳۶ سال عمر تھی۔ مدتِ خلافت ۵ سال نو مہینے کچھ دن۔

فکر و رائے کی انتہا پسندی کا نمونہ واثق اتنا تنگ خیال اور متشدد تھا کہ عوام تک سے ان اہم مسائل کا اقرار کرایا جاتا تھا۔ چنانچہ ۲۳۰ھ میں جب مسلمانوں اور رومیوں میں قیدیوں کا تبادلہ ہوا تو قاضی ابن ابی داؤد کے اشارے سے جن کا یہ تمام فتنہ اٹھایا ہوا تھا، وہ قیدی جو خلقِ قرآن کا اقرار کرتے تھے چھڑا لیے جاتے تھے اور جو انکار کرتے وہ رومیوں کی قید میں رہنے دیے جاتے تھے کہ وہ اس کے

عقیدہ میں کافر تھے۔

علویوں کے ساتھ حُسنِ سلوک

اس کے تحمل اور نرمی کا ثبوت یہ ہے کہ اس کے زمانے میں اہل بیتِ نبویؐ اور علویوں کو جو عباسیوں کے حریف اور مدِ مقابل تھے اور مدتوں سے ان کے مظالم سہتے چلے آتے تھے آزادی ملی اور واثق نے ان کے رتبے کے مطابق ان کا احترام کیا۔ واثق علویوں کا غیر معمولی احترام کرتا تھا۔ اور ان کے ساتھ بہت زیادہ حسنِ سلوک سے پیش آتا تھا۔

حرمین شریف کی خدمت

حرمین کی خدمت خلفاء کے لیے سرمایۂ سعادت تھی۔ واثق بھی اس سعادت سے محروم نہ رہا وہ یہاں کے باشندوں کو اس فیاضی سے داد و دہش کرتا تھا کہ اس کے زمانے میں مکہ اور مدینہ میں کوئی سائل باقی نہ رہا۔ جب اس کی موت کی خبر مدینہ پہنچی تو کہرام مچ گیا۔ مدینہ کی عورتیں ہر شب اس کی یاد میں بقیع میں جا کر روتی تھیں۔

واثق باللہ اور محمد بن عبدالملک زیات

الفخری کا بیان ہے:

زیات کا باپ مامون کے عہد میں ایک خوش حال تاجر تھا۔ محمدؔ نے جب نشوونما پایا تو اس نے شائستگی سیکھی۔ پڑھا لکھا اور فہم و ذکا کا ظہور ہونے لگا اور ہر چیز میں دست گاہ حاصل کر لی۔ عقل و فہم، ذہانت، علم شعر ادب اور ریاست کے آداب اور شاہانہ طریقوں کی واقفیت وغیرہ میں یہ نادرہ روزگار تھا۔ جب معتصم کا دور آیا تو اس نے اسے وزیر بنا لیا۔ اس نے وزارت کے بوجھ کو اس طرح سنبھالا کہ اس سے پہلے اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اس کی وزارت کے دوران معتصم کا انتقال ہوا۔

معتصم نے ایک بار اپنے فرزند واثق کو ایک رقم دینے کا حکم دیا۔ رقم ابن زیات کی معرفت ملتی تھی۔ ابن زیات نے رقم روک لی۔ اور معتصم کو رائے دی کہ واثق کو کوئی رقم نہ دی جائے۔ معتصم نے اس کی بات مان لی۔ اور واثق کے لیے جو حکم دیا تھا وہ واپس لے لیا۔ واثق نے اپنے قلم سے ایک حکم نامہ لکھا کہ اگر میں خلیفہ بننے کے بعد ابن زیات کو بری

طرح قتل نہ کروں تو مجھ پر حج اور صدقہ واجب ہو اور میرے لونڈی غلام آزاد ہوں۔
جب معتصم مر گیا اور واثق تختِ خلافت پر بیٹھا تو ابن زیات والی بات اسے یاد آئی اور اپنی قسم پوری کرنے میں اس نے جلدی کرنی چاہی۔ اس نے اپنے حاجب سے کہا: ابن زیات کو بلاؤ۔

حاجب اسے بلا کر لایا۔ اور واثق کے سامنے سہما ہوا بیٹھ گیا۔ واثق نے اپنے خادم سے کہا کہ فلاں کاغذ لے آؤ۔ وہ وہی کاغذ لے آیا جس میں واثق نے قسم کھا کر لکھا تھا کہ ابن زیات کو قتل کر کے رہے گا۔ واثق نے وہ کاغذ ابن زیات کے سامنے رکھ دیا۔ اور کہا کہ اسے پڑھ لو۔ ابن زیات نے وہ کاغذ پڑھ کر کہا امیر المومنین میں تو غلام ہوں اگر آپ سزا دیں تو آپ کو اس کا پورا اختیار حاصل ہے اور اگر آپ اپنی قسم کا کفّارہ ادا کر کے مجھے زندہ رکھیں تو یہ آپ کی شان کے زیادہ مطابق ہے۔ واثق نے کہا کہ بخدا میں تمھیں اس لیے زندہ رہنے دیتا ہوں کہ ملک تم جیسے آدمی سے خالی ہو جائے گا۔ میں اپنی قسم کا کفارہ ادا کروں گا۔ میں مال کا عوض تو پا سکتا ہوں لیکن تمھارا عوض مجھے نہیں ملے گا۔

اس کے بعد واثق نے اپنا کفارہ قسم ادا کر دیا۔ اور ابن زیات کو وزیر بنا لیا۔ اسے آگے بڑھایا اور امور مملکت اس کے سپرد کر دیے۔

اُستاد کا ادب و احترام

حمدون بن اسمٰعیل کا بیان ہے۔ واثق سب سے زیادہ حلیم و صابر تھا۔

احمد بن حمدون کا بیان ہے واثق باللہ خلیفہ کے پاس ایک دن ان کے استاد ہارون بن زیاد تشریف لائے تو واثق باللہ نے ان کی بے انتہا تعظیم و تکریم کی۔ لوگوں نے پوچھا اے امیر المومنین یہ کون ہیں؟ جواب دیا یہ وہ ہیں جنھوں نے مجھے اس درجے تک پہنچایا اللہ کی یاد کے لیے مجھے زبان دانی سکھائی اور مجھے اللہ کی رحمتوں سے قریب کیا۔

متوکّل علی اللہ[1]

ترکوں کے ہاتھوں بنو عبّاس کا پہلا خلیفہ مقتول

گوناگوں اور متضاد صفات و خصائل

متوکّل گوناگوں اور متضاد صفات و خصائل کا حامل تھا۔ ایک طرف یہ حضرت علی اور حسنین علیہم السلام کا بدترین دشمن تھا۔ دوسری طرف روایاتِ خاندانی کے برعکس کہ اب تک اس خاندان میں کوئی خلیفہ کسی خاص امام کا مقلد نہ تھا امام شافعی کا مداح، معتقد اور مقلد تھا۔ جن کا جذبۂ حبِ اہل بیتؓ ایک معروف و مشہور واقعہ ہے۔

اسے ایک طرف احیائے سنّت سے حد درجہ شغف تھا، دوسری طرف بے انتہا عیّاش اور بدنفس تھا۔ علامہ سیوطی متوکل سے اس لیے بہت خوش ہیں کہ وہ ان کا ہم عقیدہ یعنی شافعی بن گیا تھا۔ اور اس واقعے کا ذکر بڑے فخر سے اپنی تاریخ الخلفاء میں کرتے ہیں دوسری جانب اس امر کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ اس کے حرم میں چار ہزار لونڈیاں تھیں اور ان سب سے وہ تمتع کر چکا تھا۔

قتل سے تخت نشینی کا آغاز

یہ ایک خوارزمی لونڈی کے بطن سے تھا۔ واثق کسی کو ولیعہد نہیں بنا گیا تھا۔ اس لیے اس کی وفات کے بعد قاضی احمد

۱: ۲۳۲ھ تا ۲۴۶ھ (۸۴۷ء - ۸۶۱ء)

بن داؤد نے بڑھ کر اس کو شاہی لباس پہنایا۔ اور پیشانی پر بوسہ دے کر سلام خلافت گزرانا اس پر سب کا اتفاق ہو گیا۔ اور "متوکل علی اللہ" لقب اختیار کیا۔ ذی الحجہ ۲۳۲ھ میں وہ تخت نشین ہوا۔ اس وقت اس کا ستائیسواں سال تھا۔

واثق کے زمانے سے متوکل وزیر ابن زیات سے برہم تھا۔ چنانچہ تخت خلافت پر بیٹھنے کے بعد اس کو قید کر دیا۔ پھر اس لوہے کے کانٹے دار تنور میں جسے ابن زیات نے لوگوں کو سزا دینے کے لیے بنوایا تھا اس کو بند کر دیا۔ اسی تنور میں اس نے تڑپ تڑپ کر جان دی۔

اسی زمانے میں ایتاخ ترکی پر عتاب نازل ہوا۔ اور وہ قتل کیا گیا۔

صوبہ آرمینیا کی حکومت پر یوسف بن محمد مامور تھا۔

ارمینیا کے بطریقوں کی بغاوت

بقراط بن اسواط نامی بطریق نے جو بطریقوں کا سردار تھا دار الامارت میں حاضر ہو کر یوسف بن محمد سے امان طلب کی۔ یوسف نے اس کو مع اس کے بیٹے کے گرفتار کر کے خلیفہ متوکل کے پاس بھیج دیا۔ ارمینیا کے بطریقوں میں یوسف کے خلاف سخت اشتعال پیدا ہوا تھا۔ بقراط بن اسواد کے داماد موسیٰ بن زراہ نے بطریقوں کو جمع کر کے اس مسئلے میں مشورہ طلب کیا۔ سب نے قسمیں کھائیں کہ یوسف بن محمد کو قتل کر دیں گے۔ چنانچہ موسیٰ بن زراہ کی سرکردگی میں عیسائیوں نے خروج کیا یوسف بن محمد مقابلے کو نکلا۔ رمضان ۲۳۷ھ میں یوسف بن محمد اور اس کے ہمراہیوں کو باغیوں نے قتل کر ڈالا۔ یہ خبر سن کر متوکل نے بغا کبیر کو ارمینیا کی طرف بھیجا۔ بغا کبیر نے موصل اور جزیرہ میں ہوتے ہوئے مقام ارزن کے قریب جا کر قیام کیا اور ارزن کو فتح کر لیا۔ موسیٰ بن زراہ کے ہمراہیوں میں سے قریباً تیس ہزار آدمی مارے گئے اور ایک گروہ کثیر گرفتار ہوا۔ اس کے بعد ۲۳۸ھ تک بغا کبیر نے ارمینیا کے باغی بطریقوں کو چن چن کر سزائیں دیں۔ اور سب کو گرفتار کر کے بغداد کی جانب بھیج دیا۔

خلیفہ متوکل نے علی بن یحییٰ کو لشکر صاعفہ کے ساتھ بلاد روم پر جہاد رومیوں کی سرکوبی کرنے کو روانہ کیا۔ اور ۲۴۴ھ میں خود دار الخلافہ کو چھوڑ کر دمشق میں آیا۔ اور دمشق میں قیام کر کے بلادِ روم پر فوجیں بھیجے اور حملۂ روم کو کامیاب بنانے میں

مصروف ہوا۔ خلیفہ کے ہمراہ دمشق میں تمام اراکین سلطنت آ گئے۔ کیونکہ خلیفہ کا ارادہ مستقل طور پر دمشق ہی میں قیام کرنے کا تھا۔ ابھی خلیفہ کو دمشق میں آئے ہوئے صرف دو ہی مہینے گزرے تھے کہ وہاں وبا پھوٹ نکلی۔ اور خلیفہ کو مجبوراً دمشق سے بغداد آنا پڑا۔ دمشق سے روانگی کے وقت متوکل علی اللہ بغا کبیر کو ایک لشکرِ عظیم کے ساتھ بلادِ روم پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کر آیا۔ بغا کبیر نے بلادِ روم میں داخل ہو کر ہر طرف قتل کا بازار گرم کر دیا۔ بہت سے قلعے فتح کیے اور رومیوں کو بے دریغ تہِ تیغ کرنے اور اسیر بنانے میں کمی نہیں کی۔

جب رومیوں نے الامان الامان کی آوازیں بلند کیں۔ اور اپنی خطاؤں کی معافی چاہی تو بغا کبیر خلیفہ کے حکم سے واپس آیا۔ ۲۴۵ھ میں رومیوں نے پھر بدعہدی کی اور موقع پا کر مسلمانوں کے شہروں کو لوٹ کر بھاگ گئے۔ اس کے جواب میں علی بن یحییٰ نے بلادِ روم پر حملہ کیا اور خوب لوٹ مار کر کے واپس ہوا۔ ۲۴۶ھ میں رومیوں نے پھر مسلمانوں کو تنگ کرنا شروع کیا۔

اب کی مرتبہ خلیفہ متوکل نے خشکی اور تری کی راہوں سے مختلف مقامات اور مختلف سمتوں سے بلادِ روم پر حملہ آوری کے لیے فوجیں متعین کیں۔ ان بحری و بری فوجوں نے بلادِ روم میں ایک زلزلہ پیدا کر دیا۔ رومیوں نے پھر معافی چاہی اور صلح کے خواہش مند ہوئے مسلمانوں نے بہ خوشی اس درخواستِ صلح کو منظور کر لیا۔ اور نہر لامس پر پھر قیدیوں کا تبادلہ عمل میں آیا۔ اس مرتبہ دو ہزار تین سو قیدی ۲۴۶ھ میں چھڑائے گئے۔

شہر جعفریہ کی تعمیر

۲۴۵ھ میں متوکل نے ایک جدید شہر موسوم بہ جعفریہ آباد و تعمیر کرایا۔ اس کی تعمیر میں دو لاکھ دینار صرف ہوئے۔ وسطِ شہر میں ایک بہت بڑا محل جس کا نام لؤلؤ رکھا تھا تعمیر کرایا، اس کی بلندی تمام محل سراؤں سے زیادہ تھی۔ اس شہر کو کوئی جعفریہ کوئی متوکلیہ کوئی ماخورہ کہتا تھا۔ اسی سال جعفر بن دینار خیاط نے وفات پائی۔ اسی سال نجاح بن سلمہ کو متوکل نے اس قدر پٹوایا کہ وہ مر گیا۔ نجاح بن سلمہ بڑے رعب داب کا آدمی تھا۔ اور متوکل کے دفتر فرامین کا افسر تھا، اس کی نسبت رشوت کا الزام ثابت ہو گیا تھا۔ اسی لیے اس کو ایسی سخت سزا دی گئی۔

احیائے سنت سے متوکل کی دلچسپی متوکل علی اللہ نے تخت خلافت پر بیٹھتے ہی اپنا میلان احیاء سنت کی طرف ظاہر کیا۔ ۲۳۴ھ میں تمام محدثین کو دارالخلافہ سامرہ میں مدعو کیا اور بے حد تعظیم و تکریم سے پیش آیا۔ اس سے پیشتر واثق و معتصم کے عہد میں محدثین علانیہ درس نہیں دے سکتے تھے۔ اور رویت الٰہی کے متعلق احادیث نہیں بیان کر سکتے تھے۔ متوکل نے حکم دیا کہ محدثین مساجد میں آزادانہ حدیث کا درس دیں۔ اور صفات باری تعالیٰ اور رویت باری تعالیٰ کے متعلق احادیث بیان کیں۔

اس کے بعد علامہ ابوبکر بن شیبہ کو جامعہ رصافہ میں اور ان کے بھائی علامہ عثمان کو جامعہ منصور میں متعین کیا۔ ہر ایک کے وعظ میں تقریباً تیس تیس ہزار آدمی شریک ہوتے تھے۔

مشہد حسینؓ کی بے حرمتی عیسائیوں پر پابندیاں ۲۳۵ھ میں متوکل نے تمام عیسائیوں کو حکم دیا کہ وہ لازمی طور پر گلوبند باندھا کریں علامہ سیوطی کا بیان ہے ۲۳۶ھ میں متوکل نے حضرت امام حسینؓ اور آس پاس کی قبروں کو کھدوا دیا اور وہاں کاشت کاری کرائی۔ نیز زیارت قبور سے لوگوں کو منع کیا۔ پھر یہ علاقہ (کربلا) عرصے تک بنجر اور غیر آباد پڑا رہا۔ اہل بیت سے دشمنی کرنے کی وجہ سے متوکل کو لوگ برا بھلا کہنے لگے۔ مزاروں کی بے حرمتی سے عوام بہت رنجیدہ ہوئے۔ اہل بغداد نے مسجدوں کی دیواروں پر متوکل کو گالیاں لکھیں اور شعراء نے اس کی مذمت میں بکثرت ہجو نامے لکھے۔

علامہ یعقوب بن سکیت کا قتل ناحق ۲۴۴ھ میں متوکل نے اپنے لڑکوں کے استاد یعقوب کو قتل کرا دیا اس کا واقعہ یہ ہے کہ متوکل نے ایک دن اپنے لڑکوں معتز اور مؤید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا یہ دونوں اچھے ہیں یا حسن و حسین علیہم السلام یعقوب نے کہا ان سے تو حضرت علیؓ کا غلام قنبر ہی اچھا تھا۔ متوکل نے یعقوب کی زبان کھنچوا ڈالی اور ان کے بیٹوں کو خوں بہا بھجوا دیا۔

خوشامد کرنے والوں پر انعامات کی بارش متوکل اپنی تعریف کرنے والوں کو خوب داد و دہش کرتا تھا۔ اور متوکل نے گزشتہ خلفاء کی بہ نسبت اپنے شعراء کو دل کھول کر انعامات دیے۔ مروان بن ابی جنوب نے متوکل کی شان میں قصیدہ کہا تو اس کو ایک لاکھ بیس ہزار نقد اور پچاس تھان کپڑے کے عنایت کرتے ہوئے کہا میں اس وقت تک ہاتھ نہ روکوں گا جب تک میرا انعام تجھے ڈبو نہ دے

شبستانِ عشرت کی داستانیں

سیوطی نے لکھا ہے: علی بن جہم کا بیان ہے متوکل کو کسی نے محبوبہ نامی خاتون تحفۃً دی جو طائف میں پیدا ہوئی تھی۔ علم و ادب میں کامل اور بلند پایہ شاعر تھی۔ متوکل اس کا فریفتہ تھا۔ ایک دن اس سے خفا ہوگیا اور محل کی تمام خواتین وغیرہ سے کہہ دیا کہ کوئی فرد محبوبہ سے بات نہ کرے۔

اسی زمانے میں ایک دن متوکل نے مجھ سے کہا رات میں نے خواب میں محبوبہ سے صلح کی۔ وہ بھی من گئی۔ میں نے کہا خواب مبارک۔ تو کہا چلو دیکھیں اس کا کیا حال ہے؟ چنانچہ ہم دونوں جب محبوبہ کے پاس پہنچے تو وہ ستار پر غزل گا رہی تھی۔ متوکل نے اسے آواز دی تو وہ جھپٹ کر آئی اور ان کے پاؤں پر گر کر پاؤں چومنے لگی۔ اور پھر کہا اے میرے آقا رات میں نے دیکھا کہ میری آپ کی صلح ہو گئی۔ جس کے جواب میں متوکل نے کہا بخدا میں نے بھی ایسا ہی خواب دیکھا ہے۔ اس کے بعد متوکل نے پھر اسے اس کے مرتبے پر پہنچا دیا۔ متوکل کے قتل کے بعد جب یہ بغا کے قبضے میں گئی تو تب بھی متوکل کے ہجر و فراق کے اشعار پڑھتی تھی۔

ولیعہدوں کی نامزدگی

متوکل کو اپنی بیعت کے وقت امراء میں اختلاف رائے کا تجربہ ہو چکا تھا۔ اس لیے اس نے اپنی زندگی ہی میں اپنے لڑکوں محمد، طلحہ، اور ابراہیم کو علی الترتیب ولی عہد نامزد کر کے منتصر باللہ، معتز باللہ اور موید باللہ لقب دیا۔ اور عباسی حکومت کو ان تینوں میں تقسیم کر کے ہر ایک کو ان کے رقبۂ حکومت کا خود مختار بادشاہ بنا دیا۔

یہ تینوں اپنے اپنے ملکوں کے خود مختار بادشاہ تھے اور ایک کو دوسرے کے حدود میں کسی قسم کی مداخلت کا اختیار نہ تھا۔

متوکل نے ولایتِ عہد کے سلسلے میں منتصر کا نام سب سے مقدم رکھا تھا لیکن اس کو معتز کی ماں سے بہت محبت تھی۔ اس لیے نامزدگی کے بعد اس نے معتز کا نام منتصر سے پہلے کرنا چاہا۔ اور اس کو حکم دیا کہ وہ معتز کے حق میں اپنا منبر بعد میں کر لے لیکن منتصر اس پر آمادہ نہ

نہ ہوا۔ اس کے انکار پر متوکل نے دربار میں اس کا مرتبہ گھٹانا شروع کیا۔ اور عام مجمعوں میں اسے ڈانٹنے، دھمکانے، برا بھلا کہنے لگا۔ اور معتز کو اس کے مقابلے میں بڑھانے کے لیے اپنی نیابت کا اعزاز بڑھانے لگا۔ اور رمضان ۲۳۰ھ کے پہلے جمعہ میں اس کو امامت کی نیابت عطا کی۔ اس تقریب میں اس کے ساتھ وہ تمام آداب و رسوم برتے گئے جو خلفاء کے ساتھ برتے جاتے تھے۔

متوکل نے اسی پر بس نہیں کیا۔ بلکہ علانیہ منتصر کی تحقیر و تذلیل کرنے لگا ایک مرتبہ بھرے دربار میں اس کو گالیاں دیں اور فتح بن خاقان سے اس کے منہ پر طمانچے لگوائے۔ اور حاضرین سے خطاب کر کے کہا لوگو! گواہ رہنا میں نے "مستعجل" یعنی اپنی بادشاہی کے لیے جلدی کرنے والے کو ولی عہدی سے خارج کر دیا۔

باپ بیٹے کے اختلاف کی توجیہ ابن خلدون کی طرف سے

ابن خلدون نے متوکل اور منتصر کے اختلاف کا ایک سبب یہ بھی لکھا ہے کہ اہلبیتؓ کے ساتھ طرزِ عمل کے بارے میں منتصر اپنے اسلاف کے خلاف تھا۔ اور اس بارے میں وہ متوکل کی مخالفت کرتا تھا۔ متوکل کی مجلسوں میں علی الاعلان حضرت علیؓ کے عیوب بیان کیے جاتے تھے منتصر ان کی مخالفت کرتا تھا اور عیب جوئی کرنے والوں کو دھمکاتا تھا اور متوکل سے کہتا تھا کہ علیؓ ہمارے بزرگ اور بنی ہاشم کے شیخ ہیں، اگر آپ کو ان کو برا ہی کہنا ہے تو خود کہیے۔ لیکن ان بیہودوں سے نہ کہلائیے۔ اس پر متوکل منتصر سے بگڑتا اور اسے برا بھلا کہتا۔

ترکوں کے ہاتھوں متوکل کا قتل

ترکی امراء اور متوکل میں پہلے سے کشیدگی تھی۔ اور امیر ایتاخ وغیرہ کے قتل اور ترکوں کے ساتھ متوکل کی برگشتگی کی وجہ سے تمام ترکی امراء اس کے خلاف ہو گئے تھے۔ ولی عہد کی مخالفت کا سہارا پا کر وہ منتصر کے ساتھ ہو گئے۔

یہ سب ۳ شوال ۲۴۷ھ کو رات گئے جب دربار برخاست ہو گیا اور صرف چند آدمی باقی رہ گئے اور محل شاہی کے ایک دروازہ کے سوا تمام دروازے بند

ہو چکے تھے۔ محل میں گھس کر متوکل پر ٹوٹ پڑے۔ فتح بن خاقان نے نمک حلالی کا پورا حق ادا کیا۔ جس وقت متوکل پر تلوار کے وار ہونے لگے تو اس کو بچانے کے لیے اپنے آپ کو اس کے اوپر گرا دیا۔ اور آقا و ملازم دونوں ایک ساتھ قتل ہو گئے۔ منتصر نے اس جرم کو چھپانے کے لیے مشہور کر دیا کہ فتح بن خاقان نے والد کو قتل کیا ہے میں نے اسے انتقام میں قتل کر دیا۔ چونکہ قصر شاہی میں فتح بن خاقان کے علاوہ سب ترک ہی تھے اس لیے فوراً یہ راز افشا نہیں ہوا۔

بنو عباس کی تاریخ میں خلیفہ کے قتل کا یہ پہلا واقعہ تھا اور ترکوں کو حد سے زیادہ بڑھانے اور منتصر کے معاملے میں غیر دانش مندانہ طرز عمل کا لازمی نتیجہ تھا۔ اس واقعے نے خلفاء کا احترام اور خلافت کی عظمت کھو دی۔ اور عباسی خلافت میں اتراک گردی کا دور شروع ہوا۔ قتل کے وقت متوکل کی عمر ۴۰ سال تھی۔ مدتِ خلافت ۱۴ سال ۱۰ ماہ چند دن۔

عہدِ متوکل کی فارغ البالی رعایا کی فارغ البالی، ملک کی آسودہ حالی اور عیش و تنعم کے سامانوں کی فراوانی کے اعتبار سے متوکل کا دور عباسی حکومت کا عہدِ زریں تھا۔ اس کے زمانے میں تمدنی نفاستیں اور رنگینیاں اس نقطے پر پہنچ گئی تھیں جس کے بعد زوال کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ مسعودی کا بیان ہے کہ متوکل کا زمانہ اپنی بھلائیوں، خوبیوں، سرسبزی و شادابی، فارغ البالی اور رفاہیت و عیش کے لحاظ سے عہدِ سرور تھا۔ سارے خواص و عوام اس سے خوش و رضا مند تھے۔ اس کا زمانہ راستوں کے امن و امان، چیزوں کی ارزانی، حسن و شباب کی کیفیتوں اور عشق و محبت کے ولولوں کے لحاظ سے بہترین دور تھا۔ اخراجات کی جس قدر کثرت اس کے زمانے میں تھی اس قدر عباسیہ کے گزشتہ زمانے میں نہ تھی۔

حضرت علیؑ اور اہلبیت سے متوکل کی دشمنی لیکن ان تمام محاسن کے ساتھ اس میں ایک سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ اس کو حضرت علیؑ اور آپ کی اولاد کے ساتھ مخالفت بلکہ نفرت اور دشمنی تھی۔ ان سے محبت

رکھنے والوں تک کا دشمن ہو جاتا۔

اسی نفرت کی بنا پر اس نے ۲۳۶ھ حضرت امام حسینؑ کے مشہد مبارک اور اس کے قرب وجوار کے مکانات کو منہدم کرا کے اس میں کھیتی کرائی اور اس کی زیارت سے لوگوں کو روک دیا۔

امام حسن عسکری اور متوکل

اسی زمانے میں ایک شخص نے متوکل کو اطلاع دی کہ امام حسن عسکری کے گھر میں آپ کے خلاف سازش ہوتی ہے اور اسلحہ اور شیعانِ علیؑ پوشیدہ ہیں۔ متوکل نے ترکوں کو ان کے گھر پر چھاپہ مارنے کا حکم دیا۔ لیکن گھر میں سوائے امام حسن عسکری کے اور کوئی نہ تھا۔ فرش فروش میں کنکریے اور ریت تھا۔ حضرت حسن عسکری پشمینہ کا کرتہ پہنے صوف کا رومال سر پر باندھے اسی فرشِ خاکی پر آیاتِ قرآنی کی تلاوت میں مصروف تھے۔ ترک اسی حالت میں ان کو پکڑ لے گئے اور متوکل کے سامنے پیش کیا۔

مسعودی کا بیان ہے کہ متوکل اس وقت مے پرستی میں مشغول تھا۔ حسن عسکری کو دیکھ کر ان کی تعظیم کی اور جام پیش کیا۔ انھوں نے کہا آج تک میرا گوشت اور خون شراب کے اثر سے محفوظ رہا ہے اس لیے مجھے معاف رکھا جائے۔ متوکل نے آپ سے اشعار سنانے کی فرمائش کی۔ آپ نے چند عبرت انگیز اشعار سنائے۔ متوکل ان کو سن کر بہت رویا اور روتے روتے اس کی داڑھی تر ہو گئی۔ درباریوں پر بھی گریہ طاری ہوا اور متوکل نے سامنے سے شراب ہٹوا دی۔

منتصر باللہ

خوش خلق اور محبِ اہلبیت

حالات و واقعات علامہ جلال الدین سیوطی نے منتصر کے احوال اور واقعات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

منتصر اپنے والد کے انتقال کے بعد ماہ شوال ۲۴۷ھ میں تخت نشین خلافت ہوا۔ اور اپنے بھائیوں معتز اور موید کو ولیعہدی سے خارج کر دیا جنہیں متوکل نے ولیعہد بنایا تھا۔ رعیت میں عدل و انصاف قائم کیا۔ اور اپنی ہیبت کے باوجود لوگوں کے دل موہ لیے۔ کیونکہ بڑا حلیم و سخی تھا۔ وہ کہا کرتا تھا سزا دینے کے بجائے معاف کرنے میں بڑی لذت ہے اور مقتدر شخص کا انتقام لینا نہایت ہی کریہہ فعل ہے۔

منتصر مہیب و بہادر ہونے کے ساتھ دانش مند بھی تھا اور لوگوں کے چکر میں نہ آتا تھا۔ آخر کار ترکوں نے طبیب خاص ابن طیفور کو پوشیدہ طور سے تیس ہزار اشرفیاں دیں، جس نے منتصر کے علاج کے زمانے میں زہریلے نشتر سے اس کی فصد کھولی۔ جس کے باعث منتصر کی موت واقع ہوئی۔ (۵۔ ربیع الثانی ۲۴۸ھ)

شہر جعفریہ کی تخریب اور ویرانی تخت خلافت پر بیٹھنے کے بعد منتصر نے

۱: ۲۴۷ھ تا ۲۴۸ھ (۸۶۱ء تا ۸۶۲ء)

جعفریہ کو جسے متوکل نے بڑے ذوق و شوق سے بے شمار دولت صرف کر کے بنوایا تھا ویران کر دیا اور یہاں کی کل آبادی کو اس کی پرانی جگہوں پر واپس کر دیا۔ تفصیل کے لیے تاریخ یعقوبی ملاحظہ ہو۔

عہدِ منتصر کے فتوحات کا جائزہ

منتصر کا زمانہ نہایت مختصر تھا لیکن اس مختصر زمانے میں صقلیہ میں بعض فتوحات حاصل ہوئیں۔ ۲۴۷ھ میں امیر صقلیہ عباس کی وفات ہوئی۔ اس کے بعد اس کا لڑکا عبداللہ ابن عباس امیر ہوا۔ اس نے جبل بن مالک، ارسنین اور رمشارعہ متعدد قلعے فتح کیے۔ پانچ مہینے کے بعد جمادی الاولیٰ ۲۴۸ھ میں عبداللہ کی جگہ خفاجہ ابن سفیان امیر مقرر ہوا۔ اس نے اپنے لڑکے محمود کو سرقوسہ روانہ کیا، اس نے سرقوسہ پر حملہ کر کے اسے خوب لوٹا۔ اہل سرقوسہ نے مقابلہ کیا مگر ناکام رہے اور محمود صحیح و سالم واپس آیا۔ سرقوسہ سے واپسی کے بعد صقلیہ کے مختلف حصوں میں فتوحات حاصل ہوئیں۔

ترکوں کے مقابلے میں منتصر کی بے بسی

منتصر کے بعد نامزد ولیعہد معتز تھا۔ اس لیے احمد بن خصیب کو خطرہ پیدا ہوا کہ اگر اس کی زندگی میں معتز کی خلافت کی نوبت آگئی تو وہ اس کی جماعت میں سے ایک کو بھی نہ چھوڑے گا۔ اس لیے اس نے امیر وصیف اور بغا سے کہا اگر آج خلیفہ کی آنکھ بند ہو جائے اور کل کو معتز خلیفہ ہو جائے تو ہم میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑے گا۔ اس لیے معتز اور موید کا نام ولیعہدی سے نکالنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ تجویز بھی ترکوں کے لیے مفید تھی، اس لیے بغا نے بھی اس کی تائید کی اور منتصر پر زور ڈالنا شروع کیا کہ معتز اور موید کو ولیعہدی سے خارج کر کے اپنے لڑکے عبدالوہاب کو ولیعہد بنائے۔ منتصر انہی کا بنایا ہوا خلیفہ اور ان کے مقابلے میں بالکل بے بس تھا۔ اس لیے طوعاً و کرہاً اسے رضامند ہونا پڑا۔ چنانچہ دونوں بھائیوں کو طلب کیا۔ اور کہا تم لوگوں کو گمان ہوگا کہ میں نے یہ سب اس لیے کیا ہے تاکہ اپنے لڑکے کو ولیعہد بناؤں خدا کی قسم ایک لمحہ کے لیے بھی میرے دل میں یہ طمع پیدا نہیں ہوئی لیکن ان ترکوں کے مقابلے میں بے بس تھا، مجھے یہ خوف تھا کہ اگر میں تم کو معزول نہیں کرتا تو ان میں سے کوئی نہ

کوئی تم کو ضرور قتل کردے گا۔

یہ سن کر دونوں بھائیوں نے جھک کر بڑے بھائی کے ہاتھ چومے اور منتصر نے دونوں کو گلے لگا کر واپس کیا۔

منتصر کے حسنات و صفات

منتصر عدل و انصاف، نرمی، ضبط و حلم اور دوسرے اوصاف میں متوکل کے مشابہ بلکہ اس سے بڑھا ہوا اور اس کی برائیوں سے بالکل پاک تھا۔ مسعودی کا بیان ہے کہ وہ نہایت متحمل، عاقل و فرزانہ تھا۔ اسے نیکی اور بھلائی سے طبعی رغبت تھی۔ اچھے کام بہت کرتا تھا، سخی تھا، ادیب تھا، پاک دامن تھا اور عدل و انصاف و مکارم اخلاق میں اپنے تمام پیش رووں پر فائق تھا۔

منتصر کا برتاؤ اہلِ بیتِ کرام کے ساتھ

اپنے والد کے برعکس اس کو آلِ اطہار کے ساتھ بڑی عقیدت تھی۔ چنانچہ خلیفہ ہونے کے ساتھ ہی اس نے علویوں اور اہل بیتِ نبوی کے ساتھ زیادتیوں کا سلسلہ یکقلم روک دیا۔ اور ان کے متعلق بحث و مباحثہ کی قطعی ممانعت کردی۔ حضرت امام حسین علیہ السلام اور جملہ آل ابی طالب کے مقابر کی زیارت کی عام اجازت دے دی۔ فدک حضرت حسنین علیہم السلام کی اولاد کو واپس کردیا۔ علویوں کے جس قدر اوقاف تھے سب واگزار کردیے۔ اور شیعانِ علی سے تعرض کرنے کی ممانعت کردی۔

آل ابی طالب کا وطن مدینہ تھا، یہاں کے حکام خلیفۂ وقت کی مرضی کے مطابق ان کے ساتھ سلوک کرتے تھے۔ اور عموماً ان سے بدسلوکی کرنے کے عادی چلے آتے تھے۔ منتصر نے جب مدینہ کے سابق حاکم صالح بن علی کو معزول کرکے علی بن حسین کو مدینہ بھیجا تو رخصت کرتے وقت کہا:

علی! میں تم کو اپنے گوشت اور خون کی طرف بھیج رہا ہوں۔ دیکھوں، ان کے ساتھ تمھارا کیسا برتاؤ رہتا ہے۔ اور تم ان کے لیے کیسے ثابت ہوتے ہو؟!

انھوں نے جواب دیا: انشاء اللہ میں امیر المومنین کے فرمان کی پوری تعمیل کروں کروں گا۔

وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ :

خدا کی قسم اہلِ باطل کبھی سرخرو نہیں ہو سکتے، خواہ ان کی پیشانی سے ماہتاب ہی کیوں نہ طلوع ہو، اور اہلِ حق کبھی ذلیل نہیں ہو سکتے خواہ تمام عالم ان کی ذلت پر کیوں نہ متفق ہو جائے!

غرض معتضد کا عہدِ حکومت خواہ کمزور قرار دیا جائے یا سطوت آفریں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنی ذات، اپنے معتقدات اور افکار و خیالات کے لحاظ سے اس زہرِ ہلاہل کا تریاق تھا جو کسی اور نے نہیں خود اس کے باپ نے ملّتِ اسلامیہ کی رگ و پے میں سرایت کر دیا تھا، اس خاندان میں یہ بڑی عجیب اور حیرت انگیز بات نظر آتی ہے کہ ظلم و رحم، روشنی اور تاریکی، حق اور باطل ساتھ ساتھ رواں دواں نظر آتے ہیں، ایک خلیفہ اگر قہر و غضب کا پیکر ہے تو دوسرا رحم و کرم کا مجسمہ۔ ایک اگر اپنے افکار و معتقدات کے اعتبار سے زہر ہے تو دوسرا تریاق، ایک گمراہ ہے تو دوسرا رہبرِ جادۂ صواب ـــــ شاید یہی سبب ہے کہ یہ خاندان بنو امیہ کے برعکس زیادہ دنوں تک برسرِ اقتدار رہا۔ بنو امیہ کو اس کارگاہِ عالم میں زندگی کے صرف سو سال ملے اور بنو عباس کم و بیش پانچسو سال زندگی کی کٹھنائیاں جھیلتے رہے۔ کبھی جاہ و جلال کے ساتھ کبھی ادبار و انحطاط کے ساتھ!

مستعین باللہ

حالات کی نامساعدت، خلافت سے دستبرداری، قتل

عوام میں شورش

مستعین باللہ بن معتصم باللہ بن ہارون الرشید کا اصل نام احمد اور کنیت ابو العباس تھی۔ خوبصورت گورے رنگ کا آدمی تھا۔ چہرے پر چیچک کے داغ اور توتلا تھا۔ مخارق نامی ام ولد کے پیٹ سے ۲۲۱ھ میں پیدا ہوا تھا۔ جب منتصر فوت ہو گیا تو ارکان سلطنت جمع ہوئے کہ اب کس کو خلیفہ بنایا جائے اولاد متوکل میں معتز اور موید موجود تھے لیکن ترک ان کی جانب سے اندیشہ مند تھے۔ اور ترکوں ہی نے ان کو ولی عہدی سے معزول بھی کرایا تھا۔ لہٰذا معتصم باللہ کے بیٹے احمد کو تخت پر بٹھایا گیا۔ اور مستعین باللہ اس کا لقب تجویز ہوا۔ مستعین باللہ نہایت نیک، فاضل ادیب اور فصیح و بلیغ شخص تھا۔ ۶۔ ربیع الآخر ۲۴۸ھ کو تخت نشین ہوا۔

جب مستعین باللہ کو تخت نشین کرنے کے لیے قصر خلافت کی طرف چلے تو محمد بن عبداللہ بن طاہر اور اس کے ہمراہ اور عام لوگوں نے شور و غوغا مچا کر خروج کیا اور معتز کی خلافت کا مطالبہ پیش کیا، آخر ترکوں نے ان لوگوں کا مقابلہ کیا۔ لڑائی میں بہت سے غوغائی مارے گئے بہت سے ہزیمت خوردہ اپنی جان بچا کر لے گئے۔ ادھر لڑائی ہو رہی تھی ادھر ترک

---

(۱) ۲۴۸ھ تا ۲۵۱ھ (۸۶۲ء تا ۸۶۵ء)

مستعین باللہ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے۔ ہنگامہ فرو ہوا اور انعام و عہدے تقسیم ہونے لگے۔ محمد بن عبداللہ بن طاہر کے پاس بیعت کے لیے پیغام بھیجا گیا۔ اس نے بھی بیعت کرلی۔

ترکوں کے خلاف عوام میں برہمی

۲۴۹ھ میں رومیوں نے ممالک اسلامیہ پر حملہ کیا۔ رومیوں کے مقابلے میں عمر بن عبداللہ اور علی بن یحییٰ دو مشہور سردار مع بہت سے مسلمانوں کے شہید ہوئے۔ ان دونوں سرداروں کی شہادت کا حال سن کر بغداد میں لوگوں کو سخت ملال و افسوس ہوا۔ اور ترکوں کی نسبت شکایات زبانوں پر آنے لگیں کہ انھوں نے طاقت پاکر خلفاء کو قتل اور شرفاء کو ذلیل کرنے کا تو کام کیا لیکن کفار کے مقابلے میں جہاد کرنے کی طرف سے غفلت برتی۔ اسی لیے دو خادم اسلام سردار شہید ہو گئے اور رومیوں کی جرأت مسلمانوں کے مقابلے میں بڑھ گئی۔

اس قسم کا نتیجہ یہ ہوا کہ بغداد میں ایک قسم کی شورش برپا ہو گئی۔

ایک وقت میں دو خلیفہ۔ بغداد اور سامرہ کی جنگ

خلیفہ مستعین نے دلیل بن یعقوب نصرانی کو اپنا وزیر بنایا۔ چند روز کے بعد باغر نامی ایک ترک کو دلیل نصرانی وزیر سے کوئی شکایت پیدا ہوئی۔ اس معاملے میں بغا صغیر اور وصیف نے باغر کو مجرم بتایا۔ خلیفہ نے اس کو قید کر دیا۔ ترکوں نے شورش برپا کی۔ ترکوں کی اس شورش کو دیکھ کر بغا صغیر نے باغر کو قتل کرا دیا۔ اس سے بجائے فرو ہونے کے شورش اور بھی ترقی کر گئی۔ تمام سامرہ باغی ہو گیا۔ اور ہر طرف سے بلوائیوں کے جھنڈے نظر آنے لگے۔ مجبوراً خلیفہ مستعین، بغا، وصیف، شاہک اور احمد بن صالح بن شیرزاد سامرہ سے نکل کر بغداد چلے آئے۔ اور محرم ۲۵۱ھ میں بغداد کے اندر محمد بن عبداللہ بن طاہر کے مکان میں فروکش ہوئے۔ خلیفہ کے آنے کے بعد دفتر کے آدمی بھی دفتر لے کر بغداد آ گئے۔

خلیفہ کے بغداد چلے جانے کے بعد ترکوں کو پشیمانی ہوئی۔ اور سامرہ سے چھ ترک سردار بغداد میں خلیفہ کے پاس آکر ملتجی ہوئے کہ آپ سامرہ ہی تشریف لے چلیں۔ ہم سب اپنی حرکاتِ ناشائستہ سے پشیمان اور معافی کے خواہاں ہیں۔ خلیفہ مستعین نے ترکوں کو ان کی گستاخیاں اور بے وفائیاں یاد دلا کر سامرہ جانے سے انکار کیا۔ ترکوں نے سامرہ واپس جا کر معتز بن متوکل کو جیل سے نکالا اور اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ ابو احمد بن ہارون رشید بھی اس زمانے میں سامرہ میں موجود تھا۔ ابو احمد سے جب بیعت کے لیے کہا گیا تو اس نے کہا میں چونکہ مستعین سے بیعت کر چکا ہوں اور معتز اپنی معزولیٔ ولی عہدی خود تسلیم کر چکا تھا لہٰذا میں بیعت نہیں کروں گا۔ معتز نے ابو احمد کو اس کے حال پر چھوڑ دیا اور زیادہ اصرار نہیں کیا۔

معتز اور مستعین کی الگ الگ خلافت بغا کبیر کے دونوں بیٹوں موسیٰ و عبداللہ نے بھی معتز کی بیعت کر لی۔ اسی طرح جو لوگ معتز کی خلافت کو پسند کرتے تھے وہ معتز کے پاس سامرا چلے گئے جو مستعین کو پسند کرتے تھے وہ سامرہ سے بغداد چلے آئے۔ یہی حالت صوبوں کے عاملوں اور گورنروں کی ہوئی۔ کچھ اس طرف ہو گئے کچھ اس طرف۔ بغداد و سامرہ دونوں جگہ دو الگ الگ خلیفہ تھے۔ مستعین کی طرف خاندانِ طاہریہ اور خراسانی لوگ زیادہ تھے۔ معتز کی طرف قریباً تمام ترک اور بعض دوسرے سردار بھی تھے۔ گیارہ مہینے تک جنگ و پیکار کا ہنگامہ دونوں خلیفوں کے درمیان برپا رہا۔ باہر کے صوبیداروں سے دونوں خط و کتابت کرتے اور اپنی اپنی طرف ان کو مائل کرتے تھے۔ یہ جنگ سامرہ و بغداد تک ہی محدود نہ رہی۔ بلکہ باہر کے صوبوں میں بھی اس کے شعلے مشتعل ہونے لگے مگر زیادہ زور بغداد کے نواح میں رہا۔ کیونکہ باہر والے دارالسلطنت کے نتائج کا انتظار کرنے لگے۔

آخر ماہ ذیقعدہ ۲۵۱ھ میں محمد بن عبداللہ بن طاہر نے جو بغداد میں مستعین کی فوجوں کا سپہ سالار تھا ترکوں پر جو بغداد کا محاصرہ کیے ہوئے تھے ایسا سخت و شدید حملہ کیا

کہ وہ ہزیمت پاکر فرار ہو گئے۔ بغا اور وصیف بغداد میں مستعین کے ساتھ تھے۔ بغا اور وصیف نے جب ترکوں کو شکست پاکر خراسانیوں اور عراقیوں کے مقابلے سے بھاگتا ہوا دیکھا تو ان کی قومی عصبیت میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ فوراً جدا ہو کر ترکوں کی شکست خوردہ فوج سے جا ملے۔ ان کے پہنچنے سے ترکوں کی ہمت بندھ گئی اور وہ اپنی جمعیت کو درست کر کے پھر لوٹ پڑے اور دوبارہ بغداد کا محاصرہ کر لیا۔

مستعین کی خلافت سے دستبرداری اور قتل

ادھر شہر والوں نے محمد بن عبد اللہ بن طاہر کے متعلق خبریں اڑانی شروع کر دیں کہ یہ دیدہ و دانستہ خلیفہ مستعین کو مشکلات میں مبتلا کر رہا ہے جس سے محمد بن عبد اللہ بھی کچھ شکستہ ہو گیا۔ آخر ۶ محرم ۲۵۲ھ کو مستعین باللہ نے معتز باللہ کے پاس ایک تحریر بھیج دی جس میں معتز باللہ کی خلافت کو تسلیم کر کے خود خلافت سے دستبرداری اختیار کی تھی۔ معتز نے مستعین کو واسط میں نظر بند کر دیا اور ۲۵۲ھ میں قتل کر دیا۔

معتز باللہ

ترکوں کے ہاتھوں گرفتاری، ذلت، قتل

حالات و کوائف معتز باللہ بن متوکل علی اللہ بن معتصم باللہ بن ہارون الرشید ۲۳۲ھ میں بمقام سامرہ ایک رومیہ ام ولد قبیحہ نامی کے بطن سے پیدا ہوا۔ محرم ۲۵۱ھ سامرہ میں خلیفہ بنایا گیا۔ ایک سال مستعین باللہ سے جنگ آزما رہ کر مستعین کو خلع خلافت پر مجبور کرنے میں کامیاب ہوا۔ نہایت خوبصورت شخص تھا جس سال یہ تخت نشین ہوا اسی سال اشناس ترکی مرا تھا اس نے پچاس ہزار دینار چھوڑے تھے۔ یہ رقم معتز نے ضبط کر کے اپنا کاروبار چلایا۔ معتز جب تخت خلافت پر بیٹھا ہے تو اس کی عمر انیس سال کی تھی۔ اس نے احمد بن اسرائیل کو وزیر بنایا۔ محمد بن عبداللہ بن طاہر کو بدستور بغداد کی پولیس پر مامور رکھا۔ محمد بن عبداللہ بن طاہر خراسان کا گورنر تھا مگر خراسان میں اس کا نائب رہتا تھا اور وہ خود بغداد میں مقیم تھا معتز کو ترکوں ہی نے تخت خلافت پر بٹھایا تھا، وہ بالکل ترکوں سے دبا ہوا تھا۔ بغداد میں جو لشکر رہتا تھا اس میں خراسانی اور عراقی لوگ تھے۔ اس لشکر کو وظیفے اور تنخواہیں محمد بن عبداللہ تقسیم کیا کرتا تھا معتز نے

(: ۲۵۱ھ تا ۲۵۵ھ (۸۶۵ء - ۸۶۹ء)

اس تمام لشکر کی تنخواہیں اور وظیفے بند کر دیے۔

بھائی کے ہاتھوں بھائی کا قتل ماہ رجب ۲۵۲ھ میں خلیفہ معتز نے اپنے بھائی مؤید کو ولی عہدی سے معزول کر دیا۔ اور جیل خانے بھجوا کر قتل کرا دیا۔

احمد بن طولون۔ غلام سے بادشاہ ترکی سرداروں میں بابجیال نامی سردار بھی بغا، وصیف اور سیما طویل کی طرح ایک سر برآوردہ اور نامی سردار تھا۔ اسی سال یعنی ۲۵۳ھ میں خلیفہ معتز باللہ نے بابجیال کو سندِ گورنری عطا کی۔ بابجیال نے اپنی طرف سے احمد بن طولون کو بطور نائب حکومت مصر مقرر کر کے بھیجا۔

طولون ایک ترک تھا جو لڑکپن میں فرغانہ کی لڑائی میں گرفتار ہو کر آیا تھا۔ اس نے خاندانِ خلافت میں پرورش پائی تھی، اور غلامانِ شاہی میں شامل تھا۔ اس کے بیٹے احمد نے بھی دار الخلافہ میں پرورش پا کر امورِ سلطنت سے واقفیت حاصل کی تھی۔ بابجیال کو جب مصر کی سندِ گورنری ملی تو اس کو یہ فکر ہوئی کہ اپنی طرف سے کس کو مصر کی حکومت پر مامور کر کے بھیجوں، اس کے مشیروں نے احمد بن طولون کا نام لیا۔ چنانچہ اس نے احمد بن طولون کو مصر بھیج دیا۔ اور احمد نے مصر پر قبضہ کر کے وہاں کا انتظام کیا۔ جب معتز کے بعد خلیفہ مہتدی نے بابجیال کو قتل کر کے یارکوج ترکی کو مصر کی گورنری عطا کی تو یارکوج نے بھی اپنی طرف سے احمد بن طولون کو مصر کی حکومت پر مامور رکھا۔ اس طرح احمد بن طولون کو حکومت مصر پر خوب مضبوطی سے قیام ہو گیا اور پھر اس کی اولاد وراثۃً مصر پر قائم رہی اور اپنا سکہ مصر میں چلایا۔ ۲۵۳ھ سے مصر کو بھی خلافتِ عباسیہ سے خارج ہی سمجھنا چاہیے کہ ۲۵۳ھ سے مصر میں حکومت طولونیہ کی ابتدا ہوئی۔

ایک نئی حکومت کا بانی یعقوب بن لیث اور اس کا بھائی عمرو بن لیث دونوں سجستان میں تانبے اور پیتل کے برتنوں کی دکان کرتے تھے۔ چونکہ اس زمانے میں خلافت کے کمزور ہو جانے کی وجہ سے جابجا بغاوتیں اور سرکشیاں نمودار ہو

رہی تھیں۔ اس لیے خوارج نے بھی خروج شروع کیا۔ اُن کے مقابلے میں اہل بیت یعنی علویوں کے طرف دار بھی نکل کھڑے ہوئے۔ انہیں میں سے ایک شخص صالح بن نضر کنعانی بھی ہواخواہی اہلبیت کا دعویٰ کر کے خروج پر آمادہ ہوا۔ اس کے گرد امرار و رؤسا اور عوام الناس کا ایک گروہ جمع ہو گیا۔ یعقوب بن لیث بھی اسی گروہ میں شامل ہو گیا۔ صالح نے بڑھ کر سجستان پر قبضہ کر لیا اور خاندانِ طاہریہ کے ارکان کو وہاں سے نکال دیا۔ اس کامیابی کے بعد ہی صالح کا انتقال ہو گیا۔ صالح کی جماعت نے یعقوب بن لیث کو امیر بنا لیا۔ یعقوب نے نہایت ہوشیاری اور شجاعت سے کام لے کر سجستان پر اپنا قبضہ مکمل کیا اور محمد بن عبداللہ بن طاہر کے عامل محمد بن اوس انباری کو جو ہرات کی حکومت پر متعین تھا نکال دیا اور ہرات پر قبضہ کر کے خراسان کے علاقوں پر قبضہ کرنا شروع کیا۔

اسی اثنا میں فارس کے گورنر علی بن حسین بن شبل نے کرمان پر قبضہ کرنا چاہا۔ ادھر سے یعقوب بن لیث نے بھی کرمان کو اپنے تصرف میں لانا چاہا۔ علی بن حسین کے سپہ سالاروں کو یعقوب بن لیث نے شکست دے کر بھگا دیا اور آخر فارس کے دارالسلطنت شیراز پر حملہ آور ہو کر ۲۵۵ھ میں شیراز پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد فوراً سجستان کی طرف واپس چلا گیا اور دربار خلافت میں ایک درخواست اس مضمون کی بھیج دی کہ اس علاقہ میں بڑی بد امنی پھیل رہی تھی یہاں کے لوگوں نے مجھ کو اپنا امیر بنایا ہے۔ میں امیر المومنین کا فرماں بردار ہوں۔

معتز باللہ کی معزولی اور موت

خلیفہ معتز ترک سرداروں کے قبضے میں تھا وہ جو چاہتے کرتے تھے۔ خزانہ بالکل خالی ہو گیا تھا۔ بڑے بڑے سرداروں نے خزانہ پر خود تصرف کر لیا تھا۔ فوج کے آدمی خلیفہ پر اپنے وظائف کا تقاضا کرتے تھے۔ خلیفہ سخت مجبور تھا۔ آخر ایک روز ترکوں نے جمع ہو کر خلیفہ کے دروازے پر جا کر شور و غل مچایا۔ اور کہا کہ ہم کو کچھ دلوائیے۔ ورنہ ہم صالح کو قتل کر دیں گے۔

ترکوں نے جب دیکھا کہ پوری تنخواہ نہیں مل سکتی تو انھوں نے کہا کہ اگر پوری تنخواہ نہیں مل سکتی تو انھوں نے کہا کہ پچاس ہزار دینار بھی دے دیے جائیں تو وہ اس پر قناعت کر لیں گے۔ لیکن معتز کے پاس ایک حبہ نہ تھا اس لیے وہ اتنا مطالبہ بھی پورا نہ کر سکا۔ فوج نے

مایوس ہو کر قصرِ سلطانی پر حملہ کر دیا۔ اور معتز کو محل سے باہر بلا بھیجا۔ اس نے کہلا دیا کہ میں نے اس وقت دوا پی ہے اس لیے باہر نہیں آسکتا۔ اگر کوئی ضروری کام ہو تو تم میں سے کوئی آدمی خود اندر چلا آئے۔ یہ سن کر سب کے سب محل میں گھس گئے اور معتز کو پیٹتے ہوئے باہر گھسیٹ لائے۔ اور اتنا مارا کہ اس کی قمیص کے پرزے اڑ گئے۔ اور تپتی ہوئی زمین پر ننگے پاؤں کھڑا کر دیا۔ وہ تپش سے ایک پاؤں اٹھاتا تھا ایک رکھتا تھا۔ اور وحشی ترک برابر طمانچے مارے جاتے تھے۔ خلیفۂ وقت کو اس طرح ذلیل و رسوا کرنے کے بعد قاضی ابو الشوارب اور گواہوں کے روبرو اسے معزول کر کے ایک سنگ دل ترک کے حوالے کر دیا۔ اس نے سزا کا سلسلہ جاری رکھا اور کھانا پانی بند کر دیا۔

ماں نے بھی ساتھ نہیں دیا

معتز کی ماں قبیحہ بڑی دولت مند تھی۔ اس کے پاس بے شمار دولت تھی، اگر وہ چاہتی تو روپیہ دے کر معتز کی جان بچا سکتی تھی لیکن وہ دولت کی بڑی حریص تھی۔ اس لیے معتز کی گرفتاری کے وقت وہ روپوش ہو گئی۔

معتز کو معزول کرنے کے بعد باغی ترک محمد بن واثق کو جسے معتز نے بغداد میں نظر بند کر رکھا تھا نکال کر سامرہ لائے اس کے آنے کے بعد معتز جان و مال کی امان لے کر رجب ۲۵۵ھ میں باقاعدہ دست بردار ہو گیا۔ مگر قتل کر دیا گیا۔ اور ترکوں نے محمد بن واثق کو خلیفہ بنایا معتز کی مدتِ خلافت ۴ سال ۸ مہینے چند دن تھی۔

خلیفۂ معتز کی حیاتِ الم انگیز کے بعض پہلو

بیعتِ خلافت کی تاریخ سے لے کر دستبرداری تک ایک دن بھی اسے ترکوں کی ذات سے چین و سکون میسر نہ ہوا۔ جب تک بغا زندہ رہا معتز کا خواب و خور حرام تھا۔ بغا کے خوف سے وہ نہ بیٹھی نیند سوتا تھا اور نہ شبانہ روز میں کسی وقت ہتھیار اتارتا تھا۔ اور کہتا تھا جب تک میرا یا بغا کا سر نہ چلا جائے۔ اس وقت تک اسی حالت میں رہوں گا۔ اس پر بغا کا خوف اتنا غالب تھا کہ کہتا تھا مجھے ڈر معلوم ہوتا ہے کہ بغا مجھ پر آسمان سے نازل نہ ہو جائے یا زمین پھاڑ کر میرے سامنے نہ نکل آئے۔ اس کا پورا زمانہ شورش اور انقلابات میں

گزرا اور حکومت کی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہ ملی۔

ایک لطیفہ ایک طنز اس بدبخت خلیفہ کے بارے میں "الفخری" نے لکھا ہے:
متوکل کے قتل ہونے کے بعد مملکت پر ترکوں کا پورا تسلط ہو گیا تھا۔ خلفاء بے بس ہو کر رہ گئے تھے۔ خلیفہ ان کے ہاتھ میں ایک ایسے قیدی کی طرح تھا کہ یہ چاہیں تو اسے باقی رکھیں چاہیں معزول کر دیں۔ چاہیں قتل کر دیں۔

جب معتز تختِ خلافت پر بیٹھا تو اس کے خاص احباب اس کے پاس آ بیٹھے۔ ایک نجومی کو بلوایا گیا اور اس سے پوچھا۔ ذرا دیکھ کر بتاؤ یہ کب تک زندہ رہے گا اور اس کی خلافت کب تک باقی رہے گی۔ اس نے جواب دیا جب تک یہ ترک چاہیں گے۔ اس پر ساری محفل کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

معتز کے بارے میں سیوطی کا بیان علامہ سیوطی نے معتز باللہ کے بارے میں تحریر فرمایا ہے:
المعتز باللہ لقب، ابو عبداللہ کنیت اور محمد نام تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ زبیر نام تھا۔ غرضنکہ معتز باللہ کے والد کا نام متوکل، دادا کا نام معتصم اور پردادا کا نام ہارون رشید بن مہدی بن محمد بن منصور تھا۔ اس کی ماں کا نام قبیحہ تھا جو روم کی رہنے والی تھی۔ اور اس کے والد متوکل کی باندی تھی۔

مستعین کی خلافت سے دست برداری کے بعد معتز ۲۵۲ھ میں بہ عمر ۱۹ سال تخت نشین خلافت ہوا۔ اس سے قبل کوئی اتنی کم عمری میں خلیفہ نہیں ہوا۔ معتز بڑا ہی حسین و خوبصورت تھا۔

معتز کے استادِ حدیث علی بن حرب کا بیان ہے معتز سے زیادہ حسین و خوبصورت کوئی خلیفہ دیکھنے سننے میں نہیں آیا۔

معتز کس طرح ہلاک ہوا محمد بن واثق وہ شخص تھا جسے معتز نے بغداد میں نظر بند کر دیا تھا اس واقعہ کے پانچ دن کے بعد ترک معتز کو گرم حمام میں لے گئے جہاں غسل کرنے کے بعد اسے پیاس لگی اور اسے برف کا پانی پلا دیا جس کے پیتے ہی وہ فوراً مر گیا۔ یہ واقعہ ماہ شعبان ۲۵۵ھ میں ہوا۔

مہتدی باللہ

خاندانِ بنو عباس کا عمر بن عبدالعزیز

محاسن و خصائل، صفات و شمائل مہتدی باللہ بن واثق باللہ بن معتصم باللہ بن ہارون الرشید کا اصل نام محمد اور کنیت ابو اسحٰق تھی۔ اپنے دادا کے عہدِ خلافت ۲۱۸ھ میں پیدا ہوا۔ اور ۳۷ سال کی عمر میں بتاریخ ۲۹۔ رجب ۲۵۵ھ تخت نشین ہوا۔ گندم گوں، دُبلا پتلا، خوبصورت، عابد و زاہد، عادل اور بہادر شخص تھا۔ احکام الٰہی کی پابندی کے رواج دینے میں بہت کوشاں تھا۔ تخت نشین ہونے کی تاریخ سے مقتول ہونے تک برابر روزہ رکھتا رہا۔ مگر اس کو کوئی مددگار نہ ملا۔ اس نے ایسا خراب زمانہ پایا کہ خلافتِ اسلامیہ کے عزت و وقار کو دوبارہ واپس لانا سخت دشوار تھا۔

مہتدی نے لہو ولعب کو سختی سے روک دیا تھا۔ گانے بجانے کو حرام قرار دیا تھا۔ عاملانِ سلطانی کو ظلم کرنے سے سخت ممانعت کر دی تھی۔ دفتر کے معاملات میں سختی

ا: ۲۵۵ھ تا ۲۵۶ھ (۸۶۹ - ۸۷۰ء)

سے کام لیتا تھا۔ خود روزانہ اجلاس کرتا۔ دسامرا سے تمام لونڈیوں اور مغنیوں کو نکلوا دیا محل سرائے شاہی میں جس قدر درندے پلے ہوئے تھے سب کے مار ڈالنے اور کتوں کے نکلوانے کا حکم دیا۔ قلمدانِ وزارت سلیمان بن وہب کے سپرد کیا مگر صالح بن وصیف نے اپنی حکمتِ عملی اور خوش تدبیری سے سلیمان بن وہب کو بھی اپنے قابو میں کر لیا اور خود حکومت کرنے لگا۔

مہتدی باللہ کی ہلاکت ترکوں کے ہاتھوں

مہتدی باللہ نے ایک شورش پسند ترک افسر بابکیال کو قتل کرا کے اس کا سر ترکوں کی طرف پھینک دیا۔ بابکیاں کو ترکوں میں غیر معمولی مقبولیت تھی۔ وہ ترک جو فرغانہ وغیرہ کے خلیفہ کی فوج میں شامل تھے بابکیال کے قتل سے ناراض ہو کر موسیٰ کی فوج میں جا ملے جس نے خلیفہ مہتدی کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ بغداد و سامرا اور دوسرے مقامات کی رعایا خلیفہ مہتدی کے لیے دعائیں مانگ رہی تھی۔ کیونکہ رعایا اس خلیفہ کے عدل و داد سے بہت ہی خوش تھی اور خلیفۂ صالح کے لقب سے یاد کیا کرتی تھی مگر نتیجہ اس کا مہتدی کے خلاف نکلا، خلیفہ کو شکست ہوئی اور ترکوں نے اس کو گرفتار کر کے خصیتین دبا کر مار ڈالا۔ یہ حادثہ ۱۴۔ رجب ۲۵۶ھ کو وقوع پذیر ہوا۔ خلیفہ مہتدی باللہ نے پندرہ دن کم ایک سال خلافت کی اور ۳۸ سال کی عمر میں مقتول ہوا۔

مہتدی باللہ کے کردار و صفات کا جائزہ

الفخری نے لکھا ہے کہ مہتدی تمام خلفا میں ایسا خلیفہ تھا جو مذہب میں، بہترین کردار میں لاجواب، تقویٰ میں ممتاز اور عبادت میں بڑھ چڑھ کر تھا۔ وہ عمر بن عبدالعزیز سے بہت مشابہ تھا۔ اور کہتا تھا مجھے یہ دیکھ کر بہت شرم آتی ہے کہ بنی امیہ میں اُن جیسا آدمی ہو اور بنی عباس میں ان جیسا کوئی نہ ہو۔ جب وہ مقدمات کا فیصلہ کرنے بیٹھتا تو ایسا فیصلہ دیتا کہ لوگ خوش ہو جاتے۔ وہ اپنی پوشاک اور خوراک پر بہت کم خرچ کرتا تھا۔

مہتدی کو معزول کرنے کا ترک امراء کی طرف سے فیصلہ

مہتدی غیر معمولی دل و دماغ اور صلاحیتوں کا شخص تھا لیکن قسمت کا ہیٹا تھا، اس نے اچھا زمانہ نہیں پایا۔ ترک امورِ حکومت اور قصرِ خلافت پر اتنے غالب آچکے تھے کہ جو چاہتے تھے کرتے تھے۔ انھیں جب یہ شبہ ہوا کہ مہتدی ان کے راستے کا کانٹا ہے تو بہانہ سازی کر کے اسے معزول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

مہتدی کو اس فیصلے کی اطلاع ہوئی تو اس نے صاف کپڑے پہنے، خوشبو لگائی اور تلوار گلے میں ڈال کر نکلا اور ترکوں کو مخاطب کر کے یہ پُرجوش تقریر کی۔ مجھے مستعین اور معتز نہ سمجھنا، میں موت کے لیے تیار ہو کر آیا ہوں، جب تک میری تلوار کا قبضہ میرے ہاتھ میں ہے، اس وقت تک وہ تمھارے سروں پر چمکتی رہے گی، یاد رکھو اگر میرا ایک بال بھی گرا تو اس کے بدلے میں تمھارا پورا گروہ برباد کر دیا جائے گا۔ کیا مذہب، حیا اور خوف تم میں باقی نہیں رہ گیا ہے۔ خلفاء اور خدا کے ساتھ تمھاری یہ مخالفت، تمھارا یہ اقدام اور تمھاری یہ جسارت کب تک قائم رہے گی خلیفہ تمھارا خیر خواہ ہو یا بدخواہ تمھاری جسارت دونوں کے ساتھ یکساں رہتی ہے اگر تمھیں یہ خیال ہے کہ تمھاری ذات سے مجھ کو کوئی دنیاوی فائدہ پہنچتا ہے تو مجھے بتاؤ کہ تمھاری دنیا سے مجھے کیا ملا؟ تم کو معلوم ہوگا کہ تمھارے بعض متوسلین میرے بھائیوں اور میری اولاد سے زیادہ دولت مند اور فارغ البال ہیں۔ اگر تم اس کا ثبوت چاہتے ہو تو جاؤ تم ان کے گھروں کا جائزہ لو، دیکھو تم کو وہاں فرش فروش، لونڈی، غلام، خدم و حشم، جاگیر اور آمدنی میں سے کوئی چیز بھی تمھارے برابر نظر آتی ہے۔

مہتدی سے ترکوں کی دشمنی کے اسباب

مہتدی بڑا مدبر، بیدار مغز، عاقبت اندیش اور اس کے ساتھ ہی دیندار خلیفہ تھا، ترکوں کا استبداد اور ان کی خودسری و بے دینی اس کی نگاہوں میں کھٹکتی تھی، وہ

دیکھ رہا تھا کہ ترکوں نے عباسی حکومت کی سیاسی اہمیت کا بالکل خاتمہ کر دیا ہے۔ اگر یہی لیل و نہار رہے تو وہ چند دن کی مہمان ہے۔ اس سیاسی ضعف کے ساتھ امتدادِ زمانہ، غیر قوموں کی آویزش اور ترکوں کی وحشت سے اس کی مذہبی اور اخلاقی روح بھی روز بروز مُردہ ہوتی جاتی ہے اس لیے مہتدی چاہتا تھا کہ وہ ان تمام مفاسد کو دور کر کے عظمت و شان میں ہارونی عہد اور عدل پروری اور دینی روح میں عمر بن عبد العزیز کی یاد تازہ کر دے۔ چنانچہ سب سے پہلے اس نے مذہبی اور اخلاقی اصلاح کی طرف توجہ کی اور "قبۃ المظالم" کے نام سے ایک عمارت بنوائی، اس میں وہ روزانہ رعایا کی دادرسی کے لیے بیٹھتا تھا۔ عوام و خواص سب بلا امتیاز آتے تھے اور مہتدی ان سب کی دادرسی کرتا تھا۔ نماز پنجگانہ کے لیے جامع مسجد جاتا تھا۔ خود ہی امامت کرتا اور نماز کے بعد خطبہ دیتا تھا۔ خطیب کا بیان ہے کہ عمالِ حکومت کے ظلم و تعدی کو سختی کے ساتھ روک دیا تھا۔

لیکن جو لوگ مدتوں سے آزادانہ زندگی کے خوگر چلے آتے تھے ان پر یہ احتساب سخت گراں گزرا۔ مسعودی لکھتا ہے کہ جب مہتدی نے لوگوں کو سیدھے راستے پر چلانا چاہا تو عوام اور خواص سب پر یہ بار گراں گزرا اور وہ اس کے عہدِ خلافت سے تھک کر اس سے گھبرانے لگے۔ انھوں نے اس کے خلاف حیلہ جوئیاں شروع کر دیں اور اسے قتل کر کے چھوڑا۔

مہتدی کے قتل کی ایک اور روایت مسعودی کا بیان ہے کہ مہتدی کو گرفتار کرنے کے بعد ترکوں نے اس سے سوال کیا کہ تم لوگوں کو ایسے اخلاق اور ایسے راستے پر چلانا چاہتے ہو جس سے وہ ناواقف ہیں۔ مہتدی نے کہا میں ان کو رسول اللہ صلعم، اہلِ بیتِ نبوی اور خلفائے راشدین کے طریقے پر چلانا چاہتا ہوں، اس کا یہ جواب ملا کہ رسول اللہ صلعم کا سابقہ ایسے لوگوں سے تھا جو دُنیا سے کنارہ کش اور آخرت کی طرف مائل تھے۔ اور تمھارے ساتھی ترک خزر، فرغانی، مغربی وغیرہ عجم کی ایسی قومیں ہیں جو اخروی فرائض سے ناواقف ہیں۔

اور اُن کا مقصود اور ان کی غرض وغایت دنیاوی منفعت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ایسی حالت میں تم ان کو کیونکر اس راستے پر چلا سکتے ہو؟

پھر ترک دیوانہ وار خنجر لے کر مہتدی پر جھپٹ پڑے۔ بابکیال کے چچازاد بھائی نے جو شراب کے نشے میں چور تھا وار کر کے گردن کی رگ کاٹ دی، خون کا فوارہ پھوٹ نکلا، وحشی ترک نے زخم میں منہ لگا کر خون پیا اور پی کر بولا جس طرح میں نے آج شراب سیر ہو کر پی تھی ویسے ہی خون سے بھی خوب آسودہ ہوا۔ یہ واقعہ رجب ۲۵۶ھ کا ہے۔

مہتدی باللہ کی شانِ عدل مہتدی کی سیرت کا نمایاں رُخ اس کا عدل وانصاف، زہد وتقوٰی اور امر ونواہی کا قیام ہے۔

کرسئ عدالت پر بیٹھنے کے بعد اپنے اور بیگانے سب اس کی نظر میں ایک ہو جاتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی شخص نے اس کے لڑکے پر دعویٰ کیا۔ مہتدی نے اس کو عدالت میں طلب کیا۔ اور مدعی کے پہلو میں کھڑا کر کے دعوے کے متعلق پوچھا۔ لڑکے نے اقرار کر لیا، مہتدی نے اسی وقت اس کا حق واپس دلایا۔

مہتدی کے زاہدانہ صفات مہتدی کی زندگی سادگی اور زہد کا نمونہ تھی۔ اپنے خاندان والوں سے کہا کرتا تھا کہ مجھے عمرؓ بن عبد العزیزؒ کے راستے پر چلنے دو کہ میں بنو امیہ کی طرح بنو عباس میں بھی عمر بن عبد العزیزؒ کی مثال پیدا کر دوں۔ اس اسوۂ حسنہ کو اس نے عملاً کر دکھایا۔ کھانے، پینے، لباس، ساز و سامان اور فرش فروش سب میں اس نے عمر بن عبد العزیزؒ کی تقلید کی۔ سارے نقرئی و طلائی ظروف گلوا کر اس کے سکے ڈھلوا دیے، ایوانِ عیش کے تمام مرقعے مٹا دیے مینڈھوں اور مرغوں کا غول جو خلفائے عباسیہ کی تفریح طبع کے لیے جمع کیے گئے تھے ذبح کروا دیے۔ دیبا اور اس جیسے کے جملہ فرش فروش جن کا استعمال شرعاً ممنوع تھا اٹھوا دیے، خلفائے عباسیہ کے دستر خوان کا خرچ دس ہزار درہم روزانہ تھا مہتدی نے گھٹا کر سو درہم کر دیا۔ اور اس سے بھی وہ بہت کم فائدہ اٹھاتا تھا۔ کیونکہ ہمیشہ روزہ

رکھتا تھا۔

اس کے قتل کے بعد اس کا ایک بکس لوگوں کے ہاتھ آیا وہ سمجھے اس میں کچھ نقدی اور قیمتی جواہرات ہوں گے لیکن جب کھولا گیا تو صرف صوف کا ایک جبہ اور ایک معمولی ہنڈی نکلی۔ اس کے خادم سے پوچھا گیا تو معلوم ہوا کہ مہتدی رات گئے اسے پہن کر صبح تک رکوع وسجود میں مشغول رہتا تھا، رات کے ابتدائی حصے میں تھوڑا سا سو کر اٹھ بیٹھتا تھا اور بقیہ رات عبادت کرتا تھا۔

صلحاء واخیار کے سبق آموز مواعظ کا ورد رکھتا تھا، حضرت علیؓ کا ایک نہایت پُر موعظت خطبہ محمد بن علی ربعی سے پوچھ کر قلم بند کر لیا تھا اور روزانہ رات کو ایک تنہا مکان میں رو رو کر دُہراتا تھا۔ مسعودی نے یہ پورا خطبہ نقل کیا ہے۔

معتمد علی اللہ[1]

ترکوں کی بڑھتی ہوئی طاقت خلیفۂ وقت کی بے بسی!

این دفتر بے معنی غرق مے ناب اولیٰ

تاریخ الخلفاء میں علامہ سیوطی نے خلیفہ معتمد علی اللہ کے بارے میں لکھا ہے

المعتمد علی اللہ، لقب ابو العباس و ابو جعفر کنیت اور احمد بن متوکل بن معتصم بن ہارون رشید بن مہدی بن منصور نام تھا۔ یہ ۲۲۹ھ میں پیدا ہوا۔ اس کی والدہ کا نام فتیان تھا۔ یہ روم کی رہنے والی تھی۔ مہتدی کے قتل کے ہنگامے میں معتمد جوسق کی جیل میں تھا۔ جہاں سے اسے لوگوں نے چھڑا کر اس کے ہاتھ پر بیعت کی چنانچہ ۲۵۶ھ میں معتمد نے خلیفہ ہونے کے بعد اپنے بھائی موفق طلحہ کو مشرقی اور اپنے فرزند ولیعہد جعفر کو مغربی ممالک کا گورنر مقرر کیا۔ اور اپنے فرزند جعفر کو مفوض الی اللہ کا لقب دے کر مصر کا علاقہ بھی اسی کے تحت کر دیا۔ اور خود ملکی و قومی کاموں سے بے پرواہ ہو کر عیش و عشرت میں مشغول ہو گیا جس کے باعث رعایا اسے بدظن ہو کر اس کے

۱: ۲۵۶ھ تا ۲۷۹ھ (۸۶۹ء - ۸۹۲ء)

بھائی موفق طلحہ کی گرویدہ ہوگئی۔

عہدِ معتمد کے خاص واقعات معتمد کے زمانۂ خلافت میں سوڈانیوں نے مصر اور اس کے اطراف میں لوٹ، مار، قتل و غارت گری، آتش زدگی کی۔ گرفتاریوں کا بازار گرم کیا۔ اور سرکاری فوج سے مقابلہ کیا اس جنگ میں موفق طلحہ نے سالارِ اعلیٰ کے فرائض انجام دیے۔ اسی زمانے میں ایسی وبا پھیلی جو عراقی جنگ سے کسی طرح کم نہ تھی اور اس وبا سے بے انتہا لوگ لقمۂ اجل ہوئے۔ اس کے بعد سخت زلزلے آئے جس کی وجہ سے روم کے نشیبی علاقہ کے ہزاروں رہنے والے جاں بحق ہوئے۔

غرضکہ آغازِ خلافتِ معتمد ۲۶۵ھ سے ۲۷۰ھ تک سوڈانیوں سے جنگ ہوتی رہی اور سال ۲۷۰ھ میں سوڈانی سردار بہبود کو قتل کیا گیا۔ اس بہبود نے رسالت کا دعویٰ کیا تھا، اور خود کو غیب داں کہتا تھا۔

معتمد کی وفات رجب سنہ ۲۷۹ھ میں بغیر کسی بیماری کے معتمد کا دفعتہً انتقال ہوگیا بعض روایتوں میں ہے کہ اس کو زہر دیا گیا لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ ایک شب کو اس نے نبیذ زیادہ پی، اس کے بعد کھانا کھایا، اس سے سوءِ ہضم ہوگیا اور صبح ہونے سے قبل ہی مرگیا۔ چونکہ موت ناگہانی تھی اس لیے موفق نے قضاۃ اور اعیانِ سلطنت کو بلاکر لاش دکھائی۔ ان کے ملاحظے کے بعد سامرا لے جاکر دفن کیا گیا وفات کے وقت پچاس سال چھ مہینے کی عمر تھی۔ مدتِ خلافت ساڑھے تیئس سال۔

معتمد کی خلافت کا زمانہ گو مدت کے اعتبار سے بہت طویل ہے لیکن وہ محض نام کا خلیفہ تھا صرف خطبہ اور سکہ اس کے نام کا تھا، باقی جملہ امورِ سلطنت، احکام کا اجراء، فوجوں کی قیادت، صلح و جنگ، سرحدوں کی حفاظت، وزارت کی ترتیب، جملہ امور اس کے بھائی موفق کے ہاتھوں میں تھے۔ معتمد اس بے بسی کا غم غلط کرنے کے لیے عیش پرستی میں مشغول رہتا تھا۔

معتمد اور موفق کے کردار و سیرت کا فرق معتمد کو نبیذ اور شعر و موسیقی سے کام تھا۔ اس کی بزمِ عیش میں ہر وقت ادب و شعر، رقص و سرود اور اسی قبیل کے مشاغل کا چرچا رہتا تھا۔

موفق پر یہ بڑا الزام ہے کہ اس نے معتمد کو بالکل بے بس کر دیا تھا۔ لیکن اس سے عباسی حکومت کو بڑا فائدہ پہنچا۔ معتمد میں کوئی عملی صلاحیت نہ تھی۔ اس کے مقابلے میں موفق جملہ اوصافِ جہانبانی کا حامل تھا۔ فضل و کمال، تدبیر و سیاست، اخلاق، عدل و انصاف وغیرہ تمام محاسن موجود تھے۔ رعایا کی دادرسی کے لیے قضاۃ کے ساتھ بیٹھتا اور مقدمات کی سماعت کرتا تھا۔ اور منصفانہ فیصلے دیتا تھا۔

شجاع و بہادر تھا، خود فوجوں کی قیادت کرتا تھا۔ صاحب الزنج کے انقلاب انگیز شورش میں اس نے بڑے کارہائے نمایاں کیے۔ اور اپنے زمانے میں اس نے ترکوں کو ان کی حد سے آگے نہ بڑھنے دیا۔

زنگیوں کی بغاوت اور اس کا انجام الفخری نے لکھا ہے: عہدِ معتمد میں ایک شخص ظاہر ہوا جس کا نام علی تھا۔ اس کا نسب نامہ یوں بیان کیا جاتا ہے: علی بن محمد بن احمد بن عیسیٰ بن زید بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب علیہم السلام۔ لیکن انساب دانوں کے نزدیک یہ نسب نامہ درست نہیں بلکہ وہ منہ بولا فرزند تھا۔ تاہم وہ بڑا عالم، فصیح و بلیغ اور دانا تھا۔ بصرہ اور نواحی بصرہ کے زنگی غلاموں کے دل اس نے موہ لیے تھے۔ یہ لوگ بڑی تعداد میں اس کے گرد جمع ہو گئے بلکہ ان کے علاوہ بھی بہت سے لوگ آملے۔ جن سے اس کی پوزیشن اونچی ہو گئی۔ اور خاصا اقتدار حاصل ہو گیا۔ ابتدا میں یہ بے سر و سامان تھا۔ تین تلواروں کے سوا اس کے پاس کچھ نہ تھا بلکہ اسے کسی نے ایک گھوڑا ہدیہ کیا تو اس کے ساتھ نہ زین تھی نہ لگام، اس لیے رسی باندھ کر اس نے سواری کی، چند جنگیں ایسی پیش آئیں جن میں اسے فتح ہوئی اور وہ مالدار بھی ہو گیا۔ اس کی پوزیشن بڑھی اور ساتھ ساتھ لوٹ مار میں اضافہ ہو گیا۔ اس کا سوڈانی لشکر عراق، بحرین اور ہجر کے

علاقوں میں پھیل گیا۔ موفق ایک بھاری لشکر لے کر اس کے مقابلے کے لیے نکلا۔ بصرہ اور واسط کے درمیان دونوں کی مڈبھیڑ ہوئی۔ اور کئی سال جنگ جاری رہی انھوں نے وہیں اپنے اپنے شہر آباد کر لیے اور ہر ایک فریق دوسرے فریق کے مقابلے میں اپنی حفاظت کرتا رہا۔

آخر کار عباسی فوج کو فتح حاصل ہوئی تو انھوں نے اپنے دشمنوں کو قتل اور قید کر کے نیست ونابود کر دیا۔ قائدِ زنجیاں (علی بن محمد) بھی مارا گیا اور اس نے "مختارہ" نامی جو شہر بسایا تھا وہ لوٹ لیا گیا۔ اس کا سر بغداد بھیج دیا گیا۔ اس دن بڑا ہجوم تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ان تمام جنگوں میں مقتولین کی تعداد ۲۵ لاکھ تھی۔

معتمد نے ۲۷۹ھ میں وفات پائی۔

معتمد کی طرف سے ولیعہدی کی نامزدگی

موفق جب فارس واصفہان وغیرہ سے واپس آیا تو دردِ نقرس میں مبتلا ہو گیا۔ ہر چند علاج کیا آرام نہ ہوا۔ ۲۲۔ رجب ۲۷۸ھ کو فوت ہو کر رصافہ میں مدفون ہوا۔ اگرچہ خلیفہ معتمد موجود تھا مگر اس کی حیثیت ایک قیدی سے زیادہ نہ تھی۔ اصل خلیفہ موفق ہی تھا۔ اب موفق کی وفات کے بعد اراکینِ سلطنت اور سپہ سالارانِ لشکر نے متفق ہو کر موفق کے بیٹے ابو العباس معتضد کو موفق کی جگہ ولیعہد بنایا اور خلیفہ معتمد نے معتضد کی ولی عہدی کا اعلان کر کے معتضد کو موفق کا قائم مقام بنایا۔ معتضد چونکہ خوب تجربہ کار اور بہادر شخص تھا لہٰذا وہ تمام امورِ سلطنت پر حاوی ہو گیا اور خلیفہ معتمد پھر اپنی اسی حالت میں مجبور و معطل رہا۔

معتضد باللہ[1]

نڈر، اولوالعزم، مدبر اور دوراندیش فرمانروا

حلیہ، سراپا، صفات علامہ جلال الدین سیوطی نے معتضد باللہ کے حالات و کوائف بیان کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

معتضد باللہ لقب، ابوالعباس کنیت اور احمد بن موفق، طلحہ بن متوکل بن معتصم بن ہارون رشید نام تھا۔ یہ ماہ ذی قعدہ ۲۴۲ھ میں پیدا ہوا۔ لیکن صولی نے اس کی تاریخ پیدائش ماہ ربیع الاول ۲۴۳ھ لکھی ہے۔ اس کی والدہ کا نام صواب تھا جو موفق طلحہ کی داشتہ تھی۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کی والدہ کا نام حرز تھا اور بعض نے اس کی والدہ کا نام ضرار لکھا ہے۔

معتضد اپنے چچا معتمد کے انتقال کے بعد ماہ رجب ۲۷۹ھ میں تخت نشین خلافت ہوا۔

خاندان بنو عباس میں معتضد سب سے زیادہ خوبصورت، بہادر، پُرہیبت، صاحب

۱: ۲۷۹ تا ۲۸۹ھ (۸۹۲ - ۹۰۲)

جبروت، نہایت عقل مند اور سخت گیر تھا۔ اس کی شجاعت کی حالت یہ تھی کہ شیر کا تنہا مقابلہ کرتا تھا۔ جب کسی حاکم پر غصہ آتا تو اس پر مہربانیوں کا نام نہ لیتا۔ مجرموں کو گہرے غار میں ڈلوا دیتا۔ حقیقت یہ ہے کہ بڑا سیاست داں تھا۔

رعایا کے ساتھ حسنِ سلوک معتضد دُور بیں، دُور رس اور بہادر تھا۔ اس نے بہت سی جنگوں میں فتح پائی، اس کی برتری مشہور تھی۔ امورِ شاہی کو بہ حُسن و خوبی انجام دیتا۔ لوگ اس کے رعب وداب کی وجہ سے بے انتہا خوف زدہ ہوتے، اس کے عہدِ حکومت میں فتنہ و فساد کی روک تھام ہوگئی اس کی بادشاہت کے زمانے میں امن و امان تھا جو ٹیکس جبریہ طور پر احکامِ شریعت کے خلاف وصول کیا جاتا تھا، معتضد نے معاف کر دیا۔ عدل و انصاف سے کام لیتا۔ رعایا پر کسی کو ظلم نہ کرنے دیتا۔ چونکہ عباسی حکومت کو اس نے از سرِ نو مضبوط کیا تھا اس لیے سفاح دوم کے نام سے مشہور ہو گیا۔ حالانکہ متوکل کے زمانہ ہی سے ملک میں کمزوری، خرابی، زوال اور بے چینی کا آغاز ہو چکا تھا۔ معتضد کے حُسن عمل، خوش اسلوبی اور تجدد کی ابن رومی نے بھی مدح سرائی کی ہے۔ اور ابن معتز نے یوں زمزمہ ریزی کی ہے کہ معتضد نے بنو ہاشم کی مملکت کو غالب اور باعزت کر دیا۔

فلسفہ و منطق اور نجوم و کہانت سے بیر معتضد نے اپنی خلافت کے پہلے سال کتب فروشوں کو فلسفہ و منطق و علم کلام کی کتابوں کی فروخت کی ممانعت کی۔ قصہ کہانی کہنے والوں اور نجومیوں کو سڑک کے کنارے کھڑا ہونے سے باز رکھا۔ بقر عید کی نماز خود پڑھائی۔ جس کی پہلی رکعت میں چھ اور دوسری میں ایک تکبیر کہی۔ اور کوئی خطبہ نہیں دیا۔

مکے کے دار الندوہ کا انہدام ۲۸۱ھ میں علاقہ روم کا شہر مکوریہ مسلمانوں کے قبضے میں آگیا۔ اسی سال رے اور طبرستان کے درمیانی علاقے میں پانی سوکھ گیا۔ اور پانی کی اتنی قلت ہوئی کہ تین رطل پانی کی قیمت ایک روپیہ ہوگئی۔ اور پھر اتنا سخت قحط پڑا کہ لوگ مردار کھانے لگے۔ اور اسی سال معتضد نے

مکہ کے دارالندوہ کو منہدم کرا کے وہاں مسجد بنوائی جو مسجد حرام کے پاس ہے۔

عید نوروز کی ممانعت ۲۸۲ھ میں معتضد نے عید نوروز کے دن آگ روشن کر کے لوگوں پر پانی چھڑکنے کی ممانعت کی۔ اور احکام جاری کیے کہ یہ طریقہ مجوسیوں کا ہے۔

بغضِ معاویہ اور حُبِّ علی ابن جریر نے لکھا ہے ۲۸۴ھ میں معتضد نے برسر منبر امیر معاویہ پر لعنت کی جس سے وزیر خاص عبداللہ نے اس لیے منع کیا کہ رعایا میں اضطراب پیدا ہو جائے گا۔ لیکن معتضد نے ایک نہ سُنی بلکہ مزید احکام جاری کیے جس میں حضرت علی کے بے انتہا مناقب اور امیر معاویہ کے عیوب تحریر ہوتے تھے اس پر کہا گیا کہ جب عوام آپ کے یہ احکام سنیں گے تو سخت فتنہ و فساد رونما ہو جائے گا جس کا جواب معتضد نے یہ دیا۔ فتنوں کو اسی تلوار سے دبا دوں گا۔ جس پر عرض کیا گیا علوی تمام ممالک میں موجود ہیں۔ لوگ اہلبیت کے فضائل سن کر ان کا ساتھ دیں گے اور وہ آپ پر خروج کریں گے تو اس وقت کیا کیجیے گا۔ اس پر معتضد نے ایسے احکام اجرا کرنا بند کر دیے۔

۲۸۵ھ میں بمقام بصرہ پیلی آندھی آئی پھر وہ ہری ہو گئی اور پھر کالی آندھی کی شکل میں بدل کر تمام شہروں میں پھیل گئی۔ اس کے بعد آسمان سے برف کا ایک چھپایہ گرا جس کا وزن ڈیڑھ سو درہم تھا۔ اس آندھی سے تقریباً پانچ سو کھجور کے درخت جڑ سے اکھڑ گئے۔ اور مشک کے برابر کالے اور سفید پتھر آسمان سے گرے۔

ابو سعید قرمطی کا ظہور ۲۸۶ھ میں ابو سعید قرمطی بمقام بحرین ظاہر ہوا۔ اور شان و شوکت حاصل کی۔ یہ وہی ابو طاہر سلیمان ہے جس نے حجر اسود کو اکھاڑ پھینکنے کا ارادہ کیا تھا۔ چنانچہ اس نے خلیفہ کی فوج سے جنگ کی۔ اور خلیفہ کی فوج کو کئی مرتبہ شکست دینے کے بعد بصرہ اور اس کے قریب میں غارت گری کے بعد بصرہ پر قابض و متصرف ہو گیا۔

خمارویہ کی لڑکی سے معتضد کی شادی

مصر کے طولونی خاندان اور خلافتِ بغداد کے اختلاف کا خاتمہ معتمد ہی کے زمانے میں ہو چکا تھا معتمد کے زمانے میں دونوں کے روابط میں اور زیادہ ترقی ہوئی۔ خمارویہ بن طولون نے معتمد کی تختِ نشینی کی سبزیک میں بیش قیمت ہدایا پیش کیے تھے معتضد نے اس کے صلے میں مصر کے خراج کی باقی ماندہ رقم میں سے کل دو لاکھ دینار سالانہ کے حساب سے لے کر مزید تین لاکھ سالانہ پر فرات سے برقہ تک کی حکومت کا سی سالہ قبالہ خمارویہ اور اس کے لڑکے کے نام لکھ دیا۔ اور سنہ ۲۸۰ھ میں بارہ پارچے کا خلعت، تلوار، تاج اور مالائے مروارید عطا کیا۔ سنہ ۲۸۲ھ میں خمارویہ کی لڑکی "قطرۃ الندی" (قطرۂ شبنم) سے شادی کر کے طولونی خاندان کی عزت افزائی کی۔

معتضد باللہ کا شاندار دورِ حکومت

معتضد بڑے جاہ وجلال کا خلیفہ تھا۔ مدتوں کے بعد اس دل ودماغ اور حوصلہ کا خلیفہ عباسی تخت پر بیٹھا تھا۔ تدبیر وسیاست کے ساتھ وہ اخلاق سے بھی آراستہ تھا۔ اپنی ہشت سالہ مدتِ حکومت میں اس نے عباسی حکومت کے مردہ قالب میں جان ڈال دی اور ہر حیثیت سے اس کے عہدِ عروج کی یاد تازہ کر دی مسعودی کا بیان ہے کہ معتضد کے تختِ خلافت پر قدم رکھتے ہی فتنہ وفساد میں سکون پیدا ہو گیا، ملک کی حالت درست ہو گئی، لڑائیوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ چیزوں کا نرخ ارزاں ہو گیا شورش وہیجان میں سکون ہو گیا۔ مخالفین نے صلح کر لی، وہ مظفر ومنصور تھا۔ تمام امور اس کے قابو میں آ گئے، مشرقی ومغربی علاقے اس کے زیرِ راں ہو گئے۔ مخالفین مغلوب ہو گئے۔ اور ہارون شاری پر اس نے فتح پائی۔

طقطقی نے الفخری میں لکھا ہے: اس کی سیاست مستحکم تھی، فسادیوں کے لیے بڑا سخت تھا۔ فوجی ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھانے کے لیے جو لوگ رعایا کو ستاتے تھے اُن کا خاتمہ کر دیا۔

علویوں سے حُسنِ سلوک۔ عمرو بن لیث صفاری

طالبی عم زادوں کے ساتھ عمدہ سلوک کرتا تھا۔ اس عہد میں فرقی اختلافات

بہت ہوئے اور خوارج بھی بہت اٹھے۔ عمرو بن لیث صفار بھی انہی میں تھا اس کا اقتدار وسیع ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ عجم کے اکثر ممالک اس کے زیر نگیں ہو گئے۔ یہ خود کہتا تھا کہ اگر میں یہ چاہوں کہ نہر بلخ پر سونے کا پل بنوا دوں تو بنوا کر رہوں گا۔

اس کے باورچی خانے کا ساز و سامان چھ سو اونٹوں پر لادا جاتا تھا مگر انجام یہ ہوا کہ گرفتار کیا گیا اور قید خانے میں رہا، رسوا ہوا۔ اس کے بعد معتضد اپنے ملک کے اختلافات کو دور کرنے اور رعایا میں عدل قائم کرنے کی طرف لگا رہا۔ یہاں تک کہ ۲۸۹ھ میں فوت ہوا اُس وقت خزانے میں ایک کروڑ دینار سے زیادہ رقم موجود تھی۔

خلیفہ معتضد باللہ کا مرض الموت اور وفات

۲۸۹ھ میں خلیفہ معتضد بیمار پڑا اور یہ بیماری مرض الموت ثابت ہوئی۔

اطبا بیماری کا سبب کثرت مباشرت قرار دیتے ہیں، انتہائی تنگ و دو اور دوا دوش کے بعد مرض دب گیا۔ اور وہ بظاہر تندرست ہو گیا۔ لیکن جلد ہی دوسرے امراض اس پر غالب آ گئے۔ سیوطی کا بیان ہے کہ جب معتضد پر نزع کا عالم طاری ہوا تو طبیب حاضر ہوا اور نبض دیکھنے لگا تو معتضد نے ایک لات اس کے سینے پر ماری، ادھر طبیب چوٹ کھا کر گرا اُدھر معتضد کی جان نکل گئی۔

خلیفہ مکتفی باللہ

عالم و فاضل، دانا و بینا، رحمدل اور نیک و نرم خو

حالات و کوائف

مکتفی باللہ بن معتضد باللہ بن موفق باللہ بن متوکل علی اللہ بن معتصم باللہ بن ہارون الرشید کا اصل نام علی اور کنیت ابو محمدؐ تھی۔ ایک ترکیہ ام ولد حیجک نامی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ علی نام کے صرف دو ہی خلیفہ ہوئے ایک حضرت علی کرم اللہ وجہٗ اور دوسرا مکتفی باللہ۔ معتضد باللہ نے اس کو اپنا ولی عہد بنایا تھا۔ جب معتضد کا انتقال ہوا تو مکتفی رقہ میں تھا۔ اور بدر غلام فارس میں۔ وزیر اعظم قاسم بن عبید اللہ نے مکتفی کے نام پر لوگوں سے بیعت لی اور مکتفی کے پاس رقہ میں خبر بھیجی۔ مکتفی ۷۔ جمادی الاوّل کو بغداد میں داخل ہوا اور قاسم وزیر کو سات خلعت عطا کیے۔ مکتفی عادل، خوش خلق اور خوبصورت شخص تھا۔

قرامطہ کی شورشیں اور شرارتیں

اوپر ذکر آچکا ہے صوبہ بحرین پر قرامطہ نے تسلط کرلیا تھا اس کے بعد وہ کوفہ میں نمودار ہوئے۔ مگر

وہاں شکست کھائی تو دمشق میں پہنچ کر طغج نامی عامل دمشق کو بار بار شکستیں دے کر اس کا محاصرہ کر لیا۔ مکتفی باللہ نے دمشق میں قرامطہ کی یہ چیرہ دستی دیکھ کر خود بغداد سے کوچ کیا۔ اور ۲۹۰ھ میں رقہ پہنچ کر قیام کیا، اور محمد بن سلیمان کو ایک زبردست لشکر دے کر دمشق کی جانب قرامطہ کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ محمد بن سلیمان نے بڑی ہوشیاری اور بہادری کے ساتھ قرامطہ کا مقابلہ کیا۔ قرامطہ کا سردار ابوالقاسم یحییٰ المعروف بہ ذکرویہ ۶ محرم ۲۹۱ھ کو گرفتار ہوا بہت سے قرامطہ مقتول، بہت سے مقید اور بہت سے مفرور ہوئے۔ ذکرویہ گرفتار ہو کر رقہ میں مکتفی کے سامنے پیش ہوا۔ اس نے اس کو قتل کر دیا۔ ذکرویہ کے بعد اس کے بھائی حسین نے قرامطہ کو فراہم کر کے بد امنی پیدا کی وہ بھی مقتول ہوا۔ اس حسین قرمطی نے اپنا خطاب امیر المومنین مہدی رکھا تھا۔ اس کے چچیرے بھائی عیسیٰ نے اپنا لقب مدثر رکھا۔ اور یہ ظاہر کیا کہ سورۂ مدثر میں میرا ہی نام آیا ہے۔ اس نے اپنے غلام کا نام مطوق بالنور رکھا تھا۔ غرض ۲۹۱ھ میں سب کے سب یکے بعد دیگرے مقتول ہوئے اور ملک شام میں یہ فتنہ فرو ہوا مگر یہاں سے قرامطہ نے یمن میں جا کر فتنہ برپا کر دیا۔

خاندانِ بنو طولون کا خاتمہ جب قرامطہ کی جنگ سے فراغت ہو گئی تو مکتفی رقہ سے بغداد آیا۔ اور محمد سلیمان بھی دمشق سے بغداد کی طرف روانہ ہوا۔ شام کا اکثر حصہ ہارون بن خمارویہ بن احمد بن طولون کی حکومت میں شامل تھا۔

بغداد کی طرف آتے ہوئے راستے میں محمد بن سلیمان کو بدر حمامی کا جو ہارون بن خمارویہ کا غلام تھا، ایک خط ملا، بدر حمامی نے لکھا تھا کہ آج کل بنی طولون کی سلطنت کا شیرازہ کمزور اور قوائے حکمرانی مضمحل ہو گئے ہیں۔ اگر اس وقت آپ مع فوج اس طرف چلے آئیں اور مصر پر حملہ آور ہوں تو میں بھی اپنے ہمراہیوں کے ساتھ آپ کی امداد کو تیار ہوں۔

محمد بن سلیمان یہ خط لیے ہوئے بغداد آیا اور خلیفہ مکتفی کی خدمت میں پیش کیا۔ خلیفہ مکتفی نے محمد بن سلیمان کو ایک زبردست فوج دے کر فوراً مصر کی جانب روانہ کر دیا۔ محمد بن سلیمان نے مصر پہنچ کر لڑائیوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ بدر حمامی محمد بن سلیمان کے

پاس چلا آیا۔ ہارون بن خمارویہ مارا گیا۔ مصر پر محمد بن سلیمان کا قبضہ ہوگیا، خاندان طولون کے تمام افراد گرفتار کر کے بغداد بھیج دیے گئے۔ یہ واقعہ ماہ صفر ۲۹۲ھ کا ہے۔

موصل میں بنو حمدان کی حکومت کا قیام

موصل کے کرد اور خارجی بڑے شورش پسند تھے۔ آئے دن یہاں بد امنی بپا رہتی تھی۔ یہاں آل حمدان تغلبی کا عرب خانوادہ بڑا با اثر تھا۔ اس لیے مکتفی نے موصل میں قیام امن کے لیے ۲۹۳ھ میں ابوالہیجا عبداللہ بن حمدان تغلبی کو پورے علاقہ موصل کا حاکم بنا دیا۔ اس وقت سے یہاں حمدانی حکومت کی بنیاد پڑی۔

اس کے تقرر کے بعد ہی کردوں نے نینوی میں پھر تاخت و تاراج شروع کر دی۔ ابن حمدان نے خازر میں ان کا مقابلہ کیا۔ اس مقابلے میں ایک حمدانی سردار مارا گیا۔ ابن حمدان کی قوت کمزور تھی اس لیے وہ لوٹ گیا۔ اور دربار خلافت سے امدادی فوجیں منگا کر سنہ ۲۹۴ھ میں دوبارہ مقابلے کے لیے نکلا، کردوں کے کئی ہزار خانوادے جمع تھے، ابن حمدان کو دیکھ کر وہ جبل سلق کی ایک گھاٹی میں چلے گئے۔ ابن حمدان ان کے تعاقب میں جبل سلق کی طرف بڑھا۔ ایک کرد سردار محمد بن بلال نے کہلا بھیجا کہ میں نے اطاعت قبول کر لی ہے، اور عنقریب یرغمال میں اپنے لڑکوں کو حاضر کر دوں گا۔ یہ پیام کہلا کر ایک جرگہ آذربائیجان روانہ کر دیا۔ ابن حمدان کو شبہ ہوا۔ اس نے تعاقب کر کے چند آدمیوں کو قتل کیا۔ باقی پورا جرگہ قلہ کوہ پر چڑھ گیا اور ابن حمدان کو واپس آنا پڑا۔

عہدِ مکتفی باللہ کے فتوحات

مکتفی کے زمانے میں ان اندرونی شورشوں کے استیصال کے ساتھ ساتھ بیرونی مہمات کا سلسلہ بھی قائم رہا۔ ۲۹۲ھ میں مکتفی کے غلام زرافہ نے اناطولیہ کے شہر انطاکیہ پر حملہ کیا۔ اور رومیوں سے بڑا سخت بحری معرکہ ہوا۔ لیکن ان کو شکست فاش ہوئی۔ اور رومی بیڑا جو ساٹھ جہازوں پر مشتمل تھا مسلمانوں کے قبضے میں آگیا۔ انطاکیہ پر بھی قبضہ ہوگیا۔ اس مہم میں اتنا مالِ غنیمت ہاتھ آیا کہ ایک ایک مسلمان سپاہی کو ایک ایک ہزار دینار حصہ ملا!

سنہ ۲۹۳ھ میں ابن کیغلغ نے ایشیائے کوچک پر فوج کشی کر کے چار ہزار رومی گرفتار کیے۔

ایک پادری نے اسلام قبول کیا۔ اسی سال ابن کیغلغ نے شکند فتح کیا، مدلیس تک بڑھتا چلا گیا اور پچاس ہزار رومی گرفتار اور بہت سے قتل کیے۔ رومی سرحد کا محافظ اندورس مسلمانوں سے مل گیا اور دو سو مسلمان قیدیوں کو لے کر اسلامی علاقے میں نکل جانا چاہا۔ ایک رومی دستے نے جو اس کی گرفتاری کے لیے آیا تھا راستے میں روکا لیکن مسلمان قیدیوں نے ان سب کو قتل کر دیا۔ یہ دیکھ کر آس پاس کے رومی مقابلے کے لیے جمع ہو گئے، مسلمانوں کو اس کی خبر ہوئی تو وہ بھی مدد کے لیے پہنچ گئے۔ لیکن رومی لوٹ گئے اور مسلمان اندورس کو اپنی حفاظت میں لے آئے۔

مکتفی باللہ کا انتقال
عہدِ مکتفی پر ایک نظر

ذیقعدہ سنہ ۲۹۵ھ میں مکتفی کا انتقال ہوا۔ امیر محمد بن طاہر کے محل میں اپنے باپ کے پہلو میں دفن کیا گیا، وفات کے وقت کل ۳۲ سال کی عمر تھی۔ مدتِ خلافت چھ سال چھ مہینے۔ مرض الموت میں اپنے چھوٹے بھائی جعفر الملقب بہ مقتدر باللہ کو ولیعہد نامزد کیا۔

مکتفی طبعاً نہایت نرم اور متحمل مزاج تھا۔ سختی و درشتی مطلق نہ تھی، عفو و درگزر کا مادہ اتنا غالب تھا کہ مجرموں سے بھی چشم پوشی کر جاتا تھا۔ اس نے معتضدی دور کی سخت گیری کے تمام آثاروں کو مٹا دیا تھا۔ معتضد نے مجرموں اور معتوب لوگوں کو سزا دینے کے لیے جس قدر قیدخانے بنوائے تھے مکتفی نے انھیں تڑوا کر مسجدیں بنوا دیں اور معتضدی دور کے تمام قیدیوں کو رہا کر دیا۔ معتضد نے اپنے محل ثریا کی تعمیر کے سلسلے میں جن لوگوں کے باغات اور دکانوں کو لے لیا تھا مکتفی نے انھیں واپس کر دیا اور اس کی تلافی کے لیے نقد روپیہ علیحدہ دیا۔ اس نرمی اور لطف و کرم کی وجہ سے رعایا میں بہت زیادہ محبوب تھا اور ہر زبان سے اس کے لیے دعا نکلتی تھی۔

مکتفی باللہ کی تعمیری سرگرمیاں

الفخری نے لکھا ہے: اس کا شمار فاضل ترین خلفاء میں ہے۔ رحبہ (واقع بغداد) کی جامع مسجد اسی نے بنوائی تھی۔

مقتدر باللہؒ

نا اہل ۔ بد نصیب ۔ مقتولِ جفا!

تختِ خلافت پر جلوس

الفخری نے خلیفہ مقتدر باللہ کے بارے میں لکھا ہے:
اس کی عمر صرف تیرہ سال تھی ۔ یہ بڑا سخی ، داتا اور فیاض تھا۔ پہلے کی بعض خلافتوں کی طرف سے فیاضی، معاشی فراوانی، خلعتوں اور انعاموں کی کثرت کا جو رواج تھا وہ سب کا سب اس نے از سر نو زندہ کر دیا۔ اس کے دربار میں گیارہ ہزار رومی اور سوڈانی خادم تھے۔ جو سب کے سب خصی تھے۔ صرف جواہر کے خزانے میں اعلیٰ درجے کے جواہر موجود تھے۔ جن میں وہ یاقوتی نگینہ بھی تھا جو ہارون الرشید نے تین لاکھ دینار میں خریدا تھا اور وہ یکتائے روزگار موتی بھی تھا جس کا وزن تین مثقال تھا۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے نفیس جواہر تھے۔ مقتدر نے ان سب کو تقسیم کر دیا۔ اور تھوڑے عرصے میں سب کچھ ختم کر دیا۔ حلاج اسی کے عہد میں قتل ہوا۔

عہدِ مقتدر میں منصور حلاج کا قتل

حلاج کا نام حسین بن منصور اور اس کی کنیت ابو المغیث تھی۔ یہ ایران کے مجوسی خاندان سے

لہ: ۲۹۵ تا ۳۲۰ھ (۹۰۸ - ۹۳۲ء)

سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا نشوونما "واسط" میں یا بقول بعض "تستر" میں ہوا۔ یہ صوفیوں میں بہت گھلا ملا رہتا تھا۔ پھر سہیل تستری کا شاگرد ہو گیا۔ اس کے بعد وہ بغداد آیا اور ابوالقاسم جنیدی سے ملا۔ حلاج پریشان خیال انسان تھا۔ کبھی ادنیٰ کھردرا کپڑا پہنتا اور کبھی رنگا ہوا لباس، کبھی بڑا سا عمامہ اور چوغہ پہنتا اور کبھی فوجی لباس زیب تن کرتا۔ پہلے تمام شہروں میں گھومتا رہا۔ آخر میں پھر بغداد آیا اور وہیں ایک گھر بنا لیا۔ لوگوں کے خیالات اور عقائد اس کے بارے میں مختلف ہیں کیونکہ اس سے افکارِ پریشاں کا ظہور ہوتا رہا۔ اور وہ ایک مذہب سے دوسرے مذہب میں منتقل ہوتا رہا۔ عوام کو وہ کراماتی شعبدے دکھا دکھا کر پھانستا رہا۔

جب یہ فتنہ بڑھنے لگا تو مقتدر نے حامد ابن عباس اپنے وزیر سے کہا کہ اسے (حلاج) کو مناظرے کے لیے بلوایا جائے۔ وزیر نے اسے بلوایا اور قضاۃ و ائمہ کی موجودگی میں مناظرہ ہوا۔ منصور حلاج نے بعض ایسے خیالات کا اعتراف کیا جن سے وہ مستحقِ قتل ٹھہرتا تھا، پھر اسے ایک ہزار کوڑے لگائے گئے تاکہ مر جائے مگر وہ مرا نہیں لہٰذا اس کے ہاتھ پاؤں اور سر کاٹ کر الگ کر لیے گیے اور اس کا دھڑ جلا دیا گیا۔ اس نے قتل ہوتے وقت اپنے ساتھیوں سے کہا کہ تمھیں کوئی دہشت نہیں ہونی چاہیے۔ کیونکہ میں ایک ماہ کے بعد پھر تمھارے پاس لوٹ آؤں گا۔ یہ ۳۰۹ھ کا واقعہ ہے۔

خانہ جنگی دربارِ عباسیہ کے ایک وزیر یا تدبیر ابن حمدان نے مقتدر کو معزول کر کے ابن معتز کو خلیفہ بنا دیا۔ مقتدر کے خواص مقتدر کی معزولی اور بحالی کے علاوہ باقی تمام امرا اور ارکانِ سلطنت نے اس کی بیعت کر لی۔ اور مرتضیٰ باللہ لقب دیا۔ اس نے محمد بن داؤد کو وزارت اور دوسرے امرا کو مختلف عہدوں پر ممتاز کیا۔

عبداللہ بن معتز کو خلیفہ بنانے کے بعد حسین بن حمدان نے مقتدر کو قصرِ خلافت خالی کرنے کا حکم دیا۔ اس نے ایک دن کی مہلت مانگی لیکن اتنی جلد خالی نہ کر سکا، دوسرے

دن احمد بن حمدان پھر قصرِ خلافت پہنچا۔ یہاں مقتدر کا پورا عملہ اور محافظ موجود تھے ان سے جنگ ہو گئی، لیکن پھر ابن حمدان کسی نامعلوم سبب سے بغداد چھوڑ کر موصل چلا گیا، سب سے زیادہ با اقتدار امیر یہی تھا۔ اس لیے اس کے الگ ہو جانے سے مقتدر کے حامیوں کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اور انھوں نے عبداللہ بن معتز کی فرودگاہ پر حملہ کر دیا۔ اب عبداللہ کے حامیوں کی قوت کمزور پڑ چکی تھی اس لیے وہ بھی اس کا ساتھ چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ اور ابنِ معتز کو عبداللہ بن جصاص کے گھر میں پناہ لینی پڑی۔ ابن جصاص کے ایک خادم نے جس کے آقا کے یہاں ابن معتز روپوش تھا جاسوسی کر کے اس کو گرفتار کرا دیا۔ اور وہ قتل کر دیا گیا۔

عہدِ مقتدر باللہ کے انقلابات و حوادث

مقتدر باللہ کا عہد انقلابات و حوادث سے معمور ہے۔ اس عہد میں حکومتیں بنیں اور بگڑیں اور خود بنو عباس کی حکومت بھی جس کا وہ سربراہ تھا نذرِ حوادث ہوتی رہی۔

- ۲۹۸ھ میں اسماعیل سامانی نے فوج کشی کر کے حکومتِ صفاریہ کا خاتمہ کر دیا۔
- ۳۱۱ھ سے لے کر ۳۱۷ھ تک بصرہ، شام، حجاز مقدس اور عراق وغیرہ میں قرامطہ کی شورشوں اور قتل و غارت کا سلسلہ جاری رہا۔
- اسی سنہ میں ابوطاہر قرمطی نے حجرِ اسود اٹھا لیا اور مقام ہجر میں اسے بھیج دیا۔
- خلفائے بنو فاطمہ نے قرامطہ کی اس روش کے خلاف سخت برہمی اور بیزاری کا اظہار کیا۔
- ۲۹۷ھ میں فاطمی حکومت کا رقادہ (افریقیہ) میں آغاز ہوا۔
- ۳۱۹ھ میں جرجان میں ایک نئی حکومت "زیاری" قائم ہو گئی جس کا خاتمہ مسعود غزنوی کے ہاتھوں ۴۳۰ھ میں ہوا۔

رومیوں سے مسلمانوں کی معرکہ آرائیاں

مقتدر کے زمانے میں اندرونی انقلابات کے ساتھ ساتھ بیرونی مہمات اور رومیوں سے معرکہ آرائی کا بھی وسیع سلسلہ جاری رہا۔ ۲۹۶ھ میں مونس مظفر نے اناطولیہ پر فوج کشی کر کے رومیوں کی ایک جماعت گرفتار کی، ۲۹۹ھ میں حاکم سرحد رستم نے ارمنی علاقے پر فوج کشی کی اور ملیح ارمنی کا ایک قلعہ فتح کر کے اس کو جلا دیا۔ ۳۰۳ھ میں رومیوں نے جزیرہ کی سرحد پر حملہ کر کے حصن منصور کو لوٹ لیا۔ اور طرطوس اور فراتی علاقے پر تاخت کی اور ملیح ارمنی نے نواح مرعش کو تاراج کیا۔ اس کے انتقام میں مونس نے بڑے اہتمام سے ملطیہ پر فوج کشی کر کے بہت سے قلعے فتح کیے۔ اور مال غنیمت کی بڑی مقدار حاصل کی۔ مقتدر نے اس کے صلے میں اس کو خلعت سے نوازا۔

ان لڑائیوں کے سلسلے میں طرفین کے بہت سے قیدی ایک دوسرے کے ہاتھ میں اسیر ہوئے تھے۔ ۳۰۵ھ میں قیصر روم نے ان کی رہائی اور صلح کے لیے اپنے سفیر بغداد بھیجے۔ مقتدر نے خاص دربار منعقد کر کے انھیں شرف باریابی بخشا، مصالحت تو نہ ہو سکی، لیکن قیدیوں کی رہائی کا مسئلہ طے ہو گیا۔ اور مقتدر نے مونس خادم کو ڈیڑھ لاکھ دینار فدیہ دے کر بڑے اہتمام سے مسلمان قیدیوں کی رہائی کے لیے بھیجا لیکن طرفین میں معرکہ آرائی کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ ۳۱۰ھ میں مونس نے کئی رومی قلعے فتح کیے۔ ۳۱۱ھ میں امیر البحر ثمالی نے بحری حملہ کیا۔ ۳۱۲ھ میں قیصر روم نے مقتدر کے پاس قیمتی ہدیے بھیج کر پھر صلح اور قیدیوں کی رہائی کی خواہش کی۔ اس مرتبہ اس نے منظور کر لیا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد رومیوں نے مسلمانوں کی گرمائی فوجوں پر حملہ کر کے صلح توڑ دی۔ اور ۳۱۴ھ میں دمستق اور ملیح کے ساتھ مل کر ملطیہ کا محاصرہ کر لیا۔ اہل شہر نے پوری قوت سے مدافعت کی اور ان کو شہر میں نہ داخل ہونے دیا۔

۳۱۵ھ میں طرطوس کے والی ثمالی اور رومیوں میں جنگ ہوئی، رومی شکست کھا کر عموریہ میں جمع ہوئے۔ ثمالی بھی ان کے تعاقب میں عموریہ پہنچے لیکن رومی منتشر

ہو گئے۔ اور شاہی انگورہ تک بڑھتا چلا گیا۔ اسی زمانہ میں ارمنوں اور رومیوں نے مل کر اسلامی ارمنستان پر فوج کشی کر کے خلاط اور اس کے آس پاس کے علاقوں کو تاخت و تاراج کیا، اس کے انتقام میں امیر مفلح والی آذربائیجان نے ارمنی علاقے کو لوٹا اور بہت سے ارمنی قتل کیے گئے۔ اور رومیوں نے سمیساط کا محاصرہ کر لیا لیکن سعید بن حمدان والی موصل مدد کے لیے پہنچ گیا اس لیے رومی لوٹ گئے، اس کے بعد سعید نے مقتدر کے حکم سے ملطیہ کو رومیوں کے قبضے سے چھڑایا۔

ترکوں کے ہاتھوں مقتدر کا بیدردانہ قتل

مونس ایک ترک سردار تھا جو امیر الامراء کے منصب پر فائز تھا لیکن اس سے اور مقتدر سے بنتی نہیں تھی، اس سے قبل مقتدر کی معزولی اور بحالی کا واقعہ ہو چکا تھا۔ لیکن مونس اسے ختم کر دینے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ چنانچہ اس نے ترک سپاہیوں کو جمع کیا اور بغداد پر چڑھائی کر دی۔ مقتدر بھی شوال ۳۲۰ھ میں بڑے اہتمام سے مونس کے مقابلے کے لیے نکلا۔ ردائے نبوی دوش پر تھی۔ جلو میں قرار وفقہاء کلام مجید کی تلاوت کرتے چلتے تھے۔ چاروں طرف فوجیں تھیں، پیچھے افسران فوج اور عمالِ حکومت کی قطار تھی۔ اس شان سے وہ رزم گاہ تک آیا۔

میدانِ جنگ کے قریب اسے ایک بلند مقام پر کھڑا کر دیا گیا۔ مونس کی فوجیں پہلے سے تیار تھیں۔ دونوں میں بڑی خوں ریز جنگ ہوئی۔ مونس کی فوجوں کو متاثر کرنے کے لیے عباسی امراء نے تھوڑی دیر کے لیے مقتدر کو میدانِ جنگ میں لے جانا چاہا لیکن اس پر اتنا خوف طاری تھا کہ اس کے لیے آمادہ نہ ہوتا تھا، بڑے اصرار کے بعد آمادہ بھی ہوا تو اس وقت جب کہ اس کا وقت گزر چکا تھا۔

محمد بن یعقوب نے بڑی شجاعت کے ساتھ مونس کا مقابلہ کیا اور اس کے بہت سے افسروں کو گرفتار کر لیا۔ لیکن تنہا اس کی شجاعت کام نہ آسکی اور مونس نے عباسی فوجوں کو پسپا کر دیا۔ اس وقت مقتدر میدانِ جنگ میں دکھائی دیا۔ لیکن اب اس کا آنا لاحاصل تھا، تاہم مونس کی فوج پر اس کا یہ اثر ہوا کہ اس کا ایک سردار علی بن بلیق مقتدر کو دیکھ کر

فوراً اس کے پاس پہنچا اور زمین بوس ہو کر عرض کی کہ آپ کہاں جاتے ہیں فوراً واپس جائیے جن لوگوں نے اس نازک وقت میں آپ کو نکلنے کا مشورہ دیا ہے ان پر خدا کی لعنت ہو مقتدر واپس جانا چاہتا تھا کہ مونس کی فوج کے آدمی پہنچ گئے اور تلواریں لیکر مقتدر پر ٹوٹ پڑے وہ ہر چند چلاتا رہا کہ میں خلیفہ ہوں لیکن ان وحشیوں نے کوئی شنوائی نہیں کی اور جواب دیا کہ ہاں ہم تم کو پہچانتے ہیں تمھاری ہی تلاش تھی، تم ابلیس کے خلیفہ ہو اور زخمی کر کے زمین پر پٹک کر قتل کر دیا۔ سر جدا کر کے لکڑی پر آویزاں کیا، بدن کے کپڑے اتار کر عریاں لاش چھوڑ گئے۔ کسی نے دفن کرنے کی بھی ہمت نہ کی۔ ایک راہ گیر نے گڑھا کھود کر لاش زمین میں دبا دی اور ایک نااہل خلیفہ کا یہ عبرت ناک انجام ہوا۔

مونس خود راشدیہ میں مقیم تھا، یہیں لے جا کر اس کے سامنے مقتدر کا سر پیش کیا گیا اس نے دیکھ کر ظاہر داری سے اپنا سر پیٹ لیا اور کہا مفسدو اس کا تم کو کس نے حکم دیا تھا۔ اگر تمھارا یہ عذر نہ ہوتا کہ تم نے لاعلمی میں قتل کیا ہے تو اس کے بدلے میں تم کو قتل کر دیتا۔ اسی وقت قصرِ خلافت پر پہرہ بٹھا دیا کہ کوئی شخص اس کو ہاتھ نہ لگانے پائے۔ قتل کے وقت مقتدر کی عمر ۳۸ سال تھی، مدتِ خلافت پچیس سال۔

عہدِ مقتدر باللہ پر تبصرہ مقتدر نے اگرچہ ۲۵ سال کی طویل مدت تک حکومت کی لیکن اس کا سارا زمانہ شورش و انقلاب میں گزرا۔ دو مرتبہ تخت سے اتارا گیا، دوسری مرتبہ جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔

وہ عقل و دانش اور تدبیر و سیاست سے عاری نہ تھا، لیکن عیش پرستی نے بالکل ناکارہ کر دیا تھا۔ اسے امورِ مملکت سے کوئی دلچسپی نہ تھی، ہر وقت عورتوں کی صحبت اور نبیذ نوشی میں غرق رہتا تھا۔ عورتیں اس پر حاوی ہو گئی تھیں۔ اس کی ماں اور اس کی قہرمانہ ام موسیٰ حکمرانی کرتی تھیں۔ ان کے سامنے وزرا تک کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ علی بن عیسیٰ جیسے وزیر کو ایک ادنیٰ قہرمانہ نے معزول کرا دیا تھا۔

علامہ سیوطی نے لکھا ہے: مقتدر نے احکام دیے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کو ملازم نہ رکھا جائے اور وہ سواریوں پر منہ دہ رکھ کر سوار ہوا کریں۔

تمام ممالکِ اسلامیہ میں بنو عباس کی خلافت کی مدت ایک سو ساٹھ سال سے کچھ زیادہ رہی۔ پھر اس کے بعد سے روز افزوں زوال آتا رہا۔

ذہبی کا بیان ہے مقتدر کے زمانۂ حکومت میں اس کی کم عمری کی وجہ سے نظامِ سلطنت میں گڑبڑ پیدا ہو گئی۔

۳۰۶ھ میں شغب مادرِ مقتدر نے ایک شفا خانہ قائم کیا جس کا سالانہ خرچ سات ہزار اشرفیاں تھا۔ مقتدر کی بے پروائی کے باعث اس سال سے حکومت کے تمام کاموں کی نگرانی وغیرہ مادرِ مقتدر انجام دینے لگی، یہاں تک کہ فوجداری مقدمات تک کا فیصلہ خود کرتی۔ ہر جمعہ کو دربارِ عام کرتی جس میں جج اور ارکین حاضر رہتے، وہ اپنے دستخطی فرامین جاری کرتی تھی۔ اسی سال قائم محمد بن مہدی فاطمی نے مصر پر حملہ کیا اور اکثر علاقے پر قبضہ کر لیا۔

قاہر باللہ[1]

نام، کنیت، لقب

قاہر باللہ بن معتضد باللہ بن موفق باللہ بن متوکل ایک ام ولد فتنہ نامی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ اس کا نام محمد، کنیت ابو منصور اور لقب قاہر باللہ تھا۔

خلیفہ مقتدر باللہ کے قتل کے بعد اس کا بیٹا عبدالواحد معہ ہارون بن غریب محمد بن یاقوت اور ابراہیم بن رائق کے مدائن کی طرف چلا گیا تھا وہاں سے واسط اور سوس ہوتا ہوا اہواز پہنچا۔ قاہر بن باللہ نے علی بن بلیق اپنے حاجب کو فوج دے کر عبدالواحد اور اس کے ہمراہیوں کی گرفتاری کے لیے روانہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سردارانِ لشکر کی کوشش اور خط و کتابت کے ذریعے عبدالواحد اور اس کے ہمراہیوں نے مونس اور خلیفہ قاہر باللہ سے امن طلب کیا جو فوراً دیا گیا۔ اور یہ سب لوگ بغداد چلے آئے۔

قاہر باللہ کی قہر انگیزیاں

محمد بن یاقوت کو خلیفہ نے اپنی مصاحبت میں داخل کر لیا۔ وزیر السلطنت علی بن مقلہ کو محمد بن یاقوت کا مصاحب ہونا سخت ناگوار تھا۔ اس نے مونس کو بہکایا کہ تمھاری مخالفت و بربادی کے لیے محمد بن یاقوت

[1] ۳۲۱ھ تا ۳۲۲ھ (۹۳۳-۹۳۴ء)

کوشاں ہیں مونس نے بلیق اور اس کے بیٹے علی بن بلیق حاجب کو خلیفہ کی نگرانی کا حکم دیا۔ خلیفہ کے پاس محل سرائے میں آنے جانے والی عورتوں تک کی بھی تلاشی لی جانے لگی۔ اور کسی کو اندر جانے کی اجازت نہ دی جاتی تھی۔ خلیفہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ مجھ کو معزول و معطل کیا جا رہا ہے تو اس نے بھی بعض فوجی سرداروں سے خفیہ سازش مونس وغیرہ کے خلاف شروع کر دی۔ ادھر مونس اور اس کے ہمراہیوں نے خلیفہ کے معزول کرنے اور ابو احمد بن مکتفی کے خلیفہ بنانے کی تیاری شروع کر دی۔ ان کوششوں میں قاہر باللہ کو کامیابی ہوئی۔ علی بن بلیق حاجب بلیق مونس دھوکے سے گرفتار ہو کر قاہر باللہ کے حکم سے قتل کیے گئے۔ محمد بن یاقوت کو حاجب اور ابو جعفر محمد بن قاسم بن عبید اللہ کو وزیر بنایا گیا۔ یہ واقعہ شعبان ۳۲۱ھ کو وقوع پذیر ہوا۔ انہیں ایام میں احمد بن مکتفی کی تلاش شروع ہوئی وہ روپوش ہو گیا تھا۔ آخر گرفتار ہوا اور قاہر باللہ نے اس کو دیوار میں چنوا دیا۔ ان تمام مقتولوں کے مکانات مسمار کرا دیے گئے۔ مال و اسباب خلیفہ نے ضبط کر لیا۔ ساڑھے تین مہینے وزارت کرنے کے بعد ابو جعفر وزیر بھی معتوب و مقید ہوا۔ اور اٹھارہ روز قید رہ کر بحالت قید فوت ہو گیا۔

دولتِ بنی بویہ کا قیام

سیوطی کا بیان ہے:

۳۲۲ھ میں باشندگانِ مرداویج نے اصبہان پر حملہ کیا۔ ان کا سردار علی بن بویہ تھا جس نے بہت زیادہ دولت جمع کی اور اپنے آقا سے الگ ہو گیا تھا۔ علی نے محمد بن یعقوب نائب السلطنت سے جنگ کی۔ اس جنگ میں محمد بن یاقوت کو شکست ہوئی جس کے بعد ابن بویہ فارس پر قابض ہو گیا۔ ابن بویہ فقیر و محتاج تھا۔ مچھلیاں پکڑا کرتا تھا۔ ایک دن اس نے خواب میں دیکھا کہ اس کے پیشاب میں سے ایک آگ نکلی اور اس کا عمودی شعلہ آسمان تک بلند ہو گیا۔ اس خواب کی تعبیر یہ دی گئی کہ اس کی اولاد بادشاہت کرے گی اور اس کی سلطنت اتنی وسیع ہو گی جتنا یہ شعلہ بلند ہے۔

تھوڑے دنوں بعد یہ مرداویج کا حاکم بن گیا اور مرداویج کے بادشاہ نے اسے کرخ سے مال لانے کے لیے بھیجا۔ یہ پانچ لاکھ روپے لے کر نکلا اور ہمدان پر قابض ہونا چاہا لیکن اہلِ

ہمدان نے شہر کے دروازے بند کر لیے۔ غرضکہ زور شمشیر اس نے ہمدان فتح کیا۔

بعض کہتے ہیں کہ ہمدان صلح کے ذریعے ہاتھ آیا۔ پھر یہ شیراز پہنچا جہاں اس کے پاس خرچ کرنے کے لیے کوئی رقم باقی نہ رہی تھی۔ ایک دن یہ سو رہا تھا کہ چھت میں سے سانپ نکلا اس نے چھت توڑ ڈالنے کا حکم دیا۔ جب چھت توڑی گئی تو اس میں سے سونے کے بھرے ہوئے صندوق برآمد ہوئے جو اس نے اپنے ساتھیوں میں بھی تقسیم کیے۔ پھر ایک درزی کو بلایا جو بہرا تھا اس نے خود بخود کہا۔ بخدا میرے پاس صرف بارہ صندوق ہیں اور مجھے نہیں معلوم ان میں کیا ہے۔ جب یہ صندوق منگائے گئے تو ان میں بہت زیادہ مال تھا، ایک دن یہ گھوڑے کی سواری کر رہا تھا کہ گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس گئے جب وہ زمین کھودی گئی تو وہاں سے بہت بڑا خزانہ نکلا۔ غرضکہ ابن بویہ بہت زیادہ مالدار ہو گیا۔ اور اکثر ممالک اس کے قبضے میں آ گئے۔ نیز خراسان اور فارس پر بھی اس کا تسلط ہو گیا۔

بنی بویہ یا دیلمی حکومت جو آگے چل کر خلافت بغداد کی متولی بنی، اس خاندان کا مورث اعلیٰ ابو شجاع بویہ بن فنا خسرو سلاطین فارس کی اولاد سے تھا، ابن ماکولا اس کو بہرام گور کی اولاد سے بتاتا ہے اور ابن مسکویہ نے فارس کے آخری تاجدار یزدگرد کی نسل سے قرار دیا ہے۔ ابن ماکولا امام الانساب ہے اس لیے اس کی رائے قابل ترجیح ہے۔

یہ خاندان گو سلاطین (ایران) کی اولاد سے تھا لیکن حکومت وسلطنت کا مدتوں سے خاتمہ ہو چکا تھا اور اس کے افراد زیادہ تر غربت وافلاس میں مبتلا تھے۔ بویہ ماہی گیری کے ذریعے بسر اوقات کرتا تھا لیکن اس کے لڑکے علی حسن اور احمد بیدار بخت تھے، انھوں نے اپنی کوششوں سے حکومت حاصل کی۔ بعد میں یہی تینوں عماد الدولہ، رکن الدولہ اور معز الدولہ کے لقب سے مشہور ہوئے۔

بنی بویہ کا زمانہ گو ۳۵، ۳۶ سال سے زیادہ نہیں لیکن ان کے کارناموں اور عظمت و شان کے لحاظ سے تاریخ اسلام میں اس خاندان کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس حکومت

کے سربراہ یہ تین بھائی تھے۔ عماد الدولہ، رکن الدولہ اور معز الدولہ، تینوں نے ایران و عراق میں علیحدہ علیحدہ حکومتیں قائم کیں۔ عماد الدولہ کے سلسلے میں عضد الدولہ، صمصام الدولہ، شرف الدولہ، بہاء الدولہ، سلطان الدولہ، جلال الدولہ اور ملک الرحیم فرمانروا ہوئے۔ رکن الدولہ کے سلسلے میں فخر الدولہ، مجد الدولہ، علاء الدولہ، ظہیر الدولہ اور معز الدولہ کے سلسلے میں صرف عز الدولہ ہوا۔ یہ حکومت ۳۲۲ھ میں قائم ہوئی، اور ۳۶۰ھ میں سلجوقیوں نے اس کا خاتمہ کیا۔

مقتدر کے خاندان پر قاہر کی ستم رانیاں

قاہر بڑا بہادر اور بڑے سطوت و جبروت کا خلیفہ تھا۔ اس نے امراء کی سرکشی کو دور کرنے اور خلافت کے وقار کو قائم کرنے کی پوری کوشش کی، لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔

تخت نشینی کے بعد قاہر نے مقتدر کی ماں کو گرفتار کر کے جس کی دولت مندی کے بڑے افسانے مشہور تھے اس پر سختی شروع کی۔ اس نے انکار کیا اور کہا، اگر میرے پاس دولت ہوتی تو میں روپے کے لیے اپنے لڑکے کی جان کیوں گنواتی؟ اس کے انکار پر قاہر نے کوشش کی کہ وہ اوقاف ہی سے دست بردار ہو جائے اور قاہر کو ان کے بیچنے کا اختیار دیدے لیکن اس نے اس سے بھی انکار کیا اور کہا میں نے ان کو کار خیر کے لئے وقف کیا ہے اب نہ اس کو توڑ سکتی ہوں اور نہ ان کے فروخت کرنے کا اختیار دے سکتی ہوں۔ آخر میں قاہر نے اس سے قضاۃ کے سامنے زبردستی دستبرداری لکھوا کر ان کو گواہ بنایا اور اوقاف کو فوج کے اخراجات کے بدلے میں دیدیا۔ اوقاف پر قبضہ کے بعد قاہر نے مقتدر کے بھائیوں اور اس کے دوسرے متعلقین کو گرفتار کیا اور ان سے روپیہ حاصل کر کے انھیں حسن بن ہارون کے سپرد کر دیا۔ اس نے ان کے ساتھ شریفانہ سلوک کیا، ابن خلدون کا بیان ہے کہ ابن مقلہ اور امیر بریدی وغیرہ کی دولت پر بھی قبضہ کر لیا۔

قاہر باللہ کا عبرت انگیز اور حسرتناک انجام

قاہر بڑا جری، سخت گیر اور دبدبہ و شکوہ کا خلیفہ تھا، اس نے اپنے ڈیڑھ سالہ عہد حکومت میں ان سرکش اور خیرہ سر امراء کا سر توڑنے کی پوری کوشش کی جو خلفاء پر حکومت کرنے کے خوگر ہوگئے تھے۔ چنانچہ یونس، بلیق اور علی بن یاقوت کو ایک ایک کر کے ختم کر دیا۔ اس سے یہ فائدہ تو ضرور ہوا کہ دلوں پر اس کی ہیبت بیٹھ گئی لیکن جن پر ان کو قابو نہ حاصل ہو سکا وہ اس کے درپے ہو گئے۔ چنانچہ اس کے پہلے وزیر ابن مقلہ نے جو معزولی کے بعد سے روپوش تھا، اس کے خلاف سازش کا دام بچھا دیا۔

اتفاق سے اسی دوران میں قاہر نے چند تہہ خانے بنوائے۔ ابن مقلہ نے ترکی افسروں کو یقین دلایا کہ یہ تہہ خانے ان کو قید کرنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ اس تدبیر سے فوج اور ترکی افسر دونوں قاہر کے خلاف ہو گئے۔ اور سیما نے حجریہ کو بھی اپنا ہمخیال بنا کر قاہر کے خلاف تدبیریں شروع کر دیں۔

وزیر دولت کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے پوچھا کہ بلا وجہ یہ تیاریاں کیوں ہو رہی ہیں۔ ان لوگوں نے صاف صاف ظاہر کر دیا کہ ہم کو معلوم ہوا ہے کہ سیما کو قاہر گرفتار کرنا چاہتا ہے اور ہمارے افسروں کو قید کرنے کے لیے اس نے تہہ خانے بنوائے ہیں اور جمادی الثانی ۳۲۲ھ میں دونوں فوجوں نے مل کر قصر خلافت پر حملہ کر دیا وزیر نے فوراً قاہر کو اطلاع کرائی۔ وہ اس وقت مخمور ہو رہا تھا، اس لیے باغی فوجیں قصر خلافت میں گھس گئیں۔ ان کا شور سن کر قاہر کو ہوش آیا۔ اس نے محل سے باہر نکل جانا چاہا، لیکن پھاٹک پر فوج متعین تھی اس لیے نہ نکل سکا۔ ایک حمام کی چھت پر چڑھ گیا۔ ایک فوجی اس کی خواب گاہ میں داخل ہوا لیکن وہ خالی تھی۔ ایک ملازم کے ذریعے پتہ چل گیا، چنانچہ یہ لوگ حمام کی چھت پر چڑھ گئے، قاہر ننگی تلوار لیے کھڑا تھا اس لیے کسی کو آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی ان لوگوں نے دھوکا دینا چاہا اور کہا ہم سب حضور کے غلام ہیں صرف اپنی حفاظت کا پیمان لینے کے لیے آئے ہیں لیکن قاہر فریب میں نہ آیا اور ڈانٹ کر کہا جس نے قدم بڑھایا اس کا سر قلم کر دوں گا، ایک شخص نے تیر کمان میں

جوکر دھمکایا اگر تم نے اپنے کو حوالے کرنے میں ذرا دیر کی تو یہ تیر تمھارے سینے میں پیوست ہو جائے گا۔ اس دھمکی پر قاہر مجبور ہو کر نیچے اتر آیا۔ اور باغی اسے پکڑ کر طریف کے قید خانہ میں لے گئے۔ اور اسے نکال کر قاہر کو قید کر کے اس کی دونوں آنکھوں میں گرم سلائیاں پھیر دیں اور خیرہ سر ترکوں کے ہاتھوں یہ با جبروت خلیفہ اس انجام کو پہنچا مدت خلافت ڈیڑھ سال تھی

جیسا کہ اوپر کے واقعات سے ظاہر ہے قاہر بڑا بہادر اور دبدبہ و شکوہ کا خلیفہ تھا لیکن مزاج میں تلوّن تھا کسی ایک حال پر قرار نہ رہتا تھا اس لیے کامیاب نہ ہوا مسعودی کا بیان ہے کہ قاہر کے تلوّن اور غیر مستقل مزاجی کی وجہ سے اس کی سیرت کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

جو تلوّن اور تضاد اس کی سیاست میں تھا یہی اس کی پوری زندگی میں تھا چنانچہ ایک طرف تو اس نے بہت سی مذہبی اصلاحات کیں، ناچنے گانے والی عورتوں کا پیشہ اور شراب نوشی کو قانوناً بند کر دیا، گویّوں کو قید اور ہیجڑوں کو جلا وطن کر دیا۔ موسیقی اور لہو و لعب کے تمام آلات ضائع کرا دیے۔ گانے والی لونڈیوں کو فروخت کر ڈالا لیکن خود ہر وقت شراب کے نشے میں مخمور رہتا تھا، عیش پرستی کے لیے اس نے ایک باغ لگوایا تھا، اس میں ایک عالی شان محل تعمیر کرایا تھا۔ باغ کی زینت اور محل کی آرائش کے لیے مختلف ملکوں سے درخت اور سامانِ آرائش منگائے تھے۔

نابینا ہونے کے باوجود قاہر کی عیاری

مسعودی کا بیان ہے کہ قاہر نے مونس وغیرہ سے بہت سا مال حاصل کیا تھا لیکن جب وہ خلافت سے دست بردار ہو کر اندھا ہو گیا تو مظلوموں نے اپنے مال کا مطالبہ کیا، اس کے انکار پر انھوں نے اسے طرح طرح سے ستایا، لیکن پھر بھی اس نے اقرار نہ کیا اس نوبت پر راضی باللہ نے قاہر کو بلوا کر اپنے پاس بٹھایا۔ اور کہا لوگ تم سے اپنا مال و دولت واپس مانگ رہے ہیں اور تمھارے پاس جو رکھا ہوا ہے وہ تمھاری آخرت میں سود مند نہ ہوگا، اگر میرے پاس دولت ہوتی تو میں تمھاری طرف سے لوگوں کے مطالبے پورے کر دیتا۔ اس پر قاہر نے کہا ہاں لوگوں کا مطالبہ درست ہے اور تمام مال میں نے

باغ میں دفن کر دیا ہے، یہ خاص باغ تھا جس میں دور دراز مقامات سے طرح طرح کے درخت منگوا کر لگوائے گئے تھے۔ اور باغ کو خوب سجایا گیا تھا نیز اس میں مکانات و محل بھی تعمیر کرائے تھے اس باغ پر راضی باللہ دل و جان سے فریفتہ تھا۔ راضی باللہ نے پوچھا باغ میں کس مقام پر دولت دفن کی تھی؟ قاہر نے جواب دیا اب میں اندھا ہوں مقام کا تعین کیسے کروں؟ تم باغ کھدوا کر دولت نکال لو غرضکہ راضی باللہ نے بادل ناخواستہ باغ کی زمین اور محلات کی بنیادیں تک کھدوائیں درخت کٹوائے لیکن کچھ نہ ملا تو پھر قاہر سے کہا بتائیے دولت کہاں دفن ہے؟ قاہر نے کہا کہاں کا مال اور کیسی دولت؟ مجھ سے یہ نہیں دیکھا جاسکتا کہ میرے باغ میں تم عیش و آرام کرو اس لیے میں نے تمھارے ہاتھوں اسے کھنڈر بنوا دیا۔ یہ سن کر راضی باللہ بہت شرمندہ ہوا۔ اور قاہر کو جیل خانے بھیج دیا جہاں وہ ۳۳۳ھ تک قید رہا پھر اس کو چھوڑ دیا۔

قاہر کا انتقال قاہر باللہ اپنے گھر میں نظر بند رہا اسے گھر سے نکلنے کی ممانعت تھی یہاں تک کہ ۵۳ سال کی عمر میں آخر ماہ جمادی الاول ۳۳۹ھ میں اس نے انتقال کیا اور یہ چار بیٹے چھوڑے:

عبدالصمد، ابوالقاسم، ابوالفضل اور عبدالعزیز۔

راضی باللہ[1]

کمزور اور بے تدبیر فرمانروا

راضی کے حالات و کوائف

راضی باللہ بن مقتدر باللہ کا نام محمد اور کنیت ابوالعباس تھی۔ سنہ ۲۹۷ھ میں ایک رومیہ اُمِّ ولد موسومہ ظلوم کے پیٹ سے پیدا ہوا۔ قاہر کے معزول ہونے کے بعد جمادی الثانی سنہ ۳۲۲ھ میں تختِ خلافت پر بیٹھا۔ یہ جیل خانے سے لاکر تختِ خلافت پر بٹھایا گیا تھا۔ اس نے علی بن مقلہ کو وزیرِ اعظم بنایا۔ محمد بن یاقوت کو گرفتار کر کے قید کر دیا۔

عہدِ راضی باللہ کا انحطاط و ادبار

راضی باللہ کی حکومت بغداد اور اس کے مضافات کے سوا اور کہیں نہ تھی۔ نہ کسی صوبے سے خراج آتا تھا۔ ہر جگہ خود مختار حکومتیں لوگوں نے قائم کر لی تھیں، جن لوگوں نے خراجِ مقررہ بھیجنے کے وعدے پر سندیں حاصل کی تھیں انھوں نے بھی اپنے وعدوں کا پورا کرنا غیر ضروری سمجھ رکھا تھا۔ بصرہ پر محمد بن رائق کا قبضہ، خوزستان اور اہواز پر ابوعبداللہ بریدی کا

لہ سنہ ۳۲۲ھ تا ۳۲۹ھ (۹۳۴ء تا ۹۴۰ء)

قبضہ تھا۔ فارس کی حکومت علی بن بویہ ملقب بہ عماد الدولہ کے قبضے میں تھی۔ کرمان میں ابو علی محمد بن الیاس حکمراں تھا۔ رے، اصفہان اور جبل کے صوبوں میں حسن بن بویہ ملقب بہ رکن الدولہ اور وشمگیر برادر مرداویج ایک دوسرے کے مقابل مصروفِ پیکار تھے۔ موصل، دیارِ بکر، دیارِ مضر، دیارِ ربیعہ بنی حمدان کے قبضے میں تھے مصر و شام پر محمد بن طغج قابض و متصرف تھا۔ ماوراء النہر اور خراسان کے بعض حصے پر بنی سامان حکمراں تھے۔ بحرین اور یمامہ کے صوبوں پر ابو طاہر قرمطی کی حکومت قائم تھی۔ طبرستان کے صوبہ پر دیلمی سردار قابض و حکمراں تھے۔ اندلس، مراکش اور افریقہ میں تو ایک عرصے سے خود مختار سلطنتیں قائم ہی تھیں۔ راضی کے عہد میں خلافت برائے نام تھی۔ آخر عہد میں بجکم خلیفہ اور دربار خلافت پر ہر طرح قابض و مستولی تھا اور کسی کو اس کی مخالفت کی جرأت نہ تھی۔ بجکم خود واسط میں رہتا تھا اور اس کا میر منشی بغداد میں خلیفہ کے پاس وزارتِ عظمیٰ کی خدمات انجام دیتا تھا۔

راضی باللہ کے خصوصیات

الفخری نے لکھا ہے:

ابو العباس احمد بن مقتدر بن معتضد ۳۲۲ھ میں اس کی بیعتِ خلافت ہوئی۔ یہ شاعر اور بڑا فصیح و دانا تھا۔ بعض باتوں میں خاتم الخلفاء تھا۔ مثلاً وہ آخری خلیفہ ہے جس کا دیوان (شعر) مرتب ہوا۔ وہ آخری خلیفہ ہے جو ملک کا نظم و نسق سنبھالتا رہا۔ وہ آخری خلیفہ ہے جس نے جمعہ کا خطبہ منبر پر دیا۔ وہ آخری خلیفہ ہے جو ندیموں کی محفل میں بیٹھا اور جس کے پاس علماء آئے۔ اور یہ وہ آخری خلیفہ ہے جس کے دفاتر، انعامات، خدام اور حاجب خلفائے سابق کے مطابق تھے۔

عماد الدولہ کی حکومت کا آغاز

عباسی قلمرو میں عراق اور خوزستان کا علاقہ نہایت سیر حاصل اور عباسی خلفاء کی ذاتی جاگیر تھا۔ اس لیے اس کی حکومت کے حصول کے لیے امراء میں بڑی کشمکش رہتی تھی۔ امیر یاقوت، عماد الدولہ، مرداویج، ابو عبداللہ بریدی سب اس کے لیے دست و گریباں رہتے تھے راضی کے زمانے میں یہ کشمکش اور بڑھ گئی تھی۔ مرداویج کے قتل کے بعد عماد الدولہ نے یاقوت کو شکست دے کر صلح کرنے پر مجبور کر دیا اور عراق اور خوزستان میں اس کی قوت اتنی

بڑھ گئی کہ راضی نے اس کو فارس، عراق اور خوزستان کے مفتوحہ علاقوں پر باقاعدہ مقرر کر دیا، عماد الدولہ نے شیراز کو مستقر بنایا۔

حنابلہ اور شوافع کی معرکہ آرائیاں

۳۲۳ھ میں حنابلہ کی وجہ سے بغداد میں بڑا ہنگامہ برپا ہوگیا۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ ترکوں اور دوسری عجمی اقوام کے اثر سے بغداد کی اخلاقی حالت عرصے سے بگڑ گئی تھی ۳۲۳ھ میں حنابلہ نے اس کی اصلاح کے لیے احتساب شروع کر دیا۔ فوجی افسروں اور عام لوگوں کے گھروں پر چھاپے مارتے جہاں نبیذ نظر آتی اسے بہا دیتے، گانے والی عورتوں کو مارتے، آلاتِ موسیقی کو توڑ ڈالتے، مردوں کو عورتوں کے ساتھ چلنے سے روکتے ان کے احتساب سے بغداد میں بڑا ہنگامہ برپا ہوگیا۔ اور بغداد کے کوتوال کو ان کے خلاف کارروائی کرنی پڑی۔ اس نے شارع عام پر ایک ساتھ دو حنبلیوں کے اجتماع کی ممانعت کر دی اور مذہبی مناظروں کو بالکل روک دیا۔ اس سے حنابلہ کا جوش اور بڑھ گیا انھوں نے مار پیٹ شروع کر دی جو شافعی نظر آتا اسے پیٹتے یا مار ڈالتے۔ اس طرح بہت سے شوافع کی جانیں ضائع ہوئیں۔ یہ صورت دیکھ کر راضی نے سخت احکام جاری کیے کہ اگر حنابلہ ان مذہبی سخت گیریوں سے باز نہ آئیں گے تو ان کو پوری سزا دی جائے گی اور بے دریغ ان کا استیصال کیا جائیگا۔

راضی باللہ کا انتقال

ربیع الاول ۳۲۹ھ میں راضی مرضِ استسقا میں مبتلا ہوا اور اسی مہینے میں انتقال کر گیا۔ انتقال کے وقت کل ۳۲ سال کی عمر تھی۔ مدتِ خلافت ۶ سال دس مہینے۔

متقی للہ[1]

ترکوں کی ہوسِ اقتدار کا ایک اور شکار

دار الخلافہ کی حالت "الفخری" نے متقی کے عہدِ خلافت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

۳۲۹ھ میں اس کی بیعت ہوئی۔ اس کی سیرت میں کوئی ایسی بات نہیں جو بیان کی جائے"۔ اس کے دور میں بدنظمی پھیلی رہی۔ امرائے دیلم میں سے ایک شخص "توزون" نامی اس پر غالب آ گیا۔ اور یہ اپنی بیوی اور بیٹے کو لے کر بھاگ نکلا اور موصل پہنچ گیا۔ اسے خطرہ تھا کہ بغداد میں جنگ لڑنی پڑے گی۔

ان دنوں خانہ جنگی اور فتنے سر اٹھاتے رہے اور دار الخلافہ لوٹ لیا گیا اور وہاں کا سب کچھ لے لیا گیا۔ اس کے بعد توزون نے متقی کو چاپلوسی کا خط لکھ کر حکمتِ عملی سے کام لیا۔ اسے قسم کھا کر یقین دلایا کہ میری طرف سے اسے کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ متقی دھوکے میں آ گیا اور موصل سے بغداد کی طرف روانہ ہو گیا۔ نہر عیسیٰ کے راستے

---

[1] سنہ ۳۲۹ھ تا ۳۳۳ھ (۹۴۱ - ۹۴۴ء)

"سندیہ" پہنچا۔ توزون اور اس کے ساتھ ساتھ سارے لوگ استقبال کے لیے نکلے۔ جب توزون نے متقی کو دیکھا توزمیں بوس ہوگیا۔ لیکن اپنے ساتھیوں کی ایک جماعت کو سکھا پڑھا دیا کہ اسے گھیر لینا۔ یہ سب اسے توزون کے خیمے میں لے آئے وہاں اسے پکڑ کر اس کی آنکھیں نکال لیں اور اُسے معزول کر کے مستکفی کی بیعت کر لی۔ متقی ۳۵۰ھ میں مر گیا۔

متقی للہ کے صفاتِ حمیدہ علامہ سیوطی نے لکھا ہے: متقی للہ لقب، ابو اسحٰق کنیت، ابراہیم بن مقتدر بن معتضد بن موفق بن طلحہ بن متوکل نام تھا۔ اپنے بھائی راضی کے انتقال کے بعد ۳۴ سال کی عمر میں خلیفہ ہوا۔ اس کی ماں لونڈی تھی جس کا نام خلوب تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ زہرہ تھا۔ اس نے خلیفہ ہونے کے بعد کسی چیز میں ردّ و بدل نہیں کیا۔ اپنی کنیزوں سے فائدہ حاصل نہیں کیا۔ یہ بڑا روزہ دار عبادت گزار تھا، اس نے کبھی شراب نہیں پی۔ خود کہا کرتا تھا کہ قرآن شریف کے سوا مجھے کسی مصاحب کی ضرورت نہیں یہ برائے نام خلیفہ تھا۔ مملکت کا انتظام ابن عبداللہ احمد بن علی کوفی کے ہاتھ میں تھا جو بحکم کا پیش کار اور میر منشی تھا۔

عہدِ متقی باللہ میں مسلمانوں کی عسکری زبوں حالی دولتِ عباسیہ کی زبوں حالی کی وجہ سے بیرونی مہمات کا سلسلہ عرصے سے رُک گیا تھا جس سے رومیوں کے حوصلے بڑھ گئے تھے۔ چنانچہ ۳۳۰ھ میں وہ شام کی سرحد میں گھس آئے۔ اور لواحِ حلب کو تاخت و تاراج کر کے پانچ ہزار آدمی گرفتار کر لیے گئے۔

خلافتِ بغداد میں مقابلے کی سکت نہ تھی۔ خود شام کے مسلمانوں نے اس کا انتقام لیا اور رومی حدود میں تاخت کر کے بہت سا مالِ غنیمت حاصل کیا۔ اور کئی بطریق گرفتار کیے۔

عہدِ متقی باللہ کی داخلی کمزوریاں

قاضی تنوخی لکھتے ہیں کہ بنی عباس کے سیاسی نظام میں سب سے پہلے عہدۂ قضا پر زوال آیا اور بے علم قضاۃ مقرر ہونے لگے۔ پھر وزارت پر زوال طاری ہوا۔ متقی کے عہد میں اس کی شان و شوکت کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔ اور گلی کوچوں میں اس کا مذاق اڑایا جانے لگا۔

خلافتِ راشدہ کے بعد تاریخ اسلام کا سب سے زیادہ المناک اور اندوہناک باب یہ ہے کہ حکومتیں مذہب کے نام پر قائم ہوئیں لیکن انھوں نے مذہب کو صرف آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا۔ مذہب ان کے دل میں نہ تھا زبان پر تھا اس لیے وہ بزم و محلس میں تو وردِ زبان رہا، لیکن ان کے کردار و سیرت کی دُنیا میں جگہ نہ پا سکا۔

یہ جتنی بے تدبیریاں اور ناکامیاں اور خام کاریاں نظر آتی ہیں صرف اس لیے کہ مذہب سے دُور رہ کر حکومت کا کاروبار چلایا گیا ورنہ نتائج کچھ اور ہوتے اور اسلام کی مملکت ساری دُنیا تک وسیع ہو گئی ہوتی ۔ !

مستکفی باللہ [1]

عباسیوں کے عہدِ زوال کے دلدوز مناظر!

تخت نشینی

ابوالقاسم عبداللہ مستکفی باللہ بن مکتفی باللہ ایک ام ولد املح الناس کے بطن سے پیدا ہوا تھا صفر ۳۳۳ھ کو یہ عمر ۴۱ سال تخت نشین ہوا۔ ابوالقاسم فضل بن مقتدر باللہ بھی دعویدار خلافت تھا وہ روپوش ہو گیا۔ مستکفی نے اس کو بہت تلاش کرایا مگر وہ ہاتھ نہ آیا۔ اور مستکفی کے عہد میں روپوش ہی رہا۔ مستکفی جب اس کی تلاش میں ناکام رہا تو اس کا مکان منہدم کرا دیا۔

خلافتِ عباسیہ دیلمی اُمراء کی تحویل میں

معز الدولہ دیلمی والیٔ فارس کی قوت اس وقت بہت بڑھ چکی تھی۔ اس کی نگاہ عرصے سے بغداد کی حکومت کے لیے اٹھ رہی تھی۔ بغداد کے ہنگاموں نے اس کے لیے موقع پیدا کر دیا۔ اس کی خوش قسمتی سے ابن شیرزاد ایک ممتاز عہدہ دار نیال کوشہ والیٔ واسط اس سے مل گیا اور اس کو بغداد پر فوج کشی کی دعوت دی۔ یہ

---

[1] ۳۳۳ھ تا ۳۳۴ھ (۹۴۴ء تا ۹۴۵ء)

یہ معز الدولہ کی دیرینہ آرزو تھی۔ اس لیے وہ فوراً آمادہ ہوگیا۔ ادھر ابن شیرزاد پہلے سے بغداد کے انقلاب کو روکنے سے عاجز آچکا تھا۔ اس پر مستزاد یہ ہوا کہ ترکی اور دیلمی فوجیں بھی ہنگامے میں شریک ہوگئیں۔ اور بغداد میں معز الدولہ کو کوئی طاقت روکنے والی باقی نہ رہی۔ اس لیے اس کا معتمد علیہ امیر عبداللہ ہاشمی مع دیلمی فوجوں کے آسانی کے ساتھ بغداد میں داخل ہوگیا۔ اور ابن شیرزاد کو مع مستکفی کے روپوش ہوجانا پڑا۔

جمادی الاول ۳۳۴ھ میں معز الدولہ بھی بغداد پہنچ گیا۔ اور مستکفی کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کی بیعت کی اور عمائد و ارکانِ سلطنت کے روبرو دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ وفاداری کا عہد و پیمان کیا۔ مستکفی نے ابوالحسین معز الدولہ اور اس کے دونوں بھائیوں ابوالحسن اور ابوعلی کو معز الدولہ، عماد الدولہ اور رکن الدولہ کے لقب سے نوازا اور سکوں پر ان کے نقش کرنے کا حکم دیا۔ معز الدولہ نے مستکفی سے ابن شیرزاد کی خطا معاف کرا کے اپنا کاتب بنایا۔

بغداد کا خلیفہ بےبسی کی تصویر معز الدولہ نے مستکفی کے حقوق و اختیارات سلب کر کے اس کے گزارہ کے لیے پانچ ہزار ماہانہ اور تھوڑی سی جاگیر مقرر کردی اور اس کو حکومت کے نظم و نسق سے بالکل الگ کردیا۔ صرف خطبے میں خلیفہ کا نام لیا جاتا تھا یا بعض احکام و فرامین اس کے نام سے رسماً جاری ہوتے تھے۔

ایک دن جب کہ ایک قاصد مستکفی کے حضور میں باریاب ہو رہا تھا، دو دیلمیوں نے جنھیں معز الدولہ نے پہلے سے مقرر کر دیا تھا مستکفی کے ہاتھوں کی طرف ہاتھ بڑھایا، وہ سمجھا دست بوسی کرنا چاہتے ہیں، اس لیے ہاتھ بڑھا دیا، انھوں نے کھینچ کر تخت کے نیچے گرا دیا اور گھسیٹتے ہوئے معز الدولہ کے فرودگاہ پر لا کر قید کر دیا۔ اور دارالخلافہ کا کل سامان لوٹ لیا۔ اس افسوس ناک طریقے سے کل ایک سال چار ماہ کی حکومت کے بعد مستکفی کی خلافت کا خاتمہ ہوگیا۔

بنی بویہ خلافتِ عباسیہ کے حاکمِ مطلق تھے اور مستکفی کی حیثیت ایک وظیفہ خوار سے زیادہ نہ تھی۔ معز الدولہ دربار میں اس کے پہلو بہ پہلو بیٹھتا تھا، جس کی جرأت اب تک کسی نے نہ کی تھی۔

ایک زمانہ تھا کہ خلافتِ اسلامیہ کے دبدبے اور طنطنے سے دُنیا کانپتی تھی، دُنیا کے ملوک و سلاطین اس نام سے لرزنے لگتے تھے اور یا وہ زمانہ آیا کہ خود مسلمان قوم کے طالع آزما اپنے عسکری جتھے بنا کر خلافتِ اسلامیہ کو اپنی تحویل میں لیتے ہوئے اسے اپنا آلۂ کار بنانے لگے۔ نام خلیفۃ المسلمین کا تھا احکام ان کے تھے۔ تخت پر متمکن تھے خلیفۃ المسلمین اور ملک میں احکام چلتے تھے ان متولیانِ خلافت کے!

یہ بڑا تاریک اور حد درجہ افسوس ناک دور تھا۔ لیکن اسے کیا کیجیے کہ:

هر کہ آموخت علم تیر از من
کہ مرا عاقبت نشانہ کرد!

مسلمانوں پر جو کچھ بیتی اور گزری وہ صرف اپنے ہی ہاتھوں!

مطیع للہ[1]

ہنگامہ آرائیوں کا دور شیعہ سنی آویزش

حالات و واقعات عباسی خاندان میں خلیفہ مقتدر کا لڑکا فضل عرصے سے خلافت کا متمنی تھا۔ اور متقی کے بعد مستکفی کے مقابلے میں ایک مرتبہ اس کے حصول کی کوشش بھی کر چکا تھا لیکن کامیاب نہ ہوا تھا۔ اس لیے مستکفی کے زمانے بھر وہ اس کے خوف سے روپوش رہا۔ اس کی معزولی کے بعد معزالدولہ نے اسے تلاش کر کے خلیفہ بنایا اور جمادی الثانی سنہ ۳۳۴ھ میں وہ تخت نشین ہوا، اور مطیع للہ لقب اختیار کیا۔ یہ ایک کنیز مشغلہ کے بطن سے تھا۔ تخت نشینی کے وقت ۳۴ سال کی عمر تھی۔

مطیع کی بیعت کے وقت مظلوم مستکفی سے باقاعدہ خلافت سے دست برداری کرا کے اس سے مطیع کی بیعت لی گئی اور اس کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھیر کر اس کو اندھا کیا گیا

فرقہ وارانہ تعصب اور باہمی تلخیاں معزالدولہ نے خلفاء کی قوت ختم کرنے کے ساتھ ہی بغداد میں شیعیت کی تبلیغ شروع کر دی۔

---

[1] سنہ ۳۳۴ھ تا ۳۶۳ھ (۹۴۵ء تا ۹۷۴ء)

شیعوں اور سنیوں کے مابین خونریزیاں

معزالدولہ نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ بغداد میں شیعوں کے تمام مراسم جاری کر دیے۔ عید غدیر کے دن عام عید اور جشنِ مسرت منانے کا حکم دیا۔ محرم کے لیے حکم جاری کیا کہ عاشورہ کے دن تمام دکانیں اور کاروبار بند رکھے جائیں، کل مسلمان خاص قسم کی ٹوپیاں پہن کر نوحہ و ماتم کریں۔ عورتیں چہرے پر بھبوت مل کر پریشان مو سینہ کوبی کرتی ہوئی شہر میں ماتمی جلوس نکالیں۔

سنیوں پر یہ احکام بہت شاق گزرے لیکن شیعوں کی قوت اور حکومت کے مقابلے میں بے بس تھے اس لیے ان احکام کو منسوخ تو نہ کرا سکے لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ محرم ۳۵۳ھ میں شیعوں اور سنیوں میں سخت فساد ہوا اور بغداد میں بڑی بد امنی پھیل گئی۔

مرض الموت، توبہ، وفات

۳۵۶ھ میں معزالدولہ، عمران بن شاہین کے مقابلے کے لیے نکلا، راستہ میں بیمار پڑ گیا اس لیے واسط لوٹ آیا، یہاں آ کر مرض اور زیادہ بڑھ گیا، معدہ میں کوئی چیز ٹھہرتی نہ تھی، جب حالت زیادہ نازک ہوئی تو بغداد لوٹ آیا اور اپنے لڑکے بختیار المقلب بہ عزالدولہ کو ولی عہد نامزد کیا۔ اور فقہاء کو بلا کر ان کے روبرو اپنے گزشتہ اعمال سے توبہ کی اور اپنی دولت کا بڑا حصہ خیرات کیا۔ اور اپنے کل غلام آزاد کر دیے، جن جن لوگوں کا مال ظلم و زیادتی سے لیا تھا سب کو واپس کر دیا اور ان امور سے فراغت کے بعد ربیع الاول ۳۵۶ھ میں انتقال کیا۔

ترکوں کا بغداد پر قبضہ، تلافیٔ مافات

۳۶۳ھ میں ترکی اور دیلمی فوجوں میں روپے کے لیے شورش بپا ہوئی بغداد کا خزانہ خالی تھا، اس لیے یہ لوگ روپے کے حصول کے لیے ناصرالدولہ کے پاس موصل پہنچے۔ مگر جب یہاں بھی کچھ نہ ملا تو بختیار کو ساتھ لے کر اہواز کا رخ کیا۔ یہاں کے والی امیر بختگین نے بختیار کی پوری مدارات کی اور ایک بڑی رقم مہیا کر دی جس سے فی الجملہ فوجوں کا مطالبہ پورا کرنے کی ایک صورت پیدا ہو گئی تھی کہ اسی دوران میں

ایک ترک اور ایک دیلمی غلام میں ایک معمولی سی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ دونوں جماعتیں اپنے اپنے غلام کی حمایت میں لڑ گئیں اور بہت سے ترک اور دیلمی مارے گئے، بختیار نے ہر چند رفع کرنے کی کوشش کی مگر فریقین میں سے کسی نے نہ سُنا اور بختیار نے دیالمہ کے مشورہ سے بہت سے ترکی سرداروں کو گرفتار کر کے قید کر دیا۔ دیالمہ نے ان کا مال و متاع لوٹ کر اُن کی بڑی تعداد تہ تیغ کر دی۔ بختیار نے سبکتگین کی جاگیر ضبط کر لی اس سے ترک اور دیالمہ میں مستقل مخالفت پیدا ہو گئی۔

ترکوں کا سردار سبکتگین اس وقت بغداد میں تھا بغیر اس کی گرفتاری کے ترکوں کا شیرازہ منتشر نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے بختیار نے اہواز ہی سے اس کی گرفتاری کی تدبیر کی تھی لیکن سبکتگین کو اس کی اطلاع ہو گئی۔ اس نے فوراً ترکوں کو جمع کر کے بختیار کے محل کا محاصرہ کر کے اس میں آگ لگا دی۔

مطیع کی دست برداری ترک اور دیالمہ کے اختلاف سے پہلے مطیع پر فالج کا حملہ ہوا تھا جس نے اسے بالکل بیکار کر دیا تھا، لیکن وہ عرصے تک اپنی حالت کو چھپائے رہا۔ آخر میں سبکتگین کو اس کا علم ہو گیا، اس نے اس پر پرزور ڈال کر ۳۶۳ھ میں اس کے لڑکے عبدالکریم طائع کے حق میں خلافت سے دستبردار کرا دیا۔ دست برداری کے بعد وہ بغداد چھوڑ کر واسط چلا گیا اور وہیں انتقال کیا، مدتِ خلافت ۲۹ سال تھی۔

طائع للہ

خلافتِ عباسیہ طالع آزماؤں کے نرغے میں!

بغداد پر عزالدولہ کا قبضہ مطیع کی دست برداری کے بعد ابو الفضل عبدالکریم ذیقعدہ ۳۶۳ھ میں تختِ خلافت پر بیٹھا اور طائع للہ لقب اختیار کیا۔

مطیع کی طرح طائع بھی بالکل بے دست و پا اور بنی بویہ کا دست نگر تھا، اس کے دور میں بھی عباسی حکومت کی کوئی خاص تاریخ نہیں ہے۔ بغداد کے حالات بھی بتمامتر بنی بویہ سے متعلق ہیں۔ اس عہد میں البتہ ایک اہم تغیر یہ ہوا کہ عزالدولہ بختیار کے چچیرے بھائی عضدالدولہ بن رکن الدولہ نے بغداد پر قبضہ کر لیا۔ گو اس سے خلیفہ کی بے بسی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ لیکن عضدالدولہ بڑا جامع اوصاف اور بڑے دبدبہ و شکوہ کا فرماں روا تھا۔ اس نے بغداد کی ابتری کو دور کر کے مختلف حیثیتوں سے اس کو ترقی دی۔

عضدالدولہ کی وفات، کارنامے اور شخصیت عضدالدولہ عرصے سے صرع کے مرض میں مبتلا تھا، شوال ۳۷۲ھ میں انتقال

لہ ۳۶۳ھ تا ۳۸۱ھ (۹۷۴ - ۹۹۱ء)

گر گیا۔ لاش بغداد سے نجف لے جا کر حضرت علیؓ کے جوار میں سپردِ خاک کی گئی۔ وفات کے وقت کل ۴۷ سال کی عمر تھی۔

عضد الدولہ دیلمی خاندان میں بڑا جامع اوصاف فرماں روا تھا عقل و دانش، تدبیر و سیاست، شجاعت و شہامت، فضل و کمال، علم نوازی اور علماء پروری جملہ اوصاف جہاں بانی میں یگانہ تھا۔ اس نے اپنے دور میں دیلمی حکومت اور خلافتِ بغداد دونوں کو علمی و تمدنی حیثیت سے بڑی ترقی دی۔ ابن اثیر کا بیان ہے کہ وہ عاقل، فاضل، مدبّر باہیبت، عالی ہمت، صائب الرائے، فضائل دوست، فضلا نواز، بخشش کے موقع پر فیاض اور احتیاط کے موقع پر محتاط اور عاقبت اندیش فرماں روا تھا، ابن خلکان کا بیان ہے کہ ملک کی وسعت، سلاطین اور حکومتوں پر غلبہ، جاہ و جلال اور عظمت و شان میں وہ پورے دیلمی خاندان میں ممتاز تھا، اس نے بہت سے ملک زیر نگیں اور بہت سے فرمانروا مغلوب کیے۔ تاریخ اسلام میں وہ پہلا فرماں روا ہے جو شہنشاہ کے لقب سے ملقب ہوا۔ اور بغداد کے منبروں پر اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔

اپنے باپ اور چچا اور دوسرے حکمرانوں کی متعدد چھوٹی چھوٹی حکومتوں کو ملا کر ایک متحدہ حکومت قائم کر دی۔ خلافت پر زوال کے ساتھ بغداد اجڑ گیا تھا، اس کی علمی مجلس برہم ہو گئی تھی۔ عضد الدولہ نے اس کو دوبارہ زندہ کیا۔ اس کی علم نوازی کی بدولت مختلف ملکوں کے علماء کھنچ کر بغداد میں جمع ہو گئے اور اس کے نام پر کتابیں لکھیں۔

رفاہِ عام کے بہت سے کام انجام دیے۔ بغداد مسلسل شورشوں اور سیاسی انقلابات سے اجڑ گیا تھا۔ اس کو دوبارہ آباد کیا، مدینہ طیبہ کے گرد شہر پناہ تعمیر کرائی۔ حضرت علیؓ کی قبر کا پتا چلا کر اس پر عمارت بنائی۔ سارے ممالکِ محروسہ میں پل، شفاخانے اور دوسری رفاہِ عام کی عمارتیں بنوائیں۔

بغداد کا شفاخانہ جو بیمارستانِ عضدی کے نام سے موسوم تھا بڑا عظیم الشان تھا۔ اس کے اخراجات کے لیے ایک خطیر رقم وقف کی۔ ابن خلکان کا بیان ہے کہ اس سروسامان اور حسنِ انتظام کا کوئی دوسرا شفاخانہ دنیا میں نہ تھا۔

ہر سال کے آغاز میں صدقے کے لیے ایک خطیر رقم نکالتا تھا۔ اور اس کو معتبر علماء اور قضاۃ کے ذریعے سارے ممالکِ محروسہ کے مستحقین میں تقسیم کراتا تھا۔

ان خوبیوں کے ساتھ اس میں بعض عیوب بھی تھے۔ خونریزی میں بڑا بیباک تھا۔

بارگاہِ خلافت سے تعلقات اگرچہ طائع عملاً عضد الدولہ کے ماتحت تھا اور خلافت کا سارا انتظام اس کے ہاتھوں میں تھا لیکن عضد الدولہ نے اس کا ظاہری احترام پوری طرح قائم رکھا تھا۔ مگر طائع اس قدر کمزور اور نااہل تھا کہ اس نے خود تمام اختیارات عضد الدولہ کے حوالے کر دیے تھے۔ اور اس کو اتنا اعزاز بخشا کہ اس سے پہلے کسی متولی خلافت کو نصیب نہ ہوا تھا۔

۳۶۹ھ میں ملک العزیز والئ مصر کی سفارت کی باریابی کے موقع پر عضد الدولہ کو اپنے سامنے کرسی پر بٹھایا۔ ۳۷۰ھ میں جب وہ ہمدان سے بغداد آیا تو خلفاء کے دستور کے خلاف طائع خود اس سے ملنے کے لیے گیا۔

عضد الدولہ نے خلفاء میں اپنی نسل کو شامل کرنے کے لیے اپنی لڑکی بھی طائع کو بیاہ دی تھی۔

نیا دیلمی بادشاہ صمصام الدولہ عضد الدولہ کی وفات کے بعد دیلمی امراء نے اس کے لڑکے ابو کالیجار مرزبان کو اس کا جانشین بنایا۔ اور صمصام الدولہ کا لقب دیا۔ طائع نے بھی اس کی تصدیق کر دی اور اپنی جانب سے شمس الدولہ کا لقب، سات پارچے کا خلعت اور دو لواء عطا کیے۔

عضد الدولہ نے حکومت کی جو عظمت و شان قائم کر دی تھی اس کو صمصام الدولہ نہ سنبھال سکا۔ گو خلافتِ بغداد کے ساتھ اس کے دستوری تعلقات بھی قائم رہے لیکن کوئی نمایاں امتیاز حاصل نہ کر سکا۔

شرف الدولہ اور بہاء الدولہ صمصام الدولہ کی گرفتاری کے بعد طائع نے شرف الدولہ کی حکومت بغداد کی تصدیق کر دی اور معمول کے مطابق خلعت اور تاج سے سرفراز کیا۔

طائع نے اس کو سات پارچے کا خلعت، سیاہ عمامہ، طوق اور کنگن عطا کیے۔ اور بہاء الدولہ اور ضیاء الدولہ کے القاب سے ملقب کیا۔

طائع کا حشر بہاء الدولہ کے زمانے میں دیلمی حکومت کا خزانہ خالی ہوگیا تھا۔ فوج کو تنخواہ وقت سے نہ ملتی تھی اس لیے ۳۸۱ھ میں فوج میں روپے کے لیے شورش پیدا ہوگئی۔ امیر ابوالحسن بن معلم نے جس کا بہاء الدولہ پر بڑا اثر تھا اس کو مشورہ دیا کہ طائع کے پاس کافی دولت ہے، اگر اس کو گرفتار کرلیا جائے تو کل دولت ہاتھ آجائیگی بہاء الدولہ اس پر آمادہ ہوگیا۔ اور تجدید عہد کے بہانے طائع سے باریابی کی اجازت لے کر چند دیلمیوں کے ساتھ دربارِ خلافت پہنچا اور طائع کے سامنے زمین بوس ہوکر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ دیلمی بھی دست بوسی کے بہانے آگے بڑھا اور طائع کو تخت سے کھینچ کر نیچے اتار لیا، وہ ہر چند فریاد کرتا رہا لیکن کسی نے نہ سُنی، دار الخلافت کا کُل سامان لُوٹ لیا۔ اور طائع کو بہاء الدولہ کے محل میں لاکر خلافت سے معزول کرکے قاہر باللہ کے گھر میں نظر بند کردیا۔ نظر بندی کے بعد اس کی راحت و آرام کا پورا لحاظ رکھا، کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں دی گئی یہیں ۳۹۳ھ میں اس کا انتقال ہوگیا۔ اس کی مدتِ خلافت سترہ سال آٹھ مہینے اور عمر ۶۴ سال تھی۔

طائع جسمانی اعتبار سے بڑا قوی اور بہادر تھا، لیکن جہانبانی کی اہلیت نہ تھی۔ اس کی قوت اور بہادری کا یہ واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ اس کے قصرِ بستان میں ایک پہاڑی بینڈھا مست ہوگیا۔ کوئی شخص اس کے پاس جانے کی ہمت نہ کرتا تھا۔ وہ خود اس کو پکڑنے کے لیے گیا، بینڈھے نے اس پر حملہ کردیا۔ طائع نے بڑھ کر اس کے دونوں سینگ پکڑ لیے اور بڑھئی کو بلاکر آری سے کٹوا دیے۔

لیکن یہ دماغی قوت اور اوصافِ جہانبانی سے محروم تھا اس کا جو نتیجہ نکلا وہ اس کی معزولی کی نوعیت سے ظاہر ہے۔ اس کے زمانے میں دیالمہ کا اقتدار و استبداد بہت بڑھ گیا اور خلافت کی قوت محض برائے نام رہ گئی۔

قادر باللہ

عباسی خلافت کے ادبار و انحطاط کا دور

صاحبِ دیانت و سیاست ابو العباس احمد قادر باللہ اسحٰق بن مقتدر ۳۳۶ھ میں ایک ام ولد موسومہ یمنی کے بطن سے پیدا ہوا۔ اور ۱۲۔ رمضان ۳۸۱ھ میں تختِ خلافت پر بیٹھا۔ صاحبِ دیانت و سیاست تھا۔ نمازِ تہجد کبھی قضا نہیں کی۔ اعلیٰ درجے کا فقیہ تھا۔ تخت نشینی کے چند روز بعد ماہ شوال ۳۸۱ھ میں قادر باللہ نے ایک دربار منعقد کیا۔ اس میں بہاؤ الدولہ اور خلیفہ قادر باللہ نے ایک دوسرے کے وفادار رہنے کی قسمیں کھائیں۔ قادر باللہ نے اس تذلیل و تحقیر کو جو طائع للہ کے زمانے میں خلیفہ بغداد کی ہو چکی تھی کم کرنے کی کوشش کی اور وقارِ خلافت کو قائم کرنے کا خواہش مند رہا مگر دیلمی اس طرح چھائے ہوئے تھے اور خلافت کا مرتبہ اس قدر پست ہو چکا تھا کہ قادر باللہ کوئی بہت بڑا تغیر پیدا نہیں کر سکا تاہم اس نے طائع کے مقابلے میں اپنے مرتبے کو ضرور ترقی دی۔

لہ ۳۸۱ھ تا ۴۲۲ھ (۹۹۱ء تا ۱۰۳۱ء)

سنہ ۴۰۳ھ میں بہاء الدولہ کا انتقال ہوا۔ اور اس کی جگہ اس کا بیٹا سلطان الدولہ حکومت کرنے لگا۔ خلیفہ قادر باللہ نے اس کو سلطان الدولہ کا خطاب دیا۔

قادر باللہ کی وفات

خلیفہ قادر باللہ نے سنہ ۴۲۲ھ میں انتقال کیا اور اس جگہ اس کا بیٹا ابو جعفر عبد اللہ قائم بامر اللہ کے لقب سے تختِ خلافت پر بیٹھا۔ شیخ تقی الدین صلاح نے خلیفہ قادر باللہ کو فقہائے شافعیہ میں شمار کیا ہے۔

قادر باللہ بہرحال انسان تھا اور کون انسان ہے جس میں کچھ کمزوریاں نہ ہوں! لیکن مجموعی حیثیت سے وہ خوبیوں کا پیکر تھا۔ اس میں حسنات بہت زیادہ تھے اور سیئات بہت کم۔ اس کی خوبیوں کا اعتراف سب کو ہے اور اس اعتراف میں مخالف تک شریک ہیں۔ اور یہی سب سے بڑا ثبوت اس کے اچھے ہونے کا ہے

قائم بامر اللہ[1]

سلجوقیوں کا اقتدار خلیفہ اور خلافت پر!

فاضل اور صالح خلیفہ ۴۲۲ھ میں اس کی بیعتِ خلافت ہوئی۔ یہ بڑا فاضل اور صالح خلیفہ تھا۔ دیر تک اس کی خلافت قائم رہی اسی کی وجہ سے حکومت کا وقار بڑھا اور اس کا اقتدار مکمل ہو گیا۔ اس کے عہد میں بنی بویہ کی حکومت کا خاتمہ ہوا۔ اور بنی سلجوق کی حکومت ابھری۔

سلاجقہ کا ظہور و نمود اس حکومت کا اقتدار زبردست اور اس کا پھیلاؤ خاصا ہو گیا تھا۔ اس کے احکام خلیفہ کی موجودگی میں بھی چلتے تھے۔ بلکہ خلافت پر یہی لوگ چھائے ہوئے تھے۔ منبر پر اس کے خطبے پڑھے جاتے تھے۔ اور اس کے فرمانرواؤں کے نام سکوں پر کندہ ہوتے تھے۔

سلجوقیوں کے حالات اور تاریخ ان کی اصل ترکان خزر ہیں۔ یہ شاہانِ ترک کی خدمت گزاری کرتے تھے۔ ان کا جد سلجوق جب

---

[1] ۴۲۲ھ تا ۴۶۷ھ (۱۰۳۱ء تا ۱۰۷۴ء)

نشوونما پا رہا تھا تو نجابت کی علامتیں اس پر جھلکتی تھیں اور اس کی حرکتوں سے سعادت مندی کے آثار نمایاں ہوتے تھے۔ اس لیے ترک فرمانروا نے اسے اپنا مقرب خاص بنا لیا اور اسے "شباشی" کا لقب دیا۔ جس کے معنی اس کی زبان میں "قائد جیش" کے ہیں۔ سلجوق اپنی بلند ہمتی سے ابھرتا رہا۔ اپنی فیاضی اور عقل سے لوگوں کے قلوب کو مسخر کرتا رہا۔ اور تمام بڑے لوگ اس کے مطیع ہو گئے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ شاہ ترک سے اس کی زوجہ نے کہا کہ میں یہ محسوس کرتی ہوں کہ سلجوق آپ پر غالب آتا جا رہا ہے میری رائے ہے کہ آپ اسے قتل کرا دیں، کیونکہ لوگوں کا میلان اس کی طرف بہت ہو گیا ہے۔

اس نے جواب دیا: میں غور کروں گا کہ اس کے بارے میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔

اس کے بعد سلجوق اس کے ارادے کو بھانپ گیا۔ اور شاہ کے بدلے ہوئے رُخ کو محسوس کر لیا۔ اس لیے اس نے اپنے خاندان والوں کو اور اپنے پیروؤں کو اکٹھا کر کے ان سے حلف لیا اور اس حلف میں اپنے دوسرے فرمانبرداروں کو بھی شریک کر لیا۔ اس طرح وہ "غز" کا سب سے بڑا کمانڈر بن گیا۔ اور وہاں سے سب لوگوں کو لے کر ترک مملکت سے فرار ہو گیا۔ اور اسلامی مملکت میں جا پہنچا یہاں آ کر اس نے اپنے اسلام کو ظاہر کیا تاکہ مسلمان اس کے مددگار بن جائیں اور اُسے چراگاہیں اور ٹھکانے مہیا کر دیں۔ وہ اپنے فوجیوں کے ساتھ مقیم ہو گیا اور اپنے قرب و جوار کے ترک قبائل پر حملے شروع کر دیے۔ شاہ ترک ان سرحدی علاقوں سے خراج وصول کیا کرتا تھا سلجوق نے اسے بند کرا دیا۔ اور شاہی محصلوں کو نکال باہر کیا۔ سلجوق جب مرا تو اس کی عمر سو سال کی تھی۔ اس کے بعد اس کی اولاد قوت، نعمت اور حکومت میں خوب پھولی پھلی۔ اور جس عجمی علاقے کو کمزور پایا اس پر اپنا قبضہ جما لیا۔ ان کی شوکت اسی طرح بڑھتی گئی یہاں تک کہ طغرل بے ملکِ عجم کے ایک حصّے کا فرمانروا بن گیا۔

یہ پہلا سلجوقی فرمانروا ہے اس کی قوت بڑھتی گئی۔ اور ادھر "بساسیری" بغداد

پر قابض ہو گیا۔ وہاں خوب لوٹ مار اور خوں ریزی کی۔ خلیفہ قائم کو باہر نکال کر نئے قلعے میں قید کر دیا۔ بساسیری کا فتنہ بڑا زبردست تھا اس لیے خلیفہ نے سلطان طغرل بے کو لکھا کہ بغداد آئے اور بساسیری کے مقابلے میں اس کی امداد کرے۔ طغرل بے اپنا لشکر لے کر بغداد پہنچا جب بساسیری کو طغرل بے کی اطلاع ہوئی تو وہ بے بس ہو گیا اور بغداد چھوڑ کر بھاگا۔ طغرل بے بغداد میں داخل ہوا۔ اور خلیفہ کی حکومت کی رونق از سرِ نو لوٹ آئی۔ بغداد کے منبروں پر سلطان کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ یہ پہلا موقع تھا جب کہ دار الخلافہ میں سلطان کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔

سلجوقیوں کا انجام، قائم کی وفات

سلجوقیوں کا انجام یہ ہوا کہ ان کی شوکت رفتہ رفتہ گھٹتی گئی۔ یہاں تک کہ ناصر کے زمانے میں ان کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔

یہ سنہ ۵۹۰ھ کا واقعہ ہے۔ قائم سنہ ۴۶۷ھ میں راہیِ ملکِ عدم ہوا۔

مقتدی بامر اللہ[۱]

قوی نفس، عالی ہمّت، باحوصلہ

مقتدی کے اصلاحات

مقتدی بامر اللہ لقب۔ ابو القاسم کنیت، عبد اللہ بن محمد بن قائم بامر اللہ بن قادر باللہ نام تھا۔ قائم بامر اللہ کی زندگی میں اس کے بیٹے عبد اللہ نے انتقال کیا۔ اور عبد اللہ کے انتقال کے چھ ماہ بعد مقتدی بامر اللہ پیدا ہوا۔ اس کی والدہ کا نام ارجوان تھا جو محمد بن قائم کی باندی تھی۔ قائم کے زمانے ہی میں اسے ولیعہد بنایا گیا تھا جس کے انتقال کے بعد اس نے ۱۹ سال۔ تین ماہ خلافت کی۔ اس کی بیعت شعبان ۴۶۷ھ میں ہوئی۔ بیعت کے وقت شیخ ابو اسحٰق شیرازی، ابن صباغ دامغانی بھی موجود تھے۔

بزمانۂ مقتدی شہروں میں عام طور پر اچھائیاں اور نیکیاں ظہور میں آئیں۔ قواعد خلافت و انتظام مملکت شگفتہ ہوئے۔ اور حرمت خلافت گزشتہ کے برعکس ترقی پذیر اور بلند و بالا تھی۔ مقتدی نے بغداد میں ترنم ریزی اور گانا بجانا موقوف کیا، چکلے بند کرائے، حمام میں بغیر لنگی باندھے غسل کرنے کی ممانعت کی، حمام سے کبوتر خانے نکلوا دیے تاکہ غسل کرنے والوں کو تکلیف نہ پہنچے، وہ مذہبی طور پر بلند کردار، قوی نفس، عالی ہمّت اور بنو عباس کا شریف خاندانی

[۱] ۴۶۷ تا ۴۸۷ھ (۱۰۷۴-۱۰۹۴ء)

فرد تھا۔

عہدِ مقتدی کے خصوصیات ۱: مقتدی کی خلافت کے پہلے ہی سال ۴۶۷ھ سے مکہ معظمہ میں عبیدیوں کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔

۲: اسی سال وزیر اعظم نظام الملک نے نجومیوں کو طلب کیا جنھوں نے نقطہ برج حمل کے آغاز ہی کو نوروز مقرر کیا۔ حالانکہ گزشتہ زمانے میں دستور تھا کہ نصف برج حوت میں آفتاب کے داخل ہونے کے بعد نوروز مانا جاتا تھا۔ اور نظامی تقویم (جنتری) ہی اصل و مبدار تقاویم ہے۔ جو آب تک جاری ہے۔

۳: ۴۶۸ھ میں مقتدی کے نام کا خطبہ دمشق میں پڑھا گیا۔ اذان سے اضافہ شدہ جملہ حی علیٰ خیر العمل خارج کر دیا گیا۔

۴: ۴۶۹ھ میں ابو نصر بن استاذ ابو القاسم قشیری نے بغداد میں داخل ہو کر مدرسہ نظامیہ میں ایک تقریر کی جس میں تمام دلائل وغیرہ مذہب اشعریہ کے بیان کیے اس لیے حنبلیوں کو طیش آیا اور ایک نیا فتنہ کھڑا ہو گیا۔ دونوں جماعتوں کے اکثریتی افراد میں تعصب کی بنا پر فساد برپا ہوا۔ اور اکثر لوگ قتل کیے گئے۔ پھر فخر الدولہ بن جہیر کو وزارت سے معزول کیا گیا۔ کیونکہ وہ متعصب حنبلی تھا۔

۵: ۴۷۵ھ میں خلیفہ نے سلطان ملک شاہ اتابک بن الپ ارسلان کے پاس اپنے قاصد ابو اسحٰق شیرازی کے ذریعے عمید ابو الفتح کی شکایتیں لکھ بھیجیں۔

۶: ۴۷۶ھ میں تمام ممالک سے قحط دور ہو گیا اور غلہ وغیرہ ارزاں ہو گیا۔

۷: ۴۷۷ھ میں سلیمان بن قلمتش سلجوقی شہریار قونیہ و اقصرا اپنی فوج کے ساتھ شام کی جانب متوجہ ہوا۔ اور رومی شہنشاہیت کے مقبوضہ شہر انطاکیہ کو فتح کیا۔ یہ شہر انطاکیہ ۳۵۸ھ سے رومی مقبوضہ تھا۔ انطاکیہ کی فتح پر ملک شاہ اتابک نے سلیمان بن قلمتش کے اسلامی قبضے کی سلطان کو مبارک باد دی۔

۸: ۴۷۹ھ میں یوسف بن تاشفین والی سبتہ و مراقش نے خلیفہ مقتدی بامر اللہ سے درخواست کی کہ جو ممالک بحالت موجودہ میرے مقبوضہ ہیں ان کا مجھے بادشاہ بنا دیا جائے۔

چنانچہ خلیفہ نے اس کی یہ درخواست منظور کرتے ہوئے اس کو خلعت پرچم اور شمشیر عنایت کرتے ہوئے امیر المسلمین کا لقب بھی دیا جس سے وہ اور تمام فقہائے مغرب بہت زیادہ مسرور ہوئے۔ یوسف بن تاشفین ہی وہ شخص ہے جس نے مراقش کی بنیاد رکھی اور اسے شہر مراقش بنایا۔

۹: اسی سال ملک شاہ پہلی مرتبہ بغداد میں آکر قیام پذیر ہوا۔ اس نے خلیفہ کے ساتھ دوستانہ طور پر چوگان کھیلا پھر یہ اصفہان واپس چلا گیا۔

۱۰: اسی سال حرمین کے اندر خطبے سے عبیدیوں کا نام خارج کر کے مقتدی کا نام پڑھا جانے لگا۔

۱۱: ۴۸۱ھ میں مؤید ابراہیم بن مسعود بن محمود بن سبکتگین والیٔ غزنہ نے انتقال کیا اور اس کے بجائے اس کا فرزند جلال الدین مسعود تخت نشین ہوا۔

۱۲: ۴۸۳ھ میں بغداد کے باب ابرز میں تاج الملک مستوفی الدولہ نے ایک مدرسہ قائم کیا جس میں ابوبکر شاشی تعلیم دیا کرتے تھے۔

۱۳: ۴۸۴ھ میں تمام جزائر صقلیہ پر فرنگیوں نے قبضہ کیا، حالانکہ یہ وہ جزیرے ہیں جنھیں ۲۰۰ھ میں مسلمانوں نے فتح کیا تھا اور اب تک مسلمانوں کے مقبوضہ تھے اور جن پر عرصے تک آلِ اغلب منجانب خلیفہ حکمراں رہے تھے۔ یہ جزیرے عبیدی مہدی کے قبضے سے فرنگیوں نے چھین لیے تھے۔

۱۴: اسی سال ملک شاہ نے بغداد آکر ایک عالی شان جامع مسجد تعمیر کرا کے اس کے اطراف شاہی محل بنوائے اور پھر اصفہان واپس ہو گیا۔

مقتدی کا انتقال

۴۸۷ھ میں مقتدی نے اچانک انتقال کیا۔ بعض کہتے ہیں کہ خلیفہ کی لونڈی شمس النہار نے خلیفہ کو زہر دیا۔ اور مقتدی کے فرزند مستظہر ولیعہد کو خلیفہ بنایا گیا۔

مستظہر باللہ[1]

نرم خو، خوش اخلاق اور عالم و فاضل

علماء کا دوست صلحاء کا مخلص

مستظہر باللہ لقب، ابو العباس کنیت احمد بن مقتدی، بن محمد بن قائم بامر اللہ نام، ماہ شوال سنہ ۴۷۰ھ میں پیدا ہوا، والد کے انتقال کے فوراً بعد ۱۶ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔

ابن زبیر کا بیان ہے کہ مستظہر حد درجہ نرم خو، خوش اخلاق، عالم و فاضل، جوانمرد، سخی، علماء کا دوست اور صلحاء کا مخلص تھا۔

عہدِ مستظہر باللہ کے قابلِ ذکر واقعات

سنہ ۴۸۷ھ یعنی خلافت کے پہلے ہی سال مستنصر عبیدی شاہ مصر نے انتقال کیا۔ جس پر اس کا فرزند مستعلی احمد تخت نشین ہوا، اور رومیوں نے بلنسیہ پر قبضہ کیا۔

۲: سنہ ۴۹۰ھ میں سلطان ارسلان ارغون بن الپ ارسلان سلجوقی قتل ہوا۔ جس کی

---

[1]: ۴۸۷ھ تا ۵۱۵ھ (۱۰۹۴ء تا ۱۱۱۸ء)

جگہ سلطان برکیاروق بادشاہ ہوا۔

۳: اس سال حلب، انطاکیہ، معرۃ و شیراز میں ایک ماہ تک عبیدیوں کا نام خطبے میں پڑھا گیا لیکن پھر عباسیوں کا نام خطبے میں لیا جانے لگا۔

۴: ۴۹۲ھ میں اصفہان کے اندر باطنی فرقے کا زور رہا۔

۵: اسی سال عیسائیوں نے بیت المقدس پر قبضہ کیا جہاں ڈیڑھ ماہ تک وہ پڑاؤ ڈالے رہے۔ اس جنگ میں ستر ہزار عالم، عبادت گزار اور زاہد قتل کیے گئے عبادت گاہوں کو منہدم کیا۔ یہودیوں کو ایک عبادت خانہ میں بند کر کے زندہ جلا دیا کچھ لوگ بچ بچا کر بغداد پہنچے اور انھوں نے جو باتیں بیان کیں ان پر آنکھیں گریاں ہیں اس غدر میں بادشاہ و امراء وغیرہ کہیں چلے گئے۔ ابی وردی شاعر نے بھی ان تمام واقعات کو نظم کیا ہے۔

۶: اسی سال یعنی ۴۹۲ھ میں محمد بن ملک شاہ نے اپنے بھائی برکیاروق پر حملہ کیا۔ اور فتح یاب ہوا۔ اس موقع پر خلیفۂ وقت مستظہر نے محمد بن ملک شاہ کو خلعت و غیاث دنیا و دین کا لقب دیا۔ بغداد میں اس کا نام خطبوں میں پڑھا جانے لگا۔ اس کے بعد پھر ان دونوں بھائیوں کے درمیان کئی مرتبہ لڑائیاں ہوئیں۔

۷: ۴۹۴ھ میں فرقۂ باطنیہ نے عراق میں قوت حاصل کی اور اکثر لوگوں کو تہ تیغ کیا۔ سخت معرکہ آرائی ہوئی اور اسی خانہ جنگی میں رویانی صاحب البحر بھی قتل کیے گئے۔ قتل کے خوف سے امراء عام طور پر لباس کے نیچے زرہ پہنے رہتے تھے۔

۸: ۴۹۵ھ میں مستعلی بادشاہ مصر نے انتقال کیا اور اس کا پانچ سالہ لڑکا منصور آمر باحکام اللہ تخت نشین ہوا۔

۹: ۴۹۶ھ میں سلطان کے مقابلے میں فتنہ انگیزیاں ہوئیں۔ سلطان کا نام خطبے میں سے نکال کر صرف خلیفہ مستظہر باللہ کا نام پڑھا جاتا رہا۔

۱۰: ۴۹۷ھ میں سلطان محمد بن ملک شاہ اور سلطان برکیاروق میں باہم صلح ہو گئی دونوں عرصے تک میدان قتال میں سرگرم رہے۔ طرفین کے ممالک وغیرہ میں فتنہ و

فساد ہوتا رہا۔ دولت و مال برباد ہوا۔ خوب خوں ریزی ہوئی، آبادیاں ویران ہوگئیں حکومت پر لوگوں نے دست درازی کی مغلوب و شکست خوردہ والیانِ ریاست طرح طرح سے نت نئے ظلم و قہر ڈھانے لگے۔ ان تمام ویرانیوں کے پیشِ نظر چند عقلمندوں نے ان دونوں سلاطین کے درمیان صلح صفائی کرادی اور صلحنامہ بشمول حلف و اقرار مرتب ہوا۔ اس صلح پر خلیفہ نے برکیارق کو خلعت مرحمت فرمائی بعد اس کا نام بغداد کے خطبوں میں پڑھائے جانے کا حکم دیا۔

۱۱: ۴۹۸ھ میں سلطان برکیارق کے انتقال پر امراء نے اس کے پانچ سالہ فرزند جلال الدولہ ملک شاہ کو اس کا قائم مقام بنایا۔ خلیفہ نے اسے شمشیر عنایت کی اور اس کا نام خطبے میں پڑھا جانے لگا۔

۱۲: ۴۹۹ھ میں نہاوند کے علاقے میں ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ اکثر لوگوں نے اسے نبی تسلیم کیا لیکن آخرکار گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔

۱۳: ۵۰۰ھ میں وہ قلعہ جس پر باطنی قابض تھے سلطان محمد بن ملک شاہ نے منہدم کرادیا۔ تمام باطنیوں کو تہ تیغ کیا۔

۱۴: ۵۰۱ھ میں سرائے کا کرایہ وغیرہ اور شہری ٹیکس معاف کیے۔ اس پر باشندگانِ بغداد نے دعائیں دیں۔ اور لوگوں کے ساتھ مزید عدل و انصاف سے کام لیا گیا۔

۱۵: ۵۰۲ھ میں فرقہ باطنیہ نے پھر سر اٹھایا اور شیراز پر اچانک حملہ کر کے اس کے قلعہ وغیرہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ لوگوں نے اپنے اپنے گھروں کے دروازے بند کر لیے۔ اس افراتفری میں اکثر لوگوں کو باطنیوں نے پکڑ کر تہ تیغ کیا۔ اسی ہڑ لونگ میں باطنیوں نے شیخ شافعیہ امام رؤیانی صاحب البحر کو بھی بغداد میں شہید کیا۔ اور یہ معرکہ ایسے وقت ہوا جب کہ والئ شیراز بغرض سیر و تفریح باہر گیا ہوا تھا۔

مستظہر باللہ کا انتقال

خلیفہ مستظہر باللہ نے بدھ کے دن ۲۳۔ ربیع الاوّل ۵۱۲ھ کو ۲۵ سال خلافت کے بعد انتقال کیا، ابنِ عقیل شیخ حنابلہ نے غسل دیا اور مسترشد بن مستظہر نے نماز جنازہ پڑھائی۔ پھر تھوڑے ہی عرصے بعد مستظہر کی دادی "ارجوان" جو مقتدی بامر اللہ کی والدہ تھی فوت ہوئی۔

ذہبی کا بیان ہے "خلیفہ مستظہر کی دادی ہی وہ یکتا خاتون ہے جس نے اپنے بیٹے پوتے اور پڑپوتے کو اپنی زندگی میں تختِ خلافت پر جلوہ فگن دیکھا۔

مستظہر کی علمی قابلیت

مستظہر شاعر بھی تھا۔ صارم بطائحی مشہور شاعر و عالم نے بھی اس کی تعریف کی ہے۔

مستظہر میں اکثر ذاتی خوبیاں تھیں وہ حسنِ سلوک کے ساتھ ساتھ انعام واکرام اور بخشش بھی کرتا۔ دشمنوں سے سینہ سپر ہوتا اور لوگوں کو منصب جاگیریں اور خلعتیں وغیرہ بھی دیا کرتا تھا۔

مسترشد باللہ[1]

باطنیوں کے ہاتھوں خلیفۂ وقت کا قتل

صاحبِ علم و فضل مسترشد بڑا فاضل آدمی تھا۔ جب اس کی بیعتِ خلافت ہوئی تو اس کا بھائی امیر ابوالحسن بھاگ کر روپوش ہو گیا۔ اور مقام حلّہ میں دبیس بن صدقہ کے پاس پناہ لینے پہنچ گیا۔

مفرور بھائی کی تلاش و جستجو مسترشد باللہ کو معلوم ہوا کہ وہ دبیس کے پاس ہے تو اسے بڑا رنج ہوا۔ اور اُسے خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں اس کی طرف سے کوئی خاص حادثہ پیش نہ آجائے۔ لہٰذا اس نے نقیبوں کے نقیب علی بن طراد زینبی کو اپنی مہر اور امان نامے کے ساتھ حلّے بھیجا اور اسے حکم دیا کہ پہلے دبیس سے بیعت لی جائے۔ اس کے بعد امیر ابوالحسن کو حوالے کرنے کا مطالبہ کیا جائے۔ دبیس نے کہا کہ امیر المومنین کے حکم کے مطابق بیعت تو بسر و چشم کروں گا اور اس نے بیعت کر بھی لی۔ لیکن کہا کہ اپنی پناہ میں آئے ہوئے شخص کو

---

[1]: ۵۱۲ھ تا ۵۲۹ھ (۱۱۱۸ء تا ۱۱۳۴ء)

کسی کے حوالے نہیں کروں گا۔ بخدا میں اسے تمھارے حوالے نہیں کروں گا۔ کیونکہ وہ میری پناہ میں ہے اور میرا مہمان ہے۔ اس کی حفاظت میں قتل بھی کر دیا جاؤں تو مجھے منظور ہے۔

امیر ابو الحسن نے بھی نقیب کے ساتھ اپنے بھائی کے پاس جانے سے انکار کر دیا اس لیے نقیب تنہا ہی واپس گیا۔ اس کے بعد مسترشد نے اس پر قابو پا لیا اور اسے اپنے ایک محل میں قید کر کے اچھی حالت میں رکھا۔

خلیفہ اور سلطان مسعود میں ان بن

پھر خلیفہ اور مسعود کے درمیان کچھ ان بن پیدا ہو گئی۔ اور بات یہاں تک بڑھی کہ نوبت جنگ تک پہنچ گئی۔ خلیفہ مسترشد فوج اور ارکانِ حکومت کو ساتھ لے کر اُدھر متوجہ ہوا اور ادھر مسعود نے مقابلے کی تیاری کر لی۔ جب سامنا ہوا اور میدانِ کارزار گرم ہوا۔ تو مسترشد کی فوج نے شکست کھائی۔ اور سلطان مسعود غالب آ گیا اس کی فوج نے بے شمار مال و دولت حاصل کیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جن صندوقوں میں چالیس لاکھ دینار تھے وہ ایک سو ستر خچروں پر لادے گئے تھے۔ اور پانچ سو اونٹوں پر دوسرے سامان تھے جن میں دس ہزار عمامے، دس ہزار جبے اور دس ہزار قبائیں تھیں اور یہ سب اعلیٰ درجے کے کپڑے تھے۔ یہ سب کپڑے اس لیے تیار کیے گئے تھے کہ اگر فتح ہوئی تو وہ بطور انعام تقسیم کیے جائیں گے۔

کہتے ہیں کہ یہ سارا لوٹ کا مال ایک کروڑ دینار کی قیمت کے برابر تھا۔ مسعود نے خونریزی کی سخت ممانعت کر دی تھی۔ صرف یہ کیا کہ خلیفہ کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے قلعے میں پہنچا دیا۔ اس کے لیے ایک الگ خیمہ نصب کرا دیا اور ایک جماعت کو وہاں نگرانی کے لیے مقرر کر دیا۔

باطنیوں نے خلیفہ کو قتل کر دیا

اس کے بعد مسعود خلیفہ کو لے کر مراغہ پہنچا۔ وہاں اسے سلطان سنجری کا خط ملا جس میں یہ حکم تھا کہ خلیفہ کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کیا جائے۔ اُسے عزت و احترام کے ساتھ بغداد واپس پہنچا

دیا جائے، ہر بات کی پوری تصدیق کی جائے اس کا سارا مال و اسباب واپس کر دیا جائے۔ اور اس سے جتنے خدام، سواریاں اور دوسرے اسباب لیے گئے ہیں ان سے زیادہ اور بہتر شکل میں تمام چیزیں واپس کر دی جائیں۔ اور مکمل ساز و سامان کے ساتھ اسے بغداد پہنچا دیا جائے۔ مسعود نے اس حکم کی پوری پوری تعمیل کی۔ اور خلیفہ کو بغداد واپس بھیجنے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن سوئے اتفاق کہیے کہ مسعود اور فوج سے غفلت ہو گئی اور باطنیہ کی ایک جماعت نے مسترشد پر حملہ بول دیا۔ اور اس کے خیمے میں گھس کر اسے چھریوں سے زخمی کر دیا۔ یہ خیمہ مراغہ سے صرف ایک فرسخ کے فاصلے پر تھا۔ ان باطنیوں نے مسترشد کے بہت سے ساتھیوں کو بھی قتل کر دیا۔ جب مسعود کو یہ قصہ معلوم ہوا تو وہ فریاد کرتا ہوا پریشانی کی حالت میں سوار ہو کر ادھر روانہ ہو گیا۔ حملہ آوروں کو گرفتار کر کے قتل کرا دیا اور مسترشد کو علماء اور امراء کی موجودگی میں مراغہ میں لا کر دفن کر دیا گیا۔ اس کی قبر اب تک وہیں ہے۔

مسترشد کے قتل کے اسباب مسترشد کے قتل کے بارے میں اختلاف ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ مسعود کو نہ اس کا علم تھا اور نہ اس میں اس کی رضا تھی۔ اور کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ مسعود ہی نے سازش کر کے باطنیوں کو اس کے قتل پر اکسایا تھا۔ کیونکہ اسے خطرہ تھا کہ کہیں یہ خلیفہ پھر ہمت کر کے فوجیں اکٹھی نہ کر لے۔ مسعود کے لیے علانیہ قتل کرنا ممکن نہ تھا اس لیے بظاہر تو بڑا اعلیٰ سلوک کیا لیکن اسے اندر سے قتل کرانے کا سامان کیا اور چند دوسرے جرائم پیشہ لوگوں کو پکڑ کر قتل کرا دیا اور لوگوں کو یہ یقین دلا دیا کہ خلیفہ کے قاتلوں کو قتل کیا جا رہا ہے اور اصل قاتلوں کو رہا کر دیا۔ یہ واقعہ ۵۲۹ھ کا ہے۔

راشد باللہ[1]

قاضیٔ شہر کا فتویٰ خلیفۂ وقت کے خلاف اور اس کا قتل

راشد کی معزولی راشد باللہ بن مسترشد باللہ ۵۰۲ھ میں ایک ام ولد کے بطن سے پیدا ہوا۔ راشد باللہ جب بغداد میں تخت نشین ہوا تو سلطان مسعود موجود نہ تھا۔ راشد باللہ کے نام کا خطبہ شہروں میں پڑھا گیا۔ راشد باللہ نے تخت نشین ہونے کے بعد لوگوں سے مال و دولت لینے میں کسی قدر ظلم و زیادتی سے کام لیا۔ سلطان مسعود کو لوگوں نے شکایات لکھ کر بھیجیں۔ سلطان مسعود بغداد کی طرف روانہ ہوا۔

سلطان مسعود کے بغداد کی طرف آنے کی خبر سن کر راشد باللہ موصل کی طرف چلا گیا۔ سلطان مسعود نے بغداد میں داخل ہو کر ایک محضر تیار کرایا اس میں بہت سے لوگوں کی شہادت قلم بند کی گئی۔ جنھوں نے بیان کیا تھا کہ راشد نے فلاں فلاں آدمیوں پر ظلم کیا، زبردستی مال چھینا، خونریزی کی اور شراب بھی پی۔ یہ محضر فقہاء و قضاۃ کی خدمت میں پیش کر کے استفتا کیا گیا کہ خلیفہ اگر ایسے حرکات کا مرتکب ہو تو نائب السلطنت کو اس کی معزولی کا اختیار ہے یا نہیں؟ اس پر قاضیٔ شہر نے فتویٰ لکھ دیا کہ نائب السلطنت ایسے خلیفہ کو معزول کر سکتا ہے چنانچہ سلطان

---

[1] ۵۲۹ھ تا ۵۳۰ھ (۱۱۳۴ - ۱۱۳۵ء)

مسعود نے راشد باللہ کے چچا محمد بن مستظہر کو تخت خلافت پر بٹھا کر بیعت کر لی اور راشد کی معزولی کا اعلان کر دیا۔ یہ واقعہ ۱۶ ذی قعدہ کا ہے۔

راشد کی خلافت ایک سال رہی۔ محمد بن مستظہر نے تختِ خلافت پر بیٹھ کر اپنا لقب مقتفی لِامر اللہ تجویز کیا۔

راشد کو جب اپنے معزول ہونے کا حال معلوم ہوا تو وہ موصل سے بلاد آذربائیجان کی طرف چلا گیا اور اپنے لشکریوں میں مال و دولت تقسیم کیا آذربائیجان کے شہروں کو برباد کیا۔ وہاں سے ہمدان آیا یہاں بھی خوب فتنہ و فساد برپا کیا۔ لوگوں کو پکڑ کر سولی چڑھایا، قتل کیا، علماء کی داڑھیاں منڈوائیں پھر اصفہان پہنچ کر اس کا محاصرہ کیا۔ اسی اثناء میں بیمار پڑا اور ۱۶ رمضان ۵۳۲ھ کو بعض عجمیوں نے آکر چھریوں سے اُسے قتل کر ڈالا۔ بغداد میں راشد کے قتل ہونے کی خبر پہنچی تو اس کے ماتم میں ایک دن کے لیے دفاتر بند کیے گئے۔

چادر اور عصا مرتے وقت راشد کے پاس تھے، اس کے قتل ہونے پر یہ دونوں چیزیں مقتفی کے پاس بغداد پہنچا دی گئیں۔

مقتفی لامر اللہ[1]

نئے خلیفہ کی شرط راشد کی معزولی کا واقعہ بالکل غیر متوقع پیش آیا تھا۔ اس وقت تک اس نے کسی کو ولیعہد نہیں بنایا تھا۔ سلطان مسعود نے اس کی معزولی کے بعد امرار کے مشورے سے اس کے چچا ابو عبد اللہ محمد بن مستظہر الملقب بہ مقتفی لامر اللہ کو جو خاندان میں سب میں ممتاز تھا عہد و پیمان لے کر خلیفہ بنایا اور ایک دوسرے کے حقوق و فرائض کی بھی تعیین کر دی۔ سلطان کو مسترشد اور راشد کی آزادی کا تجربہ ہو چکا تھا اس لیے آئندہ اس قسم کے خطرات سے بچنے کے لیے یہ شرط بھی کر لی کہ ابو عبد اللہ دار الخلافہ میں سفر اور نقل و حرکت کا کوئی سامان نہ رکھے گا۔ ذی الحجہ ۵۳۰ھ میں ابو عبد اللہ تختِ خلافت پر بیٹھا اور مقتفی لامر اللہ لقب اختیار کیا۔ اس وقت چالیس سال کی عمر تھی۔

سیوطی کا بیان ہے کہ مسعود نے دار الخلافہ کے تمام جانوروں، اثاث البیت طلائی و نقرئی سامانوں، خیمہ و خرگاہ، سراپردۂ شاہی وغیرہ پر قبضہ کر لیا۔ اور چار گھوڑوں، آٹھ خچروں اور مقتفی کے خالصہ کے علاوہ کوئی چیز اس کے پاس نہ رہنے دی۔ پھر چند دنوں

---

[1] ۵۳۰ھ تا ۵۵۵ھ (۱۱۳۵ء تا ۱۱۶۰ء)

کے بعد اس سے ایک لاکھ دینار کا مطالبہ کیا۔ مقتفی نے اس کے جواب میں کہلا بھیجا کہ تمھارا یہ مطالبہ کس قدر حیرت انگیز ہے، تم کو معلوم ہے کہ مسترشد تمھارے مقابلے میں جاتے وقت خزانہ لیتا گیا تھا۔ اس کے ساتھ جو بیش آیا وہ معلوم ہے اس سے جو بچ رہا تھا وہ راشد ساتھ لے گیا تھا اس کا حشر بھی نگاہوں کے سامنے ہے اس کے بعد دار الخلافہ میں صرف ساز و سامان باقی رہ گیا تھا، اس پر تم نے قبضہ کر لیا۔ ٹکسال، تبرکات اور جوالی کی آمدنی تک تم نے لے لی، اب میرے پاس کیا ہے جو تمھاری فرمائش پوری کی جائے۔ صرف یہی ایک صورت باقی رہ گئی ہے کہ دار الخلافہ تمھارے حوالے کر کے کہیں چلا جاؤں۔ یہ میں نے عہد کر لیا ہے کہ مسلمانوں سے ایک حبہ بھی جور و ظلم سے نہ لوں گا۔ یہ جواب سن کر سلطان نے اسے چھوڑ دیا اور اس کے بجائے بغداد کے صاحب جائداد امراء اور تاجروں سے روپیہ وصول کیا۔

مقتفی کے اوصاف و کمالات

مقتفی نہایت دلیر، عالی دماغ اور باجبروت خلیفہ تھا۔ اس لیے سلطان نے اس پر جو پابندیاں عائد کی تھیں وہ اس کی راہ میں حائل نہ ہو سکیں۔ اور رفتہ رفتہ اس نے اپنے تدبر سے خلافتِ بغداد میں سلجوقیوں کی مداخلت بالکل ختم کر دی۔ اور اس کی تخت نشینی کے چند ہی دنوں بعد سلطان مسعود کو خلافت کا نظام اور تبرکات کی آمدنی اس کے حوالے کر دینی پڑی۔

خلیفہ مقتفی باللہ کی وفات

ربیع الاول ۵۵۵ھ میں خلیفہ مقتفی باللہ کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت اس کی عمر ۶۶ سال تھی۔ مدتِ خلافت ۲۴ سال ۳ ماہ۔

مقتفی کی سیرت و شخصیت

مقتفی جامع کمالات خلیفہ تھا، تدبیر و سیاست شجاعت و شہامت، علم و عمل، زہد و تقویٰ، اخلاق و شرافت میں یکتا تھا۔ اس کے پیشروؤں نے جس مہم کا آغاز کیا تھا مقتفی نے اس کو انجام تک پہنچایا۔ اور عراق سے سلجوقیوں کا اقتدار ختم کر کے خلافتِ بغداد کو

ان کے اثر سے بالکل آزاد کر دیا۔

اس کو زمانہ بھی ایسا ملا تھا جب سلجوقیوں کی قوت ختم ہو چکی تھی۔ گو سلطان مسعود کے زمانے میں سلجوقی حکومت کا ظاہری ٹھاٹھ اور سطوت قائم تھی۔ لیکن خانہ جنگی نے ان کی قوت ختم کر دی تھی۔ سلجوقی حکومت کا نظام بگڑ گیا تھا خصوصاً غزوں کے ہاتھوں سلطان سنجر کی شکست اور خراسان کی تباہی سے سلجوقی خاندان کی عظمت و شان ختم ہو گئی تھی۔

اس نے شروع ہی سے سلطان مسعود کو اس کی حد سے آگے نہ بڑھنے دیا چنانچہ ۵۴۱ھ میں سلطان نے بغداد میں ٹکسال قائم کی مقتفی نے اس کے منتظم کو جس نے ٹکسال قائم کرنے کا مشورہ دیا تھا گرفتار کر لیا۔ سلطان نے اس کے جواب میں مقتفی کے حاجب کو گرفتار کر لیا اس نے سخت برہمی ظاہر کی اور تین دن تک مسجدیں بند کر دیں۔ اس کی یہ برہمی دیکھ کر سلطان مسعود کو مجبور ہو کر حاجب کو رہا کرنا پڑا۔

وہ بہ نفس نفیس لڑائیوں میں نکلتا تھا۔ اور عام سپاہیوں کے دوش بدوش لڑتا تھا۔ اس نے اپنے تمام مخالفین پر فوج کشی کر کے انھیں مغلوب کر لیا۔

اس کی اس شجاعت و حوصلہ مندی کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلافت بغداد سلجوقیوں کے پنجے سے بالکل آزاد ہو گئی۔ ابن اثیر کا بیان ہے کہ دیالمہ کی تولیت خلافت کے بعد مقتفی پہلا خلیفہ تھا جس نے عراق کو سلاطین کے اثر سے چھڑا کر آزاد حکومت قائم کی اور معتضد کی ایک مستثنیٰ مثال کے سوا مستنصر کے بعد وہ پہلا فرمانروا ہے جس کو خلافت بغداد پر اختیار و اقتدار حاصل ہوا اور فوج اور عمالان حکومت پر اس کی حکومت قائم ہوئی وہ شجاع و جری تھا، خود لڑائیوں میں نکلتا تھا۔ خبر رسانی کے شعبہ پر بے دریغ خرچ کرتا تھا۔ ملک کے کسی گوشہ کی خبر اس سے پوشیدہ نہ رہتی تھی۔

ابن سمعانی لکھتا ہے کہ مقتفی پسندیدہ سیرت اور حکومت میں کامیاب تھا اس میں عقل و دانش، علم و فضل، تدبیر و سیاست تمام باتیں جمع تھیں، اس نے معالم امامت کو زندہ اور رسوم خلافت کو مرتب و منظم کیا۔

علم دوست اور علماء نواز بھی تھا، حدیث نبویؐ سے خاص ذوق رکھتا تھا، علم کے

ساتھ وہ باعمل اور زاہد متورع تھا، خلافت سے پہلے اس کا سارا وقت عبادت و ریاضت، تلاوتِ قرآن اور علمی مشاغل میں گزرتا تھا۔

طبعاً بڑا نرم خو، حلیم الطبع اور نیک سیرت تھا۔ اس کا دور عدل و انصاف اور نیکیوں سے سرسبز و شاداب تھا۔

بہت سے ناکارہ حکمرانوں کے بعد کسی ایک ایسے حکمراں کا نمودار ہو جانا جو اپنے اخلاق و سیرت، کردار و خصائل اور عادات و افتادِ مزاج کے اعتبار سے نیک اور محبوب ہو بگڑے نظام کو مستحکم نہیں کر سکتا بہت سے اچھے اور کارگزار حکمرانوں کے بعد اگر کوئی ایک ناکارہ اور بدخو حکمراں آجاتا ہے تو نسلوں اور پشتوں کی محنت اکارت جاتی ہے۔ اسی طرح مسلسل کئی ناکام فرمانرواؤں کے بعد اگر کوئی خوش تدبیر حاکم رعایا کو میسّر آجائے تو رعایا کی یہ خوش نصیبی آخرکار عارضی ہی ثابت ہوتی ہے اس کے بعد پھر وہی دور شروع ہو جاتا ہے جو پہلے تھا۔

مستنجد باللہ[۱]

شورشوں اور بغاوتوں کا استیصال

علالت کی حالت میں قتل یہ خلیفہ ۴۵ سال کی عمر میں مسند آرائے خلافت ہوا۔ بگڑے ہوئے حالات کو سنبھالنے اور روبراہ کرنے کی بھی کوشش کی، لیکن حالات اتنے ابتر ہو چکے تھے کہ کامیاب نہ ہو سکا۔

مستنجد باللہ بن مقتفی لامر اللہ ماہ ربیع الثانی ۵۱۰ھ میں ایک گرجستانی ام ولد موسومہ طاؤس کے بطن سے پیدا ہوا۔ ۵۴۷ھ میں ولی عہد بنایا گیا۔ اور اپنے باپ کی وفات کے بعد ربیع الاول ۵۵۵ھ میں تخت خلافت پر بیٹھا۔ ۵۵۶ھ میں ترکمانوں، کردوں اور عربوں نے یکے بعد دیگرے بغاوت کی اور خلیفہ مستنجد نے ان بغاوتوں کو فرو کیا۔ مقام حلہ میں قبیلہ بنی اسد کی آبادی زیادہ تھی۔ ان لوگوں سے سرکشی کے آثار نمایاں ہوئے۔ اور ۵۵۸ھ میں خلیفہ نے تمام بنی اسد کے خلاف فوجیں روانہ کرکے ان کو عراق سے نکال دیا۔ ۵۵۹ھ میں واسط کے اندر بغاوت ہوئی، یہ بغاوت بھی فوجی قوت کی نمائش سے فرو کر دی گئی۔ ۵۶۰ھ میں خلیفہ کے وزیر عون الدین نے وفات پائی۔ ۵۶۳ھ میں مصر کے آخری فاطمی حاکم عاضد لدین اللہ کے وزیر شاور پر ابن سوار نامی ایک شخص نے غالب

۱۔ ۵۵۵ھ - ۵۶۶ھ (۱۱۶۰ء - ۱۱۷۰ء)

ہو کر اس کو مصر سے نکال دیا۔ شاور مصر سے ملک العادل نور الدین زنگی کے پاس آیا۔ نور الدین زنگی سلاطینِ سلجوقیہ کے سرداروں میں سے ایک سردار تھا۔ اس کے باپ عماد الدین زنگی کا اوپر ذکر آ چکا ہے۔ نور الدین محمود زنگی نے حلب و شام وغیرہ ممالک پر قبضہ کر رکھا تھا اور خلیفۂ بغداد کا فرمانبردار تھا۔ نور الدین محمود کے سرداروں میں نجم الدین ایوب (جس کا ذکر اوپر بھی آ چکا ہے) اور اس کا بیٹا صلاح الدین یوسف بن نجم الدین ایوب اور نجم الدین ایوب کا بھائی اسد الدین شیر کوہ معزز اور اعلیٰ عہدوں پر مامور تھے۔ ملک العادل نور الدین محمود نے امیر اسد الدین شیر کوہ کو دو ہزار سواروں کے ساتھ مصر کی طرف روانہ کیا۔ شیر کوہ نے ابن سوار کا کام تمام کیا مگر شاور نے ان وعدوں کو جو دربارِ نور الدین میں کر کے آیا تھا پورا نہ کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ فرانسیسی سواحل شام و مصر پر حملے کیا کرتے تھے۔ اور ساحلی مقامات پر قابض ہو گئے تھے شیر کوہ سے فرمائش کی گئی کہ ان عیسائیوں کو بھی ملک سے خارج کرو۔ شیر کوہ اور اس کے بھتیجے صلاح الدین نے فرنگیوں کو کئی مہینے کی لڑائیوں کے بعد مصر سے نکال دیا اور خود شام کی طرف چلا آیا۔

۵۶۶ھ میں فرانسیسیوں نے پھر مصر پر حملہ کیا۔ عاضد الدین اللہ نے پھر ملک العادل نور الدین محمود زنگی کی خدمت میں امداد و اعانت کی درخواست کی۔ نور الدین نے پھر شیر کوہ کو مع صلاح الدین مصر کی جانب روانہ کیا۔ فرانسیسی شیر کوہ کے آنے کی خبر سنتے ہی بھاگ گئے۔ اور عاضد دین اللہ نے شیر کوہ کو اپنا وزیر بنا کر اپنے پاس رکھ لیا۔ شاور نے علمِ بغاوت بلند کیا۔ شیر کوہ نے فوراً اس کا کام تمام کر دیا۔ اور اطمینان سے خدماتِ وزارت انجام دینے لگا۔ سال بھر کے بعد ۵۶۵ھ میں شیر کوہ کا مصر میں انتقال ہو گیا تو حاکمِ مصر عاضد دین اللہ نے شیر کوہ کے بھتیجے سلطان صلاح الدین یوسف کو وزارت کا عہدہ دیا۔ شیر کوہ اور صلاح الدین دونوں اپنے پرانے آقا سلطان نور الدین محمود کے بھی وفادار تھے۔ اس طرح شام اور مصر دونوں ملکوں کی اسلامی طاقت متحدہ طور پر عیسائیوں کے حملوں کی مدافعت پر متوجہ رہی۔ ادھر خلیفہ مستنجد باللہ کو بھی عراق کی تمام بغاوتوں کے فرو کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی اور خلیفہ کا اقتدار و رعب پورے طور پر قائم ہو گیا۔ ملک العادل نور الدین بھی خلیفہ مستنجد کا وفادار اور مستنجد کے ہر ایک حکم کی تعمیل کو تیار تھا۔ لہٰذا یہ زمانہ امن و امان اور آرام و

شام و مصر کے مسلمانوں کے لیے اطمینان کا زمانہ تھا۔ ۹۔ربیع الثانی ۵۶۶ھ میں خلیفہ مستنجد باللہ نے بیمار ہو کر وفات پائی۔

اسی خلیفہ کے عہد میں حضرت سیّد شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے وفات پائی۔

مستنجد کے بعد لوگوں نے اس کے بیٹے ابو محمد حسن کو تختِ خلافت پر بٹھا کر مستضئ بامر اللہ کا لقب دیا۔

لیکن الفخری نے اس کا سببِ وفات دوسرا بیان کیا ہے:

مستنجد حمام میں گلا گھونٹ کر مار ڈالا گیا۔ اعیانِ حکومت ہی نے اس کا گلا گھونٹا تھا جب کہ یہ ایک سخت مرض میں مبتلا ہو چکا تھا۔ اعیانِ حکومت کو درحقیقت اس سے اپنے بارے میں کچھ خطرات تھے۔ یہ واقعہ ۵۶۶ھ کا ہے۔

جب مستنجد کی بیعتِ خلافت ہوئی تو اس نے اپنے باپ کے وزیر یعنی ابن ہبیرہ ہی کو وزارت پر قائم رکھا۔

اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا محمد بن یحییٰ جس کا لقب عضد الدین تھا وزیر ہوا یہ بڑا فاضل اور اچھا قائد تھا سیادت کا شوقین بھی تھا شاعر اور مضمون آفریں تھا۔ ادب اور حدیث نبوی سے خوب باخبر تھا۔

مستضی بامر اللہؒ [1]

فاطمی حکومت کا خاتمہ

قسمت کا چکر کچھ عجیب طرح سے چل رہا تھا، ایک گیا، دوسرا آیا۔ لیکن جو گیا وہ بُری طرح گیا۔ جو آیا وہ بھی خوبی کے ساتھ کام نہ چلا سکا۔

الفخری کا بیان ہے کہ مستنجد کے قتل کے بعد عضد الدین نے اس کے بیٹے مستضی کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ مگر اس سے چند باتوں کا پختہ حلفیہ اقرار لے لیا۔ ایک یہ کہ وہ (عضد الدین) وزیر ہوگا۔ دوسرے اس کا فرزند استاذ الدار[2] ہوگا۔ تیسرے فلاں آدمی کمانڈر انچیف ہوگا۔ چوتھے فلاں اور فلاں کو فلاں فلاں عہدہ دیا جائے گا۔ مستضی نے یہ سب شرطیں مان لیں اور قسم بھی کھالی۔ اس کے بعد محل کے اندر اس کی خاص بیعت کی گئی۔ پھر ابن بلدی وزیر کو بیعت کے لیے طلب کیا گیا۔ جب وہ محل میں آیا تو اسے کسی دوسری جگہ لے جایا گیا۔ اور اس کی گردن مار دی گئی۔ وہاں سے اس کی لاش نکال کر نشست گاہ کے باہر کوڑے پر ڈال دی گئی۔ اس کے بعد گھسیٹ کر دریائے دجلہ میں پھینک دی گئی۔ ابن بلدی اچھی عادات اور پسندیدہ اخلاق کا تھا۔

۱؎ ۵۶۶ تا ۵۷۵ھ (۱۱۷۰-۱۱۷۹ء)

۲: وزیر محل۔

۵۶۶ھ میں مستضیٔ کی بیعت ہوئی۔ اس کی زندگی میں کوئی برائی نہ تھی۔ اسی کے عہد میں فتح مصر اور حکومت فاطمیہ کے خاتمے کی خبر بغداد پہنچی تھی۔ جب یہ تخت خلافت پر بیٹھا تو ابن بلدی کو قتل کرانے کا حکم اسی نے دیا۔ جو اس کے باپ کا وزیر تھا۔ مستضیٔ ۵۷۵ھ میں مرا۔

اس کا سب سے پہلا وزیر عضد الدین ابو الفرج محمد بن ابوالفتوح عبداللہ بن رئیس الرؤسا تھا۔ یہ مستنجد کے عہد میں استاذ الدار تھا۔ یہ بڑا ہی صاحب فضل اور خاص آدمی تھا۔ مستنجد کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کے بعد عضد الدین سب پر چھا گیا۔ مستضیٔ کو یہی قید سے باہر نکال لایا۔ اور اس کی بیعت کرائی۔ اور اس سے قسم لی اس لیے مستضیٔ نے اس کو وزیر بنایا۔ اس نے وزارت کے فرائض بڑی عمدگی سے انجام دیے۔ جس دن یہ وزارت کی گدّی پر بیٹھا اس دن اس نے زیارت گاہوں، مسجدوں، مدرسوں اور خانقاہوں کے رہنے والوں میں بہت سونا اور غلہ تقسیم کیا۔ تمام معاملات کو اس خوبصورتی سے سلجھاتا تھا کہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آسکے۔ اس کا گھرانہ قیادت میں مشہور تھا۔

عضد الدین کی معزولی

عضد الدین کی وزارت عمدگی سے چلتی رہی۔ آخر مستضیٔ نے اسے معزول کر دیا اور اُسے گرفتار کر لیا۔ اس کی معزولی کا واقعہ یوں ہے کہ ایک دن وہ اپنی وزارت کی گدّی پر بیٹھا تھا کہ خلیفہ کا ایک ملازم اس کی طرف لپکتا ہوا آیا۔ اور کہا: "اب تمھاری ضرورت نہیں رہی"۔ پھر اس کی دوات الٹ دی۔ پھر ترک اور فوجی اس کے گھر کے اندر گھس گئے۔ اور سب کچھ لوٹ لیا۔ عوام بھی ساتھ ہی گھس گئے۔ اور اس کے جو صندوق آبنوس اور ہاتھی دانت کے تھے اُن کو ہتھوڑے مار مار کر توڑ ڈالا۔ اور جو کچھ ان کے اندر تھا سب لے لیا۔ عضد الدین باہر آ کر یہ سارے تماشے دیکھتا رہا اور ترکوں سے مخاطب ہو کر کہتا رہا۔ تمھیں شرم نہیں آتی۔ تم میرے گھر کے اندر گھس کر میرا آذوقہ بھی کھا گئے۔ لیکن ان پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں اس کا گھر صفا چٹ میدان تھا۔ پھر اس کو لوگ زنان خانے میں لے گئے۔ جہاں ایک عرصے تک وہ قید رہا۔ اس کے بعد مستضیٔ نے

عضد الدین کی بحالی

اس کے بعد مستضئی نے اسے پھر وزیر بنا دیا۔ اور اختیارات دے کر اسے خوش کر دیا۔ اس کی دنیا اچھی ہو گئی، شان بلند ہو گئی اور اس کی خیرات اور بخششیں اور زیادہ ہو گئیں اور لوگوں کی نظروں میں محبوب ہو گیا۔ وہ بڑا سخی، داتا اور شریف مزاج تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے گھر کے لئے کبھی ایک ہزار دینار سے کم کی شکر نہیں خریدی۔

عضد الدین کا قتل

اس کی دوسری بار کی وزارت نہایت عمدگی سے چلتی رہی یہاں تک کہ اس کی عمر ڈھلنے لگی۔ اس نے خلیفہ سے حج کی اجازت مانگی جو مل گئی۔ اس نے حج کے لیے ایسا سامان کیا جو اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا اس نے مدینۃ السلام سے روانہ ہو کر غربی کنارے کو عبور کیا تاکہ حلّے اور کوفے سے ہوتا ہوا مکہ پہنچے۔ اس کے تمام ارکانِ حکومت موجود تھے۔ وہیں کے ایک محلے میں جسے "قطفتا" کہتے ہیں ایک شخص ملا، یکایک وہ ایک بڑی جست لگا کر کودا اور چھرے سے وزیر کے حلقوم پر ایک وار کیا۔ دوسرا دوسری طرف سے کود کر آیا اور اس کی کمر پر وار کیا۔ اور تیسرا بھی ایک ننگی چھری لئے ہوئے کودا مگر وہ پہنچ نہ سکا۔ اتنے میں، ہجوم نے تینوں کو پکڑ لیا اور وہیں قتل کر دیا۔ وزیر نے بھی دم توڑ دیا۔ نمازِ جنازہ کے بعد اسے ڈیکے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس کے تینوں قاتل فرقۂ باطنیہ کے کوہ سماق کے باشندے تھے۔

محلہ قطفتا کے ایک شخص کا بیان ہے کہ میں وزیر کے قتل ہونے سے دو گھنٹے پہلے محلے کی ایک مسجد میں گیا تو وہاں تین آدمیوں کو دیکھا، انھوں نے ایک کو محراب میں مُردے کی طرح لٹا دیا اور بقیہ دو نے اس کی نمازِ جنازہ ادا کی۔ پھر دوسرا لیٹ گیا اور دوسرے دو نے اس کی نماز پڑھی۔ اسی طرح ہر ایک کی نمازِ جنازہ دوسرے دو نے پڑھی۔ میں ان سب کو دیکھتا رہا۔ مگر انھوں نے مجھے نہیں دیکھا۔ مجھے ان کی اس حرکت پر بڑا تعجب تھا۔ جب وزیر کو قتل کیا گیا اور اس کے تینوں قاتلین بھی قتل کیے گئے تو میں نے ان کے چہروں کو غور سے دیکھا تو وہی تینوں نکلے۔!

ناصر لدین اللہ[1]

طویل دورِ حکومت، شاندار کارنامے

تائیدِ غیبی علامہ جلال الدین سیوطی نے اپنی تاریخ الخلفاء میں اس کے بارے میں لکھا ہے:

ناصر لدین اللہ، ابو العباس احمد بن مستضئی پیر کے دن ۱۰۔ رجب ۵۵۳ھ میں پیدا ہوا۔ اس کی ماں ترک خاتون تھی جس کا نام زمرد تھا۔ ۳۰۔ شوال ۵۷۵ھ کو تختِ نشینِ خلافت ہوا۔

ذہبی کا بیان ہے خلفائے گزشتہ کی بہ نسبت ناصر نے طویل عرصے تک یعنی ۴۷ سال خلافت کی اور عزت و شان سے زندہ رہا، دشمنوں کو نیست و نابود کیا۔ تمام بادشاہوں نے اس کی فرمانبرداری کی اور کسی سلطان نے اس کی سرکشی نہیں کی۔ جس خارجی نے حملہ کیا اس کا قلع قمع کر دیا۔ جس مخالف نے دشمنی کا اظہار کیا اس کا تختہ پلٹ دیا اور جس نے سلطان ناصر سے برائی کرنے کا ارادہ کیا اس کو اللہ تعالیٰ نے ذلیل و رسوا کیا۔

اندازِ سیاست ناصر اپنے دادا مستنجد باللہ کی طرح نیک سیرت، مصالح ملکی کا زبردست منتظم و مہتمم تھا۔ کسی بادشاہ و رعایا کا چھوٹا بڑا کوئی کام اس سے

---

[1] ۵۷۵ھ۔ ۶۲۳ھ (۱۱۷۹ء۔ ۱۲۲۵ء)

ڈھکا چھپا نہ تھا۔ کیونکہ اس کے پرچہ نویس مملکت کے گوشہ گوشہ میں موجود تھے جو لمحہ لمحہ پر ذرا ذرا سی بات کی خلیفہ کو اطلاع دیتے رہتے تھے۔ ناصر کو بڑے بڑے حیلے اور غضب کی باتیں آتی تھیں۔ اس کی چال کو کوئی نہیں پہچانتا تھا۔ وہ دو دشمن بادشاہوں میں دوستی کرا دیتا اور دوست ملکوں میں عداوت ڈلوا دیتا اور پھر لطف یہ کہ دونوں میں سے کسی کو بھی دوستی یا دشمنی کے اسباب کا پتہ تک نہ چلتا۔

ناصر عجیب متضاد طریقوں کا حامل تھا۔ وہ جب مہربان ہوتا تو کسی کو اتنا دیتا کہ دُنیا سے بے نیاز کر دیتا اور جسے سزا دیتا اس کی ہڈی پسلی تک ایک کر دیتا۔ اور سخت ترین سزائیں دیتا۔ اس کے جود وسخا کی کیفیت یہ تھی کہ جب وہ کسی کو دیتا تو اتنا دیتا کہ خود کے فقیر ہو جانے کا خیال نہ رکھتا ایک مرتبہ ایک شخص ہندوستان سے ایک طوطا لے کر بغداد چلا تاکہ خلیفہ کو تحفہ دے لیکن بغداد پہنچنے پر وہ طوطا مر گیا۔ اور یہ ہندوستانی سخت پریشان ہوا۔ چنانچہ خلیفہ کے فراش نے آکر اس سے کہا لاؤ طوطا کہاں ہے؟ اس نے روتے ہوئے کہا ہائے وہ گزشتہ رات مر گیا۔ فراش نے کہا یہ تو ہمیں معلوم ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ خلیفہ کو طوطا پیش کرنے کے بعد تمھیں کتنی رقم ملنے کی امید تھی؟ ہندی نے کہا پانچسو اشرفیوں کی۔ اس پر فراش نے پانچسو اشرفیاں دیتے ہوئے کہا خلیفہ نے تمھارے پاس یہ پانچ سو اشرفیاں بھیجی ہیں۔ ہندوستان سے روانہ ہوتے وقت ہی خلیفہ کو تمھارا عندیہ وغیرہ سب معلوم ہو گیا تھا۔

ناصر کی ہیبت

مؤفق عبداللطیف کا بیان ہے لوگوں کے دل میں ناصر کی ہیبت بیٹھ گئی تھی۔ وہ اس کے رعب و داب سے خوف زدہ رہتے تھے جس طرح بغدادی اس سے خوفزدہ تھے اسی طرح ہندی و مصری بھی اس کے نام سے ڈرتے تھے۔
معتصم باللہ کے بعد سے لوگوں کے دلوں سے خلافت کا رعب داب مُردہ ہو چکا تھا جسے ناصر نے دوبارہ زندہ کیا۔ ناصر کے رعب داب اور خوف کی حالت یہ تھی کہ بادشاہ اور امراء مصر و شام وغیرہ جب اپنی خلوتوں میں ناصر کا تذکرہ کرتے تو اس کے رعب داب اور خوف سے آہستہ آہستہ تذکرہ ناصر کیا کرتے تھے۔

ابن نجار کا بیان ہے بڑے بڑے بادشاہ آکر خلیفہ ناصر کی اطاعت قبول کیا کرتے تھے۔

جس نے خلیفہ ناصر کی مخالفت کی وہ ذلیل ہوا۔ سرکشوں اور بیباکوں کو ناصر کی شمشیر براں نے ذلیل و خوار کیا۔ اس کے دشمنوں کے پاؤں تھرّاتے تھے۔ خلاصہ یہ کہ ناصر کے مددگاروں کی کثرت تھی۔ اس نے اکثر شہر فتح کیے۔ اس کی مملکت کی سرحدیں بے انتہا وسیع تھیں۔ اور اتنی بڑی سلطنت کسی گزشتہ خلیفہ کو بھی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اسپین و چین تک میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ یہ بنو عباس کا نہایت پُرہیبت خلیفہ تھا۔ اس کے خوف سے پہاڑ تک لرزاں و ترساں رہتے تھے۔ ناصر خوش اخلاق، خوش مزاج، شیریں سخن اور فصیح و بلیغ مقرر تھا۔ اس کے فرامین کے الفاظ برمحل اور درست ہوتے تھے۔ اس کا عہدِ خلافت دراصل زمانہ کے چہرے کی روشنی تھا۔ اور وہ خود فخر و عزت کے تاج کا دُرِ شاہوار تھا۔

ابن واصل کا بیان ہے خلیفہ ناصر دانش مند، بہادر، صائب رائے عقل مند و سیاست داں تھا، اس کے جاسوس عراق اور تمام ممالک میں کارگزار تھے۔ اور معمولی سے معمولی باتوں کی بھی ناصر کو ہر وقت اطلاع دیا کرتے تھے۔ حد یہ کہ بغداد میں ایک مرتبہ ایک میزبان نے مہمانوں کو کھلانے سے پہلے خود ہی ہاتھ دھوئے۔ جس کی اطلاع پرچہ نویس نے ناصر کو دی۔ جس پر اس میزبان کے نام ناصر نے لکھا مہمانوں سے پہلے اپنے ہاتھ دھونا بے ادبی ہے یہ پڑھ کر میزبان حیران و ششدر رہ گیا۔ ان تمام امور کے باوجود خلیفہ ناصر اپنی رعایا سے کچھ اچھا سلوک نہیں کرتا تھا۔ ظلم و جبر کرنے کا شوقین تھا اس لیے اکثر لوگ ترکِ وطن کر گئے جن کی دولت و جائداد پر خلیفہ ناصر نے قبضہ کر لیا۔ غرضکہ ناصر متضاد افعال کیا کرتا تھا۔ وہ شیعہ عقیدہ رکھتا تھا۔ اپنے آبا و اجداد کے مذہب کے خلاف مذہب امامیہ کی طرف مائل تھا۔ ایک مرتبہ امام جوزی سے پوچھا رسول اللہؐ کے بعد کون سب سے زیادہ افضل ہے تو امام نے حضرت ابوبکرؓ کی افضلیت بیان کرنے کی خود میں طاقت نہ دیکھ کر کہا وہ جن کی بیٹی اُن کے نکاح میں ہو۔[1]

حدیث کا شوق

الموفق عبداللطیف کا بیان ہے خلیفہ ناصر کو وسط ایامِ خلافت میں حدیث کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ علمائے محدثین کو جمع کر کے اس نے

---

[1] اس بلیغ جواب سے دو مطلب نکلتے ہیں: ۱۔ حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی حضرت عائشہؓ آپ کی بیوی تھیں ۲۔ حضرت علیؓ جن کی بیوی حضرت فاطمہؓ آنحضرتؐ کی صاحبزادی تھیں

احادیث کی سماعت کی اور ان کو انعامات و اکرامات دے کر سند روایات حاصل کی۔ اور پھر علماء و بادشاہوں کو اجازت دی کہ وہ اس کے ذریعے احادیث کی روایت کریں۔ ناصر نے ۷۰ احادیث کا ایک کتابچہ لکھ کر حلب بھیجا جسے وہاں کے باشندوں کو سنایا جاتا تھا۔

۵۷۰ھ میں خلیفہ ناصر نے سلطان صلاح الدین کو یہ عتاب نامہ لکھا، سب کو معلوم ہے کہ ہم نے ملک ناصر اپنا لقب اختیار کیا ہے اس کے باوجود تم نے اپنا لقب یہ کیوں اختیار کیا؟

۵۸۰ھ میں خلیفہ ناصر نے مشہد امام کاظمؑ کو مقام امن مقرر کیا اور حکم دیا جو شخص یہاں پناہ لے اس سے کوئی باز پرس نہ کی جائے۔

ناصر لدین اللہ نے خلیفہ ہونے کے بعد سلطان صلاح الدین کو خلعت و شمشیر روانہ کرتے ہوئے لکھا بحمد اللہ خادم کو دولت عباسیہ اسلامیہ میں سبقت حاصل ہے اگرچہ حکومت عباسیہ کا پہلا بادشاہ ابو مسلم تھا اور آخری بادشاہ طغرل بک ہوا میں نے ہر ایک کو خلعت سے سرفراز کیا ہے اور جو لوگ راہ الٰہی سے بھٹک گئے انھیں میں نے سزا دی ہے اب کوئی باطل پرست منبروں پر نہیں آسکے گا اور حضرت ابراہیم کی سنت کے موافق پوشیدہ بتوں کو اسلام کی ظاہری تلوار سے کاٹ پھینکوں گا۔

طفطفی کا بیان

الفخری کی روایت ہے:

خلیفہ ناصر کا ایک غلام بدر الدین ایاز کہتا ہے کہ: اس نے ایک رات میٹھے پھل طلب کیے اور اسی وقت بہت سی لبریز کشتیاں اس کے سامنے کر دی گئیں۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ایاز: کیا تم اتنے ہی وافر شیریں پھلوں کا ذخیرہ میرے لیے روز حشر تک کے لیے جمع کر سکتے ہو؟

آقائے ما یہ کس طرح ہو سکتا ہے، اور کیا یہ ممکن بھی ہے؟

اس نے کہا: ہاں یہ ممکن ہے تم اسی وقت موسیٰ اور جواد علیہم السلام کے مشہد پر جاؤ اور یہ تمام کشتیاں علوی یتیموں کے آگے رکھ دو بس اس طرح تم تا قیامت میرے لیے وافر ذخیرہ جمع کر لو گے۔

میں نے کہا بسر و چشم حاضر ہوں۔ پھر میں مشہد کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس وقت آدھی رات گزر چکی تھی، میں نے دروازہ کھلا، یتیم بچوں کو جگایا اور وہ کشتیاں ان کے آگے رکھ کر واپس آ گیا۔

ظاہر باللہ[۱]

غیور، رحم دل، سخی، خداترس!

عدل و انصاف یہ خلیفہ مجموعۂ حسنات تھا۔ عہدِ حکومت بہت مختصر ہے لیکن خیر اور نیکی سے بھرپور۔

سیوطی کا بیان ہے:

ظاہر بامر اللہ، ابونصر، محمد بن ناصر لدین اللہ ۵۷۱ھ میں پیدا ہوا۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد بہ عمر ۵۲ سال تختِ نشینِ خلافت ہوا۔

ابوشامہ نے لکھا ہے ظاہر بامر اللہ سے اراکینِ حکومت نے کہا اے امیر المومنین آپ ملک کو وسیع کرنے کے لیے فتوحات کی جانب متوجہ کیوں نہیں ہیں؟ جواب دیا کھیتی سوکھ گئی۔ مطلب یہ کہ میری عمر ختم ہو رہی ہے، مجھے لازمی ہے کہ باقی زندگی نیک کاموں میں بسر کروں اور دنیا طلبی کا لالچ نہ کروں! اور جو تاجر سہ پہر کو دکان کھولتا ہے تو وہ کیا کما سکتا ہے۔ غرضیکہ ظاہر بامر اللہ نے رعایا کے ساتھ حُسنِ سلوک کیا۔ تمام ٹیکس معاف کر دیے، مظالم دُور کیے اور خوب مال خرچ کیا۔

انصاف پروری ابن اثیر نے تاریخ کامل میں لکھا ہے ظاہر بامر اللہ نے خلیفہ ہونے کے بعد حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی مانند عدل و انصاف

۱۔ ۶۲۲ھ - ۶۲۳ھ (۱۲۲۵ء - ۱۲۲۶ء)

سے کام لیا۔ کہتے ہیں عمر بن عبد العزیز کے بعد صرف ظاہر بامر اللہ نے خلافت کی، کیونکہ حقیقت یہی ہے کہ اس نے اپنے والد کے زمانے کی لوٹی ہوئی دولت و جائداد وغیرہ لوگوں کو واپس دے دی۔ جو زیادہ ٹیکس لگائے گئے یا جن ٹیکسوں میں اضافہ ہوا تھا اس نے تمام کے تمام ٹیکس معاف کر کے صرف اصلی و قدیم ٹیکس باقی رکھے۔ معافی ٹیکس کی رقم کچھ کم نہ تھی، مثال کے طور پر بغداد سے دس میل کے فاصلے پر موضع عقوبا کا ٹیکس بہ زمانہ گزشتہ دس ہزار تھا لیکن اس کے والد نے ٹیکسوں میں اضافہ کر کے ۸۰ ہزار کی رقم ٹیکسوں کے ذریعے وصول کرنا شروع کر دی تھی، لوگوں کی استدعا پر زائد ٹیکس معاف کر کے اصلی رقم دس ہزار ہی رہنے دی پھر لوگوں نے آکر عرض کیا کہ ہمارے باغ اور کھیت سوکھ گئے ہیں ٹیکس کی رقم اور کم کی جائے تو فرمان جاری کیا کہ صرف ترو تازہ درختوں پر محصول لیا جائے۔

ظاہر بامر اللہ کا عدل و انصاف اس واقعے سے بھی ظاہر ہے کہ خزانہ کی ترازو ایک طرف تقریباً آدھا ماشہ یعنی ۴ رتی جھکتی ہوئی تھی، خزانچی روپیہ وغیرہ اس سے تول کر لیتا۔ اور دیتے وقت شہر کی ترازو سے تول کر دیتا۔ لوگوں نے خلیفہ سے اس کی شکایت کی تو وزیر خزانہ کے نام حکم نامہ لکھا جس کے سرنامہ پر آیۂ قرآنی ویل للمطففین (کم تولنے والوں کے لیے ہلاکت) تحریر کی۔ اس کے نیچے لکھا، ہمیں معلوم ہوا کہ سرکاری خزانہ کی ترازو میں کان ہے۔ اگر یہ امر واقعہ ہے تو خزانچی کو حکم دیا جائے کہ وہ لوگوں کو بلا کر ان کی زیادہ رقمیں واپس کر دے۔

وزیر خزانہ نے جواب لکھا: تحقیقات سے معلوم ہوا کہ یہ تفاوت زمانۂ قدیم سے چلا آرہا ہے اور حساب لگا کر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ تقریباً ۳۵ ہزار اشرفیاں لوگوں کو واپس کرنا ہوں گی۔ اس پر خلیفہ نے جواب سرفراز فرمایا یہ سب باتیں لغو و بیکار ہیں اگر ۳ کروڑ اشرفیاں بھی دینی پڑیں تب بھی دیدی جائیں چنانچہ لوگوں کو بلوا بلوا کر ان کی زائد جمع کردہ رقمیں واپس کرادیں۔ جو رعایا کہ محصول ادا نہ کرنے کی وجہ سے قید تھی ان کو آزاد کرانے کے لیے اپنی جیبِ خاص سے دس ہزار اشرفیاں قاضی کے پاس روانہ کرتے ہوئے

حکم دیا کہ مفلس و ناداروں کو اس رقم سے چھٹکارا دلایا جائے۔
بقرعید کی رات کو علماء و صلحاء کو ایک لاکھ اشرفیاں دیں۔ اس پر کسی نے کہا آپ نے ایک رات میں جتنی دولت خرچ کی اتنی تو بعض خلفاء نے مدت العمر خرچ نہیں کی۔ اس پر جواب دیا میں نے عصر کے بعد دکان لگائی ہے۔ مجھے نیکیاں کما لینے دو۔ اب میری زندگی تھوڑے ہی دنوں کی ہے۔ ظاہر بامر اللہ کو خلیفہ ہونے کے بعد اپنے گھر میں ہزاروں سربمہر بند لفافے ملے۔ لوگوں نے کہا انھیں کھول کر پڑھیے۔ کہا انھیں کھول کر کیا کروں گا، ان سب میں لوگوں کی غمازی و بدی تحریر ہے۔

سبط ابن جوزی کا بیان ہے کہ ظاہر بامر اللہ ایک دن خزانے میں گیا تو ایک آبائی قدیم ملازم نے کہا: اے امیر المومنین! یہ آپ کے آباد اجداد کے زمانے میں بھرا رہتا تھا۔ جواب دیا میں خزانہ بھر کے کیا کروں گا میں تو اسے اللہ کے نام پر خرچ کرنا چاہتا ہوں۔ اور جمع کرنا در حقیقت تاجروں کا کام ہے۔

ابن واصل نے لکھا ہے ظاہر بامر اللہ نے اچھی طرح عدل و انصاف سے کام لیا۔ تمام زیادہ ٹیکس معاف کر دیے۔ خود اس کی حالت یہ تھی کہ لوگوں سے ملتا جلتا، سب کے سامنے آتا۔ حالانکہ اس کے والد ناصر لدین اللہ شاذ و نادر ہی لوگوں سے ملا کرتے تھے۔

ظاہر بامر اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۳ رجب ۶۲۳ھ کو نو ماہ و چند دن خلافت کر کے انتقال کیا۔ اسے احادیث روایت کرنے کی اجازت اس کے والد نے دی تھی اور اس کے حوالہ سے ابو صالح نصر بن عبد الرزاق بن شیخ عبد القادر جیلانیؒ نے احادیث کی روایت کی ہے۔ ظاہر کے انتقال کے بعد اسی سال ۶۲۳ھ میں دو مرتبہ چاند گرہن ہوا۔ چنانچہ بادشاہ موصل نے ایک تعزیت نامہ اپنے سفیر ابن اثیر نصر اللہ کے ذریعے ظاہر بامر اللہ کے فرزند مستنصر کے نام روانہ کیا۔ جس میں لکھا تھا دن رات اس لیے گریہ کر رہے ہیں کہ ان پر ایک عظیم حادثہ پڑا ہے اور چاند اور سورج اس لیے گرہن میں آرہے ہیں کہ ان کا تیسرا ساتھی گم ہو گیا ہے جو ہمارے سید و آقا امام ظاہر امیر المومنین رحمۃ اللہ علیہ تھے جنھوں نے اپنے پورے عہد خلافت میں رحم و کرم ہی سے کام لیا۔

مُستنصر باللہ[1]

وہ ہستی جو مجموعۂ فضائل و مکارم تھی!

مدرسۂ مستنصریہ

خلیفہ مستنصر کے بارے میں مؤرخین کا اتفاق ہے کہ یہ مجموعۂ محامد و مکارم تھا۔

الفخری کا بیان ہے:

اس کی بیعتِ خلافت ۶۲۳ھ میں ہوئی۔ یہ بڑا عملی اور فیاض تھا سخاوت و فیاضی میں یہ ہوا سے بازی لے جاتا۔ اس کے عطیے اور بخششیں شمار سے باہر تھیں۔ صحیح ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ خلفائے بنی عباس میں ایسا کوئی خلیفہ نہیں ہوا۔ اس کے بڑے بڑے آثار موجود ہیں۔ مثلاً اس کی سب سے بڑی یادگار "مستنصریہ" کا شہر ہے جو تعریف سے بالاتر ہے۔ اور اس کی شہرت ہی تعریف سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ اس کی دوسری یادگار "خانِ حربی[2]" اور اس کا پل ہے۔ نیز علاقہ واسط کا "خان تہر سابس" اور "خانِ خرسنی" ہے۔ علاوہ ازیں بے شمار مساجد، عبادت گاہیں اور مہمان خانے بھی اس کی یادگار ہیں۔ مستنصر کہا کرتا تھا کہ:

مجھے اللہ سے خوف ہے کہ جو انعامات و عطیات میں دیتا ہوں اس کا وہ مجھے کوئی

---

[1] ۶۲۳ھ تا ۶۴۰ھ (۱۲۲۶ء-۱۲۴۳ء)

[2] سرائے۔

ثواب نہ دے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ لن تنالوا البر حتیٰ تنفقوا مما تحبون (تم نیکی کو نہ حاصل کر سکو گے جب تک اپنی مرغوب و محبوب چیزیں نہ دو) اور میرا یہ حال ہے کہ میرے نزدیک بخدا مٹی اور سونے میں کوئی فرق نہیں "۔

اس کا عہد بڑا پاکیزہ تھا۔ دُنیا کو اس کے عہد میں سکون حاصل تھا نیکیاں برستی تھیں۔ اور تمام صوبے آباد تھے۔ اسی کے دَور میں "اربل" فتح ہوا۔ مستنصر نے ۶۴۰ھ میں وفات پائی۔

جب اس کی بیعت خلافت ہوئی تو اس نے قمی ہی کو وزارت پر باقی رکھا جو اس کے باپ کا بھی وزیر تھا اور دادا کا بھی۔ یہ صرف چند سال وزیر رہا۔ اس کے بعد مستنصر نے اسے گرفتار کر لیا۔

قمی کے بعد مستنصر نے ابو الازہر احمد بن ناقد کو اپنا وزیر بنایا۔ ابتداءً یہ مستنصر کا وکیل (ایجنٹ) تھا۔ ایک عرصے تک اسی عہدے پر قائم رہا۔ اس کے بعد محل شاہی کا نگران و معلّم بنا۔ پھر وزارت سنبھالی۔ وزارت کی ذمہ داریوں کو عمدگی سے ادا کرتا رہا۔ اور مملکت کا نظم و ضبط بھی خوشگوار طریقے سے چلاتا رہا۔ یہ بڑا امانت دار اور مضبوط سیاست داں تھا۔ چھوٹے فرمانرواؤں پر اس کا بڑا رعب تھا۔ اس نے مفاد پرستی اور فساد کی جڑیں کاٹ ڈالیں۔

مستنصر باللہ بن ظاہر بامر اللہ ۵۸۸ھ میں ایک ترکیہ امّ ولد کے پیٹ سے پیدا ہوا۔ اور اپنے باپ کی وفات کے بعد رجب ۶۲۳ھ میں تخت نشین ہوا۔ یہ خلیفہ اخلاق فاضلہ میں اپنے باپ سے بہت مشابہہ تھا۔ اس نے عدل و انصاف کے قائم رکھنے میں اپنے باپ کی طرح کوشش کی۔ دین و مذہب کی پابندی کا اس کو خاص طور پر شوق تھا۔ بغداد میں اس نے مدرسۂ مستنصریہ بنایا اور بڑے بڑے علماء مدرسی پر مقرر کیے اس مدرسے کی تعمیر کا کام ۶۲۵ھ میں شروع ہو کر ۶۳۱ھ میں ختم ہوا۔ اس مدرسے میں ایک کتب خانہ قائم کیا۔ جس میں ایک سو ساٹھ اونٹوں پر لاد کر نہایت نفیس و نایاب کتابیں داخل کی گئیں۔ حدیث، نحو، طب اور فرائض کے استاد الگ الگ مقرر کیے گئے۔ ان سب کے

کھانے پینے، مٹھائی، میوے اور دوسری چیزوں کا انتظام مدرسے کی طرف سے ہوتا تھا۔ بہت سے گاؤں اس مدرسے کے لیے وقف تھے۔ سنہ ۶۲۸ھ میں ملک اشرف نے دارالحدیث اشرفیہ کی بنیاد رکھی۔ سنہ ۶۳۰ھ میں اس کی تکمیل ہوئی۔ سنہ ۶۲۹ھ میں محمدؐ بن یوسف بن ہود نے اندلس میں دعوتِ عباسیہ کا اعادہ کیا۔ سنہ ۶۳۴ھ میں کیقباد بن قلیج ارسلان بن سلیمان بن قتلمش بن اسرائیل بن سلجوق جو ایشیائے کوچک کے اکثر حصے پر قابض و متصرف تھا۔ فوت ہوا اور اس کا بیٹا غیاث الدین کیخسرو تخت نشین ہوا۔ سنہ ۶۴۱ھ میں تاتاریوں نے غیاث الدین کیخسرو پر چڑھائی کر کے اسے شکست دی اور کیخسرو نے اطاعت قبول کر کے باجگذاری منظور کی۔ اس طرح سلاجقۂ روم کی دو صد سالہ حکومت کا خاتمہ ایشیائے کوچک میں ہوگیا۔ غیاث الدین کیخسرو تاتاریوں کی باجگذاری میں سنہ ۶۵۶ھ تک حکومت کر کے فوت ہوا۔ اسی زمانے میں خاندانِ عثمانیہ کے مورثِ اعلیٰ نے سلطنتِ عثمانیہ کے ایوانِ رفیع کی بنیادی اینٹ رکھی تھی۔ جس کا حال بعد میں مفصل بیان کیا جائے گا

خلیفہ مستنصر نے ملک کے انتظام اور عدل و انصاف کے قیام میں بہت کوشش کی۔ مگر چونکہ ترکوں اور تاتاریوں نے یکے بعد دیگرے ولایتوں اور صوبوں پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ اور جلد جلد ایک کے بعد دوسرا ملک ان کے قبضے میں آتا گیا۔ لہٰذا خلیفہ کی آمدنی کم ہوگئی۔ صلاح الدین یوسف کی سلطنت جو شام و مصر پر مشتمل تھی۔ صلاح الدین کی اولاد کی نااتفاقیوں سے برباد ہو رہی۔ تاتاریوں کے سیلاب نے ماوراءالنہر سے بحرِ روم اور بحرِ اسود تک کے تمام ملکوں کو تاخت و تاراج کر ڈالا تھا۔ تاہم ملک عراق پر خلیفہ کا قبضہ تھا۔ اور تاتاریوں (مغلوں) کے دلوں پر خلیفۂ بغداد کا اس قدر رعب قائم تھا کہ وہ خلیفہ کے مقبوضہ ملک کی طرف نگاہ نہیں کر سکتے تھے۔ اور جس طرح خراسان، آذربائیجان، موصل، شام وغیرہ کے سلاطین خلیفہ کی ناراضی سے ڈرتے تھے۔ اسی طرح مغل بھی خلیفۂ بغداد کی سیادت کو تسلیم کرتے۔ اور کسی قسم کی گستاخی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ یہ تاتاری (مغل) چونکہ آفتاب پرست تھے اور سلجوقیوں کی طرح مسلمان ہو کر نہیں آئے تھے لہٰذا ان کو اس کی پرواہ ہی نہ تھی کہ کس کے نام کا خطبہ مسجدوں میں پڑھا جاتا ہے۔ لہٰذا ان

کے مفتوحہ ممالک میں بدستور خلیفہ بغداد کا خطبہ جاری تھا اور اسی لیے خلیفہ کو اطمینان تھا۔
تاتاریوں کے اس سیلاب کو دیکھ دیکھ کر خلیفہ مستنصر کا بھائی خفاجی نامی جو مستنصر سے زیادہ بہادر اور اولوالعزم تھا کہا کرتا تھا کہ اگر میں خلیفہ ہو جاؤں تو دریائے جیحون کے پار تک ان تاتاریوں کا نام و نشان تک ہٹا کے چھوڑوں۔

۶۴۱ھ میں خلیفہ مستنصر فوت ہوا تو لوگوں نے اس کے بھائی خفاجی کو تخت پر نہ بٹھایا۔ جو ہر طرح قابل اور مستحق خلافت تھا، بلکہ مستنصر کے بیٹے ابو احمد عبد اللہ کو اس لیے ترجیح دی کہ ابو احمد عبد اللہ نرم مزاج اور سادہ لوح تھا۔ ارکینِ سلطنت ایسے ہی خلیفہ کو پسند کرتے تھے تاکہ ان کے اقتدار و حکومت میں ترقی ہو۔ چنانچہ ابو احمد عبد اللہ نے مستعصم باللہ کے لقب سے تخت خلافت پر جلوس کیا۔

مدرسۂ مستنصریہ

سیوطی نے مدرسۂ مستنصریہ کے بارے میں لکھا ہے:

اُس نے علماء کو بڑی بڑی تنخواہیں دے کر پڑھانے کے لیے مامور کیا تھا۔

ابن واصل نے لکھا ہے کہ خلیفہ مستنصر نے دریائے دجلہ کے مشرقی کنارے پر جو مدرسہ قائم کیا وہ روئے زمین پر سب سے بڑا اور اچھا تھا۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ چاروں مذہب کے چار علماء اس میں علیحدہ علیحدہ پڑھایا کرتے تھے، ان کے علاوہ دیگر اساتذہ بھی تھے۔ اسی مدرسے سے متعلق ایک شفاخانہ، اساتذہ کے لیے علیحدہ باورچی خانہ ٹھنڈے پانی کا انتظام، قیام کے لیے مکان مع فرش فروش، روشنی اور لکھنے پڑھنے کے لیے کاغذ، قلم دوات وغیرہ فراہم کیے گئے تھے۔ تنخواہ کے علاوہ ہر ایک کو ماہانہ ایک اشرفی بھی دی جاتی تھی۔ یہ ایسا شاندار مدرسہ تھا کہ تاریخ میں اپنی مثال آپ تھا، کیونکہ اس سے پہلے اس نوعیت کا کوئی مدرسہ تاریخ میں نہیں پایا گیا۔

ذھبی کا بیان ہے مستنصریہ کی ابتدائی عمارت پر ستر ہزار مثقال سے کچھ زیادہ لاگت آئی تھی۔ ۶۲۵ھ میں اس کی تعمیر شروع ہوئی۔ اور ۶۳۱ھ میں عمارت مکمل ہوئی۔

اس میں ایک سو ساٹھ گاڑیاں بھر کر کتابیں منتقل کی گئیں جس میں عمدہ، نفیس اور بیش قیمت اور نایاب کتابیں شامل تھیں۔ اس میں اساتذہ کی تعداد ۲۴۸ تھی اور چاروں مذہب کے چار بڑے بڑے علماء علیحدہ علیحدہ پڑھاتے تھے۔ شیخ الحدیث، شیخ نحو، شیخ طب، اور شیخ تقسیم حصص متروکہ جات وغیرہ بھی درس دیا کرتے تھے۔ اس مدرسہ میں اساتذہ کے لیے کھانے پینے، میٹھے میوے وغیرہ کا مکمل انتظام تھا اور تمام چیزیں انھیں بجانب حکومت فراہم کی جاتی تھیں۔ یہاں تین سو یتیم بھی پڑھا کرتے تھے جن کے تمام اخراجات کالج ہی انتظام کرتا تھا۔

۶۳۲ھ میں مستنصر نے چاندی کے سکے بنانے کا حکم دیا تاکہ چاندی اور سونے کے ٹکڑوں سے لین دین میں دشواریوں کا سدباب ہو کر اس کا عمدہ بدل ہاتھ آجائے۔ اس فرمان پر وزیر خزانہ نے ارکین حکومت، تاجروں اور صرافوں کی مجلس طلب کر کے کہا دیکھیے امیر المومنین نے ازراہِ کرم یہ چاندی کے سکے بنوائے ہیں تاکہ سونے چاندی کے ٹکڑوں کے لین دین کی دشواریاں دور ہو جائیں اور لین دین میں جو سود کی شکل ہے اس حرام کمائی سے بھی محفوظ رہیں۔ اس پر تمام شرکاء مجلس نے خلیفہ کو دعائیں دیں۔ پھر پورے عراق میں ان چاندی کے دس سکوں کو ایک اشرفی کے برابر قرار دیا گیا جس پر موفق ابو المعالی قاسم بن ابی حدید نے خلیفہ کی منظوم تعریف کی۔

۶۳۵ھ میں شمس الدین احمد جونی کو دمشق کا قاضی بنایا گیا۔ اور گواہوں کی شہادت لینے کے لیے شہر میں کئی مرکز بنائے گئے تاکہ گواہوں کو سہولت ہو اور عہد گزشتہ کی طرح عدالت میں جانے کی تکلیف سے محفوظ رہیں۔

مُستعصم باللہ

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں!

بغداد تاراج ہو گیا!

معتصم کا عہد، بربادی کا عہد ہے:

دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد

الفخری مستعصم کے بارے میں لکھتا ہے:

اس کی بیعتِ خلافت سنہ ۶۴۰ھ[1] میں ہوئی۔ یہ آخری عباسی خلیفہ تھا۔ یہ بہت بہتر آدمی تھا۔ دین دار تھا اور سادی زندگی رکھتا تھا۔ شریف طبع اور پاکباز تھا۔ حافظِ قرآن اور بڑا خوشخط تھا۔ نرم مزاج تھا اور سخت گیری بہت کم تھی۔ مگر اس کی رائے بہت کمزور تھی۔ دار و گیر میں بھی بہت کمزور تھا، ملکی معاملات کی واقفیت بہت کم تھی۔ لوگوں کے دلوں میں اس کا رعب نہ تھا۔ اور معاملات کی حقیقت سے بے خبر رہتا تھا۔ اس کا زیادہ وقت گانے سُننے میں صرف ہوتا تھا یا ہنسی مذاق کی باتوں سے دلچسپی لینے میں۔ بعض اوقات وہ کتب خانے میں بے فائدہ بیٹھا کرتا تھا۔ اس کے رفقاء اور درباری اس پر چھائے ہوئے

---

[1] سنہ ۶۴۰ھ - ۶۵۵ھ (۱۲۴۱ء تا ۱۲۵۷ء)

تھے اور یہ سب کے سب جاہل اور رذیل قسم کے لوگ تھے۔ بجز اس کے وزیر موید الدین محمد بن علقمی کے۔ یہ البتہ ممتاز اور دانا شخص تھا مگر بے بس تھا اور اس کی کوئی بات نہ مانی جاتی تھی۔ دن رات اسے یہ انتظار رہتا تھا کہ اب معزول ہوئے اور اب گرفتار ہوئے[1]۔

خلفاء کی یہ عادت تھی کہ اپنے اور اپنے رشتہ داروں کے لڑکوں کو نظربند رکھتے تھے۔ مستنصر کے آخری عہد تک یہی دستور رہا۔ لیکن جب مستعصم خلیفہ ہوا تو اس نے اپنی تینوں اولادوں کو آزاد رکھا۔ ان تین میں ایک تھا امیر کبیر ابوالعباس احمد، جب کرخ[2] لوٹا گیا تو لوگوں نے اس کی ذمہ داری اسی کے سر عائد کی اور یہ کہا گیا کہ اسی کے اشارے سے یہ لوٹا گیا ہے۔ دوسرا فرزند تھا امیر اوسط ابوالفضائل عبدالرحمان یہ بڑا عملی آدمی تھا۔ سلطان ہلاکو کے پاس جاتا تھا اور اس کی باتیں سلطانی دربار میں بڑی پسند کی جاتی تھیں تیسرا لڑکا امیر اصغر ابوالمناقب تھا۔

صفی الدین عبدالمومن بن فاخرارموی مستعصم کے آخری ایام میں اس کا مقرب اور خاص آدمی بن گیا تھا۔ اس نے خود مجھ سے (ابن طقطقی سے) بیان کیا کہ: مستعصم نے اپنے آخری ایام میں ایک نیا کتب خانہ بنایا تھا جس میں اعلیٰ درجے کی کتابیں منتقل کی گئی تھیں اور اس کی چابی میرے حوالے کر دی تھی۔ میں کتب خانے کے دروازے پر بیٹھا رہتا اور مستعصم جو چاہتا اسے نقل کیا کرتا۔ خلیفہ جب کتب خانے میں بیٹھنا چاہتا تو وہاں آجاتا۔

میں ایک بار ایک چھوٹے کمرے میں بیٹھا لکھ رہا تھا۔ وہاں خلیفہ کے لیے ایک کوچ رکھا تھا جس پر خلیفہ بیٹھا کرتا تھا اس پر ایک گردپوش پڑا رہتا۔ ایک خادم بچہ آیا اور اس کوچ کے قریب ہی سو گیا۔ وہ غفلت کی نیند سو رہا تھا۔ میں اپنے لکھنے میں مشغول تھا۔ اتنے میں کچھ آہٹ سی محسوس کی میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ خلیفہ تھا اور مجھے اشارے سے بلا رہا تھا۔ اس کی چاپ بھی بہت ہلکی تھی۔ میں گھبرا کر اٹھا اور زمیں بوس ہوا تو اس نے کہا: یہ بچہ جو سویا ہوا ہے جب یہ جاگے گا

1: یہ وزیر شیعہ تھا۔ اور اس زمانے میں بغداد شیعہ سنی فسادات کا مرکز بنا ہوا تھا۔

2: بغداد کی شیعہ بستی۔

اور اسے معلوم ہو گا کہ میں نے اسے اس حال میں دیکھا ہے تو ڈر کے مارے اس کا پتہ پانی ہو جائے گا۔ اس لیے تم اسے بڑی نرمی سے جگاؤ۔ اور جب تک میں چمن کی طرف جاتا ہوں اور تھوڑی دیر میں لوٹ آؤں گا۔ اس کے بعد خلیفہ تو باہر چلا گیا۔ میں نے اس خادم بچے کو جگایا اور اسے ہوش آیا پھر میں نے کوچ کو ٹھیک کر لیا، تو خلیفہ بھی اندر آ گیا۔

مجھ سے (ابن طقطقی سے) ایک بغدادی نے کسی کی زبانی شیخ صدر الدین بن نیار کا یہ واقعہ خود شیخ کے الفاظ میں یوں بیان کیا کہ میں ایک بار حسب معمول کتب خانہ میں گیا اس وقت میری آستین میں ایک رومال تھا جس میں بہت سے اہلِ حاجت کی درخواستیں تھیں میں نے وہ بستہ اپنی نشست گاہ پر رکھ دیا اور کسی کام سے باہر چلا گیا۔ کوئی ایک گھنٹے کے بعد میں واپس آیا تو میں نے وہ بستہ کھولا کہ درخواستوں پر غور کروں اور اہم درخواستوں کو الگ چھانٹ لوں۔ میں نے تمام درخواستوں کو دیکھا۔ ہر ایک پر خلیفہ کی منظوری کے دستخط ثبت تھے۔ جس درخواست میں جو کچھ بھی سوال تھا سب منظور کر دیا گیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ جب میں اٹھ کر باہر گیا تھا تو اسی اثنا میں خلیفہ کتب خانے میں آ گیا اور درخواستوں والے بستے کو دیکھ کر کھولا اور سب پر دستخط کر دیے۔

مستعصم بغداد میں حکومت عباسیہ کا آخری خلیفہ تھا۔ اس کے عہد میں اہم ترین واقعہ کرخ کی لوٹ اور بغداد کی تباہی کا پیش آیا۔

مستعصم کے آخری دور میں یہ افواہ زوردار طریقے سے گشت کرتی رہی کہ سلطان ہلاکو کے ساتھ مغلوں کی فوج آیا چاہتی ہے مگر مستعصم کے کانوں پر جوں بھی نہ رینگی۔ نہ اس نے کوئی جرأت دکھائی نہ کوئی اقدام کیا۔ وہ یہ تصور ہی نہ کر سکا کہ اصل صورت حال کیا ہے اس کا وزیر موید الدین بن علقمی صورت حال سے پوری طرح واقف تھا۔ وہ خلیفہ کو لکھ کر ہوشیار و متنبہ کرتا رہا۔ اور بیداری کے ساتھ احتیاط اور تیاری کی رائے دیتا رہا۔ مگر خلیفہ کی غفلتوں میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ خلیفہ کے خاص لوگ اسے یہ یقین دلاتے رہے کہ اس میں کوئی بڑا خطرہ نہیں۔ اور نہ کوئی ڈرنے کی بات ہے۔ وزیر اس معاملے کو بہت بڑھا چڑھا کر محض اس لیے دکھاتا ہے کہ اس کا بازار گرم رہے اور اس کے پاس فوجیں تیار کرنے کے لیے

خوب رقمیں آئیں اور وہ رقم کا ایک حصہ اپنے لیے بھی رکھ لے۔

خلیفہ کی غفلت بڑھتی رہی اور دوسری طرف سے ہوشیار رہنے کی صلاحیت کمزور سے کمزور تر ہوتی گئی۔ آخر سلطان (ہلاکو) کی فوجیں ہمدان تک پہنچ گئیں اور وہاں ایک عرصے تک مقیم رہیں۔ سلطانی پیغام دفتر میں پیہم آتے رہے۔ شاہی محل کے نگران و معتمد کے فرزند شرف الدین عبداللہ بن جوزی کو (سفارت کے لیے) متعین کیا گیا۔ وہ سفیر بن کر درگاہ سلطانیہ میں ہمدان بھیجا گیا۔ جب وہ وہاں پہنچا اور سلطان نے جواب سُنا تو وہ سمجھ گیا کہ یہ جواب محض مغالطہ اور وقت گزارنے کا حیلہ ہے۔ بس ہلاکو نے بغداد پہنچنے کی تیاری شروع کر دی اور فوجیں ادھر بڑھنے لگیں۔ مغلوں کی بھاری فوج کمانڈار "باجو" کی ماتحتی میں "تکریت" کی طرف روانہ ہوئیں اور غربی بغداد کی طرف سے حملہ آور ہوئیں۔ غرض یہ تھی وہاں سے آگے بڑھکر غربی جانب روانہ ہوں۔ سلطانی فوج مشرقی جانب سے حملہ آور ہو۔ باجو کی فوجیں تکریت کو عبور کر کے بغداد میں گھس آئیں تو لوگ وہاں سے دجیل، اسحاقی، نہر ملک، اور نہر عیسیٰ کے راستے بھاگے اور اپنے اپنے بال بچوں کے ساتھ شہر بغداد میں آگئے۔ اس وقت یہ حال تھا کہ مرد و زن نہر میں کود پڑتے اور ہر ملاح جب کسی کو اس پار سے اس پار پہنچا دیتا تو سونے کے کنگن یا زردوزی کے کپڑے یا متعدد دینار اُجرت میں لے لیتا۔ جب سلطانی فوج دجیل پہنچی تو اس وقت اس میں تیس ہزار شہسوار تھے۔ مقابلے کے لیے خلیفہ کی فوج دفعدار مجاہد الدین ایبک کی ماتحتی میں نکلی، مگر اس کی تعداد بہت کم تھی۔ غربی بغداد میں شہر سے قریب ہی دونوں کی مڈبھیڑ ہوئی پہلے تو خلیفہ کی فوج غالب آئی۔ اس کے بعد سلطانی فوج کا حملہ غالب آگیا۔ انھوں نے (سلطانی فوج نے) خونریزی اور گرفتاری کر کر کے بُرا حال کیا۔ انھیں اس نہر سے بڑی مدد ملی جو انھوں نے رات بھر میں فتح کر لی تھی۔ بھاگنے والوں کی راہ میں کثرت سے کیچڑ حائل ہو گئی صرف وہی بچ سکا جو نہر میں کود کر بھاگا۔ یا وہ بچا جو خشکی کی راہ سے شام کی طرف چل دیا۔ دفعدار مذکور اپنی جمعیت کو لے کر بغداد آگیا اس لیے وہ بھی بچ گیا۔ باجو نے پیچھا کیا اور غربی جانب سے شہر میں داخل ہو گیا۔ اور اپنی فوج کو لے کر "تاج" کے سامنے رُک گیا۔

فوجیں ہر جگہ پھیل گئیں اور وہ تاج کے سامنے ڈٹا رہا۔

سلطان (ہلاکو) کی فوج کا حال بھی سنیے۔ ۱۲ محرم ۶۵۶ھ کو بروز جمعرات مشرقی بغداد کی طرف سے ایک زبردست غبار اٹھا اور "یعقوبا" کی سڑک پر اس طرح چھا گیا کہ شہر تاریک ہو گیا۔ لوگ گھبرا گئے، چھتوں اور سیڑھیوں پر چڑھ کر یہ تماشا دیکھنے لگے غبار چھٹا اور سلطان ہلاکو کی فوجیں، گھوڑے، جمعیتیں اور جانور دکھائی دیئے۔ زمین ڈھپ گئی۔ ہر چہار طرف سے بغداد کا محاصرہ ہو گیا۔ اس کے بعد محاصرہ مضبوط کرنے کے ذرائع استعمال ہونے لگے۔ خلیفہ کی فوج ۱۹ محرم تک مدافعت کرتی رہی۔ اس کے بعد اچانک ہی لوگوں نے دیکھا کہ بغداد کی شہر پناہ پر مغلوں کے جھنڈے لہرانے لگے۔ بغداد کے دروازوں میں ایک دروازہ ہے جسے باب کلواذی کہتے ہیں۔ اسی طرف سے وہ لوگ داخل ہو کر اس برج پر چڑھ گئے جسے برج عجمی کہتے ہیں۔

یہ شہر پناہ کا سب سے نیچا برج تھا۔ اسی راستے ہلاکو کی فوجیں اژدہام کے ساتھ داخل ہوئیں۔ اور اچانک ہی قتل و غارت ایسی شدت کے ساتھ جاری ہو گیا کہ بالاجمال بھی اُسے سُننا گراں گزرتا ہے چہ جائیکہ تفصیل وار۔

وکان ما کان مما لست اذکرہ

فظن ظنا ولا تسئل عن الخبر

(جو کچھ ہونا تھا سو ہوا میں اس کا ذکر نہیں کروں گا بس قیاس سے سمجھ لو اور اصل خبر مت پوچھو)

سلطان ہلاکو نے خلیفہ، اس کی اولاد اور اس کی عورتوں کو باہر نکلنے کا حکم دیا۔ وہ سب نکلے اور خلیفہ درگاہِ سلطانیہ میں حاضر ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ خلیفہ کو اس کی بے کسی کمزوری اور غفلت یاد دلا کر بہت تنبیہہ کی گئی۔ پھر اس کے بڑے اور چھوٹے لڑکوں کو مغل قانون کے حوالے کیا گیا۔ اور اس کی لڑکیوں کو قیدی بنایا گیا۔ اس کے بعد مستعصم کو ۴ صفر ۶۵۶ھ کو قتل کر دیا گیا۔

جب اس کی بیعتِ خلافت ہوئی تو اس نے اپنے باپ کے وزیر نصیر الدین احمد بن ناقد ہی کو وزارت پر باقی رکھا جو مرتے دم تک وزیر رہا۔ اس کے مرنے کے

اس نے موئدالدین محمد بن علقمی، کو وزیر بنایا۔

یہ بنی اسد سے تھا اور اس کا وطن "نیل" ہے، اس کے دادا کو علقمی اس لیے کہتے ہیں کہ اس نے علقمی نامی نہر کھدوائی تھی۔ اور اس کی کھدوائی کے لیے سلطانی حکم پہنچا تھا۔ اسے قازانی بھی کہتے ہیں۔ بچپنے ہی سے یہ علم وادب سے دلچسپی رکھتا تھا اور اس میں خاصا مقام حاصل کر لیا۔ بڑا خوش خط تھا۔ فصیح تحریر ہوتی تھی۔ اور نظم وضبط صحیح طریقے سے چلاتا تھا۔ فاضل، کامل، عقلمند، شریف اور باوقار تھا۔ قائد بننے کا بڑا شوقین تھا، بردبار بھی تھا، ایسا لیڈر تھا جو لیڈری کے اصول اور سیاست کے آداب سے واقف ہو۔ وزارت کے اصول کو عمل میں لانے میں بڑا ہوشیار اور چوکس تھا۔ اہل ادب سے محبت کرتا اور اہل علم کو تقرب بخشتا۔ اس نے بہت سی نفیس کتابوں کا ذخیرہ جمع کر لیا تھا۔ اس کے لڑکے شرف الدین ابوالقاسم علی نے مجھ سے بیان کیا کہ میرے والد کے کتب خانے میں اعلیٰ درجے کی دس ہزار کتابیں تھیں، لوگوں نے بھی اس کے لیے کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں صغانی لغوی بھی ہے جس نے اس کے لیے العباب لکھی۔ یہ عربی زبان کا بہت بڑا لغت ہے۔ عزالدین عبدالحمید بن ابی الحدید نے نہج البلاغہ کی شرح اسی کے لیے لکھی تھی جو بیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ ابن علقمی نے ان دونوں کو نوازا۔ اور معقول انعامات دیے۔ یہ شعراء کا ممدوح تھا۔ اور اہل فضل انعامات لینے اس کے پاس آتے تھے۔

خلیفہ کے خواص سب کے سب ابن علقمی سے نفرت اور حسد کرتے تھے، مگر خلیفہ خود اس سے خوش گمان تھا اور محبت کرتا تھا۔ یہ لوگ خلیفہ کے دل میں اس کے خلاف نفرت پھیلاتے تھے۔ اس لیے بہت سے معاملات میں وہ بے بس ہو گیا۔ لوگ اس کی طرف سازش کو منسوب کرتے ہیں لیکن یہ درست نہیں۔ اس کے سازش نہ کرنے کی سب سے بڑی یہ دلیل ہے کہ وہ صحیح سلامت رہا۔ سلطان ہلاکو نے جب بغداد فتح کیا اور خلیفہ کو قتل کیا تو ملک اسی وزیر کے حوالے کر دیا۔ اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا اور اسے حاکم بنا دیا۔ اگر اس نے سازش کی ہوتی تو اس پر وثوق نہ کیا جاتا۔

کمال الدین احمد ابن ضحاک نے جو مویدالدین ابن علقمی کا بھانجا ہے بیان کیا کہ جب سلطان ہلاکو بغداد آیا تو اس نے پیغام بھیج کر اس وزیر کو بلوایا۔ جب وہ سلطان کے سامنے حاضر ہوا اور سلطان نے اس کی گفت گو سنی تو اسے بنظر استحسان دیکھا۔ جس شخص نے بارگاہِ سلطانی میں اس کے تعلقات پیدا کیے تھے وہ سلطان کا وزیر سعید نصیر الدین محمد طوسی تھا۔ لہٰذا جب بغداد فتح ہوا تو اس کا انتظام ابن علقمی اور علی بہادر شحنہ کے سپرد کر دیا گیا۔ یہ چند مہینے وزیر رہا پھر بیمار پڑ کر جمادی الاولیٰ ۶۵۶ھ میں مر گیا۔

سیوطی کا بیان اور پر جو تفصیل مذکور ہوئی وہ الفخری کی تھی۔ سیوطی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے:

ہلاکو کا حملہ ۶۵۲ھ میں ہلاکو غارت گر تاتاریوں کا ایک لاکھ کا لشکر لیے بغداد پر حملہ آور ہوا۔ خلیفہ مستعصم کی فوج نے مدافعت کی مگر شاہی فوج کو شکست ہوئی، اور ہلاکو اپنے ساتھ تاتاریوں کا غول لیے ۱۰ محرم ۶۵۶ھ کو بغداد میں داخل ہو گیا۔ تو وزیر مملکت علقمی نے خلیفہ مستعصم سے کہا کہ اب مصلحت یہ ہے کہ آپ چل کر حملہ آور فوج کے افسر سے مصالحت کر لیجیے، چلیے میں چلتا ہوں اور مصالحت کی گفت گو کرتا ہوں۔ اس کے بعد علقمی خود تاتاری فوج میں گیا۔ اور اپنی جان کی امان لے کر خلیفہ کے پاس آیا۔ اور کہا تاتاری سلطان اپنی بیٹی کی شادی حضور کے صاحبزادہ ابوبکر سے کرنا چاہتا ہے اور پھر آپ کو اسی طرح خلیفہ رکھنا چاہتا ہے جیسا کہ رومی حکومت میں خلیفہ برقرار رہے۔ وہ صرف اپنی بادشاہت تسلیم کرانا چاہتا ہے جیسا کہ آپ کے آبا و اجداد کے زمانے میں سلجوقی بادشاہ رہے ہیں۔ اس کے بعد وہ اپنا لشکر لیے واپس چلا جائے گا۔ اے امیر المومنین! آپ یہ بات بخوشی منظور فرمائیں جس کے نتیجے میں مسلمانوں کا خون بہنے نہ پائے گا۔ باقی آپ کو اختیار ہے۔

مستعصم کی ہلاکت نمک حرام وزیر مملکت علقمی کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر خلیفہ مستعصم اپنے مخصوص وزرائے دولت کو لیے ہوئے تاتاری جرگے میں گیا۔ جہاں ایک بہت بڑے عالی شان پردہ دار خیمہ میں اس کو ٹھہرا کر

علقمی خود تن تنہا ہلاکو کے پاس گیا۔ اور وہاں پہنچ کر فقہاء وغیرہ کو طلب کیا تاکہ معاہدۂ صلح مرتّب کریں۔ غرضیکہ ہلاکو نے بغداد کے تمام عالموں، امیروں اور ارکین سلطنت وغیرہ کو ایک ایک کر کے اس طرح قتل کیا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی پھر ان تمام لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد قتلِ عام شروع کر دیا۔ اور چالیس دن تک تاتاریوں کی تلوار بے نیام ہتیں ہوئی۔ اس شورش میں کئی لاکھ مسلمان شہید کیے گئے۔ البتہ کنوؤں اور تہہ خانوں وغیرہ میں چھپنے والوں کی جان بچ گئی اور خلیفہ مستعصم کو تاتاریوں نے ٹھوکریں مار مار کر مار ڈالا۔

ذہبی نے لکھا ہے کہ خلیفہ کی لاش دفن بھی نہ ہوسکی، خلیفہ کی اولاد اور رشتہ دار گرفتار اور قتل کیے گئے۔ اس جیسی بلا اور مصیبت اسلام میں مسلمانوں پر نہیں پڑی تھی۔ وزیر علقمی بھی اپنے ارادے میں کامیاب نہیں ہوا بلکہ تاتاریوں کے ہاتھوں ذلت اور خواری کے مزے چکھتا رہا۔ شاعروں نے بغداد کے اس حادثۂ عظیم پر مرثیے لکھے سبط تعاویذی نے بھی ایک مرثیہ لکھا جس کے ایک شعر کا ترجمہ یہ ہے:

ترجمہ "وزیر علقمی نے بغداد اور بغدادیوں کو تباہ کر کے ان کے گھر کھنڈر کر دیے"۔

بغداد کے خطیب نے آخری خطبے میں کہا تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس کے حکم سے مضبوط اور شاندار عمارتیں منہدم ہو گئیں اور بغداد کے باشندے فنا ہو گئے لیکن تلوار اب بھی ننگی ہے۔ تقی الدّین بن ابی یسرہ کا مرثیہ بغداد کے باشندوں کی ہلاکت و بربادی پر اب بھی نوحہ کر رہا ہے۔

علقمی کا حشر خلیفہ اور باشندگانِ بغداد کے قتل کے بعد ہلاکو نے عراق میں اپنے نائب مقرر کرنا شروع کیے تو علقمی نے منت سماجت کی کہ کوئی علوی خلیفہ ہی نائب مقرر کر دیا جائے لیکن ہلاکو نے صاف انکار کر دیا اور علقمی کو کسی قسم کا عہدہ دینے کی بجائے ذلیل و خوار رکھا علقمی بعض نوکروں کی طرح زندہ رہ کر تھوڑے ہی دنوں میں مر گیا۔

لہ سیوطی کے بیان پر تمام مؤرخین کا اتفاق ہے، تاریخ وصاف اور جہاں کشائے جوینی سے بھی سیوطی کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔

ایک اور بیان

مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی نے اپنی تاریخ میں دوسری متعدد تاریخوں کا جو خلاصہ پیش کیا ہے وہ مختصراً یہ ہے :

خلیفہ کے بیٹے ابوبکر نے شیعوں کی دست درازیوں کے روکنے کو خود بغداد کے محلہ کرخ پر حملہ کیا جو بالکل شیعوں کی آبادی تھی۔ اور علقمی کی نسبت بھی سخت سست الفاظ کہے۔ اس سے علقمی کو سخت ملال ہوا۔ اور خلیفہ سے شکایت کی مگر خلیفہ نے بیٹے کا لحاظ کیا اور علقمی کے حسب منشا ابوبکر کو سزا نہ دی۔ اس سے علقمی کی غداری میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ اس نے چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو خاں سے جو تاتاریوں کا سردار اعظم تھا خط و کتابت شروع کی۔ ہلاکو خاں کے پاس جب علقمی کا پہلا خط پہنچا تو ہلاکو خاں نے اس پر زیادہ توجہ نہ کی۔

علقمی کی چال

حقیقت یہ تھی کہ خلیفہ کی کثرتِ افواج، عربوں کی بہادری اور اہلِ بغداد کی شجاعت سے مغل بہت مرعوب تھے اور شام کے ملک میں ان کے لشکر کو عرب قبائل کے مقابلے میں شکستیں بھی حاصل ہو چکی تھیں۔ علقمی نے خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہو کر محاصلِ ملکی کی کمی اور فوج کی تنخواہوں کے زیادہ ہونے کی شکایت کر کے تخفیفِ لشکر کی تجویز پیش کی اور خلیفہ نے منظور کر لی۔ لشکر بغداد کا بڑا حصہ دوسرے شہروں اور ولایتوں میں منتشر کر دیا گیا۔ جو تھوڑے سے آدمی بچے ان کی تنخواہوں کی ادائیگی کے لیے یہ صورت اختیار کی کہ بازار کا محصول وصول کرنے کی لشکریوں کو اجازت دے دی۔ اس سے شہر والوں کو سخت اذیت پہنچی اور لوٹ مار کا بازار شہر میں گرم ہو گیا۔ فوج کے بہت سے دستوں کو وزیر علقمی نے موقوف کر کے نکال دیا۔ اور خلیفہ سے کہہ دیا کہ ان کو تاتاریوں کی روک تھام کے لیے سرحد پر روانہ کیا گیا ہے۔ بمقام حلہ میں شیعوں کی آبادی زیادہ تھی۔ حلہ کے شیعوں کو آمادہ کر کے ان سے ہلاکو کے پاس خطوط بھجوائے۔ ہلاکو کے دربار میں نصیر الدین طوسی کو بڑا رسوخ حاصل تھا اور وہ وزارت کی خدمات انجام دیتا تھا نصیر الدین طوسی بھی علقمی کی طرح شیعہ تھا۔ علقمی نے نصیر الدین کو خط لکھا کہ جس طرح ممکن ہو ہلاکو خاں کو بغداد پر حملہ کرنے کی ترغیب دو۔ اس وقت عباسیوں کی تباہی کے لیے بہترین موقع حاصل ہے۔ ساتھ ہی ہلاکو خاں کے نام عریضہ روانہ کیا اور لکھا کہ میں نے بغداد کو فوجوں سے خالی کر دیا ہے۔ اور سامانِ حرب سب باہر بھیج دیا ہے

اس سے بڑھ کر آپ اور کیا ضمانت چاہتے ہیں۔ اس عریضے کے ساتھ ہی والئ اربل سے ایک درخواست بھجوائی۔ اس میں بھی بغداد پر حملہ کرنے کی ترغیب دی گئی تھی۔ ہلاکو کے پاس یہ خطوط اس وقت پہنچے جب وہ قرامطہ یعنی اسمٰعیلیوں کا قلعہ الموت فتح کر چکا تھا۔ اور اسمٰعیلیوں کا آخری بادشاہ گرفتار ہو کر اس کے سامنے آچکا تھا۔ ہلاکو خاں نے نصیر الدین طوسی سے مشورہ طلب کیا۔ نصیر الدین نے کہا کہ علم نجوم سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ بغداد پر آپ کا قبضہ ہو جائے گا۔ اور بغداد پر حملہ آور ہونے میں آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ چنانچہ ہلاکو خاں نے زبردست فوج کے ساتھ بطور مقدمۃ الجیش بغداد کی جانب کوچ کیا ——

یکایک خبر مشہور ہوئی کہ ہلاکو خاں نے افواجِ کثیر کے ساتھ بغداد کا محاصرہ کر لیا ہے اہل شہر نے مدافعت کی کوشش کی اور پچاس روز تک تاتاریوں کو شہر میں نہیں گھسنے دیا۔ آخر وزیر علقمی اول شہر سے نکلا اور ہلاکو خاں سے مل کر صرف اپنے لیے امن طلب کر کے واپس آگیا۔ اور خلیفہ سے کہا کہ میں نے آپ کے لیے بھی امن طلب کر لیا ہے۔ آپ ہلاکو خاں کے پاس چلیں وہ آپ کو ملکِ عراق پر اسی طرح قابض و متصرف رکھے گا جیسا کہ غیاث الدین کیخسرو کو تاتاریوں نے اس کے ملک پر حاکم و فرمانروا رکھا ہے۔ خلیفہ مع اپنے بیٹے کے شہر سے نکل کر ہلاکو خاں کے لشکر میں پہنچا۔ ہلاکو خاں نے خلیفہ کو دیکھ کر کہا کہ اپنے اراکین سلطنت اور شہر کے علماء و فقہاء کو بھی آپ بلوائیں۔ خلیفہ کو ہلاکو خاں نے اپنے لشکر میں روک رکھا۔ خلیفہ کا حکم سن کر علماء و فقہاء اور اراکین سلطنت شہر سے نکل کر لشکر تاتار میں آئے ان سب کو ایک ایک کر کے قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد ہلاکو نے خلیفہ سے کہا کہ تم شہر میں پیغام بھیج دو کہ اہلِ شہر ہتیار رکھ کر سب خالی ہاتھ شہر سے باہر آجائیں۔ مستعصم نے یہ پیغام بھی شہر میں بھیج دیا۔ اہلِ شہر باہر نکلے اور تاتاریوں نے ان کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ شہر کے تمام سوار و پیادے اور شرفاء بھیڑ بکری کی طرح کئی لاکھ کی تعداد میں مقتول ہوئے۔ شہر کی خندق ان لاشوں سے ہموار ہو گئی۔ اور دریائے دجلہ کا پانی ان کے خون کی وجہ سے سرخ ہو گیا۔ تاتاری لوگ شہر میں گھس پڑے، عورتیں اور بچے اپنے سروں پر قرآن شریف رکھ رکھ کر گھروں سے نکلے مگر تاتاریوں کی تلوار سے کوئی بھی نہ بچ سکا۔ ہلاکو خاں نے اپنے لشکر کو قتلِ عام کا حکم دے دیا تھا

بغداد اور اس کے مضافات میں تاتاریوں نے چن چن کر لوگوں کو قتل کیا۔ اگلے دن بروز جمعہ نہم صفر ۶۵۶ھ کو ہلاکو خاں خلیفہ مستعصم کو ہمراہ لیے ہوئے بغداد میں داخل ہوا۔ قصر خلافت میں داخل ہو کر اجلاس کیا۔ خلیفہ کو سامنے بلوایا اور کہا کہ ہم تمھارے مہمان ہیں ہمارے لیے کچھ حاضر کرو۔ خلیفہ پر اس قدر دہشت طاری تھی کہ وہ کنجیوں کو نہ پہچان سکا۔ آخر خزانے کے تالے توڑے گئے۔ دو ہزار نہایت نفیس پوشاکیں ہزار دینار اور سونے کے زیورات ہلاکو کے سامنے پیش کیے گئے۔ اس نے کہا یہ چیزیں تم نہ دیتے تب بھی ہماری تھیں۔ یہ کہہ کر اپنے درباریوں میں سب کو تقسیم کر دیا۔ اور کہا کہ ان خزانوں کا پتا بتاؤ جن کا حال کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کہاں مدفون ہیں۔ خلیفہ نے فوراً ان خزانوں کا پتا بتایا، زمین کو کھود کر دیکھا گیا تو جواہرات اور اشرفیوں کی تھیلیوں سے بھرے ہوئے حوض نکلے ——

—— ہلاکو کی فوج کے ہاتھ سے بغداد اور مضافات بغداد میں ایک کروڑ چھ لاکھ مسلمان مقتول ہوئے۔ اور یہ تمام زہرہ گداز نظارے خلیفہ مستعصم کو دیکھنے پڑے۔ ہلاکو نے خلیفہ کو بے آب و دانہ نظر بند رکھا۔ خلیفہ کو بھوک لگی اور کھانا مانگا تو ہلاکو نے حکم دیا کہ طشت جواہرات کا بھر کر سامنے لے جاؤ۔ اور کہو کہ اسے کھاؤ۔ خلیفہ نے کہا کہ میں ان کو کیسے کھا سکتا ہوں۔ ہلاکو نے کہلا بھیجا کہ جس چیز کو تم کھا نہیں سکتے اس کو اپنی اور لاکھوں مسلمانوں کی جانیں بچانے کے لیے کیوں نہ خرچ کیا اور سپاہیوں کو کیوں نہ دیا کہ وہ تمھاری طرف سے لڑتے اور تمھارا موروثی ملک بچاتے۔ اور ہماری دست برد سے محفوظ رہتے۔

اس کے بعد ہلاکو نے مستعصم کے قتل کرنے کا مشورہ اپنے ارکین سے کیا۔ سب نے قتل کرنے کی رائے دی۔ اسے نمدے میں لپیٹ کر اور ایک ستون سے باندھ کر اس قدر لاتیں لگوائیں کہ خلیفہ کا دم نکل گیا۔ پھر اس کی لاش کو زمین میں ڈال کر مغل سپاہیوں کے پاؤں سے کچلوا کر پارہ پارہ اور ریزہ ریزہ کر دیا۔

شاہی کتب خانے کی بربادی

اس کے بعد ہلاکو نے شاہی کتب خانے کی طرف توجہ کی جس میں بے شمار کتابوں کا ذخیرہ تھا۔ یہ تمام کتابیں

دریائے دجلہ میں پھینک دی گئیں۔ جس سے دجلہ میں ایک بند سا بندھ گیا اور بہت دیر تک پانی سب کو بہا کر لے گیا۔ دجلہ کا پانی جو اس سے پہلے مقتولین کے خون سے سرخ ہو رہا تھا اب ان کتابوں کی سیاہی سے سیاہ ہو گیا، اور عرصے تک سیاہ رہا۔ تمام شاہی محلات لُوٹ لینے کے بعد مسمار کر دیے گئے۔

اور اس طرح وہ حکومت جو بڑے جاہ وجلال سے قائم ہوئی تھی ایک مرقعِ عبرت بن کر ختم ہو گئی۔

سچ کہا تھا سعدی شیرازی نے:

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں
بر زوالِ ملکِ مستعصم امیر المومنیں

لیکن یہ زمانہ ایسا تھا اور مسلمانوں میں خود غرضی اور نفسا نفسی کا یہ عالم تھا کہ مستعصم کی ہلاکت اور بغداد کی تباہی کی ذمہ داری صرف ابنِ علقمی پر نہیں ڈالی جا سکتی — گو اسے بری بھی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ہلاکو کی فوج کے شانہ بشانہ اور پہلو بہ پہلو چھوٹی چھوٹی مسلم ریاستوں کی فوج بھی بغداد کو تباہ کرنے کے لیے کیل کانٹے سے لیس تھی۔ خود سعدی شیرازی جنھوں نے بغداد کا اتنا دلگداز مرثیہ کہا ہے تاتاری فرماں رواؤں کی مدح میں قصیدہ کہنے پر مجبور ہو گئے۔

فاعتبروا یا اولی الابصار!

خلافت عبّاسیہ مصر میں

ڈھائی سو سال تک کے یاس انگیز احوال و کوائف

آغاز و انجام مستعصم کی ہلاکت اور بغداد کی تباہی کے بعد تقریباً ساڑھے تین سال کی مدت ایسی گزری کہ دنیائے اسلام میں کوئی خلیفہ نہیں تھا۔

ایک وہ زمانہ تھا کہ بیک وقت تین تین خلافتیں قائم تھیں، ایک بغداد میں عباسیوں کی، ایک سپین (اندلس) میں امویوں کی، ایک مصر میں فاطمیوں کی اور پھر وہ دور آیا کہ خلافت کی مسند خالی ہو گئی مسلمان موجود تھے لیکن امیر المومنین کوئی نہ تھا!

آخر مملوک خاندان نے نام نہاد طور پر عباسی خلافت مصر میں قائم کر دی۔ اب خلیفہ کی حیثیت صرف سجادہ نشین کی سی تھی۔ ملوک و سلاطین اس سے برکت حاصل کرتے تھے لیکن اقتدار و اختیار سے وہ محروم تھا۔ تقریباً ڈھائی سو سال تک یہ صورت قائم رہی پھر عثمانی ترکوں نے یہ صورت بھی قائم نہ رہنے دی اور خلافت کا تاج اپنے سر پر رکھ لیا۔

عباسیہ مصر کے مختصر احوال و کوائف یہ ہیں:

رجب ۶۵۹ھ میں مستعصم باللہ کے چچا ابوالقاسم احمد کے ہاتھ پر بیعت ہوئی۔ سلطان صلاح الدین بن ایوب نے حکومتِ فاطمی کے بعد مصر میں دولتِ ایوبیہ کی بنیاد ڈالی تھی۔ ۶۴۸ھ تک مصر، شام اور حجاز کی حکومت سلطان صلاح الدین کے خاندان میں رہی۔ سلطان صلاح الدین چونکہ قوم سے کُرد تھے اس لیے دولتِ ایوبیہ کو دولتِ کُردیہ بھی کہتے ہیں۔ دولتِ ایوبیہ کا

ساتواں بادشاہ ملک الصالح تھا جو سلطان صلاح الدّین کے بھائی کا پرپوتا تھا اس نے اپنے خاندانی رقیبوں کے خطرے سے محفوظ رہنے کے لیے علاقہ کوہِ قاف یعنی صوبہ سرکیشیا کے بارہ ہزار غلام خرید کر اپنی حفاظت کے لیے ایک جدید آہنی پیدل فوج قائم کی، اس کے عہد سلطنت میں فرانس کے عیسائی بادشاہ نے مصر پر جہازوں کے ذریعے فوج لاکر حملہ کیا۔ مملوک فوج نے نہایت بُردباری کے ساتھ مقابلہ کر کے فرانس کے بادشاہ کو میدانِ جنگ میں گرفتار کر لیا۔ اس کارنامے کے بعد مملوک فوج کا مرتبہ اور بھی بلند ہو گیا۔ ملک الصالح کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ملک معظم توران شاہ تخت نشین ہوا۔ مگر دو ہی مہینے کے بعد تختِ سلطنت پر ملک الصالح کی محبوب کنیز شجرۃ الدر نامی قابض ہو گئی۔ اس ملکہ کے عہدِ حکومت میں بےچینی و سرکشی کے آثار نمایاں ہوئے ملکہ شجرۃ الدر کچھ دنوں کے بعد گوشہ نشین ہو گئی اور برائے نام خاندان ایوبیہ کا ایک شخص ملک الاشرف موسیٰ بن یوسف تخت نشین ہوا اس کے عہدِ حکومت میں مملوکوں کا زور اور بھی بڑھ گیا آخر ۶۵۳ھ میں مملوکوں نے اپنی جماعت میں سے ایک شخص عزالدین ایبک صالحی کو ملک المعز کے لقب سے تخت نشین کیا۔ اور مصر میں خاندانِ ایوبیہ کی حکومت کا سلسلہ ختم ہو کر مملوکیوں یعنی غلاموں کی حکومت شروع ہوئی جو عرصہ دراز تک رہی۔ ۶۵۵ھ میں ملک المعز کے بعد اس کا نوعمر بیٹا علی تخت نشین ہوا۔ اور اس کا لقب ملک المنصور رکھا گیا۔ اور امیر سیف الدّین مملوک اس کا اتابک مقرر ہوا۔ ۶۵۷ھ میں علماء سے فتویٰ حاصل کر کے ملک المنصور کو اس لیے معزول کیا گیا کہ وہ ابھی بچّہ تھا اس کی جگہ امیر سیف الدّین تخت نشین ہوا اور ملک المظفر اس کا خطاب تجویز ہوا۔

مملوکوں کا اصولِ حکومت

عام طور پر مملوک اپنے اندر سے بیس پچیس آدمیوں کو منتخب کر کے ان کو حکومت کا اختیار دے دیا کرتے تھے۔ یہی بیس پچیس آدمی حکمراں کونسل کے ممبر سمجھے جاتے۔ اور اپنے اندر سے کسی ایک شخص کو منتخب کر کے اپنا امیر یا صدر بنا لیتے تھے۔ یہ صدر منتخب ہو کر بادشاہوں کی طرح تخت نشین ہوتا اور سلطان یا ملک کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ سلطان تخت نشین ہونے کے بعد باقی ممبرانِ کونسل کو بڑے بڑے فوجی و ملکی عہدے سپرد کرتا تھا۔ ان بیس یا پچیس عہدہ

داروں ہی میں سے کوئی وزیرِ اعظم ہوتا تھا کوئی رئیس العسکر، کوئی افسرِ پولیس ہوتا تھا کوئی افسرِ مال، غرض ان کے سوا باقی لوگوں کو ان سے کم درجے کے عہدے اور اختیارات ملتے تھے۔ ان کا مرتبہ سب پر فائق ہوتا تھا۔ مملوک فوج کے کچھ آدمی فوت ہو جاتے یا لڑائی میں مارے جاتے تو فوراً سرکاری خزانے سے اسی وقت سرکیسی غلام خرید کر تعداد کو پورا کر دیا جاتا۔ اس نظام پر چراکسہ یعنی مملوکوں کے طبقہ دوم نے زیادہ عمل درآمد کیا۔

مصر کے تخت پر متمکن ہونے والے مملوک اکثر زرِ خرید غلام ہی ہوتے تھے اور اپنی ذاتی قابلیت کے سبب تختِ حکومت تک پہنچتے تھے۔ مؤرخین نے اس طرف توجہ نہیں فرمائی اور دولتِ مملوکیہ مصر کی اس خصوصیت کو نمایاں اور واضح تر الفاظ میں بیان نہیں کیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دولتِ مملوکیہ مصر میں گو بعض باتیں قابلِ اصلاح ضرور تھیں مگر یہ بات بے حد قابلِ تعریف تھی کہ بادشاہ کے انتخاب کا اکثر آزادوموقع لوگوں کو مل جاتا تھا۔

ملک المظفر نے جب یہ سنا کہ مغل یعنی تاتاری افواج نے بغداد و عراق اور خراسان و فارس و آذربائیجان و موصل وغیرہ کو برباد و پامال کرنے کے بعد اپنی پوری طاقت سے شام کے علاقے کو برباد اور خاک سیاہ بنانا شروع کر دیا ہے تو وہ اپنا مملوک لشکر اور مصری افواج لے کر مصر سے شام کی طرف متوجہ ہوا۔ اور ۱۵ رمضان المبارک ۶۵۵ھ بروز جمعہ نہر جالوت پر مملوک فوج نے جس کا سپہ سالار رکن الدین بیبرس تھا مغلوں یعنی تاتاریوں کے لشکرِ عظیم کو ایسی شکستِ فاش دی کہ آج تک مغلوں کو ایسی ذلت آمیز شکست کھانے کا موقع نہ ملا تھا۔ ہزارہا مغل میدانِ جنگ میں کھیت رہے اور باقی مملوکیوں کے مقابلے سے اس طرح بھاگے جیسے شیر کے سامنے سے گوسفندوں کا گلہ فرار ہوتا ہے۔ مملوکیوں کے ہاتھ مغلوں کا بہت کچھ ساز و سامان آیا۔ اور ان کی دھاک مغلوں کے دلوں پر اس قدر بیٹھ گئی کہ مغلوں نے بیسیوں سلطنتوں کو تہ و بالا کر ڈالا۔ مگر ملکِ مصر کی طرف مملوکیوں کے خوف سے ان کو نظر بھر کر دیکھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ مملوکیوں نے حلب تک مغلوں کا تعاقب کیا پھر مصر کی جانب چلے گئے۔

رکن الدین بیبرس کا کارنامہ ۱۶۔ ذیقعدہ ۶۵۸ھ کو ملک المظفر کے مقتول ہونے

پر رکن الدین بیبرس تختِ نشین ہوا۔ اور اپنا لقب ملک الظاہر تجویز کیا۔ ملک الظاہر کو تخت نشین ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ خاندانِ عباسیہ کے سینتیسویں آخری خلیفہ مستعصم باللہ کا چچا ابوالقاسم احمد جو بغداد میں عرصے سے قید تھا بغداد کی بربادی اور مستعصم کے قتل ہونے کے وقت کسی طرح قید خانے سے نکل کر اور چھپ کر بھاگ نکلا تھا۔ اور وہ ملک شام کے کسی مقام میں روپوش اور موجود ہے۔

المستنصر باللہ

چنانچہ ملک الظاہر نے دس معزز عربوں کا ایک وفد مصر سے ابوالقاسم احمد بن ظاہر بامر اللہ عباسی کی تلاش میں روانہ کیا۔ یہ لوگ ابوالقاسم احمد کو ہمراہ لے کر مصر پہنچے۔ ملک الظاہر ابوالقاسم کے قریب پہنچنے کی خبر سن کر مصر کے تمام علماء و اراکین کو لے کر استقبال کے لیے اپنے دار السلطنت قاہرہ سے نکلا اور نہایت عزت و احترام سے شہر میں لا کر اس کے ہاتھ پر بتاریخ ۱۳۔ رجب ۶۵۹ھ بیعتِ خلافت کی۔ اور المستنصر باللہ کا لقب اختیار کیا۔ اس کے نام کا خطبہ پڑھوایا سکوں پر خلیفہ کا نام مسکوک کرایا۔ جمعہ کے دن خلیفہ کے جلوس کے ساتھ جامع مسجد میں آیا۔ بنی عباس کا شرف خطبہ میں بیان کیا اور خلیفہ کے واسطے دعا کی۔ بعد نماز خلیفہ نے سلطان ظاہر کو خلعت عطا کیا۔ ۴ شعبان ۶۵۹ھ بروز دوشنبہ قاہرہ سے باہر خیمے نصب ہوئے۔ خلیفہ نے دربار کیا اور اپنی طرف سے ملک الظاہر کو نائب السلطنت قرار دے کر سلطنتِ مصر کے سیاہ و سفید کا اختیار دیا یعنی اس مضمون کا ایک فرمان لکھ کر لوگوں کو سنایا۔ ملک الظاہر نے خلیفہ کے واسطے خدمت گار، خزانچی آبدار اور ضروری اہل کار مقرر کیے۔ اور خزانہ مصر کا ایک حصہ خلیفہ کے لیے مخصوص کر دیا جس میں اس کو تصرف کا اختیار حاصل رہا۔ اس طرح ابوالقاسم احمد ۲ محرم ۶۶۰ھ کو جب کہ ملک الظاہر مصر سے فوج لے کر تاتاریوں سے لڑنے کو ملکِ شام میں آیا ہوا تھا، ایک لڑائی میں گم یا مقتول ہو گیا۔ خلیفہ کے مفقود الخبر ہونے کے بعد ایک سال پھر زمانہ فترت گزرا۔ اور ملک الظاہر نے ایک اور عباسی شہزادے کا پتا لگوا کر بلوایا اور اس کو خلیفہ بنایا۔ اس شہزادہ کا نام ابوالعباس احمد بن حسن بن علی بن ابی بکر بن خلیفہ مسترشد باللہ بن مستظہر باللہ تھا۔ اس طرح خلیفہ مستظہر کی اولاد میں پھر خلافتِ عباسیہ شروع ہوئی۔ اس خلیفہ کا لقب حاکم بامر اللہ تجویز ہوا۔ اور ۲ محرم ۶۶۱ھ

کو وہ تخت نشین ہوا۔ ۶۷۴ھ میں ملک الظاہر نے ملک سوڈان کو فتح کیا جو نہایت عظیم الشان فتح سمجھی جاتی ہے۔ محرم ۶۷۶ھ میں ملک الظاہر فوت ہوا۔ ملک السعید تخت نشین ہوا۔ ۶۷۸ھ میں ملک المنصور مصر کا سلطان مقرر ہوا۔ ۶۸۰ھ میں ملک المنصور نے تاتاریوں کو شام میں پہنچ کر شکستِ فاش دے کر بھگا دیا۔ ۶۸۹ھ میں ملک المنصور فوت اور ملک الاشرف تخت نشین ہوا۔ ۱۸ جمادی الاوّل ۷۰۱ھ کو خلیفہ الحاکم بامراللہ ۴۰ سال ۵ مہینے دس دن کی خلافت کے بعد فوت ہو کر قاہرہ میں مدفون ہوا۔ اور اس کی جگہ اس کا بیٹا ابوالربیع مستکفی باللہ خلیفہ بنایا گیا۔

سرکیشی مملوکوں کا دورِ حکومت

خلاصہ یہ کہ مصر میں ۹۲۲ھ تک مملوکوں کی خود مختار سلطنت قائم رہی۔ ۷۸۴ھ تک سرکیشی مملوک جو مملوک بحریہ کہلاتے تھے حکمراں ہوتے رہے۔ اس کے بعد مملوکوں کی ایک دوسری قوم جو جرکسی مملوک کہلاتے تھے بادشاہ ہوتے لگے بحریہ مملوکوں کا آخری سلطان ملک صالح رمضان ۷۸۴ھ میں معزول ہوا۔ اور برقوق جرکس ملک الظاہر کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد ۹۲۲ھ تک یکے بعد دیگرے جرکسی (گرجی) مملوک مصر کے بادشاہ ہوتے رہے۔ گرجی یا جرکسی مملوکوں کے آخری سلطان تومان بے کو سلطان سلیم عثمانی کے مقابلے میں شکست ہوئی۔ اور مصر کا ملک سلطنتِ عثمانیہ کے مقبوضات میں شامل ہوا مملوکوں کی حکومت کے ابتدائی زمانے میں خلفائے عباسیہ کا دوسرا سلسلہ مصر میں شروع ہو گیا تھا جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ یہ سلسلہ مملوکوں کی حکومت کے ساتھ ہی ۹۲۲ھ میں ختم ہوا۔

خلافت ترکوں کے ہاتھ میں

سلطان سلیم عثمانی نے مصر پر قبضہ کرنے کے بعد مصر کے عباسی خلیفہ محمد نامی پر بھی قبضہ کیا جو خلفائے مصر کے سلسلے میں اٹھارواں اور آخری خلیفہ تھا۔ اس خلیفہ کے پاس جو علَم اور جبّہ بطور نشانِ خلافت موجود تھا وہ سلطان سلیم نے اس کو رضامند کر کے لے لیا۔ اور مصر سے چلتے وقت اس آخری عباسی خلیفہ کو بھی اپنے ساتھ ہی لے گیا۔ اس عباسی خلیفہ

نے سلطان سلیم کو امر خلافت میں اپنا جانشین بنا دیا۔ اور اس طرح ۹۲۲ھ میں عباسیوں کی وہ خلافت جو سفاح سے شروع ہو کر اب آٹھ سو برس کے بعد برائے نام اسم بےمسمیٰ ہو کر رہ گئی تھی ختم ہوئی اور خاندانِ عثمانیہ میں جو اس زمانے میں سب سے زیادہ حقدار خلافت تھا شروع ہوئی۔ خاندانِ عباسیہ میں سینتیس خلیفہ بغداد اور عراق میں ہوئے۔ اور اٹھارہ مصر میں جن کی کل تعداد پچپن ہوتی ہے۔

ہلاکو کا انتقال۔ تاتاریوں کی اسلام سے رغبت

سیوطی نے عباسیۂ مصر کے حالات وکوائف کے سلسلے میں کئی کئی باتیں لکھی ہیں سیوطی کا بیان ہے:۔

۱: ۶۶۱ھ اور اس کے بعد کے تاتاریوں نے اسلام قبول کرنا شروع کیا۔ اور مسامن بن کر رہنے لگے پھر ان نومسلم تاتاریوں کی تنخواہیں وغیرہ مقرر کر دی گئیں۔ اس طرح تاتاری مشرکین کی شرارت کی روک تھام ہوئی۔

۲: ۶۲۲ھ میں قصرین کے مدرسہ ظاہریہ کی تعمیر مکمل ہو گئی جس میں فقہ شافعی پڑھانے کے لیے لقی بن زرین اور حدیث شریف پڑھانے کے لیے شرف دمیاطی مقرر ہوئے۔

۳: ۶۶۳ھ میں سلطان المسلمین ابو عبداللہ بن احمر بادشاہ اسپین کو فرنگیوں پر فتح ہوئی سلطان نے ان سے انتقام لیا اور غصب کیے ہوئے بتیس شہر مسلمانوں کے قبضے میں آئے جن میں اشبیلیہ و مرسیہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

۴: اسی سال قاہرہ کے اکثر مواقع میں آتش زنی ہوئی۔ یہ آگ لاوے کی شکل میں تھی اور سطح زمین پر گندھک ابل کر آگئی۔

۵: اسی سال سلطان نے بہ نفس نفیس دریائے اشمون کھدوایا جس میں امرائے حکومت نے بھی حصہ لیا۔

۶: اسی سال یعنی ۶۶۳ھ میں تاتاریوں کے طاغوت اکبر ہلاکو کا انتقال ہوا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا ابغا خاں تخت نشین ہوا۔

۷: اسی سال ملک الظاہر نے اپنے کم عمر چار سالہ بیٹے ملک السعید کو ولیعہد بنایا اور قلعۃ الجبل سے اس کی سواری نکالی اس زبردست جلوس میں سلطان باب سر سے باب سلسلۃ تک ملک السعید لباسِ شاہی کا دامن پکڑے ہوئے پیدل چلتا رہا۔ یہاں تک کہ یہ پورا جلوس جس میں تمام امرائے حکومت وغیرہ شریک تھے بادشاہ کے ساتھ ہی پیدل قاہرہ آئے۔

۸: اسی سال مصر میں مذہبِ اربعہ کے چار قاضی مقرر کیے گئے کیونکہ قاضی تاج الدین بن بنت الاعز اکثر مقدمات کا فیصلہ نہیں کر سکے تھے۔ اور سرکاری احکام کی تعمیل بھی نہیں کرائی تھی۔ بلکہ تمام کام جوں کا توں پڑا ہوا تھا۔ مذہب شافعیہ کے پیشِ نظر یتیموں کا مال و دولت بیت المال میں داخل نہ ہو سکا تھا۔

۹: ماہ رمضان ۶۶۳ھ سے سلطان نے خلیفہ کے اندرونِ پردہ رہنے کا انتظام کیا۔ اور لوگوں کو ہر وقت خلیفہ کے پاس آمدورفت کی ممانعت کر دی۔

۱۰: ۶۶۵ھ میں سلطان نے جامع مسجد حسنیہ بنوانا شروع کی۔ پھر ۶۶۷ھ میں اس کی تعمیر مکمل ہو جانے پر حنفی مذہب کے اس میں خطیب مقرر کیے۔

۱۱: ۶۷۶ھ کے ماہ محرم میں ملک الظاہر کا دمشق میں انتقال ہوا۔ اور اس کا ۸ سالہ فرزند ملک سعید محمد تختِ سلطنت پر بیٹھا۔

۱۲: ۶۸۰ھ میں تاتاری لشکر نے شام پہنچ کر سخت اضطراب پیدا کیا سلطان نے ان سے مقابلہ کیا۔ اور سخت معرکہ آرائی کے بعد اللہ کا شکر ہے مسلمانوں کو فتح ہوئی۔

۱۳: ۶۸۸ھ میں سلطان نے بزورِ شمشیر طرابلس پر قبضہ کیا جو ۵۰۳ھ سے عیسائیوں کے تسلط میں تھا۔ اگرچہ طرابلس بہ زمانہ امیر معاویہؓ فتح ہو چکا تھا لیکن بعد کو فرنگیوں نے اس پر قبضہ جما لیا تھا۔

پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

۱۴: اسی سال یعنی ۶۹۴ھ میں قازان بن ارغون بن ابغا بن ہلاکو بادشاہ تاتار اسلام لایا جس سے مسلمانوں کو خوشی ہوئی اور اس کی فوج میں بھی اسلام تیزی سے پھیلنے لگا۔

وزیر اور علامہ ابن تیمیہ میں اختلاف ۷۰۹ھ میں وزیر نے سلطان ناصر سے کہا کہ

ذمیوں کو سفید پٹکا بسر پر باندھنے کا حکم دیا جائے حالانکہ وہ سات لاکھ اشرفیاں سالانہ جزیہ بھی دیا کرتے تھے۔ وزیر کے اس حکم کی شیخ تقی الدین امام ابن تیمیہ نے مخالفت کی اللہ کا شکر ہے کہ وزیر کا یہ حکم صادر نہ ہو سکا۔

۱۶: اسی سال تاتاری بادشاہ فوبند نے اپنی مملکت میں شیعوں کو عروج دیا اور خطیبوں کو حکم دیا کہ خطبہ میں صرف حضرت علیؓ اور حضرت حسنین علیہما السلام کا نام لیا جائے۔ جس کی تعمیل اس کی وفات ۷۱۶ھ تک ہوتی رہی۔ فوبند کے انتقال پر اس کا بیٹا ابو سعید بادشاہ ہوا جس نے انصاف سے کام لینا شروع کیا۔ سنتِ نبوی کی تعمیل کرائی اور حضرت ابو بکر صدیقؓ و عمر فاروقؓ، و عثمان غنیؓ اور علی مرتضیٰؓ کا نام سلسلہ وار خطبوں میں پڑھوایا۔ اکثر و بیشتر فتنوں کا سدِّ باب کیا تاتاریوں میں یہ بادشاہ مرتے دم تک عمدہ طریق پر کارگزار رہا۔ اس کی وفات ۷۳۶ھ کے بعد سلطنت تاتار میں افتراق و انتشار رونما ہو گیا۔

۱۷: ۷۳۶ھ میں سلطان اور خلیفہ کے درمیان

سلطان ناصر اور خلیفہ مستکفی میں رنجش

چشمک ہو گئی۔ چنانچہ سلطان نے خلیفہ کو ایک قلعہ میں بند کر کے حکم دیا کہ یہاں کوئی آدمی نہ آنے پائے پھر خلیفہ کو ۷۳۷ھ میں قوص بھیج دیا۔ اس کے اور اس کے اہل و عیال کیلئے جنکی تعداد تقریباً ایک سو تھی ایک معقول وظیفہ مقرر کر دیا۔ جو اُن کی ضروریات کے لیے بالکل کافی تھا چنانچہ خلیفہ مستکفی باللہ ابو ربیع نے قوص کے قلعہ میں نظر بند رہ کر ماہ شعبان ۷۴۰ھ میں انتقال کیا اور وہیں دفن کیا گیا۔ خلیفہ مستکفی باللہ ابو ربیع ۵۶ سال زندہ رہا۔

ابن حجر عسقلانی نے کتاب الدرر میں لکھا ہے خلیفہ المستکفی باللہ عالم، فاضل، سخی، خوش نویس اور بہادر تھا۔ چوگان بازی اور بندوق چلانے میں مشہور تھا۔ عالموں اور ادیبوں کو اپنی صحبت میں رکھتا اور انھیں انعام و اکرام دیتا۔ آزادی، قید اور قوص میں نظر بندی کے زمانے میں بھی اس کا نام ہمیشہ خطبوں میں پڑھا گیا۔

۱۸: مستکفی باللہ بن الحاکم بامر اللہ آخری عباسی خلیفہ تھا جس کی وفات کے بعد خطبوں میں کسی خلیفہ کا نام پڑھنا متروک ہو گیا اور دعا میں صرف سلطان ملک ناصر کا نام لیا جانے لگا۔ یعنی

مسلمانوں نے ایک قدیم رواج ترک کر دیا۔

تیمور لنگ۔ ایک عذاب

۱۹: ۷۷۳ھ میں سرکش تیمور لنگ نے حملے کیے۔ شہروں کو برباد اور لوگوں کو ہلاک کیا، وہ عمر بھر فتنہ و فساد برپا کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ۸۰۷ھ میں اللہ تعالیٰ نے اسے ہلاک کیا جیسا کہ ایک شاعر نے لکھا ہے کہ تاتاریوں کی بہ نسبت تیمور لنگ کے کردار بہت زیادہ خراب تھے۔ وہ جسے چاہتا مار ڈالتا۔

تیمور لنگ کی اصلیت یہ ہے کہ یہ ایک کسان کا لڑکا تھا۔ بچپن میں معمولی چوپایہ چَرایا کرتا تھا۔ بڑا ہو کر ڈاکے ڈالنے لگا۔ پھر بادشاہ کی فوج میں بھرتی ہو کر ترقی کرتا گیا۔ یہاں تک کہ بادشاہ کے انتقال کے بعد اس کے تختِ شاہی کا مالک بن بیٹھا۔

کسی نے تیمور لنگ کے پہلے حملے کا سنہ پوچھا تو دوسرے نے جواب دیا۔ "سالِ عذاب" جس کا حروفِ ابجد کے لحاظ سے ۷۷۳ھ نکلتا ہے۔

عہدِ عباسی پر ایک نظر

اموی سو برس تک مالکِ تاج و نگیں رہے۔
عباسی آٹھ سو سال تک تختِ شہر یاری پر متمکن رہے۔
عباسیوں سے غلطیاں بھی ہوئیں اور نیکیاں بھی۔ سیاسی اعتبار سے یہ دورِ حکومت بہ حیثیتِ مجموعی بہت شاندار ہے۔ خالص دینی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا اس کی خامیاں ہی اس کی بربادی کا باعث بنیں۔
تاریخ اپنے دامن میں زر و جواہر بھی رکھتی ہے اور خس و خاشاک بھی، خون کے دھبے بھی اور کٹی ہوئی گردنوں کے مرقعے بھی!
عہدِ بنو عباس کی تاریخ اپنے دامن میں یہ ساری چیزیں رکھتی ہے زر و جواہر، خس و خاشاک، خون کے دھبے اور کٹی ہوئی گردنوں کے مرقعے سب ہی کچھ!
اس عہد کی تاریخ کا اگر تفصیل و استیعاب سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا " پستش بغایت پست، بلندش بغایت بلند!
اس عہد نے جو تہذیب پیدا کی ہے اس کا جواب نہیں، مدنیت، حضارت، اور ثقافت کو جو ترقی ہوئی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس عہد میں امیروں کو غریب بھی بننا پڑا لیکن غریب بھی جب امیر بنے تو ان کی اونچائی آسمان سے باتیں کرنے لگی۔ دولت کی اتنی افراط تھی کہ ناواجب، غلط اور اندھا دھند تقسیمِ دولت کے باوجود نہ غربت عام ہوئی نہ فلاکت، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہُن برس رہا ہے اور خود بخود لوگوں

کے جیب و دامن سیم و زر سے بھرتے چلے جا رہے ہیں۔

عہدِ نبوی کے بعد خلافتِ راشدہ کا دور لفظی و معنوی ہر اعتبار سے صحیح ترین اسلامی حکومت تھا۔ پھر بنو امیہ کے دور میں یہ ہیئتِ اسلامیہ ایک مطلق العنان بادشاہت میں تبدیل ہو گئی۔ جس میں نہ شوریٰ کا سوال تھا، نہ تعزیر و عقوبت اور اجر و انعام میں اسلامی اقدار کا، نہ قرآن کی حکومت باقی رہ گئی تھی۔ نہ سنتِ نبوی کی کارفرمائی قائم تھی عدلیہ اور انتظامیہ میں کوئی تفریق نہیں تھی۔ بلکہ عدلیہ پر انتظامیہ کی حکومت تھی۔

بنی عباس کی حکومت بھی اسلامی حکومت نہ تھی۔ اس میں بھی شوریٰ یعنی جمہوریت کا کوئی وجود نہ تھا۔ یہ بھی مطلق العنان بادشاہت تھی۔ بلکہ بادشاہت سے اس نے شہنشاہیت کا روپ دھار لیا تھا۔ مگر بایں ہمہ اسلامی نظامِ عدل و مملکت کا جو مفصل، مکمل اور مدلل ضابطہ تیار ہوا وہ اسی دور کی خصوصیت کا خاصہ ہے۔ امام ابو یوسف نے اس سلسلے میں جو اصول اور ضابطے تیار کیے اور اسلامی عدل اور نظامِ مملکت کا سب سے بڑا ناقابلِ فراموش اور زبردست کارنامہ ہے۔ بعد میں اسی بنیاد پر دوسری شان دار عمارتیں تیار ہوئیں۔

تاریخ کے اوراق سامنے رکھ لیے جائیں، اقوامِ ماضی کی تاریخ عروج و ارتقا کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ عباسی حکومت ایک مرتبۂ خاص پر فائز ہے، اس کی انفرادیت ہر جگہ عجیب اور عظیم نظر آتی ہے۔

لیکن بدقسمتی سے اسلامی تاریخ کا خالص اسلامی نقطۂ نظر سے جب مطالعہ کیا جائے تو یہی پیشِ نظر نہیں رکھا جاتا کہ خزانہ معمور تھا۔ شہر بن رہے تھے، عمارتیں تعمیر ہو رہی تھیں۔ تہذیب و تمدن اور حضارت و ثقافت کی طرحِ نو کا آغاز ہو رہا تھا۔ علم و ادب کا پایہ اونچا ہو رہا تھا۔ شعر و نظم کی تجدید و تنظیم ہو رہی تھی، دار الترجمہ قائم ہو رہا تھا۔ بیمارستان کی بنیاد پڑ رہی تھی۔ علومِ غیر کے نقل و ترجمہ پر غیر معمولی توجہ کی جا رہی تھی۔ نئے نئے فنون ایجاد ہو رہے تھے۔ ثقافتی سرگرمیاں از قبیل رقص و نغمہ نقطۂ عروج پر تھیں۔ یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ ان سب چیزوں میں اسلامی روح بھی کارفرما تھی یا نہیں! دین سے دور رہ کر، دین سے الگ رہ کر، دین کو نظر انداز کر کے بھی ترقی کی

جا سکتی ہے اور کی جاتی ہے۔ یہ سعادت غیر مسلموں کے علاوہ مسلمانوں کے حصے میں بھی آتی اور خوب آئی۔ لیکن یہ ترقی خواہ کتنی ہی چکاچوند پیدا کرنے والی ہو، خواہ کتنی ہی نظر افروز اور حیرت انگیز ہو مسلمانوں کی تو ہو سکتی ہے لیکن اسلام کی نہیں۔

جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی!

اور کوئی شبہ نہیں مسلمانوں کی سیاست جب بھی دین سے جُدا ہوئی تو خاص طور پر نیکو کاروں، پاک سرشتوں اور صالح کردار رکھنے والوں کے لیے چنگیزی بن گئی۔ ان کے لیے زندگی اجیرن بن گئی۔ زندہ رہنا مشکل ہو گیا۔ سچی بات کا مُنہ سے نکالنا دشوار ہو گیا۔

ابوبکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ و علیؓ کو لوگ مسجد کے صحن میں، دار الخلافت میں، بر سرِ راہ ٹوک سکتے تھے، باز پرس کرتے تھے، اعتراض کر سکتے تھے لیکن بعد کی حکومتیں اتنی حسّاس اور نازک مزاج بن گئیں کہ مدح و ثنا کے سوا کسی چیز کا تحمّل ان کے لیے دشوار تھا۔

یہی حالات تھے جب تصوّف اُبھرا۔

تصوّف درحقیقت ردِّ عمل تھا اس غیر دینی اقتدار کا جو مسلمانوں کی حکومت میں جگہ پاتا جا رہا تھا۔

اسلام تزکیۂ نفس اور تطہیرِ رُوح کے لیے آیا تھا، اسلامی حکومت جب تک اسلامی حکومت رہی اس فریضے کو خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیتی رہی لیکن جب اس جادہ سے ہٹ گئی تو ایک جماعت پیدا ہوئی جس نے سیاست اور امورِ مملکت کی طرف سے یکسر غافل ہو کر اپنی توجّہ اور سرگرمیوں کا مرکز و محور صرف رُوح کی طہارت اور نفس کے تزکیہ کو رکھا۔ دُنیا سے، امورِ دُنیا سے بے تعلق ہو کر، حکومت سے، معاملاتِ حکومت سے بے پرواہ ہو کر زاویوں، خانقاہوں اور حجروں میں اس نے پناہ لی اور صرف اپنے کام سے کام رکھا۔ اور کوئی شبہ نہیں اس جماعت نے اقدارِ اسلامی کے احیاء و تجدید کے سلسلے میں جو علمی اور عملی کارنامے انجام دیے ہیں وہ تاریخِ حیاتِ اسلامیہ کا ایک تابناک اور روشن باب ہیں۔ انھیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ جماعت

میدانِ عمل میں نہ آتی تو اسلام کا وجود خطرے میں پڑ جاتا۔ اسلام کے اقدار فنا ہو جاتے اور اسلامی اصول وحقِ طاقِ نسیاں ہو جاتے۔ اسلام کی تاریخ میں اس جماعت کو بہت بڑا مقام حاصل ہے۔

کوئی شبہ نہیں بغداد پر تاتاریوں کی یورش بغداد کی تباہی مسلمانوں کا قتلِ عام اسلامی تہذیب وتمدن، علوم وآداب اور نقوشِ آثار کی بربادی تاریخ کا بہت بڑا المیہ ہے اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اس آفت کے لانے میں ابن علقمی خلیفہ مستعصم کے وزیر اعظم اور مشہور مہندس اور فلسفی خواجہ نصیر الدین طوسی ہلاکو خاں کے مشیر اعظم کا بہت بڑا حصہ تھا علقمی بار بار ہلاکو کے پاس دعوت نامے بھیجتا رہا اور خواجہ صاحب اسے یورش پر اکساتے رہے لیکن اس صورتِ احوال کی ذمہ داری مستعصم پر بھی تھی۔ ایک طرف اس نے ابن علقمی کو وزیر اعظم بنا کر امور مملکت کا رازدار اور نگہبان بنایا۔ دوسری طرف وہ اس نہ ختم ہونے والے خونریز اور ہولناک شیعہ سنی فساد نہ روک سکا جس نے بد امنی اور بدنظمی انتہا کو پہنچادی تھی، بلکہ لطف کی بات یہ ہے کہ سنی ہونے کی حیثیت سے مستعصم سنیوں کی پاسداری کرتا رہا اور شیعہ ہونے کی حیثیت سے ابن علقمی شیعوں کا ساتھ دیتا رہا۔ سنیوں اور شیعوں کا خون بہتا رہا، کوئی ایسا نہ تھا جو اسلام کا نام لے کر انھیں متحد کرتا اور مشترک دشمن کے مقابلے پر آمادہ کرتا۔ کیونکہ یہ مشترک دشمن تھا۔ اس کی تلوار شیعوں اور سنیوں پر یکساں چلتی تھی۔ دونوں کے گلے ساتھ ساتھ کاٹتی تھی اور کسی طرح کی تفریق روا نہیں رکھتی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کو جتنا نقصان حرب، عقائد، بیکار باہمی اور خانہ جنگی سے پہنچا کسی بڑے سے بڑے دشمن سے بھی نہیں پہنچا، بہرحال خدا کی مرضی پوری ہو کر رہی جو ہونا تھا ہو کر رہا۔ وکان امر اللہ مقدورا!

لیکن درحقیقت غور کیجیے تو اموی اور عباسی حکومت کے زوال و انہدام میں قدرت کی کارفرمائی بھی شامل تھی۔ قدرت سزا دیر میں دیتی ہے لیکن معاف ہرگز نہیں کرتی۔

کیسے کیسے جلیل القدر علماء، صلحاء، اتقیاء، فقہاء، محدثین اور صحابہ تک موت کے گھاٹ محض حق پرستی کے جرم میں اتار دیے گئے۔ کیسے کیسے جلیل القدر سپہ سالار قائدانِ فوج اور ماہرینِ فنونِ جنگ محض شک و شبہے کی بنا پر بے دردی سے ہلاک کر دیے گئے۔ اور ان کی لازوال خدمات اور کارنامے شفیع نہ بن سکے۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ ان دونوں حکومتوں کا تختہ الٹ گیا۔

تاریخ میں ایسے واقعات شاذ و نادر ہی ملتے ہیں کہ مسلمانوں نے میدانِ جنگ میں شکست، بزدلی یا کم ہمتی کے باعث کھائی ہو، ان کی شکست کا سبب صرف باہمی خلفشار اور باہمی جنگ و پیکار ہی رہا ہے۔ اگر وہ متحد اور متفق رہتے اور ہوسِ اقتدار میں مبتلا ہو کر آپس میں لڑنے نہ لگتے تو آج دنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا!

عہدِ عباسیہ کی خود مختار حکومتیں

حرفِ آغاز

بنو عباس کا عہدِ حکومت آٹھ سو سال تک پھیلا ہوا ہے، یہ بہت طویل مدت ہے، بنو عبّاس کے ختم ہونے کے بعد ترکانِ آلِ عثمان ان کے جانشین ہوئے۔

لیکن قبل اس کے کہ ہم ترکانِ آلِ عثمان کی تاریخ بیان کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حد درجہ اختصار کے ساتھ ان آزاد اور خود مختار حکومتوں کا ذکر بھی کر دیں جو اس مدت میں پردۂ نمود پر اُبھریں اور اپنی مدّت پوری کر کے ختم ہو گئیں اذا جاء اجلھم لایستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون۔

ان حکومتوں میں بعض بہت چھوٹی تھیں، بعض بڑی تھیں، بعض بہت بڑی تھیں۔

ضروری ہے کہ ان سب کا ذکر کر دیا جائے تاکہ ایک طرف ربط و تسلسل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے دوسری طرف واقعات کی صحیح تفصیل اور تصویر نظر کے سامنے رہے۔

چھوٹی حکومتوں کا خفی، بڑی حکومتوں کا اجمالی اور بہت بڑی حکومتوں کا تفصیلی لیکن اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم ذکر کریں گے۔

اس کے بعد ترکانِ آلِ عثمان کی تاریخ پیش کی جائے گی۔

آٹھویں منزل

اندلس

ہسپانیہ تو خونِ مسلماں کا امیں ہے
مانندِ حرم پاک ہے تو میری نظر میں

تعارف

عرب کے صحرا سے مسلمان نکلے اور دُنیا کے بہت بڑے حصّے پر چھا گئے۔ ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست!

اندلس، اسپین یا ہسپانیہ یورپ کا ایک ملک ہے مسلمان یہاں بھی پہنچے۔ اور کم و بیش آٹھ سو سال تک شان و شکوہ اور عظمت و جلال کے ساتھ شہریاری کرتے رہے

غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے
جہانگیر و جہاں بان و جہاں ساز و جہاں آرا

یہ داستان بڑی طویل ہے لیکن ہم اسے اختصار کے ساتھ بیان کریں گے۔

سب سے پہلے اس خطۂ ارض کا تعارف ضروری ہے:

یورپ کا یہی جنوبی اور مغربی جزیرہ نما ہے جو اندلس، اسپین یا ہسپانیہ کہلاتا ہے اس کا رقبہ دو لاکھ مربع میل سے زیادہ ہے۔ آب و ہوا یورپ کے دوسرے ملکوں کے مقابلے میں بجید معتدل، زمین زرخیز، چاندی اور دوسری گراں بہا دھاتوں کی کانیں بھی یہاں پائی جاتی ہیں۔ ٹیگس اور وادی الکبیر یہاں کے دو مشہور اور بڑے دریا ہیں، اس جزیرہ نما کی شمالی سرحد پر خلیج بسکے اور جبل البرتات ہے۔ مشرق میں بحر روم یا بحر متوسط، جنوب میں آبنائے جبل الطارق، بحر متوسط اور بحر ظلمات اور مغرب میں بحر ظلمات ہے۔

یہ جزیرہ نما متعدد صوبوں، ولایتوں، شہروں اور آبادیوں کا مجموعہ ہے، قرطبہ اور

غرناطہ اس کے صوبۂ اندولسیہ کے جنوبی حصّے میں واقع ہیں، اشبیلیہ بھی جنوبی مغربی علاقے کا شہر تھا۔ یہاں کا سب سے زیادہ زرخیز جنوبی علاقہ ہے۔ اور مسلمانوں کا عرصۂ دراز تک اس پر دوسری ولایات کے علاوہ قبضہ رہا۔

گاتھ سلطنت میں امتدادِ زمانہ کے ساتھ ہی ساتھ مذہبیت ترقی کرتی گئی۔ وہاں علیحدٰہ مذہبی مرکز یعنی چرچ قائم تھا۔ قانونِ سلطنت میں عیسوی تنگ دلی خوب داخل ہو گئی تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اندلس کے یہودی دمبدم ذلیل ہوتے گئے۔ یہودیوں کو عیسائی اپنا غلام سمجھتے تھے۔ ان کی جائدادیں زبردستی چھین لی جاتی تھیں۔ اُن سے ہر قسم کی خدمت لی جاتی تھی اور ان کا مرتبہ حقوق کے اعتبار سے چوپایوں کے قریب پہنچا دیا گیا تھا۔ حالانکہ گاتھوں کی حکومت کے ابتدائی زمانے میں یہودیوں کی ایسی ذلیل و سقیم حالت نہ تھی۔ بُت پرستی کے تمام اوہام باطلہ اندلس کے عیسائیوں میں موجود تھے۔ تہذیب و شائستگی، علوم و فنون اور تجارت کے اعتبار سے یہودیوں کو عیسائیوں پر فضیلت حاصل تھی۔ عیسائی عام طور پر عیش پسند اور تن آسان تھے۔ مگر یہودیوں میں جفاکشی موجود تھی چونکہ یہودی تعداد میں کم تھے اور حکومت بھی عیسائیوں کی تھی لہٰذا وہ اپنی نجات کے لیے کوئی کوشش نہیں کر سکتے تھے۔ پادری لوگ معاملاتِ سلطنت میں اس قدر زیادہ دخیل ہو گئے تھے کہ بادشاہ اُن کے خلاف کوئی کام کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ بڑی بڑی جاگیریں اور زرخیز علاقے پادریوں کے قبضے میں تھے، خود پادریوں کے مکان عشرت کدے بنے ہوئے تھے۔ بدمستیوں کے تمام نظارے پادریوں کی مجلسوں میں دیکھے جا سکتے تھے۔ پادریوں کے فتوے بڑے بڑے عالی جاہ اور صاحبِ سطوت لوگوں کو سرنگوں کر سکتے تھے۔ ایک ایک پادری کے پاس سو سو اور دو دو سو بردی غلاموں کا موجود ہونا تو معمولی بات تھی، ان کے احکام کی کہیں اپیل ہو سکتی تھی گاتھ سلطنت کا دارالحکومت طلیطلہ تھا۔ طلیطلہ میں اسقفِ اعظم یالاٹ پادری چرچ ہسپانیہ کا صدر اعظم رہتا تھا۔ اسقفِ اعظم کے حقوق میں یہاں تک ترقی ہو چکی تھی کہ وہ بادشاہ کی معزولی کا فرمان بھی صادر کر سکتا تھا۔ غرض اندلس میں خالص عیسوی حکومت قائم تھی۔

ساتویں صدی عیسوی کے آخری عشرہ میں اپنی شان و شوکت اور وسعتِ مملکت کے

اعتبار سے گاتھ سلطنت اپنے معراجِ کمال کو پہنچ چکی تھی۔ تمام بحرِ روم پر اُن کی سیادت مُسلّم تھی۔

گاتھ قوم کا بادشاہ وٹیزا طلیطلہ میں برسرِ حکومت تھا، اس نے عیسائیوں یعنی پادریوں کے اقتدار کو توڑنے اور کم کرنے کی کوششیں شروع کیں۔ پادریوں نے اس پر یہ الزام لگایا کہ وہ یہودیوں کا خیر خواہ ہے چنانچہ انھوں نے وٹیزا کو معزول کر کے ایک فوجی سردار لرزیق کو جو شاہی خاندان سے نہ تھا تخت نشین کیا۔ اس طرح گاتھوں کی سلطنت کا خاتمہ ہو کر لرزیق کی حکومت پانچویں صدی عیسوی کے آغاز میں شروع ہوئی۔ لرزیق ایک کار آزمودہ سپہ سالار اسّی سال کی عمر کا تجربہ کار شخص تھا

لرزیق نے تخت نشین ہو کر نہایت اطمینان اور پوری طاقت کے ساتھ حکومت شروع کی اور پادریوں کے اقتدار میں کسی قسم کا فرق نہ آنے پایا۔

افریقہ (مراکو) کے شمالی ساحل پر سبطہ یا سوطا ابھی تک عیسائیوں کے قبضے میں تھا۔ اس قلعے کا قلعہ دار ایک شخص کونٹ جولین نامی تھا جس کو عربی مؤرخ بالیاں کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جولین ایک یونانی سردار تھا اور قیصرِ قسطنطنیہ کی طرف سے مامور تھا۔ قیصر کے تمام مقبوضاتِ افریقہ مسلمانوں کے قبضے میں آ چکے تھے صرف یہی ایک قلعہ باقی تھا جو صلح کے ذریعے جولین کے قبضے میں چھوڑ دیا گیا تھا۔

مسلمانوں کا یہ معمول تھا کہ وہ اپنی طرف سے کبھی اور کسی قیمت پر عہد شکنی کا ارتکاب نہیں کرتے تھے، ان کے مذہب نے سختی کے ساتھ عہد شکنی سے روکا تھا، وہ جنگ مذہب کے لیے کرتے تھے۔ ہوسِ اقتدار، توسیعِ مملکت اور مستعمراتی جذبات سے وہ ماورا تھے۔ اُن کے اِن خصائل سے ان کے بدترین دشمن بھی واقف تھے بلکہ ثناخواں اور مدّاح تھے۔ دل سے ان کی قدر کرتے تھے اور ان کے اس کردار کا سپاس و شکر کے ساتھ فاش و برملا اعتراف کرتے تھے۔ جولین نہایت اطمینان سے حکومت کر رہا تھا چونکہ اس کا مسلمانوں سے معاہدہ صلح تھا۔ یہی جولین تھا جس سے اندلس کے آخری گاتھ فرماں روا نے جس کا نام وٹیزا تھا اپنی بھتیجی اور حسین و جمیل بیٹی کی شادی کر دی تھی۔

تھی۔ جب وٹیزا تختِ سلطنت سے معزول کیا گیا تو جولین کو بالطبع وٹیزا کے معزول اور لرزیق کے تخت نشین ہونے سے ملال ہوا۔ مگر چونکہ لرزیق کی تخت نشینی پادریوں کے حسب منشا عمل میں آئی تھی۔ لہٰذا جولین کو بھی مجبوراً سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ جولین کی ایک بیٹی فلورنڈا نامی تھی جو وٹیزا کی نواسی یعنی قدیمی شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ گاتھ حکومت کے زمانے میں یہ دستور تھا کہ امیروں، گورنروں، سپہ سالاروں اور بلند مرتبہ لوگوں کے چھوٹے لڑکے بہ طور پیش خدمت بادشاہ کے پاس رہتے۔ آدابِ دربار سیکھتے اور شائستگی حاصل کرتے تھے۔ جب وہ جوان ہو جاتے تو اپنے والدین کے پاس واپس کی اجازت پاتے تھے۔ اسی طرح امراء کی لڑکیاں ملکہ کے پاس محل میں بھیج دی جاتی تھیں۔ اور محلاتِ شاہی میں پرورش پاکر جوان ہوتی تھیں۔ اسی رسمِ قدیم کے موافق کونٹ جولین کی فلورنڈا بھی شاہی محلات میں موجود تھی۔ یہ لڑکی جوان ہو گئی تھی۔ لرزیق نے باوجود اس کے کہ وہ بوڑھا شخص تھا اس لڑکی کو جبریہ طور پر بے آبرو کیا۔ لڑکی نے بہ مشکل اپنی اس بے عزتی کے حال سے اپنے باپ کو اطلاع دی۔ اس خبر کو سن کر جولین کے دل میں طیش و غضب کی آگ مشتعل ہوئی۔ اور گاتھ قوم کے جس شخص کو بھی اس کا حال معلوم ہوا اس نے اپنی قوم اور قدیمی شاہی خاندان کی اس بے حرمتی کو گراں محسوس کیا۔ کونٹ جولین نے اپنی ناراضگی کو پوشیدہ رکھا۔ اور فوراً سبطہ سے روانہ ہو کر طلیطلہ (ٹالیڈو) میں پہنچا۔ شاہی دربار میں حاضر ہو کر اپنی بیوی یعنی فلورنڈا کی ماں کے بیمار ہونے اور مرنے سے پہلے بیٹی کے دیکھنے کی خواہش ظاہر کرنے کا حال بیان کیا۔ اور فلورنڈا کے لے جانے کی اجازت چاہی، یہ ایک ایسا بہانہ تھا کہ لرزیق کسی طرح اس کی مخالفت نہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ جولین اپنی بیٹی کو لے کر سبطہ میں واپس آ گیا۔ قدیمی شاہی خاندان کے حامیوں میں سے اشبیلیہ کا اسقف بھی جولین کے پاس آیا اور لرزیق کی حکومت کے درہم برہم کرنے کی تدابیر سوچنے میں دونوں مصروف ہوئے۔

اس زمانے میں خلیفہ ولید بن عبدالملک کی جانب سے شہر قیروان میں موسیٰ بن نصیر خلیفہ کے مفتوحاتِ غربی کا وائسرائے تھا۔ موسیٰ بن نصیر کی طرف سے طارق بن

زیاد اس کا ایک بربری النسل غلام شہر طنجہ کی حکومت پر مامور اور ملک مراقش کی افواجِ اسلامیہ کا سپہ سالار تھا۔ طارق اگرچہ جولین سے قریب تھا لیکن جولین نے بجائے طارق سے گفت گو کرنے کے موسیٰ بن نصیر سے اپنا مقصود ظاہر کرنا مناسب سمجھا۔ وہ اشبیلیہ کے اسقفِ اعظم اور چند عیسائی سرداروں کو ہمراہ لے کر قیروان پہنچا اور موسیٰ ابن نصیر کی خدمت میں اپنے آنے کی اطلاع پہنچائی۔ موسیٰ بن نصیر اس عیسائی وفد سے بڑی تعظیم و تکریم سے پیش آیا۔ جولین اور اس کے ہمراہیوں نے عرض کیا کہ آپ اندلس پر فوج کشی کریں فتح و نصرت یقیناً آپ کے شاملِ حال ہوگی۔ موسیٰ یہ سن کر متامل ہوا۔ تب جولین اور اسقفِ اشبیلیہ نے کہا کہ آجکل اندلس میں ایک شخص غاصبانہ طور پر متسلط ہے۔ موجودہ حکومت اندلس کی رعایا کے لیے ایک قہرِ الٰہی ہے۔ بجز آپ کے اور کوئی طاقت دنیا میں ایسی نہیں ہے جس کے پاس ہم فریاد لے کر جائیں اور اس کے ذریعے اس مصیبت سے نجات پائیں۔

موسیٰ بن نصیر نے جولین کے اس اصرار کے بعد اندلس کے حالات اور حکومت اندلس کی فوجی طاقت کے متعلق سوالات کیے۔ اور دمشق میں ابن عبد الملک سے اجازت طلب کرنا ضروری سمجھ کر ایک عریضہ دمشق کی جانب روانہ کیا۔

ادھر جولین کے ہمراہ اپنے ایک سردار طریف یا طارف کو پانسو آدمیوں کے ساتھ بھیج دیا کہ جولین کے جہازوں میں سوار ہو کر ساحلِ اندلس پر اتریں اور وہاں کے حالات سے خود واقفیت حاصل کر کے آئیں۔ چنانچہ طریف اپنے ہمراہیوں کے ساتھ ۹۲ھ میں اندلس کے ساحل یعنی اندلس کی جنوبی راس کے مشرقی کنارے بندرگاہ جزیرہ پر اترا۔ اور معمولی لوٹ مار کے بعد سالماً غانماً واپس آیا۔ تھوڑے ہی دن میں خلیفہ کے دربار سے اجازت آگئی جس میں کمال حزم و احتیاط کے ملحوظ رکھنے کی تاکید تھی۔

جب موسیٰ بن نصیر کو جولین اور اس کے ہمراہیوں کے بیان کی تصدیق طریف کی زبانی ہوگئی تو اس نے طنجہ کے گورنر طارق بن زیاد کے نام حکم بھیج دیا کہ تم اپنی فوج لے کر اندلس پر چڑھائی کرو۔ طارق اپنا سات ہزار لشکر کشتیوں میں سوار کر کے آبنائے جبل الطارق کے

پار اندلس کی جنوبی راس پر جا اترا۔ طارق اپنی اس سات ہزار فوج کو چار کشتیوں میں سوار کر کے لے گیا تھا۔ اس سے اس زمانے کے جہازوں کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ کتنے بڑے تھے۔ طارق کی فوج میں زیادہ تر بربری نومسلم اور کمتر عربی لوگ تھے۔

آخر کار اموی عہد حکومت[1] میں مسلمانوں نے اندلس (ہسپانیہ یا اسپین) فتح کر لیا اور یہ اموی حکومت کا ایک صوبہ بن گیا۔

موسیٰ کے حکم سے اندلس میں سب سے پہلے فاتحانہ پیش قدمی موسیٰ بن نصیر کے غلام طارق بن زیاد نے کی تھی۔ پھر خود موسیٰ اپنا لشکر گراں لے کر بڑھا اور اپنے بلند اقبال اور بہادر بیٹے عبدالعزیز کی معیت میں سارا اندلس فتح کر لیا۔

مسلمانوں سے پہلے اندلس میں عیسائی اکثریت یہود اقلیت پر انسانیت سوز مظالم کرتی تھی۔ موسیٰ بن نصیر اور اس کے بیٹے عبدالعزیز کے دور گورنری میں شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پینے لگے۔ اقلیت کو وہ حقوق ملے جو ہر انسان کو ایک مہذب حکومت میں حاصل ہوتے ہیں۔ اکثریت کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوئی۔

موسیٰ کا حسرتناک انجام

موسیٰ کی پیش قدمیوں کا سلسلہ جاری تھا وہ سارے اندلس کو فتح کر لینے کے بعد فرانس تک یلغار کرتا ہوا پہنچ گیا۔

موسیٰ طارق کی معیت میں جبل برتات یعنی فرانس تک پہنچ گیا۔ اور بغیر کسی مزاحمت کے برشلونا (بارسلونا) اربونہ (ناربون) پر قبضہ کر لیا۔ دریائے ادن کے کنارے خیمہ زن ہوا۔ اور شہر لیون (لائنز) کے مستحکم قلعے پر اپنا جھنڈا نصب کر دیا۔

جب موسیٰ اور طارق طلیطلہ میں ملاقات کر کے آئندہ کا پروگرام طے کر رہے تھے موسیٰ کا ہونہار، شجاع اور مجاہد پیشہ بیٹا عبدالعزیز جنوبی اندلس میں فتوحات کا ایک نیا ریکارڈ

---

[1]: ۹۳ھ۔

قائم کر رہا تھا۔

عیسائیوں کا بہت بڑا بہادر اور صاحب تدبیر فرمانروا تدمیر یہیں حکومت کر رہا تھا۔ وادی مسکنہ کی جنگ میں اس کی بے نظیر شجاعت کے کارنامے دیکھے جا چکے تھے۔ عبدالعزیز خود بھی بہادر تھا اور بہادروں کا قدر شناس بھی۔ تدمیر کی بہادری اس کے دل پر نقش ہو گئی لیکن اب مقابلے کے سوا چارہ نہیں تھا، تدمیر اطاعت پر رضامند نہ تھا۔ اس نے عربوں سے مقابلے کے لیے درہ ہائے کوہ اور محفوظ مقامات پر فوج کو مورچہ بند کر دیا۔

تدمیر کی چال یہ تھی کہ عربوں کو اندر بلا کر شکار کرے۔ اور عبدالعزیز اس فکر میں تھا کہ عیسائیوں کو میدانی لڑائی لڑنے پر مجبور کرے۔ دونوں اپنی اپنی گھات میں لگے رہے آخر عبدالعزیز کامیاب ہوا۔ تدمیر بادل ناخواستہ اپنی فوجوں کو لے کر میدان لورگ (لورکو) میں اترا۔ بڑی زبردست اور خون ریز جنگ ہوئی مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا عیسائی بری طرح ہارے۔ تدمیر شکست خوردہ حالت میں بھاگ کر قلعہ اوری اولا میں پناہ گزین ہو گیا لیکن کب تک؟ آخر اسے ہتیار ڈال دینے پڑے!

عبدالعزیز نے کمال اولوالعزمی کے ساتھ اس کی فرمانروائی قائم رکھی صرف خراج پر اس سے صلح کر لی۔ یہ معاہدہ ۴ رجب ۹۴ھ کو تحریر ہوا۔ غرناطہ بھی عبدالعزیز کے ہاتھ پر فتح ہوا۔ یکایک دمشق سے پروانہ آیا کہ امیر المومنین خلیفۃ المسلمین ولید بن عبدالملک نے موسیٰ کو یاد فرمایا ہے۔ موسیٰ تعمیل حکم پر مجبور تھا۔ چنانچہ اس نے اندلس کی گورنری اپنے بیٹے عبدالعزیز کو سونپی، افریقہ کی ولایت پر اپنے دوسرے بیٹے عبداللہ کو مامور کیا۔ اور خود مال غنیمت لے کر دربار خلافت کی طرف روانہ ہوا۔

موسیٰ جب دمشق کے قریب پہنچا تو ولید بن عبدالملک مرض الموت میں مبتلا تھا اس کا ولیعہد سلیمان بن عبدالملک تھا سلیمان کو جو یہ معلوم ہوا کہ موسیٰ بے اندازہ مال غنیمت لے کر آ رہا ہے۔ اس نے موسیٰ سے کہلایا کہ وہ دمشق پہنچنے کی رفتار دھیمی کر دے تاکہ سلیمان کے عہد خلافت میں وہ دمشق پہنچے اور یہ مال غنیمت ولید کے بجائے سلیمان کے ہاتھ آئے لیکن موسیٰ نے اس ارشاد کی تعمیل نہ کی، اس نے اپنی رفتار اور تیز کر دی تاکہ اپنے آقا سے سند خوشنودی مزاج حاصل کرے

موسیٰ نے اپنے مرنے والے آقا کی خوشنودیٔ مزاج کے ساتھ ساتھ اپنے ہونے والے آقا کا مستقل عتاب بھی حاصل کر لیا۔

چنانچہ جیسے ہی ولید ۹۶ھ میں مرا اور سلیمان برسرِ حکومت آیا تو اس نے ننگِ انسانیت انتقام کا سلسلہ شروع کر دیا۔ موسیٰ نے جس بےنفسی۔ ایثار۔ للہیت اور خالص اسلامی جذبے کے ماتحت جو نہ مٹنے والے کارنامے انجام دیے تھے اس کا صلہ سلیمان نے یہ دیا کہ اسے معزول کر دیا۔ اس پر بغیر کسی جرم اور خطا کے دو لاکھ اشرفیاں جرمانہ کیں، اس کا مال و اسباب ضبط کر لیا اسے دھوپ میں کھڑا رکھا، اس کی توہین کی، اس کے بیٹوں کو قتل کرا دیا حتیٰ کہ عبدالعزیز تک کی جان لے لی۔ اور پھر اس کا کٹا ہوا سر بوڑھے باپ کے پاس بہ طور تحفہ کے بھیجا موسیٰ بڑی آسانی سے سلیمان کے خلاف بغاوت کر سکتا تھا۔ افریقہ اور اندلس کا بادشاہ بن سکتا تھا اور سلیمان اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن موسیٰ نے اپنی جان اور اسباب قربان کر دیا مگر نزاعِ باہمی اور خود غرضی کے جرم کا ارتکاب نہیں کیا۔

موسیٰ حضرت عمرؓ کے دورِ حکومت (۱۹ھ) میں پیدا ہوا۔ اس کی ساری زندگی اسلام کے لیے لڑتے گزری، اس نے بڑے بڑے معرکے سر کیے، لیکن بڑھاپے میں سلیمان بن عبدالملک نے جوشِ انتقام سے بےبس ہو کر اس کو ذلت اور نکبت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا۔

سلیمان تو اس کے قتل کا حکم بھی دے چکا تھا لیکن ابنِ مہلب نے اس کے کارناموں کا واسطہ دیا تو بڑی مشکل سے جان بخشی کی لیکن جرمانہ قائم رکھا۔ اس مردِ مجاہد کے پاس تھا کیا جو جرمانہ ادا کرتا، جو کچھ تھا وہ دے دیا تب بھی جرمانہ ادا نہ ہو سکا۔ ہاں وہ حقیقی معنوں میں نانِ جویں کو محتاج ہو گیا۔ آخر ۹۷ھ میں بےبسی اور بےکسی کے عالم میں اس نے اپنی جانِ عزیز جاں آفریں کو سپرد کر دی۔

سلیمان مر گیا لیکن اپنے نام کو بٹہ لگا کر، موسیٰ بھی مر گیا لیکن اس کے کارنامے تاریخ کے صفحات پر اب تک روشن ہیں!

دورِ عروج

عبد الرحمن الداخل سے عبد الرحمن الناصر تک

رزم و پیکار، بزم و انجمن اور باہمی خلفشار کی داستان!

۱۳۸ھ سے ۳۰۰ھ تک

۱۳۲ھ میں حکومت بنی امیہ کا تختہ الٹ گیا۔ آخری اموی تاجدار مروان الحمار اگرچہ بڑا معاملہ فہم بیدار مغز اور شجاع تھا لیکن ادبار کی گھٹاؤں کو وہ نہ روک سکا، زوال کا جو طوفان آرہا تھا ایک تنکے کی طرح وہ اس میں بہہ گیا۔

بنو امیہ کے بعد بنو عباس نے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور برسر اقتدار ہوتے ہی انھوں نے ان تمام سفاکیوں، شقاوتوں اور زیادتیوں کا ایک ایک کرکے بدلہ لینا شروع کیا جو بنی امیہ سے ظہور میں آچکی تھیں۔

بنو عباس نے یہ تہیہ کرلیا تھا کہ بنو امیہ کا نام و نشان صفحہ ہستی سے مٹادیں اور اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے وہ مظالم کیے کہ خود بنو امیہ سے بڑھ گئے۔ غرض جب بنو امیہ کا قتلِ عام ہو رہا تھا تو خاندانِ شاہی کا ایک شخص عبد الرحمن اپنے سر پر ننگی تلواروں کی جھنکار دیکھ کر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا، سامنے دریائے فرات لہریں لے رہا تھا۔ دریا میں کودا، پار اترا اور کسی طرح گرتا پڑتا افریقہ پہنچا۔ وہاں کے لوگ گویا منتظر ہی تھے

انھوں نے سر آنکھوں پر بٹھایا، تختِ حکومت پیش کیا اور وہ بڑی حدتک امن و امان کے ساتھ اور کسی حدتک خونریزی کے بعد خلیفہ عبدالرحمٰن الداخل کے نام کے ساتھ تختِ حکومت پر جلوہ فرما ہوا۔ یہ واقعہ ۱۳۸ھ کا ہے۔

عبدالرحمٰن اپنے ساتھ ستارۂ اوج و اقبال بھی لایا تھا۔ امیر یوسف الفہری نے بار بار بغاوت کی۔ اس لیے کہ عبدالرحمٰن نے سریر آرائے حکومت ہونے سے پہلے وہی اندلس کا مالک و مختار بنا ہوا تھا۔ اس کی اطاعت مصلحت کا تقاضا تھی اور بغاوت ناکام ہوئی۔ عبدالرحمٰن کامیاب ہوا۔ وہ شام سے بھاگ کر یہاں اس لیے آیا تھا کہ فرماں روائی کرے، اپنے اس مقصد میں وہ بدرجۂ اتم کامیاب ہوا۔ کوئی سرکشی اس کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکی۔

تدبر اور فراست

۱۴۶ھ (۷۶۳ء) میں خلیفہ ابوجعفر المنصور العباسی نے اپنے ایک امیر العلا ابن مغیث کو ایک لشکر گراں دے کر اندلس کی فتح پر مامور کیا۔ اشبیلیہ کے قریب ابوالعلا اور الداخل کی فوجوں میں مقابلہ ہوا۔ ابوالعلا قتل ہوا اور عباسی فوج نے شکست کھائی۔ معاملہ یہیں پر ختم ہوگیا، اصل میں یہ آزمائشی مہم تھی۔ ورنہ خلافتِ عباسیہ خود اپنے مسائل میں اتنی الجھی ہوئی تھی کہ اتنے دور دراز مقام پر فوج کشی کرنا نہ اس کے لیے مناسب تھا نہ قرینِ مصلحت!

۱۶۶ھ میں عبدالرحمٰن نے ایک مدبرانہ قدم اٹھایا۔

اگرچہ اندلس میں عبدالرحمٰن کا پرچم لہرا رہا تھا اور وہ شان و شکوہ کے ساتھ حکومت کر رہا تھا لیکن سازشیں اور بغاوتیں ہوتی رہتی تھیں۔ یہ سازشیں اور بغاوتیں زیادہ تر عرب قبائل ہی کی طرف سے رونما ہوتی رہتی تھیں اس لیے کہ انھیں میں کشورکشائی اور فرمانروائی کی امنگ تھی۔ عبدالرحمٰن نے سوچا جب تک توازنِ قوت کے اصول پر کام نہ کیا جائے، یہ ہنگامہ آرائیاں جاری رہیں گی، چنانچہ اس نے اہلِ بربر کو اندلس آنے کی ترغیب دی۔ چنانچہ چالیس ہزار بربر آکر اس کی فوج میں شریک ہوگئے۔ ان بربروں سے اس نے بڑے کام لیے۔ دشمنوں اور مخالفوں کی خوب سرکوبی کی

اندلس کے عیسائی اگرچہ امن و راحت اور سکون و عافیت کی زندگی بسر کر رہے تھے لیکن ان میں رہ رہ کے بغاوت کا شعلہ بھڑکتا تھا۔ آس پاس کے عیسائی فرمانروا بھی انھیں شہ دیتے رہتے تھے۔ چنانچہ فرانس کا بادشاہ شارلیمین بھی ایک عرصے تک عبدالرحمٰن سے برسرِ پیکار رہا۔ لیکن تھک کر اس نے سلطان کے پاس سفارت بھیجی اور صلح کی التجا کی جو منظور کر لی گئی۔

اندلس کی یادگار زمانہ عمارتوں کی (جن کے آثار و نقوش اب تک قائم ہیں) داغ بیل درحقیقت عبدالرحمٰن کے ہاتھوں پڑی۔ مسجد قرطبہ اور باغ رصافہ کی تعمیر اسی کے عہد میں شروع ہوئی تھی۔ تکمیل اس کے بیٹے ہشام کے عہد میں ہوئی۔

بنو امیہ کے لوگوں پر عباسیوں نے عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا عبدالرحمٰن نے انھیں اندلس پہنچایا انھیں جاگیریں عطا کیں اور بڑے بڑے عہدے دیے اور انعامات سے نوازا اگرچہ ان سب کا صلہ اسے سازشوں اور بغاوتوں کی صورت میں ملا۔ لیکن وہ اپنی طرز اور روش پر قائم رہا۔

عبدالرحمٰن نے اپنے عہد میں مسجدیں بنوائیں، محلات تعمیر کیے، مدرسے قائم کیے۔ سرائوں کی بنیاد ڈالی، رفاہ عام کے کاموں سے اسے بڑی دلچسپی تھی اور ان کاموں کو شروع کرتے وقت ذرا نہیں سوچتا تھا کہ ان پر خرچ کتنا آئے گا اور اپنی اولوالعزمی سے انھیں اتمام تک پہنچا کر دم لیتا تھا۔

۱۷۲ھ میں یہ نیک نام اور نیک فرجام بادشاہ اس دُنیا سے رخصت ہوا۔

حالات کس کس طرح پلٹا کھاتے ہیں۔!؟

عبدالرحمٰن نے ہشام کو اپنا ولی عہد مقرر کیا تھا اور بڑے بیٹے سلیمان کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اس لیے کہ سلیمان صفاتِ ملوکانہ سے محروم تھا اور ہشام ہر اعتبار سے اس منصب کا مستحق تھا۔

چنانچہ باپ کے انتقال کے بعد ہشام تختِ حکومت پر بیٹھا۔ یہ بڑا عابد، زاہد، متقی، پرہیزگار، خدا ترس ساتھ ہی مدبر، منتظم، بہادر اور شجاع تھا، اسے تخت پر بیٹھتے ہی

بغاوتوں سے سابقہ پڑا۔ لیکن بڑی کامیابی کے ساتھ اس نے بغاوتوں کو فرو کیا۔

کم و بیش ۸ سال حکومت کرنے کے بعد ۴۰ سال کی عمر میں بیمار پڑا۔ اور اس دنیا سے سدھارا۔ اس کا جانشین الحکم ہوا۔ جس نے دنیا کی صرف ۲۲ بہاریں دیکھی تھیں۔

الحکم میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو عبدالرحمٰن الداخل میں تھیں، وہی تدبر، وہی مآل اندیشی وہی حکمتِ عملی، وہی شجاعت و بسالت، وہی استقلال و استقامت، پھر اس میں کچھ چیزیں باپ اور دادا سے زیادہ بھی تھیں، اُسے انصاف کا بڑا پاس رہتا تھا، اس نے بڑی منت و سماجت کے بعد قاضی بشیر کو عہدۂ قضا قبول کرنے پر راضی کیا، وہ انصاف کے معاملے میں بڑے سخت تھے۔ ایک مرتبہ خود سلطان کو عدالت میں طلب کر لیا۔ اور اس کے خلاف فیصلہ صادر کیا۔ لیکن سلطان کی پیشانی پر بل بھی نہیں آیا۔

الحکم کی یہ خوبیاں وبالِ جان بن گئیں۔

جب وہ تختِ حکومت پر بیٹھا تو اس کے دونوں چچاؤں سلیمان اور عبداللہ نے اس کے خلاف بغاوت کی، الحکم ان الجھنوں میں گرفتار تھا کہ اس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر عیسائیوں نے سر اٹھایا۔ چنانچہ فرانسیسیوں نے ۱۸۵ھ میں برشلونہ پر حملہ کیا اور اس پر قبضہ بھی کر لیا۔ عربوں نے پورا صوبہ خالی کر دیا۔ اور سرحدی قلعوں میں پناہ گزیں ہو گئے۔

الحکم نے اپنے حاجب عبدالکریم ابن مغیث کو اس مہم پر مامور کیا۔ اس نے نہایت قابلیت کے ساتھ اس مہم کو سر کیا۔ فرانسیسیوں کو ملک سے خارج کر دیا۔ اور اشبیلیہ پر قبضہ کر کے قرطبہ واپس آ گیا۔

۲۰۰ھ میں اندلس کو ایک خوفناک قحط سے دوچار ہونا پڑا۔ ہزاروں آدمی موت کے گھاٹ اتر گئے۔ الحکم اس ساری مدت میں خواب و خور حرام رہا، وہ اسے ایک لمحے کے لیے برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ اس کی رعایا دکھ سہے مصیبت اٹھائے تکلیفیں برداشت کرے اور خود عیش و آرام کی زندگی بسر کرے، اس نے اپنے اوپر ہر لذت حرام کر لی اور اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھا جب تک یہ مصیبت اس کی مملکت سے دور نہیں ہو گئی۔

علوم و فنون کی سرپرستی الحکم علم کا بڑا قدردان تھا اور اہل علم کو بہت عزیز رکھتا تھا۔

اس کے عہد میں مدارس کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہوا۔ علماء کی قدر و منزلت بڑھی۔

۲۰۳ھ میں اس نے اپنے بیٹے عبدالرحمٰن کو ولی عہد مقرر کیا۔ ۲۰۶ھ میں جمعرات کے دن اس دُنیا سے رخصت ہو گیا۔

عبدالرحمٰن ثانی بھی ایک اولوالعزم فرماں روا تھا، اس نے ۲۰۸ھ میں عبدالکریم ابن عبدالواحد کو قسطلہ اور البہ کی تسخیر کے لیے فوجِ گراں دے کر روانہ کیا۔ عبدالکریم نے عیسائی قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ اور انھیں خراج ادا کرنے پر مجبور کر دیا۔

عیسائی دراندازی سرگرمیوں میں برابر مصروف تھے۔ وہ حدود اندلس میں داخل ہو کر مسلمانوں کو قتل کرتے، لوٹتے اور چلتے بنتے۔ ۲۲۴ھ میں سلطان نے عبداللہ البلنسی کو مقابلے کے لیے بھیجا اس نے اہلِ قسطلہ کو شکستِ فاش دی، دوسری جانب موسیٰ بن موسیٰ نے بادشاہِ جلیقیہ کو زبردست شکست دی۔

۲۲۵ھ میں طیوفلس شاہِ قسطنطنیہ نے عبدالرحمٰن ثانی سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی التماس کی، عبدالرحمٰن نے اپنے وزیر یحییٰ الغزالی کو بیش بہا تحائف کے ساتھ طیوفلس کے پاس بھیجا اور دونوں میں دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے۔

عبدالرحمٰن کی داد و دہش، اندلس کی زرخیزی اور کشش نے بہت سے لوگوں کو اکسایا اور دولتِ عباسیہ کا دامن چھوڑ کر اندلس میں آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ ان نوواردوں میں اہلِ علم بھی تھے اور اہلِ فن بھی۔ اندلس نے ان سب کے لیے اپنا آغوش کھول دیا۔ ان کی قدر افزائی کی، اور انھیں عروج و کامیابی کے وسائل بہم پہنچائے۔

عیسائیوں کی شیطنت

عبدالرحمٰن کے دور میں عیسائیوں نے ایک نہایت خطرناک تحریک شروع کی۔ یہ جوق درجوق سڑکوں پر اسلام اور داعیٔ اسلامؐ کو گالیاں دیتے ہوئے نکلتے تاکہ مسلمان مشتعل ہوں، حکومت ان پر ظلم کرے اور عیسائی رعایا بغاوت پر آمادہ ہو جائے۔

لیکن عبدالرحمٰن کے تدبر اور مقامی رعایا کے صاحبِ اثر و نفوذ عیسائیوں کی مآل اندیشی کے باعث یہ تحریک پروان نہ چڑھ سکی۔ خود عیسائی مؤرخ اسٹینلی لین پول نے لکھا ہے کہ سمجھدار

عیسائیوں نے اپنے ہم مذہبوں کو روکا اور کہا کہ عرب ہمارے مذہب میں بالکل دخل نہیں دیتے ہم ہر طرح سے خوشحال اور مطمئن ہیں۔ ان فوائد کے عوض محض حکومت کی تمنا میں اپنی جان و مال تلف کر دینا عقل و دانش سے بعید ہے۔

عبدالرحمٰن ثانی کے دور میں اندلس کے مالیات پر بھی بہت اچھا اور خوشگوار اثر پڑا اس کی تخت نشینی کے وقت کُل آمدنی چھ لاکھ دینار سُرخ تھی لیکن اب حُسنِ انتظام کی بدولت یہ رقم دس لاکھ دینار سُرخ تک پہنچ گئی۔

۲۳۸ھ میں ۳۱ سال حکومت کرنے کے بعد عبدالرحمٰن ثانی کا انتقال ہو گیا۔

۲۳۸ھ میں سلطان محمد بن عبدالرحمٰن تخت نشین ہوا۔ یہ بڑا اجیالا اور منچلا بادشاہ تھا۔ اُس نے تخت پر بیٹھتے ہی موسیٰ ابن موسیٰ کی سرکردگی میں ایک فوج قسطلہ کی فتح کے لیے بھیجی اور دوسری برشلونہ روانہ کی۔

یہ مہم جاری تھی کہ طلیطلہ کے عیسائیوں کے اکسانے سے جلیقیہ کے بادشاہ نے اندلس پر حملہ کر دیا۔ سلطان نے صورتِ حال کی نزاکت محسوس کر لی۔ خود فوج لے کر مقابلے کے لیے بڑھا۔ وادیٔ سلیطہ کے کنارے دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ عیسائیوں نے محمد کی حسنِ تدبیر سے بری طرح شکست کھائی۔

۲۵۱ھ میں محمد کے بیٹے المنذر نے شاہِ الفانسو سے مقابلہ کیا اور اسے زبردست شکست دی، بہت کثیر مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔ یہ سارا مال اس نے لا کر اپنے باپ کے قدموں پر ڈھیر کر دیا۔ اسی سال سلطان محمدؒ نے بھی جلیقیہ پر دوبارہ فوج کشی کی، دشمن کو بہت نقصان پہنچا کر دار الخلافہ واپس آیا۔

سلطان محمدؒ کی زندگی کا بڑا حصہ داخلی اور خارجی جنگ و جدل میں بسر ہوا اس سے جو وقت بچتا تھا اسے وہ اہلِ علم کی صحبت میں صرف کرتا تھا۔ ۲۷۳ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔

محمد کے انتقال کے بعد المنذر تخت نشین ہوا یہ باپ سے بھی زیادہ اور منچلا تھا بڑے سے بڑے خطرہ کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ چنانچہ ۲۷۵ھ میں ایک جنگ ہی کے

دوران میں اس نے جامِ شہادت نوش کیا۔

جنگِ باہمی کے نتائج عبداللہ نہایت ہی نکما اور ناکارہ بادشاہ ثابت ہوا۔ اس کا دورِ حکومت تمام تر بغاوت اور سازش سے عبارت ہے، یہ اپنے طرزِ عمل سے کسی کو بھی خوش نہ رکھ سکا۔ نہ عربوں کو نہ بربروں کو اور نہ عیسائی رعایا کو، اس کے عہدِ حکومت میں اندلس کی وسیع اور شاندار حکومت چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ بدنظمی کا دور دورہ ہو گیا، انتشار اور پراگندگی کی کارفرمائی ہر طرف نظر آنے لگی۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ تاج و تخت کے سوا کوئی چیز ایسی نہیں رہ گئی جسے یہ اپنی کہہ سکتے۔ اشبیلیہ کے گورنر نے خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ اور اشبیلیہ قرطبہ سے چشمک زنی کرنے لگا۔ بربروں نے بھی انگڑائی لی، انھوں نے پرتگال کے جنوبی صوبے اور اندلسیہ کے مشہور شہر جاین پر قبضہ کر لیا۔ کئی مقامات پر عیسائیوں نے بھی سر اٹھایا اور آزادی و خودمختاری کے خواب دیکھنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا مسلمانوں کے خون سے سیراب ہونے والا یہ پودا اب مرجھایا ہی چاہتا ہے۔ اندلس طوائف الملوکی کی نذر ہو جائے گا اور یا تو یہ چھوٹی چھوٹی اور کمزور ریاستوں میں بٹ جائے گا ورنہ پھر عیسائی اس پر قبضہ کر لیں گے۔ لیکن خدا کو کچھ اور منظور تھا۔

رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم!

یاس کی تاریکی میں امید کی کرن قدرت کو بھی یہ منظور نہ تھا کہ اندلس سے مسلمانوں کا نام و نشان مٹے۔ اسی لیے عبدالرحمٰن ثالث جو عام طور پر عبدالرحمٰن الناصر الدین اللہ کے نام سے معروف و مشہور ہے۔ جلوہ آرائے سریرِ مملکت ہوا۔

عبدالرحمٰن الناصر میں کوئی خوبی ایسی نہ تھی جو موجود نہ ہو، جو خوبیاں تھوڑی تھوڑی کر کے بہتوں میں تھیں وہ سب اس ایک ذات میں خدا نے جمع کر دی تھیں۔

صرف تیس سال کی عمر میں عبدالرحمٰن اپنے باپ محمدؒ کی وفات کے بعد تختِ حکومت پر بیٹھا۔ لیکن وہ کچھ اس سج دھج اور شان و تمکنت کے ساتھ تختِ حکومت پر بیٹھا کہ دفعتہً حالات بدل گئے، باغیوں نے اطاعت قبول کر لی، سرکشوں نے سر جھکا دیے

دشمنوں نے دوستی کا پیمان باندھا، مخالفوں نے وفاداری کا عہد کیا۔

الناصر نے سب سے پہلے امرائے عرب کی خبر لی۔ اور انھیں اطاعت پر مجبور کیا۔ اس سے فارغ ہو کر وہ عیسائیوں کی طرف متوجہ ہوا کہ انھوں نے اپنی شر پسندی سے سارے ملک میں بے اطمینانی اور انار کی پھیلا رکھی تھی۔ اور بہت جلد انھیں اطاعت پر مجبور کر دیا

الناصر نے فوج میں اضافہ کیا، سپاہیوں کی تنخواہیں بڑھائیں، انھیں انعامات سے نوازا، پھر غلاموں کی ایک فوج تیار کی اور اس سے بڑے بڑے کام لیے جس نے سر اٹھایا اس کی فوراً سرکوبی کی۔ جس نے سازش کی بس اسے فوراً سزا ملی، جس نے بغاوت کی تیاری کی اس کی قوت کو پارہ پارہ کر کے کچل دیا گیا اسی نے جلیقیہ اور طلیطلہ کے مرحلے سر کرنے کے بعد اردونی ثانی (میون کا حکمراں، میون فرانس میں ہے) کی یورش کا حال سنا، ۳۰۸ھ میں یہ خود مقابلے پر پہنچا، اردونی کی مدد کے لیے فرانس وغیرہ کی فوجیں موجود تھیں۔ بڑا سخت معرکہ ہوا۔ لیکن عبدالرحمن نے زبردست کامیابی حاصل کی۔ اس نے دشمن کی فوج کو درہم برہم کر دیا۔ اور عیسائیوں کے فوجی استحکامات تباہ کرنے کے بعد شادیانۂ فتح بجاتا اپنے دار الخلافہ قرطبہ واپس آگیا۔

۳۱۱ھ میں شاہ بنبونہ نے چند سرحدی قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ الناصر بنبونہ کے پایۂ تخت تک بڑھا چلا گیا، شہر میں داخل ہوا، شہر پناہ کو منہدم کیا اور کامیاب و کامراں اپنے مستقر پر واپس آگیا۔

اندلس میں خلافت کا قیام اب تک اندلس کے فرمانروا یا امیر کہلاتے یا سلطان خلیفہ کا لقب، خاندانِ عباسی کے لیے مخصوص تھا لیکن الناصر نے پہلی مرتبہ یہ رسم توڑی اور خود خلیفۃ المسلمین ہونے کا باقاعدہ اعلان کر دیا۔

۳۲۷ھ میں الناصر اور ادمیر کے درمیان نہایت خوں ریز جنگ ہوئی، اس جنگ کی شدت اور ہولناکی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس میں پچاس ہزار عرب کام آئے لیکن الناصر نے ادمیر کا پیچھا نہ چھوڑا۔ یہاں تک کہ وہ مقابلے سے عاجز آگیا۔

۳۳۶ھ میں قسطنطین شہنشاہ قسطنطنیہ نے اپنے سفیر کی معرفت بیش بہا تحائف ارسال کیے اور پیمانِ دوستی مستحکم کرنے کی کوشش کی، کچھ عرصے بعد جرمنی اور فرانس کی طرف سے بھی سفارتیں آئیں اور انھوں نے حکومتِ اندلس سے دوستی اور رفاقت کا عہد استوار کیا، یہ رنگ دیکھ کر اردونی اور شاہ برشلونہ نے بھی دوستانہ تعلقات استوار کرنے کی التجا کی، جو قبول کر لی گئی، الناصر کی ہیبت اس کے کارناموں کی بنا پر معاصر یورپین فرمانرواؤں پر ایسی قائم ہو گئی کہ اکثر بڑے بڑے شہنشاہوں نے سفارتیں بھیجیں اور دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی تمنا کا اظہار کیا۔

عبدالرحمٰن الناصر اور افریقہ و مصر کی فاطمی حکومت کے تعلقات بھی ناخوشگوار تھے یہ دونوں حکومتیں ایک دوسرے کو اپنا حریف سمجھتی تھیں اور اس فکر میں رہتی تھیں کہ ایک دوسرے کے علاقے پر قابض ہو جائیں۔

چنانچہ خاندان بنی فاطمہ کی فوجیں یلغار کرتی ہوئی اندلس کے قریب پہنچ گئیں۔ لیکن آگے نہ بڑھ سکیں، الناصر بھی تاک میں تھا۔ ۳۴۱ھ میں اس نے اپنے بیڑے ساحلِ افریقہ کی طرف روانہ کیے اور قلعوں پر بہ جبر قبضہ کر لیا۔ رفتہ رفتہ وہ افریقہ کے اس تمام علاقے پر قابض اور متصرف ہو گیا۔ جو مغربِ اقصیٰ کے نام سے مشہور ہے۔

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام!

عبدالرحمٰن الناصر کو عمارتوں کا بھی بہت شوق تھا، اس نے ایسی ایسی خوبصورت اور نادرِ روزگار عمارتیں تعمیر کرائیں جن کی نظیر چشمِ فلک کی نظر سے نہ گزری ہوگی اس کی عمارتوں کے کھنڈر اور آثار اب تک موجود ہیں اور دیکھنے والوں کو درسِ عبرت دے رہے ہیں۔

قرطبہ کی مشہور مسجد میں اس نے توسیع کرائی، اور اسے پہلے سے کہیں زیادہ شاندار بنا دیا۔

الناصر کا بہت بڑا کارنامہ قصر الزہرا یا مدینۃ الزہرا کی تعمیر ہے۔ یہ اس نے اپنی محبوب کنیز زہرا کی فرمائش پر تعمیر کرایا تھا۔ اس کی وسعت کا اندازہ اس سے ہو سکتا

ہے کہ اس کی حدود کی دیواروں میں پندرہ ہزار بلند دروازے نصب تھے۔ اس پر ایک کروڑ پچاس لاکھ دینار سُرخ کی لاگت آئی۔ ۳۲۵ھ میں اس کی تعمیر شروع ہوئی۔ اور ۳۵۰ھ میں اتمام کو پہنچی۔ دس ہزار معمار اور مزدور، چار ہزار اونٹ اور خچر روزانہ اس کے بنانے میں مصروف رہتے تھے۔ قصر زہرا، چار ہزار تین سو سولہ بُرجوں اور ستونوں پر قائم تھا۔ ان ستونوں میں سے بعض ستون بادشاہان فرانس اور قسطنطنیہ وغیرہ نے تحفۃً بھیجے تھے۔ اس قصر کے انتظام اور نگہبانی کے لیے تیرہ ہزار سات سو پچاس ملازم اور تیرہ ہزار تین سو بیاسی غلام قوم نصاریٰ کے متعین تھے۔ حرم سرا میں چھ ہزار عورتیں خدمت گزاری کے لیے رہا کرتی تھیں۔ حوضوں میں روزانہ بارہ ہزار روٹیاں علاوہ اور چیزوں کے ڈالی جاتی تھیں۔ عربوں نے اس محل کی تعمیر پر اپنا فن ختم کر دیا تھا۔ لیکن جب عیسائیوں نے اس دیس سے مسلمانوں کو نکالا تو جوشِ انتقام میں اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔

الناصر بڑا انصاف دوست اور معدلت پرور فرماں روا تھا۔ اس نے عدلیہ کو بالکل آزاد کر رکھا تھا۔ اور اسے پورا حق تھا کہ وہ خود خلیفۃ المسلمین اور امیر المومنین پر اپنے احکام نافذ کرے، چنانچہ اس نے اپنے اس حق سے فائدہ بھی اٹھایا۔ اسی سلسلے میں قاضی منذر کے کارنامے صفحاتِ تاریخ کے نہ مٹنے والے واقعات کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں

خلفائے اندلس میں خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر نے طویل عمر پائی۔ یہ ۲۷۷ھ میں پیدا ہوا۔ ۲۔ رمضان سنہ ۳۵۰ھ میں بہ عمر ۷۳ سال اپنے قصر الزہرا میں انتقال کیا۔

الناصر کے کارناموں پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ عبداللہ بن محمد کے بعد تخت پر نہ بیٹھتا تو اندلس کی تاریخ اسی وقت ختم ہو گئی ہوتی۔ لیکن الناصر نے بگڑا ہوا کام بنا لیا۔

فتوحات، پیش قدمی اور فوج کشی

الناصر کے بعد الحکم ثانی تخت حکومت پر متمکن ہوا۔ الحکم بڑا علم دوست، علماء کا قدر شناس، بہادر، بہادروں کا دوست، مدبر، مصلحت شناس اور مآل اندیش فرمانروا تھا اس کی تخت نشینی کا جشن بڑی دھوم دھام سے منایا گیا۔

حسب دستور الحکم کے تخت نشین ہوتے ہی سرحدی عیسائیوں نے فتنہ وفساد اور شورش کا سلسلہ شروع کر دیا۔ لیکن الحکم ایک بیدار مغز فرماں روا تھا، وہ خود بہ نفس نفیس ایک لشکر گراں لے کر پہنچا۔ اس نے باغیوں کی سرکوبی کی اور قرطبہ واپس آگیا۔ اس کے واپس آنے کے بعد بھی جلیقیہ کی طرف سے شورش کا سلسلہ جاری رہا تو الحکم نے اپنے ایک سردار غالب کو فوج دے کر روانہ کیا۔ غالب کو اپنی فوج سے کئی گنا زیادہ عیسائی فوج کے مقابلے میں لڑنا پڑا۔ لیکن جس خدا پر بھروسہ کر کے اس نے میدان میں قدم رکھا تھا اس نے مدد کی، آس پاس کے دوسرے عیسائیوں نے بھی سر اٹھایا لیکن :

سر اٹھایا تھا کہ سنگ یاد آیا!

اذفیر کے بیٹے شانجہ نے بھی دوسرے عیسائی رجواڑوں کی مدد سے بغاوت کی۔ اور الناصر کے پچھلے احسانات اور عنایات کو بالکل فراموش کر دیا، لیکن الحکم کی چوکسی نے اس بغاوت کو بھی ناکام بنا دیا۔ برشلونہ اور قسطلہ کی طرف سے بھی بغاوت ہوئی لیکن اسے بھی آسانی سے کچل دیا گیا۔

الحکم کی تخت نشینی کے چوتھے سال یعنی ۳۵۴ھ سے پھر فتوحات اور پیش قدمی اور فوج کشی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ چنانچہ قلمرا اور قطوبیہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ ان دونوں شہروں میں مسلمانوں کی آبادی بھی بہت زیادہ بڑھ گئی۔ اس کے بعد اسلامی لشکر (الاوا) کی طرف فاتحانہ یلغار کرتا ہوا بڑھا یہاں بھی حسب دلخواہ کامیابی ہوئی۔ قلعہ عرماج پر قبضہ کر لیا۔ اسی سال مجوسیوں (نارمنوں) نے بحری لوٹ مچائی۔ اور اندلس کے ساحلی شہروں پر یورش کر کے مسلمانوں کو لوٹا اور شہروں کو تاراج کیا۔ الحکم نے بحری ناکہ بندی کر کے نارمنوں کو بھگایا اور آئندہ کے لیے ایسا انتظام کیا کہ اگر نارمن آئیں تو انھیں قرار واقعی سزا دی جاسکے۔ الحکم کے اس اقدام نے ساحلی علاقوں کے مسلمانوں میں اطمینان کی کیفیت پیدا کر دی۔

مغربِ اقصیٰ اور اندلس

فاطمی خلیفہ المعز نے جب یہ دیکھا کہ مغربِ اقصیٰ میں امیہ اندلسی کا زور بڑھ رہا ہے تو اس نے اپنے سپہدار جوہر کو اس مقصد کے ماتحت روانہ کیا کہ وہ جنگ کرے اور امیہ اندلسی کا زور توڑ دے۔ جوہر نے اس فرض

کو خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا۔ طنجہ میں یعلیٰ ابن محمد امیہ اندلسی کی طرف سے حکمراں تھا، جوہر کی فوج سے جنگ کرتے ہوئے وہ ہلاک ہو گیا۔ پھر جوہر نے شہر فاس کو فتح کیا۔ حاکم شہر کو قتل کیا۔ ملک کو تاراج کر ڈالا اور مصر واپس چلا گیا۔ ۳۶۲ھ میں امیر غالب اس مہم کو سر کرنے کے لیے الحکم ثانی کی طرف سے پہنچا۔ اس نے فاس پر پھر قبضہ کر لیا۔ اور کامیاب و کامراں قرطبہ واپس آ گیا۔

علماء کی ناز برداریاں

الحکم کو علم و فن سے بڑی دلچسپی تھی۔ اس کا دربار عالموں اور فنکاروں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ خود الحکم کو بھی علم ادب اور فلسفے سے بڑی دلچسپی تھی۔ ان علوم میں اس کا پایہ کسی بڑے سے بڑے عالم سے کم نہ تھا۔ اس نے بڑے بڑے محققین کو گراں قدر معاوضے دے دے کر اندلس بلایا۔ اس نے بڑے بڑے مصنفین کی کتابیں رقم خطیر خرچ کر کے اندلس میں شائع کیں۔ اس کے کتب خانے میں چار لاکھ کتابیں موجود تھیں۔ ان میں سے ہر کتاب اس نے پڑھی تھی۔ ہر کتاب پر اس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نوٹ موجود تھے۔

الحکم کو مذہب سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ اس کے قلمرو میں اگر کوئی شخص کسی خلاف شرع فعل کا ارتکاب کرتا تھا تو اسے فوراً سزا دی جاتی تھی۔ اس نے مدارس اور مساجد پر کروڑہا روپیہ خرچ کیا۔ علماء کی ناز برداری میں وہ اپنے وقار اور آداب شاہی کا بھی خیال نہ کرتا تھا۔ ۳۶۶ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ الحکم کے انتقال کے وقت ہشام کی عمر صرف گیارہ سال کی تھی۔ چونکہ وہ نابالغ تھا لہٰذا سن شعور تک پہنچنے کی مدت کے لیے خود الحکم نے ایک "ریجنسی کونسل" قائم کر دی تھی یہی کونسل تمام امور مملکت انجام دیتی تھی۔ یہ کونسل ہشام کی ماں ملکہ صبح، امیر مصحفی اور محمد بن ابی عامر پر مشتمل تھی۔

ابو عامر کو خاک سے پاک کرنے میں امیر مصحفی اور امیر غالب کا بڑا حصہ تھا۔ ان دونوں کا عوام پر بھی بڑا اثر تھا، اور خواص پر بھی!

ابو عامر محسوس کر رہا تھا جب تک یہ دونوں کانٹے راستے سے نہ ہٹیں اس وقت تک وہ صحیح معنی میں عروج حاصل نہیں کر سکتا۔ ترقی نہیں کر سکتا، امور و نظم مملکت کا واحد مالک

مختار نہیں بن سکتا۔ اس نے بڑی چالاکی سے اپنے ان محسن سرداروں کو ایک دوسرے سے لڑا دیا اور یہ کام اتنی ہوشیاری سے انجام دیا کہ دونوں کو پتہ اس وقت چلا جب وہ ہر قسم کے اقتدار و اختیار سے محروم ہو کے عزت اور بے چارگی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ان دونوں سرداروں کو لڑانے کے بعد ابو عامر کے لیے راستہ صاف ہو گیا۔ اس نے باری باری سے ان دونوں کو محروم اقتدار کر دیا۔ ملکہ سلطانہ صبح پر ایسا اثر ڈالا کہ وہ ابو عامر کی وفاداری کارگزاری اور نمک حلالی کی ثناخواں ہو گئی۔ ہشام ابھی نوعمر تھا، وہ بھی ابو عامر کا مطیع و منقاد بن گیا۔

ابو عامر۔ اندلس کا آمر حصولِ اقتدار کے بعد ابو عامر منصور نے رفتہ رفتہ تمام حکام و عمال بدل دیئے اور ان کی جگہ اپنے آدمیوں کو مقرر کیا۔ فوج میں بھی اس نے یکسر تبدیلی کی۔ اور اپنے آوردوں سے فوج کو بھر دیا۔ شاہی محل کے سابق ملازمین بھی برخاست کر دیے۔ اور اب محل میں تمام تر اسی کے آدمی نظر آنے لگے۔

برسرِ اقتدار آنے کے بعد ابو عامر منصور نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ ابو مصحفی کو معزول کر کے جیل میں ڈال دیا اور ایک روایت کے مطابق زہر دے کر ہلاک کر دیا۔ مصحفی اپنی زندگی کے دورِ اقتدار میں جدھر نکل جاتا تھا لوگوں کا ہجوم اس کے دیدار کے لیے جمع ہو جاتا تھا، اب جب وہ جیل میں مرا تو ایک گمنام گوشے میں چند دوستوں نے خاموشی سے لے جا کر دفن کر دیا۔

مصحفی کی ہلاکت کے بعد امیر غالب کو احساس ہوا کہ ابو عامر کیسا شخص ہے۔ ایک موقع پر اس نے ابو عامر پر تلوار سے حملہ کر دیا۔ بری طرح زخمی ہوا، لیکن بچ گیا۔ انجام ظاہر ہے جو غالب کی ہلاکت کی صورت میں ظاہر ہوا۔

جب ابو عامر بالکل مطمئن ہو گیا اور اس کا طوطی بولنے لگا تو اس نے ملکہ سلطانہ صبح سے جبراً سارا خزانہ چھین لیا۔ ہشام کو اس نے مٹھی میں کر رکھا تھا، وہ ابو عامر کے سوا کسی کی بات نہ سنتا تھا نہ مانتا تھا۔ رفتہ رفتہ خود ہشام کی یہ حالت ہو گئی کہ وہ قیدی بن گیا۔ اس کا کام صرف یہ تھا کہ ابو عامر کے احکام کی تعمیل بے چون و چرا کرے۔ اسے محل سے باہر نکلنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ اگر کبھی باہر نکلتا تھا تو ابو عامر کے حکم سے نقاب ڈال کر۔

ان خامیوں اور خام کاریوں کے باوجود ابو عامر میں خوبیاں بھی تھیں، اس نے اگرچہ اپنی آمریت قائم کر رکھی تھی۔ لیکن سارے ملک میں امن و امان قائم کر دیا۔ باغیوں کی اس بری طرح سرکوبی کی کہ وہ اطاعت پر مجبور ہو گئے۔ عیسائی حکومتوں کی طرف سے جو شورشیں وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی تھیں ان کا استیصال کیا۔

ابو عامر منصور اب شاہی لباس پہنتا تھا۔ مساجد کے خطبوں میں خلیفہ کے بعد اس کا نام لیا جاتا تھا۔ سکوں پر بھی المنصور کا نام آنے لگا۔

اپنی زندگی میں ابو عامر نے پچاس سے زیادہ لڑائیاں لڑیں اور ہر جنگ میں کامیاب ہوا۔

ایک مرتبہ عیسائی لشکر قرطبہ تک بڑھتا چلا آیا۔ ابو عامر نے سخت جنگ کی۔ اور عیسائیوں کو بھگا کر دم لیا۔ ۳۷۲ھ میں المنصور یلغار کر کے جلیقیہ پہنچا۔ اور بہت سے مقامات تاراج کرتا ہوا قرطبہ واپس آیا۔ ۳۷۰ھ میں جہاد کا اعلان کر کے جہاں البیرہ بسطہ (بازار) اور تدمیر ہوتا ہوا ابلنسیہ آیا، پھر ابو عامر ربل کے ملک میں داخل ہوا۔ اسے شکست فاش دی ۳۸۷ھ میں متعدد عیسائی قلعے اور شہر فتح کر لیے۔ ۳۹۲ھ میں ایک بڑی فوج لے کر قسطلہ کی سرحد میں داخل ہوا۔ یہاں اس کے مقابلے کے لیے اطراف و جوانب کے تمام عیسائی والی اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ موجود تھے۔ بڑے گھمسان کا رن پڑا۔ لیکن منصور نے ان سب کو بری طرح شکست دی۔

المنصور علم اور علماء کا بھی بڑا قدردان تھا، ان کا ادب کرتا تھا اور ان کی خدمت کرنا اپنے لیے باعث سعادت سمجھتا تھا۔

ابو منصور عامر نے عیسائیوں پر اتنی دہشت طاری کر رکھی تھی جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ ایک مرتبہ جب ایک خونریز جنگ کے بعد عرب اپنے مرکز پر واپس جا رہے تھے ان کا ایک پرچم مقام مفتوحہ کے قریب ایک ٹیلے پر گڑا رہ گیا۔ اگرچہ عرب فوج کوسوں دور نکل گئی تھی، لیکن صرف پرچم کو ہوا میں لہراتا دیکھ کر کئی روز تک عیسائیوں نے شہر کے دروازے بند رکھے۔ کسی میں ہمت نہ ہوئی کہ شہر سے باہر نکل کر

دیکھتا کہ آخر بغیر فوج کے یہ پرچم کیسے یہاں لہرا رہا ہے؟

تعمیراتی کارنامے

ابو عامر منصور کو تعمیرات سے بھی بڑی دلچسپی تھی ۳۸۰ھ میں اس نے ایک بہت بڑا قلعہ الزہرہ کے نام سے بنوایا۔ یہ رفتہ رفتہ ایک خوبصورت اور خوش نما شہر بن گیا۔ عمدہ اور نفیس مکانات جن کے سنہرے گنبد آفتاب کی طرح روشن تھے۔ پُر فضا سیر گاہوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ بازاروں کی خوشنمائی دیکھنے والوں کی نظر اپنی طرف کھینچتی تھی منصور نے وادی الکبیر کا شاندار پُل بھی تعمیر کر دیا جس پر ایک لاکھ ۴۰ ہزار دینار سُرخ صرف ہوئے۔ ۳۹۲ھ میں منصور کا انتقال ہو گیا ہشام کے لیے یہ بڑا عمدہ موقع تھا کہ اسے تمام اختیارات سلطنت اپنے ہاتھ میں لے لیتا خود رعایا کی بھی یہی خواہش تھی۔ اور خوش قسمتی سے منصور کا لڑکا بھی قرطبہ میں موجود نہیں تھا۔ لیکن ہشام اتنے دنوں کے تعطل سے اتنا از کار رفتہ ہو گیا تھا کہ اس نے اس طرف توجہ نہیں کی۔

اور فوراً ابو عامر منصور کے بیٹے عبدالملک کو اپنا حاجب مقرر کر لیا۔ اس کے اس طرز عمل سے اس کے حامی بڑے بد دل ہوئے لیکن مجبور تھے کیا کرتے! عبدالملک بھی اپنے باپ کی طرح بڑا جیالا اور اولوالعزم شخص تھا۔ یہ بھی حکومت اور شاہی محل پہ باپ کی طرح چھا گیا۔ اس نے ۳۹۴ھ میں جلیقیہ کے عیسائی بادشاہ کو بُری طرح شکست دی اس کے پایہ تخت لیون تاراج کیا لیکن یہ زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہا۔ محرم ۳۹۹ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔

عجب بے ہودہ وزیر

عبدالملک کی وفات کے بعد اس کا بھائی عبدالرحمٰن بن منصور حاجب مقرر ہوا۔ یہ بھی ہشام کو انگلیوں پر نچاتا رہا۔ لیکن یہ جتنا صاحبِ تدبیر، بہادر اور اولوالعزم تھا اس سے کہیں زیادہ بیوقوف تھا اس نے وہ پردہ بھی ہٹا دینا چاہا جو اب تک وزارت اور خلافت کے درمیان حائل تھا۔ اس نے ہشام کو مجبور کیا کہ وہ اس کی ولیعہدی کا اعلان کر دے ہشام نے تعمیل کر دی۔ یہ واقعہ ۳۹۹ھ ربیع الاول کا ہے۔ اس بات نے عوام کو

عبدالرحمٰن سے بہت برگشتہ کر دیا، وہ ایک مہم پر فوج لے کر قرطبہ کے باہر گیا، یہاں بغاوت ہوئی اور اس بغاوت کا خاتمہ عبدالرحمٰن کے قتل پر ہوا۔ رجب ۳۹۹ھ اس اثنا میں محمد بن عبدالجبار المہدی زبردستی ہشام کو ہٹا کر خلیفہ بن بیٹھا تھا۔ المہدی کی مدد بربروں نے کی تھی اب وہ کھیل کھیلے کہ تمام عربوں اور بربروں اور عام رعایا میں آویزش کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ آخر المہدی نے ہشام کو قید خانے سے نکال کر پھر تخت خلافت پر متمکن کر دیا۔ اور انجام کے خوف سے بھاگ کھڑا ہوا۔ لیکن اب تخت خلافت کا ایک اور حریف سلیمان پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے عیسائیوں کو سبز باغ دکھائے تھے کہ کامیابی کی صورت میں ان سے یہ یہ سلوک کیا جائے گا یہی کھیل المہدی بھی کھیل رہا تھا۔ وہ طلیطلہ بھاگ کر پہنچا، وہاں کے لوگوں نے خلاف توقع پذیرائی کی۔ اس نے عیسائیوں کا ایک لشکر مسلمانوں سے لڑنے کے لیے تیار کیا۔ اور عیسائیوں سے بہت سے مراعات کے وعدے کر لیے اور سلیمان کے مقابلے کو نکلا۔ یہ واقعہ ۴۲۰ھ کا ہے۔ مقابلے کی تاب نہ لا کر سلیمان بھاگ کھڑا ہوا۔ اب پھر المہدی کا دور شروع ہوا۔ اس نے پھر ہشام کو قید کر لیا اور خلیفہ بن بیٹھا۔ لیکن اس مرتبہ یہ بری طرح ناکام ہوا۔ ایک خواجہ سرا عنبر نے اسے قتل کر دیا۔ ہشام پھر تخت خلافت پر بیٹھ گیا لیکن اب حالات بدل چکے تھے، وہ عرب بربر خانہ جنگی کو نہ روک سکا۔ وہ بربروں کے سرگروہ سلیمان کو جو عیسائیوں کی مدد کے بھروسے پر مسلمانوں کو زبردست نقصان اور عیسائیوں کو زبردست فوائد پہنچا رہا تھا راہ راست پر نہ لا سکا، آخر ۴۰۳ھ میں زبردست خونریزی کے بعد سلیمان غالب آیا۔ اور اس نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ ہشام کو قتل کر دیا۔

لیکن یہ حکومت سلیمان کو راس نہ آئی، اس کے خلاف بھی بغاوتیں شروع ہو گئیں اور متعدد صوبوں نے خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ ۴۰۷ھ میں اطالقہ (اتالیکا) کے میدان میں سلیمان اور علی ابن حمود (سردار بربر) والئ افریقیہ کے درمیان زبردست جنگ ہوئی۔ اس جنگ کا اختتام سلیمان کی شکست پر ہوا۔ علی ابن حمود نے اسے

قتل کر دیا۔

اور اب علی ابن حمود خود مدعئ خلافت بن بیٹھا۔

"عرب بربر آویزش" تاریخ کا تاریک ترین صفحہ ہے۔

بربر ہرگز آمادۂ پیکار نہ ہوتے۔ اگر عربوں نے ان کے ساتھ اس مساوات کا برتاؤ کیا ہوتا جس کا حکم اسلام نے دیا ہے۔

عربوں پر یہ کمزوری ہمیشہ غالب رہی اور حد یہ ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی اس میں بہت کم فرق آیا۔ وہ خود تو احساسِ برتری میں مبتلا رہے اور دوسروں کو اپنے سے کمتر سمجھتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آویزش شروع ہو گئی اور اس آویزش کا نتیجہ یہ نکلا کہ عرب بھی تباہ ہوئے بربر بھی برباد ہوئے اور اسلامی حکومت بھی ختم ہو گئی جس کی ذمہ داری ظاہر ہے دوسروں کے بجائے خود اپنے ہی اوپر عائد ہوتی ہے۔

عہدِ اختلال و خلفشار

مُسلمانوں کی باہمی معرکہ آرائیاں عیسائیوں کی امنگیں اور ولولے

کچھ شخصیتیں، کچھ واقعات، کچھ حادثات مرکزیت کا اختتام!

سنہ ۴۰۷ھ سے سنہ ۴۷۸ھ تک علی بن حمود الناصر الدین اللہ کا شاندار لقب اختیار کر کے تختِ حکومت پر متمکن ہوا۔ رعایا خانہ جنگیوں اور ہنگامہ آرائیوں سے عاجز آچکی تھی اس نے خوشی خوشی اس کی بادشاہت قبول کرلی۔ شروع میں اس نے عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کی کسی کے ساتھ رعایت نہیں کرتا تھا۔ لیکن جب اُسے معلوم ہوا کہ لوگوں کے دلوں میں خاندانِ امیہ کی یاد چٹکیاں لے رہی ہے۔ اور کسی اموی شخص کو اس منصب پر فائز کرنا چاہتے ہیں تو اس نے اپنی پالیسی بدل دی اور ظلم و جور کا سلسلہ شروع کردیا۔ بربروں نے بہت زیادہ طوفانِ بدتمیزی مچا رکھا تھا۔ نہ کسی کی جان محفوظ تھی نہ آبرو نہ مال، امن و امان کو ان بربروں نے پوری بربریت کے ساتھ تاراج کر رکھا تھا، علی بن حمود نے بھی بربروں کی پشت پناہی شروع کردی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے خلاف بھی شورش شروع ہوئی اور سنہ ۴۰۸ھ میں یہ قتل کردیا گیا، پھر القاسم تخت نشین ہوا جو اشبیلیہ کا حاکم تھا۔ اس کا عہد بھی بربروں کی امن سوزی، بغاوت شور اور خانہ جنگی میں ختم ہوا۔ اس کے خلاف اس کے بھتیجے یحییٰ نے بغاوت کی، یہ بھاگ گیا وہ تخت پر بیٹھ گیا۔ یہ واقعہ سنہ ۴۱۰ھ کا ہے۔ اس کے بعد پھر سنہ ۴۱۳ھ میں نمودار ہوا۔

اور ۴۲۰ھ میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

اس اثنا میں خاندان بنی امیہ کے تین شہزادے وقتاً فوقتاً ذرا سی مدت کے لیے تخت نشین ہوئے۔ لیکن حکومت ان سے بھی نہ سنبھلی یا قتل ہوئے یا روپوش!

ان خانہ جنگیوں اور ہنگامہ آرائیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اندلس کی حکومت مرکز سے محروم ہو گئی۔ اور چھوٹی چھوٹی کمزور، خود غرض اور غدار ریاستوں میں تقسیم ہو گئی۔ جس ریاست کے حاکم کے پاس ذرا سی بھی قوت تھی وہ آزادی اور خود مختاری کے خواب دیکھنے لگا چنانچہ قرطبہ، غرناطہ، طلیطلہ، اشبیلیہ، مالقہ، الجزائر، سرقسطہ، امیریہ، افریقیہ میں چھوٹی چھوٹی آزاد اور خود مختار حکومتیں قائم ہو گئیں۔

۵۱۲ھ (۱۱۱۸ء) تک یہی کیفیت رہی، یہ چھوٹی چھوٹی اور کمزور حکومتیں آپس میں لڑتی رہیں۔ اور عیسائی قوت حاصل کرتے رہے۔ انھوں نے متعدد مقامات پر قبضہ کر لیا بہت سے قلعے لے لیے، بہت سے حقوق اور مراعات حاصل کر لیے بعض ریاستوں کو اپنا باجگزار بنا لیا۔ اب یہ صاف معلوم ہو گیا کہ مسلمانوں کے ادبار کا زمانہ شروع ہو چکا ہے اور عیسائی عروج و ترقی حاصل کر رہے ہیں۔

عیسائی بڑی خاموشی اور ایک خاص نظم و انتظام کے ساتھ مسلمانوں کو آپس میں لڑاتے رہتے تھے اور فوائد حاصل کرتے رہتے تھے۔

طلیطلہ پر عیسائیوں کا قبضہ

۴۷۸ھ میں القادر باللہ نے عیسائی اقتدار سے مرعوب ہو کر اور بلنسیہ کی حکومت پر فائز رہنے کی امید میں طلیطلہ ادفونش کے حوالے کر دیا۔ طلیطلہ کا شمار قرطبہ کے بعد ہوتا تھا۔ اس خبر نے عربوں کے ہر گھر کو ماتم کدہ بنا دیا۔ ادفونش جب طلیطلہ میں داخل ہوا تو عیسائیوں کی مسرت جنون اور دیوانگی کی حد تک پہنچ گئی۔ عیسائیوں نے مسلمانوں کے احسانات کا صلہ یہ دیا کہ پہلا فرمان جو نافذ کیا وہ یہ تھا کہ مسلمان جبراً عیسائی بنا لیے جائیں اور مساجد کو کلیساؤں میں تبدیل کر دیا جائے۔ شہر بشطر پر عیسائیوں نے جب قبضہ کیا تو وعدہ کیا تھا مسلمانوں کے ساتھ کوئی زیادتی نہ کی جائے گی لیکن قبضہ کرتے ہی اس عہد کو توڑ دیا۔ اور عورتوں اور بچوں

تک کو قتل کر دیا۔

یوسف بن تاشفین

اسی سال ادفونش نے ایک بہت بڑا لشکر لے کر اشبیلیہ پر چڑھائی کی، یہ مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کا بہت بڑا مرکز تھا۔ یہاں کے فرماں روا نے والیٔ افریقہ یوسف بن تاشفین کو اپنی مدد کے لیے بلایا۔ وہ محض حسبتہً للہ جہاد کی نیت سے یہاں پہنچا، وادیٔ زلاقہ میں بڑی خونریز جنگ ہوئی۔ عیسائیوں نے انجیل ہاتھ میں لے کر قسم کھائی تھی کہ میدانِ جنگ سے فرار نہ ہوں گے۔ لیکن انھیں فرار ہونا پڑا۔ ان کے ہزاروں آدمی ہلاک ہوئے، ان کا سارا مال مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔

یوسف بن تاشفین کے خلوص کا تقاضا یہ تھا کہ اگر اس کی صحیح قسم کی حوصلہ افزائی کی جاتی تو بہت ممکن تھا کہ اندلس پر پھر مسلمانوں کی مضبوط و مستحکم حکومت قائم ہو جاتی لیکن اس کے خلاف سازشیں شروع ہو گئیں بلکہ اسے گرفتار کرنے کی سازشیں ہونے لگیں، لیکن وہ ایک زیرک آدمی تھا۔ اس نے اپنی قربانی کا کوئی صلہ نہیں لیا۔ اور خاموشی کے ساتھ اندلس کو اس کی قسمت کے سپرد کر کے افریقہ واپس چلا گیا۔ اس کے زمانے میں عیسائیوں کے حوصلے پھر بڑھ گئے اور انھوں نے ترک تازیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر دیا۔

یوسف بن تاشفین کی آمد و رفت اور پھر آمد

یوسف بن تاشفین کے جاتے ہی عیسائی پھر چوکنے اور جنگ و پیکار کی تیاریاں کرنے لگے۔ ادفونش اپنی سابقہ شکست سے اتنا برہم تھا کہ اس نے اعلانِ جنگ کیے بغیر عبدالعزیز رئیسِ مرسیہ پر حملہ کر دیا۔ اور قلعہ الیط (الیڈو) پر قبضہ کر لیا۔ اب ادفونش کے حوصلے بڑھ گئے۔ ۴۸۱ھ میں وہ اشبیلیہ کی تسخیر کے لیے بڑھا۔ المعتمد خود افریقہ پہنچا اور یوسف بن تاشفین سے استدعا کی کہ وہ اس کی مدد کے لیے چلے۔ وہ اندلس آیا اور عبدالعزیز کی رفاقت میں قلعۂ الیط کو گھیر لیا۔ لیکن عبدالعزیز اور المعتمد آپس میں لڑ پڑے، وہ بددل ہو کر پھر افریقہ چلا آیا۔

۴۸۳ھ میں یوسف بن تاشفین بہ ارادۂ تسخیر پھر اندلس وارد ہوا۔ طلیطلہ کے دروازے

تک پہنچ گیا، شاید وہ اسے فتح بھی کر لیتا لیکن عربوں نے غداری کی، کسی نے بھی اس کی مدد نہ کی۔ عرب اس سے اس لیے بھڑکتے تھے کہ اگر وہ کامیاب ہو گیا تو اندلس کی انفرادی حیثیت ختم ہو جائے گی۔ اور وہ افریقہ کا ایک صوبہ ہو کر رہ جائے گا۔ یوسف خود تو پھر واپس افریقہ چلا گیا اور اپنے مشہور سپہ سالار سیر ابن ابی بکر کو کارِ جہاد پر مامور کر گیا۔ سیر نے بڑی دلاوری کے ساتھ جہاد کا سلسلہ جاری رکھا۔ مگر عربوں نے نہ صرف اس کا ساتھ نہیں دیا بلکہ دراندازیاں کرتے رہے۔ چنانچہ اس نے یوسف کے حسب ایما عربوں کو تنبیہہ و تادیب کا سلسلہ شروع کیا، سب سے پہلے وہ ابن ہود والئی سرقسطہ کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ عیسائیوں سے ملا ہوا تھا۔ سیر نے حکمتِ عملی اور بہادری سے کام لے کر اس قلعے کو بڑی آسانی سے سر کر لیا۔ پھر اس نے ابن طاہر کو شکست دی اور مرسیہ پر قابض ہو گیا۔ بعد ازاں اس کے لشکر نے بطلیموس اور المریہ فتح کر لیا۔ پھر اس نے اشبیلیہ پر اپنا جھنڈا گاڑا۔ آخر میں المعتمد کو آمادہ بہ جنگ پا کر اس سے لڑا۔ اس کے بیٹوں کو ایک ایک کر کے قتل کیا، قرطبہ پر قبضہ کر لیا۔ اور المعتمد کو گرفتار کر کے افریقہ بھیج دیا۔ المعتمد بھی اب عیسائیوں کا آلۂ کار بن چکا تھا۔ المعتمد کے ساتھ اس کا لڑکا ابوالحسن عبداللہ اور اس کی بیوی اعتماد کو بھی افریقہ بھیج دیا گیا۔ یوسف نے المعتمد پر جیل میں بڑی سختیاں کیں جن کی تاب نہ لا کر وہ فوت ہو گیا۔

بلیس ہزار عربوں کی ہلاکت

۵۰۰ھ (۱۱۰۶ء) میں یوسف بن تاشقین کا انتقال ہو گیا۔ جانشینی اس کے بیٹے ابوالحسن علی کے حصے میں آئی۔ یہ بھی بڑا بیدار مغز اور اولوالعزم انسان تھا، اندلس میں اپنے باپ کی طرح اس نے بھی مرابطین (یوسف بن تاشقین کے قبیلے کا نام) کی فوجی پیش قدمی کامیابی کے ساتھ جاری رکھی۔

ساتھ ہی ساتھ عیسائیوں کی معاندانہ اور باغیانہ سرگرمیاں بھی جاری تھیں۔ چنانچہ ادونش اوّل ابن ادمیر والئی برشلونا نے ۵۰۳ھ میں المستعین ابن ہود کو شکست دے کر تمام ملکِ ارغون کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ لیکن علی کے گورنر تمیم نے اس کی

پیش قدمی روک دی یمتیم کے حملے نے عیسائیوں کو اتنا ہراساں کر دیا کہ پھر ۵۱۲ھ تک وہ سر اٹھانے کی ہمت نہ کر سکے۔ اسی سال اوقونش نے فرانس کے عیسائیوں کی مدد سے متعدد قلعے مسلمانوں سے چھین لیے۔ اورقہ کے قریب ابراہیم ابن یوسف ابن تاشفین کو زبردست شکست دی۔ اس جنگ میں بیس ہزار عرب کام آئے۔ علی یہ سنتے ہی ۵۱۳ھ میں اشبیلیہ اور قرطبہ ہوتا ہوا سرقسطہ پہنچا اس کی دہشت سے عیسائی پھر دبک گئے۔ اس نے وہ تمام مقامات جو عیسائیوں نے مسلمانوں سے چھین لیے تھے پھر بزور شمشیر واپس لے لیے، پھر اپنے بھائی یمتیم سے ملتا ہوا افریقہ چلا آیا۔

یوسف بن تاشفین کے مرنے کے بعد بھی اس کا کام اس کے بیٹوں نے جاری رکھا لیکن ــــ موت سے کس کو رستگاری ہے؟

یہ دونوں بھائی بھی اپنا جاہ و جلال دکھا کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ سنہ ۵۲۰ھ میں ابوطاہر یمتیم کا انتقال ہو گیا۔ علی نے اس کی جگہ اپنے بیٹے تاشفین کو اندلس کا گورنر بنا دیا۔ سنہ ۵۳۷ھ میں علی کا بھی انتقال ہو گیا۔ علی کے انتقال کے بعد تاشفین افریقہ اور اور اندلس کا واحد فرمانروا بن گیا۔ تاشفین کا سارا عہد موحدین کی سرکوبی اور مقابلے میں صرف ہوا۔ یہ ایک نئی طاقت افریقہ میں ابھر رہی تھی۔ شروع شروع میں تاشفین کو باغیوں کے مقابلے میں خاصی کامیابی ہوئی لیکن سنہ ۵۳۹ھ میں تلمان کے قریب بری طرح ہارا، گھوڑے پر بیٹھ کر بھاگا لیکن خندق میں گر کر ہلاک ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ابواسحٰق ابراہیم مالک تاج و تخت ہوا۔ لیکن خاندانِ موحدین کے گل سرسبد عبدالمومن نے سنہ ۵۴۱ھ میں تاوس فتح کر لیا۔ پھر مراقش آیا، اسے فتح کیا، ابواسحٰق ابراہیم گرفتار ہو کر قتل کیا گیا۔

خاندانِ موحدین

یوسف بن تاشفین نے خاندانِ مرابطین کی حکومت سارے افریقہ اور اندلس پر قائم کر لی تھی لیکن یہ حکومت ابراہیم پر ختم ہو گئی اور ایک نیا خاندان موحدین برسر اقتدار آگیا۔ مرابطین

کے انحطاط و زوال نے پھر اندلس میں چھوٹی چھوٹی اور کمزور مسلمان ریاستیں قائم کرا دیں۔ جہاں جس کو موقع ملا اس نے خود مختاری کا جھنڈا لہرانا شروع کر دیا۔ لیکن موحدین نے جلد ہی اس ملک پر بھی اپنی حکومت قائم کر لی۔ عیسائیوں کو پھر سر اٹھانے کا موقع ملا۔ انھوں نے وہی پرانی چالیں چلیں جو ہمیشہ سے چلتے آئے تھے یعنی مسلمانوں کو آپس میں لڑانا شروع کر دیا۔ پھر انھیں کمزور کر کے ان علاقوں پر اقتدار و تسلط حاصل کرنے لگے۔ چنانچہ المریہ پر جو بہت بڑا تجارتی مرکز تھا انھوں نے قبضہ کر لیا۔ یہ واقعہ ۵۴۶ھ کا ہے۔ دوسرے "آزاد" اندلسی شہروں کے خود مختار فرماں روا یہ تماشہ دیکھتے رہے۔ ابوسعید کو اپنا قائم مقام مقرر کر کے افریقہ واپس چلا آیا۔

۵۵۸ھ میں عبدالمومن کا انتقال ہو گیا۔ ابو یعقوب تخت نشین ہوا۔ یہ ۵۶۶ھ میں افریقہ سے اندلس آیا۔ اشبیلیہ کو پایہ تخت قرار دے کر یہیں رہ گیا۔ یہاں اس نے تھوڑا بہت فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا۔ لیکن عیسائیوں کے سیلاب کو روکنے کے سلسلے میں یہ سعی و کوشش کے باوجود زیادہ کامیاب نہ ہو سکا۔ ۵۸۰ھ میں اس نے وفات پائی اس کے بعد اس کا بیٹا ابو یوسف المنصور تخت نشین ہوا۔

ابو یوسف المنصور

ابو یوسف المنصور نے اندلس کے مغربی حصے کو عیسائیوں کی ترکتازیوں سے محفوظ کیا پھر اشبیلیہ ہوتا ہوا مراکش چلا گیا۔ لیکن دوسرے سال اسے پھر واپس آنا پڑا۔ کیونکہ عیسائیوں نے دب کر صلح کر لی لیکن ۵۹۱ھ میں بے سان و گمان زبردست حملہ مسلمانوں پر کر دیا۔ المنصور بالکل تیار تھا۔ زبردست جنگ ہوئی، عیسائیوں نے سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی۔ اور مسلمان بھی سر سے کفن باندھ کر میدان میں نکلے تھے۔ دونوں اپنی جگہ یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ جنگ بڑی فیصلہ کن اہمیت رکھتی ہے۔ دونوں نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ عیسائیوں کو اپنی کثرت تعداد پر غرور تھا، لیکن جب وہ شکست کھا کر بھاگے تو اس طرح کہ ایک لاکھ چھیالیس ہزار عیسائی ہلاک اور تیس ہزار قید ہوئے۔ ایک لاکھ پچاس ہزار خیمے، اسی ہزار گھوڑے، ایک لاکھ خچر، چار لاکھ بار برداری کے گدھے اور ساٹھ ہزار مختلف

اقسام کے زرہ بکتر اور بہت وافر زروجواہر مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ المنصور نے بڑی فراخ دلی کے ساتھ یہ سارا مال وزر اپنی فوج میں تقسیم کر دیا۔

۵۹۵ھ میں المنصور کا انتقال ہو گیا۔ اس کی عمر کا بڑا حصہ جہاد میں بسر ہوا تھا۔

المنصور کے بعد اس کا بیٹا ابوعبداللہ الناصر تخت نشین ہوا لیکن یہ خود سر اور کوتاہ اندیش تھا۔ اسی کی بے تدبیری اور گھمنڈ کے باعث جنگ العقاب میں مسلمانوں کو زبردست اور حوصلہ فرسا شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس جنگ میں چھ لاکھ مسلمانوں کا پورا لشکر ضائع ہو گیا مشکل سے چند ہزار نفوس اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو سکے اس جنگ کے اس ہوشربا اور لرزہ خیز انجام کا نتیجہ یہ ہوا کہ افریقہ کے قصبے کے قصبے ویران ہو گئے، ایک عرصۂ دراز تک فوج فراہم نہ ہو سکی۔ اندلس کے حفظ و دفاع میں بڑی دشواریاں پیش آنے لگیں ــــ اور عیسائیوں کے حوصلے بڑھ گئے ان میں ایک نئی امنگ اور ترنگ پیدا ہو گئی۔ ان کے مقاصد کی تکمیل کا موقع پیدا ہو گیا۔ اس شکست نے مسلمانوں کی کمر توڑ دی اور حق یہ ہے کہ پھر اندلس نہ سنبھل سکا۔

۶۱۲ھ میں ابوعبداللہ الناصر کا انتقال ہو گیا۔ یہ لاولد فوت ہوا تھا لہٰذا اس کا بوڑھا چچا عبدالواحد تخت پر بیٹھا، یہ بڑا کمزور اور بے حوصلہ انسان تھا، اس کے عہد میں سمجھنا چاہیے خاندانِ موحدین کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ کیونکہ اندلس کے شہر پھر "آزاد" ہونے لگے۔ اور تھوڑے ہی عرصے میں بہت سی عیسائی حکومتیں با جگزار اور ذلہ ربا مسلم حکومتیں قائم ہو گئیں۔ عبدالواحد کا ۶۲۱ھ میں مراکش میں انتقال ہو گیا خانہ جنگی اور باہمی حرب و پیکار کی یہی کیفیت مسلسل قائم رہی، عیسائی اس سے خوب فائدہ اٹھاتے رہے اور نئے نئے مقامات پر قبضہ کرتے رہے۔

مسلمانوں کا دبدبہ ختم ہوتا جا رہا تھا اور عیسائیوں کی کامرانیوں نے ان میں حصولِ سلطنت کا نہ مٹنے والا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ اس تمام عرصے میں افریقہ اور اندلس میں کوئی مضبوط حکومت قائم نہ ہو سکی۔ عیسائی ایک کھلونے کی طرح ان چھوٹی چھوٹی مسلمان ریاستوں کو اپنی اغراض کی تکمیل کا ذریعہ بناتے رہے۔

اس تمام مدت میں مسلمانوں کو ایک دن بھی امن و سکون کا میسر نہ آیا۔

۶۶۸ھ تک متعدد افراد اور متعدد خاندان برسر اقتدار آئے، لیکن ان کا کارنامہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ آپس میں لڑتے رہے ایک دوسرے کی گردنیں کاٹتے رہے۔ اور عیسائیوں کی قوت و طاقت بڑھتے رہے۔

شعلۂ مستعجل پھر خاندان بنو نصر نے عروج حاصل کیا، لیکن یہ بھی شعلہ مستعجل ثابت ہوا۔ بنو نصر کے عروج کے بعد محمد بن الاحمر، محمد ثانی، محمد ثالث، ابو سعید، ابوالولید، اسمٰعیل بن ابوسعید، محمد چہارم یوسف، محمد پنجم محمد ششم اور آخر میں پھر محمد پنجم باری باری برسر حکومت آئے۔ انھوں نے عیسائیوں سے لڑائیاں بھی کیں، شکست بھی دی اور کھائی بھی، جیتے کم ہارے زیادہ۔ دشمن سے لڑتے میں اتنے مستعد ثابت نہیں ہوئے جتنے اپنوں سے جنگ کرنے اور ان کا خون بہانے میں۔

یہ دور ۷۹۳ھ تک قائم رہا۔

اس تمام عرصے میں مسلمانوں نے کھویا زیادہ اور پایا بہت کم! ان کی قوت پارہ پارہ ہوتی چلی گئی۔ دشمن نئی زندگی حاصل کرتا رہا اور آگے بڑھتا رہا۔

اندلس پر عیسائی تسلط کا آغاز

محمدؒ پنجم کے انتقال کے بعد ہمیں پھر نئے حکمرانوں کی ایک فہرست نظر آتی ہے۔ وہ یہ ہے:

یوسف ثانی، محمد ہفتم، یوسف ثالث، محمد ہشتم، محمد الصغیر وغیرہ۔

مذکورہ لوگوں کا دور ۸۷۰ھ تک قائم رہا۔ اس مدت میں جو بہت طویل ہے چھوٹے چھوٹے آزاد اور خود مختار عرب فرماں رواؤں کا کارنامہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ یہ ایک دوسرے کے خلاف سازشیں اور بغاوتیں کرتے رہے، ایک دوسرے سے برسر

بیکار رہے۔ انھوں نے عیسائیوں کی مدد کر کے انھیں مسلم مقبوضات پر قابض کر دیا ان کی طاقت وقوت کا لوہا مانا، ان کے خراج گزار بن جانے کی ہتک کو فخر اور مسرت کے ساتھ قبول کیا۔

اب صورت حال یہ تھی کہ اندلس کے بہت بڑے حصے پر یا تو عیسائی قابض ہو چکے تھے یا براہ راست قابض نہیں ہوئے تھے لیکن بالواسطہ وہی حکومت کر رہے تھے، مسلمانوں کو قدرت نے بہت سے مواقع دیے لیکن ان مواقع سے انھوں نے فائدہ نہ اٹھایا۔ قدرت بھی آخر کب تک اُن کا ساتھ دیتی!؟

اندلس چھن گیا

آٹھ سو برس تک حکومت کرنے کے بعد اسپین سے مسلمانوں کی جلاوطنی!

مسلمانوں کی خود غرضی، خانہ جنگی اور مفاد پرستی کا ہولناک انجام

شرائط صلح اور ان کا حشر

حالات بدلتے رہے۔
تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔

مسلمانوں نے اندلس پر تقریباً آٹھ سو سال تک جاہ و جلال، دبدبے اور طنطنے کے ساتھ داد حکمرانی دی تھی۔ لیکن جب انھوں نے اپنی صلاحیتیں کھو دیں تو حکومت سے محروم ہو گئے۔ انھوں نے خدا کو فراموش کر دیا، خدا نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔

جس اندلس کے فرماں رواؤں سے فرانس اور دوسرے یورپین ممالک کے سلاطین لرزتے اور کانپتے تھے اس کے ایک فرماں روا سے ـــ جو آخری فرمانروا کا باپ تھا، انھوں نے خراج لینا شروع کر دیا۔

کہ ہم نے انقلاب چرخ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں!

۸۷۰ھ میں ابوالحسن مسند خلافت پر جلوہ آرا ہوا۔ یہ غرناطہ کا فرماں روا تھا اور مسلمانوں کی جنگ باہمی کے باعث سارے اندلس کی مسلم حکومت ختم ہو کر بس یہیں سمٹ آئی تھی ـــ!

اس ابوالحسن کو قسطلہ کے معمولی فرمانروا فرڈی نینڈ اور اس کی ملکہ ازابیلا نے الٹی میٹم بھیجا!:-

"اگر زندہ رہنا اور صلح و امن کے ساتھ رہنا چاہتے ہو تو ہمیں خراج دینا منظور کرو"

ابوالحسن کی رگوں میں جو خون گردش کر رہا تھا ابھی بالکل سرد نہیں ہوا تھا۔ ابھی کچھ حرارت اس میں باقی تھی۔ اس نے جواب دیا:

"غرناطہ کے دارالضرب (ٹکسال) میں سونے کے سکے نہیں ڈھلتے عیسائیوں کے جگر اور سینے چاک کرنے کے لیے شمشیریں اور سنانیں ڈھلتی ہیں"

پھر اس نے ۸۸۶ھ میں سرحد اندلوسیہ کے قلعہ صخرہ پر حملہ کیا۔ فرڈی نینڈ مقابلہ نہ کر سکا پسپا ہو گیا۔ لیکن صرف ایک سال بعد یعنی ۸۸۷ھ میں عیسائیوں نے قلعہ الحمد پر قبضہ کر لیا اور جوشِ تعصّب میں ہزارہا مسلمان عورتوں اور بچوں کو تہ تیغ بے دریغ کر دیا۔

بیٹا باپ کے خلاف بغاوت کرتا ہے

ابوالحسن نے ڈٹ کر عیسائی یلغار کا مقابلہ کیا۔ لیکن اس کے فرزند عبداللہ نے اس کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس بغاوت کا انجام یہ ہوا کہ غرناطہ کی آخری اور چھوٹی سی مسلم حکومت دو حصّوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک پر باپ کی حکومت تھی اور دوسرے پر بیٹا حکومت کرتا تھا۔

چچا اور بھتیجے کی جنگِ زرگری

ابوعبداللہ ۸۸۸ھ میں عیسائیوں سے جنگ کرتا ہوا گرفتار ہو گیا۔ اس کی ساری سپاہ فرڈینینڈ نے ذبح کر دی۔ غرناطہ کے مسلمان فریاد کناں ابوالحسن کے پاس پہنچے وہ اب نابینا اور مفلوج تھا۔ اس نے اپنے بھائی الزغل کو حکومت کا پروانہ عطا کیا۔

۸۹۰ھ میں عیسائیوں نے پھر یورش کی اور متعدد مقامات پر قبضہ کر لیا۔ اب غرناطہ کے سوا سارا اندلس ان کی تحویل میں تھا اور غرناطہ بھی۔ بس یوں سمجھیے کہ عالمِ نزع میں دم توڑ رہا تھا۔

الزغل نے حالات کو درست کرنے کی بڑی کوشش کی، لیکن حالات اتنے بگڑ چکے تھے کہ ان کا سنبھالنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا تھا۔ اسی اثنا میں فرڈی نینڈ نے ابوعبداللہ کو قید سے رہا کر کے مالقہ کی حکومت حوالے کی۔ ابوعبداللہ نے رہا ہوتے ہی فرڈی نینڈ کے اشارے

سے جنگ زرگری شروع کردی۔ اپنے چچا الزغل کے مقابلے میں سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ فرڈی نینڈ اس کی "مدد" کو اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ قلعہ پر قلعہ ابو عبداللہ کے لیے فتح کرتا رہا۔ الزغل کو شکست دیتا رہا۔ ابو عبداللہ مطمئن رہا کہ یہ سب فتح کر کے فرڈی نینڈ اس کے حوالے کر دے گا۔

ابو عبداللہ سے فرڈی نینڈ کا معاہدہ یہ تھا کہ جہاں کے لوگ اس کی بادشاہت تسلیم کر لیں گے۔ انھیں وہ نہیں چھیڑے گا، لیکن فرڈی نینڈ نے ایسے مقامات پر بھی چھاپے مارنا شروع کر دیے۔

آخر بسطہ کے مقام پر ایک زبردست جنگ ابو عبداللہ اور فرڈی نینڈ کے مابین ہوئی۔ اس کا خاتمہ اس طرح ہوا کہ بسطہ پر فرڈی نینڈ نے یہ وعدہ کر کے قبضہ کر لیا کہ مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت کی جائے گی۔

عیسائی بادشاہ کس طرح عہد نبھاتا ہے ۱۰ محرم ۸۹۵ھ کو فرڈی نینڈ بسطہ میں داخل ہوا۔ اور اپنا معاہدہ اس طرح پورا کیا کہ مسلمانوں کی ساری جائداد و مال عیسائیوں میں تقسیم کر دیا۔ اور ان کے قتلِ عام کا حکم صادر کر دیا۔

الزغل نے ابو عبداللہ کو زک دینے کے لیے فرڈی نینڈ کی رفاقت اختیار کر لی۔ فرڈی نینڈ نے وعدہ کر لیا کہ صوبہ المریہ اسے عطا کر دیا جائے۔

اب الزغل اور ابو عبداللہ میں جنگ و پیکار کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ فرڈی نینڈ کبھی ایک کی حوصلہ افزائی کرتا کبھی دوسرے کی۔ اس طرح جب یہ دونوں کمزور ہو گئے تو اس نے تمام مواعید کو بالائے طاق رکھ کر الزغل کو حکم دیا کہ وہ مراکش چلا جائے اور ابو عبداللہ کو شدید محاصرہ کے بعد ۸۹۷ھ میں اس نے صلح پر مجبور کر دیا۔ حالانکہ غرناطہ کے مسلمان ہر قیمت پر جنگ جاری رکھنا چاہتے تھے لیکن ابو عبداللہ کے حوصلے پست ہو چکے تھے۔ وہ لڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔

شرائطِ صلح جن شرائط پر ابو عبداللہ نے فرڈی نینڈ سے صلح کی وہ یہ تھے:

۱: مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت کی جائے گی۔ وہ جہاں چاہیں رہ سکیں گے۔
۲: مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہ کی جائے گی۔
۳: کوئی عیسائی مسجد میں نہ گھسنے پائے گا۔
۴: مساجد اور اوقاف بدستور قائم رہیں گے۔
۵: مسلمان قاضی مسلمانوں کے مقدمات کا فیصلہ کیا کریں گے۔
۶: مسلمان قیدی فوراً رہا کر دیے جائیں گے۔
۷: اگر کوئی مسلمان اندلس سے ترکِ اقامت کر کے افریقہ جانا چاہے تو حکومت سرکاری خرچ پر اُسے افریقہ بھیجے گی۔
۸: جو عیسائی مسلمان ہو گئے ہیں انھیں اسلام ترک کرنے پر مجبور نہ کیا جائے گا۔
۹: اس جنگ میں جو مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا ہے وہ بدستور اُن کے قبضے میں رہے گا۔
۱۰: مسلمانوں کے گھروں پر عیسائی سپاہ متعین نہ کی جائے گی۔
۱۱: موجودہ ٹیکس کے علاوہ کوئی جدید ٹیکس مسلمانوں پر عائد نہ کیا جائے گا۔
۱۲: تین سال تک مسلمانوں سے کسی قسم کا ٹیکس نہ لیا جائے گا۔
۱۳: ابو عبداللہ کے سپرد ابشارات (البکواس) کی حکومت کر دی جائے گی۔
۱۴: آج سے ساٹھ دن کے اندر اس معاہدے کے تمام شرائط پورے کر دیے جائیں گے۔
۱۵: روما کا پوپ اس معاہدہ کا گواہ اور ذمہ دار ہو گا۔
۱۶: ساٹھ روز کے اندر غرناطہ وغیرہ کا سامانِ جنگ عیسائیوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔

اندلس پر عیسائیوں کا مکمل قبضہ

چونکہ غرناطہ کی رائے عامہ اس معاہدۂ صلح کی سخت مخالف تھی۔ لہٰذا ابو عبداللہ نے چپ چپاتے تاریخ معاہدہ سے قبل غرناطہ فرڈیننڈ کے سپرد کر دیا۔

ابو عبداللہ خاموشی سے قصر الحمرا سے نکلا اور غرناطہ سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔

یہ الحمرا وہ قلعہ تھا جو نہ صرف غرناطہ کا بلکہ دُنیا کا ایک تعمیری عجوبہ تھا، فرڈی نینڈ اپنی ملکہ ازابیلا کے ساتھ اسی محل میں مقیم ہوا۔

ابو عبداللہ کو فرڈی نینڈ نے ابشارات جیسی چھوٹی جگہ بھی نہ ٹھہرنے دیا۔ آخر وہ افریقہ آ گیا اور یہیں ۹۴۰ھ میں قتل ہوا۔

مسلمان اندلس سے رخصت ہوتے ہیں

عیسائی فاتحانہ شان سے شہر میں داخل ہوئے۔ فرڈی نینڈ نے معاہدہ پر عمل اس طرح کیا کہ مسلمانوں کو حکم دیا وہ عیسائی ہو جائیں مسلمان عورتوں کو حکم دیا کہ وہ عیسائی ہو جائیں مسلمان مذہبی رسوم اور عبادات کی ادائیگی سے محروم کر دئیے گئے مسجدوں پر تالے لگا دیے گئے۔ اور نماز کی ممانعت کر دی گئی، اگر کوئی مسلمان ان ہدایات و احکام کی خلاف ورزی کرتا تھا اُسے قتل کر دیا جاتا تھا۔ بہت سے مسلمان عیسائی ہو گئے۔ کچھ سچ مچ اور کچھ ظاہری طور پر۔ اکثر نے اس ذلت کی زندگی پر موت کو ترجیح دی، وہ لڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ انھیں بُری طرح قتل کیا گیا۔ ان کی عورتوں کی بے آبروئی کی گئی، ۱۰۲۰ھ میں مسلمانوں کو جبراً اندلس سے خارج کر دیا گیا۔ ہزاروں راستے کے مصائب کی تاب نہ لا کر اس دُنیا سے رخصت ہو گئے جو بچے وہ مرتے کھپتے اور گرتے پڑتے فاس تلمسان اور تیونس وغیرہ جس طرف مُنہ اٹھا اور جہاں جگہ ملی چلے گئے۔ وہ دن ہے اور آج کا دن کہ مسلمان پھر اندلس کی زمین پر قدم نہ رکھ سکے!

نظرِ بازگشت

عربوں نے اندلس پر تقریباً آٹھ سو سال تک حکومت کی۔ جب انھوں نے اندلس کی سرزمین پر قدم رکھا تو اسے جہنم سے بدتر پایا۔ اور جب وہ وہاں سے رخصت ہوئے تو یہ خطۂ ارض جنت الفردوس سے چشمک زنی کرتا تھا۔

عرب جب اندلس میں پہنچے تو وہاں انسانیت دم توڑ رہی تھی، شرافت کا جنازہ نکل رہا تھا، اخلاق دیوالیہ ہو چکا تھا، اقدار انسانی کی کوئی وقعت نہیں رہ گئی تھی، مذہبی اختلافات نے لرزہ خیز مظالم کا لباس پہن لیا تھا۔ اقتصادی نظام نہایت ابتر تھا، غلاموں اور کسانوں

کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا تھا جس کا آج تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔
لیکن جب مسلمان وہاں پہنچے تو وہاں کی ہر چیز بدل چکی تھی۔ وہاں کے مظلوموں نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہاں کے یہودیوں نے عافیت کی زندگی بسر کی، وہاں کے عیسائیوں نے مساواتِ اسلامی کا نظارہ کیا، وہاں کے غلاموں نے برابری کے حقوق پائے۔ وہاں کے کاشتکاروں نے عزت کی زندگی بسر کرنے کا حق حاصل کیا، وہاں کی بنجر زمین پر وہ پھل اگائے گئے، وہ ترکاریاں پیدا کی گئیں، وہ غلہ بویا گیا جس کا نام بھی وہاں کے رہنے والوں نے کبھی نہیں سنا تھا، وہاں کے لوگ نیم وحشی تھے لیکن عربوں نے انھیں تہذیب سکھائی، انھیں انسانیت کا درس دیا، انھیں عزت اور احترام کے معنی بتائے۔
عیسائی اپنے دورِ حکومت میں یہودیوں کے ساتھ تنگِ انسانیت سلوک روا رکھتے تھے، مسلمانوں نے یہودیوں کو وہ تمام حقوق دیے جو ایک مہذب حکومت میں کسی شہری کو حاصل ہو سکتے ہیں، مسلمانوں نے اپنے دورِ حکومت میں عیسائیوں کے مذہبی معاملات میں ذرا بھی مداخلت نہیں کی۔ ان کے نجی معاملات میں بھی دخیل نہیں ہوئے۔ ان کی جان و مال پر بھی ڈاکہ نہیں ڈالا گیا۔ ان کی غلطیوں کو نظر انداز کیا، ان کی بغاوتوں کو معاف کیا۔ ان کی شرارتوں اور سازشوں سے درگزر کیا۔ اُن کے ساتھ زیادہ سے زیادہ بہتر اور شریفانہ برتاؤ کیا۔ اور جب وہ اس دیس سے رخصت ہوئے تو ان کے ساتھ اس سے بدتر سلوک کیا گیا جو مسلمانوں کے آنے سے پہلے عیسائی یہودیوں پر کیا کرتے تھے۔
مسلمان جب اندلس میں پہنچے تو وہ ایک ویرانہ تھا۔
لیکن مسلمانوں نے اندلس کو لہلہاتے ہوئے کھیت، نظر افروز پارک میووں سے بھرپور باغ مرحمت کیے۔
اندلس میں مسلمانوں کے داخلے کے وقت ایک بھی قابلِ ذکر اور قابلِ دید عمارت نہیں تھی۔ لیکن مسلمانوں نے اندلس کی سرزمین پر ایسی یادگارِ زمانہ عمارتیں تعمیر کیں جن کی مثال دنیا اب تک پیش نہیں کر سکی۔ مسجد قرطبہ، قصر الزہرا، قلعہ زاہرہ، الحمرا اور دوسری بہت سی لاجواب عمارتیں۔ ان عمارتوں کے ساتھ جوشِ انتقام میں یہ سلوک کیا گیا کہ اُن

کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔ لیکن ان کے آثار و نقوش آج بھی موجود ہیں اور زبانِ حال سے اپنے معماروں اور بانیوں کی فنی اور انسانی عظمت کا اعتراف کر رہے ہیں۔

اپنے دورِ حکومت میں مسلمانوں نے کسی عیسائی کو جبراً مسلمان نہیں بنایا لیکن حکومت کا چارج لیتے ہی عیسائیوں نے مسلمانوں کو جبر و جور کے ذریعے عیسائی بنانا شروع کر دیا آج وہاں سے اگرچہ مسلمانوں کا نام و نشان مٹ چکا ہے لیکن مسلمانوں کے آثار و نقوش وہاں کے لوگوں میں اب بھی موجود ہیں۔

یورپ کے دوسرے خطوں کی طرح اندلس کی سرزمین بھی مسلمانوں کے آنے سے پہلے علم سے محروم تھی۔ لیکن مسلمان جب وہاں پہنچے تو ان کے ہاتھ میں صرف تلوار ہی نہیں قلم بھی تھا۔ انھوں نے وہاں علم کی ترویج کی، وہاں کے لوگوں کو علم سکھایا۔ ان میں علم کا ذوق پیدا کیا، انھیں علم کی طرف راغب کیا، انھوں نے وہاں ایسے ایسے کتب خانے قائم کیے جن کی مثال ترقی کے اس عہدِ جدید میں ملنا بھی مشکل ہے۔ صرف الحکم کے کتب خانہ میں چار لاکھ کتابیں تھیں جنھیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے میں چھ مہینے کی مدت صرف ہوتی تھی۔

فلسفہ، منطق، جغرافیہ، طب، ہیئت، نجوم، ہندسہ، زراعت، فلاحت، تعمیر اور دوسرے سینکڑوں فنون میں مسلمانوں نے جان ڈالی، انھیں اپنایا، ان میں اضافے کیے جنھیں یورپ پہلے بھی مانتا تھا، آج بھی مانتا ہے اور ہمیشہ مانتا رہے گا!

ضمیمہ

اندلس پر مسلمانوں کا آٹھ سو سالہ دورِ حکومت

بعض اہم سبق آموز اور ناقابلِ فراموش واقعات

عہدِ ماضی کی طرف اندلس پر مسلمانوں کے عہدِ فرماں روائی کی تاریخ اجمالاً گزشتہ صفحات میں دی جا چکی ہے۔ چونکہ اختصار مدّ نظر تھا اس لیے ربط و تسلسل قائم رکھتے ہوئے بے حد اہم اور مخصوص بیانِ واقعات پر اکتفا کیا گیا۔ لیکن یہ تاریخ جو آٹھ سو سال کی طویل مدت کی حامل ہے اپنے دامن میں بہت سے اہم سبق آموز اور ناقابلِ فراموش واقعات کا ذخیرہ رکھتی ہے۔ ان میں سے چند ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔

(۱)

بڑے باپ کا بڑا بیٹا

عبدالعزیز فاتح اندلس موسیٰ ابن نصیر کا بیٹا تھا اور جس کا حصّہ فتح اندلس میں ہرگز کسی سے کم نہ تھا۔

موسیٰ ابن نصیر جب دمشق طلب کیا گیا تو اپنے اس شجاع، دلیر، مردِ میداں اور صالح بیٹے کو اپنا جانشین بنا گیا۔ اس نے اندلس کی مسندِ امارت پر بیٹھتے ہی:

اعلان کیا کہ جو غلام اسلام قبول کرے گا وہ مسلمان ہوتے ہی اپنے غیر مسلم آقا کی غلامی وقید سے آزاد سمجھا جائے گا۔ عیسائیوں کے پاس غلاموں کی بڑی تعداد تھی۔ اور وہ ان غلاموں سے اس طرح خدمات لیتے تھے جیسے چوپایوں سے خدمات لی جاتی ہیں۔ امیر عبدالعزیز کے اس اعلان کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہزارہا غلاموں نے آزادی حاصل کرنی شروع کر دی۔ اور انسانی حریت سے بہرہ اندوز ہونے لگے۔

امیر عبدالعزیز نے شاہ لرزیق کی بیوہ ایجیلونا سے خود شادی کی اور اس کو اپنے عیسائی مذہب پر قائم رہنے دیا۔ امیر کی تقلید میں دوسرے مسلمانوں نے بھی عیسائی عورتوں سے شادیاں کرنی شروع کر دیں۔ شہروں کے اُن مکانات میں جو لڑائیوں میں عیسائیوں کے مفرور مقتول ہونے سے خالی اور ویران ہو گئے تھے مسلمانوں نے اقامت اختیار کی۔ اور عیسائیوں کے ساتھ مل کر شہروں اور قصبوں میں رہنے لگے۔

انداز جہانگیری حاکم اندلس عتبہ[1] بہت ہوشیار اور منصف مزاج شخص تھا۔ عتبہ کے عظیم الشان کارناموں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے اندلس میں امن وامان قائم رکھنے کی غرض سے بڑے بڑے معقول انتظامات کیے۔ پولیس کا ایک خاص اور الگ محکمہ راستوں کی حفاظت اور امن وامان کے لیے قائم کیا اس محکمے میں سوار بھرتی کیے گئے تھے۔ جو گشت و گرداوری کر کے راستوں کی حفاظت کرتے تھے۔ یہی گویا جندرمہ پولیس کی ایجاد تھی۔ عتبہ نے ہر ایک گاؤں اور ہر ایک بستی میں ایک ایک عدالت قائم کر دی تاکہ مرکزی عدالتوں میں کام کی کثرت نہ ہو اور لوگوں کو انفصال خصومات میں سہولت رہے۔ عتبہ نے یہ بھی انتظام کیا کہ ہر ایک گاؤں اور ہر ایک بستی میں کم از کم ایک ایک مدرسہ قائم ہو گیا۔ ان مدارس کے مصارف کو پورا کرنے کے لیے ملک کے خراج کا ایک حصہ مخصوص کر دیا۔ جہاں جہاں مساجد کی ضرورت تھی وہاں مسجدیں تعمیر کرائیں اور ہر مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ بھی لازمی طور پر قائم کیا۔

۱: ۱۱۷ھ

(۲)

فرانس پر مسلمانوں کا حملہ

امیر سمح بن مالک خولانی ایک فوجی آدمی اور طارق بن زیاد کے ہمراہیوں میں تھا اسے حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اندلس کی حکومت پر مامور فرمایا۔

ملک اندلس کے اندرونی انتظام و استحکام سے فارغ ہو کر خلیفہ کی اجازت کے مطابق امیر سمح نے فوج لے کر جبل البرتات کی طرف توجہ کی۔ اس پہاڑ کی گھاٹیوں کو طے کر کے وہ اس ملک میں داخل ہوا جو آج کل جنوبی فرانس کہلاتا ہے۔ فرانس کے اس جنوبی حصے میں دو زبردست حکومتیں قائم تھیں۔ ایک حکومت وہ تھی جو اندلس کے گاتھ لوگوں نے فرار ہو کر اور یہاں آ کر قائم کر لی تھی۔ اس ریاست کا دارالحکومت شہر ناربون تھا اور چونکہ تمام ملک اندلس کے خزائن گاتھ لوگ جس قدر گاتھ لا سکتے تھے یہیں لے آئے تھے اور وہ تمام لوگ بھی یہیں آ کر جمع ہو گئے تھے جو مسلمانوں کے دشمن تھے۔ لہٰذا یہ حکومت خوب طاقتور اور اپنے محل وقوع کے اعتبار سے ناقابلِ تسخیر سمجھی جاتی تھی دوسری زبردست سلطنت قوم گال کی تھی جس کا دارالسلطنت طولوز تھا۔ امیر سمح نے جبل البرتات سے گزر کر ناربون پر حملہ کر کے اس شہر کو فتح کر لیا اور تمام ریاست مسلمانوں کے قبضے میں آ گئی ــــ اسلامی لشکر کو یہاں سے بہت کچھ مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔ ناربون سے آگے بڑھ کر طولوز پر حملہ کیا گیا۔ بڑی خوں ریز جنگ ہوئی۔ آخر مسلمانوں نے اس شہر کا محاصرہ کر لیا۔ مسلمانوں کی فوج بہت تھوڑی تھی اور عیسائیوں کا لشکر آئندہ ہر ایک لڑائی میں زیادہ ہی زیادہ برسرِ مقابلہ آتا تھا۔ شہر طولوز فتح ہی ہونے والا تھا کہ ایک فرمانروا ڈیوک آف ایکیوٹین ایک عظیم الشان فوج لے کر پہنچ گیا تو امیر سمح نے بجائے اس کے کہ وہ حواس باختہ ہو جاتے اپنی صفوں کو درست کر کے ایک ہمت بڑھانے والی اور جوش دلانے والی تقریر کی۔

عین اس وقت جب کہ مسلمان عیسائیوں کو پیچھے دھکیل کر آگے بڑھ رہے تھے۔ ایک تیر امیر سمح کے گلے میں آ کر ترازو ہو گیا۔ اپنے امیر کو اس طرح جام شہادت نوش (۱۰۲ھ) کرتے

ہوئے دیکھ کر مسلمانوں کے حوصلے پست ہو گئے اور جوش شمشیر زنی سرد پڑ گیا۔ مگر پھر بھی وہ حواس باختہ نہیں ہوئے۔ فوراً امیر سمح کی جگہ عبدالرحمٰن غافقی کو اپنا سپہ سالار اور امیر منتخب کر لیا۔ عبدالرحمٰن غافقی نہایت ہوشیاری اور استقلال کے ساتھ پیچھے ہٹ گئے۔ عیسائیوں کو تعاقب کی ہمت نہ ہوئی۔

اندلس میں عیسائی حکومت کا قیام امیر عنبسہ[۱] نے پلیو نامی ایک عیسائی لٹیرے کو جبل البرتات کے دروں میں ناقابلِ التفات سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ پلیو نامی غارت گر نے جب جبل البرتات میں اپنی قیام گاہ قائم کر لی تو وہ عیسائی جو مسلمانوں کے خوف سے آوارہ پھر رہے تھے اور وہ پادری جو اپنے ساتھ اندلس کے گرجاؤں سے تبرکات لے کر بھاگ گئے تھے پلیو کے پاس آ آ کر جمع ہونے لگے۔ اس طرح پلیو کی جمعیت نے ترقی کی۔ اور وہ پہاڑوں کے درمیان ایک نہایت سخت دشوار گزار مقام میں مضبوط ہو کر بیٹھ گیا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ جس پہاڑ کے چند میل مربع رقبے میں پلیو مقیم تھا اس کے چاروں طرف اسلامی حکومت تھی۔ شمال کی جانب فرانس کا علاقہ مسلمانوں کے قبضے میں تھا جنوب و مشرق کی جانب بھی اسلامی حکومت قائم تھی مغرب کی جانب بھی اسلامی علاقہ تھا پہاڑ کے اس جزیرے میں ان عیسائی متمردین کا استیصال کر دینا کوئی بھی بڑی بات اور دشوار کام نہ تھا مگر مسلمانوں کے ہر ایک سردار اور ہر ایک سپہ سالار نے اس ہوش کو ہی پر حملہ آور ہونا اور فوج لے جانا اپنی بے عزتی سمجھی اور اس کو اس کے حال پر یہ سمجھ کر رہنے دیا کہ اس سے کسی مسلمان کو کوئی نقصان کبھی نہیں پہنچ سکتا۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ پلیو کو پہاڑ سے نیچے اترنے اور میدانی علاقے میں نکلنے کی کبھی جرأت بھی نہیں ہوئی۔ اور نہ ایسی جرأت عیسائیوں کے مقابلے میں ہو سکتی تھی۔ مگر ان پادریوں نے جو اپنے مذہبی تبرکات لے کر پلیو کے پاس پہنچ گئے تھے پلیو کو ایک مذہبی سردار اور عیسوی تبرکات کا محافظ قرار دیا۔ بارہ تیرہ سال تک وہ اسی چھوٹے سے پہاڑی علاقے میں رہا اور اطراف و جوانب کے عیسائیوں

۱: یہ امیر سمح کی شہادت کے کچھ عرصے بعد حاکم اندلس مقرر ہوئے تھے، یعنی ۱۰۳ھ میں۔

سے اس کو سامانِ رسد کی امداد پہنچتی رہی۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا عیسائیوں میں پلیو کی عزت و محبت اور شہرت ترقی کرتی گئی اور بہت سے عیسائی تکالیف برداشت کر کے بھی پلیو کے پاس پہنچے اور تبرکات کی زیارت کرنے کو ضروری سمجھتے رہے مسلمان ہمیشہ یہ سمجھتے رہے کہ چند عیسائی وحشی پہاڑ کی کھوہ میں ہمارے خوف سے اپنی جان بچا کر چھپ گئے ہیں۔ ہماری صورت دیکھ کر فرار ہوتے اور خوف کے مارے ہمارے سایہ سے بھاگتے ہیں ان کو پڑا رہنے دو۔ اس بے پروائی اور کم التفاتی نے ان عیسائیوں میں بتدریج جرأت پیدا کر دی اور وہ اپنی چھوٹی سی جائے پناہ کو ایک سلطنت سمجھنے لگے۔ پلیو کو اپنا بادشاہ اور محافظ دینِ عیسوی قرار دیا۔

پلیو کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے کو اپنا بادشاہ بنایا اور دو تین سال کے بعد وہ بھی فوت ہو گیا تو پلیو کے داماد الفانسو نامی کو عیسائیوں نے اپنا افسر اور بادشاہ قرار دیا ادھر مسلمانوں کی خانہ جنگی اور آپس کے کشت و خون نے مسلمانوں کو شمالی صوبوں اور جبل البرتات کے متصلہ علاقوں کی طرف مطلق توجہ نہ کرنے دی۔ اس فرصت میں الفانسو نے جلیقیہ، اراگون اربونیہ کے علاقوں سے عیسائیوں کو اس پہاڑی علاقے میں آنے اور آباد ہونے کی دعوت دی، جب عیسائیوں نے اپنے سرسبز کھیتوں اور میدانی علاقوں کو چھوڑنا اور زاہدانہ زندگی بسر کرنا پسند نہ کیا تو الفانسو نے اردگرد کے علاقوں پر چھاپے مارنے شروع کیے ان ڈاکہ زنیوں میں وہ صرف لوٹ مار پر ہی اکتفا نہ کرتا تھا بلکہ عیسائی آبادیوں پر چھاپہ مار کر عیسائیوں کو پکڑ پکڑ کر لے جاتا۔ اور اپنے پہاڑی علاقے میں سکونت پذیر کرتا تھا۔ ان عیسائیوں کی نظر بندوں کی طرح نگرانی بھی ہوتی تھی۔ اور وہ کسی طرح اس پہاڑ سے نکل کر بھاگ نہیں سکتے تھے۔

اس طرح جبریہ طور پر ایک آبادی پہاڑ کے اندر قائم کی گئی، ایسٹریاس کے نام سے موسوم ہوئی اور یہی الفانسو کا دارالحکومت بنا۔ یہاں پادریوں کے رات دن کے وعظ و تقریر نے ان گرفتار شدہ عیسائیوں کو بتدریج اس پہاڑی زندگی پر رضامند کر لیا اور رفتہ رفتہ اس قدر آدمی جمع ہو گئے کہ وہ تنگ مامن ان کے لیے کافی نہ رہا۔ اب الفانسو نے جبل البرتات

کے شمالی دامن کی طرف مسلمانوں کے علاقے میں لوٹ مار مچائی وہ کھل کر مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا تاہم اس نے بتدریج جبل البرتات کے جنوبی دامن سے شمالی دامن تک کا پہاڑی علاقہ سب اپنے قبضے میں کرلیا اور ایک چھوٹی سی ریاست قائم کرکے عیسائیوں کی امیدگاہ بن گیا۔

مُسلمان یہ بھی کرتے ہیں!

خلیفہ مہدی عباسی بڑا نیک اور باخدا خلیفہ تھا مگر یہ انسانی فطرت کا تقاضا تھا کہ اس کو بنو امیہ سے نفرت اور عبدالرحمٰن کے اندلس میں برسرِ اقتدار ہونے سے ملال تھا۔ خلیفہ کے ایک مصاحب نے فرانس کے بادشاہ شارلمین سے خط و کتابت کرکے اس کو ملک اندلس پر حملہ کرنے کی ترغیب دی اور یہ بھی بتایا کہ خلیفۃ المسلمین مہدی عباسی جو تمام عالمِ اسلام کے دینی و دُنیوی پیشوا ہیں ان کا بھی یہی منشا ہے کہ عبدالرحمٰن اور اس کی حکومت کو مٹا دیا جائے۔ لہٰذا ہم اور اکثر مسلمانانِ اندلس آپ کے شریکِ حال اور ہر طرح معاون و مددگار ہوں گے۔ شارلمین کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی زریں موقع اندلس کی فتح کا نہ ہوسکتا تھا۔ اور اندلس کی فتح سے بڑھ کر کوئی دوسرا کارنامہ اس کی شہرت و عظمت کے لیے ممکن نہ تھا مگر وہ صوبہ اربونیہ اور شہر تاربون کے مٹھی بھر بے یار و مددگار مسلمانوں کی ہمت و استقلال اور شجاعت و بہادری سے خوب واقف تھا۔ اس لیے اس نے اندلس پر حملہ کرنے میں عجلت سے کام نہیں لیا۔ بلکہ اچھی طرح فوجی تیاریاں کیں اور ساتھ ہی مسلمان باغیوں اور غداروں سے خط و کتابت جاری رکھی اور ہر قسم کی واقفیت بہم پہنچائی۔ غرض فرانس کا بادشاہ شارلمین لاکھوں کی تعداد میں فوج فراہم کرکے کیل کانٹے سے لیس ہوگیا۔

امیر عبدالرحمٰن کے لیے یہ سب سے زیادہ نازک اور خطرناک موقع تھا کہ اس کی بربادی کے لیے دربارِ بغداد کا اخلاقی اثر مسلمانانِ اندلس کے باغیانِ سرقسطہ کی عظیم ترین سازش و بغاوت اور عیسائیوں کی عظیم الشان فوجی تیاریاں سب متحد و متفق تھیں۔ اور عبدالرحمٰن اس خطرہ کی پوری پوری کیفیت سے ناواقف و بے خبر تھا۔ امیر عبدالرحمٰن نے اپنے ایک سپہ سالار ثعلبہ بن عبید کو سرقسطہ کے باغیوں کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ متعدد لڑائیاں ہونے کے بعد ثعلبہ کو سلیمان بن یقظان نے گرفتار کرلیا اور اس بات کے ثبوت میں کہ ہم کس قدر طاقت ور

---

(۱) عبدالرحمٰن الداخل۔ یہ واقعہ ۱۶۲ھ کا ہے۔

آپ کے ہواخواہ ہیں ثعلبہ کو شارلمین کے پاس بھجوا دیا۔ ثعلبہ کی گرفتاری کے بعد اس کی بقیۃ السیف فوج بھاگ کر قرطبہ میں عبدالرحمٰن کے پاس پہنچی اور باغیوں کی قوت وطاقت سے اس کو مطلع کیا۔

ثعلبہ کی گرفتاری کے بعد ہی شاہِ فرانس جو اپنی لاتعداد فوج لیے ہوئے جبل البرتات کے اس طرف جنوبی فرانس میں پڑا ہوا تھا روانہ ہوا۔ فوج اس قدر زیادہ تھی کہ جبل البرتات کے ایک درہ میں ہو کر نہیں گزر سکتی تھی۔ لہٰذا اس کے دو حصے کیے گئے اور پہاڑ کے دو مختلف راستوں سے عبور کر کے شہر سرقسطہ کی فصیل کے نیچے دونوں طرف آکر جمع ہو گئی۔ اس عیسائی لشکر کی کثرت اور اندلس سے اسلامی اثر کے محو کر دینے کے ارادے کی شہرت جب سرقسطہ کے مسلمانوں نے سنی تو دروازے بند کر لیے۔ شارلیمین کو جب یہ محسوس ہوا کہ مسلمانانِ شہر میری امداد و اعانت میں پہلو تہی کریں گے اور امیر عبدالرحمٰن کے آنے پر ممکن ہے کہ اس کے ساتھ شامل ہو جائیں تو سرقسطہ سے وہ بے نیل و مرام فرانس کی جانب واپس ہو گیا۔

شارلیمین کے آنے کے وقت اسٹریاس کی عیسائی ریاست بھی اس کی حامی ومعاون بن گئی تھی۔ اور ان پہاڑی عیسائیوں نے شارلیمین کو عیسائیوں کا نجات دہندہ سمجھ کر اس کی فوج کے گزارنے میں مدد کی تھی۔ لیکن جب وہ خوف زدہ ہو کر فرانس کی طرف واپس جانے لگا تو ان پہاڑی عیسائیوں نے اس کی فوج کے پچھلے حصے پر چھاپے مارنے شروع کیے۔ اور شمالی میدان میں پہنچنے تک اس کے کئی مشہور ومعروف سپہ سالاروں اور فوج کے ایک بڑے حصے کو قتل کر دیا۔

چھری کانٹے کی ایجاد ۲۰۶ھ میں ابراہیم موصلی کا شاگرد علی بن نافع معروف بہ زریاب واردِ اندلس ہوا۔ علی بن نافع موسیقی میں استادِ کامل تھا۔ نیز علوم مروجہ اور بعض دوسرے علومِ غریبہ میں ماہر یکتا تھا۔ سلطان حکم نے یہ سن کر کہ ملکِ عراق و شام میں اس کے مرتبہ کے مطابق اس کی قدردانی نہیں ہوئی اس کو اندلس میں اپنے پاس طلب کیا تھا۔ مگر اس کے پہنچنے سے پہلے ہی سلطان حکم فوت ہو چکا تھا۔ جب سلطان عبدالرحمٰن ثانی (۲۰۶ھ) کو اس حکیم وفلسفی کے واردِ اندلس ہونے کا حال معلوم ہوا تو اس نے

شہروں کے عاملوں کے نام احکام جاری کر دیے کہ قرطبہ تک پہنچنے میں علی بن نافع کو جس جس شہر میں ہو کر گزرنا پڑے اس شہر کا حاکم اس کا شاہانہ استقبال کرے۔ اور متعدد غلام، گھوڑے اور ہدیے پیش کرے۔ غرض بڑی عزت و احترام سے یہ شخص قرطبہ تک پہنچا اور بادشاہ کا مقرب خاص اور ندیم با اختصاص بن گیا۔

اس نے اندلس میں بڑی بڑی اہم معاشرتی اصلاحیں کیں۔ اور تکلفات و زینت کے عجیب عجیب طریقے ایجاد کیے جو بہت مقبول عوام ہوئے۔ اس کی کوششوں سے قرطبہ کے اندر آب رسانی کے نل لگائے گئے اور پھر بہت جلد اندلس کے دوسرے شہروں میں بھی نلوں کا سلسلہ جاری ہوا۔ نئے نئے پُر تکلف اور لذیذ و مقوی کھانے اور خوبصورت لباس اسی کی ایجاد ہیں۔ غرض اس ایک شخص کی کوششوں اور ایجادوں نے نہ صرف تمام ملکِ اندلس بلکہ تمام یورپ پر اپنا اثر ڈالا۔ چھری کانٹے کے ساتھ کھانا بھی اسی کی ایجاد ہے۔ اور یورپ والوں نے اندلس کے مسلمانوں ہی سے چھری کانٹے کے استعمال کو سیکھا تھا۔ علی بن نافع کو سلطان عبدالرحمٰن ثانی کے مزاج میں بڑا رسوخ حاصل تھا۔ اور سلطان اس کی بڑی عزت کرتا تھا مگر اس نے کبھی کسی سیاسی معاملے میں دخل نہیں دیا بلکہ اپنی تمامتر توجہ کو اصلاح معاشرت ہی کی جانب مبذول رکھا۔ اسی لیے وہ تمام ملک میں ہر دلعزیز و محبوب تھا کوئی اس کا دشمن و مخالف کبھی پیدا نہیں ہوا۔ اندلس والوں نے جہاں اس شخص کی وجہ سے لباس و غذا اور مکان کے تکلفات سیکھے۔ وہاں انھوں نے موسیقی کا شوق بھی اس سے حاصل کیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ علی بن نافع نے اندلس پہنچ کر وہاں کے سپاہی پیشہ مسلمانوں کو عیش پسند اور نازک مزاج بنانے کی مؤثر کوشش کی۔

عیسائیوں سے رواداری

اندلس میں مسلمانوں کی طرف سے عیسائیوں کو ہر قسم کی مذہبی آزادی حاصل تھی۔ وہ اپنے گرجوں میں گھنٹے بجاتے اور اطمینان سے ارکانِ عبادت بجالاتے تھے۔ مذہبی معاملات اور مقدمات کو عام طور پر عیسائی جج فیصلہ کرتے اور گرجوں کے مصارف شاہی خزانے سے عطا ہوتے تھے مسلمان عیسائیوں کے تہواروں میں اور عیسائی مسلمانوں کے تہواروں میں شریک ہوتے اور تجارت و زراعت

وغیرہ میں دونوں قومیں بلا امتیاز یکساں حقوق رکھتی تھیں۔

عبدالرحمٰن ثانی کے عہدِ حکومت میں عیسائیوں کو سلطنت کے بڑے بڑے ذمہ دار عہدے دیے جاتے تھے۔ اور عیسائی جو عام طور پر عربی زبان بولتے اور لکھتے تھے دفتروں پر قابض و متصرف ہو گئے تھے۔ مسلمانوں کی توجہ زیادہ تر فوجی خدمات کی طرف تھی۔ دفتری اہل کاریوں کو انھوں نے عیسائیوں کے لیے چھوڑ دیا تھا۔

فرڈی نینڈ کی حکومت مسلمانوں کا عطیہ تھی

۳۴۴ھ میں ردمیر بادشاہ جلیقیہ کے فوت ہونے پر اس کا بیٹا اردونی چہارم تخت نشین ہوا اور عبدالرحمٰن ناصر کی خدمت میں سفیر بھیج کر اپنی حکومت اور باپ کی جانشینی کی اجازت چاہی۔ خلیفہ نے اس کی تخت نشینی کو منظور کر کے اجازت نامہ بھیج دیا۔ ۳۴۵ھ میں فرڈی نینڈ سردار قسطلہ نے اردونی چہارم کو اپنا سفارشی بنا کر خلیفہ کی خدمت میں اپنی مستقل ریاست و حکومت کے تسلیم کیے جانے کی درخواست بھیجی۔ خلیفہ نے فرڈی نینڈ کی اس درخواست کو منظور کر لیا۔ اور اس کو ریاست قسطلہ کا مستقل حاکم و فرمانروا بنا دیا۔ فرڈی نند اب تک ریاست جلیقیہ یعنی ردمیر کا ماتحت سمجھا جاتا تھا لیکن چونکہ اردونی چہارم کو تخت نشین کرانے میں فرڈینینڈ نے خاص طور پر خدمات انجام دی تھیں۔ اس لیے اردونی چہارم نے سفارش کر کے اس کو بھی مستقل فرماں روا اور خود مختار رئیس بنوا دیا۔

مسجدِ قرطبہ اور قصرِ زہرا

خلیفہ عبدالرحمٰن کو سلاطینِ اندلس میں وہی مرتبہ حاصل تھا جو ہندوستان کے شاہانِ مغلیہ میں شاہجہاں کو۔ مسجدِ قرطبہ کی تعمیر کا کام عبدالرحمٰن اوّل کے زمانے میں شروع ہو کر اس کے بیٹے ہشام کے زمانے میں ختم ہوا۔ مگر اس کے بعد بھی ہر ایک فرمانروائے اندلس نے اس مسجد کی شان و شوکت اور زیب و زینت کے بڑھانے میں ہمیشہ خزانوں کا منہ کھلا رکھا۔ عبدالرحمٰن ثالث نے بھی اس مسجد کی تعمیر و تکمیل میں چالیس اور پچاس لاکھ کے درمیان روپیہ خرچ کیا۔ اس مسجد کا طول شرق سے غرب تک پانچ سو فٹ تھا۔ اس کی خوبصورت محرابیں ایک ہزار چار سو سترہ سنگِ مرمر کے ستونوں پر قائم تھیں۔ محراب کے قریب ایک بلند منبر خالص ہاتھی دانت اور

چھتیس ہزار مختلف رنگ اور وضع کی لکڑی کے ٹکڑوں سے بنا اور ہر قسم کے جواہرات سے جڑا ہوا رکھا تھا۔ یہ منبر سات برس کے عرصے میں تیار ہوا تھا۔ خلیفہ عبدالرحمٰن نے اس مسجد کے قدیم میناروں کو گرا کر ایک نیا مینار ایک سو آٹھ فٹ بلند تعمیر کرایا تھا۔ جس میں چڑھنے اور اترنے کے دو زینوں میں ایک سو سات سیڑھیاں تھیں۔ اس مسجد میں چھوٹے بڑے دس ہزار جھاڑ روشنی کے جلا کرتے تھے۔ جن میں سے تین سب سے بڑے جھاڑ خالص چاندی کے اور باقی پیتل کے تھے۔ بڑے بڑے جھاڑوں میں ایک ہزار چار سو اسی پیالے روشن ہوتے تھے۔ اور ان تین چاندی کے جھاڑوں میں ۳۶ سیر تیل جلا کرتا تھا۔ تین سو ملازم اور خدام اس مسجد کے لیے متعین تھے۔

خلیفہ عبدالرحمٰن نے اپنی بیوی زہرہ کے لیے قرطبہ سے چار میل کے فاصلے پر جبل العروس کے پُر فضا دامن میں ایک رفیع الشان قصر تیار کیا۔ یہ اس قدر وسیع عمارت تھی کہ اس کو بجائے قصر الزہرا کے مدینۃ الزہرا کہتے تھے۔ اس قصر کی وسعت کا اس طرح اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کے احاطے کی دیواروں میں پندرہ ہزار بلند اور شاندار دروازے تھے۔ یہ قصر ہمارے زمانے کے موجودہ رائج الوقت سکے کے اعتبار سے بتیس کروڑ پچاس لاکھ روپے کی لاگت میں بن کر تیار ہوا تھا۔ لیکن اگر اس زمانے میں روپے کی ارزانی اور ضروریات زندگی کی گرانی کا لحاظ کیا جائے تو قصر الزہرا کی لاگت ہم کو ایک ارب روپیہ لگانی چاہیے۔ اس قصر کا طول چار میل اور عرض قریباً تین میل تھا۔ ۳۲۵ھ سے اس قصر کی تعمیر شروع ہو کر ۳۵۰ھ میں پچیس سال کے اندر ختم ہوئی۔ دس ہزار معمار، چار ہزار اونٹ اور خچروں سے روزانہ اس کے بنانے میں کام لیا جاتا تھا۔ یہ قصر چار ہزار تین سو سولہ برجوں اور ستونوں پر جو سنگ مرمر وغیرہ قیمتی پتھروں کے بنے ہوئے تھے قائم تھا۔ ان ستونوں میں سے بعض ستون فرانس و قسطنطنیہ وغیرہ کے بادشاہوں نے ہدیۃً عبدالرحمٰن ناصر کی خدمت میں بھیجے تھے۔ عبداللہ حسن بن محمد، علی بن جعفر وغیرہ انجنیروں کو بھیج کر سنگ مرمر کی ایک مقدار افریقہ سے منگوائی گئی تھی۔ ایک سب سے بڑا فوارہ جو سونے کا معلوم ہوتا تھا اور اس پر نہایت خوش نما نقش و نگار تھے جو احمد یونانی اور ربیع پادری قسطنطنیہ سے لائے تھے۔ ایک فوارہ سنگِ سبز کا ملکِ شام سے منگوایا گیا تھا، بارہ

پرند اور چرند جانوروں کی صورتیں مختلف جواہرات اور سونے کی بنی ہوئی اس میں لگائی گئی تھیں۔ ہر جانور کے مُنہ اور چونچ میں سے پانی کا فوارہ بلند ہو رہا تھا۔ اس فوارے میں کاریگروں نے وہ دست کاری ظاہر کی تھی کہ یورپ کے جن سیاحوں نے ان کو دیکھا ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ دیکھنا اور سُننا تو بڑی بات ہے خواب اور خیال کو بھی یہاں مجالِ دخل نہ تھی۔

اس قصر کا ایک حصّہ قصر الخلفا بھی قابلِ دید تھا۔ اس کی چھت خالص سونے اور ایسے شفاف سنگِ مرمر سے بنی ہوئی تھی کہ دوسری طرف کی چیز مثل آئینے کے نظر آتی تھی۔ یہ چھت باہر کی جانب سونے چاندی کے سفالوں سے سجی ہوئی تھی۔ اس کے وسط میں ایک خوبصورت مرصّع فوارہ نصب تھا جس کے سر پر وہ مشہور موتی جڑا ہوا تھا جس کو شہنشاہِ یونان نے بطور تحفہ عبدالرحمٰن ثالث کی خدمت میں بھیجا تھا۔ اس فوارہ کے علاوہ قصر کے بیچ میں ایک فوارہ سنا طشت پارہ سے لبریز رکھا تھا۔ اس قصر کے گرد نہایت خوش نما آئینے ہاتھی دانت کے چوکھٹوں میں جڑے ہوئے تھے۔ مختلف اقسام کی لکڑیوں کے مرصّع دروازے سنگِ مرمر اور بلوری چوکٹوں پر نصب تھے۔ جس وقت یہ دروازے کھول دیے جاتے اور آفتاب کی شعاع سے مکان روشن و منوّر ہوتا تو کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ اس کی چھت اور دیواروں کی طرف نظر بھر کے دیکھ سکے۔ اس حالت میں اگر پارہ ہلا دیا جاتا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ مکان جنبش میں ہے۔ جو لوگ اس راز سے واقف نہ تھے وہ مکان کو فی الحقیقت جنبش میں سمجھ کر بے حد خائف ہوتے۔

اس قصر کے انتظام اور نگرانی کے لیے تیرہ ہزار سات سو پچاس ملازم اور تیرہ ہزار تین سو بیاسی غلام جو نصاری اقوام کے تھے متعین تھے۔ حرم سرا کے اندر چھ ہزار عورتیں خدمت گزاری کے لیے حاضر رہا کرتی تھیں۔ حوضوں میں روزانہ بارہ ہزار روٹیاں علاوہ اور چیزوں کے مچھلیوں کی خورش کے لیے ڈالی جاتی تھیں۔ مدینۃ الزہرا وہ نادر الوجود قصر تھا جس کی وسیع سنگِ مرمر کی عمارات، دربارِ خاص و عام کی شان و شوکت، اس کے باغات کا پُرفضا سماں جہاں ہزارہا فوارے اچھلتے، نہریں اور حوض پانی سے چھلکتے تھے، دیکھنے کے

لیے دور دور سے سیاح آتے تھے۔ عربوں نے اس قصر کو اپنی صنعت وحرفت اور دست کاری کی نمائش گاہ بنا دیا تھا۔ افسوس کہ عیسائی وحشیوں نے آئندہ زمانے میں جب قرطبہ پر قبضہ کیا تو قصر الزہرا کا نام ونشان تک مٹا دیا۔ مسجدوں کو ڈھایا، مقبروں کو مسمار کر کے قبروں تک کو ادھیڑ ڈالا۔

خلیفہ اور قاضی کی ٹکّر عبدالرحمٰن ناصر نے قرطبہ میں ایک مکان کو اپنی کسی ضرورت کی وجہ سے خریدنا چاہا۔ وہ مکان یتیم بچوں کی ملکیت تھا اور وہ یتیم بچے قاضی منذر کی نگرانی میں تھے۔ جب قاضی کے پاس اس مکان کی خریداری کا پیغام پہنچا تو قاضی صاحب نے فروخت کرنے سے انکار کر دیا اور خلیفہ کی خدمت میں کہلا بھیجا کہ یتیموں کی جائداد اس وقت منتقل ہو سکتی ہے جب کہ ان تین شرطوں میں سے کوئی ایک شرط پوری ہو۔

۱: کوئی سخت ضرورت لاحق ہو۔

۲: جائداد کے تلف ہو جانے کا اندیشہ ہو۔

۳: ایسی قیمت ملتی ہو جس کے لینے میں یتیموں کا آئندہ فائدہ متصور ہو۔

فی الحال ان تینوں شرطوں میں سے کوئی شرط موجود نہیں۔ اور ملازمین سرکار نے جو قیمت اس مکان کی تجویز کی ہے وہ بہت کم ہے خلیفہ یہ پیغام سن کر خاموش ہو گیا۔ اور اس نے سمجھا کہ قاضی بغیر قیمت بڑھائے نہ مانے گا۔ ادھر قاضی منذر کو اندیشہ ہوا کہ کہیں خلیفہ اس مکان کو زبردستی چھین نہ لے، چنانچہ قاضی نے فوراً مکان کو منہدم کر دیا۔ اس کے بعد ملازمین شاہی نے دگنی قیمت ادا کر کے اُس زمین کو خریدا۔ خلیفہ کو جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو اس نے قاضی کو بلا کر مکان کے منہدم کرانے کا سبب دریافت کیا قاضی منذر نے کہا جس وقت میں نے مکان کے منہدم کرنے کا حکم دیا ہے، اس وقت میرے زیرِ نظر قرآن کی یہ آیت تھی: فانطلقا حتیٰ اذا رکبا فی السفینۃ خرقہا قال اخرقتہا لتغرق اہلہا لقد جئت شیئاً امراً۔ خلیفہ یہ سن کر خاموش ہو گیا اور اس روز سے قاضی منذر کی اور زیادہ عزت کرنے لگا۔ اس واقعے سے قاضی اور خلیفہ دونوں کی پاک باطنی کا

ثبوت ملتا ہے۔ قاضی منذر ۳۵۵ھ میں خلیفہ ناصر سے پانچ سال بعد فوت ہوئے تھے۔ امیر المومنین خلیفہ عبدالرحمن ثالث ناصر الدین اللہ نے ۲۔ رمضان المبارک سنہ ۳۵۰ھ کو ۷۲ سال چند ماہ کی عمر میں بمقام قصر الزہرا وفات پائی۔

خلیفہ حکم ثانی کا ذوقِ علمی

خلیفہ حکم ثانی[1] کو تمام علوم مروجہ میں دست گاہ کامل حاصل تھی۔ کتابوں سے اس کو عشق تھا۔ دمشق، بغداد، قسطنطنیہ، قاہرہ، قیروان، مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ وغیرہ تمام ان مقامات میں جہاں کہیں علم کا چرچا تھا خلیفہ الحکم کے گماشتے موجود رہتے تھے۔ ان کا کام یہ تھا کہ جو اچھی یا نایاب کتاب پائیں اس کو خریدیں اور خلیفہ حکم کے پاس بھیج دیں مصنفین کو ترغیب دیں کہ وہ اپنی تصنیف کی پہلی کتاب خلیفہ کے پاس بھیجیں، علماء کو قرطبہ جانے کی ترغیب دیں جہاں نہایت فراخدلی کے ساتھ ان کی قدر و منزلت بڑھائی جاتی تھی۔ اور وہ مال و دولت سے بے نیاز کر دیے جاتے تھے۔ کسی کتاب کے حاصل کرنے میں چاہے کتنی ہی مصیبت برداشت کرنی پڑے اور اشرفیوں کی چاہے کتنی ہی تھیلیاں خالی کرنی پڑیں حکم کے کتب خانے کے لیے وہ کتاب ضرور ہی خریدی جاتی تھی۔ ہر ایک شہر میں خلیفہ حکم کی طرف سے بہت سے لوگ صرف اسی کام پر متعین تھے کہ وہ کتابوں کی نقلیں کر کے قرطبہ بھیج دیں۔ دنیا کے تمام بادشاہوں سے خلیفہ حکم کے مراسم تھے۔ اور ان سب کے شاہی کتب خانوں میں نقل کرنے والے لوگ خلیفہ حکم کی طرف سے موجود رہتے تھے کہ تمام نایاب کتابوں کی نقلیں حاصل کریں۔

روئے زمین کے ہر ملک اور ہر شہر میں اس بات کی شہرت ہو گئی تھی کہ قرطبہ کا خلیفہ سب سے زیادہ مصنفین کا قدردان ہے۔ اس لیے بہت سے ایسے مصنفین تھے جو بغداد یا بصرہ وغیرہ میں رہتے تھے مگر اپنی کتابیں خلیفہ حکم کے نام سے معنون کر کے دربارِ قرطبہ میں بھیجتے تھے یونانی اور عبرانی زبانوں کی کتابوں کے ترجمے کرانے کے لیے سینکڑوں ہزاروں علماء کا ایک زبردست

۱: ۳۵۰ھ سال جلوس

محکمہ بنا دیا تھا۔ اندلس بالخصوص قرطبہ کے ہر ایک شریف آدمی کو کتاب کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ اور ہر گھر میں ایک کتب خانہ موجود ملتا تھا۔ صرف قرطبہ ہی میں نہیں بلکہ اندلس کے ہر بڑے شہر میں ایک بڑا کتب خانہ سرکاری اہتمام سے موجود و مہیا تھا۔ ہر ایک شخص جو امیر المومنین کی خدمت میں عزت و رسوخ حاصل کرنا چاہتا تھا وہ کوئی نایاب اور مفید کتاب بطور ہدیہ لے کر حاضر ہوتا تھا۔

حکم کا ذاتی کتب خانہ

خلیفہ حکم کا ذاتی کتب خانہ اس قدر شاندار تھا کہ اس کی عمارت قصر شاہی سے کم وسیع اور شاندار نہ تھی۔ اس کتب خانے کی عمارت کو سنگ مرمر سے بنایا گیا تھا سنگ مرمر ہی کا خوبصورت فرش تھا جس پر سنگ سبز اور سنگ موسیٰ کی پچیکاری تھی۔ صندل، آبنوس اور اسی قسم کی قیمتی لکڑیوں کی الماریاں تھیں۔ ہر ایک الماری پر سنہرے حرفوں سے لکھا ہوا تھا کہ الماری میں کس علم و فن کی کتابیں ہیں۔ اس دار الکتب میں ہزارہا جلد ساز اور کاتب مصروف کار رہتے۔ کتابوں کی تعداد چھ لاکھ کے قریب تھی۔

فہرست کتب ۴۴ جلدوں میں تھی۔ اس فہرست میں صرف کتاب اور مصنف کا نام درج تھا۔ ان کتابوں میں بہت ہی کم ایسی کتابیں ہوں گی جن کو خلیفہ الحکم نے مطالعہ نہ کیا ہو۔ قریباً ہر ایک پر خلیفہ کے قلم کے لکھے ہوئے حواشی تھے۔ ہر ایک کتاب کے پہلے ورق پر خلیفہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا مصنف اور کتاب کا نام اور مصنف کا شجرۂ نسب درج ہوتا تھا۔ خلیفہ حکم کی قوت حافظہ بہت زبردست تھی، ساتھ ہی وہ اعلیٰ درجے کا ذہین و نقاد بھی تھا ہر قسم کی نظم و نثر بلا تکلف لکھتا تھا۔

علماء اور اہل کمال کی قدر دانیاں

ابو علی قالی بغدادی مصنف کتاب الامالی عبدالرحمن ثالث کے عہد میں وارد اندلس ہوا تھا۔ سلطان حکم اس بے نظیر عالم کو ایک دم کے لیے اپنے پاس سے جدا نہ کرتا تھا۔ ابوبکر الارزق

جو اپنے زمانے کا مشہور عالم اور سلمہ بن عبدالملک بن مروان کے خاندان سے تھا ۳۴۹ھ میں قرطبہ پہنچا اور ۸۰ سال کی عمر میں بہ ماہ ذیقعدہ ۳۸۵ھ میں فوت ہو کر قرطبہ میں مدفون ہوا خلیفہ حکم اس کی بڑی عزت کرتا تھا۔ اسمٰعیل بن عبدالرحمٰن بن علی جو ابن زمع کے خاندان سے تھا قاہرہ سے اندلس آیا۔ اور خلیفہ حکم کے علمائے دربار میں شامل ہوا۔ ثقر البغدادی اور قیاس بن عمر وغیرہ مشہور خوش نویس تھے۔ جن کی خلیفہ حکم بڑی قدر کرتا تھا، ابو الفرج اصفہانی اور ابو بکر مالکی کے پاس ایک ایک ہزار دینار سرخ خلیفہ نے بھیجے تھے۔ ابو عبداللہ محمد بن عبدون عذری دربار قرطبہ کا اعلیٰ درجے کا طبیب تھا۔ محمد بن مفرج فقہ اور حدیث کا مشہور عالم تھا۔ ابن مغیث، احمد بن عبدالملک، ابن ہشام القومی، یوسف بن ہارون، ابو الولید یونس اور احمد بن سعید ہمدانی مشہور شعراء تھے۔ محمد بن یوسف وراق نے خلیفہ حکم کے حکم سے افریقہ کی تاریخ مع جغرافیہ لکھی تھی۔ عیسیٰ ابن محمد، ابو عمر احمد بن فرج، یعیش بن سعید خلیفہ حکم کے عہد میں مشہور مؤرخ اور زبردست عالم تھے جو دربار قرطبہ کی رونق تھے۔

اندلس کا آخری مسلمان فرمانروا رخصت ہوتا ہے

۱۲۔ ربیع الاول ۸۹۷ھ کو ابو عبداللہ نے قصر الحمرا عیسائیوں کے حوالے کر دیا۔ فرڈیننڈ نے اندلس کے سب سے بڑے پادری منذورہ کو حکم دیا کہ وہ مع فوج پہلے شہر میں داخل ہو اور قلعۂ الحمرا کے سب سے بلند برج پر سے اسلامی نشان کو گرا کر صلیب نصب کر دے تاکہ اس نیک شگون کو دیکھتے ہی بادشاہ مع اپنی ملکہ ازابیلا کے شہر میں داخل ہو۔

جب سلطان ابو عبداللہ نے منذورہ کو قلعہ میں آتے دیکھا تو مع پچاس امیروں کے گھوڑے پر سوار ہو کر قلعہ سے باہر نکل آیا۔ اس وقت کی کیفیت کا تصور ہر شخص کر سکتا ہے کہ شہر پر کیسی اداسی چھائی ہوئی ہو گی مسلمانوں کے دلوں پر کیا گزر رہی ہو گی اور عیسائیوں کی خوشی کا حال بھی تحریر میں نہیں لایا جا سکتا۔ عیسائی بادشاہ اور اس کی ملکہ فوجی لباس میں اپنے

لشکر کے ساتھ صلیب کے بلند ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ سب کی نگاہیں قصرِ حمرا کے سب سے بلند برج کی طرف لگی ہوئی تھیں کہ سامنے سے ابو عبد اللہ نے شاہِ قسطلہ کے قریب آ کر کنجیاں حوالے کیں اور کہا کہ اے طاقتور بادشاہ ہم اب تیری رعایا ہیں یہ شہر اور تمام ملک ہم اب تیرے حوالے کرتے ہیں کیونکہ خدا کی یہی مرضی تھی۔ ہم کو یقین ہے کہ تو رعایا کے ساتھ ہمیشہ شریفانہ اور فیاضانہ برتاؤ رکھے گا۔

فرڈی نینڈ چاہتا تھا کہ کچھ تشفی آمیز الفاظ کہے لیکن ابو عبد اللہ بلا توقف آگے بڑھ گیا۔ اور ملکہ ازبیلا سے ملتا ہوا البشرات کی طرف جہاں اس کا اسباب اور رشتہ دار پہلے ہی جا چکے تھے روانہ ہو گیا، اتنے میں چاندی کی صلیب قصرِ حمرا پر بلند ہو کر آفتاب کی شعاعوں میں چمکنے لگی۔ اور عیسائی بادشاہ قصرِ حمرا میں فاتحانہ داخل ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

جب ابو عبد اللہ البشرات کے پہاڑ کی ایک چوٹی پر پہنچا تو اس نے بے ساختہ مڑ کر غرناطہ کی طرف دیکھا اور اپنے خاندان کی گزشتہ شان و عظمت پر آخری نظر ڈال کر بے ساختہ زار و قطار رونے لگا۔ ابو عبد اللہ کی ماں نے جو اس وقت ہمراہ تھی کہا کہ:

"جب تو ایک سپاہی پیشہ مرد ہونے کے باوجود اپنے ملک کو نہ بچا سکا تو اب مثل عورتوں کے ایک گم شدہ چیز پر رونے سے کیا حاصل ؟!"

مسلمانوں پر عیسائیوں کی سفاکیاں

عیسائیوں نے الحمرا پر قابض ہو کر معاہدے کی تمام شرائط کو فوراً فراموش کر دیا۔ شہر غرناطہ پر بھی قبضہ کر لیا، سلطان ابو عبد اللہ کو البشرات میں بھی نہیں رہنے دیا تھوڑی سی رقم دے کر البشرات کو بھی ابو عبد اللہ سے خرید لیا اور وہاں سے ابو عبد اللہ مراقش میں جا کر شاہِ مراقش کا ملازم ہو گیا۔ وہاں ایک عرصۂ دراز تک اس حالت میں رہ کر فوت ہوا۔ عیسائیوں نے فوراً تمام ملک میں اپنی مذہبی عدالتیں قائم کر دیں جن میں ہر روز ہزارہا مسلمان گرفتار کر کے لائے جاتے اور محض اس جرم میں کہ ان کا مذہب اسلام ہے بعض جھوٹے الزام لگا کر آگ میں جلا دیے جاتے تھے۔ تاہم مسلمان اپنے مذہب پر قائم اور جزیرہ نمائے اندلس میں موجود پائے جاتے تھے۔

۱۵۰۲ء میں ایک حکم جاری کیا گیا کہ ہر ایک شخص جو مسلمان ہے وہ دینِ عیسوی قبول کرلے ۔ ورنہ اس کو جہاں کہیں پایا جائے گا قتل کر دیا جائے گا۔ مسلمانوں نے اس حالت میں شہروں اور میدانوں کو چھوڑ کر پہاڑوں میں پناہ لی اور ہر قسم کی اذیت برداشت کی، مگر دینِ اسلام کو چھوڑنا پسند نہ کیا۔ بعض مسلمانوں کو عیسائیوں نے پکڑ کر زبردستی بپتسمہ دیا۔ اور اُن کے بچوں کو عیسائی بنایا۔ یہ وہ لوگ تھے جو عربی النسل یا بربری نہ تھے ۔ اور اپنا عیسوی مذہب چھوڑ کر بخوشی مسلمان ہو گئے تھے ۔ ان نومسلم خاندانوں میں سے کسی نے بھی دینِ اسلام کا چھوڑنا گوارا نہ کیا ۔ اور وہ چھپ چھپ کر اپنے گھروں میں نمازیں پڑھتے تھے۔

بعض مسلمانوں پر عیسائیوں نے بظاہر یہ سب سے بڑی مہربانی کی کہ ان کو افریقہ چلے جانے کی اجازت دی ۔ ان لوگوں کے لیے جہاز بھی فراہم کر دیے ۔ انھوں نے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ جو سب سے زیادہ قیمتی سامان جہازوں میں لادا تھا، وہ نایاب اور قیمتی کتابوں کے ذخائر تھے۔ مگر عیسائیوں نے ان جہازوں کو ساحلِ افریقہ تک پہنچنے سے پہلے سمندر کے اندر غرق کر دیا۔

مُسلمانوں نے اندلس کو کیا دیا تھا؟

اندلس میں بھی عربوں کی حکومت اگرچہ بظاہر شخصی نظر آتی تھی مگر اس میں جمہوریت کا رنگ بہت زیادہ شامل تھا۔ خلیفہ کا حکم اور شریعت کا قانون ہر فردِ بشر پر یکساں عامل تھا۔ ان حکمرانوں میں نہ موروثی جاگیر دار تھے نہ موروثی امرار، عبدالرحمٰن ثانی اموی سلطان پر قاضی کی کچہری میں عیسائی نے دعویٰ کیا اور قاضی کے حکم کی اس عظیم الشان سلطان کو اسی طرح تعمیل کرنی پڑی جس طرح ایک غلام کو تعمیل کرنی پڑتی ۔ کوتوالی کا انتظام نہایت اعلیٰ درجے کا تھا۔ ہر بازار میں ایک محتسب ہوتا تھا جو تجارت پیشہ لوگوں کے کاروبار کی نگرانی کرتا تھا۔ ہر شہر و قصبے میں شفاخانے اور دواخانے کھلے تھے۔ سڑکیں اور نہریں مسلمانوں نے تمام ملک میں جال کی طرح بچھا دی تھیں۔ خلیفہ ہشام نے دریائے وادی الکبیر

کا نہایت شاندار اور خوبصورت پُل بنایا۔ اسی طرح جابجا دریاؤں کے پُل بنائے گئے تھے۔ فنونِ جنگ اور آئینِ فوج کشی میں عام طور پر مسلمان ساری دُنیا سے زیادہ شائستہ تھے۔ اندلس کے مسلمانوں نے قلعہ شکنی کے آلات ایجاد کیے۔ یورپ کے وحشیوں کو جو ہمیشہ فتح مند ہونے پر شہروں اور بستیوں کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا کرتے۔ اور عورتوں، بچوں اور بوڑھوں تک کو تہ تیغ کر دیتے تھے۔ اپنے طرزِ عمل سے مسلمانوں نے آٹھ سو برس تک شائستگی کی تعلیم دی کہ فتح یاب ہونے پر بے گناہ رعایا کو کسی قسم کا بھی آزار نہیں پہنچانا چاہیے

زراعت کو مسلمانوں نے اس قدر ترقی دی تھی کہ یہ ایک مکمل فن بن گیا تھا۔ ہر میوہ دار درخت اور زمین کی خاصیت و ماہیت سے واقفیت حاصل کی۔ اندلس کے ہزاروں لاکھوں میل مربع رقبوں کو جو بنجر اور ویران پڑے ہوئے تھے مسلمانوں نے میوہ دار درختوں اور سرسبز و شاداب لہلہاتے ہوئے کھیتوں کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ چاول، نیشکر، روئی، زعفران، انار، آڑو، شفتالو وغیرہ جو آجکل اندلس میں بکثرت پیدا ہوتے ہیں مسلمانوں ہی کے طفیل اندلس بلکہ تمام یورپ کو نصیب ہوئے۔ اندلوسیہ اور اشبیلیہ کے صوبوں میں زیتون اور خرما کی کاشت کو بڑی ترقی دی۔ سرلیش، غرناطہ اور مالقہ کے علاقوں میں انگوروں کی بڑی پیداوار ہوتی تھی۔ زراعت کے ساتھ مسلمانانِ اندلس نے معدنیات کی تلاش میں بھی کوتاہی نہیں کی۔ سونا، چاندی، لوہا، فولاد، پارہ، کہربا، تانبا، یاقوت اور بلّور کی کانیں دریافت کیں اور یہ چیزیں بہ کثرت حاصل ہونے لگیں۔ غرناطہ کی سلطنت اندلس میں مسلمانوں کی آخری نشانی تھی۔ لیکن اس چھوٹی سی سلطنت نے بھی فنِ تعمیر اور قدردانی علوم کے متعلق بڑی بڑی عظیم الشان یادگاریں چھوڑی ہیں۔ مسلمانوں نے ایسا عجیب و غریب سیمنٹ ایجاد کیا کہ قصرِ حمرا جو سلطنت غرناطہ کی نشانی دُنیا میں باقی ہے آج تک اپنے مسالے کی پختگی سے سیّاحوں کو حیران کر دیتا ہے۔ قصرِ حمرا کو شاہانِ غرناطہ نے یہ صرف زرِ کثیر شہر کے قریب ایک نہایت بلند ٹیلے پر جبل شلیر کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں کے سائے میں تیار کیا تھا۔ اس کی چار دیواری کے اندر ایسے خوش نما، سرسبز و شاداب باغات نہرہائے شیریں، درختہائے میوہ دار تھے کہ چشمِ فلک نے اس کی نظیر نہ دیکھی تھی۔ اس قصر

کی ہر ایک چیز قابلِ دید اور اس قدر حیرت انگیز ہے کہ دُنیا کے مشہور صنّاع و دست کار دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں۔ اس کی بلند دیواروں کی گچ کی صفائی سنگِ مرمر سے زیادہ چمکدار اور لوہے سے زیادہ مضبوط ہے۔ جالی دار دیواروں کی طرح طرح کی نازک گل کاریاں اور اس کی نئی وضع کی محرابوں سے ہر ایک سکھی ہوئی قلم نزاکت کا اظہار کرتی ہے مسلمانوں نے اندلس پر قابض و متصرف ہو کر تمام ملک میں دار العلوم، مدارس، رسد خانے عظیم الشان کتب خانے کھول دیے تھے جہاں علمی تحقیقات کا ہر ایک سامان موجود رہتا تھا۔ بڑے بڑے شہروں میں دار العلوم یا یونیورسٹیاں اور چھوٹے قصبوں میں ابتدائی اور درمیانی درجے کے مدارس تھے۔ قرطبہ، اشبیلیہ، مالقہ، سرقسطہ، لشبونہ، جیان، طلیطلہ وغیرہ بڑے بڑے شہروں میں دار العلوم قائم تھے۔ جہاں اطالیہ، جرمن، فرانس اور انگلستان وغیرہ ممالک کے طلبار اور شائقینِ علوم آتے اور برسوں رہ کر تعلیم پاتے تھے۔ عربوں نے یونانی، لاطینی اور اسپانش زبانوں کو بے حد مشقت اور عرق ریزی کے ساتھ سیکھا۔ اور اُن زبانوں میں عربی زبان کے متعدد لغات لکھ ڈالے۔ خلیفہ حکم ثانی کے عہد حکومت میں صرف قرطبہ کے کتب خانے میں چھ لاکھ کتابیں مختلف علوم و فنون کی موجود تھیں۔ اور ہر کتاب پر خاص خلیفہ کے ہاتھ کا حاشیہ تحریر تھا مسلمانوں نے تمام فلسفۂ یونان کی کتابوں کا اپنی زبان میں ترجمہ کر ڈالا۔ ابن رشد جو ارسطو پر بھی فضیلت رکھتا تھا، اندلس ہی کا ایک مسلمان تھا مسلمانوں نے علمِ ہیئت میں وہ ترقی کی اور ایسے رسد خانے قائم کیے کہ تمام یورپ کو انہی کے نقشِ قدم پر چلنا پڑا اصطرلاب جو رسد خانوں کی روح رواں ہے اندلس کے مسلمانوں کی ایجاد ہے۔ طب اور جراحی میں اندلسی مسلمانوں نے ایسی ترقی کی تھی کہ چند روز گزشتہ تک تمام یورپ اُنھیں کی کتابوں سے فیض اٹھاتا تھا۔ علمِ حیوانات و نباتات میں اندلسی مسلمانوں کے کارنامے بیحد عظیم الشان ہیں۔ قرطبہ اور غرناطہ میں علمِ حیوانات و نباتات کی تعلیم کے لیے خاص طور پر باغات اور کارخانے موجود تھے۔ سَن اور روئی سے کاغذ تیار کرنا اندلسی مسلمانوں نے ایجاد کیا۔ الفانسو یازدہم کی تاریخ میں لکھا ہے کہ:

"شہر کے مسلمان بہت سی گو بجنے والی چیزیں اور لوہے کے گولے بہت بڑے بڑے

سیب کی برابر پھینکتے تھے۔ یہ گولے اس قدر دور جاتے تھے کہ بعض فوج کے اس پار جاگر اور بعض فوج کے اندر گرتے تھے۔

اس بیان سے ظاہر ہے کہ مسلمان جب توپ اور بارود کو استعمال کرتے تھے عیسائی اس سے قطعاً ناواقف تھے۔ سنین الاسلام کا مصنف لکھتا ہے کہ سال ۴۴۲ھ میں اندلس کے مسلمانوں میں سے بعض نے امریکہ کو دریافت کیا تھا مگر اس کی زیادہ شہرت نہ ہوئی۔ یہ شہرت کولمبس کی قسمت میں لکھی تھی۔ جو بہت دنوں بعد امریکہ پہنچا تھا۔

مسلمانوں کے علمی ذوق و شوق نے تمام یورپ کے لئے ادب و فلسفہ اور صنعت و حرفت بلکہ تمام علوم و فنون کے دروازے کھول دیے تھے۔ آٹھ سو برس تک مسلمان ہر چیز میں اہلِ یورپ کے استاد بنے رہے۔ عیسائی امراء زبان اور ہر چیز میں مسلمانوں کی تقلید کرنا اپنے لیے موجبِ فخر سمجھتے تھے۔ اور عربی نظم و نثر لکھنے کی کوشش کیا کرتے تھے یہ انھیں مسلمانوں کا اثر تھا۔ فرانسیسی اور اطالوی زبانوں میں اکثر وہ الفاظ جو جہاز رانی اور بحری انتظامات سے متعلق ہیں عربی ہیں۔ اور یہ دلیل اس بات کی ہے کہ ان ممالک نے مسلمانوں ہی سے جہاز رانی سیکھی ہے۔ سیر و شکار کے متعلق بھی اکثر الفاظ عربی الاصل ہیں۔ علمِ ہیئت کی اصطلاحیں اور دواؤں کے نام جو یورپ کی زبانوں میں رائج ہیں عربی الاصل ہیں۔

غرض کہ اندلس کے مسلمان تمام یورپ کے استاد، تمام یورپ کے محسن اور تمام یورپ کو علم و حکمت اور ترقی و عزت کے طریقے بتانے والے اتالیق تھے۔ آج یورپ اپنی کوئی بھی ایسی قابلِ فخر چیز پیش نہیں کر سکتا جس میں بجا طور پر وہ مسلمانوں کا رہینِ منت نہ ہو ان احسانات کا جو معاوضہ یورپ اور یورپ کے عیسائیوں نے مسلمانوں کو دیا وہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔

اس جگہ ایک مرتبہ پھر اس بات کو یاد کر لینا چاہیے کہ مسلمانوں نے جب پہلی صدی ہجری میں اندلس کو فتح کیا تھا تو کسی عیسائی کو زبردستی مسلمان نہیں بنایا تھا۔ بلکہ عیسائی لوگ خود بخود اسلام کی خوبیوں کو دیکھ کر مذہبِ اسلام میں داخل ہوتے تھے، اب جب کہ عیسائیوں نے طاقت حاصل کی اور وہ مسلمانوں کو ان کے مذہب سے نہ پھیر سکے تو عیسائیوں نے

لاکھوں مسلمانوں کو جو اندلس میں موجود تھے قتل کر ڈالا۔ آگ میں جلا دیا اور پانی میں ڈبو دیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ملکِ اندلس جو مسلمانوں کے عہد حکومت میں دُنیا کا سب سے زیادہ سرسبز و شاداب اور آباد ملک سمجھا جاتا تھا اور جس کی زرخیزی ضرب المثل تھی مسلمانوں کی بربادی کے بعد ایسا ویران اور غیر آباد ہوا کہ آج تک ویرانی و نحوست نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ مسلمانوں کے زمانے میں پہاڑوں تک پر زراعت ہوتی تھی اور کوئی چپہ زمین بنجر نہ تھا لیکن آج ہزارہا مربع میل زمین کے قطعات ویران و بنجر پڑے ہوئے ہیں۔ وہ ملک جو مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں دُنیا کا سب سے زیادہ قیمتی اور شاندار ملک تھا آج سب سے زیادہ منحوس اور بے حقیقت ملک سمجھا جاتا ہے۔

نویں منزل

ادریسی حکومت مراقش میں

بربروں اور عربوں کی آویزش اور کشمکش

آغاز و انجام شمالی افریقہ میں ادریسی حکومت کم و بیش دو سو سال قائم رہی۔ خارجیوں سے، عربوں سے، بربروں سے، اہلِ خاندان سے اور حکومتِ اندلس سے مسلسل اس کی معرکہ آرائیاں جاری رہیں۔ بالآخر ایک روز یہ سلطنت بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پردۂ عدم میں روپوش ہو گئی۔

ملک عرب کی طرح ملک مراقش میں بھی بربر قوم کے قبائل الگ الگ صوبوں میں بود و باش رکھتے تھے۔ اور ان قبائل کے نام سے صوبوں کو نامزد کیا جاتا۔ اور ان کی آبادی کے اعتبار سے حدود کی تقسیم و تعیین کی جاتی تھی۔ تیونس، الجیریا اور مراقش تینوں ملکوں میں زیادہ تر بربر قوم آباد تھی۔ اس لیے سوائے ملک مصر کے تمام شمالی افریقہ کو ملک بربر کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کی آمد کے وقت اس ملک مراقش میں زناطہ، مصمودہ، سنہاجہ، قطامہ، ہوارہ وغیرہ بربری قبائل آباد تھے۔ مشرقی روم یعنی قسطنطنیہ کی حکومت اس زمانے تک اس علاقے میں موجود تھی جب تک کہ مسلمانوں نے اس ملک کو فتح کیا ہے بہر حال قوم بربر مراقش اور اس کے متصلہ مشرقی علاقوں میں آباد اور سینکڑوں قبائل میں منقسم تھی، اس قوم کو

عربوں، شامیوں، مصریوں، یونانیوں، ایرانیوں اور رومیوں وغیرہ کا مجموعہ کہا جا سکتا ہے اس کی بربریت اور وحشت میں اگر فرق آیا اور وہ مبدل بہ تہذیب شائستگی ہوئی تو اسلام کے اثر سے ہوئی۔ مسلمانوں کو اس ملک کے فتح کرنے اور حکومتِ اسلامیہ کے قائم کرنے میں بڑی دقتیں اٹھانی پڑیں۔ بربری قبائل نے بار بار بغاوتیں کیں اور بار بار وہ مفتوح اور مغلوب بنائے گئے۔ اُن کی ان غداریوں اور بے وفائیوں کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ وہ سب کے سب مذہب اسلام قبول نہ کر چکے۔ مذہب اسلام کو قبول کرنے کے بعد وہ مثل عربوں کے بہادر، مہذب اور شریف ثابت ہوئے جب کبھی ان میں اسلام کی پابندی کم ہوتی اسی نسبت سے ان کی قدیمی وحشت اور غداری عود کر آئی۔

ملک مراقش کو عقبہ بن نافع نے تمام و کمال فتح کر لیا تھا۔ اور مراقش کے بعض صوبوں کے فرمانرواؤں نے بخوشی عقبہ کی فرمانبرداری قبول کر لی تھی۔ اس کے بعد کئی مرتبہ مراقش باغی ہوا۔ اور ہر مرتبہ مغلوب و محکوم بنایا گیا۔ موسیٰ بن نصیر گورنر افریقہ و مراقش نے اپنی طرف سے طارق بن زیاد کو مراقش کی حکومت سپرد کی تھی۔ ملک اندلس کی فتح میں زیادہ تر بربری لوگوں کی فوج کام میں لائی گئی تھی۔ اور اسی لیے یہ کہنا بیجا نہیں ہے کہ مراقش نے اندلس کو فتح کر کے حکومتِ اسلامیہ میں داخل کیا تھا۔ اندلس پر قبضہ ہونے کے بعد ہی بربری لوگوں نے مراقش و اندلس میں بغاوتوں کا سلسلہ عربوں کے جذبہ برتری کے باعث جاری کر دیا۔ اندلس میں تو ان کی بغاوت جلد فرو ہو گئی مگر ملک بربر یعنی شمالی افریقہ میں ان کی بغاوتوں کا ایک سلسلہ تھا جو عرصہ دراز تک جاری رہا۔

حکومتِ ادریسیہ کا قیام امام محمد بن عبد اللہ کے خاندان کا ایک شخص ادریس نامی مع اپنے خادم راشد کے ملکِ حجاز سے فرار ہو کر مصر و افریقہ ہوتا ہوا مراقش پہنچا۔ سجلماسہ کے متصل مقام بولیہ میں مقیم ہوا۔ وہاں کے امک عامل اسحاق بن محمد بن عبد الحمید نامی نے ادریس کی خوب خاطر تواضع کی۔ اور رفتہ رفتہ بربر قبائل میں سے زواغہ، لواطہ، زناطہ، سدراطہ، کمناسہ اور غمازہ وغیرہ

قبائل ادریس کے معتقد ہو گئے۔ بربری قبائل میں ابھی تک بعض قبائل شالہ اور مادلہ وغیرہ مقامات میں آباد تھے۔ ۱۷۲ھ میں اسحاق بن محمد بن عبدالحمید کی کوششوں سے اکثر مسلم قبائلِ بربر نے ادریس کے ہاتھ پر بیعتِ خلافت کی اور ادریس نے قبائل کی ایک فوج مرتب کر کے ان بربر قبائل پر جہاد کیا۔ جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ ان لوگوں کو مغلوب کر کے اسلام کی تعلیم و ترغیب دی اور بہت جلد وہ اسلام میں داخل ہو کر ادریس کو اپنا سلطان اور خلیفہ ماننے لگے۔

ہارون رشید کا اضطراب اور فریب

۱۷۳ھ میں ادریس نے تلمسان پر چڑھائی کی تلمسان کے عامل نے ادریس کی اطاعت و فرمانبرداری قبول کی۔ ادریس نے تلمسان کو اپنا دارالحکومت بنا کر یہاں ایک جامع مسجد تعمیر کرائی۔ اور جلد جلد اپنی طاقت کو ترقی دی۔ اس کے بعد ادریس تلمسان سے مقام بولیہ یا بولیلی میں چلا گیا اور وہیں اقامت گزیں ہو گیا۔ ادریس کی اس بڑھتی ہوئی طاقت اور ملکِ مغرب میں اس کی حکومت کے قائم ہونے کا حال خلیفہ ہارون رشید عباسی کو معلوم ہوا تو وہ بہت فکر مند ہوا۔ اس نے اپنے غلام سلیمان بن جریر مشہور بہ شماخ کو ملکِ مغرب کی طرف روانہ کیا کہ وہ ادریس کا کام تمام کرے۔ چنانچہ شماخ نے ادریس کے پاس پہنچ کر ظاہر کیا کہ ہارون الرشید سے ناراض ہو کر اور اس کی حکومت کے دائرے سے نکل کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ ادریس نے اس کو اپنے مصاحبوں میں داخل کر دیا۔ شماخ نے ادریس کو ایک منجن دیا جس کے استعمال کرتے ہی ادریس کا دم گھٹ گیا۔ اور وہ ۱۷۵ھ میں راہیٔ ملکِ بقا ہوا۔ شماخ وہاں سے بھاگا۔ ادریس کے خادم راشد نے اس کا تعاقب کیا مقابلہ ہوا شماخ زخمی ہوا مگر بچ کر نکل گیا۔ ادریس مقام بولیلی میں مدفون ہوا۔

ادریس اصغر کی بیعت قبل از ولادت

ادریس کے مرنے پر اس کے خادم راشد نے ظاہر کیا کہ ایک بربری لونڈی کنزہ نامی کو ادریس سے حمل ہے۔ اور اب اسی بچے کی جو رحمِ مادر میں

ہے ہم کو بعیت کرنی چاہیے۔ چنانچہ بربریوں نے بعیت کی اور اس تمام علاقے پر جو ادریس کی حکومت میں شامل تھا قبضہ و انتظام قائم رکھا۔ ایامِ حمل کے گزرنے پر اس بربری لونڈی کے پیٹ سے لڑکا پیدا ہوا۔ راشد نے لوگوں کو حکم دیا کہ اب اس لڑکے کے ہاتھ پر پھر بعیت کرو، چنانچہ سب نے بعیتِ اطاعت کی۔ راشد اس شیرخوار بچے کی طرف سے نیابۃً امورِ سلطنت انجام دیتا تھا۔ یہ راشد ہی کی عقل مندی اور دانائی تھی کہ اس نے اپنے آقا کے مرنے پر بھی حکومت کے نظام کو درہم برہم نہ ہونے دیا۔ اور بربریوں کے مزاج سے پوری واقفیت حاصل کر کے حکومت کو قائم رکھا۔

جب ۱۸۸ھ میں یہ لڑکا گیارہ سال کا ہو کر بارھویں سال میں داخل ہوا تو اس کے ہاتھ پر جامع مسجد ولیلی میں پھر بعیت کی گئی۔ اسی سال ابن اغلب حاکمِ افریقیہ نے راشد کے خلاف بربریوں کو ابھارا۔ اور انھوں نے راشد کو قتل کر ڈالا۔ مگر اس لڑکے کی اطاعت سے باہر نہ ہوئے۔ اس لڑکے کا نام بھی ادریس ہی رکھا گیا تھا جو ادریسِ ثانی یا ادریس اصغر کے نام سے مشہور رہا۔ راشد کے بعد ابو خالد بن یزید بن الیاس عبدی ادریسِ اصغر کا اتالیق و نگراں مقرر ہوا۔

فتوحات

ادریسِ اصغر نے بہت جلد امورِ سلطنت سے واقف و آگاہ ہو کر قلمدانِ وزارت مصعب بن عیسیٰ ازدی کو سپرد کیا۔ اور رفتہ رفتہ اپنی حدودِ سلطنت کو وسیع کر کے قریباً تمام ملکِ مراقش پر قبضہ کر لیا اور نہایت خوبی کے ساتھ حکومت کرنے لگا۔ بہت سے عرب اندلس و افریقیہ و مصر و شام سے آ آ کر ادریسِ اصغر کے پاس جمع ہونے لگے۔ اور ان لوگوں کی وجہ سے حکومت و سلطنت میں رونق اور شان و شوکت کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اسحاق بن محمد بن عبدالحمید سلطنتِ ادریسیہ کے اعلیٰ اراکین میں شامل تھا۔ اور اسی کی امداد و اعانت سے ادریس اول کو اپنی حکومت قائم کرنے میں بڑی آسانی ہوئی تھی مگر ۱۹۲ھ میں اس کو اس الزام میں قتل کر دیا گیا کہ وہ ابراہیم بن اغلب سے سازباز رکھتا ہے۔ اور اسی کے اشارے سے راشد قتل ہوا تھا۔ ولیلی یا ولیلیہ جہاں اب تک دارالحکومت تھا ایک چھوٹا سا مقام

تھا۔ ۱۹۳ھ میں ادریس اصغر نے بولیلی سے مقام فاس میں آکر اس کے قریب ایک جدید شہر کی بنیاد ڈالی اور اسی کو اپنا دار الحکومت بنایا۔ اس عرصے میں تلمسان کا علاقہ اس کے قبضے سے نکل گیا تھا۔ ۱۹۷ھ میں اس نے تلمسان کو فتح کیا۔ اور اس کے نواحی علاقے کو اپنے تصرف میں لا کر ۱۹۹ھ تک تلمسان میں مقیم رہا۔ اس کے بعد جب وہ فاس کی طرف گیا تو بربروں نے پھر اپنی جبلی عادت کے موافق بغاوت اختیار کی اور ابراہیم بن اغلب کی حکومت تسلیم کر لی۔ اس طرح ابراہیم بن اغلب اور ادریس اصغر کے درمیان چند روز تک کشمکش جاری رہی۔ آخر ادریس اصغر اور ابراہیم بن اغلب کے درمیان صلح ہو گئی اور مراقش کا ملک ہر طرح خلافت عباسیہ سے بے تعلق ہو کر وہاں ایک مستقل ادریسیہ سلطنت قائم ہو گئی۔

۲۱۳ھ میں ادریس اصغر نے وفات پائی اور اس کا بیٹا محمد اپنے باپ کی جگہ تخت نشین ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ادریس اوّل کا حقیقی بھائی سلیمان بن عبد اللہ بن حسن مثنیٰ بن حسن بن علی بن ابیطالب مصر و افریقیہ میں ہوتا ہوا تلمسان پہنچ گیا تھا۔ اس نے جب اپنے آپ کو ادریس اوّل کا حقیقی بھائی ظاہر کیا تو وہاں کے بربری قبائل نے بخوشی اس کی بیعت کر لی اور اس کی حکومت تلمسان میں قائم ہو گئی۔

ادھر ادریس اصغر کی ماں اور محمد بن ادریس کی دادی کنیزہ نے کہا کہ تنہا محمد ہی کو تمام ممالک مقبوضہ کی حکومت نہ دی جائے بلکہ محمد کے دوسرے بھائیوں کو بھی ایک ایک حصہ کی حکومت دی جائے۔ اس طرح اراکین سلطنت نے مراقش کی زبردست سلطنت کو چند چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر دیا۔ چند روز کے بعد عیسیٰ نے ازمور سے اپنے بھائی محمد بن ادریس پر فوج کشی کی۔ محمد نے اپنے بھائی قاسم کو اس مہم پر جانے کا حکم دیا مگر قاسم نے اس حکم کی تعمیل سے انکار کیا۔ تب محمد نے عمر کو عیسیٰ کے مقابلے پر روانہ کیا۔ عمر نے عیسیٰ کو شکست دے کر اس کے تمام مقبوضہ ملک کو اپنی ریاست میں شامل کر لیا اور محمد نے عمر کو بخوشی ایسا کرنے دیا۔ ۲۲۰ھ میں عمر کا انتقال ہوا۔ اور محمد نے اس کے بیٹے علی بن عمر کو سندِ حکومت عطا کر کے اس کے باپ کی جگہ مامور کیا۔

عمر کی وفات کے سات مہینے بعد ۲۲۱ھ میں محمد بن ادریس نے بھی وفات پائی۔ اس نے مرتے وقت اپنے نو سالہ بیٹے علی کو اپنا جانشین و ولی عہد مقرر کیا۔

چنانچہ محمد کے بعد ارکینِ سلطنت نے بہ خوشی علی بن محمد کے ہاتھ پر بعیت کر لی اور نہایت مستعدی سے کاروبار سلطنت انجام دینے لگے۔ اس کے عہدِ حکومت میں ہر طرح امن و امان قائم رہا، تیرہ سال کی حکومت کے بعد علی بن محمد نے ۲۳۴ھ میں وفات پائی اور مرتے وقت اپنے بھائی یحییٰ ابن محمد کو اپنا جانشین مقرر کیا۔

یحییٰ ابن محمدؒ کا شاندار دور

یحییٰ ابن محمدؒ نے سلطنت کو خوب رونق دی اور اس کے زمانے میں سلطنتِ ادریسیہ عظیم الشان سلطنتوں میں شمار ہونے کے قابل ہو گئی۔ شہر فاس کی آبادی میں خوب ترقی ہوئی۔ تجارت کی گرم بازاری ہوئی، علماء و فضلاء دُور سے آ کر دربارِ ادریسیہ میں جمع ہوئے۔

یحییٰ ابن محمدؒ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا یحییٰ بن یحییٰ تخت نشین ہوا۔ یحییٰ ابن یحییٰ کی نالائقی اور بدچلنی نے رعایا کو ناراض کر دیا۔ اور عبدالرحمٰن بن ابی سہل کی سرداری میں لوگوں نے بغاوت کر کے یحییٰ ابن یحییٰ کو معزول کر کے فاس سے نکال دیا۔ وہ اسی غم و غیرت میں چند روز کے بعد فوت ہو گیا۔ یحییٰ ابن یحییٰ کے مذکورہ انجام سے مطلع ہو کر علی بن عمر فاس میں آ کر تخت نشین ہوا۔ اور اس طرح ایک وسیع سلطنت کا مالک ہو گیا۔ مگر چند ہی روز کے بعد عبدالرزاق خارجی نے علمِ بغاوت بلند کر کے اکثر حصۂ ملک پر قبضہ کر لیا اور عرصۂ دراز تک خاندانِ ادریسیہ کی حالت بہت ہی نازک اور کمزور و پریشان رہی۔

مراقش نے اندلس کی اطاعت قبول کر لی

یہاں تک کہ ۲۹۲ھ میں یحییٰ ابن ادریس بن عمر بن ادریس اصغر نے قوت پا کر تمام ملک مراقش پر قبضہ کر لیا۔ اور سلطنتِ ادریسیہ پر پھر عروج و کمال کا زمانہ آیا، اس نے نہایت کامیابی اور قوت و شوکت کے ساتھ حکومت کی۔ یہ ادریسیوں کا سب سے بڑا بادشاہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ فاطمیوں کی حکومت افریقیہ میں قائم ہو چکی تھی ۳۰۵ھ میں ان کے لشکر نے حدودِ مراقش پر حملہ کیا۔ اُدھر سے یحییٰ ابن ادریس اپنا لشکر لے کر مقابلے پر

مستعد ہوا۔ سخت مقابلے اور عظیم الشان معرکہ آرائی کے بعد یحییٰ کو شکست اور لشکر فاطمی کو فتح حاصل ہوئی۔ یحییٰ شکست خوردہ فاس میں واپس آیا اور صلح کی سلسلہ جنبانی خط و کتابت کے ذریعے شروع کی۔ آخر یہ بات قرار پائی کہ یحییٰ بن ادریس دولتِ فاطمی کی اطاعت قبول کر کے نشانِ اطاعت کے طور پر کچھ زرِ نقد سالانہ ادا کرے۔ ۳۰۹ھ میں جب یحییٰ ابن ادریس کا بیٹا طلحہ بن یحییٰ ابن ادریس فاس پر حکمراں تھا لشکر فاطمی کے ہاتھ میں گرفتار ہو گیا۔ دو سال قید رہ کر یحییٰ رہا ہوا اور مہدیہ میں رہنے لگا وہیں ۳۳۱ھ میں فوت ہوا۔

۳۰۹ھ سے مراقش اور فاس پر فاطمی حکومت قائم ہو گئی تھی۔ ۳۱۳ھ میں حسن بن محمد بن قاسم بن ادریس نے فاس کے فاطمی گورنر ریحان کتامی کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ اور اس کو فاس سے بے دخل کر کے فاس میں پھر ادریسی حکومت قائم کی۔ مگر چند ہی روز کے بعد موسیٰ بن ابی العافیہ فاطمی سپہ سالار نے چڑھائی کر کے فاس کو فتح کیا۔ اور حسن کو گرفتار کر کے قتل کر دیا۔ اس کے بعد اور بھی کئی شخص خاندانِ ادریسی کے گرفتار و مقتول ہوئے۔ فاس پر تو فاطمی حکومت کا قبضہ ہوا مگر مراقش کے اکثر اضلاع میں خاندانِ ادریسی کے افراد چھوٹے چھوٹے قطعات پر قابض و متصرف رہے اور یہ سب ادریسِ اصغر کی اولاد عمر و محمد کی نسل سے تھے۔ آخر انھوں نے سلطان اندلس کی طرف رجوع کیا اور سب کے سب فرماں روائے اندلس کے مطیع ہو گئے۔ اندلس کے اموی سلطان نے بہت جلد مراقش پر قبضہ کر کے وہاں سے فاطمیوں کو نکال دیا۔ اور مراقش سلطنتِ قرطبہ کا ایک صوبہ بن گیا اور پھر یہ سلطنت ختم ہو گئی!

دسویں منزل

حکومتِ اغالبہ

یہ زمانہ طالع آزمائی کا تھا، وفاداریاں بدلتی رہتی تھیں، حالات بدلتے رہتے تھے، انقلابات رونما ہوتے رہتے تھے۔ مرکز سے بغاوت عام تھی، جسے موقع ملا اس نے مرکز سے ناطہ توڑا۔ اور اپنی ایک جدا گانہ آزاد اور خود مختار حکومت بنا ڈالی۔ حکومتِ اغالبہ بھی اسی طرح عالمِ وجود میں آئی۔

قیروان شمالی افریقہ کا مرکز تھا۔ امویوں اور عباسیوں کے زمانے میں دمشق اور بغداد سے عامل یا گورنر نامزد ہو کر یہاں آیا کرتے تھے۔

یہاں بھی بربر زیادہ آباد تھے، وہ عربوں کے احساسِ برتری سے برہم رہتے تھے۔ لہٰذا یہاں بھی آویزش اور کشمکش کا سلسلہ جاری تھا۔ ۱۸۴ھ میں خلیفہ ہارون رشید نے ابراہیم بن اغلب کو بہ ایں شرط یہاں کی حکومت دے دی کہ چالیس ہزار دینار ہر سال دربارِ خلافت میں پیش کیا کرے گا۔ ابراہیم بن اغلب بہت اچھا شاعر، ادیب، فقیہہ اور خطیب تھا، ساتھ ہی ساتھ صائب الرائے، شریف، باوضع، صاحبِ عزم و ہمت، وجیہ اور شکیل بھی تھا۔ فنونِ جنگ اور جنگ کے داؤ پیچ سے خوب واقف تھا، پھر نہایت فصیح و بلیغ بھی، رعایا پر

مہربان، عہد کا پکا، باعزت، صورت کا اچھا، سیرت کا بہتر، حافظِ قرآن اور عالم بھی تھا۔ بربر نے اس کی اطاعت بڑی آسانی سے قبول کرلی، اس کے زمانۂ ولایت میں افریقہ کا علاقہ سرسبز و شاداب ہو گیا۔

امین الرشید کے عہد تک ابراہیم اپنے منصب پر فائز رہا۔ اس نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ نئی بستیاں بسائیں، نئے شہر تعمیر کیے، عدالت کا نظام استوار کیا، امن و امان قائم کیا، اسلام کی روح کو زندہ رکھا، سرکشوں کی سرکوبی کی اور امن پسندوں کو نوازا۔ مؤرخ اس امر پر متفق ہیں کہ افریقہ کو جو ترقی جو عروج اور جو فروغ ابراہیم کے عہد میں حاصل ہوا اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ وہ نہایت خاموشی کے ساتھ اپنے کام میں لگا رہا۔ اس نے بڑے طنطنہ اور دبدبے کے ساتھ حکومت کی، اس نے کسی کے ساتھ ظلم نہیں کیا۔ اور کسی ظالم کو معاف نہیں کیا۔ رعایا کے ساتھ اس نے ایسا سلوک کیا کہ کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیا۔

بارہ سال چند ماہ حکومت کرنے کے بعد ۳۰ شوال ۱۹۶ھ میں بعمر ۵۶ سال اس نے وفات پائی۔ اور اس کے بعد اس کا بیٹا عبداللہ بن ابراہیم تختِ حکومت پر متمکن ہوا۔ یہ بڑا ظالم اور بدخو تھا۔ ۲۰۱ھ میں اس نے وفات پائی اور اس کا بھائی زیادۃ اللہ اول بن ابراہیم اس کی جگہ مسندِ حکومت پر جلوہ فرما ہوا۔

زیادۃ اللہ بھی بڑا ضدی، خود رائے اور بدخو و غلط شخص تھا، شراب پیتا تھا اور نشہ کی حالت میں امراء اور حکام فوج کے احکام قتل صادر کیا کرتا تھا، اس وجہ سے فوج میں بھی بڑی بددلی پھیلی اور عوام میں بھی باغیوں اور سرکشوں کو سر اٹھانے کا موقع ملا۔ چنانچہ اس کے عہد میں متعدد بغاوتیں ہوئیں۔ جو شخص دوستوں کو بھی معاف نہ کرتا ہو وہ دشمنوں کے ساتھ کتنا شقی ہوگا، اس

۱: عرب مؤرخ افریقہ کے ان قبائل کو بربری کہتے ہیں جو فتح افریقہ کے وقت مصر سے لے کر بحر اٹلانٹک تک تمام شمالی افریقہ کے علاقہ میں آباد تھے ان کے متعلق علمائے فن اب تک یہ فیصلہ نہیں کر سکے ہیں کہ یہ لوگ کس نسل سے ہیں مگر ان کی قدامت اس سے ظاہر ہے کہ ... ۷، ق م کے مصری کتبوں اور تصویروں میں ان کے نام اور تصویریں پائی جاتی ہیں

کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں، جو لوگ گرفت رہو کر آتے تھے۔ ان کے سر کاٹ لیتا تھا۔ انھیں طرح طرح کی اذیتیں دیتا تھا۔ ہولناک اور لرزہ خیز مظالم میں اپنا کوئی جواب نہ رکھتا تھا۔

اس کی اس شقاوت اور سفاکی کی بنا پر متعدد بڑی بڑی بغاوتیں اس کے خلاف ہوئیں بعض دفعہ تو ایسا معلوم ہوا کہ اس کی حکومت کا تختہ الٹ جائے گا۔ متعدد مقامات اس کے ہاتھ سے چھن گئے، متعدد شہروں پر دشمن نے قبضہ کر لیا، صرف ایک چھوٹے سے علاقے تک اس کی حکومت محدود رہ گئی۔ تیونس سے جب منصور اس کے مقابلے پر بڑھا تو بہ ظاہر ایسا نظر آ رہا تھا کہ قیروان بھی چند لمحے کا مہمان ہے۔ اور یہ یا بھاگ جائے گا یا قتل ہو جائے گا۔

لیکن اس نے ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں کی، اپنی منتشر اور پراگندہ قوتوں کو مجتمع کرتا رہا۔ حوصلہ اور استقامت سے کام لیتا رہا۔ میدان سے پیچھے نہیں ہٹا۔ ڈٹ کر مقابلہ کرتا رہا، اور آخر کار ہر مرحلے میں کامیاب ہوا۔ ہر بغاوت فرو کر دی، ہر دشمن کو زیر کیا۔ تباہ کیا۔ قتل کر دیا۔ خوش قسمتی کی یہ انتہا تھی۔

صقلیہ کی فتح عظیم

لیکن قسمت نے ایسے شخص کے ہاتھوں ایک بہت بڑا کارنامہ بھی مقدر کیا تھا۔

۲۱۲ھ میں زیادۃ اللہ نے صقلیہ پر فوج کشی کی۔ ستر جہاز جمع کیے اور ایک بڑا لشکر قاضی اسد بن فرات کی سرکردگی میں روانہ کیا۔ جو بیک وقت میر سپاہ بھی تھے اور قاضی القضاۃ بھی۔

قاضی اسد بن فرات کے مقدس قدم صقلیہ میں پہنچے اور پھر تقریباً تین سو سال تک مسلمان اس خالص یورپین جزیرہ پر شان و شوکت اور جاہ و تجمل کے ساتھ حکومت کرتے رہے، قاضی صاحب کا یہ کارنامہ تمام تر زیادۃ اللہ کی اولوالعزمی کا نتیجہ ہے۔

عامر بن نافع

۲۱۳ھ میں زیادۃ اللہ کا ایک بہت بڑا دشمن اور باغی عامر بن نافع مر گیا، زیادۃ اللہ اس کی موت سے بہت خوش ہوا

اس نے کہا۔ "آج جنگ نے اپنے ہتھیار ڈال دیے"
لیکن جب عامر کی اولاد امان کی طالب ہوئی تو خلافِ عادت زیادۃ اللہ نے اسے پروانۂ امن عطا کر دیا۔

۲۱۸ھ میں فضل بن ابو عنبر نے علمِ بغاوت تونس سے بلند کر دیا اور زیادۃ اللہ کے رسالے کو شکست دے دی۔ زیادۃ اللہ کے حکم سے ابو قہر محمد بن عبد اللہ نے ایک بڑے لشکر کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا اور شکست دی۔ ۲۱۹ھ میں زیادۃ اللہ پھر تپھر سے موم بن گیا۔ اس نے تونس کے باغیوں کو معاف کر دیا۔

لطیفہ زیادۃ اللہ کی اس امان سے متاثر ہو کر عبد الرحمٰن نے (باغیوں کا ساتھی) ایک قصیدۂ مدحیہ پڑھا۔ حریف شاعر یعقوب نے چند شعر سنائے، ایک شعر کا مطلب یہ تھا کہ تلوار کا زخم مندمل ہو سکتا ہے زبان کا نہیں۔

زیادۃ اللہ نے اس جنگ کی طرف توجہ نہ کی، مگر سوال کیا۔
تم اب تک طالبِ امان کیوں نہ ہوئے؟
وہ بولا:
"میں احمقوں کی قوم میں رہتا تھا جو ایک دن کسی کو والی مقرر کرتے تھے اور دوسرے دن اسے معزول کر دیتے تھے۔ میں نے سوچا شاید کسی دن اپنی حماقت سے یہ مجھے والی بنا لیں۔"
زیادۃ اللہ ہنس پڑا۔ اور بات آئی گئی ہو گئی۔

احمد بن ابی محرز ۲۲۱ھ افریقیہ کے قاضی احمد بن ابی محرز نے انتقال کیا یہ بڑے زاہد شخص تھے، یہ زیادۃ اللہ سے اس کی ظلم آرائیوں کے سبب اس سے خفا رہتے تھے، چنانچہ مرتے وقت بھی انھوں نے یہ چاہا کہ زیادۃ اللہ ان کی نمازِ جنازہ نہ پڑھائے۔ لیکن زیادۃ اللہ کو ان سے بڑی عقیدت تھی۔ اس نے نماز پڑھانے کے بعد کہا:
"اے اہلِ قیروان! اگر خدا کو واقعی تمھاری بہتری اور بہبودی منظور ہوتی تو وہ ہرگز ابن ابی محرز کو تم سے الگ نہ کرتا۔" وہ کہا کرتا تھا۔

"مجھے قیامت کے دن اپنے گناہوں کی ذرا بھی پرواہ نہیں، کیونکہ میرے اعمال نامہ میں چار نیکیاں ایسی ہیں جو میرے سب گناہوں کا کفارہ بن جائیں گی۔

پھر اس نے واقعی اپنی قابلِ فخر نیکیاں گنوا دیں۔

۱: جامع قیروان کی تعمیر۔

۲: جسر (پل) ابی الربیع کی تعمیر۔

۳: سوسہ میں قلعہ کی تعمیر۔

۴: احمد بن ابی محرز کا منصبِ قضا پر تقرر۔

اور کوئی شبہ نہیں اس کی یہ نیکیاں بہت بڑی تھیں۔

۱۴۔ رجب ۲۲۳ھ میں زیادۃ اللہ کا انتقال ہو گیا۔ وفات کے وقت اس کی عمر صرف ۵۱ سال تھی۔ اس کی حکومت کا زمانہ ۲۱ سال ۷ ماہ اور ۸ دن ہے۔

صقلیہ (سسلی) پر مسلمانوں کے حملوں کی تاریخ جزیرۂ صقلیہ پر سب سے پہلے مسلمانوں نے امیر معاویہؓ کے عہدِ خلافت میں بسرداری عبداللہ بن قیس فزاری فوج کشی کی تھی۔ لیکن یہ فوج کشی ایک وقتی حملہ تھا جس سے رومیوں کو مرعوب کرنا مقصود تھا۔ یہ حملہ ۳۳ھ میں ہوا تھا۔ پھر ۸۵ھ میں موسیٰ بن نصیر گورنر افریقیہ نے بھی اسی قسم کی فوج کشی اس جزیرہ پر کی تھی۔ پھر ۱۰۲ھ میں خلیفہ یزید بن عبدالملک کے ایک سردار محمد بن ابو ادریس انصاری نے جزیرۂ صقلیہ پر حملہ کیا۔ اس کے بعد بشر بن صفوان کلبی نے ۱۰۹ھ میں خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے عہدِ حکومت صقلیہ پر حملہ کیا۔ ان تمام حملوں میں مسلمانوں کو فتوحات حاصل ہوئیں۔ اور وہ صقلیہ سے بہت سے قیدی اور مالِ غنیمت لے کر واپس ہوئے۔

۱۱۰ھ میں عبیدہ بن عبدالرحمٰن قیسی گورنر افریقیہ کے ایک سردار مستنیر بن حرث نے صقلیہ پر فوج کشی کی مگر سمندر میں طوفان کے برپا ہونے اور جہازوں کے ڈوب جانے سے یہ مہم ناکام رہی اور مستنیر راستے ہی سے بدقت تمام طرابلس واپس آیا۔ اس کے بعد ۱۲۲ھ میں عبیداللہ بن حجاب گورنر افریقیہ نے حبیب بن عبیداللہ کو مع اس کے بیٹے

عبدالرحمٰن بن حبیب کے صقلیہ کی طرف روانہ کیا۔ عبدالرحمٰن بن حبیب نے ساحل پر اتر کر فتوحات کا سلسلہ شروع کیا اور اندرونِ جزیرہ میں شہر سرقوسہ تک جو صقلیہ کا دارالسلطنت تھا، پہنچ گیا۔ حاکمِ صقلیہ نے عبدالرحمٰن بن حبیب کو جزیہ دینا منظور کیا۔ اور اطاعت و فرمانبرداری کا اقرار کرا کے عبدالرحمٰن سرقوسہ سے ساحل پر اپنے باپ حبیب بن عبیداللہ کے پاس واپس آیا۔ اس طرح جزیرۂ صقلیہ کو مفتوح و باجگزار بنا کر دونوں باپ بیٹے افریقیہ واپس آئے۔ مگر چند ہی روز بعد یہ جزیرہ اسلامی حکومت و سیادت کے دائرے سے خارج کر دیا گیا۔ یہ فتح بھی محض عارضی اور ہنگامی ہی تھی۔ ۱۳۵ھ میں ایک مرتبہ پھر حاکمِ افریقیہ نے اس جزیرہ پر فوج کشی کی۔ اس کے بعد ۲۱۲ھ تک مسلمانوں کو اس جزیرہ کی طرف متوجہ ہونے کا موقع نہیں ملا۔

قاضی اسد بن فرات نے سرقوسہ کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرہ کے دوران میں قاضی اسد بن فرات کا شعبان ۲۱۳ھ میں انتقال ہو گیا۔

لشکرِ اسلام نے قاضی اسد بن فرات کے انتقال پر محمد بن ابوالجواری کو اپنا سردار منتخب کیا اس کے بعد ہی عیسائیوں کی امداد اور مسلمانوں کے مقابلے کی غرض سے قسطنطنیہ سے فوجیں جنگی جہازوں میں آ گئیں سخت لڑائی ہوئی۔ لشکرِ اسلام نے اس نووارد فوج کو شکست دے کر بھگا دیا۔ اور محاصرہ کو سختی سے جاری رکھا۔ مگر اس کے بعد ہی لشکرِ اسلام میں وبا پھیل گئی۔ اس وبا کا حملہ عیسائی لشکر کے حملے سے زیادہ خطرناک اور مہلک ثابت ہوا۔ بہت سے آدمی ہلاک ہو گئے۔ مسلمانوں نے سرقوسہ سے محاصرہ اٹھا لیا اور اپنے مقبوضہ شہروں میں واپس آ کر ارادہ کیا لیکن قسطنطنیہ کے جہازوں نے ناکہ بندی کر لی۔ اسی حالتِ محاصرہ میں محمد بن ابوالجواری نے وفات پائی۔

مسلمانوں نے فوراً زہیر بن عوف کو اپنا سردار منتخب کر لیا۔ مقام مازر میں مسلمان عرصہ دراز تک اسی حالتِ محاصرہ میں رہے۔ اتفاقاً اندلس سے ایک بیڑہ جنگی جہازوں کا بہ قصدِ جہاد نکلا ہوا تھا۔ اور بحرِ روم میں گشت کر رہا تھا۔ صقلیہ کے ان مسلمانوں کو جو محاصرہ سے باہر تھے یہ حال معلوم ہوا اور انھوں نے اس اندلسی بیڑہ کے قریب پہنچ کر کسی نہ کسی طرح اسلامی

لشکر کی حالتِ سقیم سے مطلع کیا۔ اس بیڑہ سے فوراً تین سو کشتیاں ساحلِ صقلیہ پر بھیج دی گئیں۔ اور اندلس کے اسلامی لشکر نے ساحل پر اتر کر عیسائیوں کو مارنا اور قتل کرنا شروع کیا اور عیسائی محاصرہ اٹھا کر فرار ہو گئے۔ یہ واقعہ جمادی الآخر ۲۱۵ھ کا ہے۔ مسلمانوں نے اس محاصرہ سے آزاد ہوتے ہی پھر فتوحات کا سلسلہ جاری کر دیا۔ اندلسی بیڑہ تو اپنا کام کر کے واپس چلا گیا۔ اور افریقی اسلامی لشکر نے شہر پلرمو کا محاصرہ کر لیا۔ اور مفتوحہ شہروں پر از سرِ نو حکومت قائم کی۔ اسی عرصے میں افریقیہ سے بھی کمکی فوج کی کشتیاں پہنچ گئیں۔ اس سے پہلے جو فوج اسد بن فرات کے ہمراہ آئی تھی اس کی کُل تعداد دس ہزار سات سو تھی۔ جس میں دس ہزار پیدل اور سات سو سوار تھے۔ شہر پلرمو بھی فتح نہ ہوا تھا کہ ۲۱۸ھ میں افریقیہ سے محمد بن عبداللہ بن اغلب یعنی زیادۃ اللہ کا چچا زاد بھائی صقلیہ کا گورنر مقرر ہو کر آیا اور ۲۲۰ھ میں پلرمو اور قصریانہ وغیرہ شہروں کو رومیوں سے فتح کر لیا۔ جزیرۂ صقلیہ کا نصف جنوبی حصہ مسلمانوں کے قبضے میں تھا۔ اور نصف شمالی حصے میں عیسائیوں کی حکومت قائم تھی۔ انھیں قیصر روم کی طرف سے برابر امداد پہنچتی رہتی تھی۔ مگر مسلمان برابر اپنی فتوحات کو بڑھاتے اور جزیرہ میں اسلامی حکومت کو وسیع کرتے رہے۔ پلرمو کی فتح کے بعد سے جزیرۂ صقلیہ سلطنت اغلبیہ کا ایک صوبہ بن گیا۔ اور وہاں برابر یکے بعد دیگرے قیروان سے گورنر مقرر ہو کر آتے اور حکومت کرتے رہے۔ زیادۃ اللہ کے عہدِ حکومت کا سب سے بڑا اور شاندار کارنامہ جزیرۂ صقلیہ کا حکومتِ اسلامیہ میں شامل کرنا ہے۔ اس جزیرہ پر قریباً پونے تین سو سال تک مسلمانوں کی حکومت قائم رہی۔

زیادۃ اللہ کا جانشین زیادۃ اللہ کے بعد ابو عقال بن ابراہیم تختِ حکومت پر بیٹھا، یہ اچھا آدمی تھا، اس نے لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا، فوج کو دوست بنایا بہت سی بدعتیں جو جاری ہو گئی تھیں۔ انھیں مٹایا، فوج کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کیا، عمال کے مشاہرے وسیع کیے، انعامات دیے، صلے عطا کیے، رعایا پر عمال و حکام کی دست درازی کی روک تھام کی، نبیذ کے استعمال سے خرید و فروخت اور کاروبار پر پابندی عائد کر دی۔

لیکن زیادہ دلوں نہ جیا، ربیع الآخر ۲۲۶ھ میں بہ عمر ۵۳ سال۔ دو سال ۹ ماہ اور چند روز

حکومت کر کے اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

انقلابات و تغیرات

ابو عقال کا بیٹا ابو العباس محمد بن اغلب اس کا جانشین ہوا۔ اس نے امورِ حکومت زیادہ تر اپنے بھائی احمد کے سپرد کر دیے تھے ۲۳۱ھ میں دونوں بھائیوں میں چل گئی۔ پھر صلح کافی خوں ریزی کے بعد ہوئی، سال بھر بعد ۲۳۲ھ میں محمد نے بد عہدی کی اسے قید کر کے پھر جلاوطن کر دیا۔ وہیں اس کا انتقال ہو گیا۔

اس کے عہد میں بھی تیونس وغیرہ سے علمِ بغاوت بلند ہوا۔ لیکن اس نے باغیوں کو زیر کر لیا۔ اور عبرت انگیز سزائیں دیں۔

محمد بن اغلب کے زمانے میں متعدد بغاوتیں ہوئیں۔ لیکن اس نے انھیں دبانے اور باغیوں کا قلع قمع کرنے میں کامیابی حاصل کی۔

۳۶ سال کی عمر میں ۱۵ سال ۸ ماہ اور ۱۲ دن حکومت کرنے کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

(۲۴۲ھ) اس کے بعد اس کا بھتیجا ابو ابراہیم احمد اورنگِ حکومت پر متمکن ہوا۔ یہ بیس سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا، یہ خوش اخلاق، نیک افعال، سخی، شجاع، رحمدل اور نرم خو فرمانروا تھا۔ عمر نے وفا نہ کی۔ ۲۷ سال کی عمر میں ۱۳۔ ذی قعدہ ۲۴۹ھ میں وفات پا گیا۔ اس کے بعد زیادۃ اللہ ثانی بن محمد بن اغلب بن ابراہیم تخت نشین ہوا۔ یہ صرف ایک سال سات دن حکومت کرنے کے بعد ذی قعدہ ۲۵۰ھ میں وفات پا گیا۔ پھر ابو العزائیق اس کا جانشین ہوا۔ یہ ۲۶۱ھ میں وفات پا گیا۔ اس کے دور کا کوئی خاص کارنامہ قابلِ ذکر نہیں۔ اس کے بعد اس کا بھائی ابراہیم ثانی تختِ حکومت پر بیٹھا۔

ابراہیم ثانی نے ۲۶۳ھ میں شہر رقادہ کی تعمیر کا کام شروع کیا۔ ۲۶۴ھ میں ایک بہت بڑا اور شاندار محل بنایا جس کا نام "قصرِ فتح" رکھا۔

صقلیہ میں مسلمانوں کے حملے جاری تھے، ان کے جاری رکھنے میں اس نے مدد کی۔ سرقوسہ ۹ مہینے کے زبردست محاصرہ کے بعد اس کے زمانے میں فتح ہوا تھا۔

۲۶۶ھ میں افریقہ کو بہت بڑے قحط سے دوچار ہونا پڑا۔ ابراہیم کا دورِ حکومت بعض اعتبارات سے اور بعض واقعات کے لحاظ سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔

عہد ابراہیم ثانی کے لرزہ خیز حوادث

۲۶۷ھ میں احمد بن طولون کا بیٹا عباس اپنے باپ سے روگرداں ہو کر افریقہ کی طرف بڑھا کہ اسے فتح کرلے۔ اس کے ساتھ آٹھ سو سوار اور دس ہزار پیادے تھے، پانچ ہزار اونٹ ساتھ تھے، پیادے انہی پر سوار تھے۔ مصر کے بیت المال سے جو دولتِ کثیر وہ اپنے ساتھ لایا تھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صرف آٹھ سو تھیلیاں سونے کے انباروں کی تھیں، وہ اس لیے آیا تھا کہ بنو اغلب کو افریقہ سے نکال دے اور خود فرماں کا مالک اور حاکم بن جائے۔

ابراہیم کو جب اس یلغار کی اطلاع ملی تو وہ بھی کیل کانٹے سے لیس ہو گیا۔ اس نے احمد بن قرہب کو ڈیڑھ ہزار سوار دے کر مقابلے کے لیے روانہ کیا۔ وہ سب سے پہلے طرابلس پہنچا، یہاں اس نے بربروں کی ایک فوج مرتب کی اور عباس سے مقابلے کے لیے سدہ پہنچا ابن قرہب نے سدہ سے پندرہ میل آگے بڑھ کر عباس سے مقابلہ کیا۔ لیکن احمد بن قرہب غالب نہیں آیا۔ البتہ امیر طرابلس ابو منصور نے اس کے چھکے چھڑا دیے۔ اور وہ پسپا ہونے پر مجبور ہو گیا۔ اسی اثنا میں خود ابراہیم بھی فوج لے کر پہنچا۔ لیکن عباس بن احمد بن طولون بازی ہار چکا تھا۔ ابراہیم نے اس کے مال و دولت پر قبضہ کر لیا۔

ابراہیم ثانی کے دَور کا دوسرا واقعہ ثورۃ دراہم ہے۔ اس کی کہانی یہ ہے کہ ابراہیم نے صحیح معیار کے درہم مضروب کرائے اور پرانے درہم منسوخ کرائے۔

لوگوں کو یہ بات ناگوار گزری اور بغاوت پر آمادہ ہو گئے، ابراہیم نے اس بغاوت کو سختی سے دبایا۔ بہت سے لوگوں کو قید بھی کر لیا۔ پھر لوگوں کے جذبات کا لحاظ کر کے نئے دینار چلائے جن کا نام عاشرہ رکھا کیونکہ ہر دینار دس درہم کی قیمت کے برابر ہوتا تھا۔

لہو پکارے گا آستیں کا!

۲۸۰ھ میں ابراہیم کی زیادتیوں اور دراز دستیوں سے عاجز آکر کئی شہر اس کی اطاعت سے منحرف ہو گئے، یتونس، جزیرۂ اریس باجہ اور قموده نے اس کے خلاف بغاوت کر دی۔ ابراہیم نے بڑی سختی کے ساتھ اس بغاوت کو فرو کیا۔ لوگوں کے دلوں میں اس کے خلاف جو تلخی پیدا ہو گئی تھی وہ برابر قائم رہی۔

اسی سال کا ایک اور واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے:

ایک شخص ابوعبداللہ حجاز سے مصر ہوتا ہوا قیروان آیا اور یہیں رہ پڑا، یہ درحقیقت خدمتِ اہل بیت اطہار کا داعی تھا۔ اس نے معلمی کا پیشہ اختیار کیا اور بہت جلد ہر دلعزیزی حاصل کی۔ فرقے کا سب سے بڑا بہادر اور کثیر النفوس قبیلہ کتامہ خاص طور پر ابوعبداللہ سے متاثر ہوا۔ اب اس نے باقاعدہ لیکن خفیہ طور پر دعوت کا کام شروع کر دیا تھا۔ ابراہیم کے بے پناہ مظالم نے اس کے لیے زمین اور زیادہ ہموار کر دی۔ یہ امام معلوم کے شمائل و مناقب اس طرح بیان کرتا کہ جو سنتا تھا اسی کا ہو رہتا تھا۔ ابراہیم کو پتہ بھی نہیں چلا کہ اس کی جڑیں کھوکھلی ہو رہی ہیں، وہ نہایت اطمینان کے ساتھ ظلم کی چکی چلا رہا تھا اور ابوعبداللہ پوری یکسوئی کے ساتھ اپنی دعوت میں مصروف تھا۔

ابراہیم شروع میں جتنا نیک نفس تھا تکمیل اقتدار کے بعد اتنا ہی بدخو، سفاک اور بے رحم بن گیا۔

چند واقعات

۱: ۲۶۸ھ میں اہلِ عتاب پر حملہ کیا۔ انھیں اور ان کے بچوں کو قتل کر ڈالا۔

۲: ۲۷۶ھ میں اس نے عبداللہ بن احمد کو منصبِ قضاۃ سے معزول کر کے قید کر دیا۔ جیل میں زہر آلود کھانا کھلا کر ہلاک کر دیا۔

۳: اسی سال اپنے کاتب محمد بن حیون المعروف بہ ابن یزیدی سے خفا ہو کر اسے ایک تابوت میں بند کر دیا۔ اور اسی حالت میں اس نے جان دی۔

۴: ۲۷۷ھ میں اپنے حاجب نصر بن صمصامہ کو پانچ سو دُرّے لگوائے پھر گردن مار دی۔

۵: ۲۷۹ھ میں صرف لوگوں کو مرتا دیکھ کر خوش ہونے کے لیے افریقہ کے بہت سے لوگوں کو قتل کرا دیا۔ اپنے حاجب کو چابکوں سے پٹوا کر مروا ڈالا۔ نجومیوں کی بات بہت سنتا تھا، کسی نجومی نے کہہ دیا کہ تمھارا خادم تمھیں قتل کرے گا، بس پھر کیا تھا خادموں کے پرے کے پرے صاف کر دیے۔ پھر حبشیوں کو خادم بنایا، چند روز بعد شبہ میں انھیں بھی ہلاک کرا دیا۔

۶: ۲۸۰ھ میں بلزمہ کے سات سو شرفا کو اقادہ لے آیا اور یہاں ایک ایک کر کے سب کو قتل کر ڈالا۔

۷: ۲۸۲ھ میں میمون حبشی کو حکم دیا کہ تیونس جا کر بنو تمیم کو قتل کر ڈالے۔

۸: ۲۸۳ھ میں اپنے برادرِ عم زاد ابو عباس محمد بن زیادۃ اللہ کو قتل کر دیا، حالانکہ انھوں نے کوئی سرکشی نہیں کی تھی۔

۹: اپنے ایک بیٹے ابو الاغلب کو ہلاک کر دیا۔

۱۰: ایک لونڈی سے وہ رومال گم ہو گیا جس سے وہ مُنہ پونچھا کرتا تھا۔ تلاش کے بعد وہ ایک غلام کے پاس ملا، اس نے تین سو خادموں کو قتل کرا دیا۔

۱۱: اپنے آٹھ بھائیوں کو قتل کرا دیا اور خوش ہوا۔

۱۲: اپنی سولہ بیٹیوں کو قتل کرا دیا۔ جلاد نے تامل کیا تو کہا۔ اگر دیر کی تو پہلا نمبر تیرا ہو گا۔

۱۳: ایک مرتبہ بہت سے خادموں کو تنور میں ڈال کر سب کو دم پخت کر دیا۔

سر پر لٹکتی ہوئی تلوار کی دہشت

کہتے ہیں کہ ابراہیم شروع میں بہت اچھا آدمی تھا، پھر خلط سوداوی غالب آئی اور وہ نیم پاگل ہو گیا۔

۲۸۹ھ میں ابراہیم نے ابو عبداللہ کی دعوت کے پاؤں جمتے دیکھ کر اپنے جور و ستم سے توبہ کی اور کوشش کی کہ عامۃ الناس کو راضی اور اکابر کو اپنی طرف مائل کر لے۔ اس نے تمام مظلوموں کو رہا کر دیا ضمانتوں سے دست بردار ہوا۔ گیہوں کے بجائے جَو کھانے شروع کر دیے، جاگیرداروں کو ایک سال کی مالگزاری معاف کر دی۔ بہت سے غلاموں کو آزاد کر دیا، فقہائے قیروان کو بہت سا مال و اسباب ضعیفوں اور یتیموں میں تقسیم کرنے کے لیے دیا۔ پھر تخت سے دست بردار ہو کر اپنے بیٹے ابو عیال کو حکومت سونپ دی، اسی سال اس کا صقلیہ میں انتقال ہو گیا۔

لیکن حالات جب بگڑ جاتے ہیں تب اُن کا سُدھرنا بہت مشکل اور دشوار ہو جاتا

ہے۔ اور یہی بات ہمیں افریقہ اور مغربِ اقصیٰ کے اس دورِ حکومت میں بھی نظر آتی ہے، گاڑی جب اٹکی تو پھر آگے نہ بڑھ سکی۔ حالانکہ زور پورا لگایا گیا۔ لیکن ہر تدبیر الٹی پڑی، زندگی پر موت غالب آگئی!

شخصی حکومت کے یہی وہ مصائب اور نقائص ہیں جو اس کے خلاف سب سے بڑی اور مضبوط گواہی ہیں۔ شخصی حکومت میں بادشاہ مطلق العنان ہوتا ہے، کسی کو اس کے سامنے مجالِ دم زدن نہیں ہوتی۔ وہ مجرم کو نوازشوں سے مالا مال کر سکتا ہے اور بیگناہوں کو پھانسی کے تختے پر لٹکا سکتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسلام نے "شوریٰ" کا حکم دیا ہے۔ جو حکومت شوریٰ کی تابع ہوگی وہ کسی حالت میں بھی مطلق العنان نہیں ہو سکتی، نہ کتاب و سنّت کے دائرے سے قدم باہر نکال سکتی ہے، اس کا انعام اور اس کی تعزیر قوانینِ خداوندی کے ماتحت ہوگی۔

گیارھویں منزل

فاطمی عہدِ خلافت

مغربِ اقصیٰ، صقلیہ اور مصر وغیرہ

دولتِ اغالبیہ کا خاتمہ، نیا دور فاطمیوں نے کم و بیش تین سو سال تک حکومت کی۔ ان کا عہدِ حکومت تعمیری، اصلاحی، انتظامی، سیاسی، علمی اور ثقافتی اعتبار سے ایک مخصوص اور ممتاز حیثیت کا حامل ہے۔ یہ مدت اقوام وملل کی تاریخ میں کچھ ایسی زیادہ نہیں ہوتی۔ لیکن اس مختصر مدت میں بھی انھوں نے جو کارنامے انجام دیے ہیں وہ اتنے وقیع ہیں کہ انھیں فراموش نہیں کیا جاسکتا، اور یہ دیکھ کر اور زیادہ حیرت ہوتی ہے کہ انھیں اپنے مختصر عہدِ حکمرانی میں بہت سی قوتوں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ خارجی جو افریقہ میں ایک مستقل مقام حاصل کر چکے تھے فاطمیوں کے سخت و شدید دشمن تھے، ان سے معرکہ آرائیاں تواتر اور تسلسل کے ساتھ جاری رہیں۔ جس خاندان سے انھوں نے حکومت چھین لینی چاہی چھین لی۔ اس کے افراد سے، دوستوں اور ہوا خواہوں سے برابر انھیں جنگ کرنا پڑی۔ عباسی حکومت ظاہر ہے اس نئی حکومت کے وجود، جو احساسِ برتری کے ساتھ پردۂ وجود پر نمودار ہوئی تھی کسی طرح برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے بھی اسے فتح کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا، فاطمیوں کے مرکزِ حکومت کے

بالکل پڑوس میں اندلس میں اموی خلافت تھی۔ کھلی ہوئی بات ہے اس حکومت کے لیے فاطمیوں کی بڑھتی ہوئی قوت ایک مستقل خطرہ تھی۔ لہٰذا جب کبھی موقع ملا اسے فنا کرنے کی مساعی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اندرونی اور داخلی شورشیں مستزاد۔ لیکن ان تمام موانع اور مشکلات کے باوجود جب تک وہ خاندان مسند آرائے حکومت رہا اس نے زندگی کے مختلف شعبوں میں تیز قدمی کے ساتھ اصلاحات اور ارتقا کا سلسلہ جاری رکھا۔

فاطمی عہدِ حکومت ایک مستقل کتاب کا طالب ہے لیکن ہمیں اختصار سے کام لینا پڑے گا، لیکن ہماری کوشش ہوگی کہ کوئی اہم اور قابلِ ذکر واقعہ اس خاندان کی تاریخ کا نظر انداز نہ ہونے پائے۔

اب ہم مختصر طور پر اس خاندان کی تاریخ سے بحث کرتے ہیں۔

آخری اغلبی تاجدار

ابو مضر زیادۃ اللہ کی تخت نشینی کے بعد ابو عبد اللہ شیعی نے بڑھ کر شہر سطیف پر قبضہ کر لیا اور اس کی طاقت میں خوب اضافہ ہو گیا۔ ابو مضر عیش پرست اور پست ہمت شخص تھا۔ اس نے تیونس کو چھوڑ کر مقام رقادہ میں سکونت اختیار کی اور اپنے ایک سردار ابراہیم بن جیش کو ابو عبد اللہ شیعی کے مقابلے پر روانہ کیا۔ ابراہیم بن جیش ایک لاکھ فوج لے کر کتامہ کی طرف بڑھا۔ مقابلہ ہوا لیکن شکست ہوئی اور اس نے قیروان میں آکر دم لیا۔

ابو عبد اللہ شیعی نے شہر طبنہ کو فتح کر کے وہاں کے عامل فتح بن یحییٰ کو قتل کیا۔ جلد جلد ایک شہر کے بعد دوسرا شہر اس کے قبضے میں آتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ابو عبد اللہ نے شہر قمودہ پر قبضہ کر لیا۔

شہر قمودہ پر اس کے قبضے کا حال سن کر ابو مضر زیادۃ اللہ مقام رقادہ سے جہازوں میں مع اپنے مال و اسباب کے سوار ہو کر مشرق کی طرف چلا گیا۔ اول اس نے اسکندریہ میں اترنا چاہا۔ مگر وہاں حاکمِ مصر نے اترنے سے روک دیا۔ مجبوراً وہ ساحلِ شام پر اترا اور مقام رقہ میں

ا: ۲۹ سنہ ھ

مقیم ہوا اور وہیں فوت ہو گیا۔ ۲۹۶ھ میں ابو عبداللہ شیعی نے تمام حدود سلطنتِ اغلبیہ پر قبضہ کر کے عبید اللہ مہدی کے لیے لوگوں سے بیعت لی۔ اور اس طرح سلطنت اغلبیہ کا خاتمہ ہو کر دولت فاطمیین یا عبیدیین کی ابتدا ہوئی۔ اسی سال قیروان ورقادہ وغیرہ پر قابض ہو کر ابو عبداللہ شیعی نے ۲۹۷ھ میں حسن بن خزیر کتامی کو جزیرۂ صقلیہ کا گورنر مقرر کر کے روانہ کیا۔ ۲۹۹ھ میں صقلیہ والوں نے حسن بن خزیر کی بدخوئی سے تنگ آکر اس کو قید کر لیا۔ اور عبید اللہ مہدی کو معذرت کے ساتھ اطلاع دے کر دوسرا گورنر اپنے جزیرے کے لیے مقرر کرایا۔

فاطمیوں کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی، اور شروع میں ان کی حکومت کے استحکام میں یہ خصوصیت بہت زیادہ معین و مددگار رہی کہ وہ رعایا پر گورنروں اور حاکموں کو مسلط نہیں کرتے تھے۔ اگر یہ دیکھتے تھے کہ کسی حاکم یا گورنر سے رعایا خوش اور مطمئن نہیں ہے تو بے تامل اسے بے دخل کر دیتے تھے۔

خلفائے فاطمیین

عہد بعہد کے تاجدارانِ فاطمی، ان کے حالات اور ان کا جائزہ!

"امام" ظاہر ہو گیا امام جعفر صادقؓ کے زمانے سے اُن کے داعی یمن، افریقیہ اور مراقش میں مصروفِ کار تھے۔ اور لوگوں کو اس طرف متوجہ کر رہے تھے کہ عنقریب امام مہدی کا ظہور ہونے والا ہے اور وہ علوی فاطمی ہوں گے۔

ابوعبداللہ شیعی ۱۵۔ ربیع الاول ۲۸۸ھ[1] کو شہر کتامہ میں وارد ہوا۔ اور لوگوں کو امام مہدی کی آمد کا یقین دلانے لگا۔ چونکہ ابوعبداللہ شیعی سے پہلے بھی اس ملک میں علویوں کے داعی آ آ کر اس قسم کے خیالات کی اشاعت کر چکے تھے لہٰذا ابوعبداللہ کو زیادہ دقت پیش نہیں آئی۔ اہلِ کتامہ نے ابوعبداللہ شیعی کے لیے مقام فج الاخیار میں ایک مکان بنا دیا۔ یہ وہاں رہ کر لوگوں کو وعظ و پند کے ذریعے تعلیم دینے لگا۔ اس نے اہلِ کتامہ کو یقین دلایا کہ امام مہدی جس مقام پر آ کر قیام کریں گے اس مقام کا نام کتمان سے مشتق ہو گا اس لیے مجھ کو یقین کامل ہے کہ وہ یہی مقام کتامہ ہے اور جو لوگ امام مہدی کے اعوان و انصار ہوں گے وہ بہترین خلائق ہوں گے پس تم کو ان کا منتظر رہنا چاہیے۔ اور تمھارا فرض ہے کہ ہمہ اوقات امام مہدی کی حمایت و اعانت کے لیے مستعد رہو۔

پھر ابوعبداللہ کے فرستادوں نے عبیداللہ کے پاس پہنچ کر عرض کیا کہ ملک مغرب میں آپ

۱: ۲۸۹ھ۔

کی حکومت قائم ہو چکی ہے۔ اب تشریف لے چلیے۔ چنانچہ عبید اللہ جو عبید اللہ المہدی کے نام سے مشہور ہوا سلمیہ سے ان لوگوں کے ساتھ روانہ ہوگیا۔ عبید اللہ المہدی کے ہمراہ اس کا بیٹا ابوالقاسم اور ایک غلام بھی روانہ ہوا۔ ان سب نے سوداگروں کے ایک قافلے کی صورت میں روانگی کی۔ عباس خلیفہ مکتفی نے جاسوسوں سے اطلاع پاکر اسے گرفتار کرنا چاہا مگر ناکام رہا۔ اور عبید اللہ طرابلس پہنچ گیا۔ یہاں سے اپنے آنے کی خبر ابوعبداللہ کے پاس مقام کتامہ میں پہنچائی۔ مگر ابھی عبید اللہ اور ابوعبداللہ کے درمیان زیادۃ اللہ اغلبی حاکمِ افریقیہ حائل تھا اور اس کے پاس مصر سے خبر پہنچ گئی تھی کہ عبید اللہ ابوعبداللہ کے پاس جارہا ہے۔ لہٰذا زیادۃ اللہ نے جابجا عبید اللہ کی گرفتاری کا بندوبست کردیا۔ عبید اللہ نے طرابلس سے جس شخص کے ہاتھ اس کے آنے کی خبر ابوعبداللہ کے پاس بھجوائی تھی وہ ابوعبداللہ کا بھائی ابوالعباس تھا۔ جو مع دوسرے ہمراہیوں کے عبید اللہ کو لینے کے لیے بھیجا گیا تھا اور اس کے ساتھ سلمیہ سے آرہا تھا۔ ابوالعباس اتفاقاً راستے میں قیروان کے اندر گرفتار ہوگیا۔ زیادۃ اللہ نے اس کو جیل میں بھیج دیا۔ عبید اللہ مہدی کو جب ابوالعباس کے قیروان میں گرفتار ہونے کی خبر پہنچی تو وہ حواس باختہ ہوکر مقام قسطیلہ چلا گیا۔ وہاں بھی قیام مناسب نہ سمجھ کر مقام سجلماسہ میں پہنچا۔ سجلماسہ کا حاکم زیادۃ اللہ اغلبی کا خادم الیسع بن مدرار تھا۔ اس نے اوّل عبید اللہ کو ایک نووارد سوداگر سمجھ کر خاطر مدارات کی لیکن جب زیادۃ اللہ کا حکم پہنچا کہ یہی شخص عبید اللہ ہے اس کو گرفتار کرلو تو الیسع نے عبید اللہ کو فوراً گرفتار کرلیا۔ ابوالعباس قیروان کے جیل خانہ میں اور عبید اللہ مہدی سجلماسہ کے جیل خانے میں قید ہوکر تین چار سال تک قید کی سختیاں برداشت کرتے رہے۔ اس عرصے میں ابوعبداللہ شیعی نے اپنی حکومت و فتوحات کے سلسلے کو برابر جاری رکھا۔ یہاں تک کہ اس نے بیسیوں لڑائیوں اور معرکہ آرائیوں کے بعد شروع ۲۹۶ھ میں دو لاکھ فوج فراہم کرکے تیز رفتاری کے ساتھ پیش قدمی جاری رکھی اور ماہ رجب ۲۹۶ھ میں شہر قیروان کو فتح کرکے اپنے بھائی ابوالعباس کو جیل خانے سے نکالا۔ اور سجلماسہ کے قید خانے میں خفیہ طور پر ان فتوحات کی خوش خبری عبید اللہ مہدی کے پاس پہنچائی۔ ابوعبداللہ کی فوج میں کتامہ کے دو سردار خاص طور پر قابلِ تذکرہ تھے ایک عروبہ بن یوسف اور دوسرا حسن بن ابی خزیر۔ ابوعبداللہ نے قیروان

پر قابض و متصرف ہو کر وہاں کے مکانات و محلات اہل کتامہ پر تقسیم کر دئے۔ فتح کے بعد جب جمعہ آیا تو جامع مسجد کے خطیب نے پوچھا خطبہ میں کس کا نام لیا جائے ابو عبد اللہ نے کہا فی الحال کسی کا نام نہ لیا جائے اسکے بعد قیروان میں اپنے بھائی ابو العباس کو حاکم مقرر کر کے سجلماسہ کی طرف بڑھا۔ راستے میں جو جو قبائل آئے اکثر نے بخوشی اطاعت قبول کی، بعض راستے سے ہٹ گئے۔ سجلماسہ کے قریب پہنچ کر ابو عبد اللہ نے سجلماسہ کے حاکم الیسع بن مدرار کے پاس ایک خط بھیجا، اس خط میں بہت منت و سماجت اور فروتنی کے ساتھ درخواست صلح پیش کی۔ اس منت و سماجت اور صلح کی استدعا کا سبب یہ تھا کہ عبد اللہ مہدی اس کی قید میں تھا۔ اس لیے ابو عبد اللہ کو اندیشہ تھا کہ کہیں وہ عبید اللہ کو قتل نہ کر دے۔ ابو عبد اللہ کا قاصد خط لے کر جب الیسع بن مدرار کے پاس پہنچا تو اس نے قاصد کو قتل کرا دیا۔ خط کو چاک کر کے پھینک دیا۔ اور فوجیں آراستہ کر کے مقابلے کے لیے نکلا، مقابلہ ہوا۔ اور الیسع کی فوج شکست کھا کر بھاگی۔ الیسع اور اس کے ہمراہی بھی فرار ہوئے۔ ابو عبد اللہ نے فوراً شہر میں داخل ہو کر سب سے پہلے جیل خانے کا رخ کیا اور وہاں پہنچ کر عبید اللہ مہدی کو مع اس کے بیٹے ابو القاسم کے جیل خانے سے نکال گھوڑے پر سوار کیا تمام اراکین لشکر ہمراہ تھے۔ عبید اللہ مہدی کے پیچھے پیچھے ابو عبد اللہ تھا، فرط مسرت سے روتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا۔ ھٰذا مولاکم — ھٰذا مولاکم " (یہ تمہارا امام ہے۔ یہ تمہارا امام ہے) اسی طرح اپنے خیمے تک لایا۔ عبید اللہ کو تخت پر بٹھایا، خود بھی بیعت کی اور دوسروں سے بھی بیعت کرائی۔ اسی حالت میں الیسع بن مدرار پابہ زنجیر گرفتار ہو کر پیش ہوا۔ ابو عبد اللہ نے اس کے قتل کا حکم دیا اور وہ قتل کیا گیا۔

ابو عبد اللہ اور عبید اللہ چالیس روز سجلماسہ میں مقیم رہے پھر مغرب کی جانب روانہ ہوئے۔ ماہ ربیع الثانی ۲۹۷ھ میں رقادہ اور قیروان پہنچے۔ ابو عبد اللہ نے تمام مال و اسباب جو اب تک جمع کیا تھا عبد اللہ کی خدمت میں پیش کیا۔ اور عبید اللہ مہدی کی باقاعدہ بیعت خلافت ہوئی، خطبوں میں اس کا نام لیا گیا۔

اہل کتامہ نے شروع ہی سے ابو عبد اللہ شیعی کی مدد کی تھی۔ لہٰذا ان کا مرتبہ فوج اور انتظامی اراکین میں دوسروں پر فائق تھا۔ ابو عبد اللہ شیعی اور اس کا بھائی ابو العباس سلطنت

کے کاموں میں پیش پیش تھے۔ اور حق بھی یہی تھا کہ وہ امورِ سلطنت میں اوروں سے زیادہ دخیل ہوتے کیونکہ ابوعبداللہ ہی نے اپنی پامردی و جوانمردی سے اس عظیم الشان سلطنت کو پیدا کیا تھا۔ اسی نے خاندانِ اغالبہ کی بیخ کنی کی تھی۔ اسی نے عبیداللہ کو بلا کر بنی بنائی سلطنت کے تخت پر بٹھایا تھا۔

ابوعبداللہ اور ابوالعباس نے اقتدار ہاتھ میں لینے کے بعد ناروا حرکتیں شروع کر دیں۔ آخر کوئی چارہ کار نہ دیکھ کر عبیداللہ نے ۲۹۸ھ میں ان دونوں بھائیوں کو قتل کروا دیا۔ اس کے بعد عبیداللہ مہدی نے عروبہ کو باسنایہ کی اور حباسہ کو برقہ اور اس کے مضافات کی حکومت عطا کی اور اپنے بیٹے ابوالقاسم کی جو ابوالقاسم نزار کے نام سے مشہور ہے ولی عہدی کا اعلان کیا۔

۳۰۰ھ میں اہلِ طرابلس نے علمِ بغاوت بلند کیا۔ عبیداللہ نے ابوالقاسم کو اس طرف بھیجا۔ ابوالقاسم نے ایک طویل محاصرے کے بعد طرابلس کو فتح کیا۔ اور اہلِ طرابلس نے تین لاکھ دینار سرخ بطور تاوانِ جنگ وصول کیے۔

مصر و اسکندریہ پر فوج کشی

۳۰۱ھ میں ابوالقاسم نے جنگی جہاز فراہم کر کے اور ایک شائستہ فوج ہمراہ لے کر مصر و اسکندریہ پر فوج کشی کی۔ اس حملے میں حباسہ بن یوسف بھی اس کے ہمراہ تھا چنانچہ اسکندریہ پر قبضہ کر لیا۔ یہ خبر جب بغداد میں خلیفہ مقتدر عباسی کو پہنچی تو اس نے سبکتگین اور مونس غلام کو مع فوج اس طرف روانہ کیا۔ ان دونوں نے متعدد لڑائیوں کے بعد ابوالقاسم و حباسہ کو حدودِ مصر سے نکال دیا۔ اور عبیدی فوج قیروان کی طرف واپس چلی گئی۔ ۳۰۲ھ میں حباسہ نے دوبارہ اسکندریہ پر فوج کشی کی۔ مونس خادم نے کئی لڑائیوں کے بعد حباسہ کو بھگا دیا حباسہ کی سات ہزار فوج اس مرتبہ مقتول ہوئی اور حباسہ بہ مشکل جان بچا کر لے گیا۔

بغاوتِ صقلیہ کی خبر پا کر ۳۰۲ھ میں عبیداللہ نے حسن بن خزیر کو جنگی جہازوں کا ایک بیڑہ دے کر اہلِ صقلیہ کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ ادھر اہلِ صقلیہ کے سردار احمد بن قہرب نے سخت مقابلے کے بعد حسن بن خزیر کو شکست دے کر قتل کیا مگر اس کے بعد اہلِ صقلیہ

کو خوف پیدا ہوا کہ عبید اللہ کی مخالفت کے بعد ہمارا محفوظ رہنا دشوار ہے۔ انھوں نے خود ہی اپنے سردار احمد بن قہرب کو گرفتار کر کے عبید اللہ کے پاس بھیج دیا۔ اور اپنی خطاؤں کی معافی چاہی۔ عبید اللہ نے احمد کو قتل کرا دیا اور صقلیہ کی حکومت پر احمد بن موسیٰ ابن احمد کو مامور کر کے بھیجا۔

شہر مہدیہ کی تعمیر

۳۰۳ھ میں اس نے ساحلی علاقے کا دورہ کر کے سرزمین برکصورہ کے قریب ایک جزیرہ کو پسند کر کے وہاں ایک شہر کی بنیاد رکھی اور اس کا نام مہدیہ تجویز کیا۔ شہر مہدیہ کی شہر پناہ نہایت مضبوط بنوائی۔ دروازوں میں لوہے کے کواڑ لگوائے۔ ۳۰۶ھ میں اس شہر کی تعمیر تکمیل کو پہنچی اور عبید اللہ مہدی نے ہنس کر کہا۔ آج مجھ کو بنی فاطمہ کی طرف سے اطمینان ہوا کہ اب وہ دشمنوں کے حملوں سے محفوظ رہ سکیں گے۔ اسی سال اس نے کشتیاں بنانے کا ایک کارخانہ جاری کیا اور پہلے ہی سال نو سو کشتیاں تیار کرا کے ایک زبردست جنگی بیڑہ تیار کیا۔ ۳۰۷ھ میں اس نے اپنے بیٹے ابوالقاسم کو اسکندریہ پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ ابوالقاسم نے جاتے ہی اسکندریہ اور دریائے نیل کے ڈیلٹا پر قبضہ کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس کا حال جب بغداد میں خلیفہ مقتدر کو معلوم ہوا تو اس نے پھر مونس خادم کو فوج دے کر مصر کی جانب روانہ کیا۔ بہت سی لڑائیوں اور زور آزمائیوں کے بعد مونس کو فتح اور ابوالقاسم کو شکست حاصل ہوئی۔

۳۰۹ھ میں مراقش اور اس کے دوسرے صوبے بھی عبیدی حکومت میں شامل کر لیے گئے۔

ماہ ربیع الاول ۳۲۲ھ میں عبید اللہ مہدی اپنی حکومت کے چوبیس سال پورے کر کے فوت ہوا، اس کی جگہ اس کا بیٹا ابوالقاسم محمد مہدیہ میں تخت نشین ہوا۔ ابوالقاسم محمد نے اپنا لقب قائم بامر اللہ رکھا یعنی ابوالقاسم بامر اللہ ابوالقاسم نزار کے نام سے بھی مشہور ہے۔

خلیفہ نزار

ابوالقاسم نزار نے تخت نشین ہو کر اول تو ان معمولی بغاوتوں کو جو عبید اللہ کی وفات کی خبر سے برپا ہوئی تھیں فرو کیا۔ پھر مراقش کی طرف متوجہ

ہوا۔ یہاں موسیٰ بن ابی العافیہ آ کر پھر قابض ہو گیا تھا۔ ۳۲۲ھ تک سوائے فاس کے تمام ملکِ مراقش پر ابوالقاسم کی حکومت یا سیادت پھر قائم ہو گئی۔ اس کے بعد ابوالقاسم نے ابن اسحٰق نامی ایک سردار کو زبردست بحری فوج اور جنگی بیڑہ دے کر بحیرۂ روم کے شمالی ساحلوں پر تاخت وتاراج کرنے کے لیے روانہ کیا۔ ابن اسحق نے ساحل پر اتر کر شہر جنیوا تک تاخت وتاراج کر کے اسے فتح کر لیا۔ پھر وہاں سے رخصت ہو کر جزیرۂ سروانیہ کو فتح کیا۔ اس کے بعد ساحلِ شام کی طرف متوجہ ہوا۔ اور وہاں کے ساحلی علاقوں کو دھمکیاں دے کر ساحلِ شام پر جو کشتیاں ملیں ان کو جلا دیا۔ پھر ابن اسحٰق نے اپنے ایک خادم زیران نامی کو فوج دے کر ساحلِ مصر کی جانب روانہ کیا۔ زیران نے اسکندریہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد مصر سے اخشید کا لشکر آیا۔ اس نے ان لوگوں کو مار کر مغرب کی طرف بھگا دیا۔ ان واقعات کے بعد ابوالقاسم کو ابو یزید خارجی کے ہنگاموں سے کسی دوسری طرف متوجہ ہونے کی فرصت نہیں ملی۔

ماہِ جمادی الاوّل ۳۳۳ھ میں اہلِ کتامہ کو شکست دے کر ابو یزید نے بھگا دیا۔ اور دوسری فوجوں کو بھی جو ابوالقاسم کی حمایت میں مقابلے پر آئی تھیں شکست ہوئی۔ ابوالقاسم نے مہدیہ کو خوب مضبوط کر لیا تھا اور وہاں سامانِ رسد بہت کافی موجود تھا۔ ابو یزید نے حملہ کر کے مہدیہ کی شہر پناہ تک اپنی فوجوں کو پہنچا دیا مگر مہدیہ کے اندر داخل نہ ہو سکا۔ ابو یزید نے بار بار مہدیہ کا محاصرہ کیا۔ مگر مہدیہ کی فتح پر قادر نہ ہوا۔ ۳۳۴ھ میں ابو یزید مجبور ہو کر قیروان کی طرف لوٹا اور ابوالقاسم کی فوج نے مہدیہ سے نکل کر اس کے لشکر پر چھاپے مارنے شروع کر دیے۔

ربیع الاوّل ۳۳۴ھ میں ابو یزید کے بیٹے ایوب نے مہدیہ پر فوج کشی کی اور محاصرہ کر لیا اسی محاصرہ میں بماہ جمادی الثانی ۳۳۴ھ ابوالقاسم نے مہدیہ میں وفات پائی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ابو یزید نے شہر سوسہ کا محاصرہ کر رکھا تھا۔

خلیفہ منصور اسمٰعیل بن ابوالقاسم نے اپنے باپ کی وفات کے بعد تخت نشین ہو کر اپنا لقب المنصور رکھا۔ اس نے ایوب بن ابو یزید کا محاصرہ اٹھا دیا اور جہازوں کے ذریعے ایک فوج سوسہ کی امداد اور ابو یزید کا محاصرہ اٹھانے کے لیے روانہ کی

ابویزید نے کوشش کی کہ یہ بیڑہ ساحل پر فوج نہ اتارنے پائے مگر اس کی یہ کوشش بیکار ثابت ہوئی ـــ امدادی فوج نے ساحل پر اتر کر اور اہلِ سوسہ کے ساتھ شامل ہو کر ابویزید کا مقابلہ کیا۔ ابویزید کو شکست ہوئی، اس کا تمام لشکر گاہ لوٹ لیا گیا۔ وہ بحالتِ پریشانی قیروان کی طرف آیا۔ یہاں اس کی شکست کا حال سن کر اہلِ قیروان نے اس کے عامل کو قیروان سے نہایت ذلت دخواری کے ساتھ نکال دیا اور ابویزید کو شہر میں داخل نہ ہونے دیا۔ اور ابوالقاسم کی اطاعت کا اعلان کر دیا۔ ابویزید مجبوراً آسبیہ کی طرف روانہ ہوا۔ یہ واقعہ آخر ماہ شوال ۳۳۴ھ کا ہے۔ اس کے بعد اسمٰعیل بن ابوالقاسم قیروان میں آیا اور اہلِ شہر کو تسلی دی۔ ماہ ذیقعدہ ۳۳۴ھ میں ابویزید نے ایک زبردست فوج لے کر قیروان پر حملہ کیا۔ اسمٰعیل نے مقابلہ کیا۔ ۳۳۹ھ میں منصور نے خلیل بن اسحٰق کو جزیرۂ صقلیہ کی حکومت سے معزول کر کے حسین بن علی بن ابوالحسین کو صوبہ صقلیہ کی حکومت پر مامور کیا۔ اس کے بعد حسین بن علی کی اولاد نے بالاستقلال اس جزیرہ میں حکومت کی۔

۳۴۰ھ میں اسمٰعیل (منصور) نے ایک زبردست جنگی بیڑہ تیار کر کے حاکمِ صقلیہ حسین بن علی کو لکھا کہ تم بھی شاہی بیڑہ کے ساتھ مہم میں شامل ہونے کے لیے تیار رہو۔ چنانچہ حملہ کر کے ملک اٹلی کا جنوبی حصہ فتح کر لیا گیا۔ اور ۳۴۲ھ میں یہ فتح مند فوج مع مالِ غنیمت قیروان اور مہدیہ کی طرف واپس آئی جب کہ اسمٰعیل ماہِ رمضان ۳۴۱ھ میں فوت ہو چکا تھا۔

خلیفہ معز بن اسماعیل

اسماعیل کے بعد اس کا بیٹا معز تخت نشین ہوا اس کی تخت نشینی کے پہلے ہی سال مراقش کے بعض قبائل بربر نے اس کی حکومت قبول کر لی۔ ۳۴۲ھ میں معز نے حسین بن علی گورنر صقلیہ کو حکم بھیجا کہ اپنے جنگی جہازوں کے بیڑے کو لے کر اندلس کے ساحل مریہ پر حملہ کرو۔ چنانچہ حسین نے اس حکم کی تعمیل کی اور وہاں سے مالِ غنیمت اور قیدی لے کر واپس ہوا۔ اس کے جواب میں خلیفہ اندلس ناصر الدین اللہ نے اپنے خادم غالب کو ایک جنگی جہازوں کا بیڑہ دے کر حکم دیا کہ ساحلِ افریقیہ پر حملہ کرو۔ مگر معز کی فوج اور جنگی جہازوں نے پہلے ہی اس حملے کی روک تھام کا بندوبست کر رکھا تھا چنانچہ غالب کو واپس ہونا پڑا۔ اس کے بعد ۳۴۷ھ میں اندلسی بیڑہ نے ساحلِ افریقیہ پر کامیاب

حملہ کیا۔ اور تمام ساحلی مقامات اور شہروں کو تاخت و تاراج کیا۔ اور تباہ و ویران کر دیا اور بہت سے قیدی اور مالِ غنیمت لے کر واپس ہوا۔

فاطمیوں کا مصر پر قبضہ

۳۵۵ھ میں معز نے اپنے وزیر اور کاتب جوہر صقلی کو جو اس کا غلام رہ چکا تھا ایک زبردست فوج دے کر مصر کی طرف بڑھنے کا حکم دیا۔ جوہر راستے میں ہر مقام پر مناسب انتظام کرتا ہوا آہستگی مصر کی جانب بڑھا۔ اخشیدی فوج تاب مقاومت نہ لاسکی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۵۔ شعبان ۳۵۹ھ کو جوہر نے مصر میں داخل ہو کر جامع مسجد مصر میں معز کے نام کا خطبہ پڑھا۔ ماہ جمادی الاوّل ۳۵۹ھ میں جوہر نے جامع ابن طولون میں جاکر نماز ادا کی اور اذان میں حی علی خیر العمل کے اضافہ کرنے کا حکم دیا۔ یہ پہلی اذان تھی جو اس فقرے کے اضافے کے ساتھ مصر میں دی گئی۔ تمام ملک مصر پر قابض و متصرف ہو کر اور اخشیدی خاندان کے ارکان کو گرفتار کر کے مع تحف و ہدایا جوہر نے معز کی خدمت میں روانہ کیا۔ معز نے ممبرانِ خاندانِ اخشیدی کو مہدیہ کے جیل میں قید کر دیا۔ جوہر نے معز کی خدمت میں مصر آنے کی دعوت دی۔ معز نے خوش ہو کر دربار عام کیا۔ آخر شوال ۳۶۱ھ کو وہ اپنے دار الحکومت مہدیہ سے نکلا۔

فاطمیوں کا نیا شہر قاہرہ

اور تمام ساز و سامان اور لشکر لے کر مصر کی طرف روانہ ہوا۔ اور شعبان ۳۶۲ھ میں اسکندریہ پہنچا۔ اہلِ شہر نے استقبال کیا۔ اور عزت و احترام کے ساتھ شہر میں لے گئے۔ وہاں سے روانہ ہو کر ۵۔ رمضان ۳۶۳ھ کو قاہرہ میں داخل ہوا۔

قرامطہ سے جنگ

معز نے قاہرہ پہنچتے ہی قرامطہ کے بادشاہ اعصم کو جو اس زمانے میں اپنے دار الحکومت احساء میں مقیم تھا ایک خط لکھا۔ اس خط میں لکھا کہ تم لوگ پہلے ہمارے ہی باپ دادا کے منادی بنے پھرتے تھے اور ہماری محبت کا دعویٰ کرتے تھے اب مناسب یہی ہے کہ تم ہماری اطاعت و فرمانبرداری قبول کرو، اور ہمارے مقابلے اور مخالفت کا خیال بالکل ترک کر دو۔ یہ خط جب اعصم کے پاس احساء میں پہنچا

تو اس نے فوج کو تیاری کا حکم دیا۔ اور خود فوج لے کر مصر کی طرف روانہ ہوا۔ اور حدود مصر میں داخل ہو کر مقام عین شمس میں قیام کیا۔ یہاں تمام فوجیں قرامطہ کی آ آ کر جمع ہو گئیں۔ مگر بالآخر شکست کھائی۔ قریباً ڈیڑھ ہزار قرامطہ گرفتار ہوئے۔ معز نے فوراً اپنے سپہ سالار ابو محمود کو دس ہزار فوج دے کر قرامطہ کے تعاقب پر مامور کیا۔ چنانچہ ابو محمود نے ان کو کسی جگہ ٹھہرنے نہیں دیا۔ اور حدود مصر سے نکال کر احساء کی طرف چلے جانے پر مجبور کر دیا۔

دمشق پر معز کا حملہ

اس فتح کے بعد معز نے قرامطہ کے قیدیوں کو قتل کرا دیا۔ اور دمشق کی حکومت پر ظالم بن موہوب عقیلی کو نامزد کر کے اس طرف روانہ کیا۔ ظالم نے دمشق پہنچ کر قرامطہ کے عامل کو گرفتار کر کے مصر بھیج دیا۔ جہاں وہ جیل خانہ میں قید کر دیا گیا۔ ۳۶۴ھ تک دمشق پر دولت عبیدیہ کا پرچم لہرایا۔ اسی سال کے ایام حج میں مکہ و مدینہ کے لوگوں نے بھی معز کی حکومت تسلیم کی۔ اور اس کے نام کا خطبہ وہاں پڑھا گیا۔ ۳۶۴ھ کے آخر اور ۳۶۵ھ کے شروع میں افتگین نے جو عزالدولہ بن بویہ کے خدام میں سے تھا۔ دمشق پر قبضہ کر کے معز کے عامل کو وہاں سے نکال دیا معز یہ سن کر سخت طیش میں آیا۔ خود فوج لے کر قاہرہ سے دمشق کی جانب روانہ ہوا۔

ابھی مقام بلبیس ہی میں پہنچا تھا کہ ۱۵۔ ربیع الاول ۳۶۵ھ کو اس کے لیے پیغام مرگ آ پہنچا اور ۴۵ سال چھ مہینے کی عمر میں اپنی حکومت کے تیئسویں سال فوت ہوا۔ یہ عبیدیوں میں سب سے پہلا بادشاہ تھا جس نے مصر فتح کیا اور قاہرہ کو دارالسلطنت بنایا۔ یہ مقام مہدیہ میں ۱۱۔ رمضان ۳۱۹ھ کو پیدا ہوا تھا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا نزار تخت نشین ہوا۔ اور "عزیز باللہ" کا لقب اختیار کیا۔

خلیفہ عزیز باللہ

معز کی وفات کا حال سن کر افتگین نے فوجیں تیار کر کے حدود مصر پر فوج کشی کی اور مقام صیدا کا محاصرہ کر لیا۔ عکہ کو فتح کر لیا، اس کے بعد طبریہ پر چڑھائی کی اس پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد دمشق کی جانب واپس ہو گیا۔ عزیز بن معز نے اپنے وزیر یعقوب بن کلس کے مشورے کے موافق جوہر کاتب کو زبردست فوج دے کر افتگین کے مقابلے اور دمشق کی فتح کے لیے روانہ کیا۔ جوہر نے ماہ ذیقعدہ ۳۶۵ھ میں

دمشق کا محاصرہ کر لیا۔ اور طرفین سے لڑائیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا

دشمن کے ساتھ احسان اور حُسنِ سلوک محرم ۳۶۷ھ میں افتگین کی فوج کو شکست ہوئی۔ بیس ہزار آدمی میدانِ جنگ میں مقتول ہوئے، عزیز نے فتح مند ہو کر اعلان کرایا کہ جو شخص افتگین کو گرفتار کر کے لائے گا۔ اس کو ایک لاکھ دینار دیے جائیں گے۔ اس اعلان کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک شخص نے دھوکے سے افتگین کو گرفتار کرا کر ایک لاکھ دینار وصول کر لیے۔ عزیز کے سامنے جب افتگین پیش ہوا تو اس نے اس کی بڑی عزت کی۔ اور نہ صرف اپنا مصاحبِ خاص بنایا بلکہ وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ اس کو عطا کر کے اس کی خوب دلجوئی کی۔ عزیز افتگین کو لیے ہوئے قاہرہ چلا گیا۔ افتگین کی چونکہ سب سے زیادہ عزت و توقیر ہوتی تھی اور وہ وزیر اعظم بن گیا تھا لہٰذا سابق وزیر اعظم یعقوب بن کلس نے افتگین کو زہر دے کر مار ڈالا۔ عزیز کو جب یہ حال معلوم ہوا تو اس نے یعقوب کو گرفتار کر کے چالیس روز قید میں رکھا۔ اور پانچ لاکھ دینار جرمانہ وصول کیا۔ اس کے بعد پھر یعقوب کو قلمدانِ وزارت عطا کر دیا۔

۳۸۴ھ میں شاہِ قسطنطنیہ نے فوج کشی کی، رومی فوجوں کے دمشق کی طرف حرکت کرنے کا حال سن کر عزیز نے ۳۸۵ھ میں خود قاہرہ سے مع فوج دمشق کی جانب کوچ کیا۔ اور رومیوں کے خلاف جہاد کی منادی کرائی۔ مگر مقام بلبیس میں یہ پہنچ کر بیمار ہو گیا۔ آخر رمضان ۳۸۶ھ میں کئی ماہ بیمار رہ کر فوت ہوا۔ اور اس کا بیٹا ابو منصور باپ کی جگہ تخت نشین ہوا۔ اور حاکم بامر اللہ کا لقب اختیار کیا۔

خلیفہ حاکم بامر اللہ حاکم نے تخت نشین ہو کر امورِ سلطنت کا اختیار حسن بن عمار کتامی کے ہاتھ میں دے دیا۔ کتامیوں نے برسرِ اقتدار ہو کر ملک میں لوگوں کو بہت پریشان کیا۔

باغی کا قتل اسی اثنا میں ولید بن ہشام المعروف بہ ابو رکوہ نے خروج کیا۔ اس کا مختصر حال یہ ہے کہ جب اندلس میں منصور بن ابی عامر نے مستولی و متصرف ہو کر شہزادگانِ بنو امیہ کی گرفتاری و قتل کا سلسلہ شروع کیا تو بنو امیہ کے آخری خلیفہ کا بیٹا ولید

اپنی جان کے خوف سے چھپ کر قیروان چلا آیا تھا۔ یہاں چند روز رہ کر یمن ہمکہ وغیرہ ہوتا ہوا شام کے ملک میں آگیا۔ یہاں بد امنی کا دور دورہ تھا۔ اس نے موقع پا کر یہاں بنی امیہ کی خلافت کے لیے دعوت دینی شروع کی۔ اور ۳۹۷ھ میں اس ہنگامہ کا خاتمہ ہوا۔ اس زمانے میں حاکم نے ایک فرمان اس مضمون کا جاری کیا کہ جس شخص کا جی چاہے سنی مذہب اختیار کرے اور جس کا جی چاہے شیعہ مذہب قبول کرے۔ اسی طرح جس کا جی چاہے اذان میں حی علیٰ خیر العمل پکارے اور جس کا جی چاہے نہ پکارے۔ مذہب کے معاملے میں کسی پر کسی قسم کا تشدد نہ کیا جائے۔

حاکم کی موت

حاکم عبیدی تاثیر کواکب کا قائل اور علم نجوم کی جانب زیادہ مائل تھا۔ اس نے کوہ مقطم (متصل قاہرہ) پر ایک مکان بنوا رکھا تھا۔ وہاں کواکب کی روحانیت جذب کرنے اور اعمال عبادت بجالانے کے لیے تنہا جایا کرتا تھا۔ چنانچہ ۲۷ ماہ شوال ۴۱۱ھ کو حسب دستور رات کے وقت اپنے گدھے پر سوار ہو کر چلا، دو سوار ساتھ ہو لیے۔ اس نے تھوڑی دور چل کر یکے بعد دیگرے دونوں کو واپس کر دیا۔ اور خود کوہ مقطم کی جانب تنہا چلا گیا۔ چند روز تک واپس نہ آیا۔ ارکین سلطنت واپسی کے انتظام میں رہے۔ جب کئی روز گزر گئے تو ارکین سلطنت اس کی تلاش میں نکلے۔ کوہ مقطم پر چڑھتے ہی اول اس کی سواری کا گدھا دست و پا بریدہ مردہ ملا۔ اس کے بعد آگے بڑھے تو اس کا لباس ملا جس میں خون اور چھریوں سے زخمی کرنے کے علامات موجود تھے اس کی لاش نہیں ملی۔

حاکم شب پنجشنبہ ۲۳ ربیع الاول ۳۷۵ھ کو پیدا ہوا تھا۔ ۳۶ سال کی عمر میں فوت ہوا۔ حاکم کے قتل کا یقین ہو جانے کے بعد ارکین سلطنت نے حاکم کے نوعمر و نابالغ بیٹے علی کو تخت نشین کیا۔ علی کا لقب ظاہر الدین اللہ تجویز کیا گیا۔ اور امور جہانبانی ظاہر کی پھوپھی یعنی حاکم کی بہن ست الملک کے ہاتھ میں آئے۔

خلیفہ ظاہر بن حاکم

چار برس کے بعد ظاہر کی پھوپھی مر گئی۔ اور ظاہر ارکین سلطنت کی مدد سے حکومت کرنے لگا۔ ۴۲۰ھ میں

شام و دمشق پر صالح بن مرداس نے قبضہ کر کے عبیدی حکومت کو وہاں سے مٹا دیا۔ ظاہر نے زریری حاکمِ فلسطین کو اس طرف حملہ کرنے کا حکم دیا۔ زریری نے دمشق و شام پر قبضہ کیا مگر لڑائیوں اور بغاوتوں کا سلسلہ ملک شام میں برابر جاری رہا۔

خلیفہ مستنصر یہاں تک کہ ۱۵ شعبان ۴۲۷ھ کو ظاہر نے وفات پائی۔ اس کی جگہ اس کا بیٹا ابو تمیم معد تخت نشین ہوا۔ اس کا لقب مستنصر رکھا گیا۔ ظاہر کے زمانے میں ابو القاسم علی بن احمد وزیر اعظم تھا۔ اب مستنصر کے تخت نشین ہونے پر ابو القاسم وزیر السلطنت نے امور سلطنت کو اپنے ہاتھ میں لیا۔

مستنصر کے عہد حکومت میں ۴۳۳ھ میں شام و دمشق پر عرب قبائل نے قبضہ کر لیا۔ اور یہ ملک حکومت عبیدیہ سے نکل گیا۔ ۴۴۰ھ میں معز بن بادیس نے افریقیہ میں علم بغاوت بلند کیا۔ اور خلیفۂ بغداد کا خطبہ جاری کر دیا۔ اسی اثناء میں وزیر ابو القاسم کو مستنصر نے معزول کر کے حسین بن علی تازوری کو قلمدان وزارت عطا کیا۔

مستنصر کی ماں اپنے بیٹے سے جو حکم چاہتی تھی صادر کرا دیتی تھی۔ اس طرح اس کا اثر و اقتدار بہت ترقی کر گیا تھا۔ دوسری طرف وزرائے سلطنت اپنی حفاظت کو مدنظر رکھ کر شاہی فوج میں ترکوں کو بھرتی کرتے رہتے تھے۔ اس لیے فوج میں تین زبردست طاقتیں موجود تھیں۔ ایک غلاموں کی طاقت تھی، یہ لوگ تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ دوسرے کتامی اور بربری لوگ تھے ان کی تعداد کم تھی۔ تیسرا گروہ ترکوں کا تھا، یہ تعداد میں غلاموں سے کم تھے مگر جنگی استعداد ان میں زیادہ تھی۔ اتفاق سے ایک غلام ناصر الدولہ بن حمدان سوڈانی ترقی کر کے امراء و اراکین سب پر غالب ہو گیا اور اس نے مستنصر کو اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے حسب منشا امور سلطنت طے کرنے شروع کر دیے۔

بدر جمالی کی وزارت مستنصر نے اپنی حالت سقیم کو تبدیل کرنے کے لیے اپنے غلام بدر جمالی ارمنی الاصل کو جو عکہ میں برسر حکومت تھا اشارہ کیا۔ بدر جمالی نے عکہ میں ارمنی لوگوں کی بھرتی جاری کر دی اور ایک زبردست

ارمنی فوج لے کر براہ دریا جہازوں میں سوار ہو کر مصر میں داخل ہوا مستنصر کی خدمت میں حاضر ہوا مستنصر نے اس کو قلمدانِ وزارت عطا کیا۔ اور چند ترکوں کو سمجھایا کہ ناصر الدولہ نے تم کو بلاوجہ جنگ و جدل کی مصیبت میں پھنسایا۔ ترکوں نے خلیفہ کا یہ اشارہ پا کر اور اپنی آئندہ بہبود مدنظر رکھ کر ناصر الدولہ کو خود ہی قتل کر دیا۔ اب بدر جمالی ترکوں کا سردار بن گیا۔ بدر جمالی نے خوب طاقتور ہو کر اور سلطنت کے تمام شعبوں اور صیغوں پر مستولی ہوتے کے بعد وفاداری کے ساتھ سلطنت کے اعتماد و وقار کو بڑھایا، باغی سرداروں کو اطاعت پر مجبور کیا۔ جو شہر قبضے سے نکل گئے تھے، اُن کے فتح کرنے کی تدبیروں میں مصروف ہوا۔ طرابلس کو بھی عربوں سے چھین لیا۔ فلسطین کے تمام علاقے کو بھی حکومت میں شامل کیا۔ اور ایک لشکرِ جرار لے کر دمشق پر حملہ آور ہوا۔ مگر ناکام رہ کر واپس ہوا۔ اس کے بعد بھی کئی مرتبہ مصری فوجوں نے شام پر حملہ کیا مگر ناکام واپس ہوئیں۔ ۴۶۰ھ میں جزیرۂ صقلیہ کو عیسائیوں نے مسلمانوں کے قبضے سے نکال لیا۔ ماہِ ربیع الاول ۴۸۷ھ میں بدر جمالی نے اسّی سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس کے بعد ۸ ذی الحجہ ۴۸۷ھ کو مستنصر بھی فوت ہو گیا۔ مستنصر کا ابتدائی زمانہ بہت خطرناک تھا۔ اس کی سلطنت کے مٹنے اور دولتِ عبیدیین کے فنا ہونے میں کوئی کسر باقی نہ رہی تھی کہ بدر جمالی نے اس سلطنت کو برباد ہونے سے بچا لیا۔ مستنصر کے تین بیٹے تھے احمد۔ نزار۔ ابو القاسم۔

خلیفہ مستعلی

مستنصر کی وفات کے بعد محمد ملک نے مستنصر کی بہن کو اس بات پر رضامند کر لیا کہ تختِ سلطنت پر ابو القاسم مستعلی کو بٹھایا جائے، چنانچہ مستنصر کی بہن نے محمد ملک کی خواہش کے موافق ارا کینِ سلطنت کے سامنے اس بات کی گواہی دی کہ مستنصر نے اپنے بعد ابو القاسم کے تخت نشین ہونے کی وصیت کی ہے۔ چنانچہ لوگوں نے ابو القاسم کے ہاتھ پر حکومت کی بیعت کی۔ اور "مستعلی باللہ" کے لقب سے اسے تخت پر بٹھایا۔

بغاوت۔ شورش۔ جنگ

مستعلی کے تخت نشین ہونے سے تین روز بعد نزار قاہرہ سے روانہ ہو کر اسکندریہ چلا گیا۔

اسکندریہ میں بدرجمالی کا غلام نصیر الدولہ افتگین وہاں کا عامل وحکمراں تھا۔ وہ یہ سن کر کہ ابوالقاسم تخت نشین ہوا ہے باغی ہوگیا۔ اور نزار کو مستحق حکومت سمجھ کر اس کا موئد بن گیا۔ نصیر الدولہ نے اسکندریہ میں نزار کو تخت نشین کر کے اس کی بیعت کی اور "مصطفےٰ لدین اللہ" اس کا لقب مقرر کیا۔ یہ خبر قاہرہ میں پہنچی تو وزیر السلطنت محمد ملک فوج لے کر نزار کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوا اور جا کر اسکندریہ کا محاصرہ کرلیا۔ شدت محاصرہ سے تنگ آکر محصورین نے امن کی درخواست کی اور اسکندریہ محمد ملک کے سپرد کر دیا۔ وزیر السلطنت محمد ملک نے نزار کو گرفتار کر کے قاہرہ بھیج دیا۔ مستعلی نے نزار کو قتل کرا دیا۔ اس کے بعد وزیر السلطنت اپنے ہمراہ نصیر الدولہ افتگین کو لیے ہوئے قاہرہ پہنچا۔ مستعلی نے افتگین کو بھی قتل کرا دیا اس کے بعد کسیلہ نامی ایک شخص جو شہر صور کا والی تھا باغی ہوگیا۔ اس کی سرکوبی کے لیے فوج روانہ ہوئی۔ بڑی خوں ریزی کے بعد کسیلہ گرفتار ہو کر قاہرہ آیا اور مستعلی کے حکم سے مقتول ہوا۔

صلیبی لڑائیاں

۴۹۰ھ میں یورپ کے عیسائیوں نے جن میں بڑے بڑے بادشاہ بھی شامل تھے متحد ہو کر بیت المقدس کو مسلمانوں کے قبضے سے نکالنے کے لیے حملہ کیا۔ ان صلیبی حملہ آوروں نے آتے ہی انطاکیہ کا محاصرہ کرلیا۔ انطاکیہ میں ان دنوں ایک سلجوقی باغیسان نامی مامور تھا۔ وہ عیسائیوں کا مقابلہ نہ کرسکا اور انطاکیہ کو چھوڑ کر فرار ہوا۔ راستے میں کسی ارمنی نے اس کو مار ڈالا۔ اور سر اتار کر صلیبی لشکر میں لے آیا۔ انطاکیہ کے اس طرح نکل جانے اور باغیسان کے مارے جانے سے ملک شام میں ہلچل مچ گئی۔ کربوقا نامی سلجوقی سردار جو موصل کا والی تھا عیسائی حملہ آوروں کی طرف بڑھا۔ اور مرج وامق میں پہنچ کر پڑاؤ کیا۔ یہ سن کر وقاق بن تتش، سلیمان بن راتق طغتگین والی حمص بھی اپنی اپنی فوجیں لے کر بوقا کے پاس پہنچ گئے۔ اور سب مل کر انطاکیہ کی طرف عیسائیوں کے مقابلے کو بڑھے۔ عیسائی لشکر کے مقابلے میں ان مسلمان سرداروں کی متحدہ فوج بے حقیقت اور نہایت قلیل تھی۔ سخت معرکہ آرائی کے بعد مسلمانوں کو شکست ہوئی ہزارہا مسلمان شہید ہوئے اور عیسائیوں نے ان کے لشکرگاہ کو لوٹ لیا۔ اس کے

بعد عیسائیوں نے حمص پر قبضہ کرلیا۔ پھر عکّہ کا محاصرہ کرلیا۔ عکّہ کی ترکی سلجوقی فوج نے بڑی بڑی سختیاں برداشت کیں اور مدافعت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔

عیسائیوں نے ۲۳ شعبان ۴۹۲ھ کو چالیس روز کے محاصرہ کے بعد بیت المقدس کو فتح کرلیا۔ شہر میں گھس کر عیسائی فتح مندوں نے مسلمانوں کا قتل عام شروع کیا۔ مسلمانوں نے محراب داؤد علیہ السلام میں پناہ لی کہ یہاں عیسائی قتل سے باز رہیں گے۔ مگر انھوں نے وہاں بھی ان کو قتل کیا۔ مسجد اقصیٰ اور صخرۂ سلیمان میں ستر ہزار مسلمان شہید کیے گئے۔ مسجد اقصیٰ کا تمام سامان قندیلیں جو چاندی اور سونے کی تھیں سب لوٹ لیں۔ اس ہنگامہ میں لاتعداد مسلمان شہید ہوئے۔ بیت المقدس کے جس قدر مسلمان جو کسی نہ کسی طرح بچ کر بھاگ سکے وہ بحالتِ پریشان بغداد پہنچے اور وہاں عیسائیوں کے ان مظالم اور مسلمانوں کی بربادی کا حال خلیفۂ بغداد کو سُنایا۔ خلیفہ نے برکیارق، محمد، سنجر وغیرہ سلاطینِ سلجوقیہ کے پاس پیغام بھیجا کہ ملک شام کو بچاؤ مگر یہ آپس کی خانہ جنگیوں میں ایسے مصروف تھے کہ اس طرف متوجہ نہ ہوسکے۔ اور ملکِ شام کو عیسائیوں نے خاکِ سیاہ بنا ڈالا۔ یہ خبر سن کر مصر کا وزیر سلطنت مصر سے فوج لے کر چلا کہ بیت المقدس کو عیسائیوں سے چھین لے لیکن عیسائیوں نے اس کے آنے کی خبر سن کر آگے بڑھ کر مصری فوج کو شکستِ فاش دے کر بھگا دیا اور بھاگتے ہوؤں میں سے بھی کسی کو نہ بچنے دیا۔ چند آدمیوں کے ساتھ وزیر السلطنت مصر پہنچا۔ اس کے بعد عیسائیوں نے عسقلان کا محاصرہ کیا اور ہزار دینار تاوان لے کر وہاں سے واپس ہوئے

خلیفہ امر باحکام اللہ

۱۵ ماہ صفر ۴۹۵ھ کو مستعلی نے وفات پائی اور اس کا بیٹا ابو علی جس کی عمر پانچ سال کی تھی تختِ سلطنت پر بٹھایا گیا۔ اور "آمر باحکام اللہ" اس کا لقب مقرر کیا گیا۔

ابو علی کی تخت نشینی کے بعد مہماتِ سلطنت تمام و کمال وزیر السلطنت کے ہاتھ میں آگئے۔ اگرچہ پہلے بھی وہ سیاہ و سفید کا مختار تھا اور مستعلی اس کے خلاف کچھ نہ کرتا تھا۔

عیسائیوں سے لڑائی

۴۹۶ھ میں وزیر السلطنت نے فوجیں آراستہ کر کے اپنے باپ بدر جمالی کے غلام سعد الدولہ کی سرداری میں عیسائیوں

کے مقابلے کو روانہ کیں۔ مقام رملہ اور یافہ کے درمیان جنگ ہوئی۔ مصری فوجیں شکستِ فاش کھا کر بھاگ نکلیں۔ مقام رملہ اور یافہ کے درمیان جنگ میں مصریوں کے لشکر گاہ کو لوٹ لیا اور بہت سوں کو گرفتار کیا۔ وزیر السلطنت کو یہ حال معلوم ہوا تو اس نے اپنے بیٹے شرف المعالی کو ایک نہایت زبردست فوج دے کر روانہ کیا۔ رملہ کے قریب لڑائی ہوئی۔ اس معرکے میں عیسائیوں کو شکست ہوئی۔ شرف المعالی نے بڑھ کر رملہ کا محاصرہ کر لیا۔ پندرہ یوم کے محاصرہ کے بعد رملہ فتح ہوا۔ چار سو عیسائی مقتول اور تین سو گرفتار ہوئے۔ عیسائی سردار رملہ سے یافہ چلا گیا۔ اور بیت المقدس کی زیارت کے لیے جو عیسائی یورپ سے ابھی آئے تھے ان کو ہمراہ لے کر شرف الملک کی طرف بڑھا۔ شرف الملک عیسائیوں کے حملے کی خبر سن کر بلا جنگ مصر کی طرف چلا گیا۔ عیسائیوں نے آگے بڑھ کر عسقلان پر بلا مقابلہ و مقاتلہ قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد مصری فوج نے پھر حملہ کیا اور عسقلان کو عیسائیوں سے چھین لیا۔ یہ ذی الحجہ ۴۹۶ھ کا واقعہ ہے۔

اس کے بعد ۴۹۸ھ میں پھر ایک مرتبہ مصری فوجوں نے عیسائیوں پر حملہ کیا۔ اور دمشق کی ترکی فوج نے بھی مصری فوج کا ساتھ دیا مگر اس لڑائی کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ ساحلِ شام کے شہروں میں طرابلس۔ صور۔ صیدا اور بیروت مصری حکومتوں کے ماتحت تھے۔ ۵۰۳ھ میں عیسائیوں کے جنگی بیڑے آئے۔ اور انھوں نے ان تمام شہروں کو یکے بعد دیگرے فتح کر کے تمام ساحلِ شام پر اپنے قبضے کو مکمل کر لیا۔ عیسائیوں نے بیت المقدس کو فتح کر کے وہاں اپنا ایک بادشاہ مقرر کیا اور ملکِ شام کا جس قدر علاقہ انھوں نے فتح کر لیا تھا وہ سب بیت المقدس کی اس عیسائی سلطنت میں شامل ہوا۔ اس طرح ملکِ شام کے اندر ایک چھوٹی سی عیسائی سلطنت قائم ہو گئی تھی۔ اور وہ اس لیے بہت زبردست تھی کہ اس کو مسلسل برِ اعظم یورپ کے ملکوں سے فوجی و مالی امداد پہنچتی رہتی تھی۔

۵۱۵ھ میں آمر نے وزیر السلطنت کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو ناپسند کر کے اسے قتل کر دیا اور ایک دوسرا وزیر مقرر کر کے اس کو جلال الاسلام کا خطاب دیا۔ چار سال

کے بعد جلال الاسلام سے بھی ناراض ہوا۔ اور ۵۱۹ھ میں جلال الاسلام اس کے بھائی مؤتمن اور اس کے ہوا خواہ نجیب الدولہ کو بھی قتل کر دیا۔

خلیفہ حافظ الدین اللہ

آخر ۵۲۴ھ میں قرامطہ یا فدائیوں کے ایک گروہ نے سواری کے وقت حملہ کر کے آمر کو قتل کر دیا چونکہ اس نے کوئی بیٹا نہ چھوڑا تھا اس لیے اس کے چچازاد بھائی عبدالمجید نے تخت نشین ہو کر اپنا لقب "حافظ الدین اللہ" رکھا۔ لوگوں نے حافظ الدین اللہ کے ہاتھ پر اس شرط کے ساتھ بیعت کی کہ آمر کی حاملہ بیوی کے پیٹ سے اگر لڑکا پیدا ہوا تو وہ مستحقِ حکومت سمجھا جائے گا۔

حافظ مجید نے تخت نشین ہو کر یکے بعد دیگرے بہت سے وزیروں کے بعد اپنے بیٹے کو وزیر بنایا۔ اس نے بھی موقع پا کر باپ کے خلاف خود تخت نشین ہونے کی سازش و کوشش کی۔ آخر حافظ نے رضوان نامی ایک سنّی المذہب کو اپنا وزیر بنایا۔ کچھ دنوں کے بعد رضوان بھی مسلسل مخالفتوں کے باعث اس عہدے سے دستکش ہوا۔ یہ واقعہ ۵۴۳ھ کا ہے۔ اس کے بعد حافظ نے کسی کو اپنا وزیر نہیں بنایا۔

خلیفہ ظافر باللہ

آخر ۵۴۴ھ میں حافظ الدین اللہ ستر سال کی عمر میں فوت ہوا۔ اس کی جگہ اس کا بیٹا ابو منصور اسمٰعیل تخت نشین ہوا۔ اور "ظافر باللہ" اپنا لقب تجویز کیا۔

ظافر نے تخت نشین ہو کر عادل بن سالار والی بن اسکندریہ کو اپنا وزیر بنایا عادل نے نظم و نسق سلطنت اپنے ہاتھ میں لے کر ظاہر کو شاہِ شطرنج بنا دیا۔ ۵۴۸ھ میں عیسائیوں نے عسقلان کا محاصرہ کیا۔ اہلِ عسقلان نے محصور ہو کر دربار قاہرہ میں امداد و اعانت کی درخواست بھیجی، یہاں سے وزیر السلطنت عادل نے اپنے ربیب عباس بن ابی الفتوح کو فوج دے کر عسقلان سے عیسائیوں کا محاصرہ اٹھانے کی غرض سے روانہ کیا۔ عباس خود فوج لے کر بلبیس میں جا کر مقیم ہوا۔ ادھر عباس کے نوعمر بیٹے نصیر نے عادل کا سوتے ہوئے کام تمام کر دیا عادل کے قتل کی خبر سن کر عباس قاہرہ میں واپس چلا آیا۔ اور قلمدانِ وزارت اس کو سپرد ہوا اہلِ

عسقلان کی کسی نے خبر نہ لی۔ انھوں نے مجبور ہو کر اپنے آپ کو عیسائیوں کے حوالے کر دیا۔

سفاکانہ قتل نصیر نے ایک روز ماہ محرم ۵۴۹ھ میں ظافر کی ضیافت کی۔ ظافر نصیر کے یہاں آیا۔ نصیر نے ظافر اور اس کے ہمراہیوں کو قتل کرا کے اسی مکان میں دفن کر دیا۔ دوسرے دن وزیر السلطنت عباس بن ابی الفتوح حسب دستور قصر سلطنت میں گیا۔ اور خدام سے بادشاہ ظافر کو دریافت کیا۔ انھوں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ اس کے بعد عباس واپس چلا آیا۔ خدام محل سرا سے عباس کے واپس جانے پر ظافر کے بھائی جبرئیل اور یوسف کے پاس گئے اور ظافر کے نصیر کے مکان پر جانے اور وہاں سے اب تک واپس نہ آنے کا حال بیان کیا۔ یوسف اور جبرئیل نے کہا کہ تم اس کیفیت کو وزیر السلطنت عباس سے جا کر بیان کرو۔ خدام نے عباس کے پاس آ کر یہ حال سنایا۔ عباس نے کہا معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یوسف اور جبرئیل کی سازش سے بادشاہ ظافر قتل کیا گیا ہے چنانچہ اس نے فوراً ظافر کے اُن دونوں بھائیوں کو گرفتار کرا کر بلوایا اور فوراً قتل کرا دیا۔ ساتھ ہی حسن بن حافظ کے دونوں لڑکوں کو بھی قتل کرا دیا۔ اس کے بعد محل سرائے سلطانی میں جا کر ظافر کے بیٹے عیسیٰ ابو القاسم کو زبردستی گود میں اٹھا لایا۔ تخت سلطنت پر لا کر بٹھا دیا اور "فائز بنصر اللہ" کا لقب تجویز کر کے لوگوں سے بیعت لی۔ خاندانِ سلطنت کے پانچ آدمیوں کے اس طرح مقتول ہونے پر بیگماتِ سلطنت نے صالح بن رزیک کے پاس پوشیدہ طور پر ایلچی روانہ کیے۔ جو ان دنوں اشمونین وبنسہ کا عامل تھا۔ اور تمام حالات سے اس کو اطلاع دے کر عباس کی بیخ کنی کی درخواست کی چنانچہ صالح بن رزیک فوجیں فراہم کر کے قاہرہ کی طرف روانہ ہوا۔ عباس یہ دیکھ کر کہ اہل قاہرہ بھی میرے مخالف ہو گئے ہیں قاہرہ سے اپنے بیٹے نصیر اور اپنے دوست اسامہ بن منقذ کو ہمراہ لے کر اپنی خاص جمعیت کے ساتھ شام و عراق کے قصد سے روانہ ہوا۔ اثنائے راہ میں عیسائیوں سے مقابلہ ہو گیا لڑائی میں عباس کام آیا۔ نصیر گرفتار ہوا اور اسامہ بچ کر نکل گیا۔ اور ملک شام پہنچ گیا۔ عباس کے نکل جانے کے بعد صالح قاہرہ میں بماہ ربیع الثانی ۵۵۹ھ میں پہنچا۔ نصیر کے مکان میں سے ظافر کی لاش کو کھود کر نکالا اور شاہی قبرستان میں دفن کیا اور ظافر کے بیٹے فائز کی بیعت کی۔

فائز نے "ملک الصالح" کا خطاب دیا۔

خلیفہ فائز صالح نے وزیر السلطنت ہو کر امورِ سلطنت کا بندوبست شروع کیا۔ اس کے بعد عیسائیوں سے خط و کتابت کر کے نصیر بن عباس کو زرِ معاوضہ دے کر حاصل کیا۔ جب نصیر کو عیسائیوں نے روپیہ لے کر قاہرہ میں پہنچا دیا تو صالح نے اس کو قتل کر کے اس کی لاش کو عبرت کے لئے منظرِ عام پر لٹکا دیا۔ صالح امامیہ مذہب کا سختی سے پابند اور دولت عبیدیہ کا بڑا خیر خواہ تھا۔ اس نے نصیر کے قتل سے فارغ ہو کر ان سرکش سرداروں کی طرف توجہ مبذول کی۔ یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر دوسرے تمام سردار سہم گئے اور اطاعت و فرماں برداری کی گردنیں سب نے جھکا دیں۔ صالح نے قصرِ سلطنت کے دربان، خدام اور تمام آدمی اپنے آوردے مقرر کیے۔ اور پرانے آدمیوں کو ہٹا دیا۔ اس کے بعد تمام معاملات پر حاوی و مستولی ہونے کے بعد وہ قصرِ سلطانی کا قیمتی سامان بھی اپنے مکان میں لے آیا۔

خلیفہ عاضد چھ مہینے کی برائے نام حکومت کے بعد بادشاہ فائز عبیدی نے ۵۵۵ھ میں وفات پائی۔ وزیر السلطنت صالح بن زریک نے خدام کو حکم دیا کہ وہ خاندان سلطنت کے لڑکوں کو پیش کریں۔ تاکہ ان میں سے کسی ایک کو تختِ سلطنت کے لیے منتخب کیا جا سکے۔ چنانچہ ابو محمد عبداللہ بن یوسف بن حافظ عبیدی کو تختِ سلطنت پر بٹھا کر اس کا لقب عاضد الدین اللہ تجویز کیا۔ عاضد اس وقت سنِ بلوغت کے قریب پہنچ چکا تھا عاضد کو تختِ سلطنت پر بٹھا کر وزیر السلطنت صالح نے اپنی بیٹی کا نکاح اس کے ساتھ کر دیا۔

عاضد برائے نام بادشاہ سمجھا جاتا تھا۔ حقیقتاً بادشاہی وزیر السلطنت صالح کے ہاتھ میں تھی۔ یہ بات امرائے سلطنت کو گراں گزرتی تھی۔ ایک سوڈانی سردار نے موقع پا کر صالح پر نیزے کا وار کیا، وہ زخمی ہو کر گر پڑا اور اپنے مکان پر آ کر تھوڑی دیر کے بعد مر گیا۔ مرنے سے پہلے عاضد کو وصیت کر گیا کہ میرے بیٹے زریک کو وزیر السلطنت بنانا چنانچہ عاضد نے صالح کے بیٹے کو قلمدانِ وزارت سپرد کر کے "عادل" کا خطاب دیا۔ اس کے بعد عادل امورِ سلطنت کی انجام دہی میں مصروف ہوا۔ اس نے صعید کے والی شاور سعدی

کو معزول کر کے اس کی جگہ امیر بن رقعہ کو صعید کا والی مقرر کیا۔ شاور یہ خبر سن کر مقابلے پر مستعد ہو گیا۔ اور فوراً فوجیں لے کر قاہرہ کی طرف چل دیا۔ عادل اس کے مقابلے کی تاب نہ لا سکا، اور قاہرہ سے نکل بھاگا۔ شاور ۵۵۸ھ میں مظفر و منصور قاہرہ کے اندر داخل ہوا۔ رزیک عادل گرفتار ہو کر آیا اور ایک سالہ وزارت کے بعد مقتول ہوا۔ شاور آتے ہی دار الوزارت پر قابض و متصرف ہوا۔ عاضد نے اس کو وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ عطا کر دیا۔ نو مہینے کے بعد ضرغام نامی ایک شخص نے جو محل سرا کا داروغہ تھا قوت پا کر شاور کو قاہرہ سے نکال دیا اور خود دار الوزارت پر قابض ہو گیا۔ شاور مصر سے نکل کر شام کی طرف روانہ ہوا۔ ضرغام نے شاور کے بیٹے علی کو جو قاہرہ میں تھا گرفتار کر کے قتل کر دیا اور بہت سے امیروں کو جن سے اس کو مخالفت کا اندیشہ تھا قتل کیا۔

شاور اور نور الدین زنگی

شاور نے شام میں پہنچ کر ملک العادل نور الدین محمود زنگی کے دربار میں حاضر ہو کر مصر کے تمام حالات بیان کیے اور امداد کی درخواست کر کے یہ وعدہ کیا کہ اگر مجھ کو مصر کی وزارت پر پھر بحال کرا دیا گیا تو میں امرائے لشکر کی امدادی جاگیروں کے علاوہ مصر کے ایک حصے پر دولتِ نوریہ کا قبضہ کرا دوں گا۔ سلطان نور الدین نے بہت غور و تامل کے بعد اپنے سپہ سالار اسد الدین شیر کوہ کو ماہ جمادی الآخر ۵۵۹ھ میں شاور کے ساتھ مع ایک فوج کے بھیج دیا۔ اسد الدین کو ہدایت کی گئی کہ مصر پہنچ کر ضرغام کو معزول کر کے شاور کو وزارت کے عہدے پر بحال کر دیا جائے۔ اور جو کوئی اس کام میں مزاحم ہو اس سے جنگ کی جائے۔ شاور اور شیر کوہ کو مصر کی جانب روانہ کر کے سلطان نور الدین خود عیسائیوں کی طرف فوج لے کر روانہ ہو گئے۔ بلبیس کے مقام پر ضرغام کے بھائی ناصر الدین فخر الدین مصری فوج لے کر مقابلے پر آئے۔ شیر کوہ نے دونوں کو شکست دے کر گرفتار کر لیا اور فاتحانہ قاہرہ میں داخل ہوا۔ ضرغام وزارت چھوڑ کر بھاگ نکلا مگر راستے میں گرفتار ہو کر مقتول ہوا۔ اسی طرح ناصر الدین و فخر الدین بھی قتل کر دیے گئے، شاور پھر وزیر اعظم بن گیا۔

شاور کی بدعہدی

وزیر اعظم بن جانے کے بعد شاور نے شیر کوہ کے ساتھ بدعہدی کی اور اپنا کوئی وعدہ پورا نہ کیا۔ مجبوراً شیر کوہ مصر سے شام کی طرف واپس ہوا۔ اور شاور کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ شاور نے دولتِ نوریہ کی مخالفت میں عیسائیوں سے ساز باز شروع کر دیا۔ یہ حالت دیکھ کر شیر کوہ نے سلطان نور الدین سے اجازت لے کر ۵۶۲ھ میں مصر پر فوج کشی کی۔ مصر پر فوج کشی کرنا اس لیے دشوار کام تھا کہ راستے میں عیسائی مقبوضات میں ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔ مگر شیر کوہ اپنی فوجوں کو صاف نکال کر لے گیا۔ اور مصر کے بعض شہروں پر قبضہ کر لیا۔

شاور کی عیسائیوں سے سازش

شاور نے عیسائیوں سے امداد طلب کی عیسائی تو ایسے زریں موقع کے منتظر ہی تھے وہ فوراً شاور کی مدد کے لیے فوجیں لے کر مصر پہنچ گئے۔ شاور اور عیسائیوں کی متحدہ فوج کے مقابلے میں اسد الدین شیر کوہ کی مٹھی بھر فوج جس کی تعداد دو ہزار سے بھی کم تھی، کوئی حقیقت ہی نہ رکھتی تھی۔ مگر اس نے خدا پر بھروسہ کر کے مقابلہ کیا اور دونوں فوجوں کو شکست دے کر بھگا دیا۔ شیر کوہ کی مصر میں پہلے سے دھاک بیٹھی ہوئی تھی، وہ اپنے مقبوضہ علاقے پر مستقل بندوبست کرتا ہوا اسکندریہ کی طرف بڑھا۔ اہلِ شہر نے فوراً شہر حوالے کر دیا۔ شیر کوہ نے اسکندریہ میں اپنے بھتیجے صلاح الدین بن نجم الدین ایوب کو حاکم مقرر کیا خود صعید کی طرف بڑھا۔ وہ مصری فوجیں قاہرہ میں جمع ہو رہی تھیں، انھوں نے شیر کوہ کے اسکندریہ سے صعید کی طرف روانہ ہونے کی خبر سنتے ہی اسکندریہ پر حملے کی تیاری کی اور قاہرہ سے کوچ کیا۔ شیر کوہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ مصریوں اور عیسائیوں نے متفقہ طور پر اسکندریہ پر حملہ کیا ہے تو وہ اپنے بھتیجے صلاح الدین کی امداد کے لیے فوراً اسکندریہ کی طرف لوٹا۔ شاور نے شیر کوہ کے پاس پیغام بھیجا کہ تم ہم سے تاوانِ جنگ وصول کر لو اور اسکندریہ کو چھوڑ کر اپنے ملک کو واپس چلے جاؤ۔ تمام حالات اور نتائج و عواقب پر غور کرنے کے بعد شیر کوہ نے شاور کی اس درخواست کو قبول کر لینا ہی مناسب سمجھا۔ چنانچہ وہ اسکندریہ چھوڑ کر اور تاوانِ جنگ لے کر شام کی طرف واپس ہوا۔

عیسائیوں کے شرائط

یہ واقعہ ۵۶۲ھ بماہ ذیقعدہ وقوع پذیر ہوا۔ شیرکوہ کے واپس چلے جانے کے بعد عیسائی لشکر نے مصر میں مستقل قیام کرنے اور عیسائیوں نے مصر پر قبضہ کرنے کی بنیاد ڈالی۔ چنانچہ انھوں نے شاور کے سامنے مندرجہ ذیل شرائط پیش کیے اور شاور نیز عاضد کو وہ شرائط قبول و منظور کرنے پڑے:

۱: عیسائی فوجیں قاہرہ میں مقیم رہیں گی۔

۲: عیسائیوں کی طرف سے ایک ناظم قاہرہ میں رہا کرے گا۔

۳: شہر پناہ کے دروازوں پر عیسائیوں کا قبضہ رہے گا۔

۴: حکومتِ مصر ایک لاکھ دینار سالانہ بیت المقدس کے عیسائی بادشاہ کو ادا کیا کرے گا۔

جب اس طرح عیسائیوں نے مصر میں اپنے قدم جما لیے تو انھوں نے سلطنتِ مصر کے کاموں میں دخل اندازی شروع کی، بلبیس کو عیسائی حکومت میں شامل کر لیا پھر دارالسلطنت قاہرہ پر قبضہ کرنے پر آمادہ ہو گئے اور شاور کو اپنا طرف دار بنا کر عیسائی فوجیں بڑی تعداد میں بلوالیں اور بجائے ایک لاکھ دینار کے دو لاکھ دینار اور بہ مقدار کثیر غلے کا مطالبہ کیا۔ عاضد بادشاہِ مصر کو یہ دیکھ کر بہت فکر ہوئی۔

خلیفہ عاضد اور سلطان زنگی

اس نے ایک قاصد سلطان نورالدین محمود کے پاس بھیجا۔ اور درخواست کی کہ عیسائیوں کو جو مصر پر مستولی ہو گئے ہیں خارج کرنے میں مدد کیجیے اور بلا توقف فوجیں بھیجیے۔ شاور کو جب یہ حال معلوم ہوا کہ عاضد نے سلطان نورالدین سے امداد طلب کی ہے تو اس نے عاضد کو سمجھانے اور اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی اور کہا کہ ترکوں کے مقابلے میں عیسائیوں کا باجگذار بن جانا اچھا ہے۔ مگر عاضد نے اس کو کوئی جواب نہیں دیا۔ سلطان نورالدین محمود نے اپنے سپہ سالار شیرکوہ کو تیاری کا حکم دیا۔ اور اس کے ساتھ اس کے بھتیجے صلاح الدین اور دوسرے سرداروں کو بھی روانہ کیا۔ چنانچہ اسدالدین شیرکوہ مع لشکر و سرداران فوج مصر کی جانب روانہ ہوا۔ ماہ جمادی الاول ۵۶۴ھ میں قاہرہ

کے قریب پہنچا۔ عیسائی لشکر یہ سنتے ہی قاہرہ سے فرار ہوا۔ شیر کوہ نے عیسائی لشکر گاہ کو لوٹا اور بادشاہِ عاضد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عاضد نے شیر کوہ کو خلعت عطا کیا اور بڑی عزت کے ساتھ پیش آیا، شیر کوہ اور اس کے لشکر کو مہمان رکھا۔ اور ایک روز موقع پاکر شیر کوہ سے کہا کہ شاور چونکہ عیسائیوں کا خیر خواہ اور ہمارا دشمن ہے اس کو قتل کر دو۔ چنانچہ شیر کوہ نے اپنے سرداروں کو شاور کے قتل کرنے کا حکم دیا۔ اور شاور کا سر اتار کر عاضد کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ عاضد نے شیر کوہ کو وزارت کا عہدہ دے کر "امیر الجیوش" اور "منصور" کا خطاب دیا۔ ۵۶۵ھ میں شیر کوہ کا انتقال ہو گیا۔

صلاح الدین مسندِ وزارت پر

عاضد نے اس کے بھتیجے صلاح الدین کو عہدۂ وزارت عطا کیا۔ شیر کوہ کی وزارت سے عاضد بہت خوش تھا اور تمام سیاہ و سفید کا اختیار اس کو دے دیا تھا۔ اسی طرح صلاح الدین کو بھی کلی طور پر اختیاراتِ حکمرانی حاصل تھے۔ شیر کوہ اور صلاح الدین دونوں امام شافعی سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ صلاح الدین ایوب نے شیعہ قاضیوں کو موقوف کر کے شافعی قضاۃ مامور کیے۔ مدرسۂ شافعیہ اور مدرسۂ مالکیہ کی بنیاد رکھی۔ ۵۶۴ھ میں جب شیر کوہ نے عیسائی فوجوں کو مصر سے نکال کر خود بہ طور وزیر اعظم مصر کا انتظام شروع کیا تو عیسائیوں کو وہ خراج ملنا بھی موقوف ہو گیا جو وہ مصر سے حاصل کرنے لگے تھے۔

عیسائیوں نے یورپ سے ہر قسم کی امداد پاکر اور خوب طاقتور ہو کر ۵۶۵ھ میں دمیاط کا محاصرہ کر لیا۔ دمیاط کے عامل شمس الخواص منکور نامی نے صلاح الدین ایوب کو مطلع کیا۔ ادھر مصر میں شیعہ لوگ وزیر السلطنت صلاح الدین ایوب سے ناراض تھے۔ صلاح الدین ایوب نے ایک افسر بہاء الدین قراقوش کو فوج دے کر دمیاط کی طرف بھیجا اور سلطان نور الدین محمود کو بھی لکھا۔ سلطان نور الدین محمود نے فوراً دمیاط کی جانب تھوڑی سی فوج بھیجی اور عیسائیوں کی توجہ اور طاقت کو تقسیم کرنے کے لیے ساحلِ شام کے عیسائی علاقوں پر حملہ آوری شروع کر دی۔

صلاح الدین کے ولولے

اس کے بعد سلطان صلاح الدین نے اپنے باپ نجم الدین ایوب کو ملک شام سے مصر میں بلوایا۔ بادشاہِ عاضد خود نجم الدین ایوب

سے ملنے آیا۔ اور بہت کچھ تواضع و مدارات کی۔ بادشاہ عاضد ہمیشہ سلطان صلاح الدین کے کاموں کا مداح رہتا تھا۔ اور خود اس نے امورِ سلطنت سے بے تعلقی اختیار کر لی۔

سلطان نور الدین محمود پہلے سے صلاح الدین ایوب کو لکھتے رہتے تھے کہ تم مصر میں خلیفہ بغداد کے نام کا خطبہ پڑھواؤ مگر صلاح الدین یہ معذرت پیش کر دیتا تھا کہ اگر عاضد کا نام خطبے سے نکال دیا گیا تو اندیشہ ہے کہ مصر میں سخت فساد اور فتنہ برپا ہو جائے۔

خلیفہ عباسی کا خطبہ سلطان العادل نے پھر صلاح الدین کو لکھا کہ عاضد کے نام کا خطبہ موقوف کر کے خلیفہ مستضئ عباسی کے نام کا خطبہ پڑھواؤ۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ بادشاہ عاضد بیمار اور مرض الموت میں گرفتار تھا۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل میں محرم ۵۶۷ھ کے پہلے جمعہ کو جامع مسجد قاہرہ کے ممبر پر بغداد کے عباسی خلیفہ کا خطبہ پڑھا گیا۔ اور کسی شخص نے اس کو ناپسند نہ کیا۔ اگلے جمعہ کو صلاح الدین کے گشتی فرمان کے موافق تمام ملک مصر کی مسجدوں میں خلیفہ بغداد کا خطبہ پڑھا گیا۔

اسی عرصے میں ۱۰ محرم ۵۶۷ھ کو بادشاہِ عاضد نے وفات پائی۔ صلاح الدین نے دربارِ عزا منعقد کیا اور قصرِ سلطانی کے تمام مال و اسباب کا جائزہ لیا، اس کے ساتھ ہی دولتِ فاطمی کا خاتمہ ہو گیا۔ اور ملک مصر پھر خلافتِ عباسیہ بغداد کی حدود میں داخل ہوا۔ صلاح الدین ایوب کے نام خلیفۂ بغداد کی طرف سے حکومتِ مصر کی سند خطاب سلطانی اور خلعت و علم آ گیا۔ اور دولت عبیدیین کے بعد مصر میں دولتِ ایوبیہ کی ابتدا ہوئی۔

عہدِ خلافتِ فاطمیؓ پر ایک نظر

پونے تین سو سال کی اس مدت میں ہر طرح کی دراندازیوں، مخالفتوں، بغاوتوں، لڑائیوں، ریشہ دوانیوں اور سازشوں کے باوجود فاطمی خلفاء نے عظیم و جلیل کارنامے انجام دیے جن کے آثار و نقوش اب بھی موجود ہیں اور شاید ابھی بہت دنوں تک باقی رہیں گے۔

فاطمی خلفاء نے اپنے دورِ سطوت و اقتدار میں جو کارنامے انجام دیے جستہ جستہ ان کا ذکر مختلف خلفاء کے سلسلے میں ہو چکا ہے، لیکن اگر ان کے کارناموں کو مختصر طور پر ہم زیرِ نظر لانا چاہیں، تو تاریخ کی روشنی میں کہہ سکتے ہیں کہ:

۱: **دارالحکمت** یہ محکمہ قائم کر کے علم و فن کی گراں بہا خدمت خلفائے فاطمیین نے انجام دی۔

یہ دارالحکمت بیک وقت دارالترجمہ بھی تھا اور دارالتصنیف بھی، لیکن دارالترجمہ زیادہ اور دارالتصنیف کم۔ یہاں دور دراز مقامات کے علماء و فضلاء، ماہرینِ علوم و فنون، مختلف اکابر بلا تفریقِ رنگ و نسل بلائے گئے۔ ان سے کام لیا گیا۔ اور انھیں زیادہ سے زیادہ معاوضہ دیا گیا۔ جن علوم کی کتابیں یہاں سے منظرِ عام پر آئیں، یوں تو وہ جملہ فنون پر حاوی تھیں لیکن فلسفہ و فلکیات وغیرہ پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا گیا۔

۲: رواداری دُنیا کے مذاہب میں صرف اسلام ہی وہ مذہب ہے جو دوسرے مذاہب کا احترام کرتا ہے اور ادیانِ غیر کے ماننے والوں کو تمام شہری حقوق عطا کرتا ہے اور ان کے پرسنل لا میں کسی طرح کی مداخلت نہیں کرتا اور ان میں جو اہل اور صاحبِ استعداد و صلاحیت ہوں ان کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

فاطمی خلفاء نے رواداری کا نہایت شاندار مظاہرہ کیا۔

ان کے دورِ حکومت میں غیر مسلموں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ رواداری برتی گئی۔

انھیں اعلیٰ ترین مناصب پر فائز کیا گیا۔ ان کے اعزاز و توقیر میں کسی طرح کی کمی نہیں کی گئی۔ بعض خلفاء نے اس پالیسی سے انحراف کیا۔ لیکن یہ یک طرفہ اقدام نہیں تھا۔ اس رواداری کے بعد بھی جب ان کے رویئے میں کوئی تبدیلی نہ دیکھی تو اس کا ردِ عمل ہونا لازمی تھا۔

۳: صنعت اس شعبے میں بھی فاطمی عہدِ خلافت اگر یکتا اور بے ہمتا نہیں تو ممتاز اور شاندار ضرور ہے۔ اس عہد میں صنعتوں کو ترقی ہوئی۔ نئی نئی صنعتیں عالمِ وجود میں آئیں، کاریگروں، صناعوں اور ہنرمندوں کی زیادہ سے زیادہ افزائی اور قدر دانی کی گئی۔

۴: تعمیرات اسی طرح تعمیرات کا جہاں تک تعلق ہے فاطمی خلفاء نے بڑی بڑی اور شاندار عمارتیں تعمیر کیں۔ نئے نئے اور شاندار شہر بسائے؛ مسجدیں بنائیں، مدرسے تعمیر کیے، دانش کدے بنائے۔

قاھرہ عہد فاطمی سے اب تک مصر کا دارالحکومت چلا آرہا ہے۔ یہ شہر فاطمیوں ہی کا شاہکار ہے۔ خلیفہ معزلدین اللہ جب فتح مصر کے بعد شمالی افریقہ سے اپنے نئے مفتوحہ ملک مصر کی طرف روانہ ہوا تو اس کے آنے سے پہلے اس کا وزیر اعظم جو کبھی اس کا غلام رہ چکا تھا اور اب وزیر اعظم تھا اور میر سپاہ بھی ـــ جوہر صقلی ـــ آقا کے لیے نیا دارالخلافہ تعمیر کر چکا تھا۔ اس شہر کے حسن و رعنائی کے لیے مسلمانوں نے اور مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم یوربین سیاحوں اور مؤرخوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ اور کوئی شبہ نہیں اس کی بنا ایسی مبارک ساعت میں پڑی تھی کہ آج تک نہ صرف اس کی رونق اور گہما گہمی میں کوئی فرق نہیں آیا

بلکہ اس میں برابر اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے۔

۵: تعلیم فاطمی خلفاء نے تعلیم عام کردی تھی اور عام لوگوں کو حصولِ تعلیم میں اتنی زیادہ سہولتیں عطا کی تھیں کہ علم کا حاصل کرنا ذرا بھی دشوار اور کٹھن کام نہیں رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں علماء بہ تعداد کثیر پیدا ہوئے۔ اور انھوں نے علم و دین کے شاندار خدمات انجام دیے۔

جامعۂ ازہر کے نام سے کون پڑھا لکھا شخص ناواقف ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ بات بہت سے لوگوں کو نہیں معلوم کہ جامعۂ ازہر بھی فاطمی خلافت کا لازوال اور بے مثال کارنامہ ہے یہ یونیورسٹی اپنے وقت میں بھی عالمِ اسلام کی سب سے بڑی یونیورسٹی تھی اور آج بھی عالمِ اسلام میں کہ بہت سے عرب ملکوں میں پیٹرول اُبل رہا اور سُن برس رہا ہے جامعۂ ازہر کی ٹکر کی کوئی یونیورسٹی موجود نہیں ہے۔

۶: فتوحات فتوحات کا جہاں تک تعلق ہے اس اعتبار سے بھی فاطمی خلافت ایک امتیاز خاص کی حامل ہے، ایک دفعہ تو وہ مصر سے اٹھے اور شام تک فتح کرتے چلے گئے۔

سسلی (صقلیہ) جیسا خالص یورپین ملک فاطمیوں ہی کے بل بوتے پر عرصے تک اسلامی تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنا رہا۔ اور اگر باہمی رزم آرائیوں نے بے بس نہ کردیا ہوتا تو شاید وہاں سے مسلمانوں کا اخراج اس طرح عمل میں نہ آتا جیسا اندلس (ہسپانیہ) میں ہوا تھا

۷: صلیبی جنگیں صلیبی جنگیں عبارت ہیں بیت المقدس کے خلاف یورپ کی تمام بڑی حکومتوں کی متحدہ یورش سے اس بہت بڑی اور تاریخی یورش کا پہلا ہلہ فاطمیوں نے روکا، وہ عرصے تک اس طوفان کو روکتے رہے اور داخلی حالات اور خانہ جنگیوں نے جب بالکل بے بس کر دیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ عیسائی مصر کے نگہبان بن کر داخلِ شہر ہو گئے، تو شیعیت اور سنیت کے اختلاف کے باوجود آخری فاطمی خلیفہ عاضد نے نورالدین زنگی سے مدد طلب کرنے میں دریغ نہ کیا نورالدین نے صلاح الدین کو بھیجا جو بالآخر مصر پر قابض ہو گیا اور اس طرح فاطمی خلافت

کا خاتمہ ہو گیا۔

غرض جس اعتبار سے بھی دیکھا جائے ماننا پڑے گا کہ فاطمی خلافت تاریخ میں اپنا خاص مقام رکھتی ہے۔

فاطمیوں کے کارناموں کے نقوش و آثار اب تک موجود ہیں۔ ان پر شیعوں نے کم لکھا ہے کیونکہ ان کے اور فاطمیوں کے مابین بعض سنگین اختلافات بنیادی اصولوں میں وحدت اور اشتراک کے باوجود موجود تھے۔ سنّیوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کے تین حصّے کیے جا سکتے ہیں۔ وہ مواد جو عباسیوں کے عہد میں لکھا گیا، وہ مواد جو اندلس کے امویوں کے زمانے میں ضبطِ تحریر میں آیا، وہ مواد جو عصر صلاح الدین ایوبی کی پیداوار تھا۔ یہ تینوں حصّے نہ جانبداری سے خالی ہیں نہ تعصب سے۔ ایک چوتھا حصّہ اور ہے۔ وہ خود فاطمی داعیوں، اماموں اور ان کے عہد کے اہلِ قلم کا لکھا ہوا ہے۔ اصول یہی ہے کہ کسی کے افکار و عقائد کے مقابلے دوسروں کے خود اسی کی بات صحیح مانی جائے لیکن اسے ماننے سے مؤرخین ہچکچاتے رہے اور اسے نکتہ چینیوں کا ہدف بناتے رہے۔ اس کی وجہ یہ بھی کہ جو خیالات وہ قائم کر چکے تھے اور جو ایک عرصۂ دراز سے وہ کہتے، سنتے اور لکھتے چلے جا رہے تھے ان سے دستبردار ہونا آسان نہ تھا۔

جدید دور میں مصر کے متعدد اہلِ قلم حسن علی ابراہیم وغیرہ اور یورپ کے مستشرقین رولیری وغیرہ نے فاطمیوں کے موضوع پر کتابیں لکھی ہیں یہ کتابیں کافی ہیں اور ہر پہلو پر لکھی گئی ہیں، ان میں تشنہ بھی ہیں اور مکمل بھی، غیر مستند بھی اور مستند بھی، اچھی بھی اور بُری بھی، ان میں الزامات بھی ہیں اور دفاع بھی، ان کے وسیع مکالمے کے بعد بین السطور سے جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ فاطمیوں سے حسنات بھی سرزد ہوئے۔ اگرچہ سئیات سے بھی ان کا دامن محفوظ نہیں ہے انھوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنے غیر فانی اور یادگار کارنامے چھوڑے ہیں جو نہ مٹائے مٹ سکتے ہیں نہ بھلائے بھول سکتے ہیں۔

غرض مجموعی حیثیت سے فاطمیوں کا عصر شاندار بھی ہے فکر آفریں بھی اور عہد ساز

تی، اس میں رنگارنگی بھی ہے اور اس رنگارنگی میں تنوع بھی ہے اور جاذبیت بھی۔ انھوں نے ایک مستقل فلسفۂ حیات اور ضابطۂ دین مرتب کیا تھا۔ اور یہ فلسفہ بہت گہرا اور عمیق بھی تھا، اس میں تنظیم کی بے پناہ خوبیاں اور صلاحیتیں تھیں اور جب تک یہ خوبیاں اور صلاحیتیں قائم رہیں۔ ہر طرف سے مخالفوں میں گھرے ہونے کے باوجود وہ ابر کرم کی طرح برستے رہے۔ طوفان کی طرح چھاجاتے رہے اور بحر و بر پر قبضہ و تسلط حاصل کرتے رہے۔

زمانے کی طرف سے جو انھیں مہلت ملی وہ کم تھی۔ لیکن جتنی ملی وہ بہرحال یادگار اور ناقابلِ فراموش ہے جس کا اعتراف اپنوں کو بھی ہے اور غیروں کو بھی۔ اور یہ کوئی معمولی بات نہیں!

بارھویں منزل

ایران وافغانستان

مختلف حکومتوں کے قیام اور آغاز و انجام کی داستان

پیش لفظ

ایران کی داستان گزشتہ اوراق میں متفرق طور پر مختلف اسلامی حکومتوں کے سلسلہ میں گزر چکی ہے۔ اس باب میں مملکتِ ایران کے عہد اسلامی پر ایک سرسری نظر ڈالنا مقصود ہے۔

ایران نے اسلام قبول کر کے بہت بڑی نعمت حاصل کر لی، لیکن اسلام قبول کر کے اس نے مسلمانوں کو بہت کچھ دیا بھی، علوم و فنونِ دینی میں ایران کے اکابر و افاضل کا بڑا حصہ ہے، محدثین کرام، مفسرین عظام، صوفیانِ عالی مقام، متکلمین اسلام اور شعرائے نکو فرجام تہذیبی، ثقافتی، علمی، تحقیقی اور تاریخی کارنامے بجائے خود ایک مستقل اور ضخیم کتاب کے طالب ہیں۔ یہ وہ ہستیاں ہیں کہ اگر وجود میں نہ آئی ہوتیں تو آج ہمارے علوم و فنون کی تاریخ ایک سادہ صفحہ ہوتی۔ انھوں نے بہت کچھ کیا اور جو کچھ کیا اس کا بڑا حصہ اب تک باقی ہے اور شاید ہمیشہ باقی رہے گا۔ لیکن ہمارا موضوع علمی اور تہذیبی تاریخ کا بیان کرنا نہیں ہے۔ ہمارا موضوع مسلمانوں کے دورِ خسروی اور فرمانروائی کو اجاگر کرنا ہے لیکن جہاں ضرورت سمجھی ہے ساتھ ساتھ علمی اور تہذیبی واقعات کی طرف بھی اشارہ کرتے گئے ہیں۔

ایران میں جو مسلمان خاندان وقتاً فوقتاً برسر اقتدار آئے اجمالی و ایجاز کے ساتھ آئندہ صفحات میں ہم ان کا ذکر کرتے ہیں۔

حکومتِ صفاریہ

خاندانِ عباسیہ نے خلافت کے حاصل کرنے میں چونکہ ایرانیوں سے زیادہ امداد حاصل کی تھی لہٰذا ایرانیوں کو خود غلبہ پانے اور اپنی حکومت قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا خلفائے عباسیہ کی عیش پرستی اور کمزوری نے جب ایرانیوں کے لیے ان کی اولوالعزمی کے پورا کرنے کا راستہ صاف کر دیا تو سب سے پہلے یعقوب بن لیث جو خاندانی اعتبار سے ٹھٹیرا تھا اور اسی لیے صفار کے نام سے پکارا جاتا تھا اپنی خود مختار حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا یعقوب بن لیث کو یہ کامیابی محض اس کے سپاہیانہ اوصاف کی وجہ سے حاصل ہوئی تھی۔ یعقوب دوست نوازی، سخاوت اور سادہ زندگی بسر کرنے میں یکتا تھا۔ اس کے پاس جو کچھ ہوتا تھا اپنے دوستوں کو کھلا پلا دیتا تھا۔ خود تکلیف اٹھا کر دوستوں کو راحت پہنچانے کا شوق رکھتا تھا اس لیے اس کو اپنے جاں نثاروں کی جمعیت فراہم کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ اس نے اپنے لڑکپن کے دوستوں کو اپنی بادشاہت کے وقت مطلق فراموش نہیں کیا۔ اور سب کو اعلیٰ مدارج پر پہنچایا۔ بادشاہت کی حالت میں بھی وہ ایک معمولی سپاہی کے لباس میں نظر آتا تھا معمولی سپاہیوں کی طرح زمین پر سونے اور خندق کھودنے سے اس کو عار نہ تھا۔ اس کے خیمے اور ایک معمولی سپاہی کے خیمے میں کوئی فرق نہ ہوتا تھا۔ اسے عیاشی سے سخت نفرت تھی۔ استقلال اور اولوالعزمی

اس کے ہر ایک کام سے نمایاں تھی یہی سبب تھا کہ وہ نہایت پست اور ادنیٰ درجے سے ترقی کر کے ملک ایران کے ایک بہت بڑے حصے کا مطلق العنان فرمانروا بن گیا۔ اور بغداد کا دار الخلافت اس کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔

یعقوب بن لیث صفار کی وفات کے بعد اس کا بھائی عمرو بن لیث صفار جانشین ہوا اس نے اپنے حدودِ حکومت میں اور بھی توسیع کی۔ عمرو بن لیث اگرچہ اپنے بھائی کی نسبت عقل و دانائی زیادہ رکھتا تھا لیکن وہ ان سپاہیانہ اخلاق اور اوصاف میں اپنے بھائی سے کمتر تھا خلیفہ معتمد کے بھائی موفق نے ایک مرتبہ اس کو شکست بھی دی، لیکن وہ جلد ہی پھر پورے جاہ و جلال کے ساتھ تختِ حکومت پر متمکن ہو گیا۔

آخر خلیفہ نے ماوراء النہر کے حاکم اسمٰعیل سامانی کو عمرو بن لیث کے مقابلے پر آمادہ کیا۔ عمرو بن لیث ستر ہزار سوار لے کر اسمٰعیل سامانی کے مقابلے پر آمادہ ہوا۔ اسمٰعیل سامانی صرف بیس ہزار سواروں کے ساتھ مقابلے پر آیا عین معرکہ جنگ میں عمرو بن لیث کا گھوڑا اسے اسمٰعیل سامانی کے لشکر میں لے گیا۔ جہاں وہ آسانی سے گرفتار کر لیا گیا۔

اسمٰعیل سامانی نے عمرو کو گرفتار کر کے بغداد بھیج دیا اور اس طرح دولتِ صفاریہ کی عظمت و شوکت کا قریب قریب خاتمہ ہو گیا۔

عمرو بن لیث کے بعد اس کی اولاد نے چند سال تک علاقہ سیستان کے محدود رقبے میں اپنی برائے نام حکومت قائم رکھی یعقوب لیث صفار کا نواسا۔ جس کا نام خلف تھا محمود غزنوی کے زمانے تک سیستان میں برسرِ حکومت رہا خلف کے بیٹے نے باپ کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا۔ خلف نے اپنے آپ کو بیٹے کے مقابلے میں کمزور دیکھ کر اسے دھوکے سے قتل کر دیا۔

باشندگانِ سیستان نے سلطان محمود غزنوی کی خدمت میں خلف کے خلاف شکایات کی عرضیاں بھیجیں اور لکھا کہ آپ ہم کو خلف کے مظالم سے نجات دلائیے سلطان محمود غزنوی نے چڑھائی کی۔ خلف نے مقابلے میں اپنے آپ کو مغلوب اور اپنے قلعے کو مفتوح دیکھ کر سلطان محمود کی خدمت میں حاضر ہو کر رکاب کو بوسہ دیا اور

کہا کہ اے سلطان مجھے معاف کر دے۔ محمود غزنوی کو لفظ "سلطان" پسند آیا۔ اس نے لفظ "سلطان" کو اپنا لقب قرار دیا۔ خلف کو کوئی سزا نہیں دی۔ اسی قدر کافی سمجھا کہ اپنے ہمراہ غزنی لے گیا جہاں چار سال رہ کر خلف نے وفات پائی۔ اس طرح دولتِ صفاریہ کا خاتمہ ہو گیا۔

سلطان محمود غزنوی کی شخصیت اور کردار، سیرت اور خصائل، جنگی مہارت اور جذبۂ اسلامی کا ذکر ہم اس موقع کے لیے اٹھا رکھتے ہیں جب ہندوستان پر مسلمانوں کے شاندار عہدِ حکومت کا ذکر آئے گا، اس جگہ جتنا کچھ ذکر ہوا ہے وہ ربطِ بیان کے لیے ہے تاکہ واقعات کی کڑیوں کا سلسلہ ٹوٹنے نہ پائے۔

۲۔ سامانی حکومت

اسد بن سامان بہرام چوبین کی اولاد میں سے تھا۔ یہ اپنے چاروں بیٹوں کو لے کر مامون الرشید عباسی کی خدمت میں مقام مرو حاضر ہوا تھا۔ مامون کو اپنے بھائی امین کے خلاف تخت حاصل کرنے میں جو کامیابی حاصل ہوئی تھی، اس میں سب سے زیادہ ایرانیوں کی امداد و اعانت کو دخل تھا۔ سامانیوں کے اقتدار نے اسی زمانے سے تیزی سے ترقی کی۔ چونکہ یہ خاندان ایران کے ایک مشہور سردار کی اولاد سے تھا۔ اس لیئے ماوراء النہر خراسان میں ان لوگوں کی سیادت کے خلاف لوگوں کے آمادہ ہونے کا امکان اور بھی ضعیف ہو گیا تھا۔ اسمٰعیل سامانی جو اسد بن سامان کا پوتا تھا عمرو بن لیث پر غالب آنے کے بعد بہت جلد بادشاہت کے مرتبے کو پہنچ گیا۔ فرق صرف اس قدر تھا کہ خاندانِ صفّار خلافتِ بغداد کا مخالف تھا لیکن اسمٰعیل اور اس کے جانشین برائے نام دربارِ خلافت کی سیادت کو تسلیم کرتے رہے۔

اسمٰعیل سامانی نے ماوراء النہر اور خراسان میں سات آٹھ سال حکومت کی خلیفہ معتضد باللہ عباسی نے اسے ملک خراسان کی سندِ حکومت عطا کی تھی۔ اسمٰعیل کی وفات کے بعد ابو نصر احمد بن اسمٰعیل سامانی باپ کا جانشین ہوا۔ اسمٰعیل سامانی اپنے عادات و خصائل کے اعتبار سے نہایت شریف، سیر چشم اور متوکل شخص تھا، جہانگیری کے ساتھ ہی جہانداری

کے اصولوں سے بھی خوب واقف تھا۔ رعایا اس سے خوش تھی۔

اس کے بعد اس کا بیٹا نصر بن احمد سامانی آٹھ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ یہ بالکل اپنے دادا اسمٰعیل کا نمونہ تھا۔ اس نے چند ہی روز کے بعد اپنی سلطنت کے حدود کو اسمٰعیل سامانی کی حدودِ سلطنت سے زیادہ وسیع کر لیا۔ اور تیس سال سے زیادہ عرصے تک بڑے زور شور اور ناموری کے ساتھ حکومت کی۔ اسی کے دربار میں رودکی شاعر نے جو نابینا تھا بڑا اعزاز و اکرام حاصل کیا۔ نصر بن احمد اپنے دارالسلطنت بخارا میں فوت ہو کر مدفون ہوا۔

اس کے بعد اس کا بیٹا نوح بن نصر تخت نشین ہوا۔ اس نے تیرہ سال حکومت کر کے ۳۴۳ھ میں وفات پائی۔

اس کے بعد اس کا بیٹا عبدالملک بن نوح تخت نشین ہوا۔ اس نے اپنے ممالکِ مقبوضہ کے جنوبی حصے یعنی صوبۂ خراسان کی گورنری پر اپنے ایک سردار البتگین کو مامور کیا تھا۔ سات سال حکومت کرنے کے بعد چوگان کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر فوت ہوا۔

پھر اس کا بھائی منصور بن نوح تخت نشین ہوا۔ اس نے رکن الدولہ دیلمی کی بیٹی سے شادی کی تھی۔ اس لیے عراق و فارس کے صوبوں میں بھی اس کی سیادت تسلیم کر لی گئی۔ اسی کا وزیر ابو علی بن محمد تھا جس نے تاریخ طبری کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ منصور بن نوح نے پندرہ سال حکومت کی۔

اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ابوالقاسم نوح ثانی تخت نشین ہوا۔ اس کے تخت نشین ہوتے ہی سلطنتِ بخارا یعنی دولتِ سامانیہ پر ادبار و تنزل کی گھٹائیں چھا گئیں اس کے درباریوں نے بغاوتیں برپا کرائیں۔ اور مغولستان کے بادشاہ بغرا خاں کو حملے کی دعوت دی، بخارا کے متصل لڑائی ہوئی۔ بغرا خاں نے نوحِ ثانی کو شکست دے کر بخارا پر قبضہ کر لیا۔ مگر حجیب اتفاق یہ پیش آیا کہ بغرا خاں اس فتح کے بعد ہی بخارا میں فوت ہو گیا۔ اور اس کی فوج اپنے ملک کو واپس چلی گئی۔ نوح ثانی نے پھر بخارا پر قابض ہو کر اپنی سلطنت

مستحکم کرلی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ غزنی میں سبکتگین نے اپنی مستقل حکومت قائم کرلی تھی۔ نوح ثانی نے سبکتگین کو اس خدمت کے صلے میں کہ اس نے بغرا خاں کے خلاف نوح ثانی کی مدد کی تھی ناصر الدین کا خطاب دیا تھا۔ دقیقی شاعر اس کا معاصر تھا جس نے داستان گشتاسپ کے ایک ہزار اشعار لکھے تھے۔ بغرا خاں کے حملے سے فارغ ہونے کے بعد نوح ثانی نے اپنے باغی اور بے وفا امیروں کو سزائیں دینی چاہیں۔ ان باغی امرار نے فرار ہو کر فخر الدولہ دیلمی کے پاس پناہ لی۔ اور اس سے مدد لے کر سلطنت بخارا پر حملہ آور ہوئے۔ نوح ثانی نے سبکتگین سے پھر امداد طلب کی، سبکتگین نے ہرات کے قریب باغیوں کا مقابلہ کیا اور جنگِ عظیم کے بعد ان کو شکستِ فاش دے کر بھگا دیا۔ اس لڑائی میں سبکتگین کے بیٹے محمود غزنوی نے بڑی بہادری دکھائی اور خوب بڑھ بڑھ کر تلوار چلائی۔ نوح ثانی نے خوش ہو کر محمود کو سیف الدولہ کا خطاب دیا۔

نوح ثانی نے ۲۲ سال حکومت کی مگر اس کا زمانہ اکثر لڑائی جھگڑوں میں اور بغاوتوں کے فرو کرنے میں بسر ہوا۔ اور ملک کے صوبے یکے بعد دیگرے قبضے سے نکلتے گئے۔

نوح ثانی کے بعد اس کا بیٹا منصور ثانی تخت نشین ہوا۔ امرائے دولت نے منصور کو تخت سے اتار کر اندھا کیا اور اس کی جگہ اس کے بھائی عبد الملک ثانی بن نوح ثانی کو تخت پر بٹھایا اور اس کو لے کر محمود غزنوی پر حملہ آور ہوئے۔ محمود غزنوی نے عبد الملک ثانی اور اس کی فوج کو شکست دے کر بخارا کی طرف بھگا دیا۔ ادھر ایلج خاں والی کاشغر نے خوارزم پر قبضہ کر کے بخارا پر حملہ کیا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ ایلج خاں نے عبد الملک ثانی کو گرفتار کر کے بخارا پر قبضہ کیا۔ اور عبد الملک ثانی کا تیسرا بھائی منتصر بھیس بدل کر بخارا سے فرار ہوا۔ اور چند روز تک قزاقوں کی ایک جمعیت کے ساتھ آوارہ رہ کر ایک شخص کے ہاتھ سے مقتول ہوا۔ اس طرح سامانی خاندان اور اس کی دولت و حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

۳۔ دیلمی حکومت

دیلمیوں اور سامانیوں کی سلطنتوں کو ایک دوسرے کی معاصر سلطنت سمجھنا چاہیے سامانیوں کا قبضہ ماوراء النہر اور خراسان وغیرہ شمالی و مشرقی ممالک پر رہا۔ اور دیلمیوں کے تصرف میں فارس، عراق اور آذربائیجان وغیرہ غربی ممالک رہے۔ اس طرح تمام ملک ایران چند روز تک انھیں دونوں خاندانوں کے درمیان منقسم رہا۔ دیلمیوں کی حکومت سامانیوں کی بربادی کے بعد بھی نہایت کمزور حالت میں کچھ دنوں باقی رہی جب کہ سامانیوں کی جگہ مشرقی ایران میں غزنویوں کی زبردست سلطنت قائم ہو چکی تھی۔

۴۔ حکومت غزنی

عبدالملک بن نوح نے الپتگین کو خراسان کی گورنری پر مامور کیا تھا۔ عبدالملک کے بعد جب اس کا بھائی منصور بن نوح سامانی ۳۵۰ھ میں تخت نشین تو الپتگین جو منصور بن نوح کی تخت نشینی کے خلاف رائے ظاہر کر چکا تھا خراسان کے دار الامارت سے مقام غزنی میں چلا آیا۔ جو اس زمانے میں ایک معمولی سی بستی تھی۔ یہاں الپتگین مضبوط ہو کر بیٹھ گیا اور اپنی ایک خود مختار ریاست قائم کر کے حکومت کرنے لگا۔

۳۶۷ھ میں الپتگین کا انتقال ہوا۔ تو اس کی جگہ اس کا بیٹا اسحٰق غزنی کا فرمانروا ہوا۔ مگر چند ہی روز کے تجربے سے وہ نااہل و نالائق ثابت ہوا۔ فوجی سرداروں نے اسے معزول کر کے سبکتگین کو جو الپتگین کا سپہ سالار اور داماد بھی تھا اپنا بادشاہ بنا لیا۔

سبکتگین کی نسبت مشہور ہے کہ وہ الپتگین کا غلام تھا۔ مگر یہ غلامی محض اتفاقی طور پر وقوع میں آئی تھی۔ یعنی بعض ڈاکوؤں نے اس کو راستے میں تنہا پا کر گرفتار کر لیا اور بخارا میں لے جا کر بطور غلام فروخت کر دیا۔ سبکتگین کا سلسلۂ نسب یزدجرد شاہ ایران تک پہنچتا ہے۔ بعض مؤرخین نے سبکتگین کو ترک بتایا ہے۔ بعض کا بیان یہ ہے کہ وہ باپ کی طرف سے ترک اور ماں کی طرف سے ایرانی تھا۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ وہ حسب و نسب کے اعتبار سے ایک شریف آدمی تھا۔ ایشیائی دستور کے مطابق کسی بادشاہ کے امیر و سردار

اور بڑے بڑے اہل کار اپنے آپ کو بادشاہ کا غلام کہنے میں اپنی بے عزتی نہیں سمجھتے اس لیے ممکن ہے کہ البتگین کی فوج کا سپہ سالار ہونے کی وجہ سے سبکتگین نے اپنے آپ کو البتگین کا غلام کہا ہو۔ سبکتگین نے قریباً بیس سال غزنی کے تخت پر حکومت کی۔ شہر لبست فتح کیا۔ جو غزنی سے کئی سو میل کے فاصلے پر دریائے ہیرمند کے دونوں کناروں پر آباد ہے۔ ہرات کی جنگ میں کامیابی حاصل کی۔ پنجاب و سندھ کے راجا جے پال نے اس کے ملک پر فوج کشی کی تو اس کو شکستِ فاش دے کر گرفتار کیا۔ اور خراج کے وعدے پر رہا کیا۔ جے پال نے بدعہدی کی اور دوبارہ تین لاکھ کا لشکر لے کر سبکتگین کے ملک پر حملہ آور ہوا۔ مگر سبکتگین نے صرف چند ہزار سپاہیوں کی مدد سے اس کا مقابلہ کیا اور اس مرتبہ بھی شکست دے کر گرفتار کر لیا اور پھر اس سے اقرار اطاعت لے کر چھوڑ دیا۔ سبکتگین نے غزنی کی سلطنت کو بہت وسیع کیا۔ اور ۳۸۷ھ میں اس جہانِ فانی سے کوچ کر گیا۔ سبکتگین کے بعد اس کا بیٹا امیر اسمٰعیل بلخ میں تخت نشین ہوا۔ مگر چھ مہینے کے بعد اپنے بھائی محمود سبکتگین سے لڑ کر مغلوب و معزول ہوا۔

محمود سبکتگین

۳۸۷ھ میں محمود بن سبکتگین غزنی کے تخت پر بیٹھا۔ خلیفہ قادر باللہ عباسی نے اسے یمین الدولہ اور امین الملت کا خطاب عطا فرمایا تھا۔ محمود غزنوی نے تخت نشین ہوتے ہی نہایت قابلیت کے ساتھ مہماتِ سلطنت کو انجام دینا شروع کیا۔ لوگوں نے عبد الملک سامانی بادشاہ بخارا کو محمود کے خلاف فوج کشی پر آمادہ کیا۔ محمود نے مجبوراً مقابلہ کیا عبد الملک شکست کھا کر بخارا کی طرف بھاگا۔ بخارا پر ایلج خاں یا ایلک خاں بادشاہ کاشغر نے حملہ کر کے قبضہ کیا۔ عبد الملک سامانی قید ہوا۔ محمود غزنوی نے ایلج خاں بن بغرا خاں پر حملہ کر کے اُسے بخارا سے بھگا دیا اور بخارا کو اپنی حدودِ مملکت میں داخل کر لیا۔ اس کے بعد مغلوں کے سردار طغا خاں بن التو خاں کو شکست دے کر اپنی سلطنت کے حدود کو بحیرہ کاسپین (بحیرۂ اخضر) تک پہنچا دیا۔ ولایتِ خوارزم پر بھی قبضہ کیا۔ سیستان و خراسان کے علاقے سبکتگین کے زمانے سے سلطنتِ غزنی میں شامل تھے۔ مجد الدولہ دیلمی کو مغلوب و اسیر کر کے رے اور اصفہان کی ولایتوں

پر بھی قبضہ کیا۔ ادھر ہندوستان پر بھی اس نے حملے کیے۔ محمود غزنوی نے بہت جلد دریائے ستلج سے لے کر بحیرہ کاسپین تک ماوراء النہر سے لے کر بلوچستان و عراق تک ایک نہایت وسیع سلطنت قائم کرلی۔

سلطان محمود غزنوی محمود غزنوی براعظم ایشیا کے نہایت نامور اور زبردست شاہنشاہوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے زمانے میں فارسی زبان کو خاص طور پر رونق حاصل ہوئی۔ محمود غزنوی نہایت سچا مسلمان، بے تعصب اور علم دوست شخص تھا۔ اسی کے زمانے میں فردوسی نے شاہنامہ لکھا تھا۔ ۴۲۱ھ میں محمود غزنوی نے وفات پائی۔ سبکتگین اور محمود غزنوی کو دربار سامانیہ سے امیر الامرائی کا خطاب حاصل تھا مگر ۳۸۹ھ میں محمود غزنوی نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر کے عبدالملک سامانی کا نام خطبہ سے خارج کر دیا۔ اسی سال خلیفہ قادر باللہ عباسی نے اسے یمین الدولہ کا خطاب عطا کیا تھا۔ محمود غزنوی ۹ محرم ۳۶۱ھ کو پیدا ہوا تھا ساٹھ سال کی عمر میں فوت ہوا۔ وہ اپنے زمانے میں سب سے زیادہ طاقتور مسلمان بادشاہ تھا۔ محمود غزنوی نے ماوراء النہر۔ خراسان۔ غزنی۔ پنجاب وغیرہ کی حکومت اپنے چھوٹے بیٹے محمد کو دی تھی۔ اور خوارزم عراق فارس، اصفہان وغیرہ ممالک بڑے بیٹے مسعود کو دیے تھے۔ محمود کے فوت ہوتے ہی دونوں بھائیوں میں جھگڑا شروع ہوا۔ محمد غزنی کے تخت پر بیٹھا اور مسعود نے رے میں جلوس کیا۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ مسعود نے حملہ کر کے غزنی کو فتح کر لیا اور اپنے بھائی محمدؒ کو قید کر کے اندھا کر دیا۔

سلطان مسعود غزنویؒ تخت غزنی پر جلوس کر کے سلطان مسعود نے بلوچستانؒ مکران پر حملہ کر کے اس علاقے کو بھی اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ سلطان مسعود بن محمود کو اس وسیع اور عظیم الشان سلطنت کا سنبھالنا دشوار ہو گیا۔ سلجوقی ترکوں نے بتدریج ترقی پا کر خوارزم کے علاقے میں لوٹ مار شروع کر دی ادھر ہندوستان و پنجاب میں بھی یہاں کے بعض صوبہ داروں نے تمرد و سرکشی پر کمر باندھی۔ سلطان مسعود نے بڑی ہمت اور استقلال سے کام لیا۔ خوارزم و خراسان میں سلجوقیوں کو

متواتر شکستیں دیں اور انھیں حالات میں موقع نکال کر ہندوستان پر بھی حملہ آور ہوا اور سرستی وہانسی کے زبردست قلعوں کو فتح کر کے مسمار کیا۔ سلطان مسعود کی فوج میں ہندوؤں کی بہت بڑی تعداد بھرتی ہو گئی تھی۔ اور کئی ہندو اس کی فوج میں سپہ سالاری کے عہدے پر فائز تھے۔ جن کے ماتحت بہت سی ہندو پلٹنیں اور ہندو رسالے تھے مسعود کو ہندوؤں کی فوجیں تیار کرنے اور ان کو فوجی تعلیم دے کر شائستہ بنانے کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ اس نے کئی ہندو سرداروں کو محض اس لیے ہندوستان بھیجا کہ وہ ہندوستان سے اپنے بھائی بندوں کو فوج میں بھرتی کر کے لائیں۔ جب ہندوستان کے ہندو سپاہی غزنی پہنچے تو مسعود نے ایرانیوں اور افغانیوں سے زیادہ ان کی تنخواہیں مقرر کیں۔ اور ایک شخص مسمی تلک کو امیر الامرائی اور مہاراجگی کا خطاب دے کر سپہ سالار اعظم بنایا۔ یہ مہاراجہ تلک ایک ہندو حجام کا لڑکا تھا۔ لہٰذا اس کے مرتبے کو سب سے زیادہ رفیع دیکھ کر اکثر امرائے دربار سلطان مسعود سے بددل ہو گئے اور انھوں نے حرفِ شکایت زبان پر لانا شروع کیا سلطان مسعود کی اس ہندو نوازی پر اس لیے اور بھی سب کو تعجب تھا کہ مکران کی لڑائی میں ہندو پلٹنوں نے سخت بزدلی اور نامردی دکھائی تھی۔ اور اس امتحان کے بعد ہرگز کسی کو توقع نہ تھی کہ سلطان مسعود اس طرح ہندوؤں کا گرویدہ ہو جائے گا۔ آخر خراسان کے ایک جنگ میں سلجوقیوں سے جب معرکہ آرائی ہوئی تو ان ہندو سپاہیوں نے سب سے پہلے فرار کی عار گوارا کر کے سلطان مسعود اور اس کی افغانی فوج کو خطرہ اور ہلاکت میں مبتلا کر دیا۔ چند جاں نثاروں کی پامردی سے سلطان مسعود تو اپنی جان بچا لایا مگر شکستِ فاش کی ندامت اپنے ساتھ لایا۔ اس شکست کے بعد سلطان مسعود پر کچھ ایسی بددلی اور کم ہمتی طاری ہوئی کہ اپنے وزیر اور اپنے بیٹے مودود کو غزنی میں چھوڑ کر اور تمام اموال و خزائن اونٹوں، ہاتھیوں، چھکڑوں اور ہاتھیوں پر لدوا کر اور ہمراہ لے کر ہندو سرداروں کے ساتھ اس ارادے سے ہندوستان کی طرف روانہ ہوا کہ لاہور کو دارالسلطنت بنائے۔ چونکہ سلطان مسعود نے اپنا یہ ارادہ پہلے ہی غزنی میں ظاہر کر دیا تھا۔ لہٰذا وہاں کے سرداروں اور امیروں نے سلطان کو اس ارادے سے باز رکھنے کی بے حد کوشش کی مگر مسعود پر کوئی اثر نہ ہوا اور

تمام جواہرات، نقدی، زیور حتیٰ کہ ظروف تک لے کر غزنی سے چل دیا۔ اور اپنے بیٹے مودود کو جو ان دنوں بلخ و بدخشان کی طرف تھا خط لکھ کر بھیج دیا کہ میں تم کو غزنی و خراسان وغیرہ کا حاکم مقرر کرتا ہوں اور میرے پاس سے تمہارے نام احکام و فرامین اور مناسب ہدایات پہنچتی رہیں گی۔ ان پر عمل کرنا اور ترکوں کو ملک سے پاک کرنے کی کوشش میں مصروف رہنا۔ یہاں تک کہ مع سامان جب دریائے سندھ کو عبور کیا تو اس طرف آتے ہی ہندو پلٹنوں اور ہندو سرداروں نے جو ہمراہ تھے آنکھیں بدلیں اور سب کے سب شاہی خزانے پر لوٹ پڑے وہ تمام خزانہ جو سبکتگین اور محمود غزنوی نے چالیس پچاس سال کے عرصے میں جمع کیا تھا ذرا سی دیر میں دریائے سندھ کے کنارے ہندوؤں نے لوٹ لیا۔ اور سلطان مسعود کو مسلمانوں کی مختصر سی جماعت کے ساتھ چھوڑ کر منتشر ہو گئے۔

سلطان محمدؒ اس دل شکن اور روح فرسا نظارہ کو دیکھ کر مسلمانوں کی اس مختصر سی جمعیت نے سلطان مسعود کو اس کے اختلالِ دماغی کے سبب معزول کر دیا۔ اور اس کے بھائی محمدؒ کو جو نابینا اور اس سفر میں مسعود کے ساتھ قید کی حالت میں تھا آزاد کر کے اپنا بادشاہ بنایا۔ مسعود جب گرفتار ہو کر محمدؒ کے سامنے پیش کیا گیا تو محمدؒ نے بھائی سے اپنی آنکھوں کا بدلہ نہیں لیا بلکہ صرف یہ دریافت کیا کہ تم اپنے لیے اب کیا پسند کرتے ہو؟ مسعود نے کہا کہ مجھ کو قلعہ کری میں رہنے کی اجازت دی جائے۔ چنانچہ محمدؒ نے اس کو قلعہ کری میں مع اہل و عیال بھجوا دیا۔ اور اپنے نام کا سکہ و خطبہ پنجاب اور سرحدی علاقے میں جاری کیا۔ محمدؒ کے بیٹے احمد نے باپ کی اجازت و اطلاع کے بغیر قلعہ کری میں جا کر اپنے چچا مسعود کو قتل کر دیا۔ یہ حال سن کر محمدؒ کو ملال ہوا۔ مودود جو بلخ میں سلجوقیوں کے خلاف مہم تیار کر رہا تھا۔ اس خبر کو سنتے ہی فوج لے کر چلا، ادھر سے دریائے سندھ کے کنارے محمدؒ کی فوج نے اس کو روکا، لڑائی ہوئی جس میں مودود کو فتح ہوئی اس نے محمدؒ اور اس کے تمام اہل و عیال کو گرفتار کر کے اپنے باپ کے انتقام میں قتل کیا اس کے بعد مودود غزنی جا کر ۴۳۵ھ میں تخت نشین ہوا۔

سلطان مودود مودود بھی اپنے باپ مسعود کی طرح سلجوقیوں سے بہت سی

لڑائیاں لڑا مگر آخر کار مجبور ہو کر اس نے ماوراء النہر، غزنی اور ہندوستان کی حکومت پر اکتفا کیا۔ باقی تمام ممالک یعنی خراسان و خوارزم و عراق وغیرہ ہمیشہ کے لیے سلطنت غزنی سے نکل گئے۔ اور سلجوقی ان ملکوں کے بادشاہ بن گئے۔

سُلطانِ علی وغیرہ

۴۴۱ھ میں مودود بن مسعود نے وفات پائی اور اس کی جگہ اس کا بیٹا علی تخت نشین ہوا۔ ۴۴۳ھ میں علی کے بعد عبدالرشید بن مودود تخت نشین ہوا مگر چند ہی روز کے بعد ایک سردار طغرل نامی نے عبدالرشید کو قتل کر کے تاج شاہی اپنے سر پر رکھا مگر امرائے سلطنت نے بہت جلد متفق ہو کر طغرل کو قتل کیا۔ اور ۴۴۴ھ میں فرخ زاد بن مسعود کو غزنی کے تخت سلطنت پر بٹھایا۔

اسی طرح مختلف بادشاہ تخت نشین ہوتے رہے، ۵۰۹ھ میں ارسلان تخت نشین ہوا۔ تین سال بعد ۵۱۲ھ میں اس کا بھائی بہرام سریر آرائے سلطنت ہوا۔

بہرام نے ۳۵ سال سے زیادہ عرصے تک حکومت کی۔ ہندوستان پر اس نے بھی باغیوں کی گوشمالی کے لیے متعدد حملے کیے اور لاہور میں اکثر مقیم رہا۔ اسی کے عہد حکومت میں کتاب کلیلہ دمنہ لکھی گئی۔ خمسۂ نظامی بھی اسی کے عہد کی تصنیف ہے۔ سلطان بہرام کے آخر عہد میں غوریوں نے غزنی پر حملہ کر کے بہرام کو غزنی سے بے دخل کر دیا۔ وہ بھاگ کر ہندوستان کی طرف چلا آیا اور لاہور میں ۵۴۷ھ میں فوت ہوا۔ اب غزنویوں کے قبضے میں صرف ہندوستان یعنی پنجاب کا ملک رہ گیا تھا۔ غزنی وغیرہ پر غوریوں کی حکومت قائم ہو گئی۔

بہرام کی وفات کے بعد لاہور میں اس کا بیٹا خسرو تخت نشین ہوا۔ اس نے غزنی کو غوریوں کے قبضے سے نکالنے اور واپس لینے کی کوشش کی مگر اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ آخر آٹھ سال پنجاب پر حکومت کرنے کے بعد لاہور میں فوت ہوا۔

اس کے بعد اس کا بیٹا خسرو ملک بن خسرو شاہ تخت نشین ہوا۔ ۵۵۵ھ میں مقام لاہور تخت نشین ہوا۔ خسرو ملک کو غوریوں نے گرفتار کر کے پنجاب پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس طرح دولتِ غزنویہ کا خاتمہ ہو گیا۔

۵۔ سلجوقیوں کا عہد

ایک نو مسلم خاندان جو تختِ خلافت کا پاسبان بنا!

ترکوں کی قوم کا ایک شخص جس کا نام وقاق اور لقب تیمور تالیغ تھا ترکستان یعنی دشت قبچاق کے بادشاہ بیغو کے متوسلین میں تھا۔ اس کے بیٹے کا نام سلجوق تھا۔ ایک روز کسی بات پر سلجوق بیغو سے خفا ہو کر مع اپنے بیٹوں کے سمرقند و بخارا کی طرف چلا آیا۔ اور مقام جند کے قریب اس مختصر قافلے نے قیام کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ بخارا کے تخت پر نوح ثانی سامانی متمکن تھا۔ جند کے مسلمان عامل کی ترغیب سے سلجوق نے دینِ اسلام قبول کیا۔ یہ علاقہ اس زمانے میں بیغو بادشاہ ترکستان کا باج گزار تھا۔ چند روز کے بعد بیغو کے عمال زرِ خراج وصول کرنے آئے تو سلجوق نے وہاں کے حاکم سے کہا مجھ سے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کفار آ کر مسلمانوں سے خراج وصول کریں۔ سلجوق کی اس ہمت کو دیکھ کر وہاں کے باشندے بھی آمادہ ہو گئے اور سلجوق کے ساتھ مل کر بیغو کے عمال پر حملہ آور ہوئے۔ اس حملے میں سلجوق کو فتح حاصل ہوئی۔ اور اس کی بہادری کی دُور دُور تک شہرت ہو گئی۔ اور اس کے قبیلے کے لوگ آ آ کر اس کے ساتھ شامل ہوئے۔

جب ایلک خاں نے نوح ثانی پر حملہ کیا تو سلجوق نے نوح ثانی کی طرف سے ایلک خاں کے مقابلے میں بڑی بہادری دکھائی۔ اسی لڑائی میں سلجوق کا بیٹا میکائیل مارا گیا۔ میکائیل کے دو بیٹے طغرل بیگ اور جغر بیگ اپنے دادا سلجوق کے زیر تربیت پرورش

پانے لگے۔ سلجوق کے چار بیٹے اور تھے جن کا نام اسرائیل، یونس، میکائیل، موسیٰ تھے۔ ترک اور مغل قبائل میں کسی شخص کا غیر معمولی بہادری دکھانا اس کے سردارِ قوم بنادینے کے لیے کافی تھا۔ سلجوق اور اس کے بیٹوں کو بہت جلد ناموری اور سرداری حاصل ہو گئی تھی۔ اور اُن کے گرد ترکوں کی جمعیت کثیر فراہم ہو چکی تھی۔ ایلک خاں اور بیغو نے مل کر اس نئے قبیلے کو جو قبیلۂ سلجوق کے نام سے مشہور ہو چکا تھا۔ برباد کرنا چاہا۔ اس عرصے میں سلجوق کا انتقال ہو گیا اور اس کے پوتے جغر بیگ نے ایک جمعیت لے کر ملک ارمینیا کی جانب عیسائیوں پر جہاد کرنے کے لیے جانا چاہا۔ راستے میں محمود غزنوی کا علاقہ یعنی صوبۂ طوس پڑتا تھا۔ طوس کے عامل نے ایک مجاہد فی سبیل اللہ کو اپنی عملداری سے گزرنے دیا۔ سلطان محمود غزنوی بہت ذی ہوش اور مآل اندیش بادشاہ تھا اس کو جب یہ معلوم ہوا کہ سلجوقی گروہ اس کے علاقے میں ہو کر گزرا ہے تو اس نے عامل طوس سے جواب طلب کیا۔ اور اندیشہ مند ہوا کہ کہیں یہ لٹیرا گروہ میری مملکت کو اپنی غارت گری کا تختۂ مشق نہ بنائے۔

جغر بیگ ارمینیا کی طرف سے کامیاب واپس آیا۔ اور سلجوقیوں کی تعداد اور طاقت میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ اب انھوں نے نواح بلخ میں اپنے مویشیوں کو چرانا شروع کیا اور وہیں اقامت ڈال دی۔ سلجوقیوں کی سرداری طغرل بیگ اور جغر بیگ سے متعلق رہی، یہ دونوں بھائی آپس میں نہایت اتحاد و اتفاق کے ساتھ رہتے اور مل کر اپنے قبائل متعلقہ پر حکومت کرتے تھے۔ محمود غزنوی نے سلجوقیوں کو اوّل ماوراء النہر میں کچھ زمین بطور چراگاہ دے دی اور پھر اس بات کی بھی اجازت دے دی کہ وہ دریائے جیحون کو عبور کر کے خراسان میں آباد ہو جائیں۔

طغرل بیگ

طغرل بیگ نے اپنا دارالحکومت رے قرار دیا اور جغر بیگ مرو میں مقیم ہوا۔ دونوں بھائیوں کا نام خطبے میں پڑھا جانے لگا۔ طغرل بیگ نے خراسان پر قابو پا کر خوارزم کے ملک کو بھی اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ اس کے بعد رومیوں پر حملہ آور ہو کر وہاں سے کامیاب واپس ہوا۔ اس کے بعد بغداد پہنچا دیلمیوں کی حکومت کا خاتمہ

کیا اور خلیفۂ بغداد کا مدار المہام اور حامیٔ خلافت مقرر ہوا۔ خلیفہ کے دربار سے خلعت و خطاب پایا۔ ۴۲۷ھ میں بغداد کے اندر طغرل بیگ کا خطبہ پڑھا گیا۔ خاندانِ خلافت سے رشتہ داری کا شرف حاصل کر کے ۸۔ رمضان المبارک ۴۵۵ھ کو جمعہ کے دن ستر برس کی عمر میں طغرل بیگ نے وفات پائی۔ جغر بیگ اس سے چار سال پہلے ۱۸۔ رجب ۴۵۱ھ کو فوت ہو چکا تھا۔

الپ ارسلان

طغرل بیگ لاولد فوت ہوا۔ اس لئے اس کے بعد اس کا بھتیجا الپ ارسلان بن جغر بیگ اس کا جانشین اور مدار المہام خلافت مقرر ہوا۔ ۴۶۵ھ میں بتاریخ ۱۔ ربیع الاول سلطان الپ ارسلان نو برس اور ڈھائی مہینے حکومت کرنے کے بعد فوت ہوا۔ سلطان الپ ارسلان بڑا ہی دین دار، عالی جاہ اور اپنے زمانے کا سب سے بڑا زبردست شہنشاہ تھا۔ الپ ارسلان نے ایک مرتبہ صرف بارہ ہزار سواروں سے عیسائیوں کی تین لاکھ جرّار فوج کو شکستِ فاش دے کر قیصر روم کو گرفتار کر لیا تھا۔

ملک شاہ سلجوقی

الپ ارسلان کے بعد اس کا بیٹا ملک شاہ سلجوقی تخت نشین ہوا ملک شاہ نے شام و مصر کو بھی اپنی حکومت میں شامل کیا اِدھر دریائے سیحوں کے دوسری طرف تک اس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ ملک شاہ کی حدودِ حکومت الپ ارسلان سے بھی زیادہ وسیع تھیں۔ دیوارِ چین سے بحرِ قلزم تک ملک شاہ کا حکم جاری اور اس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ ۴۸۲ھ میں ملک شاہ نے وفات پائی۔

برکیارق

اس کے بعد اس کا بیٹا برکیارق تخت نشین ہوا۔ اور سلجوقیوں کا زوال شروع ہو گیا۔ برکیارق کے بعد اس کا بھائی محمد بن شاہ ۴۹۶ھ میں تخت نشین ہوا۔

سلطان سنجر

اس کے بعد سنجر بن ملک شاہ ۵۰۹ھ میں تخت نشین اور سلطان السلاطین کے نام سے موسوم ہوا۔ اسی سے سلطان بہرام غزنوی نے دب کر خراج گزاری گوارا کی تھی۔

سلطان سنجر نے ۵۵۲ھ میں وفات پائی۔ اسی سال محمود خاں تخت نشین ہوا اس کے زمانے میں خراسان کے ایک حصے پر غوریوں نے اور دوسرے حصے پر خوارزم شاہیوں نے قبضہ کر کے خراسان سے سلجوقیوں کی حکومت کا نام و نشان مٹا دیا۔

دُنیا میں ہمیشہ یوں ہی ہوتا چلا آیا ہے:

جہاں بجتے ہیں نقارے وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں!

ایک بنتا ہے ایک بگڑتا ہے، تعمیر اور تخریب میں چولی دامن کا ساتھ ہے، ایک حکومت قائم ہوتی ہے دوسری فنا ہو جاتی ہے۔ سلجوقی کس دبدبے کے ساتھ بزم عالم میں نمودار ہوئے تھے، لیکن غوریوں اور خوارزم شاہیوں نے ان کا نام و نشان مٹا دیا اور یہ اس شان سے ابھرے جیسے دُنیا ان کی آمد کے بغیر نامکمل تھی اور پھر ایک دن وہ آیا کہ یہ بھی آغوشِ لحد میں جا سوئے!

۶۔ خوارزم شاہی حکومت

محمد شاہ اور جلال الدین خوارزم شاہ کی داستان

ملک شاہ سلجوقی کا ایک ترکی غلام نوشتگین کا بیٹا قطب الدین سلطان سنجر کی خدمت میں رسوخ رکھتا تھا۔ سلطان سنجر سلجوقی نے قطب الدین کو خوارزم کا حاکم مقرر کیا۔ یہ قطب الدین جب کبھی سلطان سنجر کی خدمت میں حاضر ہوتا تو اپنے اسی شاہانہ لباس میں خدمت گاری کے تمام کام حسب دستور سابق انجام دیتا۔ یہ عرصہ دراز تک علاقہ خوارزم کا حاکم رہا۔ اور خوارزم کی مناسبت سے خوارزم شاہ مشہور ہوا۔ اس کے بعد اس کی اولاد بھی اسی نام سے مشہور ہوئی اور اس خاندان کے تمام فرماں روا خوارزم شاہی فرماں روا کہلائے۔

ابتداءً یہ سلطان سنجر کا فرماں بردار رہا لیکن جب سلطان سنجر کے اقبال کو زوال ہوا اور وہ ترکانِ غز کے ہاتھ میں گرفتار ہو گیا تو اس نے خود مختاری کا اعلان کیا۔ اور ماوراء النہر کے علاقے پر بھی چڑھائی کی۔ رشید الدین وطواط مشہور شاعر اس کے دربار میں رہتا تھا جس طرح انوری سلطان سنجر سلجوقی کا درباری شاعر تھا۔

اس کے بعد اس کا بیٹا اتسز خوارزم شاہ تخت نشین ہوا۔

۵۴۰ھ کے قریب اتسز فوت ہوا تو اس کی جگہ اس کا بیٹا ارسلان شاہ ۵۵۱ھ میں تخت نشین ہوا مگر تکش خان نے غالب آکر ۵۸۳ھ میں تاج شاہی اپنے سر پر رکھا۔ اسمٰعیل بن حسن مصنف ذخیرہ خوارزم شاہی اور خاقانی شاعر اسی کے عہد میں ہوئے۔

محمد خوارزم شاہ اس نے جب وفات پائی تو اس کی جگہ اس کا بیٹا سلطان محمد

خوارزم شاہ ۵۹۰ھ میں تخت نشین ہوا۔ اس نے قریباً اکیس سال حکومت کی، اس نے اپنی حدودِ حکومت کو بہت وسیع کیا۔ اس سے اور خلیفہ بغداد سے اَن بن ہو گئی۔ چنانچہ وہ بغداد کی طرف ایک جرار فوج لے کر چلا تاکہ خلیفہ کو معزول کر کے اس کی جگہ سیّد علاء الملک ترمذی اپنے پیر کو تختِ خلافت پر بٹھائے۔ خلیفہ نے حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کو اس کے پاس بھیجا کہ یہ نصیحت کر کے خوارزم شاہ کو اس ارادے سے باز رکھیں۔ اور آپس میں صلح و آشتی پیدا ہو جائے۔ مگر اس سفارت کا کوئی اثر نہ ہوا اور سلطان محمدؒ خوارزم شاہ اپنے ارادے سے باز نہ آیا۔ لیکن برف باری سے سخت نقصان اٹھا کر عراق سے واپس ہونا پڑا۔ ابھی یہ عراق ہی میں تھا کہ چنگیز خاں نے اس کے ملک پر حملہ کیا اور متواتر شکستیں دیں۔

سلطان محمدؒ خوارزم شاہ اپنے زمانے میں بہت زبردست بادشاہ تھا اس سے دُور دُور کے سلاطین ڈرتے تھے۔ تمام دُنیا میں اس کی دھاک بیٹھی تھی۔ مگر اس برف باری کے واقعے سے اس کے اقبال میں ایسا گھن لگا کہ وہ برابر تباہی کی طرف بڑھتا رہا۔ آخر اس حالت میں فوت ہوا کہ کفن بھی میسّر نہ آسکا۔

جلال الدین خوارزم شاہ

محمد شاہ کے بیٹوں میں جلال الدین خوارزم شاہ سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اس نے سندھ کے کنارے چنگیز خاں کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا مگر کوئی مفید نتیجہ نہ نکلا۔ ہندوستان کی حدود میں داخل ہو کر اور چند روز سندھ میں رہ کر پھر واپس چلا گیا۔ اور اسمٰعیلی الموت کے فدائیوں کا بہت کچھ زور توڑتا گیا۔ ایک طرف مغلوں سے لڑا دوسری طرف فرنگیوں یعنی رومیوں سے بھی خوب لڑا۔ عراق میں اس نے فتوحات حاصل کیں مگر حالات کچھ ایسے ناموافق تھے کہ اپنی کھوئی ہوئی سلطنت دوبارہ حاصل نہ کرسکا۔ اور گم نامی کے عالم میں مارا گیا یا فقیری لباس میں روپوش ہو گیا اور یہ خاندان بھی مٹ گیا۔

غوریوں کی حکومت

جاہ و جلال اور عروج و فروغ کی کہانی!

ہرات کے مشرقی کوہستان میں غور ایک وسیع خطے کا نام ہے۔ محمود غزنوی نے اس علاقے کو فتح کر کے اپنی سلطنت کا ایک صوبہ بنا لیا تھا۔ غور کے باشندوں نے دوسری صدی ہجری کے شروع میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ یہاں سب افغانی قومیں آباد تھیں محمود غزنوی نے غور کی صوبہ داری پر انہیں افغانوں کے ایک شریف شخص کو مامور فرما دیا تھا۔ جس کے خاندان میں غور کی حکومت بطور صوبہ داری چلی آتی تھی۔

قطب الدین غوری اتفاقاً سلطان بہرام غزنوی اور غور کے حاکم قطب الدین میں کسی بات پر ناچاقی پیدا ہوئی۔ اور نوبت جنگ و پیکار تک پہنچی۔ اس لڑائی میں قطب الدین مارا گیا۔

سیف الدین غوری سیف الدین نے اپنے بھائی کے انتقام میں غزنی پر فوج کشی کر کے بہرام غزنوی کو غزنی سے نکال دیا اور خود تختِ غزنی پر متصرف ہو گیا۔ بہرام غزنوی نے اطرافِ ملک سے امداد حاصل کر کے غزنی پر حملہ کیا اور سیف الدین کو گرفتار کر کے نہایت بے دردی اور سخت اذیتوں کے ساتھ قتل کیا۔

علاء الدین غوری علاء الدین غوری کو یہ حال معلوم ہوا تو وہ اپنے دونوں مقتول

بھائیوں کے خون کا بدلہ لینے کے لیے غزنی پر حملہ آور ہوا۔ علاء الدین غوری اور اس کے ہم وطن نہایت جوش و خروش کے ساتھ غزنی کی طرف بڑھے تو بہرام غزنوی نے ان کو زر و جواہر کا لالچ دے کر واپس کرنا چاہا، اور صلح و آشتی کی تمہید ڈالی لیکن علاء الدین غوری نے غزنی فتح کر لیا۔ اور جوش انتقام میں باشندگانِ غزنی کا قتلِ عام کیا۔ سلاطینِ غزنی کے بعض مقبروں کو مسمار کیا۔ مکانوں کو آگ لگا دی اور ایک ہفتہ تک اس قتل و خوں ریزی کے سلسلے کو جاری رکھا جس کی وجہ سے وہ علاء الدین جہاں سوز کے نام سے مشہور ہوا۔ غزنی کے بہت سے لوگوں کو گرفتار کر کے لے گیا۔ اور وہاں ان کو قتل کر کے ان کے خون سے گارا بنوا کر شہر پناہ کی تعمیر میں استعمال کیا۔ یہ واقعہ ۵۴۷ھ کا ہے۔

علاء الدین جہاں سوز غوری نے غزنی کی فتح کے بعد غزنی میں اپنا ایک نائب السلطنت مقرر کیا اور خود غور کی جانب اپنے دار الحکومت فیروزکوہ کی جانب چلا گیا۔ اس طرح غزنی غور کی سلطنت کا ایک صوبہ بن گیا۔ بہرام غزنوی چونکہ سلطان سنجر سلجوقی کی سیادت کو تسلیم کر چکا تھا۔ لہٰذا اس نے ہندوستان سے سلطان سنجر سلجوقی کے پاس فریاد نامے بھیجے۔ سلطان سنجر سلجوقیؒ نے دوسرے سال حملہ کر کے غور و غزنی کو فتح کر کے بہرام غزنوی کو پھر اپنی طرف سے غزنی پر قابض کر دیا۔ اور علاء الدین جہاں سوز غوری کو گرفتار کر کے اپنے ہمراہ لے گیا۔ علاء الدین بہت سمجھ دار، دور اندیش اور قابل شخص تھا۔ چنانچہ چند ہی روز کے بعد سلطان سنجر نے علاء الدین کی قابلیتوں سے واقف اور خوش ہو کر اس کو رہا کر دیا۔ اور وہ اپنے وطن غور میں آ کر پھر حکومت کرنے لگا۔

اس کے بعد ترکانِ غز نے سلطانِ سنجر کو گرفتار کر لیا۔ سلطانِ سنجر کے قید ہونے کے بعد علاء الدّین غوری نے بہرام غزنوی کو بے دخل کر کے غزنی پر بھی قبضہ کر لیا اور چند روز کے بعد مر گیا۔

سیف الدّین غوری علاء الدین غوری کو دولتِ غوریہ کا پہلا خود مختار بادشاہ سمجھنا چاہیے۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا

سیف الدین ثانی غور کے تخت پر بیٹھا اور ڈیڑھ سال کے قریب حکومت کر کے ترکان غز کی ایک لڑائی میں اپنے ہی ایک سردار کے ہاتھ سے مارا گیا۔

غیاث الدین غوری

اس کے بعد علاء الدین غوری کا بھتیجا غیاث الدین غوری تخت نشین ہوا۔ اس کا ایک بھائی شہاب الدین غوری تھا وہ بھی اپنے بھائی کے ساتھ حکومت و سلطنت میں شریک تھا۔ غیاث الدین اور شہاب الدین دونوں بڑے اتفاق و محبت سے رہتے تھے اور دونوں بادشاہ سمجھے جاتے تھے۔ خراسان کے ملک کا اکثر حصہ اپنی حکومت میں شامل کرنے کے بعد غوریوں نے ہندوستان کی طرف توجہ کی۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو سلطنتِ غزنوی کا جانشین سمجھتے اور جس قدر ملک سلطان محمود غزنوی کے قبضے میں تھا اس تمام ملک کو قبضے میں لانا اپنا جائز حق تصور کرتے تھے۔ پنجاب میں بہرام غزنوی کی اولاد حکمراں تھی۔ چنانچہ اس سے پنجاب کا ملک چھین لینا انھوں نے ضروری سمجھا اور شہاب الدین غوری نے ۵۸۲ھ میں خسرو ملک غزنوی کو لاہور سے گرفتار کر کے اپنے بھائی غیاث الدین غوری کے پاس غور کی طرف بھیج دیا اور خود دار السلطنت لاہور پر قابض و متصرف ہو گیا۔

شہاب الدین غوری

۵۹۹ھ میں غیاث الدین غوری کا انتقال ہوا اور اس کی جگہ اس کا بھائی شہاب الدین غوری فیروزکوہ میں تخت نشین ہوا۔ غیاث الدین غوری کے عہدِ حیات میں شہاب الدین غوری ہندوستان کے راجہ پرتھوی راج کو شکست دے کر اور گرفتار کر کے قتل کر چکا تھا۔ اب جب وہ فیروزکوہ میں غور کے تخت پر بیٹھا تو ہندوستان میں اس کی طرف سے اس کا غلام قطب الدین ایبک فرماں روا تھا۔ اپنی بادشاہت کے زمانے میں سلطان شہاب الدین غوری ایک مرتبہ ہندوستان آیا ہوا تھا۔ یہاں سے واپس غور کی طرف جا رہا تھا کہ ۶۰۲ھ میں فدائیوں یا گکھڑوں کے ہاتھ سے اپنے خیمے میں رات کے وقت دھوکے سے شہید کیا گیا۔ شہاب الدین غوری کی وفات کے بعد دولتِ غوریہ کا شیرازہ درہم برہم ہو گیا۔

۸۔ خاندانِ اتابک

ہلاکو خاں کے حملۂ بغداد تک کے واقعات!

سلاطینِ سلجوقیہ اپنے شہزادوں کو تعلیم و تربیت اور اخلاقِ فاضلہ سکھانے کے لیے جن اتالیقوں کے سپرد کرتے تھے وہ اتابک کہلاتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان اتالیقوں یا اتابکوں کو وزارت اور ملکوں کی حکومت ملنے لگی۔ اور خاندانِ سلجوقیہ کے کمزور ہونے پر ان اتابکوں نے مختلف ملکوں اور صوبوں میں اپنی خودمختار حکومتیں قائم کیں۔ چنانچہ ان اتابکوں کے بہت سے خاندان شام، عراق، فارس وغیرہ میں برسرِ حکومت رہے اور بعض نے عالمِ اسلام میں بڑی ناموری حاصل کی۔

سلطان سنجر سلجوقی کے عہدِ حکومت میں مظفر الدین سنقر بن مودود سلغری فارس کا عامل و حاکم تھا سلطان سنجر کی وفات کے بعد اس نے اپنا خطاب اتابک تجویز کیا اور ملکِ فارس پر خودمختارانہ حکومت کرنے لگا۔ ۵۵۶ھ میں فوت ہوا۔

اس کے بعد اس کا بھائی مظفر الدین اتابک تخت نشین ہو کر ۵۷۱ھ تک فرماں روا رہا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا تکلہ تخت نشین ہو کر بیس سال تک فرماں روائے فارس رہا۔

اتابک سعد بن زنگی اس کے بعد اتابک سعد بن زنگی ۲۸ سال تک فرمانروا رہ کر ۶۲۲ھ میں فوت ہوا۔ اسی اتابک سعد کے نام پر شیخ مصلح الدین

شیرازی نے اپنا تخلص سعدی رکھا۔

اتابک ابوبکر زنگی

اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ابوبکر سعد بن زنگی تخت نشین ہوا۔ اسی کے عہد میں ہلاکو خاں کے ہاتھ سے بغداد کی تباہی عمل میں آئی۔ اس نے مغلوں کی باج گزاری اختیار کر لی تھی۔

اس کے بعد اس کا پوتا اتابک محمد تخت نشین ہوا۔ غرض ۶۶۳ھ تک یہ خاندان شیراز و فارس میں برسرِ حکومت اور مغلوں کا خراج گزار رہا۔

اس خاندان نے تاریخ میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں جو اپنی عظمت اور اہمیت کے لحاظ سے ناقابلِ فراموش ہیں، لیکن موت جس طرح افراد و اشخاص کے لیے اٹل ہے اسی طرح خاندانوں اور قوموں کے لیے بھی اٹل ہے۔ یہ بھی مرتے ہیں اور وہ بھی جامِ فنا نوش کرتے ہیں!

۹۔ حکومتِ الموت

علاقۂ قہستان میں الموت و قزوین وغیرہ کے قلعے حسن بن صباح نے اپنے قبضے میں لے کر ایک سلطنت کی بنیاد دولتِ سلجوقیہ کے عین عالمِ شباب میں قائم کی تھی۔

حسن بن صباح حسن بن صباح کو سلجوقیوں کی حملہ آوری اور محاصرہ کے دوران اپنے بیوی بچوں کو ایک دوسرے قلعے میں احتیاطاً بھیجنے کی ضرورت پیش آئی تو اس نے اس قلعے کے حاکم کو تاکید کر دی کہ میری بیوی خود ہی سوت کات کر اپنے خورد و نوش کے لیے سامان فراہم کرے گی۔ تم کو اس کی کوئی مہمان نوازی نہیں کرنی چاہیے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حسن بن صباح نہ صرف خود ہی سادہ زندگی بسر کرتا تھا بلکہ وہ اپنے اہل و عیال کو بھی راحت طلبی سے دُور رکھنا چاہتا تھا۔

کیا بزرگ حسن بن صباح کی وفات کے بعد کیا بزرگ امید الموت میں تخت نشین ہوا۔ سلطان محمد سلجوقی اور کیا بزرگ کے درمیان محمد سلجوقی کی وفات تک لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ محمد سلجوقی کی وفات کے بعد کیا بزرگ امید نے سلجوقیوں کے کئی قلعوں کو اپنی حکومت میں شامل کیا اور گیلان کو خوب لوٹا۔

محمدؐ بن کیا بزرگ کیا بزرگ امید کے بعد اس کا بیٹا محمدؐ نامی تخت نشین ہوا۔ اس کے عہدِ حکومت میں فدائیوں نے جا بجا بادشاہوں اور بڑے

آدمیوں کو قتل کرنا شروع کیا۔ جب قتل کی وارداتیں کثرت سے وقوع پذیر ہوئیں تو ایران کے لوگوں نے سلطان سنجر سلجوقی کی خدمت میں فریاد کی۔ اور علماء نے ان فدائیوں کے خلاف قتل کے فتوے دیے۔ سلطان سنجر نے ایلچی الموت میں بھیجے کہ وہ ان لوگوں کے اعمال و عقائد کی نسبت صحیح حالات معلوم کر کے آئیں، چنانچہ مجلسِ مناظرہ منعقد ہوئی۔ اور ان ملاحدہ نے اپنی بے گناہی کے ثبوت پیش کرنے کی خوب کوششیں کیں آخر یہ افہام و تفہیم بلا نتیجہ رہی اور سلطان سنجر نے ان ملاحدہ کے قتلِ عام کی نسبت حکم دینے میں تامل اور احتیاط ہی کو ضروری خیال کیا۔

حسن بن محمدؒ تین سال کے بعد محمد بن کیا بزرگ امید فوت ہوا اس کی جگہ حسن بن محمد تخت نشین ہوا۔ اس نے اپنے فرقے میں دہریت اور بے دینی کو بہت ترقی دی۔ ۵۶۱ھ میں جب یہ فوت ہوا تو اس کی جگہ اس کا بیٹا علاء الدین تخت نشین ہوا۔ اس کے زمانے میں امام فخر الدین رازی نے آذربائیجان سے رے میں آکر سلسلۂ درس جاری کیا۔ وہ اپنے وعظ و درس میں فرقۂ ملاحدہ کے خلاف اکثر فرمایا کرتے تھے تاکہ لوگ ان کی طرف یعنی فدائیوں کی طرف مائل نہ ہوں۔ فدائیوں نے رے میں پہنچ کر امام فخر الدین رازی کو قتل کی دھمکیاں دیں۔ اور ان کو متنبہ کیا کہ اگر تم ہمارے خلاف باتیں بیان کرنے سے باز نہ آؤ گے تو قتل کر دیے جاؤ گے۔ اس کے بعد امام موصوف رے سے روانہ ہو کر غور میں غیاث الدین غوری اور اس کے بھائی شہاب الدین غوری کے پاس چلے آئے اور سلطان شہاب الدین کے ساتھ ہندوستان کے سفروں میں شامل رہے۔ چنانچہ سلطان شہاب الدین کی فوج میں آپ بطور امام مامور تھے۔ یعنی نمازوں کی امامت آپ ہی فرماتے تھے۔ اسی سلسلے میں سلطان شہاب الدین کی شہادت فدائیوں کے ہاتھ سے ۶۰۲ھ میں ہوئی جس کے بعد امام فخر الدین رازی خوارزم شاہ کے پاس چلے گئے۔

جلال الدین محمدؒ علاء الدین محمدؒ کے بعد اس کا بیٹا جلال الدین حسن الموت میں تخت نشین ہوا۔ اس نے باپ اور دادا کے عقائد سے

توبہ کی اور اپنی اس توبہ کا حال تمام سلاطینِ اسلام کے پاس لکھ کر بھیجا۔ چنانچہ یہ عالمِ اسلام میں جلال الدین حسن نومسلم کے نام سے مشہور ہوا۔ خلیفہ ناصر عباسی بھی جلال الدین سے بہت خوش ہوا۔ چنانچہ جب جلال الدین حسن کی ماں حج کرنے کے لیے خانۂ کعبہ میں گئی تو خلیفہ کے حکم سے سلطان محمد خوارزم شاہ کا رایت جلال الدین حسن کی ماں کے رایت کے پیچھے رکھا گیا، اس طرح خلیفہ نے جلال الدین حسن کی ہمت افزائی کی۔ مگر سلطان محمد خوارزم شاہ اس بات سے بے حد ناخوش ہوا۔ اور اسی کا نتیجہ تھا کہ خوارزم شاہ نے خلیفۂ بغداد کے خلاف مہم تیار کی۔

علاء الدین حسن

جلال الدین حسن کی وفات کے بعد اس کا نو سالہ بیٹا علاء الدین محمد تخت نشین ہوا۔ چونکہ یہ کمسن تھا، اس کے وقت میں سلطنت کے اندر بہت سے فتنے پیدا ہوئے اور مذہبی معاملات میں بھی مسخرانگیز باتوں کا اظہار ہونے لگا۔ نصیر الدین طوسی بھی اسی کے عہد میں تھا۔ ۶۵۲ھ میں اس کا انتقال ہوا اور اس کا بیٹا رکن الدین خورشاہ تخت نشین ہوا۔ ہلاکو خاں نے حملہ کر کے رکن الدین خورشاہ کو گرفتار اور اس کے قلعوں کو مسمار کر دیا۔ اس طرح اس خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔ آغا خاں اسی خاندان کی یادگار ہیں۔

تاریخ کے اوراق فدائیوں کے واقعات سے بھرے پڑے ہیں، ان کے عقائد و اعمال کے بارے میں جو کچھ بھی کہا جائے مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس فرقے کے اندر مر مٹنے اور جان دے دینے کا جذبہ بے پناہ تھا۔ دنیا کی بڑی بڑی حکومتوں سے ان لوگوں نے ٹکر لی۔ دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں سے انھوں نے مقابلہ کیا، دنیا کے بڑے بڑے لوگوں کو انتہائی بے جگری سے کام لے کر انھوں نے قتل کیا اور اگر خود پکڑے گئے تو مردانہ وار ہنستے کھیلتے قتل ہو گئے۔

حسن بن صباح اور فدائیوں کے متعلق جو کچھ کہا جاتا ہے اس میں حقیقت بھی ہے اور افسانہ بھی۔ مولانا عبدالحلیم شرر نے اپنا مشہور ناول "فردوس بریں" لکھ کر افسانے کا رنگ اور زیادہ چوکھا کر دیا ہے اور پروفیسر مرزا محمد سعید دہلوی مرحوم نے "باطنی مذہب"

لکھ کر حقیقت کو زیادہ سے زیادہ اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

آغاخان اس خاندان کی یادگار اور اس فرقے کے "حاضر امام" ہیں۔

لیکن آغاخاں ایک اصول پر سختی سے عامل ہیں اور اس کا ذکر انھوں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں بھی کیا ہے یعنی اپنے عقائد کی تبلیغ یہ مسلمانوں میں نہیں کرتے، غیر مسلموں میں کرتے ہیں۔ عقائد سے قطع نظر باقی تمام معاملات میں، عام مسلمانوں کے ساتھ تعاون کرتے اور اُن کا ساتھ دیتے ہیں، چنانچہ پاکستان کی تحریک میں جوش و خروش کے ساتھ آغاخاں اور ان کے پیرووں نے حصہ لیا، پھر پاکستان بن جانے کے بعد بھی اس ملک کے استحکام اور ترقی میں پورے جوش و خروش کے ساتھ سرگرم کار رہے موجودہ آغاخاں بھی اس مسلک پر سختی سے قائم ہیں!

تیرھویں منزل

زنگی اور ایوبی خاندان

اور

خاندانِ ممالیک

دفاعِ اسلام • عیسائیوں سے مقابلے • صلیبی لڑائیاں

حرف آغاز

قدرت کے کرشمے بھی بڑے عجیب ہیں!

بعض بڑے آدمی جو کام انجام نہیں دے پاتے وہ چھوٹے آدمی کر ڈالتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ بڑی بڑی حکومتیں اور سلطنتیں جو کارنامے انجام نہیں دے پاتیں وہ چھوٹی حکومتیں انجام دے ڈالتی ہیں۔:

یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے!

شام میں بھی اتابک خاندان کی ایک چھوٹی سی حکومت قائم تھی۔ لیکن اس حکومت سے قدرت کو اتنے اور ایسے بڑے کام لینے تھے جو وقت کے بڑے بڑے ملوک اور سلاطین سے بھی بن نہ آئے۔ یہی چھوٹی سی حکومت تھی جس نے عیسائیوں کے سیلِ رواں کو روکا، اور اسلام کی لاج رکھ لی۔ اس کے بعد اس خاندان کا پروردہ صلاح الدین ایوبی تھا جس نے صلیبی جنگوں میں عیسائیوں کے دانت کھٹے کر دیے اور ایوبی خاندان کی ایک مضبوط و مستحکم حکومت قائم کر لی۔

اگلے صفحات میں ہم انہی دونوں نامور خاندانوں کا مختصراً تذکرہ کریں گے۔

نورالدّین زنگی

۵۲۱ھ میں اتابک عماد الدّین زنگی نے ملکِ شام میں اپنی آزاد اور خود مختار حکومت قائم کرلی۔

۵۴۴ھ میں عماد الدّین زنگی کے انتقال کے بعد اس کا نامور بیٹا نورالدین زنگی تختِ حکومت پر بیٹھا۔ دوسرے دو بھائی بھی اپنے اپنے علاقوں پر حکمراں رہے۔ لیکن نورالدین زنگی کی بالادستی صدقِ دل سے قبول کیے رہے۔ اس خاندان کی حکومت حلب، موصل اور دمشق میں تھی۔ نورالدّین خدا ترس، عابد اور حد درجہ شجاع اور اسلامی درد رکھنے والا فرماں روا تھا۔

بیت المقدس پر ۴۹۰ھ سے عیسائی قابض اور متصرف چلے آرہے تھے۔ کسی مسلمان حکومت میں سکت نہ تھی کہ انھیں بے دخل کرسکتا۔ سارا یورپ بیت المقدس (یروشلم) کی عیسائی حکومت کا پشت پناہ اور ناصر و مددگار تھا، نورالدّین کو صرف ایک دُھن تھی، یہ کہ بیت المقدس عیسائیوں کے قبضے سے آزاد کرالیا جائے، لیکن موت نے مہلت نہ دی، آخر اس کی یہ آرزو اس کے غلام اور جانشین سلطان صلاح الدّین نے انجام دی۔

یہ زمانہ عالمِ اسلام کے لیے بہت نازک تھا۔ یورپ کے عیسائیوں نے متفقہ طاقت سے

شام و مصر پر رش اور یلغار اس یورش اور یلغار کی زد پر صلاح الدین ایک پہاڑ بن کر ڈٹ گیا۔
دوسری طرف ملاحدہ موت یعنی فدائیوں نے جو چھپ کر حملہ کرتے اور مسلمان امرار کو قتل کرنا ثواب جانتے تھے ایک ہتلکہ عظیم برپا کر رکھا تھا، ان فدائیوں سے لوگ بہت خائف و ترساں تھے۔ ان ظالموں نے سلطان صلاح الدین کو بھی قتل کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔

نور الدّین کے جذبۂ ملی اور حمیت اسلامی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس نے نہ اپنی بے سروسامانی کا لحاظ کیا نہ اپنے وسائل اور ذرائع کی کمی کو سدّ راہ بننے دیا۔ وہ اسلام کے لیے اور اسلام کی حرمت کے لیے جان کی بازی لگا دینے کا فیصلہ کر چکا تھا یہی جذبہ تھا جو نازک اور خطرناک بلکہ مہلک مواقع پر اس کا حوصلہ بڑھاتا رہا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میدان چھوڑ چکا ہوتا!

صلاح الدّین ایوّبی

زنگی کے بعد شام کے تمام سرداروں نے مل کر صلاح الدّین کو ملک شام کا باقاعدہ بادشاہ تسلیم کیا اور سلطان صلاح الدین نے بیت المقدس کو عیسائیوں کے قبضے سے نکالنے کی کوشش شروع کی ۵۸۳ھ میں سلطان صلاح الدّین نے ایک جنگِ عظیم کے بعد بیت المقدس کے عیسائی بادشاہ کو میدانِ جنگ میں گرفتار کرلیا۔ اور پھر اس سے یہ اقرار لے کر کہ وہ سلطان صلاح الدین کے مقابلے میں نہ آئے گا، چھوڑ دیا۔ اس کے بعد عکّہ پر قبضہ کرلیا۔ اور ۵۸۳ھ میں بیت المقدس کو فتح کرلیا۔ ۴۹۰ھ سے ۵۸۳ھ تک یعنی ۹۲ سال کے قریب بیت المقدس عیسائیوں کے قبضے میں رہا۔ عیسائیوں نے جب بیت المقدس کو مسلمانوں کے قبضے سے چھینا تھا تو مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہادی تھیں۔ لیکن سلطان صلاح الدّین ایوّبی نے جب اس مقدّس شہر کو عیسائیوں سے فتح کیا تو کسی عیسائی باشندے کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ بیت المقدس کی فتح کا حال سُن کر تمام برِّ اعظم یورپ میں ایک حشر برپا ہوگیا۔ اور گھر گھر کہرام مچ گیا۔ چنانچہ فلپ شہنشاہِ فرانس، رچرڈ شیر دل بادشاہِ انگلستان، فریڈرک شہنشاہِ جرمنی اور بہت سے بادشاہ، نواب اور امراء لشکرِ عظیم لے کر متفقہ طور پر برِّ اعظم ایشیا کو فتح کر کے اسلام کا نام و نشان مٹانے کے ارادے سے حملہ آور ہوئے۔ عیسائی افواجِ جرار کا یہ سمندر اس طرح متلاطم ہوا اور

اس شان و شوکت کے ساتھ ملکِ شام کی طرف بڑھا کہ بہ ظاہر برّ اعظم ایشیا کی خیر نظر نہیں آتی تھی مگر سلطان صلاح الدّین نے چار سال تک کئی سو لڑائیاں لڑ کر عیسائیوں کے اس بے پایاں لشکر کو خاک و خون میں ملا دیا مگر بیت المقدس کی دیواروں تک نہیں پہنچنے دیا۔ آخر ناکام و نامراد یہ عیسائی سلاطین نہایت ذلّت کے ساتھ واپس ہوئے پھر بھی سلطان صلاح الدّین نے عیسائیوں کو یہ رعایت دی کہ وہ اگر بیت المقدس میں محض زیارت کے لیے آئیں تو کسی قسم کی روک ٹوک نہ کی جائے گی۔

ان لڑائیوں میں صلاح الدّین نے جس شرافت و انسانیت کا برتاؤ کیا اور جس شجاعت و جفاکشی کا اس سے اظہار ہوا اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج بھی تمام یورپ سلطان صلاح الدّین کو عزّت و عظمت کے ساتھ یاد کرتا اور اس کے نام کو شجاعت و شرافت کا مترادف سمجھتا ہے، حالانکہ سلطان صلاح الدین ہی نے تمام برِ اعظم یورپ کو اس کے مقصدِ وحید میں ناکام و نامراد رکھ کر واپس بھگایا تھا ۵۸۹ھ میں سلطان صلاح الدّین نے وفات پائی۔

ملک العزیز سلطان صلاح الدین کی وفات کے بعد اس کا بیٹا عثمان الملقب بہ ملک العزیز تخت نشین ہوا۔ اس نے چھ سال نہایت نیک نامی کے ساتھ حکومت کی۔ ۵۹۵ھ میں جب فوت ہوا تو اس کی جگہ اس کا بیٹا ملک منصور تخت نشین ہوا مگر ایک سال کے بعد معزول ہوا تو اس کے بعد ملک عادل سلطان صلاح الدّین کا بھائی تخت نشین ہوا۔ یہ بڑا نیک اور قابلِ ستائش سلطان تھا۔ اس نے ۶۱۵ھ میں وفات پائی۔ اس کی جگہ اس کا بیٹا ملک کامل تخت نشین ہوا۔ یہ بھی بہت نیک نام بادشاہ تھا۔ ۶۳۵ھ میں اس کا انتقال ہوا تو اس کی جگہ اس کا بیٹا ملک عادل ابوبکر تخت نشین ہوا۔ دو برس کے بعد امرائے مصر نے اس کو محبوس کر کے اس کے بھائی ملک صالح بن ملک کو مصر کے تخت پر بیٹھایا اس نے دس سال حکومت کی آخر عیسائیوں کی لڑائی میں شہید ہوا۔ اس کے بعد ملک معظم توران شاہ بن ملک صالح ۶۴۷ھ میں تخت نشین ہوا مگر چند ہی مہینوں کی حکومت کے بعد مقتول ہوا۔ اس کے بعد ملکہ شجرۃ الدر

۶۴۸ھ میں تخت نشین ہوئی اور چند مہینے کی حکومت کے بعد وہ بھی تختِ سلطنت سے جُدا ہوگئی۔ اس کے بعد ملک اشرف ۶۴۸ھ میں تخت نشین ہوا۔ ۶۵۲ھ میں اس کو اسی خاندان کے غلاموں نے معزول کیا اور خاندانِ ایوبیہ کُردیہ کا خاتمہ ہوگیا۔

ملک معز عزالدین

جب خاندانِ ایوبیہ کو زوال آیا اور غلاموں کے ہاتھ میں سلطنت کے تمام امور آگئے تو انھوں نے انتخاب کے ذریعے اپنے ہی لوگوں میں سے ایک شخص ملک معز عزالدین ایبک کو اپنا بادشاہ بنایا۔ ملک معز نے ملکہ شجرۃ الدر سے جو ملک صالح ایوبی کی کنیزک تھی اور چند مہینے بادشاہت کرچکی تھی نکاح کیا۔ ۶۵۵ھ میں مقتول ہوا۔

ملک منصور

اس کے بعد امرائے سلطنت نے اس کے بیٹے ملک منصور کو بادشاہت کے لیے منتخب کیا۔ یہ دو برس کے بعد سلطنت سے دست کش ہوگیا اس کی جگہ ملک مظفر بادشاہت کے لیے منتخب ہوا اور گیارہ مہینے سلطنت و حکومت پر فائز رہا۔ اس کے عہد میں ہلاکو کی فوج نے حملہ کرکے مصری فوج سے شکستِ فاش کھائی۔ ملک مظفر کو قتل کرکے ۶۵۸ھ میں ملک الظاہر رکن الدین تخت نشین ہوا۔ اس نے سترہ سال تک بڑی کامیابی سے حکومت کی اور ۶۷۶ھ میں اس کی وفات کے بعد ملک سعید ناصر الدین تخت نشین ہوا۔ ایک سال کے بعد اس کو بھی معزول کیا گیا۔ اس کے بعد ملک عادل بدر الدین تخت پر بٹھایا گیا۔ صرف چار مہینے سلطنت کرنے پایا تھا کہ معزول ہوا۔ ممالیک کی بعض خصوصیات قابلِ تذکرہ ہیں۔ ایک یہ کہ انھوں نے انتخاب کا طریقہ رائج کیا۔ یعنی کثرتِ رائے سے اپنا بادشاہ منتخب کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ اُن مغلوں کو جو قریباً تمام متمدن دُنیا کو تہ و بالا کرچکے تھے انھوں نے ہمیشہ شکست دے دے کر بھگایا۔ اور حدودِ مصر میں ان کو قدم نہ رکھنے دیا۔

ملک منصور قلاؤن

ملک عادل بدر الدین کے بعد ابوالمعالی ابوالمنصور قلاؤن اسی سلسلۂ انتخاب کے ذریعے مصر کا بادشاہ منتخب ہوا۔ اس نے ۶۷۸ھ سے ۶۸۹ھ تک گیارہ سال حکومت کی۔ اس کے زمانے میں سلطنتِ مصر کا

رقبہ کسی قدر وسیع ہوا۔ اس کے بعد ملک اشرف صلاح الدین خلیل تخت نشین ہوا۔ اس نے چند روز کے بعد خود سلطنت سے دست کشی اختیار کر لی مگر لوگوں نے مجبور کر کے اس کو پھر تختِ سلطنت پر بٹھایا اور ۴۴ سال کی حکومت کے بعد ۷۴۱ھ میں فوت ہوا۔ پھر کئی ناقابلِ ذکر بادشاہ ہوئے۔ پھر ۷۴۲ھ میں ملک ناصر احمد تخت نشین ہوا۔ ۷۴۵ھ میں اس کے مقتول ہونے پر ابوالفدا ملک صالح اسمٰعیل تختِ سلطنت پر متمکن ہوا۔ اس نے صرف ایک سال حکومت کی۔ یہ وہی ابوالفدا ہے جس نے وہ مشہور تاریخ لکھی جو تاریخ ابوالفدا کے نام سے مشہور ہے اور نہایت معتبر و مستند تاریخ سمجھی جاتی ہے۔

۷۴۶ھ میں ملک کامل شعبانی تخت نشین ہو کر چند ماہ کے بعد معزول کر دیا گیا۔ پھر یکے بعد دیگرے تختِ شاہی پر لوگ متمکن ہوتے رہے۔ آخر کار ۷۸۳ھ میں صالح حاجی تخت نشین ہوا۔ اور آٹھ نو سال کے بعد خود تختِ سلطنت سے دست بردار ہو کر دولتِ قلاؤنیہ کا خاتمہ کر دیا۔ یہ سلطنت قریباً ۱۰۴ سال تک قائم رہی۔

چرکسی خاندان

ملک صالح حاجی محمد کے بعد ملک طاہر برقوق تخت نشین ہوا جو قبیلہ چرکس سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے ۷۹۲ھ سے ۸۰۱ھ تک ۹ سال حکومت کی۔ اس کے بعد ملک ناصر تخت نشین ہوا۔ ملک ناصر نے چار سال حکومت کی۔ اس کے زمانے میں تیمور نے مصر کی طرف فوج کشی کی، مگر دولتِ ملوکیہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکا۔ اسی ملک ناصر نے خانۂ کعبہ میں حنفی، شافعی، حنبلی اور مالکی چار مصلے قائم کیے۔ اوّل اوّل بعض علمائے اسلام نے اس کو بدعت قرار دیا مگر پھر اس کی زیادہ مخالفت نہیں کی۔ کیونکہ اس کام سے کوئی فتنہ اور رخنہ دین میں پیدا نہیں ہوا۔

اس خاندان کا آخری بادشاہ ملک عادل تاجر ۹۰۷ھ میں تخت نشین ہوا۔ اور ساڑھے چار مہینے کے بعد مارا گیا۔ اس کے بعد ملک اشرف ابوالنصر قانصوہ تخت نشین ہوا اس نے ۹۲۲ھ تک پندرہ سال حکومت کی۔

خاتمہ بالخیر

سلطان سلیم اوّل عثمانی نے مصر پر ۹۲۲ھ میں چڑھائی کی اور ملک اشرف طومان کو جو اسی سال تخت نشین ہوا تھا شکست دے کر دولتِ چراکسہ کا خاتمہ کر دیا اور مصر

حکومتِ عثمانیہ میں شامل ہو گیا۔ اس کے ساتھ خلافتِ عباسیہ کے اس سلسلے کا بھی جو برائے نام مصر میں قائم تھا، خاتمہ ہو گیا۔

خاندانِ ایوبیہ کے بعد مصر میں مملوکیوں کے تینوں طبقوں کی حکومت دو سو ستر سال تک قائم رہی۔ ان مملوکیوں کے ابتدائی زمانے میں ہلاکو خاں نے بغداد کو برباد کر کے خلافتِ عباسیہ کا سلسلہ بغداد سے مٹا دیا تھا۔ مگر چند ہی روز کے بعد جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے مصر کے اندر خلفائے عباسیہ کا سلسلہ ان مملوکیوں کے ساتھ ساتھ شروع ہو گیا۔ اور مملوکیوں کے خاتمے ۹۲۲ھ تک باقی رہا۔

بہرحال سلطان سلیم عثمانی نے سلطنت و خلافت دونوں چیزوں کو اپنے وجود میں مجتمع کر لیا اور پونے تین سو سال کے بعد خلیفۂ اسلام کی حیثیت اپنی اصلی حالت یعنی جامۂ شہنشاہی میں نمودار ہوئی۔ مصر میں آخری عباسی خلیفہ مستمسک باللہ (۹۰۳ھ) تھا۔

چودھویں منزل

سلطنتِ ترکیہ

سلطان سلیم سے عصمت انونو تک

نگاہِ اوّلین

ترکوں نے اسلام قبول کیا اور دُنیا کی بہت بڑی عظیم المرتبت اور ناقابلِ فراموش قوم بن گئے۔

اسلام قبول کرنے سے پہلے وہ کچھ نہ تھے، اور اگر کچھ تھے تو صحرا نورد، جنگ جُو، غیر مہذب، جاہل۔

لیکن اسلام قبول کرنے کے بعد وہ ایک ناقابلِ تسخیر قوت بن گئے!

وہ ایشیا کے باشندے تھے لیکن یورپ تک ان کے وطن کے حدود وسیع ہو گئے!

انھوں نے دُنیا کی سب سے بڑی عیسائی حکومت کو شکست دی۔ بے انتہا قدیم مقدس اور مضبوط و مستحکم شہر کو جو شہر بھی تھا اور قلعہ بھی چٹکی بجاتے میں فتح کر لیا قسطنطنیہ عیسائیت کا دینی اور دُنیاوی مرکز، تہذیبی اور ثقافتی مرکز، علمی اور تمدنی مرکز، اب ترکوں کے قبضے میں تھا۔

ترکوں نے کئی سو برس تک خلافت کی اور اس مدت میں روس جیسی عظیم سلطنت کو بارہا شکستیں دیں۔ یورپ کی متحدہ یلغار کا مقابلہ کیا اور اسے شکستِ فاش دی۔ کئی مرتبہ ان کی فوجیں یورپ کے عظیم و جلیل شہروں تک فاتح کی حیثیت سے پہنچیں

اور کامیاب رہیں۔

پھر زمانے نے پلٹا کھایا، ترک حکومت کمزور ہوگئی۔ پہلی جنگِ عظیم میں اس نے شکست کھائی۔ خلافت سے دست بردار ہونے کے بعد اس نے اپنی قومی حکومت پر ساری توجہ صرف کردی اور ایک نئی زندگی کا آغاز کردیا۔

آنے والے صفحات اسی داستان کا بیان ہیں۔

اس داستان کا سب سے زیادہ دلچسپ اور ناقابلِ فراموش واقعہ یہ ہے کہ گو ترک مختلف ادوار سے گزرے اور ان کے فرماں رواؤں کے ذاتی خیالات و افکار نے دستورِ حکومت کی صورت اختیار کرلی، لیکن کبھی اور کسی موقع پر بھی ہر طرح کی کوششوں کے باوجود اسلام ترکوں کے دل سے باہر نہیں نکالا جاسکا، ترک آج بھی اتنے ہی کھرے مسلمان ہیں جتنے پہلے کبھی تھے!

ترک سلاطین اور فرماں رواؤں کا مجمل تعارف

۱۲۸۸ء میں ارطغرل کی وفات ہوئی، اس کا بڑا بیٹا عثمان خاں جانشین ہوا۔ ترکی حکومت کا دوسرا نام سلطنتِ عثمانیہ اسی عثمان خاں کی مناسبت سے مشہور ہے۔

عثمان خاں

عثمان اگرچہ جاگیردار سے بادشاہ ہو گیا تھا لیکن اس کی زندگی بڑی سادہ تھی۔ قوت و طاقت کے نشے نے اس میں تمرد اور سرکشی پیدا نہیں کی، اس کی فروتنی کچھ اور بڑھ گئی۔ وہ بڑا عادل اور انصاف دوست تھا۔ اس کے ایوانِ عدالت میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تمیز نہ تھی۔ دولت جمع کرنے سے اسے نفرت تھی، ساری دولت وہ غریبوں، یتیموں اور مستحقوں پر دریا دلی کے ساتھ خرچ کرتا تھا۔

فتح بروصہ کے بعد عثمان نے بہ حالتِ علالت اپنے چھوٹے بیٹے اورخاں کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ اسے وصیت کی کہ رعایا کے ساتھ بلا تفریق و امتیاز عدل کا برتاؤ کرے۔ وفات کے بعد عثمان کا ترکہ، ایک عمامہ، چند گھوڑے اور اسلحہ کے سوا کچھ نہ تھا۔

بیدار بخت

اورخاں نے تختِ سلطنت پر قدم رکھنے کے بعد اپنے بڑے بھائی علاء الدین کو اپنا وزیر مقرر کیا، اور دادِ حکومت دینے لگا اورخاں بھی باپ کی طرح بہادر، شجاع اور فیاض تھا۔

۱۳۵۸ء میں اورخاں کا بڑا اور چہیتا بیٹا، شکار کھیل رہا تھا کہ گھوڑے سے گر پڑا اور اس صدمے سے جانبر نہ ہو سکا اورخان کو اس حادثے کا بہت غم ہوا اور دوسرے ہی سال یعنی ۱۳۵۹ء میں وہ بھی غم کی تاب نہ لا کر وفات پا گیا۔ خاندانِ عثمانی کا یہ پہلا فرد تھا جس نے جاگیردار کی حیثیت سے سلطان کی حیثیت اختیار کی۔

اولوالعزم فرمانروا

یہ بڑا اولوالعزم اور منچلا بادشاہ تھا، اس میں باپ اور دادا کی تمام خصوصیتیں موجود تھیں اور کچھ ایسی خصوصیتیں بھی تھیں جو صرف اسی کا حصہ تھیں، شجاعت، دلاوری، فیاضی اور حسنِ سلوک میں تو یکتا تھا ہی تدبر اور فراست میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتا تھا، اس نے اپنے دورِ حکومت میں سلطنتِ عثمانیہ میں محیر العقول توسیع کر لی، رقبہ، آبادی، مالیات ہر اعتبار سے اس کی حکومت میں سلطنتِ عثمانیہ کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔

اپنے آبا و اجداد کی طرح اسے بھی دھن تھی کہ یورپ کی سرزمین کو کوکبہ شہریاری سے پامال کرے۔ عثمان خاں کی تمنا بالکل پوری نہ ہوئی اورخاں تھریس اور گیلی پولی تک پہنچ گیا۔ البتہ مرادِ اول کی حوصلہ مندی نے اسے یورپ میں مستقل فرمانروا کی حیثیت دے دی۔

مراد کے تدبر اور فراست، دانائی اور دوراندیشی کا ایک زمانہ قائل ہے۔ ایک مشہور انگریز مؤرخ اسے محمد فاتح پر بھی ترجیح دیتا ہے۔ ۱۳۸۹ء میں ایک سردار نے اظہارِ اطاعت کرتے ہوئے دھوکے سے عین میدانِ جنگ میں خنجر مارا اور قتل کر دیا۔

فتوحات کا سلسلہ

بایزید نے اس جنگ میں جو مراد اور متعدد عیسائی افواج کے درمیان ہوئی تھی بڑا نمایاں حصہ لیا تھا، باپ کی شہادت کے بعد وہی وارثِ تاج و نگیں قرار پایا۔

بڑی آن اور شان سے حکومت کی، یورپ میں ہلچل مچا دیا، فتوحات کا نہ رکنے والا سلسلہ قائم کیا۔ بہادری اور دلیری میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ ۱۴۰۳ء میں بہ حالتِ قید

اس دُنیا سے رخصت ہوا۔ تیمور لنگ نے اسے شکست دی تھی، اور خوش ہوا تھا لیکن اس کی موت پر اس کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے۔

سلطنت کا استحکام

بایزید کے انتقال کے بعد اس کے تین لڑکے سلطنت کے دعویدار بنے، محمد سب میں چھوٹا تھا، لیکن اپنی دانش مندی حکمتِ عملی اور تدبیر سے وہی سب پر غالب آیا۔ پھر اس نے اپنے سلطان ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس نے جنگ و پیکار کے بجائے سلطنت کے استحکام پر زیادہ توجہ کی، کسی سے صلح کر کے، کسی سے جنگ کر کے، کسی کا ساتھ دے کر اور چند ہی سال میں عثمانی سلطنت کو اسی درجے پر پہنچا دیا جہاں وہ بایزید کی شکست سے پہلے تھی۔ ۱۴۲۱ء میں اس نے وفات پائی۔

دورِ فتوحات

مراد ثانی نے تختِ حکومت پر بیٹھتے ہی فتوحات کا ایک شاندار سلسلہ شروع کر دیا، اس نے کئی مرتبہ عیسائیوں کے متحدہ محاذوں کا مقابلہ کیا۔ اور کامیاب رہا۔ شاہِ ہنگری نے جنگ کو ہلال وصلیب کی جنگ بنا دیا۔ اور سارے یورپ کو مقابلے میں کھینچ لایا۔ لیکن شکست کھائی اور مارا گیا۔

مراد کی بے نفسی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ دو مرتبہ اپنے بیٹے کے حق میں تختِ حکومت سے دست بردار ہو کر خانہ نشین ہوا لیکن ہر مرتبہ اسے عیسائیوں کی ترک تازیوں کے باعث گوشہ عزلت سے نکل کر میدانِ جنگ میں آنا پڑا۔

۱۴۵۱ء میں مراد نے وفات پائی۔

سلطان محمد فاتح

مراد کے بعد محمد فاتح ۱۴۵۱ء میں تختِ حکومت پر بیٹھا اس کا دورِ حکومت اتراکِ عثمانی کی تاریخ میں سب سے زیادہ روشن اور تابناک ہے۔ قسطنطنیہ فتح کر لینے کی تمنا عثمان خاں کے وقت سے لے کر مراد تک ہر فرمانروا کے دل میں مچلتی رہی، لیکن یہ سعادت محمد ہی کے حصے میں تھی، اس نے یورپ میں اپنی فتح مندیوں سے ہلچل ڈال دی، اس نے ہنگری کے دروازے پر دستک دی اس نے اطالیہ کے صحن میں قدم رکھا، اس نے وینس کی جمہوریہ سے لڑائی لڑی اور قریب

قریب فاتحانہ طور پر اس سے شرائط صلح تحریر کرائے۔

۱۴۸۱ء میں یہ نامور فاتح اور مخلص مسلمان اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

محمد فاتح کی وفات کے بعد ۱۴۸۱ء میں اس کا بڑا بیٹا بایزید ثانی تخت حکومت پر متمکن ہوا۔ ۱۵۱۲ء میں اپنے بیٹے سلیم کے حق میں تخت سے دست بردار ہوا اور صرف تین روز بعد وفات پا گیا۔

سلیم نہایت دلاور، جنگ جو، خود سر، آشفتہ مزاج، بہادر اور شجاع تھا سلیم کے عہد میں فتوحات کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا۔ اس نے عرب حکومتوں کو زیر نگیں کیا۔ ایران کی اینٹ سے اینٹ بجادی، ممالک کا خاتمہ کیا اور خاندان عثمانیہ کو خلافت اسلامیہ کے منصب پر فائز کیا۔ سلیم میں دینداری بھی تھی، بہادروں کے اوصاف بھی لیکن شعلہ مزاج، آتش خو بھی تھا، مخالفت برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ بڑے بڑے امراء، وزراء کو کھڑے کھڑے قتل کرا دیتا تھا۔ وعدہ خلافی اور عہد شکنی میں بھی کوئی تامل نہیں کرتا تھا۔ بایزید جتنا نرم خو تھا اتنا ہی سخت!

سلیمانِ عالی شان

سلیمان اعظم ۱۵۲۰ء - ۱۵۶۶ء دنیا کے ان چند بڑے لوگوں میں تھا جو وقت کا دھارا بدل دیتے ہیں جو اپنے کارناموں سے ساری دنیا کو محو حیرت کر دیتے ہیں، جو دنیا کی قسمت بدل دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ سلیمان کے مرتبے اور پایہ کا کوئی شخص خاندان عثمانی میں پیدا نہیں ہوا۔ اس کی ملک گیری، فتح مندی، کج کلاہی کے سامنے ایک دنیا نے سر جھکایا۔ اس میں کچھ کمزوریاں بھی تھیں اور کون آدمی ہے جو کوتاہیوں اور کمزوریوں سے مبرا ہو۔ لیکن اس کے حسنات اس کے سیئات سے بہت زیادہ تھے۔ آب رواں کی طرح بڑھتا تھا اور چھاتا چلا جاتا تھا۔ دنیا کی کسی حکومت میں یہ یارا نہ تھا کہ اس کی پیش قدمی کو روک لیتی۔

سلیمان کے کاموں کو سنبھالنے والا اس کے بعد کوئی نہ پیدا ہوا جس طرح عالمگیر کی اقبال مندی اس کے مرتے ہی زوال سے ہمکنار ہوئی، اسی طرح سلیمان کے

کے جانشین نہ اس کے نام کو قائم رکھ سکے نہ اس کے کام کو۔ سلیمان اخلاق، شجاعت، انصاف، رحم دلی، مروّت اور فراست کا مجموعہ تھا، ہر خوبی اس میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ وہ اپنی رعایا کے ساتھ کسی قسم کا امتیاز روا نہیں رکھتا تھا۔ مسلم اور غیر مسلم اس کی نظر میں یکساں تھے۔

۵ ستمبر ۱۵۶۶ء کو سلیمان نے میدانِ جنگ میں وفات پائی۔ سلیمان کے عہدِ حکومت میں سلطنتِ ترکیہ کا رقبہ چالیس ہزار مربع میل پر مشتمل تھا۔ سلطان کا یہ فخر کوئی بیجا فخر نہ تھا کہ وہ بہت سی مملکتوں کا فرماں روا تین برِّ اعظموں کا شہنشاہ اور دو بحروں کا مالک ہے[۱]۔

۱۵۶۶ء میں سلیمانِ اعظم کی وفات کے بعد سلیم ثانی تخت نشین ہوا۔ یہ بادہ خوار، سرمست، بے فکرا اور سراپا نااہل تھا۔ ترکی سلطنت کا زوال اسی کے عہد سے شروع ہوا۔ ۱۵۷۴ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

۱۵۷۴ء میں سلطان مراد سوم تخت نشینِ حکومت ہوا۔ یہ ایک صوفی مشرب انسان تھا۔ فنونِ جنگ کا نہ ماہر تھا نہ کوئی خاص دلچسپی رکھتا تھا۔ ۱۵۹۵ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

۱۵۹۵ء میں محمد سوم نے عنانِ حکومت سنبھالی۔ عادات و اطوار میں یہ بھی اپنے باپ سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا، نہ فتوحات کا شوق نہ میدانِ جنگ سے دلچسپی، نہ کاروبارِ حکومت سے شغف محل کا ایک گوشہ اور عیش و عشرت!

۱۶۰۳ء میں ایک پیشین گوئی سے سہم کر اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

بالکل نوعمری کے عالم میں احمد اوّل ۱۶۰۳ء میں اورنگ نشین ہوا۔ اور ۲۸ سال کی عمر میں (۱۶۱۷ء) وفات پا گیا۔

پھر مصطفےٰ اوّل تخت نشین ہوا، چونکہ احمد کے لڑکے کمسن تھے۔ لہٰذا بھائی کو تخت

۱: مِن لے (Finlay) بحوالہ دولتِ عثمانیہ ج ۱۔

ملا۔ لیکن نااہلی کی بنا پر معزول کر دیا گیا۔

مصطفےٰ اوّل کی معزولی کے بعد احمد کا لڑکا عثمان ثانی سلطان بنا، لیکن یہ بھی حالات کو نہ سنبھال سکا۔

پھر مراد چہارم بارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا اور ۲۸ سال کی عمر میں وفات پا گیا نو عمری کے زمانے میں اس کی ماں، والدہ سلطانہ ماہ پیکر نظم مملکت کی نگراں رہی وہ بڑی منتظم اور سلیقہ شعار خاتون ثابت ہوئی، بلوغ کے بعد مراد نے عنان حکومت ہاتھ میں لی۔ اور بڑے دبدبے سے حکومت کی، یہ بڑا سخت گیر تھا۔ اس کی سخت گیری سے نقصان کم، فائدہ زیادہ ہوا۔ ینی چری کی بغاوت اس نے ختم کر دی۔

مراد چہارم کے بعد اس کا بھائی ابراہیم (۱۶۴۰ء) تخت نشین ہوا۔ یہ مراد سے زیادہ سخت گیر تھا۔ ساتھ ہی ساتھ بے تدبیر بھی۔ لوگوں کی جائیدادیں ضبط کر لینا، نیلام کرانا پھر اپنے مصرف میں لے آنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ سارا وقت محل کی خوبصورت اور خوش اندام کنیزوں کے جھرمٹ میں بسر کرتا تھا، نہ کاروبارِ مملکت سے کوئی دلچسپی تھی۔ نہ سیاسیاتِ عالم سے اس نے سرکاری عہدوں اور منصبوں کو فروخت بلکہ نیلام کرنا شروع کر دیا۔ آخر رعایا کے تمام طبقات نے مجبور ہو کر بالاتفاق اسے ۱۶۴۸ء میں معزول کر دیا۔ اور چند روز بعد قتل کر دیا۔

اس کے بعد محمدؐ ثانی ۱۶۴۸ء میں تخت نشین ہوا۔ ۴۰ سال کے قریب حکومت کی۔ خود نہایت نااہل تھا، لیکن ماں کی دانش مندی سے اس نے محمد کوپریلی اور اس کی وفات کے بعد احمد کوپریلی کو وزیر اعظم بنایا۔ یہ دونوں باپ بیٹے بڑے بہادر، وفادار دور اندیش، معاملہ فہم اور منتظم تھے، انھوں نے اپنی قابلیت اور سوجھ بوجھ سے حکومت کی تمام خرابیاں دور کر دیں۔ لیکن احمد کوپریلی کے بعد محمدؐ نے اپنے داماد قرہ مصطفےٰ کو وزیر اعظم بنایا اور احمد کے چھوٹے بھائی مصطفےٰ کوپریلی کو نظر انداز کر دیا۔ جو ہر اعتبار سے جانشینی کا اہل تھا۔ قرہ نے برسر اقتدار ہونے کے بعد سلطنت کو پھر اس پستی میں لا ڈالا، جو گزشتہ چند پشتوں سے ترکی حکومت کا حصہ بن چکی تھی۔

۱۶۸۷ء میں محمد معزول کیا گیا۔ اور ۱۶۹۲ء میں بہ حالتِ نظربندی وفات پا گیا۔

سلیمان ثانی ۱۶۸۷ء میں تخت نشین ہوا۔ اور ۱۶۹۴ء میں وفات پا گیا۔ اس کا عہد بھی ناکامیوں اور حسرت سنجیوں کا عہد ہے۔ اس نے ایک عقلمندی یہ کی کہ مصطفےٰ کوپریلی کو اپنا وزیرِ اعظم بنایا، یہ محمد کا بیٹا اور احمد کا بھائی تھا اور اس میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو باپ اور بھائی میں پائی جاتی تھیں۔ اس نے بڑی تیزی سے اصلاح و تنظیم کا کام شروع کیا۔ اس کی دیانت و امانت مسلّم تھی۔ اسی لیے لوگ اسے "صالح" کہنے لگے تھے۔

اس کے بعد احمد ثانی ۱۶۹۱ء سے ۱۶۹۷ء تک فرماں روا رہا۔

اس کے بعد ۱۶۹۵ء میں مصطفےٰ ثانی تخت نشین ہوا مصطفےٰ ثانی اپنے پیش رو کے مقابلے میں ہر اعتبار سے بہتر تھا۔ اس نے قلمدانِ وزارت کو ایک ہونہار فرد حسین کو تفویض کیا، یہ بھی بڑا دانشمند اور مخلص شخص تھا، اس نے حالات کو سدھارنے کی بڑی کوشش کی اور بڑی حد تک سدھار بھی لیے، لیکن ڈھانچہ اتنا بگڑ چکا تھا کہ ترقی اور عروج کی صورت نہ پیدا ہو سکی۔ ۱۷۰۳ء میں مصطفےٰ ثانی معزول کیا گیا۔ اور کچھ روز بعد وفات پا گیا۔

احمد سوم ۱۷۰۳ء سے ۱۷۳۰ء تک فرماں روائی کرتا رہا۔ اس کے عہد میں معرکے بھی ہوئے جنگیں بھی پیش آئیں، اصلاحِ احوال کی طرف توجہ کی گئی لیکن کوئی خاص نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ ۱۷۳۰ء میں فوج نے اس کے خلاف بغاوت کی، تخت سے دستبردار ہو کر نظربند ہو گیا، وہیں چند سال بعد انتقال ہو گیا۔

محمودِ اول ۱۷۳۰ء سے ۱۷۵۴ء تک تخت حکومت پر متمکن رہا۔ اس کے عہد میں بہت سی شورشیں ہوئیں۔ کئی معرکے رن پڑے شکستیں زیادہ ہوئیں اور کامیابیاں کم۔ دسمبر ۱۷۵۴ء میں مختصر سی علالت کے بعد محمود کا انتقال ہو گیا۔

۱۷۵۴ء میں محمودِ اول کی وفات کے بعد اس کا بھائی عثمانِ سوم مالکِ تاج و نگین

ہوا۔ ۱۷۵۷ء کے آخر میں یہ بیمار پڑا۔ اور مرگیا۔

شورش۔ بغاوت۔ بدامنی

مصطفےٰ سوم ۱۷۵۷ء میں مالکِ تاج و دیہیم ہوا اور ۱۷۷۳ء میں دُنیائے فانی سے عالمِ بقا کا رُخ کیا۔ اس کے عہد میں شروع شروع میں کچھ ترقیاں ہوئیں، باقی سارا وقفہ جنگ شورش، بغاوت، طوائف الملوکی، سرکشی اور بدامنی کی نذر ہوا۔

مصطفےٰ سوم کے زمانے میں روس نے بار بار عہد شکنی کی۔ جنگ چھیڑی، ترکوں نے ہر مرتبہ ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ کبھی ہارے کبھی جیتے، ہارے تو بُری طرح اور جیتے تو اس شان سے کہ بقول وان ہیمر: "بھگوڑے روسیوں کی چولھے پر چڑھی ہوئی دیگچیوں پر بھی قبضہ کرلیا"۔

عبدالحمید مصطفےٰ ثالث کا بھائی تھا۔ ۱۷۷۳ء سے ۱۷۸۹ء تک اس نے حکومت کی۔ اس کا دورِ حکومت بھی فتنہ سامانی، شورش اور تباہی کا دور تھا، دشمنوں کی ہر چہار طرف سے یورش تھی۔ مغربی حکومتیں ترکوں کو نیست و نابود کرنے کا تہیہ کرچکی تھیں۔ اور روس کی زارینہ کیتھرائن نے تو فیصلہ کرلیا تھا کہ جب تک قسطنطنیہ پر قبضہ نہیں ہوجائے گا قرار نہیں لیا جائے گا۔ یورپ کی دوسری حکومتیں بھی انگلستان فرانس، آسٹریا وغیرہ در پردہ اور علانیہ حسب موقع روس کا ساتھ دیتی رہیں۔

سلیم ثالث عبدالحمید کا بھتیجا تھا۔ یہ ۱۷۸۹ء میں تختِ حکومت پر بیٹھا اور ۱۸۰۷ء میں وفات پائی۔ یہ بڑا ذہین، دانش مند، سیاست داں اور زیرک فرمانروا تھا اسے ورثے میں پریشانیوں، تباہیوں اور بربادیوں کے سوا کچھ نہیں ملا تھا لیکن اس نے استقلال کے ساتھ اپنا کام جاری رکھا۔

ینی چری سلیم کی اصلاحات سے بہت ناخوش تھے۔ آخر انھوں نے پھر بغاوت کی۔ ۱۸۰۷ء میں معزول کر کے نظر بند کردیا گیا۔ اور ایک سال کے بعد بہ حالتِ نظربندی قتل کردیا گیا۔

مصطفےٰ چہارم صرف سوا سال برسرِ حکومت رہا، باغیوں کا آلۂ کار تھا۔ اور باغی ہر چہار

طرف چھائے ہوئے تھے۔ یہ حالت دیکھ کر چند دیرینہ وفادارانِ سلیم نے ازسرِ نو تنظیم کی۔ اور طاقت حاصل کر کے مصطفیٰ کو معزول کرایا۔ اور سلیم کے بیٹے محمود کو تخت نشین کر دیا۔

سلطنتِ عثمانیہ کے اولو العزم اور مدبر فرمانرواؤں میں محمود ثانی ایک مرتبۂ خاص پر فائز ہے، اسے وراثت میں شورش، طوائف الملوکی، بغاوت، بدامنی اور بدانتظامی ملی۔ اس میں اتنی لچک تھی کہ حالات کے مطابق اپنے آپ کو نئے سانچے میں ڈھال لیتا تھا۔ یہی لچک اس کی فیروزمندیوں، خوش بختیوں اور کامیابی کی ضامن تھی۔

اندرونی اصلاحات کے اعتبار سے بھی محمود ثانی کا دورِ حکومت بہت شاندار ہے اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ینی چری کا بالکل استیصال کر دیا۔ ینی چری نظام توڑ دیا۔ سرکش اور متمرد ینی چری سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

حربی اصلاحات کے لحاظ سے بھی محمود ثانی کا دور بے مثال ہے، اُس نے پوری جرأت سے کام لے کر یہ کارنامہ انجام دیا۔ اور ترکی فوجوں کو لباس، اندازِ جنگ، طریقِ تنظیم اور آن بان میں یورپ کی ترقی یافتہ فوجوں کا ہمسر بنا دیا۔

یورپ کی حاسد حکومتوں نے محمود کو ایک پل بھی چین نہ لینے دیا۔ آسٹریا، پرشیا، (جرمنی) اور فرانس سے تو اس کی اَن بَن رہتی تھی، سب سے بڑا اور سب سے طاقتور دشمن روس بھی نکل کر بار بار میدان میں آیا۔ اس کی ترک تازیوں نے محمود کو ایک لمحہ بھی سکون کا نہ میسر ہونے دیا۔ جنگ اور صلح، جنگ اور صلح، بس ترکی اور روس کے تعلقات کی داستان صرف ان چند الفاظ میں پوشیدہ ہے، روس سے ابھی جنگِ زرگری، تصادم اور کشمکش کا سلسلہ جاری تھا کہ برطانیۂ عظمیٰ سے بھی صبر و ضبط ناممکن ہو گیا۔ اور وہ بھی میدان میں کود پڑا۔

یونان کی بغاوت

محمود کے لیے سب سے زیادہ رُوح فرسا اور جان لیوا یونان کی بغاوت ہوئی، یونان کے عیسائیوں کے ساتھ نہ صرف محمود کا بلکہ تمام سلاطینِ اتراک کا برتاؤ نہایت شریفانہ اور عادلانہ رہا تھا، لیکن انقلابِ فرانس سے متاثر ہو کر یونان نے آزادی اور استقلال کا پرچم

ہاتھ میں لیا اور بغاوت برپا کر دی۔ روس، برطانیہ اور فرانس نے علانیہ یونان کا ساتھ دیا۔ ان ممالک کے نہ صرف رضاکار، یونانی فوجوں میں داخل ہوئے بلکہ بڑے بڑے سپہدار اور سپہ سالار بھی یونانی فوج کے باقاعدہ ملازم بن گئے تھے تاکہ یونان کو آزاد کرائیں اور ترکوں کو یورپ سے نکال باہر کردیں، ان بغاوتوں اور لڑائیوں میں بے گناہ، جنگ جُو اور امن پسند دیہاتی اور شہری ترک مردوں، عورتوں اور بچوں تک پر جو ہولناک اور سفّاکانہ مظالم کیے گئے، جس طرح انھیں سمندر میں دھکیلا گیا، دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر مارا گیا، ماں کے سامنے کمسن لڑکوں اور لڑکیوں کو ذبح کیا گیا، انھیں پڑھ کر تقسیمِ ہند کے وقت کے وہ خوں ریز اور لرزہ خیز فسادات یاد آجاتے ہیں جنھوں نے انسانیت کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگایا تھا۔

محمود ثانی ۱۸۰۸ء میں تخت پر بیٹھا اور ۱۸۳۹ء میں وفات پاگیا۔

لائق باپ کا لائق بیٹا عبدالمجید کے عہد میں جنگ و پیکار کا سلسلہ رہا تو، لیکن کم ــــ بغاوت اور شورش کی بھی یہی کیفیت رہی تقریباً بارہ سال کی مدت اُسے سکون و عافیت کی ملی۔ یہ مدت اس نے عیش و عشرت اور نغمہ و چنگ اور رقص و آہنگ کی کیفیت میں نہیں بسر کی، وہ کام کیا جس کی تکمیل کی حسرت عبدالحمید اپنے ساتھ قبر میں لے گیا تھا، اُس نے پوری یکسوئی، ہمت، استقلال اور عزیمت کے ساتھ اصلاحات کا پروگرام ہاتھ میں لیا اور ایک ایک کرکے ہر اس چیز کی اصلاح کر ڈالی جو اُس کے بس میں تھی۔

پھر عبدالمجید ۱۸۳۹ء میں سلطنتِ عثمانیہ کے تاج و تخت کا مالک بنا اور ۱۸۶۱ء میں اس دُنیا سے رخصت ہوگیا۔ اس کے کارناموں اور جذبۂ اصلاح کی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ جدید ترکی کے معمار بھی اس کا نام عزّت و احترام کے ساتھ لیتے ہیں۔ خالدہ ادیب خانم نے اپنی کتاب "ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش" میں اس کی اصلاحات پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔

شخصی حکومتوں میں سب سے بڑا نقص یہ ہوتا ہے کہ ایک بناتا ہے ایک بگاڑتا ہے

نہ بنانے والے کا کوئی ہاتھ پکڑ سکتا ہے نہ بگاڑنے والے کو روک سکتا ہے، شخصی حکومت مطلق العنان ہوتی ہے اور وہ کسی تنظیم وضبط اور آئین کی خوگر نہیں ہوتی۔ وہ اپنے سوا کسی اور کے سامنے جواب دہ بھی نہیں ہوتی۔

یہ سارے مفاسد عبدالعزیز کے دور میں پورے طور پر نمایاں ہوئے؛ عبدالعزیز نے سلطنتِ عثمانیہ کے مجد و وقار اور ساکھ کو جو نقصان پہنچایا وہ کوئی بڑے سے بڑا دشمن بھی نہیں پہنچا سکتا تھا۔

۱۸۶۱ء میں یہ تخت نشین ہوا اور ۱۸۷۶ء میں معزول کر دیا گیا۔ چند روز بعد اس نے خودکشی کر لی۔

مراد پنجم کے عہدِ حکومت کا کوئی واقعہ قابلِ ذکر نہیں ہے۔ تخت نشینی کے تین ماہ بعد ڈاکٹروں کی رائے اور شیخ الاسلام کے فتوے کے مطابق معزول کر دیا گیا۔

مستبد، خون آشام مطلق العنان، عبدالحمید کے دور میں ترکوں کے اندر ایک نئی لہر اٹھی، دستوریت کی، انھوں نے شخصی حکومت کی کمزوریوں اور لغویتوں کو محسوس کر لیا۔ وہ مستعد ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے کہ ملک میں اپنا دستور رائج کر کے رہیں گے۔

۱۸۷۶ء سے ۱۹۰۹ء تک عبدالحمید ثانی ترکوں پر مسلط رہا۔ یہ طویل دور بہت عبرت خیز، سبق آموز اور حیرت انگیز داستانیں اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے۔

غازی انور پاشا

عبدالحمید ثانی کی معزولی کے بعد شہزادہ محمود شاہ سلطان محمد پنجم کے نام سے وارثِ تاج و تخت ہوا لیکن اب یہاں سے سلاطینِ عثمانی کی مکمل بے دست و پائی کا دور شروع ہوتا ہے لہٰذا ہم ان کا ذکر نظر انداز کر کے ترکیہ جدید کی چار اہم شخصیتوں کے ذکر پر اس سلسلے کو ختم کر دیں گے۔

۱: غازی انور پاشا۔

۲: غازی کمال پاشا۔

۳: جلال بایار۔

۴: عصمت انونو۔

انور پاشا نے ترکی کی افراتفری کے دور میں جو ۱۹۱۴ء تک قائم رہا بڑا اہم حصہ لیا۔ انھوں نے اس گرتی ہوئی عمارت کو اپنے تدبّر، شجاعت اور موقع شناسی سے بار بار سنبھالا دیا، وہ میدانِ جنگ کے ہیرو بھی تھے اور میدانِ قیادت کے تاجدار بھی۔

دستورِ جدید نافذ ہونے کے بعد جب اس کے خلاف غرض مندوں نے بغاوت کی تو انور سامنے آیا۔ جب ترکی کی کٹھ پتلی وزارت نے اپنے محکوم ممالک، اور انگلستان و روس وغیرہ سے ذلّت بخش شرائط قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی وہ پستول لے کر پہنچ گیا۔ اور اس نے یہ کام نہ ہونے دیا۔ جب طرابلس پر اطالیہ نے فریب، جھوٹ، بدعہدی اور قوت و طاقت کے بل پر اچانک قبضہ کر لیا اور وہاں کے مسلمانوں پر ظلم و سفاکی کا لرزہ خیز دور شروع کیا تو وہ انور پاشا تھا جو شمشیر بے نیام بن کر وہاں پہنچا۔ اس نے عربوں، ترکوں اور بربروں کی تنظیم کی اور اطالیہ کو ناکوں چنے چبوا دیے۔ جب ادرنہ پر دشمنوں نے قبضہ کیا اور ترک سپاہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئی۔ ترک حکومت اس فیصلے کو تسلیم کر لینے پر آمادہ نظر آئی اور فرنگی اتحادی ترکوں کی کمزوری اور بے بسی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے لیے آگے بڑھے تو صرف انور کی ایک ذات تھی جس نے یہ طے شدہ باتیں نہ ہونے دیں۔ اگر انور ترکوں میں ایک نئی زندگی پیدا نہ کر دیتا تو یہ ساری باتیں عالمِ وجود میں آکر رہتیں۔

انور پاشا کے کارناموں کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ عرب جو ترکوں کے بدترین دشمن ہو گئے تھے وہ بھی انور پاشا کی عظمت کے دل و جان سے معترف تھے۔ فرنگی دشمنوں نے بھی اس کی شجاعت اور تدبّر کا لوہا مانا۔ غیر ترک مسلمان بھی انور کے نام پر عقیدت کے پھول ہمیشہ نچھاور کرتے رہے۔ یہی اس کی عظمت اور بڑائی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

غازی مصطفٰے کمال پاشا

جنگ عظیم (۱۴-۱۹۱۸ء) میں ترکوں کی شکست کے بعد انجمن اتحاد و ترقی کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ ترکوں کی مسلسل شکستوں نے ان میں ہراس اور نومیدی کے جذبات پیدا کردیے۔ ان سے نہ صرف یورپین مقبوضات چھن گئے بلکہ ان کے اصل علاقوں پر بھی دھاوا ہوا انھیں ذلت بخش شرائط صلح قبول کرنے پر مجبور کیا گیا۔

لیکن جس طرح جنگ بلقان وطرابلس کے زمانے میں انور نے ترکی حکومت کو ذلت بخش شرائط نامنظور کرنے پر مجبور کردیا تھا۔

اسی طرح جنگ عظیم کی شکست کے بعد مصطفٰے کمال نے سابق کمزور اور اتحادیوں سے مرعوب حکومت کو مجبور کردیا کہ اگر وہ کام نہیں کرسکتی تو اپنی جگہ خالی کردے، اتحادیوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کرلیا تھا۔ یونان سمرنا کا مالک بن بیٹھا، دوسری حکومتیں اور کئی علاقوں پر قابض ہوگئی تھیں، لیکن مصطفٰے کمال نے جب تلوار سنبھالی تو سب کو بھاگنا پڑا اور ترکی کی آزادی تسلیم کرنی پڑی۔

مصطفٰے کمال نے ایک آمر (ڈکٹیٹر) کی حیثیت سے حکومت شروع کی اور اسی حیثیت میں وہ دُنیا سے رخصت ہوگیا۔ مزاج کا یہ بھی بہت سخت تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے بہترین ساتھیوں کو جن کے خدمات کسی طرح اس سے کم نہیں تھے، جلاوطن ہونے پر مجبور کردیا، رؤف پاشا عصمت انونو، خالدہ ادیب خانم اور دوسرے ترک ہیرو مصطفٰے کی استبداد پسند طبیعت کے باعث ترک وطن پر مجبور ہوئے۔

۱۹۳۶ء میں طویل علالت کے بعد مصطفٰے کمال نے وفات پائی۔

صدر جلال بایار مصطفٰے کمال پاشا نے ترکوں کو اسلام سے منحرف کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی، اس نے عربی رسم الخط ختم کردیا۔ عربی الفاظ ترکی زبان سے خارج کردیے۔ مسجد ایا صوفیہ کو میوزیم بنا دیا، دارالحکومت بدل دیا، اذان تک ترکی زبان میں ہونے لگی اور پورے جبر و تشدد سے کام لے کر

ایک نئی قوم کی تشکیل میں مصروف ہو گیا۔ لیکن ہنستی قوم تلوار اور سنگین کا مقابلہ نہیں کر سکتی، وہ مسجدوں کو ویران ہوتے، خانقاہوں کو کھنڈر بنتے، عورتوں کو جبری طور پر بے پردہ ہوتے، علماء کی جماعت کو ختم کرتے دیکھتی رہی مگر کچھ نہ کر سکی سوا حسرت و الم کے!

مصطفےٰ کمال کے بعد عصمت انونو برسرِ حکومت رہے، ان کے دور میں دستوری حکومت قائم ہوئی، ترک قوم کو آزادیٔ گفتار و کردار کی نعمت پھر سے مل گئی۔

لیکن جنگِ عظیم ثانی کے بعد جب نئے انتخابات ہوئے تو عصمت کو اور ان کی پارٹی کو شکستِ فاش ہوئی۔ اب صدرِ مملکت جلال بایار اور وزیرِ اعظم عدنان مندریس تھے، یہ دونوں دل سے مسلمان تھے، ان کے عہد میں مذہبی آزادی بحال ہوئی اور ترک قوم خوشی سے جامے میں نہ سمائی، لیکن جو لوگ کمال پاشا کی پالیسی میں ترکوں کی نجات سمجھتے تھے انھیں یہ بات پسند نہ آئی۔ فوجی انقلاب ہوا، مندریس کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ جلال بایار کو سزائے دوامی عطا ہوئی، عصمت انونو پھر وزیرِ اعظم بن گئے۔

اب عصمت وزیرِ اعظم ہیں لیکن ملک میں بے چینی موجود ہے جو برابر نمایاں ہوتی رہتی ہے۔ مارشل لا کے بعد جو دستور بنا اس کی رُو سے جو انتخابات ہوئے اس میں بھاری تعداد میں مندریس اور بایار پارٹی کے لوگ کامیاب ہوئے، عصمت کو مخلوط حکومت بنانا پڑی جو ظاہر ہے پورے طور پر مستحکم نہیں ہے، لیکن امید ہے جلد ہی یہ افراتفری کا دور ختم ہو جائے گا، آثار کہہ رہے ہیں ترکیہ میں صحیح جمہوریت بہت ممکن ہے عصمت انونو ہی کے ہاتھوں نمودار ہو، اور یہ عظیم قوم اپنی شاندار روایات کی روشنی میں پھر عروج و فروغ کی منزل کی طرف بڑھنا شروع کر دے!

ترکوں کا عہدِ فتوحات

مشرق سے مغرب تک سلطنتِ عثمانیہ کی وسعت

نظمِ مملکت

چنگیز کے تاتاری لشکر کی ترک تازیوں اور سفاکیوں کی بدولت جب خوارزم کی اینٹ سے اینٹ بج گئی تو اس کے بہت سے قبائل ادھر سے اُدھر منتشر ہو گئے، انہی میں ارطغرل کا قبیلہ تھا، ارطغرل اپنے قبیلے کو لے کر ایشیائے کوچک کی طرف بڑھا اور سلطان علاء الدین سلجوقی کے حدودِ مملکت میں داخل ہو گیا۔

علاء الدین سلجوقی ارطغرل کی شجاعت، شہامت، جاں نثاری اور دلاوری سے بہت متاثر ہوا، اس نے بازنطینی (عیسائی) سرحد سے ملے ہوئے ایک علاقہ کو بہ طور جاگیر مرحمت فرمایا، یہاں ارطغرل کو بہادری کے جوہر دکھانے کا اور زیادہ موقع ملا، بارہا بازنطینی قلعہ داروں سے معرکے ہوئے، گھمسان کے رن پڑے اور ہر مرتبہ ارطغرل کامیاب رہا، ارطغرل کی ان کامیابیوں نے اس کے بہت سے رفیق پیدا کر دیے، ایشیائے کوچک میں جو ترک پہلے سے رہتے چلے آ رہے تھے وہ بھی اس کے دامانِ عاطفت میں پناہ گزیں ہوتے۔

ارطغرل اب صرف ایک جاگیر دار ہی نہیں تھا بلکہ علاء الدین کا سپہدار بھی تھا۔ اس نے علاء الدین کی طرف سے بازنطینیوں اور تاتاریوں سے کئی زبردست لڑائیاں لڑیں، قسمت نے ہر طرح ساتھ دیا اور وہ فاتح و غانم واپس آیا۔

۱۲۸۸ء میں عثمان خاں کو قدرت نے خود بخود بادشاہ اور فرمانروا بننے کا موقع بہم پہنچا دیا، اپنے باپ کی طرح وہ بھی سلطانِ قونیہ (سلطنتِ سلجوقی) کا ایک اطاعت شعار جاگیردار تھا، لیکن باپ کی وفات کے پہلے ہی سال اس نے بازنطینیوں سے ایک زبردست جنگ کے بعد قلعۂ قراجہ حصار چھین لیا۔ یہ بہت بڑی اور خلاف توقع کامیابی تھی۔ سلطان علاء الدین سلجوقی اس کارنامے سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے یہ سارا علاقہ عثمان کو دے دیا، از راہِ نوازشِ خسروانہ اسے بک کا خطاب مرحمت فرمایا، صرف اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ یہ اجازت بھی اسے دی کہ وہ اپنے حدود میں اپنا سکہ چلائے اور جمعہ کے خطبے میں امام اس کا نام لے۔

عثمان کی زندگی اسی ڈھرے پر بسر ہو رہی تھی کہ تاتاریوں کی ایک یورش نے اس کے عروج کا سامان مہیا کر دیا۔ تاتاریوں کو مسلمانوں سے ان کی تہذیب و تمدن سے ان کی طاقت اور عروج سے کد تھی۔ ۱۳۰۰ء میں تاتاریوں نے بڑی تیاری اور اہتمام کے ساتھ ایشیائے کوچک پر حملہ کیا۔ اس جنگ میں سلطان علاء الدین مارا گیا اس کا جانشین غیاث الدین ہوا لیکن وہ بھی تاتاریوں کے ہاتھ سے قتل ہوا غیاث الدین اور علاء الدین کے بعد سلطنتِ سلجوقیہ کا خاتمہ ہو گیا اور اس طرح عثمان کی آزادی و خود مختاری پر خود بہ خود مہر لگ گئی۔

اب عثمان خاں کے سامنے دو راستے کھلے ہوئے تھے کہ وہ اپنے رہوارِ عروج کو جس طرف چاہے موڑ دے۔

ایک راستہ یہ تھا کہ مسلمان حکومتوں کے زیر کرنے اور ان پر قبضہ جمانے کی ترکیب سوچتا، دوسرا یہ تھا کہ مسلمانوں سے قطع نظر کر کے وہ بازنطینی مورچوں کو فتح کرنے میں دست و بازو اور ذہن و دماغ کی ساری قوتیں صرف کر دیتا، اس نے یہی دوسرا راستہ اختیار کیا۔ تائید غیبی اس کے ساتھ تھی، پہلے اس نے اندرونی اصلاحِ احوال کی طرف توجہ کی، پھر وہ اپنے اصل حریف پر متوجہ ہوا۔

۱۳۰۱ء میں عثمان نے حکومتِ قسطنطنیہ کی زبردست افواج کو شکست دے کر

ناکومیڈیا پر قبضہ کر لیا۔ پھر جوں جوں وہ بڑھا ہے تو چند سال کے مختصر سے وقفے میں اس کے فتوحات کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا۔ ۱۳۱۷ء میں عثمان نے بازنطینی سامراج کے ایک بہت بڑے اور اہم مرکز بروصہ کا محاصرہ کر لیا۔ ۱۳۲۶ء میں عاجز آ کر محاصرین نے ہتیار ڈال دیے اور عثمان کا بیٹا اورخاں باپ کی علالت کے باعث تن تنہا ایک فاتح اور کشورکشا کی حیثیت سے اپنی فوجِ گراں کے ساتھ بروصہ میں داخل ہوا۔

۱۳۳۰ء میں اورخاں کی اولوالعزمی اور حوصلہ مندی نے بازنطینیوں سے ایک اور بڑا شہر ناک چھین لیا۔ بازنطینی سلطنت کا یہ بہت بڑا مرکز تھا۔

پہلے یورپین قلعے کی فتح

۱۳۵۳ء میں کنٹاکوزین نے ایک نازک موقع پر اورخاں سے مدد طلب کی، وہ دوستوں کی طرف دستِ اعانت بڑھانے میں کبھی تامل نہ کرتا تھا۔ بیس ہزار فوج مدد کو بھیج دی۔ کنٹاکوزین نے احسان مندی کا ثبوت دیتے ہوئے قلعہ زنپ پیش کر دیا، جس پر اورخاں کے بڑے لڑکے سلیمان پاشا نے قبضہ کر لیا۔ کچھ روز بعد تھریس میں زلزلہ آیا جس سے بہت سے شہروں کی شہر پناہیں منہدم ہو گئیں۔ انہی میں گیلی پولی بھی تھا۔ یہ زنپ سے تھوڑے ہی فاصلے پر واقع تھا اور درِ دانیال کے مغربی ساحل پر اپنی فوجی و عسکری حیثیت سے بہت ممتاز مانا جاتا تھا۔ سلیمان پاشا نے موقع غنیمت سمجھ کر گیلی پولی پر قبضہ کر لیا۔ یونانی مزاحمت نہ کر سکے، ایسے سراسیمہ ہوئے کہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ سلیمان نے گیلی پولی کے استحکام پر توجہ کی پھر وہاں بڑی تعداد میں ترکوں اور عربوں کو لا کر بسا دیا۔

تھریس کے مختلف چھوٹے موٹے مقامات کو فتح کرنے کے بعد مراد نے ۱۳۶۳ء میں عیسائیوں سے ایک بہت اہم مقام ادرنہ چھین لیا۔ اس طرح تھریس کا سارا علاقہ مسلمانوں کے زیرِ نگیں ہو گیا۔ مراد کی اس کامیابی نے عیسائیوں کو چوکنا کر دیا۔ انھوں نے متحد اور منظم ہو کر یہ فیصلہ کیا کہ یورپ کی سرزمین سے ترکوں کو نکال ڈالیں گے۔ پوپ اربن پنجم نے سردیا، بوسینا، ہنگری اور ولاچیا کے عیسائی فرمانرواؤں کو ترغیبِ جنگ دی اور یہ سب اتحادی بن کر بیس ہزار فوج لے کر تھریس میں پہنچے کہ ترکوں کو نکال باہر کریں۔

مراد اناطولیہ میں تھا کہ اُسے عیسائی فرمانرواؤں کے ہجوم و اقدام کی اطلاع ملی، وہ فوراً گیلی کانٹے سے لیس ہو کر چل پڑا، لیکن قبل اس کے کہ وہ موقع واردات پر پہنچے اس کا ایک سپہدار لالہ شاہین ایک مختصر سی فوج کے ساتھ آگے بڑھا اور ایک رات جب کہ عیسائی افسر اور سپاہی مسلمانوں کی طرف سے بےفکر اور غافل ہو کر راگ رنگ رقص و نغمہ اور شراب و کباب کی دلچسپیوں میں منہمک تھے قضائے مبرم بن کر پہنچا اور تقریباً سب کو کاٹ کر رکھ دیا۔ جو چند نفوس بچے وہ دریا میں کود پڑے، اور ڈوب کر ہلاک ہوئے۔ ہنگری کا بادشاہ بذاتِ خود موجود تھا لیکن بمشکل جان بچا کر بھاگا، حالانکہ مسلمان تعداد میں عیسائی افواج سے نصف بھی نہیں تھے۔

اس طرح یورپ میں بلقانی ریاستوں میں سلاوی اقوام سے براہ راست مسلمانوں کی آویزش ہوئی اور وہ کامیاب ہوئے۔ مُراد نے اس واقعے کے چند سال بعد برصہ کے بجائے حالات و مصالح کے مطابق ادرنہ کو پایۂ تخت بنا لیا۔ تاکہ یورپ کی طرف اقدام ہجوم میں آسانی ہو۔

شاہِ قسطنطنیہ باجگزار بن گیا

اس جنگ کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ شاہ قسطنطنیہ نے سلطنتِ عثمان کا باجگزار بننا منظور کر لیا۔ لیکن شہنشاہِ قسطنطنیہ اس معاہدے پر قائم نہ رہا، وہ اس معاہدہ کو اپنی مستقل توہین سمجھ رہا تھا۔ ۱۳۶۹ء میں اس نے روم کا سفر کیا اور پوپ کے دربار میں حاضر ہو کر یونانی کلیسا سے اپنی برأت اور بیزاری کا اظہار کیا اپنے گناہوں سے "توبہ" کی کلیسائے رومہ کی بالادستی اور عظمت کا اعتراف کیا لیکن وہ پوپ کو اس پر آمادہ نہ کر سکا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف اعلانِ جہاد کرے، کیونکہ پوپ اب تک اس کی ذہنی اور روحانی تطہیر کا قائل نہیں ہوا تھا۔

۱۳۶۹ء میں مراد نے بلغاریہ کی طرف پیش قدمی کی، ۱۳۷۱ء میں اس کے سپہدار لالہ شاہین نے صوفیا کے جوار میں سرویٰ اور بلغاری افواج کا مقابلہ کیا، انھیں شکست دی اور کوہ بلغار تک کا سارا بلغاری علاقہ تصرف میں لے لیا۔ ۱۳۷۲ء میں مراد کی فوجیں

مقدونیا پر حملہ آور ہوئیں اور پھر پیش قدمی کرتی ہوئی قدیم سرویا، البانیہ اور بوسینا میں داخل ہوئیں۔ شاہ سرویا لازار نے شکست کے بعد پیمانِ اطاعت باندھا، بلغاریہ کے فرمانروا اسلیمان نے صلح کی التجا کی اور اپنی لڑکی شادی کے لیے پیش کی۔ ۱۳۸۵ء میں مراد نے صوفیہ فتح کر لیا، سلیمان نے اپنی ملکہ اور اہلِ خاندان کے ساتھ قدمبوس ہو کر رحم کی درخواست کی۔ ۱۳۸۶ء میں اُس نے شدید جنگ کے بعد نیش پر قبضہ کر لیا۔ اور سرویا نے تابِ مقاومت نہ دیکھ کر خراج دینے کی شرط پر صلح کر لی۔

یورپ کی متحدہ یلغار

۱۳۸۸ء میں ایک مرتبہ پھر شکست یافتہ، ہزیمت خوردہ اور پیمانِ صلح باندھنے والی حکومتوں نے کچھ نئے حلیف اور ساتھی پیدا کر کے مرادِ اوّل پر حملہ کرنے اور ترکوں کو یورپ سے نکالنے پر کمر باندھی۔ اس معرکے میں سرویا، بوسینا، بلغاریہ، البانیہ، ولاچیا، ہنگری اور پولینڈ نے پورے زور و قوت کے ساتھ حصّہ لیا، ابھی مراد بروصہ سے مقابلہ کرنے کے لیے نہیں پہنچا تھا کہ بوسینا میں بیس ہزار کی عثمانی فوج پر اس متحدہ فوج نے حملہ کر کے پندرہ ہزار کو قتل کر دیا، لیکن مراد کے ایک سپہ سالار علی پاشا نے اپنے آقا کے حکم کے مطابق یلغار کی، شاہِ بلغاریہ بھاگ کھڑا ہوا، یہی حشر شاہِ سرویا کا ہوا۔ بلغاریہ اور سرویا کے متعدد علاقوں پر ترکوں نے قبضہ کر لیا۔ ۱۳۸۹ء میں کسووا کے میدان میں عیسائیوں کی افواجِ متحدہ اور ترکوں سے آخری معرکہ ہوا۔ اس میں اگرچہ دھوکے سے ایک سروی نے مراد کو خنجر سے ہلاک کر دیا۔ لیکن مرنے سے قبل سلطان نے سروی بادشاہ لازار کو قتل کر دیا۔ اور جب مسلمانوں نے پورے طور پر عیسائیوں کو شکست دے لی تب وہ جاں بحق ہوا۔

عیسائیوں کی متحدہ افواج کو شکست دینے کے بعد بایزید نے سرویا کی خودمختاری تسلیم کر کے اسے باجگزار بنا لیا۔ لازار کو مراد مرنے سے پہلے قتل کرا چکا تھا اب اس کا جانشین اسٹیفن تھا۔ اس نے اپنی بہن شہزادی ڈیسپینا کو بایزید کے حبالۂ نکاح میں دے دیا اور زندگی بھر نہایت وفاداری کے ساتھ بایزید کا حقِ رفاقت ادا کرتا رہا۔

بڑے بڑے معرکوں اور ترغیبوں کے ہجوم میں بھی یہ ثابت قدم رہا۔ اور اپنی وفاداری پر اُس نے داغ نہ آنے دیا۔

بایزید کا دورِ حکومت (آخری ایام سے قطع نظر) فتوحاتِ مسلسل کا دور ہے۔ اس نے جدھر کا رُخ کیا کامیاب رہا۔ شکست اور ہزیمت ایسے الفاظ تھے جن سے وہ ناآشنا تھا۔ ۱۳۹۳ء میں اس کے بیٹے سلیمان نے اس کے حکم سے بلغاریہ کے پایۂ تخت پر قبضہ کر لیا۔

اس قبضے نے بلغاریہ کی ساری حیثیت ختم کر دی، شاہی خاندان نابود ہو گیا، پھر بایزید نے ہنگری کی سرحد پر واقع کئی قلعوں پر قبضہ کر لیا۔

عیسائی ترکوں کی اس یلغار سے کافی پریشان ہو چکے تھے۔ آخر شاہ ہنگری نے دوسری عیسائی بادشاہتوں کی مدد سے عیسائیوں کی افواجِ متحدہ کے ساتھ آخری جنگ لڑنے کی ٹھانی، اس فوج میں فرانس کے امراء اور سپاہی بھی شریک تھے، کیونکہ اس جنگ نے مذہبی تقدس کا روپ اختیار کر لیا تھا، پاپائے روما کی ہمدردیاں بھی ہنگری اور اس کے اتحادیوں کے ساتھ تھیں۔ جرمنی کے سورما بھی بڑے جوش و خروش اور شوق سے ترکوں کو مارنے آئے تھے، ولاچیا سے اگرچہ صلح تھی، لیکن وہ بھی اتحادی محاذ کا ایک رُکن بن گیا، عیسائی مورخین کا بیان ہے کہ عیسائی لشکر ایک لاکھ سے کم نہ تھا۔

ابتدا میں عیسائیوں کو فتح ہوئی، چند مقامات پر انھوں نے (بایزید کی عدم موجودگی میں) قبضہ بھی کر لیا لیکن بایزید کے آتے ہی پانسہ پلٹا اور اس متحدہ فوج کا بُری طرح خاتمہ ہو گیا۔

۱۴۳۰ء میں مراد نے بازنطینی سلطنت کے مشہور شہر سالونیکا کو بزورِ شمشیر فتح کر لیا۔

۱۴۴۰ء میں نئے شاہ سرویا کی شرارت اور سازش کا جواب مراد نے اس طرح دیا کہ جنگ کی اور تمام سرویا پر مکمل قبضہ کر لیا۔

شہنشاہِ پولینڈ و ہنگری کی ہلاکت

۱۴۴۰ء میں شاہِ پولینڈ لاڈسلاس ہنگری کے تخت کا بھی مالک قرار پایا، ایک فوجی

سردار ہونیاڈے نے شاہ مذکور کو یقین دلایا کہ وہ مسلمانوں کو شکست دیدے گا، اسی زمانہ میں مراد کا ایک سپہ دار مزید پاشا ٹرانسلوینیا میں ایک قلعہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ ہونیاڈے مقابلے میں آیا، اس نے ترکوں کے بہت بڑے لشکر کو شکست دی اس جنگ بیس ہزار ترک مارے گئے۔ ہونیاڈے نے مزید پاشا اور ان کے لڑکے کو اپنے سامنے ہلاک کرادیا، جب دسترخوان پر بیٹھا تو تمام ترک قیدیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، اُن کی آہ اور کراہ میں اُسے بڑی لذت ملتی تھی، اس کے بعد مراد نے ۸۰ ہزار کی ایک فوج شہاب الدین کی سرکردگی میں بھیجی اسے بھی ہونیاڈے نے شکست دی، ترکوں کی ان شکستوں سے عیسائیوں کو یقین ہوگیا کہ اب یورپ سے وہ نکالے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ ہنگری، پولینڈ، ولاچیا، بوسینا اور سرویا نے پھر ایک اتحادی محور بنایا۔ فرانس اور جرمنی نے بھی جنگجو سورماؤں کی بڑی تعداد نذر کی، یورپ کے ہر ملک سے سپاہیوں کی ایک بہت بڑی تعداد آکر شریک ہوئی، پوپ کے جوش وخروش کا یہ عالم تھا کہ اس نے اپنے ایک نمایندہ کو مسلح فوج کے ساتھ روانہ کیا اور بہت بڑی رقم بھیجی، کیونکہ یہ اسلام اور صلیب کی جنگ تھی، وینس اور جینوا کی حکومتوں نے بھی بحری برّی مدد کی۔

مراد کے پاس کوئی بحری بیڑہ نہیں تھا، وہ ایشیائے کوچک میں باغیوں سے برسر پیکار تھا، عیسائی سپاہ نے ۱۴۴۳ء میں دریائے ڈینیوب کو عبور کرکے اوزیش کے مقام پر ترکوں کو پھر شکست دی۔

یہ رنگ دیکھ کر مراد نے صلح کی کوشش کی، ۱۴۴۴ء میں زیجیدین کے مقام پر صلحنامہ ترتیب پایا جس کی رُو سے سرویا آزاد ہوگیا۔ یہ صلح دس سال کے لیے تھی، اس معاہدہ پر عمل کرنے کی قسم مراد نے قرآن لے کر اور لاڈسلاس نے انجیل لے کر کھائی تھی لیکن اس معاہدہ کو ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ موقع دیکھ کر عیسائیوں نے عہد شکنی کی بعض لوگوں نے حلف کا ذکر کیا۔ تو پوپ کے نمایندہ جولین نے کہا:

"غیر عیسائیوں کے ساتھ معاہدہ کی پابندی نہیں کرنی چاہیے"۔[1]

---

(۱) کریسی جلد ۱ صفحہ ۱۰۸ بحوالہ دولت عثمانیہ۔

پھر اس نے بعض غیر مطمئن لوگوں کو تشفی دیتے ہوئے کہا: "پوپ کی طرف سے میں تم کو دروغ حلفی سے بری الذمہ کرتا ہوں اور اگر اب بھی کچھ پس وپیش ہے تو اس گناہ کا وبال اپنے سر لیتا ہوں۔"[1]

اب یہ فوج جوش سے بھری ہوئی سلطنتِ عثمانیہ کو پارہ پارہ کر دینے کی غرض سے آگے بڑھی، ترکوں کی متعدد چوکیوں، قلعوں اور مورچوں پر قبضہ کر لیا، ترکوں کو چٹانوں سے گرا گرا کر ہلاک کر دیا، یہاں تک کہ وارنا کا محاصرہ کر لیا۔

معاہدہ کے بعد مراد نے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی، اور اپنے چودہ سالہ بیٹے محمدؒ کو تخت نشین کر کے خانہ نشین ہو گیا تھا، لیکن یہ بدعہدی دیکھ کر مراد نے پھر میدانِ جنگ کا رُخ کیا، بڑی حکمتِ عملی سے اپنی فوجیں لے کر ایشیائے کوچک سے یورپ پہنچا۔ اور وارنا سے تھوڑی دُور اپنے خیمے نصب کرائے۔

جنگ شروع ہوئی، عیسائیوں کو اپنی فتح کا پورا یقین تھا، ان کا ساز وسامان اسلحہ اسپاہیوں کی کثرت ہر چیز ان کے اس یقین کو مستحکم کر رہی تھی، مراد کو خدا پر بھروسہ تھا اور وہ زیرِ لب دعا کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا، شروع میں عیسائیوں کی فتح ہوئی، پھر "ینی چری" نے مراد کی سرکردگی میں وہ زوردار حملہ کیا کہ عیسائیوں کے پاؤں اکھڑ گئے —— لاڈسلاس شہنشاہِ پولینڈ وہنگری کو ایک ترک نے بڑھ کر قتل کر دیا، پاپائے روما کا نائب جولین بھی ہلاک ہوا۔ اور ہونیاڈے کو بھی فرار پر قرار کرنا پڑا۔

اس جنگ کے بعد سرویا اور بوسینا پر پھر ترکوں کا قبضہ ہو گیا۔

قسطنطنیہ کا سقوط قسطنطنیہ کی اہمیت اور اسے فتح کر لینے کا خیال ہمیشہ سے مسلمانوں کے دلوں میں جاگزیں رہا ہے قسطنطنیہ پر سب سے پہلا حملہ ۳۴ھ میں ہوا، اس میں متعدد صحابہ کرام بھی شریک تھے، جن میں حضرت ابو ایوب انصاری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ امویوں اور عباسیوں کے دور میں بھی قسطنطنیہ

۱: کریسی جلد اول ص۲۹۳ بحوالہ دولتِ عثمانیہ۔

پر چڑھائی ہوئی لیکن ہر مرتبہ معاملہ ٹل گیا۔

پھر عثمان خاں اور اس کے جانشینوں نے بھی اس کی کوشش کی، حملے کیے، محاصرے جاری رکھے لیکن ہر مرتبہ کسی نہ کسی طرح محاصرہ اٹھا لینا پڑا۔ شاید اس لیے کہ یہ سعادت محمد فاتح کے مقدر میں لکھی تھی۔

شاہِ قسطنطنیہ کی شرارتوں سے تنگ آکر محمدؒ نے قطعی فیصلہ کر لیا کہ قسطنطنیہ کو فتح کیے بغیر دم نہ لے گا لیکن اس شہر کا فتح کر لینا کچھ آسان نہ تھا، قدرت نے بڑی فیاضی سے حفظ و دفاع کی سہولتیں اسے بہم پہنچائی تھیں۔ اس مثلث نما شہر کے دو حصے سمندر سے گھرے ہوئے تھے۔ لہٰذا اُدھر سے گویا اطمینان تھا۔ ترک اگرچہ آبنائے باسفورس پر قابض تھے لیکن کسی بڑے بحری بیڑے کے مالک نہ تھے۔ صرف مغرب کی طرف خشکی سے حملہ کیا جا سکتا تھا لیکن اسے بادشاہ نے بہت زیادہ مستحکم کر لیا تھا۔ کئی کئی فصیلیں، لمبی چوڑی خندقیں، کیل کانٹے سے لیس مسلح سپاہی۔

اپریل ۱۴۵۳ء میں محمدؒ نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا۔ محاصرہ کے دوران میں جھڑپوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ ۲۹ مئی ۱۴۵۳ء کو ترکوں نے زوردار اور فیصلہ کُن حملہ کیا۔ شاہِ قسطنطنیہ نے بھی بڑی پامردی سے مقابلہ کیا۔ یونانی سپاہیوں کی تعداد پر انھیں ناز بھی تھا اور اس میں کوئی شبہ نہیں، یونانی بڑی بے جگری سے لڑے لیکن ترکوں کے کامیاب حملوں کو روک نہ سکے، ان کی ٹکریاں فصیل کی دیواروں سے چڑھنے لگیں، ترک توپچی قیامت کی گولہ باری کرنے لگے۔ آخر شاہِ قسطنطین لڑتے ہوئے مارا گیا، یونانی بے بس ہو گئے، اور شہر مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا۔ محمد سینٹ صوفیہ کے گرجے پر پہنچا۔ حکم دیا اذان دی جائے اور پھر وہ خدائے مالک الملک کے سامنے سربسجود ہو گیا۔

محمد اسی فتح مندی کے بعد "محمد فاتح" کے نام سے مشہور ہو گیا۔

۱۴۵۹ء میں سرویا باقاعدہ سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ بن گیا۔ اس طرح ۱۴۶۲ء میں بوسینیا بھی سلطنتِ عثمانیہ کا ایک جزو بن گیا۔

البانیہ سے بھی بار بار معاہدے ہوئے لیکن وہ مستحکم نہ ثابت ہو سکے آخر ۱۴۶۷ء

میں محمد فاتح کی فوجیں البانیہ پر بھی قابض ہوگئیں۔

احمد کدک پاشا محمد فاتح کا جیالا اور منچلا سپہ سالار سرکشوں کی تادیب اور باغیوں کی سرکوبی میں مصروف تھا۔ وہ دولتِ عثمانیہ کی توسیع کے لیے سراپا جدّوجہد عمل بنا ہوا تھا۔ سنہ ۱۴۸۰ء میں اس نے اٹلی کے دروازے اور ٹرانٹو پر قبضہ کر لیا جس کے بعد اطالیہ براہِ راست ترکوں کی زد میں آگیا۔

یورپ کی متعدد ریاستوں کو زیر کر کے ترکوں نے ان پر قبضہ نہیں کیا بلکہ صرف باجگزار بنانے پر اکتفا کیا۔ لیکن اگر بعد میں ان کی طرف سے عہد شکنی، غداری اور شرارت کا ظہور ہوا تو پھر انھیں ممالکِ محروسہ میں شامل کر لیا گیا۔ ہرزی گو دینا سلطان بایزید ثانی (۱۴۸۱ - ۱۵۱۲ء) کے عہد میں مستقل طور پر سلطنتِ عثمانیہ میں شامل کر لیا گیا۔

ایران سے جنگ

ایران کا بادشاہ اسمٰعیل صفوی بڑا دلیر، بہادر، حوصلہ مند بادشاہ تھا۔ لیکن اپنے مذہب یعنی شیعیت میں بہت متشدد تھا، یہی حال سلیم اوّل (۱۵۱۲ - ۱۵۲۰ء) کا تھا یہ بھی اپنے مذہب یعنی سنّیت میں بہت متشدد تھا۔ وہ اہلِ سنّت پر سختیاں کرتا تھا اور یہ شیعہ آبادی کا دشمنِ جان بن گیا تھا وہ سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف سازشیں کرتا تھا، یہ ایران کو زک دینے کے منصوبے بناتا رہتا تھا۔ سنہ ۱۵۱۴ء میں بارہ سو میل کا پہاڑی اور دشوار گزار راستہ طے کرتا فوج کو تسلیاں دیتا ایران کی سرحد پر پہنچ گیا۔ تبریز کے مقام پر زبردست جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں ایران کو شکست ہوئی، ۲۵ ہزار ایرانی کھیت رہے، خود شاہ اسمٰعیل بڑی مشکل سے زخمی حالت میں جان بچا کر بھاگا۔

سنہ ۱۵۱۶ء میں سلیم اوّل نے شام پر حملہ کیا۔ حلب کے قریب مرج عرابق کے میدان میں پہلا معرکہ پیش آیا، شام پر ممالیک کا قبضہ تھا۔ یہ جنگ اگرچہ زوردار تھی لیکن صرف ایک گھنٹے میں ختم ہوگئی۔ پانسہ ترکوں کے ہاتھ رہا۔

شام کے بعد حلب نے بغیر لڑے ہوئے ہتھیار ڈال دیے، دمشق، بیت المقدس

حمص وغیرہ نے بغیر لڑے جھگڑے اطاعت قبول کرلی۔

مصر پر اب طومان بے کا قبضہ تھا۔ یہ بھی خاندانِ ملوک کا ایک فرد تھا، لیکن بڑا نڈر، بیباک، بہادر، جفاکش اور حوصلہ مند، سلیم اوّل کی فتوحات سے ذرا بھی مرعوب و متاثر نہیں ہوا۔ برابر آخری جنگ کی تیاریاں کرتا رہا۔ سلیم اپنی فوجوں کو لے کر جنوری ۱۵۱۷ء میں مصر کے دروازے پر پہنچ گیا۔ بڑی خوں ریز لڑائی ہوئی۔ ملوک اس بہادری سے لڑے کہ دشمن بھی اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے۔ لیکن بالآخر انھیں شکست ہوئی۔

ممالک عرب اور حجاز مقدس پر ترکوں کا قبضہ

حجاز مقدس پر مصر کے ممالیک کا قبضہ تھا جب مصر ہار گیا اور ترکی حکومت کا مقبوضہ بن گیا تو قدرۃً حجاز اور یمن کی حکومت بھی ترکوں کے ہاتھ میں آگئی۔ اور وہ "خادم الحرمین الشریفین" بھی بن گئے۔ حجاز اور یمن کے باشندوں نے کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی۔ بے تامل سلطان کے نام پر بیعت کرلی۔

شام، مصر، حجاز اور یمن پر سلیم کا قبضہ ہوجانے کے بعد اب اسلامی ممالک میں کوئی اس کا حریف اور مدمقابل نہیں رہ گیا۔ بغداد کی خلافت تباہ ہوچکی تھی۔ عباسی خلیفہ ممالیک کی تحویل میں تھا، وہ اس کے نام سے فائدہ اٹھاتے تھے، حکومت خود کرتے تھے، سلیم نے مناسب سمجھا کہ خلافت پر بھی قبضہ کرلے، اس کا عندیہ دیکھ کر خلیفہ نے اپنے تمام حقوق و اختیارات اُسے سونپ دیے۔ مقاماتِ مقدسہ اور حرمین شریفین کی کنجیاں حوالے کردیں۔ جو تبرکات تھے وہ بھی سونپ دیے۔

سلیمانِ اعظم (۱۵۲۰۔۱۵۶۶ء) نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد ہنگری کی آویزشوں سے تنگ آکر یورش کی۔ ۱۵۲۱ء میں اس نے بلغراد کو فتح کرلیا۔ اس فتح سے جمہوریہ وینس اتنی دہشت زدہ ہوئی کہ اس نے پھر باجگزار بننا منظور کرلیا اور خراج کی رقم بھی دوچند کردی۔

روڈس میں صلیبی جنگوں کے جاں بازوں کی نسل کے شجیع افراد رہتے تھے یہ مسلمانوں کے بدترین دشمن تھے، سلطنتِ عثمانیہ کا استیصال ان کی زندگی کا مقصد تھا۔

اپنے جہازوں پر بیٹھ کر یہ بحر پیمائی اور ترک تازیاں کرتے تھے سلیمان نے فیصلہ کر لیا کہ ان کا قلع قمع کیا جائے چنانچہ وہ ۲۸۔ جولائی ۱۵۲۲ء کو روڈس کے ساحل پر اترا، پہلی اگست کو محاصرہ شروع کیا اور ۲۵۔ دسمبر کو قبضہ کر لیا۔

ہنگری پر مسلمانوں کا قبضہ ہنگری بھی ان ممالک میں سے تھا جو سلطنتِ عثمانیہ سے خار کھاتے تھے۔ وہ دولتِ علیہ کے دشمنوں سے ہمیشہ ساز باز کرتا رہتا تھا۔ چنانچہ اس نے ترکوں کے خلاف ایران سے معاہدہ کر لیا۔

سلیمان یہ بات برداشت نہ کر سکا۔ فوجِ گراں لے کر روانہ ہوا۔ ۲۰ اگست ۱۵۲۶ء کو زبردست اور فیصلہ کُن جنگ ہوئی۔ شاہِ لوئی بھاگتا ہوا غرقِ دریا ہوا۔ بڑی شان و شکوہ سے ہنگری کے پایہ تخت بودا میں سلیمان داخل ہوا۔ بادشاہ لاولد مرا تھا، ایک امیر کو بادشاہ بنایا اور قسطنطنیہ واپس چلا گیا۔ ۱۵۲۹ء میں سلیمان نے وی آنا (آسٹریا) کا بھی محاصرہ کیا، لیکن اندرونی چپقلش کی وجہ سے محاصرہ اٹھا کر واپس چلا گیا۔

۱۵۳۴ء میں سلیمان نے ایران کی طرف پھر رخ کیا، تبریز ہوتا ہوا موصل اور بغداد پہنچا۔ یہ دونوں ایران کے صوبے تھے، ان پر قبضہ کیا اور سلطنتِ عثمانیہ میں شامل کر لیا۔ ۱۵۵۴ء میں سلیمان نے پھر ایران پر حملہ کیا اور کئی شہروں پر قبضہ کر لیا۔ اسی سلسلے میں اس نے آرمینیا اور میسوپوٹامیہ کے بعض بڑے علاقوں پر بھی تسلط کر لیا۔ پھر اپنی بحری قوت کو کام میں لایا اور عدن پر مستقل قبضہ کر لیا۔ سلیمان نے بحری طاقت پر بہت زیادہ توجہ کی تھی اور رفتہ رفتہ یہ طاقت اتنی بڑھ گئی تھی کہ اسپین اور وینس کے بحری بیڑے بھی عثمانی بیڑے سے مقابلہ کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔

سلطان سلیم ثانی (۱۵۶۶۔۱۵۷۴ء) کے عہد میں قبرص پر ترکوں نے ۱۵۷۰ء میں حملہ کیا۔ سات ہفتے کے محاصرہ کے بعد قبرص کے پایہ تخت نکوسیا پر قبضہ ہو گیا، پھر دوسرے قلعے بھی سر ہو گئے اور سارے قبرص پر ترکوں کا عمل دخل ہو گیا۔

۱۵۷۶ء میں شاہ طہماسپ کے انتقال کے بعد ترکی فوجیں جارجیا پر حملہ آور ہوتی ہیں۔ ایران اور جارجیا میں دوستی کا معاہدہ تھا۔ مصطفےٰ پاشا نے جارجیا کے پایہ تخت طفلس پر قبضہ

کرلیا۔ پھر بڑی آسانی سے سارا جارجیا اس کے قبضے میں آگیا۔

ایران سے صلح

۱۵۹۰ء میں دولتِ ایران اور سلطنتِ عثمانیہ سے جو آویزش تھی وہ ختم ہوگئی۔ اور پیمانِ صلح باندھا۔ اس عہد نامہ کی رُو سے جارجیا، شروان، لورستان، تبریز اور آذربائیجان کا ایک حصہ مراد ثالث کے ممالکِ محروسہ میں شامل تسلیم کیا گیا۔

۱۶۳۸ء میں سلطان مراد چہارم (۱۶۲۳ء۔ ۱۶۴۰ء) بہ نفسِ نفیس فتح بغداد کے لیے آگے بڑھا۔ عثمانی فوجیں فاتحانہ یلغار کرتی ہوئی بغداد میں داخل ہوگئیں، بغداد فتح کرکے جب سلطان قسطنطنیہ پہنچا تو عوام نے اس کا بڑا یادگار اور شاندار استقبال کیا۔

جزیرۂ کریٹ ہر اعتبار سے ترکوں کے لیے ضروری تھا، وہ اس مورچے کو سر کرنے کے لیے کئی بار آگے بڑھے لیکن منزلِ مقصود تک نہ پہنچ سکے۔ کریٹ کا محاصرہ کئی سال سے جاری تھا۔ آخر ۱۶۶۹ء میں بہ عہد سلطان محمد چہارم ترکی فوجیں اس پر قابض ہوگئیں اور مکمل طور پر یہ سلطنتِ عثمانیہ کا ایک جزو بن گیا۔

روس کی شکستِ فاش

نومبر ۱۷۱۰ء میں زارِ روس پیٹر کی شرارتوں اور بدعہدیوں سے مجبور ہوکر ترکی نے اعلانِ جنگ کیا۔ تاکہ اس کی بدنیتی اور بدعہدی ختم ہو جائے، زار خود فوج لے کر بڑھا، لیکن ترکوں نے اس طرح گھیر لیا کہ وہ نرغے میں آگیا۔ "نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن" اس کا یہ حال زار دیکھ کر اس کی ملکہ کیتھرائن آگے بڑھی اور اس نے ترک سردار محمد پاشا سے صلح کی استدعا کی، محمد پاشا کی عالی ظرفی نے مجبور دشمن کی جان لینا یا اُسے گرفتار کرنا مناسب نہ سمجھا، وہ صلح پر راضی ہوگیا۔ لیکن صلح نامہ اس طرح لکھا کہ روسی ہمیشہ یہ محسوس کریں کہ وہ درحقیقت شکست کھا چکے تھے۔ چنانچہ معاہدہ کی ابتدائی سطریں یہ تھیں:

"اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے فتح مند اسلامی فوجوں نے زارِ روس کو اس کی تمام فوجوں کے ساتھ دریائے پرتھ کے قریب گھیر لیا ہے اور زار نے

صلح کی درخواست کی ہے اور اسی کی درخواست پر مندرجہ ذیل دفعات (صلح) مرتب اور منظور کی جاتی ہیں۔"

آسٹریا کی یادگار شکست

۱۷۳۷ء میں آسٹریا نے بدعہدی کی صلحناموں کو ردی کا پُرزہ قرار دیا۔ اور ترکی علاقوں پر تاخت و تاراج کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کیا۔ آسٹریا کو جب انھوں نے جنگ آزما دیکھا تو پیچھے نہ ہٹے اور جنگ کا جواب جنگ سے دینا شروع کر دیا اور آخرکار انھوں نے آسٹریا کو وہ یادگار اور ناقابلِ فراموش شکست دی کہ وہ گرگرا استدعائے صلح کرنے پر مجبور ہو گیا۔

فروری ۱۹۱۵ء کو برطانیہ اور فرانس کے جنگی جہازوں نے دردانیال پر گولہ باری شروع کی۔ مسٹر چرچل کی رائے تو یہ تھی کہ دردانیال پر قبضہ کر کے قسطنطنیہ چھین لیا جائے اور ترکی حکومت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا جائے۔ لیکن ترک ابھی زندہ تھے۔ انھوں نے ایسی گولہ باری کی کہ اتحادی جہازوں کو بھاگنا پڑا۔ اس معرکے میں پچاس ہزار سپاہی اتحادیوں کے ہلاک ہوئے، دشمن کے بہت سے جہاز غرقاب ہو گئے۔ اور بہت سے مجروح۔

دردانیال کی مہم میں ناکام ہونے کے بعد خشکی کے راستے سے اتحادیوں نے ترکی پر حملہ کیا۔ میدانِ جنگ گیلی پولی قرار پایا (مئی ۱۹۱۵ء) اتحادیوں نے کئی سپہ دار بدلے لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ یہیں مصطفےٰ کمال پاشا کے جوہر چمکے اور مصطفےٰ کمال کے استقلال اور بے پناہ گولہ باری نے اتحادیوں کو خستہ اور مضمحل کر دیا۔ جنگ کا سلسلہ کئی روز جاری رہا۔ آخرکار اتحادی ہزاروں کشتے میدانِ جنگ میں چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔ مشہور امیر البحر لارڈ کچنر نے بھی اس محاذ کا معائنہ کیا لیکن وہ بھی گیلی پولی کی تسخیر سے مایوس رہے۔

دردانیال اور گیلی پولی کے معرکوں نے ثابت کر دیا کہ کمزور اور بے دست و پا ہونے کے باوجود ترک دم خم رکھتے ہیں، زندہ رہنے کا گر بھی جانتے ہیں اور مرنے کا فن بھی!

لیکن یہ کامیابیاں حالات کی نامساعدت کے باعث زیادہ نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکیں ترکوں کو آخر کار شکست اٹھانا پڑی۔

صرف شجاعت اور دلیری ہی اصل چیز نہیں ہے۔ موثرات، عوامل اور حالات بھی بڑی چیز ہیں۔

پہلی جنگ عظیم میں ترکوں اور جرمنوں کو شکست ہوئی، سارا یورپ ترکوں کا دشمن تھا۔ جرمنی سے دشمنی کے باوجود سب کو ہمدردی تھی۔ اس لیے کہ ترک مسلمان تھے اور جرمنی عیسائی۔ لیکن ترکوں نے اس متحدہ عداوت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اپنے ملک کو غلام نہیں بننے دیا مگر ترکی کے ہاتھ سے اس کے کئی مقبوضات اور اہم مقامات نکل گئے۔

سیاسی اصلاحات و انقلابات کی تاریخ

جمہوریت اور مطلق العنانیت میں کشمکش

عوام کی حکومت عوام کے ہاتھ میں عثمان خاں کے دور میں سلطنت چونکہ بالکل ابتدائی حالت میں تھی، لہٰذا انتظامات بھی معمولی تھے۔

لیکن سر و رخاں کے بھائی علاء الدین نے جو پہلا وزیر تھا فوج میں انقلابی اصلاحات نافذ کیے۔ اس نے پیادوں، سواروں اور رضا کاروں کی باقاعدہ ترتیب رکھی اس نے باقاعدہ اور تنخواہ دار فوج ملازم رکھی۔

"ینی چری" فوج ترتیب دی جس نے آگے چل کر دولتِ عثمانیہ کے عروج و زوال میں بڑا حصہ لیا۔

مراد اول نے فوجی جاگیروں کا بندوبست کیا، شاہی جاگیر الگ قائم کی، مسجدیں مدرسوں اور دوسرے مذہبی اداروں کے لیے بہت سی زمینیں وقف کر دیں۔

محمد فاتح کے دور میں نظمِ مملکت کے اصول و ضوابط پر زیادہ توجہ ہوئی۔ اس کا "قانون نامہ"، گویا سلطنتِ عثمانیہ کا دستورِ اساسی ہے، اس نے متعدد نئے منصب قائم کیے، مثلاً قضاۃ عسکر، دفتردار (خازن) نشانجی (معتمد سلطنت) خواجہ (اتالیقِ شہزادگان) مفتی، رئیس آفندی (سکریٹری) آغا، سنجق، بے وغیرہ۔

سلیمانِ اعظم نے نظامِ جاگیری کی طرف خاص توجہ کی، اس نے ایک قانون بنا دیا تھا کہ بڑی جاگیر چھوٹی نہیں بنائی جا سکتی، نیز جاگیر کی تقسیم اس وقت تک عمل میں نہیں آسکتی جب تک بابِ عالی سے اجازت حاصل نہ کی جائے۔ کوئی جاگیر وصیت نامہ کے ذریعے کسی کو منتقل نہیں کی جا سکتی۔ لاولد جاگیر سلطنت کی ملک ہو جاتی تھی۔

سلطان سلیم اعظم نے غیر مسلم رعایا کے لیے ایک ضابطہ آئین ترتیب دیا اور اسے غیر معمولی سہولتیں اور آسائشیں بہم پہنچائیں۔

فوجداری، پولیس اور دوسرے عام قوانین کی ترتیب و تہذیب پر بھی سلیمان نے خاص توجہ کی۔ اور ملا ابراہیم حلبی سے ایک مجموعۂ قوانین تیار کرایا۔

سلطان عبدالحمید (۱۷۷۴ - ۱۷۸۹ء) کے عہد میں اس کے وزیرِ بحریہ حسن پاشا الجزائری نے بحریہ کی اصلاح کی۔ اس نے نئے طرز کے جنگی جہاز تعمیر کرائے دوسرے اسلامی ممالک سے ماہر جہازراں بلائے۔ اور ان کی خدمات سے فائدہ اٹھایا۔

سلیم ثالث[1] نے سب سے پہلے جاگیری نظام کو یکقلم منسوخ کیا اور طے کیا کہ آئندہ سے ان جاگیروں کی آمدنی سرکاری خزانے میں داخل کی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ جاگیری نظام نے بہت زیادہ ابتری اور خلفشار پیدا کر دیا تھا۔ اس نے پاشاؤں کے بڑھتے ہوئے اختیارات بھی تقریباً سلب کر لیے۔ ان اختیارات سے وہ ناجائز فائدہ اٹھانے کے عادی ہو گئے تھے۔ اور اپنے اپنے حلقوں میں بادشاہ عالی جاہ بن بیٹھے تھے، مالگذاری ٹھیکے کے ذریعے وصول کی جاتی تھی۔ سلیم نے یہ قاعدہ بھی توڑ دیا اور یہ کام سرکاری عمال کے ذمے کیا گیا کہ وہ مالگذاری وصول کریں اور خزانۂ عامرہ میں داخل کریں۔ صدرِ اعظم کے لامحدود اختیارات پر بھی پابندی عائد کی گئی اور اسے اس امر کا پابند کیا گیا کہ وہ تمام اہم معاملات میں دیوان (مجلسِ

۱: ۱۷۹۸ - ۱۸۰۷ء

شوریٰ) سے صلاح لے۔

سلیم اس حقیقت کا رمز شناس تھا کہ جب تک جہالت رہے گی مملکت کی بنیادیں مستحکم نہیں ہوں گی۔ چنانچہ اس نے تعلیم کی ترویج و توسیع پر سب سے زیادہ توجہ کی۔ اور مدارس و مکاتب کا ایک جال اپنی مملکت میں بچھا دیا۔

سلیم کا ایک اور بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے یہ بات بھی محسوس کر لی تھی کہ علم کسی کی جاگیر نہیں ہوتا۔ اگر ہے تو صرف مسلمان کی گمشدہ میراث ہے۔ چنانچہ اس نے دوسری زبانوں سے علوم و فنون کے تراجم پر بھی توجہ کی۔

ینی چری سپاہ کے دستے بے شک جنگ میں سرفروشی دکھاتے تھے لیکن امن کے زمانے میں وہ بغاوت اور سرکشی کو بھی اپنا شعار بنا لیتے تھے۔ قدامت پرست اتنے تھے کہ یہ کسی اصلاح کے قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے بلکہ خون کی ندیاں بہا دیتے تھے۔

سلیم نے انھیں چھیڑنے کے بجائے عمر آغا کی سرکردگی میں ایک نئی فوج قائم کی جو بالکل جدید یورپین طرز پر مرتب کی گئی تھی۔

بحریہ کے اصلاحی پروگرام کو بھی شدت سے روبہ عمل لایا گیا، نئے جنگی جہاز یورپین طرز پر تعمیر ہوئے۔ فرانس اور سویڈن کے انجنیئر بلوائے گئے اور ان کی خدمات سے فائدہ اٹھایا گیا۔

پاشاؤں کو سزائے موت تک کا اختیار حاصل تھا۔ محمود نے صرف یہ اختیارات ہی نہیں چھینے بلکہ ہر ملزم کو اپیل کا حق بھی دیا۔ اس نے یہ اصول طے کیا کہ ملزم پہلے قاضی عسکر کے حضور میں اپیل کرے، اگر وہاں سے مسترد ہو جائے تو پھر ملاحظۂ سلطانی میں اپیل پیش کی جائے، یہاں سے اگر مسترد ہو تو سزائے قتل کا نفاذ ہو سکتا ہے۔

ترکیہ میں اگرچہ اوقاف کافی تھے، لیکن ان کا انتظام نہایت ناقص تھا، محمود نے اس طرف توجہ کی اور بدعنوانیوں اور بدانتظامیوں کا سدِّباب یوں کیا کہ جملہ اوقاف کی نگرانی حکومت کے ذمّے قرار دے دی۔

اب تک تعلیم کا نظام باقاعدہ طور سے استوار نہیں ہوا تھا۔ عملی طور پر یہ کام علماء کے ہاتھ میں تھا اور وہی بذاتِ خود اس سلسلے میں جو چاہتے تھے کرتے تھے لیکن سلطان عبدالمجید خاں نے یہ صورت بھی بدل دی۔ ۱۸۴۶ء کے ایک فرمان کی رُو سے ایک مجلس تعلیمِ عامہ کا قیام عمل میں آیا۔ جس کے ذمے ایک یونیورسٹی کی تشکیل و قیام کی ذمہ داری بھی تھی۔ تعلیم کا نظام علماء سے لے کر اس مجلس کے سپرد کر دیا گیا۔ نیز مسجدوں میں جو مکتب قائم تھے ان کی تنظیم بھی کی گئی۔ اور یہ کام بھی مجلسِ تعلیم عامہ کے سپرد کر دیا گیا۔

عبدالمجید خاں نے اور بہت سے امور کی طرح فوجی معاملات پر بھی توجہ کی اور یہاں بھی اس کی انقلاب آفریں طبیعت ایک انقلاب پیدا کیے بغیر نہ رہ سکی۔ فوج کی بھرتی کا ایک نیا نظام قائم ہوا۔ (۱۸۴۳ء) فوج دو حصّوں میں تقسیم کر دی گئی۔

۱: نظام۔

۲: ردیف۔

نظام وہ فوج قرار پائی جو میدانِ جنگ میں رہا کرتی تھی۔

ردیف اسے قرار دیا جو آئندہ اور ناگہانی ضرورتوں کے لیے چوکس رکھی جاتی تھی۔

سلطان عبدالعزیز (۱۸۶۱ء-۱۸۷۶ء) کے عہد میں ایک کونسل آف اسٹیٹ کا قیام عمل میں آیا۔ (۱۸۶۸ء) یہ مجلس دو گونہ اختیارات کی حامل تھی یعنی اسے قانون سازی کے اختیارات بھی حاصل تھے اور انھیں نافذ کرنے کے بھی۔ اس کے ارکان میں مسلمان اور عیسائی دونوں تھے۔

سلطان عبدالعزیز کے عہد میں ایک عدالتِ عالیہ بھی پہلی مرتبہ قائم ہوئی۔ جسے انصاف وعدل کے سلسلے میں زیادہ سے زیادہ وسیع تر اختیارات حاصل تھے۔ عدالتِ عالیہ کے ججوں میں عیسائی اور مسلمان ججوں کی تعداد برابر برابر تھی۔

سلطان عبدالعزیز کے عہد میں ایک جدید ضابطہ دیوانی جس کا نام مجلّہ تھا نافذ کیا گیا جس میں قانونِ شریعت اسلامی کو زمانۂ حال کی ضروریات کے مطابق مدوّن کرنے کی

کوشش کی گئی تھی۔

سلطان عبدالحمید ثانی (۱۸۷۶ء-۱۹۰۹ء) بڑا مستعد فرماں روا تھا لیکن مدحت پاشا وزیر اعظم بھی ایک آہنی عزم کا انسان تھا۔ اس نے سلطان کی تخت نشینی سے پہلے اس سے یہ وعدہ لے لیا تھا کہ وہ دستور اساسی جلد از جلد نافذ کر دے گا۔

شروع شروع میں عبدالحمید نے نفاذِ دستور کے راستے میں روڑے اٹکائے لیکن مدحت کو ہر دلعزیزی اور محبوبیت حاصل تھی۔ اس کا مطالبہ معنویت، استدلال اور منطق پر مبنی تھا۔ پھر اس مطالبے کی پشت پناہی رائے عامہ کر رہی تھی۔ آخر مجبور ہو کر بادلِ ناخواستہ دسمبر ۱۸۷۶ء میں دستورِ اساسی کا اعلان ہوا۔ اس موقع پر ترکیہ کے عوام و خواص نے بڑے جوش و خروش کا اظہار کیا۔ گھر گھر چراغاں ہوا۔ مدحت پاشا زندہ باد اور خلیفۃ المسلمین پائندہ باد کے نعرے لگنے لگے۔

پارلیمنٹ کا قیام دستور اساسی کی رُو سے ایک پارلیمنٹ کا قیام عمل میں آیا جس کے دو ایوان تھے:

ایوانِ زیریں۔

ایوانِ بالا۔

آخر الذکر کے نمائندے نامزد ہوتے تھے اور اول الذکر کے منتخب۔

ایک کابینہ کا قیام عمل میں آیا جسے پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ قرار دیا گیا۔

نیز آزادی اجتماع، آزادیٔ تقریر اور آزادیٔ تحریر کا حق تسلیم کر لیا گیا، پریس کو زیادہ سے زیادہ آزادی دینے کا وعدہ کیا گیا۔

لیکن یہ سب فریب ہی فریب تھا، موقع پاتے ہی عبدالحمید ثانی نے دستور منسوخ کر دیا، پارلیمنٹ برخاست کر دی، مدحت پاشا کو جلا وطن کر دیا۔

عبدالحمید ثانی (۱۸۷۶ء-۱۹۰۹ء) کی استبداد پسند طبیعت نے صرف اس پر ہی اکتفا نہیں کیا کہ مدحت پاشا جیسے علمبردار دستور کو جلا وطن کر دیتی، اس نے مدحت پاشا کو گرفتار کر کے طائف بھیج دیا اور وہاں پھانسی پر چڑھا دیا۔

مدحت کے قتل کے بعد نوجوان ترک اپنی امنگوں اور آرزوؤں کو زیادہ ضبط نہ کر سکے وہ میدان میں آگئے۔ انھوں نے انجمن اتحاد و ترقی کے نام سے ایک مضبوط فعال اور کارگزار جماعت بنا ڈالی، جس کا مقصد وحید یہ تھا کہ ملک میں دستوری نظام حکومت رائج کیا جائے اور شخصی مطلق العنانی کا خاتمہ کیا جائے۔

ترکیہ کے اندر اور باہر اس انجمن کے ممبر پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے ممبروں میں خواتین کی بہت بڑی تعداد تھی اور یہ سب بڑے جوش و خروش سے حصول مقصد کی سعی و کوشش میں لگے ہوئے تھے۔

انجمن کے ہر ممبر کو حلف لینا پڑتا تھا کہ اپنی جان انجمن کے اغراض و مقاصد پر قربان کر دے گا، اگر مصالح ملی کا تقاضا ہوا تو بھائی تک کے قتل سے دریغ نہیں کرے گا۔ یہ قسم قرآن اور تلوار ہاتھ میں لے کر کھانا پڑتی تھی۔

عبدالحمید بھی خاموش نہیں بیٹھا تھا، وہ اپنے نظام جاسوسی پر پورا بھروسہ کرتا تھا اور کوئی شبہ نہیں کہ اس کے جاسوس ہر ممکن طریقے سے اسے ضروری اور خفیہ اطلاعات بہم پہنچاتے رہتے تھے۔ اس نے انجمن کو توڑنے اور ارکان انجمن کو مرعوب کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا قتل تو ایک بہت معمولی اور عام سزا بن گئی تھی۔

جولائی ۱۹۰۸ء میں انجمن کی طرف سے باقاعدہ عملی طور پر تحریک انقلاب شروع ہوگئی، حکومت کی کوئی سختی بھی اس بڑھتی ہوئی رو کو نہ روک سکی۔ جیسے جیسے سختی کی گئی حالات قابو سے باہر ہوتے چلے گئے۔

آخر جب عبدالحمید نے اپنی زندگی اور اپنی سلطنت کے بچاؤ کی کوئی صورت نہ دیکھی اور اس کے حامیوں اور ساتھیوں نے بھی منہ موڑ لیا تو ہر طرف سے مایوس اور بے بس ہو کر اس نے اپنی مجلس وزراء کے مشورہ سے متاثر ہو کر ۲۴۔ جولائی ۱۹۰۸ء کو دستور کا پھر سے اعلان کر دیا۔

اس مسرت انگیز موقع پر انور پاشا نے کہا:

"آخر کار استبداد کا خاتمہ ہو گیا۔ اب ہماری حکومت ہے۔ ہم آج سے سب بھائی بھائی ہیں۔ اب نہ کوئی بلغاری ہے نہ یونانی، نہ رومانوی ہے نہ جمہوری نہ ترک، اس نیلے آسمان کے نیچے ہم سب برابر ہیں اور صرف عثمانی ہوتے پر فخر کرتے ہیں۔

ایک طرف تو انجمن کی کامیابی پر یورپ چراغ پا ہو رہا تھا۔ دوسری طرف خود عبدالحمید پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ آخر اس نے پھر چپقلش برپا کی، لیکن اب دستور پارٹی (انجمن اتحاد و ترقی) اتنی طاقت حاصل کر چکی تھی کہ اُسے دبایا نہیں جا سکتا تھا۔ چنانچہ ۲۷ اپریل ۱۹۰۹ء کو مجلس ملی نے سلطان کو معزول کر دیا اور وہ باحسرت و یاس سالونیکا چلا گیا جہاں نظر بندی کے عالم میں ۱۹۱۸ء میں وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا بھائی رشاد محمد پنجم کے نام سے تخت نشین ہوا۔

مصطفےٰ کمال پاشا نے جنگِ عظیم کے اختتام کے بعد جب ترکی کی عنانِ حکومت ہاتھ میں لی تو دور رس اصلاحات کا سلسلہ شروع کر دیا جس نے ساری دنیا کو چونکا کر دیا۔

خلافت کا خاتمہ!

پہلا کام یہ کیا کہ خلیفۃ المسلمین (عبدالحمید خاں) کو جلا وطن کر دیا اور ملک میں جمہوریت کی داغ بیل ڈالی۔ خلافت ختم کر دی۔

تحریکِ خلافت

ہندوستان میں مولانا محمد علی شوکت علی نے تحریکِ خلافت کی بنیاد ڈالی تھی تاکہ خلافتِ اسلامیہ ترکیہ کو مصائب سے محفوظ رکھنے میں مدد دیں، لیکن مصطفےٰ کمال پاشا کے اس غیر متوقع فیصلے نے مسلمانانِ ہند و پاکستان کی تحریکِ خلافت اور اسلامی ہند کی قیادت کو بڑا صدمہ پہنچایا۔

دوسرا کام مصطفےٰ کمال نے یہ کیا کہ سابق لباس بالکل متروک کر دیا۔ اس کے

بجائے پتلون اور ہیٹ کو حکماً رواج دیا۔

تیسرا کام مصطفٰے کمال نے یہ کیا کہ ایک فرمان کے ذریعے پردہ بھی ممنوع اور قابلِ سزا فعل قرار دیا۔ ترک کمال کے آہنی پنجے کی گرفت میں اس طرح آچکے تھے کہ وہ اس حکم کی تعمیل ہی کرنے پر مجبور ہو گئے۔

کمالی اصلاحات

ترکی زبان بے شک اپنا ایک الگ اور مستقل وجود رکھتی تھی لیکن اس کا رسم الخط عربی تھا۔ مصطفٰے کمال پاشا نے برسرِ اقتدار ہونے کے بعد لاطینی (رومن) رسم الخط جبراً نافذ کیا اور عربی حروف کو سختی، بے مروتی اور احسان فراموشی کے ساتھ جلاوطن کر دیا۔

ایک اور فیصلہ مصطفٰے کمال نے یہ کیا کہ قدیم ترکی زبان کا احیاء، تعصب اور عصبیت کے ساتھ شروع کر دیا۔ عربی الفاظ چھانٹ چھانٹ کر نکالے گئے اور ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ترکی الفاظ ان کی جگہ پر لائے جانے لگے۔ یہ اصلاح بھی چاروناچار ترکوں کو قبول کرنی پڑی، پھر دوسرا اقدام کمال نے یہ اٹھایا کہ اذان (اور بعض روایات کے مطابق نماز بھی) کے لیے حکم صادر کیا کہ وہ ترکی زبان میں دی جائے۔ خطبۂ جمعہ تک تو خیر کوئی مضائقہ نہیں تھا، لیکن اس اقدام نے اگرچہ رواج حاصل کر لیا لیکن ترکوں کو اس فیصلے سے بھی روحانی صدمہ ہوا۔ سنہ ۱۹۵۱ء کے انتخابات میں منتخبہ نئے صدرِ حکومت جلال بایار نے جب پھر سے عربی میں اذان دینے کی اجازت دی تو جس دن پہلی مرتبہ مسجدوں میں اذان دی گئی تو ترکوں کا یہ حال تھا کہ وہ ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے تھے۔ بہت سے ترک وفورِ مسرت سے بے قابو ہو کر رونے لگے۔

سلطان محمد فاتح نے جب قسطنطنیہ فتح کیا تھا تو ایا صوفیہ میں شکرانہ کی نماز ادا کی تھی اس دن سے اس نے قسطنطنیہ کی سب سے بڑی اور شاندار مسجد کی حیثیت اختیار کر لی لیکن مصطفٰے کمال نے اس کی یہ حیثیت یکلخت بدل دی اور اُسے نیشنل میوزیم میں تبدیل کر دیا۔

اب نئی ترکی حکومت میں عیسائیوں کا کوئی سوال نہیں رہ گیا تھا کیونکہ انھوں نے

آزادی اور خود مختاری حاصل کر کے اپنی اپنی حکومتیں قائم کر لی تھیں لیکن مصطفےٰ کمال نے پھر بھی یہ ضروری سمجھا کہ ترکی حکومت کو "سیکولر" حکومت بنا دیا۔

مصطفےٰ کمال پاشا کے یہ اقدامات درحقیقت ردّ عمل کی حیثیت رکھتے تھے۔ ترکوں نے اپنے دورِ حکمرانی میں عربوں کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کیا تھا۔ لیکن عربوں نے انگریزوں کے بہکاوے میں آکر نہ صرف ترک حکومت کے خلاف بغاوت کی، بلکہ ترک افسروں کو مارا اور قتل کیا۔ اگر عربوں نے بغاوت نہ کی ہوتی تو پہلی جنگِ عظیم میں ترکوں کو شکست نہ ہوتی۔ اور اس شکست کے نتیجے میں وہ اپنی وسیع ترین سلطنت کو ایک محدود مملکت میں تبدیل کرنے پر مجبور نہ ہو جاتے!

ترکوں کے عہد کے علمی کارنامے!

علماء کا احترام، تعلیم عامہ کا اہتمام، مدارس کا نظام

تراجم کی حوصلہ افزائی

اپنے دورِ حکومت میں عثمان خانِ اوّل کو بہت سی چیزوں کی طرف توجہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ یہ کمی اس کے ہونہار بیٹے اور جانشین اورخاں نے پوری کی۔ اپنے دورِ حکومت میں اس نے بروصہ کو اہلِ علم وفضل وکمال کا شہر بنا دیا تھا، اس دور میں بروصہ نے اتنی شہرت اور ناموری حاصل کی کہ ایران اور عرب ممالک کے طالبانِ علم کشاں کشاں دور دراز سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے وہاں پہنچتے، شادکام و بامراد ہوتے پھر شادان و فرحاں اپنے وطن واپس چلے جاتے۔

سلطنتِ عثمانیہ کا پہلا مدرسہ وہ تھا جو اورخاں کے دورِ حکومت میں بہ مقام نائسیا قائم کیا گیا تھا۔

سلطان محمد (۱۴۱۳۔ ۱۴۲۱ء) نے بھی اپنے دورِ حکومت میں بہ مقام بروصہ ایک عالیشان دارالمدرسہ تعمیر کیا جہاں دُور دُور سے طالبانِ علم کھنچ کھنچ کر آتے تھے۔

مولانا جامی کی سرپرستی

محمد فاتح، سلاطینِ عثمانیہ میں علم و ادب اور شعر وانشا سے بڑی دلچسپی لیتا تھا وہ خود بھی بہت سی زبانوں کا ماہر تھا۔ عربی، فارسی، لاطینی اور یونانی زبانوں پر اُسے خاصی دسترس تھی۔ وہ ہر سال

گراں قدر تحائف خواجۂ جہاں (ہندوستان) اور مولانا جامی (ایران) کی خدمت میں بھیجا کرتا تھا[1] علاوہ ازیں اس نے اور بھی بہت سے مکاتب اور مدارس قائم کیے۔

آخری بازنطینی مؤرخ فرانزا محمد فاتح کا ہم عصر تھا اور فتح قسطنطنیہ کے وقت گرفتار بھی ہوگیا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

"سلطان محمد سکندر، اغطس، قسطنطین اور تھیوڈ ولیس کے سوانح حیات اور کارنامے بڑے انہماک سے پڑھا کرتا تھا۔ اس کے حکم سے یونانی سوانح نگار نے پلوٹارک کی مشہور ومعروف کتاب جو مشاہیر یونان روما کے تذکروں پر مشتمل ہے ترکی زبان میں ترجمہ کی گئی"[2]

محمد فاتح نے ہر محلے میں اور ہر بڑے گاؤں میں مکاتب کا ایک جال بچھا دیا تھا۔ اعلی التعلیم کے مدارس بھی اس نے قائم کیے تھے۔ ان مدرسوں کے مصارف کے لیے بڑی بڑی جائدادیں وقف کیں۔

سلیمانِ اعظم (سنہ ۱۵۲۰ء تا سنہ ۱۵۶۶ء) علم کا بڑا قدر دان تھا، علماء کی سرپرستی خاص طور پر کرتا تھا۔ اس نے علماء کی تعلیمی تنظیم کی طرف توجہ کی۔ انھیں بڑے بڑے سرکاری مناصب پر فائز کیا۔ اور سارے طبقۂ علماء کو ہر طرح کے محصول سے بری کر دیا ایک قانون یہ بنایا کہ کسی عالم کی جائیداد کسی صورت میں بھی ضبط نہیں کی جا سکتی۔

سلطان محمد چہارم (۱۶۴۸ء - ۱۶۸۷ء) علماء کا بڑا قدر دان تھا، علماء کی ہم نشینی سے اسے بہت دل چسپی تھی۔ مؤرخین کی بھی قدر کرتا تھا، ان کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ اپنے دربار میں انھیں جگہ دیتا تھا، ان کی کتابیں پڑھتا تھا۔ اور جہاں کہیں ترمیم و اصلاح کی ضرورت محسوس ہوتی تھی خود اپنے قلم سے تخفیف و اضافہ کرتا تھا۔

سلطان احمد (۱۷۰۳ء - ۱۷۳۰ء) مدرسوں اور مکتبوں کی توسیع و تعمیر سے دلچسپی

۱: "ترکی" از لین پول ص۱۰۲ بحوالہ دولت عثمانیہ ج ۱۔

۲: گبن ج ۴ ص۴۷۵ فٹ نوٹ بحوالہ دولتِ عثمانیہ۔

لیتا تھا، علوم و فنون کی ترویج کی سعی کرتا تھا، اسی سلطان کے زمانے میں پہلی مرتبہ ایک پریس قائم ہوا۔ اور یہاں طبع و اشاعت کا کام شروع ہو گیا۔ اگرچہ مفتی اعظم نے یہ شرط لگادی تھی کہ "قرآن مجید نہیں چھاپا جا سکتا"۔

۱۷۵۷ء میں مصطفےٰ سوم نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لی، اس کا وزیر اعظم راغب پاشا بڑا بیدار مغز اور اولوالعزم تھا، خدمتِ خلق سے بڑی دلچسپی تھی، عوام کی فلاح و بہبود سے متعلق کاموں میں جوش و خروش سے حصہ لیتا تھا۔ اس نے سلطنت کے اندر متعدد شفاخانے تعمیر کرائے، کئی عمارتیں بنوائیں، چونکہ علم سے بھی گہرا تعلق تھا لہٰذا خزانۂ حکومت سے قطع نظر کر کے جیبِ خاص سے ایک کتب خانہ قائم کیا۔ اس کتب خانے کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ یہ عوام کے لیے تھا، ہر شخص یہاں آکر اپنا شوقِ علم پورا کر سکتا تھا۔

غیر مسلم رعایا کے ساتھ ترکوں کا حسنِ سلوک

رواداری اور وسعتِ قلب کے بےمثال کارنامے

غیر مسلموں کا اعتراف سلاطینِ عثمانیہ جہاں اور خوبیوں اور خصوصیتوں کے اعتبار سے یگانہ تھے، وہاں ان میں ایک صفت رواداری بھی تھی۔

۱۳۴۵ء میں اورخاں نے بازنطینی سلطنت کے ایک امیر الامرا کنٹا کوزین کی بغیر کسی طمع و حیلے کے مدد کی، اس نے اپنی حسین و جمیل لڑکی تھیوڈورا سے خود اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق اورخاں سے شادی کردی۔ اورخاں نے شادی کے بعد شہزادی سے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ اپنے آبائی مذہب پر خوشی سے قائم رہ سکتی ہے۔ کیونکہ ازروئے مذہب مسلمان اہلِ کتاب عورتوں سے شادی کرسکتے ہیں۔ چنانچہ اورخاں نے شہزادی تھیوڈورا سے کبھی یہ فرمائش نہیں کی کہ وہ اسلام قبول کرلے!

مرادِ اول کی ساری زندگی عیسائیوں سے لڑتے، عیسائی فرمانرواؤں سے جنگ کرتے گزری، لیکن اس نے عام عیسائیوں پر کبھی کسی قسم کی زیادتی روا نہیں رکھی، ان کے مذہبی معاملات میں کبھی کسی قسم کی مداخلت نہیں کی۔ انھیں اپنے مذہب پر قائم رہنے کے سلسلے میں ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ ۱۳۸۵ء میں یونانی کلیسا کے بطریقِ اعظم نے پوپ اربن ششم کو ایک خط میں لکھا تھا کہ مراد نے کلیسا کو کامل آزادی عطا کردی

تھی۔ اور شاید" یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ ۱۳۶۰ء اور ۱۳۸۹ء کے درمیان بطریق اعظم کے دور میں کوئی ایک شکایت بھی عثمانیوں کے ہاتھوں ارباب کلیسا کی بدسلوکی کی درج نہیں ملتی۔[1]

عثمانی ترکوں کو بازنطینی حکومت سے مسلسل آویزش رہی۔ قسطنطنیہ کے بادشاہوں نے ہمیشہ اس کی کوشش کی کہ ترک یورپ سے نکال دیے جائیں۔ انھوں نے اندرونی سازشوں اور علانیہ جنگوں کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔ لیکن ۱۴۵۳ء میں جب بے انتہا جانی و مالی قربانی کے بعد محمدؒ نے قسطنطنیہ کو فتح کیا تو اس نے عیسائیوں سے کوئی انتقام نہیں لیا۔ داخلہ کے وقت تھوڑا بہت کشت و خون ضرور ہوا لیکن داخلے کے بعد ترکوں کی تلوار نیام میں پہنچ گئی۔ حالانکہ عیسائی فاتح مسلمانوں کو کھیرے ککڑی کی طرح کاٹ ڈالنے کے عادی تھے۔" داخلہ کے انتہائی چند گھنٹوں کے بعد کوئی قتل عام نہیں ہوا۔ آتش زنی بھی زیادہ نہیں ہوئی۔ سلطان نے گرجاؤں اور دوسری عمارتوں کو محفوظ رکھنے میں پوری کوشش کی اور وہ اس میں کامیاب رہا۔"[2]

قسطنطنیہ میں فاتحانہ داخلے کے بعد سلطان محمدؒ نے امن عام کا اعلان کر دیا جو عیسائی خوف و دہشت کے باعث شہر سے فرار ہو گئے تھے ان کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت کا ذمہ لیا اور ترغیب دی کہ آئیں بسیں اور اپنے اپنے کام میں لگ جائیں۔ پھر اس نے یونانی کلیسا کے بطریق کو پھر سے اس کے منصب پر بحال کیا اور کلیسا کی سرپرستی قبول کرنے کا اعلان کیا اور ایک خاص فرمان کے ذریعے یونانی بطریق کی ذات محترم قرار دی گئی۔ نیز کلیسا کے تمام عہدہ دار تمام محاصل سے مستثنیٰ کر دیے گئے۔ اسی فرمان کی رو سے عیسائیوں کو مذہبی رسوم ادا کرنے کی مکمل آزادی دی گئی۔ نیز یہ اجازت بھی دی گئی کہ وہ اپنے قومی معاملات و مسائل اپنی قومی عدالتوں کے ذریعے طے کر لیا کریں۔ علاوہ ازیں عیسائیوں کے قانون نکاح اور قانون وراثت میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔

۱-۲: گبن ص۱۴۰ بحوالہ دولت عثمانیہ جلد اول۔

انگریز مورخ کا اعتراف

لارڈ ایورسلے نے بھی اعتراف کیا ہے کہ:[1]
"محمد کی یہ عظیم الشان رواداری اس عہد کی مسیحی یورپین حکومتوں کی سیاسی اخلاقیات سے بہت آگے تھی۔"

ڈیوک نوٹاراس جو افواجِ قسطنطنیہ کا سپہ سالارِ اعظم تھا جب گرفتار کر کے لایا گیا تو محمد نے اسے نہ صرف معاف کر دیا بلکہ یہاں تک نوازش کی کہ اس کی بیوی کی عیادت کے لیے گیا جو ملال اور غم (شکست) کے باعث بیمار پڑ گئی تھی۔ نہایت نرمی اور احترام سے جس طرح کوئی لڑکا ماں کو سمجھائے۔ اسے تسلی و تشفی دی، کئی اسیر جنگ افسروں کا زرِ فدیہ اس نے خود ادا کیا۔

۱۵۲۲ء میں سلیمانِ اعظم نے روڈس کو فتح کر لیا۔ یہاں کے عیسائی جنگجوؤں کو جو محارباتِ صلیبی کی یادگار تھے اور مسلمانوں کو ہمیشہ تنگ کیا کرتے تھے اجازت دے دی کہ وہ بارہ روز کے اندر اپنے تمام اسلحہ اور ہر قسم کا سامان لے کر جہاں چاہیں چلے جائیں۔ جاتے وقت وہ اپنے ہی جہاز استعمال کر سکتے ہیں۔

عیسائی مسلمانوں کی رعایا بن کر خوش ہوتے تھے

سلطان سلیمانِ اعظم (۱۵۲۰ء-۱۵۶۶ء) نے غیر مسلم رعایا کے ساتھ اتنی زیادہ رعایت برتی اور ایسے حسنِ سلوک کا مظاہرہ کیا کہ عیسائی فرمانرواؤں کی عیسائی رعایا بھاگ کر مسلمانوں کے دامن میں آ کر پناہ ڈھونڈھتی تھی۔ سلطنتِ عثمانیہ کی غیر مسلم رعایا اور مسیحی یورپ کے زرعی غلاموں کے فرقِ مراتب کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سرحدی عیسائی ممالک کے باشندے بھاگ بھاگ کر سلطنتِ عثمانیہ میں پناہ لیتے تھے۔ اور اپنے ہم مذہب عیسائی آقاؤں کے جور و تعدی پر ترکوں کی حکومت کو ترجیح دیتے تھے۔ لارڈ کریسی سلیمانِ اعظم کے ہمعصر مصنف کا قول نقل کرتا ہے۔

۱: لارڈ ایورسلے ص۱۸۸ بحوالہ دولتِ عثمانیہ۔

"میں نے گروہ در گروہ سنگری دہقانوں کو اپنے جھونپڑوں میں آگ لگا کر اور اپنے بیوی بچوں، مویشی اور سامانِ کاشت لے کر ترکی علاقوں میں بھاگ کر جاتے ہوئے دیکھا ہے جہاں وہ جا سکتے تھے عشر کے علاوہ ان پر اور کسی قسم کا محصول یا تکلیف دہ بار عائد نہیں کیا جاتا تھا"[1]

نومبر ۱۶۸۹ء میں سلطنتِ عثمانیہ کی وزارتِ عظمیٰ مصطفےٰ کوپریلی کے ہاتھ میں آئی۔ یہ بڑا دین دار، متدین صالح اور مدبر انسان تھا۔ اس نے زوال پذیر سلطنت کی تمام اندرونی خرابیوں کو تیزی کے ساتھ دور کیا، رعایا میں اعتماد اور اطمینان پیدا کیا۔ عیسائیوں کے ساتھ اس نے خاص طور پر حسنِ سلوک کا مظاہرہ کیا، اس نے ان حاکموں کو سخت سزائیں دیں جن کے بارے میں شبہ بھی ہو گیا کہ یہ عیسائیوں کے ساتھ کسی قسم کی بدسلوکی کرتے ہیں۔ جزیہ کے علاوہ ہر محصول سے انھیں آزاد کر دیا۔ اور جزیہ کی رقم بھی اتنی معمولی رکھی جو غریب سے غریب آدمی کو بھی گراں نہیں گزر سکتی تھی۔ ادھر کچھ عرصے سے عیسائیوں کو نئے گرجا اور کلیسا بنانے کی اجازت حاصل کرنے میں سخت دشواریاں لاحق ہوتی تھیں مصطفےٰ کوپریلی نے ایک فرمان کے ذریعے انھیں عام اجازت دے دی کہ وہ جتنے گرجے اور کلیسا چاہیں بنائیں۔

۱۶۹۷ء میں حسین کوپریلی کو سلطان مصطفےٰ ثانی (۱۶۹۵-۱۷۰۳ء) نے اپنا وزیر اعظم بنایا۔ یہ بھی اقلیتوں اور غیر مسلموں کے ساتھ بہت حسنِ سلوک سے پیش آتا تھا۔ اس نے بوسینا کے عیسائیوں کا ایک سال کا جزیہ معاف کر دیا۔ رومیلیا کی عیسائی رعایا کے ذمے جو محصول باقی چلا آرہا تھا اسے یک قلم معاف کر دیا جس سے عیسائیوں کے دل میں مسلمانوں کی عظمت پیدا ہو گئی

یونانیوں کے ساتھ خصوصی عنایت یونانی عیسائیوں کے ساتھ ترکوں کا برتاؤ سراسر رفق و محبت، رواداری اور عالی ظرفی کا تھا۔

۱: گریسی ج ۱- ص ۳۸ - ۳۲۶ بحوالہ دولتِ عثمانیہ

ترکی حکومت نے "ترجمان بابِ عالی" کے نام سے ایک بہت بااختیار اور معزز منصب قائم کیا اور اس پر (سنہ ۱۶۶۹ء) ایک یونانی عیسائی کو فائز کیا، یہ بڑا اہم سیاسی منصب تھا، رفتہ رفتہ یہ منصب وزارتِ خارجہ کا اہم ترین منصب بن گیا۔ اور ہمیشہ اس عہدۂ عالی پر یونانی ہی مقرر ہوتے رہے۔ پھر کچھ مدت بعد ایک اور منصب اسی طرح کا محکمہ بحریہ میں قائم کیا گیا۔ اور یہ بھی ایک یونانی ہی کو تفویض ہوا۔

ترک عیسائیوں کے جذبات کا بہت زیادہ پاس ولحاظ رکھتے تھے۔ رعایا کا لفظ ایک حد تک حقارت کا لفظ سمجھا جاتا تھا۔ لہٰذا انھوں نے اس لفظ ہی کو بدل دیا۔ اور ان عیسائیوں (یونانیوں) کو رعایا کے بجائے معاون کہنے اور لکھنے لگے۔

غیر مسلموں کی داخلی خود مختاری ترک اپنی رواداری اور عالی ظرفی میں حدِ اعتدال سے تجاوز کر گئے تھے۔ انھوں نے اپنی عیسائی رعایا کو اجازت دے دی تھی کہ وہ ترکی حکومت میں رہ کر جس یورپین حکومت کی چاہے رعایا بن جائے۔ اس رعایت سے عیسائیوں نے بہت ناجائز فائدہ اٹھایا۔ یہ دھڑلے سے قوانینِ ملکی کی خلاف ورزی کرتے تھے اور تعزیر و عقوبت سے محفوظ رہتے تھے، مگر محصول نہیں دیتے تھے، یہ تجارتی قوانین کی خلاف ورزی کرتے تھے لیکن پولیس انھیں گرفتار بھی نہیں کرسکتی تھی۔ کیونکہ جس یورپین حکومت کی ترکی میں رہ کر یہ رعایا تھے اس کا سفیر یا قونصل انھیں بچانے کے لیے آموجود ہوتا تھا۔ انگریز مؤرخ مِن لے حیرت کے ساتھ ان مراعات کا ذکر کرتا اور کہتا ہے "یہ ہر سزا سے محفوظ تھے"۔

مزید حقوق و مراعات سلطان عبدالمجید خاں (۱۸۳۹-۱۸۶۱ء) نے اپنے دورِ حکومت میں عیسائیوں کو مزید حقوق و مراعات عطا کیے۔ ایک فرمان کے ذریعے (سنہ ۱۸۵۶ء) انھوں نے اعلان کیا۔

"ان تمام حقوق کی جو نصاریٰ اور دوسرے فرقوں کو دیے گئے ہیں،

از سرِ نو توضیح کی جاتی ہے، نیز ان حقوق و مراعات پر بلا تاخیر نظرِ ثانی کر کے زمانہ اور سوسائٹی کی ضروریات کے مطابق انھیں ترقی دی جائے گی۔ اس غرض سے بطریق کے زیرِ صدارت ایک مجلس منعقد کی جائے گی جو مذکورہ بالا اصلاحات پر بحث کر کے اپنی رائے بابِ عالی میں پیش کرے گی۔ سلطان محمد فاتح نے جو حقوق بطریق کو دیے تھے ان میں اضافہ کیا جائے گا۔ اور آئندہ بطریق کا انتخاب تمام عمر کے لیے کرے گا!"

سلطان عبد المجید نے اپنے فرمان میں یہ اعلان کیا کہ:

"موجودہ کلیساؤں (اور عیسائی) مدرسوں، شفاخانوں اور قبرستانوں کی عام اجازت ہے، لیکن اگر کسی جدید کلیسا، مدرسہ، قبرستان یا ہسپتال کے تعمیر کرنے کی ضرورت ہو، اور بطریق یا اس فرقے کا مذہبی پیشوا اُسے منظور کر لے تو ہر جدید تعمیر کا نقشہ بابِ عالی میں پیش کیا جائے گا اور اگر کوئی (خاص) وجہ مانع نہ ہوگی تو سلطان نقشہ ملاحظہ فرما کر تعمیر کی منظوری خود صادر فرمائے گا۔"

ترکی حکومت اپنی رعایا کے ساتھ اس کی شورہ پشتی، بغاوت پسندی اور غداری کے باوجود اسے ہر قسم کی مذہبی، سیاسی اور سماجی سہولتیں دی تھیں ترکوں نے اپنی مختلف اللسان رعایا پر کبھی صرف ترکی زبان ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اسے اپنی زبان برتنے اور اسے ترقی دینے کی پوری پوری اجازت دی۔

ایک مردِ مومن ۱۸۶۰ء میں دروزی اور مارونی فرقوں میں خونریز فساد برپا ہو گیا۔ اوّل الذکر مسلمان تھے ثانی الذکر عیسائی، مارونی فرقے کے لوگوں نے قتل و غارت کی ابتدا کی، لیکن جب دروزی ترکی بہ ترکی جواب دینے لگے تو وہ چیخ اٹھے۔ مارونی فرقے کے لوگوں نے مسلمانوں کو خوب قتل کیا اور لوٹا، اسی طرح دروزیوں نے عیسائیوں کو بے تامل موت کے گھاٹ اتارا اور برباد کیا، چونکہ مارونی کمزور تھے اور دروزی تگڑے، اس لیے نتیجۃً زیادہ نقصان مارونی عیسائیوں کو جانی و مالی برداشت

کرنا پڑا۔

لبنان حکومت ترکیہ کا ایک زیرنگیں صوبہ تھا، یہاں کی ترک پولیس اور فوج بھی تھی وہ بھی ماردونی فرقے کے ظلم و تعدّی اور شرارت سے نالاں تھی۔ اس نے دروزیوں کو روکنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی بلکہ ایک حد تک چشم پوشی سے کام لیا۔

لیکن عیسائیوں کا یہ قتل اور ان کی یہ مظلومیت ایک سچا مسلمان امیر عبدالقادر جزائری نہ دیکھ سکا۔ یہ الجزائر کا مجاہد جسے فرانس نے جلا وطن کر دیا تھا اور جو شام کے ایک گوشے میں عزلت کی زندگی بسر کر رہا تھا عیسائیوں کو بچانے کے لیے میدان میں کود پڑا۔ ایک فرنچ مؤرخ کے الفاظ یہ ہیں:

"دمشق میں اگر عبدالقادر نہ ہوتا تو ایک عیسائی کی بھی صورت نہ دکھائی دیتی۔ یہ عرب بہادر جس نے سولہ سال تک فرانسیسیوں سے نہایت شدت کے ساتھ جنگ کی، دمشق میں تنہائی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ آگ کے شعلے پہلی ہی مرتبہ بھڑکے تھے اور درماندوں کی صدا پہلی ہی دفعہ بلند ہوئی تھی کہ اس نے بلا کسی پس و پیش کے عیسائیوں اور ان کے قاتلوں کے درمیان اپنے آپ کو ڈال دیا۔ ایک چھوٹے سے (رضاکار) دستے کے ساتھ اس نے عیسائیوں کو عوام الناس سے چھڑایا اور اپنا محل انھیں رہنے کو دے دیا۔ جو ہزاروں کی تعداد میں آ آ کر پناہ گزیں ہونے لگے۔ اس نے عیسائیوں کے سکونتی مقام پر پہرہ بندی کر دی، اس شخص نے جو مسلمان اور اولادِ پیغمبر اسلام تھا اور فرانس کا قدیم دشمن تھا، ایک سے زیادہ مرتبہ اپنی جان کو خطرے میں ڈالا اور ان خونخوار ٹولیوں کو پسپا کیا جو اسلام اور ترکی کے لیے باعثِ ننگ تھیں۔ عبدالقادر نے صرف یہی نہیں کیا بلکہ ان بدقسمتوں پر پوشاک کے لیے بے دریغ روپیہ صرف کیا جنھیں اس نے موت کے پنجے سے رہائی دلائی تھی۔ پھر اس نے خود اپنی نگرانی میں عیسائیوں کو محفوظ مقام پر پہنچایا۔ جہاں انھیں کسی قسم کا خطرہ نہ تھا، اس کا یہ ایثار، اس کی یہ شرافت اور اس کی یہ بہادری ایک لمحے کے لیے بھی کم نہ ہوئی۔ اس کی زندگی کا یہ صفحہ اتنا شاندار

ہے جس کے آگے ایک مہدی کا کارنامہ بھی مدھم پڑ جاتا ہے۔"[1]

عدلیہ میں مسلم عیسائی مساوات

۱۸۶۸ء میں سلطان عبدالعزیز نے ایک عدالتِ عالیہ قائم کی جس کے ججوں میں عیسائی اور مسلمان برابر تھے۔ اور یہ بات صرف ترکوں ہی سے مخصوص نہیں ہے مسلمان جب کہیں اور جہاں کہیں بھی برسر اقتدار آئے انھوں نے ہمیشہ محکوموں کے ساتھ لطف و کرم کا برتاؤ کیا، کبھی ان کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی روا نہیں رکھی۔

مسلمانوں نے ایک ہزار سال تک (کم و بیش) ہندوستان پر حکومت کی، لیکن اس طویل دور حکومت میں ہندوؤں کے ساتھ اس کے عشر عشیر بھی مظالم نہیں ہوئے جتنے صرف سترہ سال کی مدت میں یعنی آزادی ہند کے بعد سے اب تک مسلمانانِ ہند پر ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں، حالانکہ مسلمانوں کے دور حکومت میں نہ کوئی اقوام متحدہ تھی نہ منشور اقیانوس۔ تاریخ کا یہ اتنا بڑا عجوبہ ہے جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

ترکوں کا ذوقِ تعمیر

سلطنتِ عثمانیہ اتراک کا بانی عثمان خاں بڑا پکا اور دیندار مسلمان تھا۔ فیاضی، رحم، عدل، حسنِ سلوک اور مساواتِ عامہ اس کی سرشت تھی۔ تبلیغِ اسلام سے بھی اسے بڑی دلچسپی تھی، وہ خود بھی نومسلم تھا اور چاہتا تھا کہ جو نعمت اسلام کی صورت میں اسے ملی ہے، وہ جہاں تک ہو سکے عام ہو جائے۔

اپنے دورِ حکومت کے آغاز میں عثمان خاں نے "ایسکی شہر" میں ایک مسجد تعمیر کرائی تھی، کہنا چاہیے یہ پہلی مسجد تھی جو سلطنتِ عثمانیہ میں تعمیر ہوئی۔

اُور خاں اگرچہ جنگجو باپ کا سپاہی بیٹا تھا، فتوحات سے بھی دلچسپی تھی، اور جنگ کے میدان کی طرف شوق سے بڑھتا تھا۔ لیکن اسے سکون و عافیت کے دن بھی ملے یہ دن اس نے عیش و عشرت میں برباد نہیں کیے بلکہ رفاہِ عام کے کاموں پر صرف کیے۔ اس نے ملک میں امن و امان قائم کرنے کے بعد تعمیراتِ عامہ پر اپنی توجہ مبذول کی۔ شاندار مسجدیں تعمیر کیں، عالی شان مدرسوں کی بنا ڈالی، مسافروں کے لیے سرائیں بنوائیں، مریضوں اور بیماروں کے لیے دارالعلاج اور دارالشفا قائم کیے، بروصہ کی مسجد، ہسپتال اور مدرسہ اپنی نظیر آپ تھے۔

محمد اول (۱۴۱۳ء - ۱۴۲۱ء) نے بروصہ میں ایک شاندار مسجد تعمیر کی جس کا نام

مسجد خضرا رکھا۔ یہ مسجد اسلامی طرز تعمیر اور سنگ تراشی کا بہترین نمونہ تسلیم کی جاتی ہے۔

مُراد اول نے بھی ایک عظیم الشان مسجد کی تعمیر کا کام شروع کیا تھا، لیکن بایزید نے اس طرف توجہ نہ کی اور کام ادھورا رہ گیا، لیکن برسر حکومت ہونے کے بعد محمد نے اس طرف توجہ کی اور اس مسجد کو بھی مکمل کر دیا۔

سلطان سلیم اوّل (۱۵۱۲-۱۵۲۰ء) جب فاتحانہ یلغار کرتا ہوا دمشق میں داخل ہوا تو یہاں پہنچ کر اس نے پہلا کام یہ کیا کہ شیخ محی الدین ابن عربی کے مزار پر ایک شاندار مقبرہ تعمیر کرنے کا فرمان صادر کیا۔ وہاں کے مجاوروں اور فقیروں کے لیے ایک لنگر خانہ بھی قائم کیا اور اس سلسلے میں تمام ضروری اخراجات کے لیے کافی جائداد وقف کر دی۔

سلیمان اعظم نے اپنے دارالسلطنت قسطنطنیہ میں ایک بہت بڑی نہر تعمیر کرائی۔ جس سے عوام کو بہت فائدہ پہنچا اور وہ اس کے ممنون ہوئے، نیز مکہ معظمہ کی متعدد پرانی نہروں کو بھی اس نے پھر سے درست کرایا، مملکتِ عثمانیہ کے اکثر بڑے شہروں میں اس نے ہسپتال تعمیر کیے، پل بنوائے اور لوگوں کی رفاہ و فلاح کی طرف پوری توجہ کی۔

سلطان مصطفےٰ ثانی (۱۶۹۵-۱۷۰۳ء) کے عہد میں بہت سے بازار قائم ہوئے چھاؤنیاں تعمیر ہوئیں، مدرسوں کی بنیاد ڈالی گئی اور مسجدیں بنائی گئیں۔

سلطان محمود اوّل (۱۷۳۰-۱۷۵۴ء) کا دورِ حکومت بھی اگرچہ کچھ بہت زیادہ کامیاب نہیں رہا۔ لیکن رفاہِ عام کے کاموں سے اسے بھی بہت زیادہ دل چسپی تھی۔ ترکیہ کی مشہور اور دل آویز مسجد جامع نورِ عثمانی کا خیال اس کے ذہن میں آیا تھا اور اس نے بڑی عقیدت اور جوش کے ساتھ اس کی تعمیر کا کام شروع کیا تھا۔

سلطان محمود اوّل ہی نے کتابوں کی فراہمی اور کتب خانوں کے قیام کی طرف توجہ کی چنانچہ اُس نے پایۂ تخت قسطنطنیہ میں چار عظیم الشان کتب خانے قائم کیے جہاں تشنگانِ علم دُور دُور سے آتے اور اپنی پیاس بجھا کر واپس جاتے تھے۔

شہنشاہیت کے مفاسد

خونِ ناحق، ظلم و جور، سفّاکیاں اور خون آشامیاں!

ایک تلخ حقیقت تخت و تاج، مال و دولت اور جاہ و حشمت کے لیے جنگ و پیکار اور قتل و خونریزی ایک معمولی واقعہ ہے، تاریخ کے ہر دور میں اس طرح کی عبرت انگیز اور سبق آموز مثالیں ملتی ہیں۔

لیکن خاندانِ عثمانی میں اس طرح کا پہلا قتل جتنا سفاکانہ اور بے دردانہ تھا اتنا ہی حیرت انگیز اور عبرت خیز بھی!

جنگِ کسووا بڑی فیصلہ کُن جنگ تھی، اس میں مراد نے اپنا اور عیسائیوں کی متحدہ فوج نے اپنا سارا زور لگا دیا۔ اس لڑائی میں مراد کا چھوٹا لڑکا یعقوب بھی شریک تھا اس نے باپ کی آنکھوں کے سامنے اور بھائی (بایزید اوّل) کے پہلو بہ پہلو شجاعت اور دلیری کی نہایت شاندار اور روشن مثال قائم کر دی تھی۔ پیش قدمی کرتا ہوا وہ دشمن کی طرف بڑھ جاتا، اور بے جگری سے لڑنے لگتا۔ اس نے اپنی زندگی مسلمانوں کے ناموس اور سلطنتِ عثمانیہ کے حفظ و بقا کے لیے وقف کر دی تھی۔

مراد کے قتل کے بعد میدانِ جنگ سے جب بایزید فاتح و غانم واپس آیا تو اس نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے لائق اور ہونہار بھائی یعقوب کو بغیر کسی خطا اور قصور کے محض اس وہم میں قتل کرا دیا کہ کہیں یہ بھی صاووجی کی طرح آگے چل کر جرم بغاوت کا ارتکاب نہ کرے

تاج و تخت کی خاطر عثمانی خاندان میں یہ پہلا قتل تھا!

بایزید نے جب علاء الدین کو شکست دی تو اسے اور اس کے دونوں لڑکوں محمد اور علی کو تیمور تاش پاشا کی حراست میں دے دیا۔ وہ آقا کا اتنا بڑا وفادار تھا کہ اس نے تینوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بایزید نے تیمور تاش کو کوئی سزا نہ دی۔

مراد کے بعد اس کا بیٹا محمد فاتح ۱۴۵۱ء میں تختِ حکومت پر متمکن ہوا۔ اس موقع پر اس نے فوج کو انعامات سے نوازا اور اہلِ شہر پر لطف و کرم کی بارش کی۔ تختِ حکومت پر متمکن ہونے کے بعد مبارک سلامت کا دور شروع ہوا۔ مبارکباد کا نذرانہ پیش کرنے والوں میں مراد کی وہ بیوی بھی تھی جو سرویا کی شہزادی تھی اور عین اس وقت جب وہ تخت نشینی کی تہنیت پیش کر رہی تھی اس کا تنہا، شیر خوار اور معصوم بچہ محمد کے حکم سے ہلاک کیا جا رہا تھا تاکہ یہ فتنہ آگے چل کر قیامت نہ بن سکے۔

برادر کشی کے اصول کا محمد اس درجہ قائل تھا کہ مرنے سے کچھ پہلے اس نے جو قانون نامہ مرتب کیا (جس کی حیثیت ایک طرح سے وصیت نامہ کی بھی تھی) اس کی ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ "میرے جانشینوں میں سے جو تخت پر بیٹھیں وہ دنیا کے امن و امان کی غرض سے اپنے بھائیوں کو قتل کر سکتے ہیں۔

محمد فاتح کی وصیت پر سلیم اول (۱۵۱۲۔۱۵۲۰) نے بڑی سعادت مندی سے عمل کیا۔ اپنے دونوں بڑے بھائیوں احمد اور کرکوکی بے دردی کے ساتھ جان لی۔ سلیم نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے دو بھائی جو باپ کی زندگی ہی میں اور اس کی تخت نشینی سے پہلے وفات پا چکے تھے اپنے پیچھے پانچ بچے چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے ان معصوم اور بے گناہ بھتیجوں کو بھی اس نے بے تامل قتل کر دیا۔

سلیمان اعظم (۱۵۲۰۔۱۵۶۶) خاندانِ عثمانیہ کا گلِ سرسبد تھا سراپا خیر و برکت اور عدل و انصاف اس کی سرشت تھی۔ وہ نیکی اور مروت کا پتلا تھا، لیکن اپنی ایک روسی بیوی کے بہکانے سے اپنے لائق، ہونہار، بہادر اور دانشمند نوجوان بیٹے مصطفےٰ کو قتل کرا دیا، محض اس اندیشے سے کہ کہیں یہ بغاوت نہ کرے۔

سلطان مراد سوم ۱۵۷۴ء میں تخت نشین ہوا، تخت پر بیٹھنے کے بعد اس نے جس کارِ خیر سے اپنے دورِ حکومت کا آغاز کیا وہ یہ تھا:

"اس نے اپنے پانچ بھائیوں کو بے تامل قتل کرا دیا"

حقیقت یہ ہے کہ شخصی حکومت کے یہی مفاسد ہیں جو بالآخر اس کی تباہی اور بربادی پر منتج ہوتے ہیں۔ تاریخ کے اوراق اس حقیقت کے گواہ ہیں کہ شخصی حکومت کی خوبیاں بھی بالآخر برائیاں بن جاتی ہیں۔ آج جو شخص تختِ حکومت پر متمکن ہے ہو سکتا ہے کہ سراپا حسنات ہو لیکن کل جو اس کی جگہ بیٹھے گا وہ برا بھی ہو سکتا ہے اور چونکہ حکومت اسے وراثت میں ملی ہے اس لیے بدترین ہونے کے باوجود وہ بہترین لوگوں پر ترجیح رکھے گا!

خارجی و داخلی بدامنی اور شورش کی کہانی!

مراد اوّل کی فیروزمندیاں عروج پر تھیں، وہ ایشیائے کوچک میں سرگرم عمل تھا۔ یورپ میں ترکی سپاہ کا سپہدار اس نے اپنے بیٹے صادوجی کو مقرر کر رکھا تھا۔ صادوجی نے بغاوت کا اعلان کر دیا، لیکن یہ کوئی کمزور باپ نہیں تھا، مراد تھا، وہ فوراً پہنچا، صادوجی کے ساتھی اور حامی سپاہیوں کو معافی کا پروانہ عطا کیا، صادوجی کو قتل کرا دیا۔ باغی کی سزا، خواہ وہ شہزادہ ہو یا عامی!

ینی چری اور سپاہی یعنی فوجیں اب سلطنت عثمانیہ کی اصل حکمراں تھیں، گزشتہ کچھ عرصے سے ان فوجوں کا اثر و اقتدار بڑھتا گیا کہ عملاً زمام حکومت ان کے ہاتھ میں آگئی۔ سلاطین کی معزولی، وزرار کا قتل، حکّام کا تقرّر اور تنزّل سب کچھ ان کے ہاتھ میں تھا جب چاہتے تھے اضافۂ تنخواہ اور انعام کا مطالبہ کرتے تھے۔ اور ذرا سے تامّل پر شہر کو لوٹ لیتے تھے۔ ہر سلطان کی تخت نشینی کے موقع پر مُنہ مانگا انعام لیتے تھے۔ محل سرا کے معاملات میں مداخلت کرتے تھے اور کمزور سلاطین بے چون و چرا ان کے مطالبات تسلیم کر لیتے تھے، نہ تسلیم کرتے تو ان کی خیر نہیں تھی۔

۱۶۳۲ء میں بہ عہد مراد چہارم انھوں نے پھر یہی حرکتیں کیں، قصر سلطانی کے سامنے جمع ہو کر کئی وزرار کے قتل کا مطالبہ کیا۔ مراد نے اس وقت تو ان کی بات مان لی لیکن دل میں

فیصلہ کرلیا کہ ان کا زور توڑ کر رہے گا، چنانچہ چند روز بعد اس نے دیوان (مجلسِ مشورت) منعقد کیا اور صورتِ حال اس کے سامنے پیش کی، ایک قاضی نے کہا: "ان تمام باتوں کا علاج صرف تلوار کی دھار ہے!" یہ بات مراد کے جی میں بیٹھ گئی، اس نے خفیہ طور پر ینی چری اور سپاہ کے وفادار دستوں کو اپنے ساتھ ملا لیا، اور پھر ان کی سرکوبی شروع کردی، جس پر ذرا غداری اور بے وفائی کا شبہ ہوا۔ اس کی جان لے لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان کا رعب قائم ہوگیا، بغاوت دب گئی اور حالات معمول پر آگئے۔

۱۷۳۰ء میں جب محمود اوّل تخت نشین ہوا، پھر بغاوت ہوئی اور بڑے زور کی ہوئی، باغیوں کا سردار پطرونا خلیل تھا، اس نے دوران بغاوت میں بہت سے سرکاری عہدوں کو برطرف کرایا اور جس منصب پر اپنے جس منظورِ نظر کو چاہا مقرر کرا دیا۔

آخر محمود اوّل نے حکمتِ عملی سے خلیل اور اس کے ۲۱ ساتھیوں کو دیوان میں بلا کر اپنے سامنے قتل کرایا، پھر اس کے سات ہزار ساتھیوں کو بے تامل ہلاک کرا دیا، دو ماہ کی شورش کے بعد یہ بغاوت ایسی دبی کہ گویا کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

یونان اگرچہ سلطنتِ عثمانیہ کا ماتحت اور محکوم تھا، لیکن ترکوں نے جس رواداری کا یونانیوں کے ساتھ برتاؤ کیا تھا، اس کی مثال دُنیا کی تاریخ میں ملنا مشکل ہے یونانیوں کو مذہبی آزادی اس درجہ حاصل تھی کہ آئرلینڈ کے کیتھولک ان پر رشک کیا کرتے تھے یورپین مورخوں نے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ یورپ کی کسی قوم پر محصل کا بار اتنا، نہیں تھا کہ جتنا ترکیہ کے محکوم یونانیوں پر۔ من لے (Finley) نے لکھا ہے کہ یونانیوں کو بلدیاتی نظام میں غیر محدود اختیارات حاصل تھے، نیز آزادی تقریر اتنی حاصل تھی کہ نپولین کے عہد میں فرانسیسی بھی اتنی آزادی تقریر حاصل نہ کرسکے، اپنے قصبوں کے انتظامی معاملات میں انھیں اتنا ہی اختیار تھا جتنا فرانس کے باشندوں کو۔ ان مراعات اور سہولتوں کے باوجود یونانیوں نے بغاوت کا سلسلہ شروع کر دیا، خفیہ انجمنیں بنائیں اور زمین دوز تحریک شروع کر دی، روس، برطانیہ اور فرانس وغیرہ

کی درپردہ اور علانیہ امداد حاصل کی اور قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا!

۱۸۲۱ء میں لڈیویا کے یونانیوں نے علمِ بغاوت بلند کیا، بغاوت کا آغاز ترک شہریوں اور سپاہیوں کے قتلِ عام سے ہوا۔ یہ بغاوت پوری اندرونی تیاریوں کے ساتھ لیکن اچانک رونما ہوئی کہ جب قسطنطنیہ میں یہ خبر پہنچی تو اربابِ حکومت کو اندازہ بھی نہیں ہو سکا کہ اصل معاملہ کیا ہے؟ جون ۱۸۲۱ء میں ترکوں نے اس بغاوت کو کچل دیا۔

لڈیویا کی بغاوت ابھی پورے طور پر سَر نہیں ہوئی تھی کہ عوریا جزائر انان میں بغاوت کے سر بہ فلک شعلے بھڑک اٹھے، یہاں کے عیسائی بقول مورخ میریٹ یہ عزم کر کے اٹھے تھے کہ "ترک اب زندہ نہیں رہ سکیں گے نہ عوریا میں نہ دُنیا کے کسی گوشے میں ــ!

اپریل ۱۸۲۱ء میں یہاں مسلمانوں کا قتلِ عام شروع ہوا۔ اور ۲۵ ہزار ترک موت کے گھاٹ اتار دیے گئے، یہ بغاوت اتنی تیزی کے ساتھ بڑھی کہ قبل اس کے کہ بابِ عالی کوئی اقدام کر سکے۔ ایک ماہ کے اندر اندر عوریا کے عثمانی تسلّط و اقتدار کا یکسر خاتمہ ہو گیا جن ترکوں کو امان دی گئی تھی انھیں بھی پوری بے دردی کے ساتھ نوکِ خنجر کے سپرد کر دیا گیا۔

یونانیوں کی سفاکیوں اور درندگی کی خبروں سے مشتعل ہو کر قسطنطنیہ کے مسلمانوں نے وہاں کے عیسائیوں پر دستِ تعدّی دراز کیا۔ شیخ الاسلام نے اس کی سخت و شدید مخالفت کی۔ اور کہا ناکردہ گناہوں سے گنہگار کا بدلا نہیں لیا جا سکتا۔ مسلمانوں نے اس فتوے پر شیخ الاسلام کے خلاف مظاہرہ کیا، وہ مستعفی ہو گئے اور اپنے اہل و عیال کو لے کر ایک جہاز میں بیٹھے اور حج کو چلے گئے۔ جزائر ایجین کے قریب یونانیوں نے ان کے جہاز کو گرفتار کر لیا اور شیخ الاسلام کی آنکھوں کے سامنے پہلے ان کی لڑکیوں کو ذبح کیا، پھر خاندان والوں کی گردن کاٹی، پھر رونگٹے کھڑے کر دینے والی اذیتیں دے دے کر خود انھیں ہلاک کر دیا۔

مؤرخ فن ہے لے اسی واقعے کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ: "معذور و مجبور بوڑھے

مرد، اونچے طبقے کی عورتیں، خوبصورت لونڈیاں اور غلام کمسن بچے جہاز کے عرشے پر گائے بیل کی طرح ذبح کر دیے گئے۔

یونانیوں کی زندگی ایک نامی پادری شکست خوردہ ترکوں کے ساتھ یونانیوں کے سلوک کا اپنا آنکھوں دیکھا حال اس طرح بیان کرتا ہے:

"عورتیں بندوق کی گولیوں اور تلواروں کے زخم سے مجروح ہو کر سمندر کی طرف بھاگتی تھیں لیکن انھیں عمداً گولیوں کا نشانہ بنایا جاتا تھا، مائیں شیر خوار بچّوں کو سینے سے لگائے اپنی برہنگی کو چھپانے کی غرض سے، کیونکہ ان کے کپڑے چھین لیے گئے تھے سمندر میں کود پڑتی تھیں لیکن جب وہ پانی میں چھپنے کی کوشش کرتی تھیں یہ سنگ دل رائفل بردار انھیں گولیوں پر دھر لیتے تھے۔ شیر خوار بچّوں کو ماؤں سے چھین کر چٹانوں سے ٹکراتے اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے۔ تین چار سال کے بچّے زندہ سمندر میں پھینک دیے جاتے۔"

چونکہ مغربی حکومتیں رومانیوں کی پشت پناہ تھیں اس لیے بغاوت کا پھل عارضی طور پر تلخ کے بجائے بہت شیریں ملا، ۱۸۲۴ء تک یہ بغاوت جاری رہی اور اس عرصے میں نہ صرف موریا بلکہ بحلی کی سرحد تک کے تمام علاقے جن میں ایتھنز بھی شامل تھا، خودمختاری کی زندگی بسر کرنے لگے لیکن ۱۸۲۴ء میں محمّد علی پاشا والئ مصر کے لڑکے ابراہیم پاشا نے باغیوں کی سرکوبی کا ذمّہ لیا۔ ۱۸۲۵ء میں اس نے سارا موریا فتح کر لیا۔ کورنتھ اور ایتھنز پر بھی اس کا قبضہ ہو گیا، ہر مرحلے پر خواہ وہ بحری ہو یا برّی ابراہیم پاشا نے یونانیوں کو شکست دی۔

محمود ثانی (۱۸۰۸ - ۱۸۳۹ء) جب تختِ حکومت پر بیٹھا تو اسے تخت پر بیٹھتے ہی ینی چری بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ ینی چری باغیوں نے محمود سے اپنے سارے مطالبات منظور کرا لیے، اُسے مجبور کیا کہ ایک فرمان کے ذریعے تمام اصلاحات منسوخ کر دے، کئی سال تک حکومت کا سارا کاروبار حکومت انہی ینی چری باغیوں کے ہاتھ

میں رہا۔ محمود بہ حالتِ مجبوری سب کچھ کر رہا تھا، لیکن دل میں تہیہ کر چکا تھا کہ موقع ملتے ہی ان کا قلع قمع کر کے رکھ دے گا، چنانچہ یونان کی بغاوت کے استیصال کے بعد (۱۸۲۶ء) اس نے سب سے پہلے اس طرف توجہ کی، عوام ینی چری سے متنفر ہو چکے تھے علماء ان کی دراز دستیوں سے عاجز تھے، حکام و عمّال ان کے نام سے کانپتے تھے، اُمرائے دولت اُن سے بیزار ہو چکے تھے، ان کے ظلم، بربریت اور خون آشامی نے سب کو ان کے خلاف کر دیا تھا لیکن یہ سب سے بڑی طاقت تھے۔ اس لیے کوئی ان کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا تھا، حتیٰ کہ خلیفہ تک بے بس تھا!

محمود نے اندر اندر تیاریاں کیں۔ ۱۴ ہزار وفادار توپچیوں کو تیار رکھا، مفتی اعظم سے فتویٰ لے لیا، پھر ایک فرمان جاری کیا کہ ینی چری جدید اصولِ جنگ سیکھیں وہ تو بغاوت کا موقع ڈھونڈھتے ہی تھے فوراً مسلح ہو کر میدان میں آ گئے۔ محمود کے توپچیوں نے ایسی گولہ باری کی کہ انھیں بھون کر رکھ دیا، ینی چری اگرچہ بہادری کے ساتھ لڑے لیکن بُری طرح مارے گئے، کوئی بھی نہ بچ سکا۔ ینی چری کے استیصال کے بعد ایک بہت بڑے فتنے سے ترکی حکومت کو نجات مل گئی۔

محمّد علی پاشا ایک البانوی ترک تھا معمولی حیثیت سے ترقی کرتے کرتے اعلےٰ مناصب تک پہنچا۔ سلطان محمود ثانی (۱۸۰۸-۱۸۳۹ء) نے اسے مصر کا والی بنا دیا، اس نے شروع میں وفادارانہ طور پر اپنے فرائض انجام دیے، لیکن ۱۸۲۶ء میں جب اس کے بیٹے ابراہیم پاشا نے یونانی باغیوں کی سرکوبی کی اور پھر انگریزی بیڑے سے شکست کھا کر واپس مصر پہنچا تو محمّد علی نے مطالبہ کیا کہ شام اور دمشق بھی اس کو ولایت میں دے دیے جائیں نیز کریٹ بھی، محمود نے کریٹ کا جزیرہ تو دے دیا لیکن شام اور دمشق دینے سے انکار کر دیا، محمّد علی باغی ہو گیا۔ اس نے سلطنتِ عثمانیہ کی کمزوری اور ترک افسروں کی غدّاری اور رشوت خوری سے فائدہ اٹھایا اور طاقت کے زور پر ان مقامات کو فتح کر لیا۔ یہ خاندان مصر پر فاروق کی معزولی تک برسرِ حکومت رہا۔

عروج زوال سے ہمکنار ہوتا ہے

خانہ جنگیوں، باہمی آویزشوں اور مفاد پرستیوں کے نتائج

ایک المیہ کوئی حکومت خواہ کتنے ہی دبدبہ اور طنطنے کے ساتھ پردۂ وجود پر نمودار ہو۔ یہ ممکن نہیں کہ وہ ادبار و زوال سے روشناس نہ ہو۔ عثمانیوں نے اگرچہ کئی پشتوں تک بڑے جاہ و جلال کے ساتھ حکومت کی، لیکن ادبار و انحطاط اور زوال سے وہ بھی ناآشنا نہ رہے، یہ دوسری بات ہے کہ یہ زوال و ادبار زیادہ دیرپا نہ ثابت ہوا۔

بایزید اوّل یورپ میں فتح و نصرت کے جھنڈے گاڑ رہا تھا اور ایشیا میں تیمور لنگ کا ٹڈی دل فتح و کامرانی کے مزے لوٹ رہا تھا، تیمور کے دل میں بایزید کی عزت تھی کہ وہ یورپ میں اسلام اور مسلمانوں کا نام اونچا کر رہا تھا۔ اسی لیے وہ قوت و حشمت کے باوجود اُس سے اُلجھنا پسند نہیں کرتا تھا۔

لیکن جو بات ہونے والی ہو وہ ہو کر رہتی ہے، بایزید تیمور کو خاطر میں نہ لاتا تھا، وہ اس سے اُلجھنے کے مواقع پیدا کرتا تھا، تیمور نے ۳۵ سال کی عمر میں ۲۹ حکومتوں کو اور کئی شاہی خانوادوں کو باج گزار کر لیا تھا، وہ فنونِ جنگ اور فنونِ سیاست کا ماہر تھا، بایزید کی اس کے سامنے کوئی حیثیت نہ تھی۔

سنہ ۱۴۰۰ء میں بایزید اور تیمور کی آویزش شروع ہوئی۔ اس نے آرمینیا کی طرف

سے عثمانی سرحد میں داخل ہو کر سیوریس پر قبضہ کر لیا۔ پھر وہ انگورہ پہنچا، یہاں معرکہ آرا اور فیصلہ کن جنگ ہوئی کیونکہ سیوریس میں بایزید کے سپاہیوں نے جنگ لڑی تھی یہاں خود بایزید موجود تھا، یہ جنگ ۱۴۰۲ء میں برپا ہوئی، بایزید بڑی ہمت اور بہادری سے لڑا، لیکن ہار گیا۔ اس کے ہزارہا آدمی قتل ہوئے خود گرفتار کر کے تیمور کے سامنے لایا گیا۔ تیمور عزت و احترام کے ساتھ پیش آیا۔ دورانِ گفتگو میں ملامت کی کہ اس نے خواہ مخواہ جنگ چھیڑی، بایزید نے شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا، لیکن تیمور نے اُسے رہا نہیں کیا۔ اور اسی غم میں وہ صرف آٹھ ماہ کے بعد اس دُنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔ بایزید کی وفات کے بعد تیمور نے اس کے تمام ایشیائی مقبوضات سابق مالکوں اور فرمانرواؤں کو واپس کر دیے۔ اور اس طرح بہ ظاہر دولتِ عثمانیہ کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔

مراد ثالث (۱۵۷۴۔ ۱۵۹۵ء) کا عہد ترکی حکومت کے عہدِ زوال کا آغاز ہے۔

۱۵۹۴ء میں مولڈاویا ولاچیا اور ٹرانسلوینیا نے سرکشی، بدعہدی اور بغاوت کا مظاہرہ کیا ان سب نے آسٹریا کی حکومت سے ساز باز کی اور ترکیہ سے یکسر تعلق منقطع کر کے اپنی اپنی مملکتوں کے تمام مسلمان باشندوں کو بے دریغ تہ تیغ کیا۔

سلطان محمد سوم (۱۵۹۵۔ ۱۶۰۳ء) کا عہد ایک زوال آشنا فرمان کا دور تھا، ۱۶۰۱ء میں شاہِ عباس صفوی فرمانروائے ایران نے سلطنتِ عثمانیہ کے ایرانی مقبوضات پر حملہ کیا۔ اور گزشتہ زمانے میں ایران کے جو صوبے اور رقبے ایران کے ہاتھ سے نکل کر ترکی قبضے میں چلے گئے تھے ان پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔

۱۶۰۶ء میں بہ عہد سلطان احمد اوّل (۱۶۰۳۔ ۱۶۱۷ء) صلحنامہ سیتوا توروک پر دستخط ہوئے جس کی رُو سے ٹرانسلوینیا سلطنتِ عثمانیہ کی گرفت سے عملاً آزاد ہو گیا، نیز سلطنتِ آسٹریا جو خراج دیا کرتی تھی اس کا سلسلہ بھی ختم کر دیا گیا۔ خلیفۃ المسلمین نے ویانا کے بادشاہ کو شہنشاہ تسلیم کر لیا۔ اب تک بابِ عالی سے جو سفراء ویانا بھیجے جاتے تھے وہ معمولی درجے کے ہوتے تھے، اب یہ طے پایا کہ وہ سنجق بے کے درجے سے کم نہ ہوں، یہ پہلا موقع تھا کہ سلطنتِ عثمانیہ نے اپنے موقف سے ہٹ کر اور اپنی حیثیت سے گر کر ایک عہد نامے پر دستخط کیے، یہ کمزوری

اور زوال کی ایسی نشانی تھی جو چھپائے نہیں چھپ سکتی تھی۔

اب تک ترکوں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، یورپ اُن کے نام سے لرزتا اور کانپتا تھا، جب کبھی مقابلے کی نوبت آتی اسے زبردست اور ذلت بخش شکست سے دوچار ہونا پڑتا۔ ۱۶۶۴ء میں بہ عہد محمد چہارم عثمانی فوجوں کو کثرتِ تعداد کے باوجود آسٹریا کے مقابلے میں زبردست اور ذلت بخش شکست اٹھانی پڑی، پھر ۱۶۸۳ء میں دوبارہ محمد سوم کے داماد قرہ مصطفےٰ نے آسٹریا سے جنگ کی، اس جنگ میں بھی ترکوں کو ذلت بخش شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ ترکوں کی اس شکست نے یورپ کو اُن کی طرف سے مطمئن کر دیا۔ اس کے دل میں جو دہشت ان کی بیٹھی ہوئی تھی وہ دُور ہو گئی۔

ترکوں کی شکست کا راز یہ تھا کہ زمانہ آگے بڑھ رہا تھا، ایجاد و اختراع کی منزل میں داخل ہو چکا تھا اور وہ قدامت کی دُنیا میں آرام سے بیٹھے ہوئے تھے۔ بہت سے نئے ہتھیار عالمِ وجود میں آ گئے تھے، بہت سے نئے طریقے برتے جانے لگے تھے۔ اندازِ جنگ اور طریقِ حرب میں بہت سی ترمیمیں اور تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں، لیکن ترک ان سب سے غافل تھے، وہ قدیم طرزِ جنگ کے ماہر تھے اور اسی کو مشکل کشا سمجھ رہے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ میدان میں حریف کے نئے ساز و سامانِ جنگ طریقِ حرب اور اندازِ مقابلہ کا سامنا کرنا پڑا تو وہ بہادری اور شجاعت میں یکتا ہونے کے باوجود ہار گئے۔

ویانا کی شکست نے ترکوں کا بھرم ختم کر دیا۔

۱۸۸۶ء میں بلغراد کے علاوہ ہنگری کے تمام قلعے ترکوں کے ہاتھ سے نکل گئے، صوبہ کروشیا پر تقریباً ڈیڑھ صدی سے ترک قابض تھے، وہ بھی جاتا رہا، اسی سال ہنگری کا پایۂ تخت بودا پسٹ بھی ترکوں سے چھین لیا گیا۔ ٹرانسلوینیا اگرچہ تقریباً آزاد تھا لیکن ترکی سیادت کا معترف تھا اب یہ بات بھی جاتی رہی۔ اس نے آسٹریا کی اطاعت کا حلقہ گردن میں ڈال لیا اور ترکی سلطنت سوا کفِ افسوس ملنے کے کچھ نہ کر سکی۔

مقبوضات کی حریت طلبی اسی سال سلطان محمد چہارم (۱۶۴۸-۱۶۸۷ء) کے عہد میں ٹیونس اور الجزائر نے بھی اپنی آزادی اور خود مختاری کا

اعلان کر دیا اور سلطنت کی سیادت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اس آزادی کو کئی سو برس تک قائم رکھا پھر ۱۸۳۰ء میں الجزائر کو اور ۱۸۸۱ء میں ٹیونس کو فرانس نے فتح کر لیا۔

۱۶۸۸ء میں بہ عہد سلطان سلیمان ثانی عیسائیوں نے متحدہ مورچہ بنا کر بلغراد پر حملہ کیا۔ یہ ہنگری کا دروازہ تھا اور ترکوں کے استقلال و استحکام کے لیے اس کی بہت ضرورت تھی، اس لیے ترک اس کے حفظ و دفاع پر خاص توجہ کرتے تھے لیکن ترک کمانڈر کی غداری کے باعث حفظ و دفاع کا کام جاری نہ رکھا جا سکا اور دشمن فوجیں بڑی آسانی کے ساتھ بلغراد پر قابض ہو گئیں۔

۱۶۹۷ء میں مصطفےٰ ثانی (۱۶۹۵-۱۷۰۳ء) خود فوج کی کمان کرتا ہوا بلغراد سے ہنگری میں داخل ہوا۔ مقابلہ ایک مقام کرنتا پر ہوا۔ جو جذبہ مصطفےٰ کے دل میں کام کر رہا تھا وہی اگر سپاہیوں اور سرداروں میں بھی ہوتا تو شاید ترکوں کے دورِ عروج کا پھر یہاں سے آغاز ہوتا۔ لیکن عین اس وقت جب دشمن سر پر کھڑا تھا اور ایک ہولناک اور فیصلہ کن جنگ جاری تھی ترکی دستے آپس میں لڑ رہے تھے، ینی چری دستے اعلانِ بغاوت کر رہے تھے اور خود اپنے افسروں کو اپنے ہاتھ سے قتل کر رہے تھے۔ یہ رنگ دیکھ کر دشمن ٹوٹ پڑا، اس نے ترکوں کو کاٹ کر رکھ دیا۔ مصطفےٰ بدقت بچ کر قسطنطنیہ واپس پہنچا۔ اس جنگ میں ۲۶ ہزار ترک میدانِ جنگ میں ہلاک ہوئے اور دس ہزار دریا کو عبور کرتے ہوئے ڈوب گئے۔ صدرِ اعظم، چار وزیر اور بہت سے فوجی افسر میدانِ جنگ میں لڑتے ہوئے اور جانبازی کے جوہر دکھاتے ہوئے کام آئے۔

روس سے جنگ

مئی ۱۷۳۶ء میں روس نے معاہدوں اور صلحناموں کو بالائے طاق رکھ کر ترکی علاقوں پر اس کی اندرونی کش مکش اور چپقلش سے فائدہ اٹھا کر بغیر کسی اعلانِ جنگ کے حملہ شروع کر دیا۔ آخر مجبور ہو کر حکومت عثمانیہ کو بھی اعلانِ جنگ کرنا پڑا۔

روس چونکہ ایک عرصے سے در پردہ جنگ کی تیاریاں کرتا رہا تھا اور پوری تیاریوں کے ساتھ میدانِ جنگ میں کودا تھا لہٰذا وہ سیلِ رواں کی طرح بڑھنے لگا ترکوں نے ہر جگہ

مدافعت کی، لیکن وہ اس ریلے کو نہ سہہ سکے۔

روس نے کریمیا پر حملہ کر کے اسے بالکل تاراج کر دیا، مسجدیں ڈھا دیں، کتب خانے جلا دیے، عمارتیں نذر آتش کر دیں، بوڑھوں، بچوں، بیماروں اور عورتوں تک پر رحم نہ کیا، جو ملا اُسے موت کے گھاٹ اتار دیا، تمام قدیم یادگاریں ہتس نہس کر دیں انگریزی مؤرخ لارڈ کریسی کا بیان ہے کہ:

"روسی فخر کرتے ہیں کہ اس حملے میں انھوں نے چھ ہزار مکانات، ۲۸ مسجدیں دو گرجے اور ۵۰ چکیاں جلا ڈالیں۔"

سلطان عبد الحمید اوّل (۱۷۷۳-۱۷۷۹ء) جب تخت نشینِ مملکت ہوا تو روس سے جنگ جاری تھی۔ اپریل ۱۷۷۴ء میں ترکوں کو شکست ہوئی اور کینارجی کے مقام پر ایک نیا عہد نامہ ترتیب پایا جس کی رُو سے کریمیا آزاد ہو گیا پھر جس پر کچھ عرصے بعد روس نے مکمل قبضہ کر لیا اور کئی دوسرے ترکی مقبوضات روس کے قبضے میں آ گئے۔ اب تک بابِ عالی نے زار روس کو بادشاہ تسلیم نہیں کیا تھا۔ اب معاہدہ کے بعد اسے بادشاہ ماننا پڑا۔ اس معاہدہ کی رُو سے یہ بھی معاہدہ طے پایا کہ روس، ترکی عیسائیوں کی ترکی حکومت سے نمائندگی کرنے کا حق رکھتا ہے۔

روسیوں کے لرزہ خیز مظالم

۱۷۹۰ء میں بہ عہد سلطان سلیم ثانی روسیوں نے پھر ترکی علاقوں پر تاخت و تاراج کا سلسلہ شروع کر دیا، ملکہ کیتھرائن قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے کا ایسا عزم کر چکی تھی کہ اس نے اپنے ایک پوتے کا نام قسطنطین رکھا، اسے یونانی زبان کی تعلیم دی اور اسے پہلے بازنطینی فرماں روا کی حیثیت سے آگے بڑھانے کا منصوبہ تیار کیا۔ اسمٰعیل کے مقام پر ترکوں اور روسیوں کی جنگ ہوئی، یہ بڑا اہم قلعہ تھا۔ اور بغیر اسے سر کیے بلغاریہ کے حدود میں داخلہ ناممکن تھا، روسیوں نے مہینوں اس کا محاصرہ جاری رکھا، ترکی دستہ اپنی کم مائگی اور قلت تعداد کے باوجود بہادری کے ساتھ مدافعت کرتا رہا۔ آخر روسیوں کا سیل بے پناہ قلعہ میں داخل ہو گیا۔ ترکوں نے ایک ایک گلی اور ایک ایک سڑک پر مقابلہ کیا۔

اس جنگ میں ۳۴ ہزار ترک قتل کیے گئے۔ ان میں سے ایک ایک آدمی آخر وقت تک لڑتا رہا۔

روس کی بڑھتی ہوئی طاقت سے اب انگلستان اور فرانس بھی خائف رہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے بیچ میں پڑکر صلح کی کوشش کی۔ چنانچہ جنوری ۱۷۹۲ء کو یاسی کے مقام پر صلح نامہ ترتیب پایا۔ جس کی رُو سے ترکیہ کے کچھ مقبوضات جن میں یونان بھی شامل تھا، اسے واپس کر دیے گئے۔

سلطان سلیم (۱۷۷۹-۱۸۰۷ء) کا دور متعدد حیثیتوں سے اہم ہے۔ خاص طور پر اس اعتبار سے کہ دوستی، صلح اور عہد کے باوجود نپولین کے برسرِ اقتدار ہونے کے بعد فرانس نے بڑی بے تکلفی سے ترکی مقبوضات پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ اس نے مصر، اسکندریہ اور دوسرے مقامات پر مکمل قبضہ کر لیا۔ آخر بابِ عالی نے ستمبر ۱۷۹۸ء میں فرانس کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ اب جنگ نے اور شدت اختیار کر لی، اس نے شام پر یورش کی اور اس پر قبضہ کر لیا۔ ترکی سپاہ کو امان دینے کے باوجود قتل کر دیا۔ نپولین نے عکہ پر بھی زوردار حملہ کیا۔ لیکن ترکوں کی مقاومت کے آگے بے بس ہو گیا، اور ناکام و نامراد واپس ہوا۔ سنہ ۱۸۰۱ء میں عثمانی سلطنت پھر مصر پر نپولین کی غیر حاضری میں قابض ہو گئی۔ سنہ ۱۸۰۲ء میں فرانس سے صلح ہو گئی اور نپولین نے بھی مصر پر سلطنتِ عثمانیہ کی سیادت اور بالادستی قبول کر لی۔

دسمبر ۱۸۰۶ء میں روس سے پھر جنگ چھڑ گئی، وہ حسبِ عادت بغیر اعلانِ جنگ کے حملہ آور ہوا۔ بابِ عالی نے بھی اعلانِ جنگ کر دیا۔ اس مرتبہ نئی بات یہ تھی کہ برطانیہ نے روس کا (فرانس کی دشمنی کے باعث) ساتھ دیا اور سلطنتِ عثمانیہ کو الٹی میٹم دیا کہ وہ فوراً روس سے صلح کر لے، ترکوں نے یہ مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ فروری ۱۸۰۷ء میں انگریزی بیڑہ دردانیال میں داخل ہو گیا۔ لیکن آخرکار اُسے واپس جانا پڑا۔ کیونکہ ترکوں کی گولہ باری کی تاب نہ لا سکا۔

یونانیوں نے ۱۸۲۰ء میں بغاوت کی، ۱۸۲۶ء میں ابراہیم پاشا نے یونانی

بغاوت کا سر کچل دیا۔ اور تمام مفتوحہ مقامات واپس لے لیے۔ اس واقعے نے یورپ میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ اور ساری یورپین حکومتیں یونان کی مدد کو اٹھ کھڑی ہوئیں۔ انگریز امیر البحر کوڈرنگٹن اپنے بحری بیڑے کو لے کر آگے بڑھا اور اس نے اکتوبر ۱۸۲۷ء میں خلیج نوارینو میں مصری بیڑے پر تباہ کن حملہ کر دیا۔ ترک انگریزوں کے اچانک اور نہایت منظم اور طاقتور حملہ کا مقابلہ نہ کر سکے، سارا ترکی بیڑہ تباہ ہو گیا۔ ہزاروں مسلمان ہلاک ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یونانی باغیوں کی سرکوبی اور یونانی بغاوت کے استیصال کے باوجود ترک نقصان میں رہے اور یونان ایک خود مختار مملکت بن گیا۔

محمد علی پاشا اپنی ضد پر اڑا ہوا تھا۔ اس نے شام و دمشق پر قبضہ بھی کر لیا تھا، آخر ترکی حکومت نے فرانس اور برطانیہ کی رفاقت میں اس سے جنگ کی، شام اور دمشق کا علاقہ چھین لیا۔ اور مصر پر اس کی پاشائی نسلاً بعد نسل منظور کر لی۔ (۲ستمبر ۱۸۴۱ء)

سلطان عبد العزیز (۱۸۶۱-۱۸۷۶ء) کا عہد بڑا منحوس ثابت ہوا۔ یہ نہایت بدمعاملہ اور غیر منتظم ثابت ہوا۔ اس نے سلطنت عثمانیہ کی مالی ساکھ ختم کر دی۔ غیر ملکوں کے ساہوکاروں سے قرضے لیے۔ اُن کا سود بھی ادا کرتے وقت بغلیں جھانکنے لگتا تھا۔ کیونکہ خزانہ خالی تھا۔

رومانیا اور سربیا کا قیام ۱۸۶۷ء میں ولاچیا اور مولڈویا نے متحد ہو کر نئی ریاست رومانیا قائم کر لی۔ ۱۸۶۸ء میں ایک جرمن شہزادہ چارلس یہاں کا فرمانروا منتخب کر لیا گیا۔ دولِ مغرب نے اس اقدام کی تائید کی مگر عبد العزیز کی حکومت اتنی کمزور تھی کہ کچھ نہ کر سکی۔

سرویا نے جو نام نہاد سیادت ترکیہ کی قبول کر رکھی تھی ۱۸۶۷ء میں وہ اس کا بھی منکر ہو گیا۔ عبد العزیز کی حکومت اس کے تمرد کو نہ بدل سکی۔ چنانچہ ترکی فوجیں بلغراد سے واپس بلالی گئیں۔ اور اس کے فرماں روا نے باقاعدہ بادشاہ کا لقب اختیار کر لیا۔

اپریل ۱۸۷۷ء میں روس نے پھر اعلان جنگ کر دیا۔ دولِ مغرب کی مداخلت سے یہ جنگ ختم ہوئی۔ برلن میں بسمارک کی زیر صدارت صلح کانفرنس منعقد ہوئی جس کی رو سے

جزیرۂ قبرص برطانیہ کے حوالے کر دیا گیا۔ صرف معمولی سا خراج طے پایا۔ نیز بلغاریہ، رومانیہ مانٹی نیگرو وغیرہ کی آزادی تسلیم شدہ حقیقت بن گئی۔ اس عہد نامہ نے یورپ میں واقعی سلطنت ترکیہ کا قریب قریب خاتمہ کر دیا۔ یونان بھی خود مختار ہو گیا۔

مصر انگریزوں کے قبضے میں ۱۸۸۲ء میں انگریزوں نے اپنی شرارتوں، سازشوں حکمت عملیوں، فریب کاریوں اور قوت وطاقت کے بل پر مصر کو بھی اپنے قبضے میں لے لیا۔ خدیو مصر پہلے ہی سے غداری پر آمادہ تھا۔ انگریزوں کو بہت کم جوکھم اٹھانی پڑی۔

وہ مفاد پرست گروہ جو ترکیہ کی ترقی میں روڑا اٹکا رہے تھے یہ تھے:

۱: عیسائی۔ یہ ترکیہ میں رہتے ہوئے ترکی قومیت اختیار کرنے اور ترکی زبان سیکھنے کے لیے قطعاً تیار نہ تھے۔

۲: غیر ترک مسلمان۔ یہی کیفیت ان کی بھی تھی۔ یہ البانی اور عرب مسلمان ترکیہ میں مستقل سکونت اختیار کر چکنے کے باوجود اپنی انفرادیت پر مصر تھے اور کسی قیمت پر آمادہ نہیں تھے کہ "ترک" بن جائیں۔

۳: متوسلین بارگاہ۔ یہ وہ لوگ تھے جن پر خلیفۃ المسلمین کی بارگاہ سے انعام و اکرام کی بارش ہوا کرتی تھی، اب یہ سلسلہ بند ہو گیا تھا۔

۴: قدامت پرست۔ یہ گروہ وہ تھا جس میں بوڑھے فوجی امراء خواص اور علماء شامل تھے۔ یہ جدید کے معنی جانتے تھے نہ جاننا چاہتے تھے اور موقع کی تاک میں لگے رہتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے شورش اور افراتفری کا مستقل طوفان برپا کر رکھا تھا!

۵: فرنگی حکومتیں۔ جو ترکوں کے ہر ترقی پسند اقدام کی مخالف تھیں۔

طرابلس پر اٹلی کا قبضہ ان حالات سے یورپین دشمنوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ ترکی مقبوضات کے حصے بخرے کرنے کی کھچڑی تو اندر ہی اندر ہمیشہ پکا کرتی تھی۔ لیکن اب انھوں نے اپنے منصوبوں کو روبکار میں لانے

کی عملی تیاریاں بھی شروع کر دیں۔

۱۹۱۱ء میں اٹلی نے اچانک بغیر کسی وجہ کے، بغیر اعلانِ جنگ کے پچاس ہزار فوج طرابلس پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کر دی، اس جنگ کا جو نتیجہ ہونا چاہیے تھا وہ ہوا یعنی اطالیہ نے طرابلس پر قبضہ کر لیا۔ انور پاشا چھپ چھپا کر طرابلس پہنچے اور انھوں نے ترکی حکومت کی امداد کے بغیر وہاں کے مسلمانوں کو منتظم کر کے اطالیہ کا مقابلہ کیا اور اُسے ناکوں چنے چبوا دیے، لیکن ترکیہ کی اندرونی تباہ کاریاں اتنی بڑھ گئی تھیں کہ نہ انور پاشا جنگ جاری رکھ سکے نہ ترکی حکومت اطالیہ کو پیچھے ہٹا سکی۔ ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو صلح نامۂ توران پر دستخط ہوئے اور ترکی حکومت نے طرابلس پر اطالیہ کا باقاعدہ قبضہ تسلیم کر لیا۔

حالات اس قدر جلد پلٹا کھا رہے تھے کہ ایک مشکل دور ہوتی تھی تو دوسری سامنے آجاتی تھی، ایک طرف بلقانی ریاستوں نے جنگ و پیکار، سازش اور شرارت اور سرکشی کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا، دوسری طرف البانیہ نے علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ آزادی حاصل کر لی اور بین الاقوامی طور پر اس کی آزادی تسلیم بھی کر لی گئی۔ ترک مجبور ہو گئے اور اپنے ایک اچھے بڑے صوبہ سے بادلِ ناخواستہ بعد حسرت و یاس انھیں دست بردار ہو جانا پڑا۔

جب ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگِ عظیم برپا ہوئی اس جنگ سے ترک حکومت الگ رہنا چاہتی تھی لیکن اُسے شریک ہونے پر مجبور کیا گیا۔ جب وہ شرکت پر مجبور ہو گئی تو روس، برطانیہ اور فرانس کا ساتھ دینے کے بجائے اس نے جرمنی کا ساتھ دیا جس نے کبھی ترکیہ کے حصے بخرے کرنے اور قسطنطنیہ کو اس سے چھین لینے کی اسکیم نہیں بنائی تھی۔

عراق پر انگریزی پرچم

جنگ شروع ہونے کے بعد ترک اس بوجھ کو نہ سنبھال سکے حالات ان کے بالکل مخالف تھے۔ نومبر ۱۹۱۴ء میں انگریزی فوج ہندوستانی پلٹن کے ساتھ شط العرب میں اتری، ۲۲۔ نومبر کو بصرہ فتح کر لیا۔ ستمبر ۱۹۱۵ء میں قسط العمارہ فتح کیا۔ مارچ ۱۹۱۷ء میں بغداد بھی انگریزوں کے قبضے میں آ گیا۔

شام و حجاز کی بغاوت

۱۹۱۶ء کے وسط میں "متحدہ عرب حکومت" کے دام ہمرنگ زمین میں آکر حسین شریف مکہ نے بغاوت کردی۔ انگریز ایک عرصے سے اسے توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر شریف نے بادشاہِ حجاز ہونے کا اعلان کیا جسے انگریزوں نے فوراً تسلیم کرلیا۔ دسمبر ۱۹۱۷ء میں انگریز فوجیں فاتحانہ شان سے فلسطین میں داخل ہوئیں۔ سنہ ۱۹۱۸ء میں فرانس نے شام اور لبنان کو اپنی تحویل میں لے لیا۔

پھر اتحادی فوجیں قسطنطنیہ میں داخل ہو گئیں اور ترک ان کا خیر مقدم کرنے کے سوا کچھ نہ کر سکے۔

۱۹۱۹ء میں یعنی جنگ عظیم ختم ہونے کے بعد کہ ابھی معاہدۂ صلح تکمیل نہیں پایا تھا یونان نے سمرنا پر قبضہ کرلیا اور روایتی بربریت کے ساتھ وہاں مسلمانوں کا قتل عام کیا اور عورتوں کی عصمت دری کی۔

پہلی جنگ عظیم کے نتائج

جرمنی اور ترکی کی شکست کے بعد اتحادی صلحنامہ مرتب کرنے بیٹھے اور جتنی بے انصافی اور دھاندلی اس کرۂ ارض پر ممکن ہے اس کا مظاہرہ انھوں نے کر ڈالا۔ جرمنی کے بھی حصے بخرے کر ڈالے اور ترکی کے بھی۔ جرمنی سے سار چھین لیا۔ ڈانزگ لے لیا، اس کے افریقی مقبوضات پر قبضہ کرلیا، اس کے حدود سلطنت محدود کر دیے، تاوان کا ناقابل برداشت بوجھ اس پر لاد دیا۔ پولینڈ کو اس کے کئی علاقے دے دیے۔

اسی طرح اتحادیوں نے ترکوں کا بھی قیمہ قیمہ کر دیا۔ جو کچھ خود لے سکتے تھے وہ لے لیا جو دوسروں کو دے سکتے تھے وہ دے دیا۔ روس چونکہ سنہ ۱۹۱۷ء میں بالشویک انقلاب سے (اختتام جنگ سے پیشتر) دوچار ہو چکا تھا للہٰذا قسطنطنیہ کسی کو نہ دیا جا سکا۔ اور آپس کی پھوٹ کے ڈر سے کوئی نیا مدعی بھی پیدا نہیں ہوا۔

جرمنی اور ترکی کے ساتھ جو ناانصافیاں کی گئیں اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ترکی میں مصطفےٰ کمال اور جرمنی میں ہٹلر نمودار ہوا۔ کمالی انقلاب کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔

پندرھویں منزل

ہندوستان جنت نشان

اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو

اُترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

تعارف

یہ ھندوستان ھے، گہوارۂ اقوام وملل!

یہ ھندوستان ھے، جو باہر سے آنے والی قوموں کو اپنے اندر جذب کرلیتا ہے، ان کی انفرادیت ختم کردیتا ہے، انھیں اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔

اس دیس میں باہر سے آنے والی ہر قوم کا یہی حشر ہوا! یا وہ مٹ گئی یا بھاگ گئی یا جذب ہوگئی،

لیکن

پہلی مرتبہ اس سرزمین پر ایک ایسی قوم — مُسلمان — نے قدم رکھا جس نے کم وبیش ہزار سال تک اس ملک میں جاہ وجلال کے ساتھ حکومت کی۔

جس نے اس ملک کو ایک نئی تہذیب، ایک نیا معاشرہ اور ایک نیا تمدن عطا کیا جس نے دوسری ملتوں کی انفرادیت کا احترام کیا اور ہر قیمت پر اپنی انفرادیت قائم رکھی۔

اس ہزار سالہ دور کی تاریخ کا بیان اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ پڑھنے والوں کے سامنے پیش کرنا ہے!

تاریخ ہند کے مختلف ادوار!

تاریخ ھند کو ہم نے پانچ ادوار میں تقسیم کیا ہے:

۱: **ھندو عہد** اس دور کا آغاز دو ہزار قبل مسیح سے ہوتا ہے اور آٹھویں صدی عیسوی کو اس کا اختتام ہوتا ہے۔

۲: **عرب عہد حکومت** یہ آٹھویں صدی عیسوی کے آخر میں شروع ہوا۔ اور تقریباً تین سو سال تک قائم رہا۔

۳: **غیر عرب مسلم فرماں روایانِ ھند** یہ دور بارھویں صدی عیسوی سے شروع ہوا اور کسی نہ کسی صورت میں ۱۸۵۷ء تک جاری رہا۔

۴: **عہد فرنگ** یہ ۱۸۵۷ء سے باقاعدہ شروع ہوا اور ۱۹۴۷ء میں ختم ہو گیا۔

۵: **پاکستان** ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء کو عالم وجود میں آیا۔

ان پانچوں ادوار پر ہم الگ الگ گفتگو کریں گے۔

ہندو عہدِ حکومت

ہندوستان کے قدیم باشندے

اور قدیم تہذیبیں

ہندوستان گو قدیم سے ایک وسیع و عریض ملک ہے لیکن یہ ہمیشہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم رہا۔ ہر ریاست آزاد اور خود مختار تھی۔ اس کی تہذیب تمدن، معاشرت، اوضاع و اطوار، لباس و طعام حتیٰ کہ زبان تک میں فرق تھا۔

اشوک اور چندر گپت نے اس دیس کو ایک مرکز کا تابع کرنے کی کوشش کی۔ اور کسی حد تک کامیابی بھی حاصل کی، لیکن یہ ذاتی کوشش تھی جو فرد کے ساتھ ختم ہو گئی۔

ہندو دَور کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ اس دَور کی کوئی مرتّب مستند تاریخ نہیں ہے، یہ تاریخ جن اجزاء سے بنی ہے یہ ہیں:

۱: گیت اور نظمیں جو عوام میں رائج ہیں۔

۲: کہانیاں اور افسانے جو سینہ بہ سینہ اور نسلاً بعد نسلٍ چلے آرہے ہیں۔

۳: کتب مذہبی کے مبیّنہ مندرجات۔

۴: آثارِ قدیمہ کے نقوش۔

۵: قدیم سکّے اور کتبے۔

۶: غیر ملکی سیاحوں کے سفرنامے یا روزنامچے۔

۷: کہاوتیں، ضرب الامثال، محاورے، یہ چیزیں جتنی مستند ہو سکتی ہیں ظاہر ہے۔

ہندوؤں کو فلسفے اور ریاضی سے غیر معمولی شغف رہا ہے، لیکن انھوں نے تذکرہ نگاری اور تاریخ نویسی کی طرف کبھی توجہ نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تاریخ کی بنیاد حد درجہ کمزور اور غیر یقینی ہے۔

ہندوستان کی قدامت

دُنیا میں جو ملک غیر معمولی طور پر قدامت کے مدعی ہیں وہ تین ہیں:

۱: چین۔

۲: مصر۔

۳: ہندوستان۔

ان تینوں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر زمانی اعتبار سے ترجیح دینا مشکل ہے کیونکہ کوئی ٹھوس ثبوت تو ہے نہیں صرف ظن و تخمین ہی سے کام لیا جا سکتا ہے۔ بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان دُنیا کے قدیم ترین ممالک کی فہرست میں نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔

ماہرینِ تاریخ و جغرافیہ اس رائے پر تقریباً متفق ہیں کہ یہ برصغیر مشرق کی طرف سے آسٹریلیا اور مغرب کی طرف سے افریقہ سے ملحق تھا یعنی بحرِ ہند اور بحیرۂ عرب کی جگہ خشکی تھی۔ رفتہ رفتہ اس برصغیر کا ربط آسٹریلیا اور افریقہ سے ٹوٹتا گیا۔ یہاں تک کہ اس ربط کی ساری خشکی تہ آب چلی گئی۔ اور اس کی جگہ بحرِ ہند و بحیرۂ عرب نمودار ہو گئے۔ اسی دور میں شمالی حصّہ بھی زیرِ آب تھا اور ساری زمین کا صرف وہی حصّہ ظاہر تھا جسے سطح مرتفع دکن کہا جاتا ہے۔ بعد میں پھر جغرافیائی تغیرات ہوئے اور آہستہ آہستہ کوہ ہمالہ ظاہر ہوتا گیا۔ ارضی تبدیلیوں کے باعث شمالی حصے کی زیرِ آب زمین ابھرنے لگی۔ طویل مدّت کے بعد سطح مرتفع دکن سے ملحق شمال کی طرف

کی وہ تمام زمین نمودار ہوگئی جو شمالی ہند کے نام سے مشہور ہے۔ اس طرح اس برصغیر کی موجودہ تشکیل ہوئی۔

ہند، آسٹریلیا اور افریقہ کی آب وہوا کا بہت حد تک یکساں ہونا اور تینوں سرزمینوں میں خاص قسم کی پیداوار اور جانوروں کا پایا جانا بھی ایسے امور ہیں جو اسی نظریے کی تائید کرتے ہیں۔

برصغیر کی طویل قدامت کے حق میں دراوڑ تہذیب اور سومیریوں کی تہذیب کی ہم آہنگی بھی ہے۔ دراوڑ اور سومیری ہم نسل تھے اور ایک ہی آبائی مقام سے منتشر ہوکر دور دراز علاقوں یعنی شام وعراق اور برصغیر ہند میں آباد ہوئے۔ انہی کے زمانۂ عروج کی تہذیب کے آثار ہڑپہ اور موہنجوداڑو کے ٹیلوں میں مدفون تھے جنہیں اب کھود کر ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ آثار اس برصغیر کی تاریخ کو کم ازکم تین ہزار سال قبل مسیح تک لے جاتے ہیں۔ ان آثار سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جب آج سے پانچ ہزار سال پہلے اس سرزمین میں اس قدر اعلیٰ پیمانے کی تہذیب موجود تھی تو اس سرزمین نے اس تہذیب سے پہلے اس تہذیبی معیار تک پہنچنے کے لیے طویل دور عبور کیے ہوں گے۔ اور اس لحاظ سے یہ سرزمین کتنی قدیم ہوگی۔

ہندوستان کے قدیم باشندے

قدیم ہندوستان کی تاریخ ایک سربستہ راز ہے۔ اس راز کی گرہ کشائی آسان نہیں پھر بھی مؤرخینِ عالم نے تحقیق بسیار کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ دُنیا کی اس قدیم بستی میں آبادی کا سُراغ بھی شروع ہی سے ملتا ہے۔

یہاں کے سب سے پہلے باشندے جنہوں نے بستی بسائی اور غار کی زندگی ترک کی وہ کول تھے۔ اس نسل کے متعلق بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ پتھر اور دھات کے زمانے عبور کرنے والی نسل اس برصغیر میں یہی تھی بعض علماء کا خیال ہے کہ اس نسل کے لوگ مشرق سے اس برصغیر میں وارد ہوئے تھے لیکن بعض مورخین اس بات پر مصر ہیں کہ یہ اس برصغیر کے اصلی باشندے تھے۔ یہ لوگ سفید رنگ، گول سر، چپٹی ناک

چھوٹے قد اور بھدی شکل والے تھے جو ابتدا میں درختوں پر یا غاروں میں رہتے تھے اور جنگلی پھل پتّوں پر ان کی گزران تھی۔ پتھر کی بنی ہوئی چیزیں اور ہتھیار استعمال کرتے تھے بھوت پریت کی پوجا کرتے تھے۔ مُردوں کو جنگل میں پھینک دیتے تھے۔ رفتہ رفتہ انھوں نے ترقی کی اور دھات سے شناسا ہونے کے بعد دھات کے بنے ہوئے ہتھیار اور چیزیں استعمال کرنے لگے۔ کھیتی باڑی کی طرف متوجہ ہوئے اور رہائش کے لیے جھونپڑیوں اور مکانوں کی تعمیر کرنے لگے اور آہستہ آہستہ کچھ ریاستیں قائم ہوئیں۔ دوسری طاقت ور قوموں نے جب غلبہ پایا تو یہ لوگ بھاگ کر پہاڑی علاقوں میں روپوش ہو گئے۔ اب تک ان کی نسلیں پہاڑی علاقوں میں ملتی ہیں۔ ان کی مختلف نسلیں اور قبیلے ہیں بھیل اور سنتھال بنگال، چھوٹا ناگپور اور اڑیسہ میں اور گونڈ زیادہ تر وسط ہند کی پہاڑیوں میں پائے جاتے ہیں۔ یہ سب خانہ بدوش ہیں اور یہ اب تک ابتدائی پرانی تہذیب سے بلند نہیں۔ ان میں سے بعض ہندوؤں میں اور بعض عیسائیوں میں مدغم ہو گئے۔ کولوں کے بعد جو قوم اس برصغیر میں غالب تہذیب کی مالک ہوئی وہ دراوڑ تھی۔

اس نسل کے لوگ کولوں کے مقابلے میں بہتر خد و خال کے تھے۔ یہ کولوں سے ذرا زیادہ طویل قامت، لمبے سر، چپٹی ناک اور مضبوط جسم کے تھے۔ ان کا رنگ اگرچہ سیاہ تھا تاہم کولوں سے ذرا کھلا تھا۔ آج کل اس نسل کے قبیلے بیر، ٹوڈا اور کوٹا وغیرہ میں، زیادہ تر دکن، احاطہ مدراس اور وسطی ہند میں ملتے ہیں۔ تامل، تلیگو، تولو ملیالم اور کناری وغیرہ انہی کی زبانیں ہیں۔

اس برصغیر میں دراوڑوں کے ورود کے متعلق دو نظریے ہیں، بعض عالموں کا خیال ہے کہ یہ لوگ اس نسل سے تھے جس سے عراق عرب کے سمیری تھے۔ یہ اپنے آبائی وطن سے منتشر ہو کر کچھ مکران کی طرف سے درہ بولان کی راہ مغربی پاکستان میں وارد ہوئے۔ اور بلوچستان و سندھ میں پھیل کر مدتوں ان علاقوں میں آباد رہے۔ ان کی تہذیب و تمدن کے آثار ہڑپہ اور موہنجوڈارو میں ٹیلوں کی کھدائی

سے بر آمد ہوئے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بہت اعلیٰ معیار کی تہذیبی زندگی بسر کرتے تھے، کھیتی باڑی سے واقف تھے۔ مویشی پالتے تھے۔ کپڑا بُننا بھی جانتے تھے سونے چاندی کے زیور بھی بناتے تھے۔ صنعت و حرفت اور تجارت میں ان کی ترقی نمایاں تھی۔ ان کی کئی راجدھانیاں تھیں اور مغربی ایشیا اور افریقہ کے ممالک سے ان کے تجارتی تعلقات تھے۔ سانپوں اور درختوں کی پرستش کرتے تھے۔ بھوت پریت کا بھی عقیدہ رکھتے تھے۔ بلوچستان اور سندھ سے اس نسل کے بعض لوگ وادیٔ گنگا میں پھیلے اور پھر آگے بڑھ کر دکن کی طرف چلے گئے۔ جہاں ان کے قبیلے سکونت پذیر ہو گئے۔ اس صورتِ حال کی دو طرح تائید ہوتی ہے ایک تو یہ کہ عراق عرب میں کھدائی سے جو اشیاء بر آمد ہوئی ہیں وہ ہڑپہ اور موہنجوڈارو سے برآمدہ اشیاء سے ملتی جلتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ بلوچستان کے بروہی قبیلوں کی زبان احاطہ مدراس کے دراوڑوں کی زبان سے الفاظ، تراکیب اور ساخت میں بہت حد تک مشابہت رکھتی ہے۔

دراوڑ قوم کے بعد مؤرخ منگول نسل کا نام لیتے ہیں۔ ان کا قد پست، ناک چپٹی، رنگ زردی مائل بھورا، چہرہ چوڑا اور آنکھیں ترچھی تھیں۔ یہ دراوڑ سے زیادہ تند مزاج تھے۔ یہ لوگ منگولیا، چینی تاتار سے شمال مشرقی حدوں سے گزر کر برہمپتر کی وادی سے ہوتے ہوئے اس برِّ صغیر میں وارد ہوئے اور آسام و بنگال میں آباد ہوئے۔ ان کے نمونے آجکل انہی علاقوں میں ملتے ہیں۔ یہ پہلے کولوں اور دراوڑوں سے لڑتے رہے بعد میں ان کے ساتھ گھل مل گئے۔

دراوڑی تہذیب کے آثار و نقوش

ابھی کچھ عرصے تک ساری دُنیا اس مغالطے میں مبتلا تھی کہ ہندوستان میں تہذیب آریوں کے ساتھ وارد ہوئی۔ ورنہ اس سے پہلے یہاں کے باشندے وحشی، غیر مہذب اور ناتراشیدہ تھے۔

لیکن ہڑپہ، موہنجوڈارو اور کوٹ ڈی جی کی کھدائی کے بعد جو آثار و نقوش بر آمد ہوئے

ہیں ـــ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ دراوڑ قوم آریوں سے کہیں زیادہ قدیم ہی نہیں کہیں زیادہ مہذب بھی تھی۔

ہڑپہ کی کھدائی ہڑپہ ایک مختصر سا گاؤں ہے۔ ہڑپہ گاؤں کے آس پاس بہت پرانے زمانے کے ٹیلے چلے آتے ہیں۔ ان ٹیلوں میں سے بعض کو محکمہ آثار قدیمہ کی زیر نگرانی ۱۹۲۳ء میں کھودا گیا تو ان سے حیرت انگیز پرانے آثار نکلے۔ ان آثار میں اور بڑی اہم چیزوں کے علاوہ ایک پرانا قبرستان ایک گودام کئی کھلونے برتن اور مہریں ملی ہیں۔ مہروں پر جانوروں کی تصویروں کے علاوہ کچھ حروف لکھے ہوئے ہیں۔ ان کا رسم الخط ابھی تک پڑھا نہیں جا سکا ہے قبرستان کی ایک قبر سے ایسی لاش ملی ہے جس کی ہڈیاں نمایاں ہیں اور اس کے ہاتھ میں پیتل کی انگشتری ہے۔ ان چیزوں سے علمائے آثارِ قدیمہ نے بیش بہا تاریخی نکات اخذ کیے ہیں۔

موہنجوڈارو سندھ کے ضلع لاڑکانہ میں ہے، وہاں بھی کئی ایسے ٹیلے موجود تھے چنانچہ وہاں بھی محکمہ آثار قدیمہ نے اپنی نگرانی میں کھدائی شروع کرائی۔ اور تعجب خیز بات ہے کہ اس کھدائی سے یہاں ایک دوسرے کے نیچے شہری آبادی کی سات تہوں کے آثار نکلے۔ ان آثاروں میں پکی عمارتیں، فراخ سڑکیں وسیع کوچے، زمین دوز نالیاں، بدرروئیں، صحت افزا دو منزلے صحت افزا اینٹوں کے مکان، کنوئیں، شہری حمام، تالاب، کوڑے کی ٹوکریاں، مندر یا کونسل ہال کی طرح ایک بہت بڑا کمرہ، سونے چاندی پیتل تانبے اور کانچ کے زیور، مٹی کے پختہ برتن، تانبے اور پیتل کے برتن، پتھر اور تانبے کے ہتھیار، چرخے اور مٹی کے پختہ کھلونے ملے ہیں۔ اس مقام سے بھی اسی طرح کی مہریں ہاتھ آئی ہیں جو ہڑپہ سے ملی ہیں۔ ان مہروں پر دیوتاؤں اور جانوروں کی تصویریں اور کچھ تحریریں ہیں۔ یہاں سے کئی کانسی کے بت بھی ملے ہیں جن میں شال پہنے ہوئے مرد کا بت بھی ہے۔ بعض نعشیں کھوپڑیاں راکھ کے مٹکے اور قبریں بھی ملی ہیں۔ ہڑپہ اور موہنجوڈارو کے دونوں مقاموں سے برآمد

کی ہوئی چیزیں نوعیت و کیفیت کے لحاظ سے باہم بہت مشابہت رکھتی ہیں۔ یہ مشابہت اس بات کا ثبوت ہے کہ دونوں مقام ایک ہی تہذیب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان اشیاء کی مشابہت اُن اشیاء سے بھی ہے جو عراق عرب کے علاقہ سمیر کے کھنڈروں سے ملی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تہذیب کے علمبردار اور سمیری تہذیب کے علمبردار ایک ہی نسل سے تھے۔ دراوڑوں کے سر کی ساخت ان کی بولی اور رسوم سمیریوں سے ملتی جلتی ہیں۔

ہڑپہ اور موہنجوداڑو سے جو اشیاء دستیاب ہوئی ہیں ان سے آثار قدیمہ کے علماء نے حسب ذیل نتائج اخذ کیے ہیں۔

دراوڑ لوگ شکل و شباہت میں آریوں اور کولوں سے مختلف تھے لیکن سمیریوں کے مشابہہ تھے۔ کولوں سے زیادہ طاقتور اور جسیم تھے، اعلیٰ تہذیب کے مالک تھے، کھیتی باڑی جانتے تھے۔ زراعت کے لیے انھوں نے آبپاشی کا اچھا انتظام کیا تھا۔ مویشی بھی پالتے تھے۔ پالتو جانوروں کے علاوہ وہ جنگلی جانوروں سے بھی زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ صنعت و حرفت ان میں عام تھی، وہ دھاتوں کا استعمال جانتے تھے۔ سونے، چاندی اور پیتل کے زیور، تانبے اور پیتل کے برتن اور ہتھیار بناتے تھے۔ مٹی کے خوبصورت برتن بھٹیوں میں پکا کر بھی تیار کیے جاتے تھے۔ ان پر رنگ و روغن بھی کیا جاتا تھا۔ بچوں کے لیے مٹی کے پختہ کھلونے بھی بنتے تھے۔ ان کھلونوں کے مختلف نمونوں سے پتہ چلتا ہے کہ دراوڑ کس قسم کے پرندوں مویشیوں اور جنگلی جانوروں سے واقف و مانوس تھے۔ ان کے زمانے میں کس قسم کے سامان اور گاڑیاں استعمال ہوتی تھیں۔ چرخوں اور شال والے بت اور دوسری تصویروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ کپڑا بھی جانتے تھے۔ اون اور روئی کے لباس پہنتے تھے۔ البتہ پہننے کے طریقے جدا جدا تھے۔ تجارت میں بھی انھوں نے خاصی ترقی کی تھی۔ بیرونی ممالک سے ان کے تجارتی تعلقات تھے، وہ جہاز اور کشتیاں بناتے تھے اور سمندر کی بیرونی راہ سے ملکوں تک آتے جاتے اور تجارت

ہندوستان کی تاریخ کا نیا دور

آریہ

آریوں کے آنے کے بعد ہندوستان کی تاریخ کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اس ملک کے اصل باشندے خانہ بدوش بن جاتے ہیں اور یہ پردیسی اپنی فہرمائیت اور قوت کے بل پر یہاں کے مکین اور مالک بن جاتے ہیں۔

آریا لوگ اسی نسل سے تھے جس سے انگریز، فرانسیسی، جرمن، یونانی، رومی اور ایرانی ہیں۔ کسی زمانے میں ان سب کے آباؤ اجداد ایک ہی علاقے میں رہتے تھے۔ اس نسل کے لوگ رنگ کے گورے، قد کے لمبے اور جسم کے سڈول تھے۔ ان کی ناک بلند، سر گول اور سینے چوڑے تھے۔ ان کی زبان سنسکرت تھی۔ یہ لوگ اپنے وطن سے نکل کر ایران و افغانستان سے ہوتے ہوئے شمال مغربی دروں کی راہ اس برصغیر میں ۲۰۰۰ ق م اور ۴۵۰۰ ق م کے درمیانی سالوں میں وارد ہوئے اور ان دراوڑوں پر غالب آئے جو صدیوں سے اس سرزمین میں راج کرتے چلے آتے تھے۔ کیونکہ ان کے مقابلے میں زیادہ طاقتور فنونِ جنگ کے ماہر اور رتھوں اور گھوڑوں پر چڑھ کر لڑنے کے مشاق تھے۔

اکثر محققین و مؤرخین کا خیال ہے کہ آریاؤں کا آبائی وطن وہ علاقہ تھا جو وسط ایشیا

شجاعت دے رہی تھیں۔ یہ زمانہ زمانۂ شجاعت بھی کہلاتا ہے۔ اس دَور کے حالات آریوں کی دو متبرک رزمیہ کتابیں رامائن اور مہابھارت سے معلوم ہوتے ہیں جن میں اس زمانے کی دو اہم لڑائیوں کا منظوم ذکر کیا گیا ہے۔ یہ کتابیں اسی دَور میں لکھی گئی ہیں۔ یہ دور ڈیڑھ ہزار قبل مسیح سے ایک ہزار قبل مسیح تک بتایا جاتا ہے۔

برہمنی دَور

رزمیہ دور کے بعد برہمنوں کے اقتدار کا زمانہ آیا جس میں آریاؤں کے مذہبی راہنما یعنی برہمن لوگ علم و فن میں کمال حاصل کرنے کے علاوہ دربار میں دخل دینے لگے تھے اور عوام پر مذہبی تسلط کے نشہ میں اس قدر بدمست ہو گئے تھے کہ عوام تنگ آگئے تھے۔

اسی دَور میں آریوں کے مشہور مقنّن منو نے منوسمرتی لکھی جس میں ذات پات کے نظام کو مستقل اور پائیدار شکل دے کر برہمنوں کے وقار کو نمایاں خصوصیت دی۔ یہ کتاب بھی آریوں کی متبرک کتابوں میں سے ایک سمجھی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ تقریباً ایک ہزار قبل مسیح لکھی گئی۔

آریہ تہذیب۔ برہمنی رسوم

آریاؤں کے ہاں جو کتابیں مقدس مانی جاتی ہیں وہ دو طرح کی ہیں۔

ایک سرتی یعنی الہامی۔

دوسرے سمرتی یعنی روایاتی۔

الہامی کتابوں میں وید ہے اور روایاتی کتابوں میں اپنشد، رامائن، مہابھارت پُران اور منوسمرتی وغیرہ ہیں۔

مہابھارت اور رامائن کے بعد کے زمانے میں برہمنوں کو حکومت، معاشرت اور مذہب میں کافی اقتدار حاصل ہو گیا تھا اور ان کی نخوت و تمکنت اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ اپنی من مانی کرنے سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ علم و فن میں انھوں نے بڑی ترقی کی۔ اس دور کو برہمنی زمانہ کہتے ہیں۔

اس دور میں راجہ خود مختار تھا لیکن اس کے سارے کام برہمنوں کے اشارے

بدھ مت کے حق میں شروع ہوئیں تو جین مت کا زوال شروع ہوا۔ گپت خاندان کے عہدِ حکومت میں ہندو مت دوبارہ ابھرا تو اس نے بدھ مت کو ختم ہی کر ڈالا لیکن جین مت کو انھوں نے قابلِ اعتنا نہ سمجھا۔ اس لیے اگرچہ یہ کمزور مذہب تھا تاہم اس کی سرگرمی بدستور رہی اور آج بھی اس برصغیر میں اس مت کے معتقدوں کی کافی تعداد ہے۔

تیسری صدی قبل مسیح میں چندر گپت کے عہدِ حکومت میں مگدھ میں سخت قحط پڑا تو بہت سے جینی بھدر باہو کی رہنمائی میں دکن چلے گئے۔ وہاں کچھ مدت کے بعد ان کے عقائد میں کچھ تبدیلی رونما ہوئی اور انھوں نے برہنگی چھوڑ کر سفید کپڑے پہننے شروع کر دیے۔ اس طرح جینیوں کے دو فرقے ہو گئے۔ ایک سویتامبر فرقہ تھا جو سفید کپڑے پہنتا تھا اور شادی کا قائل تھا، دوسرا ڈگامبر تھا جو کپڑے پہننے اور شادی کرنے کا قائل نہ تھا۔

جینیوں کی مذہبی کتابیں بارہ ہیں جو بارہ انگ کہلاتی ہیں سویتامبر فرقہ ان سب کو مانتا ہے لیکن ڈگامبر فرقہ آخری انگ کا انکار کر کے صرف گیارہ کو مانتا ہے۔ یہ انگ کچھ سنسکرت میں ہیں اور کچھ مقامی ہیں۔ تامل، تلگو اور میسوری زبانوں میں بھی اس فرقے کی کافی کتابیں ملتی ہیں۔ جینیوں کا فنِ تعمیر بھی امتیازی خصوصیات رکھتا ہے۔ اجمیر گجرات، کاٹھیاواڑ، چتوڑ اور راجپوتانہ میں جینیوں کے مندر ان کے فنِ تعمیر کا دلکش نمونہ ہیں۔

بُدھ مذہب اور اس کی خصوصیات

بدھ مت کا بانی گوتم بدھ تھا۔ اس کا اصلی نام سدھارتھ تھا وہ ساکیہ قوم کے کشتری راجہ جو دھن کا اکلوتا بیٹا تھا۔ سدھودھن نیپال کا راجہ تھا۔ اس کی ریاست کوشل کہلاتی تھی۔ اور اس کا پایۂ تخت کپل دستو تھا، گوتم بدھ کی پیدائش ۵۶۷ء ق م میں ہوئی۔ گوتم شاہانہ گھر کی پیداوار تھا اس لیے خوب عیش و عشرت میں پلا، اعلیٰ درجے کی تعلیم دلائی۔ ہر فن میں اسے تربیت ملی۔ نیزہ اندازی، تیر اندازی، تیغ زنی، شہسواری اور ہر قسم کے مروج فنونِ جنگ اس نے سیکھے۔ انیس سال کی عمر میں راجکماری یشودھرا سے اس کی شادی ہوئی لیکن مسرت نہ ملی۔ دنیا کے اپاہج، لنگڑے، کمزور، بیمار، بوڑھے اور دکھی لوگوں کا

سچّا عزم۔ سچی گفتگو۔ سچّا چال چلن۔ سچّا ذریعہ معاش۔ سچی کوشش۔ سچا عقیدہ سچی سمجھ۔ سچّا غور و فکر۔

۵: ہر شخص اپنے اعمال کی اچھائی برائی کے مطابق دوسرا جنم لیتا ہے۔ بُرے اعمال سے بچ کر اچھے کاموں کی طرف راغب ہونا چاہیے۔ تاکہ دوسرے جنم میں زندگی خوشگوار ہو۔

۶: نفسانی خواہشات پر ضبط رکھنے یا انھیں مٹانے سے روح نروان (نجات) حاصل کرتی ہے۔ اور آواگون (تناسخ) پریشان کرنے والے چکّر سے محفوظ ہو جاتی ہے۔

۷: نروان (نجات) کے بعد انسان کوئی جنم نہیں لیتا۔

۸: انسان کا فرض ہے کہ ہر جاندار کی حفاظت کرے۔ حیوانی قربانی کے بجائے اہنسا کی طرف توجّہ کی ضرورت ہے۔

۹: ذات پات کی تمیز غلط ہے، سب انسان برابر ہیں۔ برہمن اور شودر میں کوئی امتیاز نہیں۔

۱۰: روح صرف جانداروں ہی میں ہے۔

۱۱: خدا کی ہستی کے متعلق بدھ نے کوئی مخصوص تعلیم نہیں دی۔ اس سلسلے میں نہ اس کا اقرار واضح تھا نہ انکار۔

گوتم بدھ کی اپنی زندگی ہی میں ساٹھ ہزار کے قریب اس کے مرید ہو گئے تھے۔ جن میں کئی راجہ اور بڑے بڑے سوداگر تھے۔ گوتم بدھ نے باقاعدہ مذہب کی تبلیغ کا سلسلہ قائم کیا اور خوب پھلا پھولا۔

منظر اُسے غمگین رکھتا۔ اس کے گھر میں طرب کے سارے سامان موجود تھے۔ ایک بچہ بھی ہو گیا تھا، لیکن اس کا دل نہ بہل سکا۔ اُسے یقین ہو گیا تھا کہ دُنیا دُکھوں کا گھر ہے۔ شودروں کی حالت سے اس کا دل پھٹتا تھا۔ جانوروں کی لاتعداد قربانیاں اسے مغموم رکھتی تھیں۔ اُس کا غم جب کہیں دُور نہ ہوا تو آخر اس نے اپنا گھر بار، شاہانہ در و بام، اہل و عیال چھوڑ کر جنگلوں کا رُخ کیا۔ سادھو بنا رہا۔ فاقے کاٹے، برت رکھے، بدن سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ لیکن اطمینانِ قلبی نصیب نہ ہوا۔ وہ گیا پہنچا اور ایک درخت کے نیچے ڈیرہ لگا کر بیٹھ گیا، غور و فکر کا سلسلہ جاری رہا۔ ایک دن اچانک اس کی چشمِ بصیرت کھلی اور یہ بات سوجھی کہ نجات نہ تو تپسیا اور قربانی میں ہے نہ چلّوں اور ریاضتوں میں بلکہ نجات (مکتی یا نروان) پاکیزہ زندگی بسر کرنے سے حاصل ہوتی ہے، دُنیا کے دُکھ، درد سب نفسانی خواہشات و اغراض کی بنا پر ہیں۔ نفسانی خواہشات و اغراض کو مٹانے سے دُکھ درد دُور ہو سکتا ہے۔ اس حقیقت کے عرفان کی وجہ سے وہ بدھ یعنی عارف مشہور ہوا۔ اس نے جنگل کی رہائش ترک کر دی اور دیس بدیس پھر پھر کر تبلیغ کرنے لگا۔ بنارس جا کر سارناتھ کے جنگل میں وعظ و نصیحت کرتا رہا۔ بہت سے لوگ معتقد ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے مگدھ کے مختلف حصوں میں تبلیغ کا کام کیا۔ اپنے وطن و مولد کپل وستو میں بھی پہنچا۔ اپنے ماں باپ، بیوی بیٹے اور دوسرے تعلق داروں کو اپنے مذہب کا قائل کیا۔ اس کی تبلیغ ۴۵ سال تک جاری رہی۔ کئی راجہ اور سوداگر بُدھ مت کے پیرو ہو گئے۔ گوتم بدھ نے ۸۰ سال کی عمر میں کرسی نگر ضلع گورکھ پور میں، ۴۸۷ ق م میں وفات پائی۔ اس کے پھول چیلوں کے سرداروں اور راجاؤں نے قرعہ اندازی سے بانٹے اور ان پھولوں پر شاندار عمارتیں تعمیر کیں جو اسٹوپا کہلائیں۔

گوتم بدھ نے جس مذہب کی تعلیم دی اس کے اہم اصول یہ تھے۔:

۱: وید الہامی کتابیں نہیں

۲: برہمنوں کی رائج کردہ مذہبی رسمیں فضول ہیں۔ رسموں سے مکتی حاصل نہیں ہو سکتی۔

۳: سچی خوشی حاصل کرنے کے لیے نفسانی خواہشات و اغراض پر ضبط کرنا چاہیے۔

۴: نفسانی خواہشات پر ضبط حاصل کرنے کے لیے آٹھ اصول ہیں:

دارا اور سکندر کے ہندوستان پر حملے

چھٹی صدی قبل مسیح میں ایران کے شہنشاہ دارا نے ہندوستان پر براہ سندھ حملہ کیا۔ اور وہ علاقہ جو اب مغربی پاکستان کہلاتا ہے زیر نگیں کر لیا۔ ایرانی پرچم اقتدار اگرچہ بہت زیادہ عرصے تک نہیں لہراتا رہا لیکن اس کے اثرات زندگی کے مختلف شعبوں میں عرصۂ دراز تک کارفرما رہے۔

چوتھی صدی قبل مسیح میں یونان کے شہنشاہ سکندر نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ راجہ پورس سے لڑائی ہوئی لیکن اسے شکست دے کر بیاس تک کا علاقہ اس نے محکوم بنا لیا۔ سکندر کا قیام ڈیڑھ سال سے زیادہ نہیں رہا۔ لیکن اس کے اثرات بھی ایک عرصۂ دراز تک مستولی رہے۔

سکندر کے حملے کے وقت ہندوستان کی حالت

اسکندر کے حملے کے وقت برصغیر پاک و ہند میں کوئی مرکزی حکومت نہ تھی۔ یہ سرزمین بہت چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹی ہوئی تھی۔ جو ایک دوسرے کی سخت دشمن تھیں اور باہم جنگ کرنے میں مصروف تھیں۔ وادیٔ گنگا کی ریاستوں میں سے مگدھ کی ریاست سب سے زیادہ زبردست اور باشکوہ تھی جس کا صدر مقام پاٹلی پتر تھا۔ اس ریاست میں نندا خاندان کا راجہ مہاپدم حکمراں

تھا۔ اس کا فوجی کمانڈر چندر گپت تھا۔ راجہ اس سے کسی بات پر ناراض ہو گیا اور وہ مگدھ چھوڑ کر ٹیکسلا چلا آیا تھا مغربی پاکستان کے علاقے میں بھی کئی چھوٹی بڑی ریاستیں تھیں۔ سرحدی علاقے میں اشکائنی قبیلے کی ریاست تھی جس کا صدر مقام موجودہ مالاکنڈ کے قریب تھا۔ کشمیر، ہزارہ اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں راجہ ابھی سارا کی حکومت تھی۔ سندھ اور جہلم کے درمیان ٹیکسلا کی ریاست تھی۔ اس کا حکمران ابھی سارا کا بھائی راجہ امبھی تھا، یہ پورس کا دشمن تھا۔ ٹیکسلا اس وقت علمی مرکز ہونے کے باعث بہت مشہور تھا۔ بدھ کے زمانے میں یہاں ایک بڑی یونیورسٹی تھی۔ جہلم اور چناب کے درمیان دوآبہ جج میں پورو خاندان کے راجہ پورس کی ریاست تھی۔ وہ بڑا خوددار اور بہادر راجہ تھا، امبھی اس کے سخت خلاف تھا۔ ان ریاستوں کے علاوہ چند جمہوری ریاستیں بھی تھیں۔ راوی اور بیاس کے درمیانی دوآبے میں سیالکوٹ کے قریب گلاسائی قوم کا اقتدار تھا، اس سے آگے کاتھ قوم یا کھاولی قبیلے کی سطوت تھی، ان کا قلعہ ساگلا خاص شہرت رکھتا تھا۔ جھنگ کے علاقے میں سبلوئی راجہ حکمراں تھا، اس کے پاس چار ہزار پیادے تھے۔ شورکوٹ اس کا صدر مقام تھا۔ راوی اور بیاس کے درمیان دوآبہ باری کے وسطی حصے میں شدرکا خاندان کی حکمرانی تھی۔ جہلم کے مشرق میں سمبوبھی کی ریاست تھی۔ اس ریاست کے لوگ عجیب قسم کے وہمی تھے، ناکارہ بچوں کو مار ڈالتے تھے۔ اچھے بچے حکومت کی سرپرستی میں پلتے تھے۔ ملتان میں ملوی خاندان کی حکومت تھی۔ اس کے پاس نوّے ہزار پیادے تھے۔ دس ہزار سوار اور نو سو ہاتھی تھے۔

سکندر فتح ہند کے ارادے سے ایران سے آگے بڑھا اور ترکستان افغانستان سے یلغار کرتا ہوا ۳۲۷ ق م میں کوہ ہندوکش پہنچا۔ یہاں اس نے اپنی فوج کے دو حصے کیے۔ ایک حصہ درۂ خیبر کی راہ پشاور روانہ کیا اور دوسرے حصے کے ساتھ خود چترال، سوات اور باجوڑ کی طرف بڑھا۔ اور وہاں کے سرحدی قبائل کو مغلوب کیا پھر ۳۲۶ ق م میں اٹک سے ۱۶ میل شمال کی طرف اوہند یا دے ہند کے مقام پر کشتیوں کا پل بنا کر دریائے سندھ عبور کیا، اس کے ساتھ کل ایک لاکھ بیس ہزار پیادے تھے اور پندرہ ہزار

سوار تھے، دوسرے حصے کے فوجی بھی یہاں آملے تھے۔ ابھیسار اتو سکندر کے اقدام میں مزاحم نہ ہوا بلکہ اس نے دورخی پالیسی اختیار کی۔ ٹیکسلا کے راجہ امبھی نے اطاعت ہی قبول نہ کی بلکہ پورس کے خلاف سکندر کو جنگ پر آمادہ کر کے سات سو جنگی سوار، تین ہزار پیادے اور بہت سامال بھی امداد کے طور پر نذر کیا۔ سکندر اس اطاعت و امداد سے خوش ہوا اور اقدام کرتا ہوا جہلم کی طرف بڑھا، پورس کو پیغام بھیجا کہ اطاعت قبول کرے۔ پورس خوددار طبیعت کا راجہ تھا اس نے سکندر کی اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ سکندر آگے بڑھ کر جہلم پر پہنچا۔ پورس بھی دریا کے پار تیس ہزار پیادوں چار ہزار سواروں، تین سو جنگی ہاتھیوں اور تین سو رتھوں کے ساتھ مقابلے پر آیا۔ بڑے گھمسان کا رن پڑا۔ یونانی فوج کے کچھ آدمیوں نے چکر کاٹ کر پیچھے سے بھی حملہ کر دیا۔ پھر کیا تھا پورس کی فوج میں بڑی افراتفری پھیل گئی۔ اگرچہ پورس اور اس کے بیٹے خوب لڑے لیکن ہاتھی یونانیوں کے تیروں کی تاب نہ لا سکے اور بوکھلا کر اپنی فوج کو روندتے ہوئے بھاگے۔ ادھر بارش کی وجہ سے کیچڑ زیادہ تھی رتھوں کے پہیے زمین میں دھنس گئے۔ پورس کے تیر انداز بھی کیچڑ کی وجہ سے کمال نہ دکھا سکے۔ پورس کے دونوں بیٹے قتل ہوئے۔ بارہ ہزار پیادے اور دو ہزار سوار مارے گئے۔ نو ہزار آدمی قید ہوئے۔ پورس خود بھی زخمی ہو کر گرفتار ہوا۔ اور سکندر کے سامنے پیش ہوا سکندر نے اس سے پوچھا کہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ پورس نے کہا "وہی جو بادشاہ بادشاہوں سے کرتے ہیں"۔ یہ جواب سکندر کو بہت پسند آیا اس نے خوش ہو کر پورس کی سلطنت نہ صرف بحال کر دی بلکہ اپنے مقبوضات سے کچھ اور علاقہ بھی اُسے دے دیا۔ اُسے اپنا نائب مقرر کیا۔ یونانیوں کے ایک ہزار سپاہی اس جنگ میں کام آئے۔

ہندو دورِ حکومت

موریہ خاندان سے راجپوتوں تک کا عہد

بُدھ مت کا عروج و زوال ہندوؤں کے دورِ حکمرانی کا نہایت شاندار حصہ عہد قبل از تاریخ سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ دور موریہ خاندان سے شروع ہوتا ہے جس کا بانی چندر گپت موریہ تھا۔

چندر گپت کا دورِ حکومت چندر گپت نے بدھ مذہب کی توسیع کے لیے بڑا کام کیا اور ہندوستان کو ایک متحدہ مرکزی حکومت کے زیرِ سایہ لانے کی کامیاب کوشش بھی کی۔ اس کے حدودِ مملکت ہمالہ سے بندھیاچل تک اور کوہِ ہندوکش سے لے کر خلیج بنگالہ تک وسیع تھی۔ تنظیمِ مملکت کے اعتبار سے شاندار اور باعثِ تحسین تھا۔ اس عہد میں فنونِ لطیفہ کو بھی بڑی ترقی ہوئی۔ یہ سلطنت "مگدھ" کے نام سے مشہور تھی۔ مگدھ وہ علاقہ ہے جس میں موجودہ صوبہ بہار کا حصہ شامل ہے۔ پاٹلی پتر اس کا صدر مقام تھا۔ یہی پاٹلی پتر ہے جو مسلمانوں کے زمانے میں عظیم آباد بن گیا تھا۔ اور اب بھی پٹنہ کے نام سے مشہور ہے۔

مگدھ کی سرزمین ہمیشہ سے غیر معمولی اہمیت کی حامل رہی۔ نالندہ یونیورسٹی یہیں قائم تھی۔ پتانجلی جیسے فاضل اس ادارے سے پیدا ہوئے تھے۔ یہ خاندان ۱۸۴ ق م

تک برسر اقتدار رہا۔ چانکیہ چندر گپت کا وزیر باتدبیر تھا، اس نے ارتھ شاستر لکھی ہے جس میں تحریر ہے کہ دشمن کو شکست دینے کے لیے ہر حربہ استعمال کرنا چاہیے۔ یہ گویا اپنے عہد کا مکیاولی تھا یا مکیاولی اپنے عہد کا چانکیہ تھا۔

اشوک چندر گپت کے بعد اس کا بیٹا بندوسار تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد بھائیوں سے جنگ لڑ کر اس کا بیٹا اشوک سریر آرائے حکومت ہوا۔ اس کی رسم تاجپوشی ۲۶۹ ق م میں منائی گئی۔ اشوک نے اچھی تعلیم و تربیت اور فنون میں مہارت حاصل کی تھی۔ ٹیکسلا کی بغاوت فرو کرنے کے لیے بندوسار نے اسے ہی بھیجا تھا۔ اور اس نے نہایت ہوشیاری اور دانائی سے وہاں کے لوگوں پر اپنا اثر قائم کیا۔ بندوسار نے اسے ٹیکسلا کا حاکم بنا دیا۔ بعد میں وہ اجین کا صوبہ دار مقرر ہوا۔ ان عہدوں پر کام کرتے ہوئے اپنے حُسنِ انتظام اور خوش اسلوبی سے اپنے باپ کو متاثر کیا۔ اور وہ اُسے اپنا ولی عہد بنانے پر آمادہ ہو گیا۔ باپ کی وفات کے وقت وہ اجین کا حاکم تھا چنانچہ اس نے اپنی تخت نشینی کا اعلان اجین ہی سے کیا۔ بھائیوں نے مخالفت کی لیکن وہ غالب آیا۔ اشوک کی طبیعت تیز تھی۔ اس نے جبر و استبداد سے حکومت کی رعایا پر سختی روا رکھی اور خود عیش و عشرت میں بسر کرتا رہا۔ شکار کا بہت شوقین تھا۔ توسیعِ سلطنت کی خاطر وہ جنگ کرنے پر آمادہ تھا لیکن جب اس نے کالنگا کی مہم بڑی کشت و خون کی لڑائی کے بعد سر کی تو اس کا دل موم ہو گیا۔ اور اس کی کایا پلٹ ہو گئی۔ ظلم جبر کی تیزی جاتی رہی، وہ رحم دل اور عادل بادشاہ بن گیا۔ شکار کا شوق جاتا رہا۔ اسے جانوروں پر رحم آنے لگا اور وہ انھیں ایذا دینے کو پاپ (گناہ) سمجھنے لگا، اس نے جنگ سے توبہ کر لی۔ اور اخلاقی اصولوں کے پرچار میں مشغول ہو گیا۔

کالنگا (اڑلیسہ) کا علاقہ مہاندی اور گوداوری کے دریاؤں کے درمیان مشرقی گھاٹ سے ملحق واقع ہے۔ اس جنگ میں ایک لاکھ آدمی مارے گئے۔ لاکھوں بچے یتیم اور عورتیں بیوہ ہو گئیں، ہزاروں گھرانے تباہ و برباد ہو گئے۔ کئی لاکھ قید ہوئے اور کئی ہزار قحط و وبا کا شکار ہو گئے۔ کالنگا کو فتح کر کے اشوک نے اپنی سلطنت کا صوبہ بنا لیا۔ فتح کی

خوشی تو ہونی چاہیے تھی لیکن اس جنگ نے اشوک کے دل کو بڑی ٹھیس لگائی، خونریزی اور تیغ زنی، بربادی اور تباہی نے اس کے دل کی تاریں ہلادیں۔ یتیم بچوں اور بیوہ عورتوں کی چیخ و پکار سے اس کا دل دہل گیا۔ اُسے جنگ سے نفرت ہو گئی۔ وہ سمجھنے لگا کہ اس قسم کی فتح ظلم ہے جو بے شمار انسانوں کے خون سے حاصل ہو۔ اس سے رعایا کے جسموں پر تو حکمرانی ہو سکتی ہے لیکن دلوں پر نہیں ہو سکتی۔ بادشاہ کی شان جسموں کو تسخیر کرنے میں نہیں بلکہ دلوں کے تسخیر کرنے میں ہے۔ دلوں کو فتح کرنے کے لیے راست بازی اور حق پرستی کی ضرورت ہے نہ کہ خون خرابے کی چنانچہ اس نے خون خرابے سے توبہ کرلی اور عہد کیا کہ آئندہ کبھی جنگ نہیں کرے گا۔ وہ بدھ مت کا کٹر عقیدت مند تھا، اس کے کتبوں میں بدھ دھرم کی مقدس کتابوں کے کئی اقتباسات ملتے ہیں۔

اشوک نے بدھ مذہب کو ہردلعزیز بنانے میں ہر ممکن کوشش کی اور اس کی اشاعت کے لیے مندرجہ ذیل تدابیر اختیار کیں۔ خود بدھ مذہب کا پیرو ہو گیا۔ بدھ مذہب کے اصول پتھر کے ستونوں، پہاڑوں کی چٹانوں، غاروں کی دیواروں اور لاٹھوں پر جگہ جگہ کندہ کرائے بدھ مت کو شاہی مذہب قرار دیا اور عوام بادشاہ کے مذہب کو اختیار کرنے لگے۔ خود بھکشو بن کر بدھ مت کے مقدس مقامات کی یاترا کی۔ ہزاروں بھکشوؤں کے ہمراہ مذہبی پرچار کے لیے مختلف مقامات پر گیا۔ کپل وستو، گیا اور کشی نگر کی زیارت کی۔

اشوک نے اپنے بھائی مہندرا اور بہن سنگامترا کو لنکا بھیجا۔ اسی طرح کئی بھکشو برما، شام، مصر، یونان، تبت، چین، منگولیا، جاپان وغیرہ ممالک کی طرف بھیجے۔ اس کی بیٹی بھی بھکشنی بنی اور نیپال میں بدھ مت پھیلانے کا باعث بنی۔ اشوک نے اپنی تخت نشینی کے اکیسویں سال بدھ دھرم کی تیسری کانفرنس منعقد کرائی۔ اس کا صدر یا پردھان اپاگپت تھا۔ اس کانفرنس کا مقصد بدھ علماء کے درمیان اختلافات دور کر کے متفقہ عقائد کا مجموعہ تیار کرنا تھا۔

اشوک کی سلطنت سب قدیم راجاؤں کے مقابلے میں بہت وسیع تھی۔ اس کے کتبوں کے مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی سلطنت کوہِ ہندوکش کی بلندی سے بنگال

تک اور کوہ ہمالہ سے میسور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس میں جنوبی ہند کا چھوٹا سا حصہ چھوڑ کر باقی تمام بھارت، پاکستان اور افغانستان شامل تھے۔

اس وسیع سلطنت کو اشوک نے پانچ صوبوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ٹیکسلا، اجین، نوسلی سولانگری اور پاٹلی پترا۔ یہ سب مرکزی حکومت کے ماتحت تھے بڑے صوبوں میں شاہی خاندان کے کمار حاکم تھے۔ اور چھوٹے صوبوں میں صوبہ دار، رعایا کے ساتھ نرم، رحمدلانہ اور ہمدردانہ سلوک ہوتا تھا۔

اشوک کے آخری دلوں میں اس کی مذہب نوازی بڑھ گئی۔ اس سلسلے میں وہ خزانہ لٹاتا رہا، آخر تخت چھوڑ دیا اور رہبہ تپ پرچار میں مصروف رہا۔ آخر کار ٹیکسلا میں وفات پائی کہا جاتا ہے کہ وہ ۲۳۲ ق م میں فوت ہوا۔ اس نے اکتالیس سال حکومت کی۔

بدھوں، ہندوؤں اور جینیوں کی متفقہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اشوک کی بے شمار بیویاں اور بہت سی اولاد تھی لیکن اس کے جانشینوں کے حالات نہیں ملتے۔

اشوک کی وفات کے بعد اس کی سلطنت پارہ پارہ ہوگئی اور طوائف الملوکی پھیل گئی۔ موریا خاندان کے آخری بادشاہ بیر مہدرت کو اس کے سپہ سالار پشیہ مترا سنگا نے ۱۸۴ ق م میں قتل کر کے سنگا خاندان کی بنیاد رکھی۔

کشان خاندان

کنشک کا عہد

موریا خاندان کے بعد سنگا، کنوا اور اندھرا خاندانوں نے سلطنت کی، لیکن ان کے تفصیلی حالات معلوم نہیں۔ ان کے بعد چند خانہ بدوش قبائل نے حملہ کیا۔ ان میں یوح چی کے کش قبیلے نے شہرت حاصل کر کے کشان خاندان کی سلطنت قائم کی، اس کا تیسرا بادشاہ کنشک تھا۔

کنشک نے کاشغر سے نربدا تک اور کابل سے متھرا تک سلطنت بڑھائی، اس نے بُدھ مذہب اختیار کر کے مہایان فرقے کی سرپرستی کی۔ اس کے عہد میں علم و فن نے کافی

ترقی کی۔

کنشک نے مہایانہ بدھ مت کو فروغ دیا۔ اس فرقے نے بدھ مت میں رسومات، بتوں کی پوجا اور بدھ کی پرستش کا اضافہ کر دیا۔

گپت خاندان کی حکومت

کنشک کے بعد تین سو سال تک کے حالات معلوم نہیں کئی خانہ انوں کے افراد مختلف حصوں میں حکومت کرتے رہے یہاں تک کہ گپتا خاندان نے حکومت کی۔ اس خاندان کی سلطنت کی بنیاد چندر گپت اول نے ڈالی۔ اس نے پاٹلی پترا پر قبضہ کیا، اپنا سکہ اور گپت سمت چلایا۔

چندر گپت اول کے بعد اس کا بیٹا سمدر گپت راجہ بنا، وہ بڑا بہادر اور فاتح تھا اس نے فتوحات سے اپنی سلطنت ہمالیہ سے نربدا اور ہگلی سے چنبل تک پھیلائی اور بیرونی ممالک سے تعلقات قائم کیے۔

سمدر گپت کے بعد چندر گپت بکر مادتیہ تخت نشین ہوا۔ اس نے شاک قوم کے حکمرانوں کو شکست دی۔ اور بحیرۂ عرب تک سلطنت بڑھائی۔ کئی بندرگاہوں پر قبضہ کر لیا۔ اس کے زمانے میں تجارت کو بڑا فروغ ہوا۔ اسی کے زمانے میں چینی سیّاح فاہیان آیا۔

فاہیان نے اس دَور کے معاشرتی، تمدّنی، سیاسی اور مذہبی حالات اپنے سفرنامے میں تفصیل سے لکھے ہیں۔

گپت دور میں معاشرتی، تجارتی، مذہبی اور علمی ترقی نمایاں طور پر ہوئی۔ یہ عہد ہندوؤں کا سنہری عہد کہلاتا ہے۔

گپت دَور کے آخری ایام میں ہنوں نے حملہ کیا۔ اس ظالم قوم کی سفاکانہ یورشوں سے گپت سلطنت متزلزل ہو گئی۔ اور برصغیر میں پھر انتشار پیدا ہو گیا۔

ھنوں کی یورش

ہُن قوم شمالی مغربی چین میں رہتی تھی۔ اسے وہاں کے یوح چی کے خانہ بدوش قبائل نے نکالا۔ اور وہ تلاشِ رزق میں دو شاخوں میں بٹ کر آگے بڑھ گئی۔ ایک شاخ ترکستان

پہنچی جو بعد میں سفید ہن کہلائی۔ اس نے ۴۸۴ء میں شاہِ ایران کو شکست دے کر ایران پر قبضہ کر لیا۔ دوسری شاخ یورپ کی طرف گئی۔ سفید ہن نے برصغیر پاک و ہند پر حملے کر کے گپتا خاندان کا عروج ختم کر دیا۔ اور دوسری شاخ نے اٹیلا کی سرکردگی میں یورپ پر حملہ آور ہو کر رومی سلطنت کی شان زائل کر دی۔

سفید ہن نے کوہ ہندوکش پار کر کے افغانستان اور گندھارا کے علاقے پر یلغار کی اور وہاں کشان خاندان کی جو بچی کھچی سلطنت تھی اسے ختم کیا اور گندھارا پر قبضہ کر لیا یہاں سے گپت سلطنت کے علاقوں پر حملے شروع کر دیے۔ پہلا حملہ ۴۵۰ء میں کیا جسے سکندا گپت نے روک کر ہنوں کو بھگا دیا۔ ۴۶۶ء میں انھوں نے تورمان کی سپہ سالاری میں گپت سلطنت پر دوبارہ حملہ کیا۔ یہ حملہ تیز تھا اور سکندا گپت اس وقت اپنے بھائی کے ساتھ لڑ رہا تھا اس لیے وہ یکسوئی سے ہنوں کے حملے کو نہ روک سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہنوں نے سکندا گپت کو شکست دی اور مالوہ اور وسطِ ہند کے علاقوں پر قابض ہو گئے۔ تورمان نے اپنا سکہ رائج کیا۔ ان سکوں کے چند نمونے دستیاب ہوئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ تورمان آفتاب پرست تھا اور اس نے مالوہ فتح کرنے کے بعد اپنا لقب مہاراجہ ادھیراج رکھ لیا تھا تورمان نے ایک سال حکومت کی لیکن اس عرصے میں پنجاب، راجپوتانہ اور مرکزی سندھ نے اسے تسلیم کر لیا تھا۔ تورمان کا دور ۵۰۰ء سے ۵۱۰ء تک رہا۔

ہنوں کے حملے سے برصغیر کی تاریخ پر غیر معمولی اثرات پڑے۔:

گپت خاندان کی سیاسی سطوت ختم ہو گئی۔ ان کی شاندار معاشرتی اور تمدنی روایات جاتی رہیں۔

مرکزی حکومت جاتی رہی اور برصغیر کی سرزمین پھر چھوٹے چھوٹے حصوں میں بٹ گئی اور کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں پیدا ہو گئیں۔ اتحاد پھر پارہ پارہ ہو گیا۔

راجے خود مختار ہو گئے اور ان کی باہمی مشاورتی مجلسوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

ہندوؤں کی قدیم قومی اور مذہبی روایات کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

پچاس ساٹھ سال کے عرصے تک برصغیر میں طوائف الملوکی سی رہی اور اس کی تاریخ پر

اندھیرا سا چھایا رہا۔ اور حالات میں ایسی پراگندگی آئی کہ پھر کسی زبردست بادشاہ کی ضرورت تھی جو ان حصوں بخروں کو باہم جوڑ کر متحد کر دے۔

ہن لوگ اسی برصغیر میں مختلف علاقوں میں چھوٹے چھوٹے قلعے بنا کر آباد ہو گئے اور رفتہ رفتہ ہندومت اختیار کر کے آریا خاندانوں کے ساتھ رشتے ناطے کرنے لگ گئے ان تعلقات کی بنا پر ایک نئی ملی جلی نسل پیدا ہو گئی جن سے کئی راجپوتوں کے خاندانوں کی تشکیل ہوئی۔ ہنوں کا ایک خاندان میر تھا اس کے نام پر اجمیر جیسلمیر وغیرہ مقامات کے نام پڑے۔

ہرش کا عہد فرمانروائی

ہنوں کے حملے کے بعد برصغیر میں طوائف الملوکی پیدا ہو گئی۔ سرزمین چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گئی جن میں سے پنجاب، تھانیسر، قنوج، مگدھ، بنگال، مالوہ اور ولبھی مشہور تھیں۔

۶۰۵ء میں تھانیسر کے تخت پر ہرش وردھن بیٹھا۔ اس نے بنگال، مالوہ، ولبھی وغیرہ فتح کر کے پھر ایک وسیع عظیم الشان سلطنت قائم کر لی اور نظام سلطنت کو مستحکم کیا۔ ہرش، علم پرور اور مذہبی آدمی تھا۔ اس کے زمانے میں علم و تعلیم نے خوب فروغ حاصل کیا اور مذہب مہایانہ بدھ مت کی اشاعت ہوئی۔

ہرش کے عہد میں چینی سیاح ہیون سانگ برصغیر میں آیا اور پندرہ سترہ سال رہا۔ اس نے اپنے سفرنامے میں اس وقت کے حالات لکھے ہیں۔ جو تاریخی لحاظ سے بڑے مفید ہیں۔

ہرش کے بعد ہندومت کی تحریکِ احیا نے فروغ حاصل کیا جس کا سہرا بہت سے ہندو فلسفیوں اور مذہبی عالموں کے سر ہے انھوں نے اس کی تبلیغ میں پوری کوشش کی شنکر اچاریہ، مادھو اچاریہ، رام نوج اور کمار بھٹ وغیرہ مشہور عالم اور مبلغ ہیں۔

راجپوتوں کا دورِ حکومت

ہرش کے بعد اس برصغیر میں مرکزی حکومت ختم ہو گئی۔ اور ہر طرف ابتری پھیل گئی۔ برصغیر میں بے شمار چھوٹی چھوٹی ریاستیں پیدا ہو گئیں جو آپس میں مستقل طور پر برسرپیکار رہتیں۔ اس دور کی بدامنی سے ایک بہادر قوم راجپوت نے بہت فائدہ اٹھایا اور برصغیر کے شمال و جنوب میں اپنی مختلف سلطنتیں قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے اور ان کا زور یہاں تک بڑھا کہ تقریباً چھ سو

سال تک اس برصغیر میں ہر طرف انہی کا طوطی بولتا رہا۔ ان کا عروج سنہ ۶۵۰ء میں ہوا اور سنہ ۱۲۰۰ء تک رہا۔ یہ زمانہ اس برصغیر کی تاریخ میں راجپوتوں کے زمانے کے نام سے مشہور ہے کیونکہ اس دور میں یہ ہر طرف غالب تھے۔

بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ راجپوت اس برصغیر کے اصلی باشندوں میں سے تھے۔ وہ اصل میں دکن اور وسط ہند کے قدیم ہندی قبیلے بھیل اور گونڈ وغیرہ سے تھے جو بعد میں سیاسی اقتدار حاصل کر کے راجپوت کہلانے لگے۔ مثلاً بندیل کھنڈ کے چندیل راجپوت اصل میں گونڈ نسل سے ہیں۔

بعض مغربی مؤرخین کی رائے ہے کہ راجپوت ان بیرونی حملہ آور قوموں کی نسل سے ہیں جو اس برصغیر میں آ کر آباد ہو گئیں اور آریا خاندانوں سے رشتے ناطے کر لیے مثلاً سیتھین ہن اور شاک وغیرہ۔ ان کی مخلوط نسل سے جو لوگ ریاستیں قائم کر کے تخت و تاج حاصل کر گئے وہ راجپوت کہلائے اور جو تخت و تاج حاصل نہ کر سکے اور دوسروں کے مقابلے میں ادنیٰ سے خاندان کی صورت میں رہ گئے وہ جاٹ اور گوجر کہلائے۔

شمالی برصغیر میں راجپوتوں نے کئی ریاستیں قائم کر رکھی تھیں۔ ان میں سے اہم یہ تھیں۔ راجہ ہرش کے زمانے میں قنوج دار الحکومت تھا۔ ہرش کی وفات کے بعد قنوج کی سلطنت کے حصے بخرے ہو گئے۔

گوجر بہار خاندان کے بعد سنہ ۱۰۹۰ء میں راٹھور خاندان برسر اقتدار آیا۔ یہ خاندان ایک سو سال تک قنوج پر قابض رہا۔ اسی خاندان کا راجہ جے چند تھا جسے محمد غوری نے شکست دے کر قنوج پر قبضہ کیا تھا۔

اجمیر میں چوہان خاندان حکمراں تھا۔ اسی خاندان کا ایک مشہور راجہ پرتھوی راج تھا اس کا نانا اننگ پال دہلی پر حکمراں تھا، چونکہ اس کا کوئی بیٹا نہ تھا اس لیے اس نے پرتھوی راج کو متبنیٰ بنا کر دہلی کی ریاست بھی اسی کو دے دی۔ اس سے جے چند والیٔ قنوج بڑا تلملایا۔ اس نے پرتھوی راج پر حملہ کیا لیکن شکست کھائی۔ بعد میں ان دونوں راجوں میں خصومت بڑھ گئی۔ پرتھوی راج بڑا طاقتور راجہ تھا۔ سنہ ۱۱۹۲ء میں ترائن کے مقام پر محمد غوری نے اس کے ساتھ

جنگ کر کے فتح پائی۔ پرتھوی راج اس جنگ میں کام آیا۔

دہلی میں راجپوتوں کا تنوار خاندان قابض تھا۔ اس خاندان کا آخری راجہ اننگ پال تھا۔ پرتھوی راج والیٔ اجمیر اس کا نواسہ تھا۔

اس دور میں مغربی پاکستان اور کابل کا تمام علاقہ ایک ہندو حکمران کے ماتحت تھا۔ یہاں راجپوتوں کے ہندو شاہی خاندان کا اقتدار تھا۔ اسی خاندان کے راجہ جے پال سے غزنویوں کی مڈبھیڑ رہی اور آخر محمود غزنوی نے جے پال کو شکست دی اور وہ ندامت سے چتا میں بیٹھ کر زندہ جل مرا۔ اس کے بعد انند پال راجہ بنا۔ اس کے ساتھ بھی جنگیں ہوتی رہیں۔ محمود غزنوی نے اس خاندان کا آخر خاتمہ کر دیا اور ان کا سارا علاقہ اپنی سلطنت میں ملا لیا۔

بگھیل کھنڈ کا علاقہ پہلے کالاچری کہلاتا تھا۔ اس میں رتن پور اور جبل پور کے ضلعے شامل تھے۔

جمنا اور نربدا کے درمیان کا علاقہ بندیل کھنڈ کہلاتا ہے۔ راجپوت دور میں اس پر چندیل خاندان حکمراں تھا۔ اس علاقے میں کالنجر اور مہوبا بہت مشہور شہر تھے۔ اس ریاست کو ۱۲۰۳ء میں قطب الدین ایبک نے فتح کر کے اسلامی حکومت میں شامل کر لیا اور اس طرح چندیل خاندان کا اقتدار ختم ہو گیا۔

نویں صدی عیسوی میں مالوہ پر پرمار خاندان کے اگنی کل راجپوت حکمراں تھے۔ راجہ بھوج اسی خاندان کا مشہور راجہ تھا۔ جو ۱۰۱۰ء سے ۱۰۶۰ء تک برسر اقتدار رہا۔ اس کی بہادری، علمیت اور شاعری بہت مشہور ہے۔ اس نے سنسکرت میں کئی کتابیں تصنیف کیں۔ اس کے عہد میں علم و ادب خصوصاً زبان سنسکرت کو خوب فروغ ہوا۔ بھوج پور اور مالوہ کی سرسوتی مندر یونیورسٹی اسی کے کارنامے ہیں۔ یہ ریاست آخر ۱۳۳۲ء میں مسلمانوں کے قبضے میں آ گئی۔

میواڑ کی ریاست راجپوتانہ میں تھی۔ اس پر سسودیا خاندان کے راجپوتوں کی حکمرانی تھی۔ بپا راول اس خاندان کا مشہور اور طاقتور راجہ تھا۔ راناسانگا اور رانا پرتاپ اسی خاندان سے تھے۔ اس خاندان کے لوگ سورج بنسی راجپوت کہلاتے ہیں۔

گجرات کاٹھیاواڑ کو پرانے زمانے میں سوراشٹر کہا جاتا تھا۔ جب گپت خاندان کا اقتدار زائل ہوا تو یہاں گوجر آباد ہو گئے۔ ان کے تعلق سے یہ علاقہ گجرات کہلانے لگا۔ ان گوجروں نے ولبھی میں سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ ولبھی خاندان کے بعد چاوہ خاندان برسرِ اقتدار آیا۔ اس خاندان کا خاتمہ سنہ ۹۶۱ء میں ہوا۔ اور مولراج نے سلونکی خاندان کی بنیاد ڈالی۔ اسی خاندان کے دوسرے راجہ بھیم کے عہدِ حکومت میں محمود غزنوی نے سومناتھ پر یلغار کی تھی۔ سنہ ۱۲۴۲ء میں یہ خاندان ختم ہوا۔ اور ریوا کے بگھیلے گجرات پر قابض ہو گئے۔ انھیں وہاں سے مسلمانوں نے شکست دی اور گجرات سلطنتِ اسلام کا جزو بن گیا۔

آٹھویں صدی عیسوی میں سورج بنسی راجپوت راجہ گوپال نے بنگال اور بہار فتح کر کے پال خاندان کا اقتدار قائم کیا۔ اس کے جانشینوں میں سے دھرم پال، دیوپال اور مہی پال مشہور ہیں۔ یہ خاندان بڑی مدت تک حکمراں رہا۔ اسکے عہد میں بدھ مت، علم و ادب اور فنونِ لطیفہ کو کافی ترقی ہوئی۔ مہی پال کے بعد سین خاندان بنگال پر قابض ہوا۔ اس خاندان کے لوگ ہندو تھے اس لیے ہندو مت نے فروغ پایا۔ بارھویں صدی عیسوی میں سین خاندان سے بختیار خلجی نے بنگال اور بہار فتح کر کے وہاں اسلامی حکومت کا جھنڈا گاڑا۔

بختیار خلجی نے صرف بنگال اور بہار ہی کو فتح نہیں کیا بلکہ تبت تک بڑھتا چلا گیا۔ کوئی طاقت ایسی نہ تھی جو اسے روک سکتی۔

امر واقعہ یہ ہے کہ مؤرخوں نے بختیار خلجی کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ تاریخ کے صفحات میں اسے اب تک وہ جگہ نہ مل سکی جس کا بجا طور پر یہ سزاوار اور مستحق تھا۔ اس کی حیثیت صرف یہ تھی کہ یہ سلطان شہاب الدین غوری کا غلام تھا۔ اسلام کی تاریخ غلاماں ایسی شخصیتوں کے احوال و سوانح کا مرقع پیش کرتی ہے جن کی مثال دنیا کی دوسری قومیں پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ شہاب الدین غوری کا یہ غلام جب میدانِ جنگ میں وارد ہوا تو اس نے اپنے فتوحات اور لازوال کارناموں سے اس عظیم ملک کی قسمت بدل دی۔ اور ایسے خطے میں اس نے ایک مضبوط حکومت

قائم کرلی جہاں ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ بھی اس کارنامے کا انجام دینا آسان نہ تھا۔ حالانکہ اس کے ساتھ تو ایک بہت معمولی سی فوج تھی۔

یہ موقع بختیار خلجی کے احوال و سوانح اور حربی کارناموں کی تفصیل کا نہیں ہے۔ ضروری تفصیل اپنے موقع پر آئے گی۔ اس جگہ بس اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ بختیار خلجی نے کشور کشائی اور فتوحات کے ایک نئے اور شاندار دور کا آغاز کیا۔ آگے چل کر ہندوستان کے مسلمان فرمانرواؤں نے اس سے متمتع ہونے میں زیادہ سے زیادہ ہوشمندی کا ثبوت دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی اس رقبے کے بڑے حصے پر مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ یہ حصہ "مشرقی پاکستان" کے نام سے معروف ہے۔

سولھویں منزل

اسلامی ہند

ہندوستان پر عربوں کا عہدِ فرماں روائی

سندھ پر عربوں کی یلغار

سندھ دنیا کے قدیم ترین خطوں میں سے ہے۔ یہاں کے آثارِ قدیمہ اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ سن عیسوی کی ابتدا سے کئی ہزار سال پہلے بھی یہ خطہ تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا۔ اس زمانے کی تہذیب و تمدن کے نقوش سکّوں، برتنوں اور عمارتوں کی صورت میں اب تک موجود ہیں۔

زمانے کے تغیرات اس سرزمین پر بھی کارفرما رہے۔ آریوں سے پہلے اس سرزمین پر کون قوم آباد تھی اس بارے میں اب تک کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ آریوں نے یہاں آ کر دریائے سندھ کے کنارے ڈیرا ڈالا ان کی زبان میں دریا کو سندھو کہتے تھے چنانچہ نہ صرف دریا بلکہ یہ پورا علاقہ سندھو کے نام سے مشہور ہوا۔ جو بعد میں سندھ بنا۔ یہی سندھ پھر ہند کہلایا پھر یہ اند۔ اند سے اندیا اور اندیا سے انڈیا ہو گیا۔ آریہ پنجاب کی سرحد سے بھی آگے نکل گئے لیکن سندھ کا نام قائم رہا۔ پھر جب انھوں نے گنگا پر پہنچ کر دم لیا تو اس ملک کا نام آریہ ورت رکھ دیا۔

سندھ کے حدود اربعہ میں ہر نئی حکومت تبدیلی کرتی رہی یہاں کا آخری ہندو راجہ داہر تھا جسے شکست دے کر عربوں نے اس ملک پر قبضہ کر لیا۔ داہر کے زمانے میں موجودہ صوبہ سرحد، پنجاب، افغانستان کا کچھ حصہ بلوچستان، ریاست کچھ اور جودھپور کی سرحد تک

مع اپنے موجودہ رقبے کے شامل تھا۔ سندھ کا موجودہ رقبہ ۴۸۴۴۵ میل ہے۔ سندھ کے دو حصے ہیں ایک زیریں دوسرا بالائی۔ انھیں شمالی جنوبی سندھ بھی کہتے ہیں۔ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق یہاں کی آبادی چالیس لاکھ کے قریب تھی جس میں پچھتر فیصدی کے قریب مسلمان اور بقیہ ۲۵ فیصدی میں دوسری قومیں شامل تھیں۔ سندھ کی شادابی، زرخیزی اور رونق میں دریائے سندھ کو زبردست دخل ہے۔ سندھ کی خاص پیداوار گیہوں اور روئی ہے یہاں کا موسم بہت سخت ہے سردی میں بھی اور گرمی میں بھی۔ کراچی کا موسم نسبتاً معتدل ہے حیدر آباد کی آب و ہوا بہت اچھی ہے۔ جیکب آباد میں سب سے زیادہ گرمی پڑتی ہے۔

اونٹ، گھوڑے، گائے اور بیل اچھی نسل کے ہوتے ہیں۔

داہر کے زمانے میں اس ملک کا حدود اربعہ یہ تھا:

۱: شمال مشرق کی طرف سندھ کی سرحد کشمیر سے ملی ہوئی تھی۔

۲: جنوب مغرب کی طرف مکران کا صوبہ حدِ فاصل کا کام دیتا تھا۔

۳: مغرب کی جانب کوہستان کرمان اور قلات واقع تھا۔

۴: جنوب میں بحرِ عرب کے مشرقی جانب ریگستان اور ہندوستان تھا۔

داہر کے زمانے میں سندھ کے پانچ صوبے تھے:

۱: برہمن آباد ۲: سیوستان ۳: اسکلندہ ۴: ملتان ۵: ارور

یہاں کی عام آبادی داہر کے زمانے میں زیادہ تر بدھ مت کی پیرو تھی۔ لیکن برسرِ اقتدار طبقہ زیادہ تر برہمنوں پر مشتمل تھا۔

سندھ فتح ہو گیا

راجہ داہر اور محمد بن قاسم کی فیصلہ کن جنگ

اسلامی رواداری، عالی ظرفی اور بلند حوصلگی کی شاندار مثال

برہمن آباد اور اروڑ کی فتح ۶۶۰ء (۴۰ھ) میں راجہ چچ چالیس سال حکومت کرنے کے بعد رخصت ہو گیا۔ چچ کے بعد اس کا بھائی چندر تخت نشین ہوا۔ لیکن یہ زیادہ دنوں زندہ نہ رہا، صرف آٹھ سال حکومت کرنے کے بعد مر گیا۔ ۶۶۸ء (۴۸ھ) میں چچ کا چھوٹا لڑکا داہر تخت نشین ہو گیا۔

داہر نے ایک منجم کو اپنا ہاتھ دکھایا۔ ہاتھ دیکھ کر اس نے کہا کہ تمھاری بہن تو بڑی نصیبہ ور لڑکی ہے۔ جو اس سے شادی کرے گا وہ بھی بڑا اقبال مند ہوگا اور سارے سندھ پر حکومت کرے گا۔ وزیر نے راجہ کو بہن سے شادی کرنے کا مشورہ دیا۔ راجہ نے تھوڑے تامل کے بعد یہ مشورہ قبول کر لیا۔ بڑے بھائی کو یہ خبر ہوئی تو وہ فوج لے کر چڑھ دوڑا۔ لیکن کچھ نہ کر سکا۔

سندھ پر اصلی اور باقاعدہ حملہ حجاج بن یوسف کے زمانے میں ہوا۔

عرب تاجر دنیا کے مختلف ممالک میں کاروبار کے سلسلے میں جایا کرتے تھے یہ تاجر اپنے ساتھ مالِ تجارت بھی لے کر جاتے تھے اور دولتِ ایمان بھی۔ یہ جہاں جاتے تھے اپنی سیرت

اپنے کردار، اپنے اخلاق اور اپنی اسلامیت کا ایسا گہرا نقش قائم کر دیتے تھے کہ جو لوگ تہذیبی، ذہنی اور مذہبی اعتبار سے ان سے بالکل الگ ہوتے تھے وہ بھی ان کا احترام کرنے پر اپنے تئیں مجبور پاتے تھے۔

لنکا میں ایک عرب تاجر کا انتقال ہوا اس کے گھر کی عورتوں اور بچّوں کو وہاں کے راجہ نے عزت و احترام کے ساتھ ایک جہاز میں بٹھایا اور روانہ کر دیا۔ وہ جہاز جب سندھ کی بندرگاہ دیبل میں پہنچا تو بحری قزاقوں نے اسے لوٹ لیا اور جہاز کے مسافروں کو گرفتار کر لیا۔

یہ خبر جب حجاج کو پہنچی تو اس کی عربی حمیت جوش میں آئی۔ اس نے راجہ داہر کو ایک خط لکھا اور تلافیٔ مافات پر آمادہ کیا۔ داہر پندار و نخوت کے مرض میں مبتلا تھا اس نے جواب دیا یہ قزاق میرے بس سے باہر ہیں میں کچھ نہیں کر سکتا۔

داہر کے ہاں سے جب حجاج کی سفارت ناکام واپس آئی تو اس نے طے کر لیا کہ اس تنازعہ کا آخری اور قطعی فیصلہ تلوار کرے گی۔

حجاج بن یوسف ثقفی کا حکم پا کر محمد بن قاسم ایک لشکر لے کر جو چھ ہزار افراد پر مشتمل تھا سندھ کی طرف عازم ہوا۔ محمد بن قاسم خشکی کے راستے سے سندھ کی طرف بڑھا۔ جہازوں پر ساز و سامانِ جنگ بار کیا۔ اور دیبل روانہ کر دیا۔

محمد بن قاسم چھ ماہ تک شیراز میں مقیم رہا۔ وہاں سے مکران آیا پھر آگے بڑھتا ہوا موجودہ ریاست لس بیلا کے پایہ تخت ارمن بیلا پر حملہ آور ہوا۔ یہاں سے وہ دیبل پہنچا۔ یہ سندھ کی سب سے زیادہ کار آمد اور مشہور بندرگاہ تھی۔ ایران، عراق، عرب اور افریقہ کے جہاز یہیں لنگر انداز ہوا کرتے تھے۔ دیبل بدھوں کا بہت بڑا اور مشہور عبادت کدہ تھا اس میں یوں تو بہت سی مورتیاں تھیں لیکن سب سے بڑی مورتی مہاتما بدھ کی تھی ۹۲ھ میں محمد بن قاسم یہاں پہنچا۔ یہاں کے لوگ قلعہ بند ہو گئے مسلمانوں نے محاصرہ کر لیا۔ اپنے لشکر کے گرد مسلمانوں نے ایک خندق کھود دی تا کہ دشمن یک بیک حملہ کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔

دیبل کس طرح فتح ہوا؟

دیبل کا محاصرہ کئی ماہ تک جاری رہا جب وہاں کے باشندوں پر خواب و خور حرام ہو گیا تو تنگ آ کر وہ باہر نکلے۔ بڑی خونریز جنگ ہوئی۔ تین دن تک شہر کے اندر بھی جنگ جاری رہی۔ آخر رعایا نے امان طلب کی، لڑنے والوں نے ہتھیار ڈال دیے اور حاکم شہر روپوش ہو گیا۔

دیبل کی فتح کے بعد فتوحات کا دروازہ کھل گیا۔ یہاں سے پچھتر میل کے فاصلے پر ایک مقام نیرون تھا۔ محمد بن قاسم اپنی فوج لے کر آگے بڑھا۔ نیرون کا حاکم بدھ تھا۔ اس نے محمد بن قاسم سے صلح کر لی اور اس طرح اپنی جان بھی بچالی۔ اور اپنا منصب بھی۔ محمد بن قاسم نے اس کی بہت عزت افزائی کی۔ یہاں مسلمانوں نے ایک مسجد کی بنا ڈالی جہاں باقاعدگی کے ساتھ فرائض پنجگانہ ادا کیے جانے لگے۔ پھر وہ نیرون کے حاکم کو رہنما بنا کر سیوستان کی طرف بڑھا۔ یہاں کا حاکم ہندو تھا۔ اور رعایا بدھ۔ رعایا خونریزی اور جنگ و پیکار سے متنفر اور حاکم شہر لڑنے مرنے پر آمادہ۔ محمد بن قاسم نے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ منجنیق سے سنگ باری شروع کر دی، ایک ہفتے کے بعد جب حاکم شہر نے یہ دیکھا کہ وہ اس جنگ میں کامیاب نہیں ہو سکتا تو بھاگ کھڑا ہوا۔ شہریوں نے اطاعت قبول کر لی اور مسلمان قلعے پر قابض ہو گئے۔

سیوستان کے انتظامات روبراہ کرنے کے بعد محمد بن قاسم نے چند اور مقامات کو فتح کیا۔ اور سیبی[۱] کے قلعے کی طرف بڑھا۔ راستے میں ایک مقام ہلیان ملا۔ یہاں کا فرمانروا کاکا اپنے لوگوں سمیت مطیع ہو گیا۔ محمد بن قاسم نے کاکا کو خلعت سے سرفراز کیا۔ اپنے برابر کرسی پر جگہ دی۔ ریشمی لباس پہنا کر اس کے سر پر پگڑی باندھی۔ اس عزت افزائی نے کاکا اور اس کے ساتھیوں کے جذبۂ رفاقت کو دوچند کر دیا۔ یہاں سے فارغ ہو کر وہ سیبی پر حملہ آور ہوا سیوستان کا حاکم بجے رائے یہیں پر مقیم تھا۔ دو روز تک زوردار لڑائی ہوئی پھر بجے رائے جنگ میں ہلاک ہو گیا۔ رعایا نے امان مانگی اور اطاعت قبول کر لی۔ لوگوں نے

---

[۱] سیبی (جسے اس زمانے میں سیوی یا سیسم کہتے تھے) اب سندھ کی بجائے بلوچستان کا ایک حصہ ہے۔

ایک ہزار درہم خراج دینا منظور کر لیا۔

محمد بن قاسم کا نو مسلم سفیر

محمد بن قاسم نے ایک شامی سردار کے ساتھ ایک سندھی نو مسلم کو جس کا نام مولانا اسلامی تھا داہر کے پاس سفیر صلح بنا کر بھیجا۔

داہر نے پیچ و تاب کھا کر سوال کیا:

"تم کیا پیام لے کر آئے ہو؟"

مولانا نے اسلامی فوج کے ترجمان کی حیثیت سے جواب دیا۔

"اطاعت یا جنگ"

یہ الفاظ سن کر داہر سکتے میں آ گیا۔

وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ایک ہندو خاندان کا فرد مسلمان ہو جانے کے بعد اس طرح اس سے دو بدو گفتگو کر سکتا ہے اس نے اپنے وزیر سے مشورہ کیا۔

پھر داہر نے پناہ گزیں اور باغی عرب سردار علافی سے رائے لی جو عربوں کے پاس سے کٹ کر اس کے پاس مقیم تھا۔ پوچھا "تم کیا کہتے ہو؟"

مطلب یہ کہ عربوں اور ہندوؤں کی جنگ میں تم کس کا ساتھ دو گے؟

علافی نے بے تامل کہا۔

"میں زندگی کی آخری سانس تک آپ کے پہلو بہ پہلو لڑوں گا۔

اس جواب سے داہر کا حوصلہ اور بلند ہو گیا۔ اس نے برہمی اور آشفتہ مزاجی کے ساتھ سفارت کو مخاطب کیا۔

"ہم تمھاری کوئی شرط منظور نہیں کر سکتے۔ تلوار ہی ہمارا فیصلہ کرے گی۔"

سفارت داہر کا انکاری جواب لے کر محمد بن قاسم کے پاس واپس آ گئی۔

محمد بن قاسم کے سامنے اس وقت سب سے اہم سوال یہ تھا کہ دریا سے پار کیونکر اترا جائے

داہر اور اس کے سرداروں کی طرف سے پوری کوشش اس امر کی ہو رہی تھی کہ دریا

کا پار کرنا ناممکن بنا دیا جائے۔ قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی کر دی گئیں۔ محمد بن قاسم کو آگے بڑھنے سے پہلے دو مرحلے طے کرنا تھے۔ ایک تو یہ کہ اقدام سے پہلے ایسے انتظامات کر لیے جائیں کہ پیچھے سے کوئی حملہ نہ کر سکے۔ رسد کی فراہمی کا سلسلہ غیر منقطع طور پر جاری رہے اور دریا کو اس طرح پار کیا جائے کہ دشمن کی مزاحمت مجاہدوں کی پیش قدمی میں حارج نہ ہونے پائے۔ اس سلسلے میں محمد بن قاسم نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ اپنی احتیاطی تدبیروں سے دشمن کے لیے عقب سے حملہ آور ہونا ناممکن بنا دیا۔ پھر رسد کی فراہمی کے لیے راستہ کھلا رکھنے کے قابلِ اطمینان انتظامات کیے ان کاموں سے فارغ ہونے کے بعد دریا پار کرنے کے لیے اس نے کشتیوں کا پل بنایا اسی پل کے ذریعے مجاہدین ایک کنارے سے دوسرے کنارے پر بہ حفاظت اور بہ اطمینان پہنچ گئے۔

راجہ راسل کی شکستِ فاش

محمد بن قاسم کے سپاہی جب دریا پار کر کے دوسری طرف پہنچے تو راجہ راسل کے سپاہیوں نے حملہ کر کے ان کی پیش قدمی روکنی چاہی۔ راجہ راسل کو داہر نے خاص طور پر اس لیے بھیجا تھا کہ وہ محمد بن قاسم کو دریا پار نہ کرنے دے۔ محمد بن قاسم نے ایسی بے جگری سے تیر اندازی کی کہ راسل کے سپاہی تاب نہ لا سکے اور بھاگ کھڑے ہوئے مسلمان سپاہی تعاقب کرتے ہوئے آگے بڑھے اور بہت دور تک بڑھتے چلے گئے۔

داہر کے لڑکے کا قتل

راجہ داہر نے اپنے ایک بیٹے کی زیر کمان ایک آزمودہ کار فوج جنگ کے لیے بھیجی، ایک جھیل کے پاس، دونوں فوجوں میں آمنا سامنا ہوا۔ محمد بن قاسم ابھی پیچھے تھا، وہاں جو فوج تھی اس کی کمان عبداللہ ثقفی کے ہاتھ میں تھی۔ عربوں نے ایسا زبردست حملہ کیا اور اس طرح جی توڑ کر دشمن سے لڑے کہ بہت جلد اس جنگ کا خاتمہ بھی ہو گیا۔ ہندو عربوں کی یورش کی تاب نہ لا سکے۔ انھیں پسپا ہونا پڑا۔ داہر کا لڑکا اس جنگ میں ہلاک ہو گیا۔ شہزادے کی ہلاکت نے فوج پر اور زیادہ برا اثر کیا۔ اس کی ہمت ٹوٹ گئی اور وہ سر پر پاؤں رکھ کر

فرار ہو گئی۔

پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے!

محمد بن قاسم کے سیلِ فتوحات کو دیکھ کر سندھ کے متعدد راجاؤں نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ اب داہر کی قسمت کا پانسہ پلٹ چکا ہے اب سندھ پر مسلمان حکومت کریں گے۔ چنانچہ کئی راجہ بہ طیبِ خاطر اپنے مذہب پر قائم رہ کر محمد بن قاسم کے مطیع بن گئے محمد بن قاسم نے بھی ان کی ہمت افزائی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ ان کے اقتدار اور اختیار میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی۔ اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی وفاداری اور زیادہ مستحکم ہو گئی۔ اور وہ دل وجان سے داہر کا ساتھ چھوڑ کر محمد بن قاسم کے معاون اور مددگار بن گئے۔ بلکہ انھوں نے خط لکھ لکھ کر محمد بن قاسم کے ہاتھوں اپنے آپ کو گرفتار کرایا۔ تاکہ ان کے ہم قوم یہ نہ سمجھیں کہ انھوں نے غداری کی ہے۔ ایک بہت با اثر راجہ موکا اسی طرح گرفتار ہو کر عربوں کا دوست بنا تھا۔ اب راسل نے بھی اسی تدبیر پر عمل کیا۔

یکم رمضان المبارک ۹۳ھ کو داہر کی فوجوں سے جنگ شروع ہوئی۔ ۱۰ رمضان کو اس طرح ختم ہوئی کہ داہر ہلاک ہو گیا اس کی فوج راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہوئی بہت سے آدمی قتل ہوئے اور بہت سے گرفتار۔

جانبین کی فوجی تعداد کا اگر اندازہ لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ دونوں میں کوئی مناسبت ہی نہیں تھی۔ داہر کی فوج ساٹھ ہزار افراد پر مشتمل تھی اور مسلمانوں کی فوج صرف ساڑھے پندرہ ہزار۔ داہر کے پاس سامانِ جنگ حد سے زیادہ تھا۔ عربوں کی فوج داہر کے مقابلے میں اس اعتبار سے کافی فرومایہ تھی۔

داہر کے ہاتھی پورس کے ہاتھی ثابت ہوئے

داہر کی فوج میں ہاتھیوں کی بھی کثرت تھی۔ یہ سدھے ہوئے ہاتھی تھے اور اس لیے میدانِ جنگ میں لائے گئے تھے کہ دشمن کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالیں، خود راجہ داہر بھی سفید رنگ کے ہاتھی پر ایک زریں عماری میں بیٹھا تھا،

آس پاس خوش جمال باندیوں کے پرے کھڑے تھے۔ یہ باندیاں شراب کے جام اور پان کے بیڑے راجہ کی خدمت میں پیش کرتی جاتی تھیں۔

شروع شروع میں تو ہاتھیوں کا کوئی توڑ عربوں کی سمجھ میں نہیں آیا۔ لیکن محمد بن قاسم کی فراست نے یہ مشکل حل کر دی، اس نے بارودی آتش بازیاں ہاتھیوں پر چھوڑنا شروع کیں ہاتھی اس حربے کی تاب نہ لاسکے، اپنی فوج کو روندتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔

داہر جس ہاتھی پر سوار تھا ایک آتشیں گولہ اس پر بھی پڑا۔ کھال جل گئی۔ سوزش سے گھبرا کر وہ الٹے پاؤں بھاگا۔ لاکھ لاکھ اسے روکنے کی کوشش کی گئی مگر اس نے میدانِ جنگ کا رخ نہ کیا۔

داہر کام آگیا داہر ذاتی طور پر بڑا بہادر آدمی تھا۔ وہ غصے میں ہاتھی سے اتر پڑا۔ اور پاپیادہ تلوار لے کر لڑنے لگا۔ اسے اس رنگ میں دیکھ کر اس کے سپاہی بھی جانبازی کے جوہر دکھانے لگے۔ لیکن عربوں کے آگے ایک نہ چلی۔ لڑتے لڑتے ایک عرب کے ہاتھ سے داہر قتل ہوا۔ راجہ کا قتل اتنا بڑا سانحہ تھا کہ فوج کے چھکے چھوٹ گئے۔ وہ بھی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگی۔

داہر کی رانی داہر کی شکست کے بعد اس کا بیٹا جے سنگھ راور میں جنگی تیاریاں کرنے لگا۔ لیکن اس کے وزیر نے مشورہ دیا کہ بہترین تیاری برہمن آباد میں ہو سکتی ہے۔ وہاں کا خزانہ بھرپور ہے اور رعایا بھی مطیع ہے، اناج کی بھی کمی نہیں اور یہاں سے فاصلے پر بھی ہے۔

بات جے سنگھ کی سمجھ میں آگئی، وہ راور کا بہت سامال و اسباب لے کر برہمن آباد چلا گیا۔

وہ مسلمان عورتیں جنھیں قزاقوں نے گرفتار کرلیا تھا اب محمد بن قاسم کی فوجیں برہمن آباد کی طرف تزک و احتشام کے ساتھ روانہ ہوئیں۔

لیکن برہمن آباد اس وقت تک پہنچنا ناممکن تھا جب تک بہرور اور دہلیلہ کے قلعے

نہ فتح کر لیے جاتے ۔ یہ راستے میں پڑتے تھے اور ان سے بغیر گزرے برہمن آباد پہنچنا ناممکن تھا۔

آخر یہ فیصلہ ہوا کہ ان دونوں قلعوں کو سر کر لیا جائے، ان قلعوں کے رہنے والوں نے بڑے مکمل طور پر جنگی تیاریاں کر رکھی تھیں ۔ محمد بن قاسم نے محاصرہ کر لیا، قلعہ والے محاصرہ سے عاجز ہو کر باہر نکل کر لڑے اور ہار گئے ۔ ان قلعوں میں بہت سامان غنیمت ملا جس کا پانچواں حصہ حسب معمول کوفہ اور وہاں سے دمشق بھیج دیا گیا۔

جب تک داہر زندہ رہا سی ساکر وزیر اس کا معتمد رہا۔ داہر کے بعد اس کے بیٹے کو صلاح و مشورہ دیتا رہا۔

لیکن اب سی ساکر بھی ہمت ہار گیا۔

اس نے محمد بن قاسم سے امان طلب کی ۔ محمد بن قاسم نے اسے امان دے دی۔

سی ساکر محمد بن قاسم کے حضور میں حاضر ہوا ۔ یہاں اس کی بڑی قدر و منزلت ہوئی۔

محمد بن قاسم سے امان حاصل کرنے کے بعد سی ساکر نے ایک عجیب و غریب تحفہ اس کی خدمت میں پیش کیا۔

وہ عورتیں ـــــ جو لنکا سے چل کر دیبل پر گرفتار کر لی گئی تھیں۔

یہ وہی عورتیں تھیں جن کے ناموس اور حرمت کی خاطر جنگ شروع ہوئی تھی۔

محمد بن قاسم نے اس تحفے کو بڑی مسرت اور شکر گزاری کے ساتھ قبول کیا۔ ان عورتوں کو ان کے وطن بھیج دیا اور خود حسب معمول اپنے فرائض کے ادا کرنے میں مصروف و منہمک ہو گیا۔

سی ساکر ڈرتا ڈرتا مسلمانوں کے لشکر میں آیا تھا لیکن یہاں اس کی توقع سے زیادہ اس کے ساتھ حسن سلوک اور تالیفِ قلب کا برتاؤ کیا گیا۔ یہاں تک کہ محمد بن قاسم نے اسے اپنا مشیر خاص بنا لیا۔

یہاں کئی ماہ تک مسلمان لشکر ستایا، پھر اس نے برہمن آباد کا رخ کیا۔

برھمن آباد محمد بن قاسم نے فتح کیا

انھوں نے بہت جلد یہ اندازہ کرلیا کہ جنگ جاری رکھنے کی صورت میں جان و مال کے زیاں کے سوا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ چنانچہ معززین شہر نے ایک مجلس مشاورت میں طے کیا کہ محمد بن قاسم سے معاہدہ کرلیا جائے۔ چنانچہ محمد بن قاسم کو پیام بھیجا گیا کہ ہم باہر بہ ظاہر جنگ کے لیے نکلیں گے لیکن جلد پسپا ہو جائیں گے۔ پسپا ہوتے وقت قلعہ کا دروازہ کھلا چھوڑ دیں گے آپ شوق سے تشریف لے آئیے۔

محمد بن قاسم تک جب یہ پیام پہنچا اس نے موکا سے مشورہ کرنے کے بعد جواب دیا کہ شہر کے تمام غیر جنگجو افراد کو امان دی جاتی ہے جو ہتھیار لے کر مقابلے کو آئے گا اسے ضرور قرار واقعی سزا دی جائے گی۔ برہمن آباد کے لوگ اپنی پیش کش پر قائم رہے، وہ جنگ کے لیے نکلے اور بہت جلد پسپا ہو گئے، ان کی پسپائی کے بعد بھی قلعے کا دروازہ کھلا رہ گیا۔ محمد بن قاسم کی فوج شہر میں داخل ہو گئی اور نعرۂ اللہ اکبر بلند کر کے اپنی آمد کا اعلان کر دیا۔

جیسے ہی مسلمان فوجیں برہمن آباد پر قابض ہوئیں محمد بن قاسم نے فرمان نافذ کردیا کہ مقابلہ صرف ان سے کیا جائے جو لڑنا چاہتے ہوں اور جو نہ لڑنا چاہتے ہوں ان سے ذرا بھی تعرض نہ کیا جائے۔ اس حکم کی بسر و چشم تعمیل ہوئی، پُرامن شہریوں کے جان و مال کو کسی نے نہیں چھیڑا۔ جن میں اب بھی لڑنے کا ولولہ تھا انھیں تھوڑی سی کوشش کے بعد گرفتار کرلیا گیا۔ ان گرفتارشدگان میں بھی جنھوں نے اطاعت قبول کرلی تھی، نہ صرف جان بخشی کی گئی بلکہ ان کی دولت و املاک اور جاگیر بھی واپس کر دی گئی۔

داہر کی رانی لاڈھی سے محمد بن قاسم کی شادی

داہر کی رانی لاڈی اب تک یہیں مقیم تھی بلکہ برہمن آباد کی جنگ جاری ہی اس کی وجہ سے تھی۔ اس نے بھاگے ہوئے سپاہیوں کو مجتمع کیا اور لشکر تیار کر کے جنگ جاری رکھی۔ لیکن اب مسلمان برہمن آباد پر قابض تھے۔ رانی لاڈھی گرفتار کرلی گئی۔ اسے عزت و آبرو کے ساتھ محل میں رکھا گیا۔ پھر محمد بن قاسم نے اسے

آزاد کیا، اور حجاج بن یوسف کی اجازت اور دربار خلافت سے استمزاج کے بعد اس سے شادی کرلی۔ اس کے بطن سے محمد بن قاسم کا ایک لڑکا بھی پیدا ہوا۔

عدیم المثال رواداری برہمن آباد پر قابض ہونے کے بعد محمد بن قاسم امور مالی و ملکی کے تنظیم و ضبط کی طرف متوجہ ہوا۔ اور اس نے وہی کیا جو عام طور پر دریادل اور وسیع القلب عرب فاتح کیا کرتے تھے اس نے ان سندھیوں کو جو مسلمان ہو گئے تھے وہی حقوق دیے جو عربوں کو حاصل تھے۔ کامل مساوات!

جو لوگ اپنے دھرم پر قائم رہے ان پر کوئی زیادتی نہیں کی گئی۔ نہ انھیں ترکِ مذہب پر مجبور کیا گیا بلکہ انھیں اپنے مذہب پر قائم رہنے کی جملہ سہولتیں فراہم کی گئیں۔ البتہ ان پر جزیہ عائد کیا گیا جس کی شرح بہت معمولی تھی۔ اتنی معمولی کہ ایک فقیر پر بھی وہ گراں نہیں گزر سکتی تھی، مالداروں اور دولت مندوں سے فی کس ۴۸ درہم سالانہ وصول کیے جاتے تھے۔ اوسط درجے کے لوگوں سے ۲۴ درہم سالانہ وصول کیا جاتا تھا۔ کم حیثیت کے لوگوں سے صرف تین درہم سالانہ، فقیروں، غریبوں اور معذوروں سے جزیہ بالکل نہیں لیا جاتا تھا۔ اس جگہ پر یہ بات بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ ایک درہم ہمارے سکے کی ایک چونی سے کچھ کم ہی مالیت رکھتا ہے۔

محمد بن قاسم نے:

۱: کسی غیر مسلم کی جائداد پر جبراً قبضہ اور تسلط نہیں کیا۔

۲: برہمنوں کو سابق حکومت میں جو حقوق و مراعات حاصل تھے وہ بغیر کسی کمی کے علیٰ حالہ قائم رکھے گئے۔

۳: علاوہ ازیں سرکاری خزانہ سے مزید ایک رقم خطیر برہمنوں کو وظائف میں جاری کی گئی۔

۴: جن شہریوں کے مال و اسباب کو دورانِ جنگ میں نقصان پہنچا تھا انھیں تلافی اور تاوان کے طور پر ایک لاکھ بیس ہزار درہم عطا کیے گئے تاکہ وہ اپنی حالت درست کرسکیں۔

۵: قلعہ کی حفاظت و نگہداشت کے لیے جو فوجی دستے مختلف دروازوں پر مقرر کیے گئے ان کا افسر برہمنوں کو بنایا گیا۔ ان میں سے ہر برہمن کو ایک ایک گھوڑا ساز و براق سمیت عطا ہوا۔ نیز اُن کے ہاتھوں اور پاؤں میں سونے کے کڑے پہنائے گئے اور مزید عزت افزائی یوں کی گئی کہ ان میں سے ہر ایک کو دربار میں بیٹھنے کے لیے کرسی بھی دی گئی۔

۶: مالگذاری وصول کرنے کا کام بھی انہی برہمنوں کے سپرد کیا گیا۔

۷: مالگذاری وصول کرنے والے برہمنوں کو محمد بن قاسم نے ہدایت کی کہ خبردار رعایا کے کسی فرد پر ٹیکس اور محصول وصول کرنے کے سلسلے میں ظلم و جبر سے کام نہ لیا جائے اور نہ اتنا محصول عائد کیا جائے جو قوت و طاقت سے زیادہ ہو۔

۸: جن برہمنوں کو سرکاری مناصب پر فائز کیا گیا انھیں یہ خدمت شخصی طور پر نہیں بلکہ موروثی طور پر تفویض کی گئی تاکہ ان کے دل میں اپنے منصب کے بارے میں شبہ نہ پیدا ہو کہ یہ عزت وقتی اور عارضی ہے۔

اس رواداری، عادلانہ اور شریفانہ طرز عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ برہمن جو سختی سے اپنے دھرم پر قائم تھے قریہ قریہ دیہات دیہات اور بستی بستی گھوم کر عوام کو تلقین کرنے لگے کہ وہ اس نئی مسلم حکومت کی اطاعت کریں، اس کی وفاداری کا دم بھریں۔ اس کے احکام تسلیم کریں اور اس کے خلاف کسی سازش میں شریک نہ ہوں۔

یہ برہمن اپنے ہم مذہبوں کا دورِ حکومت بھی دیکھ چکے تھے۔ وہاں ظلم، تعدّی اور دھاندلی کے سوا کچھ نہ تھا۔ جہاں لوگوں کے حقوق مارے جاتے تھے انھیں لوٹا جاتا تھا رشوت کی گرم بازاری تھی، سفارش کا دَور دورہ تھا اور اب مسلمانوں کا دورِ حکومت دیکھ رہے تھے۔ یہ مسلمان روادار تھے، عادل اور شریف و پاکباز تھے۔ کسی پر ظلم نہیں کرتے تھے کسی مظلوم کی دستگیری میں تامّل نہیں کرتے تھے، ظالم کا سر کچلتے تھے مظلوم کی دادرسی کرتے تھے چاہے وہ ظالم کتنا ہی بڑا ہو اور وہ مظلوم کتنا ہی حقیر و کم مایہ ہو۔ ایک نے زندگی کا رس چوس لیا تھا اگرچہ وہ ہم مذہب تھا دوسرے نے آبِ حیات

عطا کر دیا تھا اگرچہ اس کا مذہب دوسرا تھا۔

برہمن آباد میں ایک بہت بڑا مندر تھا۔ جو زیارت گاہ خاص و عام تھا، شہر پر قبضہ ہونے کے بعد اس پر پہرہ لگ گیا۔ دہشت کے باعث عوام نے آنا جانا بند کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پجاری بھوکوں مرنے لگے۔ محمد بن قاسم کی رحم دلی اور رواداری کی بھنک ان کے کانوں تک پہنچ چکی تھی۔ وہ ایک جمعیت بنا کر اس کے دروازے پر پہنچے اور اپنا حالِ زار بیان کیا۔ بت پرستی کا معاملہ تھا اس لیے محمد بن قاسم نے خود کوئی فیصلہ کرنا مناسب نہ سمجھا حجاج کو خط لکھ کر استصواب کیا۔ حجاج نے فوراً جواب دیا کہ جب وہاں کے ہندو جزیہ قبول کر کے ہمارے حفظ و امان میں آگئے تو ہم ان کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہیں کر سکتے۔ وہ چاہے بت پرستی کریں یا مظاہر پرستی۔ انھیں اس کام سے نہ روکو۔ مندر کے دروازے کھول دو اور صرف ان کی جان و مال کے تحفظ سے کام رکھو، اس کی پروا نہ کرو کہ وہ کسے پوجتے ہیں۔ اور کس کے آگے سر جھکاتے ہیں۔

سندھ میں ہندو بھی تھے اور بودھ بھی، ہندوؤں کی تعداد نسبتہً کم تھی اور بودھوں کی زیادہ لیکن اختیار، اقتدار اور دولت ہندوؤں ہی کے پاس تھی، بودھ ان چیزوں سے محروم تھے وہ ہندوؤں کے محکوم تھے۔ اور ہندو جی بھر کے ان پر ظلم کرتے تھے۔

جب محمد بن قاسم نے ہندوؤں کے ساتھ یہ روادارانہ اور فیاضانہ برتاؤ رکھا تو سندھ کے بودھوں میں بھی حرکت پیدا ہوئی۔ وہ بھی ایک وفد کی صورت میں محمد بن قاسم کے پاس حاضر ہوئے انھیں اپنے مذہبی معاملات کی بجا آوری کے سلسلے میں وہ تمام مراعات اور سہولتیں حاصل ہو گئیں جو ہندوؤں کو تھیں۔

ایک اور عظیم شہر اور مسلمانوں کے قبضے میں

چچ نامہ کے بیان کے مطابق محمد نے آگے روانہ ہونے سے پہلے تمام انتظامات اور حالات کا جائزہ لیا، نظم و انتظام کا معائنہ کیا۔ دیوانی امور کے قضایا کے لیے ایک کمیٹی مقرر کر دی۔ امن و امان قائم کرنے کے لیے تجربہ کار اور معتمد سرداروں کو مامور کیا۔ اس کا انتظام بھی کر دیا کہ آگے بڑھنے کے بعد ایسا نہ ہو کہ دشمن

پس پشت سے آکر حملہ آور ہو جائے اور ساری کی کرائی محنت برباد ہو جائے نظم و انتظام کے معاملے میں ہندوؤں اور بودھوں پر اتنا ہی اعتماد کیا جتنا مسلمانوں پر!

اب محمد بن قاسم کی فوجیں شان و شوکت کے ساتھ ارور کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

سندھ کا اصلی پایہ تخت بھی شہر ارور تھا۔ یہ سندھ کا سب سے بڑا شہر تھا، داہر ہلاک ہو چکا تھا لیکن اس کا تختِ حکومت خالی نہیں تھا۔ اس وقت داہر کا لڑکا گوپی تخت نشینِ حکومت تھا۔ اس نے ایک طرف تو شہر والوں کو یہ یقین دلا رکھا تھا کہ راجہ داہر زندہ ہے ہلاک نہیں ہوا ہے تاکہ ان کی ہمت بندھی رہے اور وہ گھبرائیں نہیں، دوسری طرف اس نے زور سے جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔

رانی لاڈی کے کلمات

محمدؐ نے ارور کے پاس آکر قلعے کا محاصرہ کر لیا لیکن قلعے والے اس خیالِ خام میں مگن تھے کہ بس اب داہر فوج لے کر آتا ہی ہوگا، وہ فصیل پر آتے اور اس قسم کی باتیں کر کے چلے جاتے یہ اطلاع جب محمدؐ کو ملی تو اس نے سوچا یہ لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہیں لڑائی شروع ہوئی تو مفت میں مارے جائیں گے۔ اس نے اپنی بیوی یعنی رانی لاڈی کو ایک سانڈنی پر سوار کر کے فصیل کے پاس بھیجا۔ رانی لاڈی نے قریب پہنچ کر اپنے چہرے سے نقاب ہٹا دیا اور کہا۔

"مجھے پہچانتے ہو میں کون ہوں؟"

جواب میں سب نے خاموشی سے گردن جھکالی۔ رانی نے کہا:

"میں راجہ داہر کی رانی ہوں اور تمھیں خبر دیتی ہوں کہ راجہ ہلاک ہو چکا، اس کی گردن کاٹی جا چکی اور وہ عراق بھی بھیج دی گئی۔ اللہ کی مرضی یہی تھی اور وہ پوری ہو کر رہی تم لوگ خواہ مخواہ قسمت سے مقابلہ کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔"

یہ کہہ کر رانی چپ ہو گئی، اس تقریر سے امرائے داہر نے اندازہ لگایا کہ رانی مسلمان ہو چکی ہے، انھوں نے کہا:

"تو راجہ کو چھوڑ کر محمدؐ بن قاسم سے آملی ہے راجہ آتا ہی ہوگا وہ تیری بھی خبر لے گا۔

اب محمد بن قاسم کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہ گیا تھا کہ وہ قلعہ کی قسمت جنگ کے حوالے کر دے، چنانچہ محاصرہ میں اور زیادہ شدت اختیار کر لی گئی۔ محاصرہ کی اس شدت نے قلعہ والوں کے حواس پراں کر دیے۔ راجہ داہر کے انتظار سے بھی وہ مایوس ہو گئے تھے، ان کے لیے صرف ایک ہی راستہ تھا:

جنگ ——!

لیکن طویل اور سخت محاصرہ نے ان کی کمر توڑ دی تھی، اُدھر گوپی بھی یہ رنگ دیکھ کر اپنے بال بچوں سمیت رات کی تاریکی میں کسی دوسرے شہر چلا گیا۔ اس سے قلعہ والوں کی ہمت اور زیادہ پست ہو گئی۔ پھر ایک بات اور بھی تھی آبادی کی اکثریت بُدھ مت کی پیرو تھی اور حکومت برہمن طبقے کے ہاتھ میں تھی حکمراں طبقے کی اس بزدلی کو دیکھ کر آبادی میں اور زیادہ ہراس پیدا ہوا کہ ہم صرف آلۂ کار بنائے جاتے ہیں ہماری حفاظت کی کوئی پروا نہیں کی جاتی!

اہلِ قلعہ کی طرف سے امان کی التجا

یہ رنگ دیکھ کر قلعہ والوں نے محمد بن قاسم کی روایتی رواداری اور فراخ حوصلگی سے کام نکالنا چاہا۔ انھوں نے ایک وفد مرتب کیا اور سپہ سالارِ عسکرِ اسلام کی خدمت میں حاضر ہوئے، اطاعت کا اقرار کیا اور قلعہ حوالے کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا۔

محمد بن قاسم نے یہ استدعا قبول کر لی، اس نے حکم دیا تم لڑائی سے باز آجاؤ، قلعہ سے باہر نکل آؤ اور کنجیاں ہمارے حوالے کر دو، قلعہ والوں میں مزاحمت کی تاب و طاقت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ انھوں نے بسر و چشم ان احکامات کی تعمیل کی۔

بلاذری کے بیان کے مطابق ارور ایک بہت بڑا شہر تھا اور ایک پہاڑی پر آباد تھا محاصرہ کی سختیوں کی تاب نہ لا کر جب اہلِ قلعہ نے امان طلب کی تو حسب معمول محمد بن قاسم نے انھیں امان دے دی۔ شرائطِ صلح حسب ذیل تھے:

۱: تمام شہریوں کو امان دی جاتی ہے کسی کو قتل نہیں کیا جائے گا۔

۲: شہریوں کے دہار (یعنی بُدھ عبادت گاہیں) قائم رہیں گی۔

شرائطِ صلح کو منظور کرتے ہوئے سپہ سالار لشکر اسلام نے ارور کے بدھوں سے واضح اور صاف الفاظ میں کہہ دیا:

"میں دیار کو بھی ویسا ہی مقدس سمجھتا ہوں جتنا عیسائیوں، یہودیوں اور آتش پرستوں کے معبدوں کو!"

شرائط صلح طے ہو جانے کے بعد محمد بن قاسم کی فوجیں شہر میں داخل ہوئیں۔

محمد بن قاسم کی طرف سے عفوِ عام کا اعلان

شہر میں داخل ہونے کے بعد رانی لاڈی کے ایما سے محمد بن قاسم نے عفوِ عام کا اعلان کر دیا۔ صرف وہ لوگ اس عفو سے مستثنیٰ رکھے جو برسرِ فساد یا آمادۂ جنگ ہوں۔

گوپی ارور سے بھاگ کر اپنے ایک عزیز راجہ کے ہاں پہنچا۔ پہلے تو اس نے خوب خاطر مدارات کی، پھر اپنی آوارہ مزاج بہن کی لگائی بجھائی میں آکر قتل کر دینے کی ٹھان لی، لیکن کسی طرح گوپی کو بھی اس واقعے کا علم ہو گیا اور وہ اپنی جان بچا کر بھاگا۔

ارور کو فتح کرنے کے بعد محمد بن قاسم نے یہاں کے انتظامات کی طرف توجہ کی، دیوانی کے معاملات کے لیے اس نے ایک مجلس مقرر کر دی، رعایا پر کسی قسم کی زیادتی نہیں ہونے دی، رعایا کے افراد کو آزاد کیا، انھیں عہدے دیے، عزت افزائی کی، جاگیریں عطا کیں، مندروں کے بارے میں حکم صادر کیا کہ وہ حسبِ معمول آباد رہ سکتے ہیں، وہاں عبادات کی جا سکتی ہے، ان کی بے حرمتی نہیں کی جا سکتی۔ عام رعایا پر جزیہ لگا دیا گیا۔

ارور بہت بڑا شہر تھا، یہاں ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کی گئی، بعد میں عظیم دریائی یورشوں کی تاب نہ لا کر یہ شہر تقریباً ویران ہو گیا اور اس کی جگہ سندھ کے موجودہ شہر روہڑی نے لے لی۔ ارور کی زیادہ تر آبادی یہیں منتقل ہو گئی اور رفتہ رفتہ ارور ایک معمولی سا گاؤں رہ گیا۔

ارور کی فتح سے ایک بہت بڑا مرحلہ سر ہو گیا۔ لیکن ابھی ایک منزل طے ہوئی تھی دوسری باقی تھی۔ ملتان ــ حجاج کا حکم تھا ملتان بھی فتح کیا جائے۔ اور اب محمد بن قاسم کا لشکر اسی طرف بڑھنے کی تیاریاں کر رہا تھا!

ملتان کی فتح

محمد بن قاسم کی ادبار و زوال کی داستان

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے!

محمد بن قاسم کا عسکرِ فتح و ظفر برابر آگے بڑھ رہا تھا۔ بہت کم مواقع آئے جہاں کسی سخت و شدید مزاحمت سے مقابلہ پڑا ہو، زیادہ تر اطاعت و انقیاد کے مظاہرے ہوئے، مزاحمت و مقابلے کے کچلنے میں اس نے کوئی تامل نہیں کیا۔ اور اطاعت و انقیاد کے ساتھ زیادہ سے زیادہ رواداری، وسیع القلبی اور عالی ظرفی کا برتاؤ کیا۔ وہ امن پسندوں کا دوست تھا اور فتنہ انگیزوں کا دشمن۔

داہر کا ابنِ عم محمد بن قاسم کا مشیر

اروڑ کی فتح کے بعد جب محمد بن قاسم کا لشکر آگے بڑھا تو وہ متعدد مقامات کو فتح کرتا، قلعوں کو سر کرتا، شہروں پر غلبہ حاصل کرتا دریائے ستلج کے کنارے ایک قلعے پر پہنچا جس کا نام بابیہ تھا۔ یہاں کا حکمراں "کسکا" تھا، یہ شخص داہر کا چچازاد بھائی تھا۔ اور پرانے شاہی خاندان کا ایک سربرآوردہ شخص تھا۔ داہر کے پہلو بہ پہلو محمد بن قاسم سے مقابلے میں یہ شریک تھا، جب داہر کو شکست ہوئی اور وہ قتل ہوا تو یہ بھاگ کر یہاں آیا۔ تختِ حکومت حاصل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی، حاکمِ مطلق بن بیٹھا۔

جب عربوں کا لشکر سر پر پہنچا تو گھبرا گیا۔ داہر کا انجام دیکھ چکا تھا، اپنے آپ کو اس انجام سے بچانے کے لیے ایک وفد اس نے بھیج کر مسلمانوں سے لطف و کرم کی التجا کی،

دورانِ گفتگو میں محمد بن قاسم کو یہ بات معلوم ہوگئی کہ "کسکا" واقعی شاہی خاندان کا ایک فرد ہے۔ اس نے اس کی حد درجہ تالیفِ قلب کی۔ کسکا صاحبِ عقل و دانش آدمی تھا۔ جلد ہی محمد بن قاسم کی نظر پر چڑھ گیا۔ ہر معاملے میں اس سے صلاح و مشورہ کیا جانے لگا بابیہ کا انتظام تمام تر اسے سونپ دیا گیا۔ اور دوسرے تمام مقامی افسروں اور حاکموں پر اسے ترجیح دی گئی۔

اسکلندہ کی یادگار فتح

محمد بن قاسم کے لطف و مدارا کا یہ اثر ہوا کہ "کسکا" دل و جان سے مسلمانوں کا مطیع و منقاد بن گیا، چنانچہ جب مسلمان فوجیں بابیہ سے آگے اسکلندہ کی طرف بڑھیں تو اسلامی لشکر کی سربراہی دو آدمیوں کے سپرد ہوئی۔ ایک مسلمان تھا اور دوسرا یہی غیر مسلم کسکا۔ اور کسکا کے جوش و وفاداری کا یہ عالم تھا کہ جب اسکلندہ والوں نے جنگ و پیکار پر آمادگی ظاہر کی تو کسکا اتنا انتظار بھی نہ کرسکا کہ رسمی اور اصولی طور پر محمد بن قاسم سے اجازت لے لیتا۔ فوراً فوجیں آگے بڑھا دیں اور لڑنے لگا۔

لیکن جب غنیم نے دیکھا کہ مسلمانوں سے سر بر ہونا مشکل ہے تو وہ قلعہ بند ہوگئے مسلمانوں نے بھی محاصرہ کر لیا اور ایسی ناکہ بندی کی کہ کسی چیز کا اندر سے باہر آنا یا باہر سے اندر جانا بالکل مسدود ہوگیا۔ دشمن نے قلعے کے پھاٹک بند کر دیے تھے اور فصیل پر سے مسلمان لشکر پر برابر منجنیق سے پتھروں کی بارش کر رہا تھا۔ مسلمان بھی مقابلے میں ڈٹے رہے۔ نہ صرف یہ کہ انھوں نے مقابلے میں کوئی کمزوری نہیں دکھائی بلکہ سات روز تک مختلف موانع اور دشواریوں کے باوجود ایسا جم کر مقابلہ کیا کہ دشمن کے دانت کھٹے ہوگئے۔ آخر سنگھو رائے حاکم اسکلندہ مایوس ہوگیا تو بال بچوں سمیت ایک رات کو فرار ہوگیا، اب شہر والوں کے چھکے چھوٹ گئے، فوج بے سردار بھلا ایک باقاعدہ اور منظم فوج کے مقابلے میں کیا ٹھہر سکتی ہے، چنانچہ انھوں نے اطاعت پر آمادگی ظاہر کی مسلمانوں نے عام شہریوں کے لیے معافی کا اعلان کر دیا۔

سکہ کی فتح

اسلامی لشکر پھر آگے بڑھا، سامنے سکہ کا قلعہ تھا۔

جنگ شروع ہوئی اور کامل سترہ دن تک جاری رہی، اس مدت کا ہر ہر لمحہ طرفین نے پوری قوت کے ساتھ اس کام میں صرف کیا۔ اور اس مدت میں کسی نے کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی۔

مسلمان بہرحال اس دیس میں اجنبی تھے انھیں ہر قسم کی دشواریاں لاحق تھیں، سپاہ وہی تھی جسے وہ اپنے ساتھ لائے تھے اس میں اضافہ نہیں ہو سکتا تھا سامانِ جنگ جو کچھ بھی تھا وہی تھا جو ان کے ساتھ تھا۔ یہاں کسی دکان سے اسے خریدا نہیں جا سکتا تھا وسائل و ذرائع جتنے بھی تھے ان لوگوں کے ہاتھ میں تھے جو یہاں کے اصلی باشندے تھے۔ پشتہا پشت سے یہاں رہتے چلے آئے تھے۔ یہاں کے چپہ چپہ اور گوشہ گوشہ سے واقف تھے۔

بہرحال سترہ روز تک جنگ اپنی خوں فشانی اور ہلاکت خیزی کے ساتھ جاری رہی لیکن مسلمانوں کے استقلال و عزیمت نے سنگھر رائے کی ہمت پسپا کر دی اسے یقین ہو گیا کہ وہ جیت نہیں سکتا شکست و ہزیمت اس کے حصے میں بھی آئے گی۔ یہ دیکھ کر اس نے بھی وہی کیا جو اس سے پہلے ہندو راجہ عالم یاس میں کرتے آئے تھے یعنی ایک رات موقع دیکھ کر وہ اپنے بال بچوں اور متعلقین سمیت بھاگ کھڑا ہوا اور سکہ کے باشندوں کو محمد بن قاسم کے رحم و کرم پر چھوڑ گیا۔

اسلامی لشکر نے بڑی قربانی کے بعد سکہ کو فتح کیا تھا۔

محمد بن قاسم نے پُرامن والیانِ شہر کو تو کچھ نہیں کہا ان کی جان بھی محفوظ رہی۔ اور مال کو بھی کسی نے ہاتھ نہیں لگایا۔ لیکن فوجی لوگ نہ بچ سکے۔

مسلمان فوجی اتنے برہم اور از خود رفتہ ہو رہے تھے کہ انھوں نے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، مکین بچ گئے لیکن مکان نہ بچ سکا۔ بلاذری نے اس شہر کے کھنڈر دیکھے ہیں اور ان کا تذکرہ کیا ہے۔

رواداری اور عدل فاتح فتح کے بعد ایک بہت اہم مسئلہ فاتح کے لیے یہ ہوتا ہے کہ نیا انتظام و آئین بروئے کار لائے۔

محمد بن قاسم اور دوسرے فاتحوں میں فرق تھا، وہ جو چاہتے تھے کر سکتے تھے اور کرتے تھے۔ لیکن اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے، کچھ اپنی طبیعت کے اعتبار سے کچھ مسلمان ہونے کی حیثیت سے لہٰذا یہ کوئی ایسی بات نہیں کر سکتا تھا جو اسلام کے وقار اور روایات کے منافی ہو۔

چنانچہ اس نے یہاں بھی ویسے ہی عادلانہ اور روادارانہ انتظامات کیے جیسے وہ دوسرے مقامات پر کرتا آرہا تھا یعنی غیر مسلموں کو مکمل مذہبی اور سماجی آزادی عطا کی، ان پر جو ٹیکس لگایا اس میں یہ رعایت ملحوظ خاطر رکھی کہ ان کی حیثیت اور اطاعت سے زیادہ نہ ہو۔

ملتان کی طرف کوچ

یہاں کے بندوبست سے فارغ ہو کر محمد بن قاسم نے دریائے چناب پار کیا جو سکہ اور ملتان کے درمیان سرگرم خرام تھا جیسے ہی مسلمان فوج گھاٹ پر اتری سپہ سالار لشکر نے اسلحہ بندی کا اور مقابلے کے لیے تیار ہو جانے کا حکم دیا۔ فوج ابھی تیار ہو ہی رہی تھی کہ سکہ کا مغرور حاکم ملتانیوں کی ایک فوج گراں لے کر مقابلے کے لیے نمودار ہوا۔

پہلا حملہ دشمن نے اس تیور کے ساتھ اور ایسے بھرپور طریقے سے کیا کہ اندیشہ ہونے لگا کہیں مسلمانوں کے پاؤں نہ اکھڑ جائیں اور وہ رو بہ فرار ہونے پر مجبور نہ ہو جائیں لیکن وہ اس زبردست حملے کو استقلال اور عزیمت کے ساتھ سہہ گئے۔ سارا دن گزر گیا مگر یہ خوں ریز جنگ ختم نہیں ہوئی۔ ہر ہر حملے پر اس کی شدت پہلے کے مقابلے میں کچھ اور بڑھ جاتی تھی۔ اس جنگ میں بھی مسلمانوں کے کئی مشہور اور نمایاں سردار شہید ہوئے۔ لیکن اس سانحے سے بجائے اس کے کہ مسلمانوں کے حوصلے پست ہوتے اور زیادہ جوش اور صبر کے ساتھ مرنے مارنے پر تیار ہو گئے۔ انھوں نے ایسا دوٹوک اور زبردست حملہ کیا کہ دشمن اس کی تاب نہ لا سکا بھاگ کھڑا ہوا۔ بھاگتے بھاگتے اس نے اسی قدیم جنگی ٹیکنیک پر عمل کیا یعنی سامنے سے بھاگا اور قلعے میں جا کر پناہ گزیں ہو گیا۔ دوسرے روز پھر ایسا ہی رن پڑا۔ پھر ہندو فوجیں قلعے سے باہر نکلیں اور پٹ کر قلعہ میں پناہ گزیں

ہو گئیں لیکن جب تیسری صبح سورج چمکا تو سامنے نہ آئیں، ان کا میدان میں مقابلہ کرنے کا ولولہ سرد ہو چکا تھا۔

بالآخر ملتان فتح ہو گیا ہر روز جو طلوع ہوتا تھا مسلمانوں کے لیے ابتلا اور مصیبت کا پیغامبر بن کر طلوع ہوتا تھا۔ وہ بہادر تھے، لڑنے کے لیے تیار تھے۔ ان میں بڑے سے بڑے اور طاقتور سے طاقتور دشمن کا مقابلہ کرنے کی ہمت تھی۔

لیکن دشمن ناپید تھا۔

وہ سامنے نہیں آتا تھا، اطمینان سے قلعہ میں پناہ گزیں تھا۔

ملتان کے لوگ جو پانی پیتے تھے اس کا سرچشمہ ایک نالا تھا۔ نالے سے نکل کر یہ پانی ایک جھیل میں جمع ہوتا تھا اور یہی ہر خاص و عام کی تشنہ کامی دور کرتا تھا۔

مسلمان جب اس راز سے واقف ہوئے تو انھوں نے پانی کے رخ میں تبدیلی کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جھیل خشک ہو گئی۔ اس میں خاک اڑنے لگی۔ اب تک محصورین بھوکے مر رہے تھے اب اہلِ قلعہ پیاسے مرنے لگے، بھوک کا بہر حال کسی نہ کسی طرح مقابلہ کیا جا سکتا ہے لیکن پیاس تھوڑے ہی وقفے میں آدمی کی تاب و طاقت چھین لیتی ہے۔ قلعہ میں پانی کا جو قحط پڑا تو شور اور فریاد و الغیاث کی آوازیں قلعے کے باہر تک آنے لگیں اب غنیم کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہا کہ وہ قلعہ کی عافیت گاہ سے باہر نکلے اور کھلے میدان میں مقابلہ کر کے نتیجہ قسمت کے حوالے کر دے۔ آخر مجبور ہو کر اسے یہی کرنا پڑا۔

کئی روز تک یہ سلسلہ جاری رہا کہ غنیم کی فوج قلعے سے باہر نکل کر آتی، مقابلہ کرتی اور نقصان اٹھا کر واپس چلی جاتی۔ ایک روز مسلمانوں نے یہ طے کیا کہ آج قلعے میں داخل ہو کر رہیں گے، ایک گھر کے بھیدی کی مدد سے فصیل کے کمزور ترین حصے پر مسلسل حملہ کیا گیا، ایک جگہ سے رخنہ پیدا ہوا، مسلمان بے جگری کے ساتھ بڑھے، یہ دیکھ کر دشمن کی فوج بھی بپھری ہوئی قلعے سے نکلی اور خونریز جنگ کا آغاز ہو گیا۔ غنیم کی فوج یہ جان رہی تھی کہ اب

روز کی طرح قلعے میں سلامتی کے ساتھ جانا ناممکن ہے کیونکہ فصیل میں رخنہ پیدا ہو چکا ہے، اگر ہم واپس گئے تو مسلمان ضرور اس راستے سے قلعے میں داخل ہو جائیں گے۔ اور سر افگندگی کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہ ہوگا۔ لہٰذا وہ خوب جی توڑ کے لڑے۔ لیکن قسمت اپنا فیصلہ صادر کر چکی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ قلعے کا فرمانروا جودا ہر کا بھتیجا تھا کمک کی امید میں کشمیر بھاگ گیا۔ فوج جس نے مقابلہ کیا تھا بُری طرح ہاری۔ اس جنگ میں تقریباً چھ ہزار دشمن کے سپاہی ہلاک ہوئے، اب مسلمان فوج قلعے میں تھی۔ اور یہاں بھی اس بات کا التزام رہا کہ کسی امن پسند شہری کو کسی طرح کا نقصان نہ پہنچنے پائے، نہ اس کی جان کو نہ مال کو۔

مالِ غنیمت کا ڈھیر

اس جنگ میں مسلمانوں کو مالِ غنیمت بھی کافی ملا اور یہ مال سواروں اور پیادوں میں حسب مراتب تقسیم کر دیا گیا۔

لیکن اس مالِ غنیمت کے سوا ایک اور ذریعے سے بھی مسلمانوں کو بہت بڑی رقم ملی، یہ اتنی بڑی رقم تھی کہ اس نے مع نفع کے تمام مصارفِ جنگ جو اب تک ہوئے تھے بیت المال کو ادا کر دیے۔

ہوا یہ کہ فتح کے بعد ایک برہمن کی نشان دہی سے اتنے بڑے دفینے کا ایک مندر میں سراغ ملا جس کی کسی طرح توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ یہ برہمن اب اپنی قوم کے روشن مستقبل سے مایوس ہو چکا تھا، اس نے عافیت اسی میں سمجھی کہ حکمراں قوم کی اطاعت اور وفاداری کا ایسا ثبوت دے کہ اس کی عزت و حرمت کو نہ صرف کوئی نقصان پہنچے بلکہ اس میں کچھ اور اضافہ ہو جائے، اس کی نشان دہی پر محمد بن قاسم خود تن تنہا برہمن کے ساتھ گیا۔ یہ ایک قدیم خزانہ تھا۔ یہاں سے دو سو تیس من خالص سونا برآمد ہوا اور تیرہ ہزار دو سو من خاک زر تانبے کے مٹکوں میں بھری ہوئی ملی۔ اس کے علاوہ ایک بُت بھی تھا جو سر تا سر سونے کا بنا ہوا تھا۔ محمد بن قاسم نے یہ ساری رقم اور مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ فوراً دیبل کے راستے عراق حجاج بن یوسف ثقفی کے پاس بھیج دیا۔ محمد بن قاسم کو مصارفِ جنگ کے سلسلے میں چھ کروڑ درہم دیے گئے تھے اس نے بارہ کروڑ درہم خزانۂ خلافت میں داخل کرائے۔ اور ان

سب پرستنر اور راجہ داہر کا سر۔

فتح ملتان نے جہاں ہندوؤں کے حوصلے پست کر دیے تھے وہاں مسلمانوں کے حوصلے بہت بڑھ بھی گئے تھے۔ سندھ کا وہ سارا علاقہ جو راجہ داہر کے قبضے اور تصرف میں تھا اب مسلمانوں کے زیرِ نگیں تھا۔ یہ علاقہ کوئی معمولی علاقہ نہ تھا ایک پوری مملکت تھی۔ شمال میں کشمیر کی سرحد تک مسلمانوں کے قدم پہنچ چکے تھے۔ جنوب میں بحرِ عرب کا سینہ مسلمانوں کی کشتیاں چیر رہی تھیں مغرب میں بلوچستان اور مکران کے کوہستان اور ریگستان پر مسلمانوں کا پرچم لہرا رہا تھا۔ مشرق میں دریائے راوی کی موجیں قبضے میں آ چکی تھیں۔ آس پاس کے دوسرے راجہ مہاراجہ بھی اطاعت کا حلقہ اپنی گردن میں ڈال چکے تھے۔

ان حالات میں محمد بن قاسم نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ وہ داہر کے مقبوضات پر قانع ہو جائے۔ اس کی طبع بلند اکسا رہی تھی کہ آگے بڑھے اور جہاں تک جا سکتا ہے چلا جائے اور جہاں پہنچے وہ اسلام کا پیام ان لوگوں تک پہنچائے جو فکر و عقیدہ کی گمراہیوں میں مبتلا ہیں۔ مظاہر پرستی اور اصنام پرستی کو اپنا شعار بنا چکے ہیں۔ خدائے واحد کو بھول چکے ہیں اور نہیں جانتے کہ اس کے سامنے سرِ عبودیت کس طرح خم کریں۔

ایک سانحہ، ایک حادثہ

یکایک شوال ۹۵ھ میں اطلاع ملی کہ حجاج بن یوسف ثقفی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

محمد بن قاسم کے لیے حجاج کی موت ایک بڑا سانحہ تھی صرف اس لیے نہیں کہ وہ اس کا بھتیجا اور داماد تھا اس لیے بھی کہ سندھ عراق کے ماتحت تھا، اب عراق کی ولایت جس کے حصے میں آئے گی سندھ پر بھی اسی کا فرمان چلے گا۔ اور وہ نہ جانے کون ہو، اس کی پالیسی کیا ہو؟

اب ایک کتابِ واقعات ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سر بمہر کر کے بند کر دی گئی اور دوسری کتابِ حوادث کھل گئی۔ اس کتاب کے کس ورق میں کیا لکھا ہے؟ اس کا جواب صرف مستقبل ہی دے سکتا تھا لہٰذا اپنے مقام پر محمد بن قاسم کی پریشانی بالکل بجا تھی۔ وہ قدم آگے

بڑھانے سے پہلے بار بار سوچ لینا چاہتا تھا کہ اس کا انجام کیا ہوگا، اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟

چنانچہ سب سے پہلا کام جو محمد بن قاسم نے کیا، وہ یہ تھا کہ پیش قدمیاں روک دیں۔

محمد بن قاسم انتقام کی زد میں

حجاج کی وفات کو ابھی ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ خلیفہ ولید بن عبدالملک نے اس دُنیائے فانی کو خیرباد کہا

عبدالملک بن مروان کے دو بیٹے تھے:

۱: ولید بن عبدالملک۔

۲: سلیمان بن عبدالملک۔

مرنے سے پہلے عبدالملک نے اپنے دونوں بیٹوں ولید اور سلیمان کے لیے بیعت لی۔ یعنی عبدالملک کے بعد تختِ خلافت پر ولید متمکن ہوا اور جب ولید کا انتقال ہو جائے تو اس کا بھائی سلیمان سریر آرائے خلافت ہو۔ ماننے کو تو یہ بات ولید نے مان لی۔ لیکن جوں جوں اس کا اقتدار مستحکم ہوتا گیا وہ اس فیصلے کو رد کرنے کی تدبیروں پر غور کرنے لگا۔ بیٹے کے مقابلے میں بھائی کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ اب ولید کی خواہش یہ تھی کہ سلیمان کی بیعت فسخ کرادے اور اپنے بیٹے عبدالعزیز کو ولی عہد بنا کر اس کی ولایت عہد پر لوگوں سے بیعت لے لے۔

جب سلیمان کی بیعت فسخ کرنے اور عبدالعزیز کی بیعت لینے کے لیے ولید نے اپنے صلاح کاروں سے رائے لی تو موسیٰ بن نصیر، حجاج بن یوسف، محمد بن قاسم اور قتیبہ بن مسلم نے بے تامل اپنے آقا کی تائید کی اور سلیمان کی بیعت فسخ کر کے عبدالعزیز کی بیعت کر لینے پر راضی ہو گئے۔

ولید بن عبدالملک نے اپنے ارادے کو ابھی عملی جامہ نہیں پہنایا تھا کہ خود اس کا وقت آ گیا۔ اور وہ قبل اس کے کہ عبدالعزیز کے لیے تختِ خلافت کا انتظام کرے خود اس دُنیا سے رخصت ہو گیا۔

ولید کی زندگی میں عبدالعزیز کی بیعت اگر ہو جاتی تو پھر اس کے اقتدار اور فرمانروائی کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا تھا، لیکن ولید کے مر جانے کے بعد اب کسی میں ہمت نہیں تھی کہ وہ سلیمان سے کہتا: آپ کی بیعت فسخ کرتے ہیں اور عبدالعزیز کو امیرالمومنین اور خلیفۃ المسلمین بنا لیتے ہیں۔

سلیمان بن عبدالملک تختِ حکومت پر متمکن ہو گیا لیکن غیظ و غضب سے بھرا ہوا۔ تختِ خلافت پر بیٹھتے ہی اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنے کسی مخالف کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ خواہ وہ کتنا ہی بڑا اور عظیم المرتبت کیوں نہ ہو!

سلیمان بن عبدالملک نے عراق کی ولایت (گورنری) یزید بن مہلب کو سونپی، یزید کو حجاج سے سخت عداوت تھی۔ اس نے محکمۂ خراج، صالح بن عبدالملک کو سونپ دیا، یہ خارجی شخص تھا اور خوارج کے استیصال میں حجاج نے جو کچھ کیا تھا اُسے دنیا جانتی ہے۔ چنانچہ اب کہ اقتدار اور حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں تھی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ خاندانِ حجاج کے افراد کی پکڑ دھکڑ اور تعزیر و استیصال کا کام شروع کر دیا۔ محمدؒ بن قاسم بھی اسی خاندان کا ایک فرد تھا۔

چنانچہ سب سے پہلے اسے سندھ کی گورنری سے معزول کیا گیا، ایک شخص یزید بن ابی کبشہ سندھ کا گورنر بنا کر بھیجا گیا۔ اس نے اپنے پیش رو سے چارج اس طرح لیا کہ اُسے گرفتار کر لیا، لباسِ فاخرہ اتار لیا، ٹاٹ کا بنا ہوا لباس پہننے کے لیے عطا کیا، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں، پاؤں بیڑی سے بوجھل کر دیے۔ پھر اس بے گناہ قیدی کو عراق روانہ کر دیا۔

محمدؒ بن قاسم تختِ حکومت سے اتار کر جیل کی ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں مقید کر دیا گیا۔ یعقوبی کی روایت کے مطابق جیل میں محمدؒ بن قاسم کو طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں، وہ صبر و استقامت اور عزم و حوصلے کے ساتھ شدائد اور مصائب کا مقابلہ کرتا رہا اور آخر ایک روز قید ہی کی حالت میں جیل کی چار دیواری کے اندر وفات پا گیا!

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلیمان بن عبدالملک صرف اس لیے تختِ حکومت پر بیٹھا تھا کہ انتقام لے اور مر جائے!

وہ زیادہ دنوں زندہ نہیں رہا۔ صفر ۹۹ھ میں سلیمان کا انتقال ہو گیا، اس مختصر مدت میں وہ کوئی کام نہ بنا سکا جتنے کام بگاڑے جا سکتے تھے بگاڑ دیے۔ اس نے سندھ کا گورنر یزید بن ابی کبشہ کو مقرر کیا تھا لیکن یہ بھی زیادہ دنوں زندہ نہیں رہا۔

ایک تو محمد بن قاسم کی معزولی نے سندھ کے لوگوں کے دلوں میں مایوسی اور بد دلی پیدا کر دی تھی، پھر جو نیا گورنر بن گیا وہ بھی اپنی کارگزاری کا نمونہ دکھانے سے پہلے مر گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سندھ میں افراتفری اور بد امنی کے آثار پیدا ہو گئے۔

یزید ابن ابی کبشہ کی وفات کے بعد سندھ کی بد امنی جب بہت زیادہ بڑھ گئی تو حبیب بن مہلب یہاں کا گورنر مقرر ہوا۔ اس کے اور محمد بن قاسم کے کردار میں زمین آسمان کا فرق تھا، جہاں محمد بن قاسم کا یہ حال تھا کہ وہ مالِ غنیمت سے خلافت کا خزانہ بھر رہا تھا وہاں حبیب کا یہ عالم تھا کہ وہ مالِ غنیمت پر تصرف کر رہا تھا۔ لیکن یہ بد اطمینانی جلد ہی ختم ہو گئی حالات نے پھر پلٹا کھایا۔

صفر ۹۹ھ میں سلیمان بن عبدالملک کا انتقال ہو گیا تھا۔

اب مسندِ خلافت پر ایک مختصر مدت کے لیے وہ شخص متمکن ہوا جس کے عہد کو بجا طور پر خلافتِ راشدہ کے آثار سے تشبیہ دی جاتی ہے یعنی عمر بن عبدالعزیز۔ آپ نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی ان تمام لوگوں کو مناصب سے برطرف کر دیا جن کے بارے میں بد دیانتی اور خیانت کا شبہ بھی تھا۔ اس سلسلے میں عراق کی ولایت یزید بن مہلب کے ہاتھ سے اور سندھ کی گورنری حبیب بن مہلب کے ہاتھ سے جاتی رہی بلکہ حبیب کو خیانت کے جرم میں جیل بھی بھیج دیا گیا۔ اس کی جگہ دربارِ خلافت سے عمر بن مسلم باہلی کو سندھ کا گورنر بنا کر بھیج دیا گیا۔ وہاں جا کر اس نے انتظامات کو سنبھالنے کی پُر زور کوشش کی۔

لیکن حالات پے بہ پے بدل رہے تھے!

سن ۱۰۱ھ میں عمر بن عبدالعزیز بھی وفات پا گئے۔ آپ کی جگہ مسندِ خلافت پر یزید بن عبدالملک بیٹھا، اس میں وہ تمام خصوصیات موجود تھیں جو عبدالملک بن مروان کی اولاد میں ورثہ کے طور پر کی جاتی تھیں یعنی خود رائی، سفاکی، شقاوت، جور و ستم!

سن ۱۰۵ھ کے آخر میں یزید بن عبدالملک بھی وفات پا گیا۔ اس کی جگہ اس کا ایک اور بھائی ہشام سریر آرائے خلافت ہوا۔ جس کی عیش پرستی اور رنگ رلیوں کی داستانیں ہم اغانی کے صفحات پر پڑھ سکتے ہیں۔

نئے دور کا آغاز ہشام بن عبدالملک کے عہدِ خلافت سے سندھ کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔

ہشام نے ابن ہبیرہ کو معزول کر کے خالد قسری کو عراق کی گورنری سونپی اس طرح سندھ خالد قسری کی ماتحتی میں آ گیا۔ خالد نے کچھ روز تک تو انقلاب و تغیر کی پالیسی پر عمل نہیں کیا پھر اس نے جنید نامی ایک شخص کو سندھ کی گورنری سونپ دی۔

محمد بن قاسم کے بعد جنید کی صورت میں ایک مضبوط اور صائب الرائے فرمانروا سندھ کو ملا تھا۔ جنید کی سیرت اور کردار کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا وہ بڑا اولوالعزم اور باہمت آدمی تھا۔ اس نے صرف چار سال سندھ پر حکومت کی۔ یہ مدت ملکی نظم و انتظام کے اعتبار سے کچھ بہت زیادہ نہیں ہوتی۔ اس مدت میں اس نے ایک طرف تو سندھ کا امن و امان قائم رکھا دوسری طرف سندھ کی سرحدی ریاستوں کو مطیع و منقاد بنا دیا اور اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ گجرات اور مارواڑ تک بڑھتا چلا گیا۔ اس نے بھروچ کو بھی فتح کر لیا جو اب بھی صوبہ بمبئی کا ایک اچھا ترقی یافتہ شہر ہے۔

جنید نے گجرات کے راجہ سے جنگ کی اور اس جنگ میں گجرات کے پایہ تخت پر اس نے قبضہ کر لیا۔ جنید کی حوصلہ مندی اور اولوالعزمی کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کی فوجیں اجین اور مالوہ میں فاتح اور کشور کشا کی حیثیت سے داخل ہوئیں۔ دشمن مقابلے پر آیا اور مارا گیا یا پیٹھ دکھائی اور روپوش ہو گیا!

ریاست چمبہ پر حملہ ان فتوحات سے یکسو ہونے کے بعد جنید نے دریائے بیاس کے

مغربی جانب (موجودہ ریاست) چمبہ کی طرف یلغار کرتا ہوا بڑھا، راجہ نے مقابلے کی ٹھان لی۔ اور میدان میں اتر آیا۔ اس راجہ نے کئی مرتبہ مسلمانوں سے شکست کھائی لیکن اس کے عزم جنگ میں کوئی فرق نہ آیا۔ ہارتا تھا پھر لڑتا تھا۔ ایک جگہ سے شکست کھا کر بھاگتا تھا اور پھر یکایک کسی دوسرے مقام پر نمودار ہو جاتا تھا۔

جنید جب چمبہ کے قلعے کے پاس میدانی جنگ ختم کر کے پہنچا تو اہلِ قلعہ نے دروازہ بند کر لیا۔ اور اطمینان سے قلعہ بند ہو گئے۔ جنید نے فوراً محاصرہ کا حکم دے دیا۔

آخر جب قلعہ والے کسی طرح اس مشکل سے عہدہ برآ نہ ہو سکے تو انھوں نے اطاعت کا پیام بھیجا۔ جنید نے صلح کی التجا منظور کر لی اور غیر جنگ جو لوگوں سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا۔

سنہ ۱۱۱ھ تک جنید سندھ کی گورنری تک فائز رہا پھر وہ ایک اور بلند منصب خراسان کی نظامت پر فائز کر دیا گیا۔ یہ گرانبار ذمہ داری اس نے تقریباً چھ سال سنہ ۱۱۶ھ تک خوبی اور خوش اسلوبی، نیک نامی اور شہرت کے ساتھ انجام دی۔

جنید کا حشر لیکن ان تمام کارناموں اور ناقابلِ فراموش خدمات کے باوجود انجام جنید کا بھی بہت ہی افسوس ناک ہوا۔

خراسان کی نظامت کے زمانے میں جنید نے یزید بن مہلب کی خوش جمال اور خوش سلیقہ لڑکی عاقلہ سے شادی کر لی، خلیفہ اس بات پر بھڑک گیا، کیونکہ خاندانِ مہلب اس کا معتوب تھا چنانچہ اس جرم میں اس کے تمام روشن کارنامے پس پشت ڈال دیے گئے اور خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے حکم سے معزول کر دیا گیا۔

کچھ روز بعد وہ بیمار پڑ گیا، یہ بیماری جان لیوا ثابت ہوئی اور آخر اس کا انتقال ہو گیا۔

عمر بن محمد بن قاسم کا دور

سندھ میں عرب آبادیوں کی تعمیر کا آغاز

عہدِ انتشار و ارتداد

جنید کے تبادلے کے بعد سندھ کی ولایت تمیم بن زید عتبی کے سپرد ہوئی (۱۱۱ھ) اس کی نالائقی نے بہت سے گل کھلائے، فوج بد دل ہو گئی۔ امرائے فوج بگڑ بیٹھے۔ رعایا میں ابتری پیدا ہو گئی، نظم و انتظام درہم برہم ہو گیا، حکومت کا رعب اٹھ گیا۔ اور رفتہ رفتہ غیر اسلامی عصبیتیں ابھریں اور خانہ جنگی تک کی نوبت پہنچ گئی۔ تمیم کو اپنی کمزوری کا احساس تھا مقابلے کی ہمت نہ ہوئی بھاگ کھڑا ہوا لیکن موت پیچھے پیچھے آ رہی تھی، سوچا تھا بھاگ کر عراق پہنچ جائے گا لیکن راستے ہی میں موت نے آدبوچا۔

حالات کی ابتری تمیم کے فرار اور موت کے بعد اتنی ابتری پھیلی اور ایسا خلفشار مچا کہ وہ لوگ جو دل سے مسلمان نہیں ہوئے تھے بلکہ حصولِ جاہ و منصب کے لیے ترکِ مذہب پر آمادہ ہوئے تھے وہ مرتد ہو گئے۔ دشمن اگرچہ شکست کھا چکا تھا، موقع غنیمت دیکھ کر اپنی عظمتِ رفتہ کے حصول میں جدّ و جہد کرنے لگا۔ حالات اتنے ناسازگار ہو گئے کہ جو عرب یہاں مستقل بود و باش اختیار کر چکے تھے وہ سندھ سے ترکِ اقامت اور ہجرت پر اپنے تئیں مجبور پانے لگے، جو لوگ التجا کر کے مسلمانوں کا غلبہ دیکھ کر باج گزار بنے تھے، انھوں نے باج اور

خراج ادا کرنے سے نہ صرف انکار کردیا بلکہ جنگ و پیکار پہ آمادہ ہوگئے اس زمانہ میں ملتان نے سندھ سے تعلق منقطع کرلیا اور اپنی انفرادیت بحال کرلی۔

عمر بن محمد بن قاسم

خالد قسری کو جب یہ حالات معلوم ہوئے تو وہ بہت پریشان ہوا اس نے فوراً حالات کو قابو میں لانے کی کوشش کی اور حکم بن عوانہ کو سندھ کا گورنر مقرر کردیا۔

حکم کو عمر بن محمد بن قاسم پر بڑا بھروسہ تھا۔ یہ محمد بن قاسم کا نوعمر لڑکا تھا، لیکن بالکل اپنے باپ کا چربہ تھا، طبیعت، فطرت، خصلت اور مزاج بالکل باپ کا پایا تھا، وہی بہادری وہی شرافت، وہی حسن انتظام جو محمد بن قاسم کا طرۂ امتیاز تھا، پورے طور پر عمر میں بھی موجود تھا۔ اگر یہ کہا جائے تو ذرا بھی مبالغہ نہیں ہوگا کہ حکم کے عہد کی تمام احتیاطیں اور پیش بندیاں نتیجہ تھیں عمر کے دماغ اور عمل کا!

حالات یہ تھے کہ بہت لوگ ترکِ اقامت پر آمادہ ہوگئے بہت سے نہیں ہوئے بلکہ ہر طرح کے نامساعد اور ناخوشگوار حالات میں اپنی جگہ چٹان کی طرح جمے بیٹھے رہے وہ سخت غیر محفوظ حالت میں تھے، ان کی جان و مال کو ہر وقت اندیشہ تھا اس لیے کہ وہ ہر چہار طرف سے دشمن کے نرغے میں تھے۔ ہر وقت اس کا امکان تھا کہ کسی دشمن کی طرف سے یورش ہو اور وہ بالکل تباہ و برباد ہوجائیں۔

یہ سوچ کر حکم نے اپنے صلاح کاروں خاص طور پر عمر سے مشورہ کیا کہ اب کیا کیا جائے۔ کون سا ایسا اقدام کیا جائے جس کا نتیجہ ہو کہ سندھ سے عربوں کا انخلا بند ہوجائے اور جو لوگ جاچکے ہیں وہ پھر واپس آجائیں جو نہیں گئے ہیں وہ اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس نہ کریں۔

کامل غور و خوض اور سوچ بچار کے بعد یہ بات طے پائی کہ خالص عرب آبادیاں بسانے کا کام شروع کیا جائے۔

شہر محفوظہ

یہ اسکیم جب باہمی صلاح و مشورہ سے منظور ہوگئی تو حکم نے دریائے سندھ کے دہانے پر ایک نئے شہر کی داغ بیل ڈالی، یہ شہر دریائے سندھ کے

جانبِ مشرق تعمیر کیا گیا۔ اس کی مضبوطی اور استحکام کی طرف خاص توجہ کی گئی کہ دشمن کے قدم کسی طرح یہاں نہ پہنچ سکیں۔

اب یہ سوال پیدا ہوا کہ اس شہر کا نام کیا رکھا جائے؟ حکم نے محفوظہ نام رکھا چنانچہ یہی نام طے پا گیا اور تاریخ کے صفحات پر ابھی تک محفوظ ہے۔

نیا شہر منصورہ

محفوظہ میں اب مسلمان ہی مسلمان تھے اور ہر طرح سے محفوظ تھے۔ اب بے امنی اور شر انگیزی اور فتنہ انگیزی کی طرف توجہ کی گئی چنانچہ حکم کے حکم سے عمر بن محمد بن قاسم آگے بڑھا اور اس نے ایک مختصر سی مدت میں امن و امان قائم کر دیا۔ اس نے دلیری اور بہادری کے ساتھ تمام نامساعد حالات کا مقابلہ کیا۔ اس نے سرکشوں کو سرنگوں کیا، باغیوں کو اطاعت پر مجبور کر دیا۔ دشمنوں کو ایسا زچ کیا کہ وہ مجبور ہو گئے کہ پھر پیمانِ دوستی باندھنے کی التجا کریں۔ جو لوگ کمزور طبیعت کے تھے ان میں مستقبل کی طرف سے ہراس کی بجائے اطمینان پیدا کیا اور سارے سندھ پر ایسا دبدبہ قائم کر دیا کہ وہی ملک جو بدامنی اور شورش کا گہوارہ بنا ہوا تھا پھر سے امن کا شائق اور قانون کا مطیع ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے یہاں شورش اور بدامنی کا دور آیا ہی نہ تھا!

عمر جب فاتحانہ شان و شوکت کے ساتھ واپس ہوا تو اس نے اس غیر معمولی اور ناقابلِ فراموش کامیابیوں اور فتح مندیوں کی یادگار میں دریائے سندھ کے کنارے ایک نیا شہر تعمیر کیا جس کا نام فتح مندی اور فیروز مندی کی رعایت سے اس نے "منصورہ" تجویز کیا اور یہی نام چل پڑا۔

یہ عمر بن محمد بن قاسم کے حُسنِ عمل اور حُسنِ نیت کی برکت تھی کہ کچھ عرصہ بعد شہر منصورہ صرف ایک شہر نہیں بلکہ سندھ کا پایۂ تخت بن گیا۔ یہ اس کی فتح و نصرت کی ایسی یادگار تھی جو آج بھی تاریخ کے سینے میں محفوظ ہے اور جب تک تاریخ کے اوراق محفوظ ہیں منصورہ کا نام بھی زندہ رہے گا۔

خالد قسری بہت بڑا شخص تھا۔ جاہ و جلال میں، رعب و دبدبے میں، سیاست اور فراست میں، خطابت اور فصاحت میں، مذہب سے بیزاری اور آقا پرستی میں، ظلم اور سفاکی میں،

سیاسی جوڑ توڑ اور سازش میں، سفاکی اور خون آشامی میں، موقع پرستی اور ابن الوقتی میں کسی طرح وہ حجاج بن یوسف سے کم نہ تھا۔ بلکہ بعض اربابِ نظر کی رائے میں تو وہ حجاج سے بھی بڑھا ہوا تھا۔ لیکن حالات جب بگڑے تو اس کی یہ خصوصیتیں کام نہ آسکیں۔ ۱۲۱ھ کے نصف آخر میں وہ معزول کر دیا گیا۔

خالد قسری کی معزولی پیش خیمہ تھی اس کے مقرر کیے ہوئے حکام و عمال میں سے اکثر کے زوال، قتل، ہلاکت اور بربادی کا۔ شخصی حکومتوں میں ایسا ہی ہوتا ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ خالد قسری کے معزول ہوتے ہی جو دوسرا شخص اس کی جگہ پر حاکمِ اعلیٰ اور مختار ہو کر آیا اس نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ ان لوگوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا جو خالد کے آوردے یا خاص آدمی سمجھے جاتے تھے۔ سب سے پہلی زد جس شخص پر پڑی وہ خود حکم تھا۔

خلیفہ ہشام نے محمد بن قاسم کے بیٹے عمر کے لیے والیٔ عراق کو لکھا کہ اگر محمد بن قاسم کا بیٹا جوان ہو چکا ہو اور اس بارِ گراں کے سنبھالنے کی اہلیت رکھتا ہو تو یہ منصب اسے تفویض کیا جا سکتا ہے۔ خلیفہ کا اشارہ کافی تھا فوراً عمر اس منصب پر مقرر کر دیا گیا اس نے برسرِ اقتدار آتے ہی یزید کو نذرِ زندان کر دیا۔

عمر کے شاندار کارنامے عمر نے حکم کے ماتحت اور نائب کی حیثیت سے بھی اور بعد میں سندھ کے مستقل گورنر کی حیثیت سے بھی جو کارنامے انجام دیے وہ بڑے روشن اور تابناک تھے، اپنے باپ کی طرح اسے بھی کام کرنے اور یکسوئی کے ساتھ نظم و انتظام قائم کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ لیکن جو تھوڑی بہت مدت کام کرنے کی ملی اس میں بھی اس نے ثابت کر دیا کہ وہ کتنا بہادر اور دانا شخص ہے، اس نے باغیوں کا زور ختم کر دیا، اس نے سرکشوں اور شورش پسندوں میں یہ ہمت باقی نہ رکھی کہ وہ مقابلے کا خیال تک دل میں لاسکیں۔ اس نے کم ہمت اور بے حوصلہ لوگوں میں ایک نئی امنگ اور ترنگ پیدا کر دی، اس نے داخلی نظم و نسق کی طرف توجہ کی اور ہر طرح کی مشکلات اور موانع کے باوجود اس کام کو خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے ڈالا۔

عمر بن محمد بن قاسم کا حشر ہشام کی وفات کے بعد اس کے تمام ولاۃ اور حکام د

امرا معزول کر دیے گئے۔ انہی معزول ہونے والوں میں محمد بن قاسم کا جواں سال اور جواں ہمت بیٹا عمر بھی تھا۔ اس کے پاس بھی پروانۂ عزل پہنچا اور اسے اپنے منصب سے ہٹنا پڑا۔

عمر اس اعتبار سے خوش قسمت تھا کہ اسے صرف عزل کی مصیبت سے دوچار ہونا پڑا۔ اور اپنے باپ محمد بن قاسم کی طرح وہ جیل میں نہیں ڈالا گیا۔

۱۲۵ھ میں ہشام رہگزار عالم جاودانی ہوا۔ اب تختِ خلافت ولید کے حصے میں آیا یہ بیچارہ ۱۲۶ھ میں ہلاک ہو گیا۔ اب یزید بن ولید بن عبدالملک کی باری آئی۔ یہ بھی بڑے کروفر سے اورنگ نشین ہوا۔ لیکن موت نے مہلت نہ دی صرف چھ ماہ تک حکومت کی اور مر گیا۔ اب اس کا بھائی ابراہیم بن ولید مسند آرائے خلافت ہوا تھا لیکن اسی خاندان کے ایک شخص مروان الحمار نے ابراہیم کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا اور خود خلیفۃ المسلمین اور امیر المومنین بن بیٹھا، اس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن ۱۳۲ھ میں نہ صرف اس کا بلکہ سرے سے حکومتِ بنو امیہ کا خاتمہ ہو گیا اور اب مسندِ خلافت پر عباسی متمکن ہو گئے۔

سلطنتِ منصورہ

۲۴۰ھ میں عمر ہباری نے ولایتِ سندھ کی مسند پر قبضہ کر لیا اب یہاں سے سندھ کے نظم و انتظام مملکت کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ یہ نئی سلطنت تاریخ میں "سلطنتِ منصورہ" یا "مملکتِ خاندانِ ہباری" کے نام سے موسوم ہے۔

عمر جب تک زندہ رہا دربارِ خلافت سے وابستہ رہا، اس کا احترام کرتا رہا، اس کی اطاعت کرتا رہا۔ غرض خارجی پالیسی کا جہاں تک تعلق تھا عمر نے وہی پالیسی قائم رکھی جو چلی آ رہی تھی۔

نیا اور شاندار دور

داخلی اعتبار سے دیکھیے تو بھی عمر کا دور ہر اعتبار سے کامیاب نظر آتا ہے، وہ تقریباً تیس سال تک اس منصب کی گراں بار ذمہ داریوں کو انجام دیتا رہا۔ لیکن اس طویل مدت میں نہ اس کے خلاف کوئی

بغاوت یا شورش رونما نہ ہوئی نہ مرکز خلافت کو اس سے کسی قسم کی کوئی شکایت پیدا ہوئی۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ اس کی پالیسی داخلی اور خارجی ہر اعتبار سے کامیاب رہی اور یہی اس کے تدبر، فراست اور معاملہ فہمی کا شاہکار ہے۔ پھر جب ہم اس پر غور کرتے ہیں کہ یہ تیس برس اس نے ایسے دور میں کامیابی اور نیک نامی کے ساتھ گزار لیے جسے بجا طور پر عہد فتنہ کہا جا سکتا ہے تو اس کی صلاحیت اور استعداد کار کا اور زیادہ اعتراف کرنے کو جی چاہتا ہے۔

عمر نے تخت نشین ولایت ہونے کے بعد سارے سندھ پر قبضہ کر لیا۔

۲۷۰ھ کے قریب عمر کا انتقال ہو گیا، اس کی جگہ اس کا بیٹا تخت نشین ولایت ہوا۔ جس کا نام عبداللہ بن عمر ہباری تھا۔

عبداللہ بن عمر ہباری

عبداللہ کو اپنے باپ سے ورثے میں تمام اچھائیاں ملیں، عنان اختیار و اقتدار ہاتھ میں لینے کے بعد وہ ان تمام مشکلات پر آسانی سے غالب آیا جو ہمیشہ ایک نئے فرمانروا کو پیش آیا کرتی تھیں۔ ایک شخص نے منصورہ پر بغاوت کر کے قبضہ کر لیا۔ لیکن عبداللہ نے منصورہ چھین لیا۔ اب تک وہ بانیہ میں زیادہ مقیم رہتا تھا، لیکن اب وہ مستقل طور پر منصورہ میں رہنے لگا۔ عبداللہ کے عہد حکومت میں بھی ہمیں یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ اس نے بیدار مغزی اور دور اندیشی کے ساتھ حکومت کی۔ اس نے بغاوت کو کچلنے میں جہاں کوئی تامل نہیں کیا وہاں عوام اور رعایا کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے، ان کی دلجوئی کرنے، ان کی شکایات رفع کرتے اور ان کا دل ہاتھ میں لینے کا بھی کوئی موقع ضائع نہیں کیا۔

تبلیغ اسلام اور لا اکراہ فی الدین

عمر اور عبداللہ کے دور میں تبلیغ اسلام خود بخود ہوتی رہی جس میں کسی قسم کے جبر و اکراہ کو دخل نہیں تھا، بلکہ اس کا سبب صرف طبع سلیم کی مناسبت اور حق کی تلاش تھی۔ عبداللہ جس سال تخت نشین ہوا تھا (۲۷۰ھ) اسی سال کا واقعہ ہے کہ سندھ کے

ایک راجہ نے جس کا نام "مہروک" تھا عبداللہ سے استدعا کی کہ اسلام کے تعلیمات و ہدایات کا خلاصہ اسی کی (سندھی) زبان میں اسے لکھ کر بھیج دیا جائے۔ تاکہ وہ براہِ راست اس دین سے واقفیت حاصل کر سکے، عبداللہ نے ایک عراقی نژاد شخص کو اس کام پر مامور کیا اس نے ایک قصیدہ میں تمام کام کی باتیں نظم کر دیں، عبداللہ نے یہ قصیدہ راجہ کے پاس بھیج دیا۔ راجہ قصیدہ سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے عبداللہ سے درخواست کی کہ قصیدہ گو کو اس کے پاس بھیج دیا جائے عبداللہ نے یہ بات بھی مان لی۔ راجہ نے اسے تین سال تک اسے اپنے پاس رکھا۔ اس کی بڑی قدر و منزلت کی، اسے انعام و اکرام سے نوازا، اور اسے مقربِ بارگاہ بنالیا۔ تین سال کے بعد جب وہ واپس آیا تو عبداللہ نے اس سے راجہ کے بارے میں دریافت کیا کہ تم نے اسے اور اس کے دینی رجحان کو کیسا پایا؟

عراقی نے جواب دیا راجہ اسلام کی تعلیمات سے اس درجہ متاثر ہوا کہ اس نے اسلام قبول کر لیا۔ جب میں وہاں سے چلا ہوں اس وقت تک وہ صدقِ دل سے اسلام پر عامل تھا۔ تنہائی میں پابندی سے نماز پڑھتا تھا۔ اپنے اسلام کا اعلان اس ڈر سے نہیں کرتا کہ جب رعایا کو یہ بات معلوم ہو گی تو وہ برہم ہو جائے گی اور اس کا راج پاٹ چھن جائے گا۔

عراقی کے اس بیان سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ اگر قبولِ اسلام میں کسی قسم کا جبر ممکن ہوتا تو راجہ تو راجہ پرجا بھی اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتی لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ راجہ دل سے اسلام قبول کرتا ہے لیکن اس کا اخفا کرتا ہے اعلان و اظہار نہیں کرتا اس لیے کہ کہیں رعایا برہم نہ ہو جائے۔

دوسرے یہ کہ یہ واقعہ عبداللہ بن عمر کو معلوم ہوتا ہے، عبداللہ بڑی آسانی سے راجہ مہروک سے کہہ سکتا تھا کہ تم اپنے قبولِ اسلام کا اعلان کر دو، رعایا اگر برسرِ پرخاش ہوئی تو میں اس سے سمجھ لوں گا، میرے پاس جو فوج ہے آخر کس مرض کی دوا ہے وہ اسی لیے تو ہے کہ کفار کی سرکوبی کرے لیکن عبداللہ ایسا نہیں کرتا۔

کیا اس سے یہ بات اچھی طرح صاف اور واضح نہیں ہو جاتی کہ ان الدین عند اللہ الاسلام ماننے کے باوجود مسلمانوں کا عمل ہمیشہ لا اکراہ فی الدین پر رہا۔ بیشک مسلمان

عقیدہ کے طور پر ہمیشہ مانتے رہے کہ خدا کے نزدیک مقبول اور پسندیدہ دین ایک ہی ہے اور وہ صرف اسلام ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ایک مسلمان کی حیثیت سے انھوں نے یہ کبھی گوارا نہ کیا کہ اسلام قبول کرنے پر کسی کو مجبور کریں۔ یہ بات انھوں نے ہر شخص کے ضمیر اور ایقان پر چھوڑ دی کہ وہ خود ہی فیصلہ کرے کہ کونسا دین اُسے پسند ہے۔ اور کس دین کو وہ اپنی روحانی ترقی اور عروج کے لیے بہتر اور مناسب سمجھتا ہے۔ صرف یہی ایک واقعہ یہ بات ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ دوسرے مقامات کی طرح سندھ میں بھی اسلام بزورِ شمشیر نہیں پھیلا بلکہ اس نے خود اپنی تبلیغ کی۔ اور یہ تبلیغ مبنی تھی حق و صداقت پر۔

مناد روں میں قربانیاں بودھوں اور ہندوؤں کو اپنے مذہبی مراسم ادا کرنے میں کس درجہ آزادی حاصل تھی اس کا اندازہ ان واقعات سے ہوتا ہے جو مسعودی، ابن حوقل اور دوسرے مؤرخوں اور سیاحوں نے اپنی کتابوں میں لکھے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جگہ جگہ منادر قائم تھے، ان مندروں میں نہ صرف یہ کہ بھجن گائے جاتے تھے، پوجا پاٹ ہوتی تھی بلکہ طرح طرح کے چڑھاوے بتوں کے سامنے چڑھائے جاتے تھے ہر طرح کی قربانیاں بتوں کے سامنے کی جاتی تھیں لیکن اسلامی حکومت ان معاملات میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرتی تھی بلکہ ہر طرح اس کا لحاظ رکھتی تھی کہ اپنے مذہبی مراسم کی بجا آوری کے سلسلے میں انھیں کسی قسم کی زحمت یا تکلیف سے دوچار نہ ہونا پڑے۔

کم و بیش تیس سال تک عبداللہ بن عمر نے حکومت کی پھر اس کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا عمر بن عبداللہ ہباری مسندِ ولایت پر متمکن ہوا۔ یہ ہر اعتبار سے اپنے دادا اور باپ سے بڑھا ہوا تھا۔ اس کے کارنامے اتنے وقیع ہیں کہ ان کے لیے ہمیں الگ سے گفتگو کرنی پڑے گی۔

ابو المنذر کا یادگار دورِ حکومت ۳۰۲ھ میں عمر بن عبداللہ مسند آرائے حکومت ہوا، کنیت ابو المنذر تھی، یہ بڑا دانا بینا اور صاحبِ فہم و ذکا تھا۔

اس نے سب سے پہلے عدل و انتظام کے شعبوں کی طرف توجّہ کی ، مسندِ قضا پر ایسے لوگوں کو مامور کیا جن کی دیانت اور غیر جانبداری شک و شبہے سے بالا تھی ۔ اس نے عنانِ اقتدار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں دی جو معاملات کے تصفیہ میں اگرچہ سخت اور درشت تھے لیکن نامنصف اور خودغرض نہیں تھے ، اس نے بیک وقت عوام ، خواص اور حکام و عمّال کی اصلاح کی طرف توجہ کی اور اس کام کو خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دینے میں ذرا بھی مداہنت یا رواداری سے کام نہیں لیا ، سختی کے موقع پر پوری سختی کی ، نرمی کے موقع پر زیادہ سے زیادہ نرمی برتی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی دہشت بھی لوگوں کے دلوں پر بیٹھ گئی ۔ اور محبت بھی عوام کے دلوں پر قائم ہو گئی ۔ دہشت اس لیے کہ خطاکار کا سزا پانا ضروری تھا اور محبت اس لیے کہ مصیبت میں دستگیری کرنا اس کا شعار تھا ۔

منصورہ کی داستان اصطخری کی زبان سے

ابو اسحٰق اصطخری نے سندھ اور منصورہ کا ذکر (۳۴۰ھ) میں کیا ہے :

"شہر منصورہ سندھ کا پایہ تخت ہے ۔ یہ طول و عرض میں دو میل ہے ۔ جسے دریائے سندھ کی ایک شاخ گھیرے ہوئے ہے جس کے باعث یہ ایک جزیرہ نما کی شکل میں ہے ۔ یہاں کا فرمانروا ایک قریشی ہے جو ہبار ابن اسود کے خاندان میں سے ہے البتہ خطبہ اب تک خلیفہ بغداد کے نام کا پڑھا جاتا ہے منصورہ ایک گرم شہر ہے یہاں کھجور کے درخت بکثرت پائے جاتے ہیں البتہ انگور ، سیب ، امرود اور شفتالو وغیرہ نہیں ہوتے ہاں گنا خوب ہوتا ہے یہاں کا لیمو سیب کے برابر ہوتا ہے ، یہ ایک کھٹا پھل ہے ، شفتالو کے برابر ایک اور پھل ہوتا ہے جس کا نام آم ہے ۔ یہ پھل بڑے ارزاں ہوتے ہیں ۔ یہ شہر بہت سرسبز و شاداب ہے ۔"

سندھ اور ہند کا ذکر عرب مؤرخوں ، جغرافیہ نویسوں اور سیّاحوں نے بڑے اچھے اور محبت بھرے انداز میں کیا ہے ۔ ان مختلف کتابوں کے وہ ٹکڑے جو

ہندوستان کے ذکرِ خیر سے متعلق ہیں اگر مرتّب کیے جائیں تو ایک اچھی خاصی طویل اور ضخیم کتاب مرتّب ہو سکتی ہے جس سے مسلمانوں کی رواداری، وسعت قلب اور خلوص و دیانت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ملتان اور منصورہ پر اسمٰعیلیوں کا قبضہ

ہندو راجاؤں سے "باہمی اتحاد" کے معاہدے

سلطان محمود غزنوی سے ٹکر

سندھ کے متعلق ہم اس سے پہلے یہ بتا چکے ہیں کہ مسلمانوں کے زمانے میں بلکہ مسلمانوں سے بھی پہلے اس کا رقبہ وہ نہیں جو اب ہے بلکہ یہ ایک وسیع مملکت کا نام تھا، ملتان جو اب صوبہ پنجاب کا ایک شہر ہے اسی سندھ میں شامل تھا۔ اور محمد بن قاسم کی فتح کے تھوڑے ہی عرصے بعد ملتان ایک مستقل مملکت بن گیا جس کا سندھ کی حکومت سے جو خلافتِ اسلامیہ کے تابع تھی، کوئی تعلق نہیں رہ گیا۔ یہاں بنو منبہ کا خاندان حکمراں تھا۔ تاریخ کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً ۳۷۲ھ تک یہی خاندان حکومت کرتا رہا۔ مسعودی، اصطخری، ابن حوقل، ابن رستہ سب نے یہاں بنو منبہ کی آزاد اور خود مختار حکومت کا ذکر اپنے مشاہداتِ سیاحت میں کیا ہے۔ بشاری مقدسی نے اس علاقہ کا سفر کیا تو اس نے بنو منبہ کے بجائے اسماعیلیوں کی حکومت بتائی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ تقریباً ۳۷۲ھ میں ملتان کی حکومت اسماعیلیوں کے ہاتھ میں آئی۔ یہ پہلی حکومت تھی جو شیعہ جماعت کے ایک طبقے کے ہاتھ میں آئی۔ یہ لوگ فاطمی خلافت کا خطبہ پڑھتے تھے۔ اور خلافتِ عباسیہ سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے۔

سندھ میں اسماعیلی داعیوں کی آمد شروع ہی سے اسماعیلی داعی وقتاً فوقتاً سندھ میں آتے رہے، اپنا کام کرتے رہے

لیکن منصورہ میں انھیں کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ ناکامی سے دل برداشتہ ہونا تو یہ جانتے ہی نہیں تھے۔ ہر ناکامی ان کے سمندِ عزم پر تازیانے کا کام کرتی تھی۔ اور یہ پہلے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ اپنے کام میں لگ جاتے تھے۔ منصورہ میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی تو یہ ملتان کی طرف بڑھے یہاں کامیابی ان کی منتظر تھی۔ پہلے تو یہاں خفیہ طور پر دعوت کا کام شروع ہو گیا، جب وہ برگ و بار لایا اور عوام کی ایک معقول تعداد ہمنوا ہو گئی تو مصر کے اسماعیلی خلیفہ اور امام العزیز باللہ نے (متوفی ۳۸۶ھ) ایک فوجی مہم حلیم بن شیبان کی سرکردگی میں روانہ کی، یہ مہم ایسے راستے سے ملتان پہنچی کہ اس سے اور سندھ کی حکومت سے کسی مقام پر ٹکر نہیں ہوئی۔ اس مہم کا راستہ کیا تھا؟ کسی کو یہ بات واضح طور پر نہیں معلوم۔ ایک خیال جو بڑی حد تک قرینِ قیاس ہے یہ ہے کہ مہم خراسان کے راستے سے آئی ہو گی۔ اور یہ بات تاریخی شواہد سے پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ خراسان اسماعیلی امامت سے بہت زیادہ متاثر تھا اور یہاں اسماعیلیوں کا خاصا اثر و رسوخ تھا۔ ایک دوسرا قیاس یہ بھی ہے اور یہ بھی ناممکن نہیں کہ یہ مہم مکران کے راستے آئی ہو کیونکہ مکران کا والی بھی اسماعیلی دعوت سے بہت متاثر تھا۔ اور خطبہ فاطمیوں کا پڑھتا تھا۔ بہرحال یہ مہم کسی راستے سے بھی آئی ہو اس سے اور سندھ کی حکومت سے کسی جگہ بھی تصادم نہیں ہوا۔ اس واقعے سے حلیم بن شیبان کی احتیاط پسندی اور دُور اندیشی ظاہر ہوتی ہے۔

اسماعیلیوں کی فوج کس طرح پہنچی؟

یہ فوجی مدد جو پہنچی تھی ایک باقاعدہ پلان کے ساتھ اس نے کام کیا۔

یہ مہم جب ملتان کے قریب پہنچ گئی تو اسماعیلی داعیوں نے حالات ایسا پیدا کر دیے کہ اہلِ شہر نے اپنے حکمرانوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ بنو منبہ چونکہ اس اچانک بغاوت کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھے، گھبرا گئے۔ ابھی وہ کوئی اقدام اس بغاوت کو فرو کرنے کے سلسلے میں نہیں کر پائے تھے کہ یہ مہم پہنچی اور حلیم بن شیبان بہت معمولی سی جدّ و جہد کے بعد بنو منبہ کو ختم کرنے اور اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا، یہ جنگ اسلحہ اور ہتھیاروں کی اتنی نہیں تھی جتنی فکر و دانش کی۔ اسماعیلی بڑی ہوشیاری سے ایک فن کار

کی طرح نقشہ بناتے تھے اور اس پر قدم بہ قدم عمل کرتے تھے، ان کی کامیابی کا راز یہی تھا حلیم بن شیبان کی حکمتِ عملی کامیاب رہی اور بغیر کسی بڑی خونریزی اور جنگ کے ملتان کی حکومت اس کے ہاتھ میں آگئی۔ اور بغیر کسی خرخشے کے اطمینان اور بے فکری کے ساتھ وہ حکومت کرنے لگا، رعایا کا بڑا طبقہ پہلے ہی سے ہمنوا ہو چکا تھا حکمراں خاندان فنا کے گھاٹ اتر چکا تھا۔ سندھ کی حکومت میں یہ سکت نہیں تھی کہ وہ ملتان کی حکومت سے الجھ کر خواہ مخواہ اپنی مشکلات میں اضافہ کرتی۔ قدرت کی طرف سے حلیم بن شیبان کو یہ ایسی سہولتیں حاصل تھیں جن سے اگر وہ پورا پورا فائدہ نہ اٹھاتا تو کفرانِ نعمت کا موجب ہوتا۔ چنانچہ اس نے موقع سے فائدہ اٹھانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اور کامل یکسوئی کے ساتھ کاروبارِ حکومت سنبھال کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

حلیم بن شیبان کو حکومت چلانے کا سلیقہ تھا اس نے جو حکومت قائم کی وہ ہر اعتبار سے مضبوط و مستحکم ثابت ہوئی۔ اس نے اس انداز میں حکومت کی کہ کسی بھی داخلی یا خارجی دشواری سے اسے سابقہ نہیں پڑا۔ وہ رعایا کو خوش رکھنے کی بھی کوشش کرتا تھا اور حکومت کے رعب و وقار میں کسی قسم کی کمی بھی نہیں گوارا کرتا تھا۔

ابن شیبان کا عہدِ فرمانروائی

حلیم بن شیبان متعدد حیثیات سے چند خاص امتیازات کا حامل ہے۔

۱: ہندوستان میں وہ پہلا شخص ہے جس نے اسماعیلیوں کی حکومت قائم کی۔

۲: ہندوستان کے مسلمان فرمانرواؤں میں وہ پہلا شخص ہے جس نے مسلم قومیت سے روگرداں ہو کر سیاسی اتحاد و پیمان کی بنیاد ڈالی — اب تک یہ ہوتا آیا تھا کہ مسلمان والی اور حاکم ایک دوسرے کا خیال رکھتے تھے، ایک دوسرے کے ساتھ رعایت اور مروت کرتے تھے۔ اگر جنگ و پیکار کی نوبت آ بھی جاتی تھی تو وہ باہمی جنگ کی حدود سے آگے نہیں بڑھنے پاتی تھی۔ لیکن حلیم بن شیبان نے سندھ کے والی کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ اور آس پاس کے ہندو راجاؤں سے پیمانِ صلح و مودت اختیار کیا سیاسی معاہدے کیے اور جنگی تعاون اور موالات کا پروگرام بنایا۔

بات یہ تھی کہ حلیم بن شیبان خلافتِ فاطمیہ کا داعی اور منّاد تھا، وہ جانتا تھا اگر کبھی کوئی نازک وقت پڑا تو سندھ سے مدد کیا ملے گی ہاں اگر اس کے بس میں ہوا تو وہ استیصال میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرے گا مصر اور یمن اس قدر دور دراز واقع ہیں کہ ان سے کسی فوری امداد کی توقع نہیں کی جا سکتی لہٰذا اس نے یہی مناسب سمجھا کہ ہندوؤں سے میل جول بڑھائے اور امداد باہمی کا معاہدہ کر لے یعنی اگر ملتان پر سندھ یا خلافتِ عباسیہ کے عساکر حملہ آور ہوں تو راجہ اس کی مدد کریں اور اگر اس کے برعکس کوئی صورت ہو تو ملتان کی حکومت اپنے تمام ذرائع اور وسائل امداد و اعانت میں صرف کر دے۔ یہ بات مذہبی اور ملی نقطۂ نظر سے خواہ کتنی ہی عجیب اور افسوسناک ہو لیکن کوئی شبہ نہیں سیاسی اعتبار سے یہ بڑی گہری اور مستحکم تدبیر تھی۔ اور شاید اسی تدبیر کا یہ نتیجہ تھا کہ ایک عرصۂ دراز تک خاندان فاطمی ملتان پر بے غل و غش حکومت کرتا رہا۔

شیخ حمید تختِ حکومت پر

تاریخ میں ملتان کے فاطمیوں کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے (حالانکہ تاریخ و اثرات کے اعتبار سے یہ دور خاص اہمیت کا حامل ہے) اس لیے ان کے حالات جستہ جستہ ملتے ہیں اور حکمرانوں کی تاریخ آغاز و انجام کی تلاش میں بہت دشواری ہوتی ہے، بسا اوقات صرف قیاس اور شواہد سے کام لینا پڑتا ہے۔

بہر حال حلیم بن شیبان کے بعد تختِ حکومت پر ہمیں شیخ حمید متمکن نظر آتا ہے اندازہ یہ ہے کہ یہ سنہ ۳۷۶ھ میں تخت نشین ہوا۔ اس کا عہد بھی واقعات و حوادث کے اعتبار سے کئی خصوصیتوں کا حامل ہے۔ شیخ حمید حلیم کا (غالباً) بیٹا تھا۔ متعدد بیانات اور شواہد سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس نے حتی الامکان وہی پالیسی قائم رکھی جو حلیم کی تھی۔

سنہ ۳۷۸ھ میں لاہور کے راجہ جے پال سے محمود غزنوی کے باپ امیر سبکتگین کی جنگ ہوئی اس جنگ میں راجہ کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ جنگ کا آغاز اگرچہ راجہ کی طرف سے ہوا تھا لیکن امیر نے غایت رواداری اور شرافت سے نہ صرف اسے معاف کر دیا بلکہ اس کا راج پاٹ بھی اسی کے حوالے کر دیا، سنہ ۳۸۱ھ میں راجہ کی بدعہدی اور غداری کے باعث

دوسری جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں بھی پانسہ امیر کے ہاتھ رہا۔ اور راجہ نے بُری طرح شکست کھائی۔ اس مرتبہ دریائے سندھ تک کا علاقہ غزنی کے ماتحت ہو گیا۔

اس جنگ میں جلیم بن شیبان کی پالیسی کے مطابق شیخ حمید نے امیر کا ساتھ نہیں دیا۔ اس کی کوئی مدد نہیں کی، اس کے لیے کوئی سہولت بہم نہیں پہنچائی گئی بلکہ حسب معاہدہ جے پال کی علانیہ یا خفیہ حسب موقع مدد کرتا رہا۔ امیر نے جب جے پال کو شکست دے دی تو ملتان کی طرف متوجہ ہوا، وہ ہندو کو تو معاف کر سکتا تھا کہ وہ اس سے برسر جنگ ہے، اور اس کی تخریب کے درپے ہے لیکن ایک مسلمان کو اس کی اجازت نہیں دے سکتا تھا کہ وہ اسلام کا دعویٰ بھی کرے اور مسلمانوں کی تخریب بھی کرتا رہے دوستوں کو چھوڑ دے اور دشمنوں سے پیمانِ وفا باندھے۔ دشمنوں کا ساتھ دے اور دوستوں کی جڑ کاٹنے میں مصروف ہو جائے۔

اس باز پرس نے شیخ حمید کو پریشان کر دیا۔ ایک طرف منصورہ کی حکومت تھی جو کسی معرکے میں اس کی دوست نہیں تھی بلکہ ہر وقت اس تاک میں رہتی تھی کہ موقع ملے تو اسے ہضم کر لے، دوسری طرف لاہور کا راجہ تھا جو مسلسل اور پے بہ پے شکستیں کھا رہا تھا۔ اور امیر سبکتگین کے مقابلے کی قوت سے محروم ہو چکا تھا، تیسری طرف امیر تھا جس کا مقابلہ کرنا شیخ کے بس سے باہر تھا۔ جب راجہ جے پال بہت سے ہندوؤں کی مدد اور فوجی اعانت کے باوجود یہ کام نہ کر سکا تو شیخ حمید کیسے کر سکتا تھا جس کا اس وسیع سرزمین پر کوئی یار اور مددگار نہ تھا، لہٰذا صورتِ حال کا صحیح اندازہ کر کے اس نے امیر سے صلح کر لی اور خراج پر معاملہ طے ہو گیا اور جب تک شیخ زندہ رہا اپنے معاہدہ پر قائم رہا یعنی اس نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی جس سے ترکوں کو شکایت کا موقع ملتا۔ شیخ حمید کے بعد اس کا بیٹا شیخ نصر اقتدار و اختیار کا مالک بنا۔ اس نے بھی باپ کی پالیسی پر عمل کیا اور ترکوں سے چھیڑ چھاڑ نہ کرنے ہی میں عافیت سمجھی، اس کے بعد اس کا بیٹا ابوالفتوح داؤد بن نصر سریر آرائے حکومت ہوا۔

یہ غالباً ۳۹۴ھ میں تخت نشین ہوا۔

ابوالفتوح اور سلطان محمود غزنوی

ابوالفتوح داؤد بن نصر بڑا من چلا آدمی تھا موقع پرستی اس کے خون میں شامل تھی، یہ بھی اس حقیقت کو اچھی طرح محسوس کر رہا تھا کہ آس پاس کے مسلمان ملکوں سے کسی نازک موقع پر مدد نہیں مل سکتی۔ ہاں ان سے ضرر پہنچنے کا اندیشہ ضرور ہے۔ لہٰذا اس نے ہندو رجواڑوں اور راجوں سے پھر تجدید عہد کی اور ۳۹۵ھ میں اس نے اپنے طرز عمل سے یہ بات ظاہر کر دی کہ اس کی پالیسی شیخ حمید اور شیخ نصر کی سی نہیں ہے بلکہ خود کی وضع کردہ ہے جس میں حلیم کی پالیسی بھی شامل ہے، خود کی وضع کردہ ہم نے اس لیے کہا کہ اگرچہ اس نے ہندوؤں سے رشتہ جوڑا تھا لیکن وہ ملت دشمنی سے اتنا آگے نہیں نکل گیا تھا جتنا ابوالفتوح داؤد۔

۳۹۵ھ میں ایک ہندو راجہ سے جو ایک ریاست بھاٹیہ کا فرمانروا تھا، محمود غزنوی کی جنگ ہوئی، اس جنگ میں ابوالفتوح نے محمود کی کسی قسم کی مدد نہیں کی۔ البتہ راجہ بھاٹیہ کی ہر طرح سے مدد کی۔ یہ بات محمود غزنوی کو ناگوار گزری، لیکن ٹال گیا۔ دوسرے سال ۳۹۶ھ میں وہ ایک لشکر لے کر غزنی سے صرف یہ مقصد لے کر چلا کہ ابوالفتوح کی سرکوبی کرے۔ راستے میں لاہور پڑتا تھا۔ لاہور کے راجہ اور ملتان کے حکمراں میں فوجی معاہدہ ہو چکا تھا۔ اس نے محمود کے لشکر کو اپنے حدودِ مملکت سے گزرنے کی اجازت نہیں دی، چنانچہ بجائے اس کے کہ محمود غزنوی اور ابوالفتوح میں براہ راست جنگ ہو، راجہ انندپال جے پال کا جانشین اور محمود غزنوی میں معرکہ آرائی شروع ہو گئی اس معرکہ کا انجام راجہ کی شکستِ فاش کی صورت میں نمودار ہوا۔ اب محمود بھٹنڈہ ہوتا ہوا ملتان پہنچا۔ اب قیامت سر پر تھی۔ ابوالفتوح کو اپنے دوست اور کرم فرما راجہ انندپال (راجہ لاہور) کا انجام معلوم ہو چکا تھا اور اس واقعے کا علم ہونے کے بعد اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ اس نے سوچا جب اتنا بڑا راجہ جس کے پاس نہ فوج کی کمی تھی نہ روپے کی، یوں شکست کھا کر دربدر مارا مارا پھرنے پر مجبور ہو گیا ہے تو میں کیا کر لوں گا، لیکن یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ قلعہ کا پھاٹک کھول دے اور بغیر کسی شرط کے

محمود غزنوی کو خوش آمدید کہے۔

چنانچہ ابوالفتوح نے قلعہ بند ہو جانے کو مقابلہ کرنے کے بجائے ترجیح دی غزنوی نے محاصرہ کر لیا۔ سات روز تک یہ محاصرہ جاری رہا۔ شہر والے بھی صورت حالات کی نزاکت سے پورے طور پر واقف ہو چکے تھے۔ وہ ایک وفد بنا کر غزنوی کے حضور میں پہنچے اور دونوں میں صلح کرا دی۔ محمود غزنوی اگرچہ فتحمند تھا اور زیادہ سے زیادہ ذلت آمیز شرائط پیش کر کے انھیں منوا سکتا تھا لیکن اس کی عالی ظرفی نے اسے گوارا نہ کیا کہ مجبور اور بےبس دشمن پر زیادہ دباؤ ڈالے۔ اس نے صرف:

۱: دو لاکھ درہم سالانہ خراج

۲: دریائے سندھ کے متصل علاقے سے الحاق

پر صلح کر لی۔ اس علاقے کا غزنی کے تابع اور زیر نگیں رہنا ضروری تھا۔ ابوالفتوح کو یہ شرطیں ماننا پڑیں، اس طرح اس کی عزت بھی بچ گئی اور جان اور حکومت بھی لیکن ابوالفتوح فطرت کی طرف سے بڑی متمرّد اور سرکش طبیعت لے کر آیا تھا۔ غزنوی کے جاتے ہی پھر اپنے رنگ پر پلٹ آیا۔ وہی سرکشی، وہی باغیانہ انداز، وہی خودسری اور خودرائی، اس کے بعض حاشیہ نشینوں نے اسے سمجھایا کہ ہاتھی سے گنّے نہ کھائے جو معاہدہ ہو گیا ہے اس پر قائم رہے اور عافیت و اطمینان کے ساتھ حکومت کرتا رہے لیکن وہ نہ مانا، محمود کو جب اس کی اطلاع ملی تو اس نے آزمودہ را آزمودن جہل است کے مقولے پر عمل کیا اور پھر ایک لشکر لے کر ملتان پر چڑھ دوڑا۔ اس مرتبہ اس نے کسی قسم کی رعایت نہیں کی۔ اور ملتان کو حکومت غزنی کے ساتھ باقاعدہ ملحق کر کے اس فتنے کا خاتمہ کر دیا۔ جو نہ صرف غزنی کے لیے بلکہ مسلمانوں کے لیے ناقابل برداشت بن چکا تھا۔ یہ واقعہ ۴۰۱ھ کا ہے یوں ابوالفتوح داؤد کی زندگی تو بچ گئی یعنی محمود نے اسے صرف گرفتار کر لینے پر اکتفا کیا سزائے قتل نہیں دی لیکن اس کے جوشِ غضب اور جوشِ انتقام کی زد میں ملتان کے شہری بھی آئے اور وہ لوگ خاص طور پر آئے جو ابوالفتوح کے دست و بازو بنے ہوئے تھے۔

منصورہ پر اسمٰعیلیوں کا قبضہ

اسماعیلیوں کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ شکست کھانے کے باوجود ہارنا نہیں جانتے تھے۔

۴۰۱ھ میں ملتان کا صوبہ سر ہو گیا۔ اسماعیلیوں کی حکومت ختم ہو گئی۔ اسماعیلی فرمانروا گرفتار کر کے نظر بند کر دیا گیا۔ اور محمود غزنوی پورے طور پر مطمئن ہو کر غزنی واپس چلا گیا۔ لیکن اسماعیلی نچلے بیٹھنے والے نہیں تھے، وہ اپنی تدبیروں اور اسکیموں سے غافل نہیں تھے۔ ایک پل کے لیے بھی ان پر غفلت طاری نہیں ہونے پاتی تھی۔ وہ برابر اس فکر میں رہتے تھے کہ جو کچھ کھو چکے ہیں اسے کس طرح حاصل کریں!

منصورہ پر اب تک ہباری خاندان حکومت کر رہا تھا، مرور ایام کا اثر جس طرح واقعات و حوادث پر پڑتا ہے اسی طرح اشخاص و افراد پر قوموں اور ملتوں پر حکومتوں اور انسان کے قائم کیے ہوئے نظاموں پر بھی پڑتا ہے۔ گزشتہ صفحات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ منصورہ پر ہباری حکومت کس شان سے قائم ہوئی تھی اور کتنی خونریزیوں کے بعد قائم ہوئی تھی لیکن اب وہی ہباری حکومت تقویم پارینہ بن چکی تھی، نہ اس میں کوئی دم خم تھا نہ رعب و سطوت، نہ استحکام تھا نہ وقار شاہی! وہ صرف ایک بیجان ڈھانچے کی صورت میں موجود تھی اور ہوا کا ایک جھونکا اس کے وجود کو ختم کر سکتا تھا، اس کی زندگی کا چراغ گل کر سکتا تھا، چنانچہ یہی ہوا۔

ملتان کے ستم رسیدہ، تباہ حال، آشفتہ روزگار، خانماں برباد اور شکست یافتہ اسماعیلیوں نے اپنا جائزہ لیا تو محسوس کیا کہ اگرچہ وہ شکست کھا چکے ہیں، اگرچہ ان کا دم خم ختم ہو چکا ہے، اگرچہ ان کی حکومت فنا کے گھاٹ اتر چکی ہے لیکن ان میں اب تک زندہ رہنے اور زندگی کو قائم رکھنے کی امنگ ہے، ان کا سینہ زندگی کی اس تمنا کو بر دئے کار لانے کے جذبے سے معمور ہے، وہ اب بھی کسی مقصد کے لیے مر سکتے ہیں اور جو لوگ زندگی کو حاصل کرنے کے لیے موت کو لبیک کہنے پر تیار ہوتے ہیں وہ کسی نہ کسی نہج سے کامیاب ضرور ہوتے ہیں۔

ملتان کے اسماعیلیوں نے اپنا بکھرا ہوا شیرازہ مجتمع کیا۔ اور منصورہ کی ہباری حکومت کا تختہ الٹ دیا!

لیکن یہ حکومت پندرہ سولہ سال سے زیادہ زندہ نہ رہ سکی، فتح سومنات کے بعد ۴۱۶ھ میں محمود غزنوی جب اس طرف سے گزرا تو منصورہ والوں نے اس کی فوج کو بہت پریشان کیا، جاٹوں اور میدھوں کو ہشکار دیا، انھوں نے اور بھی زیادہ اشتعال انگیز حرکتیں کیں، محمود کو جب تاب نہ رہی تو اس نے منصورہ پر اچانک حملہ کردیا۔ شیخ حنیف فرمانروائے منصورہ مقابلے پر آیا اور جی توڑ کر مقابلہ کیا لیکن تاب نہ لاسکا اور شکست کھانے پر مجبور ہو گیا۔

منصورہ کی اسماعیلی حکومت ختم ہو گئی، لیکن اسماعیلیوں کو فاطمی خلافت سے جو تعلق تھا وہ بدستور قائم رہا۔ جیسے ہی ظاہری حکومت ختم ہوئی باطنی حکومت کا آغاز ہو گیا۔ یعنی خلافتِ فاطمی کی طرف سے ایک زمیندار سومرہ نامی کو روحانی تاجدار تسلیم کر لیا گیا۔ اور جلد ہی اس نے پرپرزے نکالنا شروع کر دیے۔ چنانچہ کچھ عرصے بعد یہ خاندان بھی مسندِ باطن سے تختِ ظاہر پر رونما ہوا۔ اور کم و بیش پیہم سو سال تک یہ بھی حکومت کے جوہر دکھاتا رہا۔

منصورہ فتح کر لینے کے بعد محمود غزنوی زیادہ عرصے تک نہیں ٹھیرا۔ تھکا ہوا تھا، فوج پر ماندگی غالب آچکی تھی۔ گھر سے نکلے ہوئے بہت دن ہو چکے تھے۔ غزنی سے لے کر سومنات تک کی یلغار اسی کا حصہ تھی۔ پھر واپسی پر دوسری الجھنوں نے اور پریشان کر دیا۔ لہٰذا محمود نے مناسب یہی سمجھا کہ واپس چلا جائے اور سندھی جاٹوں کی سرکوبی کسی آئندہ موقع کے لیے ملتوی رکھے۔ محمود کا یہ اصول تھا کہ ایک مہم ختم کرتے وقت یہ فیصلہ اس نے کر لیا کہ جلد آنا ہے اور آتے ہی سندھی جاٹوں کا قلع قمع کرنا ہے!

سندھی جاٹوں کا استیصال

اس ذہنی قرارداد کے ماتحت ۴۱۸ھ میں محمود دوبارہ ملتان آیا۔ یہاں اس نے

سندھی جاٹوں کی سرکوبی کا پروگرام بنایا۔ اور نکل کھڑا ہوا۔ یہ جاٹ بالکل اُجڈ اور گنوار تھے مقابلے کے لیے نکل پڑے، غزنوی کے لشکر کی ٹکر نہ سہہ سکے اور بڑی آسانی سے نیست و نابود ہو گئے، ان کے خاتمے کے بعد مالِ غنیمت اور لونڈیوں، غلاموں کا بہت بڑا انبار لے کر محمود غزنوی پھر اپنے دار السلطنت غزنی پہنچ گیا مقصود چونکہ صرف جاٹوں کی سرکوبی تھی، کسی دوسری طرف اس نے توجہ نہ کی!

محمود کے حملوں کے سلسلوں میں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ غیر مسلم مورخ اس پر چاہے جتنے سنگین الزامات عائد کریں اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ متعصب ہرگز نہیں تھا ورنہ اس کی فوج میں ہندو بہ تعداد کثیر موجود نہ ہوتے جیسا کہ خود جلیل القدر ہندو مورخ ڈاکٹر سیتا رام نے اپنی تازہ کتاب "امیر خسرو" میں اعتراف کیا ہے۔

سومرہ خاندان

عروج و زوال کی داستان!

قباچہ اور خوارزم شاہ!

تقریباً ساڑھے چار سو سال تک سومرہ یا سامرہ خاندان نے سندھ کے علاقے پر حکومت کی۔ یہ خاندان بھی اسماعیلی (آغاخانی) تھا۔ اس خاندان کی اصل و نسل کے بارے میں مؤرخین مختلف الآراء ہیں۔ کوئی انہیں ہندو راجپوت قرار دیتا ہے کسی کا خیال ہے کہ یہ راجپوت تو تھے لیکن مسلمان ہو گئے تھے۔ علامہ سلیمان ندوی مغفور کی تحقیق یہ ہے کہ مخلوط النسل عرب خاندان، بہرحال ان کی اصل و نسل کچھ بھی ہو یہ متفقہ ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ لوگ جس مسلک کے پیرو تھے وہ وہی تھا جو آج بھی آغاخانیوں کی صورت میں عرب اور بیرونِ عرب کے ممالک میں موجود ہے۔ اسماعیلیوں کا ایک خاص وطیرہ یہ بھی ہے کہ جس ملک میں رہتے ہیں وہاں کے نام اختیار کر لیتے ہیں، وہاں کی زبان بولتے ہیں، وہاں کا لباس پہنتے ہیں، وہاں کی معاشرت اختیار کر لیتے ہیں، ان میں سے کوئی چیز بھی ان کے عقائد پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ آج بھی بمبئی، کھمبات اور دوسرے مقامات کے خوجوں یعنی آغاخانیوں کو دیکھ لیجیے۔ نام ہندوانہ، لباس ہندوانہ، زبان مقامی لیکن عقائد کے اعتبار سے کٹر اسماعیلی۔ یہ صورت صرف آج ہی نہیں ہے ہمیشہ سے چلی آتی ہے۔ چنانچہ سومرہ خاندان کو بھی ہم اس امتیاز کا حامل پاتے ہیں۔

بہرحال سلطان محمود غزنوی نے جب ملتان فتح کر لیا تو سومرہ نامی شخص نے مصر کی فاطمی

حکومت کے داعی کی حیثیت سے پوشیدہ طور پر تبلیغ و دعوت کا کام شروع کر دیا۔ ۴۲۲ھ میں سومرہ کا لڑکا راجہ پال باپ کے انتقال کے بعد جانشین بنا۔ یہ "راجہ" اگرچہ کسی حکومت کا مالک نہیں تھا لیکن اس خطاب سے اس لیے مخاطب کیا جاتا تھا کہ دولت مند تھا بہت بڑی جاگیر کا مالک تھا، فاطمیوں نے اسے "شیخ" کا خطاب مرحمت کیا تھا اور تمام سندھ کے اسماعیلیوں کے دلوں پر یہ حکومت کر رہا تھا۔ راجہ پال نے بار بار — محمود غزنوی کے واپس جانے کے بعد ملتان اور سندھ میں بغاوتیں برپا کرائیں لیکن سندھ پر حکومت کرنے کی حسرت پوری نہ کر سکا۔

بیس سال تک یہ خفیہ کش مکش جاری رہی یہاں تک کہ محمود غزنوی کا انتقال ہو گیا۔ اس کے جانشین اتنی بڑی حکومت کو سنبھالنے کی اہلیت اور صلاحیت سے محروم تھے، دور دراز کے مقامات پر خاص طور سے زیادہ انتشار و اختلال کا اثر پڑا۔ آخر ۴۴۳ھ میں جب غزنوی سلطنت کا چراغِ حیات جھلملا رہا تھا اور ہر آن اس کے بجھنے کا اندیشہ پیدا ہو رہا تھا اسماعیلی اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے اور سارے سندھ پر سومرہ خاندان کی باقاعدہ حکومت قائم ہو گئی۔ اب جو شخص اورنگ نشینِ حکومت ہوا اس کے بارے میں یہ تو ثابت ہے کہ راجہ پال کا لڑکا نہیں تھا کیونکہ وہ لاولد فوت ہو چکا تھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ شخص خاندانِ سومرہ ہی سے تھا اور اس کا لقب بھی سومرہ تھا۔ اس نے نیک نامی، اولوالعزمی اور بلند ہمتی کے ساتھ فرائضِ حکومت انجام دیے۔ پندرہ برس حکومت کر کے یہ مر گیا۔ پھر اس کا بیٹا راجہ سنگھر تخت نشین ہوا اس نے بھی تقریباً اتنی ہی مدت تک حکومت کی اس کے بعد انتقال ہو گیا یہ بھی لاولد مرا۔ اس لیے اس کی بیوی نے نظمِ مملکت اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ رانی کے دو بھائی تھے جو رانی کی مدد کرتے تھے اور نظمِ مملکت میں اس کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ پھر شہاب الدین غوری نے سندھ پر حملہ کیا۔ ملتان اور دیبل کا علاقہ فتح کر لیا۔ سندھ کا والی علی کرماخ کو بنایا جو سنہ ۵۸۲ھ تک اس منصب پر مامور رہا۔ پھر سنہ ۶۰۱ھ میں یہ علاقہ بہ عہد ناصر الدین قباچہ پھر ہمیں آزاد اور خود مختار نظر آتا ہے پھر سنہ ۶۰۷ھ میں جب قباچہ دلی کی مرکزی حکومت سے آزاد ہو کر خود مختار فرمانروا بن گیا تو اس نے سندھ

پر خاص توجہ کی، اس نے سندھ کے متعدد مقامات فتح کر لئے۔ اور ٹھٹھہ کے علاوہ سندھ کا سارا رقبہ تقریباً زیر نگیں کر لیا۔ سومرہ خاندان کا اثر و اقتدار اب بھی موجود تھا، قباچہ نے اس طرف توجہ کی اور سومروں کو کچلنے کی سرگرم کوششیں شروع کر دیں۔ لیکن ٹھٹھہ اب تک ان کے تصرف میں تھا اور یہاں ان کی چھوٹی سی ریاست قائم تھی پھر ۶۲۰ھ سے ۶۲۷ھ تک جلال الدین خوارزم شاہ سندھ کی سرزمین کو پامال کرتا رہا اس نے ٹھٹھہ پر قبضہ کر لیا۔ اور یہاں پر بیٹھ کر دوسرے مقامات پر تاخت و تاراج کا سلسلہ جاری رکھا۔ خوارزم شاہ جب چنگیز کی آمد کے باعث مکران ہوتا ہوا عراق چلا گیا تو پھر قباچہ نے سندھ پر توجہ کی اور اس مرتبہ ٹھٹھہ پر بھی قبضہ کر لیا۔

اسماعیلیوں کا نیا مرکز

لیکن اسماعیلی اس مدّ و جزر اور ہزیمت و شکست، اختلال و انتشار سے ذرا بھی دل برداشتہ نہیں ہوئے، ایک مرکز ہاتھ سے جاتا رہتا دوسرا اپنا لیتے، چنانچہ اب انھوں نے ایک دوسرا مرکز قائم کر لیا۔ ایک سومرہ سردار محمد تور نے اپنے نام پر ایک گاؤں آباد کیا۔ اور یہی اسماعیلیوں کی حکومت اور دعوت کا مرکز بن گیا۔ اس نے ۳۳۵ھ تک حکومت کی، اس کے بعد جو دور آتا ہے، وہ تاریخ کا عجیب و غریب دور ہے، دہلی میں حکومتیں بدل رہی تھیں بدنظمی اور انتشار کے آثار دور دراز کے علاقوں میں خاص طور پر نظر آتے تھے، سندھ کی حالت اور زیادہ ابتر تھی۔ اگرچہ بادِ مخالف میں سومرہ خاندان کا چراغ مملکت ٹمٹما رہا تھا لیکن تیل ختم ہو چکا تھا۔ صرف ایک جھونکا اُسے گل کر دینے کے لیے کافی تھا۔ خانہ جنگیوں نے اور سندھ پر بار بار دوسرے فرماں رواؤں کی طرف سے مسلح اور مکمل حملوں نے سومرہ خاندان کی حکومت کو متزلزل کر دیا۔ اور ۷۵۲ھ میں تو یہ حکومت بالکل ختم ہو گئی۔

اب ایک نئی طاقت ابھر رہی تھی، یہ سمّہ قوم تھی، مکران کو چھوڑ کر مغربی سندھ سے جنوبی سندھ تک سمّہ قوم کی طاقت پھیلی ہوئی تھی، اگرچہ یہ قوم اب تک محکوم و درماندہ تھی، لیکن دم خم سے معلوم ہوتا تھا کہ حالات جیسے ہی ذرا ساز گار ہوئے یہ حکومت کی باگ اپنے

ہاتھ میں لے گی۔ اور سومرہ خاندان کی حکومت ختم کر دے گی۔ اور ایسا ہی ہوا بھی!

اسماعیلی راعی سے رعایا بن گئے

یہ وقت اسماعیلیوں کے لیے خاص طور پر بہت ہی مایوس کن اور تباہ کن تھا۔ قسمت مخالف ہو چکی تھی، حالات بد سے بدتر ہوتے چلے جا رہے تھے حکومتیں مٹ رہی تھیں، اقتدار کا چراغ گل ہو رہا تھا، اثر و رسوخ کی بنیادیں ہل رہی تھیں، دُنیا کے گوشے گوشے سے اسماعیلیوں کی سطوت و ہیبت ختم ہو رہی تھی۔

۵۲۴ھ میں آمر باحکام اللہ کے انتقال کے بعد اسماعیلیوں میں اختلاف و افتراق کی بنیاد پڑ گئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یمن خود مختار ہو گیا۔ سندھ اور ہند کے علاقے یمن ہی کے ماتحت تھے۔ اُدھر مصر پر کچھ روز بعد صلاح الدین ایوبی کا قبضہ ہو گیا۔ اور فاطمی حکومت کی بچھی بچھائی مسند اُٹھ گئی۔ اب سندھ کا تعلق یمن سے ہو گیا۔ یعنی وہاں کے داعی یہاں آنے جانے لگے۔

۶۵۴ھ میں فتنۂ تاتار اٹھا اور ہلاکو خاں نے نزاری حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ اس طرح اسماعیلیوں کے ہاتھ سے سیاسی اقتدار و اختیار کی باگ اس طرح نکل گئی کہ پھر وہ ان کے ہاتھ نہ آسکی۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ اسماعیلی جب اقتدار حکومت سے محروم ہوئے تو پھر کہیں نہ جم سکے اب اُن کی حیثیت رعایا کی ہو گئی جو امن پسند تھے وہ عافیت کی زندگی بسر کرتے جو ہنگامہ آرا طبیعت کے مالک تھے وہ تعزیر و انتقام کے مستحق قرار پاتے۔

سمہ خاندان کا تسلط

سمہ قوم کے برسر اقتدار آنے کے بعد حالات کچھ ایسے پیش آئے کہ آغاخانی داعیوں سے لوگ منحرف ہو گئے لیکن کسی نہ کسی درجے میں اپنی انفرادیت قائم رکھی اور اپنے جذبۂ دیرینہ کی پرورش بھی کرتے رہے اور اپنی خفیہ تنظیم کا وجود بھی کسی نہ کسی طرح قائم رکھا۔

سب سے پہلا سومرہ جو راجہ سوم رائے کے نام سے معروف تھا، محمود غزنوی کی فتح ملتان کے بعد نمایاں ہوا اور ۷۵۲ھ میں یہ خاندان ساڑھے چار سو سال تک انقلابات اور بادِ حوادث کا مقابلہ کرتے کرتے ختم ہو گیا اور پھر یہ کبھی نہ ابھر سکا یعنی سیاسی طاقت اور اقتدار حاصل نہ کر سکا۔

ہم نے تاریخ ہند کے اس اہم حصہ کو قدرے وضاحت سے بیان کیا ہے۔ اس لئے کہ ہماری نظر میں تاریخ ہند (عہد مسلمانان) کا وہ حصہ اپنی اہمیت کے اعتبار سے بہت زیادہ لائق غور و خوض ہے، جو عربوں سے شروع ہوتا ہے۔

عرب جب سندھ میں داخل ہوئے تو اس سرزمین پر بتوں کی پرستش ہو رہی تھی، ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو خدائے واحد کے سامنے سر جھکاتا ہو۔ یا رسالت محمدی پر ایمان لایا ہو۔ عربوں نے تلوار کا استعمال صرف میدان جنگ میں کیا، وہ بھی بہت احتیاط کے ساتھ رحم و رعایت اور مروت و احسان کا سلسلہ خوں ریزیوں کے ہجوم میں بھی جاری رکھا۔ اور اسی لئے بغیر کسی خاص سعی و کوشش کے یہاں اسلام پھلا پھولا، پروان چڑھا اور ایک مختصر مدت میں یہ حالت ہو گئی کہ آبادی کا غالب ترین حصہ اسلام قبول کر چکا تھا۔ اور جو لوگ مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ وہ بھی اسلام سے بہت زیادہ قریب آ گئے تھے۔ اب اسلام یہاں مسافر اور اجنبی کی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ وہ یہاں مقیم ہو گیا تھا۔ اس نے یہاں کا توطن اختیار کر لیا تھا، وہ یہاں کی زبان پر معاشرت پر رسم و رواج پر، تقویم پر، لباس اور غذا پر تعلیم و تہذیب' ثقافت اور سماج پر اپنے ایسے گہرے نقش قائم کر چکا تھا۔ جو ان مٹ تھے، جو آج بھی باقی ہیں اور تا قیام قیامت باقی رہیں گے۔

اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ عربوں کا ہر حملہ جو کسی دوسرے ملک پر ہوتا تھا ہوس ملک گیری، حصولِ مال و زر اور حبِ جاہ و منفعت کے لئے نہیں ہوتا تھا۔

وہ صرف کلمۃ الٰہی کی سربلندی کے لئے کفن سر سے باندھ کر گھر سے باہر نکلتے تھے، خلوص کبھی بھی بے اثر نہیں رہتا۔ چنانچہ ان کے اسلامی خلوص کا پرتو کفر آشنا دلوں پر پڑتا اور جو لوگ ان کے بدترین دشمن ہو سکتے تھے، وہی بہترین دوست بن جاتے تھے۔

کاروانِ اسلام منزل بہ منزل

دوسروں کو دیکھ کر انسان بہت کچھ سیکھتا ہے
بہت کچھ حاصل کرتا ہے

بے شک ان لوگوں کو اپنا دھرم عزیز تھا اپنے سماج سے پیار تھا۔ اپنے رواج پسند تھے لیکن اب ان کے ساتھ ایک دوسرا دھرم بھی تھا۔ اب یہ ایک اور سماج کو بھی دیکھ رہے

تھے۔ اب ان کی نظر ان رسوم پر، ان رواجوں پر تھی، جو یہ نئے آئے ہوئے حاکموں کے ہاں دیکھ رہے تھے۔ انسان کی فطرت ہے کہ ایسے موقع پر وہ ضرور دل ہی دل میں اپنا اور غیر کا موازنہ کرتا ہے۔ اپنا احتساب کرتا ہے اور دوسرے پر تنقید کرتا ہے۔ اپنی خامیوں کو ٹٹولتا ہے۔ اور دوسرے کی خامیوں پر نظر رکھتا ہے۔ اور جب کوئی آخری فیصلہ کرتا ہے تو دنیا کے سامنے یہ بات آجاتی ہے کہ یہ ادھر سے نکل کر ادھر آگیا ہے۔

مسلمانوں کو نماز پڑھتے ایک دوسرے سے مؤاخات اور مساوات کا برتاؤ کرتے، حاکم کو محکوم سے اور محکوم کو حاکم سے ملتے دیکھ کر انہوں نے موازنہ کیا، پھر احتساب کیا، بہت سے ایسے تھے جو اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکے۔ باپ دادا سے ترکہ نہیں پائے ہوئے تھے۔ دھرم کو چھوڑ بیٹھے اور اس نئے دین کو اختیار کر لیا۔

یہ داستان اتنی دل آویز تھی کہ اسے لاکھ ایجاز و اختصار کے ساتھ بیان کیا جاتا، لیکن ممکن نہ تھا کہ ضروری اور اہم گوشے نظر انداز کر دیے جاتے، اس لئے سب سے پہلے ہم نے تسخیر سندھ کی طرف توجہ کی اور پہلے یہی داستان بیان کر ڈالی۔

اب قلم کا مسافر دوسری سمت یعنی درّۂ خیبر کے راستے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھے گا۔ اور اس راستے سے آنے والوں کے کارناموں، کردار و سیرت، طور و طریق، اور انداز و اسالیب کو بیان کرے گا۔ ہندوستان پر مسلمانوں نے تقریباً ایک ہزار سال تک حکومت کی۔ اس طویل مدت میں بہت سے نئے خاندان ابھرے، بہت سی نئی حکومتیں قائم ہوئیں، بہت سی نئی شخصیتیں نمودار ہوئیں۔ ان سب کو بھی ان کا حق ملے گا۔ ان کی بھی وہ تمام باتیں زیر بحث آئیں گی، جو کسی نہ کسی حیثیت سے لائق اعتنا ہیں۔

اب وہ باب جو سندھ پر مشتمل تھا ختم ہوتا ہے اور وہ باب جو درّۂ خیبر کے نشیب و فراز سے تعلق رکھتا ہے، شروع ہوتا ہے ——— خدا کرے قلم اپنا فرض دیانت کے ساتھ ادا کرے۔

سترھویں منزل

ہندوستان کے غیر عرب مسلمان حکمران

سلطان محمود غزنوی

دنیا کا بہت بڑا اور منچلا سپہ سالار

سندھ کے سلسلہ میں ہم تاریخ کے خاص خاص حصص پیش کر چکے ہیں، اب شمالی ہند اور دوسرے اقطاع ہند کی باری آتی ہے، یوں تو ہندوستان پر سکندر اعظم سے ماقبل و مابعد متعدد حملے ہوئے، لیکن اصلی اور فیصلہ کن حملہ محمود غزنوی کے دور میں ہوا، اس حملہ نے بھارت کو مستقل طور پر مسلمانوں کا نشیمن بنا دیا۔

فتوحات کا آغاز

امیر سبکتگین کے انتقال کے بعد حالات بہت زیادہ ابتر ہو گئے لیکن محمود ۳۸۷ھ میں صاحب طبل و علم بن گیا اور اس نے حالات سنبھال لئے

محمود جب تخت پر بیٹھا تو حالات سبکتگین کے عہد سے کہیں زیادہ نامساعد تھے، بغاوتیں شورشیں اور سازشیں ہر طرف بکھری ہوئی تھیں، لیکن چند ہی سال کی مدت میں بڑی خوبی کے ساتھ وہ ان تمام چیزوں پر غالب آگیا، خراسان پر اس کا قبضہ مکمل ہو گیا۔ غزنی کی سالمیت تسلیم کر لی گئی!

طبعاً محمود بڑا جیالا اولوالعزم اور من چلا شخص تھا، جو حکومت اسے باپ سے ورثہ میں ملی تھی وہ اس کے لئے کافی نہیں تھی۔ جو حکومت اس وقت اس کے قبضہ میں تھی اس پر بھی اس کی حوصلہ مندی قناعت کرنے پر راضی نہیں تھی، وہ بڑی آسانی سے آس پاس کی نسبتاً کمزور اسلامی مملکتوں پر اپنا پرچم لہرا سکتا تھا، اور ان کی آزادی ختم کر کے اپنی فرماں روائی کا ڈنکا بجا سکتا تھا،

لیکن اس نے عمداً اس سے احتراز کیا، اس نے اپنی ایک پالیسی مرتب کر لی - اور اس پر سختی سے عمل درآمد شروع کر دیا، پالیسی یہ تھی کہ معاصر مسلم حکومتوں سے از خود چھیڑ چھاڑ نہ کی جائے، نہ ان کی آزادی اور استقلال پر حملہ کیا جائے، ہاں حالات مجبور کر دیں تو بات دوسری ہے، دوسرے یہ کہ جدوجہد کا اصلی مرکز ہندوستان کو بنایا جائے، محمود اس بات کو بھولا نہیں تھا کہ بدعہد جے پال بار بار وعدہ خلافیاں کر چکا تھا، بدعہدیاں کر چکا تھا، معاہدے توڑ چکا تھا، قول و قرار سے پھر چکا تھا، صرف یہی نہیں بلکہ بار بار اپنی طرف سے چھیڑ چھاڑ کا آغاز کر چکا تھا

جے پال اب تک زندہ تھا اور اپنی شرارتوں سے باز نہیں آیا تھا، تاریخ فرشتہ نے صراحت کے ساتھ اس کی مفسدہ پردازیوں کا ذکر کیا ہے، یہ محمود کی خوش قسمتی تھی کہ اسے بطور خود جے پال سے چھیڑ چھاڑ نہیں کرنا پڑی بلکہ جے پال ہی اپنی حرکتوں کے باعث اس معرکہ کا سبب بنا۔ چنانچہ ۳۹۴ھ میں حوالیٔ پشاور میں ایک زبردست اور خوں ریز جنگ ہوئی اس جنگ کا نتیجہ بھی وہی ہوا جو اس سے پہلے بھی ہو چکا تھا - راجہ بری طرح ہارا، بڑی بے ترتیبی کے ساتھ اس کی فوج بھاگی بے اندازہ مال غنیمت محمود کے ہاتھ آیا، راجہ نے پھر اطاعت کا عہد کیا، خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا، محمود نے راجہ سے قول و قرار لے کر اسے معاف کر دیا، اس کی حکومت بھی اسے بخش دی، لیکن دریائے جہلم کے کنارے نندنہ نامی قلعہ پر قبضہ کر لیا اس قبضہ سے فوجی مصالح کے باعث دست بردار نہیں ہوا،

دوسرے سال ۳۹۵ھ میں وہ ایک اور مغرور اور متمرد راجہ سے برسرپیکار رہا جو بھٹنڈا کا فرماں روا تھا، راجہ کو ذلت بخش شکست ہوئی اور اس نے وفور غیرت سے خودکشی کر لی، محمود بھٹنڈا فتح کرنے کے بعد غزنی واپس چلا گیا،

سال آرام کرنے کے بعد ۳۹۶ھ میں محمود پھر اپنے دارالسلطنت سے نکلا، اس مرتبہ پیش نظر ملتان کی سرکوبی تھی، ملتان تک پہنچنے کے لئے فوج کو لاہور سے گزارنا تھا لیکن لاہور کے راجہ نند پال نے (جو جے پال کے بعد تخت نشین ہوا تھا) اندیشہ ہائے دور دراز کے ماتحت محمود کو راستہ دینے سے انکار کر دیا، چنانچہ پہلی جھڑپ نند پال سے ہوئی، وہ محمود کا وار نہ سہ سکا، مجبور ہو کر بھاگ کھڑا ہوا، محمود ملتان پہنچا اور فرماں روائے ملتان ابوالفتوح

کے سر پر تلوار بن کر پہنچ گیا، لیکن ابوالفتوح بھی ایک زیرک آدمی تھا، اس نے صورت حال کی نزاکت کا اچھی طرح احساس کرلیا، باطنی عقائد سے (بظاہر) توبہ کی اطاعت کا حلف اٹھایا، آئندہ ہر مرحلہ پر امداد و اعانت کا وعدہ کیا، خراج ادا کرنے پر آمادگی ظاہر کی اور اس طرح موت کے چنگل میں پہنچ کر صحیح سلامت نکل آیا، محمود نے اسے معاف کر دیا، اور اس سارے علاقہ (موجودہ سرحد اور پنجاب) کا وائسرائے ایک نومسلم شخص سکھپال کو بنا کر پھر اطمینان سے غزنی روانہ ہوگیا،

سکھ پال نومسلم تھا اور محمود نے اس پر اس درجہ اعتماد کیا تھا کہ اسے اپنا نائب بنا کر، اور پشاور کو اس کا صدر مقام بنا کر اور تقریبًا سارے (موجودہ مغربی پاکستان کو اس کی تحویل میں دے کر وہ غزنی چلا گیا تھا، ہندو راجاؤں نے سوچا اگر کسی طرح سکھ پال قبضہ میں آجائے تو پھر بغیر کسی زحمت کے محمود کے سارے مقبوضات چھینے جا سکتے ہیں

انند پال کی فوجی تیاریاں حدِ کمال کو پہنچی ہوئی تھیں پھر قنوج، گوالیار، کالنجر، دلی اور گجرات کے راجاؤں نے بھی دل کھول کر مالی اور عسکری مدد دی تھی، بلکہ لاؤ لشکر لے کر جمع ہوگئے تھے کہ مقبوضات محمودی پر متحدہ حملہ کریں۔

ادھر خوبیٔ قسمت سے سکھ پال بھی بہکاوے میں آگیا، اس نے محمود کی عنایات خسروی کو فراموش کر دیا، اور مرتد ہوکر پورے طور پر انند پال کا رفیق و دمساز بن گیا، میدان جنگ پشاور کے قریب ایک جگہ قرار پائی،

محمود غزنوی کو جب راجگان ہند کے ایکے کی خبر ملی، اور سکھ پال کی غداری اور نمک حرامی کی خبر پہنچی، پھر انند پال اور راجگان ہند کے عسکری اجتماع کا حال معلوم ہوا تو فورًا بھارت کی طرف چل پڑا،

دشمنوں کی شکست فاش

محمود تن تنہا تھا اور مقابلہ میں راجگان ہند کا متحدہ لشکر تھا، قدرتًا محمود کمتر تھا اور اس کے حریف برتر، محمود کے پاس سامانِ جنگ بھی کم تھا، سپاہی بھی کم تھے، دشمنوں کے پاس سامانِ جنگ کی افراط تھی اور سپاہ شمار سے خارج تھی، انہی دشمنوں میں ایک بنا گروہ بھی تھا یہ کھوکھر تھے، بڑے لڑاکو، بڑے

جنگجو، بڑے بہادر، بڑے نڈر، بڑے وحشی اور سرفروش، بظاہر یہ نظر آ رہا تھا کہ اس مرتبہ محمود کو ایسی شکست ہوگی کہ گذشتہ ساری فتوحات پر پانی پھر جائے گا اور اس کے حریف اس طرح جیتیں گے کہ ان کی گزشتہ ساری ہزیمتوں کا کفارہ ادا ہو جائے گا ——— لیکن قدرت مسکرا رہی تھی۔

یہ جنگ سنہ ۱۰۰۸ء میں پوری خوں فشانی اور ہلاکت خیزی کے ساتھ برپا ہوئی تھی، فرشتہ نے اس جنگ کا حال کافی تفصیل سے لکھا ہے۔ خود محمود بھی زیادہ پُر امید نہیں تھا، وہ بار بار سجدے میں گرتا تھا اور خدائے قدوس سے گڑگڑا گڑگڑا کر فتح و نصرت کی دعائیں مانگتا تھا۔

آخر کار جنگ شروع ہوئی، بہت جلد اس نے گھمسان کے رن کی صورت اختیار کر لی، محمود کا پلّہ یوں بھی کمزور تھا، لیکن جب سر بہ کف کھوکھروں نے قیامت برپا کی تو شکست کے آثار پورے طور پر ظاہر ہو گئے، کھوکھر اس دلیری اور بہادری سے خندقیں پھاند پھاند کر محمود کے لشکر پر گرے کہ ذرا سی دیر میں انہوں نے کشتوں کے پشتے لگا دئے۔ عین اسی حالت میں کہ جنگ کا فیصلہ محمود کے خلاف اور راجگان ہند کے حق میں صادر ہونے ہی والا تھا، قسمت نے اپنا فیصلہ صادر کر دیا، راجہ آنند پال کا فیل کوہ پیکر ایک آتشبازی سے کچھ اس طرح بھڑک کر بھاگا کہ پھر سارے لشکر ہی کو بھیڑ چال کی طرح پسپا ہونے اور بھاگنے پر مجبور کر دیا، اب کیا تھا محمود کی بن آئی اس نے اپنے لشکر کے سامنے ولولہ انگیز تقریر کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بھاگتے ہوئے سپاہیوں کے پاؤں جم گئے اور جو لوگ اب تک جم کر لڑ رہے تھے، وہ بھاگ کھڑے ہوئے اس جنگ نے نقشہ پلٹ دیا۔

انند پال اور ہندو راجاؤں کے نہ صرف بے شمار سورما اور ساونت مارے گئے۔ بلکہ ان سب کو بڑی ذلت اور خواری سے دو چار ہونا پڑا، محمود کو اس جنگ میں بہت سا مالِ غنیمت ہاتھ آیا، راجگان ہند کی سرکوبی کرنے کے بعد وہ آگے بڑھا، سلطان کا لشکر بڑھتے بڑھتے نگرکوٹ (کانگڑہ) پہنچا یہاں بڑا مضبوط قلعہ تھا اُسے سر کیا یہاں پشت ہا پشت سے چڑھاوے چڑھتے چلے آ رہے تھے، منوں سونا جمع تھا، ہیرے جواہرات کے ڈھیر لگے تھے، چاندی کی سلیں اور اینٹیں محمود کا انتظار کر رہی تھیں، محمود نے اہالیان قلعہ کی جان بخشی کی، مذہبی معاملات میں کسی

قسم کی مداخلت نہ کرنے کا وعدہ کیا، مندر کی حرمت اور تقدیس کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچنے دیا اور مالِ غنیمت سے اپنا دامن بھر کر واپس ہوا اور غزنی پہنچ گیا۔

تھانیسر اور قنوج پر قبضہ

راجگان ہند کو ہزیمت دینے اور نگرکوٹ (کانگڑہ) فتح کرنے کے بعد، محمود غزنی میں آکر مقیم ہوگیا اور مملکت کے اندرونی معاملات کی اصلاح وتنظیم کی طرف متوجہ ہوگیا، کچھ دنوں بعد اسے اطلاع ملی کہ اب تھانیسر اس کے خلاف سازشوں اور دراندازیوں کا سب سے بڑا اکھاڑہ بنا ہوا ہے، شکست کا بدلہ لینے اور مقبوضاتِ محمودی واپس لینے کے منصوبے تیار ہو رہے ہیں، یہ سنتے ہی وہ اپنا لشکر لے کر تھانیسر کی طرف بڑھا (غالباً ۴۰۳ھ) اور جس آسانی اور سہولت سے اس نے کانگڑہ کو فتح کرلیا تھا اسی آسانی اور سہولت سے تھانیسر پر بھی قبضہ کرلیا، کانگڑہ کی طرح تھانیسر بھی بہت بڑا مذہبی مرکز تھا، فرشتہ نے یہاں کے بتوں اور مندروں کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔

غزنی اور قنوج کا فاصلہ کم وبیش ڈیڑھ ہزار میل ہے —— اس فاصلہ کو تصور میں لائیے اور محمود کے زمانہ پر غور کیجئے، حالات کو نگاہ میں رکھئے، راستہ ناہموار، دشمن ملک، نامانوس فضا، غیر مطمئن ماحول بے انتہا لمبی مسافت، اور ساتھ ہی ساتھ رسد کا بندوبست کہ اتنی بڑی فوج ساتھ ہوگی، اسے کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچے، کھانا وقت پر ملتا رہے، پانی بہ سہولت حاصل ہو، اور پھر مزید ستم یہ کہ موسم وہ جس سے کبھی سابقہ نہیں پڑا، راستہ ایسا جس پر سے کبھی گزرنے کا اتفاق نہیں ہوا، لیکن ان باتوں میں سے کوئی بات بھی عنان گیر نہ ہوسکی، محمود ایک بڑا لشکر لے کر قنوج کی طرف بڑھا، (۴۰۹ھ) یہ لشکر تقریباً سوالاکھ آدمیوں پر مشتمل تھا، ان سوالاکھ آدمیوں کو مع اپنے گھوڑوں اور جانوروں کے ہر روز کم ازکم دو وقت کھانا کھانا تھا، اور کئی بار پانی پینا تھا، ان سوالاکھ آدمیوں کی پندرہ سو میل کی مسافت قطع کرنی تھی، یہ سوالاکھ آدمی ایسے راستے پر چل رہے تھے، جس سے قطعاً ناواقف تھے، یہ سوالاکھ نفوس اس علاقہ میں، اس سرزمین پر، اس ملک میں بادیہ پیمائی کر رہے تھے، جہاں کا ذرہ ذرہ ان کا دشمن تھا، ان کا در بار آزاد تھا، انہیں کھا جانے اور نگل جانے کے لئے آمادہ اور تیار تھا، لیکن ان سوا

لاکھ آدمیوں کا سپہ سالار اور بادشاہ وہ شخص تھا جو صرف خدا پر بھروسہ کرتا تھا اور ہر دشواری اور مصیبت سے بے نیاز ہو جاتا تھا، وہ پورے اطمینان اور سکون قلب کے ساتھ اپنا لشکر لئے بے فکری اور بے پروائی اور اطمینان، ولولہ، اور امنگ کے ساتھ بڑھ رہا تھا،

قنوّج نے صدیوں میں وہ مقام حاصل کیا تھا، جو آج اسے حاصل تھا، صدیوں کی اس طویل مدت میں قنوّج کسی شکست سے دوچار نہیں ہوا، کسی سے دبا نہیں، کسی کی ماتحتی نہیں قبول کی، اس کا راجہ جس طرح اپنی عالی نسبی پر نازاں تھا، اسی طرح اسے اپنے بخت ونصیب پر بھی ناز تھا اس کے پاس بے شمار دولت تھی۔ اس کے پاس بے شمار فوج تھی، اور یہ فوج بہادروں اور ساونتوں پر مشتمل تھی، اس کی عظمت وجلالت کے آگے راجگان ہند سر جھکاتے تھے،

محمود بغیر کسی طرح کا نقصان اٹھائے اپنا لشکر گراں لے کر قنوج کے سامنے پہنچ گیا، راجہ دہل اٹھا اور اطاعت کا اقرار کر لیا۔

متھرا کا حشر اور راجہ قنوج کا قتل

کچھ دن قنوج میں مقیم رہنے کے بعد محمود پھر وطن کی طرف واپس پلٹا، واپسی میں وہ متھرا پہنچا، متھرا والوں کو بڑا زعم تھا، انہوں نے نہ صرف یہ کہ سلطان کی پیشوائی نہیں کی بلکہ اس سے اچھا برتاؤ نہیں کیا۔ متھرا والے جانتے تھے ہمارے چاروں طرف بڑے بڑے ہندو رجواڑے ہیں، ہمیں کوئی ٹیڑھی آنکھ سے بھی نہیں دیکھ سکتا چاہے وہ سکندر مقدونی ہو، یا محمود غزنوی!——

محمود کو یہ بات کھل گئی، اس نے متھرا کی ساری دولت سمیٹ لی، متھرا کی آہ وفغاں کی آوازیں ان آزاد، خود مختار اور طاقتور رجواڑوں کے صحن وبام تک پہنچتی رہیں جو آس پاس واقع تھیں، لیکن سب نے کانوں میں انگلیاں دے لیں، کسی میں ہمت نہ پڑی کہ وہ گھر سے نکلتا اور میدان جنگ میں پہنچتا، جو سونا، چاندی اور ہیرے جواہرات کا ذخیرہ یہاں موجود تھا، وہ اونٹوں پر لد کر غزنی روانہ ہو گیا، یہ لدے پھندے اونٹ بھی اتنی ہی بے فکری اور اطمینان سے غزنی پہنچ گئے، جس طرح محمود کا لشکر متھرا پہنچا تھا!

یہی وہ واقعہ ہے، جس کی خبر جب خلیفۂ بغداد القادر باللہ کو پہنچی، تو اس نے ایک جشن

مسرت ترتیب دیا، بغداد کے ارد گرد دیوار پر چراغاں کی روشنی جگمگائی، اور خلیفہ نے محمود کو "سلطان یمین الدولہ" کا خطاب مرحمت فرمایا، یہ خطاب تاریخ میں سب سے پہلی مرتبہ محمود نے استعمال کیا، محمود کے جانے کے بعد ہندو راجاؤں نے قنوج کے راجہ پر حملہ کر دیا، یہ حملہ ایک سوچی سمجھی سازش کے ماتحت اس سرعت کے ساتھ ہوا کہ نہ وہ مدافعت کر سکا نہ مقابلہ کی تیاریاں ہو سکیں، دوست اور معاصر راجاؤں نے راجہ اجے پال کا سر کاٹ کر اپنی ہوس انتقام پوری کی، اس مہم کا سرخیل راجہ کالنجر تھا، محمود سے اسے جتنی دشمنی تھی وہ ساری اجے پال کی طرف منتقل ہو گئی، محمود کا وہ کچھ نہ بگاڑ سکا لیکن اجے پال کو اس نے قتل کر دیا ـــــــ

پنجاب کا الحاق غزنی سے

محمود کو جب راجہ اجے پال کے قتل کی خبر ملی تو وہ بہت برہم ہوا، اسے وہ تمام پیمان یاد آ گئے جو اس کے اور اجے پال کے مابین ہوئے تھے، غضب ناک حالت میں وہ اپنا لشکر لے کر پھر (۴۱۲ھ) ہندوستان میں تیر کی طرح پہنچا، اور کالنجر کا فیصلہ کرنے سے پہلے گوالیار کا محاصرہ کر لیا، کیونکہ بغیر گوالیار کو سر کئے، کالنجر کی مہم کامیاب نہیں ہو سکتی تھی، گوالیار نے حلفِ اطاعت اٹھا کر جان اور حکومت واپس پالی، پھر اس نے کالنجر کی طرف توجہ کی، راجہ بھاگ گیا دوسرے راجہ جو اس قتل ناحق میں شریک تھے محمود کے انتقام سے نہ بچ سکے، آخر جب راجہ گنڈا (کالنجر) نے دیکھا کہ مخلصی کی کوئی صورت نہیں ہے تو وہ ہاتھ باندھ کر اظہار اطاعت کے لئے سلطان کے حضور میں حاضر ہوا، بہت سا زر و جواہر اور کئی سو ہاتھی نذر کئے، محمود نے یہ فروتنی دیکھ کر اسے بھی معاف کر دیا،

ادھر سے مطمئن ہو کر محمود نے پھر غزنی کا عزم کیا، لیکن جاتے جاتے پنجاب کو مملکتِ غزنوی سے ملحق کر لیا، اور اپنے محبوب و معتمد غلام ایاز کو یہاں کا صوبہ دار مقرر کیا، اب گویا دریائے ستلج تک کا علاقہ غزنی قلمرو میں شامل ہو گیا (۴۱۳ھ)

پنجاب کا سلطنت غزنی کا جز بن جانا بہت سے دور رس نتائج کا موجب بنا، اس طرح پنجاب ایک اسلامی مملکت کا حصہ بن گیا، یہاں مسلمانوں کی عام آمد و رفت شروع ہو گئی، بہت

سے خاندان غزنی اور دوسرے مقامات سے آکر یہاں بس گئے، اسلامی تہذیب وتمدن اور حضارت وثقافت کو پھلنے پھولنے کا اس سرزمین پر موقع ملا، صوفیاء کرام کے جتھے پہنچے اور وہ نہایت خاموشی کے ساتھ دین متین کی تبلیغ وترویج میں مصروف ہو گئے، ان کی سیرت، ان کے کردار، ان کے زہد و پاکبازی ان کے افکار تلقین سے متاثر ہوکر لوگ جوق در جوق اور فوج در فوج اسلام کے حلقہ میں داخل ہونے لگے!

فتح سومنات

یہ مورخین صاف الفاظ میں تسلیم کرتے ہیں کہ محمود کی ساری عمر ہندوستان پر تاخت وتاراج کرتے گزری لیکن ایسی ایک مثال بھی نہیں ملتی کہ محمود نے کبھی کسی ایک شخص کو دین بدلنے پر مجبور کیا ہو، یہ سب سے بڑی شہادت ہے جو محمود کے حق میں پیش کی جا سکتی ہے۔

تاریخ فرشتہ میں تاریخ کے دوسرے ادوار کی طرح محمود کے دور پر بھی مکمل اور سیر حاصل تبصرہ موجود ہے، فرشتہ نے اپنی کتاب میں ایک اور بات بھی لکھی ہے، یہ کہ محمود کے لشکر میں ہندو سپاہی اور ہندو سردار بھی تھے، اور یہ اسی منصب پر فائز تھے جس پر مسلمان سپاہی اور مسلمان سردار فائز تھے، اس نے متعدد ہندو سرداروں لے نام بھی لکھے ہیں، یہی ایک واقعہ محمود کی بے تعصبی رواداری اور عالی ظرفی کی شہادت کے لئے کافی ہے۔

تو محمود جب اس درجہ روادار اور غیر متعصب تھا، پھر اس نے کانگڑہ اور تھانیسر اور آخر میں سومنات کے مندر پر حملہ کیوں کیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مندر اپنے ظاہری تقدس کی آڑ لے کر نہایت اطمینان اور یکسوئی سے ان سازشوں اور فتنوں کے مرکز بن جاتے تھے جو محمود اور مسلمانوں کے استیلاء کے خلاف ابھرتے رہتے تھے۔ ظاہر ہے کوئی فرماں روا بھی ان باتوں کو اپنی سیر چشمی اور اولوالعزمی کے باوجود گوارا نہیں کر سکتا، بلکہ مجبور ہے کہ پوری قوت سے ان فتنوں کا سر کچل دے،

قبل اس کے کہ فتح سومنات کا ذکر کیا جائے، ذرا اس مہم کے خطرات اور مہالک بھی نظر کے سامنے رکھیئے کہ بغیر اس کے صحیح قدر وقیمت کا اندازہ نہیں ہو سکے گا۔

۱۔ سب سے پہلی چیز تو فاصلہ ہے، غزنی سے سومنات کا فاصلہ کم وبیش دو ہزار میل سمجھئے

۲۔ لاہور کے بعد سے سومنات تک کا سارا طویل وعریض دشمن علاقہ!

۳۔ بڑے بڑے وسیع اور طویل وعریض جنگلات جو اب تک انسانی قدم سے آشنا نہیں ہوئے تھے محمود کی گزرگاہ کا شرف حاصل کرنے والے تھے،

۴۔ تین سو میل کا وہ بے آب وگیاہ ریگستان بھی طے کرنا تھا، جسے طے کئے بغیر سومنات کے دروازے پر عساکر محمودی خیمہ زن نہیں ہو سکتے تھے،

۵۔ لاہور سے لے کر سومنات تک یہ انتظام کرنا تھا کہ دشمن سے عقب بالکل محفوظ رہے، اگر پسپائی کی ضرورت پڑے تو بغیر کسی مزاحمت اور اندیشہ سے واپس ہو سکے،

۶۔ لاہور سے لے کر سومنات تک رسد کا نہایت مکمّل انتظام کرنا تھا کہ راستہ میں کہیں بھی لشکر کو پانی اور غذا کی تکلیف نہ ہو،

۷۔ اس دو ہزار میل لمبے راستہ میں قدم قدم پر دشمن کی مزاحمت کا اندیشہ تھا، اس لئے کر وہ گھر سے نکل کر اور تمام وسائل و ذرائع سے فائدہ اٹھا کر جب چاہے حملہ آور ہو سکتا تھا، اور یہاں صورت بالکل برعکس تھی،

۸۔ دشمن کو ہر وقت ہر طرف سے تازہ دم کمک پہنچ سکتی تھی اور یہاں کمک پہنچنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

۹۔ احتیاط اور پیش بندی کا تقاضہ یہ تھا کہ یہ طویل راستہ کم سے کم آدمیوں کے ساتھ طے کیا جائے، لیکن ضروریات وحزم ومصالح کا تقاضا یہ تھا کہ لشکر زیادہ سے زیادہ آدمیوں پر مشتمل ہو، کیونکہ یہ زیادہ سے زیادہ سپاہی بھی بہرحال اس متحدہ لشکر کے مقابلہ میں بہت کم تھے جس کا مقابلہ کرنا تھا اور جسے شکست دینے کا منصوبہ بنا کر یہ مہم شروع کی جا رہی تھی۔

۱۰۔ ناکامی کی صورت میں ایک سپاہی کے بھی زندہ وسلامت بچ نکلنے کا امکان نہیں تھا، اس حقیقت سے سپاہی بھی خوب واقف تھے اور محمود بھی،

۱۱۔ راستہ نہایت ناہموار تھا ——— صرف ناہموار ہی نہیں انجان بھی! اس راستہ سے پہلے نہ محمود گزرا تھا نہ اس کے لشکر کا کوئی سپاہی، پھر بھی اسے طے کرنا تھا

۱۲۔ یہی حال موسم کا تھا، غزنی کی آب وہوا اور موسم سے کوئی مناسبت ہی نہیں تھی ان موسموں

کو جو راستہ کے ہر ہر صوبہ میں ایک نئی صورت اختیار کر لیتے تھے، لہٰذا موسم کا بھی مقابلہ کرنا تھا جس طرح ایک گھر سے دوسرے گھر میں جاتے وقت انسان کسی قسم کی جھجک اور خطرہ نہیں محسوس کرتا، اسی طرح غزنی سے چل کر سومنات کا سفر اختیار کرنے میں محمود نے نہ کوئی جھجک محسوس کی، نہ کسی قسم کا خطرہ محسوس کیا۔

۴۱۵ھ میں وہ غزنی سے چلا اور ملتان پہنچا جو کوتاہیاں انتظامات کی رہ گئی تھیں، یہاں انہیں مکمل کیا، اس باب میں اختلاف ہے کہ یہاں سے اٹھ کر وہ اجمیر پہنچا، وہ کچھ اور جنوبی سندھ کے راستے کو چھوڑ کر راجپوتانہ کے ریگستان سے ہوتا ہوا دفعۃً کوہستان ارولی کے دامن سے نمودار ہو کر کاٹھیاواڑ۔کے پایۂ تخت میں پہنچ گیا، یہاں کا راجہ جب تک محمود نہیں آیا تھا بڑا باہمت اور صاحب تدبیر تھا، لیکن جب وہ آگیا تو اس کی ہمت اور تدبیر کا مصرف فرار کا راستہ تلاش کرنا رہ گیا، اس معرکہ کو چٹکی بجاتے سر کرتا محمودی لشکر بغیر کسی مزاحمت کے گجرات میں داخل ہوا اور سومنات کے سامنے پہنچ گیا۔

مندر کے پجاریوں کا خیال تھا کہ صنم اعظم کا قہر و جلال اس لشکر کو خاک سیاہ کر دے گا لیکن ایسا نہیں ہوا، پھر انہوں نے اپنی دعاؤں اور بد دعاؤں پر تکیہ کیا لیکن اس کا نتیجہ بھی کچھ نہیں برآمد ہوا، بہت سے راجہ اور مہاراجہ اپنی اپنی فوجیں لے کر سومنات کی مدد اور محمود کے مقابلہ کو آموجود ہوئے تھے، کئی روز تک خوں ریز اور ہولناک جنگ جاری رہی مندر کے پروہت اور پجاری تو دعا اور بددعا کے سوا کچھ نہ کر سکے، لیکن راجپوتوں اور دوسرے سپاہیوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا، ہر طرف سے تازہ دم فوجیں کمک کے طور پر پہنچ رہی تھیں اور یہاں صرف وہی جانباز اور سرفروش تھے، جن میں لحہ بہ لحہ کمی تو ہو رہی تھی، لیکن اضافہ کا کوئی امکان نہیں تھا، صورت حالات نازک سے نازک تر ہوتی جا رہی تھی؛

یہ رنگ دیکھ کر محمود نے ایک عجیب فیصلہ کیا، وہ خود دُور رہ کر فوجیں لڑانے کے بجائے عین میدان جنگ میں پہنچ کر تلوار سونت کر لڑنے لگا ۔ سپاہیوں نے جب اپنے سلطان اور شہنشاہ کی جانبازی اور فداکاری کا یہ رنگ دیکھا تو ان میں بھی ایک نیا حوصلہ اور جوش پیدا ہو گیا، وہی جو ابھی سہمے اور پریشان نظر آ رہے تھے، اس جوش اور زور شور سے لڑنے لگے

کہ حریف کے چھکے چھڑا دیئے،

اور جس جنگ کا فیصلہ کئی دن کی معرکہ آرائیوں اور خوں ریزیوں سے نہیں ہو سکا تھا، وہ چند لمحوں کے اندر سر ہو گئی، محمود کا لشکر بغیر کسی روک ٹوک اور مزاحمت کے سومنات میں داخل ہو گیا،

جس طرح سومنات کا قلعہ اپنی نظیر آپ تھا، اسی طرح سومنات کا مندر بھی اپنا جواب نہیں رکھتا تھا، مندر کا سب سے بڑا ہال ۵۶ ستونوں پر قائم تھا، چھت میں اور ستونوں میں قیمتی جواہر پارے جڑے ہوئے تھے، محمود صنم اعظم کے سامنے پہنچا، یہاں مہنت اور پجاری دم بخود کھڑے ہوئے تھے، یہ وہ لوگ تھے جو ابھی چند لمحات قبل تک محمود کی جان کے گاہک تھے۔ اس کی شکست کے جویا تھے، اس کی ہلاکت اور بربادی کے دعاگو تھے اور اب اس کے سامنے کھڑے جان کی امان طلب کر رہے تھے، جس کو یہ خود مار ڈالنا چاہتے تھے، اسی سے زندگی کی دریوزہ گری کر رہے تھے —— کتنا عجیب اور کتنا حیرت خیز تھا یہ واقعہ؟

محمود نے پوری عالی ظرفی کے ساتھ جان بخشی کا فرمان صادر کر دیا۔

سومنات کا بڑا بُت

اب ایک دوسرا سوال درپیش تھا، مندر کے پجاری اور مہنت یہ بھی چاہتے تھے کہ صنم اعظم کی جان بخشی کر دی جائے اور محمود اس کے لئے تیار نہیں تھا۔ مہنتوں اور پجاریوں نے دام بڑھانے شروع کئے یہاں تک کہ وہ اس پر رضامند ہو گئے کہ اس بت کے بقدر بلکہ اس سے دوگنا سونا اور جواہرات پیش کر دیں، لیکن یہ بچ جائے،

محمود کے رفقا اور سردار اس پیش کش کو منظور کر لینے پر راضی ہو گئے، لیکن محمود نے اپنے ان ساتھیوں پر ایک حقارت کی نظر ڈالی اور کہا،

"کیا تم یہ چاہتے ہو، قیامت کے دن میں محمود بت فروش کے نام سے پکارا جائے نہیں میں چاہتا ہوں کہ مجھے محمود بُت شکن کے نام سے یاد کیا جائے،

یہ کہہ کر اس نے اپنا گرز گھما کر جو بُت کے مارا ہے تو اس کے دو ٹکڑے ہو گئے ——

خدا کی قدرت بُت جب پاش پاش ہو کر گرا تو معلوم ہوا یہ ٹھوس نہیں تھا اس میں خلا تھا، اور وہ زر و جواہر سے بھرپور تھا، یہ زر و جواہر اس مقدار سے کئی گنا زیادہ تھا، جو مہنت اور پجاری

بت کو بچانے کے لئے ادا کر رہے تھے،

محمود کی شرافت اور عالی ظرفی

محمود کو گجرات کا علاقہ آب وہوا اور صفائی کے اعتبار سے بہت پسند آیا، یہاں وہ فتح سومنات کے بعد تقریباً ایک سال تک رہا، پھر ۴۱۷ھ میں غزنی واپس چلا گیا۔

جاتے وقت پھر محمود نے رواداری اور بے تعصبی کا ایسا ثبوت دیا، جو آپ اپنی مثال ہے، اس نے (تاریخ فرشتہ کے بیان کے مطابق) ایک زاہد اور مرتاض ہندو کو یہاں کی حکومت سونپی، اور اس سے عہد اطاعت لے کر باطمینان تمام چلا گیا،

محمود کی وفات

۴۲۱ھ میں محمود اس دُنیا سے رخصت ہوگیا، وراثت میں محمود کو ایک چھوٹی سی حکومت ملی تھی، لیکن محمود نے اپنے وارثوں کے لئے جو ترکہ چھوڑا تھا وہ دنیا کی بہت بڑی مملکت پر مشتمل تھا،

محمود عجیب اور متضاد خصوصیات کا جامع تھا، وہ جس طرح میدان رزم کا یکہ تاز تھا، اسی طرح بزم وانجمن کی آرائش وزیبائش بھی اس کے دم سے تھی اس کا دربار جس طرح فنونِ جنگ کے ماہروں سے لبریز رہتا تھا، اسی طرح علمار، ادبار، فقہا اور شعرا بھی وہاں موجود رہتے تھے، کون ہے جو فردوسی اور فردوسی کے شاہنامہ سے ناواقف ہو، جس کی تکمیل محمود ہی کی زرپاشیوں کی بدولت ہوئی تھی،

عدل وانصاف میں بھی محمود اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا، وہ اصول کے معاملہ میں کسی کے ساتھ رعایت نہیں کرتا تھا، یوں حُسن سلوک کے ساتھ سب سے پیش آتا تھا، فرشتہ نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک شریف خاتون کی عزت بچانے کے لئے اپنے ملک کے ایک امیر کو اس نے رات کی تاریکی میں قتل کر دیا،

مذہبیت دین داری اور خدا ترسی محمود کی سرشت بن گئی تھی، وہ پابندی سے نماز پڑھتا تھا، علوم اسلامیہ پر وسیع نظر رکھتا تھا۔ فقہ میں اس کی ایک کتاب بھی بیان کی جاتی ہے، علمار کی قدر دانی دل کھول کر کرتا تھا، جب میدان رزم کی گرہ کشائیوں سے فارغ ہوتا تھا تو بزم وانجمن کو سجاتا تھا، اور بیان کا موضوع گفتگو علمی مسائل، مذہبی مباحث اور کلامی نظائر ہوتے تھے،

خدا ترسی کا یہ عالم تھا کہ (بقول فرشتہ) ایک مرتبہ اس نے ایک بات پر برہم ہو کر خلیفۂ بغداد کو دھمکی دی کہ اپنے ہاتھیوں کی فوج گراں لے کر اگر میں بغداد پر چڑھائی کر بیٹھا تو سارا دم خم ختم ہو جائے گا، خلیفہ نے جواب میں "الٓم" لکھ کر بھیج دیا، یہ ایک معمہ بن گیا، کوئی حل نہ کر سکا، دربار کے ایک صاحب نظر عالم نے کہا، خلیفہ نے آپ کو سورہ الم ترکیف یاد دلائی ہے، جس میں خدا نے فرمایا ہے کہ اصحاب فیل کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا تھا، یہ سنتے ہی محمود کانپنے لگا اس پر گریہ طاری ہو گیا، اور وہ اتنا رویا کہ اس کی داڑھی تر ہو گئی، اس نے خلیفہ سے معذرت کی، اور اپنی غلطی پر نادم اور پشیمان ہوا، پھر اس طرح کی کوئی حرکت اس سے تا عمر سرزد نہیں ہوئی۔

تاریخ فرشتہ میں محمود کی درباروالیوں، بزم آرائیوں، عدل و انصاف، مہر و مروت، جود و سخا، بذل و عطا، فہم و فراست، فکر و تدبر کے متعدد واقعات مندرج ہیں، لیکن طوالت کے خوف سے ہم انہیں نظر انداز کرتے ہیں۔

امیر سبکتگین کو محمود جیسا بیٹا ملا جس نے غزنی کو دنیا کی بہت بڑی مملکت بنا دیا، لیکن محمود کو ایسے جانشین ملے جو باپ کے ترکہ کی حفاظت نہ کر سکے، اگرچہ یہ خاندان تقریباً دو سو برس تک (از ۳۶۷ھ تا ۵۹۲ھ) تخت حکومت پر متمکن رہا، لیکن زوال محمود کے فوراً بعد شروع ہو گیا، زوال کی ابتدا خانہ جنگی سے ہوئی جو باپ کے انتقال کے بعد تخت کے حصول پر شروع ہوئی تھی۔

محمود کے بعد اس کا بیٹا مسعود تخت نشین ہوا، لیکن اسے آرام کے لمحات میسر نہ آئے زیادہ تر آویزشوں میں اُلجھا رہا، مسعود نے ہندوستان پر دو یلغاریں کیں لیکن ان یلغاروں میں اور محمود کی یلغاروں میں زمین آسمان کا فرق تھا، مسعود کے بعد جو لوگ اس تخت حکومت پر بیٹھے وہ اور زیادہ زوال کا سبب بنے، آخری دور میں غوریوں کی مخالفت اُبھری اور اس نے اس خاندان کی عظمت و جلالت کا خاتمہ کر دیا، غزنوی خاندان کا آخری فرماں روا خسرو ملک غوریوں کے ہاتھ گرفتار ہو گیا (۵۸۲ھ) اور اس طرح غزنوی خاندان کا چراغ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا۔

یہ خاندان امیر ناصرالدین سبکتگین (۳۶۷ھ) کے عہد میں ابھرا اور خسرو ملک (۵۸۲ھ) پر ختم ہوگیا۔

اس گلستان کا سر سبد محمود غزنوی ہے اور گلِ پژمردہ و خزاں رسیدہ خسرو ملک!!

محمود نے اس برصغیر کے ایک طویل و عریض علاقہ کو اپنے مقبوضات میں شامل کیا، مسلمانوں کی جرأت، جانبازی اور رواداری کے انمٹ نقوش چپہ چپہ پر مرتسم کئے۔ سلطان محمود یوں تو سراسر خوش بختی بلند طالعی کی ایک تصویر تھا لیکن اس بارے میں اس کو بدنصیب کہا جاسکتا ہے کہ اس کے اخلاف اس کے سچے جانشین ثابت نہیں ہوئے۔

سلطان شہابُ الدّین غوری

گذشتہ صفحات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ غزنوی خاندان کو غوریوں نے ہٹادیا، اور خود سریر آرائے حکومت بن گئے، شہاب الدین غوری اس خاندان کا ایک فرد تھا، اصل فرماں روا اس کا بڑا بھائی غیاث الدین غوری تھا، !

ہندوستان پر اس وقت پرتھوی راج حکمرانی کررہا تھا، یہ اجمیر کا راجہ تھا اور دلّی کی حکومت بھی اسے وراثت میں مل چکی تھی، یہ بڑا دلیر اور منچلا بادشاہ تھا، اس کی تعریف میں جو گیت عوام میں گائے جاتے تھے، وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ بہادری اس کے قدم چومتی تھی، دلاوری اس پر نثار ہوتی تھی، اولوالعزمی اس کے گھر کی ادنیٰ کنیز تھی، شان فرماں روائی وکج کلاہی اسے زیب دیتی تھی، کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس سے سرتابی کرسکتا یا اس کی مرضی کے خلاف لب کشائی کرسکتا، پرتھوی راج کو اپنی قوت وطاقت پر بھی بہت ناز تھا اور ہونا بھی چاہیئے تھا، اس لئے کہ اس کے پاس نہ مال وزر کی کمی تھی، نہ سپاہ ولشکر کی،

شہاب الدین غوری کی پہلی ٹکر اسی سے ہوئی۔

غوری کی شکست

۵۸۵ھ میں غوری بٹھنڈہ کے قلعہ کی طرف یورش کناں بڑھا، اس قلعہ پر پرتھوی راج کا پرچم ملوکیت لہرا رہا تھا، پرتھوی راج کو جب یہ خبر ملی تو وہ ایک لشکر گراں لے کر تھانیسر آگیا، غوری کے پاس صرف ۱۰، ۱۲ ہزار سپاہی تھے اور رائے تھورا (پرتھوی راج) کا لشکر دو لاکھ سے زیادہ نفوس پر مشتمل تھا،

اُس نے اپنے رفیقوں سے کہا، اگر رائے تھورا کے لشکر سے آمنا سامنا نہ ہوگیا ہوتا تو ممکن تھا میں پرے ٹرتا، لیکن اب لڑے بغیر واپس جانا شانِ مردانگی کے خلاف ہے، یہ لڑائی ترائن

(کرنال)، کے میدان میں ہوئی اور اس میں مسلمانوں کو زبردست شکست ہوئی، محمود غوری بُری طرح زخمی ہوا، اور بے ہوش حالت میں اسے بروقت میدان جنگ سے ہٹایا جا سکا، اس جنگ میں غوری کس دلیری سے لڑا تھا، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جب ایک مرصع ہاتھی پر بیٹھے ہوئے رائے پتھورا کے نائب نے تلوار سے غوری پر حملہ کیا تو اس نے پلٹ کر گھوڑا ہاتھی پر بڑھا دیا، اور ہاتھی کی سونڈ کا سہارا لے کر ایسا گرز لگایا کہ اس کے سامنے کے دو دانت ٹوٹ گئے!

لیکن صرف بہادری ہی کسی جنگ کا فیصلہ نہیں کرتی، کچھ دوسرے عوامل اور موثرات بھی ہوتے ہیں جو کامیابی کے لئے شرط اول کی حیثیت رکھتے ہیں!

رائے پتھورا سے اتمام حجت

اس شکست سے غوری بہت متاثر ہوا، وہ ان غوری سپاہیوں سے خفا ہو گیا جو اس جنگ میں ثابت قدم نہیں رہ سکے تھے، اس نے قسم کھا کر ہر لذت اپنے اوپر حرام کر لی، اس نے وہ کپڑے بھی نہیں تبدیل کئے جنہیں پہنے ہوئے وہ میدان جنگ سے دوچار ہوا تھا،

۵۸۸ھ میں وہ پھر ہندوستان کی طرف ایک لشکر لے کر بڑھا، اس مرتبہ یہ فوج صرف غوریوں ہی پر مشتمل نہیں تھی، ہر قسم کے مسلمانوں کو اذن عام تھا کہ جو چاہے مجاہدین کی صف میں شریک ہو جائے، یہ جنگِ ملوکیت نہیں تھی جہاد تھا، مسلمان جوق در جوق اور فوج در فوج اس کے جھنڈے تلے جمع ہونے لگے، اسے حسنِ اتفاق کہئے کہ اس مرتبہ بھی جنگ کا میدان ترائن ہی قرار پایا، غوری کی سپاہ ایک لاکھ نفوس پر مشتمل تھی، اور رائے پتھورا کا لشکر گراں تین لاکھ سواروں اور پیادوں کا مجموعہ تھا، جس میں جنگی ہاتھی جو صرف اسی حصہ کے لئے سدھائے گئے تھے، بہت کافی تھے، غوری نے سب سے پہلے رائے پتھورا کے پاس اپنے سفیر بھیجے، تاکہ اتمام حجت ہو جائے،

سفرا نے دو شرطیں پیش کیں، یا تو اسلام قبول کر کے ہمارے بھائی بن جائیے، پھر ہمارا دُکھ آپ کا دُکھ اور آپ کا سکھ ہمارا سکھ ہو گا، ورنہ پھر ہتھیار رکھ دیجئے اور اطاعت قبول کر لیجئے، رائے پتھورا کے پندار پر یہ اتمام حجت ایک ہتھوڑے کی طرح لگی. وہ غصہ سے

بے قابو ہوگیا، اُس نے بڑے سخت اور ناملائم الفاظ میں یہ پیش کش مسترد کردی اور جنگ کی دعوت دی، اُس نے کہا، اب ہمارا فیصلہ میدان جنگ ہی میں ہوگا، پرتھوی راج کا یہ پندار اس لئے اور زیادہ بڑھ گیا تھا کہ تقریبًا ایک سو پچاس راجاؤں اور مہاراجوں نے شریک جنگ ہونے کا فیصلہ کرلیا تھا وہ اپنی سپاہ کے ساتھ میدان میں موجود تھے اور ان سب نے دیوتاؤں کو گواہ کرکے یہ عہد کیا تھا کہ مرجائیں گے مگر پیٹھ نہیں دکھائیں گے ــــــــ

غوری کی فتح مبین شہاب الدین کے کانوں میں جب رائے پتھورا کے الفاظ گونجے تو اس نے پورے اطمینان کے ساتھ کہا،" اگر وہ فیصلہ میدانِ جنگ پر چھوڑتا ہے تو ہم بھی اس پر تیار ہیں"

جنگ شروع ہوئی

بہت جلد اس نے جنگ مغلوبہ کی صورت اختیار کرلی، کسی کو اپنے تن بدن کا ہوش نہیں تھا، راجپوت بھی جان کی بازی لگا کر لڑ رہے تھے، اور مسلمان بھی موت سے نڈر ہو کر دادِ شجاعت دے رہے تھے رائے پتھورا کو اپنے سدھے ہوئے ہاتھیوں پر بہت ناز تھا، لیکن مسلمان ان ہاتھیوں سے بھی خوف زدہ نہیں ہوئے، انہوں نے ان کا بھی اپنے تیروں اور نیزوں سے ایسی دلیری کے ساتھ مقابلہ کیا کہ خود یہ ہاتھی ان سے پناہ مانگنے لگے،

غوری کی سپاہ خاصہ، جو بارہ ہزار نڈر اور دلاور سپاہیوں پر مشتمل تھی، اب تک الگ کھڑی تھی، اب دفعتًہ وہ اپنی سپاہ خاصہ کو لے کر آگے بڑھا، ان بارہ ہزار آدمیوں نے تین لاکھ کے لشکر پر ایسی تندی اور تیزی کے ساتھ حملہ کیا کہ تہلکہ برپا ہوگیا، راجپوت حوصلہ ہار گئے اور جب کسی طرح سر بر نہ ہوسکے، تو بھاگ کھڑے ہوئے، خود پرتھوی راج بہادری اور شجاعت کے باوجود میدان میں نہ ٹھہر سکا، اور راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہوگیا، لیکن پکڑا گیا، اور جان سے ہاتھ دھونے پر مجبور ہوا، اس جنگ میں بھی مسلمان کافی ہلاک اور زخمی ہوئے، لیکن رائے پتھورا کے سپاہی ہزارہا ہزار کی تعداد میں مقتول اور مجروح ہوئے، اور اس طرح آن کی آن میں ایک بہت بڑے راجہ اور اس راجہ کی ایک بہت بڑی مملکت کا خاتمہ ہوگیا،

رائے پتھورا کی شکست کے بعد غوری نے دلّی اور اجمیر کی ریاستوں کا الحاق نہیں کیا، اپنے

ایک معتمد غلام قطب الدین ایبک کو اپنا قائم مقام بنایا، اور چلا گیا، لیکن راجہ دلّی کی سرکشی اس کی محرومی کا باعث ہوئی، ۵۸۹ھ میں اس نے دلّی کو فتح کر کے ممالک محروسہ میں شامل کر لیا، جس کی ذمہ داری خود راجہ کی تنگ نظری اور بدعہدی پر ہی رکھی جاسکتی ہے۔

غوری نے قنوج کے راجہ جے چند سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی تھی، لیکن اجمیر اور دلّی کے بعد اسے اپنی فکر ہوئی، اور وہ جنگی تیاریاں زور شور سے کرنے لگا۔

اس مہم کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسے سر کرنے کے لئے خود شہاب الدین غوری کو واپس آنا پڑا، سنہ ۵۹۰ھ میں جے چند اور شہاب الدین غوری کی جنگ ہوئی اس جنگ نے مسلمانوں کے مقبوضات میں اور زیادہ اضافہ کر دیا، جے چند نے شکست کھائی، اور بھاگ کھڑا ہوا، یہ ریاست غوری مملکت کا ایک جزو بن گئی، اور اب مسلمان بنارس تک حکمرانی کرنے لگے۔

۵۹۹ھ میں سلطان غیاث الدین کا انتقال ہو گیا، اب مکمل طور پر زمام سلطنت شہاب الدین کے حصہ میں آئی، اور وہ نہایت شان و تجمل کے ساتھ غزنی اور بھارت پر حکومت کرنے لگا، بھارت کا کام اتنے عمدہ طریقہ سے سرانجام پا رہا تھا، اور اس کے نائب و گورنر اس خوبی سے اپنی ذمہ داریاں انجام دے رہے تھے کہ پھر اسے یہاں آنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی سوا ایک مرتبہ کے جب وہ کھوکھروں کی سرکوبی کے لئے آیا تھا، اور انہیں مطیع و منقاد کر کے رخصت ہو گیا تھا،

اس مہم کو سر کرنے کے بعد سلطان شہاب الدین غزنی واپس جا رہا تھا کہ راستہ میں چند قرامطہ نے (اسماعیلی مذہب کے پیرو تھے) ۶۰۲ھ میں سے عالم خواب میں شہید کر دیا، یہ اسماعیلی اس سے اس لئے برسر پرخاش تھے کہ اس نے ان کی سرکوبی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا، وہ ان کے عقائد سے زیادہ ان کی پُر اسرار سرگرمیوں سے بہت برہم تھا، اور ان کا کام ہی یہ تھا کہ ملت کے ان بڑے بڑے لوگوں کو دھوکے سے قتل کریں جو ان کے مخالف ہیں۔

شہاب الدین کے بعد اس کا بھتیجا سلطان محمود بن غیاث الدین غوری فرماں روا ہوا اور اس نے شہاب الدین کے تمام غلاموں کو ان کے مناصب پر بحال رکھا۔

خاندانِ غلامان
یا
سلاطینِ دلّی

سلطان محمود بن غیاث الدین غوری کو یہ معلوم تھا کہ شہاب الدین اپنے غلاموں کو کتنا عزیز رکھتا تھا، اور یہ بھی جانتا تھا کہ ان غلاموں کو مرحوم چچا نے کیسے کیسے جہاندازی کے منصب سونپے تھے، اور یہ بات بھی اس کے علم میں تھی کہ یہ غلام اگرچہ اب تک غلام ہی ہیں، لیکن انہیں وہ حشمت وعظمت حاصل ہے، جو ملوک وسلاطین کو بھی نہیں حاصل ہوتی، اس نے مصلحت یہی سمجھی کہ انہیں آزاد کردے، اور وہ ان کی بادشاہی تسلیم کرلے، اور اس نے کمال تدبر اور دانش سے یہی مناسب خیال کیا، چنانچہ ۶۰۲ھ میں اس نے قطب الدین ایبک کو دلّی کا اور تاج الدین یلدز کو غزنی کا بادشاہ (غلامی سے آزاد کرکے) تسلیم کرلیا، چنانچہ باضابطہ جشن تاجپوشی بڑی دھوم دھام اور تزک واحتشام سے منایا گیا،

سلطان شہاب الدین غوری کے حسبِ ذیل غلام اُسی کی زندگی میں عروج ترقی کے منازل طے کررہے تھے:-

۱- قطب الدین ایبک ——— دلّی

۲- تاج الدین یلدوز ——— غزنی

۳- ناصر الدین قباچہ ——— سندھ

۴- بہار الدین طغرل ——— بیانہ اور گوالیار

۵- محمد بن بختیار خلجی ——— اودھ

۶- التمش (شمس الدین) (ایبک کا متبنیٰ)

- غیاث الدین بلبن،

اب ہم ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ ذکر کریں گے۔

قطب الدین ایبک

اسے سلطان شہاب الدین غوری نے خریدا تھا، اچھی تربیت دی، عمدہ تعلیم دلائی، فنونِ جنگ سکھائے، جوہر قابل موجود تھا، چمک گیا، رائے پتھورا کی شکست کے بعد شہاب الدین اسے اپنا نائب بنا کر واپس چلا گیا، اب اس کے اور جوہر کو دنیا نے دیکھا، وہ تھا حکمرانی کا انداز، اُس نے بڑی خوبی سے حکومت کی، بڑا بیدار مغز اور دور اندیش تھا، دِلّی کی مسجد قوت الاسلام اور قطب مینار، اسی کی اولوالعزمی اور جہانداری کے کرشمے ہیں۔

قطب الدین نے ۵۹۱ھ میں اجمیر کو بھی دلّی اور میرٹھ وغیرہ کی طرح اپنی حکومت سے ملحق کر لیا، یہاں ایک مسجد تعمیر کی جو "ڈھائی دن کا جھونپڑا" کے نام سے اب تک موجود ہے، اور اپنی نفاست و نزاکت اور خوبیٔ تعمیر کے لحاظ سے آپ اپنا جواب ہے، ۵۹۳ھ میں ایبک نے ایک اور کارنامہ انجام دیا یعنی انہل واڑہ (پٹن) پر قبضہ کر لیا، ۵۹۹ھ میں اس نے کالنجر کا وہ قلعہ فتح کر لیا، جسے ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا، اس طرح بُندھیل کھنڈ کے چندیل پورے طور پر قابو میں آ گئے، اور ایک طاقت ور حریف ختم ہو گیا۔ ۶۰۷ھ میں چوگان کھیلتا ہوا گھوڑے سے گرا، اور اس صدمہ کی تاب نہ لا کر لاہور میں وفات پا گیا،

۲۔ تاج الدین یلدز

تاج الدین یلدز، سلطان شہاب الدین غوری کا سب سے چہیتا غلام تھا اسے اس نے غزنی کا کاروبارِ مملکت سپرد کیا تھا، سلطان شہاب الدین غوری کی شہادت کے بعد جب اس کا بھتیجا محمود غور کا فرماں روا اور سلطان بنا تو اس نے چچا کے جذبات کا پاس و لحاظ کرتے ہوئے یلدز کو غزنی کا بادشاہ تسلیم کر لیا،

لیکن یلدز صرف غزنی پر قناعت کرنا نہیں چاہتا تھا، اس کی تمنا تھی کہ موجودہ صوبۂ سرحد اور پنجاب کو بھی اپنی تحویل میں رکھے، قطب الدین ایبک تاج الدین یلدز کا داماد تھا، لیکن اس نے یلدز کا یہ دعوےٰ نہیں قبول کیا، اور ان علاقوں کو اپنی مملکت میں شریک رکھنے پر مصر رہا، آخر نوبت لڑائی تک پہنچی، قطب الدین فتحیاب رہا، اور یلدز کو شکست سے دوچار ہونا پڑا قطب الدین اتنے جوش میں تھا کہ تعاقب کناں غزنی تک پہنچ گیا، یہاں آ کر پانسہ پلٹا اور راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا

۳۔ ناصر الدین قباچہ یہ سندھ کا گورنر تھا، لیکن جب سلطان شہاب الدین غوری کی شہادت کی خبر سنی تو وہاں کا بادشاہ بن بیٹھا، یہ قطب الدین ایبک کا داماد تھا لیکن اس رشتہ کے باوجود حکومت کے لئے دونوں میں کشمکش بھی ہوئی اور جنگ کی بھی نوبت آئی، ملتان تک اس کا قبضہ تھا، اور یہ علاقہ ایبک اس سے نہ چھین سکا۔ تاج الدین یلدز سے بھی اس کی آویزش جاری رہی، سندھ اور بلوچستان کے لئے یلدز سے پنجاب کے لئے ایبک سے ۶۱۸ء میں اسے جلال الدین خوارزم شاہ سے ——— جو سندھ میں چنگیز کے چنگل سے بچ کر آگیا تھا ——— مقابلے کرنے پڑے، اگرچہ اسے طرح طرح کی بیرونی اور خارجی مشکلوں سے سابقہ پڑا، لیکن عزم و ہمت والا آدمی تھا، اپنی جگہ ڈٹا رہا اور توسیع مملکت کی کوششوں سے ایک لمحہ کے لئے بھی غافل نہیں ہوا، چنگیز کی سفاکی اور درندگی سے خستہ اور درماندہ اور عاجز ہو کر جو علماء، امراء، اور ادبار شعراء سندھ پہنچے اُن کی قباچہ نے بڑی اچھی طرح پذیرائی کی، انہیں ہر مرحلے پر نوازا اور حتی الامکان ان کے راحت و آسائش کا پورا پورا بندوبست کیا ۶۲۴ھ میں ایبک کے جانشین التمش سے اس کی لڑائی ہوئی، ذلت کی زندگی پر عزت کی موت کو ترجیح دی، جب کوئی چارہ کار باقی نہ رہا، التمش کے سامنے جان کی امان مانگنے کے بجائے دریا میں کود کر جان دے دینے کو ترجیح دی،

۴۔ بہاء الدین طغرل اسے سلطان شہاب الدین غوری نے بیانہ اور گوالیار کی تسخیر پر مامور کیا تھا یہ بڑا دریادل، عالی ظرف اور سیر چشم شخص تھا، اس نے ایک نیا قلعہ سلطان کوٹ کے نام سے تعمیر کرایا، قطب الدین ایبک نے سازش کر کے قبل اس کے کہ یہ گوالیار کا قلعہ فتح کر لے، محصورین سے ساز باز کر کے قلعہ پر قبضہ کر لیا طغرل کو جب اس واقعہ کی اطلاع ملی، بہت برہم ہوا اگر زندہ رہتا تو ممکن تھا جنگ کی نوبت پہنچ جاتی، لیکن بہت سی خوبیوں اور قابلِ رشک صلاحیتوں کے باوجود موت نے مہلت نہ دی، اور عین عالم شباب میں اس دنیا سے اس مختصر سی علالت کے بعد رخصت ہو گیا۔

محمد بن بختیار خلجی۔ یہ اگرچہ باقاعدہ غلام نہیں تھا لیکن کسی خاص حیثیت کا بھی حامل نہیں تھا کس مپرسی اور پریشان حالی میں زندگی بسر کی، غوری کے زمانہ میں

بہت سی نایوسیوں اور محرومیوں کے بعد اسے اودھ میں کارگزاری کا موقعہ ملا، اور پھر اس نے وہ کارنامہ انجام دیا جو آج بھی تاریخ کا حیرت انگیز ترین واقعہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ۵۹۹ھ میں اس نے صوبہ بہار کی کئی ریاستوں کو جو رقبہ میں بھی چھوٹی تھیں اور زیادہ طاقت ور بھی نہ تھیں بڑی آسانی سے فتح کرلیا، اس سے اس کی ہمت بلند ہوئی، فتحمندی کا جوش اور ولولہ پیدا ہوا، کشور کشائی اور جہانگیری کے خواب دیکھنے لگا، کبھی کبھی خواب حقیقت میں بھی تبدیل ہو جاتے ہیں، چنانچہ اس کا خواب بھی حقیقت بن گیا!

صوبہ بنگال پر ایک برہمن خاندان کا راجہ لکشمن حکومت کر رہا تھا، محمد بن بختیار خلجی، بنگال فتح کرنے کے ارادہ سے دو ڈھائی سو سوار لے کر نکلا۔ ——— اتنی بڑی حکومت، اور اتنی مختصر فوج ———

جب پایۂ تخت کے قریب پہنچا تو اتنا تیز آیا تھا کہ بہت سے سوار پیچھے رہ گئے، اب صرف اٹھارہ سوار ساتھ تھے، محمد بن بختیار اس طرح جیسے آگے کوئی خطرہ نہیں ہے، اور کامیابی ہاتھ باندھے کھڑی ہے، بغیر کسی جھجک اور تامل کے ان سواروں کو لے کر گھوڑے دوڑاتا ہوا شہر میں داخل ہو گیا، اور قلعہ کی طرف بڑھا، شہر والوں نے ان مٹھی بھر سپاہیوں کی طرف کوئی توجہ نہیں کی قلعہ کے دروازے کھلے ہوئے تھے، محافظین کو ان ۱۸ سواروں سے کیا خطرہ ہو سکتا تھا، وہ سمجھے یہ گھوڑوں کے تاجر ہیں، اور راج محل میں گھوڑے دوڑاتے ہوئے آرہے ہیں، جیسے ہی یہ لوگ پھاٹک کے اندر داخل ہوئے، فوراً تلواریں سونت لیں اور محافظوں اور دربانوں کو آن کی آن میں موت کے گھاٹ اتار دیا اور بخط مستقیم رنواس کی طرف بڑھے، راجہ کھانا کھا رہا تھا دفعتہً غل مچا اور فریاد و فغاں کی آواز پہنچی وہ اتنا ہراساں ہوا کہ کھانا اور جوتا چھوڑ کر چور دروازے سے صرف جان ساتھ لے کر بھاگا۔

فوراً ہی محمد بن بختیار کی حکومت قائم ہو گئی، بعد میں وہ سوار بھی جو پیچھے رہ گئے تھے آ گئے چند روز میں ایک فوج مرتب ہو گئی، راجہ لکشمن بھاگ کر ڈھاکہ کے پاس ایک مقام بیرم پور میں پہنچا، اور پناہ گزیں ہو گیا، محمد بن بختیار نے لکھنوتی کو اپنا دارالحکومت قرار دیا اور ٹھاٹھ کے ساتھ حکومت کرنے لگا۔

یہ واقعہ اب بھی ایک خواب معلوم ہوتا ہے، ہاں یہ خواب ہی ہے لیکن ایسا خواب جس نے حقیقت کا جامہ پہن لیا تھا، اور جسے تاریخ نے اپنے اوراق میں محفوظ کر لیا ہے!——

۶۰۲ھ میں جبکہ وہ تبت اور ترکستان پر ترک تازیوں کے منصوبے بنا رہا تھا بیمار پڑا، اور اس دنیا سے رخصت ہو گیا، اس کے ساتھ ہی اس کی اولوالعزمی بھی دفن ہو گئی——

۶- شمس الدین التمش

یہ بھی ایک معمولی آدمی تھا لیکن قطب الدین ایبک کی نظر پر چڑھ گیا، اس نے اپنا متبنیٰ بنا لیا، بیٹی کی شادی کر دی، اس کے بعد بدایوں کا صوبہ دار بنا اور ایبک کے بعد ہی اورنگ نشین ہوا سوتیلے بھائیوں نے اسے غلام بنا کر بازار میں فروخت کیا تھا، قسمت نے اس غلام کو بھارت کا بادشاہ بنا دیا۔

۶۱۲ھ میں تاج الدین یلدز بادشاہ ہند بننے کے خیال سے پھر آگے بڑھا ترائن کے قریب شمس الدین التمش سے مقابلہ ہوا، گرفتار کر کے بدایوں بھیج دیا گیا۔ اور وہیں فوت ہوا، یلدز کے بعد التمش نے قباچہ سے مقابلہ کیا اور اسے شکست دی اور اپنا قبضہ مستحکم کر لیا ۶۲۴ھ میں التمش کے بیٹے نے باپ کا حکم پا کر بنگال کے خود ساختہ بادشاہ غیاث الدین کو مقابلہ کر کے گرفتار کر لیا اور یہاں بھی التمش کی فرماں روائی بے روک ٹوک تسلیم کر لی گئی،

۶۲۳ھ میں جب گوالیار کے راجہ نے سرکشی کا اظہار کیا، تو التمش خود سرکوبی کے لئے پہنچا اور محاصرہ کر لیا، آخر گوالیار بھی پکے ہوئے پھل کی طرح اس کی جھولی میں آگرا، پھر ۶۳۱ھ میں مالوہ پر بھی التمش کا پرچم لہرانے لگا، اور بھیلسا و اُجین اس کے قبضہ و تسلط میں آ گئے،

۶۳۲ھ میں التمش کا انتقال ہو گیا، اس نے صرف ۲۶ سال حکومت کی، لیکن اس مختصر سی مدت میں اس نے وہ کارنامے انجام دیئے، جو چھ سو برس کی حکومت میں بھی دُوسروں کے لئے ممکن نہیں تھا۔

التمش کے بیٹے نالائق اور نااہل ثابت ہوئے، اس کی چہیتی بیٹی رضیہ سلطانہ تخت پر بیٹھی، لیکن عورت کی حکومت مردوں کو گوارا نہ ہوئی، ۶۳۷ھ میں وہ مع اپنے شوہر کے دہلی پر چڑھائی کرتی ہوئی ماری گئی اور اس کا بھائی معز الدین بہرام شاہ تخت نشین ہوا، یہ بھی نااہل ثابت ہوا، اس کے عہد میں مغلوں (تاتاریوں) نے پیہم حملے کئے، لاہور کو تو بالکل تاراج کر دیا، لیکن یہ اپنے مشاغل میں

منہمک رہا، کچھ نہ کر سکا، ۶۳۹ھ میں یہ قید کر لیا گیا اور اس کا بھتیجا علاؤالدین مسعود تخت پر بٹھا دیا گیا، الغ خاں فوجی سربراہ قرار پایا اور اس کے دور میں پھر مغل چڑھ آئے، ایک بڑا لشکر تیار ہوا جس نے ان کا منہ پھیر دیا، اس کامیابی کے بعد یہ بھی عیاشی میں پڑ گیا، آخر یہ بھی قید کر لیا گیا، اور التمش کا چھوٹا بیٹا ناصرالدین محمود تخت نشین کیا گیا (۶۴۴ھ) یہ بڑا نیک، عابد اور دیندار شخص تھا، لیکن نظم مملکت سے کوئی دلچسپی نہ رکھتا تھا، چند سال بعد اپنے ایک غلام اور سردار غیاث الدین بلبن کو کاروبار مملکت سونپ دیا، اور خود ریاضت وعبادت میں مصروف ہو گیا،

۷۔ غیاث الدین بلبن

بلبن بھی ایک غلام تھا، جو بازار سے خریدا گیا، رفتہ رفتہ اپنی قابلیت اور اہلیت سے امیر کبیر بن گیا، اس کی بیٹی سے ناصرالدین محمود کی شادی ہوئی تھی، ۶۶۴ھ میں ناصرالدین فوت ہو گیا، چونکہ لاولد تھا اور بلبن پہلے ہی سے رئیس الوزراء اور نائب شاہ بن چکا تھا، لہذا کرسی وزارت سے تخت شاہی تک پہنچنے میں اسے کوئی دشواری نہیں پیش آئی، بڑی آسانی سے بادشاہ، شہنشاہ اور سلطان معظم ومحتشم بن گیا، اور لوگوں نے اس کی خداوندی کے سامنے ادب واحترام کے ساتھ سر جھکا دیا۔

بلبن میں وہ تمام صلاحیتیں موجود تھیں جو ایک فرماں روا میں ہونی چاہئیں، وہ بہادر تھا، صاحب عزم وکردار تھا، بلند حوصلہ اور اولوالعزم تھا، خطا کاروں کے مقابلہ میں اس سے بڑھ کر کوئی سخت گیر نہیں تھا، اور مظلوموں کا اس سے بڑا کوئی دستگیر نہیں تھا،

بلبن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے تاتاریوں (مغلوں) کے مسلسل اور پیہم حملوں کے خلاف ایسے دفاعی مورچے قائم کئے کہ اس فتنہ کا بڑی حد تک استیصال ہو گیا، پنجاب کے بہت سے علاقے تاتاریوں کی یورش سے بنجر اور بے آب وگیاہ ہو گئے تھے، آبادی وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی تھی بلبن نے ان علاقوں کو پھر بسایا، لاہور کی رونق پھر قائم کی، اور اپنے محبوب اور مدبر بیٹے محمد کو ملتان میں اپنا نائب بنا کر بھیج دیا۔

بلبن کا زمانہ اس اعتبار سے بھی ممتاز ہے کہ اس نے غیر سوشل عناصر کے استیصال میں بھی بڑی جدوجہد کی، لٹیروں، ڈاکوؤں اور قزاقوں کی سرکوبی کے لئے اس نے جنگل کے جنگل صاف کر دیئے۔

سرکشی اور بغاوت کسی قیمت پر بھی بلبن برداشت نہیں کر سکتا تھا، حکومت کی مرکزیت اور جمعیت کی ہر حالت میں توقیر کرانا چاہتا تھا۔ ۶۷۸ھ میں بلبن کے ایک غلام طغرل نے جو بنگال کا صوبہ دار تھا بغاوت کی، بلبن ضعیف و کہن سال ہونے کے باوجود خود دلی سے بنگال گیا، اور طغرل اور اس کے ساتھیوں کو عبرت انگیز طور پر موت کے گھاٹ اتار کر واپس آیا اور اپنے بیٹے بغراخان کو سردار بنا آیا، ۶۸۴ھ میں تاتاریوں (مغلوں) نے پھر ایک زبردست حملہ کیا، تیمور لنگ اس حملہ کا سربراہ تھا، محمد نے ایسی خوبی سے مقابلہ کیا کہ تاتاریوں نے دو مرتبہ حملہ کیا، اور ہر دو مرتبہ بری طرح شکست کھانے پر مجبور ہوئے، محمد تعاقب میں آگے نکل گیا، صرف چند ساتھی ساتھ تھے، تاتاریوں نے گھات لگائی، اور شہزادے کی جان لے لی، اس حادثہ نے بلبن کی کمر توڑ دی، بوڑھا پہلے ہو چکا تھا، اور اب دنیا سے دل بیزار ہو گیا، بنگال سے بغراخاں کو جانشین بنانے کے لئے بلایا، وہ نہ آیا تو اس کے بیٹے کیقباد کو جانشین بنا کر اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ (۶۸۶ھ) کیقباد آوارہ مزاج، اوباش طبع اور دنی فطرت انسان تھا، وہ اس بوجھ کو نہ اٹھا سکا، جو سلطنت اسے ورثہ میں ملی تھی اسے اس نے اپنی نااہلی اور نالائقی سے گنوا دیا۔

علاءالدین خلجی

جب کیقباد بلبن کے ایوانِ عظمت کو نہ سنبھال سکا تو جلال الدین فیروز خلجی آگے بڑھا، اور دربار کے اُمرا نے تاج شہریاری اس کے سر پر رکھ دیا، یہ دربار بلبنی کا ایک امیر تھا، لیکن قسمت میں بادشاہت لکھی تھی، خلاف توقع حالات میں تخت حکومت پر بیٹھ گیا، (۶۸۹ھ)

بڑا رحمدل، سیر چشم، اور مرنجان مرنج بادشاہ تھا، ۶۹۱ھ میں مغلوں (تاتاریوں نے پھر یورش کی، دلّی کے بادشاہ نے ڈٹ کر مقابلہ کیا، اور کامیاب ہوا، بہت سے تاتاری گرفتار ہو گئے، ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا گیا، اور انہیں دلی میں بسا لیا گیا، اب تاتاری اسلام سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے، بہت سے مسلمان ہو بھی چکے تھے، ان گرفتار شدگان میں بھی کافی مسلمان تھے، ۶۹۴ھ میں جلال الدین کے بھتیجے علاؤالدین خلجی نے دیوگری (جنوبی ہند) پر کامیاب یلغار کی، یہ بھی تاریخ کا ایک حیرت انگیز اور عجیب واقعہ ہے، علاؤالدین کا لشکر تعداد میں کم تھا، راستہ پرخطر تھا، صدہا میل تک کسی دوست کا نام و نشان تک نہ تھا، لیکن علاؤالدین نے بڑی کامیابی کے ساتھ یہ مہم سر کر لی اور مؤرخ اس بات پر متفق ہیں کہ جتنا مال غنیمت وہ اپنے ساتھ لایا، اتنا مال غنیمت کسی ایک مہم میں اس سے پہلے کسی فاتح کو نہیں ملا تھا،

۶۹۵ھ میں علاؤالدین نے چچا (جلال الدین فیروز خلجی) کو قتل کر دیا اور مالک تاج و تخت ہو گیا، اس کے عہد میں، بلکہ یوں سمجھئے تخت حکومت پر بیٹھتے ہی (۶۹۶ھ) مغلوں نے پھر بڑے وسیع اور منظم پیمانہ پر یورش کی، اور دلّی تک بڑھتے ہوئے چلے آئے، اور شہر کا محاصرہ کر لیا، علاؤالدین نے ایسا جم کر مقابلہ کیا، اور اس کے بھائی الماس بیگ، اور ظفر خاں اور تغلق نے اس شان کے ساتھ جنگ لڑی کہ تاتاریوں (مغلوں) کے چھکے چھوٹ گئے، وہ بُری طرح شکست یاب ہوئے،

ان کے بہت سے آدمی قتل اور زخمی ہوئے، ظفر خاں تعاقب کرتا ہوا بہت دُور نکل گیا، اس میں اس کی جان کام آئی، دوسری مرتبہ ۷۰۳ھ میں پھر تاتاری لشکر آیا، لیکن بغیر لڑے ہوئے ہی واپس چلا گیا، ۷۰۵ھ میں، پھر مغلوں نے یورش کی اس مرتبہ بھی علائی لشکر سے ذلت بخش شکست کھائی، دو مغل شہزادے جو سردار لشکر بھی تھے، بہت سے مغلوں کے ساتھ گرفتار ہوئے، ان سب کی گردنیں ماردی گئیں، اور ان کے سروں سے دلی میں ایک برج تعمیر کیا گیا ——— تاریخ اسی طرح اپنے آپ کو دوہراتی رہتی ہے، یہ وہی تاتاری ہیں جو خود مقتولین کے سروں کے مینار تیار کیا کرتے تھے، آج ان کے سروں کا برج تیار ہوا تھا،

علاؤالدین خلجی اپنے وقت کا بہت بڑا سپہ سالار، بہت بڑا کشور کشا اور بہت بڑا فاتح تھا، وہ بالکل اَن پڑھ اور جاہل تھا، لیکن اس میں حکمرانی اور فرماں روائی کی صلاحیتیں فطری طور پر موجود تھیں، اور وہ ان صلاحیتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا تھا! ——— وہ بڑا سخت گیر، جابر، اور سفاک بھی تھا، جو آدمی مجرم ثابت ہو جائے، اسے ایسی عبرت انگیز سزا دیتا تھا، کہ دیکھنے والے تو دیکھنے والے، سننے والے تھرا جاتے تھے، وہ کسی قسم کی رورعایت اور مہرومروت کا خوگر نہیں تھا، وہ اپنے چچا جلال الدین فیروز خلجی کا صرف بھتیجا نہیں محبوب اور عزیز داماد بھی تھا، لیکن اس کی جان لینے میں بھی اس نے تامّل نہیں کیا، علماء اور مشائخ سے بھی خوش نہیں تھا، اگرچہ یہ علما اور مشائخ اس کی خوں آشامی اور سفاکی کے باوجود حق بات اس کے منہ پر کہنے سے نہیں چوکتے تھے، ۷۰۰ھ میں اس نے رنتھنبور کا قلعہ سر کیا، جو اب پہلے سے بھی زیادہ دشوار گزار اور ناقابلِ تسخیر بن گیا تھا، یہ اس کا اتنا بڑا کارنامہ تھا، جس نے اس کی دھاک بٹھادی اور آس پاس کے راجہ مہاراجہ اس سے بہت زیادہ مرعوب اور خوف زدہ ہو گئے!

علاؤالدین کو سب سے زیادہ فکر اس کی تھی کہ رعایا بدحالی کا شکار نہ ہونے پائے، اس سلسلہ میں اس نے ایسے اقدامات کئے، جو تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے، اس نے جاگیریں ضبط کرلیں، اجناس اور ضروریاتِ زندگی کی قیمتیں مقرر کر دیں، اس بات کا سختی سے لحاظ رکھا کہ مقرر کردہ قیمتوں سے ایک پائی بھی زیادہ پر کوئی چیز فروخت نہ ہو، ایک مرتبہ اس طرح کی اطلاع ملی تو اس نے بقالوں اور تاجروں کو ایسی عبرت انگیز سزا دی کہ پھر بلیک مارکٹ کا اس کے

دورِ حیات میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا،

چتوڑ بھی راجپوتانہ کا سب سے مستحکم اور بہت مضبوط قلعہ تھا، علاؤ الدین نے اسے بھی (۷۰۳ھ) فتح کرلیا،

۷۰۶ھ میں علاؤ الدین نے اپنے چہیتے اور معتمد غلام ملک کافور کو، دکن کی مہم سر کرنے کے لئے بھیجا، اس مہم میں نمایاں کامیابی ہوئی، اور تاریخ میں پہلی مرتبہ جنوبی ہند دلّی کے ماتحت ہوا اور دیوگری کا باقاعدہ دلّی سے الحاق ہو گیا،

۷۱۶ھ میں علاؤ الدین اس دنیا سے رخصت ہو گیا، بڑا بیٹا خضر خاں گوالیار کے قلعہ میں نظر بند تھا (جس کی شادی بڑے چاؤ سے علاؤ الدین نے رانی کنول دیوی (دیوگری) کی بیٹی دیول دیوی سے کی تھی) کافور اب جزو کل کا مالک تھا، اس نے خود حکومت پر قابض ہونے کا منصوبہ بنایا، لیکن وہ قتل کر دیا گیا اور علاؤ الدین کا چھوٹا بیٹا قطب الدین ۷۱۷ھ میں تخت نشین ہوا، یہ حد درجہ نالائق اور نااہل ثابت ہوا، بھائیوں کو قتل کرا دیا، خود کاروبار مملکت ایک غلام خسرو خاں کو سپرد کر کے عیاشی میں پڑ گیا، آخر اسی خسرو خاں نے اسے قتل کر دیا اور ظلم و سفاکی کے ایسے مناظر دکھائے کہ ساری دلّی چیخ اٹھی، علاؤ الدین کا ایک معتمد سردار غازی ملک (تغلق) پنجاب کا گورنر تھا، یہ بڑا بہادر تھا، اس کا جی چاہا کہ آقا کا بدلہ لے اور نظم مملکت استوار کرے لیکن اس کا بیٹا جونا خاں (محمد تغلق) دلّی میں تھا، اندیشہ تھا، کہیں خسرو خاں اسے نہ ہلاک کر دے، جب جونا خاں باپ کے پاس صحیح سالم پہنچ گیا، تو وہ فوج لے کر دلّی کی طرف بڑھا، خسرو خاں باقاعدہ بادشاہ بنا ہوا دلّی پر حکمرانی کر رہا تھا، عزت والوں کو بے عزت، اور بے عزتوں کو صاحب مال و املاک بنا رہا تھا، قلعہ شاہی میں بھی اس نے ایسی سفاکیوں کے مظاہرے کئے جو اس کی کورنمکی پر دال ہیں (۷۲۰ھ) بہرحال غازی ملک فوج لے کر بڑھا، خسرو بھی مقابلہ کے لئے نکلا، موجودہ نئی دلّی کے قریب رن پڑا خسرو خاں شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوا، پھر گرفتار کر کے قتل کیا گیا،

غازی ملک نے شہر کے ارباب حل و عقد کو جمع کیا، اور اقرار کیا کہ وہ جسے بھی بادشاہ منتخب کر لیں گے (کیونکہ خاندانِ غلام ختم ہو چکا تھا) میں دل سے اس کی اطاعت کروں گا، لوگوں نے اس کا نام پیش کیا، اور وہ غیاث الدین تغلق کے نام سے اورنگ نشین (۷۲۰ھ) ہو گیا!

علاؤالدین کے عہد میں مسجدیں، خانقاہیں، حوض، بینار، حصار بہت زیادہ تیار و تعمیر ہوئے۔ مؤرخ ضیا برنی نے عہد علائی کے خصوصیات و امتیازات میں یہ بات لکھی ہے کہ اس کے عہد میں،

۱۔ اناج، پارچہ جات اور دوسرے ضروریات زندگی بہت ارزاں اور سہل الحصول تھے۔

۲۔ اس نے فتوحات کا ایک ریکارڈ قائم کر دیا، اور اتنی زیادہ دولت حاصل کی کہ اس کے پیش روؤں میں ایک بھی مثال نہیں پیش کی جا سکتی،

۳۔ اس کی فوج کے صرف سوار چار لاکھ ۷۰ ہزار نفوس تھے، انہی پر پیادوں کا اندازہ کر لیجئے۔ اتنی بڑی فوج رکھنے کے باوجود اس نے کچھ ایسا اقتصادی ڈھانچہ بنایا کہ خزانہ پر کسی قسم کا غیر معمولی بار نہیں پڑنے پایا،

۴۔ جس باغی نے سر اٹھایا، فوراً ہی اسے کچل دیا گیا۔

۵۔ تاتاری (مغول) ایک مستقل فتنہ تھے، لیکن اس فتنہ کی جس شان اور اہتمام سے علاؤالدین نے سرکوبی کی، یہ اس کا حصہ تھا، مغلوں کا زور اس نے توڑ دیا، ان کی ساری وحشت اور بربریت مسل کر رکھ دی! لوہے کو لوہا کاٹتا ہے،

۶۔ راستوں کی حفاظت کا اس درجہ انتظام کیا کہ بے غل و غش کارواں آتے اور جاتے تھے، اور کسی قسم کے حادثہ سے دوچار نہیں ہوتے تھے،

۷۔ تاجروں پر ایسا کنٹرول کیا اور ایسی نگاہ رکھی کہ حاضر و غائب سب ایماندارانہ کاروبار کرنے پر مجبور ہو گئے۔

خاندانِ تغلق

غیاث الدین تغلق، محمد تغلق اور فیروز تغلق، تغلق شاہ، حملۂ تیمور

اپنے آقا بلبن کے دَورِ حکومت میں غیاث الدین تغلق نے جو کارنامے انجام دیئے تھے، وہ خود کم وقیع نہ تھے، اور اب تختِ حکومت پر بیٹھنے کے بعد توسیع مملکت، نظم و انتظام اور رفاہ عوام کے سلسلہ میں جو کچھ کیا، وہ بھی تاریخ کا قابلِ فخر سرمایہ ہے، اس کے عہد میں خوش حالی عام ہوگئی، بہت سے ویران علاقوں کو اس نے از سرِ نو آباد کیا بہت سی بنجر اور غیر مزروعہ زمینوں کو قابلِ کاشت بنایا، آب پاشی کے لئے نہریں کھودیں اور ایسا انتظام کیا کہ رعایا فارغ البالی اور سکون و عافیت کی زندگی بسر کرنے لگی،

بنگال اور جنوبی ہند پر یورش

۷۲۲ھ میں غیاث الدین تغلق کے ولی عہد محمد تغلق نے بڑے ساز و سامان کے ساتھ جنوبی ہند کے ہندو راجاؤں کی سازش اور شرارت کا استیصال کرنے کے لئے ورنگل پر چڑھائی کی، تلنگانہ میں زور شور سے میدان قتال گرم ہوا، آخر بڑی جد و جہد اور سعی و کوشش کے بعد تغلق نے یہ مہم سر کرلی، صرف ایک سال کی مدت میں یعنی ۷۲۳ھ میں تلنگانہ کی حکومت سلطنت دہلی کا ایک جزو بن گئی، ورنگل پر تغلق کا پرچم لہرانے لگا۔ اور اتنے دور دراز مقام پر آسانی سے سلطنت دہلی کے احکام و فرامین نافذ ہونے لگے۔

پھر ایک سال بعد ۷۲۴ھ میں غیاث الدین تغلق نے بنگال پر وہاں کے حکمران کی درخواست پر شورش اور بد امنی کی وجہ سے فوج کشی کی، یہ منزل بھی اگرچہ دلی سے بہت دُور تھی، اور اس کا سر کرنا بظاہر بہت مشکل تھا، لیکن تغلق نے بڑی آسانی سے یہ معرکہ بھی سر کرلیا،

بنگال سے جب وہ فاتح اور کامگار واپس ہوا تو ایک حادثہ کے سلسلہ میں وہ ہلاک ہوگیا، اور

اس کا بیٹا محمد تغلق سریر آرائے حکومت ہوا۔

محمد تغلق میں وہ تمام صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں جو ایک اولوالعزم فرماں روا میں ہونی چاہئیں وہ بڑا زیرک، منصوبہ ساز، دور اندیش اور مہم جو تھا، اگر یہ کہا جائے کہ وہ ان لوگوں میں تھا، جو اپنے وقت سے پہلے پیدا ہو جاتے ہیں تو ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا، اس کے زمانہ کے لوگ اس کا ساتھ نہ دے سکے، اس لئے کہ یہ لوگ اس کی اسکیموں، منصوبوں اور نقشوں کے دوررس نتائج کو سمجھنے کی صلاحیت سے محروم تھے، اپنے وقت سے دو سو برس بعد اگر وہ پیدا ہوتا تو آج ہندوستان کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا،

اس کی ناکام اسکیم جو تبادلۂ آبادی سے تعلق رکھتی تھی، اگر عمل میں نہ آئی ہوتی تو آج جنوبی ہند میں مسلمانوں کا وجود ہی نہ ہوتا، یا اگر وہ ہوتے بھی تو تعداد کے اعتبار سے ہیچ، اور اثر و رسوخ کے اعتبار سے ناقابل ذکر ہوتے، لیکن یہ محمد تغلق کی ناکام اسکیم ہی کا نتیجہ تھا کہ بعد میں مسلمانوں کا سب سے بڑا مرکز اور دفاعی مورچہ دکن ثابت ہو، یہاں ان کی آزاد اور خود مختار حکومتیں قائم ہوئیں، یہاں مسلمانوں نے بہت سے نئے شہر بسائے، یہاں مسلمانوں کی تہذیب ثقافت اور حضارت پھیلی، یہاں مسلمانوں نے شاندار پُرشکوہ اور یادگار عمارتیں بنائیں، جن کی نفاست نزاکت اور فنِ تعمیر کے انداز پر آج بھی غیر مسلم مؤرخین عش عش کر اٹھتے ہیں، سخت مزاجی اور سخت گیری کے باوجود داد و دہش کا جہاں تک تعلق تھا سخاوت اور دریا دلی میں بھی کسی سے پیچھے نہیں تھا، وہ جب کسی کو مستحق سمجھتا تھا تو جاگیریں بھی دیتا تھا، انعام بھی عطا کرتا تھا، لاکھوں اشرفیاں بھی دے ڈالتا تھا، بیماروں کی بھی خبر گیری کرتا تھا، بیواؤں اور یتیموں کی سرپرستی کرتا تھا، رعایا اور دوسرے ضرورت مندوں کی حاجت روائی کرتا تھا، مسافروں پر نوازش شاہانہ کی بارش کرتا تھا، ہنرمندوں اور فن کاروں کو زیادہ سے زیادہ نوازتا تھا، شاعروں، طبیبوں اور ماہرین فن کی امداد و اعانت میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتا تھا،

مغلوں کے خلاف دفاعی مورچہ

مغلوں کے حملوں کو وہ بلبن کے عہد میں اپنی آنکھ سے دیکھ چکا تھا، یہ حملے ہر وقت ہو سکتے تھے، ان کے خطرات و مہالک کو اس نے اچھی طرح محسوس کر لیا تھا، چنانچہ اس نے کوہستان سلیمان کے پار دفاعی مورچہ مستحکم کرنے کا پروگرام بنایا، اسے عمل میں لایا، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوں (تاتاریوں) کی یلغار

اور یورش کا سلسلہ تقریباً ختم ہوگیا،

دوسری طرف اس نے دکن میں اسلامی نو آبادی کی ضرورت محسوس کی، اور دولت آباد کے نام سے ایک نیا شہر بسایا، اس نے کوشش کی کہ دلّی کو اٹھا کر وہیں لے جائے، اس نے دلی کے مالکان مکانات و باغات، ان کے مکان اور باغ دام دے کر خرید لئے، انہیں وہاں رہنے اور بس جانے کی ترغیب دی، اس نے سوچا تھا، اس طرح دکن میں جو مسلمان آباد ہوں گے، وہ علم، معاشرت، تہذیب، تمدن کسی اعتبار سے بھی درماندہ نہ رہیں گے، رہی دلّی تو وہ بار بار اجڑ چکی ہے، بس چکی ہے، آج اُجڑے گی پھر بس جائے گی، لیکن لوگوں نے اس کی عظیم مصلحت کو نہ سمجھا، یہ اسکیم ناکام اور ادھوری رہ گئی،

ملک چین پر پیش قدمی

۷۳۸ھ میں اس نے چین پر پیش قدمی کا پروگرام بنایا، اور اپنے بھانجے خسرو ملک کی سرکردگی میں ایک بہت بڑی فوج اس کارنامہ کو انجام دینے کے لئے روانہ کردی، یہ لشکر نیپال کو پامال کرتا ہوا تبت کی سرحد تک پہنچ گیا، لیکن اس کے بعد رسد کی بدنظمی اور راستہ کی مشکلات کے باعث مزید پیش قدمی نہ کرسکا، مجبوراً لوٹ آیا، اس کم ہمتی پر تغلق بہت برہم ہوا، اس نے فوج کے تمام افسروں اور قابل ذکر لوگوں کو اس "جرم" میں سخت سزائیں دیں۔

۷۴۱ھ میں بنگال اور دکن کے دور دست علاقے بغاوت اور سرکشی کے مرکز بن گئے، تغلق فوراً اٹھا اور دولت آباد پہنچا، یہاں سے تلنگانہ اور مالابار کا دورہ کیا، سرکشوں اور باغیوں کو عبرت انگیز اور سبق آموز سزائیں دیں، جن حکام و عمال پر ناوفاداری کا ذرا بھی شبہ ہوا، انہیں برطرف کردیا اور ان کی جگہ نئے نئے حکام و عمال مقرر کئے، پھر جب دکن سے واپس جانے لگا، (۷۴۲ھ) تو اس نے عام اجازت دے دی کہ اب جس کا جی چاہے وہ پھر دلّی جا کر آباد ہوسکتا ہے۔

لیکن ۷۴۸ھ میں بادشاہ کے جانے کے بعد دکن میں ایک آزاد مسلم حکومت، ظفر خاں کی سربراہی میں قائم ہوگئی، اس زمانہ میں تغلق گجرات میں تھا، یہاں بھی وہ اسی لئے آیا تھا کہ سرکشوں کی سرکوبی کرے، اور باغیوں کی تادیب کرے، یہاں خلاف توقع اسے زیادہ عرصہ تک یعنی تقریباً ۳ سال تک مقیم رہنا پڑا، پھر اسے سندھ کے اُمرا کی بغاوت کی اطلاع ملی، وہ فوراً گجرات سے چلا

اور بحری راستہ سے ٹھٹھہ آیا، یہاں عاشورہ کا روزہ اس نے مچھلی سے افطار کیا، جس سے بیمار پڑ گیا، اور ایسا بیمار پڑا کہ چند ہی دن میں چٹ پٹ ہو گیا (۲۱ محرم ۷۵۲ھ)

محمد تغلق لاولد تھا، اس لئے فیروز تغلق مسند نشین مملکت ہوا جو اس کا بھتیجا تھا۔

فیروز شاہ تغلق چچا کے برعکس نرم طبیعت کا آدمی تھا، داد و دہش میں بھی یکتا تھا، جہاں سزا دینا جانتا تھا وہاں معاف کرنا بھی جانتا تھا، اس کے عہد میں وہ لوگ جو محمد تغلق سے باغی ہو گئے تھے، رام ہو گئے، بہتوں نے از خود اطاعت قبول کر لی، بعضوں کو اطاعت قبول کرنے پر مجبور ہونا پڑا،

فیروز شاہ کو تعمیرات سے بڑی دلچسپی تھی، اس نے بہت سی عمارتیں بنوائیں جن کے نشان اب تک موجود ہیں، دلّی کے رہنے والے اب بھی "فیروز شاہ کا کوٹلہ" دیکھنے جاتے ہیں، اور وہاں کے سبزہ زار پر فرصت کے اوقات صرف کرتے ہیں، فیروز شاہ کی لاٹ بھی جو اشوک کے زمانہ کی تھی اور جسے فیروز شاہ نے برآمد کیا تھا، اب تک اپنے نقوش کے ساتھ اس کوٹلہ کی زینت بنی ہوئی ہے، کوٹلہ میں ایک شاندار مسجد بھی موجود ہے، جس میں بیک وقت ہزاروں آدمی نماز پڑھ سکتے ہیں، محلات و قصور دست برد زمانہ کی نذر ہو گئے۔

فیروز شاہ نے بہت عمارتیں بنوائیں، نہریں کھدوائیں، کنوئیں تیار کرائے، مسافر خانے تعمیر کئے مدرسے اور مکتب اور خانقاہوں کی بنیاد ڈالی، باغات لگائے اور نئے نئے شہر بسائے، اس نے ایک نئی دلّی بھی بسائی، جس کی آبادی اور رونق کی داستان ہم تاریخ کے صفحات پر دیکھ سکتے ہیں، دلّی کے علاوہ ایک اور شہر "حصار فیروز پور" بسایا، جمنا سے وہاں تک ڈیڑھ سو میل لمبی نہر کھدوائی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں اب تک خاک اڑ رہی تھی، وہاں سبزہ خودرو کی حکومت ہو گئی، اپنے مرحوم چچا محمد تغلق عرف جونا کے نام پر ایک نیا شہر بسایا جو "جونپور" کے نام سے اب تک موجود ہے، اور جس نے آگے چل کر سلطنت شرقی کے پایۂ تخت کی حیثیت سے بڑا نام پایا

چنانچہ وفات سے چند ماہ پیشتر وہ اپنے پوتے تغلق شاہ کے حق میں تخت حکومت سے دستبردار ہو گیا، اور ۷۹۰ھ میں وفات پا گیا،

مرکزی حکومت میں اختلال

فیروز شاہ کی وفات کے بعد خانہ جنگیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، نئے نئے دعوے داران سلطنت پیدا ہونے لگے

نتیجہ یہ ہوا کہ یہ خاندان ہی ختم ہو گیا، وزیر سلطنت خاں جہاں دلی سے جونپور چلا گیا اور وہاں خود شہنشاہ بن کر حکومت کرنے لگا، یہی حکومت سلطنت شرقیہ کے نام سے تاریخ میں مشہور ہے،

شہنشاہ تیمور لنگ کا حملہ

اسی اثنا میں تیمور لنگ نے ہندوستان پر حملہ کیا اور دِلی پر قبضہ کر لیا (۸۰۱ھ) تیمور اگرچہ تاتاری النسل تھا لیکن مسلمان ہو چکا تھا، پھر بھی اس نے دلی فتح کرنے کے بعد اور دوران جنگ میں اور دلی کے راستے میں مسلمانوں کے قتل عام میں کوئی تامل نہیں کیا، تیمور نے پہلے لاہور فتح کیا تھا، پھر دلی، ان دونوں جگہوں کو خوب جی بھر کے لوٹا،

لامرکزیت کا دور

تیمور خوب اچھی طرح دلی اور لاہور کو لوٹ کھسوٹ کر جب واپس جانے لگا، تو حاکم ملتان خضر خاں کو دہلی کی حکومت عطا فرمادی، جو سادات کا بانی عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے، صرف ۳۶ سال میں خضر خاں کا خاندان سادات بھی حکومت کی اس مسند کو دوسروں کے لئے خالی کرنے پر مجبور ہو گیا، اب یہاں لاہور کا سردار بہلول لودھی حکومت کرنے لگا،

لودھی خاندان ۹۳۲ھ تک زندہ رہا، پھر بابر نے اسے ختم کر کے اپنی بادشاہت قائم کی،

طوائف الملوکی کا دور!

عروج وزوال ساتھ ساتھ چلتے ہیں، عروج کی انتہا زوال ہے، اور زوال کی انتہا عروج! مسلمان جب اس دیس میں آئے تو یہ ہزارہا متفرق، پراگندہ اور منتشر حکومتوں کا مجموعہ تھا لیکن انہوں نے بہت جلد اس ملک میں ایک ایسی مرکزی حکومت قائم کرلی، جو صرف اشوک کے عہد میں کچھ عرصہ کے لئے عالم وجود میں آئی تھی، پھر مسلمانوں کی آمد تک کہیں نظر نہیں آئی، مسلمانوں نے دلی میں بیٹھ کر ایک طرف بنگال اور کام روپ (آسام)، پر حکومت کی، دوسری طرف دیوگری، ورنگل اور تلنگانہ (جنوبی ہند) پر اپنا پرچم لہرایا، یہ حکومت مرکزیہ کئی سو سال تک قائم رہی، لیکن مجموعہ حسنات وفضائل ہونے کے باوجود فیروز شاہ تغلق اتنی بڑی حکومت کو واحد اور منظم نہ رکھ سکا، یہ مختلف حکومتوں میں تقسیم ہوگئی، یہ چھوٹی حکومتیں تھیں، لیکن لوازم شاہی اور شانِ کج کلاہی سے بھرپور اور معمور،

اب ہم ان کا الگ الگ ذکر کرتے ہیں، تاکہ صحیح صورت سامنے آجائے۔

۱۔ سندھ مرکزی حکومت کے زوال نے سندھ کو بھی جو دور دست علاقہ تھا آزاد کردیا، اس کی آزادی کی بنا یوں پڑی کہ فیروز شاہ تغلق کے پوتے نے (جسے اس نے جانشین بناکر گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی)، جام بانبھیہ بن خیر الدین کو ۷۹۰ھ میں چتر شاہی عنایت کیا اور یوں سندھ میں آزادی اور خود مختار حکومت کی بنا پڑگئی، یہ حکومت ۹۴۲ھ تک قائم رہی، اس کے بعد اس کا خاتمہ ہوگیا،

۲۔ بنگال بنگال میں مسلمانوں کی آبادی اچھی خاصی تھی، بودھوں اور اچھوتوں نے بھی کافی تعداد میں اسلام قبول کرلیا تھا، اور نو آباد کار مسلمان بھی کافی تعداد میں تھے، یہاں علما اور

صوفیا کی بھی بہت بڑی تعداد تھی، جو تبلیغ اسلام میں مصروف و منہمک رہی تھی۔

محمد تغلق کے زمانہ میں جب خود مختاری کی وبا پھیلی تو یہاں بھی شورش ہوئی، پہلے سنار گاؤں میں یہ بدعت آئی، پھر مغربی بنگال میں، آخر ملک الیاس حاجی نے سنہ ۷۴۶ھ میں سلطان شمس الدین کے نام سے سنار گاؤں کو مطیع کرنے کے بعد موروثی بادشاہت کی طرح ڈال دی، یہ خاندان تقریباً ایک سو سال تک حکومت کرتا رہا،

آخری بادشاہ غیاث الدین محمود بن حسن تھا، جو سنہ ۹۴۴ھ میں تخت پر بیٹھا، اور یہی آخری بادشاہ اس خاندان کا ثابت ہوا۔

۳۔ بہمنی سلطنت علاؤالدین ظفر خاں کا بے شک مرکز سے کوئی تعلق نہیں تھا، لیکن اس نے بہمنی سلطنت قائم کرنے کے بعد جس بہادری اور استقلال سے مسلمانوں کو دکن میں عزت اور سرخ روئی سے زندہ رکھا، یہ ایسا کارنامہ ہے جو عزت کی نظر سے دیکھا جائے گا، اور کبھی فراموش نہیں کیا جائے گا، اس سلطنت کے قیام سے مسلمانوں کو دکن میں وہ استحکام اور فروغ حاصل ہوا، جس نے ان کے ملّی مجد و وقار میں گراں بہا اضافہ کیا، اور جس کی بدولت وہ بڑے تجمل کی زندگی بسر کرنے میں کامیاب ہوئے،

۱۔ پہلا بادشاہ علاؤالدین حسن ظفر خان سنہ ۷۴۸ھ میں تخت نشین ہوا، سنہ ۷۵۹ھ تک حکومت کرتا رہا۔

۲۔ آخری فرماں روا کلیم اللہ تھا، جس نے حکومت کی مسند سنہ ۹۳۳ھ میں خالی کر دی،

جب تک بہمنی حکومت قائم رہی اس نے بیجانگر تلنگانہ، کرناٹک، گونڈوانہ اور اڑیسہ کے ہندو راجاؤں سے خم ٹھونک کر دو بدو مقابلہ کیا، بعد میں جب زوال شروع ہوا تو یہ کئی ریاستوں میں بٹ گئی،

۴۔ خان دیس خاندیس بھی فیروز شاہ تغلق کے بعد علم خود مختاری لے کر آگے بڑھا، اور "لا مرکز" ہو گیا، یہی حال مالوہ کا ہوا، خان دیس کا دارالحکومت "برہان پور" تھا، یہ حکمران فاروقی سلاطین کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں، یہ حکومت تقریباً ڈھائی سو سال تک صفحہ تاریخ پر موجود رہی،

۱۔ پہلا بادشاہ ملک راجہ تھا، جو سنہ ۷۷۲ھ میں تخت نشین ہوا، سنہ ۸۰۱ھ تک داد حکومت

دیتا رہا۔

۲۔ آخری فرماں روا بہادر شاہ کے نام سے مشہور تھا، یہ ۹۰۱ھ تک برسر حکومت رہا۔

۵۔ مالوا یہاں کا صوبہ دار دلاور خاں غوری تھا، تیمور کے حملہ کے بعد جب دلی کی سلطنت تقریباً ختم ہوگئی، اور عام طور سے لامرکزیت کا دور دورہ شروع ہوگیا تو دلاور خاں نے بھی آزادی اور خود مختاری کو اپنا شعار بنالیا اور مالوے کا صوبہ ایک آزاد اور خود مختار حکومت میں تبدیل ہوگیا۔

۱۔ اس خاندان کا پہلا فرماں روا دلاور خاں غوری تھا، جو ۸۰۴ھ میں مالک تاج و اورنگ ہوا، اور ۸۰۸ھ تک فرماں روائی دبدبہ اور طنطنہ کے ساتھ کرتا رہا،

۲۔ آخری فرماں روا محمود شاہ ثانی تھا، ۹۳۷ھ تک برسر حکومت رہا، اس کے بعد یہ حکومت ایک دوسرے خاندان میں بداعمالیوں اور رنگ رلیوں کے باعث منتقل ہوگئی،

۶۔ گجرات لامرکزیت کے اس دور کی پیداوار گجرات کی آزاد اور خود مختار حکومت ہے دلی کی مرکزی حکومت کے زوال، اور تیمور کے قتل عام نے اس نئی حکومت کو جنم دیا، پہلا فرماں روا ظفر خاں قرار پایا،

یہ حکومت بڑی مضبوط اور مستحکم تھی، یہاں کے فرماں رواؤں نے اپنی شان شوکت کا آس پاس کے راجاؤں پر سکہ بٹھا دیا تھا، راجپوتانہ، مالوا اور سورت کے حاکموں سے جنگیں ہوئیں اور ان جنگوں میں مسلمانوں ہی کا پلہ بھاری رہا، اس خاندان کے ایک باہمت اور اولوالعزم بادشاہ احمد شاہ نے احمد آباد بسایا، جو آج بھی گجرات کا سب سے سرسبز اور شان دار شہر ہے، احمد کے پوتے محمود نے ۴۵ برس حکومت کی، اور اس تجمل سے کہ باید و شاید! اس نے جوناگڈھ، کچھ اور بڑودھ کے کئی علاقے تسخیر کرلئے، پرتگیزوں کو لوہے کے چنے چبوا دیئے، جو بحری قزاقی کے فن میں کمال رکھتے تھے، پھر اس محمود شاہ کے ایک جانشین بہادر شاہ نے پرتگیزوں کو دیو میں قلعہ بنانے کی اجازت دی، جس سے ان کے قدم دیار ہند میں جم گئے،

۱۔ مملکت گجرات کا پہلا بادشاہ ظفر خاں تھا، جو مظفر خاں کے نام سے ۸۰۶ھ میں تخت حکومت پر بیٹھا، اور ۸۱۳ھ تک شان و تجمل سے حکومت کرتا رہا،

۲- آخری فرماں روا بھی مظفر شاہ تھا جو سنہ ۹۰۱ھ تک حکومت پر قابض رہا،

۷- خاندان لودھی

بہت سے افغان سپاہی خلجی اور تغلق کے زمانہ میں اپنے اہل وعیال سمیت دلی آکر بس رہے تھے، یہ شاہی فوج میں بڑے بڑے عہدوں اور منصبوں پر فائز تھے، ایک قبیلہ لودھی بھی تھا جو اپنے خصائص تہور وشجاعت کی بنا پر خاص طور پر نمایاں اور ممتاز تھا

اسی خاندان کا ایک شخص بہلول لودھی، اب دلی کے تخت حکومت پر متمکن تھا،

سکندر لودھی

بہلول کا جانشین سکندر لودھی تھا، یہ سنہ ۸۹۴ھ میں تخت نشین حکومت ہوا، اس نے نظم مملکت استوار کیا، حالات کو روبراہ کیا، بگڑے ہوئے حالات سنوارے، لوگوں میں اعتماد اور اعتبار کا جذبہ پیدا کیا، دلی کی حالت مسلسل یورشوں اور یلغاروں سے بہت زبوں ہو چکی تھی، سکندر نے دلی کو چھوڑا اور آگرہ کے قریب ایک نیا دارالسلطنت بنایا، جو، اب بھی "سکندرہ" کے نام سے مشہور وموجود ہے،

سکندر کا عہد

سکندر کے عہد کی خاص بات یہ ہے کہ فارسی باقاعدہ دفتری اور سرکاری زبان بن گئی اور ہندو بھی بڑے شوق اور ذوق سے اسے سیکھنے لگے، سکندر سنہ ۹۲۳ھ تک حکمران رہا، اس کا عہد ہمیں ہر اعتبار سے کامیاب نظر آتا ہے،

ابراہیم لودھی،

سکندر کے بعد اس کا بیٹا ابراہیم لودھی سریر آرائے مملکت ہوا، لیکن اس میں وہ صلاحیت نہ تھی جو باپ میں تھی، اس سے فائدہ اٹھا کر تیمور کے پڑپوتے ظہیرالدین بابر نے پہلے تو پنجاب پر قبضہ کر لیا، پھر سنہ ۹۳۲ھ میں اس سے اور ابراہیم لودھی سے باقاعدہ جنگ ہوئی، اس جنگ میں بابر کا پلہ بھاری رہا، اور ابراہیم کے نصیب میں شکست آئی ابراہیم اگرچہ میدان جنگ میں آخر وقت تک ڈٹا رہا، اور بہادری سے مقابلہ کرتا رہا، لیکن قسمت مخالف ہو چکی تھی، لڑتا ہوا مارا گیا، ابراہیم کی ہلاکت نے لودھی سلطنت کا خاتمہ کر دیا، اور بھارت پر بابر کی حکومت قائم ہو گئی،

اٹھارویں منزل

مغل دورِ حکومت

از ظہیر الدین بابر تا محی الدین اورنگ زیب عالمگیر

عہدِ مغل کی خصوصیات

قبل اس کے کہ ہم مغلوں کے عروج و زوال کی داستان شروع کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ اوراق میں جن لوگوں کی کہانیاں ہم پڑھیں گے، ان کی زندگی کارناموں کے اثرات و نتائج، جدوجہد انداز حکومت، اسلوب فرماں روائی، طرز حکمرانی، اور خصائص و کمالات کا پس منظر اور پیش منظر بھی سامنے رکھیں، جس کا مطالعہ کئے بغیر مغلوں کے کئی سو سال کے عہد حکومت کا ہم جائزہ ہی نہیں لے سکتے،

۱۔ علمائے کرام یہ عہد اس اعتبار سے خاص طور پر ممتاز ہے کہ اس زمانہ میں بڑے بڑے علماء ہر طرح کے تھے، علماء سوء بھی اور علمائے حق و خیر بھی، کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ تخت شاہی مسند علم سے ٹکرایا اور بظاہر ایسا معلوم ہوا کہ یہ مسند الٹ گئی، لیکن علماء کا من حیث الجماعت جو وقار تھا، اس میں فرق نہیں آیا، اس جماعت نے درس و تدریس، تعلیم و تعلّم اور افہام و تفہیم کا سلسلہ غیر منقطع طور پر مسلسل جاری رکھا خواہ حکومت کی طرف سے سرپرستی ہو یا مخالفت،

انہوں نے ہر طرح کے مصائب کا مقابلہ کیا لیکن اپنی آن اور شان میں فرق نہیں آنے دیا، اکبر کے مقابلہ میں ملّا عبدالنبی کے مجاہدات کبھی فراموش نہیں ہو سکتے!

۲۔ شعرائے نامدار اس عہد میں ہمیں شعرا کی بھی ایسی منتخب جماعت نظر آتی ہے، جو اس سے پہلے اور اس کے بعد کبھی اور کہیں نظر نہیں آئی، ان کی زبان منجھ چکی تھی، ان کے خیالات میں ندرت تھی، جدّتِ تھی، رعنائی تھی، شگفتگی تھی، طنز تھا، ذہانت تھی، بالیدگی فکر و نظر کا سامان تھا،

شعرا کے یہ قافلے زیادہ تر ایران سے آتے، اور یہاں آکر انہوں نے بزم شعر و سخن میں ایک نئی

زندگی پیدا کردی، ان کے قصیدے، ان کی غزلیں، ان کی مثنویاں، ان کے قطعات ورباعیات ان کے ہجویات ومطائبات، ان کے الفاظ، ان کی فکر کا سیل رواں، ان سب کی زندگی کے سوتے پھوٹے پڑ رہے ہیں، اُبلے پڑ رہے ہیں، انہوں نے فلسفہ کو شعر کا لباس پہنایا، شعر کو فلسفہ بنادیا، اس فنکاری اور کمال کے ساتھ کہ عقل حیران رہ گئی، اور ذہانت عش عش کر اٹھی، شعر نے "کارگہ شیشہ گراں" کی حیثیت اسی دور میں حاصل کی، اوزان وبحور اور ردیف وقوافی میں ان کی جدت طرازیاں اپنی مثال آپ ہیں،

۳۔ صوفیائے عظام

یوں تو غزنوی اور غوری، ایبک اور التمش وغیرہ کے دور میں بھی ہمیں صوفیائے کرام اس دیس میں وعظ وتلقین اور تبلیغ کرتے نظر آتے ہیں لیکن عہد مغلیہ میں بلند پایہ اور عالی منزلت صوفیا کے جو قافلے اس کفرزار کی طرف رواں دواں نظر آتے ہیں، حقائق ومعارف کی ایک دُنیا انہوں نے آباد کردی تھی، ان کی مجلس وعظ جہاں سیاہ قلب مسلمانوں کا پھر سے دین سے رشتہ جوڑتی تھی، وہاں کفروطغیان کے قلعوں میں انکی تبلیغ رخنے بھی پیدا کردیتی تھی، ان کے پاس نہ تلوار تھی، نہ دولت، لیکن یہ جہاں پہنچ جاتے تھے خلقت ان کے فیض سے استفادہ کرنے کے لئے ٹوٹ پڑتی تھی، ان کی زندگی خدا کے لئے وقف تھی، خدا ان کی دستگیری کرتا تھا، بڑے بڑے منکر اور ملحد اور کافر ان کے سامنے آتے، ان کی سیرت، کردار اور انفاس طیبہ سے متاثر ہوکر خدائے واحد کی جناب میں سربسجود ہوجاتے تھے، زنگ کفر دُور ہوجاتا تھا، اور آئینہ قلب مصفا اور مجلا ہوجاتا تھا!

۴۔ بے لاگ مؤرخ

ملوک وسلاطین میں ہمیں ایسی شخصیتیں بھی نظر آتی ہیں، جن کی نگاہ تلوار کا حکم رکھتی تھی،

لیکن اس دور میں ہمیں وہ بے لاگ مؤرخ بھی نظر آتے ہیں، جو بغیر خوف ودہشت کے حق بات کہنے میں ذرا نہیں جھجکتے، جن کا قلم بڑی بے دردی سے ملوک وسلاطین پر تنقید کرتا ہے، ان کی کمزوریاں اجاگر کرتا ہے، ان کی غلطیوں کو فاش کرتا ہے اور ان کی کوتاہیوں کے بیان میں ذرا بھی نہیں ڈرتا ———— مثلاً ملا عبدالقادر بدایونی، یہ عہد اکبری کے بزرگ تھے، علم معقول ومنقول میں ماہر تھے، ابوالفضل اور فیضی کے ہم درس اور خواجہ تاش تھے، ملا مبارک کے شاگرد تھے، لیکن

جب اظہارِ حق پر آتے ہیں تو نہ شہنشاہ حجاہ کی پرواہ کرتے ہیں نہ اُستاد والاجاہ کی، نکتہ چینی کرتے وقت مروت ان کے پاس بھی نہیں پھٹکتی، اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ مروّت اور حق گوئی ساتھ ساتھ نہیں چل سکتیں، ملّا عبدالقادر نے جس طرح اکبر کے دینِ الٰہی اور ملّا مبارک کے کلام نافرجام کی دھجیاں اڑائی ہیں، وہ تاریخ کا غیر فانی نقش بن چکی ہیں۔

۵۔ نظم و انتظام مملکت اس دور میں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ مملکت کا نظم و انتظام اور زیادہ نکھر گیا تھا، راستے پُر خطر تھے، لیکن حکومت کی سختی اور نگرانی نے ان پُر خطر راستوں کو مامون بنا دیا تھا،

۶۔ امن و امان کسی اچھی حکومت کے لئے یہ ضروری ہے کہ اندرون مملکت خلفشار، بدنظمی اور ہنگامہ آرائی سے محفوظ ہو، مغلوں نے اس طرف پوری توجہ کی، اور ایسے مستحکم پیمانہ پر امن و امان قائم کیا کہ اس طویل و عریض مملکت میں بدامنی اور شورش کا کہیں وجود نظر نہیں آتا،

۷۔ عدل و انصاف عہد مغلیہ میں ایک اور چیز اپنی پوری تابناکی اور رعنائی کے ساتھ جو نظر آتی ہے، وہ ہے بے لاگ عدل و انصاف، مغل فرماں روا اس طرف خاص طور پر توجہ کرتے تھے، ہندو ہو یا مسلماں، عیسائی ہو یا پارسی، ان کے دربار میں جو فریاد لے کر آتا تھا وہ محروم و مایوس نہیں جاتا تھا،

۸۔ بندوبست مال گزاری اس عہد میں ایک اور چیز جواب تک معیار و اساس کا درجہ رکھتی ہے، وہ ہے لگان بندی، مال گزاری اور بندوبست کا نیا نظام۔

اکبر کا بنایا اور نافذ کیا ہوا نظام مال و محصول آج تک جزوی تغیرات کے ساتھ قائم ہے، انگریز بھی باہمہ دعوائے ہمہ دانی اس سے استفادہ کرنے اور اس پر عمل کرنے پر مجبور ہو گئے،

۹۔ فتوحات جدیدہ اس اعتبار سے بھی ہمیں مغلوں کا دور ایک امتیازی وصف کا حامل نظر آتا ہے کہ انہوں نے فتوحات جدیدہ کا ایک نہ ٹوٹنے والا سلسلہ قائم کر دیا اور اس معاملہ میں کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی، انہوں نے جہاں راناسانگا کو شکست

دی، اور رانا اودے پور کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا وہاں دکن میں، خان دیس میں، مالوا میں، اور دوسرے مقامات میں ان مسلمان بادشاہوں اور مسلم مملکتوں کو بھی اپنی لشکر کشی کا نشانہ بنایا، جو آزادی اور خود مختاری کی زندگی بسر کرنے کی آرزوؤں کو عملی جامہ پہنا رہے تھے،

۱۰۔ متحدہ ہندوستان

مغلوں کا یہ طرز عمل اس بنیادی اصول پر مبنی تھا کہ وہ رفتہ رفتہ لیکن تیزی اور سرعت کے ساتھ ہندوستان کو ایک متحدہ ملک بنا رہے تھے، اگرچہ خلجی اور التمش وغیرہ کے دور میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اس دیس کو ایک مرکزی حکومت کا تابع بنانے کی کوششیں کی گئیں اور وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئیں، لیکن مغلوں کے عہد میں یہ کوشش ایک حقیقت بن گئی، مغلوں کا رقبۂ سلطنت اپنے پیش رووں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ وسیع تھا، اس مناسبت سے ہندوستان کو ایک مرکزی حکومت کا تابع رکھنے میں دشواریاں بھی حائل تھیں، لیکن انہوں نے ہر دشواری کا جان پر کھیل کر مقابلہ کیا، ہر طوفان سے ٹکرائے، ہر قوت سے زور آزمائی کی اور ایسے متحدہ ہندوستان کی تشکیل کر دی، جو ان کی حکومت کے ختم ہونے کے بعد بھی قائم رہی، اور اس کے فوائد و مصالح بھارت کے باشندوں کو اتنے بھائے کہ وہ تشکیل و قیام پاکستان کی مخالفت بھی اس دلیل سے کرتے رہے کہ متحدہ ہندوستان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا،

۱۱۔ مستقل رہائش کا فیصلہ

مغلوں نے اپنے پیش رووں کے مقابلہ میں متحدہ ہندوستان پر زیادہ زور دیا، اور اپنے پیش رووں کے مقابلہ میں وہ زیادہ کامیاب بھی رہے، اس کی وجہ صرف ایک ہے، غزنوی اور غوری تو مسافر کی طرح یہاں فاتح بن کر آتے تھے، فتح کیا اور واپس چلے گئے، غزنوی اور غوری کے بعد ایبک اور التمش وغیرہ اگرچہ یہیں رہے، اور یہیں مرے، لیکن وہ درحقیقت اپنے ان آقاؤں کے غلام تھے، جو غزنی اور غور میں بادشاہت کر رہے تھے، بعد میں یہ خود مختار ہوئے، لیکن عہد خود مختاری میں بھی یہ کوئی ایسا اقدام نہیں کر سکے، جس سے یہ معلوم ہوتا کہ اب دائمی طور پر یہ رہنا اور بسنا چاہتے ہیں،

اس کے برعکس بابر نے ہندوستان فتح کرتے ہی فیصلہ کر لیا کہ اب یہیں زندہ رہنا اور مرنا ہے اب فرغانہ وطن نہیں رہا، بھارت وطن بن گیا ہے، چنانچہ اس نے امرا اور سرداروں

سے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ میں تو اب یہیں کا توطن اور بود و باش اختیار کروں گا تم میں سے جو میرے ساتھ رہنا چاہے رہے جو وطن واپس جانا چاہے چلا جائے،

۱۲- ہندو مسلم اتحاد

یوں تو ہم غزنوی کی فوج میں بھی ہندو سپاہیوں کو دیکھتے ہیں، لیکن ہندو مسلم اتحاد کا صحیح تخیل عہد مغلیہ کی پیداوار ہے،

مغلوں نے جب اس دیس میں مستقل طور پر رہنے کا فیصلہ کرلیا، تو محسوس کیا، جب ایک ہی ملک میں دونوں کو رہنا ہے تو پھر کیوں نہ میل محبت خلوص اور تعاون دوستی اور رفاقت کی زندگی بسر کی جائے، ادھر مسلمانوں کے مستقل رہ پڑنے سے ہندوؤں نے بھی یہی محسوس کیا کہ دوست بن کر رہنا، دشمن بن کر رہنے سے زیادہ بہتر اور سودمند ہے، اس اتحاد خیال نے ہندو مسلم اتحاد کی تشکیل کی اور تاریخ میں پہلی مرتبہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہندو اور مسلمان عوام و خواص مذہبی اختلاف کے باوجود رل مل کر رہنے کا گُر سیکھ گئے، جہاں مسلمانوں نے ان کے ساتھ اتنی رواداری برتی کہ ان کے مذہبی معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کی، ان پر کسی قسم کی زیادتی نہیں کی، سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان کے لئے کھول دیئے، فوج میں بھی بڑے سے بڑے اور اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں پر انہیں فائز کیا، مسلم ممالک ـــــ مثلاً افغانستان ـــــ تک میں انہیں گورنر اور سپہ سالار بنا کر بھیجا، تجارت تمام کی تمام انہی کے ہاتھ میں رہنے دی، اور ان کی نفع اندوزی سے کچھ بھی تعرض نہیں کیا، وہاں ہندوؤں نے بھی اتنی عالی ظرفی اور فراخ دلی دکھائی کہ ذوق و شوق سے فارسی سیکھنے لگے، اس زبان میں شاعری کرنے لگے، ادب و انشا میں بہت سے مسلمانوں سے بازی لے گئے، جو عہدہ دیا گیا اس پر پوری دیانت اور وفاداری سے (بجز چند مستثنیات کے) فائز رہے اور اپنی ذمہ داریاں خوبی اور خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے، دولت بھی خوب کمائی اور جب موقع آیا تو خون بہانے سے دریغ نہ کیا، اس صورت حال نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے بہت قریب کردیا، اور فاتح و مفتوح میں برادرانہ تعلقات قائم ہوگئے، اور روز بروز ان میں استحکام پیدا ہوتا گیا،

۱۳- رشتہ و پیوند کے تعلقات

مغلوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے قریب کرنے کے سلسلہ میں ایک قدم اور بڑھایا، یعنی

راجپوت خاندانوں میں شادی کی طرح ڈالی، چنانچہ عالمگیر تک جتنے مغل سلاطین گزرے ہیں، سب کے سب ہی ہندو مہارانیوں کے بطن سے تولد ہوئے، جہانگیر رانی جودہ بائی (اچے پور) کے بطن سے پیدا ہوا، جہانگیر کی شادی راجکماری جودھ پور سے ہوئی، اس شادی سے شہنشاہ اکبر نے اتنی دلچسپی کا اظہار کیا کہ خود اکبر نے بہو یعنی دولہن کا ڈولا اٹھایا، اسی راجکماری کے بطن سے شاہجہان اعظم پیدا ہوا جس کے کارنامے صفحۂ ارض پر نقش دوام بن چکے ہیں،

۱۴- رواداری

یوں تو ہر عہد کے مسلمان بادشاہوں نے مذہبی رواداری کا غیر مسلموں کے ساتھ ثبوت دیا لیکن مغل اس معاملہ میں بھی دوسروں سے گوئے سبقت لے گئے، اکبر تو اس معاملہ میں یہاں تک بڑھ گیا تھا کہ محل شاہی میں اُس نے پیاز اور لہسن کی درآمد بند کر دی تھی، اور سارے ملک میں گاؤکشی کے بارے میں حکم امتناعی نافذ کر دیا تھا، دوسرے مغل بادشاہ اس حد تک تو نہ جا سکے لیکن انہوں نے بھی حتی الامکان کوئی ایسی بات نہیں کی جو ان کی دل آزاری کی موجب ہو، ہندو اہل قلم نے عالمگیر اورنگ زیب کو بہت بدنام کیا ہے کہ وہ مذہبی دیوانہ تھا، لیکن عالمگیر تک کے فرامین موجود ہیں، جن میں بنارس وغیرہ کے مندروں کو معافیات دی گئی تھیں، اور یہ مندر ان معافیوں سے آج بھی پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں!

۱۵- شجاعت اور دلیری

مغلوں کی سلطنت کو جن وجوہ سے استحکام و دوام حاصل ہوا ان میں ایک بڑی وجہ، مغل فرماں رواؤں کی غیر معمولی جرأت وہمت اور شجاعت و دلیری بھی ہے، خاص طور پر بابر سے لے کر عالمگیر تک تو اس شجاعت اور دلیری کے ایسے کارنامے نظر کے سامنے آتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے،

۱۶- عام خوشحالی!

مغلوں نے چونکہ ملکی بنا پر حکومت کی، اس لئے ملک کی صلاح و فلاح سے وہ کبھی غافل نہیں رہے، انہوں نے ملک کی معاشیات، زراعت، تجارت، کاروبار اور صنعت کو فروغ دینے کے وسائل سوچے، اور انہیں بروئے کار لائے، یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ مغلوں کے دور میں ایک طرف تو حکومت کا خزانہ ہمیشہ بھرپور رہا، دوسری طرف عوام بھی خوش حالی اور فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے رہے، روپیہ کی قیمت خرید اتنی بڑھ گئی کہ اس زمانہ کا ایک روپیہ ہمارے موجودہ زمانہ کے بیس پچیس روپیہ کے برابر تھا!

غرض جس اعتبار، اور جس حیثیت سے بھی دیکھئے، مغلوں کا طویل دور حکومت، بھارت کے لئے یکسر آیۂ رحمت ثابت ہوگا، انہوں نے اس ملک کو وہ کچھ دیا، جو یہاں کے پشتینی راجہ اور مہاراجہ بھی نہ دے سکے، پھر کتنے تعجب کی بات ہے کہ آج آزاد بھارت میں جب غلامی کی مدت کا حساب لگایا جاتا ہے تو وہ انگریزوں کے وقت سے نہیں شروع کی جاتی، بلکہ ان مسلمان بادشاہوں کے وقت سے شمار کی جاتی ہے، جنہوں نے اس ملک کو اپنا وطن بنالیا تھا، جنہوں نے یہاں باغوں کا جال پھیلا دیا، نہریں کھدوائیں اور سارے ملک کو سرسبز و شاداب کر دیا، نئے نئے شہر بسائے، آج اگر ان شہروں اور قصبوں کو ہندوستان کے جغرافیہ سے خارج کر دیا جائے، جو صرف مسلمانوں نے اس ملک میں بسائے اور آباد کئے، تو یہ شاید یہ ملک بالکل ہیچ ہو کر رہ جائے گا، اگر مسلمانوں کے بسائے اور آباد کئے ہوئے شہروں کو عارضی طور پر بھارت کے موجودہ باشندوں سے خالی کرالیا جائے تو وہاں آبادکاری اور بحالیات کا ایک ایسا محکمہ قائم کرنا پڑے گا، جسے لاکھوں نہیں کروڑوں آدمیوں کے لئے شہر بسانے پڑیں گے۔

ظہیر الدین بابر

بابر کا باپ شیخ عمر، فرغانہ نامی چھوٹی سی ریاست کا والی تھا، بابر ابھی بارہ برس کا بھی نہ تھا کہ داغ یتیمی سہنا پڑا (۸۹۹ھ) یتیم ہوتے ہی اس پر مصائب بارش کی طرح برسنے لگے کبھی بھی اسے یکسوئی اور اطمینان کے ساتھ بیٹھنے کا موقع نہیں ملا۔

وہ خانہ بدوشوں کی طرح ادھر سے ادھر مارا مارا پھرتا رہا، لیکن آدمی جیالا، اور حوصلہ مند تھا، مصائب کا ہجوم بھی، اس کے عزم و تہوّر میں تزلزل نہ پیدا کر سکا، سنہ ۹۱۰ھ میں بھی آشفتہ روزگار اور پریشان حال بابر ہمیں کابل کے تخت پر بصد جاہ و تمکین متمکن نظر آتا ہے،

بابر کی تگ و تاز کا مقصد زیادہ تر ماوراء النہر پر قبضہ و تسلط تھا، لیکن ادھر ہندوستان نے دعوت قبضہ دی۔

بابر تو مہم جو اور خطرات پسند تھا ہی، آمادہ ہو گیا ابتدائی تین حملے کوئی خاص فیصلہ نہ کر سکے، چوتھی مرتبہ (سنہ ۹۲۰ھ) میں وہ ابراہیم لودھی کے صوبہ دار دولت خاں کی غداری کے باعث لاہور پر قابض ہو گیا،

اب ابراہیم لودھی ایک بہت بڑی فوج لے کر مقابلہ کو پہنچ گیا، میدان جنگ پانی پت قرار پایا، بظاہر بابر کی فتح کا کوئی امکان نہیں تھا، بابر کی فوج صرف ۱۲ ہزار افراد پر مشتمل تھی، اور لودھی کی فوج اس سے کئی گنا زیادہ تھی، لیکن بابر جیت گیا، اور لودھی کے حصہ میں شکست اور موت آئی، (سنہ ۹۳۲ھ)

رانا سانگا سے ٹکر

بابر نے ہندوستان فتح کر لیا ——— اور بظاہر حالات ساز گار ہو گئے، یکایک چتوڑ کا رستم زماں اور سکندر اعظم، رانا سانگا، اپنا لاؤ لشکر لے کر بابر کے مقابلہ کو نکلا، اس یلغار کی خبر سن کر بابر کے لشکر پر مرگ آسا، سکوت طاری ہو گیا

اوراس خوف ودہشت کے معقول وجوہ بھی تھے۔

ایک طرف،

۱۔ راناسانگا خود بڑا جری، بہادر، کارآزمودہ تجربہ کار اور ناقابلِ تسخیر، سپاہی اور سپہ سالار تھا، اس کا جسم جنگ کے تمغوں (زخموں) سے بھرا ہوا تھا، اس کے ساتھ جو راجپوتی لشکر تھا اس میں اسی ہزار سوار اور ۵ سو ہاتھی تھے،

۲۔ سکندر لودھی کا بیٹا محمود لودھی دس ہزار کے لشکر جرار کے ساتھ راناسانگا سے آکر مل گیا کہ بابر کو شکست دے، اور اپنے ہندو حلیف کی مدد سے تختِ ہند پر قبضہ کر لے،

۳۔ حسن خاں میواتی بھی قول وقرار سے پھر گیا، اس نے بابر سے، دوستی اور وفاداری کا جو پیمان باندھا تھا اُسے توڑ دیا، بارہ ہزار سواروں کے ساتھ وہ بھی راناسانگا کے لشکر کے ساتھ آملا،

۴۔ ایک اور رقیب و حریف مملکت، صلاح الدین اپنی تیس ہزار فوج کے ساتھ راناسانگا کی امداد و اعانت کے لئے وارد ہوا اور بابر کے خلاف لڑنے کا اعلان کر دیا۔

۵۔ علاوہ ازیں راناسانگا کے ہندو دوستوں میں جو راجہ اور مہاراجہ تھے، وہ بھی بابر کو بھارت سے نکالنے کے لئے ساتھ تھے، اور ان راجاؤں کی تعداد ایک سو بیس سے متجاوز تھی،

۶۔ راناسانگا کے ساتھ اس کا اور دوستوں اور حلیفوں کا جو لشکر تھا، اس کی تعداد اکسفرڈ ہسٹری کے بیان کے مطابق دولاکھ سے زیادہ تھی!

اور دوسری طرف،

۱۔ بابر کی فوج صرف بارہ ہزار افراد پر مشتمل تھی،

۲۔ اس یلغار کی خبر سن کر ہر طرف سے مطیع ومنقاد لوگوں کی سرکشی اور بغاوت پر مائل ہونے کی خبریں آنے لگیں،

۳۔ کول (علی گڑھ) سنبھل (مرادآباد) اور قنوج وغیرہ مقامات کے بابری قلعہ داروں کو اپنا مستقر چھوڑ کر آگرہ آکر پناہ لینی پڑی،

۴۔ بعض قلعہ دار حالات کی ناسازگاری اور کسی قسم کی کمک سے مایوس ہو کر قلعہ بند ہونے پر مجبور ہو گئے۔

۵- جتنے ہندوستانی سپاہی اور سردار مغل لشکر میں تھے، وہ اس مایوس کن حالت کو دیکھ کر راہ فرار اختیار کرنے لگے، لشکر بابری سے قطع تعلق کر کے جس کا جدھر منہ اُٹھا چلا گیا،

۶- شاہی منجم نے جس کی پیشین گوئیوں کے مغل سپاہی اور افسر بہت زیادہ قائل تھے پیشین گوئی کردی تھی کہ بابر اور بابری لشکر کی خیر نہیں، اس پیشین گوئی نے ہراس اور دہشت میں کئی گنا اضافہ کر دیا۔

ان حوصلہ شکن، روح فرسا اور مایوس کن حالات میں بابر نے کیا کیا؛

۱- بابر کے عزم و استقامت میں کوئی فرق نہیں آیا، اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے جنگی تیاریاں جاری رکھیں۔

۲- اس نے اپنے سرداروں اور سپاہیوں کو یقین دلایا کہ وہ یہ جنگ توسیع مملکت کے لئے نہیں، حصول ثواب جہاد کے لئے لڑ رہا ہے (تزک بابری)

۳- اپنے قول کا ثبوت دینے کے لئے اس نے شراب خوری ترک کردی، توبہ کی، شراب کے گراں قیمت برتن تڑوا دیئے، اور ان کا سونا چاندی غریبوں اور فقیروں میں تقسیم کر دیا۔

۴- غزنی سے ابھی ابھی کئی اونٹوں پر لد کر شراب کے قرابے آئے تھے، ان سب میں نمک ڈلوایا، اور شراب انگوری کو سرکہ میں تبدیل کر دیا،

۵- مسلمانوں سے جو غیر شرعی محاصل وصول کئے جاتے تھے، وہ یک لخت معاف کر دیئے،

اور یہ سب کچھ کرنے کے بعد اس نے اپنے سپاہیوں، امیروں اور سرداروں کو مخاطب کر کے ایک موثر تقریر کی جس میں جہاد پر زور دیا، لوگوں کے دل سے موت کی دہشت کافور ہوگئی، وہ ایک بلند مقصد (اسلام) کے لئے جان دینے اور لینے پر تیار ہو گئے سب نے قرآن ہاتھ میں لے کر قسم کھائی کہ مر جائیں گے لیکن میدان جنگ سے پیٹھ نہیں پھیریں گے، آگرہ سے تیس میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں کنواہہ پر دونوں لشکروں میں مقابلہ ہوا۔ بابر بذات خود اپنے لشکر کا سپہ سالار تھا، بابر کی توپوں نے دشمن کا منہ پھیر دیا، بڑے بڑے ساونتوں کے چھکے چھوٹ گئے، گھمسان کا رن پڑا، دیکھتے دیکھتے سب سے پہلے راجپوت میدان چھوڑ کر بھاگے، ان بھاگنے والوں کے آگے آگے جو شخص تھا، وہ چتوڑ کا سکندر اعظم اور رستم زماں رانا سانگا تھا، البتہ ایک حسن خاں میواتی تھا، جس نے

بھاگنے کو عار سمجھا، جس نے رانا سانگا کے ساتھ بھی فرار ہونا شرافت، شجاعت اور قول و قرار کے خلاف سمجھا، جو آخر وقت تک لڑتا رہا، اور لڑتے لڑتے میدان جنگ میں ہلاک ہوا، مغلوں کو عظیم الشان فتح حاصل ہوئی، اور بقول لین پول کے اگر بابر راجپوتوں کا پیچھا کرتا رہتا تو اسی جنگ میں راجپوت قوتِ مزاحمت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی، (۱۹۳۳ء)

اس مرحلہ کے سر کرنے کے بعد، بابر نے چندیری ممالک شرقی، اور بنگالہ کی طرف توجہ کی ہر معرکہ میں کامیاب اور فتحمند رہا، ۹۳۷ھ میں بیمار پڑا، اور آگرہ میں وفات پائی، نعش کابل بھیجی گئی، وہیں تدفین عمل میں آئی اور ایک عالی شان مقبرہ بنا، جو آج تک زیارت گاہ خلائق ہے۔

لہ یہ گاؤں اب بھی موجود ہے، اور ریاست بھرت پور میں شامل ہے۔

ہمایوں

بابر کی وفات کے بعد اس کا چہیتا اور محبوب بیٹا نصیر الدین ہمایوں مالک چتر داورنگ ہوا، یہ بڑا نرم دل، اور سراپا محبت وشفقت انسان تھا، اس کی یہ نیکی اور نرمی اس کے لئے بلائے جان بن گئی، اپنے بھائیوں کی بڑی سے بڑی غلطی اور غداری کو اس نے بڑی آسانی سے معاف کر دیا، بابر کے انتقال کے بعد اس کے ایک سوتیلے بھائی مرزا کامران نے کابل اور پنجاب پر خود مختاری کا ڈنکہ بجانا شروع کر دیا۔ ہمایوں نے سرکوبی کرنے کے بجائے اس کے دعویٰ کو تسلیم کر لیا، گجرات اور مالوے میں شورش اور جنگ وپیکار کا سلسلہ شروع ہوا، لیکن ہر مرتبہ ہمایوں کی کامیابیوں کو اس کے بھائیوں اور بداندیش سرداروں نے ناکامیوں سے بدل دیا، لیکن ہمایوں نے اپنوں کے خلاف کوئی تعزیری قدم نہیں اٹھایا۔

اس اثنا میں ایک نئی قوت اُبھر رہی تھی، یہ تھا فرید خاں جو آگے چل کر شیر شاہ سوری کے نام سے مشہور ہوا،

یہ غوری خاندان کی ایک شاخ کا فرد تھا، بابر کی فوج میں ملازم تھا، لیکن اب سارے ہندوستان پر حکومت کرنے کا منصوبہ تیار کر رہا تھا، اس نے رفتہ رفتہ بڑی جمعیت فراہم کر لی، اور بہت زیادہ قوت حاصل کر لی، اور قنوج تک کے تمام راستوں پر قابض ہو گیا، آگرے کے قریب جنگ ہوئی ہمایوں کا لشکر ہار گیا، (۹۴۶ھ) خود ہمایوں غرق آب ہوتے ہوتے بچا، ہمایوں ابھی آگرہ سے بہت دور تھا کہ شیر شاہ نے آگرہ پر قبضہ کر لیا (۹۴۷ھ میں) اب ہمایوں کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ بھاگے اسی افراتفری میں ہمایوں کو خدا نے ایک چاند سا بیٹا ——— جلال الدین اکبر مرحمت فرمایا (۹۴۹ھ) جو آگے چل کر سورج سے زیادہ چمکا، آخر ہر طرف سے مایوس ہو کر بیچارہ!

میں جاکر پناہ گزین ہوگیا وہاں سے ایک لشکر آیا تو کابل اور بدخشاں کی حکومت بھائیوں سے چھین لی، لیکن انہیں کوئی سزا نہ دی،

سوری کی وفات ہمایوں کی یلغار اور موت

شیر شاہ کے عہد حکومت پر ایک نظر ڈالی جائے تو ماننا پڑے گا، قدرت نے اسے حکمرانی اور فرماں روائی کے لئے پیدا کیا تھا، اس نے اپنی مختصر مدتِ حیات اور مختصر تر دور حکومت میں جو کارنامے انجام دیئے، وہ بہت سے بادشاہ پچاس برس میں بھی انجام نہیں دے پائے، اس نے نیا بندوبست قائم کیا، وہی تھوڑی سی ترمیم کے بعد دور اکبری میں قائم رہا، اور اب بھی موجود ہے، ۹۶۱ھ میں اس کا انتقال ہوگیا، اس کے مرتے ہی سوری خاندان کا دبدبہ ختم ہوگیا، حکومت کے نئے نئے مدعی پیدا ہونے لگے، ہمایوں نے حالات سے فائدہ اٹھایا، بڑی آسانی سے ۹۶۲ھ میں رہتاس کے قلعہ پر قابض ہوگیا، پھر لاہور پہنچا، وہاں سے دِتی —— یہیں ہمایوں اپنے کتب خانے کے زینہ سے گر کر وفات پاگیا (۹۶۳ھ) ہمایوں کے مرتے ہی، پھر شورش شروع ہوئی، پٹھانوں کی مدد سے ہیمو بقال نے یکایک دوآبہ سے بڑھ کر دتی پر قبضہ کرلیا، اور "راجہ بکرماجیت" کا لقب حاصل کر کے حکومت کرنے لگا، اکبر کا اتالیق بیرم خاں بڑے غصہ کے ساتھ مقابلہ کے لئے بڑھا، پانی پت کے میدان میں جنگ ہوئی، اس جنگ میں راجہ بکرماجیت قتل ہوا، پٹھان تتر بتر ہوگئے اور مغلوں کی سلطنت از سر نو مستحکم ہوگئی، یہ واقعہ ۹۶۴ھ کا ہے!

اکبر کی تخت نشینی اور بیرم خان

اکبر ابھی بالکل نوعمر تھا، کاروبار مملکت ہاتھ میں لینے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا، بیرم خان اس کا اتالیق مقرر ہوا، اور حق یہ ہے کہ بیرم خان نے حسن وفاداری، دیانت داری، صداقت اور خلوص کے ساتھ اپنی گراں بار ذمہ داریاں انجام دیں یہ اسی کا حصہ تھا۔

جلال الدّین اکبر — محی الدّین عالمگیر

تختِ حکومت پر بیٹھتے ہی اکبر نے ہندوؤں کے ساتھ رواداری فراخ دلی، عالی حوصلگی اور اخوت و مساوات کا برتاؤ شروع کر دیا، اس نے جزیہ یک قلم معاف کر دیا، گاؤکشی کے امتناع کا فرمان نافذ کر دیا، ہندو جاتریوں پر جو محصول لگتے تھے وہ یک قلم منسوخ کر دیئے، ہندوؤں کو بڑے بڑے عہدے دیئے، جے پور کے راجہ نے اس سے اپنی لڑکی بیاہنا چاہی، اکبر نے اسے منظور کر لیا (۹۶۹ھ) اس طرح راجپوتوں اور مغلوں میں رشتہ داریاں بھی شروع ہو گئیں ولی عہد سلطنت نور الدین جہانگیر اسی راجکماری کے بطن سے تھا، راجکماری کے بھائی بھگوان داس کو اُمرائے دربار میں بڑی جگہ دی، اس کے بھتیجے مان سنگھ کو منصبِ اعلیٰ پر فائز کیا، اور کوئی شبہ نہیں کہ ان راجپوت سرداروں نے بھی بادشاہ پرستی، عزیز داری اور رفاقت کا حق ادا کر دیا۔

چتوڑ کے رانا سے جنگ

لیکن اس فراخ دلانہ برتاؤ کے باوجود اسے بعض ہندو راجاؤں سے محاربات بھی کرنے پڑے،

چتوڑ کے رانا سے اکبر کی ٹھنی، اکبر خود فوجِ گراں لے کر بڑھا، رانا اودے سنگھ خود تو جنگلوں میں روپوش ہو گیا، اس کا ایک عزیز اور قائم مقام جے مل مقابلہ کو سامنے آیا، کئی مہینے تک یہاں معرکہ آرائیوں کا سلسلہ جاری رہا، آخر ۹۷۵ھ میں یہ مستحکم ترین قلعہ اکبر نے فتح کر لیا، اکبر نامہ کے بیان کے مطابق ۳۰ ہزار کے قریب نفوس اس معرکہ میں ہلاک یا زخمی ہوئے، اکبر نے یہ ریاست ضبط کر لی، اور اسے اجمیر کے صوبہ کا ایک جزء بنا دیا، پھر ۹۷۶ھ میں اکبر نے رنتھمبور کا قلعہ چٹکی بجاتے میں فتح کر لیا!

بنگال و اڑیسہ کے پٹھانوں سے ٹکر

بنگال میں خاص طور پر بہار و اڑیسہ میں عام طور پر پٹھان موجود تھے، اور یہ اپنی عظمتِ رفتہ کے

حصول کے لئے جد وجہد کرتے رہتے تھے، بنگال پٹھانوں کا گڑھ بن گیا تھا، یہاں انہوں نے بادشاہت قائم کرلی تھی، اور بڑے طمطراق سے حکومت کر رہے تھے، یوں تو کئی جھڑپیں ہوئیں لیکن ۹۸۲ھ میں اکبر خود ایک بڑی فوج لے کر چلا، راستہ میں اُس نے گنگا اور جمنا کے سنگم پر الہ آباد تعمیر کرنے کے احکام صادر کئے۔ بنگال کا بادشاہ داؤد خاں، پٹنہ میں آکر قلعہ بند ہوگیا تھا یہیں رن پڑا، ۹۸۳ھ کے معرکہ میں داؤد کو جان سے ہاتھ دھونا پڑے، اور بنگال پر مکمل طور سے اکبری حکومت قائم ہوگئی، اور حسین قلی خاں نیا ناظم اطمینان سے حکومت کرنے لگا،

اکبر کی وفات

۱۰۱۴ھ میں اکبر وفات پاگیا، سکندر لودھی کے "سکندرہ" میں دفن ہوا، شاندار مقبرہ تعمیر ہوا، اکبر نے تقریباً ۵۰ سال حکومت کی، اس میں کمزوریاں بھی تھیں خامیاں بھی تھیں، نقائص بھی تھے، لیکن اس میں اچھائیاں بھی تھیں، خوبیاں بھی تھیں، حسنات بھی تھے!

مجموعی حیثیت سے اکبر کا عہد شاندار عہد تھا، اس کی شخصیت، بلند مرتبت شخصیت تھی، اس کا کردار رفیع واعلیٰ تھا، اس کی سیرت بلند اور بہتر تھی،

اکبر کا مذہب

مذہب کے معاملہ میں اکبر اب تک بدنام ہے، اور شاید ابھی بہت دنوں تک بدنام رہے گا، لیکن اگر اس عہد کی تاریخ عمار کی ذہنیت اور غلط قسم کی مذہبیت کا جائزہ لیا جائے تو ماننا پڑے گا، خالص مذہبی نقطہ نظر سے بھی اکبر اتنا بُرا نہیں ہے جتنا سمجھا جا رہا ہے! ——— اور اگر ہے بھی تو اس کی ذمہ داری، الحاد دوستی اور لادینی پر اتنی نہیں ہے جتنی خود علمائے کرام کی، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اکبر جو مسجد میں جھاڑو دیتا تھا، آگرہ سے اجمیر تک پاپیادہ سفر کرتا تھا، حضرت شیخ سلیم کے اسم گرامی پر اپنے ولی عہد جہانگیر کا نام سلیم رکھتا تھا، خود ہی ایک نئے دین کا بانی بن گیا اور اس طرح اس نے اپنی اس ذہنی کوفت کو تسکین دی جو غلط قسم کے علمار نے پیدا کر دی تھی،

شہنشاہ جہانگیر

بظاہر اکبر کے بعد اس کا کوئی امکان نہ تھا کہ اس کا بڑا بیٹا اور ولی عہد سلطنت مالک تاج ونگین ہو سکے گا، شراب خوب پیتا تھا، بے اعتدالیوں کا شروع ہی سے عادی تھا، رند مشرب بھی تھا، طبیعت میں بغاوت کے

عناصر بھی تھے، ایک دفعہ باپ کے مقابلہ کو آمادہ ہوگیا پھر باپ اور بیٹے میں ایسی جدائی ہوئی کہ لوگوں نے سمجھ لیا، اب یہ کبھی نہیں مل سکیں گے، لیکن عجیب بات تھی کہ ان نالائقیوں کے باوجود اکبر کو جہانگیر سے عشق تھا، وہ اس سے والہانہ محبت کرتا تھا، جب وہ بستر مرگ پر دراز تھا، جہانگیر آیا، باپ کے قدموں سے لپٹ گیا، اکبر نے اسے کلیجہ سے لگالیا، اپنے سامنے تاج شہریاری پہنایا، آنکھوں میں مسرت کے آنسو تھے، اسی حالت میں وہ اس جہانِ فانی سے گزر گیا، جو لوگ خسرو کی آس لگائے بیٹھے تھے، وہ منہ دیکھتے رہ گئے،

جہانگیر کے صفات و خصوصیات

جہانگیر کو خدا نے عجیب صفات دئے تھے، وہ رند الست تھا ہر وقت شراب کے نشہ میں وھت رہتا تھا، وہ عاشق بیتاب تھا، نور جہاں اس کے دل پر حکومت کرتی تھی، بقول مولانا شبلی اس کی جبین پیشانی،

جا کے بن جاتی تھی اوراق حکومت پہ شکن!

وہ مناظر قدرت کا دلدادہ تھا، کشمیر کو کشمیر اسی نے بنایا تھا، ساتھ ہی ساتھ مستعد، فرض شناس اور اولوالعزم بھی بلا کا تھا، جہاں رزم کا وقت آیا اُس نے بزم کی بساط الٹی، شراب کا پیالہ پھینکا، نور جہاں سے منہ موڑا، گھوڑے پر بیٹھا، اور ایک سورما کی طرح میدان میں پہنچ گیا۔ اور جب تک معرکہ سر نہ کر لیا نہ شراب و کباب سے تعلق رکھا، نہ مہوشان گلفام، نغمہ و موسیقی اور عیش و طرب سے، یہی وجہ ہے کہ اگرچہ وہ رند لاابالی تھا، لیکن استحکام و وقار میں اس کی حکومت پیش روسے کسی طرح کم نہیں تھی، زوال قریب بھی نہیں آنے پایا، اور اقبال و عروج کا چتر برابر سایہ فگن رہا!

ہم گزشتہ اوراق میں پڑھ چکے ہیں کہ چتوڑ کا مہارانا کتنا سرکش تھا، اکبر نے اس کے زور کو توڑا، چتوڑ کو فتح کرلیا، اور اسے اجمیر کا ایک حصہ بنا دیا، لیکن یہاں کا مہارانا اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا، اس کی سرکشی اب بھی قائم تھی، مغلیہ فوجیں جب تاخت و تاراج کر کے واپس چلی جاتی تھیں، یہ جنگلوں، پہاڑوں اور غاروں سے نکل آتا تھا، جب وہ پھر سرکوبی کے لئے پہنچتی تھیں، تو یہ پھر جنگلوں، پہاڑوں اور غاروں میں چھپ جاتا تھا، جہانگیر نے فیصلہ کیا یہ صورت حال ختم ہونی چاہیے چنانچہ اس نے اپنے ولی عہد شہزادہ خرم (شاہجہان) کو اس مہم پر مامور کیا، وہ گیا اور اس خوبی

سے اس نے ناکہ بندی کی کہ آخر رانا کو ہتھیار ڈال دینے پڑے اور اس نے باقاعدہ اطاعت کا اعلان کر دیا (۱۰۲۳ھ) پھر کبھی بغاوت اس سے ظہور میں نہیں آئی، بلکہ دکن کی مہمات میں اپنے سواروں کے ساتھ وہ ہمیں مغل افواج کا ہم رکاب نظر آتا ہے،

۱۰۳۷ھ میں کشمیر کے راستہ سے واپس آتے ہوئے لاہور میں جہانگیر کا مرض دمہ میں انتقال ہوگیا، شہزادۂ خرم کے اتنے وقیع کارنامے لوگوں کے سامنے تھے کہ دراندازوں کی ایک نہ چلی، وہ اگرچہ آگرہ سے دُور تھا لیکن بلوایا گیا، اور تخت حکومت پر باطمینان متمکن ہوگیا، احتیاطاً شہریار اور دوسرے بھائی جو رقیب یا حریف بن سکتے تھے قتل کر دیئے گئے، تاکہ کوئی کانٹا باقی نہ رہے۔

شاہجہان تخت حکومت پر

شاہجہان ۱۰۳۷ھ میں تخت حکومت پر بیٹھا، اور ۱۰۶۸ھ میں سعادت مند بیٹے کے ہاتھوں معزول اور نظر بند ہوا اس تیس اکتیس سال کی مدت کا اگر جائزہ لیا جائے تو ماننا پڑے گا، شاہجہان (خاندانی نام شہاب الدین) کی عجیب و غریب ذہنی اور دماغی صلاحیتیں اس کی ولی عہدی کے زمانہ ہی سے اجاگر ہو چکی تھیں، تخت حکومت پر بیٹھنے کے بعد ان میں اور زیادہ جلا اور صیقل پیدا ہوگئی، ایسا معلوم ہوتا ہے، قدرت بھی شاہجہان پر بہت مہربان تھی!

شاہجہان کے عہد میں بھارت جتنا خوشحال، دولت مند، سرسبز اور شادکام نظر آتا ہے، اس سے پہلے اور بعد کبھی نظر نہیں آتا، دنیا جہان کی دولت بھارت کی طرف کھنچ رہی تھی، ممالک غیر (فرنگستان وغیرہ) کے لوگ سونا اور چاندی کے ذخیرے لاتے تھے، یہ ذخیرے یہاں کے باشندوں کو سونپ کر مالِ تجارت لے کر واپس جاتے تھے، اس افراطِ زر نے یہاں کے لوگوں میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی، ایک نیا حوصلہ پیدا کر دیا،

اس خوش گوار صورت حالات سے شاہجہان نے بھی پورا پورا فائدہ اٹھایا، اس نے اس ملک کو نئے نئے باغوں عمارتوں قلعوں شہروں مقبروں اور مسجدوں سے پاٹ دیا، وہ جہاں گیا اپنی یادگار اس نے ضرور قائم کی موجودہ دلی اس کی آباد کی ہوئی ہے جس طرح آگرہ اکبر کے سبب "اکبرآباد" کے نام سے مشہور ہوا، اسی طرح یہ نئی دہلی شاہجہان آباد کے نام سے موسوم ہوئی، یہ بہت بڑا اور نیا شہر شاہجہان اعظم کی حوصلہ مندیوں کا ایسا ثبوت ہے جو آج تک موجود ہے اور رہتی دنیا تک

موجود رہے گا،

یوں تو شاہجہان نے بہت سی مسجدیں بنوائیں جو اپنی سنگینی، مضبوطی، استحکام پائیداری، نفاست اور خوبصورتی کے اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتیں لیکن دلّی کی مسجد جامع اس کے ذوق تعمیر کا شاہکار ہے، اسے اگر عروس المساجد کہا جائے تو ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا،

قلعے بھی شاہجہانی دور میں بہت سے تعمیر ہوئے، لیکن لال قلعہ جہاں اپنی نزاکت کے اعتبار سے تختۂ گل نظر آتا ہے. تو اپنی سنگینی اور استحکام کے لحاظ سے وہ کوہ مرتبت بھی ہے، اس قلعہ کی موتی مسجد اور دوسرے محلات و قصور، تاریخ میں اپنا مقام خاص رکھتے ہیں، اجمیر میں شاہجہان نے مسجد بنوائی، سندھ کے ٹھٹھہ میں بھی اور دوسرے مقامات میں بھی، غرض اس نے ہندوستان کے چپہ چپہ پر اپنے نقوش قائم کردیئے، اشوک صرف اتنا کرسکا تھا کہ جگہ بہ جگہ اس نے لاٹ نصب کردیئے تھے، یہی اس کی عظمت کا ثبوت مانے جاتے ہیں، لیکن شاہجہان کے بارے میں کیا کہا جائے گا جس نے لاٹ نہیں، اس سرزمین پر ان گنت باغ، قلعے، شہر، مسجدیں اور مقبرے کھڑے کردیئے، جن کی عظمت و جلال کے سامنے آج بھی آسمان خم ہوتا ہے اور زمین فخر کرتی ہے،

شاہجہان کو اپنی بیوی ارجمند بانو سے محبت نہیں عشق تھا، یہ نورجہاں کی بھانجی اور اعتماد الدولہ کی بیٹی تھی، حسن صورت میں لاجواب حسن سیرت میں بے نظیر" شاہجہان حقیقی معنوں میں شاہجہان تھا، دنیا کا حسن اس کے قدموں پر لوٹتا تھا، لیکن اس نے ارجمند بانو سے جو پیمان وفا باندھا تھا، اسے زندگی کی آخری سانس تک نباہا، ارجمند بانو خوش قسمت تھی کہ شوہر کے زانو پر سر رکھ کر عالم جاوداں کو سدھاری، شوہر نے بیوی کو زندہ جاوید کرنے کے لئے روضۂ تاج گنج تعمیر کیا ——— "خالص سنگِ مرمر کی جنت!" اس روضہ کا شمار دنیا کے ہفت عجائبات میں ہوتا ہے، دور دراز مقامات سے سیاح آتے ہیں اور اسے عقیدت و عظمت کی نظر سے دیکھتے ہیں.

یہ نہ سمجھنا چاہیئے، شاہجہان صرف ایک خوش ذوق اور شاعر مزاج فرماں روا تھا، وہ خوش ذوق بھی تھا اور شاعر مزاج بھی، قدرت کی فیاضیوں سے تمتع حاصل کرنا بھی جانتا تھا، ساتھ ہی ساتھ جیالا اور دلیر بھی تھا، مدبّر اور دور اندیش بھی تھا، میدانِ رزم کا سورما، اور رَن کا دھنی بھی تھا، اس

نے شاہزادگی کے زمانہ میں جو کارنامے انجام دیئے تھے، وہ اس کی عظمت و بزرگی کا کافی ثبوت ہیں، پھر تخت سلطنت پر بیٹھنے کے بعد ہی اس نے جو مہمیں، کابل و بدخشاں تک روانہ کیں، وہ اس کی جنگی مہارت اور فراست کا ناقابل تردید ثبوت ہیں!

سنہ ۱۰۴۰ھ میں دربار شاہجہانی کا ایک امیر کبیر، خان جہاں لودھی، بادشاہ کے عتاب کا شکار ہوا، عتاب سے بچنے کے لئے اپنی پوری سپاہ و جمعیت لے کر وہ دکن پہنچ گیا، دکن کے مفسدہ پردازوں نے اس کی خوب آؤ بھگت کی،

شاہجہان کب خاموش بیٹھ سکتا تھا، وہ آگرہ سے اٹھا، اور ایک فوج لے کر برہان پور آن کی آن میں پہنچ گیا، یہ کسی کو وہم دگمان بھی نہیں تھا کہ خود شاہجہان سرکوبی کے لئے پہنچے گا، لیکن جب یہ واقعہ حقیقت کی صورت میں نمودار ہوا تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، جو لڑنے اور شکست دینے کا پروگرام بنا رہے تھے، وہ راہِ فرار تلاش کرنے لگے، خود خان جہاں شمال کی طرف بھاگا، مغل سپاہیوں نے تعاقب کیا، اور کالنجر کے قریب گھیر کر مار لیا (سنہ ۱۰۴۰ھ)

شاہجہان کے جانے کے بعد ایک نیا دشمن اُبھرا، یہ ساہو تھا، سیواجی کا باپ، بیجاپور کی مسلمان حکومت اس کی پشت پناہی کر رہی تھی، دکن کی دوسری اسلامی ریاستیں بھی اسکی حوصلہ افزائی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کر رہی تھیں،

شاہجہان پھر اٹھا۔ اور سر پر آن کی آن میں پہنچ گیا! ——— اس نے بیجاپور کا بھی قلع قمع کر دیا۔ اور گول کنڈہ کو بھی خراج گزار بنا لیا (سنہ ۱۰۴۵ھ) یہ سب کچھ اتنی تیزی اور مستعدی کے ساتھ ہوا کہ دشمنوں اور باغیوں کے حوصلے پست ہو گئے، مغل حکومت کی سطوت اور شوکت میں اضافہ ہو گیا۔

شاہجہان کے چار بیٹے تھے، چاروں ایک ہی ماں ارجمند بانو کے بطن سے تھے۔

۱۔ دارا شکوہ،

۲۔ شہزادہ شجاع

۳۔ اورنگ زیب عالمگیر

۴۔ مراد بخش،

چاروں میں ان بن رہتی تھی، چاروں کا مزاج جداگانہ تھا، سیاست کے جوڑ توڑ میں ہر ایک

دوسرے سے بازی لے جانا چاہتا تھا ـــــــــــ

عالمگیر میں حکومت کرنے کی خداداد صلاحیت تھی، دکن کی صوبہ داری کے زمانہ میں ایک طرف اس نے نظم و انتظام درست کیا، باغیوں اور سرکشوں کی سرکوبی کی، دوسری طرف رعایا کی فلاح اصلاح سے بھی غافل نہیں رہا، اس نے دُور دُور مقامات سے غلہ منگایا، اور سستے داموں فروخت کیا، بیج دیئے کہ کسان بوئیں اور اگائیں، تقاوی تقسیم کی کہ جو دشواریاں زراعت اور غلافت کے راستے میں حائل ہوں انہیں دور کریں، بارش بھی وقت پر ہونے لگی، کھیت لہلہانے لگے، سبزہ خودرو اپنی بہار دکھانے لگا، مزروعہ اراضی کی پیمائش ہوئی، جمع بندی کی گئی، لوگوں کو روزگار ملنے لگا، آسودہ حالی بڑھنے لگی، خوش حالی میں اضافہ ہونے لگا،

۱۰۶۷ھ تک بھائیوں کی اندرونی کشمکش جاری رہی، اسی سال شاہجہان بیمار پڑا، اور بے صبر شاہزادوں میں جنگ زرگری شروع ہوگئی، نتیجہ یہ ہوا، کہ بعد میں اگرچہ شاہجہان تندرست ہو گیا، لیکن حصول شاہی کی جنگ پر کوئی اثر نہ پڑا، اصل معرکہ دارا شکوہ اور اورنگ زیب میں تھا، دارا شکوہ ہار گیا، اورنگ زیب جیت گیا، باپ کو قلعہ میں نظر بند کیا، اور اس کی زندگی میں اپنی بادشاہت کا اعلان کردیا، (۱۰۶۸ھ) بعد میں شکست خوردہ بھائی دارا شکوہ اور رفیق کار بھائی مراد بخش دونوں کو ہلاک کردیا، تیسرا بھائی شجاع ہاتھ نہ آیا، اراکان کی پہاڑیوں میں ایسا غائب ہوا کہ پھر اس کی کوئی خیر خبر نہ معلوم ہوئی،

صاف اور سچی بات یہ ہے کہ عالمگیر کی دارا شکوہ سے جنگ قطعاً مذہبی نہ تھی، خالص سیاسی تھی، اسلامی حکومت کو اکبر اور جہانگیر سے کوئی گزند نہیں پہنچا تھا، تو دارا شکوہ سے بھی نہیں پہنچ سکتا تھا، بلکہ دارا شکوہ چونکہ اکبر سے زیادہ تعلیم یافتہ، نکتہ ور صوفی منش، اور صاحب فہم و فراست تھا، اس لئے ممکن تھا اس کا عہد اکبر سے زیادہ کامیاب ہوتا، جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ دارا اور عالمگیر میں مذہبی دشمنی تھی، وہ غلط کہتے ہیں، دشمنی ضرور تھی، لیکن محض ذاتی، خالص سیاسی، سرتاسر "جنگِ زرگری"! ہمارے اس دعوے کا ثبوت ان مکاتیب سے ملتا ہے، جو دکن سے اپنی صوبہ داری کے زمانہ میں عالمگیر نے باپ اور بہن کو لکھے تھے، ان میں دارا کی سخت گستاخانہ شکایتیں ہیں، لیکن کہیں اس کے مذہبی اطوار زیر بحث نہیں لائے گئے ہیں، پھر آخر میں جب شاہجہان کو دارا کی

طرف داری کے الزام میں عالمگیر نے نظر بند کیا، تب بھی نہ باپ پر یہ الزام لگایا کہ وہ ایک ملحد و زندیق کی طرف داری کرتا ہے، نہ بھائی کو یہ الزام دیا کہ وہ فسق و فجور میں مبتلا ہے، دونوں بھائی حکومت کے لئے لڑ رہے تھے، جو جیت گیا اس نے حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی، فتاوائے عالمگیری اس کا ایک کارنامہ ہے، اور کارنامہ کو ہم عزت اور قدر و وقعت کی نظر سے دیکھتے ہیں لیکن یہ خالص علمی کام تھا اسلامی حکومت کسی کتاب کے ترتیب و تدوین سے عمل میں نہیں آیا کرتی، عہد عالمگیری کے قوانین و ضوابط ہمارے سامنے ہیں ان میں کہیں بھی وہ "اسلامیت"، نظر نہیں آتی جو ایک اسلامی حکومت کے لئے ضروری اور لابدی ہے، جو بادشاہ مذہب کے احترام میں بھائی کی گردن اڑادے اور باپ کو قید کرلے، وہ برسر اقتدار اور برسر حکومت ہونے کے بعد اسلامی حکومت قائم کرنے سے کیوں قاصر رہا؟ —— اس کا جواب ہمارے ذمہ نہیں، ان اصحاب کے ذمہ ہے، جو اس کی مذہبیت کو ہر الزام کے مقابلہ میں شفیع بنا کر کھڑا کر دیتے ہیں، ہندوؤں پر جزیہ لگانا اور دکن کی متعدد حکومتوں کو ختم کردینا ایک اچھا کام تھا، لیکن صرف یہ دونوں کام اسلامی حکومت کے کفیل نہیں ہو سکتے، انہیں کسی طرح بھی اسلامی حکومت کا سنگِ بنیاد نہیں قرار دیا جا سکتا۔

گفتگو ابھی ختم نہیں ہوئی، ایک خاص نکتہ اور غور طلب ہے!

اکبر جیسے لامذہب شخص کے دور میں بھی ہمیں مخدوم الملک اور ملا عبد النبی جیسے اصحاب نظر آتے ہیں جو امور مذہبی کے سرکاری طور پر انچارج تھے، ان معاملات کو انجام دینے کے لئے انہیں حسبِ ضرورت عدالتی اختیارات بھی حاصل تھے، خزانہ کا ایک حصہ بھی ان کی تحویل میں رہتا تھا اور وہ مصارف معلومہ میں اسے خرچ کرنے کے مجاز تھے، گویا من حیث الجماعت علماء برسرِ اقتدار تھے،

لیکن عالمگیر کے عہد میں ہمیں علماء کی کوئی تنظیم نظر نہیں آتی! —— کوئی عالم ایسا نظر نہیں آتا، جو سرکاری طور پر امور مذہبی کا انچارج ہو، یہ صحیح ہے کہ حسبِ مرضی وہ علماء سے صلاح و مشورہ کر لیتا تھا، لیکن علماء کی رائے کو فیصلہ کن حیثیت حاصل تھی، یہ ہمیں کہیں نظر نہیں آتا۔

مد علمائے اسلام سے برابر مشورہ کرتا رہا، لیکن ان کی کوئی باقاعدہ اور صاحب اختیار جماعت نہ تھی، کلی اقتدار کا مالک بادشاہ وقت ہی مانا جاتا تھا، عوام اور علما کو

قوت وہمت بلکہ نیت ہی نہ ہوتی تھی کہ اپنے حقوق منوائیں اور ملکی معاملات میں حصّہ لینے کی کوشش کریں!

(تاریخ پاکستان وبھارت از سید ہاشمی صفحہ ۵۶)

یہ ایک بالغ نظر مورخ اور وقائع نویس کی رائے ہے، اور واقعات وحقائق کی بنا پر ہم اس رائے کی تائید پر مجبور ہیں، اس سے اختلاف کی کوئی وجہ ہمیں نہیں نظر آتی،

لہٰذا ہم اگر یہ تسلیم کرلیں کہ تخت حکومت پر عالمگیر کا تسلط مذہبی جذبہ سے زیادہ ذاتی اور سیاسی محرکات کا نتیجہ تھا تو ہم عالمگیر اور تاریخ کے ساتھ انصاف کریں گے۔

اور یہ تسلیم کرلینے کے بعد بھی عالمگیر کی بلند وبالا شخصیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، وہ بہر حال ایک انسان تھا، کوئی فرشتہ نہ تھا، غلطیاں انسان ہی سے ہوتی ہیں، فرشتوں سے نہیں ہوتیں، وہ انسان تھا اس سے غلطیاں سرزد ہوئیں، لیکن اس کے حسنات سیئات پر غالب تھے، خوبیاں بہت تھیں، نقائص بہت کم، وہ تاریخ کا بہت بڑا آدمی تھا، اس کی شخصیت عظیم وجلیل تھی، وہ فضائل وملکات کا مجموعہ تھا اور بہت بڑا بادشاہ، بہت بڑا فاتح، بہت بڑا سپہ سالار، بہت بڑا مدبر اس کا لباس، اس کی وضع قطع، اس کا رہن سہن، اس کا انداز حیات یکسر فقیرانہ تھا، وہ سادہ کھاتا تھا، سادہ پہنتا تھا، سادہ زندگی بسر کرتا تھا، اگرچہ دنیا کی بہت بڑی حکومت اس کی مٹھی میں تھی،

عالمگیر کا عہد ہر اعتبار سے نمایاں اور ممتاز ہے، وہ چالیس سال کی عمر میں تخت حکومت پر جلوہ فرما ہوا، پچاس برس تک حکومت کی، شروع کے ۲۵ سال وہ شمالی ہند میں رہا، اور یہاں کے سرکشوں کو اس نے اس طرح قابو میں کیا کہ آخری ۲۵ سال جب وہ دکن میں رہا، تو یہ سر اٹھانا تو بڑی چیز ہے، کلبلا بھی نہ سکے اسے ان کی مزاج پرسی کے لئے ایک مرتبہ بھی دکن سے شمالی ہند نہیں واپس آنا پڑا، پچاس سال کی طویل مدت میں اس نے اس طرح حکومت کی، کہ اگر اس کے اخلاف میں بھی وہی بات ہوتی تو شاید آئندہ ایک ہزار سال تک مغلیہ حکومت متزلزل نہ ہوتی!

عہد عالمگیری کے فتوحات اور مہمات کی داستان بڑی طویل ہے، پچاس سال کی مدت یوں بھی کم نہیں ہوتی، اور جب یہ پچاس سال کارناموں سے لبریز ہوں تو نگاہ انتخاب درماندہ ہو جاتی ہے

کس کو چھوڑے اور کسے لے، لیکن یہ طویل داستان مختصر الفاظ میں ہمیں سنانی ہی پڑے گی،
عہد عالمگیری میں صوبۂ سرحد کے پٹھان پہلے کے مقابلہ میں زیادہ شورش پسند ہو گئے تھے، یوں تو انہوں نے بابر اور اکبر کے زمانہ میں بھی شورشوں کا سلسلہ جاری رکھا، لیکن عالمگیر کے عہد میں یہ شورش حد کمال کو پہنچ گئی تھی، خوش حال خاں خٹک کا نام آج بھی سرحدی پٹھانوں میں عزت و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے کہ وہ کسی طرح بھی اس پر آمادہ نہ ہوا کہ سر جھکائے،
جب یہ شورش مقامی حکام فرو نہ کر سکے تو عالمگیر خود ایک لشکر لے کر بڑھا، حسن ابدال میں مقیم ہوا اور ناکہ بندی کر کے اپنے دستوں کو آغر خاں کی سپہ سالاری میں آگے بڑھایا، یہ آغر خاں خود بھی پٹھان تھا، اس مہم میں سرحدی شورش اور فتنہ کا ایسا سدِ باب ہوا کہ پھر ایک عرصۂ دراز تک یہاں سے کوئی فتنہ رونما نہیں ہوا۔ (۱۰۸۱ھ)

۲۔ مرہٹوں کی سرکوبی

دکن کی "اسلامی" ریاستوں کی پشت پناہی نے سیواجی کو اُبھارا، یہ مرہٹوں کا ایک لشکر بنا کر کھڑا ہو گیا، مرہٹے کسان تھے اور کھیتی باڑی کر کے پیٹ پالتے تھے، ملک عنبر نے انہیں پہلی مرتبہ جنگجو بنایا اور تلوار تھمائی، رفتہ رفتہ ہندوستان پر بادشاہت کے خواب دیکھنے لگے، ساہو سیواجی کے باپ کو بیجاپور کی حکومت نے چھوٹی سی جاگیر دی، یہی جاگیر اب حکومت بن رہی تھی، سیواجی اپنے لٹیروں کو لے کر جدھر چاہتا نکل جاتا، اور لوٹ مار کر کے نہتے شہریوں اور دیہاتیوں میں سراسیمگی پیدا کر دیتا، عالمگیر کے ایک سردار شائستہ خاں نے سیواجی پر فوج کشی کی، سیواجی میدانی لڑائی سے بھاگتا تھا، اسے گوریلا جنگ بھی آتی تھی، شائستہ خاں کوکن کے تمام قلعوں پر قابض ہو گیا، پونا بھی فتح کر لیا، اور خاص سیواجی کی حویلی میں مقیم ہوا، دکن کا صوبہ دار اورنگ زیب کا بیٹا شہزادہ معظم تھا، اس نے اتنی سرزنش کافی سمجھی راجہ جے سنگھ نے سفارش کی اور دربار عالمگیری سے معافی مل گئی (۱۰۷۳ھ)
لیکن مرہٹوں نے اس معافی کی قدر نہ کی، پھر اُٹھے سورت پہنچے، حاجیوں کی کشتیاں لوٹ لیں، اور پہاڑوں میں روپوش ہو گئے، سیواجی کو جب راہِ فرار نہ ملی تو مجبور ہو کر تن تنہا مسلمانوں کے لشکر میں معافی مانگنے آیا، لشکر کا سردار جے سنگھ تھا، اس نے مغلیہ روایات کے ماتحت یہ اطاعت قبول کر لی، پھر آگرہ جا کر عالمگیر کے دربار سے پنج ہزاری منصب پایا (۱۰۷۶ھ)

کچھ دن آگرہ میں رہ کر سیواجی اپنے بیٹے کو وہیں آگرہ میں چھوڑ کر پھر بھاگ کھڑا ہوا اور ۱۰۸۵ھ میں اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا، اور ابوالحسن تاناشاہ (گول کنڈہ) اور بیجاپور سے اسے مالی مدد ملی، اور آئندہ ہر طرح اعانت کا وعدہ ہوا،

پھر خود عالمگیر پہنچا، سیواجی اس کا مقابلہ نہ کر سکا، ۱۰۹۰ھ میں وہ وفات پا گیا، اور اس کا بڑا بیٹا سنبھا وارث حکومت ہوا اب عالمگیر دکن میں طویل قیام کے ارادہ سے (۱۰۹۳ھ) پہنچ چکا تھا، وہ دلی میں بیٹھا دیکھ رہا تھا کہ دکن کی تمام مسلمان ریاستیں کس طرح مرہٹوں کو شہ دے رہی ہیں اور مرہٹے کس طرح ترقی اور طاقت حاصل کر رہے ہیں، لہذا اس نے فیصلہ کر لیا ان تمام نام نہاد اسلامی حکومتوں کو بھی ختم کر کے سلطنت مغلیہ میں شامل کر لے اور مرہٹوں کی بھی ایسی سرکوبی کرے کہ پھر وہ سر نہ اٹھا سکیں،

عالمگیر نے نظام شاہی، عادل شاہی اور قطب شاہی حکومتوں کا استیصال کر دیا جس پر اسے ذرا بھی ملامت نہیں کی جا سکتی، (۱۰۹۷، ۱۰۹۸) یہ اپنی جگہ پر صحیح ہے کہ دکن کی یہ اسلامی حکومتیں اپنی تہذیب و تمدن، معاشرت اور خصائص علم پروری، ادب نوازی، شان حکومت، ہر اعتبار سے ایک دل آویز مجموعہ تھیں، لیکن انہوں نے مرکزی حکومت کے خلاف اتنی معاندانہ ذہنیت پیدا کر لی تھی کہ مرہٹوں تک کے عروج و اقتدار کا سبب بن گئیں، اب عالمگیر کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہ تھا کہ پہلے انہیں ختم کرے پھر مرہٹوں سے نبٹے!

ادھونی کا قلعہ مرہٹوں کا گڑھ تھا، عالمگیر کی طرف سے فیروز جنگ، اسے سر کرنے پر مامور ہوا، اس نے بڑی دلاوری اور جاں بازی کے ساتھ اسے سر کر لیا، سنبھا گرفتار ہوا، بدزبانی کے جرم میں قتل ہؤا، سنبھا اتنا سفاک تھا کہ اس کی لوٹ سے ہندو مسلمان کوئی نہیں بچتا تھا، چنانچہ جب یہ گرفتار ہوا تو جس گاؤں سے اسے لے کر گزرتے تھے لوگ خوشیاں مناتے تھے کہ ایک پاپی سے نجات ملی۔

ساہو سیواجی کا پوتا سنبھا کے بیٹے ساہو کو عالمگیر نے اپنی نگرانی میں لے لیا، اس کی تعلیم کا انتظام کیا، تربیت کا بندوبست کیا، اس کے وقار میں کوئی فرق نہ آنے دیا، اسے اُمرائے شاہی میں داخل کر لیا، عالمگیر کی ان کرم فرمائیوں کو ساہو کبھی نہ بھول

سکا ہمیشہ شکر گزاری کے ساتھ ان احسانات کو یاد کرتا رہا،

عالمگیر کی آخری مہم

عالمگیر کی آخری مہم راجا رام کی سرکوبی تھی یہ سنبھا کا بھائی تھا، اور اب گدی کا وارث بن بیٹھا تھا، عالمگیر خود بڑھاپے کے باوجود ایک لشکر گراں لے کر دکن پہنچا، (۱۱۰۹ھ) مرہٹے یہاں پوری طاقت سے لڑے، لیکن ان کی قوت پاش پاش ہو گئی، بسنت گڑھ، ستارا، اور دوسرے مقامات بڑی جدوجہد کے بعد سر ہو گئے، اور مغلیہ حکومت کا پرچم یہاں لہرانے لگا، اگر عالمگیر دتی سے دکن میں نہ آتا تو کوئی شبہ نہیں، دکن کی حکومتیں شمالی ہند پر چھا جاتیں، مغل حکومت ختم ہو جاتی، اور پھر ان حکومتوں کو مرہٹے ختم کر دیتے،

عالمگیر کی وفات

۱۱۱۸ھ میں عالمگیر چند روز بیمار رہ کر عالم آخرت کو سدھارا، وفات کے وقت عمر ۹۰ سال سے متجاوز تھی، جہانگیر کی طرح یہ بھی دمہ کا مریض تھا، اسی مرض میں جان گئی، عالمگیر نے وصیت کی تھی کہ تجہیز و تکفین خالص اسلامی سادگی کے ساتھ انجام دی جائے، لاش احمد نگر سے (جہاں وفات ہوئی تھی) اورنگ آباد لائی گئی، اور یہیں دفن ہوئی اس کا مزار اب تک زیارت گاہ خلائق ہے!

عالمگیر کے عہد میں مغل حکومت کا رقبہ اور زیادہ وسیع ہو گیا، دشمنوں کی اس طرح سرکوبی ہوئی کہ یا تو وہ نیست و نابود ہو گئے، یا اتنے کمزور پڑ گئے کہ پھر کسی بڑے خطرہ کا سبب نہ بن سکے، رعایا کی خوشحالی بھی قائم رہی، اس کی آسودگی میں بھی کوئی فرق نہیں آیا، کاروبار سلطنت کی تنظیم ایسے پیمانہ پر ہوئی کہ کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جس پر عالمگیر کی نظر نہ ہو، وہ براہ راست واقفیت نہ رکھتا ہو اور خود اس کے احکام و فرامین بہت بڑا ادبی سرمایہ بھی ہیں، اس کی انشا، فصاحت و بلاغت کا معیار سمجھی جاتی ہے، اس کے مکاتیب اور فرامین خالص ادبی نقطۂ نظر سے بڑی قدر و قیمت رکھتے ہیں اکبر سے لے کر شاہجہان تک ہر بیٹے نے ——— جہانگیر نے اکبر کے خلاف خسرو نے جہانگیر کے خلاف ——— باپ سے مقابلہ کی ٹھانی، لیکن عالمگیر کے ایک بیٹے اکبر کی بغاوت کا انجام ایسا دردناک ہوا کہ آخر وقت تک عالمگیر کے بیٹے باپ کے نام سے کانپتے رہے ۹۰ برس کی عمر میں بھی اس کے رعب و جلال کا یہ عالم تھا، جیسے شیر! ——— کہ وہ جتنا بوڑھا ہوتا ہے اتنا ہی خوفناک ہو جاتا ہے!

بے تعصّب اور روادار عالمگیر

عالمگیر میں کئی کمزوریاں تھیں لیکن یہ بات جو کہی جاتی ہے کہ عالمگیر ہندو کش تھا، ظالم تھا، ستم گر تھا! تاریخی اعتبار سے بالکل غلط ہے!

۱۔ عالمگیر نے سیواجی جیسے غدار کے پوتے کے ساتھ جو روادارانہ برتاؤ کیا، جس طرح اس کی پرورش کی، تربیت کی، امرائے دربار میں داخل کیا، ہم پڑھ چکے ہیں!

۲۔ ہم یہ بھی پڑھ چکے ہیں کہ اس نے بار بار سیواجی کی غلطیوں کو معاف کیا، اور ہر معافی کے بعد وہ اور زیادہ شوخ و دلیر ہوتا گیا، لیکن عالمگیر کے لطفِ عمیم میں کوئی فرق نہیں آیا وہ بار بار معاف کرتا رہا!

۳۔ مہاراناجسونت سنگھ وہ شخص ہے، جو عالمگیر سے مخالف بھائیوں کا ساتھی بن کر لڑا، لیکن تختِ حکومت پر بیٹھنے کے بعد نہ صرف یہ کہ عالمگیر نے اس سے کوئی انتقام نہیں لیا، بلکہ اس کے تمام مراعات بحال کرائے، خطاب بھی، منصب بھی، دولت بھی، اقتدار و اختیار بھی!

۴۔ عالمگیر نے ہندوؤں سے جزیہ لیا، لیکن وہی شرعی جزیہ، جو ایک فقیر بھی بآسانی دے سکتا ہے اس کے مقابلہ میں مسلمانوں سے جو زکوٰۃ لی گئی، وہ اس جزیہ سے کئی گنا زیادہ تھی،

۵۔ مندروں کے ساتھ بھی عالمگیر نے روادارانہ برتاؤ کیا، اس نے بنارس کے متعدد منادر کو جاگیریں اور معافیاں دیں، جن کا تذکرہ سر جادو ناتھ سرکار بھی اپنی تاریخ میں کرنے پر مجبور ہوئے ہیں، اگر وہ ہندو کش اور ہندو بیزار اور متعصب ہوتا تو کسی طرح بھی ممکن نہ تھا کہ وہ مندروں کو مالی امداد دیتا،

۶۔ عالمگیر کی فوج میں ہمیں ہندو سپاہی اور سردار، دربار میں ہندو امرا اور منصب دار نظر آتے ہیں، دکھاوے کے لئے نہیں بلکہ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ان پر زیادہ سے زیادہ اعتماد کیا جاتا تھا۔ انہیں بڑی سے بڑی ذمہ داریاں سونپی جاتی تھیں، نازک سے نازک مواقع پر ان کی نیت اور کام پر بھروسہ کیا جاتا تھا، کبھی بھی انہیں مسلمانوں سے ہیچ اور کمتر نہیں سمجھا گیا۔ ہمیشہ ان کے وقار اور اجلال کا احترام کیا گیا، اور ان کے ساتھ کبھی ایسا رویہ نہیں اختیار کیا گیا کہ وہ احساسِ کمتری کے مرض میں مبتلا ہوں۔

۷۔ عالمگیر نے مسلمانوں کے ساتھ کوئی خاص رعایت نہیں کی اس نے نظام شاہی، عادل شاہی حکومتیں ختم کر دیں ——— وہ اس سلوک کی مستحق بھی تھیں ——— لیکن ہندو راجاؤں اور سرداروں کی بار بار سرکشی اور بغاوت اور غداری کے باوجود ان کے ساتھ کبھی ایسا نہیں کیا، ان کے جرائم معاف کئے، ان کی مکاری سے درگزر کی، ان کے منصب بحال کئے ان کا راج پاٹ واپس کیا، ان کے اختیارات پھر سے عالی ظرفی اور بلند حوصلگی سے کام لے کر انہیں تفویض کر دیئے، لہٰذا اگر مسلمان شکایت کریں تو کسی حد تک وہ قابلِ غور ہو سکتی ہے، لیکن ہندوؤں کو کسی طرح بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس کے خلاف لب کشائی کریں۔

مُغلوں کا دَورِ زوال

○

بہادر شاہ اوّل سے بہادر شاہ ظفر تک،
از ۱۷۰۷ء تا ۱۸۵۷ء

عہدِ زوال پر ایک نظر

زوال و ادبار کی کارفرمائی اور سلطانی کے سامنے سب بے بس ہو جاتے ہیں، لیکن یہ طوفان اور آندھی کی طرح نہیں آتا، اس سیلاب کی طرح آتا ہے، جو اندر ہی اندر زمین کو کاٹتا رہتا ہے، اپنی جگہ بناتا رہتا ہے، پھیلتا رہتا ہے اور ایک روز دفعتاً بے سان گمان بڑی بڑی عمارتیں، مکانات، محلات، حویلیاں بتاشے کی طرح بیٹھ جاتی ہیں، بلبلے کی طرح تیرنے لگتی ہیں اور دیکھتے دیکھتے غرق آب ہو جاتی ہیں یہ سیلاب اگر سامنے سے آئے تو اس کا تدارک بھی کیا جا سکتا ہے لیکن یہ اس طرح رفتہ رفتہ آتا ہے کہ پھر اس کے سامنے کسی کا بس نہیں چلتا،

مغلیہ سلطنت کا زوال عالمگیر کے آنکھ بند کرتے ہی شروع ہو گیا تھا، یہ زوال بہت آہستہ آہستہ جڑیں کھوکھلی کرتا رہا، ڈیڑھ سو برس کی مدت گذر گئی، اور ایک دنیا نے دیکھ لیا کہ عالمگیر کا جانشین لال قلعہ کا مالک فرمانروائے ہندوستان انگریزوں کی ایک عدالت میں مجرم کی طرح کٹہرے میں کھڑا ہے، یہ زوال ۱۷۰۷ء سے شروع ہوا تھا اور ۱۸۵۷ء میں تکمیل کو پہنچا،

مغلوں کے اسباب زوال کی یوں تو ایک لمبی چوڑی فہرست تیار کی جا سکتی ہے لیکن اس طویل فہرست کو اگر ہم مختصر کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ :-

۱- ایک بڑا سبب خانہ جنگی تھا،

۲- خانہ جنگی کے ساتھ ساتھ کمزوری کا جذبہ بھی ابھرا، اب تک مغل فرمانروا اپنے دست و بازو پر بھروسہ کرتے تھے اب وہ اپنے اعوان و انصار پر تکیہ کرنے لگے اور ان اعوان و انصار نے تاریخ میں ہمیشہ نقصان زیادہ پہنچایا ہے اور فائدہ بہت کم!

۳- سعدی کی نصیحت ہے کہ

دشمن حقیر و بیچارہ نشمرد دشمن تواں حقیر و بیچارہ شمرد

ایک بہت بڑی حقیقت ہے ——— ہم دیکھتے ہیں جب مغل طاقتور تھے تب ان کی یہ حالت تھی کہ سیواجی جیسے معمولی لٹیرے کی سرکوبی اور دکن کی نام نہاد اسلامی سلطنتوں کی شورش پسندی کے استیصال کے لئے عالمگیر نے زندگی کے آخری ۲۵ سال دکن میں گذار دیئے، لیکن جب مغل کمزور ہونے لگے، تو بڑے دشمن کو کمزور اور حقیر سمجھنے لگے، ہم دیکھتے ہیں کہ سکھ ابھرے ابھرتے رہے، بہت بڑی طاقت بن گئے لیکن یہ مغل امپائر کچھ نہ کر سکی، اسی طرح مرہٹے جو عہد عالمگیری میں کچھ نہ کر سکے تھے اب پروان چڑھے، وہ رفتہ رفتہ ایک حکومت کے مالک بن گئے پھر آگے بڑھے تو انہوں نے سارے ہندوستان میں ایک تہلکہ مچا دیا، لیکن ان کا کوئی کچھ نہ کر سکا، جب تک وہ زیادہ ابھرے نہیں تھے، نظرانداز کئے جاتے رہے جب ناقابل مزاحمت ہوگئے تو تسلیم و اختیار کی پالیسی اختیار کر لی گئی، نادر شاہ درانی ایران سے اٹھا، اور طوفانِ بادوباراں کی طرح دلی پہنچ گیا، لیکن دلی کا بادشاہ،

اب تو آرام سے گذرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے

کا وظیفہ پڑھتا رہا، پھر وہ دلی میں آیا، اور اس نے سنہری مسجد میں بیٹھ کر ایک معمولی سی بات پر قتل عام شروع کر دیا، لیکن شہنشاہ معظم کچھ نہ کر سکے، پھر اس نے تخت طاؤس اور کوہ نور ہیرا لے لیا مگر شہنشاہ فلک بارگاہ ذرا مزاحمت نہ کر سکے، اس نے سرزمین ہند کو خوب لوٹا، دتی کو روندا، سونے چاندی سے جھولی بھری اور عیش پرستیوں کا دور شروع ہوگیا ——— اس طرح بادشاہت

کی ساکھ بھی مٹ گئی، اور دبدبہ بھی جاتا رہا، لوگوں نے سمجھ لیا خالی لفافہ ہے!

۴۔ مغلوں کے دورِ عروج میں سب سے زیادہ زور جس چیز پر دیا جاتا تھا وہ تھی حکومت کی مرکزیت اور ملک کی وحدت، لیکن عہدِ زوال میں ہم دیکھتے ہیں کہ بھارت پھر ہندو دورِ حکومت کی طرح متعدد آزاد اور خود مختار شاہیوں اور ریاستوں کا مجموعہ بن گیا ہے، وہ جنوبی ریاستیں تھیں، جو اپنے دبدبہ اور طنطنہ میں دلّی سے بازی لئے جا رہی تھیں، بہت سے خاندان تھے، جن میں بادشاہت پیدا ہو رہی تھی، پل رہی تھی، بڑھ رہی تھی، بہت سی ریاستیں تھیں، جنہوں نے اطاعت کا جوا گردن سے اتار پھینکا تھا، اور علی الاعلان اپنی آزادی کا ڈھول بجا رہی تھیں، دلّی کی بادشاہت سمٹتے سمٹتے لال قلعہ تک محدود ہوتی جاتی تھی، اور نئی نئی ریاستیں، نئی نئی حکومتیں، نئی نئی بادشاہتیں، ایک ایسی سیلابی ندی کی طرح جس کا پاٹ ہر آن بڑھتا رہتا ہے پھیلتی جا رہی تھیں!

۵۔ ملکی عناصر —— سکھ، ہندو اور مسلمان —— اگر خود مختاری کی طرف مائل ہو رہے تھے، تو ایک بات بھی تھی، غیر ملکی تاجر، فرانسیسی، انگریز اور پرتگیز جو یہاں صرف تجارت کرنے آئے تھے، قلعے بنانے لگے، فوجیں مرتب کرنے لگے، ارضی سیاسیات میں حصہ لینے لگے، متصادم طاقتوں میں سے کسی ایک کی برملا پشت پناہی اور کسی دوسرے کی علانیہ فوجی مزاحمت کرنے لگے،

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں یہی وہ چند عوامل تھے، جنہوں نے رفتہ رفتہ مغل حکومت کو، مرہٹوں کو، سکھوں کو ختم کر دیا، اور ایک غیر ملکی طاقت جو نہ مسلمان تھی، نہ ہندو، نہ سکھ اقتدار کی تلوار اور اختیار کی بندوق لے کر مسندِ شہر یاری پر متمکن ہو گئی کوئی اسے نہ ٹوک سکا، نہ روک سکا!

لیکن عجیب بات ہے، عین اس وقت جب مسلمانوں کا آفتابِ اقبال گھٹ رہا تھا، مغل حکومت تیزی سے روبہ زوال ہو رہی تھی، ہم دیکھتے ہیں، کہ ذہنی، روحانی علمی، ادبی، تہذیبی اور لسانی اعتبار سے ایسی محیّر العقول ترقیاں زوال کے گہوارے میں

پرورش پارہی تھیں جو اگر کسی آزاد ملک میں، اور خود مختار حکومت کے زیر سایہ نمودار ہوتیں تو ایسی انقلاب آفریں ثابت ہوتیں، جن کا اس وقت تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا

اردو زبان

بھارت کے رہنے والے ہندو اور غیر مسلم اپنی ایک خاص زبان رکھتے تھے، پھر مسلمان آئے تو ان کے ساتھ فارسی بھی آئی اور بہت جلد فارسی بھارت کی دفتری اور سرکاری زبان بن گئی، لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی میل جول سے ایک نئی زبان جو غیر معمولی تہذیبی اثرات اور نقوش کی حامل تھی، عالم وجود میں آگئی، یہ اردو تھی! ——

—— ہندو فارسی اس لئے سیکھتے تھے کہ سرکاری ملازمت میں آسانی ہو، لیکن اردو ان میں سے بہتوں کی مادری زبان بن گئی، اس نے بہت بڑا تہذیبی اثر یہ ڈالا کہ ہندوؤں سے نمستے اور مسلمانوں سے السلام علیکم چھڑا دیا اور ایک نیا بدل "آداب عرض" کا دیا، اسی طرح اور بہت سے تہذیبی نقوش ہیں جو صرف اردو زبان ہی کی بدولت عالم وجود میں آئے اور جن کے اثرات اب تک کارفرما ہیں،

یہ عہد زوال، ایک اور حیثیت سے بھی ممتاز و یگانہ نظر آتا ہے! —— اس عہد میں جتنی اور جیسی عظیم و جلیل شخصیتیں پیدا ہوئیں، انہوں نے جو تحریکیں چلائیں، ان کے فیوض و برکات اور رشد و ہدایت سے جس طرح لوگ —— خواص اور عوام —— مستفید ہوئے، ان کے فضل و کمال اور علم کا دائرہ جس طرح پھیلا، صوفیا میں شاہ ولی اللہ دہلوی علماء میں علمائے بحر العلوم، مجاہدین میں حضرت سید احمد شہید شعراء میں میر، درد، غالب اور دوسرے صاحبان علم و معرفت اصحاب سجادہ و طریقت، ارباب زہد و اتقا، امامان ادب و شعر و لغت پیدا ہوئے، انہیں دیکھ کر یہ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ جب کسی قسم کے اقبال و عروج کا سورج ڈوب رہا ہو، اذہان و اقدار کا سورج کیسے طلوع ہو سکتا ہے؟

بظاہر یہ چیز بڑی خوش آئند نظر آتی ہے کہ مسلمان دہلی میں کمزور پڑ گئے، لیکن دوسرے مقامات پر ابھرے، اور چھا گئے، ہم دیکھتے ہیں کہ بنگال ایک وسیع مملکت

بن چکا ہے، دکن میں ایک آزاد مسلم حکومت کا پرچم لہرا رہا ہے اور وہ ایک مستقل اور خود مختار حکومت کے روپ میں نظر آرہا ہے، نجیب آباد، بریلی اور فرخ آباد نئی اور آزاد خود مختار حکومتوں کے پایۂ تخت ہیں اور ان مسلم حکومتوں کے دوش بدوش ہندو حکومتیں بھی قائم ہو رہی ہیں، ترقی کر رہی ہیں، عروج و استحکام حاصل کر رہی ہیں قوت و طاقت پیدا کر رہی ہیں، پونہ ایک بڑی حکومت ہے، گوالیار کی قوت و طاقت کو سب مانتے ہیں جے پور اور جودھ پور میں بھی آزادی کی لہر اٹھتی دکھائی دے رہی ہے، رام پور ایک "ملک" بن گیا ہے، سندھ میں ایک نیا خاندان ابھرا ——— اور اس نے اپنی حکومت قائم کر لی، پنجاب میں سکھ ابھرے اور ان کا رنجیت سنگھ اقتدار و اختیار کی آخری منزل پر پہنچ گیا، اور بھی کئی چھوٹی چھوٹی، ہندو مسلم ریاستیں ہیں جن کا مرکز سے اگرچہ یونہی برائے نام تعلق ہے، لیکن دوسرے "دوستوں" اور "رفیقوں" کے بل پر جن کی خود مختاری کا بادبان ہوا میں لہرا رہا ہے، جب ہوا مخالف ہوتی ہے، رفتار سست ہو جاتی ہے جب موافق ہوتی ہے، رفتار بڑھ جاتی ہے ——— کبھی خطرناک حد تک، کبھی حد اعتدال میں!

بھارت، اب رنگا رنگ حکومتوں کا مجموعہ ہے، یہ حکومتیں مسلمانوں کے پاس بھی ہیں اور ہندوؤں کے پاس بھی ان سب کے پاس اپنا بادشاہ یا راجہ ہے، اپنا پرچم ہے، اپنا خزانہ ہے یہ آپس میں حلیف بھی ہیں اور حریف بھی، ان میں دوستی بھی ہے اور دشمنی بھی، ان میں صلح بھی ہوتی رہتی ہے اور جنگ بھی، لیکن کوئی مرکز نہیں ہے، جو انہیں حد اعتدال میں رکھ سکے، جو انہیں راہ راست پر گامزن کر سکے، جس سے یہ مرعوب ہوں، جس کے سامنے یہ جواب دہ ہوں، جس کا استحکام انکے استحکام کا سبب ہو!

جس طرح بغیر سردار کے فوج نہیں رہ سکتی، اسی طرح مرکز کے بغیر یونٹس (واحدے) اپنی زندگی قائم نہیں رکھ سکتے، خواہ ان کی ظاہری ٹیپ ٹاپ کتنی ہی زیادہ ہو، خواہ وہ کیسے ہی "فریدوں فر، دارا حشم، کیواں مرتبت" ہوں چنانچہ مرکز کی شکست و ریخت کے بعد یہ شاندار واحدے بھی، بہت جلد تحلیل ہو گئے،

گھٹا ٹوپ اندھیرا

عالمگیر نے اپنی زندگی میں اس کا انتظام کر دیا تھا کہ وفات کے بعد اسکے بیٹوں میں خون ریزی اور خانہ جنگی نہ ہو، نیز یہ کہ ہر لڑکا اپنی جگہ پر اطمینان اور شان کی زندگی بسر کرے، نہ ایک دوسرے کا دستِ نگر ہو، نہ محکوم، تدبیر یہ سمجھ میں آئی کہ تینوں بیٹوں پر حکومت تقسیم کر دے، چنانچہ زندگی ہی میں اس نے جو انتظام کیا وہ یہ تھا:۔

۱۔ کابل سے بنگال تک سارا علاقہ بڑے بیٹے شہزادہ معظم کو عطا کیا گیا، جس میں پنجاب اور دلی وغیرہ سب شامل تھے،

۲۔ گجرات اور وسط ہند کا سارا علاقہ منجھلے بیٹے شہزادہ اعظم کو بخش دیا —" کہ لے اور شہنشاہی کر!"

۳۔ جنوبی ہند کی وسیع وعریض مملکت چھوٹے بیٹے شہزادہ کام بخش کو سونپ دی،

سپردم بتو مایۂ خویش را تو دانی حساب کم و بیش را

لیکن ادھر باپ کی آنکھ بند ہوئی ادھر بھائیوں نے ایک دوسرے کیخلاف تلواریں سنبھال لیں بڑا بھائی معظم، جو اب بہادر شاہ اول کے نام سے سریر آرائے مملکت ہوا تھا، غالب آیا، دونوں بھائی، اعظم اور کام بخش بادشاہی کی حسرت لئے ہوئے عالم سفلی سے عالم بالا کو سدھارے! (سنہ ۱۱۱۹ھ) اس بادشاہ کے عہد میں کوئی خاص حادثہ رونما نہیں ہوا، سوا اس کے کہ سکھوں کے بندا بیراگی نے شورش پر کمر باندھی، سرہند میں سکھوں نے سر اٹھایا، لیکن ایک معمولی سی ضرب کی تاب نہ لاسکے بلبلہ کی طرح بیٹھ گئے (سنہ ۱۱۲۱ھ) بیٹوں کی عمر

باپ لے چکا تھا، ۵۰ برس حکومت کر کے اور ۹۰ سال سے زیادہ عمر پا کر عالمگیر نے ۱۱۱۸ھ کے آخر میں (ذی قعدہ میں) وفات پائی، ۱۱۲۳ھ میں تقریباً ۷۱ سال کی عمر پا کر اور قریباً چار سال حکومت کر کے بہادر شاہ نے سفر جناں پہ کمر باندھی،

معظم یعنی بہادر شاہ اول کے چار بیٹے تھے، لیکن بڑے جہاندار شاہ نے باغی تینوں بھائیوں اور کئی بھتیجوں کو ملک عدم بھیج کر اپنا دربار سجایا، لیکن ایک بھتیجا جو زد سے دور تھا بہار سے لشکر لے چلا اور شاہی لشکر کو شکست دے کر بادشاہ بن گیا، جہاندار شاہ کا محل میں گلا گھونٹ کر خاتمہ کر دیا گیا، اب فرخ سیر کے راستہ میں کوئی رکاوٹ نہ تھی اس کی بادشاہت بے چون و چرا تسلیم کر لی گئی" (۱۱۲۳ھ) یہ واقعہ سال کے آخری مہینہ (ذی الحجہ) کا ہے اور جہاندار شاہ اسی سال محرم میں تختِ حکومت پر قابض ہوا گویا ایک سال کی مدت میں وہ بادشاہ بھی بنا، قید بھی ہوا، اور سفر آخرت پر بھی مجبور کر دیا گیا!

دیدی کہ خون ناحق پروانہ شمع را
چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

گویا عالمگیر کی وفات کے وقت سے لے کر (۱۱۱۸ھ) فرخ سیر کی تخت نشینی کے وقت تک (۱۱۲۳ھ) آدھے درجن سے زیادہ شہزادے جو آپس میں سگے بھائی، بھتیجے تھے، موت کی نذر ہو گئے، یہ واقعات و حوادث پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ وہ آفتاب جو نصف النہار تھا جس کی طرف نظر نہیں اٹھتی تھی، جس کی عظمت اور رفعت کی ایک دنیا گواہ تھی، بری طرح گہن چکا ہے، اور تیزی سے مائل بزوال ہو رہا ہے، بادشاہتیں جب اس طرح جلد جلد بدلنے لگیں، اور شاہی خون اتنا ارزاں ہو جائے تو اسے استحکام اور فروغ کہاں سے حاصل ہو سکتا ہے

فرخ سیر ہر چند کہ فرخ سیر خود ایک طالع کامگار کا مالک تھا، قدرت نے اسے ان تمام اوصاف سے نوازا تھا جو ایک فاتح کے لئے ضروری ہیں لیکن اس کی کامیابی میں سادات بارہہ کا بڑا ہاتھ ہے، یہ سید بڑے جیالے، بڑے بہادر، زور آور اور دلیر تھے، تیغ کیا چیز ہے یہ توپ کے

لڑجاتے تھے!

لیکن حکمرانی کے فن سے ناواقف تھے، پھر بھی سیاست اور امارت کو ساتھ لے کر چلنے پر مصر تھے معاملات حکومت اپنی تحویل میں لے لئے تھے، اپنی قربانیوں اور جاں نثاریوں کا صلہ یہ چاہتے تھے کہ بادشاہ ان کے اشارہ پر رقص کرے، کچھ دنوں تک تو فرخ سیر ان کے اشاروں پر چلا، لیکن وہ بھی بادشاہ تھا، آخران بن ہو گئی، اور اس کا انجام یہ ہوا کہ وہ سادات بارہہ کے ہاتھوں بے دردی سے قتل ہوا (۱۱۳۱ھ)

بندا بیراگی پھر انہی سادات نے فرخ سیر کے بیٹے رفیع الدرجات کو تخت نشین کر دیا (۱۱۳۱ھ) فرخ کے قتل میں سادات بارہہ کے ساتھ اس کا خسر راجہ اجیت سنگھ (جودھ پور) اور رتن چند (وزیر مالیات) بھی شریک تھا، رفیع الدرجات نے تخت نشین ہوتے ہی جزیہ کے احکام منسوخ کر دیئے، جو عالمگیر کے عہد سے رائج چلے آرہے تھے، لیکن یہ بادشاہ چند ماہ سے زیادہ زندہ نہ رہا، پھر اس کا دوسرا بھائی رفیع القدر شاہجہاں ثانی کے نام سے سادات کے اشارۂ چشم وابرو سے متمکن ہو گیا لیکن چند ہی ماہ میں وفات پا گیا، اس کی وفات کے بعد روشن اختر کو جو اسی خاندان کا ایک فرد تھا تخت پر بٹھایا گیا۔ یہ روشن اختر محمد شاہ کے نام سے تخت حکومت پر متمکن ہوا اور اسی کے عہد میں سادات بارہہ کا خاتمہ ہوا۔

روشن اختر یا محمد شاہ کے عہد پر ہم آگے چل کر گفتگو کریں گے، فرخ سیر، رفیع الدرجات اور رفیع القدر کے بارے میں صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ انہیں اتنی فرصت ہی نہ ملی کہ کوئی کارنامہ دکھا سکیں، زندگی کے جو لمحات بھی میسر آئے، وہ اس اضطراب کی نظر کر دیئے کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے؟

فرخ سیر کے عہد کا صرف ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے اس کے عہد میں بندا بیراگی نے پھر سر اٹھایا اور غریب و بے شاہ شہریوں اور دیہاتیوں پر قیامت کے مظالم توڑے، آخر ۱۱۲۵ھ میں گرفتار ہو کر قتل ہوا، اور اپنے کیفر کردار کو پہنچا!

عالمگیر کے بعد سے اب تک کسی بادشاہ کو اطمینان سے حکومت کرنے، نظام

مملکت درست کرنے اور معاملات ملکی کی طرف توجہ کرنے کا موقع نہیں ملا تھا، جو بھی تخت پر بیٹھتا تھا، اپنی فکر میں مبتلا ہو جاتا تھا کہ اب پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے، یہی وجہ تھی کہ بادشاہت ایک تمسخر بن گئی، یہ انقلاب صرف ۱۱-۱۲ سال میں ہوا۔ اس مختصر مدت میں حکومت کا تمام جاہ وجلال فنا ہو گیا، رعب سلطانی اور دبدبۂ خاقانی ایک قصہ پارینہ بن گیا۔

محمد شاہ

فرخ میر کے قتل، رفیع الدرجات اور رفیع القدر کی بے کسانہ موت نے سادات بارہ کو بہت حقیر و ذلیل کر دیا تھا، عوام ان پر آوازے کستے تھے انہیں برسرِ عام برا کہا جاتا تھا، لیکن قوت ان کے ہاتھ میں تھی، کوئی ان کا کچھ نہ بگاڑ سکا، لیکن روشن اختر (محمد شاہ) زیرک اور سمجھدار آدمی تھا، اس نے کچھ ایسی چال چلی کہ سادات بارہ کا سارا زور ایک سال میں ختم ہو گیا (۱۱۳۲ھ) اور قطب الملک اور سید حسین جن کے ہاتھ میں عملاً حکومت کی باگ ڈور تھی ہلاک ہوئے اور محمد شاہ نے ایک خود مختار بادشاہ کی حیثیت سے حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی (۱۱۳۳ھ)

شروع میں محمد شاہ کا چلن اچھا رہا، لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد دیندار عالمگیر کا یہ پوتا فواحش اور مسکرات کا عادی بن گیا

نادر شاہ کی آمد

برہان الملک نے نادر شاہ سے ساز باز کی اس کا حوصلہ بڑھایا، نتیجہ یہ ہوا کہ نادر شاہ دلی کی طرف چل پڑا، یہاں کسی کو ہوش بھی نہیں تھا کہ قیامت سر پہ آئی جا رہی ہے! بادشاہ، امراء اور سردارانِ فوج کو اس طرف متوجہ بھی کیا جاتا تھا، تو وہ ہنس کر ٹال دیتے تھے، انہیں ذرا بھی اس کی امید نہیں تھی، کہ نادر واقعی آ جائے گا، اور آکر قیامت برپا کر دے گا، لیکن وہ آیا، (۱۱۵۱ھ) اور اسے کوئی روک نہ سکا، بلکہ برہان الملک علی الاعلان اس سے مل گیا، اور گھر کا بھیدی بن کر اسے خزانوں اور بیش بہا چیزوں کی تفصیل بتائی، جن کے لالچ میں وہ اتنی دور کا سفر

کر کے یہاں آیا تھا، بادشاہی لشکر، نادری لشکر کے مقابلہ میں نہ ٹھہر سکا، صلح کی درخواست پیش ہوئی، نادر شاہ نے یہ درخواست ازراہ عنایت منظور کر لی، لیکن اس طرح کہ بادشاہ کو نظر بند کر لیا، خزانہ پر پہرہ لگا دیا، اور لال قلعہ میں مقیم ہو گیا، اور یہاں آ کر تختِ طاؤس کے علاوہ کروڑوں روپیہ کا زر و جواہر اپنے قبضہ میں لے لیا، (۱۱۵۱ھ) کچھ ایرانیوں سے دلی والوں کی چل گئی، نادر اتنا بپھرا کہ سنہری مسجد میں ننگی تلوار لے کر بیٹھ گیا، اور نو گھنٹہ تک قتلِ عام کرتا رہا، پھر نظام الملک کی استدعا پر اس نے تلوار میان میں رکھی، اور

"بریشِ سفیدت بخشیدم"!

کہہ کر نیچے اترا، اس قتلِ عام میں تقریباً ایک لاکھ آدمی ہلاک ہوئے، اور اربوں روپیہ کا ساز و سامان اور مال و اسباب دلی کے رئیسوں اور امیروں کی حویلیوں سے، ایرانیوں نے لوٹ لیا، مکانات میں آگ لگا دی، اور شہر میں جھاڑو پھیر دی، ایسا معلوم ہوتا تھا، نادر کی صورت میں چنگیز آیا ہے ۱۱۵۲ھ میں نادر مالِ غنیمت کا پشتارہ لے کر واپس گیا معاصر مؤرخین کا اندازہ ہے کہ اپنے ساتھ ساٹھ کروڑ روپیہ نقد اور پچاس کروڑ مالیت کا سامان لے گیا۔

جاتے جاتے اس نے محمد شاہ کی لڑکی سے اپنے لڑکے کی شادی کر دی، بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی، اور جس شہر میں کل نوح و فغاں، فریاد و شیون، آہ و فریاد کی صدائیں در و دیوار سے بلند ہو رہی تھیں، وہیں سے چنگ و رباب اور رقص و موسیقی کا طوفان امنڈ پڑا، نادر شاہ کے جانے کے بعد محمد شاہ نے عقل کے ناخن لئے اور سنبھل کر حکومت کرنے لگا، حکومت کا انتظام پھر قائم ہو گیا، اس کے عہد میں (۱۱۶۱ھ) احمد شاہ ابدالی نے بھی حملہ کیا، جو نادر شاہ کا پروردہ تھا، لیکن شکست کھا کر واپس گیا، احمد شاہ ابدالی کی شکست کے چند ہی روز بعد محمد شاہ وفات پا گیا! (۱۱۶۱ھ) اس کی وفات نے سلطنت کا شیرازہ اور زیادہ درہم برہم کر دیا۔

احمد شاہ محمد شاہ کے بعد اس کا بیٹا احمد شاہ تخت نشین ہوا، جو ہر اعتبار سے نااہل اور نالائق تھا، اس کے عہد میں صفدر جنگ اور نظام الملک کے پوتے عماد الملک نے بڑا زور باندھا، ان دونوں میں رقابت اور چشمک تھی، ہر ایک زور و قوت کے لئے ایک دوسرے سے برسر پیکار تھا، دونوں ایک دوسرے کو زک دینے کے لئے مرہٹوں سے ساز باز کرتے رہے تھے، اور یہ مرہٹے ایک مدت سے اس فکر میں تھے کہ کسی طرح بادشاہت کا خاتمہ کریں، اور تخت حکومت پر قبضہ کریں! —— روہیلے بھی اب ایک بڑھتی ہوئی قوت تھے، یہ بھی اس بساط پر اپنی چالیں چل رہے تھے،

عماد الملک اپنے اقتدار کے لئے ضروری سمجھتا تھا کہ احمد شاہ کو راستہ سے ہٹائے چنانچہ اس نے بادشاہ کی آنکھوں میں سلائی پھروائی، اسے نابینا کر کے قید کر لیا اور معز الدین جہاندار شاہ کے پوتے اور عالمگیر کے پرپوتے معز الدین کو عالمگیر ثانی کے نام سے تخت پر بٹھا دیا!

احمد شاہ ابدالی :۔ عالمگیر ثانی کے عہد کا سب سے اہم واقعہ صرف ایک ہے!

عماد الملک نے احمد شاہ ابدالی سے چھیڑ چھاڑ جاری رکھی، وہ بھی دوسرا نادر تھا، اگرچہ بہت سے صفات حسنہ کے اضافہ کے ساتھ، ۱۱۷۰ھ میں عماد الملک کی شرارتوں کا جواب دینے کے لئے اس نے دلّی پر چڑھائی کی، مغلیہ حکومت میں اتنا دم کہاں تھا کہ اسے روک سکتی؟ عماد الملک جو اب تک ابدالی کا سب سے بڑا دشمن تھا اس سے جان کی امان کا طالب ہوا، ابدالی نے عماد الملک اور بادشاہ دونوں کو "معاف کر دیا" لیکن دلی کو نہ معاف کیا افغان سپاہیوں نے اتنی لوٹ مچائی کہ نادر شاہ کے دور کی یاد تازہ ہو گئی، فرق صرف اتنا تھا کہ قتل عام کا حکم صادر نہیں کیا، صرف لوٹ مار پر اکتفا کی!

ابدالی نے اگرچہ عماد الملک کو معاف کر دیا تھا، لیکن یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے جانے کے بعد یہ پھر جو چاہے کرے، چنانچہ اس نے نجیب الدولہ (روہیلہ سردار) کو وزیر جنگ کے منصب پر فائز کیا، صفدر جنگ مر چکا تھا اس کے بیٹے شجاع الدولہ سے عہد لیا کہ بادشاہ کی اطاعت کرے گا، پنجاب کا صوبہ اپنے بیٹے تیمور کو تفویض کیا، یہ سارے انتظامات

اس لئے تھے کہ عماد الملک سر نہ اٹھا سکے، پنجاب پر اس کا قبضہ رہے اور دلی کی بادشاہت کا بھرم قائم رہے۔

عالمگیر ثانی پیروں فقیروں کا قائل تھا، عماد الملک نے اسی کمزوری سے فائدہ اٹھایا، فیروز شاہ کے کوٹلہ میں اسے ایک شاہ صاحب کا نادیدہ مشتاق بنا کر ملاقات کو بھیجا، وہیں وہ بیچارہ بادشاہ قتل کر دیا گیا، لاش جمنا کی ریت پر پھنکوا دی جو دن بھر جھلستی رہی[1]۔

---

[1] شمس العلماء مولانا ذکاءاللہ دہلوی نے اپنی یگانہ تاریخ ہند میں بڑی بسط و تفصیل سے اس بے دردانہ قتل کے واقعات مؤرخانہ کاوش سے تحریر کئے ہیں، ہم نے صرف خلاصہ پر اختصار کی غرض سے اکتفا کیا ہے۔

شاہِ عالم ثانی کا دور

شہزادہ عالی گہر، باپ کی وفات کے بعد شاہ عالم ثانی کے پر شکوہ نام سے تخت حکومت پر بیٹھے، یہ بہت دنوں تک اس منصب اور اس مسند پر فائز رہے، لیکن ان کے طویل دورِ حیات کا خلاصہ یہ ہے کہ مرکز اور زیادہ کمزور ہوگیا، دشمنوں کی طاقت بہت زیادہ بڑھ گئی، مختلف مقامات پر نئی نئی حکومتیں جو کچھ پہلے سے قائم تھیں کچھ اب عالم وجود میں آئیں اور زیادہ زور پکڑ گئیں، انگریز اس ملک میں تاجر بن کر آئے تھے، لیکن شاہ عالم ثانی کے طفیل وہ بادشاہ اور فرمان روا (عملی طور پر اور بعض مقامات پر حقیقی طور پر) بن گئے تھے، یہ سچ ہے کہ شاہ عالم ثانی کی زندگی تک مغل سلطنت کی مرکزیت کا دبدبہ بڑی حد تک قائم رہا، لیکن اس دبدبہ کی پشت پر چونکہ قوت وسطوت نہیں تھی، اس لئے شاہ عالم کے بعد یہ دبدبہ بھی ختم ہوگیا،

عماد الملک کی شہ پر مرہٹے پنجاب کو روندتے ہوئے اٹک تک بڑھ گئے تھے، ابدالی کو جب یہ اطلاع ملی تو وہ غیظ وغضب کا پیکر بنا ہوا طوفان اور آندھی کی طرح پھر بڑھا، مرہٹے پیچھے ہٹے آخر پانی پت کا میدان میدانِ جنگ بنا،

اس جنگ کو جیتنے کے لئے مرہٹوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا، عماد الملک نے جب اپنی تدبیر چٹ پڑتی دیکھی تو پہلے بھرت پور کے جاٹ راجہ کے پاس پناہ گزیں ہوا، پھر گوالیار پہنچا اور روپوش ہوگیا مرہٹے اپنے ساتھ بہت بڑا لشکر لائے تھے۔ اب پونا مرکزی حیثیت رکھتا تھا) اندور گوالیار، بڑودہ، ناگپور (ہلکر، سندھیا، گائیکواڑ بھونسلے) پونا کے تابع تھے

اس جنگ میں اگرچہ مرہٹوں کا توپ خانہ ابراہیم گاردی مسلمان کے تحت تھا اور وہ پوری وفاداری کے ساتھ ہندو آقاؤں کے لئے مسلمانوں کو چنے کی طرح بھون رہا تھا، نیز پیشوا کی مسلمان بی بی مستانی بیگم کا لڑکا شمشیر جنگ[1] بھی ہندو اور مرہٹہ اقتدار کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھا، ہندوستان کے دوسرے ہندو رجواڑے اور مسلمان غدار بھی مرہٹوں کے ساتھ تھے، مرہٹہ فوج کا سالار اعظم سداشیو راؤ پیشوا کا بھائی تھا، وسواس راؤ پیشوا کا بیٹا اس لئے ساتھ آیا تھا کہ ابدالی کو مار کر دلی کے لال قلعہ میں نوبت اور نقارہ بجاتا ہوا خود تخت حکومت پر بیٹھے، اور مغل سلطنت اور شاہی کے خاتمہ کا اعلان کر دے، مرہٹہ لشکر کی تعداد غیر مسلم مورخین تک تین لاکھ کے قریب بتاتے ہیں، ابدالی نے اگرچہ فراست اور تدبر سے کام لے کر نجیب الدولہ (نجیب آباد)، رحمت خاں (بریلی) احمد خاں بنگش (فرخ آباد) شجاع الدولہ (اودھ) کو اپنا رفیق بنا لیا تھا، پھر بھی اس کا لشکر مرہٹوں کے مقابلہ میں تعداد اور ساز و سامان کے اعتبار سے بہت کم تھا، بایں ہمہ جب لڑائی شروع ہوئی تو مرہٹے بری طرح ہارے، وسواس راؤ قتل ہو گیا، اور شیو راؤ کو جان سے ہاتھ دھونا پڑے، دو لاکھ کے قریب مرہٹہ سپاہی مارے گئے، افغانوں نے دور دور تک تعاقب کیا، اس طرح مرہٹوں کا زور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا، مرہٹہ ایمپائر کا تصور خواب بھی نہ رہا، مرہٹوں کی کمر ایسی ٹوٹی کہ پھر وہ نہ ابھر سکے، یہ واقعہ ۱۱۷۴ھ کا ہے مرہٹوں کے اس قتل عام کے وقت ہر مرہٹہ گھر سے نوحہ و ماتم اور فریاد و فغاں کی دلدوز صدائیں بلند ہونے لگیں، کوئی مرہٹہ گھر ایسا نہیں تھا جو اپنے کسی عزیز کے لئے ماتم گسار نہ ہو، پیشوا پر اس واقعہ کی ایسی دہشت طاری ہوئی کہ پھر وہ زندہ نہ رہ سکا، مایوسی اور حرماں کے مرض میں مبتلا ہو کر دنیا سے سدھار گیا!

احمد شاہ ابدالی کو یہ فتح مبین ایسی حاصل ہوئی تھی کہ وہ بڑی آسانی سے شہنشاہ

[1] یہ شمشیر جنگ مسلمان ہو گیا تھا، اسی کی اولاد کو باڑی کرد وہ کی جاگیر ملی نیز اندور سے منصب اور وظیفہ مقرر ہوا، یہ خاندان اب تک مسلمان ہے اور بھارت میں آباد ہے۔

ہندوستان بن سکتا تھا، لیکن ابدالی نے کمال بے نفسی سے یہ حکومت جیت کر پھر شاہ عالم کو سونپ دی اور خود واپس چلا گیا!

اب وقت تھا کہ اس خداداد موقع سے شاہ عالم ثانی فائدہ اٹھاتے، لیکن ان کی رنگ رلیوں اور عیش پرستیوں میں کوئی فرق نہیں آیا، وہ اتنی بڑی حکومت نہ سنبھال سکے اور اپنے ماتحتوں کو مطیع نہ رکھ سکے بلکہ انہوں نے کمال فیاضی، رواداری اور مہمان نوازی سے کام لے کر ۱۱۷۹ھ میں یعنی ابدالی کے جانے کے صرف چار سال بعد بنگال کی دیوانی انگریزوں کو عطا کر دی، گویا اعلان کر دیا کہ ہم نہ حکومت کر سکتے ہیں نہ انتظام جس کا جی چاہے آئے اور حکمران بن جائے اور کاروبار نظم و انتظام سنبھال لے!

ایسٹ انڈیا کمپنی

۱۲۲۱ھ میں شاہ عالم ثانی کا انتقال ہو گیا!

سلطنت ہند یعنی دلی کے متولی اب انگریز تھے، بہت سے رجواڑوں سے نبٹ چکے تھے، بعض سے نبٹ رہے تھے، انگریز جو کچھ کر رہے تھے، وہ "کمپنی" کے نام پر، کمپنی صرف کاروباری اغراض کے لئے قائم ہوئی تھی، لیکن تجارت کی کوٹھی گورنمنٹ ہاؤس بننے میں دیر نہ لگی، اگرچہ ظاہری طور پر اب بھی خطبہ بادشاہ کے نام کا پڑھا جا رہا تھا، سکہ بھی بادشاہ کا چل رہا تھا، انگریز کمپنی جو کچھ کرتی تھی، بطور خود کرتی تھی، اپنے حکم اور اپنی مرضی سے کرتی تھی، لیکن نام بادشاہ کا ہوتا تھا، اور بادشاہ اتنی جرأت بھی نہیں رکھتا تھا کہ اپنے نام کے غلط استعمال کو روک سکے، رفتہ رفتہ اس پر قانع ہو گیا تھا کہ وہ گوشۂ عافیت میں زندگی بسر کرلے اور انگریز اس کی طرف سے جہاں بانی کریں، وہ تو دل سے یہی چاہتے تھے چنانچہ بادشاہ کو انہوں نے طاق پر رکھ دیا، اور خود قیصر ہند بننے کے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے وسائل و ذرائع بروئے کار لانے لگے، کہ اب انہیں حکومت کی چاٹ پڑ چکی تھی، اور وہ تجارت پر قناعت کرنا نہیں چاہتے تھے

اکبر شاہ ثانی

شاہ عالم ثانی کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادہ معین الدین اکبر شاہ ثانی کے نام سے رونق افروز بزم مملکت ہوئے، ۱۲۵۳ھ تک لال قلعہ میں بیٹھ کر مملکت خیال پر حکومت کرتے رہے، سراج الدین بہادر شاہ ظفر الٰہی

کے پوتے تھے، جو ۱۸۱۲ء تک لال قلعہ میں موجود رہے، لیکن اس طرح کہ دلی شہر بھی ان کی مملکت سے خارج تھا، اور انگریزوں کے وظیفہ پر وہ زندگی بسر کر رہے تھے، ۱۸۵۷ء میں غدر[1] ہوا، یہ آخری کوشش تھی جو انگریزوں کی حکومت ان کے ظلم و عدوان، ان کی شقاوت اور سفاکی کے خلاف سکھ سپاہیوں اور ہندو مسلم والیان ریاست کی بدولت کامیاب نہ ہو سکی، غدر ناکام ہوا، بہادر شاہ ظفر پکڑے گئے، ان کے بیٹوں کے سر تحفہ میں ان کی خدمت میں پیش کئے گئے، اور پھر "بغاوت" کے الزام میں ان پر مقدمہ چلا، اور رنگون جلاوطن کر کے بھیج دیئے گئے، وہیں وفات پائی،

شاہان تیموری کی اولاد فاقے کرنے، اکبر اور عالمگیر کے پوتے بھیک مانگنے پر مجبور ہو گئے، غدر کے بعد کمپنی کی حکومت ختم ہو گئی اور حکومت برطانیہ نے تاج شہریاری سر پر رکھ لیا۔؛

---

[1] اس جنگ آزادی کو غدر کا نام انگریز مورخین نے دیا اور دور غلامی میں پروان چڑھنے والے مدتوں اس جنگ آزادی کو اسی نام سے یاد کرتے رہے یہاں تک کہ یہ نام زبانوں پر چڑھ گیا۔

انیسویں منزل

انگریزوں کا عہدِ فرماں روائی

بنگال انگریزوں کے قبضے میں

فرخ سیر کے عہد میں بنگال کا ناظم مرشد قلی خاں[1] تھا. یہ بڑا خوش تدبیر اور منتظم تھا. اس سے قبل دکن میں کار ہمایاں انجام دے چکا تھا. بنگال کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی اسے رشک جناں بنا دیا. نظم و انتظام درست ہو گیا. رعایا میں اطمینان و اعتماد قائم ہو گیا. یہ عہد عالمگیری کا امیر تھا. اس کے زمانہ میں اڑیسہ میں نمایاں خدمات انجام دے چکا تھا. عالمگیر اسے بہت عزیز اور محبوب رکھتا تھا. انگریزوں کے قدم اسی دور میں بنگال آئے لیکن وہ پنپ نہ سکے مرشد قلی خاں ان سے سخت بیزار اور متنفر تھا. لاکھ لاکھ کوششیں کیں، تحائف گزارے. دلی میں سفارت بھیجی. بادشاہ پگھل بھی گیا لیکن مرشد قلی خاں نے فرنگیوں کے قدم نہ جمنے دیئے. ۱۱۳۸ھ میں وفات پائی. اس کے بعد اس کا خویش دشت شجاع الدولہ منصب پر فائز ہوا. وہ اڑیسہ کا گورنر تھا. اس طرح بہار اور اڑیسہ بھی بنگال میں شامل ہو گئے. شجاع الدولہ کا دور بھی شان سے گزر گیا اس کی بھلائیوں نے برائیوں کو ڈھانپ لیا تھا، ۱۱۵۳ھ میں اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سرفراز خاں اس منصب پر فائز ہوا لیکن مہابت جنگ علی وردی خاں نے اسے ٹکنے نہ دیا. چند ہی روز میں اسے ہٹا کر سپہ سالار سے ناظم بنگالہ بن گیا. ۱۱۵۳ھ سے تقریباً سولہ برس تک بڑے دبدبہ اور شان سے خدمت کرتا رہا. دشمن کو ہر طرح سے زیر کرنے میں کمال رکھتا تھا، ۱۱۶۹ھ میں اسی سال دنیا کی بہار دیکھ کر یہ مرا تو اس کا نواسا سراج الدولہ مسند نشین ہوا کیونکہ اولاد نرینہ سے محروم تھا. سراج الدولہ نوعمر اور نوجوان تھا، بہادر تھا. لیکن صاحب تدبیر نہ تھا

---

[1] مرشد آباد. اسی مرشد قلی خاں کا بسایا ہوا اور اسی کے نام سے مشہور ہے. یہ شہر اب بھی مغربی بنگال (بھارت) کا ایک حصہ ہے ۔ ریڈ کلف کی بدولت بھارت میں شامل ہو کر ہاتھ سے نکل گیا.

انگریز، قاسم بازار اور کلکتہ میں تجارت شروع کر چکے تھے۔ علی وردی اور شجاع الدولہ سے زک کھا چکے تھے۔ لیکن تاک میں تھے۔ سراج الدولہ جب مسند پر بیٹھا تو بہت سے عزیز اور رشتہ دار مسند حکومت کا دعوی کرنے والے پیدا ہو گئے انگریزوں نے موقعے سے فائدہ اٹھایا، بھڑا دیا، سراج الدولہ نے کلکتہ پر حملہ کیا۔ انگریز شکست فاش کھا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ سراج الدولہ کلکتہ میں فاتحانہ شان سے داخل ہوا۔ گرفتار شدہ انگریز سپاہیوں کی جان بخشی کی اور مانک چند کو شہر کا حاکم مقرر کیا۔ یہ واقعہ مسند حکومت پر متمکن ہوتے ہی پیش آیا (۱۱۶۹ھ)

سراج الدولہ کا قتل:۔ انگریزوں نے سراج الدولہ کے بھتیجے میر جعفر کو آلۂ کار بنا کر حکومت کا مدعی بنایا۔ ادھر کلکتہ کے امی چند سے سازش کر کے ارکاٹ سے فوج لائے۔ فوج کا سپہ سالار کلائیو تھا۔ اور امیر البحر واٹسن اور کلکتہ پر حملہ کر دیا مانک چند کی مدد کو سراج الدولہ پھر پہنچا۔ اس مرتبہ انگریزوں نے صلح کی استدعا کی جو قبول ہوئی۔ صلح کے بعد سراج الدولہ مرشد آباد چلا گیا۔ اور میر جعفر نے اندر اندر جب سراج الدولہ کے ہندو امراء سرداران فوج اور امرائے ملک کو ورغلا لیا۔ تو انگریز مرشد آباد پر حملہ کرنے کے لیے بڑھے۔ پلاسی کے میدان میں لڑائی ہوئی۔ یہ لڑائی بھی سراج الدولہ آسانی سے جیت لیتا۔ لیکن میر جعفر کی سازش کامیاب ہو چکی تھی۔ سپاہ نے کچھ نہ کیا۔ صرف چند جاں نثار لڑتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سراج الدولہ کو شکست ہوئی (۱۱۷۱ھ) انگریزوں نے گرفتار کر کے بے دردی سے اسے قتل کر دیا۔ اور شہر (مرشد آباد) میں اس کی لاش کی تشہیر کرائی۔

انگریزوں نے میر جعفر کو فرمانروائے بنگال مان لیا۔ اس نئے فرمانروا نے سب کچھ انگریزوں کو دے دیا اور ان کے اشارہ پر رقص کرنے لگا۔ ادھر جعفر کا خویش میر قاسم جو دربار پر اور جعفر پر بری طرح حاوی تھا۔ اپنی حکومت کا خواب دیکھنے لگا۔ اس نے انگریزوں سے "خدمت" کے وعدے کر کے انہیں اپنا ہمنوا بنا لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۱۷۴ھ میں جعفر کو معزول کر کے میر قاسم کو مسند پر بٹھا دیا۔

قاسم نے حکومت پر قابض ہونے کے بعد آلۂ کار بننے سے انکار کر دیا۔ نظم مملکت کی طرف توجہ کی۔ اپنی آزادی کی حفاظت کی، رعایا کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا۔ انگریز پریشان ہو گئے

اور چھیڑ چھاڑ کرنے لگے۔ آخر تنگ آکر قاسم مرشد آباد سے مونگیر چلا گیا۔ انگریزوں نے دباؤ ڈالا کہ انہیں چنگی کے محصول سے مستثنیٰ کر دیا جائے جب قاسم مجبور ہوگیا تو یہ بات مان لی۔ لیکن دیسی تاجروں کو بھی یہ رعایت دے دی۔ انگریز جل گئے اور لڑائی کا آغاز کر دیا۔ ۱۱۷۷ھ کی لڑائی میں اس کا پلہ فرانسیسی سردار سمرو کی مدد سے بھاری رہا۔ لیکن اسی سنہ کی دوسری جنگ میں قاسم کے ایک سردار نجف خاں نے غداری کی ——— یہی بعد میں شاہ عالم کے ساتھ دلی پہنچا۔ جس کا نجف گڑھ اب تک موجود ہے ——— انگریزوں سے مل گیا۔ انگریزوں نے شب خون مار کر فتح حاصل کر لی اور پھر میر جعفر کو مسند نشین کر دیا۔ میر قاسم اودھ کے شجاع الدولہ کے پاس پہنچا۔ شجاع الدولہ نے اسے نظر بند کر کے بکسر کے مقام پر انگریزوں سے شاہ عالم کی سرپرستی میں جنگ کی لیکن ہار گیا۔ شاہ عالم نے شکست کے بعد انگریزوں سے دوستی کر لی اور بنگال بہار اور اڑیسہ کی دیوانی انگریزوں کے حوالے کر دی۔ میر جعفر کے انتقال کے بعد (غالباً ۱۱۷۹ھ) انگریز پورے طور پر بنگال کے مالک بن گئے۔

میروں کی حکومت کا خاتمہ:۔ (سندھ) ۱۷۸۳ء (۱۱۹۸ھ) میں سندھ پر میروں کی حکومت قائم ہوئی ۱۸۴۳ء (۱۲۶۰ھ) میں انگریزوں نے اس کا بالکل خاتمہ کر دیا۔

۱۔ ۱۸۳۲ء میں انگریزوں نے بھکاری بن کر سندھ میں تجارتی حقوق حاصل کیے ——— اس واضح شرط کے ساتھ کہ سندھ کی سرزمین پر للچائی ہوئی نظر نہیں ڈالیں گے، نہ اندرونی معاملات میں مداخلت کریں گے۔

۲۔ ۱۸۳۸ء میں افغانستان پر انگریزوں نے فوج کشی کی اور خلاف معاہدہ ان کا لشکر، سندھ کی سرزمین کو پامال کرتا ہوا آگے بڑھا اور شکارپور و بھکر پر قبضہ بھی کر لیا۔

۳۔ ۱۸۳۹ء میں انگریزوں نے زبردستی ان ریاستوں کو اپنا باج گزار بنا لیا۔ جس پر انگریز مؤرخین تک نے ملامت کی ہے۔

۴۔ ۱۸۴۳ء ۱۲۶۰ھ میں جنرل نیپئر ——— جس کے نام سے منسوب نیپئر روڈ اب تک کراچی میں موجود ہے ——— نے میروں سے زبردستی جنگ چھیڑی۔ حیدر آباد اور

میرپور خاص کے میروں کو جلاوطن کر کے ان دونوں حکومتوں کو ختم کر دیا۔ خیرپور نے سراطاعت بھائیوں کو بے یار و مددگار چھوڑ کر ختم کر دیا۔ لہٰذا وہ ایک ریاست کی حیثیت سے ابتک موجود ہے لیکن اس کے حدود بھی بہت کم کر دیئے گئے۔

۵۔ ٹیپو کی امداد و اعانت میں جہاں آغا خاں اوّل پیش پیش تھے۔ وہاں سندھ کے دوسرے "مسلمان" امراء، رؤسا اور شرفاء بھی کسی سے پیچھے نہ تھے۔

۶۔ حیدرآباد دکن پر انگریزوں کا تسلط

نظام الملک آصف جاہ دکن میں صوبیدار بن کر آیا تھا۔ لیکن مرکز کی کمزوری سے حکمران مطلق بن بیٹھا۔ نام اگرچہ ماتحتی کا تھا لیکن عملاً خود مختار تھا۔ اس کے بعد سے یہی خاندان اب تک وہاں کا ــــــ پہلے حقیقی طور پر اب نام نہاد طور پر ــــــ حکمران چلا آ رہا ہے

نظام الملک کے بعد جنوبی ہند فرانس اور برطانیہ کے تاجروں کی آماجگاہ بن گیا انگریزوں نے جہاں بڑے نامور بھیجے وہاں فرانس کے ڈوپلے کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان لوگوں کی اصلی تکنیک "سازش" تھی۔ یہ مسلمان حکمرانوں کو پہلے آپس میں لڑاتے تھے پھر خود جیتنے والے کے مددگار بن کر یا اس سے بھڑ جاتے تھے یا زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کر لیتے تھے۔

فرانسیسیوں نے سازشوں کا جو جال خاندان آصف جاہی اور ارکاٹ کے نواب اور مرہٹہ سرداروں سے مل کر تیار کیا تھا۔ اور جو خوفناک جنگ کی صورت میں رونما ہوا اس میں نظام الملک کا ہونہار بیٹا ناصر جنگ ہلاک ہوا ۱۷۵۰ء ۱۱۶۳ھ پھر نظام الملک کا ایک اور بیٹا، صلابت جنگ تخت نشین ہوا۔

صلابت جنگ کے بعد اس کا بھائی نظام علی تخت نشین ہوا۔

نظام بڑا دوراندیش اور صاحب تدبیر اور بہادر ثابت ہوا۔ اس نے مرہٹوں سے جی بھر کے انتقام لیا۔ اور پچھلے تمام مقبوضات واپس لے لیے، فرانسیسی سپہ سالار ڈوپلے نے اس کی فوج کو جدید طرز پر مکمل کر کے اسے جنوبی ہند میں بہت بڑی طاقت بنا دیا تھا۔

انگریز بھی جنوبی ہند میں موجود تھے۔ اور نظام اور فرانسیسیوں سے خائف ۱۷۹۸ء میں

موسیو ریموں کا انتقال ہوا۔ انگریز لشکر قریب ہی تھا۔ اس نے خاندان آصفیہ کے غداروں کی مدد سے چھاؤنی کو گھیر کر اپنا تسلط قائم کر لیا اور اب نظام فرانسیسیوں سے کٹ کر انگریزوں کا حلیف بننے پر مجبور ہو گیا۔ اور یہ "دوستی" نازک سے نازک مواقع پر بھی قائم رہی خود انگریزوں نے اعتراف کیا ہے کہ اگر نظام ان کا دوست نہ ہوتا تو وہ غدر میں سلامت نہیں رہ سکتے تھے، اسی طرح تحریک خلافت کے زمانہ میں انگریزوں کا نظام نے ساتھ جان و مال سے دیا اسی طرح پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں!

سلطنت میسور کا خاتمہ:۔ جنوبی ہند میں ایک اور مسلمانوں حکومت میسور کی تھی۔ یہ حیدر علی کے زور بازو نے قائم کی تھی اور اس کے بیٹے ٹیپو سلطان کی شہادت نے اسے ختم کر دیا

ٹیپو سلطان نے مرہٹوں کو خوب پیٹا۔ نظام کے وار بھی سہہ لیے لیکن انگریزوں کی سیاست سازش اور اپنوں کی غداری عداوت اور جاہ طلبی کا مقابلہ نہ کر سکا، ہار گیا۔

بیس برس تک حکومت کر کے حیدر علی اس دنیا سے رخصت ہوا اس کا بیٹا ٹیپو سلطان تخت نشین ہوا۔ ۱۷۸۲ء / ۱۱۹۵ھ

انگریز اگرچہ ٹیپو کے حلیف تھے معاہدے کر کے پیمان دوستی مستحکم کر چکے تھے لیکن برابر اکھاڑ پچھاڑ کی فکر میں مصروف و منہمک رہتے تھے۔ انگریز از روئے معاہدہ پابند تھے کہ جب کسی دشمن سے ٹیپو کی لڑائی ہوئی وہ مدد کریں ——— وہ مدد کرتے تھے لیکن ٹیپو کی نہیں اس کے دشمنوں کی!

۱۷۹۲ء / ۱۲۰۶ھ میں نظام مرہٹوں اور انگریزوں سے جو جنگ ہوئی اسے ٹیپو اپنے غداروں اور نمک حراموں کے باعث نہ جیت سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کئی ضلعے مرہٹوں نظام اور انگریزوں کے حوالے کرنے پڑے۔ تاوان بھی ادا کرنا پڑا اور آخر میں کورگ سے بھی دست بردار ہونا پڑا کورگ کا مطالبہ انگریزوں نے اس وقت کیا جب معاہدہ پر دستخط ہو چکے تھے۔ تاوان کی رقم دی جا چکی تھی اور سلطان کے بیٹے یرغمال کے طور پر تحویل میں آ چکے تھے۔ ٹیپو کورگ سے دستبردار تو ہو گیا لیکن خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔

ٹیپو سلطان کی شہادت:- ٹیپو انگریزوں کو سمجھ گیا تھا۔ وہ ان سے نفرت کرنے لگا تھا، وہ ان کے عزائم سے واقف ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنے معاصرین کو اس فتنہ کی طرف توجہ دلائی مگر کوئی متوجہ نہ ہوا۔ ادھر انگریز بھی اسے فتح کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے سلطان کا دیوان میر صادقؒ انگریزوں سے باقاعدہ مل چکا تھا۔ نائب دیوان پورنیا بھی انگریزوں سے ساز باز کر چکا تھا۔ اور بھی کئی امیر و سردار آقا کشی میں ایک دوسرے سے بازی لیے جا رہے تھے ۱۷۹۹ء؍۱۲۱۴ھ میں "اتحادیوں" کا لشکر سرنگاپٹم پر بڑھا ——

یہ اتحادی، مرہٹہ، انگریز اور نظام تھے —— اندر سے دیوان اور نائب دیوان اور دوسرے امراء اور ہندو شریک سازش تھے۔ جنگ شروع ہوئی اور ہو گئی۔ صرف سلطان اور اس کے چند جاں نثار آخر وقت تک لڑتے رہے۔ سلطان امان طلب کر کے جان اور مال اور کسی حد تک حکومت بھی بچا سکتا تھا۔ لیکن اس کا عقیدہ تھا ؎

کہ آزادی کا ایک لمحہ ہے بہتر
غلامی کی حیات جاوداں سے

لڑتے لڑتے میدان جنگ میں اس نے جان دی اور واصل جناں ہوا،

سلطان کی شہادت کے بعد اس کے بیٹوں کو وظیفہ دے کر مختلف مقامات پر بھیج دیا گیا۔ کچھ علاقہ اتحادیوں نے لے لیا۔ باقی پر میسور کی ریاست بن گئی! جس کا پہلا دیوان سلطان کا نائب دیوان پورنیا تھا۔

سرنگاپٹم سے انگریزوں کو اتنی دولت ملی جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اور یہ ساری دولت بلا شرکت غیرے ان کے ہاتھ آگئی۔

اودھ پر انگریزوں کا اقتدار:- اودھ کی حکومت کا باقاعدہ آغاز صفدر جنگ کے بیٹے شجاع الدولہ کے عہد سے ہوا۔ یہ اتنا بڑا سیاست دان تھا کہ اگر آج زندہ ہوتا تو بین الاقوامی مدبّرین کی صف اول کے پہلے نمبر پر ہوتا تعمیر و تخریب دونوں کا بادشاہ تھا۔ تعمیر ایسی کہ فیض آباد کو رشک جناں بنا دیا تخریب ایسی کہ بریلی کی اینٹ سے اینٹ

ؒ یہ وہی میر صادق ہے جس کے بارے میں اقبال نے کہا ہے: جعفر از بنگال و صادق از دکن ۔ ننگ دنیا ننگ دیں ننگ وطن ؎

سعادت علی خاں کی بے بسی: ۱۸۱۴ء/۱۲۲۸ھ میں سعادت علی خاں کی وفات کے بعد اس کا بیٹا حیدر بادشاہ تخت پر بیٹھا اسے انگریزوں نے اور زیادہ دبایا اور جو کچھ چاہا حاصل کر لیا۔ غازی الدین کے بعد نصیر الدین حیدر پھر محمد علی شاہ پھر امجد علی شاہ پھر واجد علی شاہ علی الترتیب تخت پر بیٹھے لیکن ہر نئے فرماں روا کو انگریز دباتے رہے یہاں تک کہ ۱۸۵۶ء میں بغیر کسی وجہ کے، باہمہ اطاعت و نیاز مندی اودھ کا الحاق کر لیا اور واجد علی شاہ کو وظیفہ دے کر کلکتہ بھیج دیا۔

اور اس طرح وہ تمام معاہدے پس پشت ڈال دیئے گئے وہ تمام احسانات فراموش کر دیئے گئے جو بادشاہان اودھ نے انگریزوں سے کیے تھے ان تمام نیاز مندیوں کو نظر انداز کر دیا گیا، جن کا مظاہرہ اودھ کے تخت نشین سعادت علیخاں کے وقت سے واجد علی شاہ تک کرتے آئے تھے لکھنؤ کے انگریز بیلی اور ہند کے انگریز حاکم کل لارڈ ولزلی تک کو رحم آیا اور کمپنی کو اس ظالمانہ اقدام سے روکنا چاہا۔ لیکن ان کی ایک نہ چلی۔ اودھ کا الحاق ہو گیا اور واجد علی شاہ نظر بند ہو گئے

سکھوں کا خاتمہ: سکھ مذہب کے بانی گرونانک نیم مسلمان شخص تھے بلکہ بعض مؤرخین کے نزدیک مسلمان ہی تھے۔ وہ کعبہ شریف بھی گئے تھے۔ یہی بات ان کے مسلمان ہونے کے ثبوت میں کہی جاتی ہے بہر حال وہ مسلمان ہوں یا نہ ہوں لیکن مسلمانوں سے متاثر بہت تھے۔ ان کا مذہب تمام تر اسلام کا عکس ہے، خدا کی وحدانیت، اونچ نیچ، اور چھوت چھات سے بیزاری، ان کی مذہبی کتاب "گرنتھ" میں مسلمان صوفیا کے اقوال و اشعار کافی موجود ہیں۔ گرونانک کے بعد ان کے جانشینوں نے سیاست میں پاؤں نہیں اڑایا، وہ آرام سے رہے جنہوں نے سیاست میں حصہ لیا انہوں نے اس کے نتائج بھی بھگتے۔ رفتہ رفتہ مغلوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے لوٹ مار شروع کر دی ۱۷۶۲ء/۱۱۷۵ھ میں احمد شاہ ابدالی نے ان کی سرکوبی کی ان کے شرپسندوں کو موت کے گھاٹ اتار جاتے وقت سردار آلا سنگھ کو سرہند کی عملداری دے دی اس طرح تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک مسلمان بادشاہ کی امداد سے ہم دیکھتے ہیں کہ سکھ ایک چھوٹے سے رقبہ پر حکومت کرنے لگے۔

رنجیت سنگھ: سکھوں میں سرکشی، رہزنی اور قتل و غارت کا مادہ پیدا ہو چکا تھا وہ سرہند کی حکومت نے اور بڑھا دیا، ابدالی کے چلے جانے پر اس کی وفات کے بعد پنجاب کے وارثوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی سکھوں نے اس سے فائدہ اٹھایا اور گوجرانوالہ کے ایک سکھ سردار رنجیت سنگھ نے زماں شاہ ابدالی والی کابل کی عنایت سے لاہور کی حکومت کا پروانہ اور راجہ کا خطاب حاصل کر لیا۔ رفتہ رفتہ رنجیت سنگھ عروج و قوت کا حامل بن گیا۔

اب انگریز بھی دہلی تک پہنچ چکے تھے، انگریزوں اور سکھوں میں ۱۲۲۴ھ/۱۸۰۹ء میں ایک معاہدہ ہوا اب رنجیت سنگھ کی ہمت اور بڑھ گئی اس نے ۱۲۳۴ھ/۱۸۱۸ء میں ملتان پر قبضہ کر لیا پھر ایک سال بعد وہ کشمیر پر بھی قابض ہو گیا۔ پنجاب اور کشمیر کے علاقے کابل کے ماتحت تھے وہاں کے لوگ اپنے جھگڑوں میں پڑے تھے۔ انگریزوں سے معاہدہ ہو چکا تھا دلی سے کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ سکھ کھل کھیلے۔ یوں تو سبھی پر ظلم کرتے تھے لیکن مسلمانوں پر سفاکانہ مظالم کی انتہا اپنے دورِ حکومت میں کر دی رنجیت سنگھ نے پشاور اور صوبہ سرحد پر بھی قبضہ کر لیا اس کی مسلم آزادی کے باعث حضرت سید احمد شہیدؒ کچھ جانبازوں کے ساتھ جہاد کرتے ہوئے بڑھے اور پشاور سکھوں سے چھین لیا (۱۲۴۶ھ/۱۸۳۰ء) لیکن مسلمان خوانین نے حضرتؒ کو شہید کرا دیا اور سکھ پھر قابض ہو گئے رنجیت کا ۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء میں انتقال ہوا۔ سارا دم وخم اسی کی ذاتی صلاحیت اور جدوجہد کا تھا۔ انگریزوں کو موقع ملا۔ وہ بڑی آسانی سے سارے معاہدوں کو بالائے طاق رکھ کر ۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء میں سکھوں کو شکست دے کر سارے پنجاب پر قابض ہو گئے اور اس طرح سکھ حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ صرف معمولی سی چند سکھ ریاستیں باقی رہ گئیں، جنہوں نے انگریزوں کی سیادت قبول کر لی۔ رنجیت سنگھ کا سارا اثاثہ داخل خزانہ ہوا۔ اس کا بیٹا دلیپ سنگھ لندن جا کر عیسائی بن گیا۔

مرہٹوں کا استیصال انگریزوں کے ہاتھوں: ۱۸۱۷ء میں حسب معمول معاہدوں اور عہد ناموں کو چاک کر کے انگریزوں نے پونا کی ریاست ختم کر دی۔ صرف ستارا میں چھوٹی سی مرہٹہ ریاست باقی رہنے دی گئی۔ اسے بھی

۱۸۴۸ء میں ڈلہوزی نے ضبط کر لیا۔ باقی ریاستیں بظاہر باقی رہیں لیکن کامل طور پر انگریز ان کے متولی اور مالک بن گئے

اب صورت حال یہ تھی کہ تقریباً سارے بھارت پر انگریزوں کا قبضہ تھا۔ اگرچہ دلّی میں ایک بادشاہ موجود تھا اور نام نہاد طور پر سب اس کے ماتحت اور رعایا تھے۔

ڈلہوزی:- ڈلہوزی ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۲ء تک بھارت کا حاکم اعلیٰ رہا۔ اس عرصہ میں اس نے برطانوی حکومت کو دنیا کی سب سے بڑی مملکت بنا دیا، وہ ہر اصول ضابطہ قاعدہ، معاہدے اقرار نامے سے بالا تھا جن ریاستوں نے حلقہ اطاعت گلے میں ڈال لیا تھا انہیں بھی بغیر کسی وجہ کے ختم کر دیا اور کمپنی کی ملکیت بنا لیا۔ ایک اصول یہ بنایا کہ جس ریاست کا والی لاولد مرے وہ کمپنی کی ملکیت ہو جائے گی۔ اس طرح بہت سی ریاستیں ہضم کر لیں، برما پر قبضہ کیا، افغانستان سے جنگ چھیڑ دی عجیب سر پھرا آدمی تھا۔ ستارا، ناگ پور جھانسی، جیت پور، سنبھل پور اور بہت سی ریاستیں ضبط کر لیں نظام سے برار لے لیا گیا۔ (۱۸۵۳ء) اور بھی اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں لیکن گنجائش نہیں۔

اب تک ہندوستان کی دفتری زبان فارسی تھی اب انگریزی کا چلن ہونے لگا عدالتیں بھی انگریزی قائم ہونے لگیں۔ دل بدلنے کے لیے تعلیم کا ڈھانچہ بھی بدل دیا گیا۔ ہر چہار طرف سے جال پھینکے جانے لگے کہ اس دیس کی ہر چیز کو انگریزوں اور انگریزی کا غلام بنا لیا جائے۔ چنانچہ یہ مقصد باہمہ وجوہ پورا ہوا

۱۸۵۶ء میں ڈلہوزی کا جانشین کیننگ بن کر آیا!

۱۸۵۷ء کا غدر:- انگریزوں کی دراز دستیوں، فریب کاریوں چالاکیوں، بدعہدیوں سفاکیوں ظلم آرائیوں اور رکیک حرکتوں نے اہل ہند کو انگریزوں سے بیزار اور متنفر کر دیا۔ مواد اندر اندر پک رہا تھا مئی ۱۸۵۷ء میں بغاوت یا غدر کا نام پا کر یہ مادہ پھوٹ نکلا اور انگریزوں کو موقع مل گیا کہ وہ مکمل طور پر ہر نمایش اور تصنع سے بے پروا ہو کر اس ملک پر قابض ہو جائیں اس مقصد کو پورا کرنے، اور غدر کو فرو کرنے کے لیے مسلم والیان ریاست کی امداد و اعانت کے باوجود مسلمانوں پر خاص طور پر جو مظالم کیے ان کا ذکر کرتے ہوئے خود انگریز مؤرخین شرماتے

ہیں اور ندامت کا اظہار کرتے ہیں ان کی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" فرنگی مظالم کا ایسا آئینہ ہے جو خود ظالم کے ہم قوم نے تیار کیا ہے اس آئینہ میں انگریز کی سیرت، کردار اور جبلت کو بہت اچھی طرح سے دیکھا جا سکتا ہے۔

انگریزوں کا ظلم: غدر کے سلسلہ میں کئی لاکھ ہندوستانیوں کا جن میں مسلمان زیادہ تھے اور غیر مسلم کم انگریزوں نے صفایا کیا صرف دلی میں ۲۷ ہزار نفوس مارے گئے، بہتوں نے خودکشی کر لی بہت سی عورتیں کنویں میں گر کر خودکشی پر مجبور ہو گئیں۔ لال قلعہ کے پاس جتنے مسلم محلے تھے زمین کے برابر کر دیئے گئے قلعہ کے محلات شاہی منہدم کر دیئے گئے۔ بادشاہ (ظفر) کے لڑکے کا سر اس کے سامنے پیش کیا، بادشاہ پر بغاوت کا مقدمہ چلایا اور اسے حبس دوام کی سزا دے کر رنگون بھیج دیا۔

انگریز بادشاہ: غدر کے بعد کمپنی کی حکومت ختم ہو گئی اور حکومت برطانیہ نے باقاعدہ اس ملک کو اپنا غلام بنا لیا

ہند کے انگریز بادشاہوں کی فہرست۔

۱۔ ملکہ وکٹوریہ ——— سنہ ۱۸۵۸ء سے سنہ ۱۹۰۱ء تک حکومت کی
۲۔ ایڈورڈ ہفتم سنہ ۱۹۰۱ء سے سنہ ۱۹۱۰ء تک برسر حکومت رہے۔
۳۔ جارج پنجم سنہ ۱۹۱۰ء سے سنہ ۱۹۳۶ء تک تخت پر متمکن رہے۔
۴۔ ایڈورڈ ہشتم صرف ایک سال برسر حکومت رہے سنہ ۱۹۳۶ء
۵۔ جارج ششم سنہ ۱۹۳۶ء سے سنہ ۱۹۵۲ء تک بادشاہ رہے۔

بیسویں منزل

پاکستان

غدر کے بعد کی حالت

غدر کے بعد شرافت بک رہی تھی، نسب کا فخر، حسب کا غرور، خاندان کا تجمل خاک میں مل رہا تھا، ایک عجیب کسمپرسی اور تباہ حالی، بیکاری اور بے روزگاری، پریشانی اور ادبار کا عالم تھا مسلمانوں میں ؎!

ان کی جاگیریں چھن چکی تھیں۔ زمینداریاں چھن رہی تھیں۔ انگریز کی ملازمت ہی ایک آخری چارۂ کار تھا۔ مگر وہ بھی نہ مل سکتی تھی۔ کیونکہ وہ انگریزی تعلیم سے متنفر تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نوبت فقر و فاقہ تک پہنچ گئی۔ اور وہ کوڑی کوڑی کے محتاج ہو گئے۔

سرسیّد احمد خاں

ان حالات میں سرسیّد احمد خاں (جواد الدولہ، عارف جنگ سیّد احمد خاں بہادر) میدانِ عمل میں اترے!

سرسیّد نے محسوس کر لیا جو ہونا تھا وہ ہو چکا، حکومت جا چکی، اب وہ واپس نہیں مل سکتی مسلمانوں نے اگر ؎

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز

پر عمل نہ کیا تو ایک نسل کے بعد وہ اس دیس میں اگر زندہ رہے تو اچھوتوں کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوں گے!

چنانچہ سید نے اپنی قوم کو جو پیام دیا اور اس کے سامنے جو پروگرام رکھا اس کا خلاصہ یہ تھا

۱۔ انگریزی تعلیم حاصل کی جائے۔

۲۔ حکومت سے تعاون کیا جائے۔

۳۔ زندگی کے میدان میں جدوجہد کا سلسلہ جاری رکھا جائے!

سرسید کے اس پیام اور پروگرام کی سخت مخالفت کی گئی، علماء کے حلقہ سے ان پر درجنوں کفر کے فتوے صادر ہوئے۔ صلحائے امت نے انہیں گمراہ، خاطی، بدنہاد اور غدار ملت قرار دیا، قوم کے مالدار طبقہ نے سنی کی ان سنی کردی عوام نے انہیں منہ نہ لگایا، لیکن وہ دُھن کے پکّے تھے، ان حالات سے ذرا بھی دل برداشتہ نہیں ہوئے، انہوں نے اپنی جدوجہد جاری رکھی، تمرّد اور غرور حکومت نے انہیں حواس باختہ کیا، نہ قوم کی سرد مہری اور اربابِ ملّت کے استغنا نے ان کے عزم کو کمزور کیا۔ ۱۸۷۵ء کے وسط میں بہ مقام علی گڑھ اپنے "مدرستہ العلوم" کی بنیاد ڈال دی۔ یہی مدرستہ العلوم آگے چل کر علی گڑھ کالج بنا اور اب علی گڈھ یونیورسٹی کے نام سے مشہور و معروف ہے!

علی گڑھ کے سپوت

سرسید نے ہمت سے کام لے کر یہ کارنامہ انجام دے ڈالا، بہت جلد اس کے خوش گوار نتائج بھی سامنے آگئے، آج کون ہے جو جسٹس سیّد محمود، محمد علی، شوکت علی، آفتاب احمد خاں، ڈاکٹر ضیاء الدین، حسرت موہانی، ظفر علیخاں لیاقت علی خاں، اور دوسرے صدہا سربرآوردہ علیگ اصحاب کی خدمت اور قیادت کے وصف سے انکار کر سکے، "اسی کفر" کے قلعہ سے اسلام کے وہ مجاہد اور سورما نکلے، جنہوں نے استعمار و طاغوت کے قصور و محلات دالیوان میں تزلزل پیدا کر دیا۔ ان کے کارنامے، ان کے خدمات اور ان کے ایثار کے واقعات تاریخ کا ناقابل فراموش جز بن چکے ہیں جنہیں نہ بھارت فراموش کر سکتا ہے نہ پاکستان —— نہ عالم اسلام!

ہندو اپنی تعلیمی خامیاں دُور کر کے بہت آگے نکل چکے تھے، جس طرح مسلمانوں کے دور حکومت میں جی لگا کر انہوں نے فارسی پڑھی تھی اسی طرح اب انگریزی پڑھ لی تھی، مسلمانوں کے دور حکومت میں بھی وہ اعلیٰ سرکاری مناصب پر فائز ہوتے رہتے، اب فرنگی راج میں بھی بلند تر سرکاری مناصب کے دروازے ان کے لیے کھلے ہوئے تھے، معاش، معیشت اور تعلیم سے مطمئن ہو کر اب وہ یکسوئی کے ساتھ سیاست کے میدان میں کود پڑے، ہندوؤں کی یہ سیاسی تحریکیں بیک وقت منفی بھی تھیں اور مثبت بھی، یعنی سلبی بھی، اور ایجابی بھی!

کانگریس کی تشکیل

۲۷- دسمبر ۱۸۸۵ء کو آل انڈیا یونین کی تشکیل ہندو سیاست والوں کی شرکت سے ہوئی۔ یہی انجمن ایک سال بعد ۱۸۸۵ء میں آل انڈیا

کانگریس بن گئی، جسے ایک انگریز مسٹر ہیوم نے قائم کیا تھا۔

بظاہر کانگریس کا مقصد صرف یہ تھا کہ ہندوستان کا سیاسی شعور بیدار ہو، لیکن عملی مقصد یہ تھا کہ ہندو ابھریں اور مسلمان پامال ہوں، یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں نے شروع میں اس سے کسی طرح کا تعاون نہیں کیا۔

مسلم لیگ کا قیام ڈھاکہ مسلم لیگ قائم ہوئی اس کے بانیوں میں نواب سلیم اللہ خاں نواب وقارالملک اور مولانا محمد علی تھے۔

اور اس سلسلہ میں یہ بات پیشِ نظر رکھنی چاہیئے کہ مسلم لیگ صرف اس لیے وجود میں آئی تھی کہ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کرے، اس لیے نہیں کہ کسی دوسری ملّت کے حقوق پر حملہ کرے۔ اور اسے نیچا دکھائے۔

ہوم رول لیگ اور سوراج لیگ ۱۹۱۷ء میں ہوم رول لیگ قائم ہوئی اس کا مقصد ہندوستان کے لیے حکومت خود اختیاری کا حصول تھا۔ اس نام کی دو انجمنیں تھیں، ایک مسز بسنت نے قائم کی تھی اور دوسری مسٹر تلک نے۔

بعد میں گاندھی جی نے بھی اس میں شرکت کرلی اور اس کا نام ہوم رول لیگ ہوگیا۔ اب اس کے ناخدا گاندھی جی تھے، جن لوگوں نے نام بدلنے کی مخالفت کی ان سے بھرے مجمع اور کھلے جلسہ میں گاندھی جی نے کہا وہ مستعفی ہوسکتے ہیں۔

مجلس خلافت اور جمعیتہ علما پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء میں) ترک اتحادیوں سے ہار گئے تھے خلافتِ اسلامیہ کا مرکز قسطنطنیہ تھا، خلافت کا وقار خطرہ میں تھا اور ترکی مقبوضات پر اتحادی قبضہ کر رہے تھے، ان حالات میں ۱۹۱۹ء میں مجلس خلافت علی برادران کے جوشِ عمل نے قائم کی، اسی سال خلافت کے سرمایہ سے مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کی زیرِ قیادت جمعیتہ علماء قائم ہوئی۔

مہا سبھا کی تشکیل سوامی شردھانند رولٹ ایکٹ کے سلسلہ میں گرفتار ہوئے تھے، اپنی مدّتِ اسیری ختم ہونے سے پہلے وہ رہا کر دیے گئے۔ اور ۱۹۲۳ء میں انہوں نے آل انڈیا ہندو مہا سبھا کی بنیاد رکھی کانگرس نے اس کے سامنے سپر

ڈال دی اور اس نے وسیع پیمانہ پر شدھی (تبلیغ)، سنگھٹن (تنظیم) کا کام مسلمانوں کے خلاف شروع کر دیا۔ گویا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ مجلس خلافت کے دور میں ہندو مسلم اتحاد کی جو داغ بیل پڑی تھی، وہ مہا سبھا نے ختم کر دی!

انڈین یونین

سنہ ۱۹۲۷ء میں پنڈت موتی لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد صاحب (آمر بالمعروف اور ناہی عن المنکر) نے ایک انجمن "انڈین یونین" کے نام سے بنائی جس کی ممبری کی پہلی شرط یہ تھی کہ اس کا ممبر کوئی ایسا شخص نہیں ہو سکتا جو کسی مذہبی یا فرقہ وارانہ انجمن کا ممبر ہو۔ مولانا نے مجلس خلافت سے علیحدگی اختیار کر لی۔ لیکن اس بے داغ کردار کے باوجود کانگرس کا ایک معقول طبقہ مولانا کو بھی "فرقہ پرست" کہتا رہا ــــ اب بھی کہتا ہے!

مسلم کانفرنس اور تحریک خاکسار

آخر میں یہ دو نئی تحریکیں عالم وجود میں آئیں اور مسلمانانِ ہند پر چھا گئیں۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں مسلم کانفرنس سر آغا خاں کی صدارت میں قائم ہوئی، مسلم لیگ کمزور ہو چکی تھی، اس کے کئی ٹکڑے ہو چکے تھے اس انجمن نے اس کی جگہ لے لی۔

اسی سال مسٹر مشرقی نے تحریک خاکسار کی بنیاد ڈالی اور ہر خاکسار کے لیے یہ لازم قرار دیا کہ جب وہ کسی انگریز کو دیکھے تو اپنی خاکساری کا مظاہرہ اسے سلامی دے کر کرے۔

مسلم یونٹی بورڈ

سنہ ۱۹۳۲ء مولانا شوکت علی مرحوم (مغفور) نے نواب اسمٰعیل خاں وغیرہ کے اشتراکِ عمل سے "مسلم یونٹی بورڈ" قائم کیا تاکہ مسلمانوں کا ایک پلیٹ فارم اور ایک مرکز بن سکے۔

سنہ ۱۹۳۴ء میں مولانا شوکت علی اور سید مرتضٰے بہادر وغیرہ اسی جماعت کے ٹکٹ پر مرکزی اسمبلی کے ممبر ہوئے تھے۔

گاندھی جی کی قیادت

علی برادران نے گاندھی جی کی قیادت قبول کر لی اور انہیں "باپو" تک کہنے لگے۔ لیکن گاندھی جی نے مسلمانوں کے بل پر مہاتما بننے کے بعد مسلمانوں کے ساتھ کیا کیا۔ یہ رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم کی زبان سے سُنیئے، ۲۵ دسمبر سنہ ۱۹۲۷ء کو پشاور کے ایک عظیم الشان اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے مولانا محمد علی نے کہا:۔

"کانگرس کو انڈین نیشنل کانگرس فی الحقیقت مسلمانوں نے بنایا ہے اس سے پہلے وہ صاحب بہادروں کی تقریر گاہ تھی، مگر جس دن سے محمد علی، شوکت علی اسمیں شریک ہوئے، اسی دن سے اس میں جان پڑ گئی چنانچہ کلکتہ کانگرس میں لالہ لاجپت رائے کی مخالفت کے باوجود کانگرس نے ترک موالات کو اپنا شعار بنایا، اور یہ حقیقت ہمیں ہمیشہ فخر کے ساتھ یاد رہے گی کہ سب سے جلیل القدر ہندو رہنما مہاتما گاندھی، ہمیشہ خلافت کے سرمایہ سے دورہ کرتا رہا، ہماری قید کے بعد بھی مہاتما جی نے دورہ کے مصارف خلافت کے سرمایہ سے لیئے، حتیٰ کہ کانگرس کے لیے ایک کروڑ روپیہ جمع کرنے کے لیے آپ کے دوروں کے مصارف بھی مجلس خلافت نے ادا کئے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ کانگرس کی روح رواں تحریک خلافت اور مجلس خلافت تھی۔"

کانگرس اور گاندھی جی کے بارے میں اگر یہ شہادت ناکافی ہے تو ایک دوسری شہادت لیجے، یہ شہادت ہے ہندوستان کے مشہور محقق، سیاست دان اور تاریخ سیاسات کے ماہر خصوصی ڈاکٹر امبیدکر کی، موصوف اپنی کتاب "پاکستان کے بارے میں چند خیالات" THOUGHTS ON PAKISTAN میں لکھتے ہیں:-

"۹ جون ۱۹۲۰ء کو خلافت کانفرنس الہ آباد میں منعقد ہوئی اور متفقہ طور پر ترک موالات کا اصول طے ہوا۔ ایک کمیٹی بنائی گئی جس کے ذمہ یہ کام تھا کہ وہ ترک موالات کے اصول اور پروگرام کو واضح طور پر مرتب کرے ۲۲۔ جون ۱۹۲۰ء کو مسلمانوں نے وائسرائے کو ایک پیام بھیجا کہ اگر یکم اگست ۱۹۲۰ء سے پہلے ترکوں کے شکایات رفع نہ ہوئے تو تحریکِ ترکِ تعاون شروع کر دی جائے گی، ۳۰ جون ۱۹۲۰ء کو خلافت کمیٹی کا جلسہ الہ آباد میں ہوا اور طے ہوا کہ ایک مہینہ کا وائسرائے کو نوٹس دے کر ترک موالات کا پروگرام شروع کر دیا جائے۔ پہلی اگست ۱۹۲۰ء کو نوٹس دے دیا گیا اور ۳۱۔ اگست ۱۹۲۰ء کو تحریک ترک تعاون شروع کر دی گئی ان حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ تحریکِ ترکِ موالات خلافت کمیٹی نے شروع کی تھی،

کانگرس کے اسپیشل کلکتہ (زیر صدارت لالہ لاجپت رائے) نے جو کچھ کیا وہ صرف یہ کہ خلافت کانفرنس کا مسلک قبول کرلے!"

محمد علی اور رامبید کرکی کی ان تصریحات سے معلوم ہو گیا کہ گاندھی جی کو مہاتما اور کانگرس کو کانگرس خلافت کمیٹی علی برادران نے بنایا، کانگرس تک نے خلافت کی پیروی کی، لیکن اقتدار حاصل کر لینے کے بعد مجلس خلافت اور علی برادران کے ساختہ پرداختہ گاندھی جی اور ان کی کانگرس نے جو سلوک علی برادران اور مجلس خلافت کے ساتھ کیا، وہ بڑی دردناک کہانی ہے، ہندو مسلم اتحاد کے چمن کو شردھانند پنڈت مالوی، اور خود کانگرس کے بڑے بڑے لیڈروں نے تاراج کیا، وہ ایک ایسی حقیقت ہے، جسے کوئی نہیں جھٹلا سکتا!

مجلس خلافت نے کانگرس سے آزادئی ہند کے معاملہ پر مفاہمت کی، ہندو مسلم اتحاد کا بیڑا اُٹھایا، اور کامیاب ہوئی، مسلمانوں نے رضاکارانہ طور پر گاؤ کشی تک بند کردی، لیکن شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں شروع کر دی گئیں، فسادات کا لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا گیا، منافرت اور افتراق کے جھنڈے لہرائے جانے لگے، محمد علی، شوکت علی مسلمانوں کی گالیاں کھاتے رہے، مگر اُس وقت تک کانگرس سے جُدا نہ ہوئے جب تک بالکل مایوس نہ ہو گئے، اور ان کے مایوس ہو جانے اور الگ تھلگ ہو جانے کے بعد کانگرس باقاعدہ ایک ہندو ادارہ بن گئی!

کانگرس کا دورِ اقتدار

۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن کے چرچے نے ہندوستان کی سیاسی فضا میں ایک تموّج پیدا کر دیا، ٹوٹے ہوئے دل پھر جڑنے لگے شکستہ تعلقات پھر استوار ہونے لگے، مشترک معاملات میں متحدہ محاذ پھر بن گیا، ہندوؤں سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ مسلمانوں نے سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کیا مشترک جلوسوں اور جلسوں میں بڑھ چڑھ کے حصّہ لیا۔

چودہ نکات مسلمان سائمن کمیشن کے وقت ہی سے چونک چکے تھے، مسٹر جناح آئے دن کے منافشوں اور ہنگامہ آرائیوں سے تنگ آچکے تھے وہ چاہتے تھے کہ مستقل مفاہمت اور مصالحت اور مخلصانہ تعاون کی کوئی صورت نکل آئے یہ جھگڑے ختم ہوں اور صلح و سلام کا دور شروع ہو۔ انہوں نے ۱۹۲۷ء میں اپنے "چودہ نکات" مرتب کئے، یہ مسلمانوں کے کم از کم اور زیادہ سے زیادہ معقول مطالبات تھے، ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو دہلی میں مسلم زعماء کا ایک اجتماع ہوا، اس نے بھی یہ نکات منظور کر لیے، ان نکات کی تشکیل میں مولانا محمد علی مرحوم کے مشوروں کو بھی خاصا دخل تھا، لیکن تھا یہ سب کچھ جناح کا دماغی شاہکار، ہندو سب سے زیادہ جداگانہ انتخاب سے بھڑکتے تھے ان نکات میں جداگانہ انتخاب مشروط طور پر ترک کر کے مخلوط انتخاب پر آمادگی ظاہر کی گئی تھی اور اس طرح ہندوؤں کی طرف بھرپور خلوص اور سچائی کے ساتھ دستِ تعاون مسلمانوں نے بڑھایا اور کہہ دیا کہ اگر ہمارے یہ معمولی مطالبات منظور کر لیے جائیں تو ہم جداگانہ انتخاب سے دستبردار ہو جائیں گے سائمن کمیشن کے سفارشات خواہ کچھ ہوں، ہم اس میثاق پر قائم رہیں گے۔

مسٹر جناح کے یہ نکات مسلم لیڈروں نے تسلیم کر لیے، مولانا محمد علی مرحوم نے خاص طور پر انہیں پسند کیا، اس وقت تک جناح عوامی لیڈر نہیں تھے، صرف تعلیم یافتہ طبقہ انہیں مانتا تھا، مولانا محمد علی مرحوم عوامی لیڈر تھے۔ انہوں نے ان نکات کو تسلیم کیا اور ان کی تبلیغ و تلقین کے لیے اپنی زبان و قلم کو وقف کر دیا اور مسٹر جناح کی بہت بڑی مشکل آسان کر دی۔

اب ایک دوسری مشکل پیش آئی۔ ہندو قوم نے یہ بات بڑی خوشی سے مان لی کہ مسلمان انتخاب کے لیے راضی ہو گئے۔ لیکن ان کے دوسرے مطالبات جن کی منظوری پر مخلوط انتخاب مشروط تھا، ماننے سے صاف انکار کر دیا، یعنی نہ وہ یہ ماننے پر تیار تھے کہ سندھ کو بمبئی سے الگ کیا جائے نہ یہ مان رہے تھے کہ سرحد کو مساوی اصلاحات دیئے جائیں۔ نہ وہ مرکزی اسمبلی میں ⅓ نیابت کے حامی تھے، وہ کوئی مطالبہ بھی نہیں مان رہے تھے۔

نہرو رپورٹ

سائمن کمیشن کے سفارشات ابھی پارلیمنٹ کے سامنے پیش نہیں ہوئے تھے، لیکن ہندوستانیوں میں اس کی تشکیل اس کی کارروائیوں اور اس کی حیثیت کے بارے میں ایک ہیجان برپا تھا اسی اثنا میں مسٹر برکن ہیڈ وزیر ہند نے پارلیمنٹ میں ایک بیان دیتے ہوئے کہا۔ ہندوستانی اس درجہ منقسم مختلف اور ایک دوسرے سے بیزار ہیں کہ وہ ایک متحدہ دستور اساسی بھی نہیں بنا سکتے،

اس چیلنج کو ہندوستان کے سیاستدانوں نے اور کانگرس نے منظور کر لیا، طے ہوا کہ ایک دستور اساسی بنایا جائے اور ہندوستان کے مطالبہ کی صورت میں حکومت کے سامنے اسے پیش کر دیا جائے، چنانچہ پنڈت موتی لال نہرو کی زیر صدارت ایک مجلس تشکیل دستور قائم کی گئی،

اگست ۱۹۲۸ء میں یہ رپورٹ آل پارٹیز کانفرنس لکھنؤ میں پیش ہوئی، مجلس خلافت کی طرف سے مولانا شوکت علی مرحوم نے ان کی مخالفت کی اور اعلان کیا کہ مسلمان اس رپورٹ کو منظور نہیں کر سکتے، کیونکہ اس میں کوئی بھی اہم مطالبہ مسلمانوں کا منظور نہیں کیا گیا تھا، پنجاب میں انہیں اقلیت بنا دیا گیا تھا بنگال میں ہندو اقلیت ان پر مسلط کر دی گئی تھی، سندھ علیحدگی بھی واضح الفاظ میں تسلیم نہیں کی گئی تھی، مرکزی اسمبلی میں ایک تہائی نشستیں بھی مسلمانوں کو دینے سے انکار کر دیا گیا تھا، غرض ان کے جائز مطالبات میں سے کوئی بھی اہم اور

بنیادی مطالبہ تسلیم نہیں کیا گیا تھا،
مسلمانوں نے کوئی ایسا مطالبہ نہیں کیا تھا جو ناقابلِ قبول ہو، لیکن اکثریت کے زعم میں ایک مطالبہ بھی نہرو رپورٹ میں منظور نہیں کیا گیا!

گول میز کانفرنس سائمن کمیشن نے اپنی رپورٹ ۱۷ اپریل ۱۹۲۹ء میں مرتب کر لی، لیکن قبل اس کے کہ رپورٹ پارلیمنٹ میں ہو کنزرویٹو حکومت کا تختہ الٹ گیا اور لیبر حکومت برسر حکومت ہو گئی۔

مسٹر جناح نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور ۱۹ جون ۱۹۲۹ء کو مسٹر میکڈانلڈ کو جنہیں وہ اپنے قیام ولایت کے زمانہ سے جانتے تھے، حسب ذیل مکتوب لکھا، جس کا ترجمہ یہ ہے:۔

"سائمن کمیشن کا سیاسی ہندوستان مکمل مقاطعہ کر چکا ہے اگر اسی بنیاد پر معاملات آگے بڑھائے گئے تو سارا ہندوستان بھڑک اٹھے گا، ہندوستان اب برطانیہ کے وعدوں پر بھروسہ نہیں کر سکتا، میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ سوچیے یہ اعتماد رفتہ آپ کس طرح واپس لا سکتے ہیں؟۔۔۔ آپ کے لیے واحد چارۂ کار یہ ہے کہ آپ ایک واضح اعلان کریں جس میں بتایا گیا ہو کہ ہندوستان کو جلد از جلد درجۂ نو آبادیات حکومت برطانیہ دیدیگی"

لارڈ ارون وائسرائے ہند رخصت پر ولایت گئے۔ وہاں سے واپس آ کر ۳۱ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو انہوں نے اعلان کیا کہ ہندوستان کی منزل مقصود، درجۂ نو آبادیات ہے اور حکومت سیاسی ارتقا کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کے لئے ایک گول میز کانفرنس بھی منعقد کرنے کو تیار ہے، اس اعلان کا گاندھی جی اور دوسرے کانگرسی لیڈروں نے خیر مقدم کیا، لیکن شرط تعاون یہ رکھی کہ گول میز کانفرنس میں کانگرس کے مندوبین کو اکثریت حاصل ہو۔

گاندھی جی نے گول میز کانفرنس میں شرکت کی (۳۲ء) اور سب سے پہلے یہ کوشش کی کہ "فرقہ وارانہ مسئلہ" یہاں زیر بحث لایا ہی نہ جائے اس پر اس وقت گفتگو ہو۔ جب ہندوستان کے سیاسی مستقبل کا فیصلہ ہو جائے، مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا، اب گاندھی جی نے یہ فرمایا، اچھا میں مسٹر جناح کے "چودہ نکات" مانے لیتا ہوں، لیکن شرط

یہ ہے کہ مسلمان دوسری اقلیتوں کے فرقہ وارانہ مطالبات کی تائید نہ کریں، ظاہر ہے اسے مسلمانوں نے نہیں مانا۔ اب انہوں نے فرمایا۔ کانگریس ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت ہے اسے پہلے مانو پھر ہیں باب سخن واکروں گا۔ اسے نہ حکومت مان سکتی تھی، نہ دوسری سیاسی جماعتیں، لہذا گاندھی نے فرمایا پھر میرا یہاں ٹھیرنا بیکار ہے اور ہندوستان واپس آنے کی تیاریاں کرنے لگے۔

کمیونل اوارڈ گول میز کانفرنس نے ایک "مجلس اقلیت" بنائی تھی جو فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل کے لیے قائم کی گئی تھی، لیکن وہ بھی ناکام رہی، آخرکار گاندھی جی کے مشورہ اور مسز نائیڈو کی تائید سے پنڈت مدن موہن مالوی اور دوسرے ہندو لیڈروں نے وزیر اعظم مسٹر میکڈانلڈ سے درخواست کی کہ وہ ثالث بن کر تصفیہ کردیں، مسٹر جناح نے مسلمانوں کی طرف سے اس ثالثی کے ماننے سے قطعاً انکار کردیا۔

پھر جب وزیر اعظم نے اپنا فیصلہ صادر کردیا اور جسے مسلمانوں نے صرف اس لیے قبول کیا کہ کوئی دوسرا حل موجود نہ تھا۔ تو سب سے زیادہ شور مچانے والے اس "اوارڈ" کی مخالفت میں وہی تھے۔ جنہوں نے مسٹر ریمزے میکڈانلڈ کی "ہندو نوازی" پر بھروسہ کر کے انہیں پنچ مان لیا تھا۔

مسئلہ وفاق گول میز کانفرنس میں سب سے زیادہ اہم مختلف فیہ اور نازک مسئلہ وفاق کا تھا، یعنی ہندوستان کے صوبے کامل طور پر آزاد اور خودمختار ہوں یا وہ ایک وفاق سے وابستہ ہوں۔ اس مسئلہ پر تینوں پارٹیوں (حکومت کانگریس، مسلم لیگ) کے نقطہ ہائے نظر جداگانہ تھے۔

حکومت اس لیے وفاق کی حامی اور مؤید تھی کہ انڈیا ایکٹ اور وفاق کے نفاذ کے بعد مرکزی اسمبلی میں سے نامزد گروہ ختم ہو جائے گا۔ صرف منتخب گروہ رہ جائے گا۔ اور یہ گروہ سرکار کا وفادار نہیں لہذا تلافی کی صورت حکومت نے یہ نکالی کہ وفاق میں والیانِ ریاست کو بھی شریک کر لیا جائے۔ اور وہ اس وفاق میں اپنے نمائندے نامزد کر کے بھیجیں۔ یہ نمائندے ظاہر ہے ریاستی عوام کے نمائندے نہیں ہوں گے۔ والیانِ ریاست کے پسند کردہ ہونگے، لہذا اسمبلی میں اگر یہ سابق نامزد گروہ کا کام کریں گے اور حکومت کے اشارہ پر رقص کریں گے

اس طرح حکومت ہندوستان کو اندرونی آزادی دینے کے بعد بھی اس کی مربی اور سرپرست بنی رہے گی۔

کانگرس وفاق کی اس لیے مخالف تھی۔ کہ وہ یہ چاہتی تھی کہ یا تو والیانِ ریاست وفاق میں شریک ہی نہ کیے جائیں، اور اگر ان کی شرکت ضروری ہے تو فیڈریشن کو حق ہونا چاہیئے کہ وہ بھی ریاستوں کے معاملات میں مداخلت کر سکے، نیز یہ کہ وفاق میں جو ریاستی نمائندے آئیں وہ عوام سے منتخب کردہ ہوں، نہ کہ والیان ریاست کے نامزد۔

مسلم لیگ کی طرف سے قائدِ اعظم کہتے تھے کہ وفاق اس لیے ناقابل قبول ہے کہ یہ صوبوں کی آزادی اور خود مختاری کو ختم کر دیتا ہے۔ یہ اُنہیں اپنی غلامی میں لے لیتا ہے، لہٰذا اس کی سرے سے ضرورت ہی نہیں ہے۔ قائدِ اعظم نے وفاق کی اس شدومد سے مخالفت کی کہ انہیں آخری گول میز کانفرنس میں مدعو ہی نہیں کیا گیا۔ حالانکہ وہ لندن میں مستقل طور پر اقامت گزیں تھے، چنانچہ ۷ فروری ۱۹۳۵ء کو مرکزی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:۔

"میں آغاز ہی سے وفاق کا سرگرم مخالف ہوں۔ اسی لیے مجھے گول میز کانفرنس کی آخری نشستوں میں شریک نہیں کیا گیا"

مجلس تشکیل وفاق FEDRAL STRUCTURE COMMITTEE میں قائدِ اعظم نے جو معرکہ آرا مدلل اور برجستہ تقریر وفاق کے خلاف کی تھی۔ اس نے مجلس کے صدر لارڈ سینکے کو حواس باختہ کر دیا تھا اور انہوں نے اپنی جوابی تقریر میں کہا "مسٹر جناح نے ہمارے کئے دھرے پر پانی پھیر دیا"

انڈیا ایکٹ ہندو مسلم مفاہمت، دستوری اور فرقہ وارانہ معاملات پر مسٹر جناح کی مساعی کے باوجود نہ ہو سکی، اب حکومت نے ۳۵ء میں انڈیا ایکٹ نافذ کر دیا یعنی صوبوں کو اندرونی آزادی مل گئی۔

کانگرس کا طرزِ عمل ۳۷ء کے اوائل میں صوبائی مجالس کے انتخاب کامیابی کے ساتھ ختم ہو گئے، تمام ہندو صوبوں میں کانگرس غیر معمولی اکثریت کے ساتھ

جلتی۔ کچھ عرصہ تک کانگرس نے وزارت قبول کرنے سے انکار کیا کیونکہ وہ گورنروں سے یہ وعدہ لینا چاہتی تھی کہ وہ وزارت کے کاموں میں مداخلت نہیں کریں گے، اس عرصہ میں مسلم لیگ نے شرافت کا ثبوت دیا اور کہیں وزارت نہیں بنائی۔

ہر صوبہ میں مسلم لیگ کانگرس کے بعد سب سے بڑی جماعت تھی، اخلاقاً اور اصولاً کانگرس کا فرض تھا کہ وہ مسلم لیگ کے اشتراک تعاون سے وزارتیں بناتی، لیکن اس نے مسلم لیگ پارٹیز کے سامنے یہ شرط رکھی کہ مسلم لیگ کے ممبر مسلم لیگ سے مستعفی ہو جائیں، کانگرس کے میثاق PLEDGE پر دستخط کریں مسلم لیگ پارٹی توڑ دیں تو وہ وزارت میں شریک کئے جا سکتے ہیں، مسلم لیگیوں نے پوری آن اور خودداری کے ساتھ یہ شرائط ماننے سے انکار کر دیا اور ان مسلمانوں کو شریکِ وزارت کر لیا جن کے ساتھ نہ مسلم قوم تھی، نہ کوئی مسلم جماعت، جو ایوان اسمبلی میں اگر کسی کے نمائندے تھے۔ تو صرف اپنی ذات کے، جو کل تک کانگرس سے کوئی تعلق بھی نہ رکھتے تھے بلکہ اس کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ اس طرز عمل نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان اختلافات کی ایک وسیع خلیج حائل کر دی۔

مغربی جمہوریت سے مسلمانوں کا اندیشہ

کانگرس کے اس رویہ نے مسلمانوں کو اپنے مستقبل کی طرف سے مایوس کر دیا۔ اب پہلی بار مسٹر جناح نے محسوس کیا کہ مغربی جمہوریت ہمارے درد کا درماں نہیں بن سکتی۔ آخر یہ کیسی جمہوریت ہے جو مسلم قوم کی اکثریت کو محروم کر دے اور اقلیت کو سرفراز کر دے؟ جو مسلمان جماعتیں اسمبلی میں مسلم ممبروں کی اکثریت اپنے ساتھ رکھتی ہیں۔ وہ تو نظر انداز کر دی جائیں، اور جو مسلم ممبر نہ قوم کی پشت پناہی کے حامل ہیں، نہ ایوان میں جن کی کوئی پارٹی ہے وہ سرفراز ہوں اور سیاسی سربلندی حاصل کریں۔

۵- فروری ۱۹۳۸ء کو مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کی یونین میں تقریر کرتے ہوئے قائداعظم نے کہا: "ہندوستان میں ہماری سیاسی تربیت مغربی جمہوریت کے اصولوں کے ماتحت ہوئی ہے یہ دستور جو ہم پر مسلط کیا گیا ہے، کم و بیش برطانوی طرز اصول پر مرتب کیا گیا ہے، لیکن اس ملک میں اور برطانوی مملکت میں اہم بنیادی فرق ہے

برطانیہ میں اکثریت کی جماعتیں تغیر پذیر رہتی رہتی ہیں، ان کی صورت و سیرت، ان کی ہیئت اور کیفیت ان کی قوت و طاقت آئے دن بدلتی رہتی ہے، آج اگر وہاں کنزرویٹیو پارٹی برسر حکومت ہے تو کل لبرل جماعت سریر آرائے حکومت ہے اور پرسوں قلمدان وزارت مزدور جماعت کے ہاتھ میں آگیا، لیکن ہندوستان کی صورت حالات بالکل برعکس ہے۔

یہاں ایک مستقل ہندو اکثریت ہے۔ اور باقی جو ہیں وہ اقلیت ہیں۔ جو کسی ممکن اور قابلِ قیاس زمانہ میں اکثریت نہیں بن سکتیں"۔

وہاں روایات کا اختلاف نہیں ہے، اس لیے وہاں سیاسی جماعتیں مذہبی بنیاد پر نہیں بنیں، اور ہندوستان میں یہ اختلاف بدرجہ اتم موجود ہے لہٰذا یہاں کی سیاسی جماعتیں مذہبی بنیاد پر بنتی ہیں۔ اور مذہب ایسی چیز ہے کہ ہندو ہندو کی طرف اور مسلمان مسلمان کی طرف بہرحال جھکے گا۔ ہندو اکثریت ہی میں رہیں گے اور مسلمان اقلیت ہی میں رہیں گے۔ اور یہ اکثریت و اقلیت دائمی ہوگی لہٰذا مغربی جمہوریت کے فروغ دینے کا اس ملک میں مطلب یہ ہوا کہ ہندو اکثریت کی غلامی میں مسلم اقلیت دے دی جائے۔ مسلمان اسے کسی طرح منظور نہیں کر سکتے، پھر کیا ہو؟ یہ سوال اب قائدِ اعظم کے دماغ میں گردش کرنے لگا تھا،

کانگرس کی اُردو کشی

کانگرس نے تختِ حکومت پر بیٹھتے ہی مسلمانوں کے ساتھ وہی سلوک شروع کر دیا۔ جو ایک فاتح ایک مفتوح کے ساتھ کرتا ہے، سب سے پہلا حملہ اردو زبان پر ہوا جو ہندو مسلم اتحاد کی بہترین یادگار تھی۔ اس کے بارے میں گاندھی جی نے فرمایا:۔

"اُردو مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے قرآنی حروف میں لکھی جاتی ہے مسلمان بادشاہوں نے اسے اپنے زمانۂ حکومت میں بنایا اور پھیلایا"۔

حالانکہ اُردو، ہندی زبان سے کتنی متاثر ہے۔ اس کا اندازہ ایک ہندو رسالہ زمانہ (کانپور) کے ان اعداد و شمار سے ہو سکتا ہے:۔

"اُردو کے مشہور مستند لغت فرہنگ آصفیہ میں کل لفظ ۵۴ ہزار ہیں۔

ان میں سے ہندی ۳۹ ہزار ہیں — ان میں سے عربی ۷ ہزار چھ سو ہیں
ان میں سے فارسی ۶ ہزار چار سو ہیں — ان میں سے سنسکرت ۵۰۰ ہیں
ان میں سے انگریزی وغیرہ ۲ سو ہیں"۔

کانگرس کا مسلمانوں کی تعلیم پر حملہ

اپنے دورِ حکومت میں کانگرس نے ایک واردھا اسکیم بنائی، یہ تعلیمی اسکیم تھی، اور اسلامی روح کے قطعاً منافی۔ اس اسکیم کی رو سے لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط تعلیم رائج کی گئی تھی، موسیقی تعلیم کا لازمی جزو تھا، عدم تشدد کو دنیا کے بہترین عقیدہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا تھا، ظاہر ہے ان اصولوں میں سے کوئی اصول بھی ایسا نہ تھا جو اسلام کے اصولوں سے ٹکراتا نہ ہو، اسلام لڑکوں اور لڑکیوں کے اشتراک و اختلاط کو قطعاً جائز نہیں رکھتا، موسیقی اسلام میں حرام ہے، جس قوم کو یداللہ علیؑ ابن طالب، سیف اللہ خالد بن ولید اور سردار جوانان اہل جنت حضرات حسنین علیہما السلام پر ناز ہو، وہ عدم تشدد کو بہترین اور برتر عقیدہ کی حیثیت سے ہرگز قبول نہیں کر سکتے مذاہب عالم کی "مشترک سچائی" اب سابق مذاہب میں موجود نہیں ہے، پھر ایک مسلمان "مشترک سچائی" کا اصول مان کر تمام مذاہب عالم پر مہر تصدیق کس طرح ثبت کر سکتا ہے؟ مسلمانوں نے اس اسکیم کے خلاف احتجاج کیا، جلسے کیے، جلوس نکالے مظاہرے کیے لیکن کانگرس حکومت ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اور سی پی میں اس اسکیم کی ابتدا کی اور "ودیا مندر اسکیم" کو عملی جامہ پہنا دیا،

کانگرس کی زیادتیاں

دسمبر ۱۹۳۸ء میں مسلم لیگ کا ایک اہم اور شاندار اجلاس پٹنہ میں قائد اعظم کی زیر صدارت منعقد ہوا، صدر مجلس استقبالیہ عزیز ملت سید عبدالعزیز بیرسٹرایٹ لا تھے۔ بہار میں بھی مسلمانوں پر سی پی کی طرح مظالم توڑے جا رہے تھے۔ اس اجلاس میں ایک تجویز منظور ہوئی کہ بہار میں بھی اگر حالات سازگار نہ ہوں تو مرکزی مسلم لیگ کی اجازت سے سول نافرمانی شروع کی جا سکتی ہے۔

اپنے خطبہ استقبالیہ میں سید عبدالعزیز صاحب نے کانگرسی دورِ حکومت پر ایک سرسری نظر ڈالی ہے۔ اس کا کچھ حصہ اگر پیش نظر رہے تو اچھا ہے:۔

وہ بندے ماترم کو قومی ترانہ قرار دے کر مسلمانوں کو بالعموم اور مسلمان طلباء کو بالخصوص کانگریس حکومت اور اس کے ناعاقبت اندیش ہواخواہوں نے بے حد صدمہ اور رنج پہنچایا ہے۔ اس نغمہ میں بت پرستی کا تخیل اور اس کی تصنیف مسلمانوں سے منافرت پر مبنی ہے۔

قربانی کے مسئلہ میں رسم و رواج کی ایسی قید لگائی جا رہی ہے کہ مسلمان اپنے فرائض کو برت نہیں سکتا۔ چونکہ یہاں قربانی عام طور سے گھروں کے اندر کی جاتی ہے اور اگر چوکیدار کو اسکی اطلاع بھی ہوئی تو عام طور پر ہندو چوکیدار اور ہندو پولیس افسران کے باعث بہت سے علاقوں کی قربانیوں کا اندراج تھانہ کے رجسٹر میں نہیں ہوتا اور پولیس کی مصلحت بھی زیادہ تر یہی ہے کہ کم سے کم جگہوں کے متعلق قربانیوں کا اندراج ہو۔"

فضل الحق کی فہرست

مسٹر فضل الحق وزیر اعظم بنگال نے بھی ایک بیان میں کانگرس کی دراز دستیوں کا راز فاش کیا تھا

"کانگرسی وزارتوں نے عہدے سنبھالنے کے ساتھ ہی بعض انوکھی حرکتیں کیں۔ انہوں نے مقامی حکام کے نام تحریری اور زبانی ہدایات جاری کر دیں کہ اہم معاملات میں وہ اپنے ہاں کی کانگرس کمیٹی کے عہدیداروں سے مشورہ حاصل کر لیا کریں۔ انہوں نے احکام جاری کیے کہ پبلک عمارتوں اسکولوں اور دوسرے مقامات پر کانگرسی جھنڈے نصب کیے جائیں۔ ان کے منصوبے کیا تھے؟ مختصراً یہ کہ:۔

۱۔ گئو ماتا کی بہر صورت رکھشا ہونی چاہیئے۔ اسی بنا پر مدنا پور، بلیا اور دیگر مقامات میں قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا گیا۔

۲۔ مسلمانوں کو گائے کا گوشت کھانے کی اجازت نہ دینی چاہیئے چنانچہ اس مقصد کو سامنے رکھ کر تلوکری میں وحشیانہ اور انسانیت سوز مظالم کئے گئے اور اسی طرح دوسرے کثیر التعداد مقامات پر خوں ریزیاں روا رکھی گئیں۔ جن کی حقیقت سے کسی کو انکار کی جرأت نہیں ہو سکتی۔

۳۔ مسلمانوں کے مذہب کو پامال کر دینا چاہیئے۔ کیونکہ یہ دیس ہندوؤں کا ہے، اس منصوبے کو پورا کرنے کے لیے اذانیں روک گئیں۔ مساجد میں نمازیوں پر حملے

کئے گئے۔ نماز کے اوقات میں مسجدوں کے سامنے شور و غوغا کرتے ہوئے باجے کے ساتھ فاتحانہ انداز میں جلوس گزارے گئے۔ بقر عید کے موقعوں پر گائے کی قربانی کو جبریہ روکا گیا۔ اور مسلمانوں کے قبرستانوں مسجدوں اور دوسرے مقدس و محترم مقامات کی بے حرمتی کی گئی۔"

ایک ہندو کی شہادت پنڈت راوی شنکر شکلا وزیر اعظم سی پی نے ایک پبلک بیان میں ان الزامات کو "جھوٹ کا ہمالیہ" قرار دیا،

مسٹر شکلا کے اس بیان کا جواب ان کے پیش رو ڈاکٹر کھرے سابق کانگرسی وزیر اعظم سی پی نے دیا، جو مرہٹہ اخبار "ہتواد" ناگپور میں مورخہ ۲۲ دسمبر ۱۹۳۹ء کو شائع ہوا جو حسب ذیل ہے۔

"مجھے پنڈت شکلا کا وہ بیان جو جبل پور سے ایسوسی ایٹڈ پریس کے ذریعہ اشاعت پذیر ہوا ہے۔ اور جس میں مسٹر فضل الحق وزیر اعظم بنگال کے فرد الزامات کو جھوٹ کا ہمالہ کہا گیا ہے، دیکھ کر تعجب ہوا، اگر پنڈت شکلا کا یہ بیان شائع نہ ہوا ہوتا تو میں اس معاملہ کا تذکرہ پریس کے ذریعہ نہ کرتا۔ اس کے علاوہ یہ بھی مناسب نہیں ہوگا کہ اگر اس موقع پر میں واقعات کو جس طرح کہ مجھے معلوم ہیں۔ پبلک کے سامنے نہ لے آؤں۔ میں نے پہلے بھی کہا ہے اور اب پھر کہتا ہوں کہ وزارت قبول کرنے کے پندرہ روز کے اندر ہی میرے اس وقت کے رفیق کار مسٹر نیاز احمد خاں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کا جو اس وقت جبل پور میں تعینات تھے۔ تبادلہ کر دیا جائے۔ بلا کسی ظاہری سبب کے مسٹر مصرا کی اس درخواست کا صرف ایک ہی سبب، میں سمجھ سکا۔ وہ یہ تھا کہ مسٹر نیاز احمد خاں نے مشہور مقدمہ حسینہ کے اغوا کی تفتیش کی تھی۔ یہ مسلمان افسر کو ایذا پہنچانے کی مثال نمبر ایک ہے۔ میرے بعض مہاکوشلی رفیق یہ چاہتے تھے کہ میں مسٹر انعام الرحیم آئی سی ایس کو جو اس وقت بعہدہ ڈپٹی کمشنر ایوب محل میں تعینات تھے۔ اور جو اس صوبہ میں واحد مسلم آئی سی ایس افسر تھے، مستقل نہ کروں، یہ مسلمان افسر کو ایذا پہنچانے کی دوسری مثال ہے۔ اگرچہ میں نے اپنے رفقائے کار کے ان ارشادات کی

تعمیل نہیں کی، کیونکہ میں سب کے ساتھ یکساں سلوک کرنے کا خواہشمند تھا۔

ایک اور مثال مسٹر شریف کا مشہور معاملہ ہے۔ اس معاملہ میں مسٹر شریف سے جو اس وقت وزیر تھے، بعض قیدیوں کو جن میں چند مسلمان بھی تھے، میعاد سے پہلے رہا کر دینے پر سخت بازپرس کی گئی تھی۔ شریف صاحب کے معافی مانگنے پر کانگریس اسمبلی پارٹی نے اپنے ایک جلسہ میں مسٹر شریف کی اس حرکت سے درگزر کر دیا تھا۔ لیکن ہائی کمان اور کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اسمبلی پارٹی کی تجویز نظرانداز کرتے ہوئے ایک ٹربیونل مقرر کر دیا، کہ یہ شریف کے معاملہ کی تحقیقات کرے اور انجام کار شریف صاحب کو نکال باہر کیا۔

ایک بالکل اسی قسم کا معاملہ جس کا تعلق مسٹر مصرا کے خلاف تحریری شکایت سے ہے، لیکن ہائی کمان نے مسٹر مصرا کے حق میں یک طرفہ فیصلہ دے دیا اور شکایت کرنے والوں سے کوئی جواب طلب کرنے کے بغیر ان سے کہا کہ وہ مسٹر مصرا سے معافی مانگیں۔ اپنی ان حرکتوں سے کانگریس ورکنگ کمیٹی اور ہائی کمان نے مسلمانوں کو اس کا موقع دیا کہ وہ ایک ہی قسم کے دو واقعات میں امتیازی سلوک پر معترض ہوں کیونکہ مسٹر شریف مسلمان ہیں اور مسٹر مصرا ہندو، ان کے علاوہ مشہور پان والا واقعہ بھی ہے، جس میں وزیر قانون نے ایک مسلمان کے ہندو قاتل کو رہا کر دیا، لیکن ہائی کمان نے اس طرف کوئی توجہ نہیں کی حالانکہ مسٹر شریف کے معاملہ میں بہت شور اُٹھایا گیا اس لیے کوئی تعجب کی بات نہیں اگر اس معاملہ میں مسلمانوں نے ہائی کمان پر جانبداری کا الزام لگایا کیونکہ جس وزیر نے یہ حرکت کی وہ ہندو ہے۔

میں ہر کمیٹی یا کمیشن کے سامنے اس سلسلہ میں جو کچھ جانتا ہوں بیان کرنے کے لیے تیار ہوں۔

پیرپور رپورٹ

۲۰- مارچ ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے کانگرسی حکومتوں کے ظلم و ستم کی تاریخ مرتب کرنے، حالات جمع کرنے، واقعات فراہم کرنے اور معلومات مرتب کرنے کے لیے راجہ سید محمد مہدی (آف پیرپور) کی صدارت میں ایک مجلس تحقیقات مرتب کی۔

تقریباً آٹھ مہینے تک ملک کا دورہ کرنے، کانگرسی صوبوں کے حالات فراہم کرنے، واقعات کی چھان بین کرنے کے بعد، ۱۵- نومبر ۱۹۳۹ء کو کمیٹی نے اپنی رپورٹ مسلم لیگ کے سامنے پیش کر دی۔ (اب یہ رپورٹ مسلم لیگ کی طرف سے انگریزی زبان میں شائع ہو چکی ہے) اس رپورٹ کے مدلل واقعات سے بھی کانگرس ہائی کمان متاثر نہیں ہوئی، وہ اپنے ظلم و ستم کی روش پر قائم رہی۔

اکیسویں منزل

مُسلم لیگ کی جدّوجُہد

کے مصنفین نے بھی فرقہ داری کے اس اعلیٰ پہلو کے فوائد کو تسلیم کیا ہے سندھ کی علیحدگی پر بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ وسیع قومی نقطہ نگاہ سے یہ کہنا کہ کہ فرقہ دارانہ صوبے نہیں بنانے چاہئیں، ایک لحاظ سے یہ کہنے کے مترادف ہے۔ کہ وسیع بین الاقوامی نقطہ نگاہ سے الگ الگ قومیں بھی نہیں ہونی چاہئیں ان دونوں بیانات میں کچھ صداقت تو ہے لیکن بین الاقوامیت کے بڑے سے بڑے داعی کو بھی اس امر کا اعتراف ہے۔ کہ کامل قومی وخود اختیاری کے بغیر ایک بین الاقوامی ریاست کی تشکیل امر محال ہے اسی طرح کامل ثقافتی خود اختیاری اور اعلیٰ قسم کی فرقہ داری کے بغیر ایک متحدہ قومیت کی تعمیر مشکل ہوگی۔

جب کہ ہندوستان کے ہندوؤں میں بھی پورے طور پر یک رنگی نہیں۔ پائی جاتی تو فرقہ دارانہ طبقات کو تسلیم کیے بغیر ہندوستان میں فرنگی جمہوریت کا نفاذ درست قرار نہیں دیا۔ جا سکتا، مسلمانوں کا اسلامی ہند کی تشکیل کا مطالبہ کاملاً صحیح ہے۔ میری تمنا ہے۔ کہ پنجاب شمال مغربی سرحدی صوبہ سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک سلطنت کے قیام کی کوشش کرنی چاہیے۔ حکومت خود اختیاری خواہ وہ سلطنت برطانیہ کے اندر رہ کر لے یا اس سے باہر ہندی مسلمانوں کے لئے مذکورہ بالا متحدہ سلطنت کی تعمیر مسلمانوں کا مقصد اعلیٰ ہونا چاہیے۔ ہندوستان دنیا میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس تقسیم سے مسلمانوں کا احساس ذمہ داری وحب وطن مزید ترقی کرے گا۔ اور شمال مغربی ہند کے مسلمان ہندوستان کو بیرونی حملوں سے بچانے کے لئے بہترین مدافعی فوج ثابت ہوں گے خواہ یہ حملے خیالات کے ہوں یا سنگینوں کے اگر آزاد نیپال کے ۱۹ ہزار گورکھے جو فوج میں بھرتی کیے جاتے ہیں منہا کر دیے جائیں۔ تو ہندوستانی فوج میں ۶۲ فی صدی پنجابی ہیں۔ اسمیں سرحدی اور بلوچی سپاہی شامل ہیں۔ جن کی تعداد تقریباً چھ ہزار ہے۔ اس سے آپ شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کی مدافعانہ

قوت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اس بارے میں آنریبل مسٹر شاستری نے اپنے شبہات کا اظہار کیا ہے۔ میں انہیں واضح طور پر بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسلمان صرف آزادانہ ترقی کرنا چاہتے ہیں، جو کہ وجدانی طرز حکومت کے ماتحت تقریباً ناممکن ہے۔ اور قوم پرست ہندو سیاستین اسی طرز حکومت کے شیدا ہیں تاکہ سارے ہندوستان پر ان کا مستقل غلبہ قائم رہے۔"

پاکستان کا تمسخر شروع میں یہ تجویز اتنی ناممکن العمل نظر آتی تھی کہ خود مسلمان اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ لیکن صوبوں میں ہندو سامراج کا دور حکومت دیکھنے کے بعد مسلمانوں کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہا۔

قائد اعظم کا ظہور مسٹر جناح نے پریکٹس ترک کر کے اور گوشہ نشینی کو الوداع کہہ کر مسلمانان ہند کی قیادت کا بار گراں اپنے دوش ناتواں پر اٹھا لیا تھا۔ مسلمانانِ ہند پروانہ وار اُن کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ ان کے منہ سے نکلا ہوا ایک لفظ ساری قوم کے لئے فرمان کی حیثیت رکھتا تھا۔ قائد اعظمؒ نے پاکستان کے مطالبہ کو قومی مطالبہ بنا دیا۔ اور بہت جلد بھارت کے طول و عرض میں اسی مطالبہ کی گونج سُنائی دینے لگی۔

تجویز پاکستان ۲۲۔ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں قائد اعظم کی زیر صدارت مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا، اس اجلاس میں قائد اعظم کے ایماء سے مسٹر فضل الحق نے حسب ذیل تجویز پیش کی۔

۱۔ کل ہند مسلم لیگ کا یہ اجلاس دستوری معاملات کی نسبت، لیگ کونسل اور مجلس عاملہ کی کارروائی کی جوان تجاویز مورخہ ۲۷ اگست ۱۷-۱۸ اور ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۹ء اور ۳، فروری ۱۹۴۰ء سے ظاہر ہے، توثیق کرتے ہوئے پوری شدت کے ساتھ اس امر کا اعادہ کرتا ہے۔ کہ وفاقی اسکیم جس کی، دستور ہند بابت ۱۹۳۵ء میں تشریح کی گئی ہے۔ اس ملک کے حالات کے اعتبار سے قطعاً ناموزوں اور ناقابلِ عمل ہے۔ اور مسلم ہندوستان کے لئے کسی طرح قابل قبول نہیں۔

۲۔ ملک معظم کی حکومت کی جانب سے وائسرائے بہادر کے اعلان مورخہ ۱۸ اکتوبر

۱۹۳۹ء کی نسبت یہ اجلاس اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کرتا ہے کہ حکومت ہند کے دستور بابت ۱۹۳۵ء کا جہاں تک تعلق ہے۔ اس اعلان کے ذریعہ یقین دلایا گیا ہے کہ مختلف جماعتوں، فرقوں اور مفادات سے مشورہ کے بعد دستور پر نظر ثانی کی جائے گی مسلم ہندوستان اس وقت تک مطمئن نہ ہو سکے گا جبتک کہ پورے دستوری خاکہ پر از سر نو غور نہ کیا جائے تا وقتیکہ اس کی بابت مسلمانوں کی رضامندی اور توثیق حاصل نہ ہو جائے کوئی غور کردہ خاکہ قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ نیز یہ قرار پایا کہ کل ہند مسلم لیگ کے اس اجلاس کی یہ غور کردہ رائے ہے کہ کوئی دستوری خاکہ اس ملک میں قابل عمل یا مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہ ہوگا جبتک کہ وہ مندرجہ ذیل بنیادی اصول کے تحت مرتب کیا گیا ہو۔

جغرافیائی حیثیت سے متصل ارضی وحدتوں کے مابین حدود قائم کر کے ان کو جداگانہ علاقوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ لیکن جیسا کہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ان رقبہ جات میں جہاں بلحاظ تعداد مسلمان اکثریت میں ہیں مثلاً شمال مغربی اور ہندوستان کے مشرقی علاقوں کو آزاد ریاستوں کی حیثیت سے ایک دوسرے سے اس طرح متحد کرنا چاہیے کہ ان میں سے ہر ایک وحدت خود مختار ہو۔

ان آزاد علاقوں اور خود مختار وحدتوں کے دستور میں اقلیتوں اور ان کے مذہبی، ثقافتی، معاشی، سیاسی، انتظامی اور دیگر حقوق و مفادات کی حفاظت کے لئے ان ہی کی مشورت سے معین اور موثر تحفظات مہیا کرنے چاہئیں۔ ہندوستان کے دیگر علاقوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں دستور میں ان کے لئے مذہبی، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی انتظامی اور دیگر حقوق و مفادات کی خود ان کے مشورت کے ذریعہ حفاظت ہو سکے۔

یہ اجلاس مجلس کو اختیار دیتا ہے کہ مذکورہ صدر بنیادی اصول کے بموجب ایسی دستوری اسکیم مرتب کرے جس میں ان مختلف مجوزہ ریاستوں کو سارے

مسائل مثلاً دفاع، خارجی معاملات، رسل و رسائل، چنگی اور دیگر ضروری امور کا اختیار دیا گیا ہو۔"

کانگرس کی شدید مخالفت کانگرس نے شدت کے ساتھ اس مطالبہ کی مخالفت کی مسلمانوں کے ایک طبقہ نے بھی مخالفت میں اپنی ساری صلاحیتیں صرف کر دیں۔ لیکن قائداعظم کی آواز کو کوئی دبا نہ سکا۔ دسمبر ۱۹۴۱ء میں ایک بیان کے سلسلہ میں قائداعظم نے فرمایا۔

"ہندوستان میں جو اختلافات یہاں کی دو بڑی قوموں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان موجود ہیں، وہ ان اختلافات سے ہزار گنا زیادہ ہیں جو یورپ کی مختلف اقوام کے درمیان پائے جاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے۔ کہ یہاں نسل، مذہب، زبان اور تہذیب کے اعتبار سے جتنا تنوع اور اختلاف ہے۔ اتنا دنیا کے کسی حصہ میں بھی نہیں ہے۔ مگر خوش قسمتی سے مسلمانوں کے وطنی علاقے شمال مغرب اور شمال مشرق میں الگ واقع ہوئے ہیں۔ اور ان علاقوں میں مسلمانوں کی ٹھوس اکثریت موجود ہے۔ جو سات کروڑ نفوس پر مشتمل ہے۔ مسلمانوں کی خواہش یہ ہے کہ ان علاقوں کو بقیہ ہندوستان سے الگ کر کے انہیں آزاد اور خود مختار ریاستوں کی حیثیت دے دی جائے۔ مسلمان نہایت غیر مبہم طور پر اس کے خواہاں ہیں کہ اس نیم برّاعظم میں وہ خود بھی آزاد ہوں اور ہندو اور ہندوانڈیا بھی آزاد ہو۔ برخلاف اس کے ہندوؤں کی تمام چالیں اور تجویزیں اور ان کی پیش کی ہوئی تمام اسکیموں کی بنیاد اس منصوبہ پر ہوتی ہے کہ سارے ہندوستان پر ہندو راج مستولی کر کے دس کروڑ مسلمانوں کو اس کے ماتحت غلام رکھا جائے جس کے معنی یہ ہوئے کہ مسلمان محض برطانیہ کا طوق غلامی اُتار کر ہندوؤں کا طوقِ غلامی پہن لیں۔ خواہ صریح ناواقفیت کی بناء پر ہو یا غیر ممالک کی رائے عامہ کو اپنی موافقت میں گمراہ کرنے کی غرض سے آج کل یہ کہا جاتا ہے۔ کہ ہندوستان کا معاملہ چین، سوویٹ روس بلکہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے حالات کے متوازی ہے۔ اور ان ممالک کے

باشندوں نے جو تجربات حاصل کیئے ہیں۔ ان کی روشنی میں یہاں کے مسائل بھی حل کیئے جا سکتے ہیں۔ اگر کوئی ذی فہم انسان اس دعوے کا سرسری جائزہ بھی لینے کی زحمت کرے تو وہ یقیناً اس نتیجہ پر پہنچے گا۔ کہ ہندوستان اور ان کے ممالک کے مسائل کا تقابل صریحاً لایعنی اور گمراہ کن ہے۔

ہندوستان ایک قومی اسٹیٹ نہیں ہے، نہ ایک ملک ہے۔ بلکہ ایک نیم براعظم ہے۔ جس میں متعدد قومیتیں ہیں۔ منجملہ ان کے ہندو اور مسلمانوں کی دو بڑی بڑی قومیں ہیں۔ جن کے تہذیب و تمدن زبان و ادب فنِ تعمیر اسم و اصطلاحات، معیار قدر و تناسب اصول و قوانین ضوابط و اخلاق و معاشرت رسم و رواج، نظام، تقویم، تاریخ و روایات، رجحانات و عزائم نظریۂ حیات، غرض تمام چیزیں۔ ایک دوسرے سے صریحاً مختلف ہیں بلکہ بعض حیثیتوں سے ایک دوسرے کے یکسر مخالف و متضاد ہیں۔"

قائدِ اعظم کی ان تصریحات سے بآسانی اندازہ ہو جاتا ہے۔ کہ پاکستان کے محرکات و عوامل کیا ہیں؟

تخریب میں تعمیر کا پہلو پاکستان کو روکنے کی جتنی کوششیں ہو رہی تھیں بالآخر وہ پاکستان کے راستہ میں اور زیادہ سازگار ہو جاتی تھیں۔

۱۔ دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹ء-۱۹۴۵ء) کے دوران میں کانگرس حکومت سے لڑتی رہی صلح کی شرط صرف یہ رکھی کہ مسلم لیگ نظرانداز کر دی جائے پاکستان کا مطالبہ نہ مانا جائے،

۲۔ بہت سے مسلمانوں کو بھی کانگرس نے اپنا تابع بنا رکھا تھا یہ ہر وقت کانگرس کی رہنمائی کرتے رہتے تھے۔

۳۔ جب یہ مطالبہ زور پکڑتا گیا تو منظم طور پر فسادات شروع کیئے گئے لیکن اس نے کانگرس کا کیس اور کمزور کر دیا۔

۴۔ کابینۂ وفد (۱۹۴۶ء) نے ایک تجویز مفاہمت پیش کی، مسلم لیگ نے مان لیا۔ کانگرس نے تسلیم نہیں کیا، اس تجویز کی رُو سے ہندوستان کی وحدت قائم رہ سکتی تھی۔ اس رُو سے

پاکستان کو اور یقینی بنا دیا۔
(۵) عبوری حکومت میں (۱۹۴۶ء) کانگرس سارے ہندوستان کی مالک بن گئی لیکن
اس کے باوجود،
الف۔ بہار میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا، اور کانگرس اسے نہ روک سکی
ب۔ گڑھ مکتیشر میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ کانگرس کوئی تلافی نہ کر سکی۔
ج۔ کلکتہ بمبئی اور دوسرے مقامات پر خوں ریز فسادات ہوئے کانگرس نے کچھ نہ کیا
ان سب واقعات سے مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچا لیکن پاکستان کا راستہ صاف ہوتا گیا ضروری ہے۔ کہ ان فسادات کا سرسری جائزہ لے لیا جائے۔
اب ہندوستان دہکتا ہوا۔ کوہ آتش فشاں بن گیا۔ جس کا کھولتا ہوا۔ لاوا ہری بھری کھیتیوں اور خوش و خرم انسانوں کو جھلسانے لگا۔
بمبئی اور کلکتہ میں فساد کی آگ بھڑک رہی تھی۔ کہ بینی آباد —

بینی آباد کا فساد صوبہ بہار کا ایک قصبہ — میں عجیب و غریب قسم کا ہندو مسلم فساد ہوا۔ اور یہی سارے ہندوستان کی فساد آرائیوں اور ہنگامہ خیزیوں کا سبب بنا
یہ فساد کلکتہ کے حوادث سے متاثر ہو کر کیا گیا۔ اور اس کے سبب سے نادر اور عجیب و غریب خصوصیت یہ تھی۔ کہ اس میں چن چن کے نیشنلسٹ مسلمان بھی قتل کیئے گئے وہ مسلمان جن کی ساری زندگی کانگرس کی خدمت کرتے اور کانگرس کے لئے اپنی قوم سے لڑتے گزری تھی۔
فساد اشتعال کی گرم بازاری میں نادان اور ناسمجھ کوتاہ اندیش اور نافہم عوام عقل و ہوش کھو بیٹھتے ہیں۔ دوست دشمن کی تمیز نہیں کر پاتے اور جو سامنے آجاتا ہے اسے بے دریغ ہلاک کر دیتے ہیں۔
بینی آباد کے کانگریسی کارکن حافظ محمد شفیع کو اپنی کانگریسیت پر اس درجہ اعتماد تھا۔ کہ انہوں نے پولیس کو واپس کر دیا۔ اور کہہ دیا کہ ہم یہاں فساد نہیں ہونے دیں گے لیکن فساد ہوا، اور اس فساد میں سب سے پہلے جو شخص اپنے دوستوں کے ہاتھوں قتل

ہوا وہ حافظ صاحب مرحوم تھے۔ ان کے والد بزرگوار تھے، اور ان کا فرزند سعادت مند تھا، جب حافظ محمد شفیع مرحوم کا یہ حشر ہوا۔ تو ان سے مخالف نقطۂ نظر رکھنے والوں کا جو انجام ہوا ہوگا۔ اس کا اندازہ لگا لینا کچھ دشوار نہیں ہے۔

نواکھالی کا خونین ڈرامہ متعدی مرض کی طرح کلکتہ کا فساد سارے ہندوستان میں پھیلنے لگا۔ بینی آباد کی خبریں بنگال میں اور خاص کر مشرقی بنگال میں پہنچیں۔ جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ یہاں کلکتہ کی خبروں سے کافی اشتعال تھا۔ بینی آباد کی خبروں نے آگ پر تیل کا کام کیا۔

اور دفعۃً ایک روز اخبارات میں مشرقی بنگال کی دلدوز اور جگر خراش خبریں چھپنے لگیں۔ نواکھالی کے فساد میں۔ اگرچہ جانی نقصان بہت زیادہ نہیں ہوا۔ لیکن دہشت اور سراسیمگی بہت زیادہ پھیل گئی نتیجہ یہ ہوا کہ ایک فرقہ کے لوگ دوسرے فرقہ کی تعدی اور ظلم کی فریاد لے کر بہار کی طرف اور کلکتہ کی طرف بھاگنے لگے۔

نواکھالی کے فساد میں انسانیت روپوش ہوگئی تھی۔ کتنی ہی کم مقدار میں سہی لیکن یہاں بھی بیباکی سے خدا کے خوف سے بے نیاز ہو کر اور مذہب کو پس پشت ڈال کر ایک فرقہ کے لوگوں کو مارا۔ قتل کیا۔ اغوا کیا جبری تبدیل مذہب کے بھی بعض واقعات ہوئے لوٹ مار کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ گویا نواکھالی میں انسان نہیں رہتے درندے رہتے ہیں۔ جو ایک دوسرے کو بھنبھوڑ رہے ہیں۔ نوچ رہے ہیں کاٹ رہے ہیں۔ کھا رہے ہیں کچھ واقعہ تھا۔ اور بڑی حد تک مبالغہ۔ اخبارات کے پروپیگنڈے نے واقعہ کو دبا دیا اور مبالغہ کو حقیقت بنا دیا۔ دنیا نواکھالی پر نفریں بھیجنے لگی۔

مسلمانوں کا قتل عام نواکھالی کی خبریں پوری مبالغہ آفرینی اور حاشیہ آرائی کے ساتھ ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلائی جا رہی تھیں۔ دوسرے مقامات دور تھے۔ اس لئے ان پر اثر بعد میں لیکن دیر میں ہوا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہار پڑوس میں تھا۔ اس لئے وہاں لوگوں پر فوری اثر ہوا۔ اور ایسا اشتعال پھیلا کہ اس کا روکنا حکومت کے بس کی بات نہیں رہی۔

اس ٹریجڈی کا سب سے الم انگیز پہلو یہ تھا۔ کہ بہار کی اشتعال انگیزی اور ہنگامہ آرائی میں ایسے لوگ بھی شریک تھے۔ جو اپنے تئیں کانگریسی کہتے تھے۔

بہار میں نہایت جوش و خروش کے ساتھ۔ ار یوم نواکھالی، منایا گیا، اور اس جوش و خروش کا انجام یہ ہوا۔ کہ وہاں بے گناہوں اور بے قصوروں کا قتل عام شروع ہو گیا، بہار میں جس وسیع پیمانہ پر دیہات کے دیہات جلا دیئے گئے اور وہاں کے رہنے والوں کو جس بیدردی کے ساتھ موت کے گھاٹ اُتارا گیا، اس کا ثبوت لاشوں سے بھرے ہوئے وہ کنوئیں ہیں جنہیں خان عبدالغفار خاں نے اپنی چشم اشکبار کے ساتھ ملاحظہ فرمایا اور وہ اعلان ہے جس میں خود گاندھی جی نے اعتراف کیا کہ بہار میں ایک فرقہ نے دوسرے فرقہ کا قتل عام جس بیدردی اور شقاوت کے ساتھ وسیع پیمانہ پر کیا نواکھالی کے افسوس ناک حوادث کو اس سے کوئی نسبت نہیں ہے۔

مسلم لیگ کا مطالبہ

یہ قتل عام، یہ سفاکی، یہ درندگی، یہ بہیمیت دیکھ کر بہار کے مسلمان ہزاروں کی تعداد میں پناہ گزین کی حیثیت سے بنگال پہنچے، سندھ گئے، پنجاب میں بس گئے۔ ہزاروں مسلمان دیہاتوں سے بھاگ کر شہر پہنچے، اور پناہ گزینوں کے کیمپ میں مقیم ہو گئے۔

مسلم لیگ کی طرف سے اس سلسلہ میں تین مطالبے پیش کیے گئے:۔

۱۔ بہار کے فساد کی آزادانہ اور غیر جانبدارانہ تحقیقات کرائی جائے اور جو لوگ ملزم ثابت ہوں، انہیں پوری پوری سزا دی جائے جو لڑکیاں اغوا کی گئیں ہیں۔ ان کا سراغ لگایا جائے، اور جن کا مذہب جبراً تبدیل کیا گیا ہے۔ انہیں واپس لایا جائے۔

۲۔ حکومت اپنی ذمہ داری پر تبادلۂ آبادی کی اسکیم پر عمل در آمد کرے اور مہاجرین کو بنگال میں یا جہاں وہ پسند کریں پہنچا دیا جائے۔

۳۔ یا کم از کم یہ کرے کہ صوبہ میں مسلمانوں کے تین چار مراکز قائم کرے اور صوبہ کی بکھری ہوئی اور منتشر مسلم آبادی کو ان مراکز میں جمع کر دے، تاکہ آئندہ اس طرح کے خونریز حملے ان پر نہ ہو سکیں؟

حکومت بہار نے ان میں سے کسی مطالبہ کو بھی عملی جامہ نہیں پہنایا۔ اب تک تحقیقاتی عدالت قائم نہیں ہوئی ہے۔ اور مسلم منطقہ قائم کرنے کی تجویز تو قابلِ غور بھی نہیں سمجھی گئی

گڈھ مکٹیشر میں مسلمانوں کی ہلاکت

ادھر تو بہار میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ ادھر بنگال کے پڑوسی صوبہ بہار کی آگ، بہار کے پڑوسی صوبہ یوپی میں پھیل رہی تھی، وہاں یوم نواکھالی تو کچھ زیادہ شد و مد کے ساتھ نہیں منایا گیا۔ لیکن یوم نواکھالی کے خفیہ پروگرام پر علانیہ عمل درآمد بڑی کامیابی سے ہوا۔

یو۔پی میں گڈھ مکٹیشر ایک چھوٹی سی بستی میرٹھ کے قریب ہے، جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ ہر سال اشنان کے موقع پر بالعموم، اور کمبھ کے میلہ پر بالخصوص یہاں لاکھوں جاتریوں کا اجتماع ہوتا ہے۔ اس میلہ میں دہلی، میرٹھ وغیرہ کے مسلمان تاجر، سامان تجارت لیکر پہنچتے ہیں۔ اور خود گڈھ مکٹیشر کے مسلمان بھی اس میں شریک ہوتے ہیں۔ اس سال بھی یہی ہوا

نومبر ۲۶ء میں یہ میلہ ہوا۔ اور لاکھوں کا یہ ہجوم دفعۃً چند سو مسلمانوں پر وحشی درندوں کی طرح ٹوٹ پڑا۔ اس فساد کی خصوصیت یہی تھی۔ کہ اس میں مرد ہی نہیں مارے گئے عورتیں بھی ماری گئیں، ان کی آبروریزی کی گئی، انہیں اغوا کیا گیا۔ انہیں فروخت کر دیا گیا۔

ڈاکٹر ہارون رشید جو محکمہ صحت کے انچارج تھے۔ بیدردی سے قتل کر دیئے گئے ان کی اہلیہ محترمہ کے کپڑے اتار دیئے گئے اور مجمع میں سے کسی ایک شخص کو بحیثیت شوہر منتخب کر لینے کا حکم دیا گیا۔ انھوں نے انکار کیا تو انہیں مارتے مارتے ادموا کر دیا گیا یہ واقعہ دریا کے کنارے پیش آیا تھا۔ ان کی سمجھ میں کچھ اور تو نہ آیا وہ دریا میں کود پڑیں، اور نیم بیہوش حالت میں بہت دور جا کر نکلیں۔ ایک آدمی نے انہیں دیکھ لیا، وہ ان کی بہتی ہوئی لاش کو گھسیٹتا ہوا کنارے لایا، کچھ رمق زندگی کی باقی تھی۔ علاج معالجہ سے اچھی ہو گئیں۔ اب اپنے وطن لاہور میں ہیں۔

گڈھ مکٹیشر کے شہیدوں کی بے گور و کفن لاشیں کئی دن تک شارع عام پر پڑی سڑتی رہیں۔ کوئی ان کی نماز پڑھنے والا، کوئی انہیں دفن کرنے والا بھی نہ تھا۔ آہ!

جو عورتیں اور لڑکیاں اس ہجوم نے اغوا کیں، ان کا آج تک پتہ نہیں چلا، حکومت کی کوششیں اس سلسلہ میں اب تک کامیاب نہیں ہو سکیں۔

گڑھ مکیٹشر کے ہولناک اور مہیب حوادث کی شدت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وزیر اعظم پنت اور ہوم ممبر قدوائی نے ایک مشترک بیان میں اقرار کیا کہ "اس حادثہ نے ہماری گردنیں شرم سے جھکا دی ہیں!"

—— لیکن یہ شرم سے جھکی ہوئی گردنیں مجرموں کا سراغ نہ لگا سکیں انہیں کیفر کردار تک نہ پہنچا سکیں۔ اُن لڑکیوں کو نہ ڈھونڈ سکیں، جو بے حجابی اور بے پردگی کے عالم میں جھوٹے پکڑ پکڑ کر گھسیٹی گئیں اور نہ جانے کہاں پہنچا دی گئیں۔

مرض کی روک تھام اگر شروع میں نہ کی جائے تو وہ سنبھالے سے نہیں سنبھلتا، کلکتہ سے اگر بہار نے اور بہار سے یو، پی نے اور یوپی سے پنجاب نے اور پنجاب سے سرحد نے اگر سبق حاصل کیا ہوتا تو ہرگز اتنے بے گناہوں کا خون پانی کی طرح نہ بہتا، لیکن،

گوش سخن شنو کجا، دیدہ اعتبار کو؟

ہندو جنتا کی اس خوں ریزی اور سفاکی نے پاکستان کو ممکن بنا دیا!

دستور ساز اسمبلی ملک فساد کی آگ میں جل رہا تھا، بنگال سے، بہار سے، یو۔پی سے دردمندوں اور سینہ فگاروں کی آہیں بلند ہو رہی تھیں بیوائیں فریاد کر رہی تھیں۔ یتیم چیخ رہے تھے۔ بربادی آبادی کا مرثیہ پڑھ رہی تھی۔ کنوئیں لاشوں سے پٹے ہوئے تھے۔ سڑکوں پر قطع و برید کی ہوئیں لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ بھگدڑ مچی ہوئی تھی بے بس، اور بے سہارا لوگ افراتفری کے عالم میں دولت چھوڑ کر گھر چھوڑ کر، کپڑے چھوڑ کر اناج چھوڑ کر، بھاگ رہے تھے بے تحاشا بھاگ رہے تھے۔ فاقہ کش حالت میں نیم عریاں حالت میں آہ زاری کرتے ہوئے فریاد و فغاں کرتے ہوئے بلکتے ہوئے روتے ہوتے چیختے ہوئے!

لیکن کانگریس کی طرف سے آگے بڑھنے،، کا کام جاری تھا پیچھے مڑ کر دیکھنے کی اسے فرصت نہ تھی اس کی طرف سے اعلان ہو چکا تھا۔ کہ ۹، دسمبر ۱۹۴۶ء کو دستور ساز اسمبلی کا اجلاس ہوگا۔ ضرور ہوگا۔ خواہ مسلم لیگ اس میں شریک ہو یا شرکت سے انکار کر دے ہم

آگے بڑھ رہے ہیں، ہم رک نہیں سکتے، جو ہمارے ساتھ آ جائے گا۔ وہ آگے بڑھے گا۔ جو پیچھے رہ جائے گا۔ وہ پیچھے رہے گا:۔

مسٹر جناح کا اعلان کامل تین مہینہ تک مسٹر جناح اس کے منتظر رہے کہ اصلاح احوال کی کوشش کانگریس کی طرف سے ہو فساد زدہ لوگوں کے درد کا درماں وہ مہیا کرے۔ ہٹ اور ضد کو چھوڑ کو معقولیت اور رواداری کے راستہ پر آجائے زمرہ بندی کو جو اسٹیٹ پیپر کی بنیادی دفعہ ہے۔ تسلیم کرے، فی الحال دستور ساز اسمبلی کا اجلاس ملتوی کر دے اس وقت جذبات بھڑکے ہوتے ہیں۔ عناد اور مخالفت کی کارفرمائی ہے۔ خوش اعتمادی اور حسن ظن کا کہیں کوسوں پتہ نہیں، ایک دوسرے کو شک اور بدگمانی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ان حالات میں دستور سازی کا کام یکسوئی چاہتا ہے اعتماد چاہتا ہے۔ تعاون چاہتا ہے۔ خوشگوار فضا چاہتا ہے۔ اور اس وقت یہ سب چیزیں ناپید ہیں

لیکن قائد اعظم کی دونوں باتیں رد کر دی گئیں۔ اصلاح احوال کی کوئی کوشش نہیں کی گئی، زمرہ بندی کا اصول تسلیم نہیں کیا گیا، اور دستور ساز اسمبلی کا اجلاس ملتوی نہیں کیا گیا قائد اعظم نے کانگرس سے اپیل کی، لیکن اس کا جواب نہ ملا قائد اعظم نے لارڈ ویول سے اپیل کی، اس کا جواب ملا، لیکن دستور ساز اسمبلی کے ممبروں کو دعوت نامے بھیج دیے گئے کہ وہ نو دسمبر ۱۹۴۶ء کے اجلاس میں ضرور شریک ہوں، اس ضد کا جواب قائد اعظم ہی دے سکتے تھے۔ کہ دستور ساز اسمبلی کا بائیکاٹ کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے اعلان کر دیا کہ مسلم لیگ دستور ساز اسمبلی کے اجلاس میں شریک نہیں ہوگی۔

حکومت کی گھبراہٹ قائد اعظم یہ اعلان کر کے سندھ کے دورہ پر روانہ ہو گئے جہاں صوبائی اسمبلی کا نیا انتخاب ہو رہا تھا۔ اور یہاں دستوری اسمبلی کے انعقاد کی تیاریاں ہونے لگیں۔

شاید کانگرس کی طرح حکومت برطانیہ بھی اس غلط فہمی میں مبتلا تھی کہ مسلم لیگ صرف دھمکی دے رہی ہے عمل نہیں کرے گی لیکن جب اسے اندازہ ہو گیا کہ مسلم لیگ بھی عمل کرے گی۔ تو اسے اپنی غلط روی کا احساس ہوا۔ اس نے محسوس کر لیا کہ مسلم لیگ کی عدم

موجودگی میں جو دستور بنے گا، وہ مسلم قوم پر نافذ نہیں کیا جا سکتا بہ نوک سنگین اگر ایسا کیا جائے تو وہ دنیا میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی۔ آخر مسٹر اٹیلی وزیر اعظم برطانیہ نے قائد اعظم، مسٹر لیاقت علی خاں، مسٹر نہرو اور مسٹر بلدیو سنگھ کو صلاح مشورہ کے لئے لندن طلب کیا۔

کانگریس نے جب دستور ساز اسمبلی کا مطالبہ باقی رکھا اور کابینہ نے اسکیم ماننے سے انکار کر دیا تو اب حکومت برطانیہ بھی مایوس ہو گئی اب تک گفتگو کا رخ یہ تھا کہ لیگ اور کانگریس میں مفاہمت ہو جاتے اب یہ ہو گیا کہ لیگ اور کانگریس الگ الگ حکومت بنا لیں۔

بائیسویں منزل

پاکستان بن گیا

حکومت برطانیہ کا فیصلہ کن اعلان

جب کوئی چارۂ کار باقی نہ رہ گیا تو حکومت برطانیہ بھی تشکیل پاکستان پر رضامند ہو گئی۔

۳؍جون ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نئے وائسرائے ہند نے لندن کے سفر سے واپسی پر مسٹر اٹیلی وزیر اعظم برطانیہ سے صلاح و مشورہ کے بعد حسب ذیل اعلان کیا:۔

۲۰؍فروری ۱۹۴۷ء کو ملک معظم کی حکومت نے اس ارادہ کا اعلان کیا تھا کہ جون ۱۹۴۸ء تک برطانوی ہند کو حاکمانہ اختیارات تفویض کر دیئے جائیں گے۔ اس وقت حکومت کو امید تھی کہ ہندوستان کی اہم جماعتیں وزارتی وفد کا پلان ۱۶؍مئی ۱۹۴۶ء کو عملی جامہ پہنانے میں حکومت سے اشتراک عمل کریں گی۔ اور ایک ایسا دستور اساسی وضع کر لیں گی جو تمام افراد متعلقہ کے لیے قابل قبول ہو لیکن افسوس کہ یہ امید پوری نہ ہوئی، مدراس، بمبئی، یوپی، بہار، سی پی، برار، آسام، اڑیسہ، صوبہ سرحد اور دہلی، اجمیر میواڑ اور کرگ کے اکثریت کے صوبوں کے نمائندے تو پہلے ایک جدید دستور وضع کرنے کے کام میں مصروف ہو گئے۔ لیکن مسلم لیگ پارٹی جس میں بنگال پنجاب اور سندھ نیز برطانوی بلوچستان کے اکثریت کے نمائندے شامل ہیں موجودہ دستور ساز اسمبلی میں شریک ہونے سے انکار کر بیٹھے۔

ملک معظم کی حکومت کی ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ خود اہل ہند کی مرضی کے مطابق اختیارات منتقل کئے جائیں۔ اس کام میں بڑی آسانی ہو جاتی اگر ہندوستان کی سیاسی جماعتوں میں اتفاق آرا یا سمجھوتہ ہو جاتا لیکن جب یہ نہ ہو سکا تو ایسا طریقہ انتقال اختیارات سوچنے کا بار، حکومت پر آن پڑا جس سے اہل ہند کی مرضی کا تیقن ہو سکے۔ چنانچہ ہندوستان کے سیاسی زعماء سے پوری طرح مشورہ کرنے کے بعد ملک معظم کی حکومت نے فیصلہ کر لیا کہ اس مقصد کو پورا

کرنے کے لیے خود ایک پلان تیار کرے جو ذیل میں دی جاتی ہے حکومت یہ بات صاف صاف واضح کر دینا چاہتی ہے کہ اس کا ہرگز یہ ارادہ نہیں ہے کہ ہندوستان کے لیے کوئی دستور اساسی خود مرتب یا وضع کرے بلکہ یہ کام تو خود ہندوستانیوں کے کرنے کا ہے۔ اس پلان میں کوئی ایسی چیز بھی نہیں ہے جو ایک متحدہ ہندوستان کے قیام کے سلسلہ میں مختلف فرقوں میں گفتگو و مشاورت کرنے میں مانع ہو۔

لیگی صوبوں کی دستور ساز مجلس:۔ ملک معظم کی حکومت کا یہ ارادہ بھی نہیں ہے کہ موجودہ مجلس دستور ساز کے کاموں میں رخنہ پیدا کرے اب جب کہ مندرجہ ذیل صوبوں کے لیے ایک موقع نکالا گیا ہے حکومت کو یقین رکھنا چاہئیے کہ اس اعلان کے بعد ان صوبوں کے مسلم لیگی نمائندے جن کی اکثریت مجلس دستور ساز میں پہلے سے شریک ہے اب اس کی محنتوں کے پھل میں اپنا مناسب حصہ لے لیں گے۔ اسی کے ساتھ یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ اس مجلس دستور ساز کا تیار کردہ دستور ملک کے ان حصوں پر نافذ نہیں کیا جا سکتا جو اسے قبول کرنے سے انکار کر دیں۔

پیراگراف نمبر ۴:۔ ملک معظم کی حکومت کو اطمینان ہے کہ جو طریقہ کار ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔ یہی وہ بہترین طریقہ ہے جس سے ایسے حلقوں کے رہنے والوں کی مرضی اس سوال کے متعلق معلوم کی جا سکتی ہے کہ آیا ان کا علیحدہ دستور تیار کیا جائے یا نہیں یعنی ——— :۔

الف:۔ آیا وہ موجودہ دستور ساز میں شامل رہنا چاہتے ہیں یا

ب:۔ ایک جدید اور جداگانہ مجلس دستور ساز میں جانا چاہتے ہیں جس میں ان حلقوں کے نمائندے شریک ہوں گے جنہوں نے موجودہ اسمبلی میں شریک ہونے سے انکار کر دیا تھا۔

جب یہ بات طے ہو جائے گی تب اس امر کا فیصلہ کرنا آسان ہو جائیگا کہ کس کو یا کن کو اختیارات منتقل کیے جائیں

بنگال اور پنجاب کی تقسیم:۔ بنگال اور پنجاب کی مجالس قانون ساز کو (یورپین ممبروں کے سوا) ہدایت کی جائیگی۔ کہ وہ دو حصوں میں تقسیم ہو کر مجتمع ہوں، ایک

حصے میں مسلم اکثریت والے اضلاع کے نمائندے ہوں اور دوسرے حصے میں باقی اضلاع کے اضلاع کی آبادی معلوم کرنے کے لیے ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار قطعی سمجھے جائیں گے۔ ذیل کے نقشہ میں ان صوبوں کے ان اضلاع کی فہرستیں بھی دے دی جاتی ہیں جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔

ان مجالس قانون ساز کے دونوں حصوں کے ممبران الگ الگ بیٹھیں گے اور ان کو اس سوال پر رائے دینے کا حق دیا جائے گا کہ آیا ان کے صوبہ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے یا نہیں۔ اگر ان دو حصوں میں سے کسی حصہ کی معمولی اکثریت نے بھی تقسیم کی موافقت میں رائے دی تو تقسیم کر دی جائے گی۔ اور اس کے لیے انتظامات بھی کر دیئے جائیں گے

ان دونوں مجالس قانون ساز (بنگال و پنجاب) کے ممبروں کو رائے دینے سے پہلے:- الگ الگ مجتمع ہو کر تقسیم کے سوال پر رائے دینے سے پہلے ہر حصہ کے نمائندوں کو یہ بھی سوچ لینا چاہیئے کہ اگر دونوں حصوں کے نمائندوں نے صوبہ کو منقسم کرنے کے بجائے متحدہ رکھنا پسند کیا تو پھر وہ بحیثیت مجموعی کس مجلس دستور ساز میں شریک ہونا چاہے گا۔ اس لیے اگر کسی مجلس قانون ساز کا کوئی ممبر مطالبہ کرے تو اس مجلس قانون ساز کے تمام ممبروں کو یورپین ممبروں کے سوا جلسہ منعقد کیا جائیگا اور اسی جلسہ میں اس سوال کا فیصلہ کیا جائیگا کہ صوبہ بحیثیت مجموعی کون سی مجلس قانون ساز میں شریک ہوگا۔ اگر اسے متحدہ رکھا گیا۔

اور اگر تقسیم کی موافقت میں فیصلہ ہوا تو اس مجلس قانون ساز کے ہر حصہ کو اپنے حلقہ ہائے انتخاب کی طرف سے فیصلہ کرنا ہوگا کہ پیراگراف نمبر ۹ کے کس جزو کو قبول کرتا ہے۔

تقسیم کے سوال کے فوری حل کے لیے بنگال اور پنجاب کی مجالس قانون ساز کے ممبران مسلم اکثریت والے اضلاع (جن کی تصریح نقشہ میں کی جاتی ہے) اور غیر مسلم اکثریت والے اضلاع کے نمائندے دو حصوں میں منقسم ہو کر الگ الگ مجتمع ہو جائیں گے۔

حد بندی کا کمیشن:- ان صوبوں کی قطعی تقسیم کے لیے ظاہر ہے کہ ان کے حدود کی مفصل تحقیق و تعین کی ضرورت ہوگی۔ اس لیے جوں ہی ان دونوں یا ان میں سے ایک صوبہ کو تقسیم کر دینے کا

فیصلہ ہو جائے گا. گورنر جنرل ایک "تعین سرحد" کا کمیشن مقرر کریں گے. اس کمیشن کے ارکان، اور مسائل تصفیہ طلب کا تعین گورنر جنرل، اصحاب متعلقہ سے مشورہ کے بعد کریں گے۔ اس کمیشن کو ہدایت دی جائے گی کہ پنجاب کے دونوں حصوں کے حدود اس بنیاد پر کرے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کی اکثریت والے رقبے باہمی یکسانیت رکھتے ہوں، فرقہ وارانہ یکسانیت و اختلاط کے علاوہ دوسرے مسائل بھی ملحوظ رکھنے ہوں گے۔ اسی طرح بنگال صوبہ کی تقسیم کے بارے میں بھی ہدایات دے دی جائیں گی۔ ان صوبوں کے عارضی حدود ہوں گے جو ذیل کے نقشہ (فہرست) میں دیئے جاتے ہیں۔

سندھ کدھر جائے گا:- سندھ کی مجلس قانون ساز کا ایک اجلاس خصوصی طلب کیا جائے گا جس کے ارکان (یورپین ممبروں کے سوا) اس امر کا فیصلہ کریں گے۔ کہ پیراگراف نمبر ۴ میں دی ہوئی کس شکل کو پسند کرتا ہے۔

صوبہ سرحد کے مخصوص حالات:- صوبہ مغربی وشمالی (صوبہ سرحد) کی حیثیت ایک خاص نوعیت کی ہے۔ اس کے تین نمائندوں میں سے دو تو موجودہ مجلس دستور ساز میں پہلے ہی سے شریک ہو گئے ہیں لیکن اس کی جغرافیائی پوزیشن اور دوسرے امور کے پیش نظر یہ امر بالکل واضح ہے کہ اگر پنجاب کُلاً یا جزواً موجودہ دستور ساز میں شریک ہونے سے انکار کر دے تو صوبہ سرحد کو اس کا موقع ملنا چاہیے کہ اپنی پوزیشن پر دوبارہ غور کرے لہذا ایسی صورت میں صوبہ سرحد کی موجودہ مجلس قانون ساز کے رائے دہندوں سے استصواب کیا جائے گا۔ کہ وہ پیراگراف نمبر ۴ کی دو شکلوں میں سے کس کو پسند کرتے ہیں. یہ استصواب رائے عامہ گورنر جنرل کی نگرانی اور صوبائی حکومت کے مشورہ سے کیا جائے گا.

برطانوی بلوچستان نے ایک ممبر منتخب کر لیا ہے لیکن وہ موجودہ ممبر دستور ساز میں شریک نہیں ہوا۔ اس صوبہ کی جغرافیائی پوزیشن کے پیش نظر اسے اپنی پوزیشن پر دوبارہ غور کرنے کا موقع دیا جائیگا۔ کہ وہ مذکورہ بالا پیراگراف نمبر ۴ کی جس شکل کو چاہے پسند کر لے. گورنر جنرل غور کر رہے ہیں کہ یہ مقصد کس طرح بوجوہ احسن حاصل کیا جائے گا۔

آسام غیر مسلم صوبہ ہے

گو آسام میں غیر مسلموں کی اکثریت ہے۔ لیکن سلہٹ کا ضلع جو بنگال سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے ایسا ضلع ہے۔ جس میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ ایک مطالبہ یہ پیش کیا جا رہا ہے۔ کہ اگر بنگال کے دو ٹکڑے کر دیئے جائیں تو ضلع سلہٹ کو مسلم بنگال سے ملا دیا جائے گا۔ لہٰذا یہ فیصلہ کیا جاتا ہے۔ کہ بنگال کو تقسیم کر دینا چاہیے اور گورنر جنرل کی نگرانی میں اور صوبہ آسام کی حکومت کے مشورہ سے سلہٹ کے باشندوں سے استصواب رائے کیا جائے کہ آیا وہ صوبہ آسام سے وابستہ رہنا چاہتے ہیں۔ یا مشرقی بنگال کے نئے صوبہ میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ اگر رائے شماری سے یہ معلوم ہوا کہ سلہٹ کے باشندے صوبہ مشرقی بنگال سے ملحق ہونا پسند کرتے ہیں، تو حدود معین کرنے والے کمیشن کو یہ ہدایت بھی کر دی جائے گی کہ سلہٹ ضلع کی مسلم اکثریت والے رقبہ اور اس سے متصلہ اضلاع کے مسلم اکثریتی رقبوں کو جو یکسانیت رکھتے ہوں آسام سے الگ کر کے مشرقی بنگال میں ملا دے اور باقی صوبہ آسام کو شریک رکھے۔

مسلم بنگال اور مسلم پنجاب

۱۴۔ اگر بنگال اور پنجاب کی تقسیم کا فیصلہ ہو جائے تو ضروری ہوگا۔ کہ جدید انتخابات کرائے جائیں، اس انتخاب کا معیار ۱۶ مئی ۱۹۴۶ء کے پلان کے مطابق ۱۰ لاکھ فی آبادی پر ایک نمائندہ کا ہوگا۔ اسی طرح، اگر سلہٹ کو آسام سے کاٹ کر مشرقی بنگال میں شامل کر دینے کا فیصلہ ہوا تو اسے بھی نیا انتخاب کرنا ہوگا۔ ہر حلقہ کو جتنی نمائندگی کا حق ملے گا۔ اس کی تفصیل یہ ہے :۔

صوبہ	عام نشستیں	مسلم	سکھ	میزان
ضلع سلہٹ	۱	۲	×	۳
مغربی بنگال	۱۵	۴	×	۱۹
مشرقی بنگال	۱۲	۲۹	×	۴۱
مغربی پنجاب	۳	۱۲	۲	۱۷
مشرقی پنجاب	۶	۴	۲	۱۲

مختلف حلقوں کے نمائندوں کو جیسا منڈیٹ (ہدایت نامہ) دیا جائے گا ویسا عمل

کریں گے یعنی یا تو موجودہ مجلس دستور ساز میں شریک ہو جائیں گے یا جدید مجلس دستور ساز میں،

تقسیم کے بعد کے انتظامات ۱۶ اگر کسی تقسیم کا فیصلہ کیا گیا تو اس کے انتظامی نتائج پر جس قدر جلد ممکن ہو ان لوگوں میں گفتگو شروع کر دینی ہوگی۔

الف اپنے اپنے حلقہ کے جانشین حکام کے نمائندوں کے درمیان گفتگو ہوگی۔ ان تمام صیغوں کے متعلق جو مرکزی حکومت کے پاس ہیں بشمول دفاع مالیات اور رسل و رسائل،

ب۔ مختلف جانشین حکام اور ملک معظم کی حکومت کے درمیان گفت و شنید ہوگی۔ معاہدات کے سلسلہ اور ان کے امور کے متعلق جو انتقال اختیارات کے سلسلہ میں پیدا ہوں گے

ج۔ ان صوبوں کے بارے میں جن کے دو دو حصے کر دیئے جائیں گے ان تمام صیغوں یا شعبہ جات کے متعلق گفتگو کرنی ہوگی جو صوبے کے ماتحت ہوا کرتے ہیں مثلاً آمدنی اور اخراجات کی تقسیم پولیس اور دیگر ملازمتیں ہائیکورٹ اور دیگر صوبائی ادارے وغیرہ،

آزاد قبائل کا سوال ۱۷ صوبہ مغربی و شمالی (سرحد) کے قبائل کے ساتھ ذمہ دار جانشین حکام کو مفاہمت و معاہدہ کرنا ہوگا۔

دیسی ریاستیں نوٹ کر لیں ۱۸ ملک معظم کی حکومت یہ امر واضح کر دینا چاہتی ہے۔ کہ مذکورہ بالا فیصلوں کا تعلق صرف برطانوی ہند سے ہے اور ہندوستانی ریاستوں کے متعلق اس کی پالیسی وہی ہے۔ جو وزارتی وفد نے مئی ۱۹۴۶ء کے پلان میں بیان کر دی ہے ۱۹ اس غرض سے کہ اختیارات لینے والے حکام اپنے کو اس کام کے لئے تیار کر لیں۔ نہایت ہی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ مذکورہ بالا امور جتنی جلد ممکن ہو مکمل کر دیئے جائیں۔ موجودہ مجلس دستور ساز اور جدید مجلس دستور اپنے اپنے دستور وضع کرنے کا کام جلد شروع کر دیں۔

درجہ نو آبادیات ۲۰ جیسا کہ ہندوستان کی اہم پارٹیاں اس بات پر زور دیتی رہی ہیں کہ جلد سے جلد اختیارات منتقل کر دیئے جائیں ملک معظم کی حکومت

بھی اس رائے سے متفق ہے اور اسی غرض سے اس نے جون ۱۹۴۸ء انتقال اختیارات کی تاریخ پہلے ہی سے مقرر کردی ہے۔ جس پر وہ اب تک قائم ہے۔ حکومت کی تجویز ہے کہ موجودہ سیشن میں تفویض اختیارات قابل پیش کردے اور اسی سال ڈومینین (درجہ نوآبادیات) کی بنیاد پر ایک یا دو جانشینوں کو اختیارات منتقل کردے اس کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ مجالس دستور ساز کو اس فیصلہ کا حق ہی باقی نہ رہے گا۔ کہ ہندوستان اگر چاہے تو برطانوی دولت مشترکہ میں رہے یا اس سے علیحدہ ہو جائے۔

ہزاکسیلینسی گورنر جنرل مذکورہ امور کو عملی شکل کو لانے کے لئے ضابطہ امور کے متعلق وقتاً فوقتاً اعلانات کرتے رہیں گے۔

مسلم بنگال اور مسلم پنجاب

پنجاب اور بنگال کے جن اضلاع میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہ یہ ہیں۔ (۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق)

پنجاب :۔ قسمت لاہور۔ اضلاع، گوجرانوالہ۔ گورداسپور۔ لاہور۔ شیخوپورہ۔ سیالکوٹ

قسمت روالپنڈی۔ اضلاع اٹک۔ گجرات۔ جہلم۔ میانوالی۔ راولپنڈی شاہپور

قسمت ملتان۔ اضلاع ڈیرہ غازیخاں۔ جھنگ۔ لائل پور منٹگمری، ملتان مظفرگڑھ

بنگال :۔ قسمت چاٹگام اضلاع چاٹگام، نواکھالی۔ پیٹرا۔

قسمت ڈھاکہ۔ اضلاع باقرگنج، ڈھاکہ، میمن سنگھ

قسمت پریسیڈنسی۔ اضلاع جیسور، مرشدآباد، نادیا۔

قسمت راجشاہی :۔ اضلاع بوگرا۔ دیناج پور، مالدا، پبنا۔ راج شاہی، رنگ پور

سنگِ گراں

جب تک پاکستان نہیں بنا تھا۔ کوشش یہ ہو رہی تھی کہ وہ نہ بن سکے اب اس کا بننا ممکن ہوگیا۔ تو جدوجہد یہ کی جانے لگی کہ وہ زندہ نہ رہ سکے، چنانچہ :۔

۱۔ فسادات کی رفتار اور تیز ہوگئی،

۲۔ مشرقی پنجاب میں لاکھوں مسلمان قتل کیے گئے، عورتوں کی عزت لوٹی گئی، بچے ذبح کیے گئے کھیتوں میں آگ لگادی گئی زیورات چھین لئے گئے، مکانات ڈھادیئے گئے جانور ہتھیا لئے گئے

۳۔ سکھ ریاستوں میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔

۴۔ کپور تھلہ میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ لیکن ایک مسلمان بھی اب وہاں نہیں،

۵۔ مغربی پاکستان سے ہندوؤں اور سکھوں نے انخلا کر کے مسلمانوں کو مجبور کیا کہ وہ بھی مشرقی پنجاب خالی کر دیں۔ دو قومی نظریہ کے علمبردار قائد اعظم اس کے لئے تیار نہیں تھے لیکن یک قومی نظریہ کے پاسبان جواہر لال نے اس پر سختی سے عمل درآمد کرایا۔ اور مشرقی پنجاب سے مسلمان مغربی پنجاب میں آکر پناہ لیتے لگے۔

۶۔ دہلی میں خاص دار المملکت ہند میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا اور حکومت ہند کچھ نہ کر سکی،

۷۔ بھرت پور اور اس کے گرد و نواح میں مسلمانوں کا قتل عام بیدردی کے ساتھ ہوا۔

۸۔ اس طرح تقریباً ۶۰ لاکھ مہاجروں کا بار ایک نئی حکومت پر پڑ گیا، اور ۴۰ لاکھ کے قریب ہندوستان جیسے وسیع ملک کے حصہ میں آتے۔

۹۔ دلی سے جو ٹرینیں پاکستانی ملازموں اور دستاویزوں کو لے کر چلتی تھیں ان میں آگ لگا دی جاتی تھی۔ کہ منزل مقصود تک نہ پہنچ سکیں۔

۱۰۔ مغربی پنجاب سے جو ہندو اور سکھ ترکِ وطن کر کے آتے وہ اپنے ساتھ لوٹا۔ اور گلاس تک لیتے گئے اور مشرقی پنجاب سے جو مسلمان آتے وہ جان تک بہ مشکل سلامت لے جا سکے!

پھر بھی پاکستان بن گیا۔

تیئسویں منزل

دنیا کا سب سے بڑا سیاسی معجزہ

○

پاکستان

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۶۴ء تک کی،

سیاسی، آئینی اور انقلابی تبدیلیوں کا جائزہ!

پاکستان کیونکر بنا؟

قائداعظم یہ چاہتے تھے کہ اٹیلی کے اعلان کے مطابق جون ۱۹۴۸ء میں دونوں آزاد مملکتوں کو اختیارات حکومت سونپے جائیں تاکہ نظم ونسق میں کوئی فرق نہ پڑے، اطمینان اور یکسوئی کے ساتھ تمام معاملات سرانجام پا جائیں، لیکن ماونٹ بیٹن جواہر لال کی دوستی رنگ لائی، فیصلہ کر دیا گیا کہ پاکستان کو ۱۴۔ اگست ۴۷ء کو اختیارات حکومت تفویض کر دیئے جائیں گے، گویا اعلان کردہ مدت سے تقریباً ایک سال پہلے!

ایسا کیوں کیا گیا؟

اس میں مصلحت یہ تھی کہ ہندوستان کے پاس ایک جمی جمائی حکومت ہے سکرٹیریٹ ہے، ایوان اسمبلی ہے، فوج ہے، خزانہ ہے، بین الاقوامی ساکھ ہے، تمام شعبہ ہائے حکومت برسرکار ہیں، ریلیں چل رہی ہیں، ٹکسال میں نوٹ چھپ رہے ہیں، سکے ڈھل رہے ہیں، اس کے برعکس پاکستان ایک نیا ملک ہے، جس کے پاس سکرٹریٹ اور ایوان اسمبلی تو کجا، دارالحکومت تک نہیں جس کی پولیس منتشر ہے، جس کی فوج نامکمل ہے، اور اس نامکمل فوج کا کچھ حصہ ملایا میں ہے کچھ ہانگ کانگ میں، کچھ انڈونیشیا میں، کچھ جاپان میں، اس لئے کہ اب تک تو یہ فوج انگریزوں ہی کی فوج ہے، بھارت کے پاس آرڈیننس فیکٹری ہے، اسلحہ بنتے ہیں، بارود تیار ہوتی ہے پاکستان کے پاس کوئی فیکٹری نہیں، تقسیم کے سلسلے میں جو سازوسامان جنگ اس کے حصہ میں آیا ہے وہ بعد میں دیا جائے گا، پاکستان کے پاس روپیہ بھی نہیں، اس لئے کہ ابھی تک حساب فہمی نہیں ہوئی۔ جب حساب فہمی ہو گی تب روپیہ دیا جائے گا، ابھی نہیں!

غرض پاکستان اس طرح بنا کہ گو اس کا شمار دنیا کی سب سے بڑی اسلامی حکومت میں ہوتا

تھا اور وہ دنیا کی بڑی حکومتوں میں پانچویں نمبر پر تھا۔ لیکن اس کی بے سرو سامانی کا یہ عالم تھا کہ عزم و حوصلہ کے سوا اس کے پاس کچھ نہ تھا، نہ روپیہ، نہ میز، نہ کرسی، نہ قلم، نہ دوات، نہ کاغذ، نہ رجسٹر نہ فوج، نہ پولیس، نہ ریل، نہ ڈاک و تار کا نظام؛

یقین تھا کہ چند ہی روز میں پاکستان خود التدعا کرے گا، ہم آزادی سے درگزرے، ہمارا الحاق پھر سے کر لیجئے۔

صرف ان حرکتوں پر اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ پاکستان کو ہست سے نیست کرنے کے لئے اور بھی بہت سے وسائل و ذرائع پوری بے تکلفی کے ساتھ عمل میں لائے گئے۔

ا۔ سندھ میں کوئی ہندو مسلم فساد نہیں ہوا تھا، نہ اس کا امکان تھا، لیکن ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق سندھ کے ہندوؤں نے پوری آزادی اور اطمینان کے ساتھ ترک وطن شروع کر دیا۔

اور وہ!

الف۔ تمام نقد سرمایہ لیتے گئے

ب۔ تمام اسباب منقولہ لیتے گئے۔

ج۔ دوکانوں اور مکانوں کی بڑی بڑی پگڑیاں دن دہاڑے وصول کر لیں،

د۔ ملازمت سے بغیر کسی وجہ کے مستعفی ہو گئے، اس لئے کہ اسی طرح سندھ کا نظام حکومت مفلوج کیا جا سکتا تھا! ——— اور وہ ہو گیا! سپاہی موجود افسر غائب، افسر موجود سپاہی ندارد! میونسپلٹی خالی ہو گئی پورٹ ٹرسٹ میں خاک اڑنے لگی، سندھ سکریٹریٹ سونا ہو گیا۔ سندھ کے مدرسے اور کالج ویران ہو گئے۔

صرف یہی نہیں!

سندھ کی تجارت انہی ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی، ساہوکارہ کے یہ مالک تھے، بینک یہ چلا رہے تھے امپورٹ اکسپورٹ ان کے ہاتھ میں تھا، لین دین کے یہ مالک تھے!

ان کے جاتے ہی بینک بند ہو گئے۔ تجارت سرد ہو گئی، دوکانیں بند ہو گئیں، کاروبار شل ہو گیا!

——— بھارت سے جو مسلمان آئے تھے وہ لٹ کر، مٹ کر، پٹ کر، اتنی جلدی اس نقصان عظیم کی تلافی نہیں کر سکتے ——— نتیجہ یہ ہو گا کہ لوگ خود چیخ اُٹھیں گے ہمیں ایسا پاکستان نہیں چاہیئے،

۲۔ فوج کا بڑا حصہ پاکستان سے باہر تھا ——— لہٰذا نظم و انتظام میں برابر خلل پڑ رہا تھا،

۳۔ فوج کے باہر رہنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ بھارت نے بالکل خلاف معاہدہ اور خلاف دستور و اصول ماؤنٹ بیٹن کی شہ پاکر مہاراجہ کشمیر سے ساز باز کیا، اور اس کے ایک بڑے حصہ پر قبضہ کر لیا، اور پاکستان فریاد کے سوا کچھ نہ کر سکا، اس لئے کہ بے بس تھا!

۴۔ جونا گڈھ، مانا دور، مانگرول، کاٹھیاواڑ کی ان ریاستوں نے بھارت کے طے شدہ اصول کے مطابق پاکستان سے الحاق باقاعدہ کر لیا تھا لیکن بھارت نے اس الحاق کو تسلیم نہیں کیا، ان تینوں ریاستوں پر زبردستی قبضہ کر لیا، بلکہ مانگرول اور مانادور کے فرماں رواؤں کو گرفتار بھی کر لیا، جو بعد میں رہا کر دئے گئے،

۵۔ مغربی پنجاب میں ساٹھ لاکھ مہاجروں کا قافلہ داخل ہو رہا تھا، جسے یہ نئی مملکت پناہ دینے پر اپنی بے سرو سامانی اور بے بضاعتی کے باوجود مجبور تھی۔

۶۔ سرحد میں بھی کوئی خاص فساد نہیں ہوا تھا ——— سارے پاکستان میں کہیں بھی بہار اور گڈھ مکتیشر کی روایت نہیں دوہرائی گئی تھی ——— لیکن سرحد سے بھی ہندوؤں کا جبری انخلا حکومت ہند کی تحریک پر شروع ہو گیا تاکہ وہاں کا نظام بھی مفلوج ہو جائے، اور ہوا،

۷۔ صرف مشرقی پنجاب ہی سے نہیں، اطراف واکناف ہند سے مہاجر مسلمانوں کی، ٹولیاں سب کچھ کھو کر پناہ ڈھونڈنے کے لئے آرہی تھیں، اس لئے نہ ان کی عزت محفوظ تھی، نہ جان، نہ مال ——— یہ ایک اور مصیبت تھی جس سے پاکستان کو دوچار ہونا پڑا تھا،

۸۔ پاکستان کے حصہ کا سارا فوجی سامان ہندوستان کے قبضہ میں تھا اور اس کے ملنے کی کم از کم فی الحال کوئی تدبیر نہیں نظر آ رہی تھی،

۹۔ پاکستان کے حصہ کا سارا روپیہ بھی ہندوستان کی تحویل میں تھا، یہاں بھارت کے نوٹ چل رہے تھے، بھارت کا سکہ چل رہا تھا، اور پاکستان مجبور تھا کہ اس صورت حال کو برداشت کرے

۱۰۔ پاکستان کا کوئی بینک نہیں تھا، بھارت کا امپیریل بینک پاکستان کا خزانچی بنا ہوا تھا۔ اور پاکستان اس معاملہ میں بھی بے بس اور بے کس تھا کہ اس صورت حال کو برداشت کرے۔

۱۱۔ بیمہ کمپنیاں بھی زیادہ تر ہندوؤں کی تھیں، اور ان کے مالک اپنے ساتھ سب کچھ لے کے جا چکے تھے،

غرض جس اعتبار سے بھی دیکھئے حالات یہ تھے کہ بظاہر پاکستان کے قائم رہنے کا کوئی امکان نہیں تھا، ہر آن یہ اندیشہ تھا کہ وہ فنا ہو جائے گا، چنانچہ بھارت کے مدبرین، سیاست داں، وزراء علی الاعلان پاکستان کی اقتصادی حالت کا مذاق اڑایا کرتے تھے اور پیشین گوئی کیا کرتے تھے کہ چند دنوں یا ہفتوں سے زیادہ پاکستان اپنی آزادی نہیں قائم رکھ سکے گا،

پاکستان بننے کے بعد قائداعظم صرف ایک سال زندہ رہے اور اس ایک سال کی مختصر مدت میں پاکستان کا شمار اقتصادی سیاسی اور عسکری حیثیت سے دنیا کی باوقار مملکتوں میں ہونے لگا،

۱۔ اسٹیٹ بنک آف پاکستان قائم ہو گیا، اور اس نے فوراً ہی نظام مالیات کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

۲۔ فوج نامکمل تھی، ابتر تھی، منتشر تھی لیکن تھوڑے سے وقفہ میں ہی فوج مکمل بن گئی، مجتمع ہو گئی، بھارت نے سازوسامان جنگ روک لیا تھا، لیکن دوسرے ممالک سے خریدا گیا۔

۳۔ مالی حالت بڑی سقیم تھی، خصوصاً اس لئے کہ بھارت نے وہ روپیہ روک لیا تھا جو پاکستان کے حصہ کا اس کے قبضہ میں تھا، لیکن پہلا میزانیہ قیام پاکستان کے معاً بعد وزیر مالیات نے اسمبلی میں جو پیش کیا وہ توفیر کا بجٹ تھا!

۴۔ بار بار اقلیتوں کو دہشت زدہ کیا جانے لگا کہ پاکستان میں انہیں آسودگی نہیں حاصل ہوگی ان کی جان، مال، آبرو ہر چیز خطرہ میں رہے گی، ان کے شہری حقوق چھین لئے جائیں گے، ان کی شہری آزادی سلب کر لی جائے گی، لیکن قائداعظم نے اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ وہ اقلیتوں کے پاکستان میں اتنے ہی پرجوش اور مخلص نگہبان ہیں، جتنے بھارت میں، مسلم اقلیت کے پرجوش اور مخلص نگہبان تھے۔ کراچی کا فساد صرف دو گھنٹے میں ختم ہو گیا،

۵۔ غیر ممالک اس نوزائیدہ مملکت کے نام سے بھی ناواقف تھے، قائداعظم نے مختلف ممالک میں ثقافتی وفود بھیجے اور ان وفود کے ذریعہ دنیا کو پاکستان، اس کے وجود اس کی اہمیت اور اس کی حیثیت سے روشناس کرایا۔

۶۔ پاکستان جب قائم ہوا تو برطانیہ کے ہائی کمشنر کے سوا کوئی غیر ملکی نمائندہ کراچی میں موجود نہیں تھا لیکن قائداعظم نے غیر ممالک سے ربط و تعلق کا سلسلہ فوری طور پر شروع کر دیا اور چند ہی روز میں نہ صرف جملہ ممالک اسلامیہ سے بلکہ امریکہ، روس، فرانس اور دُنیا کی دوسری بڑی مملکتوں سے سفارتی روابط قائم ہو گئے۔

۷۔ بھارت سے اگرچہ تلخی موجود تھی، اور بھارت کے ارباب حل و عقد کے نت نئے بیانات اس تلخی میں اور اضافہ کر رہے تھے، لیکن قائداعظم نے دوسرے ممالک کی طرح بھارت سے بھی اچھے اور دوستانہ تعلقات قائم رکھنے کی سرگرم کوشش کی۔

۸۔ یہ بات اصولی طور پر طے ہو گئی تھی کہ اگرچہ اب پاکستان اور بھارت دو جدا جدا مملکتیں ہو نگی لیکن ان کے باشندوں کے مابین صدیوں سے جو تعلقات چلے آ رہے ہیں ان کا تقاضہ یہ ہوتا چاہیئے کہ جس طرح امریکہ اور کناڈا جداگانہ وجود رکھنے کے باوجود رسل و رسائل اور آمد و رفت کے اعتبار سے ایک ہیں، اسی طرح بھارت اور پاکستان بھی رہیں گے، چنانچہ قائداعظم نے ان دونوں ممالک کے مابین پرمٹ یا پاسپورٹ کا کبھی خیال نہیں کیا، لیکن بھارت نے اس معاملہ میں پہل کی اور پرمٹ کی پابندی سفر پر لگادی!

۹۔ یہ بات بھی اصولی طور پر دونوں مملکتوں کے مابین طے پاچکی تھی کہ بھارت اور پاکستان میں سے جو جہاں رہنا چاہے رہے، اس پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی۔ لیکن بھارت نے اس معاملہ میں بھی طے شدہ اصول سے انحراف کیا، اور نقل وطن کرنے والے مسلمانوں کی جائیدادوں پر کمپنیوں کے حصص پر، بینک کے روپیہ پر قبضہ کرنا شروع کر دیا، بلکہ صرف اسی پر کافی نہیں سمجھا ایک نئی اصطلاح وضع کی، "انٹنڈنگ ایوکی" یعنی "عازم تخلیہ" یہ اتنا عام قانون تھا کہ جس مسلمان کو چاہا عازم تخلیہ قرار دے کے اس کے مال و منال اور جائیداد پر قبضہ کر لیا،

۱۰۔ سب سے اہم مسئلہ مہاجرین کا تھا، قائداعظم نے اسے حل کرنے کے لئے اپنی صحت

تک کی پروانہ کی، نہ اس کا لحاظ کیا کہ پاکستان کی مالی حالت کتنی سقیم ہے! انہوں نے ایک بیان میں بہ الفاظ واضح فرمایا کہ پاکستان کا دیوالیہ ہو جانا مجھے منظور ہے، مگر یہ منظور نہیں کہ مہاجرین کی آباد کاری کے کام میں کسی قسم کا خلل پڑے۔

پاکستان مستحکم ہو گیا غرض قائد اعظم نے پاکستان کو ایک ہی سال میں اتنا مضبوط اور مستحکم کر دیا کہ جو لوگ یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ یہ ختم ہو جائے گا، یہ اعتراف کرنے پر اپنے تئیں مجبور پانے لگے کہ پاکستان اس لئے بنا ہے کہ قائم رہے، اس لئے نہیں کہ فنا ہو جائے!

اندرونی اور داخلی طور پر پاکستان کو بہت سی مشکلوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس نے عزم و استقامت کے ساتھ ان دشواریوں اور مشکلوں کا مقابلہ کیا، اور بالآخر کامیابی کے ساتھ ان پر غالب آیا،

قائداعظم کے بعد۔۔۔!

خودغرض، طالع آزما، اور مفاد پرست سیاست دانوں کی کہانی

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

قائداعظم کی آنکھیں بند ہوتے ہی حالات دگرگوں ہونے لگے،

قائداعظم کی جگہ خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل منتخب ہوئے، لیکن لیاقت علی خاں کے قتل (۱۶ر اکتوبر ۱۹۵۱ء) کے بعد انہوں نے گورنر جنرل شپ سے استعفا دیا۔ اور وزارت عظمیٰ کی مسند پر متمکن ہو گئے، ملک غلام محمد گورنر جنرل بن گئے، غلام محمد کی گورنر جنرلی۔ پاکستان کی سیاسی، ذہنی، فکری، بربادی اور تباہی کا پیش خیمہ تھا، یہ شخص اقتدار کا بھوکا تھا، اور اس مقصد کے لئے پاکستان تک کو داؤں پر لگانے کے لئے تیار ہوگیا، غلام محمد سے لے کر سکندر مرزا تک کے عہد نافرجام کے واقعات مختصراً اگلے صفحات میں بیان ہوں گے۔ لیکن ان واقعات اور واقعات مابعد پر گفتگو کرنے سے پہلے، ہم ان اسباب و عوامل پر ایک نظر ڈالیں گے جنہوں نے پاکستان کو لب گور کر دیا تھا،

۱۔ پاکستان کی حکومت ان لوگوں کے ہاتھ میں آگئی، جنہوں نے نہ صرف یہ کہ تحریک پاکستان میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا بلکہ ان میں سے بعض تحریک پاکستان کے بدترین مخالف تھے، اور بعض نے اب تک دل سے پاکستان کو قبول نہیں کیا تھا۔

۲۔ پاکستان کی قیادت حکومت کی تابع ہوگئی، پبلک پلیٹ فارم، اسٹیج، اور مسلم لیگ پر

وہ اُگر قابض ہو گئے جنہیں مسلم لیگ سے نہ کوئی دلچسپی تھی نہ تعلق،

۳۔ ایک آزاد اور خود مختار قوم کی حکومت اور قیادت ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے جو آسمان سے ٹپکتے نہیں، زمین سے اگتے ہیں، جو اپنی خدمت کے بل پر، عوام کے دلوں میں گھر کرتے ہیں، جن کے کردار، شخصیت اور سیرت سے عوام کو غیر معمولی عقیدت ہوتی ہے۔

۴۔ اس تغیر احوال نے چھوٹوں اور بڑوں میں خود غرضی اور طالع آزمائی کا جذبہ پیدا کر دیا، قائداعظم کی زندگی میں، جب انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء نافذ ہوا، تو بڑی سے بڑی رشوت —— وزارت —— بھی مسلم لیگیوں کے پائے ثبات میں تزلزل نہ پیدا کر سکی، کانگرس کی طرف سے گاندھی جی، اور جواہر لال کی طرف سے حد درجہ منفعت بخش اور زرخیز و گہر ریز پیش کشیں بھی کسی مسلم لیگی کو غداری پر، جماعت چھوڑنے پر، اور غیروں کا ساتھ دینے پر آمادہ نہ کر سکیں۔ لیکن وہی لوگ جو تقسیم ہند سے پہلے اتنے باکردار تھے۔ قیام پاکستان کے بعد اتنے بے کردار ہو گئے کہ ایک اکاؤنٹنٹ (غلام محمد) کے سر پر تاج قیادت عظمیٰ رکھ کر اس کے سامنے دست بستہ حاضر رہتے تھے، اور اس کی گفتنی و ناگفتنی باتیں سنتے رہتے تھے، مسلم لیگ کے بدترین دشمن، قائداعظم کے مخالف، اور پاکستان کے خلاف ہمیشہ سرگرم رہنے والے، کانگرسی لیڈر (ڈاکٹر خاں صاحب) کے پیچھے پیچھے وزارت کی دریوزہ گری کرتے دوڑتے رہتے اور دعائے ترقی عمر و اقبال دیتے رہتے تھے، ایک سابق یونینسٹ لیڈر (مظفر علی قزلباش) کے اشارہ چشم پر پارٹی سے غداری کرتے اور گورنمنٹ ہاؤس میں جا کر، وزیر، نائب وزیر، وزیر مملکت، یا پارلیمنٹری سکرٹری کی حیثیت سے حلف وفاداری اٹھاتے نظر آتے تھے۔ پشاور کے سابق ڈپٹی کمشنر (اسکندر مرزا) کی چوکھٹ پر سر بسجود رہتے اور اس کے آلۂ کار بننے میں فخر محسوس کرتے تھے، —— تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو، !

یہ بہت بڑا المیہ تھا، لیکن رونما ہو کر رہا، اور اس کے تلخ نتائج سے بھی دامن نہ بچایا جا سکا،

اب ہم پھر اصل موضوع پر آتے ہیں، یعنی مختصر طور پر یہ بتائیں گے کہ قائداعظم کے بعد

حالات نے کیا رخ اختیار کیا، اور رفتہ رفتہ پاکستان جنگ قیادت، جنگِ اقتدار، اور جنگ کشی میں مبتلا ہو کر کس طرح، تباہی اور ہلاکت کے غار کی طرف لڑھکنے لگا۔؟

قائداعظم کی وفات کے بعد خواجہ ناظم الدین کو پاکستان کا گورنر جنرل مقرر کیا گیا۔ جو نہایت ایماندار مخلص اور بے لوث انسان تھے۔ انہی کے زمانے میں ہندوستان نے حیدر آباد پر دست تعدی دراز کیا، اور قابض ہو گیا (ستمبر ۱۹۴۸ء)

لیاقت علی خاں مرحوم قائداعظم کے دست راست تھے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ پاکستان کے پہلے وزیراعظم تھے۔ اپنے حسن تدبر سے پاکستان میں ایک اعلےٰ مقام پیدا کیا جس وقت پنڈت نہرو نے پاکستان کی سرحد پر ہندوستانی افواج کو جمع کرنا شروع کیا اس وقت لیاقت علی خاں کے ایک مُکّے نے وہ کام کیا جو بڑی سے بڑی فوج بھی نہ کر سکتی تھی،

۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو راولپنڈی کے کمپنی باغ میں ایک جلسہ عام میں تقریر کرنے کو کھڑے ہوئے۔ اور ابھی برادران اسلام کے الفاظ منہ سے نکلے تھے۔ کہ ایک شخص سید اکبر نامی نے ان پر پستول کے تین فائر کئے۔ وہ وہیں گر پڑے اور جانبر نہ ہو سکے +

قائد ملت کی وفات کے بعد خواجہ ناظم الدین پاکستان کے دوسرے وزیراعظم بن گئے۔ اور ملک غلام محمد کو گورنر جنرل مقرر کر دیا گیا۔

خواجہ ناظم الدین کامیاب وزیراعظم تھے، مگر گورنر جنرل نے اپنے اختیارات خصوصی سے خواجہ ناظم الدین کی وزارت کو توڑ دیا۔ ان کی جگہ محمد علی بوگرہ کو پاکستان کا وزیراعظم بنایا، اس سے پہلے محمد علی بوگرہ امریکہ میں پاکستان کے سفیر تھے۔ مجلس دستور ساز نے گورنر جنرل کے اختیارات محدود کرنے کے لئے ایک دفعہ پاس کی۔ جس کو ملک غلام محمد نے اپنے اختیارات پر ایک ضرب کاری سمجھا۔ چنانچہ اپنے خصوصی اختیارات سے مجلس دستور ساز کو توڑ دیا۔ اور سپریم کورٹ سے اپنے اقدام کے جواز کا پروانہ بھی حاصل کر لیا۔ اور ایک نئی مجلس دستور ساز بنا ڈالی۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔اس نئی مجلس دستور ساز نے چوہدری محمد علی کی وزارت عظمیٰ کے زمانہ میں نیا آئین تیار کر لیا +

ملک غلام محمد کو اکتوبر ۱۹۵۵ء میں خرابی صحت کی بنا پر مستعفی ہونا پڑا۔ اور اس کی جگہ میجر جنرل اسکندر مرزا گورنر جنرل نامزد ہوئے۔ جو اس سے پیشتر مرکزی کابینہ میں وزیر داخلہ تھے۔ چوہدری محمد علی کو وزارت عظمیٰ کا عہدہ ملا۔

وحدت مغربی پاکستان

اکتوبر ۱۹۵۵ء میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے مغربی پاکستان کے تمام صوبوں یعنی بلوچستان۔ سندھ۔ پنجاب اور سرحد بہاول پور، خیر پور، قلات، چترال وغیرہ ریاستوں کو مدغم کر کے ایک بڑا صوبہ مغربی پاکستان بنا دیا۔

چوہدری محمد علی کی وزارت کا سب سے نمایاں اور اہم کارنامہ یہ ہے کہ چھ ماہ میں دستور مکمل ہو گیا، پاکستان کے قیام کے بعد یہ سب سے بڑا کام ہے۔ یہ آئین ۲۹ فروری ۱۹۵۶ء کو "آئین اسلامی جمہوریہ پاکستان" کے نام سے دستور ساز اسمبلی نے پاس کیا، اور ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء سے تمام ملک میں نافذ ہوا۔ سکندر مرزا اس ملک کے پہلے صدر مقرر ہوئے۔ اور چوہدری محمد علی صاحب پہلے وزیر اعظم بنے۔

اس آئین کی رو سے اردو اور بنگالی دونوں زبانوں کو ملک کی سرکاری زبانیں قرار دیا گیا، مملکت پاکستان کا تاج برطانیہ سے کوئی تعلق نہ رہا۔

میجر جنرل اسکندر مرزا صاحب جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کے پہلے صدر چنے گئے۔ اور چوہدری محمد علی پہلے وزیر اعظم بنائے گئے۔ آئین سازی کے بعد ملک میں جلد عام انتخابات کرانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ مسلم لیگ کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر خان کی قیادت میں ایک نئی پارٹی جس نام ری پبلکن پارٹی تھا۔ اور جو مسلم لیگ کے خارج شدہ ممبروں پر مشتمل تھی، معرض وجود میں آچکی تھی۔ ڈاکٹر خاں صاحب نے بالکل غیر آئینی طور پر گورنر جنرل کی علانیہ تائید سے مغربی پاکستان میں وزیر اعلیٰ کا عہدہ سنبھال لیا تھا۔ ری پبلکن پارٹی کے اکثر ممبر پاکستان کے مخالف تھے۔ چنانچہ جب چوہدری محمد علی نے استعفیٰ دیا۔ تو اس کے بعد عنان اقتدار اس پارٹی کے ہاتھ میں آگئی، قومی اسمبلی میں مسلم لیگ اقلیت میں ہو گئی تھی، اور کوئی اکیلی پارٹی وزارت بنانے کے قابل نہ تھی۔ چنانچہ حسین شہید سہروردی

قائد عوامی لیگ نے ری پبلکن پارٹی کے ساتھ مل کر مخلوط وزارت بنائی۔ شہید حسین سہروردی نے وزیر اعظم بننے کے بعد عوامی لیگ کو مالی طور پر مضبوط کرنے کے لئے پارٹی کے ممبروں کو درآمدی لائسنس دینے شروع کئے۔ اور لائسنس یافتہ لوگوں سے پارٹی کے لئے چندہ بھی اکٹھا کرنا شروع کیا۔ ملک میں جلد عام انتخابات کرانے کا وعدہ کیا۔

چوہدری محمد علی نے آئندہ الیکشن لڑنے کے لئے آل پاکستان بنیادوں پر ایک نئی پارٹی نظام اسلامی کی بنیاد ڈالی۔ اور اس کے لئے ملک کے دونوں حصوں کا دورہ کیا +

مشرقی پاکستان میں یہ پارٹی پہلے ہی موجود تھی۔ اس کو اور زیادہ مستحکم کیا گیا۔ صدر اسکندر مرزا بھی پارٹی بازی میں زیادہ دلچسپی دینے لگے۔ اوران کی یہ خواہش تھی، کہ آئندہ عام انتخابات کے بعد انہیں ہی دوبارہ صدر چنا جائے، چنانچہ انہوں نے سیاسی جوڑ توڑ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کر دیا +

قومی اسمبلی کے ممبران سے اکثر ملتے رہتے تھے، اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لئے، وہ ممبران پر اپنے صدارتی عہدہ کا دباؤ بھی ڈالتے رہے۔ ان حالات کی وجہ سے ملک میں سیاسی یک جہتی مفقود تھی۔ اور ہر طرف بدنظمی کا دور دورہ تھا۔ ملک کے دونوں صوبوں کی وزارتوں میں بھی خوب کشاکش تھی، مغربی پاکستان میں سردار رشید کے بعد مظفر علی قزلباش وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے، یہ پرانے یونینسٹ تھے، اور ۱۹۴۷ء میں اس نے پاکستان بننے کی سخت مخالفت کی تھی، مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کی حکومت تھی، لیکن مستحکم وزارت نہ تھی، اپنی اپنی وزارت کو قائم رکھنے کے لئے عطاء الرحمٰن کو کانگرس پارٹی کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا، اور پالیسی کانگرس کی ہی چلتی تھی، کانگرس مخلوط انتخابات کی حامی تھی، ابو حسین سرکار کی کرشک سرامک پارٹی عوامی لیگ کے مخالف تھی، اور جداگانہ انتخابات کی حامی تھی، یہ دونوں سیاسی جماعتیں برسرپیکار تھیں، مشرقی پاکستان میں غذائی قلت روز بروز نازک صورت اختیار کر رہی تھی، عوام بھوک کا شکار ہو جاتے تھے۔ مہنگائی زوروں پر تھی، عوامی لیگ اور کرشک پارٹی عوام کی تکلیفات کو دُور نہ کر سکی، بلکہ اپنی وزارتوں کو بچانے میں مصروف رہے +

اکتوبر ۱۹۵۷ء کو شہید حسین سہروردی کو وزیر اعظم کے عہدے سے استعفیٰ دینا پڑا۔ مرکز میں

اسمٰعیل چندریگر نے جو حزب مخالف کے لیڈر تھے نئی وزارت بنائی۔ مسلم لیگ ملک کے عام انتخابات جداگانہ انتخاب کے طریقے سے کرانا چاہتی تھی۔ اور ری پبلکن پارٹی نے اسی طریقے پر انتخابات کرانے کا وعدہ بھی کیا تھا، بعد میں انہوں نے وعدہ پورا کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ چندریگر کو بھی دو ماہ وزیر اعظم رہنے کے بعد مستعفی ہونا پڑا۔

چندریگر کے بعد ملک فیروز خاں نون نے دسمبر ۱۹۵۷ء میں وزارت عظمیٰ کا قلمدان سنبھالا اور ملک میں عام انتخابات جلد کرانے کا وعدہ کیا، ملک کی سیاسی حالت بہت کمزور ہو چکی تھی، اور قومی اسمبلی کا ہر ممبر وزیر بننے کے خواب دیکھ رہا تھا، وزیروں کی تعداد میں کافی اضافہ ہو چکا تھا، مالی حالت بھی بہت خراب تھی، ملک بیرونی امداد کے سہارے جی رہا تھا، غذائی حالت انتہائی تشویش ناک تھی، ۷ اکتوبر ۵۸ء کو اسکندر مرزا نے مارشل لا نافذ کر دیا، دستور منسوخ اور مجالس آئین ساز کو برطرف کر دیا۔

فوجی انقلاب

اکتوبر ۵۸ء میں جنرل محمد ایوب خاں کمانڈر انچیف نے مارشل لار کے ناظم اعلیٰ کے اختیار سنبھال لئے، چند دن ہی گزرے تھے کہ صدر اسکندر مرزا نے ۲۴ر اکتوبر ۵۸ء جنرل ایوب خاں کو وزیر اعظم بنا دیا، اس طرح اقتدار اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی، جنرل ایوب اس چیز کو سمجھ گئے، اور انہوں نے ۲۷ر اکتوبر کو اسکندر مرزا کو صدارت سے علیحدہ کر دیا، اور چار دن کے لئے کوئٹہ بھیج دیا، صدارت کا عہدہ بھی خود سنبھال لیا، وزیر اعظم کا عہدہ اڑا دیا گیا، یہ دوسرا انقلاب تھا، اور یہ بھی پُر امن طور پر ہوا۔

ابتدائی اقدامات

جنرل محمد ایوب خاں نے سب سے پہلے اسمگلنگ کی طرف توجہ دی۔ بڑے بڑے اسمگلروں کو گرفتار کیا، اور ان پر مقدمات چلا کر قید کر دیا، اور فوج کو تمام سرحد پر اسمگلنگ کو روکنے کے لئے مقرر کر دیا،

درآمدی لائسنس کو چور بازاری میں فروخت کرنا ممنوع قرار دیا، اس سے چور بازاری کا خاتمہ ہوا۔ اور درآمد شدہ اشیاء سستے داموں بازار میں مہیا ہونے لگیں۔

ملک کی مالی حالت کو اس طرح درست کیا کہ جس سرمایہ دار طبقہ نے ابھی تک کوئی انکم ٹیکس ادا نہیں کیا تھا، ان کو مجبور کیا کہ وہ پچھلے پانچ سال کی آمدنی ظاہر کرے اور اس پر ٹیکس ادا ادا کرے، جن انکم ٹیکس دہندگان نے کم انکم ٹیکس دیا تھا، ان کو بھی نئے سرے سے انکم ٹیکس گوشوارے بھرنے کا حکم دیا، اس طرح تقریباً ایک ارب ۴۳ کروڑ کے لگ بھگ آمدنی ظاہر ہوئی اور اس پر محکمہ انکم ٹیکس کو ۴۳ کروڑ روپیہ کے قریب ٹیکس وصول ہو گیا، جن بڑے بڑے زمینداروں

نے اپنے اثرورسوخ سے مالیہ ادا نہیں کیا تھا، ان سے بھی بقایا مالیہ وصول کیا، اس طرح خزانہ میں کروڑوں روپیہ کا اضافہ ہوا۔

جن امیر لوگوں کا سرمایہ غیر ممالک کے بنکوں میں محفوظ تھا، ان کو بھی مجبور کیا کہ وہ اپنا غیر ملک کے بنکوں میں جمع شدہ سرمایہ ظاہر کریں اس طرح زرمبادلہ کی کمی کو کسی حد تک پورا کیا۔

ان اقدامات سے پاکستان کی مالی و اقتصادی حالت کافی حد تک مضبوط ہوگئی، مہاجرین کو مستقل طور پر آباد کرنے کے لئے مختلف اقدامات کئے گئے، ان اقدامات کے علاوہ صدر ایوب نے زرعی اصلاحات کمیشن، تعلیمی کمیشن، قانونی کمیشن بھی نامزد کئے، زرعی اصلاحاتی کمیشن نے اپنی رپورٹ صدر کو پیش کی۔ اور صدر پاکستان کی کابینہ نے اس کی روشنی میں ۲۴ جنوری ۱۹۵۹ء کو مندرجہ ذیل فیصلے کئے:۔

(۱) کوئی شخص ۵۰۰ ایکڑ نہری اراضی یا ایک ہزار ایکڑ غیر نہری اراضی سے زیادہ زمین اپنی ملکیت یا قبضہ میں نہ رکھ سکے گا، اس کے علاوہ ڈیڑھ سو ایکڑ تک کے باغات جو کہ زمیندار نے مارشل لا سے پہلے لگوائے ہیں اپنے پاس رکھ سکے گا۔

(۲) تمام جاگیریں بغیر معاوضہ دئے ہوئے ختم کردی گئیں اس طرح برطانوی امپیریلزم کا جاگیری نظام ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔

(۳) تمام زائد زمینوں پر حکومت کا قبضہ متصور ہوگا۔ ان زائد زمینوں کی قیمت ۲۵ سال کے عرصہ میں زمین کے مالکان کو سالانہ اقساط کے ذریعے ادا کی جائے گی۔

یہ زائد اراضیات فروخت ہوں گی، اور کاشتکار ہی کو خرید کا پہلا حقدار ٹھہرایا گیا۔

(۴) کسی مزارع کو معقول وجہ کے بغیر زمین سے بے دخل نہیں کیا جائے گا

(۵) زرعی پیداوار بڑھانے کے لئے تمام قابل زمین کو استعمال میں لایا جائے گا۔

مارشل لا، کئی سال تک نافذ رہا، لیکن صدر ایوب نے ۱۹۶۲ء میں مارشل لا ہٹا دیا، وہ آئینی صدر بن گئے، ملک میں، نیا دستور رائج کردیا، صوبوں کی مجالس آئین ساز اور مرکزی مجلس قانون ساز بحال ہوگئیں، دستور کی رو سے پارلیمنٹری نظام کے بجائے صدارتی نظام رائج کیا گیا یعنی وزرار

مجالس آئین ساز کے سامنے جواب دہ نہیں ہیں، بلکہ صدر کے سامنے جواب دہ ہیں۔

نیا دستور اس نقطۂ نظر سے بنایا گیا، تاکہ ملک میں سیاسی پارٹیاں برسر عمل نہاں ہوںگی لیکن یہ تخیل عمل سے ہم آہنگ نہ ہو سکا، آخر سیاسی جماعتیں بحال ہو گئیں، مسلم لیگ کے دو ٹکڑے ہو گئے، ایک کنونشن مسلم لیگ جس کے صدر فیلڈ مارشل ایوب خاں صدر مملکت پاکستان ہیں، دوسری کونسل مسلم لیگ جس کے صدر خواجہ ناظم الدین سابق گورنر جنرل پاکستان ہیں، دونوں میں بنیادی اختلافات ہیں، لہذا، دونوں کا دائرہ کار بھی جدا ہے۔

سنہ ۶۴ء میں قومی اسمبلی نے جو قانون پاس کیا ہے، اس کی رو سے سنہ ۶۵ء میں نئے انتخابات ہوں گے، اور نیا صدر مملکت چنا جائے گا، (کنونشن مسلم لیگ کی طرف سے صدر ایوب کا نام پیش کیا جا رہا ہے، دوسری سیاسی جماعتیں متفقہ طور پر کسی امیدوار کا نام پیش کرنے کے لئے مشورے کر رہے ہیں، لیکن ان سطروں کے لکھتے وقت تک کسی نام کا اعلان ان کی طرف سے نہیں ہوا ہے۔

نو آزاد، نیم آزاد اور محکوم اسلامی ممالک

به ترتیب حروفِ تہجی

—

ایک جائزہ

آغازِ سخن

پاکستان بنتے وقت اور قیام پاکستان کے بعد کئی اسلامی ممالک آزاد ہوئے، یا منزل استقلال سے قریب تر پہونچ گئے یا مستقبل قریب میں عروس حریت سے ہمکنار ہونے والے ہیں، آئندہ صفحات میں اجمالی طور پر ان کا جائزہ لیا جائے گا۔

اس سرسری جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دوسری جنگ عظیم نے مجموعی حیثیت سے مسلمانوں کو بہت فائدہ پہونچایا، اگر یہ جنگ برپا نہ ہوئی ہوتی، تو نہ پاکستان بنتا، نہ دوسرے اسلامی ممالک پنجۂ استعمار سے رہائی حاصل کرتے، نہ بہت سے غیر اسلامی ممالک کو آزادی کی نعمت ملتی، شر میں خیر کا پہلو اسی طرح نمایاں ہوتا ہے۔

جن ممالک کا ہم نے جائزہ لیا ہے اس میں حروفِ تہجی کی ترتیب ملحوظ رکھی ہے۔

الجزائر

یہ علاقہ پہلے تیونس اور مراقش کے ساتھ ملحق تھا، الجزائر کے الگ اور جداگانہ نام سے یہ سولہویں صدی عیسوی میں وجود آیا جب ترکوں کی حکومت مغرب اقصیٰ کے وسطی علاقے پر قائم ہو گئی۔

لیکن ۱۹ ویں صدی میں حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ فرانس کا عمل دخل اس ملک پر ہو گیا۔

۱۹ ویں صدی کے نصف اول کے آخری دور میں ایک نوجوان عبدالقادر جزائری میدان میں اترا اور اس نے فرنچ استعمار و استبداد کے خلاف لوگوں کو ابھارنا اور اکسانا شروع کر دیا، عوام نے اس کا ساتھ دیا اور جوش و خروش سے جنگ آزادی شروع ہو گئی، اور عبدالقادر نے امیرالمومنین کا لقب اختیار کر لیا ۲۶ جولائی ۱۸۳۵ء کو عبدالقادر سے اور فرانس کی فوجوں سے خون ریز جنگ ہوئی جس میں عبدالقادر کا پلہ بھاری رہا اسے افریقہ میں اسلام کا نجات دہندہ تصور کیا جانے لگا، غازی عبدالقادر نے اتنی قوت حاصل کر لی کہ ۱۸۳۷ء میں فرانس کو دب کر اور جھک کر اس سے صلح (با دل نخواستہ) کر لینی پڑی۔

لیکن فرانس کی استعمار پسندانہ ذہنیت اس صلح پر قائم نہ رہی، بار بار اس کی طرف سے عہد شکنی ہوتی رہی، جنگ و پیکار کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ آخر ۲۳ دسمبر ۱۸۴۶ء کو فرانسیسی فوجوں نے اس مرد مجاہد کو گرفتار کر لیا، ۱۸۸۳ء میں یہ جلاوطن مجاہد بمقام دمشق اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

لیکن الجزائر کے غیور اور جری باشندے غلامی پر قانع نہ ہو سکے، فرانس نے ظلم و سفاکی،

دہشت اور بربریت کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا لیکن حریت پرستوں کے دم خم میں کوئی فرق نہ آیا، ہزارہا ہزار الجزائری گرفتار ہوئے اور ہلاک کئے گئے، لیکن اس کی عزیمت اور استقامت میں تزلزل نہیں پیدا ہوا۔ ۱۹۳۰ء سے لے کر ۱۹۶۲ء تک الجزائر کے باشندوں نے پانی کی طرح اپنا خون بہایا اور فرانسیسی استعمار و استبداد کے مقابلے میں ایک چٹان کی طرح جمے رہے، زخم کھاتے رہے، لٹتے رہے، مرتے رہے، قتل کیے جاتے رہے، تباہ و برباد ہوتے رہے، لیکن آزادی کا جذبہ انھوں نے سرد نہیں ہونے دیا۔

الجزائر کا رقبہ ۸۴۷۵۰۰ مربع میل ہے۔

آبادی ۱۱ ملین سے زیادہ ہے جس میں ۲۸ لاکھ کے قریب یورپین اقلیت ہے، یہودی بھی ڈیڑھ لاکھ کے قریب بستے ہیں۔

بالآخر عرصہ دراز کی جدوجہد کے بعد ۳؍جولائی ۱۹۶۲ء کو الجزائر آزاد ہوگیا، اگست ۱۹۶۲ء بن بیلا اس آزاد مملکت کے سربراہ بن گئے، جنہیں عوام پوجتے ہیں اور جن کا اخلاص و ایثار ہر طرح کے شک و شبہ سے بالا ہے۔

انڈونیشیا

یہ مجمع الجزائر ہے، پہلے یہ شرق الہند کے نام سے مشہور تھا، ۱۸۸۴ء میں ایک جرمن ماہر نسلیات نے اسے انڈونیشیا کا نام دیا، جو شروع میں تو نہیں، لیکن کچھ عرصے بعد، زبان زد خاص و عام ہو گیا۔

انڈونیشیا کا مجموعی رقبہ ۷۳۵۰۰۰ مربع میل ہے، اور آبادی آٹھ کروڑ کے لگ بھگ ہے۔

اس علاقے میں جاوا، سماٹرا اور بورنیو وغیرہ بھی شامل ہیں۔ جاوا کی آبادی ۵ کروڑ سے زائد ہے سماٹرا کی آبادی ایک کروڑ کے قریب ہے، باقی جزائر میں بہت کم آبادی ہے اور یہ جزائر ہزاروں ہیں۔

انڈونیشیا متعدد نسلوں کا گہوارہ ہے، ملائی نسل بھی یہاں موجود ہے، اس ملک میں مسلمانوں کی غالب ترین اکثریت ہے، یعنی ۸ کروڑ کی تعداد میں ساڑھے سات کروڑ مسلمان ہیں، پہلے بدھ مت اور ہندو مت یہاں کا عام مذہب تھا لیکن اسلام کے مبلغوں نے اسے مسلمان بنا لیا۔

اس ملک پر انگریزوں اور دوسری مغربی حکومتوں کی للچائی ہوئی نظریں پڑتی رہیں، وقتاً فوقتاً انہوں نے اس کے بعض حصوں پر قبضہ بھی کر لیا، لیکن رفتہ رفتہ اس ملک پر قابض ہو گئے اور یہاں کے تمام ذرائع و رسائل پر قبضہ کر کے باشندوں کو اپنا غلام بنا لیا لیکن وہاں کے آزادی خواہ عوام برابر اس استعمار کے خلاف جدوجہد کرتے رہے، بالآخر تین سو برس کے بعد ہالینڈ کو بادل نخواستہ اسے آزاد کرنا پڑا اور ۱۹۴۹ء میں انڈونیشیا آزاد ہو گیا۔ ڈاکٹر احمد سوکارنو سلطان شہریار ڈاکٹر حتا اور دوسرے مجاہدین حریت کی مساعی بارآور ہوئیں اور سامراج کا نشان وہاں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا، اب انڈونیشیا ایک آزاد اور خود مختار مملکت ہے اور ڈاکٹر سوکارنو صدر مملکت ہیں۔

۱۹۴۲ء میں جب جاپان کی برق رفتار فوجیں، کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھیں انہوں نے انڈونیشیا پر بھی قبضہ کر لیا۔ جولائی ۱۹۴۳ء میں جاپان کے وزیر اعظم ٹوجو نے اعلان کیا کہ بہت جلد انڈونیشیا آزاد ہو جائے گا، شروع اگست ۱۹۴۵ء میں جاپانیوں نے انڈونیشیا کو آزاد کرنے کی تاریخ مقرر کر دی، لیکن ۱۴ اگست کو وہ ایٹم بم کے باعث بے بس ہو کر اتحادیوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن اہل انڈونیشیا نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا، ۱۹ ستمبر ۱۹۴۵ء میں انگریزی فوج انڈونیشیا میں اتار دی گئی، ولندیزی چاہتے تھے انگریز انڈونیشیا کو ان کے حوالے کر دیں، انگریز اس خیال کے حامی تھے، وہ انڈونیشیا کی جمہوری حکومت کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے آخر ولندیزی فوجیں انڈونیشیا میں اتر گئیں، جس کا نتیجہ شدید کشت و خون اور ہنگامہ آرائی کی صورت میں برآمد ہوا۔ نومبر ۱۹۴۶ء میں انگریز ولندیزیوں کو انڈونیشیا کی حکومت سونپ کر واپس چلے گئے۔ ۵ مارچ ۱۹۴۷ء کو ہالینڈ کی حکومت نے انڈونیشیا کے لیڈروں سے ایک معاہدہ کر لیا لیکن بار بار وہ اس کی خلاف ورزی کرتے رہے کہ انڈونیشیا کو بدستور غلام رکھیں اور اس کے وسائل و ذرائع سے فائدہ اٹھاتے رہیں، لیکن عوام کے جذبہ آزادی نے یہ آرزو پوری نہ ہونے دی۔ متعدد خونریزیوں کے بعد مجلس اقوام متحدہ نے مداخلت کی (۳۰ جولائی ۱۹۴۷ء) ۱۷ جنوری ۱۹۴۸ء کو پھر انڈونیشیا کی جمہوری حکومت اور ہالینڈ میں معاہدہ ہو گیا جس کی رو سے انڈونیشیا کی آزادی تسلیم کر لی گئی، لیکن ہالینڈ کی حکومت اس عہد پر بھی قائم نہ رہی، اس نے پھر خلاف ورزیاں شروع کیں، جن کا نتیجہ سخت کشت و خون اور جنگ و پیکار کی صورت میں نکلا ۲۸ جنوری ۱۹۴۹ء کو سلامتی کونسل نے پھر مداخلت کی، لیکن اس کی مداخلت کے باوجود ہالینڈ کے سامراجی انداز و اطوار میں کوئی فرق نہیں آیا، ساتھ ہی ساتھ انڈونیشیا کی جمہوری حکومت بھی زور و شور سے مقابلہ کرتی رہی، آخر بڑی خوں ریزی اور ہنگامہ آرائی کے بعد نومبر ۱۹۴۹ء میں ہیگ کی گول میز کانفرنس کے نتیجہ کے طور پر متحدہ انڈونیشیا کو اقتدار اعلیٰ ہالینڈ کی حکومت نے بادلِ نخواستہ منتقل کر دیا اور اس طرح تین سو برس کی غلامی سے اسے نجات مل گئی

ذیل میں انڈونیشیا کی فوجی اور عسکری حکومت کا ایک نقشہ پیش کیا جا رہا ہے:۔

انڈونیشیا کے دفاعی اعداد و شمار

فضائیہ (۲۰،۰۰۰ فوجی)

لڑاکا طیارے

۲۱ مگ	۱۲
۱۵ مگ	۷۰ روسی
۱۷ مگ	۳
کل تعداد	۸۵

اس کے علاوہ زمین سے فضا میں مار کرنے والے روسی میزائیل۔

بمبار طیارے

۱۶ ٹی یو (روسی)	۳۰
۲۸ آئی ایل بیگل (روسی)	۲۳
این امریکی بی ۲۵ مچل	۱۸
این یو ۲۰۰ سکمباتک (انڈونیشیا)	۱
کل تعداد	۷۲

۱۶ طیاروں کے لئے زمین سے فضا میں مار کرنے والے میزائل ان کے علاوہ ہیں۔

باربردار طیارے

۱۴ آئی ایل (روسی)	۱۲
ڈی ایچ اوٹر (کینیڈین)	۱۱
لاک ہیڈ سی ۱۳۰ بی (امریکن)	۱۰
ڈگلس سی ۴۷ (امریکن)	۱۱
گرومن، ہیٹرون (امریکن)	۶
دیگر	۴
کل تعداد	۴۹

تربیتی طیارے

فوجی ٹی ۳۴ (جاپانی)	۴۰

ایسے پچاس مزید طیارے درآمد کئے جائیں گے۔

این امریکن ایف ۵ ڈی (کے این)	۴۰
۹ بیلانگ (انڈونیشی) نامعلوم ۱۵ مگ	۴
دیگر	۵
کل تعداد	۸۹

ہیلی کاپٹر بیل ۲۰۴ بی (امریکن)	۲
ایم آئی ۴ / ایم آئی ۴ (روسی)	۴
ہیلر ۳۰۰ (امریکن) (امریکی)	۷
میٹسوبشی ایس ۵۵ سی (جاپان)	۶

بری فوج (۱،۹۰،۰۰۰ فوجی)

انڈونیشیا کی بری فوج کی مجموعی تعداد میں تیس ہزار چھاتہ بردار سپاہی بھی شامل ہیں۔ علاوہ ازیں بیس ہزار ملٹری پولیس کے سپاہی اور ایک لاکھ چالیس ہزار محفوظ فوج کے سپاہی ہیں۔

اسلحہ: بھاری دور مار اور طیارہ شکن توپیں (روسی) ۱۰۵ ہلکے طیارے ۲۰۰ ہلکی بکتر بند گاڑیاں چھوٹے ٹینک ۴۰۰۔

بحریہ ۱۶،۱۰۰ فوجی		بمبار اور پٹرولر	
جہاز		کونوبر (امریکی)	۴
طیارہ بردار	۱	فیری کننٹ اے ایس ۴ (برطانوی)	۱۶
تباہ کن	۵	مال بردار	
فریگیٹر	۴	فیری کننٹ ٹی ۵	۲
(میزائل بھی لگے ہوئے ہیں)		گورومن	۴
مائنز ویسل	۱۶	ہیلی کوپٹر	
آبدوزیں	۲۰	مٹ سبیشی ایس ۵۵ سی	۴
چھوٹے جہاز	۱۸۷		
کل تعداد	۲۳۳		

افنی

یہ مراقش کا علاقہ ہے، جسے سلطان نے بادشاہ اسپین کی سپردگی میں دیا تھا (۱۸۶۰ء) لیکن معاہدے میں اس کی وضاحت تھی کہ اس پر اسپین کی حکمرانی کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ مگر ۱۹۳۴ء میں اسپین نے یہاں اپنا پرچم لہرایا اور اسے اپنے مقبوضات میں شامل کر لیا۔

افنی کی کل آبادی پچاس ہزار ہے، جس میں پانچ ہزار یورپین ہیں جن میں غالب تعداد اسپین کے باشندوں کی ہے۔ اس کا رقبہ ۷۴۱ مربع میل ہے۔ افنی کی بازیابی کا سوال کئی مرتبہ اٹھا لیکن اسپین نے اس پر گفتگو کرنے سے انکار کر دیا۔

۱۲ جنوری ۱۹۵۸ء کو افنی کا علاقہ اسپین کا صوبہ بن گیا جس پر ایک گورنر جنرل ہے۔ یہی کیفیت اسپینی صحارا کی بھی ہے۔ آزادی کی جدوجہد جاری ہے۔

ایریٹریا

دوسری جنگِ عظیم کے بعد جہاں کئی مسلمان ملک آزاد ہوئے وہاں ایسے ممالک بھی ہیں، جو غلام بنا لیے گئے اور ان کی غلامی کا مداوا مجلس اقوام متحدہ بھی نہیں کر سکی۔

انہی بدقسمت مسلم اکثریت کے علاقوں میں ایک علاقہ ایریٹریا کا ہے۔

ریاست ایریٹریا قدیم زمانے میں مصر کے ماتحت تھی۔ بنو امیہ کے عہد میں یہ اسلامی سلطنت کا جزو بنی، لیکن چند صدیوں کے بعد اسے آزادی حاصل ہو گئی اور حبشہ کی دست درازیوں کے باوجود اس نے اپنی آزادی برقرار رکھی۔ سولھویں صدی میں پرتگیزوں اور حکومت حبشہ کی تاخت و تاراج سے تنگ آ کر ایریٹریا نے ترکی کی سرپرستی قبول کر لی۔ آخر ۱۸۸۵ء میں اٹلی نے اس پر قبضہ کر لیا۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد یہ ملک اٹلی سے برطانیہ کے زیرِ انتظام آ گیا اور یہ تاریخ کے کسی دور میں بھی حبشہ میں شامل نہیں رہا۔

ایریٹریا کی آبادی ساڑھے بائیس لاکھ افراد پر مشتمل ہے جن میں سے اٹھارہ لاکھ مسلمان ہیں۔ کل رقبہ پینتالیس ہزار مربع میل ہے۔

دوسری عالمگیر جنگ کے خاتمہ پر برطانیہ نے ایریٹریا کے لوگوں کو ملک کے سیاسی معاملات میں حصہ لینے کا موقع دیا۔ اس طرح سیاسی پارٹیاں قائم ہوئیں۔ مسلمانوں نے ۴، دسمبر ۱۹۴۶ء کو ایریٹرین مسلم لیگ پارٹی کی تشکیل کی جس کا مقصد مسلمانوں کے لیے آزادی کی جدوجہد قرار پایا۔

حبشہ کی نظریں شروع ہی سے ایریٹریا پر لگی ہوئی تھیں اس لیے اس نے چند ایریٹرین عیسائیوں کو شہ دے کر یونینیسٹ پارٹی قائم کرا دی جس نے ایریٹریا اور حبشہ کی یونین بنانے کا

مطالبہ کردیا۔

مسلمانوں نے مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہو کر مکمل آزادی کے لیے ایک باقاعدہ محاذ قائم کردیا۔ چونکہ اس محاذ کو غالب اکثریت حاصل تھی۔ اس لیے حبشہ کو اپنے عزائم کی تکمیل مشکوک نظر آنے لگی۔ چنانچہ حبشہ کی حکومت نے مسلم لیگ اور اس کے ہم خیال لبرل پروگریسو پارٹی کی ممتاز شخصیتوں پر دستی بموں اور آتش گیر مادے سے حملے کرائے جن کی بدولت مسلم لیگ کے صدر سید عبدالقادر محمد صالح کبیری اور لبرل پارٹی کے رہنما جازماش بارے قتل ہوئے۔

۱۹۵۰ء میں جب اقوام متحدہ کا ایک کمیشن اریٹیریا کے مسئلہ کی تحقیقات کے سلسلہ میں اسمرا پہنچا تو حبشہ نے اسمرا میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان خونریز جنگ چھیڑ دی۔ حبشہ نے کھلم کھلا عیسائیوں کی مدد کی۔ یہ جنگ پانچ روز جاری رہی اور اپنے پیچھے جانی و مالی نقصان کا ایک طویل سلسلہ چھوڑ گئی۔

۱۹۵۰ء میں مسئلہ ایریٹیریا پر تحقیقات کرنے والا اقوام متحدہ کا کمیشن جس میں برما، گوئٹے مالا، ناروے، پاکستان اور جنوبی افریقہ کے نمائندے شامل تھے۔ حبشہ کی بے جا مداخلت کے باعث ناکام واپس لوٹا۔ کمیشن کے ارکان نے مختلف آراء کا اظہار کیا لیکن اس پر سب متفق تھے کہ ملک کی غالب اکثریت حبشہ کے ساتھ الحاق کی مخالف ہے۔

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں جب کمیشن کی رپورٹ پیش ہوئی تو امریکہ کے مندوب نے ایریٹیریا اور حبشہ کی فیڈریشن بنانے کی قرارداد پیش کردی اور اسے منظور کرانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔

چنانچہ ۲ دسمبر ۱۹۵۰ء کو جنرل اسمبلی نے یہ قرارداد منظور کرلی۔ اسمبلی نے سفارش کی کہ ایریٹیریا حبشہ کے تحت ایک خود مختار یونٹ ہوگا جسے داخلی امور میں قانون سازی، انتظامی اور عدالتی اختیارات حاصل ہوں گے۔

وفاقی حکومت دفاع، امور خارجہ، مالیات، تجارت اور خارجی مواصلات کی ذمہ دار ہوگی دونوں یونٹوں کے مساوی نمائندوں پر مشتمل شاہی وفاقی کونسل بنائی جائے گی اور اریٹیریا کے

پہ جمہوری حکومت کے اصولوں پر مبنی دستور بنایا جائے گا۔

اقوام متحدہ کی قرارداد کی رو سے ایریٹریا کو اس شرط پر جمہوری دستور دیا گیا تھا کہ وہ حبشہ کی مطلق العنانیت کو قبول کرے گا۔

حبشہ میں شہنشاہ کو پارلیمنٹ کے فیصلہ کو رد کرنے کا اختیار دستوری طور پر حاصل ہے۔ لہٰذا شہنشاہ ہیلی سلاسی نے وفاقی حکومت کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے ۱۴، نومبر ۱۹۶۲ء کو ایریٹریا کا ادغام حبشہ سے کر دیا۔

ایریٹریا کا پرچم، امتیازی نشانات اور سرکاری زبانیں عربی اور انگریزی ختم کر دی گئیں اقوام متحدہ کی قراردادوں کو بالائے طاق رکھ کر دہشت اور غارت گری کی انتہا کر دی گئی سینکڑوں ایریٹرین باشندوں کو بغیر مقدمہ چلائے قتل کر دیا گیا یا جیلوں میں ٹھونس دیا گیا۔

تیونس

۱۲ مئی ۱۸۸۱ء کو تیونس پر فرانس کی حکمرانی، وہاں کے "بے" یعنی سلطان نے باقاعدہ قبول کر لی اور اس طرح یہ ملک تو اسلامی رہا، لیکن اسلامی حکومت فرانس کے ہاتھ میں آ گئی، وزارت کے تمام عہدے بھی انہی غیر ملکیوں کے لیے وقف تھے، تیونس کے تمام وسائل و ذرائع فرانس کی ملکیت بن چکے تھے۔

پہلی جنگ عظیم جب شروع ہوئی تو ۱۹۱۵ء میں تیونس کے باشندوں نے ترک سپاہیوں اور جیالوں کی قیادت میں فرانس کے خلاف آزادی کی جنگ روز شور سے لڑی، کشت و خون کا بازار گرم ہوا اور فرانس حواس باختہ ہو گیا، اس نے کئی موقعوں پر زک کھائی، لیکن بالآخر اس نے اپنی بالادستی قائم کر لی۔

۱۹۲۲ء میں فرانس نے رائے عامہ کے دباؤ سے متاثر اور مجبور ہو کر مجالس آئین ساز قائم کیں لیکن اختیارات زیادہ سے زیادہ اپنے پاس رکھے، اصلاحات سیاسی کا یہ ڈھونگ ایک پُر تکلف نمائش سے زیادہ کچھ نہ تھا۔

لیکن اب تیونس کے عوام میں، خواص میں اور تعلیم یافتہ طبقے میں آزادی کا شعور پیدا ہو رہا تھا۔ ۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۵ء میں آزادی کی تحریک وہاں خوب پھلی پھولی۔

قوم پرستوں اور حریت خواہوں کو ایک نڈر، مخلص، اور جاں باز لیڈر ——— حبیب بورقیبہ ——— مل گیا جس نے فرانس کی استعماری حکومت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، اور اپنی زندگی کے ۱۷ سال قید و بند اور مصائب میں بسر کیے، حبیب بورقیبہ کی جماعت اور "نیو دستور پارٹی" ملک کی آرزوؤں، امنگوں اور حوصلوں کی ترجمان بن گئیں۔

۱۷ جولائی ۱۹۵۴ء کو مندیس فرانس، وزیر اعظم فرانس نے بورقیبہ سے جو قید و بند کی زندگی بسر کر رہے تھے، گفتگوئے مفاہمت کی۔

۳۱ جولائی ۱۹۵۴ء کو وزیر اعظم فرانس نے تیونس کا دورہ کیا اور اعلان کیا کہ تیونس کو ہوم رُول دے دیا جائے گا۔

یکم جون ۱۹۵۵ء کو بورقیبہ فاتحانہ شان سے تیونس میں داخل ہوئے، ۳ جون ۱۹۵۵ء کو پیرس میں فرانس اور تیونس کے مابین معاہدہ ہوگیا، ۲۰ مارچ ۱۹۵۶ء کو تیونس کی مکمل آزادی ایک معاہدے کی رو سے فرانس نے تسلیم کرلی، نئے انتخابات میں بورقیبہ کی پارٹی کو غیر معمولی اکثریت حاصل ہوئی اور بورقیبہ آزاد تیونس کے پہلے وزیر اعظم بن گئے۔

۲۵ جولائی ۱۹۵۷ء کی مجلس دستور ساز نے تیونس کے فرماں روا کو معزول کر دیا، جو فرانس کے ہاتھ کا کھلونا تھا اور جمہوریہ تیونس کے قیام کا اعلان کر دیا۔

زنجبار

عرب کہاں نہیں پہونچے؟ اور جہاں بھی پہونچے اپنے غیر فانی نقوش قائم کر گئے۔ ہندوستان ہو، یا پاکستان، یورپ ہو یا افریقہ، جہاں جائیے، جدھر دیکھئے۔

کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی
ادھر ہو کر ابھی کوئی گیا ہے

اقبال نے جو کہا ہے۔

دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں

یہ صرف شاعری اور تخیل کی پرواز نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ ٹھوس اور ناقابلِ تردید حقیقت! زنجبار کا افریقی علاقہ بھی اپنی دلکشی اور رعنائی، ترقی و تعمیر اور شادابی و زرخیزی میں عربوں کی جدوجہد اور اخلاص و استقلال کا رہین منت ہے، اگر عربوں کے قدم وہاں نہ پہونچتے تو یہ علاقہ اپنے آس پاس کے علاقوں کے ساتھ اب تک "تاریک براعظم" کا ایک حصہ ہوتا۔

ذیل میں زنجبار کی مختصر تاریخ، آزادی اور فوجی انقلاب تک پیش کی جاتی ہے۔

مشرقی افریقہ کی ساحلی مملکت زنجبار کے جزائر پر ۱۰ دسمبر ۱۹۶۳ء کی صبح کو آزادی کا سورج طلوع ہوا۔ برطانیہ نے ۹ اور ۱۰ دسمبر کی درمیانی شب ۱۲ بجے زنجبار کو آزاد کر دیا۔ انتقال اقتدار کی رسوم ادا کرنے کے لیے ملکہ برطانیہ کے شوہر ڈیوک آف ایڈنبرا زنجبار آئے اور پھر ۱۰ دسمبر کو آزاد زنجبار کے پرچم نے یونین جیک کی جگہ لے لی۔ اکیس توپوں کی سلامی سے آزادی کا استقبال کیا گیا۔ ۱۱ دسمبر کو سلطان کا شاہی جلوس نکلا جس کے بعد اس نو آباد مملکت کے سربراہ نے

قومی اسمبلی کا افتتاح کیا اور اس کے بعد زنجبار کے دوسرے بڑے جزیرے پمبا کا دورہ کیا۔

اس مملکت کا سب سے بڑا جزیرہ زنجبار ہے جس کا رقبہ ۶۴۰ مربع میل ہے، دوسرے بڑے جزیرہ پمبا کا رقبہ ۳۸۰ مربع میل ہے، یہ جزیرہ زنجبار سے ۲۵ میل شمال مشرق کی طرف واقع ہے۔ ان کے علاوہ زنجبار کے شہر سے ۶۰ میل جنوب میں لاتھم کا جزیرہ بھی ہے جو بالکل ساحل مشرقی افریقہ سے ملا ہوا ہے۔ زنجبار جغرافیائی اعتبار سے افریقہ میں ہے مگر اس کی تاریخ کا تعلق ہمیشہ عربوں سے رہا۔ تاریخ یونان کے مطابق پہلی صدی قبل مسیح میں زنجبار کے جزائر جنوب مغربی عرب حکومت کے زیرِ نگیں تھے اور آج تخت زنجبار پر جو سلطان فروکش ہیں وہ ان ہی قدیم عربوں کے جانشین ہیں۔

۱۵۰۳ء میں پرتگال نے زنجبار پر قبضہ کر لیا۔ مگر پمبا والے کافی عرصے تک مزاحمت کرتے رہے۔ آخر کار ۱۵۲۸ء میں زنجبار کے ساتھ پمبا نے بھی تاجِ پرتگال کی بالادستی اور اقتدار کو تسلیم کر لیا۔ ۱۷ویں صدی عیسوی میں پرتگالی حکومت کو شمال کی طرف سے آنے والے ایک طاقتور دشمن کا سامنا کرنا پڑا۔ خلیج فارس کی مملکت عمّان کے حکمران نے اپنے جزائر سے تمام غیر ملکیوں کو نکال باہر کیا اور پھر اس کے بعد بحرِ ہند میں اپنے سابق مقبوضات سے بھی غیر ملکیوں کو نکالنے کے لیے بحری بیڑے روانہ کر دیئے۔ ۱۶۹۸ء میں تین سال کے محاصرہ کے بعد عمان کی فوج نے فورٹ جیس نامی قلعہ فتح کیا اور اس کے ساتھ ہی زنجبار اور پمبا کے جزائر نے بھی عمان کے حکمران سے صلح کر لی۔ اس کے بعد ایک سو سال تک عرب مشرقی افریقہ اور ان جزائر میں مزروعی اور بو سعیدی خاندانوں میں جنگ اقتدار جاری رہی۔ آخر سعید بن سلطان نے اس مملکت کو متحد کر دیا۔ سعید بن سلطان ۱۴ سال کی عمر میں ۱۸۰۴ء کے دوران اپنے والد کے انتقال پر برسرِ حکومت آیا اور دس سال تک مسلسل اپنی مملکت عمان کو مستحکم بنانے میں مصروف رہا۔ خلیج فارس کو سمندری لٹیروں سے پاک کیا۔ اور پھر ۱۸۲۲ء میں مشرقی افریقہ کے مقبوضات کی طرف متوجہ ہوا۔ اس زمانہ میں یہاں غلاموں کی تجارت زوروں پر تھی۔ حکومت برطانیہ نے بھی اس لعنت کے خلاف مہم میں سلطان کا ساتھ دیا۔

سلطان سعید نے فوراً ہی زنجبار کی تجارتی اہمیت کا اندازہ لگا لیا اور ان جزائر کے کئی

دوروں کے بعد آخر کار ۱۸۳۷ء میں اس نے زنجبار کی بندرگاہ کو دارالحکومت قرار دے کر یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی اور ان پورے جزائر کو غیر ملکی تسلط سے آزاد کرا لیا۔

سلطان سعید کے انتقال پر جانشینی کے معاملہ میں بڑے بھائی مسقط کے سید طوینی اور زنجبار کے سید مجید کے درمیان سخت جھگڑا ہوا۔ اس تنازعہ میں ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ کیننگ کو ثالث مقرر کیا گیا۔ ثالث نے فیصلہ کیا کہ سید مجید کے افریقی مقبوضات ان کے تحت آزاد مملکت سمجھے جائیں گے۔ اس طرح عمان اور زنجبار کو سیاسی طور پر ایک دوسرے سے الگ کر دیا گیا۔ سید مجید نے ۱۸۷۰ء تک حکومت کی۔

سید مجید کے بعد اس کا بھائی سید برغش تخت نشین ہوا۔ اس سلطان نے زنجبار کی ترقی پر بے دریغ روپیہ بہایا۔ پینے کے مقطر پانی کا اہتمام کیا۔ رفاہ عامہ کی عمارتیں تعمیر کرائیں، زنجبار کے شہر کو زبردست توسیع و ترقی دی ۱۸۷۲ء میں ایک زبردست طوفان آیا جس سے جزائر زنجبار میں لونگ اور ناریل کی دو تہائی فصلیں تباہ ہو گئیں لیکن سلطان برغش نے پامردی سے کام لیا ساری فصلیں نئے سرے سے لگوائیں۔ ۱۸۷۳ء میں اس نے اپنی مملکت میں غلاموں کی تجارت پر پابندی لگا دی اور مملکت زنجبار سے غلاموں کی برآمد کو ممنوع قرار دے دیا۔

سلطان برغش کے انتقال پر اس کا ایک بھائی سید خلیفہ برسر اقتدار آیا اور اس کے بعد سلطان سعید کا سب سے چھوٹا بیٹا سید علی تخت نشین ہوا۔ سید علی نے ۱۸۹۰ء سے ۱۸۹۳ء تک یعنی صرف تین سال حکومت کی۔ اس کے دور حکومت کے پہلے ہی سال جرمنی اور فرانس نے زنجبار اور پیمبا پر برطانوی مفادات کی بالادستی کو تسلیم کر لیا۔ برطانیہ نے زنجبار کو اب باقاعدہ اپنے مقبوضہ علاقے میں شامل کر لیا اور اس کے بدلے مدغاسکر فرانس اور ہیلی گولینڈ جرمنی کے حوالے کر دئے۔ اس سال سلطان نے غلاموں کی تجارت کو ممنوع قرار دینے کے لیے ایک باقاعدہ قانون نافذ کیا۔

سید علی کے بعد عمان کے حکمران کا بیٹا سید حامد زنجبار کا حکمران ہوا اور اس کے دورِ حکومت میں برطانیہ نے مملکت زنجبار کے ان علاقوں پر قبضہ کیا جو آج کینیا اور یوگنڈا کہلاتے ہیں۔ اب یہ علاقے بھی انگریزوں سے آزادی حاصل کر چکے ہیں۔ ۱۸۹۶ء میں سید حامد کے انتقال پر سابق سلطان برغش کا نوجوان بیٹا سید خالد تخت پر بیٹھا۔

سلطان خالد کی جلاوطنی کے بعد سلطان سعید کے پوتے سید محمود کو انگریزوں نے گدی پر بٹھایا اور اس کے دورِ حکومت میں غلاموں کی تجارت کا مکمل استیصال ہو گیا۔ اس کے بعد ۱۹۰۵ء میں اس کا بیٹا سید علی حاکم زنجبار بنا۔ سید علی نے برطانیہ کے مشہور اسکول ہیرو میں تعلیم حاصل کی تھی۔ پھر وہ پیرس گیا، جہاں اس کے رشتے کا بھائی سید خلیفہ بھی اس کے ساتھ تھا۔ سید علی نے زنجبار واپس آکر تخت سے دست بردار ہونے کا اعلان کر دیا۔ اور اس کی جگہ ۱۹۱۱ء میں انگریزوں نے سید خلیفہ کو گدی پر بٹھا دیا۔ سید خلیفہ ۱۹۶۰ء تک حکومت کرتے رہے۔ زنجبار میں اس سے زیادہ اور کسی سلطان نے حکومت نہیں کی تھی۔

۱۹۱۳ء میں زنجبار کے برطانوی مقبوضہ علاقہ کی نگرانی برطانیہ کے دفترِ خارجہ سے دفترِ نوآبادیات کو منتقل کر دی گئی اور زنجبار میں انگریز ریذیڈنٹ مقرر کر دیا گیا۔ سید سر خلیفہ بن ہارون برطانیہ کے بہت بڑے حامی تھے اور پہلی جنگ عالمگیر کے دوران مشرقی افریقہ کے پورے علاقے نے انگریزوں کا جو ساتھ دیا وہ دراصل اس سلطان کی کوششوں اور اثر و رسوخ کا نتیجہ تھا۔ اس سلطان کے دورِ حکومت میں آئینی اصلاحات نافذ ہوئیں جن کے نتیجے میں ۱۹۵۷ء کے دوران پہلے عام انتخابات ہوئے۔ اکتوبر ۱۹۶۰ء میں سید سر خلیفہ کا بعمر ۸۱ سال انتقال ہو گیا۔ اور ان کی جگہ ان کے بیٹے سید سر عبداللہ بن خلیفہ تخت نشین ہوئے۔ مگر ڈھائی سال بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا، تاہم ان کے دورِ حکومت میں زنجبار داخلی خود مختاری حاصل کر چکا تھا۔

پھر ہز میجسٹی سید جمشید بن عبداللہ زنجبار کے تخت پر بیٹھے، عام انتخابات ہوئے۔ زنجبار نیشنلسٹ پارٹی اور زنجبار پیپلز پارٹی کی مخلوط گورنمنٹ قائم ہوئی اور اس حکومت نے آزاد زنجبار کا نظم و نسق چلانے کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

لونگ زنجبار کی سب سے بڑی پیداوار ہے۔ دنیا بھر میں لونگ کی پیداوار کا ۸۵ فیصد زنجبار میں پیدا ہوتا ہے۔ اور زنجبار کی برآمدات کا ۷۲ فیصد حصہ لونگ کی برآمد پر مشتمل ہے۔ اور زنجبار میں بھی لونگ پمبا کے جزیرہ میں ہوتی ہے۔ زنجبار سے ہر سال تقریباً چار کروڑ روپے کی لونگ اور لونگ کا تیل برآمد ہوتا ہے، سال میں لونگ کی دو فصلیں ہوتی ہیں۔ جزائر زنجبار میں اس وقت لونگ کے تقریباً ۴۵ لاکھ درخت ہیں اور ہر موسم میں لونگ کے پھول چننے کے لئے تقریباً

چالیس ہزار مزدور کام کرتے ہیں۔

لیکن یہ آزادی راس نہ آئی،!

زنجبار آزاد ہوگیا، لیکن اندر ہی اندر آگ سلگ رہی تھی۔

اوپر اوپر پھول کھلے تھے اندر اندر آگ!——

یہ پھول آزادی کے تھے، اور یہ آگ "عرب حبشی" منافرت کی تھی۔

جب تک انگریزوں کی حکومت قائم تھی، عرب حکمران رہے، لیکن جیسے ہی انگریز ہٹے فوراً وہاں فوجی انقلاب رونما ہوا، جس نے عربوں کے سارے اقتدار کو ختم کردیا۔

زنجبار میں انقلاب افریقی قوم پرستوں اور ایسے کمیونسٹوں کے تعاون سے لایا گیا ہے جن کے روس، چین اور کیوبا سے گہرے روابط ہیں انقلابیوں نے کاسترو قسم کی وردی اتاردی اور زنجبار میں روزمرہ کی زندگی بحال ہوگئی ہے لیکن اس ظاہری سکون کے پس پردہ اقتدار کے لیے کشمکش جاری ہے۔ سلطان زنجبار آجکل لندن میں اپنے خاندان کے ساتھ ایک مفلوک الحال شخص کی طرح زندگی کے دن گذار رہا ہے۔

سوڈان

سوڈان ایک خاص اسلامی ملک ہے، آج سے نہیں صدیوں سے، گو مدت سے اسے دورِ زماں میٹ رہا ہے، !"

سوڈان زرخیز اور شاداب ملک ہے یہی وجہ ہے کہ اسے غلام بنانے کی کوششیں مختلف قوتوں اور ملکوں کی طرف سے برابر کی جاتی رہیں۔

سوڈان تقریباً دس لاکھ مربع میل علاقے میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کی آبادی ایک کروڑ ۲ لاکھ ہے۔ پیداوار اور مویشی بانی کے سلسلے میں یہ خطہ زرخیز ہے۔ آبادی میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔

سوڈان کے جنگلات اور پہاڑ معدنیات کے خزائن ہیں۔ آب و ہوا استوائی خطے کی ہے یعنی سخت گرم اور شدید ترین بارش، گھنے جنگلات، سوڈان کی سیاہ زمین اتنی زرخیز ہے کہ مستقبل کی تمام تر ترقیات اور ملک کی خوشحالی کے سامان اسی سرزمین سے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

خرطوم کا قدیمی شہر مملکت سوڈان کا دارالحکومت ہے۔ اس شہر میں داخل ہوتے ہی آدمی یوں محسوس کرتا ہے کہ ابھی وہ عربوں ہی کی سرزمین پر ہے۔ سیدھے سادھے عام لوگ مصری فلاحین (کاشتکاروں) کا لباس پہنے ہوئے۔ شستہ عربی زبان میں باتیں کرتے ہوئے ہر طرف گھومتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا لب و لہجہ اتنا نرم اور سنجیدہ ہوتا ہے کہ صرف ایک بات سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ یہ عرب اسلاف کی اولاد ہیں۔

مصر کے محمد علی پاشا کے دور میں سوڈان پر مصر کے اقتدارِ اعلیٰ کو قانونی طور پر تسلیم کر لیا گیا لیکن یہ دور صرف ۱۸۲۰ء سے ۱۸۵۵ء تک جاری رہا۔ اس زمانے میں خرطوم کو سوڈان کا دارالحکومت قرار دیا گیا۔ ترکوں اور مصریوں کے مشترکہ دورِ حکومت میں سوڈان کے نظم و نسق کی نمایاں بات یہ تھی کہ ملک کئی صوبوں اور اضلاع میں بٹا ہوا تھا جس کا سربراہ کوئی ترک یا مصری ہوتا تھا۔

خدیو مصر کے دورِ حکومت میں مملکت اور اس کے نظم و نسق میں توسیع کا کام جاری رہا۔ پہلے پہل یورپین یہاں سیاحوں اور نئے علاقے دریافت کرنے مہم جوؤں کے روپ میں پہنچے اور پھر خدیو مصر کے افسروں کی حیثیت سے ۱۸۸۱ء میں امام محمد احمد المہدی نے حکومت ترکی کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے ہوئے سوڈان کی سیاسی آزادی اور مذہبی اصلاحات کا نعرہ لگایا۔ المہدی کو فوری کامیابی حاصل ہوئی۔ انہوں نے خرطوم پر قبضہ کر لیا۔ جہاں ۱۸۸۵ء میں مشہور انگریز جنرل گورڈن المہدی کے خلاف جنگ کرتا ہوا مارا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترک اور مصری حکمرانوں کے ساتھ ساتھ انگریزوں کو بھی سوڈان سے جانا پڑا۔ لیکن بدقسمتی سے اس سال کے دوران المہدی کی ناگہانی موت سے ایک دم انتشار پھیل گیا۔ گو اس کے دوست یعنی خلیفہ سوڈان ۱۸۹۸ء تک آزاد رہے، مگر انگریز ایک بار پھر لارڈ کچنر کی کمان میں اینگلو مصری افواج لے کر سوڈان میں داخل ہو گئے۔ اور اس فوج نے اومدرمان کی مشہور لڑائی میں خلیفہ کو شکست دی جو ۱۸۹۹ء کے دوران میدانِ جنگ میں لڑتے ہوئے کام آئے۔

اس کے بعد سوڈان پر مصر اور برطانیہ کے مشترکہ تسلط کا دور شروع ہوا۔ لیکن اس مشترکہ حکومت میں مصر کا حصہ محض برائے نام ہی تھا۔ اصل حکمران انگریز تھے۔ ۱۹۳۸ء تک انگریز حکمرانوں نے سوڈانی باشندوں کو سرکاری دفاتر یا اپنی کمپنیوں میں معمولی کلرکوں یا کم درجے کے چھوٹے افسروں سے زیادہ کوئی ملازمت نہیں دی۔ اس پر سوڈان کے تعلیم یافتہ طبقہ نے اظہارِ نفرت کرتے ہوئے ایک زبردست احتجاجی مہم شروع کر دی اور مختلف طبقوں نے مل کر گریجویٹ کلب کے نام سے ایک جماعت کی بنا ڈالی، مگر ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ یہ ادارہ خود انگریزوں کے ایما پر قائم ہوا اور اس طرح سوڈان کی جدوجہد کا آغاز ہوا۔

۱۹۴۴ء تک چند سوڈانی صوبائی کونسلوں اور وہ شمالی سوڈان کی مشاورتی کونسل تک پہنچ سکے اور ۴۸ء تک جزوی طور پر قانون اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ یہ اسمبلی قائم تو کر دی گئی مگر اس کے اختیارات کو بہت زیادہ محدود رکھا گیا۔ دریں اثنا گریجویٹ کلب نامی جماعت دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک زیادہ قوم پرست نوعیت کا تھا جس نے مکمل آزادی کا مطالبہ کیا۔ اور دوسرا اعربوں کے ساتھ الحاق کا علمبردار تھا لہٰذا اس کا مطالبہ تھا کہ سوڈان کو آزادی کے

کے بعد مصر میں مدغم کر دیا جائے۔ ۱۹۵۳ء میں تجربے کے طور پر سوڈان کی ایک آزاد حکومت تین سال کے عرصے کے لئے قائم ہوئی۔ اس عبوری دور میں نگرانی کا بین الاقوامی کمیشن سوڈان میں قائم ہوا۔ پاکستان کا نمائندہ اس کمیشن کا سربراہ تھا۔

اس کے بعد صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے اور دو سال کے عبوری دور کے بعد سوڈان نے جنوری ۵۶ء میں مکمل آزادی حاصل کرلی۔

باہمی کشمکش کے بعد سوڈانی حکومت کی جانب سے تصفیے کی براہِ راست تجاویز پیش کرنا یا ان پر بات چیت کرنا قطعی ناممکن ہو گیا۔ حزب اختلاف حکومت کو غیر نمائندہ وزارت قرار دے رہی تھی اور خود وزارت کے اہم رکن علی عبدالرحمن اپنے وزیر اعظم کی مخالفت کا برملا اظہار کر چکے تھے۔ ہر طرف ہلچل سی مچی ہوئی تھی عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ ہر سیاسی رہنما جس کے ساتھ ایک درجن رفقا تھے۔ عوامی نمائندگی کا دعویٰ رکھتا تھا۔

۱۷ نومبر ۱۹۵۸ء کا آفتاب طلوع ہوا تو ملک ایک خاموش انقلاب سے ہمکنار ہو چکا تھا۔ علی الصبح تین بجے ہی سے بکتر بند گاڑیوں نے خرطوم کی شاہراہوں میں نقل و حرکت شروع کر دی تھی۔ فوج نے ہوائی اڈے اور دیگر سرکاری عمارات پر قبضہ کر لیا۔ غیر ملکی سفارت خانوں پر پہرہ بٹھا دیا گیا۔ یہ تبدیلی اتنے منظم اور پرسکون انداز میں رونما ہوئی تھی کہ معمولات میں کوئی فرق نہ آیا اور عوام نے چونکنے کے بجائے اطمینان کا سانس لیا۔ کابینہ برطرف کر دی گئی اور مسلح افواج کی سپریم کونسل نے جنرل عبود کی قیادت میں تمام اختیارات سنبھال لیے اور تین فرمان جاری کیے گئے۔

(۱) ہنگامی صورت حال کا اعلان

(۲) آئین کی معطلی اور پارلیمنٹ کی تنسیخ۔

(۳) اخبارات اور خبر رساں ایجنسیوں پر تاحکمِ ثانی پابندی۔

بعد میں جنرل عبود اور ان کے نائب میجر وہاب نے سید عبدالرحمن المہدی اور سید علی المرغانی سے جو علی الترتیب انصار اور ختمیہ فرقے کے رہنما تھے، ملاقات کی اور انہیں صحیح صورت حال سے آگاہ کیا۔ چنانچہ دونوں نے فوجی انقلاب کے حق میں بیانات دیئے۔ سید عبدالرحمن المہدی

کے بیان میں عوام سے اپیل کی گئی کہ وہ انقلاب کا ساتھ دیں اور ان پر اعتماد کریں۔ لیکن المرغانی نے محض توقع ظاہر کی کہ انقلاب سے اچھے نتائج پیدا ہوں گے اور یہ قومی سلامتی کا باعث بنے گا۔

سوڈان کے صدر جنرل ابراہیم عبود ۲۶ اکتوبر ۱۹۰۰ء کو سوڈان کے شہر محمد گول میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کی تکمیل کے بعد وہ گورڈن میموریل کالج خرطوم میں داخل ہوئے اور اٹھارہ سال کی عمر میں انجینئرنگ کی سند حاصل کر لی لیکن انہیں فوجی ملازمت سے دلچسپی تھی۔ اس لیے سوڈان ملٹری کالج میں بحیثیت کیڈٹ داخلہ لے لیا۔ ۱۹۱۸ء میں انہیں مصری فوج میں سیکنڈ لیفٹیننٹ کی حیثیت سے ملٹری انجینئر بنا دیا گیا۔ وہ ۱۹۵۴ء تک متحدہ عرب جمہوریہ کی فوج سے منسلک رہے اور ترقی کرتے ہوئے میجر جنرل کے جنرل کے عہدے تک پہنچ گئے۔

لیفٹیننٹ جنرل عبود نے دوسری جنگ عظیم میں نمایاں حصہ لیا تھا اور ان کی کارکردگی کا دوسرے ممالک میں بھی اعتراف کیا گیا تھا۔ چنانچہ انہیں سوڈان کے علاوہ جرمنی، برطانیہ، یوگوسلاویہ، حبشہ اور متحدہ عرب جمہوریہ نے امتیازی نشانات اور تمغے دیئے۔

چونسٹھ سالہ جنرل ابراہیم عبود نے ۱۷ نومبر ۵۸ء کو پرامن فوجی انقلاب کے بعد سوڈان میں اقتدار حاصل کر لیا۔ وہ اس وقت فوج کے کمانڈر انچیف تھے۔ انقلاب برپا کرنے کی وجہ انہوں نے یہ بتائی کہ سیاسی پارٹیوں نے بے انتہا دھاندلی مچا رکھی تھی اور ملک تیزی سے تنزل کی طرف جا رہا تھا۔

جنرل عبود نے ملک میں ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا، پارلیمنٹ توڑ دی گئی، عبوری آئین منسوخ کر دیا گیا، تمام سیاسی پارٹیوں پر پابندی لگا دی، اخبارات بند کر دیئے اور مظاہروں اور جلسوں وغیرہ کی ممانعت کر دی اور انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ برادر ملک متحدہ عرب جمہوریہ کے ساتھ اختلاف ختم کرنے کے لیے جلد ہی بات چیت شروع کریں گے۔

جنرل عبود نے سیاسی لیڈروں کو شامل کئے بغیر ایک کابینہ تشکیل دی جس میں وہ خود وزیر اعظم اور وزیر دفاع تھے۔ اس کابینہ میں اکثریت فوجی افسروں کی تھی۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے ملک کو جمہوریہ بنانے کا اعلان کیا اور خود صدر بن گئے۔ انہوں نے سیاسی لیڈروں پر سے تمام پابندیاں ہٹا لیں۔ لیکن اقتدار بدستور فوج کے ہاتھ میں رہا۔

بارہ ارکان پر مشتمل کابینہ میں پانچ سویلین وزیر شامل ہیں۔ وزیر خارجہ سید احمد خیر ہیں۔

۱۳ اپریل ۱۹۶۱ء کو صدر عبود نے اعلان کیا کہ ملک میں مغربی طرز کی جمہوریت اور پارلیمانی حکومت بحال نہیں کی جائے گی۔ انہوں نے کہا کہ ملک کے ۸۵ فیصد عوام فوجی حکومت کے حامی ہیں اور پارلیمانی نظام نے ملک کو اقتصادی دیوالیہ پن کی حدود پر پہنچا دیا تھا۔ یہ نظام جو باہر سے درآمد کیا گیا ہے۔ قومی تقاضوں کی تکمیل نہیں کرتا۔

سمالیہ

ریگ زار افریقہ کا یہ ملک بھی عربوں کے دور کشور کشائی کی یادگار ہے۔ وہ کشور کشائی جس کے پیچھے صوفیاء کے قافلے تبلیغ اسلام اور امن وعافیت کا پرچم لے کر چلا کرتے تھے۔

جمہوریہ سومالیہ کے مشرق اور جنوب میں بحر ہند شمال میں خلیج عدن، شمال مغرب میں ایتھوپیہ اور جنوب مغرب میں کینیا واقع ہے۔ اس کا رقبہ ۲ لاکھ ۶۵ ہزار ۹ سو ۶۳ مربع میل ہے۔ اس کا بیشتر حصہ سطح مرتفع پر مشتمل ہے جس کی بلندی سمندر کی سطح سے اوسطاً تین ہزار فٹ ہے۔

یہ ایک خشک، پتھریلا اور گرم ملک ہے۔ بارش اوسطاً آٹھ انچ سے اٹھارہ انچ تک سالانہ ہوتی ہے۔ البتہ ادگادن کے مغرب اور جورانا کے شمال زیر زمین پانی کا بہت بڑا ذخیرہ دریافت ہوا ہے۔ اس ملک کے خاص دریا "نوگال" "دابی" "شیبی" اور "جونا" ہیں۔ دوسرے دریا ساحل کے قریب دلدل میں جاکر ختم ہو جاتے ہیں۔ سطح مرتفع کی بلندی پر جگہ جگہ دیودار کے درخت پائے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور پودے بھی اگتے ہیں جن میں نہایت خوشبودار گل مہندی کے پودے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ چیڑ کے درختوں کی گوند بھی یہاں کی خاص پیداوار ہے۔

سمالیہ کے باشندے نسلاً قبائلی ہیں اور خیال ہے کہ یہ لوگ قریب ہی کے کسی زمانے میں یمن سے ترک وطن کرکے یہاں آبسے ہیں۔ یہ لوگ عام طور پر لمبے قد اور چھریرے بدن کے ہوتے ہیں اور ان میں ضبط وتحمل کی بڑی قوت ہوتی ہے۔ یہ لوگ ہلکے یا گہرے گندمی رنگ کے ہوتے ہیں۔ عادت وخصلت ان میں خانہ بدوشوں کی سی ہے اور یہ لوگ تین بڑے گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک گروہ حشیہ کہلاتا ہے، دوسرا گروہ حویہ اور تیسرا ارحانوین کے نام سے مشہور ہے۔ یہی تینوں گروہ مختلف ذیلی قبیلوں میں منقسم ہوگئے

ہیں۔

صومالیہ مجموعی طور پر مویشی پروری کا ملک ہے۔ اس کی بیشتر آبادی گڈریوں اور مویشی پالنے والوں پر مشتمل ہے۔ نیم خانہ بدوش قبائل ریوڑ کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پھرتے رہتے ہیں۔ بارش کی قلت اور پانی کی کمیابی کے سبب زراعت بہت محدود پیمانے پر ہوتی ہے یہاں کی خاص زرعی پیداوار باجرہ اور کھجور ہے۔ چاول اور کھجور کی باقی ماندہ ضرورت درآمدی ذرائع سے پوری کی جاتی ہے اور ان اجناس کی درآمد ملکی پیداوار سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ انتہائی زرخیز اور پوری طرح آب پاشی کے علاقے وہ ہیں جو دریائے "جوبا" اور دریائے "دابی شیبی لی" کے کنارے واقع ہیں۔ کپاس، کیلے، گنا، چاول اور مکئی ان زرخیز علاقوں کی خاص زرعی پیداوار ہیں۔ یہاں کی دوسری پیداوار میں کھال، چمڑے، مویشی اور چیڑ اور ببول کی گوند شامل ہے۔ ساحل کے قریب مختلف قسم کی مچھلیاں بھی پائی جاتی ہیں لیکن ماہی گیری کی صنعت یہاں اب تک ترقی نہیں کر سکی ہے، کیلے، کپاس اور چمڑے یہاں کی خاص برآمدی اشیاء ہیں۔

صومالیہ کی دینِ اسلام سے پہلے کی تاریخ تقریباً لامعلوم ہے۔ دینِ اسلام کی روشنی سے یہ تاریک علاقہ پہلی صدی ہجری ہی میں روشن ہوا۔ ساتویں صدی عیسوی کے لگ بھگ صومالیہ میں عرب سلطانی قائم ہوئی اور ذیلاء یہاں کا دارالسلطنت بنا جہاں کے باشندے یمنی تارکین وطن تھے۔ یہی عرب سلطانی تیرھویں صدی عیسوی تک بڑی طاقتور حکومت بن گئی اور سلطنت عادل کے نام سے مشہور ہوئی۔ لیکن آہستہ آہستہ اس سلطنت کا زور ٹوٹنے لگا اور سترھویں صدی عیسوی تک صومالیہ مختلف خود مختار ٹولیوں میں بٹ گیا۔ ذیلاء جو عرب سلطانی اقتدار کا مرکز اعلیٰ تھا یمن کے زیرِ نگیں آ گیا اور یمن کے توسط سے خلافتِ عثمانیہ کا ایک حصہ بن گیا۔

ساحلی شہروں کا مجموعہ مشرقی افریقہ کی زنج سلطنت کا حصہ بن گیا اور اسے سولھویں صدی عیسوی میں پرتگالیوں نے فتح کر لیا۔ پھر سترھویں صدی عیسوی میں مسقط کے اماموں نے اس ساحلی علاقے پر قبضہ کیا۔ اور سلاطین زنجبار نے بھی صومالیہ کے ایک بہت بڑے علاقے پر حکمرانی کی۔ ۱۸۷۴ء سے ۱۸۸۴ء تک صومالیہ کا بیشتر علاقہ مصر کے زیرِ فرمان رہا لیکن مصریوں کو صومالیہ سے اپنی فوج سوڈان کی گڑبڑ کی وجہ سے ہٹانا پڑی۔

مصریوں کے واپس آجانے کے بعد برطانیہ، فرانس اور اٹلی نے مل کر سمالیہ کے امیروں سے سازباز کر کے اسے بانٹ کھایا۔ سلطان زنجبار نے سمالیہ کا اپنا حصہ سلطنت اٹلی کے ہاتھوں ایک لاکھ ۴۴ ہزار پاؤنڈ میں فروخت کر دیا۔ یہ سودا ۱۹۰۵ء میں ہوا۔

لیکن سمالیہ کے باشندوں نے غیر ملکی غلامی بغیر مقابلہ کئے ہوئے تسلیم نہیں کی۔ ۱۸۹۹ء میں محمد بن عبداللہ نام کے ایک مذہبی پیشوائے امام مہدی ہونے کا دعویٰ کر کے مسلح بغاوت کا علم بلند کیا۔ یہ تصادم بیس سال تک جاری رہا اور اس اثنا میں کئی گھمسان کی لڑائیاں ہوئیں۔ ۱۹۲۰ء میں آخر کار یہ بغاوت کچل دی گئی اور فرضی امام مہدی نے بھاگ کر ایتھوپیہ میں پناہ لی جہاں اگلے ہی سال اس نے وفات پائی۔

یکم جولائی ۱۹۶۰ء کو سمالیہ کے برطانوی اور اطالوی حصے ایک دوسرے میں ضم کر دیئے گئے اور ان کی خود مختاری کا اعلان کر دیا گیا۔ جیبوتی کا علاقہ فرانس کے قبضے میں ہے اور اریٹریہ، اوگاڈین اور ہود کے علاقے ایتھوپیہ کے زیرِ نگیں ہیں اور شمالی سرحدی اضلاع کینیا کے زیر انتظام ہیں۔ ان علاقوں کی بڑی اکثریت سمالیوں کی ہے، جو سمالیہ سے وفاق کے خواہشمند ہیں۔ جمہوریہ سمالیہ کا موقف یہ ہے کہ ان علاقوں کے عوام کا حق خود ارادیت تسلیم کیا جائے وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ سومالیہ علاقوں کی وحدت آئینی اور پُرامن طریقوں سے عمل میں آئے۔

۲۰ ستمبر ۱۹۶۰ء کو سمالیہ اقوام متحدہ کا رکن بنا۔ اس ملک کا محل وقوع شمال مشرقی افریقہ ہے۔ اس کی مجموعی آبادی ۲۵ لاکھ ہے اور ان میں ۹۹ فیصد مسلمان ہیں۔ موجودہ سربراہ حکومت یعنی صدر مملکت کا نام عبداللہ عثمان ہے اور اس ملک کا دارالحکومت "موگادیشو" ہے۔

قبرص

۱۹۳۰ء میں قبرصی یونانیوں نے اپنے مطالبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بڑے پیمانے پر بغاوت کی جسے انگریزوں نے جزیرے کی ترک اقلیت کی مدد سے کچل دیا۔ ظاہر ہے کہ ترک یونان کے ساتھ جزیرے کے الحاق کی کسی تجویز کی حمایت نہ کر سکتے تھے۔

۱۹۵۰ء میں آرچ بشپ میکاریوس نے قبرصیوں کی حق خود اختیاری کی تحریک کی کمان سنبھال لی اور اس کے پانچ سال بعد ایک قبرصی یونانی کرنل گریواس کی زیر قیادت جزیرے کے یونانیوں نے "ایوکا" کے نام سے ایک دہشت پسند تنظیم قائم کر لی۔ یہ گوریلا فوج تھی جو اپنے مقصد کے حصول کے لیے ہر حربے سے کام لینا جائز تصور کرتی تھی۔

ایک نوجوان ایوکا لیڈر نکاس سمپسن نے جو اب قبرص کے سب سے بااثر اخبار "سٹرگل" کا ایڈیٹر ہے۔ حال ہی کے برطانوی نمائندے سے انٹرویو کے دوران کہا کہ اب ترک دہشت پسند دلیر ہو گئے ہیں۔ لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ وہ اس وقت کہاں تھے۔ جب ہم برطانیہ کے خلاف نبرد آزما ہوتے تھے۔ اب جبکہ ہم نے انگریزوں کو اس ملک سے نکال دیا ہے۔ ترک گڑبڑ پھیلانے کے لیے واپس آ گئے ہیں۔

ترکوں اور انگریزوں سے سمپسن کی نفرت کا عالم یہ ہے کہ برطانوی نامہ نگار کے مطابق اس نے یہ دونوں لفظ کبھی زبان سے ادا نہیں کئے بلکہ زمین پر تھوک کر اپنا مطلب واضح کیا۔

قبرص بھر میں ترکوں کے قتل عام کے لیے نجی طور پر یونانیوں نے جو فوجیں منظم کی ہیں ان میں سب سے بڑی فوج سیمسن ہی کے پاس ہے اور اسے حال ہی میں یونان سے ایک جہاز گولہ بارود اور اسلحہ کا موصول ہوا ہے۔

سیمسن کہتا ہے کہ اس وقت جزیرے میں اکثریت کی قانونی حکومت قائم ہے۔ لیکن ترک اس

کا تختہ الٹ کر اپنا پرانا اقتدار بحال کرنا چاہتے ہیں تاہم اس نے کہا کہ ہم ترکوں سے نمٹ لیں گے۔ اب ہم یہ گر سیکھ گئے ہیں۔

قبرص ۱۹۵۹ء میں برطانیہ، یونان اور ترکی کے درمیان ایک معاہدے کے نتیجے میں آزاد ہوا۔ میکاریوس کو پہلا صدر اور ڈاکٹر کوچک کو نائب صدر منتخب کیا گیا۔

معاہدے کے تحت برطانیہ ترکی اور یونان تینوں کو اس جزیرے کے حالات جوں کے توں رکھنے کے لیے یک طرفہ کارروائی کا حق حاصل ہے۔ ترکی اور یونان دونوں کی ایک ایک بٹالین فوج جزیرے میں موجود ہے اور برطانیہ جزیرے میں اپنے تمام بحری، فضائی اور فوجی اڈوں پر اختیار مطلق رکھتا ہے۔ اس طرح قبرص کی آزادی حقیقت میں ایک ڈھونگ سے زیادہ نہیں

لیکن معاہدے کی ایک شق جس پر یونانی سب سے زیادہ ناراض ہیں اور جس کی وجہ سے جھگڑا یہاں تک بڑھا کہ ایک مرحلے پر یونان اور ترکی میں مسلح تصادم تک کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا وہ ہے جس کے ذریعے ترکوں کو سول سروس میں تیس فیصد ملازمتوں کا یقین دلایا گیا ہے۔ جزیرے کے پانچ بڑے شہر ترک اور یونانی حلقوں میں تقسیم کر دیئے گئے ہیں اور پولیس اور حفاظتی فوج میں چالیس فیصد اسامیاں ترکوں کو دینے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ مزید برآں، مالی سیاسی اور دفاعی امور میں ترک نائب صدر ڈاکٹر فاضل کوچک کو میکاریوس کے فیصلوں پر ویٹو استعمال کرنے کا حق حاصل ہے۔

قبرصی یونانی اس معاہدے سے اتنے ناراض ہیں کہ ایوکا کا لیڈر کرنل گریواس یونان جا کر گوشہ نشین ہو گیا۔ لیکن آگ اندر ہی اندر بھڑکتی رہی اور آخر کار دسمبر ۱۹۶۳ء میں آتش فشاں پھٹ پڑا۔

قبرصی یونانیوں کے گروہ ایوکا لیڈروں کے گرد جمع ہو گئے اور انہوں نے ترکوں پر کھلم کھلا حملے شروع کر دیئے۔

۱۹۶۴ء کا سورج ترک گاؤں اور محلوں کے ملبے پر طلوع ہوا۔ سارے جزیرے میں امن اور قانون کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ ترکی اور یونان کی فوجیں ایک دوسرے سے تصادم سے بچنے کی غرض سے اپنی اپنی بیرکوں میں بیٹھے رہیں اور گلیوں اور بازاروں میں ترکوں اور یونانیوں میں

کویت نے اپنی ترقی کے ساتھ دوسرے عرب ممالک کو اپنی دولت سے فائدہ پہنچانے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے ۶ جنوری ۱۹۶۲ء کو کویت نے عالمی بینک کے طرز پر عرب معاشی ترقی فنڈ قائم کیا جس کے لئے پانچ کروڑ پونڈ کا سرمایہ ابتداء میں فراہم کیا گیا ہے۔ اس فنڈ کے ذریعہ ترقیاتی منصوبوں کے لیے سوڈان کو ۷۰ لاکھ پونڈ شرق اردن کو چھتیر لاکھ پونڈ اور الجزائر کو دو کروڑ پونڈ بطور قرض دیئے گئے ہیں۔

کویت میں تیل کی صنعت کے ساتھ ساتھ دوسری صنعتوں کو بھی فروغ حاصل ہو رہا ہے چونکہ یہاں ریت اور چونے کے پتھر کے ذخائر کی بہتات ہے، لہٰذا اینٹیں بنانے کا کارخانہ قائم کیا گیا ہے جس میں روزانہ دس ہزار اینٹیں تیار ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ حکومت نے کنکریٹ پلانٹ بھی قائم کیا ہے جس میں عمارتی سامان اور سیمنٹ کے پائپ تیار کئے جاتے ہیں۔

پٹرول کی مصنوعات کے لئے حکومت نے غیر ملکی کمپنیوں کے اشتراک سے ۱۹۶۱ء میں پٹرول کیمیکل انڈسٹری قائم کی ہے جس میں ایک کروڑ ساٹھ لاکھ پونڈ کا سرمایہ حکومت نے لگایا اور اتنا ہی سرمایہ غیر ملکی کمپنیوں نے شامل کیا ہے۔

تجارتی نقطہ نظر سے کویت مشرق وسطیٰ کا سب سے بڑا تجارتی مرکز سمجھا جاتا ہے اس لئے کہ وہ اپنی ساری ضروریات زندگی اور صنعتی اشیاء بیرونی ممالک سے درآمد کرتا ہے۔ ان میں غذائی اجناس، خام مال ضروری استعمال کی اشیاء اور مشینری وغیرہ شامل ہیں۔ یہاں کوئی درآمدی پابندی نہیں ہے اس لئے ساری دنیا کے درآمدی ممالک کی زبردست مسابقت اور عوام میں روپے کی ریل پیل ہے۔

اس چھوٹے سے ملک میں سالانہ تقریباً ۹ کروڑ پونڈ اشیاء درآمد کی ہوتی ہیں جبکہ اس کی آبادی بمشکل ساڑھے تین لاکھ نفوس پر مشتمل ہے اس سے اس کی خوش حالی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

یوں تو کویت میں آزادی سے قبل برطانوی عمل و دخل موجود تھا لیکن نئے دستور میں نومبر ۱۹۶۱ء کے بعد سے عوام کو بھی حکومتی امور میں شامل کیا گیا ہے۔ اسی دستور کے تحت جنوری ۱۹۶۲ء میں پہلی مرتبہ قومی اسمبلی کے انتخابات منعقد ہوئے تھے۔ پچاس ارکان کی اس اسمبلی کے انتخابات اس کے ٹوٹنے کے دو ماہ بعد منعقد کئے جاتے ہیں اور ہر رکن چار سال تک کے لئے منتخب ہوتا ہے۔ حکمران کسی بھی مسودۂ قانون کو اسمبلی میں دوبارہ غور کے لئے بھیج سکتا ہے لیکن اگر اسمبلی اسے دوبارہ دو تہائی اکثریت سے منظور کر لے تو حکمران کو اس پر دستخط کرنے لازمی ہوتے ہیں۔

حکومتی انتظام اور حکمران وقت کو مشورہ دینے کے لیے ایک وزارتی کونسل بھی قائم ہے جس میں اب تک صرف شاہی خاندان کے افراد ہی وزیر ہوا کرتے تھے لیکن نئے قانون کے نفاذ کے بعد عوام کو بھی نمائندگی دی جا رہی ہے۔

جنوری ۱۹۶۱ء میں جیسے ہی کویت نے برطانوی استعمار سے آزادی حاصل کی۔ عراق کی مداخلت کی وجہ سے کویت جھگڑے کا مرکز بن گیا۔ اس میں عرب لیگ اور اقوام متحدہ کو بھی مداخلت کرنی پڑی اس لئے کہ عراق کے سابق وزیر اعظم جنرل عبدالکریم قاسم نے کویت پر عراق کا ایک حصہ ہونے کا دعویٰ کر دیا اور اسے بزور شمشیر حاصل کرنے کی دھمکی دی تھی۔ اسی دوران کویت نے عرب لیگ کی رکنیت کے لیے درخواست دے رکھی تھی۔ عراق کے طرز عمل سے عرب لیگ الجھن میں پھنس گئی تھی لیکن جولائی ۱۹۶۱ء میں برطانیہ نے عراق کے حملہ کے پیش نظر اپنی فوجیں کویت بھیج دیں جو اکتوبر ۱۹۶۱ء میں عرب فوجوں کے پہنچنے کی وجہ سے ہٹا لی گئیں۔

جنرل قاسم کے محروم اقتدار ہونے کے بعد عراق کے موجودہ صدر عبدالسلام عارف نے عراق کے اس مطالبہ سے دستبرداری کا اعلان کر دیا ہے اور کویت کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کر لیے ہیں۔ چنانچہ اس ہنگامہ کے بعد کویت نہ صرف ایک آزاد ملک کی حیثیت سے اقوام متحدہ کا رکن ہے بلکہ عرب لیگ اور بین الاقوامی مالی فنڈ اور عالمی بنک کا بھی ممبر ہو گیا ہے۔

کوریا

کوریا کا شمار اگرچہ اسلامی ممالک میں نہیں ہے، اس لئے کہ وہاں مسلمانوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہے لیکن اسلام جس طرح وہاں پھیلا اور جس طرح وہاں کے باشندے اس دعوت کو قبول کر رہے ہیں اس کے پیش نظر اس کا مختصر سا ذکر ضروری ہے!!

۱۹۵۰ء میں ترک فوج کا ایک چھوٹا سا دستہ کوریا آیا۔ ترک فوج کی روایت یہ ہے کہ فوجیوں کو نماز پڑھانے کے لئے ایک امام ہمیشہ ہر ترک فوجی دستے کے ساتھ رہتا ہے۔ اس امام کے فرائض یہ بھی ہوتے ہیں کہ وہ ترک فوجیوں کو مختلف مذہبی امور کی ادائیگی میں مدد دے اور ان کی رہنمائی کرے، چنانچہ وہ امام جو کوریا آنے والے ترک دستے کے ساتھ تھے حسن اتفاق سے بڑے دیندار اور پاک دامن واقع ہوئے تھے۔ انہوں نے کوریائی عوام سے رابطے قائم کرنا شروع کئے۔ ان کے ابتدائی روابط جن لوگوں سے پیدا ہوئے ان میں ایک ادھیڑ عمر کے کوریائی بزرگ کم جن کو یو نامی کہتے تھے۔ کم اپنے پیشے کے اعتبار سے ایک چھوٹے موٹے صنعت کار ہیں۔ لیکن ان میں قیادت اور رہنمائی کی قدرتی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔ کم نے اپنے ہم وطن دوستوں کو ترک امام سے ملوایا اور کم اور ان کے احباب امام موصوف سے مل کر ان کی پیش کردہ اسلامی تعلیمات اور اسلامی نظامِ حیات کے بیش قیمت اصولوں سے کچھ اس درجہ متاثر ہوئے کہ محض چند ماہ کی مدت میں اس پورے گروہ نے اسلام کی دعوت قبول کر کے اپنے مشرف بہ اسلام ہونے کا اعلان کر دیا۔ یہاں سے اس ملک میں اسلام کی مقدس ترویج و اشاعت کا آغاز ہوا اور آج اللہ تعالیٰ کے فضل سے کوریا میں کوریائی مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی جماعت موجود ہے اس جماعت میں سات سو سے زائد کوریائی مسلمان ہیں، لیکن ان کی تعداد بتدریج بڑھ رہی ہے

اور یہ بات تمام عالمِ اسلام کے لیے مسرت بخش ہے کہ کوریا کے تعلیم یافتہ نوجوان اسلامی تعلیمات میں خاصی کشش محسوس کر کے بڑی تیزی سے شریعتِ اسلامیہ کی اطاعت قبول کر رہے ہیں۔

۱۹۳۹ء تک کوریا کا سرکاری مذہب بودھ مت رہا۔ لیکن اس کے بعد جب اس ملک کی بادشاہت سابقہ شاہی خاندان سے منتقل ہو کر "پی" خاندان میں پہنچی تو کنفوشیش مذہب ۱۹۱۰ء تک یہاں کا سرکاری مذہب بنا رہا۔ ۱۹۱۰ء میں کوریا جاپانیوں کے قبضے میں چلا گیا۔ اس کے بعد دوسری عالمگیر جنگ ختم ہوتے ہی کوریا پھر خود مختار ہوا، لیکن خود مختاری حاصل ہوتے ہی خانہ جنگی شروع ہوئی اور ملک دو حصوں میں بٹ گیا۔ جمہوریہ جنوبی کوریا کی موجودہ آبادی تقریباً دو کروڑ بیس لاکھ ہے جن میں سے تقریباً دس فیصد عیسائی، دس فیصد بودھ پانچ فیصد دگر مذاہب کے لوگ اور ۷۵ فیصد لامذہب ہیں۔ کوریا کے عوام دنیا کی سب سے زیادہ رواداد قوموں میں شمار ہوتے ہیں۔ انہیں کوئی بھی مذہب یا عقیدہ رکھنے والے سے محض مذہب اور عقیدے کی بنیاد پر کوئی کد نہیں ہے۔ یہاں لامذہبیت کا خلا پُر کرنے کے لئے عیسائی مشنریاں بڑے زور شور سے کام کر رہی ہیں اور یہ سب مشنریاں متحدہ اور مشترکہ طور پر عیسائیت کی تبلیغ یہاں تقریباً نصف صدی سے جاری ہے اور اسلام کو متعارف ہوئے ابھی چند سال ہی گذرے ہیں، اس کے باوجود حالات کے تیور بتاتے ہیں کہ یہاں کا مذہبی خلا پُر کرنے میں اسلام کو زیادہ مقبولیت حاصل ہو سکتی ہے بشرطیکہ تبلیغ و اشاعت کے اسلامی ادارے اس طرف خاطر خواہ توجہ دیں۔ ان دنوں کوریا کے یہ مٹھی بھر مسلمان طرح طرح کی مشکلات سے دوچار ہیں۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے تک ان کی اپنی کوئی باضابطہ مسجد بھی نہیں تھی۔ ایک چھوٹے سے چھپّے تلے جمع ہو کر وہ اپنی نمازیں بھی پڑھا کرتے تھے اور یہیں ان کے بچے اسلامی تعلیم بھی حاصل کرتے تھے۔ ملایا کے وزیر اعظم تنکو عبد الرحمٰن کا خدا بھلا کرے کہ انہوں نے ان کوریائی مسلمانوں کے لئے ایک باضابطہ مسجد تعمیر کرادی اور اب ان کے بچوں کے لئے ایک مستقل دینی مدرسہ بھی قائم ہو چکا ہے۔

۱۹۵۹ء میں کم جن کو یو نے جن کا اسلامی نام عمر کم ہے اور جو انجمن مسلمانان کوریا کے صدر

ہیں اپنے ناظم نشر و اشاعت جناب حائری چانگ سو کے ہمراہ مختلف مسلم علاقوں کے دورے کئے۔ سب سے پہلے یہ حضرات پاکستان آئے۔ انہوں نے کراچی اور دیگر مقامات پر کئی ماہ تک قیام کیا اور پھر پاکستان سے یہ لوگ ۱۹۶۰ء میں فریضۂ حج ادا کرنے کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ سعودی عرب کے علاوہ انہوں نے مصر اور مشرقِ وسطیٰ کے کئی دیگر ممالک کے بھی دورے کئے۔ واپسی پر وہ کوالالمپور گئے اور وہاں انہوں نے وزیر اعظم تنکو عبدالرحمٰن کو اس طرح متاثر کیا کہ انہوں نے ملایا کی مسلم تنظیم فلاح و بہبود کا ایک وفد کوریا بھجوایا۔ اسی وفد کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ اپنی واپسی پر وہ ملایا کی حکومت کو رپورٹ دے کر کس حد تک اور کس طرح کوریا کے مسلمانوں کی مدد کی جا سکتی ہے۔ ملایا مسلم ویلفیر آرگنائزیشن کا وفد کوریائی مسلمانوں کے قومی جوش و خروش سے بہت متاثر ہوا اور اسے ان مسلمانوں کی اسلام سے وابستگی اور والہانہ محبت دیکھ کر بڑی مسرت حاصل ہوئی۔ ارکین وفد نے بچشم خود حاجی عمر کم اور ان کے ساتھیوں کی زبردست قربانی اور ایثار کے مشاہدے کئے۔ انہوں نے دیکھا کہ حاجی عمر ہی وہ شخص ہیں جنہوں نے مسجد اور مدرسے کے لئے اپنی زمین دی ہے۔ چنانچہ یہ وفد جب ملایا واپس آیا تو اس نے بڑی شاندار رپورٹ پیش کی اور وزیر اعظم تنکو عبدالرحمٰن نے ایک لاکھ ڈالر کا عطیہ سیول میں مسجد کی تعمیر کے لئے ارسال کیا۔ اس کے علاوہ نوجوان کوریائی مسلمانوں کے لئے گیارہ تعلیمی وظائف دیئے گئے نیز چند کوریائی مسلم نوجوانوں کو سہ سالہ دینی تعلیم حاصل کرنے کے لئے کوالالمپور آنے کی دعوت دی گئی اور اس سلسلے کے تمام اخراجات کی ذمہ داری ملایا کی حکومت نے اپنے سر لی۔ یہ مسلم طلبا ان دنوں کوالالمپور میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

گھانا

گھانا بھی اسلامی ملک نہیں ہے، لیکن وہاں مسلمانوں کی تعداد کافی اور مستقبل روشن ہے اس لئے مختصراً اس نو آزاد ملک کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

گھانا میں مسلمانوں کی آبادی کے صحیح اعداد و شمار معلوم نہیں ہو سکے۔ کیونکہ گھانا میں اب تک آزادی کے بعد مردم شماری نہیں ہوئی ہے، برطانوی دور حکومت میں جو مردم شماری ہوئی ہے اس کے مطابق مسلمان گھانا کی کل آبادی کا ۲۵ فی صد ہیں یہ اعداد و شمار آج سے بارہ سال قبل کے ہیں۔

عام ملکوں کی طرح گھانا میں بھی اسلام عرب اور افریقی تاجروں کے ذریعہ آیا اور انہی تاجروں نے مقامی باشندوں میں اسلام کی تبلیغ کی۔ احمد عبداللہ المسدوسی نے اپنی کتاب "مذاہب عالم" میں مشہور مستشرق پروفیسر تھامس ڈبلیو آرنلڈ کے حوالے سے رقمطراز ہیں کہ ۱۹۵۰ء میں اشنتی قبیلے میں مسلمانوں کی معقول تعداد تھی۔ دوسرے قبائل مسلمانوں کا بے حد احترام کرتے تھے اور ان (مسلمانوں) کے رویے اور حسن سلوک سے اس قبیلے کا سربراہ بھی مسلمان ہو گیا اور اس کا اثر اتنا ہمہ گیر ہوا کہ آس پاس کے تمام قبائل نے اسلام قبول کر لیا۔ پروفیسر آرنلڈ نے اعتراف کیا کہ اس کے بعد اسلام سارے گھانا میں پھیل گیا، یہاں تک کہ گھانا کے بادشاہ نے بھی اسلام قبول کر لیا، جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ اسلام گھانا میں عرب اور افریقی تاجروں کے ذریعہ ساتویں اور آٹھویں صدی کے درمیان آیا اور بہت جلد اس نے سارے علاقے کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

گھانا کے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت "مسلم ایسوسی ایشن پارٹی گھانا" ہے اور وہاں کی

وہی مجلس قانون ساز میں اس پارٹی کے ستائیس ۲۷ نمائندے ہیں۔ گھانا سابق گولڈ کوسٹ اشنتی ٹوگولینڈ اور جنوبی علاقوں پر مشتمل اور مغربی افریقہ کے ساحل پر واقع ہے۔ اس کا رقبہ بانوے ہزار ایک سات سو تیس افراد پر مشتمل ہے۔ جس میں ۳۵ فی صد مسلمان ہیں۔ ساحلی علاقہ ریتیلا ہے البتہ مغربی حصہ جنگلات سے بھرا ہوا ہے۔

گھانا دنیا بھر میں سب سے زیادہ کوکو پیدا کرتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ملکی معیشت کے لئے ریڑھ کی ہڈی ہے۔ ملک کے قدرتی جنگلات کو صاف کر کے ان میں کوکو کی کاشت شروع کر دی گئی اور اب تقریباً ۴۵ لاکھ ایکڑ کے رقبہ میں کوکو کاشت کی جاتی ہے۔ ۱۹۴۵ء میں کوکو کی برآمد دو لاکھ چودہ ہزار ایک سو بادن ٹن تھی جس کی مالیت آٹھ کروڑ چھیالیس لاکھ پونڈ تھی جو ملکی برآمد کی آمدنی کا ۷۰ء۴۷ فی صد تھی۔ ۵۹-۱۹۵۸ء میں کوکو کی پیداوار ڈھائی لاکھ پونڈ تک پہنچ گئی تھی۔ نصف صدی قبل ربڑ کی پیداوار بھی کافی تھی۔ لیکن ملایا میں ربڑ کی دریافت اور کاشت سے گھانا کے ربڑ کی مانگ گر گئی۔ اب از سر نو ربڑ کی کاشت شروع کی جا رہی ہے۔

گھانا میں سونے اور ہیرے کی بڑی کانیں ہیں۔ ۱۹۵۴ء میں سات لاکھ ستاسی ہزار نو سو اونس بہترین سونا برآمد کیا گیا جس کی مالیت ستانوے لاکھ پونڈ تھی۔ ہیرے اور جواہرات بھی کانوں سے نکالے جاتے ہیں۔ ۱۹۵۴ء میں اکیس لاکھ چھبیس ہزار قیراط ہیرے برآمد کیے گئے ہیں۔ جن کی مالیت ۴۳ لاکھ پونڈ تھی۔

پرتگالی سب سے پہلے گھانا میں آئے وہ ۱۴۷۱ء میں ساحلی علاقے میں آئے اور انہوں نے سونے کی تجارت کے لئے اپنا اڈہ قائم کیا انہوں نے ایک قبیلہ سے آکر اڈے پر حاصل کردہ اراضی پر سب سے پہلے ۱۴۸۲ء میں ایک قلعہ تعمیر کیا اور اس کے بعد جلد ہی انگریز فرانس اور ڈچ بھی آئے۔ ۱۶۲۱ء میں ڈچوں نے پرتگالیوں کو بے دخل کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے کئی قلعے تعمیر کئے بلکہ پرتگالیوں کے کئی قلعے چھین لئے۔

غرب الہند میں کاشت کاری کے لئے مزارعوں کی مانگ بڑھ گئی تو مغربی استعمار پرستوں میں "غلاموں کی تجارت" کا خیال آیا اور انہوں نے مغربی افریقہ سے غلاموں کی تجارت شروع کردی اور غلاموں کی برآمد کے مقابلے میں سونے کی برآمد کی اہمیت کم ہوگئی۔ مغربی استعمار پرستوں کے اس رویے سے قبائلیوں میں نفرت کی لہر دوڑ گئی اور انہوں نے اس کے خلاف جنگ شروع کردی۔ سترھویں صدی عیسوی میں قبائلیوں اور یورپی نوآبادکاروں کے درمیان جنگ اسی صدی کے آخر میں ختم ہوئی جبکہ ڈچوں اور انگریزوں نے غلاموں کی تجارت ختم کردی اور پھر بالآخر ۱۸۱۴ء میں غلاموں کی تجارت کے خاتمہ پر پرتگالیوں کو بھی یہاں سے رخصت ہونا پڑا۔

جب گھانا سے اپنے ڈچ اور فرانس حریفوں کی روانگی کے بعد برطانیہ اکیلا رہ گیا تو اس نے یہاں اپنی نوآبادیاتی پالیسی کو عملی جامہ پہنانا شروع کردیا۔ ۱۸۲۱ء میں اس نے ساحلی علاقہ اپنے کنٹرول میں لے لیا اس کے تین سال بعد برطانوی گورنر سر چارلس میکارتھی نے اشنتی قبائل کے خلاف جنگ شروع کردی۔ اشنتی قبائل کو کچل ڈالا اور ان کے سارے علاقے کو اپنی حدود میں شامل کر لیا۔ (۱۸۲۸ء) اس کے بعد شمالی علاقے بھی برطانوی حدود میں شامل کرلئے گئے۔ ۱۹۲۲ء میں ٹوگولینڈ کا مغربی حصہ جو پہلے جرمنوں کی نوآبادی تھی لیگ آف نیشنز نے اسے برطانیہ کی عملداری میں دے دیا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد سیاسی جماعتوں نے آزادی کا مطالبہ شروع کردیا۔ آخر کافی جدوجہد کے بعد ۶ مارچ ۱۹۵۷ء کو گھانا آزاد ہوگیا، اور وہ برطانوی دولت مشترکہ کا ممبر بن گیا۔

ملک کے آئین کے تحت ایک پارلیمنٹ ہے اور صدارتی نظام حکومت ہے انتظامی اختیارات صدر کے ہاتھ میں ہیں اور کم از کم آٹھ وزیر جو پارلیمنٹ کے ممبر بھی ہوتے ہیں

صدارتی کابینہ میں شامل ہیں۔ دوسری سیاسی جماعتوں کے علاوہ ملک میں اس وقت کنونشن پیپلز پارٹی، ناروان پیپلز پارٹی، نیشنل لبریشن موومنٹ، ٹوگولینڈ کانگریس اور مسلم ایسوسی ایشن پارٹی کام کر رہی ہیں۔ کنونیشن پیپلز پارٹی ملک کی برسراقتدار جماعت ہے اور اس کے سربراہ صدر مملکت ڈاکٹر کوری نکروما ہیں۔

لیبیا

یہ ایک خالص عرب ملک ہے دوسری جنگ عظیم کے بعد اسے آزادی کی نعمت ملی۔ یہاں کا فرماں رواں روحانی تاج دار بھی ہے اور دنیاوی شہر یار بھی۔

لیبیا غیر معروف لیکن دلچسپ ملک ہے۔ یہ ملک تمام مغربی یورپ سے بڑا ہے اور امریکہ کا پانچواں حصہ ہے۔

یہ بحیرۂ روم کے ساحل پر واقع ہے اور صحرا میں دُور تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ دریا کوئی ہے ہی نہیں اور کچھ نخلستان سے قطع نظر ملک کم وبیش بنجر ہے۔ لیبیا میں اب تک نہ قیمتی معدنیات دستیاب ہوئیں نہ تیل (ممکن ہے مستقبل میں دستیاب ہو جائیں۔ کبھی سعودی عرب کو بھی کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی اور اب تیل کی دریافت نے اس ملک کو اتنی ثروت بخشی ہے کہ شمار نہیں)، اس ملک کی زمین کا ۲ فی صد ہی کاشت کے قابل ہے۔ اس لیے یہ ملک دنیا کے مفلس ترین ممالک میں شمار کیا جاتا ہے۔

پوری آبادی ۱۱،۵۰۰۰ سے جو شہر ڈیٹرایوٹ سے بھی کم ہے، لیکن اتنے لوگوں کو بھی پیٹ بھر کے روٹی نہیں ملتی۔ سالانہ آمدنی کی اوسط ۳۵ ڈالر فی کس ہے۔ لیبیا میں کوئی بینک نہیں۔ یہاں کے کسی باشندے کو ڈاکٹر بننے کی توفیق نصیب نہیں ہوئی۔ ریل کی پٹڑی کا طول ۲۲۵ میل ہے۔ ممکن ہے کہ مستقبل قریب میں کچھ اصلاحات ہو جائیں، کیونکہ یہ ملک بالکل نیا ہے۔ آزاد مراکش اور تیونس سے اس کی عمر کچھ سال ہی زیادہ ہوگی۔

لیبیا کو آزادی کے لئے جنگ نہیں کرنی پڑی۔ پہلے یہ اطالوی نوآبادی تھا۔ ۲۴ دسمبر ۱۹۵۱ء کو اقوام متحدہ نے ایک آزاد ملک کی حیثیت سے اسے جنم دیا۔ غلام ملکوں کی آزادی کے سلسلے میں اقوام متحدہ نے یہ پہلا قدم اٹھایا تھا۔

افلاس لیبیا کا پیچیدہ ترین مسئلہ ہے۔

پہلی جنگِ عظیم میں سنوسیوں نے اپنے سابق فرمانرواؤں یعنی ترکوں سے مل کر اطالیہ کا مقابلہ شروع کیا۔ صلح ہوئی لیکن قائم نہ رہ سکی۔ ۱۹۲۳ء میں لڑائی ٹھن گئی اور آخر ۱۹۳۲ء میں اطالیہ کو فتح ہوئی۔

عمر المختار ایک شجاع سنوسی راہنما کفرہ کے نخلستان میں آخر دم تک اطالیہ سے لڑتا رہا جب اسے گرفتار کیا گیا تو وہ زخموں سے مر رہا تھا لیکن اطالوی حکومت نے اُسے بیس ہزار لوگوں کے سامنے پھانسی دی۔ لوگوں کو مجبور کیا گیا تھا کہ وہ تماشا دیکھیں۔ سنوسیوں کی بسالت اور حب وطن کا اندازہ اس سے ہوگا کہ جب تک ان کے بالغ مردوں کے دو تہائی افراد کٹ نہیں گئے انہوں نے ہتھیار نہیں ڈالے۔

اطالیہ نے یہ کیا کہ اپنی ضروریات سے زائد آبادی کو لیبیا بھیج دیا کہ دباؤ کم ہو جائے لوگوں کو بہت ترغیب دی گئی، لیکن صرف بانوے ہزار اطالوی لیبیا میں آباد ہوئے۔

اطالیہ نے لیبیا میں متعدد شاندار دفتر بنائے، پبلک عمارتیں اور سڑکیں تعمیر کیں، لیکن لوگوں کی تعلیم اور صحت کی طرف سے غفلت برتی، حکومت کو خود اختیاری کی تربیت بھی نہیں دی گئی۔ فرانسیسیوں کے طرزِ عمل کے برخلاف اطالیہ نے کبھی یہ بھی نہ کیا کہ عربوں کو مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگنے کی کوشش کرتا۔ اطالوی دور میں شہری حقوق بھی پامال کر دیئے گئے

بینی ٹو مسولینی جو ۱۹۲۲ء میں اطالیہ کا فاشسٹ آمر بن بیٹھا تھا عربوں کے دل ہاتھ میں لینا چاہتا تھا، اس لئے اس نے خارجہ حکمت عملی میں کچھ تبدیلی کر دی۔ وہ چاہتا تھا کہ افریقہ کے لوگ کسی حد تک خوش حال ہو جائیں اور زندگی کا معیار بڑھ جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ مسولینی کے زمانے میں لیبیا کا معیار زیست آج کل کے معیار سے بلند تھا۔ چنانچہ شہروں میں رہنے والے بہت سے عرب اطالیہ کے حلیف بن گئے۔ لیکن سنوسی اسی ماحول سے غیر متاثر رہے۔ وہ اسی طرح جان ہتھیلی پر رکھ کر وطن کی مدافعت کرتے رہے۔ اطالیہ سے ان کی دوسری لڑائی مسولینی ہی کے زمانے میں ہوئی۔

جب ۱۹۴۳ء میں امریکہ اور اتحادیوں نے اطالیہ کو شکست دی تو لیبیا خود بخود ہاتھ

سے نکل گیا۔ لیکن جب لڑائی ختم ہوئی تو فاتحین طے نہ کر پائے کہ لیبیا کے متعلق کیا حکمتِ عملی اختیار کی جائے۔

۱۹۵۰ء میں اقوامِ متحدہ نے اعلان کیا کہ ۲۴ر دسمبر ۱۹۵۱ء سے پہلے لیبیا آزاد ہو جائے گا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک سال کے اندر حکومت کی مشینری کو متاثر بنانا پڑے گا اور یہ ناممکن تھا۔ مثال کے طور پر سارے ملک میں صرف سترہ باشندوں نے کسی یونیورسٹی سے کوئی ڈگری تھی لیکن حکومت کا قیام بھی اب ناگزیر تھا۔

خوش قسمتی سے جو برطانوی منصب دار لیبیا پر حکومت کرتے رہے تھے انہوں نے لیبیا کی حکومت کے ماتحت کام کرنا منظور کر لیا۔ لیبیا کے باشندوں نے اور کئی دوسری قوموں کے نیک نیت لوگوں نے مل جل کر کام کیا۔ سب نے محسوس کیا کہ اس خطے میں آئینی بادشاہت موزوں رہے گی۔ اس عہدے کے لئے مناسب آدمی بھی موجود تھا یعنی سنوسی جماعت کے موسس کا پوتہ۔

لیبیا کے بادشاہ کا پورا نام السید محمد ادریس المہدی السنوسی ہے۔ عموماً اسے شاہ ادریس اوّل کہہ کر پکارتے ہیں۔

ادریس کا بیٹا کوئی نہیں۔ اس نے اپنے بھائی رضا کو ولی عہد مقرر کیا ہے جو خوش باش بھی ہے اور لوگوں سے ملتا جلتا بھی ہے کہ شاہی خاندان کے صرف دو رکن رضا اور ادریس کی پردہ نشین بیوی فاطمہ ہیں اور سارا شاہی خاندان جلاوطن ہے۔

لیبیا نے امریکہ اور برطانیہ سے جو معاہدے کئے ہیں ان کی رُو سے برطانیہ لیبیا کو مالی مدد دیتا ہے اور ملک میں فوجیں متعین رکھتا ہے۔ امریکہ ملک میں اپنا ہوائی اڈہ قائم رکھتا ہے۔ پھر امریکہ لیبیا کو مالی مدد بھی دے رہا ہے اور ماہرین فن بھی مہیا کر رہا ہے۔ وی لیس فیلڈ احاطہ کا اڈہ نہیں صرف میدان ہے۔ یہاں امریکہ کے فوجی ہوائی جہاز دنیا بھر کا چکر لگاتے ہوئے اترتے ہیں اور چاند ماری بھی ہوتی ہے۔ ۱۹۵۴ء کے معاہدے کی رُو سے امریکہ پابند ہے کہ بیس سال میں لیبیا کو پینتالیس ملین ڈالر دے اس کے

علاوہ اور مالی مدد بھی دی جائے گی۔

امریکی مشیروں اور اقوام متحدہ کے ماہرین نے مل جل کر لیبیا کو ایک مدرسہ بنا دیا ہے وہ تمام آبادی کو بالواسطہ یا بلا واسطہ تعلیم دے رہے ہیں اور ملک کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا یا چلنا سکھا رہے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ غلطیاں بھی ہوئی ہوں گی، اسراف بھی ہوا ہوگا۔لیکن پھر بھی فائدہ یقیناً لیبیا ہی کو پہنچا ہے۔امریکہ اور اقوام متحدہ کے منصوبے کے چار اہم پہلو ہیں۔(۱) صحت عامہ (۲) طبعی ذرائع دولت (۳) زراعت (۴) تعلیم۔مختلف ملکوں سے ماہرین علم و فن آکر مختلف شعبوں میں کام کر رہے ہیں۔مثلاً ٹیکس، دباغت، جنگلات کی نگہداشت، نخلستان کی پرورش اور حفاظت، بچوں کی نفسیات کا مطالعہ اور جسمانی تربیت۔

مراکش

تیونس، الجزائر اور مراکش در حقیقت یہ ایک ہی سلسلے کی تین کڑیاں ہیں۔ تیونس اور الجزائر کا ذکر ہو چکا ہے۔ اب مراکش کی تاریخ پر ہم ایک نظر ڈالیں گے۔

مراکش افریقہ کے شمال مغربی گوشہ میں واقع ہے۔ اس کا رقبہ ایک لاکھ ستر ہزار مربع میل ہے۔ اس کا ایک رُخ، آبنائے جبل الطارق کا ساحل ہونے کی وجہ سے یورپ کی طرف ہے۔ تو دوسرا رُخ کرۂ مغربی کی طرف ہے۔ اس کے ساحل کے متوازی ایک سلسلہ کوہسار ہے جس کو اطلس کہتے ہیں۔ یہ سلسلہ کوہ مراکش کو باقی ماندہ افریقہ سے علیحدہ کرتا ہے ترک جب تسخیر ممالک کے لئے نکلے تو انہوں نے وہ تمام ملک فتح کر لئے جو مراکش کے مشرق میں واقع تھے لیکن وہ اصل کوہسار کو عبور کر کے مراکش کی طرف بڑھنے کی ہمت نہ کر سکے۔ اسی طرح عربوں کی تسخیر کا سیلاب چڑھتا بھی رہا اور اترتا بھی رہا اور صدیوں تک ایسا ہوتا رہا۔ لیکن مراکش تک اس سیلاب کی لہریں بہت کم پہنچیں۔ آج کل طنجہ اور کاسا بلانکا میں یورپی اقوام اور امریکہ کا اثر بہت ہے۔ لیکن یہ ساحلی علاقے ہیں۔ پہاڑوں کے اُس پار کوئی جانتا بھی نہیں کہ یورپین کون ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مراکش میں عجیب و غریب تضاد نظر آتا ہے۔ ایک طرف کاسا بلانکا میں جدید وضع کی بلند عمارتیں جگمگ جگمگ کر رہی ہیں اور دوسری طرف کوہسار اطلس کی وادیوں میں کسی قبیلے کا مٹی کا قلعہ پرانے وقتوں کی یاد تازہ کر رہا ہے۔

جب یورپی اقوام نے افریقہ کے حصے بخرے کرنے شروع کئے تو فرماں روا طبعاً

مضطرب ہوئے۔ ۱۸۸۰ء میں سلطان مراکش نے امریکہ سے درخواست کی کہ مراکش کو اپنے ظلِ حمایت میں لے لے۔ لیکن امریکہ اُن دنوں اپنے مغربی علاقوں کو آباد کرنے میں مصروف تھا۔ چنانچہ فرانس کے لئے راہ کھل گئی جو عرصے سے مراکش کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

فرانس نے اس ملک کو بزورِ شمشیر فتح کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس طرح تمام دنیا فرانس کی مخالف ہو جاتی۔ فرانس نے دوسری یورپی سلطنتوں سے سازباز شروع کی۔ انگلستان کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ اگر فرانس کو مراکش میں من مانی کرنے کی اجازت دی جائے تو وہ مصر میں انگریزوں کو کھلی چھٹی دے گا۔ ایسی ہی تجاویز جرمنی اور اطالیہ کے سامنے رکھی گئیں۔ ہسپانیہ سے یہ وعدہ کیا گیا کہ مراکش کے مالِ غنیمت میں سے اسے بھی حصہ دیا جائیگا۔

۱۹۱۲ء میں فرانسیسیوں کو مداخلت کا بڑا اچھا موقع ملا۔ ہوا یہ کہ بربروں نے سلطان کے دارالسلطنت کا محاصرہ کر لیا۔ وہ اسے تخت سے اتارنا چاہتے تھے۔ سلطان نے فرانس سے مدد مانگی۔ فرانس نے اپنی فوجیں بھیج دیں۔ محاصرین بھاگ گئے اور فرانس نے اعلان کیا کہ مستقبل میں سلطان اور ملک کے مفاد کی حفاظت ہم ہی کریں گے۔ اس کے بعد مراکش تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ فرانسیسی مراکش، ہسپانوی مراکش اور طنجہ کا علاقہ، جسے بین الاقوامی علاقہ قرار دیا گیا۔

مراکش میں فرانسیسیوں کی حکومت، ۱۹۱۲ سے لے کر ۱۹۵۶ء تک، یعنی مراکش کے آزاد ہونے تک رہی۔

پہلے تیرہ سال تک ایک باحوصلہ شخص جو مارشل لایوٹی کہلاتا تھا۔ مراکش کا حاکم رہا۔ اس نے نظم و نسق بھی قائم کیا اور امن بھی قائم کیا۔ سرکاری کاغذات میں اسے ریزیڈنٹ جنرل کہا جاتا تھا اور اس کے دفتر کو ریذیڈنسی، یہ ریذیڈنسی ہی مراکش کی حکومت کا مرکز تھی۔

جن دنوں لایوٹی فرانسیسی مراکش کی انتظامی گتھیاں سلجھا رہا تھا۔ انہی دنوں ہسپانوی بھی مشکلات میں گھرے ہوئے تھے۔ بات یہ تھی کہ ریف کے پہاڑی علاقے میں، جہاں کسی کا گزر بھی مشکل تھا، کچھ بربر قبیلے آباد تھے۔ ۱۹۲۰ء میں ان قبیلوں کے ایک سردار عبدالکریم

سے فرانس نے مراکش کی وزارتِ خارجہ کے فرائض خود سنبھال رکھے تھے اور یہ بات فرانس والوں کو ناگوار تھی کہ سلطان خارجہ پالیسی میں دخل دے۔

۱۹۵۰ء میں "استقلال" پارٹی مراکش میں بہت زور پکڑ گئی۔ اس کے ارکان کی اکثریت عربوں پر مشتمل تھی۔ شہروں اور بڑے بڑے قصبوں میں، خاص طور پر مزدوروں میں، اسے بہت مقبولیت حاصل تھی طبعاً اس جماعت کا اثر ان علاقوں میں بھی محسوس کیا گیا جہاں بربروں کی اکثریت تھی۔ اگرچہ غلاوی، جو فرانسیسیوں کا پرانا حلیف تھا، اس تحریک اور اس جماعت کا سخت مخالف تھا۔

فرانس نے "استقلال" پارٹی کے سیاسی وجود کو یوں تسلیم کیا کہ اس جماعت کے راہنماؤں کو پکڑ کر جیل میں بند کر دیا یا جلاوطن کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ استقلال نے جس تحریک کو جنم دیا تھا اس کی فعالیت کے سررشتے ان لوگوں کے ہاتھوں میں چلے گئے جو دوسرے ملکوں میں مقیم تھے کہ انہیں دیس نکالا دے دیا گیا تھا۔

ان راہنماؤں میں دو زیادہ نمایاں ہیں یعنی الہ الفیصل اور حاجی احمد بلافرج۔ انہی دونوں نے استقلال کی تحریک کو پروان چڑھایا اور اقوام متحدہ کے ذریعے دوسرے ممالک کو مراکش کے کوائف سے باخبر رکھا۔

۱۹۵۰ء کے بعد مراکش کے قوم پرستوں کی تحریکِ آزادی آخر کار انقلاب کے مرحلے طے کرنے لگی۔ کبھی ہڑتال، کہیں آتش زنی اور تخریب، کہیں بلوئے، کہیں خون ریزی اور فساد۔ مختصر یہ ہے کہ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔

کاسابلانکا میں، اور دوسرے شہروں میں یکے بعد دیگرے فساد شروع ہو گئے۔ فرانس کی فوجوں اور پولیس کے سپاہیوں نے ہزاروں قوم پرستوں کو ڈھیر کر دیا۔ چنانچہ ایک ہزار راہنماؤں کو جلاوطن کر دیا گیا اور بعض لوگوں کو صحرا میں ان فوجی کیمپوں میں قید کر دیا گیا، جہاں قیدیوں پر خصوصی سختی کی جاتی ہے۔ استقلال پارٹی کو خلافِ قانون جماعت قرار دے دیا گیا۔

فرانسیسی مراکش میں اصلاحات رائج کرنے کے متعلق زبانی جمع خرچ سے کام لیتے رہے۔ وہ

یہ بھی کہتے تھے کہ اب مراکش کے لوگوں کو سرکاری عہدوں پر فائز کیا جائے گا اور روزمرہ کی زندگی میں زیادہ آزادی ہو جائے گی جس شخص نے ان اصلاحات کو عملی جامہ پہنانے کی پوری کوشش کی وہ پیرے مینڈسے فرانس (PIERE MENDES FRANCE) نامی فرانس کا وزیر اعظم تھا کہ بات کا سچا اور دھن کا پکا تھا۔ اس کی حکومت ۱۹۵۴ء میں برسر اقتدار آئی تھی۔

جب پیرے مینڈسے فرانس نے عنان اختیار سنبھالی تو اس نے یہ تجویز پیش کی کہ مراکش کو ہوم رول دے دیا جائے یعنی داخلی امور میں اسے پوری آزادی حاصل ہو۔ البتہ وزارت خارجہ کے فرائض فرانس سرانجام دے۔ دفاع بھی فرانس ہی کے ذمے رہے اور دونوں ملکوں میں اقتصادی روابط نہایت خوشگوار ہو جائیں۔

لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ جو لوگ مراکشی قوم پرستوں کے مخالف تھے، انہوں نے مینڈسے فرانس کی مخالفت شروع کر دی۔ ان لوگوں نے شور مچایا کہ عربوں کو حکومت کرنا آتا ہی کہاں ہے کہ یہ ذمہ داری انہیں دی جائے۔ مجبوراً مینڈسے فرانس مستعفی ہو گیا۔ چنانچہ سمجھوتے اور اصلاحات کے نفاذ کے تمام امکانات ختم ہو گئے۔

۲ مارچ ۱۹۵۶ء کو ۴۴ سال کے عہد غلامی کے بعد فرانس اور مراکش کی دولت شریفیہ کے درمیان ایک نیا معاہدہ ہوا۔ اس معاہدے کے ذریعے مراکش کو خود مختار تسلیم کیا گیا۔ دوسرے مہینے ہسپانیہ نے بھی قوم پرستوں کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور ہسپانوی مراکش بھی نئی ریاست کا جزو بن گیا۔ واضح ہو کہ یہ گفت و شنید مراکش کے نئے وزیر خارجہ نے کی یعنی حاجی احمد نے، جو نیویارک میں جلاوطنی کے دن گزارنے کے بعد وطن لوٹ آیا تھا۔ اس کے بعد طنجہ بھی مراکش کا جزو قرار دیا گیا۔

نومبر ۱۹۵۶ء میں مراکش نے ایک آزاد رکن کی حیثیت سے مجلس اقوام متحدہ میں شرکت کی۔

۷ دسمبر ۱۹۶۲ء کو مراکشی عوام نے رائے شماری کے ذریعہ ملک کے نئے آئین کی منظوری دی

اس آئین کی رو سے مراکش کے بادشاہ کی حیثیت ایک ایسے لیڈر کی سی ہے جو ملک کے مختلف الخیال سیاسی عناصر کے مابین رابطہ پیدا کرتا ہے اور ان کے درمیان سمجھوتے کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس طرح ملک کے سیاسی نظام کی بنیاد کثیر الجماعتی جمہوریت پر رکھی گئی ہے۔

نئے آئین میں اس بات کی ضمانت دی گئی ہے کہ عوام کو نہ صرف سیاسی معاملات میں بلکہ اقتصادی اور معاشرتی امور میں بھی زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل ہوگی۔ اس سلسلے میں افراد کے بنیادی حقوق کے تحفظ کی پوری پوری ضمانت دی گئی ہے۔ جہاں تک اقتصادی اور معاشرتی حقوق کا تعلق ہے ان کی نگہداشت کے لئے منصوبہ بندی اور قومی ترقی کی ایک مجلس اعلیٰ قائم کی گئی ہے۔

کسی جمہوری نظام میں عوام کے بنیادی حقوق کا تحفظ عدلیہ کی آزادی اور خود مختاری کے بغیر ناممکن ہوتا ہے۔ چنانچہ آئین نے عدلیہ کو اپنے تمام معاملات میں خود مختار رکھا ہے۔ حتیٰ کہ مجسٹریٹوں کے تقرر اور برطرفی کے اختیارات بھی ایک اعلیٰ مجلس عدل کے سپرد کئے گئے ہیں اور عام انتظامی مشینری کو اس کے معاملات میں دخل دینے کی اجازت نہیں ہے۔

مراکش کا پارلیمانی نظام بڑی حد تک برطانوی طرز حکومت سے ملتا جلتا ہے کیونکہ حکومت کو بیک وقت بادشاہ اور پارلیمنٹ دونوں کے سامنے جواب دینا پڑتا ہے۔ بادشاہ کو حکومت اور پارلیمنٹ دونوں پر بالادستی حاصل ہے۔ گویا وہ انتظامیہ اور مقننہ کے درمیان ثالث کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر بادشاہ کو کچھ انتظامی اختیارات بھی دیئے گئے ہیں اور قانون سازی کا اختیار بھی دیا گیا ہے۔

پارلیمنٹ اگرچہ عوام کی منتخب کردہ ہوتی ہے، لیکن کابینہ کے وزراء کی تقرری بادشاہ کا کام ہے، اور یہ کام وہ پارلیمنٹ میں سیاسی جماعتوں کی نمائندگی کو ملحوظ رکھ کر انجام دیتا ہے۔ اسی طرح بادشاہ جو فرمان جاری کرتا ہے اس پر وزیراعظم کے دستخط بھی لازمی ہوتے ہیں۔ گویا بالواسطہ طریق سے بادشاہ کے اقدامات کو عوامی نمائندوں کی تائید حاصل ہوتی ہے۔

اس آئین کا ایک پہلو خاص طور پر قابل ذکر ہے اور وہ یہ ہے کہ بادشاہ یا حکومت کے تجویز کردہ کسی قانون کو پارلیمنٹ مسترد کردے تو حکومت کو اس مسئلے پر استصواب عام کرانے کا حق حاصل ہے۔ اسی طرح اگر بادشاہ پارلیمنٹ کے منظور کردہ کسی مسودۂ قانون سے اختلاف کرتا ہے تو وہ معاملہ عام رائے دہندگان کے سامنے رکھا جا سکتا ہے۔ اگر عام رائے دہندگان اس معاملے میں پارلیمنٹ کے موقف کی حمایت کریں تو بادشاہ اس کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا۔ البتہ رائے عامہ پارلیمنٹ کے فیصلے کے خلاف جائے تو پارلیمنٹ خود بخود ٹوٹ جاتی ہے۔

مراکش کی پارلیمنٹ دو ایوانوں پر مشتمل ہے۔ وزیر اعظم کو اپنے تمام پروگرام دونوں ایوانوں کے سامنے پیش کرنے پڑتے ہیں لیکن اس کے لیے صرف ایوان نمائندگان کی منظوری حاصل کرنا ضروری ہے، کیونکہ اس کے ارکان عوام کے براہ راست نمائندے ہوتے ہیں۔ اس ایوان کو حکومت کے حق میں اعتماد کا ووٹ منظور کرنے یا اس کے خلاف تحریک عدم اعتماد منظور کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ اس ایوان کے انتخابات چار سال کے وقفے سے ہوتے ہیں۔

پارلیمنٹ کا دوسرا ایوان ملک کی ممتاز شخصیتوں کو بالواسطہ سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی بنیادوں پر نمائندگی دیتا ہے۔ اس ایوان کے دو تہائی ارکان مقامی حلقہ ہائے نیابت کے منتخب نمائندوں کے ذریعہ منتخب کئے جاتے ہیں۔ باقی ایک تہائی ارکان کا انتخاب کاروباری اور پیشہ ور انجمنیں کرتی ہیں۔

ملائیشیا

ملایا میں، سنگاپور میں اور بعض ان علاقوں میں جن کا انڈونیشیا مدعی تھا انگریزوں کی حکومت قائم تھی۔

دوسری جنگ عظیم نے محکوم ممالک میں آزادی و استقلال کی تحریکوں کو اور زیادہ توانائی عطا کر دی۔ اور دوسرے مجاہدین حریت نے آزادی و استقلال کی لڑائی کامیابی سے لڑی۔

دوسرے سامراجی ممالک مثلاً فرانس وغیرہ نے اپنے مقبوضات آزاد کرنے میں زیادہ سے زیادہ دیر لگائی۔ اور جتنے تاخیری حربے استعمال کر سکتے تھے کیے۔ بلکہ مطالبہ حریت آزادی کا جواب توپ و تفنگ سے بھی دیا۔ لیکن برطانیہ نے ایسا نہیں کیا۔

برطانیہ نے جب محسوس کر لیا کہ سامراجی نظام متزلزل ہو رہا ہے۔ اور اب دوسرے ملکوں اور قوموں کو غلام نہیں بنایا جا سکتا، تو اس نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے ماتحت اپنے مقبوضات کو خوش دلی کے ساتھ آزاد کرنا شروع کر دیا۔

چنانچہ ملایا کو بھی ۱۹۶۲ء میں اس نے آزاد کر دیا۔

لیکن یہاں کمیونسٹوں کے فروغ نے ایسے مسائل پیدا کر دیئے تھے کہ برطانیہ نے اور برطانیہ سے زیادہ سنگاپور وغیرہ نے محسوس کیا کہ ان کی انفرادی آزادی، ایک خطرہ ہے، اور دشمن کی ایک ضرب انہیں ہمیشہ کے لیے ختم کر دے گی۔

چنانچہ سنگاپور، اور بورنیو وغیرہ کی رضامندی سے ملائیشیا کی اسکیم بنی، یعنی یہ چھوٹے چھوٹے نوآزاد، اور قریب بہ آزاد ملک جو نہ اپنا دفاع کر سکتے ہیں، نہ پورے طور پر اپنی کفالت کر سکتے ہیں وہ عظیم ملایا کے ساتھ دفاعی تعلقات قائم کریں۔ اور اپنی انفرادیت کے تحفظ اور بقا کے

ساتھ مرکزی معاملات میں ملایا کی بالادستی قبول کرلیں۔
یہ اسکیم منظور ہوگئی اور ملائشیا عالم وجود میں آگیا، لیکن انڈونیشیا کو اس سے اختلاف ہے۔ کیونکہ وہ بعض علاقوں کا مدعی ہے اور انہیں ملائیشیا کے ساتھ شامل دیکھنا نہیں چاہتا، اس مسئلے نے دونوں اسلامی ملکوں میں اختلاف کی خلیج حد درجہ وسیع کردی ہے۔

مالی

یہ فرانسیسی سوڈان کا علاقہ ہے، اس کی مختصر سیاسی تاریخ درج ذیل ہے۔

۱۔ یہاں پہلی مجلس آئین ساز ۱۹۴۷ء میں قائم ہوئی۔

۲۔ ۲۴، مارچ ۱۹۵۷ء کو سابق فرینچ سوڈان کا پورا علاقہ آزاد اور خود مختار ہوگیا۔

۳۔ جمہوریہ مالی (سابق فرینچ سوڈان) کا رقبہ ۲۵ سو مربع میل ہے۔

۴۔ ۱۹۶۲ء کی مردم شماری کے مطابق آبادی ۴۲ لاکھ ہے، جس میں غالب ترین اکثریت مسلمانوں کی ہے، یعنی ۹۵ فیصد،

۵۔ ۲۴ نومبر ۱۹۵۸ء کو سابق فرینچ سوڈان کا سرکاری نام "مالی" قرار پایا۔

۶۔ ۲۳، جنوری ۱۹۵۹ء کو مالی نے اپنا دستور تیار کر لیا، جس کی رو سے عام بالغ حق رائے حاصل ہے،

۷۔ ۸، مارچ ۱۹۵۹ء کو نئی مجلس آئین ساز کا انتخاب عمل میں آیا،

۸۔ سوڈان اور سینیگال نے "مالی فیڈریشن" میں شرکت کر لی تھی، لیکن بہت جلد دونوں نے پھر علیحدگی اختیار کر لی۔

۹۔ جون ۱۹۶۱ء کو متحدہ عرب جمہوریہ (مصر) نے مالی کو چھ ملین پونڈ قرض دیا۔

۱۰۔ مئی ۱۹۶۲ء کو جمہوریہ مالی کے صدر مملکت نے سوویت روس کا دورہ کیا۔

۱۱۔ ۱۵، اگست ۱۹۶۳ء کو عثمان ، وزیر محنت و سول سروس نے اعلان کیا کہ مالی نے ہمیشہ کے لئے سوشلزم کو اختیار کر لیا ہے۔

۱۲۔ ۷، جنوری ۱۹۶۳ء کو سوویت روس سے ایک معاہدہ ہوا، جس کی رو سے وہ ایک زراعتی مرکز قائم کرے گا، اور ایک ایڈمنسٹریشن کالج قائم کرے گا۔

اسلامی جمہوریہ ماریتانیہ

اسلامی جمہوریہ ماریتانیہ کا رقبہ ۴ لاکھ ۱۹ ہزار دو سو تیس مربع میل ہے۔ اس کے مغرب میں بحر اوقیانوس، مشرق میں مالی، شمال میں الجزائر اور جنوب میں سینیگال واقع ہے۔ جمہوریہ ماریتانیہ کا شمالی علاقہ ایک وسیع سطح مرتفع ہے۔ جس کی زمین ریت سے ڈھکی ہوئی ہے۔

مویشی پروری اور زراعت اس ملک کے خاص معاشی وسائل ہیں۔ شمالی قبائل خصوصاً خانہ بدوش واقع ہوئے ہیں۔ وہ اپنے مویشی اور بھیڑوں کے ریوڑ لئے ہوئے صحرائی سلسلوں کے چکر لگاتے پھرتے ہیں اور جہاں کہیں چارے کے لئے تھوڑی بہت ہریالی ملتی ہے وہیں کچھ دن قیام پذیر ہوجاتے ہیں۔ ۱۹۵۶ء کے اعداد و شمار کے مطابق اس ملک میں ۲ لاکھ ۹۷ ہزار اونٹ، ۸ لاکھ ۸۷ ہزار مویشی، ایک لاکھ ۶۶ ہزار گدھے اور گھوڑے اور ۴۵ لاکھ ۸۶ ہزار بھیڑ اور بکریاں تھیں۔

شمالی ریگستان میں کچھ خطے ایسے بھی ہیں جہاں تھوڑی بہت ہریالی پائی جاتی ہے اور ان ہی علاقوں میں بہت عمدہ قسم کی کھجوریں پیدا ہوتی ہیں۔ جنوبی علاقہ خصوصی طور پر زرعی ہے۔ یہاں سالانہ ۸ انچ سے ۲۰ انچ تک بارش ہوتی ہے۔

معدنی اعتبار سے یہ ملک مالدار ہے اور یہاں لوہے اور تانبے کے بڑے بڑے ذخیرے موجود ہیں۔ یہاں کی صنعت ایک خاص قسم کے درخت سے تیل نکالنا اور ساحلی علاقوں میں مچھلیاں پکڑنا ہے۔ شمالی اور جنوبی علاقوں کے قبائل کے درمیان ملکی تجارت بڑے شد و مد سے ہوتی ہے۔ شمالی قبائل جنوبی قبائل کو کھجوریں اور ریگستانی نمک دیتے ہیں اور ان کے عوض جنوبی علاقے سے جوار حاصل کرتے ہیں۔ یہ تجارت بالعموم تبادلۂ اجناس کی بنیاد پر ہوتی ہے۔

غیر ملکی تجارت یوں تو بالعموم برطانیہ سے ہوتی ہے لیکن پڑوسی ملکوں سے بھی تجارت تعلقات

قائم ہیں۔ اس ملک کی خاص برآمدات مویشی، گوند، نمک، خشک اور نمک لگی ہوئی مچھلی، لوہا، تانبا تیل اور کھجوریں ہیں۔

یہاں کی آبادی تقریباً ۱۰ لاکھ، ۷ ہزار ہے جو عربوں، بربروں اور حبشیوں پر مشتمل ہے۔ مسلمانوں کی آبادی اس ملک کی مجموعی آبادی میں ۹۴ فیصد ہے۔ عرب قبائل نسبتاً کافی مہذب اور متمدن ہیں۔ ۱۹۵۴ء کی مردم شماری کے مطابق عربوں کی تعداد ۴ لاکھ ۶۵ ہزار نو سو تھی۔ عرب اور بربر قبیلوں کے لوگ بالخصوص مویشی پالتے ہیں اور حبشی قبیلوں کے افراد کاشت کاری کرتے ہیں۔

اس ملک کا رقبہ اتنا وسیع ہونے کے باوجود یہاں زرعی وسائل بہت محدود ہیں۔ گذشتہ دس سال کے عرصے میں یہاں کی آبادی میں جو غیر معمول اضافہ ہوا ہے اس کی وجہ سے یہاں کے کافی لوگوں کو تلاش معاش میں قرب وجوار کے دیگر ممالک میں منتقل ہو جانا پڑا۔ یہ لوگ زیادہ تر سینیگال منتقل ہو گئے ہیں جہاں آبپاشی کا وافر انتظام ہے۔

عیسوی سن کے آغاز میں جنوبی صحرائے عظیم پر حبشیوں کو غلبہ حاصل تھا اور انہیں صدیوں یہ غلبہ حاصل رہا۔ انہوں نے اپنی مختلف قبائلی ریاستیں اور مملکتیں قائم کر رکھی تھیں۔ پہلی صدی ہجری میں مراکش کے سیاح ماریتانیہ میں اسلام کی دعوت لے کر آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس دین کو یہاں بڑا فروغ حاصل ہوا۔ گیارہویں صدی عیسوی میں یہاں المورادو کی سلطنت قائم ہوئی جس نے بعد میں نہ صرف مراکش بلکہ مسلم ہسپانیہ کو بھی اپنے زیر نگیں کر لیا۔ اس کے علاوہ جنوب میں بھی یہ سلطنت گھانا کے بعض علاقوں تک پھیل گئی۔ لیکن ۱۵۹۱ء میں مراکش نے پورے جنوبی علاقے پر قبضہ کر لیا اور اس کے بعد سے بیسویں صدی کے آغاز میں فرانسیسی فتوحات مکمل ہونے تک یہاں مراکش کی حکمرانی رہی۔

انیسویں صدی کے اختتام پر فرانس اور برطانیہ کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ ہوا جس کے نتیجے میں سارا مغربی افریقہ فرانسیسیوں کے قبضے میں آگیا۔ فرانسیسیوں نے اپنے اثرات و مفادات کو یہاں بڑی چالاکی اور ہوشیاری سے وسعت دی۔ انہوں نے ملکی قبائل کے سرداروں کو دھوکا دے کر ان سے صلح ناموں پر دستخط کرائے اور اس طرح یہ قبائلی ریاستیں ایک ایک کر کے فرانسیسی حفاظت اور نگرانی میں آگئیں۔ فرانسیسیوں نے اس مقصد کے لئے بہت سے قبیلوں کو

دھمکیاں دیئے اور اذیتیں پہنچانے کی بھی روش اختیار کی۔

لیکن ابھی کچھ لوگ اس ملک میں ایسے بھی تھے جو بوبھا قبیلے کے سردار تھے۔ محمد محمود نے اپنے قبیلے کے سرفروش جوانوں کو ساتھ لے کر آٹھ سال فرانسیسی لشکروں کی یلغار کا مقابلہ کیا اور اس مقابلے کے دوران وہ اپنے ملک کی حفاظت کرتے ہوئے ایک لڑائی میں کام آئے۔ ۱۹۰۳ء میں فرانسیسیوں نے اس ملک میں اپنی نگرانی اور تحفظ کا اعلان کیا اور ۱۹۲۰ء میں انہوں نے اپنا ایک نوآبادیاتی ملک بنا ڈالا۔ ۱۹۵۸ء میں ماریتانیہ فرانسیسیوں کی باضابطہ مملکت بنا اور پھر نومبر ۱۹۶۰ء میں اس نے مکمل خودمختاری حاصل کی۔ اب یہ ملک ایک اسلامی جمہوریہ اور اقوام متحدہ کا آزاد رکن ہے۔ مختار ودا ماریتانیہ کے موجودہ سربراہ مملکت ہیں۔

نائیجیریا

نائیجیریا مغربی افریقہ میں ہے۔ یہاں انگریزوں کی حکومت تھی۔ اکتوبر سنہ ۱۹۶۰ء میں آزاد ہوا ہے۔ اس کے سربراہ سرالحاج ابوبکر تفاوی بلیوا ہیں۔

اس ملک کا نام دریائے نائیجر کی وجہ سے نائیجیریا رکھا گیا۔ موسم تقریباً بارہ مہینے یکساں رہتا ہے نہ سردی نہ گرمی۔ شمالی نائیجیریا کا کچھ حصہ ریگستانی ہے۔ وہاں دسمبر جنوری میں بھی سخت دھوپ اور گرمی پڑتی ہے۔ یوں تو بارش سال بھر ہوتی ہے۔ شاذ و نادر ہی کوئی ہفتہ بغیر بارش کے گزرتا ہے لیکن مئی سے اکتوبر تک لگاتار بارش ہوتی ہے۔ جب بادل آتے ہیں گھٹا ٹوپ اندھیرے چھا جاتے ہیں۔ اور اس قدر خوفناک آواز سے گرجتے ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے گویا آسمان پھٹ رہا ہے اور بجلی اس قدر کوندتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے ابھی یہ روئے زمین کے بسنے والوں کو جلا کر راکھ کر دے گی۔ بجلی سے بچنے کے لیے مکانات پر برق کش لگے ہوتے ہیں۔ بادل کی کڑک اور بجلی کی چمک کے ساتھ ایک دم تیز بارش شروع ہو جاتی ہے۔ نشیب اور گڑھوں میں جو بارش کا پانی جمع ہو جاتا ہے اسے پینے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

نائیجیریا میں بارش کا اوسط سالانہ سو انچ ہونے کے باوجود نہ کہیں پانی جمع ہوتا

ہے۔ نہ کیچڑ ہوتی ہے کیونکہ زمین ڈھلوان ہے یعنی پورا علاقہ سطح مرتفع ہے۔ تمام علاقہ جنگلات سے پٹا پڑا ہے۔ بڑے بڑے دیو ہیکل گھنے درخت ہیں اور انسان کے سر سے اونچی گھاس۔ ان جنگلات میں دن کے وقت بھی رات کا گمان ہوتا ہے چنانچہ آگ لگا کر وہاں راستہ بنایا جاتا ہے۔ درختوں کی شاخیں اس قدر گتھی ہوئی ہوتی ہیں کہ انھیں کاٹ کر الگ کرنا ناممکن ہے۔ جنگلات کے درمیان پختہ سڑکیں بھی بنی ہوئی ملتی ہیں۔

مشرقی نائجیریا میں کوکو کے درختوں کے علاوہ اور بہت سی قسم کے درخت ہیں۔ آم کے درخت تو سڑکوں کے دونوں جانب لگے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ پچاس سال پہلے یہاں آم کا ایک بھی درخت نہ تھا۔ انگریزوں نے ان پچاس سال میں گٹھلیاں لاکر بوئیں، یہاں کی مٹی بڑی زرخیز ہے لہٰذا تمام گٹھلیاں تناور درخت بن گئیں جن میں سال میں دو بار آم آتے ہیں۔ اور اس کثرت سے کہ آم درختوں پر پک پک کر زمین پر گر کر سڑ جاتے ہیں۔

نائجیریا کا روایتی لباس لمبے چغے اور پاجامہ ہے ٹوپی بھی اوڑھتے ہیں عورتیں خوب ڈھیلے ڈھالے بلاؤز اور گھٹنوں سے اونچی لنگی باندھتی ہیں۔ یہاں کے لوگوں کے بال گھنگھریالے ہوتے ہیں، یہ بال بہت سخت تاروں کی مانند ہوتے ہیں جن میں عام کنگھوں سے کنگھی نہیں کی جاتی۔ یہ لوگ پیتل کی کنگھیاں استعمال کرتے ہیں نائجیریا کی خواتین میں بھی اب بال بڑھانے کا شوق عام ہوتا جارہا ہے۔

عیسائیوں کے مشنری تعلیمی مراکز میں مسلمانوں کو داخل نہیں کیا جاتا۔ اگر کوئی مسلمان اپنے بچّے کو تعلیم دلانا چاہتا ہے تو اس بچّے کے لیے لازمی ہے کہ وہ عیسائی ہو جائے ان اسکولوں میں کچھ ایسے مسلمان والدین کے بچّے بھی پڑھتے تھے جو اب عیسائی ہو گئے ہیں۔ اور اُن کے نام بھی تبدیل کر دیے گئے ہیں لیکن والد کے نام کے ساتھ الحاج لکھتے تھے۔

نائجیریا میں کئی قسم کی معدنیات پائی جاتی ہیں مثلاً سونا، جست، ٹین، کوئلہ، ان کے علاوہ

پٹرول کے چشمے بھی ہیں۔ نائجیریا میں بڑے بڑے صنعتی کارخانے نہیں ہیں۔ البتہ چھوٹی صنعتیں بہت ہیں۔ یہاں مٹی کے برتن، بانس کی خوبصورت ٹوکریاں، ہاتھی دانت کا آرائشی سامان، سانپ، اژدہے، مگرمچھ اور دیگر جانوروں کی کھال کا خوبصورت سامان مثلاً جوتے، زنانہ بٹوے اور دیگر آرائشی سامان بہت مشہور ہیں۔

طبی امداد سے کوئی محروم نہیں رہتا۔ ہر چھوٹے بڑے شہر میں سرکاری ہسپتال موجود ہیں جہاں مفت طبی امداد بہم پہنچائی جاتی ہے۔ چھوٹے قصبوں اور دیہاتوں میں بھی ڈسپنسریاں موجود ہیں۔ ایک سرکاری ڈاکٹر روزانہ ایک ایک ڈسپنسری میں جاکر وہاں کے مریضوں کا معائنہ اور علاج کرتا ہے۔ نائجیریا میں مریض ہسپتال میں داخل ہونے سے نہیں گھبراتے بلکہ معمولی معمولی تکالیف پر بھی ہسپتال میں داخل ہونے پر اصرار کرتے ہیں۔

اکتوبر ۱۹۵۴ء کو نائجیریا ایک انگریز گورنر جنرل کے ماتحت فیڈریشن بن گیا۔ فیڈریشن کے اجزاء داخلی طور پر آزاد اور خودمختار رہیں۔

اس کا مجموعی رقبہ ۳۹۰۲۵۰ مربع میل ہے۔ ۱۹۶۳ء کی مردم شماری کے مطابق ۳۷ ملین ہے جس میں ۲۱ ملین مسلمان ہیں یعنی ۵۷ فیصد

۱: شمالی نائجیریا بشمول شمالی کیمرون:

رقبہ: ۳۱۵۳۶۳ مربع میل

آبادی: ۲۰ ملین

وزیر اعظم الحاج سر احمد بیلو

۲: مشرقی خطہ:

رقبہ: ۲۹۴۸۴ مربع میل۔

آبادی: ۸½ ملین

۳: مغربی خطہ بشمول لاگوس:

رقبہ: ۴۵۴۰۳ مربع میل۔

آبادی : ۸½ ملین

---

۲۶ - جون ۱۹۵۷ء

مجلسِ دستوری کا اجلاس لندن میں ختم ہوا جس میں علاقائی خود مختاری کا فیصلہ ہوا۔ ۱۹۵۹ء میں شمالی علاقہ بھی خود مختار ہو گیا۔

عالم اسلام

آبادی، رقبہ، وسائل، ذرائع

مسلم ممالک کی آبادی اور دوسری تفصیلات کے اعداد و شمار درج ذیل ہیں:

عدن

برطانوی نو آبادی - ۵ء۷ مربع میل

زیر نگرانی ۱۱۱۰۰۰ "

کل آبادی - ۱۲۰۰۰۰۰ (کل مسلم)

نو آبادی کی سرکاری زبان - انگریزی

تعلیم - ۲۱ فیصد

افغانستان

رقبہ : ۲۵۱۰۰۰

کل آبادی (۱۹۶۰) ۱۳۰۰۰۰۰۰

دارالخلافہ : کابل ۔ آبادی ۴۰۰۰۰ ۔

حکومت : شہنشاہیت ۔

قومی وسرکاری زبان : فارسی اور پشتو ۔

البانیہ

البانیہ ۱۴۶۷ء سے ۱۹۱۲ء تک ترکوں کے ماتحت رہا۔ ۱۹۴۵ء میں آزاد کمیونسٹ ریاست بنا ۔

رقبہ : ۱۱۵۰۰۰

آبادی : (۱۹۶۱) ۱۶۶۵۰۰ ۵۰ فیصد مسلم

دارالخلافہ : تری آنا ۔

الجزائر

الجزائر پر ترکی اقتدار ۶۶۲۴۷ تا ۶۶۵۵۶ رہا ۔ ۱۸۳۰ء تک یہ ایک آزاد ملک رہا ۔ ۱۸۳۰ء کی نوآبادی جنگ کے بعد اس پر فرانسیسیوں نے قبضہ کرلیا ۔ لیکن فوراً ہی عبدالقادر کی نگرانی میں آزادی کی جنگ شروع ہوگئی ۔ اور مسلسل جنگ کے بعد ۱۹۶۲ء میں آزاد ہوا ۔

آزادی : ۳ ۔ جولائی ۱۹۶۲ء

رقبہ : ۹۲۰۰۰۰ مربع میل

کل آبادی : (۱۹۶۰) ۱۰۵۰۰۰۰۰ ۔ مسلم : ۱۰۰۰۰۰۰۰

راجدھانی : الجزیرہ

حکومت : اشتراکی جمہوریت ۔ بالغ رائے دہی ۔

قومی وسرکاری زبان : عربی

سالانہ بجٹ : ۲۰۴۱۰۰۰۰۰۰

تعلیم : ۶ فی صد

بحرین

فتح مکہ کے فوراً ہی بعد بحرین بھی مسلمانوں کے قبضے میں آگیا۔ انیسویں صدی کے آخر تک آزاد عثمانی خلافت کے زیر اثر رہا۔ لیکن دوسرے عرب سرداروں کی طرح شیخ بحرین نے ۱۸۹۹ء میں انگریزوں سے مصالحت کر لی۔ اور عثمانی خلافت کا قلادہ اتار کر انگریزوں کے زیر اثر آگیا۔

رقبہ : ۲۳۱ مربع میل۔

آبادی : ۱۴۳۱۳۵ (کل مسلم)

دارالخلافہ : منامہ (۶۲۰۰۰)

حکومت : شخصی۔

قومی و سرکاری زبان : عربی۔

سالانہ بجٹ : ۷۵۰۱۰۰۰۰ ۔ ۱۹۶۳ء

تعلیم : ۲۵ فی صد۔

کیمرون

آزادی : جنوری ۱۹۶۰ء

رقبہ : ۱۶۵۰۰۰ مربع میل

آبادی : ۳۰۰۰۰۰ (مسلم اکثریت)

دارالخلافہ : سیلو نمڈی۔

چاڈ

آزادی : ۱۱۔ اگست ۱۹۶۰ء۔

رقبہ : ۴۹۰۰۰۰ مربع میل۔

کل آبادی : (۱۹۵۷) ۲۵۷۶۰۰۰ (مسلم اکثریت)

دھومی (افریقہ)

آزادی : یکم اگست ۱۹۶۰ء

رقبہ : ۴۴۰۰۰ مربع میل

کل آبادی : (۱۹۶۰) ۲۰۰۳۰۰۰

دارالخلافہ : پورٹو نوور

گی آنا

آزادی : ۲۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء

رقبہ : ۹۶۰۰۰ مربع میل

آبادی : (۱۹۶۰) ۲۷۲۶۰۰۰ (مسلم اکثریت)

سرکاری زبان : فرانسیسی۔

دارالخلافہ : کناکری۔

انڈونیشیا

مسلمانوں کی انڈونیشیا پر فتح بغیر جنگ کے ہوئی۔ عرب اور ہندوستانی تاجروں نے تیرھویں صدی سے وہاں اسلام پھیلایا۔ سولھویں صدی میں جب انڈونیشی فرنسیوں کے ظلم سے عاجز ہو چکے تھے اور مسلمان اس وقت تک ملایا اور دیگر گمنی آبادی میں اپنی قوت جما چکے تھے اپنا اقتدار جمایا۔ آج دنیائے اسلام میں انڈونیشیا میں سب سے زیادہ مسلمان بستے ہیں۔

آزادی : ۱۷۔ اگست ۱۹۴۵ء

رقبہ : ۷۳۵۰۰۰ مربع میل

کل آبادی : (۱۹۶۱ء) ۹۷۰۰۰۰۰۰

مسلمان : ۸۷۰۰۰۰۰۰

دارالحکومت : جکارتا

حکومت : جمہوری

قومی و سرکاری زبان : انڈونیشی۔ سالانہ بجٹ ۱۹۶۲ء ۔۔۔ ۹۶۱۵۸۷۹۰۰

ایران

ایران میں قادسیہ اور نہاوند کی جنگ کے بعد اسلام پھیلا۔ انیسویں صدی تک یہ روسی اور برطانوی دباؤ میں رہا۔ دوسری جنگ عظیم میں غیر جانبداری کی وجہ سے ۱۹۴۱ء میں اتحادیوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ جنوری ۱۹۴۲ء میں اس نے مجبوراً سہ طرفہ مصالحت پر دستخط کئے جو ۱۹۴۶ء میں منسوخ ہو گیا۔

رقبہ : ۶۳۶۰۰۰ مربع میل

کل آبادی : (۱۹۶۰ء) ۲۱۰۰۰۰۰۰ (مسلم)

دارالحکومت : تہران

قومی و سرکاری زبان : فارسی

تعلیم : ۲۰ فیصد بجٹ : ۲۶۹۱۰۰۰۰۰ سنہ ۱۹۶۲ء

عراق

آزادی شہنشاہیت کے بعد ۳۔ اکتوبر ۱۹۶۳ء

سیاسی انقلاب : جولائی ۱۹۵۸ء

پھر انقلاب : سنہ ۱۹۶۳ء

رقبہ : ۱۷۵۰۰۰ مربع میل

کل آبادی : (۱۹۶۰ء) ۷۰۰۰۰۰۰

مسلم آبادی : ۶۰۰۰۰۰۰

دارالحکومت : بغداد

حکومت : سوشلسٹ جمہوریہ۔

قومی اور سرکاری زبان : عربی۔

آئیوری کوسٹ

آزادی : ۷۔ اگست ۱۹۶۰ء

رقبہ : ۱۲۳۰۰۰ مربع میل۔

کل آبادی : (۱۹۶۰ء) ۳۲۰۰۰۰۰ ۔ نصف مسلم

دارالحکومت : عابدجان۔

اردن

آزادی : ۲۲۔ مارچ ۱۹۴۶ء

رقبہ : ۳۷۰۰۰ مربع میل

کل آبادی : (۱۹۶۱ء) ۱۷۲۴۸۶۸

مسلم : ۱۲۵۰۰۰۰

دارالحکومت : عمان۔

حکومت : شہنشاہیت ۔ عام رائے دہی۔

سرکاری و قومی زبان : عربی۔

کویت

آزادی : ۱۹۔ جون ۱۹۶۱ء

رقبہ : ۶۸۰۰ مربع میل

کل آبادی : (۱۹۶۱ء) ۳۲۱۶۲۱

مسلم : ۳۱۸۱۷۱

دارالحکومت : کویت۔

حکومت : دستوری شہنشاہیت۔ بالغ رائے دہی۔

قومی وسرکاری زبان : عربی۔

تعلیم : ۳۸ فیصد

لبنان

آزادی : ۲۶۔ نومبر ۱۹۴۱ء

رقبہ : ۳۴۰۰ مربع میل

کل آبادی : ۱۶۲۶۰۰۰ نصف مسلم

دارالحکومت : بیروت

حکومت : جمہوریت۔ بالغ رائے دہی۔

قومی وسرکاری زبان : عربی

لیبیا

آزادی : ۲۴۔ دسمبر ۱۹۵۱ء

رقبہ : ۶۸۰۰۰ مربع میل

کل آبادی : (۱۹۶۰ء) ۱۲۲۵۰۰۰

مسلم : ۱۱۷۵۰۰۰

دارالحکومت : طرابلس۔ بن غازی۔

حکومت : دستوری شہنشاہیت۔ بالغ رائے دہی

قومی و سرکاری زبان : عربی

ملایا

ملایا میں اسلام عرب۔ ہندوستان۔ ترکی اور ایران کے تاجروں نے پھیلایا۔ یہ پہلے پرتگالیوں بعد میں ڈچوں اور پھر انگریزوں کے قبضے میں رہا۔

آزادی : ۳۱۔ اگست ۱۹۵۷ء

رقبہ : ۵۰۷۰۰ مربع میل

کل آبادی : ۷۰۰۰۰۰۰ ۔ ۶۰ فیصد مسلمان ۔

دارالحکومت : کوالالمپور

حکومت : جمہوریت ۔ بالغ رائے دہی ۔

قومی و سرکاری زبان : ملائی ۔ بجٹ : ۱۹۶۳ء : ۱۳۵۰۷۵۴۶۰۰

مالی

آزادی : ۲۲۔ ستمبر ۱۹۶۰ء

رقبہ : ۴۶۳۰۸۵ مربع میل

کل آبادی : ۱۹۶۰ء ۴۳۰۷۰۰ (مسلم اکثریت)

موریٹینیا

فرانسیسی نوآبادی : ۱۹۰۴ء آزادی : ۲۸۔ نومبر ۱۹۶۰ء

رقبہ : ۴۴۹۰۰۰ مربع میل

آبادی : ۶۳۰۶۰۰۰ (کل مسلم)

مراقش

آزادی : ۲۔ مارچ ۱۹۵۶ء

رقبہ : ۱۹۰۰۰۰ مربع میل

کل آبادی : سنہ ۱۹۶۰ء ۱۱۵۹۸۰۰۰

مسلم : ۱۱۰۴۰۰۰۰

دارالحکومت : رباط

حکومت : دستوری شہنشاہیت ۔ بالغ رائے دہی ۔

قومی و سرکاری زبان : عربی ۔ بجٹ ۱۹۶۳ء : ۱۳۰۰۰۰۰۰۰

مسقط و یمن

رقبہ : ۸۲۰۰۰ مربع میل

آبادی : ۵۵۰۰۰۰ (مسلم)

دارالحکومت : مسقط ۔

حکومت : برطانوی زیر نگرانی (شخصی)

قومی و سرکاری زبان : عربی ۔

نائیگر

آزادی : ۳ اگست سنہ ۱۹۶۰ء

رقبہ : ۴۵۷۰۰۰ مربع میل

کل آبادی : ۲۸۰۳۰۰۰ (مسلم اکثریت)

دارالحکومت : نامئی ۔

نائیجیریا

آزادی : یکم اکتوبر سنہ ۱۹۶۰ء

رقبہ : ۳۳۹۱۷۰ مربع میل ۔

کل آبادی: (سنہ ۱۹۶۰ء) ۳۵۲۹۷۰۰۰ (نصف مسلم)

دارالحکومت: لاگوس۔

حکومت: جمہوریت۔ بالغ رائے دہی۔

قومی زبان: ہاؤسا۔

سرکاری زبان: انگریزی۔ بجٹ (۱۹۶۳ء) ۱۳۶۴۵۸۴۰۰۰

پاکستان

آزادی (قیام) ۱۴۔ اگست سنہ ۱۹۴۷ء

رقبہ: ۳۶۴۷۳۷ مربع میل

کل آبادی: ۹۴۵۰۰۰۰۰

مسلم: ۸۶۴۹۸۰۰۰

دارالحکومت: اسلام آباد (زیر تعمیر)

حکومت: بنیادی جمہوریت۔

قومی زبان: اردو۔ بنگالی۔

سرکاری زبان: انگریزی

تعلیم: ۲۰ فیصد۔ بجٹ (۱۹۶۳) ۲۰۲۸۰۰۰۰۰ علاوہ ترقیاتی بجٹ۔

فلسطین

مقدس سرزمین فلسطین جس پر برطانیہ نے اوّل جنگِ عظیم میں قبضہ کر لیا اور برطانوی حکومت کے ماتحت تھا۔

مئی سنہ ۱۹۴۸ء میں یہاں اسرائیلی حکومت قائم کر دی گئی۔ اور دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا مقامات مقدسہ اور متبرک شہر یروشلم حکومت اردن میں شامل ہے۔

رقبہ: ۷۹۹۳ مربع میل۔

آبادی: ۱۹۶۱ء ۲۱۵۰۰۰۰ جس میں تقریباً ۱/۲ کروڑ یہودی باہر سے لا کر بسا دیے گئے۔ مسلم ۱۶۶۰۰۰۔ تقریباً ۱۲ لاکھ مسلمانوں کو فلسطین سے باہر نکال دیا گیا جو آج بحیثیت مہاجر پڑوسی عرب ممالک میں رہ رہے ہیں۔

دارالحکومت: بیت المقدس

قومی زبان: عربی سرکاری زبان: عبرو۔

قطر

رقبہ: ۴۰۰۰ مربع میل

آبادی: ۴۵۰۰۰ مسلم

دارالحکومت: دوحہ۔

قومی و سرکاری زبان: عربی۔

حکومت: شخصی۔

سعودی عرب

سرزمین پاک جہاں سے اسلام کی شعاعیں پھوٹی تھیں اور جو محسنِ انسانیت حضرت محمد صلعم کا مبارک وطن مدینہ منورہ اور دنیا کے بت کدوں میں سب سے پہلا خدا کا گھر مکہ معظمہ ایک خود مختار صوبہ کی طرح رہا۔ پھر عثمانیوں کے زمانے میں خلافتِ عثمانیہ کے تحت رہا۔ آج سعودی خاندان کے حکمرانوں نے اس کا ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے ۱۹۲۷ء میں اعلان کیا۔

رقبہ: ۶۲۰۰۰۰ مربع میل

آبادی: ۷۰۰۰۰۰۰ مسلم دارالحکومت: ریاض۔

قومی و سرکاری زبان: عربی

حکومت: شہنشاہیت۔

بجٹ: ۱۵۵۲۰۸۰۰۰ ریال

سینیگال (شمالی افریقہ)

آزادی : ۲۰۔اگست ۱۹۶۰ء

رقبہ : ۸۱۰۰۰ مربع میل

کل آبادی : سنہ ۱۹۶۰ء ۲۵۹۷۰۰۰ (مسلم اکثریت)

راجدھانی : ڈاکر۔

سوڈان

آزادی : یکم جنوری سنہ ۱۹۵۶ء

رقبہ : ۹۶۷۵۰۰ مربع میل

آبادی : سنہ ۱۹۶۱ء ۱۸۹۲۸۰۰۰

مسلم : ۱۰۰۰۰۰۰

راجدھانی : خرطوم

قومی و سرکاری زبان : عربی۔

حکومت : فوجی۔

شام

آزادی : اپریل سنہ ۱۹۴۶ء

رقبہ : ۷۲۲۳۴ مربع میل

آبادی : سنہ ۱۹۶۱ء ۵۱۰۰۰۰۰

راجدھانی : دمشق۔

حکومت : عرب سوشلسٹ جمہوریت۔

قومی و سرکاری زبان : عربی۔

بجٹ : ۱۹۶۳ء ۲۲۲۰۰۰۰۰۰ علاوہ ترقیاتی بجٹ

ریاستیں

شہرجاہ ۔ راس الخیمہ ۔ ام القوین ۔ اضمان بنبائی (دبائی) ابو الضبائی ۔ فجیراہ ۔

سیاسی حیثیت : برطانیہ کے زیرنگیں

رقبہ : ۳۲۰۰۰ مربع میل ۔

آبادی : ۶۰۰۰۰ مسلم

قومی و سرکاری زبان : عربی ۔

حکومت : شخصی ۔ (ہر ریاست کا الگ الگ ایک شیخ ہوتا ہے)

تیونس

آزادی : ۲۰۔ مارچ سنہ ۱۹۵۶ء

رقبہ : سنہ ۱۹۶۱ء ۴۰۰۰۰۰ مربع میل

مسلم : ۳۸۰۰۰۰۰

دارالحکومت : تیونس ۔

حکومت : جمہوریت ۔ بالغ رائے دہی ۔

قومی و سرکاری زبان : عربی ۔

ترکی

سترھویں صدی میں اسلام پھیلا اور جب سے آزاد ہے مصطفےٰ کمال اتاترک نے ترکی سے عثمانی خلافت کو ختم کر کے ترکی کو ایک آزاد جمہوریت میں منتقل کر دیا ۔

خلافت کا خاتمہ : ۳۔ مارچ سنہ ۱۹۲۴ء

رقبہ : ۳۰۲۰۰۰ مربع میل ۔

آبادی : سنہ ۱۹۶۰ء ۲۷۸۰۹۳۰۱ ۔ تقریباً کل مسلم ۔

دارالحکومت : انقرہ۔

قومی و سرکاری زبان : ترکی (لاطینی حروفِ تہجی میں)

حکومت : جمہوریت۔ بالغ رائے دہی۔

متحدہ عرب جمہوریہ (مصر)

انقلاب : ۲۲۔ جولائی سنہ ۱۹۵۲ء

رقبہ : ۳۸۶۵۰۰۰ مربع میل۔

آبادی : سنہ ۱۹۶۰ء ۲۶۶۰۰۰۰۰

مسلم : ۲۴۵۰۰۰۰۰

دارالحکومت : قاہرہ

حکومت : عرب سوشلسٹ جمہوریت۔ بالغ رائے دہی۔

قومی و سرکاری زبان۔ عربی۔ بجٹ ۱۹۶۳ء : ۱۳۰۰۰۰۰۰۰

یمن

انقلاب : ۲۸۔ ستمبر ۱۹۶۲ء

رقبہ : ۷۵۰۰۰ مربع میل

آبادی : ۵۰۰۰۰۰۰ مسلم

راجدھانی : صنعاء

حکومت : عرب سوشلسٹ جمہوریت۔

قومی و سرکاری زبان : عربی

بجٹ : ۹۷۶۵۲۰۰۰

زنجبار

رقبہ : ۶۴۰ مربع میل

کاروان اسلام

آبادی: ۱۹۵۸ء - ۲۹۹۱۱۱ مسلم
قومی و سرکاری زبان: عربی۔
حکومت: سیاسی خود مختاری۔ زیر سایہ برطانیہ۔

اقلیتی علاقوں میں مسلمان

ہندوستان : ۴۷۰۰۰۰۰۰
چین : ۴۰۰۰۰۰۰۰
سویٹ روس : ۳۵۰۰۰۰۰۰
دوسرے علاقے : ۲۵۰۰۰۰۰۰

(ماخوذ از ہفت روزہ "ترجمان" مدراس
(انڈیا)

تمام شد
کاروان اسلام